اردو

دائرۂ معارف اسلامیہ

زیرِ اہتمام

دانش گاہِ پنجاب ، لاہور

جلد ۱۹

(حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم — محمرہ)

۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء

بار دوم

ادارۂ تحریر

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، ایم اے، ڈی لٹ (پنجاب)	رئیس ادارہ (رخصت پر)*
پروفیسر سید محمد امجد الطاف، ایم اے (پنجاب)	سینیر ایڈیٹر و قائم مقام رئیس ادارہ*
پروفیسر عبدالقیوم، ایم اے (پنجاب)	سینیر ایڈیٹر
پروفیسر مرزا مقبول بیگ بدخشانی، ایم اے (پنجاب)	ایڈیٹر
شیخ نذیر حسین، ایم اے (پنجاب)	ایڈیٹر
ڈاکٹر عبدالغنی، ایم اے، پی ایچ ڈی (پنجاب)	ایڈیٹر
حافظ محمود الحسن عارف، ایم اے (پنجاب)	ایڈیٹر

*از ۹ مارچ ۱۹۸۶ء

مجلس انتظامیہ

۱۔ پروفیسر ڈاکٹر رفیق احمد، ایم اے (پنجاب)، بی اے (مانچسٹر)، ڈی فل (آوکسفرڈ)، وائس چانسلر، دانش گاہ پنجاب (صدر مجلس)

۲۔ پروفیسر ڈاکٹر منیر الدین چغتائی، ایم اے (پنجاب)، ڈی فل (آکسن)، پرو وائس چانسلر، دانش گاہ پنجاب

۳۔ پروفیسر شیخ امتیاز علی، ایم اے، ایل ایل بی (علیگ)، ایل ایل ایم (پنجاب)، ایل ایل ایم (سٹنفرڈ)، وائس چانسلر، قائداعظم یونیورسٹی و صدر، یونیورسٹی گرانٹس کمشن اسلام آباد

۴۔ جسٹس (ریٹائرڈ) سردار محمد اقبال، وفاقی محتسب، حکومت پاکستان، اسلام آباد

۵۔ سید بابر علی شاہ، ۲۔ اے۔ ایف سی سی۔ گلبرگ، لاہور

۶۔ معتمد مالیات، حکومت پنجاب، لاہور (یا نمائندہ)

۷۔ معتمد تعلیم، حکومت پنجاب، لاہور (یا نمائندہ)

۸۔ ڈین کلیۂ علوم اسلامیہ و ادبیات شرقیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور

۹۔ ڈین کلیۂ سائنس، دانش گاہ پنجاب، لاہور

۱۰۔ ڈین کلیۂ قانون، دانش گاہ پنجاب، لاہور

۱۱۔ رجسٹرار، دانش گاہ پنجاب، لاہور

۱۲۔ خازن، دانش گاہ پنجاب، لاہور

۱۳۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، ایم اے، ڈی لٹ، پروفیسر ایمریطس، صدر شعبۂ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ سابق پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور

۱۴۔ پروفیسر سید محمد امجد الطاف، ایم اے، قائم مقام صدر شعبۂ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (معتمد)

حضرت مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللّٰہِ

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ

⊗ **حضرت مُحَمَّد، صلّی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلّم:** پیغمبر اسلام، سرور کائنات، محمد بن عبداللّٰہ بن عبدالمُطّلب بن ہاشم (پورا سلسلۂ نسب آگے آتا ہے).

[یہ مقالہ بڑے ادب و احترام، بڑی احتیاط اور بڑے خوف سے مرتب ہوا ہے؛ مبادا کوئی ایسا لفظ زبان قلم پر نہ آ جائے، جو شان اقدس سے مناسبت نہ رکھتا ہو۔ یہ مقالہ عام مقالات سے مختلف ہے۔ یہ تو مرکزی نقطۂ ایمان ہے جس کے ارد گرد کونین کے سب حقایق لپٹے ہوئے ہیں۔ ہم نے ہر طرح قابل اعتماد مصادر کی بنیاد پر حالات مرتب کیے ہیں اور کوشش کی ہے کہ منصب نبوت کی تقدیس کو کوئی گزند نہ پہنچنے پائے۔ یہ مقالہ دو مقالات سیرۃ اور علم سیرۃ نگاری کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے جن میں سیرۃ کی کتابوں کی درجہ بندی کی گئی ہے].

نسب: ابو القاسم، محمّد (رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ و آلہٖ وسلّم) بن عبداللّٰہ بن عبدالمطّلب (شیبۃ الحَمَد) بن ہاشم (عَمرو) بن عبد مَناف (= المُغیرۃ) بن قُصَیّ (زید) بن کلاب بن مُرّۃ بن کعب بن لُؤَیّ بن غالب بن فِہر (قریش) بن مالک بن النَّضر (قیس) بن کِنانۃ، بن خُزَیمۃ بن مُدرِکۃ (عامر) بن اِلیاس بن مُضَر بن نِزار بن مَعَدّ بن عَدنان۔ [مُدرِکۃ کے نام کے بارے میں اختلاف ہے؛ ابن حزم (جمھرۃ انساب العرب، ص ۱۰) نے عامر لکھا ہے، مگر ابن سعد (طبقات، ۱ : ۵۵) اور البلاذری (انساب الاشراف، ۱ : ۳۵)، ابن کثیر: (السیرۃ النبویۃ، قاہرہ ۱۹۶۴ء، ۱ : ۱۸۸) وغیرہ نے عمرو نقل کیا ہے؛ مدرکہ کے باپ کے نام کے تلفظ میں بھی اختلاف ہے۔ بعض نے اسے اِلْیاس پڑھا ہے (دیکھیے لسان العرب، بذیل مادہ الس و یوس؛ الزرکلی: الاعلام، بذیل مادہ اِلیاس) اور بعض نے اَلْیَاس بن مُضَر، یعنی ال کو غیر لازم قرار دیا ہے (دیکھیے تاج العروس، مطبوعۂ کویت، بذیل مادّۂ یئس، ائس؛ البلاذری: انساب الاشراف، ۱ : ۳۱، ۳۳؛ ابن حزم: جوامع السیرۃ، ص ۲ و ۳)].

اس حد تک تو نسب خود رسول اکرم صلّی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلّم سے مروی ہے اور اس سے اوپر کے متعلق آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے: کَذَبَ النسّابون، یعنی نسب بتانے والے جھوٹے ہیں (السہیلی: الروض الانف، ۱ : ۱۱؛ طبقات، ۱ : ۵۶).

[آنحضرت صلّی اللّٰہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے نسب کے سلسلے میں عدنان تک تو سب متفق ہیں، لیکن اس سے اوپر حضرت اسمعیل علیہ السّلام تک ماہرین انساب میں اختلاف ہے کہ کتنی پشتیں ہیں۔ اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ بعض نسّاب نسبت کے وقت اوپر کے صرف نامور اور مشہور آبا و اجداد کا ذکر کر دیتے ہیں اور کم مشہور افراد کو درمیان سے حذف کر دیتے ہیں۔ اس کی مثالیں کتب اسماء الرجال میں بھی موجود ہیں؛ چنانچہ جن لوگوں نے آنحضرت صلّی اللّٰہ

علیہ و آلہٖ وسلم کے اجداد کا استقصا کیا ان کے ہاں تعداد زیادہ ہے اور جن حضرات نے صرف نامور اور چیدہ آبا و اجداد شمار کیے، ان کے نزدیک تعداد کم ہوگئی۔ ماہرین انساب کا اس پر اتفاق ہے کہ عدنان کا نسب حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام تک صحیح ہے، البتہ درمیان کے آبا و اجداد کی تعداد میں اختلاف ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کا زمانہ بہت بعید ہے اور اتنے دور تک کے سلسلۂ نسب میں اسما کی تعداد میں اختلاف رونما ہو جانا کوئی بعید نہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے سلسلۂ نسب کی ایک ایک کڑی، جس سے آپؐ کا سلسلۂ پیدائش مربوط ہے، نجابت و شرافت اور عزت و نیک نامی کا پیکر تھی۔ آپؐ کے سب آبا و اجداد اور امہات، یعنی والدہ ماجدہ، نانیاں اور دادیاں نہایت پاکباز، نیک اور باوقار خواتین تھیں۔ آپؐ کے تمام بزرگ شرعی نکاح سے پیدا ہوئے تھے۔ آپؐ کے سارے خاندان میں کبھی کوئی شخص زنا اور بدکاری کا مرتکب نہیں ہوا تھا۔ آپؐ کا سارا سلسلۂ نسب محترم اور نامور بزرگوں پر مشتمل ہے۔ وہ سب کے سب سردار اور قائد تھے اور معاشرے میں بڑی معزز اور موقر حیثیت رکھتے تھے۔ شرافت نسبی آپ کی امتیازی خصوصیت ہے]۔

یہ اکیس آبا و اجداد ہیں۔ ہر ایک میں اوسطاً ۳۳ سال کا فرق سمجھیں تو ۶۹۳ سال ہوتے ہیں۔ جیسا کہ آگے صراحت ہوگی، آپؐ کی ولادت سنہ ۵۶۹ء [مشہور ۵۷۰ء] میں ہوئی۔ اس لیے عدنان کی ولادت ۱۲۴ قبل مسیح قرار دی جا سکتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت (السہیلی، ۱ : ۱۱) ہے کہ عدنان اور اسمٰعیل علیہ السّلام کے مابین تیس پشتیں ہیں۔ اس میں ۹۹۰ سال کا اضافہ کریں تو ۱۶۸۳ سال ہوں گے یعنی ۱۱۱۴ ق م ان کا سال ولادت ہوگا۔ تورات (تکوین، ۱۱: ۲۶) کے مطابق تارح [=آزر] کی عمر ۷۰ سال تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی ولادت ہوئی اور تکوین (۱۶ : ۱۶) کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی عمر ۸۶ سال کی تھی جب حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام پیدا ہوئے اور حضرت اسحٰق علیہ السّلام کی ولادت کے وقت تو ان کی عمر (تکوین، ۲۱ : ۵) ایک سو سال کی تھی۔ اس زمانے کے جن لوگوں کی عمریں تورات میں دی گئی ہیں وہ بکثرت صد سالہ ہیں۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے مذکورہ بالا اجداد میں سب ہی پہلوٹی بیٹے نہ ہوں گے۔ اس لیے آپؐ کے اور حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے مابین صحیح مدت بیان نہیں کی جا سکتی۔ موجودہ مغربی تحقیق میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا زمانہ ۱۸۵۰ ق م، یعنی آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم سے ۲۴۱۹ سال قبل سمجھنا چاہیے [نیز دیکھیے : رحمۃ للعالمین، ج ۲، باب ہشتم]۔

[آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے اپنے اور اپنے خاندان کے مقام و مرتبے کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ آدَمَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَ لَا فَخْرَ، یعنی میں قیامت کے دن اولادِ آدم کا سردار ہوں اور اس میں فخر کی کوئی بات نہیں۔ ایک مقام پر آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالٰی نے اولاد ابراہیم علیہ السّلام میں سے حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کو منتخب فرمایا اور بنو اسمٰعیلؑ میں سے بنو کنانہ کو اور بنو کنانہ میں سے قریش کو اور قریش میں سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم میں سے مجھے منتخب فرمایا۔ ایک اور حدیث میں آپؐ نے اللہ تعالٰی کے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ میں بنی نوع انسان میں خاندان اور ذات کے اعتبار سے سب سے بہتر ہوں۔ آپؐ کے حسب و نسب اور خاندان کی شرافت و عظمت کی شہادت ابو سفیان جیسے مخالف نے بھی سر عام ہرقل کے دربار شاہی میں دی تھی۔ (دیکھیے البخاری:

الصحیح، ۱ : ۷ تا ۸، مطبوعہ لائیڈن)]۔

آبا و اجداد کے کچھ حالات: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے بیٹے، حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی اولاد میں سے ہیں۔ قرآنی بیانات کے باعث ان دونوں اجداد کے متعلق بعض گتھیاں قابل ذکر ہیں؛ اس لیے مجبوراً ہمیں اجداد کے سلسلے میں بعض اسرائیلی روایات اور تورات و انجیل کے حوالے دینے پڑے ہیں؛ ورنہ در حقیقت آپؐ کی سیرۂ اقدس آپؐ کے حالات زندگی سے شروع ہوتی ہے اور اسی سے اس کا آغاز ہونا چاہیے۔ بہر حال مختصراً بعض عقدوں کا ذکر ناگزیر ہے، کیونکہ نسب کے سلسلے میں یہودی اور عیسائی مستشرقین نے بہت سی موشگافیاں کی ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ عراق باشندے تھے: ان کے باپ کا نام قرآن مجید (۶ [الانعام] : ۷۴) میں آزر، اور تورات (تکوین، ۱۱ : ۲۶) کے مطابق تارح تھا (جو مغربی تحقیق میں بعض اوقات بگڑ کر یونانی میں آتر Athar ہوی ہو گیا ہے اور یہی لفظ عربی میں آزر ہے [رک بہ آزر]۔ قرآن (۱۹ [مریم] : ۴۶) کے مطابق بت پرست باپ نے ابراہیمؑ کو گھر سے نکال دیا۔ تکوین (۱۲ : ۱، ۵) کے مطابق، خدا کی وحی پر وہ اپنی بیوی سارہ وغیرہ کے ہمراہ کنعان (شمالی فلسطین) میں آ بسے۔ بعض سفروں میں مصر کے فرعون اور جرار Gerar کے حکمران ابیملک کے سپاہی دونوں کو زبردستی پکڑ کر لے گئے، مگر با عزت طور پر دونوں بادشاہوں نے حضرت سارہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس واپس کرتے ہوئے بہت سے جانور اور نوکر (غلام، باندیاں) تحفے میں دیں، (تکوین، ۱۲ : ۲۰؛ ۲۰ : ۱۴)۔ مصری تحفے میں حضرت ہاجرہؓ بھی شامل تھیں۔ صحیح بخاری (۶۰ : ۱۱) میں اخدمہا (بطور خادمہ کے دیا) کا لفظ آیا ہے۔ تکوین (۱۶ : ۱) میں مصری خادمہ ہاجرہ کا ذکر ہے۔ اس کی شرح میں یہودی فاضل سالوموں بن اسحق نے لکھا ہے کہ وہ فرعون کی بیٹی تھیں، اور رب نے ان سے کہا تھا اس (ابراہیم و سارہ) کے خاندان میں تیرا بطور خادمہ رہنا تیرے لیے اس سے بہتر ہے کہ کسی اور جگہ (مصر کے محل میں) مالک بن کر رہے۔ حضرت سارہ کے اولاد نہ ہوئی، اس لیے انہی میں حضرت ہاجرہؓ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نکاح کر لیا تھا (تکوین، ۱۶ : ۳)] اور ان کے بطن سے حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام پیدا ہوئے (تکوین ۱۶ : ۱۵)۔ سوتنوں کے جھگڑے کے باعث (تکوین ۲۱ : ۱۰-۱۵) [مگر فی الحقیقت امتحاناً حکم ربی سے] حضرت ہاجرہؓ اور اسمٰعیل علیہ السّلام کو حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے صحرا میں لا چھوڑا۔ وہاں ایک فرشتے نے (تکوین، ۲۱ : ۱۹-۲۰) حضرت ہاجرہؓ کو ایک کنواں بتایا۔ اس سے کنبے کی جان بچی اور وہ صحرائے فاران میں رہنے لگے۔ بائیبل کے نقشوں میں بئر سبع فلسطین میں غزہ کے جنوب مشرق میں، اور فاران جزیرہ نمائے سینا کے وسط میں بتائے جاتے ہیں، مگر اسلامی روایتوں میں حضرت ہاجرہؓ اور اسمٰعیلؑ کو وہاں لا چھوڑا گیا جہاں بعد میں زمزم کا کنواں نکلا اور شہر مکہ بسا۔ بظاہر ان دونوں میں تطبیق ممکن نہیں، لیکن امام بخاری (الصحیح : کتاب الانبیاء، باب ۸) نے صراحت کی ہے کہ کعبے کے اندر جو رنگین تصویریں کھینچی گئی تھیں ان میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی تصاویر بھی تھیں اور یہ قبل از اسلام کی بات ہے۔ [بعد میں آپؐ کے حکم سے مٹا دی گئیں]۔

[یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ بائیبل کے مرتب کرنے والوں نے حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدۂ محترمہ حضرت ہاجرہؓ کو اس طرح پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا ان کی نجابت، شرافت اور عظمت سے کماحقہ واقف نہیں ہونے پاتا۔ اسلامی روایات کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام بڑے اولوالعزم اور برگزیدہ پیغمبر تھے۔ اللہ تعالٰی نے انہیں منصب نبوت سے نوازا اور توحید کا علم بردار

بنا کر گمراہی اور بت پرستی سے مخلوق خدا کو بچانے کے لیے مبعوث فرمایا ؛ چنانچہ انھوں نے تعلیم شریعت اور تبلیغ دین ایسے بلند مقاصد کے سلسلے میں سخت ترین مصائب برداشت کیے ؛ بخوشی آتش نمرود میں کود گئے، مگر اللہ تعالیٰ نے بال بال بچا لیا ۔ انھوں نے عبادت اور تبلیغ احکام الٰہی کی خاطر ترک وطن کیا ۔ ان کی تین بیویاں تھیں : حضرت سارہؓ ، حضرت ہاجرہؓ اور حضرت قطورہؓ ۔

حضرت ہاجرہؓ کو بائیبل (کتاب تکوین) میں حضرت سارہؓ کی لونڈی بتایا گیا ہے ، جو قطعاً درست نہیں اور حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی اولاد کے خلاف تعصب کی بنا پر یہ بات لکھی گئی ہے ۔ اسلامی روایات کے مطابق حضرت ہاجرہؓ مصر کے شاہی خاندان سے تھیں۔ بقول القسطلانی (شرح صحیح بخاری، ٥ : ٢٣٣، مطبوعہ قاہرہ) کان ابوھاجَر من ملوک القبط، یعنی حضرت ہاجرہؓ کے والد قبطی بادشاہوں میں سے تھے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت ہاجرہؓ شاہان قبط کے خاندان سے تھیں [نیز دیکھیے عنایت رسول چڑیا کوٹی : النصوص الباہرۃ ، در خطبات احمدیہ ، ١٦٣ تا ١٧٧) ۔ امام بخاریؒ کے ہاں یہ الفاظ ہیں : اَخْدَمَھَا ھَاجَر، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ شاہ مصر نے حضرت سارہؓ کی بزرگی اور ان پر خدائی اکرام و انعام دیکھ کر حضرت ہاجرہ کو ان کی خدمت میں دے دیا ۔ یہ جملہ از راہ تواضع مجازی معنوں میں استعمال ہوا ہے : اگر معاذ اللہ حضرت ہاجرہ لونڈی تھیں تو کتاب تکوین (باب ١٦ : ٣) میں انھیں حضرت ابراہیمؑ کی زوجہ کیوں لکھا ہے؟ انگریزی میں wife ، عربی ترجمہ میں زوجہ اور اردو ترجمہ میں جورو (بیوی) مرقوم ہے ۔ اس کے صاف اور واضح معنی یہ ہیں کہ وہ لونڈی ہرگز نہ تھیں، بلکہ وہ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کی بیوی تھیں، جس طرح حضرت سارہؓ تھیں اور حضرت اسمٰعیلؑ اسی طرح بیٹے تھے جس طرح حضرت اسحٰقؑ تھے ۔ حضرت ہاجرہؓ اور ان کے فرزند حضرت اسمٰعیلؑ کو، جن کی اولاد سے ہمارے نبی کریم حضرت محمّد مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم ہیں، اللہ تعالیٰ نے بڑے انعامات سے نوازا۔ تورات میں بھی حضرت ہاجرہؓ کی اولاد کی کثرت اور حضرت اسمٰعیلؑ کی ولادت کی بشارت موجود ہے (دیکھیے تکوین ، ١٦ : ١ تا ٦) ۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر ٨٦ برس بتائی گئی ہے (تکوین، ١٦ : ١٦)].

اس پرانی تاریخ کا ایک اور واقعہ بھی بنواسمٰعیل اور بنو اسرائیل میں اختلاف کا باعث ہے اور وہ بیٹے کی قربانی کا مسئلہ ہے ۔ تکوین (٢٢ : ١ تا ٢) کے الفاظ ہیں: ان باتوں کے بعد خدا نے ابراہیمؑ کو آزمانا چاہا اور کہا، تیرے بیٹے، تیرے اکلوتے، اسحٰقؑ کو جس سے تو محبت کرتا ہے، لے اور موریہ کے ملک کو جا اور اسے وہاں ایک پہاڑ پر، جو میں تجھے بتاؤں گا قربان کر ۔ اسلامی روایتوں میں یہ حضرت اسمٰعیلؑ سے متعلق ہے اور قرآن مجید (٣٧ [الصّٰفّٰت]: ١٠١ تا ١١٢) کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سخت امتحان میں کامیاب ہونے کی وجہ سے بطور انعام ایک مزید بیٹے ، حضرت اسحٰق کی ولادت کی بشارت دی گئی.

تورات کی داخلی شہادت بھی قرآن مجید کی تائید کرتی ہے ۔ اس کے مذکورۂ بالا اقتباس میں اکلوتے بیٹے کا لفظ ہے اور حضرت اسحٰقؑ پہلونٹی بیٹے نہیں ، دوسرے بیٹے ہیں اور حضرت ابراہیمؑ کی وفات تک (تکوین، ٢٥ : ٩) دونوں بھائی زندہ تھے ۔ اس لیے کسی وقت بھی اسحٰق اکلوتے بیٹے نہ بنے ۔ خروج (١٣ : ٢، ١٢ اور ٢٢ : ٢٩)، نیز اعداد (٣ : ١٣ ؛ ٨ : ١٧) وغیرہ کے مطابق پہلونٹی بیٹا قربانی میں دینا چاہیے۔ تورات کو بھی انکار نہیں کہ اسمٰعیلؑ پہلونٹی بیٹے تھے.

[حاصل کلام یہ ہے کہ بائیبل کے مطابق

قربانی کے لیے اکلوتا بیٹا پیش کیا جاتا تھا اور اکلوتا بیٹا حضرت اسمٰعیلؑ ہیں نہ کہ حضرت اسحٰقؑ۔ کتاب تکوین کی تصریحات ملاحظہ ہوں: (۱) اور جب ابرام (ابراہیمؑ) کے لیے ہاجرہ سے اسمٰعیلؑ پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی برس کا تھا (تکوین ۱۶ : ۱۶)؛ (۲) اور جب اس کا بیٹا اسحٰقؑ پیدا ہوا تو ابراہیمؑ سو برس کا تھا (تکوین ۲۱ : ۵؛ نیز دیکھیے کتاب تکوین، ۱۷ : ۲۴ و ۲۵؛ ۲۱ : ۴ و ۵)۔ ان سب حوالوں سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ حضرت اسحٰقؑ سے تیرہ چودہ برس بڑے تھے اور اکلوتے بیٹے صرف حضرت اسمٰعیلؑ تھے اور یہی مفہوم و مقصود ہے اسلامی روایات کا (دیکھیے ابن القیم: زاد المعاد، ۱ : ۱۶؛ ابن کثیر: البدایة والنہایة، ۱ : ۱۹۱؛ شبلی: سیرة النبی، جلد اول)]۔

حضرت ابراہیمؑ کے کنعان آنے پر خدا نے (تکوین ۱۲ : ۷) ان سے وعدہ کیا کہ ان کی پناہ گاہ، سارا کنعان ہمیشہ کے لیے ان کے اور ان کی اولاد کے قبضے میں دے دے گا۔ پھر اسمٰعیلؑ کی ولادت پر اس کی تجدید بھی کی (تکوین، ۱۷ : ۸)۔ اس وعدے کو بنی اسرائیل سے مختص کر دینا بعد کی تحریف معلوم ہوتی ہے۔

[حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے حضرت ہاجرہؓ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو مکۂ مکرمہ میں آباد کیا اور وہ انھیں ملنے کے لیے آتے جاتے رہتے تھے۔ اللہ تعالٰی کا حکم پا کر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کے ساتھ مل کر بیت اللہ تعمیر کیا۔ کعبہ شریف کی تعمیر دراصل حضرت آدمؑ نے کی تھی۔ طوفان نوحؑ کے وقت یہ عمارت منہدم ہو گئی تھی۔ حضرت جبریلؑ کی نشان دہی پر حضرت ابراہیمؑ نے از سر نو عمارت بنائی۔ تعمیر کعبہ کے دوران میں باپ بیٹا یہ دعا کرتے تھے: رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (۲ [البقرة] : ۱۲۷)، یعنی اے ہمارے رب! ہمارا یہ عمل قبول فرما، تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔ آج بھی مقام ابراہیمؑ اور منٰی کی قربان گاہ اس زمانے کی یادگاریں ہیں]۔

حضرت اسمٰعیلؑ کی خاطر جب خدا نے چاہ زمزم پیدا کیا تو قبائل جُرہم اور ایاد کے خانہ بدوش عرب حضرت ہاجرہؓ کی اجازت سے وہاں آ بسے۔ [کعبے کی تولیت حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی اولاد کے ہاتھ میں رہی۔ ایک عرصے کے بعد] بنو جرہم اور حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں تولیت کعبہ پر جھگڑا ہوا [تو کعبے کی خدمت اور تولیت اولاد اسمٰعیلؑ اور بنو جرہم میں تقسیم ہو گئی]۔ جب بنو خزاعہ نے لڑ کر مکے پر قبضہ کیا تو ایک مدت تک کعبے کی تولیت بھی ان کے پاس رہی؛ لیکن بنو اسمٰعیلؑ بہرحال مکے ہی میں مقیم رہے۔ ان کے ایک فرد کلاب نے شمالی عرب میں اپنے ایک سفر کے دوران میں قبیلہ قضاعہ میں شادی کی۔ اس سے قُصَیّ [رکّ بآں] پیدا ہوئے۔ [قُصَیّ جوان ہو کر اپنے قبیلے میں واپس آ گئے۔ اس زمانے میں حُلَیْل بن حُبْشِیَّة بن سَلُول بیت اللہ کا متولی و حاجب تھا۔ اس نے اپنی بیٹی حُبّٰی بنت حُلَیْل کی شادی قصی کے ساتھ کر دی۔ حُلَیْل بوڑھا ہو گیا تو اس نے خانۂ کعبہ کی کنجیاں اپنی بیٹی حُبّٰی کے سپرد کر دیں]۔ اس طرح بنو اسمٰعیل کو مکرر کعبے کے انتظام میں شرکت ملی۔ خسر کی وفات کے بعد قصی نے اپنے ننھیال (بنو قضاعہ) کی مدد سے بنو خزاعہ کو مجبور کیا کہ وہ شہر چھوڑ کر مضافات میں جا بسیں (البلاذری: انساب الاشراف، ۱ : ۴۹ تا ۵۰)۔ السہیلی (۱ : ۹۷) کے مطابق خزاعی سردار الحارث بن مُضاض الاصغر (قصی کے ہمعصر ؟) نے کعبے کے قیمتی چڑھاووں کو چاہ زمزم میں ڈال کر اسے پاٹ دیا اور کنواں صدیوں غائب رہا۔ [قُصَیّ کو بڑا اقتدار حاصل ہوا۔ اس کی اولاد بہت پھلی پھولی اور وہ قوم کا بہت بڑا سردار تسلیم کیا گیا]۔

قصی نے مکے میں ایک شہری مملکت کا آغاز کیا۔ وہاں دارالندوہ (پارلیمنٹ) اور رفادہ (ٹیکس) کے نئے ادارے قائم کیے، لیکن اپنی وفات پر حکومت اپنے بیٹوں میں بانٹ دی۔ کسی کو کعبے اور اس کی چابی کی رکھوالی دی، کسی کو فوج کی قیادت، کسی کو ٹیکس کا آمد و خرچ۔ بعد کی نسلوں میں انتظامات کی مزید تقسیم در تقسیم ہوئی۔ آغاز اسلام کے وقت وہاں دس سرداروں کی ایک مجلس کارفرما نظر آتی ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے محمد حمید اللہ: "شہری مملکت مکہ"، در ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، جنوری فروری ۱۹۹۳ء)۔ [قصی کے چار بیٹے تھے، جن میں عبد مناف بڑے نامور اور صاحب عزت و شرف گزرے ہیں] ۔ عبد مناف کے بھی چار بیٹے تھے، جن میں ہاشم ناموری اور شہرت میں سب پر سبقت لے گئے۔

ہاشم کا اصلی نام عمرو تھا۔ وہ بڑے دولت مند رئیس ہونے کے ساتھ جود و سخاوت اور مروت و احسان میں بھی بے مثال تھے۔ ہاشم کہلانے کی وجہ یہ ہوئی کہ ان کے عہد میں مکۂ مکرمہ میں سخت قحط پڑ گیا۔ وہ فلسطین جا کر آٹے کی بوریاں بڑی تعداد میں اونٹوں پر لاد کر لائے۔ بہت سے اونٹ ذبح کر کے شوربا تیار کیا اور روٹیاں پکا کر اس شوربے میں بھگو بھگو کر تمام اہل شہر کو کھانا کھلاتے رہے۔ عرب ایسے کھانے کو ہشیم اور ثرید کہتے ہیں۔ یہ سلسلہ ایک مدت تک جاری رہا اور اسی وجہ سے ان کا نام ہاشم پڑ گیا۔ وہ حاجیوں کی خدمت اور مہمان نوازی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اس سخاوت اور فیاضی سے ہاشم کا نام چار دانگ عرب میں مشہور ہو گیا۔ ذاتی اثر و رسوخ اور وجاہت کی وجہ سے ان کی دوسرے ممالک کے درباروں میں بھی رسائی تھی۔ قریش کے تجارتی قافلے بیرونی ممالک میں آتے جاتے تھے؛ چنانچہ انھوں نے تقریباً ۴۹۶ء میں فلسطین کا سفر کیا اور مقامی (بوزنطی) افسروں سے اجازت حاصل کی کہ مکی کارواں رومی علاقے میں تجارت کے لیے آیا کریں۔ اس کے بعد راستے کے عرب قبائل سے بھی عبور و مرور کے لیے معاوضہ دے کر معاہدے کیے۔ پھر مکے سے ایک بڑا قافلہ فلسطین گیا۔ راستے میں ہاشم نے مدینے میں [بنو نجّار کی] سلمٰی بنت عمرو بن زید النجاریۃ سے شادی کی، مگر آگے گئے تو غزہ پہنچنے پر اچانک وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ ہاشم کی وفات پر ان کے بڑے بھائی مطلب نے یمن کا، دوسرے بھائی عبد شمس نے حبشہ کا اور تیسرے بھائی نوفل نے عراق کا سفر کر کے وہاں کے حکمرانوں سے بھی اپنے تجارتی کاروانوں کے آنے جانے کی اجازتیں حاصل کیں اور اس طرح مکۂ مکرمہ بین الاقوامی تجارت کا مرکز بن گیا (تفصیل کے لیے دیکھیے ارمغان ماسینوں (Massignon) اور اس کا ملخص ترجمہ البلاغ، کراچی، جون ۱۹۹۸ء، بعنوان "ایلاف: جاہلیت میں عربوں کے معاشی و سفارتی تعلقات")؛ [نیز رک بہ ایلاف] ۔ اس سے وہاں کی عبادت گاہ کعبہ کی زیارت و حج عام ہو گئے اور مکی زبان بھی ملک کے چاروں اطراف میں زیادہ سمجھی جانے لگی۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان قریشی کاروانوں اور سالانہ میلوں نے، جن میں قریش کو سرمایہ دارانہ تجارت، نیز قافلوں کی حفاظت کے لیے بدرقوں (خفارہ) کے انتظام کے سلسلے میں بہت اہم حیثیت حاصل تھی، جزیرہ نمائے عرب میں ایک معاشی وفاق (فیڈریشن) پیدا کر دیا (اور مکہ مکرمہ اس کا مرکز بنا)، جس نے سیاسی مرکزیت کا راستہ کھولا جو کہ اسلام کا کارنامہ بننے والا تھا۔

ہاشم کی وفات (۴۹۷ء) کے چند ماہ بعد ان کی بیوی سلمٰی کے ہاں مدینۂ منورہ میں شیبہ (عبدالمطلب) پیدا ہوئے۔ [البلاذری (انساب الاشراف، ۱: ۶۳) وغیرہ ہاشم کی وفات عبدالمطلب کی پیدائش سے پہلے بیان کرتے ہیں، لیکن ابن سعد اور ابن خلدون وغیرہ نے لکھا ہے کہ عبدالمطلب اپنے باپ ہاشم کی وفات سے پہلے

پیدا ہو چکے تھے (طبقات، ۱: ۹۷؛ بیروت ۱۹۶۰ء؛ ابن خلدون: تاریخ، اردو ترجمہ از شیخ عنایت اللہ، ۱ : ۲۷۹)۔ بچے کے سر میں کچھ بال سفید تھے، اس لیے اس کا نام شیبہ (بوڑھا) رکھا گیا۔ تقریباً سات برس کی عمر تک عبدالمطلب اپنی والدہ کے پاس اپنے ننھیال میں رہے۔ پھر ان کے چچا مُطّلب انہیں مکۃ مکرمہ اپنے پاس لے آئے۔ یاد رہے کہ ہاشم کی وفات کے بعد رفادہ و سقایۃ، یعنی حُجّاج کی مہمان نوازی اور پانی پلانے کی خدمت، مطّلب کے سپرد ہوئی تھی۔ مطّلب بھی اپنے بھائی ہاشم کی طرح اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ بقول ابن خلدون، مُطّلب بڑی عزت و فضیلت کے مالک تھے اور ان کی سخاوت کی وجہ سے قریش انہیں الفضل، یعنی پیکر فضیلت کہا کرتے تھے۔

مُطّلب کی وفات کے بعد بنو ہاشم کے معاملات کو عبدالمطلب نے سنبھالا اور رفادہ و سقایۃ کی خدمت بطریق احسن انجام دینے لگے۔ انھوں نے یمن اور حبشہ کے درباروں میں اپنی قوم کی نمائندگی بھی کی]۔

ان کی ملکیت میں ایک قدرتی چشمہ بھی تھا (البلاذری: انساب الاشراف، ۱: ۷۳-۷۵)۔ بات یہ ہوئی ایک دن خواب میں اشارہ پایا کہ فلاں جگہ کھود کر صدیوں سے غائب شدہ چاہ زمزم برآمد کریں۔ اس کے اندر سے دفینہ بھی ملا جو کعبے کے پرانے چڑھاووں پر مشتمل تھا (ابن ہشام، ص ۹۱ ببعد)۔ چاہ زمزم کی ملکیت سے سقایۃ الحاج کے عہدے کی اہمیت بڑھی اور ان کی وجاہت میں اضافہ بھی ہوا۔ عبدالمطلب اور مکی رؤسا ابرھہ حبشی (اصحاب الفیل) کے مکے پر حملے کے خلاف کچھ نہ کر سکے، لیکن عبدالمطلب کے سر برآوردہ ہونے کا پتا اس سے چلتا ہے کہ جب ابرھہ قدرتی حوادث کا شکار ہو کر اور کثیر جانی نقصان کے ساتھ بھاگا اور پھر جلدی ہی یمن میں مر بھی گیا اور قومی آزادی کی کوشش میں یمن کو فی الجملہ کامیابی حاصل ہوئی، حبشیوں کو نکال باہر کیا گیا اور سیف بن ذی یزن [رک بآن] آزاد یمن کا بادشاہ بن گیا تو اس پر مبارکباد دینے کے لیے مکے سے جو وفد گیا اس کی طرف سے اظہار مطلب کا کام جناب عبدالمطلب نے انجام دیا تھا (ابن حبیب: المنمق، ص ۵۳۰؛ ابن عبد ربہ: العقد الفرید، ۱ : ۱۷۱؛ الاغانی ۲۱ : ۷۵ ببعد)۔ عبدالمطلب کو شاہی تحفوں میں خضاب بھی ملا، جس سے اہل مکہ ناواقف تھے (البلاذری: انساب، ۱/۶۵-۶۶)۔

[آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دادا عبدالمطلب اپنے اسلاف کی طرح بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ جود و سخا اور فیاضی میں سارے عرب میں مشہور تھے۔ بیت اللہ کے زائرین کی خدمت کے لیے ہر وقت سرگرم عمل رہتے، بے کسوں اور مظلوموں کی فریاد رسی اور اعانت میں کبھی سستی نہ کرتے اور انسانوں کے علاوہ جانوروں کے لیے بھی خوراک مہیا کرنے کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ اخلاق فاضلہ اور محاسن عالیہ کے پیکر تھے اور اخلاق رذیلہ اور پست خیالات سے خود بھی ہمیشہ بچتے اور اپنی اولاد کو بھی ان سے بچنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ ان کی دینداری اور پرہیزگاری بھی قابل ذکر ہے۔ آخری عمر میں بت پرستی اور شرک کو بالکل چھوڑ دیا تھا۔ ملت ابراہیمی اختیار کرکے پکے موحد بن گئے تھے۔ شراب نوشی، زناکاری، ظلم و سرکشی اور برہنہ ہو کر طواف کعبہ کرنے سے منع کیا کرتے تھے۔ مزید برآں وہ مستجاب الدعوات بھی تھے۔ ان اوصاف و کمالات کی بنا پر لوگ انہیں الفیاض اور شیبۃ الحمد کے معزز القاب سے یاد کیا کرتے تھے۔ (محمود شکری الآلوسی: بلوغ الارب، ۱ : ۳۵۵)]۔

عبدالمطلب کو زمزم کی ملکیت کے لیے بڑی دشواریاں پیش آئیں، (مگر اہل شہر امن پسند تھے اور اسے قبول کرلیا کہ کسی غیرجانبدار حکم سے فیصلہ

کرائیں) ۔ اس پریشانی کے زمانے میں منت مانی کہ اگر خدا نے مجھے دس بیٹے دیے اور وہ بلوغ کو پہنچے تو میں ان میں سے ایک کو کعبے میں لے جا کر اللہ کے حضور میں قربان کر دونگا (ابن ہشام، ص ۱ : ۱۶۰ ببعد؛ البلاذری: انساب، ۱ : ۷۹) ۔ جب دسویں بیٹے بھی بلوغ کو پہنچ گئے تو جناب عبدالمطلب نے منت یاد کی اور قرعہ ڈال کر قربانی کے بیٹے کا انتخاب کیا۔ قرعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہونے والے باپ جناب عبداللہ کے نام نکلا۔ عبدالمطلب کا عزم دیکھ کر رشتہ داروں اور دوستوں نے مداخلت کی اور انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ کسی کاہنہ یا عرافہ سے حل معلوم کیا جائے؛ چنانچہ (بروایت السہیلی) قطبہ یا سجاح نامی کاہنہ سے ملنے یثرب (مدینہ) گئے۔ اس زمانے میں وہ خیبر میں تھی ۔ وہاں پہنچے تو اس نے قصہ سن کر مشورہ دیا کہ بیٹے اور رواجی خون بہا کے مابین قرعہ ڈالو اور خون بہا کی مقدار میں اضافہ کرتے جاؤ تا آنکہ قرعہ خون بہا پر نکلے۔ آخر دس کی جگہ سو اونٹوں پر قرعہ بیٹے کی بجائے خون بہا پر نکلا۔ جناب عبدالمطلب نے احتیاطاً تین بار قرعے کی تکرار کرکے اطمینان کر لیا کہ واقعی وہ اللہ کو منظور ہے ۔

[جناب عبدالمطلب کثیرالاولاد تھے۔ ان کی حسب ذیل چھ بیویاں تھیں، جن کے بطنوں سے بارہ اور بقول ابن سعد تیرہ بیٹے اور چھ بیٹیاں پیدا ہوئیں: (۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی دادی فاطمہ بنت عمرو بن عائذ بن عمران بن مخزوم؛ اولاد: عبداللہ، زبیر، ابو طالب (عبد مناف)، عبدالکعبہ، ام حکیم البیضاء، عاتکہ، برّہ، امیمہ، اروٰی؛ (۲) بنو عامر بن صعصعہ کی صفیہ بنت جندب بن حجیر؛ اولاد: الحارث؛ (۳) ہالۃ بنت وہیب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب؛ اولاد: حضرت حمزہؓ، حضرت صفیہؓ، المقوّم، حجل؛ (۴) نُتَیلہ بنت جناب بن کلیب؛ اولاد: عباسؓ، ضرار، قثم؛ (۵) لبنٰی بنت الہاجر؛ اولاد: ابولہب (جمهرة انساب العرب، ص ۱۵)؛ (۶) مُمَنَّعة بنت عمرو بن مالک؛ اولاد: الغیداق (مصعب) (انساب الاشراف، ۱ : ۱۰؛ طبقات، ۱ : ۹۳).

عبدالمطلب نے خاصی طویل عمر پائی۔ ان کا ایک شاندار کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے زمزم کا چشمہ دوبارہ کھود کر جاری کیا۔ اس میں سے سونے کے دو ہرن اور چند تلواریں نکلیں۔ ہرنوں سے کعبے کی زینت کے لیے سونے کا پترا تیار کیا اور تلواروں سے کعبے کے لیے لوہے کا دروازہ بنایا۔ کعبے کی زیبائش کے سلسلے میں سونا استعمال کرنے کے شرف کی اولیت جناب عبدالمطلب کو حاصل ہوئی۔ عبدالمطلب ہی نے زمزم کے ساتھ ایک حوض بنایا تاکہ لوگ اس سے پانی پی سکیں۔

عبدالمطلب کے بیٹے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے والد محترم جناب عبداللہ اور آپؐ کی پھوپھی ام حکیم البیضاء جڑواں (توأم) پیدا ہوئے تھے۔ جناب عبداللہ اپنے باپ کے بڑے لاڈلے اور محبوب بیٹے تھے۔ وہ حسن سیرت اور حسن صورت کا بڑا حسین امتزاج تھے۔ ان کے اخلاق حمیدہ، اوصاف جمیلہ اور پاکبازی کا شہرہ تھا۔ اٹھارہ سال (اور بعض نے پچیس سال یا کم و بیش بھی لکھے ہیں) کی عمر میں عبدالمطلب نے بنو زہرہ کی نیک اور پاکباز خاتون حضرت آمنہ بنت وہب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب بن مُرّہ سے جناب عبداللہ کا نکاح کر دیا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت آمنہ کے دادا عبد مناف اور عبدالمطلب کے دادا عبد مناف دونوں الگ الگ شخصیتیں ہیں۔ اول الذکر عبد مناف بن زہرہ ہیں اور ثانی الذکر عبد مناف بن قصی ہیں۔ قصی اور زہرہ دونوں بھائی اور کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب کے بیٹے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ددھیال اور ننھیال دونوں کلاب بن مرہ پر مل جاتے ہیں۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی دادی کا نام فاطمہ بنت عمرو بن عائذ اور نانی کا برّہ بنت عبد العزّی بن عثمان تھا۔ آپؐ کے نانا وھب بن عبد مناف کی والدہ کا نام ھند بنت ابی قَیلہ (وجز) بن غالب تھا (انساب الاشراف، ۱ : ۹۱)۔ آپؐ کے نانا وھب بنو زھرہ کے نامور اور معزز سردار تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی والدہ ماجدہ سیدہ آمنہ طہارت نفس، شرافت نسب، عزت و وجاہت، عفت و عصمت اور پاکبازی میں بے مثال تھیں اور اپنی قوم میں سیدۃ النساء کے لقب سے مشہور تھیں۔ بقول ابن کثیر (السیرۃ النبویۃ، ۱ : ۱۷۷)، وَ ھِیَ یومئذٍ سیدۃُ نساءِ قومِھا، یعنی حضرت آمنہ اس وقت اپنی قوم میں سیدۃ النساء تھیں اور بقول الطبری (تاریخ، ۲ : ۱۷۴)، وھی یومئذٍ افضل امراۃ من قریش، یعنی حضرت آمنہ اپنے زمانے میں قریش کی سب سے زیادہ فضیلت مآب اور محترم خاتون تھیں۔ ددھیال اور ننھیال دونوں کے اعتبار سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم عرب کے بہترین قبیلے اور بہترین قوم میں سے تھے۔

نکاح کے بعد جناب عبداللہ قریش کے دستور کے مطابق چند روز اپنے سسرال میں رہنے کے بعد اپنی زوجہ سیدہ آمنہ کو لے کر اپنے گھر چلے آئے۔

شادی کے کچھ عرصہ بعد جناب عبداللہ تجارت کے سلسلے میں قریش کے ایک قافلے کے ساتھ ملک شام میں گئے اور غزہ سے واپس گھر آرہے تھے کہ راستے میں بیمار ہو گئے۔ راستے میں یثرب (مدینہ منورہ) پڑتا تھا اور وہاں ان کے والد عبدالمطلب کے رشتے دار (اخوال) بنو عدی بن النّجار رہتے تھے۔ حضرت عبداللہ بحالت بیماری ان کے ہاں ٹھیر گئے۔ قافلے والوں نے مکۂ مکرمہ پہنچ کر عبدالمطلب کو جناب عبداللہ کی علالت اور مدینے میں رک جانے کے بارے میں اطلاع دی۔ عبدالمطلب نے اپنے بڑے بیٹے حارث کو جناب عبداللہ کے پاس مدینے بھیجا۔ حارث بڑی تیزی سے منزلیں طے کرتا ہوا مدینے پہنچا تو بنو عدی بن النجار نے اسے جناب عبداللہ کی علالت کی تفصیلات سے آگاہ کیا اور بتایا کہ وہ وفات پا چکے ہیں اور یہ کہ انہیں دارالنابغہ میں دفن کیا جا چکا ہے۔ حارث نے واپس مکے آکر اپنے باپ کو حالات سے آگاہ کیا۔ پردیس میں جوان بیٹے کی موت نے عبدالمطلب کو محزون و مغموم کر دیا۔ جوان عبداللہ کی وفات سے سارا خاندان رنج و ملال اور غم و اندوہ کا شکار ہو گیا۔ حسن صورت اور حسن سیرت کا مجسمہ، جس سے شادی کرنے کے لیے مکے کی کئی خواتین بے قرار تھیں، دنیا سے اچانک عالم شباب میں رخصت ہوگیا۔ سیدہ آمنہ پر یہ اندوہناک اور دلخراش خبر سن کر کیا گزری ہوگی، جن کا رفیق زندگی شادی کے چند ماہ بعد ہی انہیں ہمیشہ کے لیے غمزدہ اور افسردہ چھوڑ گیا! مگر سیدہ آمنہ صبر و رضا اور ہمت و استقامت کا پیکر تھیں۔ اللہ تعالی نے انہیں خاتم النبیین سیدالمرسلین، رحمۃ للعالمین کی امومت کا شرف بخشنا تھا۔ راضی برضائے الٰہی ہوکر وہ صبر و شکر کی مثال بن گئیں۔ جناب عبداللہ کی وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی پیدائش سے تقریباً سات ماہ قبل ہوئی۔ وفات کے وقت جناب عبداللہ کی عمر اٹھارہ برس تھی، مگر الواقدی نے پچیس سال لکھی ہے (طبقات، ۱ : ۹۹؛ ابن الجوزی: الوفاء، ۱ : ۸۹)۔ کتب سیرت میں ایسی روایات بھی موجود ہیں جو جناب عبداللہ کی وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت کے بعد (باختلاف مدت) بیان کرتی ہیں (دیکھیے البلاذری: انساب الاشراف، ۱ : ۹۲؛ الطبری، ۱ : ۹۸)۔ ابن سعد نے طبقات (۱ : ۱۰۰) میں مختلف روایات ذکر کرنے کے بعد وفات قبل از ولادت ہی کو صحیح قرار دیا ہے۔

آپؐ کی ولادت سے پہلے ایک اور اہم واقعہ

پیش آیا اور وہ تھا اصحاب الفیل [ترک بتان] کا مکۂ مکرمہ پر حملہ۔ یمن کے حبشی حاکم ابرھہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت سے پچاس پچپن دن پہلے ماہ محرم میں ھاتھیوں کے ساتھ بلدالحرام پر حملہ کیا تھا۔ عربوں کے ھاں اسی سال کو عام الفیل کہتے ھیں اور ایک عرصے تک یہی تقویمی سال شمار ھوتا رھا۔

ولادت نبوی: ھمارے رسول مقبول حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت با سعادت موسم بہار میں دو شنبہ کے دن ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱ عام الفیل/۵۷۱ء کو مکہ مکرمہ میں ھوئی۔ تاریخ انسانیت میں یہ دن سب سے زیادہ با برکت، سعید اور درخشاں و تابندہ تھا۔ آپؐ کی ولادت کے سلسلے یہ بات قطعی اور یقینی ھے کہ ربیع الاول کا مہینہ اور دو شنبہ کا دن تھا اور وقت بعد از صبح صادق و قبل از طلوع آفتاب۔ دو شنبہ کا دن آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مبارک زندگی میں بڑی اھمیت کا حامل ھے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم دو شنبہ کو پیدا ھوئے؛ دو شنبہ کے دن آپؐ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا؛ دو شنبہ کو مکے سے مدینے کو ھجرت کے لیے نکلے اور دو شنبہ کو آپؐ مدینے میں (شاید قباء مراد ھے جو مضافات مدینہ میں ھے) تشریف فرما ھوئے؛ دو شنبہ کے دن آپ نے اس دار فانی کو خیر باد کہا اور دو شنبہ کے دن ھی آپؐ نے حجراسود کو (۳۵ برس کی عمر میں) بیت اللہ میں نصب فرمایا تھا (ابن کثیر: السیرۃ النبویۃ، ۱: ۱۹۸)۔ ایک روایت میں دو شنبہ کے ساتھ ۱۲ ربیع الاول کا بھی ذکر ھے اور ساتھ ھی معراج نبوی کا دن بھی دو شنبہ بتایا گیا ھے۔ (کتاب مذکورہ ۱: ۱۹۹)۔ جمہور کے نزدیک ولادت مبارک کی تاریخ قمری حساب سے ۱۲ ربیع الاول ھے، مگر کتب سیرت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت کے سلسلے میں اور تاریخیں بھی مذکور ھیں۔ شبلی نعمانی نے سیرت النبی (۱: ۱۷۱) میں مصر کے مشہور ھیئت دان محمود پاشا فلکی کی تحقیقات کے پیش نظر ۹ ربیع الاول/۲۰ اپریل ۵۷۱ء کو ترجیح دی ھے۔ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری نے اپنی کتاب رحمۃ للعالمین (۱: ۴۰) میں آپؐ کی پیدائش ۹ ربیع الاول عام الفیل / ۲۲ اپریل ۵۷۱ء / یکم جیٹھ ۶۲۸ بکرمی قرار دی ھے۔ اس وقت شاہ ایران نوشیروان کے جلوس تخت کا چالیسواں سال تھا اور اسکندر ذوالقرنین کی تقویم کی رو سے سنہ ۸۸۲ تھا۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تحقیق کے مطابق عیسوی تاریخ ۱۷ جون ۵۶۹ء (دیکھیے *Muhammad Rasulullah*، ص ۱۰، کراچی ۱۹۷۹ء؛ وھی مصنف، در *Journal of Pak. Historical Society*، ۱۹۶۸ء کراچی، ۱۶: ۲۱۶ تا ۲۱۹)؛ نیز ۵۷۰ء (وھی مصنف: *Le Prophete de l'Islam*، ۱: ۲۴، پیرس ۱۹۵۹ء) قرار پاتی ھے]۔

تاریخ بڑے لوگوں، خاص کر انبیاء کی ولادت کے وقت عام طور پر عجیب و غریب واقعات کے پیش آنے کا بھی ذکر کرتی ھے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت مبارک سے پہلے بھی اسی قسم کی روایات ملتی ھیں۔ [آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت مبارک سے پہلے آپؐ کی والدہ ماجدہ سیدہ آمنہ نے عجیب و غریب خواب دیکھے، جن سے آپؐ کی عظمت و جلالت پر روشنی پڑتی ھے۔ جب آپؐ شکم مادر میں تھے تو سیدہ آمنہ نے ایک نور دیکھا جو شام کے محلات کو روشن کر رھا تھا نیز اور آپؐ کی ولادت کے وقت انھوں نے فی الواقع بچشم خود ملاحظہ کیا۔ علاوہ ازیں جو خواتین آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت با سعادت کے وقت سیدہ آمنہ کے پاس موجود تھیں، مثلاً عثمان بن ابی العاص کی والدہ فاطمہ بنت عبداللہ، وہ بیان کرتی

ہیں کہ اس مبارک ساعت میں تمام گھر نور سے بھر گیا۔ اسی طرح حضرت عبدالرّحمٰنؓ بن عوف کی والدہ الشّفاءؓ کہتی ہیں کہ میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت کے وقت بطور دایہ (قابلة) خدمات انجام دیں اور کسی کو یہ کہتے سنا کہ آپؐ سے ایسا نور روشن ہوا جس سے روم کے محلات نظر آئے (ابن کثیر: السیرة النبویة، ۱: ۲۰۶، ۲۰۷؛ ابن الجوزی: الوفاء باحوال المصطفی، ۱: ۹۳، ۹۵)۔ حافظ ابن حجر العسقلانی (فتح الباری، ۶: ۴۲۶) نے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ آپؐ کی ولادت کے وقت ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گر پڑے، آتش کدے بجھ گئے اور بحیرہ ساوہ (طبریہ) خشک ہو گیا (نیز دیکھیے ابن ہشام: سیرة؛ ابن الجوزی: الوفاء، ۱: ۹۷؛ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت کے بارے میں آیات و نشانات اور یہود یثرب کی پیش گوئیوں، نیز راہبوں اور عیسائی مذہبی راہنماؤں کے اقوال و افکار کے لیے دیکھیے ابن کثیر: السیرة النبویة، ۱: ۲۱۱ تا ۲۲۱)]۔

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل اہم واقعات رونما ہوئے: (۱) کسریٰ نے ہولناک خواب دیکھا جس میں اس کی حکومت کی بربادی اور اسلامی فتوح کی پیشین گوئی تھی؛ مزید برآں اسی زمانے میں ایران میں ایک زلزلہ آیا جس میں قصر شاہی کے کنگرے گر گئے، پایۂ تخت میں صدیوں سے جلتا ہوا آتشکدہ بجھ گیا، ایک جھیل سوکھ گئی، ایک صحرا میں ایک ندی پیدا ہو گئی، وغیرہ (ابن ہشام)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ولادت کے سلسلے میں سب سے زیادہ نمایاں وہ طویل روایت ہے جو الزرقانی نے نقل کی ہے (دیکھیے شرح المواہب، ج ۱)۔

عالم مثال کے ان مظاہر یا مکاشفات میں واقعات کا مطالعہ کرنے والے کے لیے کافی غذائے فکر ہے۔ دنیا کے دو بڑے ممالک کے سربراہوں، یعنی قیصر روم و کسریٰ ایران کو خواب میں تنبیہ کی گئی کہ اپنی اصلاح کر لو۔ ان کے لیے یہ خواب نہ صرف ان کے ظالمانہ طرز حکومت کے اختتام کی دھمکی تھی، بلکہ ان کے (عیسائی اور مجوسی) دینوں میں اسی وقت انسانی عناصر نے جو روز افزوں دخل پا لیا تھا اس پر یہ خدا کی ناراضی کا اعلان بھی تھا۔ ان "بڑوں" کو تقریباً نصف صدی کی مہلت دی گئی۔ جب وہ درست نہ ہوئے تو چشم زدن میں دونوں سلطنتیں اور دونوں دین گویا ناپید کر دیے گئے۔

بت اوندھے گرے۔ یہ سارے ہی بت تھے۔۔۔ خدا کو نہ ماننے والوں کے بھی، خدا کی خدائی میں غیروں کو شریک کرنے والوں کے بھی اور خدائے کائنات کو ایک خانوادے کے افراد سے مختص کرنے والوں کے بھی۔ عہد نبوی اور خلافت راشدہ ہی میں نہیں، آج بھی سارے ادیان اسلام ہی کو اپنا واحد اور سب سے بڑا حریف سمجھتے ہیں ۔۔ چاہے شیوعیت ہو یا نصرانیت یا یہودیت۔

[جب آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی ولادت کی اطلاع آپؐ کے معمّر دادا جناب عبدالمطلب کو دی گئی تو وہ بہت خوش ہوئے، کیونکہ آپؐ ان کے مرحوم پیارے فرزند جناب عبداللہ کی یادگار تھے۔ اپنے نوجوان بیٹے کی اچانک وفات سے ضعیف العمر باپ کو جو شدید صدمہ ہوا تھا، آپؐ کی ولادت سے ایک حد تک اس کا ازالہ ہو گیا۔ جناب عبدالمطلب کے دوسرے بیٹوں کو بھی بڑی خوشی ہوئی۔ آپؐ کے چچا ابولہب [رک بآں] کی لونڈی ثُوَیبہ نے جب آپؐ کی ولادت کی خوش خبری اپنے مالک کو سنائی تو ابولہب نے خوش ہو کر اسے ازاد کر دیا۔ عبدالمطلب خوشی خوشی پوتے کو دیکھنے کے لیے گھر آئے۔ آپؐ کو گود میں اٹھا کر یمن و برکت کے لیے خانۂ کعبہ میں لائے اور آپؐ کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کا شکر

ادا کرتے ہوئے آپؐ کی والدہ ماجدہ کے پاس واپس لے آئے۔ سیدہ آمنہ نے انہیں ان خوابوں سے بھی آگاہ کیا تھا جو سیّدہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی پیدائش سے پہلے دیکھے تھے (ابن کثیر: السیرۃ النبویۃ، ۱: ۲۰۸، ۲۲۳؛ ابن الجوزی: الوفاء باحوال المصطفیٰ، ۱: ۹۵، ۹۶)۔

دستور کے مطابق سب سے پہلے آپؐ کی والدہ ماجدہ سیّدہ آمنہ نے آپؐ کو تقریباً سات روز تک دودھ پلایا۔ اس کے بعد چند روز تک ثوبیہ (مولاۃ ابی لہب) نے آپؐ کو دودھ پلایا اور یہ واقعہ حلیمہ سعدیہ [رک باں] کی سپردگی سے پہلے کا ہے۔ اس وقت ثوبیہ کی گود میں ان کا بیٹا مسروح تھا۔ اس سے قبل وہ حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب [رک باں] کو بھی دودھ پلا چکی تھیں۔ پھر ابو سلمہ عبداللہ بن عبدالاسد المخزومی کو بھی دودھ پلایا تھا۔ اس طرح مسروح، حضرت حمزہؓ اور حضرت ابو سلمہؓ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے رضاعی بھائی ٹھہرے۔ قیام مکہ کے دوران میں، جب کبھی وہ آپؐ سے ملنے آتیں تو آپؐ اور حضرت خدیجہؓ دونوں ان کی بڑی عزت و تکریم کرتے تھے (الوفاء باحوال المصطفیٰ، ۱: ۹۷)۔ ہجرت کے بعد بھی آپؐ اپنی اس رضاعی ماں کے بارے میں، جو مکّے میں رہائش پذیر تھیں، اکثر دریافت فرماتے رہتے تھے اور تحفے تحائف بھی بھیجتے رہتے تھے، یہاں تک کہ ۷ھ میں خیبر سے واپسی پر آپؐ کو ان کی وفات کی خبر ملی۔ ان کا بیٹا مسروح اپنی والدہ سے پہلے ہی وفات پا چکا تھا (البلاذری: انساب، ۱: ۹۴، ۹۶؛ السیرۃ النبویۃ، ۱: ۲۲۴؛ الروض الانف، ۱: ۱۰۸)۔ ثوبیہ کے اسلام لانے کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام ذہبی، حافظ ابن حجر عسقلانی اور امام السیوطی کا میلان ان کے اسلام لانے کی طرف ہے۔

ملت ابراہیمیؑ کے مطابق عربوں، بالخصوص قریش مکہ میں عقیقہ کرنے کا دستور تھا؛ چنانچہ جناب عبدالمطلب نے ساتویں دن اپنے لاڈلے پوتے کا عقیقہ کیا اور ختنہ کرایا (آپؐ کے مختون پیدا ہونے کی روایات بھی منقول ہیں)۔ اس موقع پر جانور ذبح کر کے قریش کو کھانے کی دعوت بھی دی۔ کھانے کے بعد قریش نے پوچھا: اے عبدالمطلب! آپ نے اپنے جس بیٹے کے لیے ہماری ضیافت کی ہے اس کا نام کیا رکھا ہے؟ انھوں نے بتایا کہ میں نے اس کا نام محمّدؐ رکھا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آسمان میں اللہ اور زمین میں اس کی مخلوق آپؐ کی تعریف کرے۔ اہل لغت کہتے ہیں کہ محمّدؐ کا مفہوم ہے تمام صفات خیر اور اوصاف حمیدہ کا جامع۔ یہ بھی روایات ہیں کہ آپؐ کا اسم گرامی محمّد الہامی ہے، نیز آپؐ کی والدہ ماجدہ نے خالق حقیقی کی طرف سے اشارہ پا کر آپؐ کا نام احمد رکھا (ابن سعد: طبقات، ۱: ۱۰۳؛ ابن کثیر: السیرۃ النبویۃ، ۱: ۲۰۶، ۲۱۰؛ عیون الاثر، ۱: ۳۰)۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے اسمائے گرامی محمّدؐ اور احمدؐ کا مادہ حمد ہے اور حمد کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کے اخلاق حسنہ، اوصاف حمیدہ، کمالات جمیلہ اور فضائل و محاسن کو محبت، عقیدت اور عظمت کے ساتھ بیان کیا جائے۔ اسم پاک محمّدؐ مصدر تحمید (باب تفعیل) سے مشتق ہے اور اس باب کی خصوصیت مبالغہ اور تکرار ہے۔ لفظ محمّد اسی مصدر سے اسم مفعول ہے اور اس سے مقصود وہ ذات بابرکات ہے جس کے حقیقی کمالات، ذاتی صفات اور اصلی محامد کو عقیدت و محبت کے ساتھ بکثرت اور بار بار بیان کیا جائے۔ لفظ محمّد میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ وہ ذات ستودہ صفات جس میں خصال محمودہ اور اوصاف حمیدہ بدرجۂ کمال اور بکثرت موجود ہوں۔ اسی طرح احمد اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ بعض اہل علم کے نزدیک یہ اسم فاعل کے معنی میں ہے اور بعض کے نزدیک اسم مفعول کے معنی

میں۔ اسم فاعل کی صورت میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ مخلوق میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ستائش کرنے والا اور مفعول کی صورت میں سب سے زیادہ تعریف کیا گیا اور سراہا گیا (الروض الانف، ۱ : ۱۰۶؛ فتح الباری، ۶ : ۴۰۳؛ لسان العرب اور تاج العروس، بذیل مادہ)۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں صرف چند اشخاص ایسے ملتے ہیں جن کا نام محمّد تھا۔ لسان العرب اور تاج العروس میں سات آدمیوں کے نام ضبط کیے گئے ہیں اور بعض نے زیادہ بھی نقل کیے ہیں۔ ان لوگوں کے والدین نے اہل کتاب سے یہ سن کر کہ جزیرۃ العرب میں ایک نبی ظاہر ہونے والا ہے جس کا نام محمّد ہوگا، اس شرف کو حاصل کرنے کے لیے یہ نام رکھ لیا؛ البتہ کسی نے احمد نام نہیں رکھا۔ مشیت الٰہی دیکھیے کہ محمد نام کے ان لوگوں میں سے کسی نے بھی نبوّت و رسالت کا دعوی نہیں کیا (فتح الباری، ۷ : ۴۰۳، ۴۰۵)۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کا اسم گرامی احمد قرآن مجید میں صرف ایک مرتبہ مذکور ہے اور وہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی پیشگوئی کے طور پر: وَ مُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ (۶۱ [الصف]: ۶)، یعنی میں (عیسیٰ) اس پیغمبر کی بشارت سناتا ہوں جو میرے بعد آئے گا اور جس کا نام احمد ہوگا۔ آپؐ کا اسم گرامی محمّدؐ چار مرتبہ قرآن مجید میں آیا ہے اور ہر مرتبہ آپؐ کے منصب رسالت کے سیاق و سباق میں: (۱) وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ (۳ [آل عمران]: ۱۴۴)، یعنی محمّد صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم تو اللہ کے رسول ہیں؛ (۲) مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (۳۳ [الاحزاب]: ۴۰)، یعنی محمّد صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم) تمھارے مردوں میں سے کسی کے والد نہیں ہیں، بلکہ اللہ کے رسول اور انبیاءؑ (کی نبوت) کی مہر یعنی اس کو ختم کر دینے والے ہیں؛ (۳) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰي مُحَمَّدٍ وَّ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ اَصْلَحَ بَالَهُمْ (۴۷ [محمد]: ۲)، یعنی اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور جو (کتاب) محمّدؐ پر نازل ہوئی اسے مانتے رہے اور وہ ان کے ربّ کی طرف سے برحق ہے ان سے ان کے گناہ معاف کر دیے اور ان کی حالت سنوار دی؛ (۴) مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ (۴۸ [الفتح]: ۲۹)، یعنی محمّد اللہ کے رسول ہیں۔ ان چاروں آیات میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کا نام لے کر آپؐ کی رسالت و نبوّت کے منصب کو واضح طور پر بیان فرمایا ہے تاکہ کسی قسم کے شک وشبہہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔

اسی مناسبت کی بنا پر آپؐ نے اور آپؐ کی امّت نے دنیا کی تمام قوموں اور امتوں سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی حمد و ستائش کی اور قیامت تک کرتی رہے گی؛ ہر کام کے آغاز و اختتام پر اللہ تعالیٰ کی تعریف اور حمد کا حکم دیا گیا اور امت کا ہر فرد یہ فریضہ انجام دے رہا ہے۔ بالکل اسی طرح آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے محامد و محاسن اور خصائل محمودہ، اوصاف حمیدہ اور فضائل و کمالات کا بیان اور ذکر جس کثرت سے کیا گیا ہے اور ابد تک کیا جاتا رہے گا اس کی مثال بھی دنیا میں نہیں مل سکتی۔

امام ابن قیّمؒ نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے ختنے کے بارے میں تین اقوال ہیں: (۱) آپؐ مختون پیدا ہوئے؛ (۲) دائی حلیمہ سعدیہ کی حضانت کے دوران میں جب فرشتوں نے شق صدر کیا تو ختنہ بھی کر دیا؛ (۳) آپؐ کا ختنہ آپؐ کے دادا عبدالمطّلب نے کیا اور یہ بات عربوں کے دستور عام کے مطابق تھی (زاد المعاد، مطبوعہ قاہرہ، ۱ : ۱۹)۔ ابن کثیر نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے مختون و مسرور پیدا ہونے سے متعلق کئی روایات نقل کی ہیں اور یہ بھی کہا ہے کہ مختلف طریقوں

سے مروی روایات کی بنا پر بعض حضرات نے اسے متواتر کا درجہ دیا ہے؛ علاوہ ازیں دوسری دونوں روایتیں بھی نقل کی ہیں (السیرۃ النبویۃ، ١ : ٢٠٨، ٢٠٩؛ نیز دیکھیے ابن سعد: الطبقات، ١ : ١٠٣)، البتہ ابن الجوزی نے بڑے جزم سے لکھا ہے کہ آپ مختون و مسرور پیدا ہوئے (الوفاء، ١ : ٩٧)]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات پر لکھے ہوئے مرثیے میں حضرت حسان رض بن ثابت نے محمدؐ اور احمدؐ دونوں نام بطور مترادف کے استعمال کیے ہیں۔ شاخت Schacht کی علم عروض سے قطعی ناواقفیت تھی کہ اس نے اپنے مقالے [رک بہ احمد، در ١١، لائیڈن، بار دوم] میں محض قیاساً یہ لکھا ہے کہ حضرت حسان رض نے وزن شعر کی ضرورت سے محمد کی جگہ احمد کا لفظ قافیے میں استعمال کیا ہے۔ اول تو شاخت نے اس امر کو نظر انداز کر دیا کہ مذکورہ مرثیے کی ایک بیت میں احمد ہے تو دوسرے میں محمد کا لفظ بھی ہے؛ دوسرے یہ کہ باحمد، لاحمد، واحمد وغیرہ میں، یعنی احمد کے لفظ سے پہلے کوئی متحرک حرف ہو، تو وہ لفظ محمد کا ہموزن ہو جاتا ہے۔ [یہ شاخت کی ناواقفیت کی دلیل ہے۔ بہر حال یہ دونوں نام پیارے اور کثیر المعانی ہیں اور اب تو دنیا میں ان سے عظیم تر نام کوئی موجود ہی نہیں]۔

رضاعت: عرب میں ایک رواج تھا جو آج سعودی دور میں بھی باقی ہے کہ نوزائیدہ بچوں کو دودھ پلانے کے لیے کسی بدوی عورت کے سپرد کر کے صحرا میں بھیج دیا جاتا تھا۔ [اسی دستور کے مطابق شرفائے مکہ بھی بچے کی پیدائش کے چند روز بعد اسے کسی بدوی عورت کے سپرد کر دیتے تھے تاکہ بچہ صحرا کی کھلی اور صاف ہوا میں پرورش پائے، اس کی زبان فصیح اور جسم مضبوط ہو اور وہ اس قابل ہو جائے کہ مصائب و تکالیف کا صبر و تحمل سے مقابلہ کر سکے اور فصاحت و شجاعت کا پیکر بن کر سادہ زندگی بسر کر سکے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ چند روز آپؐ کی والدہ سیدہ آمنہ نے بنفس نفیس دودھ پلایا۔ پھر کچھ دن ثویبہ نے بھی دودھ پلایا]۔ پھر طائف کے مضافات کی چند بدوی عورتیں حسب عادت مکہ مکرمہ آئیں اور نوزائیدہ بچے تلاش کیے۔ آنحضرتؐ یتیم تھے، اس لیے کسی کو لینے کی رغبت نہ ہوئی۔ حلیمہ سعدیہ سواری کے جانور کی کمزوری کے باعث ذرا دیر سے پہنچیں۔ اتنے میں مالداروں کے سارے بچے اٹھ چکے تھے۔ حلیمہ نے خالی ہاتھ واپس جانے کے بجائے آنحضرتؐ کو لے لینا ہی طے کیا۔ اس سے ان کے گھر میں فوراً بڑی برکت پیدا ہو گئی؛ چنانچہ غذا سے محرومی کے زمانے میں ان کے ریوڑ یوں نظر آتے تھے گویا شاداب چراگاہ میں چرتے رہے ہوں (ابن ہشام، ص ١٠٣ ببعد)۔ یہ واقعہ بڑا معنی خیز ہے کہ حلیمہ سعدیہ نے جب آپؐ کو دودھ پلانا چاہا تو آپؐ نے صرف ایک طرف سے دودھ پیا اور دوسری طرف رضاعی ماں کے اصرار کے باوجود بھی قبول نہ کی، بلکہ اسے اپنے دودھ بھائی کے لیے چھوڑ دیا (السہیلی، ١ : ١٠٨)۔

رضاعت کے زمانے میں حلیمہ وقتاً فوقتاً مکہ آتیں اور بچہ ماں کو دکھاتی رہی ہوں گی اور حسب دستور رضاعت کی اجرت اور تحفہ تحائف پاتی رہی ہوں گی، اگرچہ ماخذ میں اس کے بارے میں سکوت ہے۔ بہرحال اس زمانے کے دو تین واقعات قابل ذکر ہیں۔ حلیمہ نے ایک بار عکاظ کے سالانہ میلے میں شرکت کی تو وہاں ایک یہودی فال گو نے بچے کو دیکھ کر غل مچایا کہ لوگو! آؤ اور اس بچے کو قتل کر دو ورنہ وہ تمھیں قتل کرے گا۔ [اس پر اس کے ساتھیوں نے پوچھا کہ کیا یہ یتیم ہے؟ حلیمہ سعدیہ نے کہا: نہیں! میں اس کی ماں ہوں اور یہ (حارث، ان کے خاوند) اس کے والد ہیں۔ اس پر یہودیوں نے کہا کہ اگر یہ یتیم ہوتا تو ہم اسے قتل کر دیتے]۔

(ابن سعد، ۱: ۱۱۳)۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ کسی دن شاید گدگدانے پر مچل کر آپؐ نے اپنی بڑی دودھ شریک بہن شیماء کو اس زور سے کاٹا کہ اس کے شانے پر دانتوں کے نشان پڑ گئے (ابن ہشام، ص ۸۵۵)۔ تیسرا واقعہ، جو غالباً تین چار سال بعد کا ہے، یہ ہے کہ ایک دن حلیمہ کا ایک بچہ چراگاہ سے بھاگتا ہوا آیا اور کہا: چند لوگ آئے اور قریشی بھائی کا سینہ چیر ڈالا۔ حلیمہ چراگاہ میں پہنچیں تو دیکھا کہ آنحضرتؐ ایک چٹان پر بیٹھے اور ٹکٹکی لگائے آسمان کو تک رہے ہیں۔ پوچھا تو کہا: فرشتے آئے تھے، سینہ چاک کر کے دل نکالا اور دھو کر برائیوں سے پاک کیا؛ پھر اس کی جگہ پر رکھ کر سینہ بند کر دیا جس کی خنکی میں اب تک محسوس کر رہا ہوں۔ وہ واپس آسمان پر جا رہے تھے تو میں نظر سے انہیں کا تعاقب کر رہا تھا۔ (ابن ہشام، ص ۱۰۵)۔

[اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت حلیمہ بنو سعد کی معزز اور شریف خاتون تھیں۔ ان کے والد کا نام ابو ذؤیب عبداللہ بن الحارث بن شِجنہ بن جابر تھا، جو بنو سعد بن بکر بن ہوازن کے قبیلے سے تھا۔ مائی حلیمہ کے شوہر الحارث بن عبدالعُزّٰی بن رِفاعہ بھی بنو سعد کے قبیلے سے تھے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے رضاعی بہن بھائیوں کے نام یہ ہیں: عبداللہ بن حارث، اُنَیْسہ بنت الحارث اور الشَّیْماء (حَذامہ یا بقول بعض حُذافہ) بنت الحارث، جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم کی دیکھ بھال اور پرداخت میں اپنی والدہ کا ہاتھ بٹایا کرتی تھیں (ابن کثیر: السیرۃ النبویۃ، ۱: ۲۲۵؛ جمھرۃ انساب العرب، ص ۲۶۳؛ طبقات، ۱: ۱۱۰، ۱۱۱؛ انساب الاشراف، ۱: ۹۳)۔ بقول شیخ عبدالحق محدث دہلوی، حلیمہ سعدیہ اپنے نام اور نسبت کی طرح حلم، وقار اور سعادت سے موصوف تھیں (مدارج النبوۃ، ۲: ۲۳)۔ قبیلہ بنو سعد کی فصاحت زبان مسلم تھی۔ آپؐ نے ابتدائی تربیت بنو سعد میں پائی۔ پھر آپؐ قبیلہ قریش سے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ سب سے زیادہ فصیح و بلیغ تھے اور اس کا آپؐ نے متعدد بار اظہار بھی فرمایا (الروض الانف، ۱: ۱۰۹)۔

حضرت حلیمہ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی وجہ سے ہر چیز میں برکت نظر آنے لگی اور ہر شے وافر ہوگئی۔ خود آپؐ کی نشو و نما اس تیزی سے ہوئی کہ دوسرے لڑکوں میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ دو سال کے عرصے میں آپؐ بڑے صحت مند اور توانا ہوگئے۔ میں نے آپؐ کا دودھ چھڑا دیا اور آپؐ کو آپؐ کی والدہ کے پاس لے آئی۔ ہماری یہ دلی خواہش تھی کہ آپؐ کچھ مدت اور ہمارے پاس رہیں، کیونکہ آپؐ کی وجہ سے ہمارے ہاں بڑی خیر و برکت رہی۔ آپؐ کی والدہ ماجدہ آپؐ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ ہمارے بیٹے کو کچھ عرصہ اور ہمارے پاس رہنے دیں، تاکہ آپؐ اور مضبوط و توانا ہو جائیں؛ علاوہ ازیں شہر مکہ میں وبا پھیلی ہوئی ہے اور مجھے اس کا بھی خدشہ ہے۔ ہمارے اصرار سے وہ رضامند ہوگئیں اور ہم آپؐ کو ساتھ لے کر خوش و خرم وطن کو لوٹے۔

بنو سعد میں واپسی کے بعد شق صدر کا واقعہ پیش آیا۔ کتب سیر و احادیث میں اس کی تفصیلات درج ہیں۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم بنو سعد کے گھروں کے پیچھے اپنے ایک رضاعی بھائی کے ساتھ تھے، جو اپنے مال مویشی چرا رہا تھا۔ اس اثنا میں دو فرشتے (روایت میں دو پرندے یا دو آدمی بھی مذکور ہیں) آئے۔ وہ سفید کپڑوں میں ملبوس تھے اور ان کے پاس برف سے بھرا ہوا سونے کا ایک طشت تھا۔ انہوں نے آپؐ کا پیٹ (یا سینہ) چاک کرکے قلب اطہر کو نکالا۔ پھر قلب کو چاک کرکے اس میں سے جما ہوا خون نکال باہر پھینکا۔ پھر قلب اور پیٹ کو برف

اور آب زمزم سے دھویا اور اسے علم و حکمت، ایمان و ایقان، رافت و رحمت اور شفقت سے بھر دیا۔ بعد ازاں قلب کو اپنی جگہ رکھ کر چاک شدہ حصے کو ٹانکے لگا دیے اور دونوں شانوں کے درمیان ایک مہر لگا دی۔ پھر فرشتوں نے آپؐ کو سینے سے لگایا، آپؐ کی پیشانی پر بوسہ دیا اور کہا: اے حبیبؐ خدا! آپؐ خوف زدہ نہ ہوں۔ اگر آپؐ کو معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ کیسی بھلائی کا ارادہ رکھتا ہے تو آپؐ بے حد خوشی اور راحت محسوس کریں۔ یہ روایت متعدد طرق سے حدیث و سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ صحیح مسلم میں بھی بصحت سند موجود ہے۔ حضرت انسؓ بن مالک کہتے ہیں کہ میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے سینۂ مبارک میں ٹانکوں کے نشان دیکھا کرتا تھا۔ اس واقعے کے سلسلے میں پہلی روایت حضرت حلیمہ سعدیہ کی ہے؛ دوسری روایت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی ہے کہ آپؐ نے صحابہ کرامؓ کے سوال کرنے پر اپنی زندگی کے آغاز کا یہ واقعہ ذکر فرمایا۔ اس واقعے کو بیان کرنے سے پہلے آپؐ نے فرمایا کہ میں دعائے خلیلؑ اور نوید مسیحاؑ ہوں؛ تیسری قسم کی روایات صحابۂ کرامؓ کی ہیں، جنھوں نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم سے یہ بات سنی اور پھر آگے بیان کی (دیکھیے الطبقات، ۱: ۱۱۰ یا ۱۱۲؛ السیرۃ النبویۃ، ۱: ۲۲۷ تا ۲۳۱؛ ابن الجوزی: الوفاء باحوال المصطفی، ۱: ۱۰۱ ببعد)۔

بعض سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ آپ کی عمر سوا دو برس تھی جب یہ واقعہ پیش آیا (ابن کثیر: کتاب مذکور، ۱: ۲۲۸)؛ لیکن ابن سعد نے اس وقت آپؐ کی عمر چار سال بتائی ہے (الطبقات، ۱: ۱۱۲)۔ جب آپؐ حضرت حلیمہ کے ہاں قیام فرما تھے تو ایک دن مائی حلیمہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو دیکھنے باہر نکلیں تو آپؐ اپنی رضاعی بہن کے ساتھ باہر دھوپ میں تھے۔ یہ دیکھ کر وہ بولیں کہ اتنی گرمی میں آپؐ باہر پھر رہے ہیں۔ اس پر رضاعی بہن نے جواب دیا: اماں جان! میرے بھائی کو گرمی نہیں لگتی۔ میں نے دیکھا ہے کہ ایک بادل سایہ کیے رہتا ہے۔ جب آپؐ چلتے ہیں تو بادل بھی ساتھ چلتا ہے اور جب آپؐ ٹھہر جاتے ہیں تو بادل بھی ٹھہر جاتا ہے (الوفاء باحوال المصطفی، ۱: ۱۱۳؛ السیرۃ النبویۃ، ۱: ۲۲۸)]۔ اس پر مائی حلیمہ نے طے کیا کہ بچے کو اس کی ماں کے سپرد کر دینا ہی بہتر ہے۔ اس وقت آپؐ کی عمر چار یا پانچ سال کی بیان کی جاتی ہے۔ واپسی میں مکّے کے قریب آپؐ کہیں کھو گئے؛ اس کی اطلاع پر دادا نے تلاش کرایا (ابن ہشام، ص ۱۰۳ ببعد؛ البلاذری: انساب، ۱: ۹۵)؛ آپؐ ایک درخت کے نیچے کھیلتے ہوئے صحیح سالم مل گئے [(الوفاء باحوال المصطفی، ۱: ۱۰۶)۔ عبدالمطلب آپؐ کو گھر لائے اور اس خوشی میں بہت سا سونا اور کئی اونٹ صدقے میں دیے اور دایہ حلیمہ کو بہت سا انعام و اکرام دے کر واپس بھیجا (مدارج النبوۃ، ۲: ۲۰)]۔

[مائی حلیمہ سعدیہ کے اسلام لانے کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام السیوطی تو اس بات کے قائل ہیں کہ جس بی بی نے بھی آپؐ کو دودھ پلایا وہ اسلام لے آئی (مسالک الحنفاء، ص ۴۴)۔ شبلی نعمانی نے بہت سے حوالوں سے اس کی تصریح و توثیق کی ہے کہ مائی حلیمہ اسلام لے آئی تھیں؛ نیز حافظ مغلطائی کے ایک مستقل رسالے التحفۃ الجسیمۃ فی اثبات اسلام حلیمہ کا ذکر بھی کیا ہے (سیرت النبی، بار اول، ۱: ۱۲۲)]۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم حضرت حلیمہ کی بڑی عزت و تکریم کرتے تھے۔ آپؐ کو ان سے اور ان کی اولاد سے بڑی محبت و موانست تھی۔ آپؐ نے اس رشتۂ رضاعت و مضاعت کو ہمیشہ یاد رکھا۔ آخر آپؐ نے اپنی زندگیٔ مبارک کے پہلے پانچ سال اسی خاندان میں گزارے تھے، دو برس تک مائی حلیمہ کا

دودھ پیا، پھر تین برس تک ان کی نگہداشت میں پرورش اور تربیت پائی۔ ان کے لڑکے لڑکیاں آپؐ کو اٹھائے کھلاتے رہے۔ السہیلی رقمطراز ہیں کہ حضرت حلیمہ آپؐ کو آپؐ کی والدہ کے پاس لائیں تو آپؐ کی عمر پانچ سال ایک ماہ تھی۔ اس کے بعد حضرت حلیمہ نے آپؐ کو صرف دو مرتبہ دیکھا: ایک مرتبہ تو حضرت خدیجہؓ سے نکاح کے بعد وہ مکہ مکرمہ میں آئیں اور آپؐ سے خشک سالی کی شکایات کی اور بتایا کہ ساری قوم قحط کا شکار ہو رہی ہے۔ یہ سن کر آپؐ نے حضرت خدیجہؓ سے سفارش کی تو انہوں نے بیس بکریاں اور سواری کے لیے ایک اونٹ دے کر رخصت کیا؛ دوسری مرتبہ یوم حنین میں ملاقات ہوئی (الروض الانف، ۱ : ۱۱۱؛ الطبقات، ۱ : ۱۱۳)۔ ابن سعد لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رضاعی ماں آپؐ کے پاس آئی تو آپؐ نے انہیں دیکھتے ہی فرمایا: اُمّی، اُمّی! پھر آپؐ نے اپنی چادر مبارک ان کے لیے بچھا دی اور وہ اس پر بیٹھ گئیں۔ پھر آپؐ نے ان کی حاجت روائی بھی کی (الطبقات، ۱ : ۱۱۴)۔ حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں تصریح کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ان کی مقام جعرانہ میں بھی ملاقات ہوئی تھی اور ان کے بیٹھنے کے لیے آپؐ نے اپنی چادر مبارک بچھائی تھی۔ البلاذری کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر حضرت حلیمہ کی بہن آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپؐ نے اپنی رضاعی ماں کی بابت دریافت فرمایا۔ جواب ملا کہ وہ وفات پا چکی ہیں۔ یہ سن کر آپؐ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ پھر آپؐ نے اپنی رضاعی خالہ کو لباس، سواری کا جانور اور دو سو درہم نقد دے کر رخصت کیا (انساب الاشراف، ۱ : ۹۵)۔

حضرت حلیمہ کے شوہر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے رضاعی باپ حارث بن عبدالعزیٰ کے بارے میں اصحاب سیر مثلاً السہیلی، حافظ الذہبی اور حافظ ابن حجر کی رائے ہے کہ وہ مکے میں اسلام لے آئے تھے اور ان کا اسلام پختہ اور عمدہ تھا۔ اسی طرح آپؐ کے رضاعی بھائی عبداللہ اور بہن شیماء بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تھے۔ حضرت شیماء کو غزوہ حنین میں گرفتار کر کے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سامنے لایا گیا تو آپؐ نے اپنی رضاعی بہن کو اس کے بیٹھنے کے لیے اپنی چادر بچھا دی اور فرمایا کہ اگر چاہو تو عزت و شفقت سے میرے پاس قیام کرو اور اگر اپنی قوم میں جانا چاہو تو تمہیں بحفاظت پہنچا دوں۔ وہ اسلام لے آئیں اور ان کی خواہش کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے انہیں ان کی قوم میں بھیج دیا اور روانگی کے وقت تین غلام، ایک لونڈی اور کچھ اونٹ اور بکریاں عطا کیں۔ اسی رشتہ رضاعت و حضانت کا پاس کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے غزوۂ حنین میں قید ہونے والے قبیلہ بنو سعد کے تقریباً چھے ہزار مردوں، عورتوں اور بچوں کو آزاد کر دیا اور ان کے مال مویشی بھی انہیں واپس کر دیے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سب کے سب مسلمان ہو گئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پانچ سالہ قیام کے بارے میں حضرت حلیمہ اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ اس عرصے میں آپؐ کی عادات نہایت پاکیزہ اور پسندیدہ تھیں؛ نہ تو آپ روتے تھے اور نہ بے تمیزی کے مرتکب ہوتے تھے، نہ عام بچوں کی طرح کپڑوں میں بول و براز کرتے تھے: فضول کاموں اور کھیلوں سے بھی پرہیز کرتے تھے (مدارج النبوۃ، ۲ : ۲۶ تا ۲۸)۔

نوعمری: جب حضرت حلیمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو لے کر آپؐ کی والدہ محترمہ کے پاس آئیں تو حضرت آمنہ اپنے لخت جگر اور نور نظر

کو تندرست و توانا دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں اور محبت و شفقت اور لاڈ پیار کے اظہار کے وہ تمام انداز اختیار کیے جو ایک بیوہ ماں اپنی آنکھوں کے تارے اور افسردہ دل کے سہارے کے لیے کر سکتی ہے۔ ماں نے اپنے لال کی تربیت اور پرورش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ آپ ؐ کی دیکھ بھال اور نگہداشت، خبر گیری اور حفاظت کے لیے اپنی خادمہ ام ایمن کو متعین فرما دیا۔ ام ایمن کا بیان ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے کبھی بھوک یا پیاس کی شکایت نہیں کی۔ آپ ؐ صبح آب زمزم نوش فرما لیتے اور پھر سارا دن کوئی چیز طلب نہ فرماتے۔ اکثر ایسا ہوا کہ میں نے ناشتہ تیار کر کے سامنے رکھا تو کہ دیا کہ مجھے خواہش نہیں (مدارج النبوۃ، ۲ : ۲۰)۔ ام ایمن کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالٰی نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو بچپن ہی سے سیر چشمی، بے نیازی، قناعت اور غنائے نفس سے نواز رکھا تھا۔ آمنہ کے لال نے اپنی عمر عزیز کا چھٹا سال اپنی مادر مہربان اور شفیق دادا کی محبت و شفقت کے سائے میں بسر کیا۔ جب آپ چھے برس کے ہوگئے تو آپ ؐ کی والدہ ماجدہ نے آپ ؐ کو آپ ؐ کے دادا کے ننھیال دکھانے کے لیے سفر یثرب (مدینہ) کی تیاری کی۔ ایک اونٹ پر حضرت آمنہ سوار ہوئیں اور دوسرے پر آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم اور آپ ؐ کی خادمہ (کھلائی) ام ایمن۔ اس سفر کا ایک مقصد یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آمنہ اپنے مرحوم شوہر حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب کی قبر کی زیارت خود بھی کریں اور اپنے ہونہار لال کو بھی مرحوم باپ کی قبر کی زیارت کرا سکیں؛ چنانچہ ماں بیٹا مع ام ایمن سفر کی منزلیں طے کرتے ہوئے یثرب پہنچے اور وہاں بنو عدی بن النجار کے ہاں دارالنابغۃ میں قیام فرمایا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے دادا عبدالمطلب کی والدہ سلمٰی بنت عمرو یثرب کے اسی خاندان سے تھیں اور آپ ؐ کے دادا یہیں پیدا ہوئے اور آٹھ برس تک یہیں اپنے ننھیال میں پرورش پاتے رہے تھے۔ وہاں ایک مہینہ ٹھیرنے کے بعد جب واپس لوٹیں تو راستے میں بیمار ہو کر مکے اور مدینے کے درمیان مقام ابواء پر اپنے معصوم اور پیارے لال کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے دیکھتے ابدی نیند سو گئیں اور وہیں مدفون ہوئیں۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و سلّم کو بچپن میں قیام مدینہ کی کئی باتیں یاد رہ گئیں تھیں۔ ہجرت کے بعد آپ ؐ کا ایک مرتبہ بنو عدی بن النجار کی منازل اور قیام گاہوں پر گزر ہوا تو فرمایا کہ میں بچپن میں جب اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ یہاں آیا تھا تو بنو عدی کی اس گڑھی میں اپنے ننھیال کے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا اور منڈیر پر بیٹھنے والے پرندوں کو ہم سب مل کر اڑایا کرتے تھے۔ آپ ؐ نے دارالنابغہ کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ میری والدہ اور میں یہاں ٹھیرے تھے اور اسی گھر کے اندر میرے والد عبداللہ بن عبدالمطلب کی قبر ہے اور بنو عدی کا یہی وہ تالاب (باؤلی) ہے جس میں میں نے تیراکی اور شناوری کی خوب مشق کی۔ ام ایمن کہتی ہیں کہ یہود کے کچھ لوگ آتے جاتے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو دیکھتے تھے۔ میں نے ایک یہودی کو یہ کہتے سنا کہ یہ شخص اس قوم کا نبی ہے اور یہ شہر اس کا دارالھجرت ہے۔ مجھے اس کے یہ الفاظ خوب یاد ہیں (الطبقات، ۱ : ۱۱۶؛ ابن کثیر: السیرۃ النبویۃ، ۱ : ۲۳۵؛ الوفا، ۱ : ۱۱۷)۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی مشفق و مہربان ماں کی وفات کے بعد ام ایمن آپ ؐ کو لے کر مکہ مکرمہ آئیں اور آپ ؐ کے دادا عبدالمطلب کے سپرد کیا۔ دادا نے اپنے پوتے کی کفالت و تربیت اور نگہداشت کا پورا پورا حق ادا کیا۔ عبدالمطلب آپ ؐ کو اپنی تمام اولاد سے زیادہ لاڈ کرتے، پیار اور عزت و محبت سے پرورش کرتے؛ وہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی

عدم موجودگی میں کھانا نہ کھاتے تھے۔ آپؐ جب چاہتے دادا کے پاس بلا روک ٹوک آتے جاتے اور ان کی مسند پر بیٹھ جاتے تھے (مدارج النبوۃ، ۲ : ۳۰)۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ عبدالمطلب کے لیے دیوار کعبہ کے پاس مسند بچھائی جاتی تھی۔ ان کے سب بیٹے اور قریش کے سردار اس مسند کے ارد گرد بیٹھتے تھے۔ عبدالمطلب آتے تو صرف وہی مسند پر بیٹھتے، البتہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم تشریف لاتے تو دادا کی مسند پر بیٹھ جاتے اور اگر کوئی شخص آپؐ کو اس مسند سے اٹھانا چاہتا تو عبدالمطلب اسے روک دیتے اور کہتے کہ میرے بیٹے کو بیٹھا رہنے دو: اس کی شان ہی کچھ اور ہے؛ اسے اپنے شرف و مرتبے کا احساس ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ اتنا بلند مرتبہ اور اعلیٰ مقام پائے گا کہ کسی عربی کو نہ پہلے ملا اور نہ بعد میں ملے گا۔ پھر وہ آپؐ کے جسد مبارک پر محبت و شفقت سے ہاتھ پھیرتے اور آپؐ کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے۔ دادا اپنے ہونہار پوتے کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ میرا پوتا بڑا ہو کر نبوت و حکومت سے نوازا جائے گا۔ اسی لیے وہ آپؐ کی خادمہ ام ایمنؓ کو اس بات کی تاکید کیا کرتے تھے کہ وہ ایک پل کے لیے بھی آپؐ سے غافل نہ ہونے پائے [(الطبقات، ۱ : ۱۱۸؛ السیرۃ النبویۃ، ۱ : ۲۳۹ و ۲۴۰؛ الوفاء، ۱ : ۱۱۹ تا ۱۲۰، ۱۳۰)]۔

مشفق و مہربان دادا دو سال بعد فوت ہو گئے اور اس وقت آنحضرتؐ کی عمر آٹھ سال کی تھی۔ (دادا کی عمر کی روایتیں مختلف ہیں: اسی، ایک سو دس، ایک سو بیس اور ایک سو چالیس)۔ جنازے کے پیچھے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم روتے ہوئے جا رہے تھے [(الطبقات، ۱ : ۱۱۹)]۔ سارا شہر سوگوار تھا۔ شہر میں کئی دن ان کا سوگ منایا گیا (البلاذری : الانساب، ۱ : ۸۷)۔

[ام ایمنؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بچپن میں کھلایا اور نگہداشت و خدمت کا حق خوب ادا کیا۔ وہ آپؐ سے بڑے لطف و محبت سے پیش آتی اور اچھی طرح دیکھ بھال کرتی تھیں۔ یہ خادمہ آپؐ کو اپنے والد اور والدہ کی طرف سے ملی تھیں۔ ان کا اصلی نام برکت تھا اور حبشہ کی رہنے والی تھیں۔ مدت العمر آپؐ کی خدمت کرتی رہیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا نکاح حضرت خدیجہؓ سے ہوا تو آپؐ نے ام ایمن کو آزاد کر دیا۔

ام ایمن کا نکاح پہلے عُبید بن الحارث الخزرجی سے ہوا تھا اور ان کے ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام ایمن تھا اور اسی نسبت سے وہ ام ایمن کہلائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بھی امّ ایمنؓ کی بڑی عزت کرتے اور میری ماں کہہ کر یاد کیا کرتے تھے۔ آپؐ نے عبید کی موت کے بعد بعثت نبوی کے آغاز میں حضرت ام ایمن کا نکاح حضرت زیدؓ بن حارثہ سے کر دیا اور اس نکاح سے اسامہؓ بن زید پیدا ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات پر ام ایمنؓ کو روتے دیکھ کر پوچھا گیا تو کہنے لگیں کہ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ آپؐ اس دنیا سے تشریف لے جائیں گے، مگر میں تو اس بات پر روتی ہوں کہ اب سلسلۂ وحی منقطع ہو گیا ہے۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے موقع پر ام ایمنؓ نے روتے ہوئے کہا کہ آج اسلام کمزور ہو گیا ہے۔ بالاخر ام ایمنؓ نے خلافت عثمانی میں وفات پائی (الذہبی: سیر اعلام النبلاء، ۲ : ۱۵۹ تا ۱۶۱)]۔

یہ قدرت کی کرشمہ سازیاں ہیں کہ آپؐ بطن مادر میں تھے کہ والد ماجد کا انتقال ہو گیا۔ چھے برس کے ہوئے تو مہر مادری سے محروم ہو گئے اور آٹھ برس کے ہوئے تو مشفق و مہربان دادا کا سایۂ عاطفت بھی اٹھ گیا۔ والد کو تو آپؐ نے دیکھا بھی نہ تھا، اس لیے پدرانہ محبت و شفقت کے لطف سے آشنا بھی نہ ہونے پائے تھے۔ مہر مادری سے محرومی کا

احساس و شعور تو تھا ؛ لیکن دادا کی شفقت اور لطف نے اس زخم پر مرہم کا کام کیا ۔ اب دادا کی وفات کے وقت آپؐ خاصے با شعور ہو چکے تھے اور اس محرومی اور غم کی شدت کا احساس اس امر سے بخوبی ہوتا ہے کہ آپؐ ان کے سرہانے کھڑے روتے رہے تھے (الوفاء ، ۱ : ۱۲۹) اور جب جنازہ اٹھا تو آپؐ جنازے کے پیچھے پیچھے روتے جا رہے تھے تا آنکہ انھیں حجون کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا تھا (الوفاء ، ۱ : ۱۳۰)].

کہتے ہیں کہ عبدالمطلب نے وصیت کی کہ ابو طالب آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے نگران بنیں ۔ آپؐ کے کئی چچا تھے ۔ ابو طالب اور زبیر کی ماں اور عبداللہ کی ماں ایک ہی تھی ۔ زبیر کو عام بہبود کے کاموں سے بڑی دلچسپی تھی (دیکھیے نیچے) ۔ اس کے باوجود ابو طالب کو ، جو مفلس بھی تھے ، ترجیح دینے کی وجہ شاید یہ تھی کہ عبداللہ اور ابو طالب میں روابط زیادہ بہتر رہے ہوں .

[بکریاں چرانے کے ضمن میں یہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے کہ بنو سعد کے ہاں دوران قیام میں بکریاں چراتے وقت آپؐ اپنے رضاعی بھائی بہنوں کے ساتھ ہوتے تھے ۔ امام بخاریؒ کی روایت کے مطابق آپؐ اہل مکہ کی بکریاں قراریط پر چرایا کرتے تھے (الصحیح ، کتاب الاجارہ ؛ الطبقات ، ۱ : ۱۲۵) ۔ نیز ابن سعد کے مطابق آپؐ اپنے گھر والوں کی بکریاں مقام اجیاد (دامن مکہ) میں چرایا کرتے تھے (اَنَا اَرْعٰی غَنَمَ اَھْلِی بِاَجْیَاد ، الطبقات ، ۱ : ۱۲۶) ۔ آپؐ نے ایک حدیث میں یہ بھی وضاحت فرمائی کہ کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں ۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنے صحابہؓ کے ساتھ پیلو کے درختوں کے پاس سے گزرے تو آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ اس کے سیاہ پھل کھاؤ ، وہ بہت اچھے ہوتے ہیں ۔ جب میں بکریاں چرایا کرتا تھا تو سیاہ پھل ہی کھایا (توڑا) کرتا تھا (الطبقات ، ۱ : ۱۲۶) ۔ بعض سیرت نگاروں نے قراریط پر بکریاں چرانے والی روایات کی تاویل کی ہے اور زیادہ تر رجحان یہ ہے کہ یہ سکے نہیں بلکہ اجیاد کے قریب ایک مقام ہے ۔ اس زمانے میں اشراف اور معززین کے لڑکے اور جوان عام طور پر بھیڑ بکریاں چرایا کرتے تھے ۔ اس میں تحقیر یا ذلت کا کوئی پہلو نہیں ، بلکہ یہ قیادت ، جفا کشی ، بلند ہمتی اور مردانگی کی نشانی تھی ، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ ہر نبی نے بکریاں چرائی تھیں ۔ اس سے بڑھ کر اور زیادہ شرف کیا ہو سکتا ہے.

ابو طالب کی بیوی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی چچی کا نام فاطمہ بنت اسد بن ہاشم بن عبد مناف تھا اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی والدہ ماجدہ تھیں ۔ وہ مکے میں ایمان لائیں ، مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی اور وہیں وفات پا کر مدفون ہوئیں ۔ انھوں نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بڑی محبت و الفت سے پرورش کیا ۔ آپؐ بھی ان کی بڑی عزت و تکریم کرتے اور ان کی خدمات کا اعتراف کیا کرتے تھے ۔ آپؐ اکثر ان کی زیارت کو جاتے اور دوپہر کے وقت انھیں کے ہاں آرام فرماتے تھے ۔ جب آپؐ کی چچی فوت ہوئیں تو آپؐ نے ان کو کفن کے ساتھ پہنانے کے لیے اپنی قمیص بھی دی تا کہ اس کی وجہ سے انھیں جنت کا لباس پہنایا جائے اور جب انھیں قبر میں اتارا گیا تو آپؐ قبر میں ان کے ساتھ اترے تا کہ ان پر قبر میں آسانی اور آسائش ہو جائے (الذھبی : سیر اعلام النبلاء ، ۲ : ۸۷ ؛ الاستیعاب ، ۲ : ۷۵۳) .

ابو طالب کو اس بات کا یقین تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا مستقبل بڑا درخشاں اور شاندار ہے ۔ وہ آپؐ کی نگہداشت کا بڑا اہتمام کرتے ۔ آپؐ کی چچی بھی اپنی اولاد سے بڑھ کر آپ کی دیکھ

بھال کرتیں ۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی وفات پر آپؐ بڑے دل گرفتہ اور مغموم نظر آتے تھے ۔

ابو طالب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے بڑی محبت تھی ۔ وہ آپؐ کی خوب اچھی طرح دیکھ بھال کرتے اور ہر طرح خیال رکھتے تھے ۔ ابو طالب عیالدار تو بہت تھے، لیکن مالدار نہ تھے ۔ ان کے ہاں آپؐ کی موجودگی باعث خیر و برکت ثابت ہوئی: جب ابو طالب کے اہل و عیال اکیلے کھانا کھاتے تو سیر نہ ہونے پاتے، لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم شریک طعام ہوتے تو سب لوگ خوب سیر ہو جاتے ۔ ابو طالب آپؐ کے مبارک ہونے کا اکثر اعتراف کیا کرتے تھے ۔ ابو طالب کے بال بچے رات بھر سونے کے بعد صبح اٹھتے تو ان کی آنکھیں کیچ آلود ہوتیں اور بال بکھرے ہوئے اور پریشان ہوتے، لیکن آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے چہرے پر تازگی، رونق اور آب و تاب ہوتی اور آنکھیں صاف اور نکھری ہوئی ہوتیں (الطبقات، ۱: ۱۱۹ و ۱۲۰؛ الوفا، ۱: ۱۳۱؛ السیرۃ النبویہ، ۱: ۲۴۲)۔

چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو رسالت و نبوت سے سے نوازنا تھا، اس لیے آپؐ کی تربیت اور نشو و نما خاص انداز میں ہوئی ۔ اللہ تعالیٰ نے ہر قدم پر اپنے حبیبؐ کی راہنمائی اور حفاظت فرمائی اور جاہلیت کی تمام بری اور مشرکانہ عادات سے ہمیشہ بچائے رکھا ۔ آپؐ اپنی قوم کی کسی مشرکانہ تقریب میں کبھی شامل نہ ہوئے ۔ آپؐ کا بچپن، لڑکپن اور جوانی نہایت پاکبازی اور راستبازی میں گزری ۔ بچپن ہی سے آپؐ شرم و حیا کا پیکر تھے ۔ ایک طرف آپؐ امانت داری، راست گفتاری اور دیگر اوصاف حمیدہ سے آراستہ تھے تو دوسری طرف بد گوئی، فحش بیانی، غیر مہذب اور آوارہ عادتوں سے بہت دور تھے ۔ آپؐ نے نہ تو کبھی میلے ٹھیلے میں شرکت کی اور نہ لہو و لعب میں شامل ہوئے ۔ اگر ایک دو مرتبہ ارادہ بھی کیا تو اللہ تعالی نے اس ارادہ سے باز رکھا اور کسی صورت میں بھی آپ تماشا گاہ تک پہنچ نہ پائے]۔

السہیلی (۱: ۱۱۲) نے البخاری سے روایت کی ہے کہ اس زمانے میں شہر میں ایک شادی تھی ۔ آپؐ کو تماشا دیکھنے کا شوق ہوا ۔ ایک رفیق چرواہے سے کہا: میری بکریاں بھی آج تو سنبھال لے؛ کسی اور دن تیری بکریاں میں سنبھال لوں گا ۔ چرائی شہر کے باہر ہوتی تھی ۔ شہر آئے تو تقریب ابھی شروع نہ ہوئی تھی ۔ انتظار میں دھوپ کے باعث ایک جگہ سائے میں ذرا پیٹھ لگئی تو غنودگی طاری ہوگئی اور جب بیدار ہوئے تو جلوس باجا سب ختم ہو چکا تھا ۔ کچھ عرصہ بعد دوبارہ ایسا ہی واقعہ پیش آیا اور مکرر سو گئے ۔ اس دن عہد کیا کہ آئندہ کھیل کود میں وقت ضائع نہ کروں گا ۔

[ابو طالب اپنے خاندان سمیت ایک بت کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے اور وہاں نذریں نیازیں چڑھاتے اور قربانی وغیرہ کرتے تھے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بھی اہل خانہ ہر سال مجبور کرتے، لیکن آپؐ انکار کر دیتے ۔ ایک سال کا ذکر ہے کہ گھر کے بزرگوں نے بے حد اصرار کیا تو آپؐ بادل ناخواستہ ساتھ چل دیے ۔ واپسی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سخت پریشان اور ہراساں نظر آ رہے تھے ۔ پھپھیاں آپؐ کو اس حالت میں دیکھ کر گھبرا گئیں ۔ اس کے بعد پھر آپؐ کبھی ایسی تقریب میں شریک نہ ہوئے ۔

عہد شباب: تین چار سال اسی طرح گزر گئے تو ابو طالب نے فلسطین کے تجارتی سفر کا ارادہ کیا کہ کچھ کمائیں (ابن ہشام: سیرۃ، ۱: ۱۹۱ تا ۱۹۳)۔ [سفر طویل اور راستہ دشوار تھا مگر شفیق چچا نے اپنے یتیم بھتیجے کو اپنے ہمراہ سفر میں لے جانے کا ارادہ ترک نہ کیا (ابن ہشام: سیرۃ، ۱: ۱۹۲،

قاہرہ ۱۹۳۶ء)]۔ فلسطین آپؐ کے لیے ایک نیا ملک تھا ۔ یونانی حکومت اور عیسائی دین دونوں آپؐ کے لیے اجنبی تھے ۔ اس وقت بھی عیسائیوں میں اپنے دین کی تبلیغ کا شوق تھا ۔ ان کے راھب مہمان نوازی اور خدمت خلق کا ذوق رکھتے تھے۔ بیت المقدس کے شمال میں دمشق کے قریب ایک مقام بُصریٰ کی منڈی میں بحیرا راھب نے اپنے صومعے میں اس چھوٹے سے تجارتی کاروان کی ضیافت کی ۔ عیسائیوں کو حضرت عیسٰی علیہ السلام کی پیشینگوئیوں کے مطابق اس زمانے میں کسی اہم انقلاب کا انتظار تھا (یوحنا، ۱۴ : ۱۶ ، ۱۵ : ۲۶ ، ۱۶ : ۷ تا ۱۶)؛ یہودیوں کو بھی آنے والے مسیحا کا انتظار تھا، جسے بنی اسرائیل کے بھائیوں کے خاندان (بنو اسمعیلؑ) سے ہونا چاہیے تھا (استثنا، ۱۸ : ۱۸)؛ [نیز دیکھیے سرسید : خطبات احمدیہ]. اس طرح بحیرا کا مقصد سہ گونہ ہو جاتا ہے : مسافر پروری، تبلیغ نصرانیت اور تسلی دھندہ کی تلاش [رک بہ بحیرا].

مکہ مکرمہ میں ابو طالب کی ایک دکان تھی ۔ وہ کپڑے اور عطر کا کاروبار کرتے تھے۔ بھتیجا بھی اسی ماحول میں پروان چڑھا تھا؛ لہٰذا فطری دیانت داری سے رفتہ رفتہ شہرت اور ہر دلعزیزی کا حاصل ہونا ناگزیر تھا ۔ آپؐ کی راست بازی اور راست گفتاری کی وجہ سے "الامین" اور "الصّادق" کا خطاب آپؐ کے لیے زبان زد عوام و خواص ہو گیا ۔ [کتب احادیث و سیر سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے قبل از نبوت عہد شباب میں تجارتی کاروبار کیا اور اس میں بڑی نیک نامی اور عزت حاصل کی].

آپؐ نے اپنے مکرم چچا ابو طالب کی رفاقت میں شام و فلسطین کی طرف جو سفر کیے اس سے آپؐ کو تجارتی اصول و ضوابط سیکھنے میں بڑی مدد ملی؛ چنانچہ بعد ازاں آپؐ نے اپنی آزاد تجارت شروع فرما دی ۔ تزویج حضرت خدیجہؓ سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا یہی شغل رہا ۔ اس دوران میں آپؐ نے جن لوگوں کے ساتھ لین دین کیا انھوں نے آپؐ کو انتہائی امین، پابند عہد اور دیانت دار پایا، حتّٰی کہ عبداللہ بن ابی الحمساء کے بیان کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پاس عہد میں تین روز تک ایک ہی جگہ تشریف فرما رہے (ابو داؤد : سنن، ۵ : ۲۶۸، عدد ۴۹۹۶؛ شبلی : سیرۃ النبی، ۱ : ۱۸۵ ببعد)۔ سفر تجارت کے دوران میں ایک بار ایک شخص نے آپؐ کو لات و عزّٰی کی قسم دینا چاہی تو آپؐ نے فرمایا : میں نے کبھی ان کے نام کی قسم نہیں کھائی ۔ میں ان کے پاس سے گزرتا ہوں تو ان کی طرف التفات ہی نہیں کرتا (ابن الجوزی : الوفا، ۱ : ۱۴۳).

[آپؐ پندرہ یا بیس سال کے تھے جب حرب فجار چھڑی (الیعقوبی، ۲ : ۱۵)۔ یہ جنگ قیس اور کنانہ کے قبیلوں میں حج کے محترم زمانے میں ہوئی ۔ قریش مکہ نے بھی اپنے دستے الگ قائم کرکے شمولیت اختیار کی ۔ چونکہ قریش اس جنگ میں برحق تھے اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بھی اس جنگ میں اپنے چچاؤں کی مدافعت میں حصہ لیا (ابن ہشام : السیرۃ النبویہ، ۱ : ۱۹۵ تا ۱۹۸؛ المسعودی : مروج الذھب، ۲ : ۲۷۴). تاہم علامہ سہیلی (روض الانف، ۱ : ۱۲۰) کی تشریح کے مطابق آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس میں نہ تو عملی حصہ لیا اور نہ کسی پر ہاتھ اٹھایا ۔ زیادہ سے زیادہ آپؐ نے اپنے چچاؤں کی معاونت کی، یعنی ان کو تیر پکڑاتے رہے اور بس ۔ [فجار کی لڑائیاں دو ہوئی ہیں ۔ پہلی لڑائی اس وقت ہوئی جب آپؐ کی عمر کم و بیش دس سال تھی ۔ دوسری جنگ اس وقت ہوئی جب آپؐ کی عمر چودہ یا بیس سال بیان کی جاتی ہے ۔ اس جنگ میں آپؐ نے اپنے چچاؤں کی معاونت کے لیے حصہ لیا

(ابن الجوزی، ۱ : ۱۳۵)۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی عمر مبارک پچیس سال کے قریب ہوئی تو ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آپؐ کی امانت و دیانت، حسن معاملگی اور ایفاے عہد کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا۔ یہ شہرت حضرت خدیجہؓ [رک باں] نے بھی سنی۔ وہ ایک مالدار تجارت پیشہ خاتون تھیں اور مکہ معظمہ میں اپنی نیک نامی کے باعث "طاہرہ" کے معزز لقب سے یاد کی جاتی تھیں۔ انھیں اشراف قریش نکاح کا پیام دے چکے تھے، مگر انھوں نے ان تمام کو رد کر دیا تھا اور اب آزادانہ پاک زندگی بسر کر رہی تھیں۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس پیغام بھیجا کہ آپؐ میرا سامان تجارت لیکر شام جائیں؛ جو معاوضہ دوسروں کو ملتا ہے اس سے آپؐ کو دوگنا ملے گا۔ آپؐ نے اپنے چچا ابو طالب کے ایما پر یہ پیش کش قبول کرلی (السہیلی : روض الانف، ۱ : ۱۲۱ ببعد)]۔

حضرت خدیجہؓ نے بہت سا سامان آپؐ کے سپرد کیا اور ایک غلام میسرہ بھی رفاقت و خدمت کے لیے ساتھ کر دیا؛ (ایک روایت میں ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے بعض رشتہ دار بھی اس کاروان میں شریک تھے)۔ اس دفعہ بھی بصری (ملک شام) جانا ہوا (ابن ہشام : سیرۃ، ۱ : ۱۹۹ ببعد)۔ یہ سفر بہت کامیاب رہا اور معمول سے بہت زیادہ نفع مند ثابت ہوا؛ چنانچہ حضرت خدیجہؓ نے بھی شکر گزاری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو وعدے سے زیادہ معاوضہ دیا۔ ان سفروں میں آنحضرتؐ کی دیانت و امانت سے حضرت خدیجہؓ بے حد متأثر ہوئیں اور ان کا اعتراف کرتے ہوئے کچھ تحائف بھی دیے (السہیلی، ۱ : ۱۲۳)۔ [ابن الجوزی نے روایت کی ہے کہ السائب بن ابی السائب بھی ایک عرصے تک آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے شریک تجارت رہے (الوفا، ۱ : ۱۴۲)]۔

خانہ داری : اس سفر سے واپسی کے تین ماہ بعد [شبلی، ۱ : ۱۸۸] اس قدر دانی کا سلسلہ باہم مناکحت کی صورت پر منتج ہوا۔ عام روایتوں کے مطابق اس وقت آپؐ کی عمر پچیس سال اور حضرت خدیجہؓ کی چالیس سال بیان کی جاتی ہے۔ حضرت خدیجہؓ سے چار لڑکیاں اور دو سے لے کر چار تک لڑکے پیدا ہوئے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ نکاح کی سلسلہ جنبانی حضرت خدیجہؓ کی طرف سے ہوئی۔ بات طے ہو گئی تو حضرت خدیجہؓ نے تاریخ مقرر کی اور فرمایا : "حسب دستور اپنے خاندان کے بزرگوں کے ساتھ آؤ"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم خاندان کے بزرگوں کے ساتھ تشریف لے گئے [جن میں حضرت حمزہؓ اور ابو طالب نمایاں تھے]۔ رسم نکاح کے بعد جناب ابو طالب نے خطبۂ نکاح پڑھا، جس میں رواج کے مطابق خاندان اور نوشہ (آنحضرتؐ) کی ستائش کی اور کہا : "اس کے کردار کا مقابلہ مکے کا کوئی دوسرا نوجوان نہیں کر سکتا۔ اگرچہ وہ مالدار نہیں، لیکن دولت تو آنے جانے والی چیز ہے۔ [اس کے پاس پائدار دولت ہے، یعنی امانت و دیانت" (الوفا، ۱ : ۱۴۵؛ انساب الاشراف، ۱ : ۹۷ ببعد)]۔ اس موقع پر حضرت خدیجہؓ کے رشتہ دار ورقہ بن نوفل نے اٹھ کر اس کی تائید کی (السہیلی، ۱ : ۱۲۳)۔ مہر میں اختلاف ہے : بیس اونٹنیاں (ابن ہشام : سیرۃ ۱ : ۲۰۱)، یا ساڑھے بارہ اوقیہ چاندی، یعنی پانچ سو درہم (البلاذری، انساب، ۱ : ۹۷)؛ [نیز دیکھیے السہیلی : روض الآنف، ۱ : ۱۲۰ تا ۱۲۴؛ ابن ہشام : سیرۃ، ۱ : ۱۹۸ تا ۲۰۳؛ الیعقوبی : تاریخ، ۲ : ۱۲۰ تا ۱۲۲]۔

قریب قریب اسی زمانے میں حلف الفضول [رک باں] کے مشہور معاہدے کی تجدید ہوئی۔ اس

کی تجویز زبیر بن عبدالمطلب نے اور سر پرستی عبداللہ بن جدعان نے کی۔ آنحضرتؐ نے بڑی جوش و خروش سے اس میں حصہ لیا۔ معاہدہ یہ تھا کہ اگر مکے میں کسی پر ظلم ہوا تو ہم اس کی مدد کو دوڑیں گے اور ظالم کو مکے میں نہیں رہنے دیا جائے گا۔ بعثت کے بعد بھی آپؐ فرمایا کرتے تھے: "میں نے یہ حلف اٹھایا تھا۔ اگر آج بھی کوئی اس کی دہائی دے تو میں اس کی مدد ضرور کروں گا اور قیمتی سرخ اونٹوں کی ایک قطار کے عوض بھی اس فریضے سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہوں گا"۔ اس معاہدے کو حلف الفضول اس لیے کہتے ہیں کہ اول اول اس معاہدے کا جن لوگوں کو خیال آیا تھا ان کے ناموں میں لفظ فضل (فضیلت کا مادہ) مشترک تھا (المسعودی: مروج الذہب، ۲: ۲۷۶ تا ۲۷۸؛ ابن الجوزی، الوفا، ۱: ۱۳۶ تا ۱۳۸)۔

امام احمد بن حنبل (مسند، ۳: ۲۰۶، ۲۰۷) نے دو طویل روایتیں قبیلہ عبدالقیس کے اسلام کے متعلق نقل کی ہیں۔ ان کے وفد سے جب آنحضرتؐ نے مشقّر، صفا اور ہجر نامی شہروں کے حالات پوچھے (جو مشرقی عرب میں موجودہ شہر الہفوف و مضافات سے عبارت ہیں) تو انھوں نے حیرت سے کہا کہ آپؐ تو ہمارے شہروں سے ہم سے بھی زیادہ واقف ہیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ میں نے تمہارے ملک کی طویل سیاحت کی ہے۔ [اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان مقامات کو آپؐ نے شغل تجارت کے دوران میں دیکھا تھا]۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا شام، یمن اور مشرقی عرب کی طرح آنحضرتؐ تجارت کے لئے حبشہ بھی گئے تھے؟ اس سلسلے میں وثوق سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ آغاز اسلام پر جب مخالفین کی طرف سے ایذا رسانی شدت اختیار کر گئی تو آپ نے اپنے جانثاروں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اس موقع پر آنحضرتؐ نے جعفرؓ بن ابی طالب کو نجاشی کے نام جو تعارفی خط دیا اس کے الفاظ یہ ہیں: "میں نے تمہارے پاس اپنے چچا زاد بھائی جعفرؓ بن ابی طالب کو، جس کے ساتھ چند مسلمان بھی ہیں، بھیجا ہے۔ جب وہ تمہارے پاس آئیں تو ان کی مہمانداری کیجیے" (الوثائق السیاسیة، عدد ۲۱)۔ انسانیت پروری کی اساس پر پناہ دہی کی درخواست کا ایسا دوستانہ اور ہمدردانہ انداز شاید اس استنباط کی اجازت دیتا ہے کہ نجاشی سے یا اس علاقے سے آپؐ کی پہلے سے واقفیت رہی ہو اور ممکن ہے کہ یہ واقفیت حبشہ کے تجارتی سفر کے باعث ہوئی ہو، [لیکن کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی]۔

زیدؓ بن حارثہ: عُکاظ کے میلے میں ایک نو عمر زیدؓ بن حارثہ بکنے آیا تو حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حزام نے خرید کر اپنی پھوپھی حضرت خدیجہؓ کے نذر کیا اور حضرت خدیجہؓ نے اسے آنحضرتؐ کی خدمت کے لیے مختص کر دیا۔ کچھ دنوں بعد حضرت زیدؓ کا باپ تلاش کرتے کرتے مکہ مکرمہ آ پہنچا تو آنحضرتؐ کی خدمت میں باریاب ہوا اور کہا کہ ایک ہمسایہ قبیلے نے ایک لڑائی میں میرے بیٹے کو گرفتار کر کے بیچ دیا ہے؛ ورنہ وہ آزاد اور معزز سردار قبیلہ کا بیٹا ہے؛ لہذا جو چاہو فدیہ لے لو، میں اسے آزاد کرا کے گھر لے جانا چاہتا ہوں۔ آنحضرتؐ اس کی گفتگو سے بہت متاثر ہوئے اور فرمایا کہ ایک اس سے بہتر حل ہے۔ آپؐ نے حضرت زیدؓ کو بلایا اور پوچھا کہ کیا وہ اس شخص کو جانتا ہے؟ زیدؓ نے کہا: یہ میرے والد ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: یہ تجھے واپس لے جانا چاہتے ہیں؛ اگر جانا چاہو تو میں تجھے آزاد کرتا ہوں۔ زیدؓ نے کہا: آپؐ نے اب تک میرے ساتھ ایسا مشفقانہ برتاؤ کیا ہے کہ اس سے بہتر ممکن

نہیں۔ میں باپ کے ہاں مالک کی طرح رہنے کے مقابلے میں آپؐ کے ہاں غلام رہنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس سے آنحضرتؐ بے حد متأثر ہوئے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر فوراً بیت اللہ میں تشریف لائے اور کمال مہربانی سے اعلان کیا کہ میں زید کو آزاد کرتا ہوں اور اسے اپنا متبنّٰی بناتا ہوں۔ باپ دلگیر تو ہوا، لیکن بچے کے مستقبل کے متعلق مطمئن ہو کر اپنے وطن کو لوٹ گیا [ابن ہشام: السیرۃ النبویۃ، ۱: ۲۶۳ ببعد، قاہرہ ۱۹۳۶ء].

تعمیر خانۂ کعبہ: مکے میں کعبے کے بیرونی پردوں کو بخور سے دھونی دی جاتی تھی۔ ایک دن ہوا کی شدت سے چنگاروں نے پردوں کو آگ لگا دی۔ عمارت کمزور ہو گئی تھی؛ کچھ دنوں بعد موسلا دھار بارش شروع ہوئی تو عمارت بیٹھ گئی۔ تعمیر جدید کے لیے صرف اکل حلال سے چندہ کیا گیا؛ سود خواروں اور قحبہ خانوں کے مالکوں سے رقم قبول نہ کی گئی۔ انھیں دنوں مکے کے قریب شعیبہ (جدہ) میں ایک کشتی، جو مصر سے آرہی تھی، ٹوٹ گئی۔ کچھ لوگ زندہ بچے اور کچھ سامان بھی بچایا جا سکا، جس میں شکستہ کشتی کے تختے بھی تھے۔ اہل مکہ نے ان کا سارا سامان حتّٰی کہ کشتی کے تختے بھی خرید لیے تا کہ کعبے کی چھت میں لگائیں۔ اہل مکہ نے پہلے ملبہ صاف کیا اور پرانی بنیادیں برآمد کرکے نئی دیواریں کھڑی کرنی شروع کیں۔ قبائل شہر نے کام بانٹ لیا اور ہر دیوار معین گھرانوں کے سپرد ہو گئی۔ آنحضرتؐ نے بھی اس موقع پر کام کیا؛ آپؐ پتھر اپنے کندھوں پر اٹھا کر لاتے رہے، جس سے آپؐ کے شانے زخمی بھی ہو گئے۔ چار دیواری کوئی گز بھر بلند ہوئی تو ایک دشواری پیدا ہو گئی۔ کعبے کے دروازے کے مغرب کی دیوار کے زاویے میں حجر اسود [رک باں] کو نصب کرنا تھا۔ اس اعزاز کو حاصل کرنے کے لیے رقابت شروع ہو گئی اور قریب تھا کہ خون خرابہ ہو جائے کہ ایک بوڑھے ابو امیّہ حذیفہ بن مغیرہ نے جھگڑے کو ختم کرنے کے لیے مشورہ دیا کہ اس وقت جو شخص سب سے پہلے مسجد کے دروازے سے اندر آئے، اسے حکم بناؤ۔ سب نے قبول کیا۔ اتفاق ہے یہ آنحضرتؐ ہی تھے جو کام کرنے کے لیے تشریف لا رہے تھے۔ آپؐ کو دیکھ کر سب لوگ پکار اٹھے: ھذا الامین رضینا بہ، یعنی یہ تو امین ہیں! ہم سب ان کے فیصلے پر راضی ہیں (ابن الجوزی، ص ۱۳۸)۔ قصہ سن کر آپؐ نے ایک چادر بچھائی، پتھر کو اس پر رکھا اور چادر کے کونے قبائل کے نمائندوں نے پکڑ کر اٹھائے اور دیوار کے قریب کیا۔ وہاں سے آنحضرتؐ نے [سب کی اجازت سے اور اس طرح سب کے متفقہ وکیل کی حیثیت سے] پتھر کو اٹھا کر اس کی جگہ پر نصب کر دیا (ابن ہشام، سیرہ، ۱: ۲۰۴ تا ۲۰۹؛ [نیز رک بہ کعبہ].

روحانی ریاضت سے شغف: اہل مکہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل تھے اور کہا کرتے تھے کہ بت تو اللہ تعالیٰ کے ہاں تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں اور بس (۳۹ [الزمر]: ۳)؛ چنانچہ بیت اللہ میں سیکڑوں بت جمع کر دیے گئے۔ رفتہ رفتہ بہت سے سلیم الطبع لوگوں کو اس سے تنفر پیدا ہو گیا اور ورقہ بن نوفل الاسدی، ابو سفیان الاموی، زید بن عمرو بن نفیل العدوی، قس بن ساعدہ، عبیداللہ بن جحش، عثمان بن الحویرث جیسے متعدد فطرت سلیمہ کے مالک لوگوں نے بت پرستی سے کنارہ کشی اختیار کر لی (ابن ہشام، ۱: ۲۳۸ تا ۲۴۸).

مکہ مکرمہ میں عبادت کے لیے گوشہ نشین (معتکف) ہونے کا رواج عبدالمطلب نے شروع کیا تھا؛ وہ رمضان میں مہینا بھر غار حراء میں گزارا کرتے تھے (البلاذری: انساب، ۱: ۸۴)، جس کی تقلید زید بن عمرو بن نفیل نے بھی شروع کی (کتاب مذکور،

مخطوطۂ استانبول ۲ : ۹۵۸)۔ آنحضرتؐ نے بھی غار حراء میں اعتکاف کیا۔ غار حراء مکہ مکرمہ کے مشرق میں کعبۃ اللہ سے کوئی تین میل کے فاصلے پر جبل النور کی چوٹی پر واقع ہے ۔ جب حاجی مِنٰی کو جاتے ہیں تو مِنٰی سے کچھ پہلے یہ پہاڑ ان کے بائیں ہاتھ پر نظر آتا ہے ۔ غار کا رخ قدرۃً کعبے کی سمت ہے اور متعدد چٹانوں کے ایک دوسرے پر پڑنے سے بنا ہے ۔ [عمر مبارک کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مزاج میں ایک تبدیلی یہ آئی کہ آپؐ خلوت کی تلاش میں رہتے (وکان یحبب الیہ الخلاء ، دیکھیے البخاری) ۔ اسی جستجو میں آپؐ غار حرا میں پہنچے ، جو آپؐ کو دشوار گزار راستے ، کعبہ کے سامنے ہونے ، نیز اس میں کامل تنہائی اور یکسوئی میسر ہونے کی وجہ سے پسند آیا] ۔ جب آنحضرتؐ یہاں پہلی بار گئے تو کچھ توشہ ساتھ لیا ؛ پھر آپ کا یہ معمول بن گیا کہ کچھ دنوں کے بعد گھر تشریف لاتے اور ایک آدھ دن قیام کر کے اور توشہ لے کر پھر اسی غار میں تشریف لے جاتے تھے (البخاری : الصحیح)۔ ادھر سے گزرنے والے مسافروں اور مساکین کو بھی آنحضرتؐ شریک طعام کر لیا کرتے (ابن ھشام ، ۱ : ۲۵۲ ؛ [الوفا باحوال المصطفیٰ ، ۱ : ۱۶۵]) ۔ [غار حراء میں آپؐ کی عبادت و ریاضت کو ظاہر کرنے کے لیے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں : وکان یتحنث (البخاری : الصحیح ، ۱ : ۵) ۔ تحنُّث کے معنی تعبُّد ، یعنی عبادت کرنے اور گناہوں سے بچنے کے ہیں ، مگر بقول علامہ عینی اس کے معنی غور و فکر اور عبرت پذیری کے ہیں (شرح صحیح البخاری ، باب کیف کان بدؤ الوحی) ۔ ابن الجوزی (الوفا ، ۱ : ۱۶۲) کے مطابق اس کا مفہوم متعدد راتوں کی مسلسل عبادت ہے ۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو ذہنی اعتبار سے بار نبوت اٹھانے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا ۔ اس موقع پر بار دگر شق صدر کا ذکر بھی ملتا ہے (ابن الجوزی : الوفا ، ۱ : ۱۶۶) ۔ اور یہ بھی کہ اس مقصد کے لیے آپؐ کو رویائے صادقہ کے ذریعے بشارات دی جاتیں ، مستقبل کے واقعات سے آگاہ کیا جاتا اور بہت سے مخفی حقائق میں آپؐ کی رہنمائی کی جاتی ۔ یہ سلسلہ کم و بیش چھے ماہ تک جاری رہا ۔ روایات میں ہے کہ آپؐ رات کو جو بھی خواب دیکھتے ، بیدار ہونے کے بعد صبح کی روشنی کی طرح اس کی صاف شفاف تعبیر ظاہر ہو جاتی تھی (البخاری : الصحیح ، باب کیف کان بدؤ الوحی)! علاوہ ازیں غیبی آوازیں بکثرت سنی جانے لگیں ، حتّٰی کہ آپؐ نے ایک موقع پر فرمایا : مجھے خطرہ ہے کہ کہیں میری عقل متأثر نہ ہو جائے کیونکہ میں اکثر کوئی آواز سنتا ہوں ، مگر جب دیکھتا ہوں تو وہاں کوئی نہیں ہوتا (ابن الجوزی، ۱ : ۱۶۰) ۔ مزید براں درخت اور پتھر آپؐ کو بلند آواز سے اسلام کرنے لگے ۔ اس کے علاوہ بے شمار نشانات دیکھنے میں آتے رہے (الوفا ، ۱ : ۱۶۱)]۔

بعثت مبارکہ : جب آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی عمر قمری اعتبار سے چالیس سال کی ہوئی تو روح الامین آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس آئے ۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم غار حراء میں تشریف فرما تھے ۔ اس وقت ان کے ہاتھ میں دیبا کے جزدان میں لپٹی ہوئی ایک کتاب تھی ۔ انھوں نے آپؐ سے کہا : اِقرأ (پڑھ)۔ آپؐ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا : مجھے پڑھنا نہیں آتا ۔ اس پر اس نے مجھے زور سے بھینچا! پھر مجھے چھوڑ کر کہا : پڑھ ۔ میں نے پھر وہی جواب دیا کہ مجھے پڑھنا نہیں آتا ۔ اس نے دوبارہ مجھے بڑے زور سے بھینچا ؛ پھر چھوڑ کر کہا : پڑھ ۔ میں نے پھر وہی جواب دہرایا تو اس نے تیسری مرتبہ اس زور سے بھینچا کہ میں تھک کر چور ہو گیا ۔ بعد ازاں اس نے چھوڑ کر کہا : پڑھ ۔

اس پر میں نے کہا : کیا پڑھوں ؟ اس نے کہا : اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَ رَبُّکَ الْاَکْرَمُ ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ (۹۶ [العلق] : ۱ تا ۵)، یعنی پڑھیے اپنے پروردگار کے نام سے، جو خالق ہے؛ جس نے انسان کو منجمد خون سے پیدا کیا ہے، پڑھیے کہ آپ کا رب نہایت بزرگ، کرم والا، ہے جس نے قلم کے ذریعے سے تعلیم دی، اس نے انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہ جانتا تھا۔ جب تکمیل ہوگئی تو وہ چلے گئے اور یہ عبارت میرے ذہن میں نقش ہوگئی (ابن سعد : الطبقات، ۱ : ۱۹۴ ببعد، بیروت ۱۹۶۰ء؛ ابن ہشام : سیرۃ، ۱ : ۲۵۱ تا ۲۵۴، مطبوعہ قاہرہ) ۔ البلاذری (انساب، ۱ : ۱۱۱) کے مطابق، وضو اور نماز کا طریقہ بھی اس کے ساتھ ہی حضرت جبریلؑ نے آپؐ کو سکھایا۔ آپؐ سخت گھبراہٹ کے عالم میں گھر تشریف لائے : حضرت خدیجہؓ سے فرمایا : مجھے کمبل اڑھاؤ۔ جب طبیعت سنبھلی تو حضرت خدیجہؓ کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔

[مختلف روایتوں پر بحث و تمحیص کے بعد علامہ السہیلی (روض الانف، ۱ : ۱۵۶ و ببعد) نے خلاصہ یہ نکالا ہے کہ اولاً بشارت نبوت خواب میں بوقت شب ہوئی، پھر بحالت بیداری میں نزول قرآن کا آغاز ہوا۔ علامہ قسطلانی (المواہب مع شرح الزرقانی، ۱ : ۲۰۷، قاہرہ ۱۳۲۰ھ) نے علامہ ابن البّر کے حوالے سے بروز دو شنبہ ربیع الاول اور ابن القیم (زاد المعاد) کے حوالے سے ۱۷ رمضان المبارک کو نزول قرآن کی روایت کی ہے۔ اس کی شرح میں الزرقانی نے لکھا ہے کہ ربیع الاول سے رمضان المبارک تک صرف خوابوں (رویائے صالحہ) میں بشارات نبوت دی جاتی رہیں۔ گویا نزول قرآن کے لیے ذہنی طور پر آپؐ کو تیار کیا جاتا رہا اور ۱۷ رمضان المبارک کو نزول قرآن کا آغاز ہوا (نیز دیکھیے شرح سفر السعادۃ ! سلیمان منصور پوری : رحمۃ للعالمین، ۱ : ۴۷، مطبوعہ لاہور.

حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو تسلی دیتے ہوئے کہا : بخدا ! اللہ آپؐ کو رسوا (یا ضائع) نہیں کرے گا کیونکہ آپؐ تو صلہ رحمی کرنے والے، صداقت شعار اور راستباز، دوسروں کا بار اٹھانے والے، محتاجوں کی مدد کرنے والے، مہمان نواز اور مصائب میں دوسروں کے مددگار ہیں (البخاری : الصحیح، ۱ : ۵، مطبوعہ لائیڈن) ۔ آپؐ کی رفیقۂ حیات کی یہ گواہی، آپؐ کے کردار کی عفت، آپؐ کے اخلاق کی بلندی اور آپؐ کے محاسن کی بڑائی کی روشن دلیل ہے۔ انسان دوسروں سے تو چھپا رہ سکتا ہے، مگر رفیق زندگی سے نہیں۔ حضرت خدیجہؓ کے ان الفاظ میں ان کے پندرہ سالہ عینی مشاہدات کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے]۔ اس کے بعد حضرت خدیجہؓ آپؐ کو اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، جو عیسائی عالم تھے ۔ البخاری (الصحیح، ۱ : ۵) کے مطابق اس نے قصہ سنا تو پکار اٹھا کہ یہ تو وہی ناموس اعظم ہے جو حضرت موسیٰؑ پر اللہ کی طرف سے نازل ہوا تھا (ناموس Namos یونانی لفظ ہے، جس کے معنے قانون کے ہیں اور لفظ تورات کا ترجمہ یونانی میں اسی لفظ سے کیا جاتا ہے) ۔ البلاذری (انساب الاشراف، ۱ : ۱۰۶) کے مطابق ورقہ نے [ایک دوسرے موقع پر] یہ بھی اضافہ کیا : میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ وہی نبیؐ ہیں جن کی حضرت عیسیٰؑ نے بشارت دی تھی۔ کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں [جب کہ قوم آپؐ کو ستائے گی اور آپؐ کو اپنے شہر سے نکال دے گی، تاکہ آپؐ کی بھرپور مدد کروں۔ آپؐ نے فرمایا : کیا سچ مچ میری قوم مجھے اپنے شہر سے نکال دے گی ؟ اس پر ورقہ بن نوفل نے کہا : بخدا ! آج تک جو بھی اس دعوت کو لے کر آیا ہے اس کے ساتھ اس کی قوم نے یہی سلوک کیا ہے (البخاری : الصحیح، ۱ : ۵)؛ پھر جلد ہی ان کی وفات ہوگئی]۔

اس کے بعد وحی میں تین سال تک فترت یعنی

وقفہ پڑ گیا۔ اس وقفے کے دوران میں بعض اوقات آپؐ اس کے اعادے کی خواہش کے باعث بے چین اور بے قرار ہو جاتے تو افق آسمان پر دوبارہ اسی ناموس اعظم کی جھلک نظر آ جاتی جو آپؐ کو یقین دلاتا کہ آپؐ یقیناً اللہ کے رسول ہیں اور وہ جبریلؑ ہیں (ابن سعد: الطبقات، ۱: ۱۹۶، مطبوعہ بیروت)۔ تین سال کے اس انقطاع کے بعد وحی مسلسل آنے لگی.

[اسلام کی دعوت و تبلیغ اور السابقون الاولون: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو جب نبوت سے نوازا گیا تو آپؐ نے سب سے پہلے ان لوگوں کو تبلیغ فرمائی جو کہ آپؐ کے ساتھ ذاتی روابط اور تعلقات رکھتے تھے۔ آپؐ کو اپنے ان قریبی رفقا کی طرف سے مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ عورتوں میں آپؐ کی زوجۂ مطہرہ حضرت خدیجہؓ، غلاموں میں آپؐ کے جانثار خادم حضرت زیدؓ بن حارثہ، مردوں میں آپؐ کے وفادار رفیق حضرت ابوبکرؓ، چھوٹی عمر کے لڑکوں میں آپ کے عم زاد حضرت علیؓ نے پہلے پہل اسلام قبول کیا (الیعقوبی: تاریخ، ۲: ۲۲ تا ۲۳، بیروت ۱۹۶۰ء)۔ حضرت عمرو بن عبسہ السلمی اور خالد بن سعید بن العاصی نے بھی اسی ابتدائی عرصے میں اسلام قبول کیا (جوامع السیرۃ، ص ۴۴)۔ خفیہ دعوت و تبلیغ کا یہ سلسلہ تقریباً تین سال تک جاری رہا۔ اسی عرصے میں حضرت ابوبکرؓ کی تبلیغی کوششوں سے حضرت بلالؓ بن رباح، حضرت عثمانؓ بن عفان، زبیرؓ بن العوام، عبدالرحمنؓ بن عوف، سعدؓ بن ابی وقاص، طلحہؓ بن عبیداللہ وغیرہ کئی حضرات نے اسلام قبول کیا (ابن ہشام، ۱: ۲۶۲ تا ۲۶۹؛ دوسرے حضرات کے ناموں کے لیے دیکھیے حوالۂ مذکور، ۲۶۹ تا ۲۸۰؛ [ابن سید الناس: عیون الاثر، ۱: ۹۱ ببعد؛ ابن کثیر: السیرۃ النبویۃ، ۱: ۴۳۲ ببعد؛ المقریزی: الامتاع، ص ۱۵؛ تاریخ الخمیس، ۲۸۶ ببعد)].

ابتدا میں تبلیغ سینہ بہ سینہ اور محدود حلقۂ احباب میں ہوتی رہی۔ پھر وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (۲۶ [الشعراء]: ۲۱۴) یعنی اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیے کی آیت نازل ہوئی، جو سماجی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے ناگزیر تھی تو آنحضرتؐ نے بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کو کھانے پر مدعو کیا اور سب لوگوں کو اسلام کی دعوت دی۔ ابو لہب کو آنحضرتؐ سے کد تھی، اس نے اس موقع پر بد زبانی سے جلسہ درہم برہم کر دیا... صرف حضرت علیؓ نے کھڑے ہو کر اپنی جانثاری کا اعلان فرمایا (الطبری، ۱: ۱۱۷۲ ببعد).

دعوت عام: جب خفیہ تبلیغ سے کسی قدر اسلام پھیل گیا تو حکم آیا: فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ (۱۵ [الحجر]: ۹۴)، یعنی آپؐ کو جو حکم دیا جاتا ہے وہ برملا بیان کر دیجیے اور مشرکوں سے کنارہ کش رہیے۔ [اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے آواز دے کر تمام اہل مکہ کو کوہ صفا کے نیچے جمع کر لیا۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو اول آپؐ نے پوچھا کہ اگر میں تمھیں بتلاؤں کہ اس پہاڑی کی دوسری جانب ایک لشکر جرار تم پر یلغار کرنے والا ہے تو کیا تم مان لو گے؟ سب نے تصدیق کی تو آپؐ نے مکہ مکرمہ میں آباد ایک ایک قبیلے کا نام لے کر فرمایا کہ مجھے اللہ نے تمہاری طرف عذاب شدید سے ڈر سنانے کے لیے مامور کیا ہے۔ لہذا اگر تم دونوں جہانوں کی کامیابی چاہتے ہو تو پڑھو لا الہ الا اللہ (ابن سعد: الطبقات، ۱: ۲۰۰، بیروت ۱۹۶۰ء)۔ اس موقع پر بھی ابو لہب نے بد زبانی کی، جس کا جواب قرآن مجید (۱۱۱ [ابی لہب]) میں دیا گیا].

اس اعلان عام کے بعد آنحضرتؐ کا طریقۂ تبلیغ یہ رہا کہ جہاں بھی کچھ لوگ نظر آتے، آپؐ ان کو مخاطب کر کے قرآن کی کچھ آیتیں پڑھتے اور طرح

طرح سے اسلام کی دعوت دیتے ۔ اس ابتدائی زمانے میں توحید باری، نبوت اور حساب آخرت پر خاص طور پر زور دیا جاتا تھا اور اسی طرح اخلاق صالحہ اور نیکوکاری پر بھی۔ [اسی ابتدائی دور میں نماز کا حکم بھی نازل ہو چکا تھا ۔ بقول شیخ عبدالحق محدث دہلوی (مدارج النبوۃ، اردو ترجمہ، ۱: ۳۸۸، مطبوعۂ کراچی) اس موقع پر ایمان توحید کے بعد عبادات میں سب سے پہلے دو رکعت نماز فرض ہوئی، جس کی حضرت جبریلؑ نے آپؐ کو تعلیم دی ۔ مقاتل کا قول ہے کہ اولاً دو رکعت نماز فجر اور دو رکعت نماز عشاء فرض ہوئی۔ حافظ ابن حجر (فتح الباری، کتاب الصلوۃ) فرماتے ہیں کہ اس پر تو اتفاق ہے کہ واقعۂ معراج سے قبل بھی آپؐ اور صحابہؓ نماز ادا فرمایا کرتے تھے، مگر یہ نمازیں کون کونسی تھیں، اس میں کچھ اختلاف ہے ۔ بعض علما کے نزدیک صرف فجر اور عصر کی دو نمازوں کا سب سے پہلے حکم ہوا ۔ امام نوویؒ (شرح مسلم) کے مطابق پہلی نماز جو آپؐ پر مرحلۂ تبلیغ و دعوت کے بعد فرض ہوئی وہ رات کی نماز، یعنی قیام اللیل ہے، جیسا کہ سورۃ مزمل اور سورۃ مدثر کی ابتدائی آیات سے مترشح ہوتا ہے ۔ البلاذری (انساب، ۱: ۱۱۰) نے بھی دو روایات اس مضمون کی نقل کی ہیں جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپؐ کو ابتدائے وحی کے فوراً بعد وضو اور نماز کی تعلیم دی گئی] ۔ ہر نیا مسلمان اپنی جگہ ایک مبلغ بن کر اپنے حلقے میں تبلیغ شروع کر دیتا ۔ مرد اور عورتیں دونوں اس کام میں جوش و خروش سے شریک تھے (ابن سعد، ۱: ۲۰۰ ببعد).

ایذا رسانی : جب مکہ مکرمہ میں اسلام کی اشاعت ہونے لگی اور لوگ مسلمان ہونے شروع ہو گئے، جن میں بالخصوص نوجوان زیادہ تھے، تو ان کے بڑوں کو بہت دکھ ہوا کہ ہماری اجازت اور مرضی کے بغیر یہ کیوں پرانے قومی دین سے برگشتہ ہو گئے ہیں ۔ اپنے ان نو عمر رشتہ داروں کو ان لوگوں نے طرح طرح سے ایذائیں دیں : مارا پیٹا، بیڑیاں لگا کر قید کیا، بے چھت کے کمروں میں بند کیا، تپتی ہوئی ریت پر برہنہ بدن گھسیٹا، مگر یہ اذیتیں بے اثر رہیں ۔ ان لوگوں میں آزاد مرد اور عورتیں ہی نہیں بلکہ لونڈی غلام بھی تھے جنہیں ان کے مالکوں نے شدید تکلیفیں دیں ۔ اسی طرح موالی، یعنی غیر قبیلوں کے عرب بھی تھے، جو اہل مکہ میں سے کسی ایک کے ساتھ کسی معاہدے کے ذریعے حلیفی (موالی) بن گئے تھے ۔ ان میں سے ایک حضرت عمار بن یاسرؓ کا خاندان بھی تھا، جس نے اپنے گھر میں ایک مسجد بنا لی تھی، جو اسلام میں اولین مسجد کہی جاتی ہے (السہیلی : روض الانف، ۲: ۱۳۱؛ [انساب، ۱: ۱۶۲] ؛ ابن کثیر : البدایۃ والنہایۃ، ۷: ۲۱۱) ۔ [اس خاندان یعنی آل یاسر کو خاص طور پر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا ۔ حضرت یاسرؓ پر اتنا تشدد کیا گیا کہ وہ شہید ہو گئے ۔ حضرت سمیہؓ کو ابو جہل نے نیزہ مار کر شہید کر دیا (انساب، ۱: ۱۶۰)] ۔ باہر سے آنے والے سیاحوں اور مسافروں میں سے بھی کچھ مسلمان ہوئے ۔ ان میں بعض نصرانی بھی تھے (ابن ہشام : سیرۃ، ص ۲۵۹، ۲۵۲).

تحریر و ضبط قرآن : جب مسلمانوں کی تعداد بیس پچیس ہو گئی تو نازل شدہ سورتوں کی تحریر و کتابت عمل میں آنے لگی.

کتب سابقہ کے برعکس خدا کے آخری نبی نے کتاب اللہ کے تحفظ کے لیے ابتدا ہی سے تحریری اشاعت کا بندوبست کیا ۔ امت میں قرآن مجید کی اشاعت کا جو طریقہ تھا، اس کے سلسلے میں ابن اسحٰق (مخطوطہ فاس؛ نسخہ زیر طبع، ص ۱۹۲) کی یہ روایت اہم ہے : اذا انزل القرآن علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم قرأہ علی الرجال ثم علی النساء، یعنی جب بھی آپؐ پر کوئی آیت قرآنی نازل ہوتی تو آپؐ اسے اولاً مردوں

کو پڑھ کر سناتے ، پھر عورتوں کو ۔ عام تعلیم قرآن ہی نہیں ، خود زنانہ تعلیم قرآن کو آپؐ جو اہمیت دیتے تھے وہ خاص طور سے مد نظر رہے ؛ مگر صرف سنانا کافی نہ تھا ، زبانی یاد کرانا بھی ضروری تھا ۔ اس کے لیے آنحضرتؐ اپنے کسی کاتب کو بلا کر خود املا کراتے ، پھر اس سے پڑھوا کر سنتے اور ضرورت پر تصحیح کراتے ۔ آپؐ نے حکم دیا تھا تھا کہ اس کے نسخے ہر مسلمان اپنے گھر میں رکھے ، اس کو زبانی یاد کر کے نمازوں میں ہر روز پڑھا کرے اور یہ کہ زبانی یاد کرنے سے پہلے قرآن کی صحیح عبارت کی تعلیم خود آنحضرتؐ سے یا اس شخص سے پائے جسے آنحضرتؐ نے تعلیم قرآن کی اجازت دی ہو ۔ لکھنا ، مستند استاد سے پڑھنا اور زبانی یاد کرنا ، اس سہ گانہ تدبیر کا اہتمام ، ابتدائے اسلام ہی سے شروع ہو گیا تھا ۔ اس کے علاوہ آنحضرتؐ ہر سال رمضان المبارک میں نازل شدہ قرآن کا حضرت جبریلؑ سے دور فرماتے تھے (فیدارسہٗ القرآن)۔ بعض روایتوں کے مطابق آپؐ رمضان المبارک ہی میں قرآن مجمع عام میں پڑھتے اور لوگ اپنے اپنے نسخے لا کر تصحیح کر لیتے اور اس وقت تک نازل شدہ قرآن سے آگاہی حاصل کرتے ۔ یہ عمل "عرضۃ" کہلاتا ۔ عرضۂ اخیرہ کی بڑی شہرت ہے کہ یہ وفات سے چھے ماہ پہلے ہوا اور اس مرتبہ ایک کی جگہ دو مرتبہ آپؐ نے پورا قرآن پڑھ کر سنایا (البخاری : الصحیح ، کتاب ۱ ، باب ۱ ، ص ۶ ، حدیث ۵ ؛ محمد حمید اللہ : دیباچہ فرانسیسی ترجمۂ قرآن مجید) .

ایذا رسانی میں شدت : جلد ہی قرآن کریم میں بت پرستی کی مذمت میں شدت آ گئی اور اعلان کیا گیا کہ : اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ (۲۱ [الانبیاء] : ۹۸) ؛ یعنی بے شک تم اور وہ بت جن کی تم اللہ کے سوا پوجا کرتے ہو سب دوزخ کا ایندھن ہوں گے اور تم سب اس میں داخل ہو کر رہو گے ۔ اس پر غیر مسلموں کی طرف سے ایذا رسانی میں بھی شدت آ گئی ، آنحضرتؐ کی ذات کے خلاف بھی اور حلقۂ اسلام میں داخل ہونے والوں کے خلاف بھی ۔

ابو جہل [رک بآں] یوں تو چھپ کر قرآن سنا کرتا ، مگر اسے یہ دکھ تھا کہ اس کا اپنا قبیلہ (بنو امیہ) ، جو سخاوت وغیرہ میں کبھی آنحضرتؐ کے قبیلہ بنو ہاشم سے پیچھے نہ رہا تھا ، اب بنو ہاشم کے فخر نبوت کا مقابلہ نہیں کر سکتا ! [اس نے اس کا جواب یوں دیا] کہ میں آنحضرتؐ کی نبوت ہی کو نہیں مانوں گا ، اگرچہ وہ جو کچھ تعلیم دیتے ہیں وہ ٹھیک ہی ہے (ابن ہشام : سیرۃ ، ۱ : ۲۳۷ ببعد) ۔ اسی زمانے میں ایک اجنبی کچھ اونٹ بیچنے مکہ مکرمہ آیا ۔ ابوجہل نے کم مول پر اس سے وہ اونٹ ہتھیا لینے چاہے اور دوسروں کو بھی منع کر دیا کہ زائد رقم پیش نہ کریں ۔ اس کی بدخلقی سے بچنے کے لیے اور مقامی خریدار تو چپ ہو گئے لیکن جب اجنبی نے آنحضرتؐ کو اپنا دکھ سنایا تو آپؐ نے معقول قیمت پر ان کو خرید لیا (البلاذری : انساب ، ۱ : ۱۳۰) ۔ اس پر ابو جہل چھچھورے پن پر اتر آیا ۔ ایک دن کسی جگہ اونٹ ذبح ہوا تھا ۔ ابو جہل نے عقبہ بن ابی معیط کو بھیجا کہ جا کر اوجھڑی اٹھا لائے اور جب آنحضرتؐ کعبے کے سامنے سجدے میں جائیں تو وہ آپ کی پیٹھ پر رکھ دے ۔ یہ اتنی بوجھل تھی کہ آپ سجدے سے سر نہ اٹھا سکے ۔ حضرت فاطمہؓ بچی تھیں ۔ اطلاع ملی تو دوڑی آئیں اور نہ صرف غلیظ بوجھ کو دور کیا [بلکہ ابو جہل کو ملامت بھی کی (انساب ، ۱ : ۱۲۵)] ۔ ابن الجوزی (المجتبیٰ من المجتنیٰ ، مخطوطہ) نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ اس پر ابو جہل نے ننھی بچی کو زور سے طمانچہ مارنے سے بھی دریغ نہ کیا ، جس

سے حضرت فاطمہؓ رونے لگیں (البلاذری : انساب ۱ : ۱۶۰)۔

ایک دن آنحضرتؐ بیت اللہ شریف کے سامنے نماز پڑھ رہے تھے کہ عُقبہ بن ابی مُعَیط نے اپنی چادر کو لپیٹ کر حضورؐ کی گردن میں گرہ ڈالی اور اس شدت سے بل دیے کہ حضورؐ کا دم گھٹنے لگا۔ بعض نیک دل حاضرین نے آپ کو اس سے چھٹکارا دلایا (السہیلی ، ۱ : ۱۸۴ ؛ [الوفا : ۱۹ ؛ ابن کثیر : السیرۃ النبویۃ ، ۱ : ۴۷])۔

(ابو لہب کی بیوی) ام جمیل آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی چچی ہونے کے باوجود درختوں کی ٹہنیاں لاتی اور آنحضرتؐ کے راستے میں ڈال دیتی۔ جب آنحضرتؐ رات کو اندھیرے میں گھر آتے تو آپؐ اس سے تکلیف اٹھاتے (ابن ہشام ، ۱ : ۳۸۱ ؛ السہیلی ، ۱ : ۱۸۴)۔ خود ابو لہب آپؐ کے مکان کے دروازے پر اور راستے میں گندگی اور غلاظت پھینک دیتا۔ ایک دن آپ کے دوسرے چچا حضرت امیر حمزہؓ نے دیکھ کر ملامت کی اور اس کے ساتھ اس کی لائی ہوئی غلاظت اس کے سر پر انڈھیل دی۔ اب ابو لہب نے دوسروں کو اجرت دے کر اس کام کے جاری رکھنے پر مامور کیا (البلاذری : انساب ، ۱ : ۱۳۱ ، ۱۳۷)۔

بارہا [رؤسائے قریش کی شہ پر قریشی آوارہ مزاج لونڈے] رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو راستے میں پتھر مارتے اور آپ کا مذاق اڑاتے اور طرح طرح سے تنگ کرتے۔ اگر کبھی اتفاق سے یہ اس جگہ پیش آتا جہاں ابو سفیان کا مکان تھا تو آپؐ پناہ لینے کے لئے اس کے گھر میں گھس جاتے اور یہ شریف دشمن لونڈوں کو گھورک کر دفع کرتا ، اور جب وہ جا چکتے تو آنحضرت اپنا راستہ لیتے۔ ہمارا مآخذ (ابن الجوزی) یہ اضافہ کرتا ہے کہ فتح مکہ کے دن کی منادی "جو ابو سفیان کے گھر میں چلا جائے تو اسے امن ہوگا" اس کی شکر گزاری میں تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرح صحابہ کرامؓ اور صحابیات صالحاتؓ کو بھی سخت اذیتیں پہنچائی جاتی رہیں۔ حضرت بلال حبشیؓ، حضرت صہیبؓ رومی ، حضرت عمّار بن یاسرؓ ، حضرت خباب بن الارتؓ اس کی واضح مثالیں ہیں (البلاذری : انساب ، ۱ : ۱۵۶ تا ۱۹۸)۔ خواتین میں حضرت لُبَینہؓ ، حضرت ام عُبَیسؓ ، حضرت سُمَیّہؓ (ام عمار) وغیرہ لونڈیاں بھی ہر اذیت کو جھیلتیں لیکن زبان پر کلمہ کفر نہ لاتیں۔ اس سے کہنا پڑتا ہے کہ آزاد مردوں عورتوں کا ہی نہیں غلاموں اور لونڈیوں کا بھی روحانی معیار اور ذہنی حوصلہ بہت بلند تھا اور انہیں اپنی مادی ہی نہیں روحانی زندگی سے بھی بے پناہ دلچسپی تھی : بعض لونڈی غلاموں کو ناقابل برداشت اذیت سے بچانے کے لئے حضرت ابوبکرؓ وغیرہ [نے ان کو خرید خرید کر آزاد کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت بلالؓ، عامر بن فُہَیرہؓ ، لبینہؓ، زِنّیرہؓ ، نَہدیہؓ ، ام عُبَیسؓ کو بھاری داموں پر خریدا اور آزاد کر دیا (شبلی ، ۱ : ۲۳۲)]۔

لیکن جلد ہی یہ نا ممکن ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم امن و سکون سے مکے میں کوئی تبلیغی کام کر سکیں۔ اس لئے آپؐ مضافات تشریف لے جانے لگے ، خصوصاً حج کے لیے جو اجنبی یہاں وارد ہوتے آپؐ ان کو اسلام کی تبلیغ فرماتے۔ ابو لہب کو آپؐ سے اتنی کد اور عداوت ہو گئی تھی کہ ہر جگہ آپؐ کے پیچھے پیچھے جاتا اور جب بھی آپ کسی سے مخاطب ہوتے تو شور مچا دیتا اور غلط سلط باتیں کر کے اس اجنبی کو بات سننے سے روک دیتا (ابن ہشام ، سیرۃ ، ۱ : ۳۸۶ ، ۳۸۰)۔ بعثت پر تقریباً پانچ سال گزرے تھے۔ چالیس پچاس آدمی مسلمان بھی ہو گئے تھے ، لیکن ایذا رسانی اتنی شدید

ہو گئی تھی کہ آنحضرتؐ ایک مخلص مسلمان حضرت ارقم بن ابی ارقم [رک بان] کے گھر میں، (جو جبل صفا کے سامنے تھا، لیکن اب مسجد کعبہ کی توسیع کے باعث وہ حرم کے اندر آ گیا ہے) مجلس لگانے لگے۔ مسلمانوں کو اس مرکز کی اطلاع تھی؛ چنانچہ اگر کوئی اجنبی مسلمان ہونے کے لئے آتا تو اہل اسلام اس کو بھی بیت الارقم پہنچا دیا کرتے تھے۔ بیت الارقم اتنا کشادہ تھا کہ اس میں تیس آدمی آنحضرتؐ کے ساتھ نماز با جماعت پڑھ سکتے تھے۔

قریش کی معاندانہ تدبیریں: قریش کو جب اس طرح مخالفت کر کے کامیابی نہ ہوئی تو انہوں نے اس مقصد کے لئے بالواسطہ طریقے اختیار کئے۔ [چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو] روپے پیسے، خوبصورت لڑکیوں، حتیٰ کہ مکے کی بادشاہت کی لالچ دلائی صرف ایک شرط پر کہ آپؐ ان کے بتوں کو برا نہ کہیں۔ آنحضرتؐ نے ان کے جواب میں سورۂ ۴۱ [حٰمٓ السجدہ] کی آیات سجدہ تلاوت فرمائیں۔ پھر فرمایا: اے ابو ولید! جو کچھ تم نے سنا یہی اس کا جواب ہے (ابن ہشام: سیرۃ النبویۃ، ۱: ۳۱۳ تا ۳۱۴)۔ پھر ایک مرتبہ یہ کہا کہ ہم سب تمہارے رب پر ایمان لانے کو تیار ہیں، لیکن تو بھی ہمارے بتوں پر ایمان لا۔ [اس کے جواب میں سورۂ ۱۰۹ (کافرون) [رک بان] نازل ہوئی]۔ جب ہر طرف سے ہار گئے تو [ابو جہل، عتبہ، شیبہ وغیرہ سرداران قریش] جناب ابوطالب کے پاس پہنچے اور کہا کہ ہم تمہاری بڑی عزت کرتے ہیں، لیکن تمہارا بھتیجا [ہمارے بتوں کو برا بھلا کہتا ہے، ہمارے دین میں کیڑے ڈالتا ہے، ہمارے داناؤں کو بے وقوف اور بزرگوں کو گمراہ ٹھیراتا ہے۔ اور] باپ بیٹے، بہن بھائی، میاں بیوی میں تفرقہ ڈال کر ناقابل برداشت فساد پھیلا رہا ہے۔ اسے روکو؛ تمہاری خاطر ہم نے اب تک اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی؛ اگر تم نہ روکو گے تو ہم مجبور ہو جائیں گے کہ جبراً اسے چپ کرائیں۔ [اس موقع پر ابوطالب بھی اپنی قوم کی شدید مخالفت سے گھبرا گئے۔ اور آپؐ کو بلا کر ساری بات بیان کر دی اور اپنی کمزوری اور ضعف کا واسطہ دیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ بخدا! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں پر چاند بھی رکھ دیں اور مجھے اس تبلیغ سے روکیں تو میں ہرگز نہیں رکونگا، تاآنکہ یا تو یہ دین غالب ہو جائے یا میں جان کھو دوں۔ یہ کہتے ہوئے آپؐ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ابو طالب بھی متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور دوبارہ اپنی مدد کی آپؐ کو یقین دہانی کرائی (ابن ہشام: سیرۃ، ۱: ۲۸۳ تا ۲۸۵)]۔ اس کے بعد پھر ایک مرتبہ قریش نے یہ تجویز پیش کی کہ محمدؐ کو ہمارے سپرد کر دو؛ ہم اسے قتل کر کے ملک کو فساد سے نجات دلانا چاہتے ہیں اور اس کے معاوضے میں جس خوبصورت عقلمند مکی نوجوان کو چاہو چن لو، ہم وہ تمہیں دے دیں گے کہ اسے متبنٰی بنا لو۔ ابو طالب نے پر لطف جواب دیا کہ یہ تو انصاف نہیں کہ تم تو میرے بیٹے کو قتل کر دو اور میں تمہارے بیٹے کو ساری عمر کھلاؤں پلاؤں (حوالہ مذکور).

حضرت حمزہؓ کا قبول اسلام: آنحضرتؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کو شکار کا بہت شوق تھا۔ ایک دن شکار سے واپسی پر ان کی لونڈی نے ان کو بتایا کہ آج تمہارے بھتیجے محمدؐ کو ابو جہل نے غیر معمولی طور پر سخت تکلیف دی ہے۔ حمیت میں آ کر سیدھے ابو جہل کے پاس پہنچے۔ اپنی فولادی کمان سے اس پر وار کر کے اسے زخمی کیا اور کہا کہ کیا تو سمجھتا ہے کہ محمدؐ کا کوئی چچا، کوئی محافظ نہیں؟ سن لو، میں بھی مسلمان ہو گیا ہوں (ابن ہشام، ۱: ۳۱۱ ببعد)۔ [بعد ازاں

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر کے مسلمانوں میں شامل ہو گئے۔ ایک روایت کے مطابق یہ واقعہ ۶ نبوت کا ہے (السہیلی: روض الانف، ۱: ۱۸۵؛ [نیز رک بہ حمزہؓ])۔

حضرت عمرؓ کا قبول اسلام: حضرت عمرؓ فاروق کو بھی شروع میں اسلام اور اہل اسلام سے بے وجہ عداوت تھی؛ [چنانچہ وہ بھی دوسرے مشرکین کی طرح] اسلام لانے والوں کو ستاتے، لیکن جب دیکھا کہ ہر طرح کی ایذا رسانی کے باوجود اسلام پھیلتا ہی جا رہا ہے تو ایک دن ایک خطرناک فیصلہ کیا کہ (معاذ اللہ) آنحضرتؐ کو ہی قتل کر دیں۔ ہتھیاروں سے لیس ہو کر وہ آنحضرتؐ کی تلاش میں نکلے۔ راستے میں نُعیمؓ بن عبداللہ (جو ایک مسلمان تھے) ملے۔ ان کا خطرناک ارادہ سن کر کہا: عمر! پہلے اپنے گھر کی خبر لو: تمہاری بہن اور بہنوئی دونوں مسلمان ہو چکے ہیں۔ لہذا بنی ہاشم کے طاقتور قبیلے سے جنگ مول لینے سے پہلے اپنے کنبے کو تو درست کرو۔ فوراً بہن کے گھر گئے۔ تلاوت قرآن کریم کی آواز سنی تو صحت کا یقین ہو گیا اور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ گھر میں ایک معلم قرآن حضرت خبابؓ بن الارت ان کو قرآن کریم پڑھا رہے تھے۔ ان کی بہن حضرت فاطمہؓ نے قرآن کے اوراق چھپا لیے۔ بہنوئی نے دروازہ کھولا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کیا پڑھ رہے تھے؟ مجھے دکھاؤ اور اس کے ساتھ ہی اپنے بہنوئی حضرت سعیدؓ بن زید کو مارنا شروع کر دیا۔ بہن نے چھڑانے کی کوشش کی تو ایک آدھ گھونسا انہیں بھی لگ گیا اور شاید منہ سے خون بہنے لگا۔ اب بہن نے جوش میں آ کر فرمایا جو چاہو کر لو؛ ہم مسلمان ہو گئے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے بہن کو زخمی دیکھا تو شرمندہ ہوئے اور نرمی سے کہنے لگے کہ مجھے بتاؤ تم کیا پڑھ رہے تھے؟ حضرت عمرؓ اب بالکل پگھل گئے اور کہا میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں تمہارا دین کیا ہے؟ حضرت فاطمہؓ نے جوش کے عالم میں تلخ ترش باتیں کیں۔ پھر فرمایا: جاؤ پہلے غسل کر کے آؤ چنانچہ بعد از غسل حضرت عمرؓ نے اس صحیفہ مقدسہ سے سورۂ طٰہٰ [رک بآں] یا سورۂ حدید [رک بآں] (عبدالحق محدث دہلوی: مدارج النبوت، ۸۵ بعد) کی کچھ آیات پڑھیں تو ان کی کایا پلٹ گئی اور کہا یہ تو بڑی دلآویز چیز ہے۔ بتاؤ مسلمان کس طرح ہوتے ہیں؟ اب استاد حضرت خبابؓ بھی بازو کے کمرے سے نکلے اور کہا: اے عمر! کل ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سام نے اللہ سے دعا کی تھی کہ اے اللہ! ابو جہل یا عمر سے اسلام کو تقویت دے۔ خوشخبری ہو کہ یہ سعادت تمہارے حصے میں آئی ہے۔ پھر وہ حضرت عمرؓ کو ساتھ لے کر بیت الارقم آئے۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر حضرت عمرؓ کو دیکھ کر اندر والوں کو ہچکچاہٹ ہوئی، مگر آنحضرتؐ نے فرمایا: دروازہ کھول دو۔ جب حضرت عمرؓ اندر آئے تو آنحضرتؐ نے کپڑے سے پکڑ کر جھنجوڑا اور فرمایا: عمر تم کس ارادے سے آئے ہو؟ حضرت عمرؓ نے فوراً کلمۂ شہادت پڑھا۔ یہ اتنا اچانک اور غیر متوقع امر تھا کہ موجود صحابہؓ کے بے ساختہ نعرۂ تکبیر سے پورا علاقہ گونج اٹھا۔ [آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا یہ معمول تھا کہ جب کوئی اچانک غیر متوقع معاملہ پیش آتا تو اس پر تکبیر (اللہ اکبر) فرماتے۔ آپ کا یہ معمول خالصۃً اللہ کی توحید اور عظمت خداوندی کے اظہار کے لیے تھا۔ ایسا ہی حضرت عمرؓ کے اسلام لانے پر ہوا]۔ پھر حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! کفر تو اپنا مظاہرہ علانیہ کرتا ہے، مگر ہم دین حق کے باوجود اس کا اخفا کیوں کریں؟ اس پر وہاں موجود تیس چالیس آدمی قطار باندھ کر نکلے۔ سب لوگ حرم کعبہ میں

پہنچے اور با جماعت نماز ادا کی۔ کسی کافر کو ہمت نہ ہوئی کہ حضرت عمرؓ کو دعوت مبارزت دے (ابن ہشام، سیرۃ ۱ : ۳۶۶ تا ۳۷۵)۔ ایک دوسری روایت (حوالۂ مذکور) میں ہے کہ انہوں نے چھپ کر آنحضرتؐ کو تلاوت قرآن کریم کرتے سنا جس سے ان کے دل پر اثر ہوا اور وہ مسلمان ہوگئے۔ البخاری (مناقب الانصار، ۶۳ : ۳۵ : ۱۸) میں بھی حضرت عمرؓ کے قبول اسلام کے بارے میں ایک روایت ہے۔ ان میں پہلی روایت ہی مشہور و مقبول ہے [نیز رک بہ عمرؓ ؛ السہیلی : روض الانف، ۱ : ۲۷۳ ببعد].

ہجرت حبشہ اولیٰ ۵ نبوی : مکے میں مسلمانوں پر مظالم روز افزوں دیکھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک دن ان سے فرمایا کہ اگر ممکن ہو تو تم لوگ حبشہ چلے جاؤ؛ وہاں ایک نیک دل حکمران ہے جس کے ہاں حق کا پاس ہوتا ہے اور کسی پر ظلم نہیں ہوتا؛ وہاں رہو تا آنکہ خدا تمہارے لیے چھٹکارے کی کوئی صورت پیدا کر دے (ابن ہشام، ۱ : ۳۴۳)۔ گیارہ [یا بارہ مسلمان مردوں اور چار یا پانچ مسلمان عورتوں] کی پہلی جماعت نے، جس میں حضرت عثمانؓ اور ان کی بیوی، آنحضرتؐ کی دختر، حضرت رقیہؓ بھی شامل تھے وہاں پہنچ کر خیر و عافیت کی اطلاع دی (ابن سعد : طبقات، ۱ : ۲۰۳ ببعد)۔ اس پر مزید کچھ لوگ روانہ ہوئے؛ [یہ جماعت ایک افواہ کی بنا پر کچھ عرصہ بعد واپس آ گئی، مگر پھر جب اذیت رسانی شدت اختیار کر گئی تو مکرر آپؐ کی اجازت سے ۸۳ مسلمانوں نے، جن میں ۱۱ قریشی خواتین بھی تھیں، حبشہ کو ہجرت کی (ابن سعد، ۱ : ۲۰۷)]۔ اس میں حضرت جعفر طیارؓ بن ابی طالب بھی تھے ان کو آنحضرتؐ نے ایک خط بنام نجاشی دیا (دیکھیے الوثائق السیاسیۃ، عدد ۲۱)؛ غالباً یہ خط ان کو بطور تعارف و سفارش نامہ دیا گیا تھا۔

کفار قریش نے مہاجرین حبش کو حبشہ سے واپس لانے کے لیے دو افراد عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص پر مشتمل ایک سفارت شاہ حبشہ کے پاس مع تحائف بھیجی۔ انہوں نے بادشاہ اور اس کے درباریوں کو اپنے گرانقدر تحائف اور اپنی چرب زبانی سے متأثر کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور بادشاہ کو کہا کہ یہ ہمارے لونڈی غلام بد دین ہو کر یہاں پناہ گزین ہوگئے ہیں، مگر نیک دل بادشاہ نے کہا کہ مناسب ہے کہ ان کی بات بھی سن لی جائے : چنانچہ ان صحابہ کرامؓ کو بلایا گیا۔ [اس موقع پر حضرت جعفر طیارؓ نے جو تقریر فرمائی اس نے نہ صرف شاہ حبشہ کو متأثر کیا، بلکہ صحابہ کرامؓ کی حق گوئی اور طلاقت لسانی کا ایک اعلیٰ معیار بھی پیش کیا (دیکھیے ابن الجوزی)]۔ اس پر شاہ حبشہ نے صحابہ کرامؓ کو واپس کرنے سے انکار کر دیا (احمد بن حنبل : مسند، ج ۱، مسند اہل بیت؛ الحاکم : مستدرک ج ۲، کتاب التفسیر)۔ دوبارہ اگلے روز مشرکین کی سفارت کی طرف سے نجاشی کے دربار میں مکرر یہ الزام تراشی کی گئی کہ مسلمان حضرت عیسیٰؑ کے منکر ہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے حضرت جعفرؓ نے جواب دیا کہ ہمارے عقیدے کے مطابق وہ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے پاکدامن حضرت مریمؑ کو عنایت فرمایا تھا۔ اس جواب سے نجاشی مطمئن ہوگیا۔ اس طرح مشرکین کی یہ سفارت مکمل طور پر ناکام ہو گئی۔

جلد ہی حضرت ابوبکرؓ بھی ترک وطن کرکے حبشہ کی طرف عازم سفر ہوگئے۔ راستے میں برک الغماد کے مقام پر قبیلۂ قارہ کے سردار ابن الدّغِنّۃ نے، جو حضرت ابوبکرؓ کا رشتہ دار بھی تھا، ان کے سفر کا سن کر افسوس ظاہر کیا۔ وہ قریش کا فوجی حلیف اور با اثر شخص تھا۔ وہ حضرت ابوبکرؓ کو مکہ مکرمہ ساتھ لایا اور اعلان کیا : میں ابوبکرؓ کو اپنی پناہ میں

لیتا ھوں؛ کوئی انھیں تکلیف نہ دے۔ ابن الدّغنہ کی پناہ دھی کے دوران میں انھوں نے اپنے گھر کے صحن میں ایک مسجد بنا لی۔ وہ بڑے رقیق القلب تھے۔ بھرائی آواز سے قرآن پڑھتے تو محلے کے غیرمسلم مرد عورتیں، حتّٰی کہ لونڈی غلام بھی ان کی تلاوت قرآن کریم کو سننے آنے لگے۔ قریش مکہ کی شکایات پر نے ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکرؓ کو اس سے روکنا چاہا، مگر حضرت ابوبکرؓ نے ابن الدغنہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے تمھاری حفاظت کی ضرورت نہیں، اللہ کی حفاظت کافی ھے (البخاری: الصحیح، باب ھجرة المدینہ؛ ابن ھشام: سیرة، ۲: ۱ تا ۱۳).

حیرت نہ ھو کہ حبشہ میں مسلمان پناہ گزین نجاشی کے دل سے شکر گزار تھے؛ چنانچہ جب ایک بار ملک میں خانہ جنگی ھوئی تو ان مسلمانوں نے نجاشی کی فوج میں رضاکارانہ شرکت کر کے بڑی جانبازی دکھائی تھی (ابن ھشام، ۱: ۳۶۵)۔ ان مہاجرین میں سے کچھ (تقریباً تینتیس مرد اور آٹھ عورتیں) تو اس وقت واپس آئے جب انھیں آپؐ کی ھجرت مدینہ کی خبر ملی۔ ان میں سے دو آدمی مکہ میں وفات پا گئے، سات وھاں محبوس کر لیے گئے اور بقیہ آپ کی خدمت میں پہنچ گئے؛ ان میں سے چوبیس افراد نے غزوۂ بدر میں بھی شرکت کی۔ ۷ھ میں باقی ماندہ مہاجرین حبش اس وقت آپؐ کی خدمت میں باریاب ھوئے جب آپؐ خیبر فتح کر چکے تھے (دیکھیے ابن سعد: طبقات، ۱: ۲۰۷؛ نیز رک بہ ھجرت)].

مقاطعۂ قریش (۷ نبوی): مشرکین کو جب حبشہ سے ناکامی ھوئی تو انھوں نے شہر کے بے کس مسلمانوں کی ایذا رسانی میں اور اضافہ کر دیا اور پھر مشورۂ عام کے بعد ایک قرارداد لکھی اور اس پر حلف لیا گیا کہ کوئی شخص بنو ھاشم اور بنو عبدالمطلب سے شادی بیاہ کے تعلقات نہ رکھے، خرید و فروخت نہ کرے، بلکہ ان سے بات چیت تک بھی نہ کرے (ابن ھشام، ۱: ۳۷۵ ببعد)۔ اھمیت دینے کے لیے اسے کعبے کے اندر لٹکا دیا گیا تھا۔ [دیگر قبائل (بنو) کنانہ نے بھی اس معاھدے میں شرکت کر کے اس کو تقویت پہنچائی۔ جناب ابو طالب اپنے خاندان والوں سمیت شعب ابی طالب میں محصور ھو گئے]۔ یہ بڑا سخت معاملہ تھا۔ بنو ھاشم کے تین سال بڑی مصیبت میں گزرے؛ صرف حج کے زمانے میں اجنبی تاجروں سے کچھ لین دین کیا جا سکتا تھا اور اسی موسم میں آپؐ وعظ و تبلیغ فرما سکتے تھے، لیکن مکے میں تجارتی مقاطعے کی باعث اندوختہ جلدی ھی ختم ھو گیا اور سال بسال کی اس خرید و فروخت کے کے امکان سے بھی کوئی فائدہ نہ ھو سکا۔ حضرت خدیجہؓ کے رشتہ دار کبھی کبھار مخفی طور پر کچھ اشیا بھیج دیتے، مگر اس سے کیا ھو سکتا تھا؟ ایک دو آدمی نہیں، یہاں دو قبیلوں کے افراد تھے۔ اس دوران میں بھوک مٹانے کے لیے بنو ھاشم نے جڑی بوٹیاں تک کھائیں اور سوکھے اور بدمزہ چمڑے ابال کر تناول کیے۔ اس خاندان کے مسلمان اور غیر مسلم رشتہ دار سبھی اس کا ھدف بنے (بجز ابو لھب کے کہ اس نے قبیلے کا ساتھ چھوڑ کر شہر ھی میں سکونت رکھی (ابن سعد: طبقات، ۱: ۲۰۸ تا ۲۱۰؛ السہیلی: روض الانف، ۱: ۲۲۰ و ببعد؛ ابن ھشام، ۱: ۳۷۵ تا ۳۷۸).

مکہ مکرمہ میں کچھ نیک دل لوگ بھی تھے، مگر ابوجھل ان کی پیش نہ چلنے دیتا تھا۔ آخر ھشام بن عمرو بن ربیعہ العامری کی کوششوں سے زھیر بن ابی امیہ، حضرت خدیجہؓ کے رشتہ دار مطعم بن عدی، نیز زمعہ بن الاسود اور ابوالبختری بن ھاشم، مختلف قبائل کے لوگوں نے رات کو ایک مخفی جلسے میں اس معاھدے کی منسوخی کا طریقۂ کار مرتب کیا۔ پھر صبح کو کعبۃ اللہ کے پاس اپنے اپنے ملنے میں جمع ھوئے۔ طواف کے بعد اولاً زھیر نے اعلان کیا کہ جب تک اس خلاف انسانیت مقاطعہ

کو ختم نہ کیا جائے گا، میں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ ابوجہل نے مخالفت کی تو باقی چار نیک دل اصحاب نے بھی اپنے اپنے قبیلے کی طرف سے یکے بعد دیگرے مقاطعے کی منسوخی کا اعلان کیا۔ [۱۰ نبوی میں یہ مقاطعہ ختم ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور آپ کے رفقا شعب ابی طالب سے باہر تشریف لائے] (ابن ہشام : سیرۃ، ۲ : ۱۴ تا ۲۱؛ [انساب الاشراف، ۱ : ۲۳۳ تا ۲۳۶؛ جوامع السیرۃ، ص ۴۹؛ الوفا، ۱ : ۱۹۷ تا ۱۹۹]).

عام الحزن (۱۰ نبوی) : آپ ؐ کو اور آپ کے رفقا کو اس مصیبت سے نجات تو مل گئی، لیکن قریش کے سہ سالہ مقاطعے نے بہت سے افراد کی صحتیں برباد کر دیں۔ آنحضرت ؐ شہر میں تشریف لائے تو جلد ہی ام المؤمنین حضرت خدیجہ ؓ اور چچا ابو طالب وفات پا گئے۔ یہ واقعہ ۱۰ نبوی کا ہے۔ آنحضرت ؐ نے کوشش تو بہت کی کہ ابو طالب کو کلمۂ شہادت پڑھنے پر آمادہ کریں، مگر ابو جہل وغیرہ مشرکین مکہ کی طعن و تشنیع کے باعث کہا تو آخر دم صرف یہ کہ میں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں (ابن ہشام، ۲ : ۵۸ تا ۶۰؛ السہیلی، ۱ : ۲۵۸).

سفر طائف : ابو طالب کی وفات پر ابولہب بنو ہاشم کا سردار بنا۔ شروع میں تو اس نے اعلان کر دیا کہ آنحضرت ؐ اپنے اقوال و اعمال کے خود ذمہ دار ہیں، خود وہ اس سے بری ہے۔ [یہ اعلان گویا آپ ؐ کو برادری سے خارج کر دینے کے مترادف تھا] کہ جو چاہے آپ کو (معاذ اللہ) قتل کر دے، قبیلہ آپ ؐ کی حمایت نہ کرے گا۔ [اس محاصرے سے نکلنے کے بعد دوسرا انقلاب یہ آیا تھا کہ سرداران قریش نے آپ ؐ کے خلاف گھیرا تنگ کر دیا؛ چنانچہ کچھ لوگ ہر وقت آپ ؐ کا تعاقب جاری رکھتے اور جہاں آپ ؐ وعظ فرمانا چاہتے آپ ؐ کو روک دیا جاتا، یا شور و غل مچا دیا جاتا۔ علاوہ ازیں بیت اللہ شریف میں نماز پڑھنے کے دوران آپ ؐ پر گندگی اور غلیظ اوجھڑی رکھ دینے کے واقعے سے بھی پتا چلتا ہے کہ آپ ؐ کے لیے اس علاقے میں رہنا مشکل کر دیا گیا تھا]۔ بے بسی کے عالم میں آپ ؐ ۲۰ شوال ۱۰ نبوی کو اپنے خادم حضرت زید ؓ بن حارثہ کے ہمراہ طائف تشریف لے گئے، جہاں آپ ؐ کی والدہ کے کچھ رشتہ دار تھے۔ یہاں ان دنوں عمرو بن عمیر کے تین بیٹے عبد یالیل، مسعود اور حبیب برسر اقتدار تھے۔ آپ ؐ یہاں دس روز ٹھیرے؛ ان لوگوں کو سرمایہ داران قریش کی مخالفت کی کہاں ہمت ہو سکتی تھی۔ ان کا [جواب اور رویہ حوصلہ شکن تھا]۔ تینوں بھائیوں نے آپ ؐ کی نہ صرف یہ کہ بات نہ سنی بلکہ شہر کے لونڈوں اور اوباشوں کو بھی "شہر بدر" کرنے کے لیے آپ ؐ کے پیچھے لگا دیا۔ انھوں نے پتھر مار مار کر آپ ؐ کو زخمی کیا۔ [کثرت سے خون نکلنے کی وجہ سے جوتے پاؤں کے ساتھ چپک گئے]۔ پھر ایک باغ کے پاس [جو عتبہ و شیبہ، فرزندان ربیعہ، کی ملکیت تھا آپ ؐ] پہنچے تو ان کے نیک دل عیسائی [غلام عداس نے اپنے آقاؤں کے کہنے کے مطابق] کچھ میووں سے آپ ؐ کی ضیافت کی۔ [وہ غلام آپ ؐ سے اس قدر متاثر ہوا کہ بے ساختہ آپ ؐ کے سر، ہاتھ اور قدم چوم لیے]۔ اس بے بسی کے عالم میں آپ ؐ نے جو دعا کی وہ یہ تھی : اے اللہ! میں تیرے پاس اپنے ضعف، اپنے وسائل کی کمی اور لوگوں کی نگاہ میں اپنی بے قدری کی شکایت کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! کمزوروں اور عاجزوں کا مالک تو ہی ہے اور میرا مالک بھی تو ہی ہے۔ تو مجھے کس کے سپرد کرتا ہے؟ کسی ایسے بیگانے کے جو مجھ سے درشتی سے پیش آئے یا کسی ایسے دشمن کے جسے تو میرے معاملے پر قابو دے دیتا ہے؟ لیکن اگر تو مجھ سے خفا نہیں تو مجھے اس کی کوئی پروا نہیں، کیونکہ تیری عافیت

ہی میں میرے لیے بڑی وسعت ہے ۔ میں تیرے بزرگ چہرے کے نور کے واسطے سے ، جس نے تاریکیوں کو روشن کیا ہے اور جس کے سبب ہی سے دنیا و آخرت کے امور ٹھیک حالت میں ہیں ، اس بات سے پناہ طلب کرتا ہوں کہ مجھ پر تیرا غضب نازل ہو، یا مجھ پر تیری خفگی اترے ۔ عتاب کا حق تجھی کو ہے یہاں تک کہ تو راضی ہو جائے ۔ کوئی طاقت اور کوئی قوت نہیں بجز اس کے کہ تیرے ہی ذریعے سے ہو ۔ [طائف سے واپس تشریف لاتے ہوئے مزید یہ بھی فرمایا کہ میں ان لوگوں کی تباہی کے لیے کیوں بد دعا کروں ؟ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو امید ہے کہ آئندہ ان کی نسلیں ضرور ایمان لائیں گی (الوفا ، ۱ : ۲۱۱ تا ۲۱۳)].

آزمائش کی گھڑی ختم ہو گئی تھی اور اس دعا کی مقبولیت کے آثار فوراً ظاہر ہونے شروع ہوگئے ۔ رات ہوئی تو آنحضرتؐ وہاں سے پیدل مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے ۔ نخلہ پہنچ کر منزل کی اور جب نماز پڑھنے لگے تو کچھ جن جب ادھر سے گزرے تو قرآن کی آواز سن کر آپؐ کے دست حق پرست پر مسلمان ہو گئے اور پھر اپنی قوم میں بھی جا کر تبلیغ کرنے لگے (۴۶ [الاحقاف] : ۲۹ تا ۳۲).

چونکہ آپؐ کی برادری نے آپ کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا تھا، اس لیے آپؐ مکہ مکرمہ کے قریب پہنچ کر رک گئے اور ایک خزاعی کے ذریعے ایک ممتاز سردار اور حضرت خدیجہؓ کے رشتہ دار مطعم بن عدی کے پاس بھیجا کہ مجھے اپنی حمایت میں لے لو ۔ اس نے فوراً درخواست قبول کر لی اور اپنے بیٹوں کو لے کر مسلح حالت میں جبل حرا کے پاس پہنچا اور وہاں سے آنحضرتؐ کو ساتھ لے کر مکہ مکرمہ لایا اور اپنی اور اپنے بیٹوں کی تلواروں کے سائے میں طواف کعبہ کروایا اور اپنی حمایت کا برملا اعلان کیا ۔ پھر آپؐ اپنے گھر جا سکے (الطبری : تاریخ، ۱ : ۱۲۰۳ تا ۱۲۰۴؛ ابن سعد : الطبقات، ۱ : ۲۱۰ تا ۲۱۳).

[اسراء و معراج : اس امر میں کسی قدر اختلاف ہے کہ واقعۂ معراج کب اور کس تاریخ کو پیش آیا ، نیز یہ کہ یہ واقعہ ایک دفعہ پیش آیا یا متعدد مرتبہ ؟ مستند اور محقق روایات کے مطابق اس واقعے کا وقوع ایک ہی مرتبہ ہوا ۔ تعدد کے قائلین کا استشہاد تعدد و اختلاف روایات سے ہے جب کہ یہ اختلاف جزئیات کے بیان میں ہے نہ کہ اصل واقعہ کے بیان میں ۔ پھر باقاعدہ نظام کتابت نہ ہونے کی وجہ سے ایسے واقعات کے راویوں میں اختلاف کا پایا جانا غیر متوقع بھی نہیں ۔

عام طور پر اس واقعے کے ضمن میں اسراء اور معراج کے دو عنوان قائم کیے جاتے ہیں اور ان میں کسی قدر فرق ہے ۔ اول الذکر سے مراد مسجد حرام سے مسجد اقصٰی تک کا زمینی سفر ہے ، جس کا ذکر قرآن مجید کی ایک مستقل سورۃ (۱۷ [بنی اسرائیل]) میں کیا گیا ہے ۔ ثانی الذکر سے مراد عروج آسمانی ہے ، جس میں رؤیت ملائکہ سے لے کر جنت و دوزخ کی سیر اور مناجات باری تک کے مقاصد شامل ہیں ۔

اس واقعہ کے وقوع میں پانچ اقوال مروی ہیں، مگر ان میں سے مستند اور محقق یہی ہے کہ یہ واقعہ ۲۷ رجب ۱۰ نبوی کو بوقت شب بعد از نماز عشاء و قبل از صلوٰۃ الفجر پیش آیا (دیکھیے الزرقانی : شرح المواهب ، ۱ : ۳۰۶ تا ۳۰۹ ؛ ابن هشام ۲: سیرة، ۲: ۳۷ تا ۴۹؛ ابن سعد : الطبقات، ۱: ۲۱۳ تا ۲۱۵ ؛ سید سلیمان ندوی : سیرة النبی ، ۳: ۲۹۳ تا ۳۸۳؛ سلیمان منصور پوری: رحمة للعالمین ، ۱: ۷۰ ، مطبوعہ لاہور؛ W. Muir: *Life of Muhammad*، ص ۱۲۱ ، مطبوعہ ۱۹۲۳ء).

واقعۂ معراج کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شب آپؐ حطیم یا حجر کعبہ میں استراحت فرما تھے

(البخاری : الصحیح، ۳ : ۱/۴۲/۹۳)؛ بیداری اور نیند کی درمیانی حالت تھی کہ آپؐ نے حضرت جبریلؑ کی معیت میں متعدد فرشتوں کو اپنے پاس آتے ہوئے دیکھا۔ انھوں نے آپؐ کے سینۂ اطہر کو چاک کیا اور آب زمزم سے دھو کر علم و حکمت اور حلم و ایقان سے بھر دیا۔ پھر آپؐ کے سامنے سواری کے لیے گھوڑے سے کسی قدر چھوٹا سفید رنگ کا جانور پیش کیا جسے تیز رفتاری کی وجہ سے براق [رک بآں] کا نام دیا گیا ہے۔ حد نگاہ پر اس کا قدم پڑتا تھا۔ اسی پر سوار ہو کر آپؐ بیت المقدس تشریف لے گئے۔ جب آپؐ دو رکعت نماز نفل سے فارغ ہوئے تو آپؐ کو دودھ اور شراب کے دو پیالے پیش کیے گئے کہ آپؐ جسے چاہیں منتخب کر لیں۔ آپؐ نے دودھ کے پیالے کو ترجیح دی۔ اس پر حضرت جبریلؑ نے فرمایا کہ اگر شراب کا پیالہ اٹھاتے تو امت گمراہ ہو جاتی۔ امام بخاری (کتاب مذکور) کی روایت کے مطابق یہ پیالے آپؐ کو عالم بالا میں پیش کیے گئے۔ پھر آپؐ حضرت جبریلؑ کی معیت میں آسمان کے دروازے پر پہنچے تو دربانوں نے پوچھا : کون ہے ؟ جواب ملا : جبریلؑ پوچھا گیا : ساتھ کون ہے؟ جواب دیا گیا : محمدؐ۔ پوچھا گیا : کیا ان کو بلایا گیا ہے ؟ جواب ملا : ہاں۔ اس پر دروازہ کھلا اور آپؐ کو مرحبا اور خوش آمدید کہا گیا۔ پہلے آسمان پر حضرت آدمؑ نے فرزند صالح و نبی صالح کہہ کر آپؐ کو خوش آمدید کہا؛ دوسرے اور اس کے بعد کے آسمانوں کے دروازوں پر یہی سوال جواب دہرائے گئے۔ دوسرے آسمان پر فرشتوں کے علاوہ آپؐ کی ملاقات حضرت عیسیٰؑ اور حضرت یحییٰؑ سے، تیسرے آسمان پر حضرت یوسفؑ سے، چوتھے آسمان پر حضرت ادریسؑ سے، پانچویں پر حضرت ہارونؑ سے، چھٹے پر حضرت موسیٰؑ سے، ساتویں پر حضرت ابراہیمؑ سے ہوئی اور ہر ایک نے آپؐ کو خوش آمدید و مرحبا کہا۔ آگے بڑھ کر آپؐ عالم بالا کے مقام سدرۃ المنتہی پر پہنچے۔ وہاں آپؐ نے بیت اللہ شریف کی طرز پر بیت المعمور دیکھا، جہاں ہر روز ستر ہزار فرشتے عبادت کرتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی سے گفتگو کی، جس کی کیفیت و کمیت کے بیان کرنے سے بحر الفاظ و معانی قاصر ہے۔ واپسی پر تین تحائف ملے : (۱) سورۃ البقرہ کی آخری دو آیتیں؛ (۲) یہ بشارت کہ جو شرک کا مرتکب نہ ہوگا عفو و مغفرت کا سزاوار ہوگا؛ (۳) پانچ وقت کی فرض نمازیں۔ واپسی ہی میں آپؐ کو جنت و دوزخ اور ملأ اعلیٰ کے دوسرے مناظر دکھلائے گئے (البخاری : الصحیح، کتاب الصلوٰۃ، باب ۱؛ کتاب الحج، باب ۹۷ و کتاب مناقب الانصار، باب ۴۲، ۴۳ وغیرہ؛ مسلم : الصحیح، باب المعراج؛ ابن جریر : تفسیر؛ الزمخشری : الکشاف؛ محمود آلوسی : روح المعانی، بذیل ۱۷ [بنی اسرائیل] و ۵۳ [النجم]؛ احمد بن حنبل : مسند، ۱ : ۲۵۷؛ ۲ : ۳۵۲؛ ۳ : ۱۸۲، ۲۲۴، ۲۳۱، ۲۳۹؛ ۴ : ۶۶، ۱۴۳، ۲۰۷؛ ۵ : ۱۴۳، ۳۸۷؛ الطبری : تاریخ، ۱ : ۱۱۵۷ بعد؛ [نیز رک بہ اسراء؛ معراج؛ بنی اسرائیل].

معراج کی خبر سے مکے میں چہ میگوئیاں ضرور ہوئیں، لیکن ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ اس خبر سے حلاوت ایمان سے شادکام ہونے والا کوئی بھی مسلم فرد مرتد ہو گیا ہو۔

پناہ گاہ کی تلاش اور شب مصائب کی طلوع سحر : معراج سے واپسی پر آپؐ نے تبلیغ و دعوت کی مہم کو مزید تیز کر دیا۔ اب آپؐ مکہ مکرمہ کے پاس آباد دیگر قبائل کے پاس تشریف لے جاتے۔ اس طرح آپؐ] بنو کلب، بنو فزارہ، بنو عامر بن صعصعۃ، بنو حنیفہ، بنو شیبان، بنو حارث، بنو کعب، بنو کندہ، بنو مرہ، وغیرہ [قبائل کے علاوہ اہم مقامات اجتماع، مثلاً ذوالمجاز، مجنّہ اور عکاظ وغیرہ

(میلوں) اور موسم حج کے اجتماع میں دعوت اسلام دیتے رہے] (المقریزی، امتاع، ۱ : ۳۰ تا ۳۱، جہاں چودہ قبیلوں بشمول غسان کا ذکر ہے)؛ السہیلی (روض الانف) اور ابن ہشام (سیرة) وغیرہ نے چند مزید ناموں کا بھی ذکر کیا ہے۔ آپؐ کی دعوت کے جواب میں کسی نے اخلاق و نرمی سے، کسی نے اجڈ پن اور سختی سے انکار کیا، مگر کوئی بھی اس سعادت دارین کے حصول کا خواہشمند نہ ہوا۔

عَقَبۂ اُولٰی: بالآخر ایک روز آپؐ نے میدان مِنٰی کے باہر، عقبہ کے موڑ پر چھ آدمیوں کی ایک چھوٹی سی جماعت دیکھی، جو رسوم حج ادا کرنے مدینہ منوّرہ [رک بآں] سے مکہ معظمہ آئی ہوئی تھی۔ یہ سب خزرجی تھے۔ [ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں: اسعد بن زُرارہ، عوف بن حارث، رافع بن مالک، قُطبہ بن عامر، عقبہ بن عامر، جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم]۔ آنحضرتؐ کی تبلیغ پر انھوں نے فوراً اسلام قبول کر لیا اور وعدہ کیا کہ گھر جا کر مزید کوشش کریں گے۔ یہ بیعت عقبۂ اولٰی کہلاتی ہے (المقریزی: امتاع، ۱ : ۳۰)۔ [اھل یثرب میں اسلام کی فوری اشاعت کے مختلف اسباب ھیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ یہ لوگ یہودیوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ان پیشگوئیوں سے واقف تھے جو سابقہ کتب مقدسہ میں نبی آخرالزمان کی آمد سے متعلق تھیں اور دوسرا یہ کہ] یثرب کے دو بڑے قبائل اوس اور خزرج، ایک عرصۂ دراز سے باہمی قتل و خونریزی سے اکتا گئے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی غیر جانبدار اور انصاف پسند ثالث کے گرد باہم متحد ہو جائیں۔ یہ اولیں مسلمان قبیلۂ خزرج کی شاخ بنو نجار سے تعلق رکھتے تھے، جس سے خود آنحضرتؐ کی ننھیالی رشتہ داری تھی۔ [یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ارباب سیر نے عقبات کی تعداد اپنے اپنے نقطۂ نگہ سے لکھی ہے۔ جس نے پہلی بیعت کو [illegible] کو عقبات تصور کیا اس نے تعداد دو بیان کی اور جس نے اول کو بھی شمار کیا اس نے اس کی تعداد تین بیان کی۔ فرق واقعات کا نہیں، طرز بیان کا ہے۔ ہم نے مؤخرالذکر طریقے کو اس بنا پر پسند کیا ہے کہ اس سے منطقی طور پر واقعات کے فہم میں آسانی ہو جاتی ہے]۔

عقبۂ ثانیہ: عقبۂ اولٰی میں شریک افراد نے وعدہ پورا کیا اور پورے سال اسلام کی اشاعت میں لگے رہے اور اسلام کی تبلیغ اس تندہی سے کی کہ اوس و خزرج کے ہر گھر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے چرچے ہونے لگے]۔ دوسرے سال ۱۲ نبوی میں حج کے زمانے ہی میں پانچ پرانے اور سات نئے افراد آنحضرتؐ سے ملنے کے لیے آئے اور آپؐ کے ہاتھ پر مکرر بیعت کی (ابن ہشام، ۲ : ۷۳ تا ۷۶)۔ [بعض نے] اسی کو عقبۂ اولٰی بھی کہا ہے۔ ان لوگوں کی خواہش تھی کہ ایک قابل شخص کو ان کا معلم اور مبلغ بنا کر مدینہ منورہ بھیجا جائے۔ اس کے لیے حضرت مُصعبؓ بن عُمیر [رک بآں] کو منتخب کیا گیا۔ اس سے پہلے نماز کی امامت کے سلسلے میں بنو اوس و خزرج کے مابین جو جھگڑے تھے وہ اس اقدام کی وجہ سے ختم ہو گئے (کتاب مذکور، ص ۷۶ تا ۷۸)۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر نے اس خوش اسلوبی سے تبلیغی کام انجام دیا کہ مدینہ منورہ میں بہت سرعت سے اسلام کی اشاعت ہونے لگی اور بعض اوقات تو پورے کا پورا خاندان بیک وقت اسلام قبول کر لیتا تھا (ابن ہشام، ۲ : ۷۶ تا ۸۴) معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مصعبؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم سے اس اثنا میں رابطہ قائم رکھا کیونکہ جب آنحضرتؐ کو مدینہ منورہ میں اسلام کی اشاعت کی خوشخبری ملی تو آپؐ نے حضرت مصعبؓ کو ایک خط ارسال فرمایا تھا (الوثائق السیاسیة و بحوالۂ السہیلی: روض الانف، ۱ : ۲۷۰ تا ۲۷۲)، جس میں درج تھا کہ دن ڈھلے [illegible] اس حکم کی تعمیل تب جب

جمعے کی نماز کا مدینہ منورہ میں اہتمام کیا گیا تو بیان کیا گیا ہے کہ پہلی نماز جمعہ میں بارہ آدمی جمع ہوئے۔ (ابن سعد، ۱/۲ : ۱۱۸).

عقبۂ ثالثہ: [اسی کو بعض نے عقبۂ ثانیہ لکھا ہے]۔ تیسرے سال، یعنی ۱۲ نبوی کے موسم حج میں یثرب سے آنے والے پانچ سو حاجیوں میں سے تہتر مسلمان مرد اور دو خواتین تھیں۔ یہ لوگ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم سے پہاڑ کی گھاٹی (عقبہ) میں رات کے وقت ملے۔ ان لوگوں نے بیعت کے موقع پر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر آپؐ اور دیگر مسلمان مکے سے مدینہ منورہ آ جائیں تو ہم آپؐ کی ویسی ہی حفاظت کریں گے جیسے کوئی اپنے اہل خاندان کی کرتا ہے۔ انھوں نے یقین دلایا کہ اگر اس کے لیے ساری دنیا سے بھی جنگ کرنا پڑے تو وہ اس کے لیے بھی تیار ہوں گے اور ہر امر میں آنحضرتؐ ہی کی اطاعت کریں گے۔ آنحضرتؐ نے ان کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے فرمایا: آج سے تمہاری خون طلبی ہی میری خون طلبی ہوگی، اور تمہاری معافی میری معافی ہو گی؛ میں تم میں سے ہوں اور تم مجھ سے۔ تعداد کی کثرت کے باعث آنحضرتؐ نے ان کے لیے بارہ نقیب نامزد فرمائے، جو بارہ خاندانوں کے لیے تھے اور ان میں سے اسعدؓ بن زرارہ کو، جو بنی النجار سے تعلق رکھتے تھے، نقیب النقباء بنایا (البلاذری: انساب الاشراف، ۱: ۲۳۴)۔ اس تنظیم کو تاسیس مملکت اور معاهدۂ اجتماعی کی ایک شکل قرار دیا جا سکتا ہے (ابن سعد: طبقات، ۱ : ۲۲۱ تا ۲۲۳).

ہجرت مدینہ: بیعت عقبۂ ثالثہ کے بعد، جو ذوالحجہ ۱۳ نبوی کا واقعہ ہے، آنحضرتؐ کی ہدایت پر مکہ مکرمہ کے مسلمان چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں ہجرت کر کے مدینہ منورہ جانے لگے۔ ان میں سے متعدد کو جسمانی اور مالی تکالیف سے سابقہ پڑا۔ ان کی جائدادیں، خاص طور پر مکان ضبط کر لیے گئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں مکہ مکرمہ مسلمانوں سے خالی ہو گیا۔ اور وہاں آنحضرتؐ اور حضرت ابو بکرؓ کا خاندان یا کچھ کمزور لوگ باقی رہ گئے، یا وہ نوجوان جن کو ان کے اہل خاندان نے ایذا دہی کے لیے قید کر رکھا تھا۔

مسلمانان مکہ کے ترک وطن پر کفار قریش گھبرائے کہ اہل اسلام کسی دوسرے علاقے میں قوت حاصل کر کے کہیں مکے پر نہ ٹوٹ پڑیں۔ دارالندوہ میں اس مسئلے پر عمومی مشورہ ہوا۔ بڑے غور و بحث کے بعد ایک تجویز قرار پائی کہ مکہ مکرمہ کے ہر قبیلے سے ایک کڑیل جوان کو چنا جائے اور یہ لوگ مشترکہ طور پر (معاذ اللہ) آنحضرتؐ کو قتل کر ڈالیں تاکہ بنو ہاشم اور مسلمانوں کو سارے قبائل سے جنگ کرنے کی ہمت نہ ہو سکے اور اس طرح وہ خون بہا لینے پر آمادہ ہو جائیں۔ ابن سعد [۸ : ۵۱، بیروت ۱۹۵۸ء] کے مطابق آنحضرتؐ کی ایک معمر رشتہ دار خاتون [رُقیقہ بنت ابی صیفی بن ہاشم نے] جو غالباً اپنے شوہر کے خاندان میں اس تجویز سے واقف ہوئی ہوں گی آ کر آنحضرتؐ کو آگاہ کیا کہ قریش یکبارگی آپؐ پر ٹوٹ پڑنے والے ہیں۔ آنحضرتؐ فوراً حضرت ابوبکرؓ کے ہاں تشریف لے گئے اور انھیں صورت حال سے آگاہ کیا اور طے ہوا کہ رات کو آپؐ حضرت ابوبکرؓ کے ہاں آ جائیں گے؛ پھر دونوں شہر کے جنوب میں واقع ایک پہاڑ کے غار، غار ثور میں جا رہیں گے۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ اطلاع ملتے یہ بندوبست کر لیا کہ روزانہ انھیں مکہ مکرمہ سے کھانا جاتا رہے اور انھیں شہر کے تازہ بتازہ حالات بھی معلوم ہوتے رہیں اور پھر چوتھے روز غار پر دو اونٹ اور ایک ماہر رہنما موجود ہو تاکہ وہ دونوں مدینہ منورہ روانہ ہو سکیں۔ آنحضرتؐ نے

مختلف لوگوں کی جو امانتیں پاس تھیں وہ اپنے چچا زاد بھائی حضرت علیؓ کے سپرد کیں تاکہ وہ مالکوں کو واپس کرنے کے بعد مدینہ منورہ آ جائیں۔ [جان لینے کے درپے دشمنوں کی امانتوں کو ان کے ارادۂ قتل کے بعد بھی واپس کرنا، یہی شان نبوت ہے]۔ مشرکین قریش رات کو حسب پروگرام آنے اور آ کر آپؐ کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور صبح تک انتظار کرتے رہے ۔ یہ لوگ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کھڑکی سے جھانک کر اپنا اطمینان کر لیتے تھے کہ اندر کوئی شخص سو رہا ہے ، لیکن اندر جانے کا حوصلہ کسی کو نہ ہوا ۔ [جب رات زیادہ گزر گئی تو خدائے قادر و قیوم نے آپؐ کے دشمنوں کو غافل کر دیا ۔ آپؐ ان کو بے خبر چھوڑ کر حضرت ابوبکرؓ کے مکان پر پہنچے ، جہاں سے ”غار ثور“ میں تین روز کے قیام کے لیے روانہ ہو گئے] ۔ صبح ہوئی تو دشمنوں کو آنحضرتؐ کی جگہ حضرت علیؓ مکان میں ملے تو انھوں نے برھمی کا اظہار کیا ، لیکن ان کا خون نہ بہایا ۔ پھر آپؐ کی اور حضرت ابوبکرؓ کی ہر جگہ تلاش شروع ہوئی ۔ گرفتاری کے لیے انعام بھی مقرر کیا گیا ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کھوجی تلاش کرتے غار ثور تک بھی پہنچ گئے تھے ۔ اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ دشمنوں کو اس قدر قریب دیکھ کر گھبرا گئے تو آپؐ نے فرمایا : لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (۹ [التوبۃ]: ۴۰)، یعنی غم نہ کرو؛ اللہ ہمارے ساتھ ہے؛ چنانچہ اللہ تعالٰی نے قریب پہنچنے کے باوجود ان کو ناکام اور نامراد لوٹا دیا (البخاری : الصحیح، ۳ ، کتاب ۶۳ ، باب الهجرة) ۔ اس دوران حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی حضرت اسماءؓ صبح و شام آپؐ کے لیے کھانا اور حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ تازہ بتازہ خبریں پہنچاتے رہے ۔ [علاوہ ازیں حضرت ابوبکرؓ کے مولیٰ عامر بن فہیرہ بکریاں چرانے ادھر آ نکلتے ۔ اس سے ایک تو آنے والوں کے نشان قدم مٹ جاتے ، دوسرے وہ دودھ وغیرہ دے جاتے] ، چوتھے روز [طے شدہ لائحۂ عمل کے مطابق] عبداللہ بن اُرَیْقِط (رہنما) دو اونٹنیاں لے کر غار کے باہر آ پہنچا ۔ [عبداللہ بن اُرَیْقِط الدِّیلی بنو بکر بن عبدمناۃ میں سے تھا اور عاص بن وائل السهمی کا حلیف ؛ وہ راستوں کے اونچ نیچ سے بڑا باخبر اور ماہر و تجربہ کار راہبر اور راہ دان تھا ۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کی مہارت راہ دانی اور امانت داری پر اعتماد کرتے ہوئے ہجرت کی غرض سے مدینے جانے کے لیے اس کی خدمات حاصل کی تھیں (انساب الاشراف ، ۱ : ۲۶۰ ؛ جوامع السیرۃ ، ص ۹۱)]۔ اب ساحل کے ساتھ ساتھ نامانوس راستوں سے ہو کر مدینے کا سفر شروع ہوا ۔ [ایک اونٹ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سوار ہوئے اور دوسرے پر حضرت ابوبکرؓ اور ان کے مولیٰ عامر بن فہیرہ ۔ بنو مُدلِج کے سردار سُراقہ بن مالک بن جُعْشُم نے آپؐ کو دیکھا تو سو اونٹوں کے لالچ میں آپؐ کا تعاقب شروع کر دیا ۔ جب سُراقہ کا گھوڑا اس مقدس کارواں کے پاس پہنچا تو حضرت ابوبکرؓ بڑے پریشان ہوئے اور آنحضرتؐ کے بارے میں خطرہ محسوس کرنے لگے ۔ آپؐ نے اپنے یار غار کو تسلی دیتے ہوئے اللہ کے حضور میں دعا کی : اَللّٰهُمَّ اكْفِنَاهُ بِمَا شِئْتَ ، یعنی اے اللہ تو جس طرح چاہے اس سے خود نبٹ ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے تو اس کا گھوڑا گرتے گرتے بچا ؛ پھر جب وہ آگے بڑھنے لگا تو گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے ۔ اس پر سراقہ نے معافی مانگتے ہوئے آپؐ سے امان طلب کی ؛ چنانچہ آپؐ نے اسے امان دے دی] ۔ راستے میں [ام مَعْبَد کے خیمے میں معجزانہ طور پر بکریوں کو دوہ کر] دودھ حاصل کرنے کا موقع بھی ملا ۔ ادھر انصار مدینہ منورہ کے جنوب میں (قُبا کے پاس) آپؐ کا روزانہ انتظار کرتے تھے ۔ جب آپؐ خیر و عافیت سے قبا پہنچ گئے تو مردوں نے ہتیاروں سے مسلح

ہو کر، بچوں اور بچیوں نے ڈھولک اور دف بجاتے ہوئے، اور یہ کہتے ہوئے آپؐ کا استقبال کیا:

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعٍ
اَيُّهَا الْمَبْعُوثُ فِيْنَا جِئْتَ بِالْاَمْرِ الْمُطَاعِ

[یعنی ثنیۃ الوداع کی طرف سے ہم پر چاند نکل آیا۔ ہم پر شکر اس وقت تک واجب ہے جب تک کہ کوئی پکارنے والا اللہ کو پکارتا رہے گا۔ اے وہ جو پیغمبرؐ کے طور پر ہم میں بھیجا گیا ہے، تو وہ چیز لایا ہے جس کی اطاعت کی جائے گی]۔ اس موقع پر انتہائی جوش و خروش اور خلوص و نیاز مندی کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔ یہ دو شنبہ ۱۲ ربیع الاول ۱ھ/ ۲۲ مئی ۶۲۲ء کا واقعہ ہے [انساب الاشراف، ۱: ۲۶۳؛ جوامع السیرۃ، ص ۹۳؛ الوفا باحوال المصطفیٰ، ص ۲۴۹]۔ ملاقات کے لیے حاضر ہونے والوں کی کثرت کے باعث آپؐ ایک درخت کے سائے میں ایک باغ میں بیٹھ گئے۔ پھر قباء اور بنی عمرو بن عوف کے رئیس حضرت کلثومؓ بن الہدم الاوسی کے مکان میں قیام پذیر ہوئے؛ البتہ دن میں سعد بن خیثمہ الاوسی کے مکان میں بیٹھنے لگے، جو بڑا بھی تھا اور خالی بھی، کیونکہ سعد غیر شادی شدہ تھے (ابن ہشام: سیرۃ النبویۃ، ۲: ۱۰۲ تا ۱۳۸؛ ابن سعد: الطبقات، ۱: ۲۲۷ تا ۲۳۷؛ البخاری: الصحیح، مطبوعہ لائیڈن، ۲، کتاب فضائل النبی، ۲: ۴۱۷ ببعد و باب ھجرۃ النبی، ۳: ۴۳ تا ۵۴)۔

مسجد قباء کی تعمیر: یہاں آپؐ نے اپنے مختصر قیام کے دوران میں ایک مسجد تعمیر کی جس کا قبلہ بھی آنحضرتؐ نے متعین فرمایا۔ تیرہ چودہ دن قیام کے بعد قباء سے روانگی عمل میں آئی اور وہاں اترے جہاں آپؐ کی اونٹنی ٹھہری تاکہ کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ اسی جگہ اب مسجد نبوی ہے۔ آس پاس آنحضرتؐ کے ننھیالی رشتہ دار بنو خزرج کی شاخ بنو النجار بستے تھے۔ جس جگہ آپؐ کی اونٹنی خود بخود رک کر بیٹھ گئی تھی وہ ایک کھلا میدان تھا، مگر وہاں سے قریب ترین مکان حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا تھا۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ آنحضرتؐ کا سامان اپنے دو منزلہ مکان میں لے گئے (ابن سعد: الطبقات، ۱: ۲۳۲ تا ۲۳۴)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے پہلا کام یہ کیا کہ خالی میدان کو، جو دو یتیم بچوں کی ملکیت تھا، قیمتاً حاصل کیا اور وہاں مسجد نبوی اور اپنے کنبے کے لیے چند حجروں کی تعمیر کا آغاز فرما دیا۔ جب کام مکمل ہو گیا تو آنحضرتؐ وہاں منتقل ہو گئے۔ پھر مکہ مکرمہ سے آپؐ کے اور حضرت ابوبکرؓ کے بیوی بچوں کو لانے کے لیے چھے آدمی روانہ فرمائے۔ دس سالہ حضرت انسؓ بن مالک الخزرجی کو ان کی عقیدت مند والدہ نے آپؐ کی خدمت میں لا کر پیش کرتے ہوئے عرض کی یا رسول اللہ! میرے اس بچے کو اپنے خادم کی حیثیت سے قبول فرما کر میری عزت افزائی فرمائیں؛ وہ کمسنی کے باوجود لکھنا پڑھنا جانتا ہے۔ حضرت انسؓ دس سال، یعنی وفات نبوی تک حضورؐ کے مکان میں بطور خادم کے رہے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اس دوران میں آپؐ نے کبھی ایک مرتبہ بھی مجھے گھرکا تک نہیں (الترمذی: شمائل النبی)۔

اجتماعی اور سیاسی تنظیم: مدینہ منورہ آنے پر آپؐ کو نظر آیا کہ مکے کے برعکس اس شہر میں کوئی شہری نظام نہیں، بلکہ بکثرت قبیلے الگ الگ مقاموں پر رہتے ہیں اور ایک دوسرے سے بالکل آزاد۔ ان میں باہمی رشتہ داری کے باوجود آپس میں خون خرابہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ ان کی اکثریت میں اسلام پھیل گیا تھا، البتہ بعض خاندان، مثلاً خطمہ، واقف، وائل اور امیہ ابھی تک شرک پر ہی مصر تھے۔ شہر میں یہودی بھی تھے جن میں سے بنو النضیر خزرج کے

حلیف تھے جبکہ بنو قینقاع اور بنو قریظہ قبیلہ اوس کے حلیف تھے۔ مدینہ منورہ میں ان کی مجموعی تعداد پانچ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ قینقاع میں سات سو جنگجو اور قریظہ میں چھے سو جنگجو سپاہیوں کا ہونا مقریزی (امتاع، ۱ : ۱۰۵، ۲۲۹م) نے صراحت سے بیان کیا ہے اور یہ کہ جب بنو النضیر مدینہ منورہ سے نکالے گئے تو چھے سو اونٹوں پر عورتوں بچوں اور سامان کو لاد کر لے گئے تھے (کتاب مذکور، ص ۱۸۱)۔ اس مخلوط آبادی میں مکے سے آئے ہوئے کئی سو بیروزگار اور بے وسائل مہاجرین بھی تھے، جن میں سے چھے حضرت بلالؓ وغیرہ کی طرح کے غیر عرب بھی تھے۔ ان میں سے بہت سے نئی آب و ہوا کے باعث بیمار بھی ہو گئے۔ ان کی آباد کاری کا کٹھن کام بھی انجام دینا تھا۔ اسی زمانے میں مکہ مکرمہ سے ابوسفیان اور ابی بن خلف نے] عبداللہ بن ابی بن ابی سلول اور اہل مدینہ کے نام ایک دھمکی آمیز خط (الٹی میٹم) لکھ بھیجا کہ آنحضرتؐ کو ان کے سپرد کر دیا جائے، ورنہ مجبوراً جنگ کرنی ہوگی (کتاب المحبر، ص ۱۷۳؛ الوثائق السیاسیۃ).

مؤاخات: آپؐ نے سب سے پہلے مہاجرین پر توجہ فرمائی؛ کیونکہ ان کی خود داری کی حفاظت کے لیے کسی مستقل انتظام کی ضرورت تھی۔ اسی لیے آپؐ نے انصار کو جمع کرکے فرمایا: ہر شخص ایک مہاجر خاندان کو لے لے، دونوں مل کر کام کریں اور کمائی مل کر کھائیں۔ انصار نے ایثار کیا۔ قرآن مجید (۵۹ [الحشر] : ۹) میں ان کی تعریف یونہیں بے وجہ نہیں آئی۔ انھوں نے کہا: یا رسولؐ اللہ! ہماری آدھی زمینیں مہاجرین کو مستقل طور پر دے دیجیے! لیکن خود دار مہاجرین نے اسے قبول نہ کیا اور کہا: غیر مزروعہ زمینیں انھیں تقاوی پر دے دیں اور پیداوار کا ایک حصہ بطور اجرت لے لیا کریں (بخاری: الصحیح، ۲ : ۶۸، کتاب الحرث والمزارعۃ وکتاب الہبۃ وغیرہ)۔ انھوں نے ایک مہاجر کو ایک انصاری کے بھائی بنائے جانے (مؤاخات) کے فرمان نبوی کو انتہائی خوشدلی سے قبول کیا اور اس طرح سیکڑوں بے روزگاروں کا مسئلہ ایک ہی دن میں حل ہو گیا۔ اس مواخات میں کافی عرصے تک باہمی وراثت بھی چلتی رہی۔ پھر اس کو وحی (۸ [الانفال] : ۷۵) سے منسوخ کر دیا گیا [تفصیل کے لیے دیکھیے البخاری: الصحیح، ۳ : ۱ تا ۹ ببعد، کتاب مناقب الانصار]۔ فراخ دلی، خود داری اور عمدہ ایثار کی ایک مثال حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف کی ہے کہ ان کے انصاری بھائی نے ان کو گھر لا کر کہا: "یہ میری جائداد ہے؛ میں اس کا نصف تمھیں دیتا ہوں۔ یہ میری دو بیویاں ہیں۔ ان میں سے جسے چاہو چن لو؛ میں اسے طلاق دیتا ہوں۔ عدت کے بعد اس سے نکاح کر لینا"۔ حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف نے جواب دیا: "خدا تمھیں تمھارے مال و عیال میں برکت دے۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں۔ مجھے تو صرف بازار کا راستہ دکھا دو"۔ انھوں نے بازار میں کام شروع کر دیا اور چند ہی روز میں اللہ تعالیٰ نے ان کو خوشحالی عطا فرما دی (البخاری: الصحیح، ۳ : ۲).

بعض انصار نے اپنے باغوں میں سے ایک ایک درخت آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لیے مختص کر دیا اور موسم میں اس کا پھل آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کرنے لگے [مسلم، ۳ : ۱۳۹۲، عدد ۱۷۷۱، کتاب الجہاد، باب ۲۴]؛ اس طرح کسی ایک پر بار نہ پڑا۔ [ان درختوں کو آپؐ نے بنو قریظہ اور بنو النضیر کے انخلا کے بعد ان کے مالکان کو واپس کر دیا]۔ آنحضرتؐ کی عادت مبارکہ تھی کہ جب کھانا کھاتے تو آٹھ دس حاضرین کو اس میں ضرور شریک فرما لیتے۔ آپؐ نے کچھ بکریاں اور اونٹنیاں خریدیں، جن کا دودھ کنبے میں خرج ہونے لگا۔

میثاق مدینہ: مہاجرین و انصار کی مؤاخات کے بعد شہر کی بقیہ آبادی کی تنظیم پر توجہ دی گئی۔

حضرت انس بن مالک رض راوی ھیں کہ ان کے باپ کے مکان میں سارے مسلم و غیر مسلم قبائل کے نمائندوں کا اجتماع ھوا اور آنحضرت ص کی تجویز پر سب متفق ھو گئے کہ بیرونی حملوں کے دفاع اور اندرونی بین القبائل جھگڑوں میں تصفیے وغیرہ کے لیے شہر میں ایک تنظیم عمل میں لائی جائے اور ایک شخص کو بطور حاکم اعلی متعین کیا جائے۔ حقوق و فرائض تحریری طور پر مرتب کیے گئے۔ یہ دستاویز جو کسی مملکت کے لیے تحریری طور پر مدون کیے ھوئے دستور کی بظاھر دنیا میں پہلی مثال ھے اور سنه ۱ھ سے متعلق ہے، ھم تک ابن ھشام، ابو عبید وغیرہ کی روایت سے کاملاً پہنچی ھے، (تفصیل کے لیے دیکھیے حمید اللہ: *The first written consitution in the world*، لاھور ۱۹۷۵ء؛ [رک بہ میثاق مدینہ])۔ یہ دستاویز آنحضرت ص کی تلوار کی میان پر ھمیشہ بندھی رھتی تھی۔

اس میثاق باھمی کے نتیجے کی رو سے آنحضرت ص کو، جو مسلمانوں کے لیے تو آقا اور سردار تھے ھی، اب غیر مسلموں نے بھی اس حیثیت سے تسلیم کر لیا۔ درحقیقت یہ آپ ص کی مدینہ منورہ میں پہلی سیاسی فتح تھی، جو عظیم نتائج پر منتج ھوئی۔ [اس کے علاوہ میثاق مدینہ کی دفعات کامل رواداری، مذھبی آزادی اور حسن تعاون پر مبنی تھیں؛ اس لیے یہودیوں اور دیگر غیر مسلموں کے پاس بے اعتمادی کی کوئی وجہ نہ تھی]۔

البخاری (کتاب ۵۶، باب ۱۸۱، حدیث ۱ [۲ : ۲۹۳]) وغیرہ نے روایت کی ھے کہ ایک دن آنحضرت ص نے حکم دیا: میرے لیے سارے کلمہ گویوں [من یلفظ بالاسلام] کے نام لکھو۔ اس طرح پندرہ سو نام درج ھوئے۔ چونکہ مؤاخات میں ۱۸۶ مکی خاندانوں کو اتنے ھی مدنی خاندانوں میں ضم کیا گیا تھا اور ھر خاندان میں بیوی بچوں کا اوسط چار ھی رکھا جائے تو پندرہ سو کی تعداد ھو جاتی ھے۔ اس لیے گمان ھوتا ھے کہ یہ مردم شماری بھی انھیں ابتدائی تنظیمات کے زمانے، یعنی تقریباً ۱ھ میں ھوئی ھوگی۔

بیرونی تعلقات: مسلمانوں کا قریش مکہ کے سوا کسی اور سے کوئی جھگڑا نہ تھا۔ اس بیرونی دشمن سے نپٹنے کے لیے اندرونی تنظم اور استحکام لازمی تھا۔ اس کے لیے ایک طرف تبلیغ دین کا سلسلہ جاری ھوا تو دوسری طرف وقتاً فوقتاً نئے احکام نازل ھو کر اسلامی قانون و شریعت کو بتدریج مکمل کرتے گئے: چنانچہ اذان [رک باں]، تحویل قبلہ، روزہ، حج، زکوۃ، قانون وراثت و نکاح و طلاق، حجاب، حرمت خمر، قانون صلح و جنگ و غیر جانبداری، نیز قانون تعزیرات (حدود و ممانعات) اور عام اخلاق و احسان (تصوف) اسی دوران میں نازل ھوئے اور شریعت اسلامیہ کا حصہ بنے۔

اب آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلم کو بیرونی تعلقات میں قریش کی دھمکی اور جارحانہ اقدامات کا مقابلہ کرنا تھا۔ جب شہری مملکت مدینہ کے قیام سے کسی قدر اندرونی استحکام و اطمینان حاصل ھو گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مدینہ منورہ کے اطراف پر توجہ دی اور وھاں کے قبیلوں کو فوجی طور سے حلیف بنانا شروع کیا؛ چنانچہ بنو جھینہ، بنو ضمرہ وغیرہ کے ساتھ ایسے معاھدے ھونے کا پتا چلتا ھے۔ بنو جھینہ مدینہ منورہ کے شمال مغرب میں اور بنو ضمرہ وغیرہ جنوب مغرب میں آباد تھے اور یہ وہ علاقہ ھے جہاں سے قریش کے تجارتی کاروان عراق، شام اور مصر جانے کے لیے گزرا کرتے تھے۔

غزوات: ھجرت کے وقت آنحضرت ص کے قتل کی سازش قریش کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف گویا اعلان جنگ تھا؛ [اس پر کچھ نہ کچھ کارروائی لازمی تھی]۔ آنحضرت ص کی اور دیگر سیکڑوں مہاجرین کی جائدادیں بھی قریش نے ضبط کر لی تھیں۔ اس کے باوجود قریش مکہ کا غصہ فرو نہ ھوا تھا

اور وہ موقع کی تاک میں تھے۔ [آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے نہ صرف مدینہ منورہ میں اندرونی استحکام پیدا کیا، بلکہ باہر کے حملہ آوروں کا پتا لگانے، نیز دشمنوں کی سرگرمیاں معلوم کرنے کے لیے مختلف دستے آس پاس کے علاقوں میں بھیجے۔ یہ دستے مدینہ منورہ کے ارد گرد آپؐ کے حکم کے مطابق دشمنوں کی سرگرمیوں کا پتا چلاتے۔ اس سلسلے کا پہلا دستہ، جو تیس افراد پر مشتمل تھا]، حضرت حمزہؓ کی قیادت میں رمضان ۱ھ میں بھیجا گیا۔ [یہ دستہ جب ساحل سمندر پر پہنچا تو اتفاقاً مشرکین کے ایک کاروان سے، جس میں ابوجہل بھی تھا، سامنا ہوگیا]، مگر مجدی بن عمرو الجہنی، جو دونوں فریقوں کا حلیف تھا، بیچ میں پڑا؛ اس طرح تصادم رک گیا [الواقدی: المغازی، ۱: ۹ اوکسفرڈ ۱۹۶۶ء]۔ اسی زمانے میں ساٹھ [اور بقول بعض اسی] افراد پر مشتمل ایک دوسرا دستہ مدینہ منورہ کے جنوب مغرب میں حضرت عبیدہؓ بن الحارث [بن عبدالمطلب] کے ماتحت بھیجا گیا [حوالۂ مذکور، ص ۱۰]۔ تیسرا دستہ حضرت سعد بن ابی وقاص کی زیر کمان بھیجا گیا۔ ان میں سے کسی میں کوئی خونریزی نہ ہوئی [(جوامع السیرۃ، ص ۱۰۰ تا ۱۰۱؛ ابن کثیر: السیرۃ، ۲: ۲۳۸ تا ۲۳۹)؛ کیونکہ یہ سب امن پسندی کے جذبے کے امین تھے]، مگر قریشی رئیس کُرز بن جابر الفہری نے ربیع الاول ۲ھ میں مدینہ منورہ کے مضافات کی چراگاہ پر حملہ کیا اور مسلمانوں کے ریوڑ لوٹ لیے۔ اس کا تعاقب کیا گیا، مگر کامیابی نہ ہوئی۔ جمادی الاولی ۲ھ میں آپؐ خود صحابہ کرامؓ کی معیت میں العُشیرہ تک گئے [دیکھیے غزوات]۔ رجب ۲ھ میں بارہ افراد پر مشتمل ایک دستہ نخلہ بھیجا گیا۔ آپؐ نے اس کی کمان حضرت عبداللہؓ بن جحش کے سپرد کی اور فرمایا: دو دن تک مدینہ منورہ کے مشرقی سمت میں جاؤ، پھر بند لفافہ کھول کر اس کے احکام کی تعمیل کرو۔ جب یہ دستہ بئر ابن ضمیرہ پہنچا تو وہاں پہنچ کر آپؐ کا نامۂ مبارک کھولا تو اس میں لکھا تھا: بطن نخلہ [مکہ مکرمہ کے مشرق جانب اور طائف اور مکہ کے درمیان ایک مقام] پہنچ کر قریش مکہ کے قافلوں پر نگاہ رکھو اور ہمیں ان کے حالات سے مطلع کرو؛ چنانچہ حسب حکم یہ دستہ وہاں پہنچ گیا۔ انھیں دشمنوں کا ایک قافلہ ملا تو انھوں نے آپؐ کے حکم کے بغیر اس پر حملہ کر دیا۔ جس کے نتیجے میں ایک کافر عمرو بن [عبداللہ] الحضرمی مارا گیا اور کچھ اسیر کیے گئے جنھیں رہا کرانے کے لیے قریش کو فدیہ دینا پڑا۔ اس طرح باھمی تعلقات پہلے سے زیادہ کشیدہ ہوگئے۔ یہ لڑائی غلطی سے رجب کی یکم کو ہوئی تھی اس پر مشرکین کی طرف سے اشہر حرم کی حرمت کو پامال کرنے کا الزام لگایا گیا، [جس کا تفصیلی جواب قرآن مجید (۲ [البقرۃ]: ۲۱۷) میں دیا گیا]۔ اس دستے کو آنحضرتؐ نے لڑنے کا نہیں بلکہ خبریں حاصل کرنے کا کام سپرد کیا تھا، اس لیے لڑائی کی اطلاع ملنے پر آنحضرتؐ ناراض ہوئے، لیکن جلدی ہی صورت حال کو قبول فرما لیا، کیونکہ قریش مکہ کی معاندانہ سرگرمیاں پہلے سے بڑھتی جا رہی تھیں۔

جمادی الآخرۃ ۲ھ میں قریشی کاروان خاص جنگی نقطۂ نظر سے تجارت کے لیے شام گیا۔ تین ماہ بعد جب یہ قافلہ واپس آ رہا تھا [تو ایک مقام پر ابو سفیان کو مسلمانوں کی طرف سے خطرہ پیدا ہوا۔ اس کو مزید تقویت اس سے بھی ہو گئی کہ آنحضرتؐ نے اس علاقے میں جو دو افراد حالات معلوم کرنے کے لیے متعین فرمائے ہوئے تھے، ابو سفیان کو ان کا نشان مل گیا؛ چنانچہ ابو سفیان نے نہ صرف راستہ تبدیل کر لیا بلکہ اس نے مکہ مکرمہ سے مدد حاصل کرنے کے لیے بھی ایک آدمی دوڑا دیا]۔ اس طرح اس کی کمک کے لیے مکے سے ابو جہل [رک بآں] کی قیادت میں جو فوج نکلی اس سے ۱۷ رمضان ۲ھ کو بدر [رک بآں] میں مقابلہ ہوگیا۔ مسلمان صرف ۳۱۳ اور دشمن ۹۵۰،

یعنی تگنے سے بھی زائد تھے، مگر انہیں بری طرح ہزیمت اٹھانا پڑی۔ قیدیوں کو قتل کی جگہ چار چار ہزار درہم کا فدیہ لے کر رہا کیا گیا، لیکن جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان کا فدیہ صرف یہ مقرر کیا گیا کہ ہر قیدی دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے (ابن سعد: طبقات، ۲ : ۱۱ تا ۲۶؛ السہیلی: روض الانف، ۲ : ۶۱ تا ۷۸؛ ابن حنبل: مسند، ۱ : ۲۴۷، عدد ۲۲۱۶)۔

غزوۂ احد: قریش نے اگلے سال بڑی تیاریوں کے بعد تین ہزار کی فوج لے کر شوال ۳ھ میں مدینہ منورہ پر حملہ کر دیا اور احد [رک بآں] میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ مسلمانوں کو آنحضرت کے جنگی احکام کی خلاف ورزی کی وجہ سے وقتی طور پر کچھ نقصان اٹھانا پڑا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جلد ہی انہیں دوبارہ صف آرا کر کے دشمنوں کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ جاتے ہوئے قریش مکہ نے یہ اعلان کیا کہ] ایک سال بعد بدر ہی میں دوبارہ مقابلہ ہوگا۔ شوال ۴ھ میں آنحضرت اپنے جانثاروں سمیت بدر گئے اور انتظار کرتے رہے، مگر دشمن نہ آئے۔ ذوالقعدہ میں بدر کے مقام پر سالانہ میلہ لگتا تھا۔ اس سے تجارتی استفادہ کرنے کے بعد مسلمان مدینہ منورہ واپس ہوگئے۔

غزوۂ خندق: اس کے کچھ عرصے بعد شوال ۵ھ میں غزوۂ خندق پیش آیا۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ مدینہ منورہ کے بنو نضیر [رک بآں] نے غزوۂ احد کے [چھ ماہ] بعد مسلمانوں سے لڑائی مول لی تھی اور شکست کھانے کے بعد [البخاری، ۳ : ۲۷] شہر چھوڑ کر خیبر جا بسے تھے۔ انہوں نے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے قبائل عرب میں اسلام دشمنی کی آگ بھڑکا دی۔ یہود نے اپنی دولت اور چرب زبانی سے کام لے کر بنو غطفان و فزارہ کو مدینہ منورہ کے مشرق سے، بنو المصطلق کو جنوب مغرب سے، اہل طائف، بنو کنانہ اور اہل مکہ کو جنوب سے اس پر آمادہ کیا کہ وہ بیک وقت اپنی متحدہ قوت سے مدینہ منورہ پر ٹوٹ پڑیں۔ وہ خود خیبر میں امن چین سے بیٹھ کر انتظامات کی نگرانی کرتے رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس موقع پر صحابہؓ کے مشورے سے خندق [رک بآں] کھدوانے کا فیصلہ کیا۔ یہود کی تجویز بظاہر یہ تھی کہ مدینے سے بہت دور لے جا کر آنحضرت اور آپ کی چھوٹی سی فوج کو خیبر اور دُومۃ الجندل کے درمیان گھیر کر [معاذ اللہ] قتل کر دیا جائے، پھر مدینہ منورہ کو لوٹ لیا جائے۔ بنو المصطلق مدینہ منورہ سے قریب تر تھے۔ ممکن ہے آنحضرت کو ان کے شریک سازش ہونے کی اطلاع مل چکی ہو؛ بہرحال آنحضرت نے ان کے بعض مسلمان رشتہ داروں کو ان کے علاقے میں بھیج کر مزید اطمینان کر لیا۔ پھر آپ نے اچانک ان پر اس وقت حملہ کر دیا جب کہ وہ چشمہ مُریسیع پر قیام پذیر تھے۔ اس موقع پر مرد بھاگ گئے اور عورتیں اور بچے گرفتار کر لیے گئے۔ پھر آنحضرت کے حسن سلوک کے باعث سب مسلمان ہوگئے۔ بقیہ دشمن فوج نے شوال ۵ھ میں دس ہزار [بقول الیعقوبی بیس ہزار] کے جم غفیر کے ساتھ مدینہ منورہ کا محاصرہ کر لیا۔ اسلام کے جانثاروں کی تعداد [تین ہزار اور بقول بعض] صرف پندرہ سو [یا آٹھ نو سو] تھی، لیکن انہوں نے خندق [رک بآں] کھود کر دشمن کو تھکانے اور تاخیر پیدا کرنے کا انتظام کر لیا تھا۔ آخر اندوختہ ختم ہو جانے، موسم کے سرد اور طوفانی ہو جانے، حرمت کے مہینے آ جانے اور سب سے بڑھ کر نصرت خداوندی کے باعث ابو سفیان نے محاصرہ اٹھا کر واپس چلے جانے کا فیصلہ کر لیا تاکہ مکہ مکرمہ آنے والے حاجیوں کی سربراہی اور تجارت و سیاحت میں مشغول ہو سکیں۔

جب وہ چلے گئے تو آنحضرت نے فرمایا: اب ان کو مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کی کبھی ہمت نہ ہوگی کیونکہ جب اتنی کثیر فوج کے باوجود وہ کچھ

نہ کر سکے تو آئندہ مکرر کوشش کی جرأت نہیں کر سکتے۔ [اس کے ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے آبائی شہر پر، جس میں خدا کا گھر بھی تھا، حملہ کرنے سے پہلے مفاہمت اور صلح جوئی میں پہل کو مقدم سمجھا اور کوشش کی کہ قریش مکہ کی مزید دلجوئی کریں کہ شاید اسی طرح ان کے دل نرم ہو جائیں]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس قدر رحیم وشفیق تھے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۶ھ میں جب مکے میں سخت قحط پڑا تو آپؐ نے پانچ سو اشرفیاں مکہ مکرمہ کے غربا میں تقسیم کے لیے بھیجیں۔ ابو سفیان بے بسی کے عالم میں جھنجھلا کر کہنے لگا: محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مکے کے نوجوانوں کو بھکانا چاہتے ہیں (السرخسی : شرح السیر الکبیر، ۱ : ۶۹)۔ کاروانی راستے بند ہونے کی وجہ سے ابو سفیان کے ہاں جانوروں کی کھالیں پڑی پڑی خراب ہو رہی تھیں۔ آنحضرتؐ نے اس کو مدینہ سے کھجوریں بھیجیں اور اس کے ہاں کی کھالیں خرید لینی چاہیں (حوالۂ مذکور، ۱ : ۷۰)۔ اسی زمانے میں یمامہ (نجد) کے سردار ثُمامہ بن اثال نے بھی مسلمانوں کی اس کوشش میں مدد دی۔ ایک بظاہر تنبیہی مہم میں مسلمانوں کا ایک دستہ اسے گرفتار کرکے مدینہ منورہ لایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے صحابہؓ کو فرمایا: یہ بنی حنیفہ کا سردار ثمامہ ہے۔ اس سے اچھا برتاؤ کرو۔ اسے مسجد میں رکھا گیا اور خوراک بھی اچھی دی گئی۔ آنحضرتؐ جب بھی ادھر سے گزرتے، اسے تبلیغ دین کرتے، لیکن اس کا ایک ہی جواب تھا: اگر مجھے قتل کرو گے تو ایک خون والے کا قتل ہوگا؛ اگر فدیہ چاہتے ہو تو جو چاہو مانگو۔ کچھ دنوں کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اسے رہا کر دیا۔ آپؐ کے حسن سلوک، رحم و کرم اور کچھ ایام کے ذوق صحبت نے حساس بدوی کی کایا پلٹ دی۔ باہر نکلا، غسل کیا، پھر مسجد میں آ کر کلمۂ شہادت پڑھنے کے بعد کہا: اب تک آپؐ کا چہرا میرے لیے سب سے زیادہ قابل نفرت تھا، اب وہ سب سے زیادہ محبوب ہو گیا ہے۔ وطن واپس جاتے ہوئے وہ مکے سے گزرا۔ اسلام کے علی الاعلان اظہار پر قریش نے اسے قتل کر دینا چاہا، پھر کسی نے یاد دلایا کہ اس کے ملک کے غلے کے تم محتاج ہو۔ رہائی پر اس نے کہا: خدا کی قسم! میرے ملک کے غلے کا ایک دانہ بھی اب تمہیں نہ ملے گا جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اجازت نہ دیں گے۔ قحط کے باعث اہل مکہ ابتر حالت میں تھے۔ ایک خط لکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے عاجزانہ التجا کی کہ ثمامہؓ کے غلے کی برآمد کی بندش اٹھا دی جائے۔ آپؐ نے فوراً ثمامہؓ کو خط لکھا کہ غلے کی برآمد کو نہ روکو (ابن ہشام، ۴ : ۲۸۷ تا ۲۸۸)۔

صلح حدیبیہ : ذوالقعدہ ۶ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پندرہ سو صحابہ کرامؓ کے ساتھ عمرہ کرنے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے، مگر قریش مزاحمت کے لیے مکے سے نکل کر حدیبیہ [رک بآں] آ گئے، جو فوجی نقطۂ نظر سے مکے کا دروازہ ہے۔ انہوں نے اپنے حلیف احابیش [رک بآں] کو بھی بلا لیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یکے بعد دیگرے متعدد سفیر بھیجے تاکہ قریش مکہ کو یقین دہانی کرائیں کہ آپؐ صرف عمرہ کرنا چاہتے ہیں، مگر قریش نے اصرار کیا اور کہا] کہ واپس چلے جاؤ، تمہیں مکہ آنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ آنحضرتؐ نے قریش کے سفیروں کو اپنے قربانی کے جانور دکھانے اور اطمینان دلایا کہ مقصد صرف عمرہ ہے (ابن ہشام، ۲ : ۳۲۱ تا ۳۲۹)؛ لیکن ان سفیروں کو معاہدے کا اختیار نہ دیا گیا تھا، اس لیے آنحضرتؐ نے خراش الخزاعی کو سفیر بنا کر بھیجا۔ مکہ مکرمہ میں اس کی اونٹنی مار ڈالی گئی اور خود اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ بڑی مشکل سے وہ جان بچا کر واپس آئے (حوالۂ مذکور)۔ اب آنحضرتؐ نے حضرت عثمانؓ

کو، جو ابو سفیان کے قریبی رشتہ دار بھی تھے، مقصد کی وضاحت کے لیے مکہ مکرمہ بھیجا۔ انھیں قید کر لیا گیا۔ ادھر اسلامی لشکر میں افواہ پھیل گئی کہ ان کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر تمام صحابہؓ سے موت کی بیعت لی کہ جان کی پروا کیے بغیر لڑیں گے اور راہ فرار اختیار نہ کریں گے۔ نازک صورت حال کے پیش نظر قریش مکہ نے سہیل بن عمرو جیسے سنجیدہ اور صلح پسند شخص کو بھیجا کہ مصالحت کی کوشش کرے۔ طویل گفت و شنید کے بعد طے ہوا کہ: (۱) مسلمانوں اور قریش مکہ میں دس سال تک باہم صلح رہے گی؛ طائف جانے کے لیے مسلمان مکے سے اور شام جانے کے لیے اہل مکہ مدینہ منورہ سے گزر سکیں گے؛ (۲) امسال آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور صحابہ کرامؓ عمرہ کیے بغیر واپس چلے جائیں گے؛ (۳) اگلے سال مسلمان عمرہ کرنے کے لیے صرف تین دن کے لیے مکہ مکرمہ آ سکیں گے؛ (۴) مسلمانوں میں سے اگر کوئی مکہ مکرمہ میں آ کر پناہ گزین ہو تو اسے واپس نہ کیا جائے گا، لیکن اہل مکہ میں سے اگر کوئی آنحضرتؐ کے پاس آئے تو اس کو اس کے سرپرستوں کے مطالبے پر ان کے سپرد کر دیا جائے گا؛ (۵) ہر فریق خلوص سے شرائط صلح پر عمل کرے گا۔ وہ نہ تو چھپ کر کسی تیسرے شخص کو مدد دے گا، نہ خود خیانت کرے گا (بلکہ غیر جانبدار رہے گا)؛ (۶) دیگر قبائل بھی حسب منشا فریقین میں سے کسی کے ساتھ ملحق ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں ان کے بھی وہی حقوق و فرائض ہونگے جو اصل فریقین کے ہیں (چنانچہ بنو خُزاعہ نے مسلمانوں کی طرف سے اور احابیش نے اہل مکہ کی طرف سے معاہدے میں شمولیت اختیار کر لی)۔

دوسری، تیسری اور خاص کر چوتھی شرط پر مسلمانوں کو بڑی تشویش ہوئی اور حضرت عمرؓ جیسی شخصیت بھی عمیق مقصد کو فوراً نہ سمجھ سکی اور برملا رسول اللہؐ کے سامنے اظہار ناپسندیدگی کیا، لیکن مسلمانوں میں انتہا درجے کا نظم و ضبط تھا؛ آنحضرتؐ کی رضامندی کو دیکھ کر ہر شخص راضی برضا ہو گیا (نیز رک بہ حدیبیہ؛ غزوات)۔

قرآن مجید میں اس صلح حدیبیہ کو فتح مبین کہا گیا ہے، جو آگے چل کر واقعی ایسا ہی ثابت ہوئی۔

خیبر کے یہودیوں کی شرارتیں بدستور جاری رہیں؛ اس لیے آپؐ نے اس فتنے کی سرکوبی کا عزم مصمم کر لیا؛ چنانچہ ایک مہینے کی تیاری کے بعد محرم ۷ھ میں خیبر [رک بآں] پر قبضہ کر کے اسے اسلامی مقبوضات میں شامل کر لیا گیا۔

[صلح حدیبیہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسرا کام یہ کیا کہ شاہان عالم کے نام تبلیغی خطوط ارسال کیے]۔

حسب معاہدہ ایک سال بعد آنحضرتؐ عمرہ کرنے مکہ مکرمہ آئے اور قریش کو شکایت کا کوئی موقع نہ دیا، بلکہ ہر طرح ان کا دل موہ لینے کی کوشش کی۔ اسی سال وہاں حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا۔ اسی زمانے میں حضرت خالدؓ بن الولید اور حضرت عمروؓ بن العاص جیسے باصلاحیت لوگ مسلمان ہوئے۔ ابو سفیان کی اپنی بیٹی حضرت ام حبیبہؓ، جو مسلمان تھیں، حبشہ میں بیوہ ہو گئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان کو اپنے ساتھ عقد کا اعزاز بخشا۔ [ان کے شوہر نے مرتد ہو کر انھیں بھی نصرانی بننے پر مجبور کیا تھا، لیکن وہ اسلام پر ثابت قدم رہیں؛ تالیف قلب کے لیے آپؐ نے ان سے نکاح فرما لیا]۔ اس ازدواج سے ابو سفیان کا متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ اسی زمانے میں حبشہ سے مسلمان مہاجرین اور بعض نومسلم حبشی بھی عرب آئے۔ ان کی خیبر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ملاقات ہوئی۔

فتح مکہ: شعبان ۸ھ میں بنوخزاعہ اور بنو بکر کے جھگڑے میں کچھ خونریزی ہوئی تو بعض اہل مکہ نے چھپ کر بنو بکر کی فوج میں شرکت کی اور انہیں ہتیار مہیا کیے۔ یہ صلح حدیبیہ کی صریحاً خلاف ورزی تھی۔ بنو خزاعہ نے، جو مسلمانوں کے حلیف تھے، آنحضرتؐ سے شکایت کی تو آپؐ نے مدد کا وعدہ فرمایا؛ [چنانچہ آپؐ نے قاصد کے ذریعے قریش مکہ کے سامنے تین شرائط پیش کیں: (۱) مقتولین کی دیت ادا کی جائے؛ (۲) بنو بکر سے قریش معاہدہ توڑ لیں؛ (۳) صلح حدیبیہ کو ختم کر دیا جائے۔ قُرطہ بن عمر نے قریش کی طرف سے جواب دیا کہ ہم کو تیسری شرط قبول ہے (الزرقانی: شرح المواہب، ۲: ۳۳۶)]، مگر پھر قریش مکہ کو ندامت ہوئی اور ابو سفیان کو صلح کی تجدید اور اس کی مدت میں اضافے کے لیے مدینہ منورہ بھیجا (المقریزی، ۱: ۳۵۸)۔ ابو سفیان تجدید معاہدہ میں ناکام ہو کر واپس چلا گیا اور اسے کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ آنحضرتؐ کیا کرنے والے ہیں۔ دوسری طرف آپؐ نے مدینے کے لوگوں کو ایک مہم کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا، [مگر اس کی وضاحت نہیں فرمائی]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک طرف تو یہ انتظام کیا کہ مدینہ منورہ سے کوئی شخص باہر نہ جانے پائے۔ [ایک شخص حاطب بن ابی بلتعہ نے قریش مکہ کو اطلاع پہنچانی چاہی، مگر اس کا خط پکڑا گیا۔ آپؐ نے اس کی سابقہ خدمات کا لحاظ کرتے ہوئے اسے معاف فرما دیا (ابن ہشام، ۴: ۴۰)]۔ دوسری طرف ملک کے تمام حلیف قبائل کو مخفی احکام بھیجے کہ ایک بڑی مہم پر جانے کے لیے تیار رہیں، لیکن مدینہ منورہ نہ آئیں، ہم خود تمہارے علاقے میں سے گزرتے وقت تم کو ساتھ لے لیں گے۔ الواقدی نے المغازی میں صراحت کی ہے کہ آنحضرتؐ نے بنو سُلیم وغیرہ کو رمضان المبارک میں مدینہ منورہ آنے کا حکم دیا، لیکن الیعقوبی (۲: ۵۹-۱۵۸) کا بیان زیادہ قرین قیاس ہے کہ ان بیرونی قبائل کے صرف سرداروں کو مدینہ منورہ بلایا گیا اور آنے پر ہر ایک کو رازدارانہ طور پر حکم دیا کہ رضاکاروں کے ساتھ تیار رہیں اور اس امر کو راز میں رکھیں۔ آنحضرتؐ نے ان کے علاقے میں گزرتے وقت انہیں فوج میں شریک کر لیا۔ جب تیاریاں مکمل ہو گئیں تو آپؐ آڑے ترچھے، اور نامانوس راستوں سے روانہ ہوئے۔ اسی زمانے میں آپؐ نے ایک مہم بطن اضم بھیجی، جو مدینہ منورہ کے شمال مغرب میں کوئی تین دن کی مسافت پر ہے۔ مؤرخین نے صراحت کی ہے کہ اس کا مقصد محض دشمنوں کی توجہ ہٹانا تھا۔ اس طرف سے آپؐ جلد ہی دوسری سمت روانہ ہو گئے حتی کہ مرالظہران پہنچنے تک (جو مکے سے ایک ہی منزل پر ہے) اکابر صحابہؓ بھی نہ جان سکے کہ کدھر کا قصد ہے (المقریزی: امتاع، ۱: ۳۵۵؛ الطبری: تاریخ، ۱: ۱۶۲۰)۔ بہرحال قبائلی دستوں کو لینے کے بعد دس ہزار کے لشکر جرار سمیت آپؐ نے رمضان المبارک ۸ھ میں مکہ کے اطراف میں واقع پہاڑوں کے دامن میں پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیا اور حکم دیا کہ رات کو ہر سپاہی ایک علٰحدہ آگ روشن کرے۔ ابو سفیان نے مکے کی ایک بلندی پر سے آگ جلنے کا نظارہ کیا تو ایک بہت بڑے میدان میں آگ جلتی دکھائی دی۔ اس نے خیال کیا کہ کم از کم پچاس ہزار کی فوج کے ساتھ کوئی دشمن حملہ آور ہوا ہے۔ اس کے پسینے چھوٹ گئے اور پتا چلانے کے لیے آگے بڑھا۔ لشکر اسلام کے ایک گشتی دستے نے اسے گرفتار کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سامنے پیش کیا۔ آپؐ نے حکم دیا کہ اسے حفاظت سے رکھو اور واپس نہ جانے دو۔ صبح کو حکم دیا کہ فوج چار مختلف جہتوں سے مکے میں داخل ہو، لیکن بجز مدافعت کے ہرگز کوئی

خونریزی اور لوٹ مار نہ کی جائے۔ تمام دستوں کو ابو سفیان کی آنکھوں کے سامنے سے گزارا گیا۔ جب ساری فوج روانہ ہوگئی تو ابو سفیان کو رہا کر دیا گیا۔ وہ اس وقت شہر میں پہنچا جب اسلامی فوج شہر میں داخل ہونا شروع ہو چکی تھی اور فوجی نقیب ہر طرف چلا چلا کر کہہ رہے تھے: جو کوئی ہتھیار ڈال دے گا، اسے امن ہے؛ جو اپنے گھر میں بند بیٹھا رہے گا اسے امن ہے؛ جو ابو سفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا، اسے امن ہے۔ خود آنحضرتؐ بڑے راستے سے شہر میں داخل ہوئے [اور اس شان سے کہ آپ کا سر مبارک، بموجب ارشاد خداوندی: وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّداً (۷ [الاعراف]: ۱۶۱)، فرط تواضع سے سواری کے پالان کو چھو رہا تھا]۔ آپ کا یہ داخلہ فاتحانہ، مگر پیغمبرانہ تھا۔

حضرت خالدؓ بن الولید کا رسالہ اس راستے سے داخل ہوا جہاں خود ان کا قبیلہ سکونت پذیر تھا۔ ان کے رشتہ دار عکرمہ بن ابی جہل نے انہیں روکنے کی کوشش کی، جس پر معمولی خونریزی ہوئی۔ آنحضرتؐ کو اطلاع ہوئی تو فوراً حضرت خالدؓ کو تنبیہ کی کہ ہاتھ کو روک لو (الواقدی: المغازی، ۲: ۸۲۷ ببعد؛ ابن سعد: الطبقات، ۲: ۱۳۴ تا ۱۴۴)۔

پر امن داخلے کے بعد آنحضرتؐ نے اعلان فرمایا کہ مسلمانوں کی سابقہ ضبط شدہ جائدادیں واپس نہیں لی جائیں گی، بلکہ غیر مسلم قابضین کے قبضے ہی میں رہنے دی جائیں گی، حتّٰی کہ خود اپنے مکان کو بھی آپؐ نے واپس نہ لیا (البلاذری: الانساب، ۱: ۳۵۶؛ البخاری، ۳: ۱۴۰)، کتاب المغازی، باب ۴۸، یہ ایک اہم قانونی حکم تھا۔ پھر اعلان ہوا کہ تمام لوگ بیت اللہ شریف میں جمع ہوں، آپؐ ان کو خطاب کرنا چاہتے ہیں؛ چنانچہ تمام لوگ جمع ہو گئے۔ آنحضرتؐ جب بیت اللہ شریف میں تشریف لائے تو کعبے کے اطراف کے تمام بت توڑ دیے گئے۔ کعبے کے اندر کی رنگین تصویریں بھی دھو کر مٹا دی گئیں۔ پھر حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ وہ کعبے کی چھت یا جبل ابی قبیس پر چڑھ کر اذان دیں (الازرقی: اخبار مکہ، ص ۲۱۱)۔ اس پر بعض غیر مسلم ناراض بھی ہوئے۔ نماز با جماعت کے بعد آنحضرتؐ نے غیر مسلم اہل مکہ کو مخاطب کرکے ان کی گزشتہ بیس سالہ اسلام دشمنی کی سرگرمیاں یاد دلاتے ہوئے پوچھا: اب تم مجھ سے کیا توقع کرتے ہو؟ وہ شرم سے صرف یہ کہہ سکے: تم ایک شریف بھائی اور ایک شریف بھتیجے ہو۔ اس پر آنحضرتؐ نے یہ تاریخی جواب دیا: [لاتثریب علیکم الیوم انتم الطلقاء، یعنی] آج تم پر کوئی گرفت نہیں، جاؤ تم سب کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ عتاب بن اسید اس غیر متوقع اعلان پر آپے سے باہر ہو گیا، جھپٹ کر حضورؐ کے سامنے آیا اور اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا۔ آپؐ کے حسن سلوک اور عمدہ اخلاق سے متأثر ہو کر تقریباً سارے کا سارا شہر مسلمان ہوگیا اور اس اخلاص کے ساتھ کہ دو سال بعد جب آنحضرتؐ کی وفات ہوئی اور عرب میں ارتداد کی لہر اٹھی تو اہل مکہ خلوص کے ساتھ اسلام پر قائم رہے۔

اس عام معافی کے اعلان پر مختلف دلچسپ چیزیں پیش آئیں، مثلاً اس موقع پر آپؐ کے قدیمی دشمن عکرمہ بن ابی جہل کو اپنی جان کا خوف ہوا اور چاہا کہ بھاگ کر کسی اجنبی ملک میں پناہ گزین ہو جائے۔ اس کی بیوی ام حکیم آ کر مسلمان ہو گئی اور شوہر کی جان بخشی چاہی تو آنحضرتؐ نے فوراً قبول فرما لیا اور اسے امان دے دی۔ وہ جا کر شوہر کو واپس لائی اور وہ اس خلوص سے مسلمان ہوئے کہ اس کی نظیر کم ملتی ہے۔ انہوں نے کہا: اسلام کے خلاف میں نے جتنا مال صرف کیا اور جتنی جنگیں کیں، اب اس کا دگنا بطور کفارہ اسلام کے لیے کروں

گا؛ چنانچہ اپنے اس عہد کو پورا کیا۔ (عکرمہؓ نے جنگ یرموک میں شہادت پائی)۔

ایک اور شخص صفوان ابن امیہ آیا جس نے فتح مکہ کے موقع پر عسکر اسلام کی شہر میں داخلہ کے وقت بھرپور مخالفت کی تھی اور کہنے لگا: میں ابھی اسلام قبول نہیں کرنا چاہتا، مجھے دو مہینے کی مہلت دی جائے۔ آپؐ نے فرمایا: تمھیں چار مہینے کی مہلت دی جاتی ہے (ابن ہشام، ۴ : ۶۱)۔ چند روز بعد وہ بھی خلوص دل سے مسلمان ہوگیا۔

ابو سفیان کی بیوی ہندہ، جس نے جنگ احد میں آنحضرتؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کی لاش کا مُثلہ کیا تھا، اس نے فتح مکہ کے بعد ایک ہتوڑا لے کر گھر کے تمام بتوں کو پاش پاش کر دیا اور کہا: تم نے ہم کو بہت دن دھوکے میں رکھا؛ آج معلوم ہوگیا کہ تمہیں کتنی قدرت ہے! پھر نقاب ڈال کر چند دیگر عورتوں کے ساتھ چھپ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس آئی اور اسلام قبول کر لیا (السہیلی، ۲ : ۲۷۷، وغیرہ)۔

وحشی بھی جو حضرت حمزہؓ کا قاتل تھا، آ کر مسلمان ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اسے معاف فرما دیا اور صرف یہ کہا: بہتر ہے کہ تو آئندہ میرے سامنے نہ آئے تاکہ مجھے حضرت حمزہؓ کی یاد سے دکھ نہ ہو (البلاذری، ۱ : ۳۶۳)۔

فتح مکہ کے بعد آپؐ نے آس پاس کے تمام بت اور بڑے بتخانے مسمار کروا دیے۔ حضرت خالدؓ بن ولید کو عزّٰی کے خلاف نخلہ (طائف اور مکے کے مابین)، حضرت عمروؓ بن العاص کو سواع کے خلاف رھاط (بلاد ھذیل میں)، حضرت سعدؓ بن زید الاشہلی کو منات کے خلاف مُشَلّل (مدینہ منورہ کے جنوب میں ساحل پر) بھیجا اور اس طرح تطہیر حرم کعبہ کے عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ پھر حضرت خالدؓ [illegible] یلملم بھیجا گیا کہ بنو جذیمہ بن عامر میں تبلیغ دین کریں۔ غلط فہمی کی بنا پر وہاں حضرت خالدؓ نے خونریزی کی، جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت ناراض ہوے اور [حضرت علیؓ کو بھیج کر] اہل خاندان کو خونبہا اور ہرجانہ دیا حتی کہ کتے کے پانی پینے کا برتن بھی اگر ٹوٹا تھا تو اس کا بھی معاوضہ دیا (البلاذری، ۱ : ۳۸۱؛ ابن ہشام، ۴ : ۷۰ تا ۷۸)۔

غزوۂ حنین: اسی زمانے میں خبر آئی کہ بنو ھوازن اور اہل طائف مکہ مکرمہ پر حملہ کرنے آ رہے ہیں۔ طائف میں لات کا مشہور بت خانہ تھا۔ تحقیق کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنے جملہ جان نثاروں اور کچھ مکی رضاکاروں کے ساتھ یکم شوال المکرم ۸ھ کو دفاع کے لیے نکلے۔ آپؐ ابھی حنین کی گھاٹی میں سے گزر رہے تھے کہ رات کے اندھیرے میں اچانک دشمن نے تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس حملے سے مسلمان منتشر ہو گئے، لیکن آنحضرتؐ کی بہادری اور ثابت قدمی سے بھاگتے ہوے مسلمان پلٹ آئے اور دشمن بدحواس ہو کر بھاگ گئے۔ مسلمانوں نے ان کے پڑاؤ پر قبضہ کرلیا اور بے شمار جانور اور تقریباً چھے ہزار عورتیں بچے قید کیے (المقریزی، ۱ : ۳۲۴)۔ ان میں آپؐ کی رضاعی بہن الشیماء بھی تھیں۔ جب آپؐ کو پتہ چلا تو آپؐ نے ان سے بڑی محبت کا برتاؤ کیا اور انعام و اکرام کے بعد رہا کر دیا اور ان کی سفارش پر بجاد نامی اس کے ایک رشتہ دار کو بھی رہا کر دیا، جس نے ایک مسلمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے آگ میں جلایا تھا (المقریزی، ۱ : ۳۱۴)۔ عام قیدیوں کو ایک محفوظ مقام پر چھوڑ کر آنحضرتؐ دشمن کے تعاقب میں بڑھے اور جا کر طائف شہر کا محاصرہ کر لیا۔ وہاں ایرانی ماہرین تعمیرات کی بنائی ہوئی فصیل اور قلعہ تھا اور شہر میں پانی اور غذا کی کافی مقدار موجود تھی۔ اسی لیے منجنیق اور دبابوں کے استعمال کے باوجود شہر زیر نہ ہو سکا۔

کچھ دن کی کوشش کے بعد رفقا کے مشورے سے آپؐ محاصرہ اٹھا کر واپس ہو گئے۔ چونکہ طائف کے اطراف میں اسلام پھیل گیا تھا، اس لیے اس کو مطیع کرنے کے لیے معاشی دباؤ کافی سمجھا گیا؛ چنانچہ ایک سال کے اندر ان کے وفد نے مدینہ منورہ آ کر اسلام قبول کر لیا (تفصیل آگے آئے گی)۔

طائف سے واپسی کے وقت جعرانہ کے مقام پر بنو ہوازن کے مال غنیمت اور قیدیوں کو حسب قانون اہل فوج میں بانٹ دیا۔ یہ آنحضرتؐ کی دودھ پلانے کے خاندان کے لوگ تھے۔ اس کے چند دن بعد ان کا وفد آیا اور اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا اور مال اور عورتوں بچوں کی واپسی کی التجا کی۔ آنحضرتؐ نے کہا: تم نے بہت تاخیر کی ہے۔ اب تو ہر چیز تقسیم ہو چکی ہے؛ تاہم آپؐ نے فرمایا کہ تمھیں ایک ہی چیز واپس مل سکتی ہے، مال یا قیدی۔ انھوں نے قیدیوں کی واپسی کا تقاضا کیا تو آپؐ نے قیدی رہا کر دیے۔ (۱ : ۹۲۴)۔ پھر آپؐ مدینہ منورہ واپس لوٹ گئے؛ [نیز رک بہ حنین؛ طائف]۔

دو ماہ بعد حج کا موسم آیا تو اس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں لوگ جمع تھے اور ہر کسی نے اپنے اپنے انداز سے حج کیا۔ ۹ھ میں حج کے موقع پر سورۃ التوبۃ کا نزول ہوا، جس میں آئندہ سال سے مشرکین کے حج بیت اللہ پر پابندی لگائے جانے کا حکم نازل ہوا تو آپؐ کی طرف سے اس کا موسم حج میں اعلان کیا گیا۔

طائف کا قبول اسلام: طائف کے ایک سردار عُروہؓ ابن مسعود کو اسلام کی ترغیب ہوئی۔ وہ مدینہ منورہ آ کر مسلمان ہو گئے اور درخواست کی کہ انھیں طائف میں تبلیغ اسلام کی اجازت دے دی جائے۔ اس کی جان کے خطرے سے آنحضرتؐ کو تردد تھا، مگر اس کے بار بار کے اصرار پر آنحضرتؐ نے اسے اجازت دے دی، مگر انھیں ان کے ہمسایوں نے شہید کر دیا۔ اس پر اس کے کچھ رشتہ دار مدینہ منورہ آ کر مسلمان ہو گئے۔ اس سے طائف میں اشاعت اسلام کی تحریک مزید بڑھی اور ان کا ایک وفد مدینہ منورہ آیا اور کہا: ہم اسلام لانے کے لیے آمادہ ہیں، البتہ نماز نہیں پڑھیں گے، زکوٰۃ نہیں دیں گے، جہاد نہیں کریں گے، زنا اور شراب سے باز نہیں رہیں گے۔ علاوہ ازیں ہمارا بت خانہ لات نہ توڑا جائے؛ سود بھی ہمارے لیے ممنوع نہ رہے اور ہمارے علاقے کو بھی مکے کی طرح حرم قرار دیا جائے، جہاں کے نہ درخت کاٹے جائیں اور نہ شکار کیا جائے . . . . [آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے منظور نہ کیا]۔ بالآخر کافی مشورے اور غور و خوض کے بعد انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ لات کے بت اور بت خانے کو منہدم کرنے کے لیے حضرت مغیرہؓ بن شعبہ اور ابو سفیانؓ کو بھیجا گیا۔ حضرت مغیرہؓ نے طائف کی ساری آبادی کے سامنے دو چار وار کر کے بت اور بت خانے کا خاتمہ کر دیا۔ اس سے اہل طائف کا ایمان مزید راسخ ہو گیا۔ اس طرح اہل طائف کی عظیم ذہنی اور انتظامی صلاحیتوں سے عہد نبوی سے ہی استفادہ شروع ہو گیا اور خلافت راشدہ میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔

مکہ اور طائف [دونوں شہر سیاسی، اجتماعی اور دینی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتے ہیں]۔ جب یہ دونوں شہر برضا و رغبت اسلامی نظام سے منسلک ہو گئے تو باقی عرب کے لیے معمولی سی بات بھی کافی تھی؛ چنانچہ ایک ہی سال کے اندر بمصداق آیۂ کریمہ: یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (۱۱۰ [النصر] : ۱ - ۲) اسلام لانے کے لیے وفد پر وفد مدینہ منورہ آنے لگے اور اس طرح اسلام کی بیرون عرب کامیابیوں کا گویا راستہ کھل گیا؛ لیکن بیرون عرب کے تعلقات نبوی سے قبل کچھ یہودیوں کا ذکر مناسب ہوگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور یہودی:

یہود کے تعلقات عرب (سبا، یمن) کے ساتھ حضرت

سلیمانؑ کے زمانے سے تھے۔ مختصر تعداد میں یہ لوگ ہر جگہ آباد تھے۔ شمال میں مقنا، تیما، خیبر، وسط میں مدینہ اور طائف، جنوب میں یمن اور عمان وغیرہ میں ان کی قابل لحاظ آبادیاں اور بستیاں تھیں۔ وہ مکہ مکرمہ میں تجارت کے لیے آیا تو کرتے تھے، لیکن وہاں متوطن نہ تھے۔

اسلام کا ان سے سابقہ سب سے پہلے مدینہ منورہ میں پڑا۔ ان کی آبادی وہاں نصف کے قریب تھی۔ وہ تین بڑے قبیلوں میں منقسم تھے: بنو قینقاع، بنو النضیر، اور بنو قریظہ۔ بنو قینقاع زرگر اور تاجر تھے اور مدینے میں سوق بنی قینقاع گویا بین الممالک تجارت کی منڈی تھا۔ [وہ تمام یہودی قبائل سے زیادہ شجاع اور بہادر تھے۔ اسلحہ کے اعتبار سے بھی ان کو تفوق حاصل تھا]۔ بنو النضیر بڑی ذات والے اور بنو قریظہ نیچ ذات والے سمجھے جاتے تھے؛ کیونکہ بنو النضیر کے قاتل قریظہ کے مقتولوں کی صرف نصف دیت (خونبہا) دیا کرتے تھے۔ مقاتل (تفسیر، بذیل ۵ [المائدة] ۴۴) وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مدینہ منورہ آنے پر جب اس نا انصافی کو منسوخ کر کے بنو قریظہ کو بھی دوسروں کے ساتھ مساویانہ حقوق عطا فرمائے تو بڑی ذات والے یہودی اس سے ناراض ہو گئے۔ آپؐ نے نرمی اور شفقت سے ان کو سمجھانے کی بہت کوشش کی، مگر بے سود۔ عبداللہ بن سلام وغیرہ گنتی کے چند لوگ تو خلوص سے مسلمان ہوئے، لیکن باقی اکثر آپؐ کی مخالفت پر کمر بستہ رہے۔ بعد میں کچھ لوگ دنیوی مصلحتوں سے ظاہر داری کے لیے نفاق کے ساتھ اسلام کا اظہار بھی کرنے لگے (ابن ہشام: ص ۳۵۵)۔

[یثرب میں آباد عرب قبائل میں ان یہودیوں نے علمی اور معاشی اعتبار سے اپنی جڑیں خاصی مضبوط کی ہوئی تھیں۔ تجارتی اور خاص کر سودی لین دین کی وجہ سے عرب قبائل کو انھوں نے اپنا دست نگر بنایا ہوا تھا۔ یہ لوگ نہایت بیدردی اور شقاوت قلبی سے سود در سود کی رقوم وصول کرتے رہتے، یہاں تک کہ مجبوری اور بیکسی کی صورت میں معصوم بچوں اور عفیفہ عورتوں کو رہن رکھوا لیتے (دیکھیے البخاری، ۳ : ۷۵، کتاب المغازی، باب ۱۵) اور دو چار روپے کے زیور کے بدلے معصوم جانیں تلف کر دیتے (البخاری، ۴ : ۳۱۷ تا ۳۱۸، کتاب الدیات، باب ۷)۔ دولت کی بہتات سے اور بتوں کے علاوہ ان میں بدکاری عام ہو گئی تھی، تاہم شرفا کے لیے یہ لوگ رجم کے بجائے صرف منہ کالا کرنے پر اکتفا کر لیتے تھے (مسلم، الصحیح، ۳ : ۱۳۲۶، شمارہ ۱۶۹۹، کتاب الحدود)؛ چند کوڑیوں کے بدلے وہ احکام الٰہی میں ترمیم و تنسیخ کر ڈالتے (۲ [البقرة] ۷۹)، ایک دوسرے کا گلا کاٹتے (۲ [البقرة] : ۸۵)؛ شرک و کفر کی حمایت کرتے اور مشرکین کو مسلمانوں سے بہتر بتاتے (۴ [النساء] : ۵۱ تا ۵۲)، خدا کی شان میں گستاخی کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے (۳ [آل عمران] : ۱۸۱)؛ اپنے بعض بزرگوں کو خدا کا بیٹا کہتے یا وہ درجہ دیتے (۹ [التوبة] : ۳۰ تا ۳۱)؛ خدا کے احکام کو لوگوں سے چھپاتے (۲ [البقرة] : ۱۵۹، ۱۷۴ ببعد)؛ حضرت سلیمانؑ کو جادوگر اور حضرت جبریلؑ کو اپنا ازلی دشمن بتاتے (۲ [البقرة] : ۹۷ تا ۹۸، ۱۰۲)؛ اعلانیہ جھوٹ بولتے اور حرام کھاتے (۵ [المائدة] : ۴۲)؛ کوئی امانت سونپتا تو اس میں خیانت کرتے اور کہتے کہ ان جاہل عربوں کا ہم پر کوئی حق نہیں (۳ [آل عمران] : ۷۵)۔ مزید برآں وہ اپنے آپ کو خدا کا بیٹا بتلاتے (۵ [المائدة] : ۱۸)، وغیرہ۔

اس پر مستزاد یہ کہ ان یہودیوں کو قبائل عرب کا اتحاد ایک آنکھ نہ بھاتا تھا؛ چنانچہ انھوں نے ان قبائل عرب کے ساتھ اتحاد کے پردے میں ان کو باہم لڑانے کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا؛ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر یہ لوگ لڑتے

رہیں گے تو ہمارا تجارتی اور سودی کاروبار چلتا رہے گا، ورنہ یہ سلسلہ ختم ہوجائے گا۔ اس بنا پر بلا شبہہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ یہودی عرب معاشرے میں ایک ناسور کی حیثیت رکھتے تھے۔

جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مدینۂ منورہ میں تشریف لائے تو یہودیوں نے یہ محسوس کرلیا کہ اب اس سچے مذہب کی روشنی میں ہمارا کاروبار ختم ہو جائے گا؛ چنانچہ انھوں نے اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف قرآن مجید میں ان کے عیوب و نقائص کو ہدف تنقید بنایا گیا اور انھیں دعوت دی گئی کہ دین اسلام کی روشنی میں وہ اپنے عقیدہ و فکر کی اصلاح کر لیں (دیکھیے ۲ [البقرة] : ۴۰ تا ۱۲۳؛ ۳ [آل عمران] : ۶۴ تا ۹۱، ۱۰۰ تا ۱۲۰، وغیرہ)۔ اس کے علاوہ اسلام کی آمد سے یہود یثرب کا سودی کاروبار مکمل طور سے ختم ہوگیا تھا، کیونکہ اسلام نے روز اول ہی سے سود اور سودی کاروبار کی مذمت شروع کر دی تھی۔ پھر چونکہ ان کے عیوب و نقائص بھی بیان کیے جا رہے تھے، اس بنا پر ان کی ناراضگی اور زیادہ بڑھ گئی؛ تاہم آپؐ نے ان کے بارے میں ہمیشہ تحمل اور بردباری سے کام لیا۔ وہ آپؐ کو سلام کی بجائے سام (موت آئے) کہتے تھے (البخاری وغیرہ)۔ ایک یہودی کا آپؐ پر قرض تھا: اس نے ایک بھری مجلس میں (جب کہ اس کی ادائیگی کا بھی وقت نہ آیا تھا) آپؐ کے گلے میں چادر ڈالی اور زور سے کھینچ کر کہا: اے محمد! تم میرا قرض کیوں نہیں دیتے؟ بخدا تم بڑے نادہندہ ہو۔ حضرت عمرؓ نے اس گستاخی کا مزا چکھانے کی اجازت چاہی تو آپؐ نے فرمایا: اے عمر! تمھیں چاہیے تھا کہ تم اسے حسن طلب کی تلقین کرتے اور مجھے حسن ادا کی۔ پھر آپؐ نے اس کو کھجوریں دینے کا حکم دیا (ابن الجوزی: الوفا)]

جب مدینہ منورہ میں شہری مملکت قائم ہوئی تو یہودیوں کی اکثریت انصار سے اپنی ماتحتانہ حلیفی کی وجہ سے اس میں خود بخود شریک ہو گئی (ابن ہشام، ۲ : ۱۴۹) [بلکہ الزرقانی (شرح المواہب، ۱ : ۵۵) اور ابن سعد (الطبقات، ۲ : ۲۹) کے بیانات میں اس بات کی صراحت ہے کہ ان یہودیوں نے خود آپؐ سے معاہدہ کیا تھا کہ وہ نہ تو آپ کے خلاف لڑیں گے اور نہ کسی دشمن کو مدد دیں گے]، لیکن سماجی تعلقات مسلمانوں کے ساتھ درست نہ رہ سکے۔ جنگ بدر میں مسلمانوں کو فتح ہوئی تو ان میں حسد پیدا ہوا اور مکہ مکرمہ جا کر قریش مکہ کو مسلمانوں کے خلاف اکسانے لگے (ابن ہشام، ۳ : ۵۰ ببعد)۔ اسی زمانے (شوال ۲ھ) میں ایک مسلمان عورت بنی قینقاع کے ایک زرگر کی دکان پر گئی، جس نے اس مسلم خاتون سے توہین آمیز سلوک کیا۔ ایک انصاری مسلمان، جو وہاں سے گزر رہا تھا، برداشت نہ کر سکا اور زرگر کا سر قلم کر دیا۔ دوسرے یہودی آئے اور اس مسلمان کو جان سے مار ڈالا۔ آپؐ ان کی فہمائش کے لیے تشریف لے گئے اور فرمایا: بدر والوں کے انجام سے عبرت پکڑو۔ انھوں نے برجستہ جواب دیا: ہم قریش نہیں؛ ہم سے معاملہ پڑے گا تو ہم دکھا دیں گے کہ لڑائی اس کا نام ہے (ابن ہشام، ۳ : ۵۰)۔ اس طرح جنگ چھڑ گئی۔ پندرہ دن کے محاصرے کے بعد چار سو زرہ پوش اور تین سو دیگر جنگجو مقاتلین کی موجودگی کے باوجود یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ آنحضرتؐ نے ان کی جان بخشی کر دی اور ان کو اسلحہ لے کر شہر سے چلے جانے کی اجازت دے دی۔ یہ آذرعات (فلسطین) چلے گئے۔ اس حادثے کے بعد باقی یہودیوں کی عداوت بڑھ گئی (البلاذری: انساب، ۱ : ۳۰۸ تا ۳۱۰؛ [نیز رک بہ قینقاع])۔

غزوۂ بنی نضیر (ربیع الاول ۴ھ): بنو نضیر اور نجد کے بنو عامر میں معاہدۂ حلیفی تھا (ابن ہشام، ۳ : ۱۹۹)۔ بنو عامر نے مسلمانوں کی ایک تبلیغی

جماعت کو بلا کر غداری سے قتل کر دیا۔ پوری جماعت میں سے صرف حضرت عمروؓ بن امیہ الضمری کسی طرح جان بچا کر مدینہ واپس پہنچے۔ انہوں نے راستے میں بنو عامر کے دو آدمیوں کو سوتے پایا اور ان کے مسلمان ہونے سے ناواقفیت کی بنا پر موقع ملنے پر انہیں قتل کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اطلاع ملی تو آپؐ نے سخت خفگی اور افسوس کا اظہار کیا اور ان کی دیت ان کے رشتہ داروں کو بھیجی۔ حلیف ہونے کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بنو نضیر کے پاس بھی گئے اور دیت میں حصہ لینے کی خواہش ظاہر کی۔ بنونضیر نے [بظاہر تو] مطالبے کو قبول کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو انتظار کرنے کے لیے کہا، [مگر دوسری طرف ایک یہودی عمرو بن جحاش بن کعب ایک پتھر اوپر سے گرانے کے لیے چڑھا۔ یہ] آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے کی ناپاک سازش تھی اور اس طریقۂ قتل کی اس زمانے میں کئی اور مثالیں پیش آ چکی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو سمجھا دیا۔ آپؐ چپکے سے واپس چلے آئے۔ آپؐ نے ان کو تجدید معاہدہ کی دعوت دی، جو انہوں نے رد کر دی۔ اس طرح بنو نضیر سے بھی جنگ چھڑ گئی۔ بجائے عفو طلبی کے وہ مقابلے پر آمادہ ہوگئے۔ دو ہفتوں کے محاصرے کے بعد صلح پر آمادہ ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان سے بڑی رعایت کی۔ انہیں کل مال و متاع سمیت چلے جانے کی اجازت دی؛ صرف اسلحہ اور اراضی کو ضبط کیا؛ حتیٰ کہ ان کے جو قرض مسلمانوں پر تھے ان کی بازیابی کا بھی انہیں حق دیا (السرخسی: شرح السیر الکبیر، ۳: ۱۸۰، ۲۲۹)۔ انہیں یہ رعایت بھی دی کہ وہ بوقت ضرورت تجارت وغیرہ کے لیے مدینہ منورہ آ سکتے ہیں۔ ان کے برے برتاؤ کی وجہ سے جنگ کے زمانے میں بنو قریظہ کا کوئی یہودی ان کی مدد کو نہ آیا (المقریزی، ۱: ۱۷۹)۔ ان کا بڑا حصہ خیبر میں جا بسا اور کچھ فلسطین چلے گئے۔ چند ایک مسلمان بھی ہوگئے۔ ان میں سے جو خیبر میں آباد ہوئے انہوں نے جنگ خندق وہ برپا کرائی، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔

بنو قریظہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بڑی مہربانیاں تھیں۔ آپؐ نے انہیں بنو نضیر کے چھوت چھات سے نجات دلائی تھی، مگر انہیں بھی شکرگزاری میسر نہ آئی۔ غزوہ احزاب (خندق) میں، جب مسلمان سخت کرب کی حالت میں تھے، تو بنو نضیر کے ورغلانے پر بنو قریظہ بھی آمادۂ فساد ہوگئے کہ مسلمانوں کی صفوں پر اندر سے حملہ کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سیاسی اور عسکری دونوں محاذوں پر شدید سرگرمی دکھانے پر جب محاصرہ کرنے والے ناکام واپس ہوگئے تو بنو قریظہ کو اپنے اعمال کا ذمہ دار بننا ناگزیر تھا۔ وینسنک (رسالہ *Der Islam*، ۲: ۲۸۹) نے غیر جانبداری سے معقول بات لکھی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بنو نضیر کے ساتھ بڑی نرمی کا برتاؤ کیا تھا، مگر جواباً انہوں نے خندق کا دہشت ناک محاصرہ کرایا۔ بنی قریظہ کو بھی اس دفعہ معاف کرنے میں ضرورت سے زیادہ خطرات مول لینا تھے۔ بہرحال [مختلف روایات کے مطابق] پندرہ، پچیس یا تیس دن کے محاصرے کے بعد انہوں نے ہتھیار ڈال دیے اور قبول کیا کہ ان کے حلیف انصار [بنو اوس] ان کی تحکیم کریں۔ بنو اوس کے سردار حضرت سعدؓ بن معاذ نے جو زخمی تھے، فیصلہ دیا کہ یہود پر یہودی قانون (تورات کا حکم) ہی نافذ کیا جائے (جو کتاب استثنا، ۲۰: ۱۰ تا ۲۰ میں ہے)۔ تورات کا حکم یہ تھا کہ مقاتلین قتل کیے جائیں؛ عورتیں بچے غلام بنائے جائیں۔ یہ فیصلہ سخت تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مجبور تھے کہ حکَم کے فیصلے کا احترام

کریں۔ کچھ قریظی یہودی مسلمان ہو گئے تھے، انہیں اس حکم سے مستثنیٰ رکھا گیا۔ اس طرح یہود سے برتاؤ کی ایک منفرد نظیر قائم ہو گئی۔ یہودی افراد کی موجودگی مدینہ منورہ میں کم ہوئی، مگر مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی۔ بنو عُریض وغیرہ کے چند قبائل پھر بھی باقی رہے۔ ان میں سے بعض کو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے عطیات بھی دیے (الوثائق السیاسیۃ، عدد ۲۰)۔ اس کے علاوہ بعض یہودی تجارت سے مرفّہ الحال ہوتے رہے۔ آپؐ نے ایک یہودی کے پاس اپنی زرہ رہن رکھوا کر، وصال سے کچھ روز قبل، کچھ غلہ قرض لیا تھا۔ آپؐ کے وصال تک وہ زرہ اسی یہودی کے پاس رہی (البخاری، کتاب البیوع (۳۴)، باب ۸۷؛ ابن سعد، ۱ ۲ : ۳۱۷)۔

غزوۂ خیبر: جیسا کہ دیکھا گیا مدینہ منورہ کے باہر اسلام سے سب سے زیادہ عداوت، خیبر کے یہودیوں کو تھی۔ جنگ خندق کے وہ براہ راست ذمہ دار تھے اور بنو قریظہ کی جنگ کے بھی بالواسطہ وہی باعث ہوئے تھے، لیکن ان کی ساری جانی و مالی قوت ہنوز خیبر میں محفوظ تھی۔ صلح حدیبیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے قریش کو اہل خیبر سے الگ کر دیا؛ پھر چند ہفتے بعد محرم سنہ ۷ھ میں پندرہ سو مسلمانوں نے خیبر کے، بروایت یعقوبی (۲ : ۵۶) بیس ہزار اور بروایت مقریزی (۱ : ۳۱۰) دس ہزار مقاتلین کو کچھ اس طرح زیر کیا کہ پھر آئندہ انہیں کبھی اسلامی حکومت کے خلاف سر اٹھانے کی جرأت نہ ہو سکی۔ اسی مہم خیبر کے دوران میں تیماء اور فَدک کے یہودی بھی لڑے بغیر مطیع ہو گئے اور اہل خیبر کی شرائط پر معاہدۂ اطاعت کرنا منظور کیا، یعنی وہاں کی زمینیں سرکاری سمجھی جائیں گی اور وہ زمینوں پر زراعت کر کے سالانہ نصف پیداوار لگان میں دیا کریں۔ (نصف پیداوار کا دینا خود مدینہ منورہ کے مسلمانوں میں بھی بروایت بخاری رائج تھا، یہ اس زمانے کا عام درآمد تھا؛ کوئی خصوصی سختی نہیں)۔

غیر مسلم رعایا پُرامن اور آئین پسند رہے تو اسلامی حکومت سے زیادہ روادار تاریخ میں کوئی اور قوم نہیں مانتی۔ [اسلامی تعلیمات کے مطابق یہ بحث اپنی جگہ آئے گی۔ مختصراً یہی کافی ہے کہ (اسلامی تعلیمات کے مطابق) غیر مسلم اپنے مقدمات اپنی عدالتوں میں لے جا سکتے ہیں اور اپنے ہی قانون کے تحت]۔

آنحضرتؐ اور عرب قبائل: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا مقصد عقائد و اخلاق کی اصلاح تھا؛ حکومت اور فتوحات نہیں۔ اسی لیے آپؐ کی طرف سے جھگڑے مول لینے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ اسی بنا پر قریش اور ہوازن اور ان کے حلیف قبائل کے سوا دیگر اور قبائل عرب سے شاذ ہی کوئی جھگڑا ہوا۔ خود دین بھی چونکہ جبر و اکراہ کا مخالف تھا: اس لیے امن پسند بت پرستوں سے کوئی تعرض نہ کیا گیا۔ مدینہ منورہ میں بھی ایسے لوگ آخر تک موجود رہے اور اسلامی ثقافت کے عالمگیر سمندر میں فاسد عقیدے خود بخود ختم ہوتے رہے۔ ہجرت کے فوراً بعد مدینہ منورہ کے شمال اور جنوب میں بسنے والے قبائل (بنو جُہینہ، بنو ضمرہ، بنو غِفار، بنو اسلم وغیرہ) سے حلیفی کے معاہدے کیے گئے اور ان غیر مسلم قبائل کو نہ آپؐ کی طرف سے کبھی بد عہدی کی شکایت ہوئی اور نہ خود ان کی طرف سے غداری ہوئی۔ وہ آہستہ آہستہ بغیر جبر کے خود بخود مسلمان ہو گئے، جن میں سے بعض فتح مکہ سے بھی بعد میں مسلمان ہوئے۔

بنو ہوازن اور بنو سُلَیم، جن سے قریش کے علاوہ مخاصمت ہوئی، نہ صرف ہم جد قبائل تھے، بلکہ ان میں باہمی حلیفی کے معاہدے بھی موجود تھے۔ بنو سلیم پر تمام عرب پر حکومت کرنے کا خبط سوار تھا اور بنو ہوازن کو اپنے بت خانہ لات کے باعث مکہ مکرمہ

اور بیت اللہ شریف سے ہمسری کا دعوٰی تھا ۔ توحید کی دعوت سے اہل مکہ کی طرح ان کی مخالفت شرک دوستی کا نتیجہ تھی ۔ نجد کے بنو عامر بن صعصعہ انہیں کی ایک شاخ تھے ۔ اگر یہ خود اسلام اور اسلامی حکومت کے خلاف جارحانہ کارروائیاں نہ کرتے تو ان سے جو مختصر جھڑپیں ہوئیں ، وہ بھی شاید نہ ہوتیں ۔ بنو غطفان اور بنو فزارہ عرب کے دو طاقتور قبیلے تھے ان سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا سامنا ہوا ۔ یہ اپنے سردار عُیینہ بن الحِصن الفزاری کی کج طبعی کے باعث اسلام اور اسلامی حکومت کے مخالف رہے ۔ اسی طرح قریش اور اہل خیبر انہیں گمراہ کرتے رہے ، مگر بعد ازاں جب حالات سازگار ہو گئے تو یہ بھی مسلمان ہو گئے ۔ اور خلافت راشدہ کی فتوحات میں شریک ہو کر اسلامی سلطنت کی توسیع کا سبب بنے ۔

جزیرہ نمائے عرب کا زرخیز ترین علاقہ جنوب میں یمن اور مشرق میں بحرین و عمان ایرانی نو آبادی پر مشتمل تھا ۔ شمالی سرحد میں رومی اثرات روز افزوں تھے ۔ عرب میں شمالی قبائل زیادہ تر عدنانی تھے ؛ بجز مدینہ منورہ کے ، جہاں کے انصار یمنی الاصل تھے اور جنوب (یمن) میں قحطانی ؛ ان میں دشمنی اور مناقشت قدیم زمانے سے ہی موجود تھی ۔ بنو عدنان میں اہل مکہ اور اہل طائف وغیرہ مضر شاخ سے تعلق رکھتے تھے تو نجد اور مشرقی عرب میں جہاں ایرانی نفوذ تھا ، ربیعہ شاخ تھی ۔ کسرائے ایران کے عطا کردہ تاج اور ماتحتی پر نجد کے بنو حنیفہ اپنے چھوٹے سے علاقے میں اپنے آپ کو بہت اونچا سمجھتے ۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان کو اسلام کی دعوت دی تو ہوذہ بن علی نے کہا : مجھے اپنے ساتھ سارے عرب کا شریک حکمران بنا لو تو اسلام قبول کرتا ہوں ۔ ہوذہ کی وفات پر مسیلمہ کذاب [رک باں] کو بھی یہی خبط سمایا ؛ چنانچہ اس نے جھوٹی نبوت کا دعوٰی کر کے مخالف اسلام قوتوں کو اپنے ماتحت جمع کر کے اسلام کے خلاف محاذ قائم کر لیا ، مگر اس کی کوشش پانی کا بلبلہ ثابت ہوئی جو ہلکی سی ضرب سے ختم بھی ہو گئی [رک بہ ابوبکرؓ] .

عرب کے انتہائی مشرق بحرین اور عمان میں اسلام برضا و رغبت قبول کیا گیا ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ دونوں علاقے پہلے ایرانی نو آبادی تھے ۔ اسلامی حکومت کی وجہ سے انہوں نے ایرانی استبداد سے نجات پائی تھی ۔ ایران کی موجودگی کے باوجود یہاں مجوسیت [رک بہ مجوس] زیادہ پھیلی ہوئی نہ تھی ۔ عمان میں تو معمولی بتوں کی جگہ اسبذ یعنی گھوڑے [ابو عبید : کتاب الاموال ، ۲۹) کی پوجا کرنے والے بھی کافی با اثر تھے (الوثائق السیاسیۃ ، عدد ٦٦) ۔ بہر حال الاحساء کے حکمران المنذر بن ساوی نے اور عمان کے مشترک حکام جیفر بن الجلندی اور عبد بن الجلندی نے تبلیغی مکتوبات نبوی پر فوراً اسلام قبول کر لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اسلام سارے مشرقی عرب میں حکمرانی کرنے لگا [نیز رک بہ عمان] .

یمن سے کوئی جھگڑا ہوا ہی نہیں ۔ نجران وغیرہ کے بنو حارث جو بت پرست تھے ، حضرت خالدؓ بن الولید اور حضرت علیؓ کی پرامن تبلیغی کوششوں سے بہت جلد اور بآسانی مسلمان ہو گئے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان کو دیکھا تو بہت خوش ہوئے ۔ وہاں جو نصرانی آباد تھے انہوں نے اولاً علمی بحث کے لیے ایک وفد مدینہ منورہ بھیجا تا کہ نصرانی عقائد کا اثبات کرے [رک بہ مباہلہ] ۔ عقائد کے معاملات میں ریاضیاتی دلیلیں تو پیش نہیں کی جا سکتیں ؛ [چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سامنے پہلے تو براہین قاطعہ پیش فرمائے ، مگر پھر باذن خداوندی (۳ [آل عمران] : ٦) مباہلے کی دعوت پیش کی جس سے اہل نجران گھبرا گئے ۔ بالآخر ایک باہمی معاہدہ ترتیب پا گیا] ، جس میں آپؐ کی طرف سے مذہبی

آزادی وغیرہ کا اطمینان دلایا گیا؛ پھر خود انھوں نے درخواست کی کہ ایک مسلمان کو ان پر حاکم عدالت بنا کر ان کے ہاں بھیجا جائے (ابن ہشام، ۲ : ۲۲۲ تا ۲۲۳؛ نیز [رک بہ نجران])۔

گمان ہوتا ہے کہ قبیلہ عنس اور قبیلہ بلحارث (بنو حارث) میں بھی رقابت تھی۔ بلحارث مسلمان ہو گئے تو عنس کو اسلام سے کد پیدا ہو گئی؛ چنانچہ اسود عنسی [رک بآں] نے جھوٹی نبوت کا دعوی کر کے نام نہاد صوبائی عصبیت کا علم بلند کیا، لیکن مقامی نو مسلموں نے چند ہی ہفتوں میں اس تحریک کو ختم کر دیا تھا۔

شمال مشرق میں بنو تمیم اور شمال میں بنو طیّئ اور بنو کلب سے بھی برائے نام جھڑپیں ہوئیں اور ان میں بھی اسلام، خاص کر فتح مکہ کے بعد، تیزی سے پھیل گیا اور اس طرح سارا عرب اسلام کے زیر نگین ہو گیا۔ سنہ ۹ھ کو عام الوفود کہا جاتا ہے۔ بیسیوں قبائل عرب کے وفد مدینہ منورہ خود بخود حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوے۔ (دیکھیے ابن سعد: الطبقات، ۱ : ۲۹۱ تا ۳۵۹، مطبوعہ بیروت ۱۹۶۰ء)۔

بیرون عرب تبلیغ: جیسا کہ اوپر اشارۃً ذکر ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حدیبیہ میں قریش سے مصالحت کے بعد مدینہ منورہ پہنچتے ہی روم، ایران، مصر اور حبشہ کے حکمرانوں کو تبلیغی خطوط بھیجے۔ یہ سنہ ۷ھ کا آغاز تھا۔ حبشہ [رک بآں] سے روابط اس تاریخ سے بہت پہلے شروع ہو چکے تھے۔ اس موقع پر نجاشی [رک بآں] کے نام آپؐ نے جو تبلیغی خط ارسال کیا وہ ہرقل کو آپؐ کے لکھے ہوے خط سے مشابہ ہے (الوثائق السیاسیۃ، عدد ۲۲)۔ یہ مکتوب سنہ ۷ھ کا ہونا چاہیے۔ اس کا ایک جواب بھی (حوالۂ مذکور، عدد ۲۳) ملتا ہے، جس میں حبشہ کے حکمران نجاشی کی طرف سے اسلام اس سے بھی ہوتی ہے کہ البخاری (۲۳ : ۵۴، ۶۱؛ [۱ : ۳۳۱، ۳۳۳ تا ۳۳۴]) نے روایت کی ہے کہ نجاشی کی وفات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مدینہ منورہ میں غائبانہ نماز جنازہ ادا فرمائی۔ امام مسلم کے مطابق نئے نجاشی کو بھی آپؐ نے تبلیغی خط بھیجا، مگر بظاہر وہ بے سود رہا (دیکھیے الوثائق السیاسیۃ، عدد ۲۵)۔ نجاشی کے نام کا ۷ھ والا اصل خط اب دستیاب ہو گیا ہے (الوثائق السیاسیۃ، ص ۴۵، مطبوعۂ قاہرہ ۱۹۵۶ء)۔

ہرقل شہنشاہ روم کو ۷ھ میں ایک تبلیغی خط بھیجا گیا (الوثائق السیاسیۃ، عدد ۲۶)۔ ہرقل سے آپؐ کے سفیر کی ملاقات بیت المقدس میں ہوئی جہاں ہرقل ایران کی فتح پر نماز شکرانہ کے لیے گیا ہوا تھا۔ سفیر کا اعزاز تو ہوا، لیکن یونانی عوام کے شدید دینی تعصب کو دیکھ کر ہرقل نے معذرتی جواب بھیجا (عدد ۲۸)۔ ادھر سے مایوس ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مختلف بوزنطی افسروں کو جو عربی النسل تھے براہ راست تبلیغی خطوط بھیجے؛ ان میں سے ایک خط (حوالۂ مذکور، عدد ۳۷) کے قاصد کو قبیلۂ غسان کے ایک افسر نے دمشق کے قریب قتل کر دیا۔ یہ قانون بین الممالک کی کھلی خلاف ورزی تھی۔ اس پر ہرقل کو مکرر خط لکھا گیا (حوالۂ مذکور، عدد ۲۷) کہ وہ اسلام لائے، یا جزیہ دے، یا کم از کم اپنی رعایا میں سے مسلمان یا ذمی بننے کے خواہشمندوں کو نہ روکے۔ ہرقل نے اسے اپنے خلاف دھمکی سمجھ کر، ایران سے جنگ کے لیے جمع کی ہوئی فوج میں سے ایک لاکھ آدمی سرحد پر مسلماتوں کے مقابلے کے لیے بھیج دیے۔ مؤتہ (اردن) [رک بآں] میں ان کی (تین ہزار) مسلمان فوج سے مڈھ بھیڑ ہوئی (۸ھ)۔ معان کا گورنر فروہ بن عمرو الجُذامی بھی، غالباً ایک تبلیغی خط پر مسلمان ہو گیا

اطلاع بھیجی (حوالۂ مذکور، عدد ۳۵)۔ ابن ہشام کے مطابق ہرقل نے اسے قتل اور سولی کی سزا دی۔ سفیر کے قتل کی تلافی سے انکار پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ایک بڑی فوج لے کر تبوک گئے (۹ھ)۔ اس پر ہرقل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سامنا کرنے سے گھبرایا۔ تبوک کی مہم کے دوران میں آپؐ نے بوزنطینی علاقوں میں سے دُومۃ الجندل، مَقنا، اَیلہ، جرباء اور اَذرح پر قبضہ کر لیا اور ان سے معاہدات فرمائے (حوالۂ مذکور، عدد ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ایک خط ضغاطر اسقف روم کے نام بھی ملتا ہے (الوثائق السیاسیۃ، عدد ۲۹)۔ اسی طرح ایلہ کے اسقف کے نام بھی آپ نے ایک مکتوب ارسال کیے (عدد ۳۰)، جس میں آپ نے ان کو اسلام لانے ورنہ جزیہ دے کر ذمی بننے کی دعوت دی، اور بصورت دیگر فوجی کارروائی کی اطلاع دی تھی۔ تبوک کی کامیاب مہم کے باوجود سفیر کے قتل کا مسئلہ حل نہ ہوسکا۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مرض الوفات میں حضرت اسامہؓ بن زیدؓ، جن کے والد حضرت زیدؓ بن حارثہ غزوہ مؤتہ میں شہید ہوگئے تھے، کی سرکردگی میں ان کی تادیب کے لیے ایک فوج تیار کی۔ اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابوبکرؓ صدیق نے اپنی خلافت کے دوران میں روانہ کیا، مگر سامنا پھر بھی نہ ہوا۔

مصر پر ایرانیوں نے قبضہ کر لیا تھا، لیکن جب نینوی میں ہرقل نے ان کو شکست فاش دی، تو مصر، شام اور دیگر مفتوحہ علاقے دوبارہ بوزنطی مملکت میں آ گئے۔ فتح کے بعد قیصر روم کی فوج ابھی مصر آئی نہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسکندریہ کے قبطی سربراہ اور صدر پادری مقوقس کو ایک تبلیغی خط بھیجا۔ جواب میں سفارتی اخلاق تو برتے گئے اور کچھ تحفے تحائف بھی بھیجے گئے، لیکن قبول اسلام کے سلسلے میں اس نے شائستہ طور پر معذرت کر دی (عدد ۵۰)۔ مکتوب نبوی بنام مقوقس کی اصل بھی دستیاب ہو چکی ہے (دیکھیے الوثائق السیاسیہ، عدد ۷۲)۔

ایران نے کئی صدیوں سے مشرق عرب پر اور تقریباً نصف صدی سے جنوبی عرب (یمن) پر قبضہ کر رکھا تھا۔ پایۂ تخت ایران کے اخلاقی انحطاط کے باعث اس کے زیر نگین علاقوں میں استبداد اور بے اصولی پیدا ہو گئی تھی۔ اس سیاسی اور نفسیاتی کشمکش کے ماحول میں سنہ ۷ھ کے آغاز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے "کسریٰ شاہ فارس" کو ایک تبلیغی خط لکھا (حوالۂ مذکور، عدد ۵۳) اور مشرق عرب کے ایرانی افسروں کے توسط سے مدائن بھجوایا۔ مضمون سن کر بادشاہ کو اتنا غصہ آیا کہ اس نے پورا خط سنے بغیر ہی چاک کر دیا اور [تمام سفارتی آداب واخلاق کو بالائے طاق رکھتے ہوئے] سفیر کو ذلت کے ساتھ اپنے دربار سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد حسب عادت آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایران کے ماتحت افسروں اور حکمرانوں کو براہ راست خطوط لکھے۔ ایک خط سماوہ کے حکمران کے نام بھی ہے، جو جنوبی عراق میں ہے (حوالۂ مذکور، عدد ۵۵)؛ وہ غالباً عربی النسل تھا، مگر اس کا جواب معلوم نہیں۔ بحرین اور عمان کے گورنر اور حکمران بھی آپ کی تبلیغ سے مسلمان ہو گئے۔ عمان میں مدینہ منورہ سے حضرت عمروؓ بن العاص کو بھیجا گیا کہ اسلامی تعلیم و تربیت اور زکوٰۃ وغیرہ کے وہ ذمہ دار رہیں۔ جبکہ غیر مسلموں کا جزیہ اور دیگر انتظام مقامی حکمرانوں: جیفُر بن الجُلَندی اور عبد [یا: عیاذ] بن الجلندی، سے متعلق رہے۔ عمان میں دبا کی بندرگاہ بڑی اہم تھی اور وہاں کے سالانہ میلے میں ہندوستان اور چین وغیرہ کے تاجر بھی آتے تھے۔ وہاں کے لیے [حضرت حذیفہؓ کو بطور] خصوصی والی مدینہ منورہ سے بھیجا گیا [(انساب الاشراف، ۱: ۵۳۹)]۔

ایران سے قربت بحرین اور عمان سے کہیں زیادہ یمن

میں تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ باذان (یا: باذام) بن ساسان نامی یمن پر ایرانی گورنر نے خلوص کے ساتھ اسلام قبول کرلیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اسے اس عہدے پر بحال رکھا اور کچھ عرصہ بعد سنہ ۱۰ھ میں اس کی وفات ہوئی تو اس کے بیٹے شہر بن باذان کو وہی منصب عطا فرمایا اور عامر بن شہر (مؤخرالذکر کے بیٹے) کو علاقے کی گورنری مرحمت فرمادی۔ ایرانی مقبوضات میں اسلام کے روز افزوں پھیلنے سے گھبرا کر چند سال بعد ملکہ پوران دخت نے بروایت ترمذی و طبری ایک سفیر مدینہ منورہ بھیجا اور تحفے تحائف بھیج کر سابقہ غلطی کی تلافی کی کوشش کی، مگر وہ خود زیادہ دن تخت پر نہ رہ سکی۔

حِجَّۃُ الْوَدَاع: فتح مکہ کے سوا سال بعد ذوالحجہ ۹ھ میں حج کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف سے منٰی وغیرہ میں اعلان کیا گیا کہ غیر مسلم قبائل کو چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے کہ نئے انتظامات کر لیں اور یہ کہ آئندہ سے بیت اللہ شریف صرف اہل اسلام کے لیے مختص ہوگا؛ غیر مسلم اس کے حج کے لیے نہ آئیں۔ یہ اعلان سیاسی و دینی اہمیت رکھتا تھا، لیکن اس سے قطعاً کوئی دشواری پیش نہ آئی؛ کیونکہ رفتہ رفتہ جملہ اہل عرب حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔ وہ کے اس اعلان کے بعد سے حاجیوں کی تعداد روز افزوں رہی اور سنہ ۱۰ھ میں جب آپ حجۃ الوداع کے لیے تشریف لائے تو ایک لاکھ چالیس ہزار کا غیر معمولی اور عظیم الشان اجتماع تھا۔ یہ حج آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رسالتی زندگی کا اکمال اور اسلام کی تعلیمات کا اتمام تھا۔ فریضۂ نبوت کے حسن تکمیل پر خداوند تعالٰی نے فرمایا: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (۵ [المائدۃ]: ۳)، یعنی آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے بطور دین کے اسلام پسند کر لیا۔ اس سے بڑھ کر مسلمانوں کو کس چیز سے خوشی ہو سکتی تھی۔

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ہجرت کے بعد پہلا اور آخری حج تھا۔ آپؐ کے حج کو جانے کی خبر پھیلی تو تمام مسلم علاقوں سے مسلمان حج کو آئے۔ اس حج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حج کے مناسک ادا فرما کر امت کے سامنے عمدہ مثال پیش کی۔ اس کے علاوہ لوگوں کے سوالوں کا جواب دیا اور وقوف عرفات کے موقع پر جبل الرحمۃ پر چڑھ کر اپنا شہرۂ آفاق خطبہ حجۃ الوداع دیا۔ آپؐ کے چاروں طرف ایسے افراد مقرر کیے گئے جو آپؐ کے ہر ہر جملے کو مکبّروں کی طرح باآواز بلند دہراتے تھے۔ اس طرح تقریباً ڈیڑھ لاکھ حاضرین اس کو بخوبی سن رہے تھے۔ اس میں حمد و صلوٰۃ کے بعد آپ نے فرمایا: لوگو میری باتوں کو غور سے سنو۔ ممکن ہے کہ اس سال کے بعد میں تم سے اس مقام پر نہ مل سکوں؛ اے لوگو! حقیقت میں تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں تمہارے لیے تمہارے رب سے ملنے تک (ہمیشہ کے لیے) محترم ہیں، اتنے ہی محترم جتنا کہ آج کا دن اور یہ مہینا اور یہ مقام ہے۔ ہاں! کیا میں نے خدائی پیغام پہنچا دیا؟ اے اللہ! گواہ رہنا؛ کسی کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو وہ صاحب امانت کو واپس کر دے؛ بے شک زمانۂ جاہلیت کا سود (ربٰو) ختم کر دیا گیا ہے؛ البتہ تمہیں قرض کے اصل سرمائے کی بازیابی کا حق ہے؛ نہ ظلم کرو، نہ ظلم سہو؛ اللہ نے حکم دیا ہے کہ سود نہ رہنے پائے؛ سب سے پہلا سود جس (کی منسوخی) سے میں آغاز کرتا ہوں، وہ میرے چچا حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کا سابقہ واجب الادا سود ہے؛ بے شک زمانۂ جاہلیت کے خون ختم کر دیے گئے ہیں

اور سب سے پہلا خون جس (کی منسوخی) سے میں آغاز کرتا ہوں وہ (میرے چچا زاد بھتیجے) ربیعہ بن الحارث بن عبدالمطلب کے بیٹے کا خون ہے۔ [ربیعہ بن الحارث کے بیٹے آدم کو شرفاے مکہ کے دستور کے مطابق دودھ پلانے کے لیے قبیلہ ھذیل کے سپرد کیا گیا تھا۔ ننھا منھا آدم بن ربیعہ ایک دن گھر کے سامنے بیٹھا تھا کہ بنو لیث کے ایک آدمی نے پتھر مارا جس سے بچہ وہیں جاں بحق ہوگیا۔ یہی پہلا خون تھا۔ جس کا قصاص یا بدلہ نبی کریم علیہ و آلہ وسلم نے اس مبارک تقریب میں معاف فرما دیا (ابن حزم : جمہرۃ انساب العرب، ص ۷۰ ؛ الروض الانف، ۲ : ۳۵۱ تا ۳۵۲ ؛ انساب الاشراف، ۱ : ۳۶۳)] ؛ بے شک زمانۂ جاھلیت کے جملہ امتیازات ختم کر دیے گئے ہیں، بجز کعبے کی رکھوالی اور حاجیوں کو پانی پلانے کے کام کے ؛ قتل عمد میں قصاص لیا جائے گا ؛ قتل خطأ وہ ہے کہ جب کسی کو لاٹھی یا پتھر مارنے سے قتل کیا جائے اور اس میں سو اونٹ (بطور خونبہا) ہیں۔ جو اس سے زیادہ (مانگے) تو وہ زمانۂ جاھلیت والوں میں سے ہوگا ؛ اے لوگو! شیطان اس سے تو مایوس ہو چکا ہے کہ تمہاری اس سر زمین میں اس کی عبادت کی جائے، لیکن وہ اس پر راضی ہے کہ اس (بت پرستی) کے سوا دوسرے ایسے کاموں میں اس کی بات مانی جائے جن کو تم حقارت سے دیکھتے ہو۔ اپنے دین کے متعلق شیطان کی چالوں سے بچتے رہو! اے لوگو! نسیء (قمری سال کو شمسی سال کے برابر کرنے کے لیے اس میں وقتاً فوقتاً مہینوں کا اضافہ کرنا) کفر میں زیادتی ہے۔ اس سے جو لوگ کافر ہیں وہ گمراہ ہوتے ہیں، ایک سال تو وہ (ایک مہینے کو) حلال قرار دیتے ہیں اور دوسرے سال اسے حرام مہینہ، تا کہ (مہینوں کی) اس تعداد کو (ظاہری طور پر) برابر رکھیں جو اللہ نے حرام قرار دیا ہے، اس طرح اس مہینے کو حلال کر دیں جو اللہ نے حرام کیا ہے اور حرام کر دیں اس کو جو اللہ نے حلال کیا ہے۔ حقیقت میں (کبیسہ والی اور غیر کبیسہ والی تقویموں میں) زمانہ گھوم کر اب دوبارہ اسی شکل پر آ گیا ہے جیسا اس دن تھا جب اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا۔ حقیقت میں اللہ کے نزدیک، اس کی تقدیر میں سال کے، اس دن سے بارہ مہینے ہی تھے جب کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا۔ ان میں چار حرمت کے مہینے ہیں، تین پے در پے اور ایک منفرد ؛ ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور قبائل مضر کا رجب، جو جمادی الآخرۃ اور شعبان کے بیچ میں آتا ہے۔ ہاں! کیا میں نے (خدائی پیغام) پہنچا دیا؟ اے اللہ! گواہ رہنا! اے لوگو! بے شک تمہاری بیویوں کا تم پر حق ہے اور تمہارا ان پر حق ہے۔ تمہارا حق ان پر تو یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر تمہارے سوا کسی اور کو (بدکاری کے لیے) روندنے نہ دیں، اور تمہارے گھروں میں کسی ایسے شخص کو داخل نہ ہونے دیں، جس کو تم پسند نہ کرتے ہو، بجز تمہاری اجازت کے اور یہ کہ بیویاں کوئی فحش کام نہ کریں، لیکن اگر وہ ایسا کریں تو بے شک اللہ نے تمہیں پورا حق دیا ہے کہ ان کو (اس سے) منع کرو اور ان کو بستروں میں سزا کے طور پر تنہا چھوڑ دو اور ان کو مارو، لیکن ایسی مار جو سخت نہ ہو۔ اگر وہ (فحش کاری سے) رک جائیں اور تمہاری بات مانیں تو تم پر واجب ہے کہ ان کو رسم و رواج کے مطابق مناسب غذا اور لباس مہیا کرو۔ اور بیویوں سے اچھے برتاؤ کے متعلق تاکید کو سنو ؛ کیونکہ حقیقت میں وہ تمہارے ماتحت سی ہوتی ہیں۔ ہاں! کیا میں نے پہنچا دیا؟ اے اللہ! گواہ رہنا ؛ اے لوگو! تمام مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں اور کسی مومن کے لیے اس کے بھائی کا مال حلال نہیں بجز اس کی رضامندی کے۔ ہاں، کیا میں نے پہنچا دیا؟ اے اللہ! گواہ رہنا ؛ میرے بعد کافر بن

کر ایک دوسرے کی گردنیں ہرگز نہ مارنا؛ میں تم میں دو ایسی چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ اگر تم ان کو تھامے رہوگے تو کبھی بھٹکنے نہ پاؤگے: اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت۔ ہاں، کیا میں نے پہنچا دیا؟ اے اللہ گواہ رہنا۔ اے لوگو! بے شک تمہارا رب بھی ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے تم آدم سے (نکلے ہو اور آدم مٹی سے بنے)۔ تم میں سے خدا کے نزدیک سب سے باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ اور کسی عربی کو کسی عجمی نہ کسی عجمی کو عربی پر؛ کسی سرخ کو کالے پر اور کسی کالے کو سرخ پر (مسند احمد بن حنبل] بجز تقوی کے کوئی فضیلت نہیں۔ ہاں، کیا میں نے خدائی پیغام پہنچا دیا؟ لوگوں نے یک زبان ہو کر کہا: ہاں بے شک۔ تو آپ نے فرمایا: اے اللہ! گواہ رہنا۔ آپ نے کلام جاری رکھتے ہوئے مزید فرمایا: تو پھر حاضر شخص (یہ باتیں) غیر حاضر تک پہنچا دے۔

اے لوگو! بے شک اللہ تعالی نے ہر وارث کے لیے (مرنے والے کی) میراث میں اس کا حصہ مقرر کر دیا ہے اور کسی وارث کے لیے کوئی (مزید) وصیت جائز نہیں اور وصیت (ترکے کے) ایک تہائی سے زیادہ کے لیے درست نہیں اور بچہ بستر کے مالک (عورت کے شوہر) کا سمجھا جائے گا، اور زنا کار کو پتھراؤ کیا جائے گا اور جو اپنے باپ کے سوا کسی اور سے نسب کا، یا اپنے مولٰی کے سوا کسی اور کے مولی ہونے کا دعوٰی کرے تو اس پر اللہ، فرشتوں اور سارے لوگوں کی لعنت ہو؛ ایسے شخص سے (قیامت کے دن) نہ کوئی معاوضہ قبول ہوگا اور نہ (فعل کے) کوئی مماثل چیز؛ والسلام علیکم۔ [تفصیل کے لیے دیکھیے: الوثائق السیاسیۃ، عدد ٢٨٧/الف؛ ابن سعد: الطبقات، ٢: ١٧٢ تا ١٧٩؛ ابن ہشام: سیرۃ، ٤: ٢٤٨ تا ٢٥٣؛ الواقدی: المغازی، ٣: ١٠٨٨ تا ١١٠٣؛ وغیرہ]۔

الطبرانی کی روایت میں یہ جملہ بھی ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں اور تمہارے بعد کوئی امت نہیں۔ اس لیے اپنے رب کی عبادت کرو، پانچ وقت کی نمازیں پڑھو؛ رمضان کے روزے رکھو، اپنے انتظامی افسروں کی اطاعت کرو تو اپنے رب کی جنت میں داخل ہوگے۔

یہ خطبہ بلاغت نبوی کے اعلٰی نمونہ کے حامل ہونے کے علاوہ اسلامی قانون و اخلاق کا بھی جامع ہے۔ [نیز رک بہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بحیثیت خطیب]۔

خطبۂ خم غدیر: حضرت علیؓ کو تبلیغ اور وصولی زکوٰۃ وغیرہ کے لیے یمن بھیجا گیا تھا۔ واپسی میں وہ حج کے زمانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے مکے میں ملے۔ ان کے ہمراہیوں نے، حق کے معاملے میں ان کی سختی کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے شکایت کی تو آپؐ نے حج سے واپسی پر مقام خم غدیر [رک بآں] (رابغ) میں پڑاؤ ڈالا اور لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت علیؓ کے طرز عمل کی تائید کی اور ان سے اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ اس طرح معاملہ رفع دفع ہو گیا اور آپ مدینہ منورہ تشریف لائے۔

مرض الوفات: سفر حج سے واپسی پر دو مہینے گزرے تھے کہ ١٨ یا ١٩ صفر ١١ھ میں ایک روز آدھی رات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم یکایک بستر سے اٹھے اور ایک خادم ابو رافع یا ابو مُوَیہبہ کو ساتھ لے کر جنۃ البقیع کے قبرستان میں تشریف لے گئے اور اپنے پرانے رفقا کے لیے دیر تک دعا و استغفار کرتے رہے؛ پھر خادم سے کہا: خدا نے مجھے اپنے ہاں آجانے اور دنیا میں تاقیامت رہنے کا اختیار دیا تو میں نے اس کے ہاں جانے کو ترجیح دی ہے۔ واپس لوٹے تو سر درد سے مرض کی ابتدا ہو چکی تھی (ابن سعد: الطبقات، ٢: ٢٠٣ تا ٢٠٥)۔ طبیعت مضمحل ہوتی گئی اور ضعف روز بروز

بڑھتا گیا، [مگر اس کے باوجود آپؐ نے ازواج مطہرات کے گھروں میں باری کے مطابق جانے کا سلسلہ جاری رکھا] اور جب چلنا پھرنا دشوار ہو گیا تو ازواج مطہرات سے کہا : ہر رات ایک بیوی کے ہاں جانے کی جگہ تیمار داری ایک ہی جگہ ہو تو اچھا ہے۔ سب نے قبول کیا۔ [یہ بھی آپؐ نے صراحۃً نہیں کہا، بلکہ کنایۃً ظاہر کیا؛ وہ یوں کہ یک شنبہ کی شام کو جب ازواج مطہرات جمع تھیں، آپؐ نے پوچھا کل کس کے گھر پر رہوں گا ؟ اگلا دن حضرت عائشہؓ کی باری کا تھا۔ ازواج مطہراتؓ نے مرضی اقدس پا کر عرض کیا : جہاں آپؐ کا دل چاہے قیام فرمائیں] ؛ چنانچہ آپؐ حضرت عائشہؓ صدیقہ کے حجرے میں تشریف لائے، جس کا دروازہ مسجد کی صف اول سے عین مقابل کھلتا تھا۔ اس حالت میں بھی جب تک طاقت رہی نمازوں کی بدستور امامت فرماتے رہے۔ آخری نماز، جو آپؐ نے پڑھائی، مغرب کی تھی۔ سر میں درد ہونے کی وجہ سے آپؐ نے سر مبارک پر رومال باندھا ہوا تھا (مسلم : الصحیح، ۲ : ۲۱ ؛ البخاری، کتاب الاذان، باب ٦٨).

وفات سے غالباً پانچ یوم قبل جمعرات کو ایک روز آپؐ نے غسل کی خواہش کا اظہار فرمایا ؛ چنانچہ آپؐ کو ایک ٹب میں بٹھا کر سات چھاگلوں سے آپؐ پر پانی ڈالا گیا۔ اس سے کچھ فوری افاقہ ہوا تو سر پر پٹی باندھے ظہر کے وقت مسجد میں تشریف لائے۔ بعد از نماز منبر پر چڑھ کر خطبہ دیا، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارک کا آخری خطبہ ہے۔ اس میں آپؐ سب سے پہلے غزوۂ احد کے شہیدوں کو یاد کر کے دیر تک دعائے مغفرت فرماتے رہے۔ پھر فرمایا : اللہ نے اپنے ایک بندے کو دنیا میں رہنے یا اس کے پاس آ جانے میں انتخاب کا اختیار دیا تو اس بندے نے خدا کے پاس جانے کو ترجیح دی۔ صحابہؓ آپؐ کے اس اشارے کو نہ سمجھے، لیکن حضرت ابوبکرؓ سمجھ گئے اور بلا اختیار رو پڑے اور کہا : ہمارے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے انھیں تسلی دیتے ہوئے ان کی تعریف کی [اور فرمایا : میں ابوبکرؓ کی رفاقت اور فیاضی کا سب سے زیادہ ممنون ہوں اور یہ کہ] ان سے بہتر رفیق مجھے کوئی نہیں ملا۔ پھر فرمایا : مسجد میں کھلنے والے تمام مکانوں کے دروازے بند کر دیے جائیں، سوائے ابوبکرؓ کے خوخہ (یعنی چھوٹے دروازے) کے۔ [اس میں بھی حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت کی طرف اشارہ ہے تاکہ نماز پڑھانے کے لیے آنے جانے میں سہولت رہے ؛ نیز فرمایا : تم سے پہلے لوگوں نے انبیا اور صلحا کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا تھا ؛ تم ہرگز قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنانا، میں تمھیں سختی سے منع کرتا ہوں (مسلم، ۲۷ : ٦٨)]۔ پھر ارشاد فرمایا : لاعلمی میں مجھ پر کسی کے کوئی واجب الادا حقوق نہ رہ جائیں ؛ اگر کسی کا میں نے مال لیا ہو تو یاد دلائے ؛ کسی کو میں نے بیجا طور پر جسمانی ایذا پہنچائی ہو تو وہ ابھی مجھ سے بدلہ لے لے، یا معاف کر دے ؛ خدا کے ہاں مؤاخذے کے لیے دل میں چھپا کر نہ رکھے۔ رحمت دو عالمؐ پر بھلا کسے دعوی ہو سکتا تھا ؟ چنانچہ کسی نے اس پر کچھ نہ کہا تو فرمایا : یہ کافی نہ ہوگا اور مکرر اس جملے کو دہرایا۔ اس پر ایک شخص نے کہا کہ اسے آپؐ سے تین درہم وصول کرنے ہیں۔ ان کی فوری ادائی کا حکم دیا گیا [ابن کثیر : السیرۃ النبویۃ، ۴ : ۴۵۳ تا ۴۵۸]۔ پھر عام خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا : تم میں سے کوئی شخص اپنی چھوٹی سے چھوٹی ذمہ داری کو بھی حقیر نہ سمجھے، اس لیے آخرت کے مؤاخذے کی جگہ دنیا ہی میں گلو خلاصی کرا لے، چاہے فضیحت ہی کیوں نہ ہو۔ اس خطبے میں انصار [رک بآں] کا آپؐ نے خاص طور پر ذکر کیا اور فرمایا : میرے بعد انصار کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے ؛ نیز ارشاد ہوا : مدینہ

منورہ میں دوسرے گروہوں کے لوگ بڑھتے جائیں گے، لیکن انصار کم ہوتے جائیں گے۔ یہ میرے پناہ دہندہ ہیں؛ میں نے انھیں کے ہاں جگہ پائی۔ [یہ اپنا فرض انجام دے چکے ہیں۔ اب تمھیں ان کا فرض پورا کرنا ہے، تم میں سے جو بھی نفع و نقصان کا متولی (خلیفہ) ہو، اسے چاہیے کہ] ان میں جو اچھے کام کرنے والے ہیں ان کے ساتھ احسان کرے اور ان میں سے اگر کوئی برائی کرے تو اس سے درگزر کرے۔ پھر تاکید فرمائی کہ بوزنطی حکومت کے خلاف تیار شدہ لشکر حضرت اسامہؓ ضرور بھیجا جائے۔ حضرت اسامہؓ کی کم عمری اور نا تجربہ کاری کی بنا پر اعتراض کرنے والوں کا بھی آپؐ نے اس موقع پر جواب دیا۔ اس فوج میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ جیسے اکابر بھی رضاکارانہ طور پر اپنے نام لکھوا چکے تھے۔ [اگر دقت نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ آپؐ کا آخری خطبہ در حقیقت آپؐ کی طرف سے اپنے نامزد جانشین (حضرت ابوبکرؓ) کی جانشینی اور ان کے لیے وصیت نامہ تھا]۔ آپؐ اس سے اس قدر تھک گئے تھے کہ مکان میں آئے تو بیہوش ہو گئے اور دانت بھنچ گئے۔ اس پر آپؐ کی تمام ازواج مطہرات اور بعض دیگر مسلمان خواتین بھی آپؐ کے حجرے میں جمع ہو گئیں (ابن حنبل: مسند، ۱ : ۲۰۹، حدیث ۱۷۸۴)۔ ہوش میں لانے کے لیے دانتوں کی درزوں میں سے دوا ڈالی گئی ہے۔ منہ کھولنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ یہ علاج کامیاب تو ہوا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پسند نہ آیا اور محبت آمیز ملامت کرتے ہوئے فرمایا: سب حاضرین کے منہ میں بھی وہی دوا ڈالی جائے، بجز (احتراماً) چچا حضرت عباسؓ کے۔ یہ واقعہ جمعرات کے دن پیش آیا؛ [اسی دن جب عشا کی نماز کا وقت ہوا تو آپؐ نے تین مرتبہ غسل فرما کر نماز کے لیے اٹھنا چاہا تو ہر بار آپؐ پر غشی طاری ہو جاتی رہی۔ چوتھی مرتبہ ہوش آیا تو فرمایا: مُرُوا اَبَابَکْرٍ فَلْیُصَلِّ بِالنَّاسِ (البخاری، ۱ : ۱۷۵)، یعنی ابوبکرؓ سے کہو کہ نماز پڑھائیں۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کی: یا رسول اللہ ابوبکرؓ بہت نرم دل ہیں۔ وہ آپؐ کے مقام پر کھڑے نہ ہو سکیں گے۔ آپؐ نے دوبارہ اس سابقہ حکم کا اعادہ فرمایا۔ حضرت عائشہؓ نے مکرر عرض دہرائی تو آپؐ نے سختی سے فرمایا کہ ابوبکرؓ ہی سے کہو نماز پڑھائیں؛ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے آپؐ کے حیات طیبہ میں آپؐ کے حکم سے کل سترہ نمازوں کی امامت فرمائی (از عشاء جمعرات تا فجر پیر)، (ابن سعد: الطبقات، ۲ : ۲۲۳ ببعد)۔ ابن سعد (حوالۂ مذکور) کے مطابق یہ بات پختہ طور پر ثابت ہے کہ آپؐ نے ایک دن فجر کی ایک رکعت حضرت ابوبکرؓ کی امامت میں ادا فرمائی تھی]۔ اس کے بعد ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا مزاج کسی قدر بہتر ہوا تو آپؐ مسجد میں تشریف لائے جبکہ ابوبکرؓ نماز شروع کرا چکے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اشارے کے باوجود کہ امامت جاری رکھو، وہ آپؐ کو دیکھ کر محراب سے ذرا پیچھے ہٹ گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بیٹھے ہوئے امامت فرمائی اور حضرت ابوبکرؓ مکبر کا فریضہ انجام دیتے رہے [السیرۃ النبویۃ، ۴ : ۳۶۲ تا ۳۶۶]۔ [اس موقع پر ابن سعد (الطبقات، ۲ : ۲۱۵) کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نماز کے بعد بھی کچھ دیر تک تشریف فرما رہے، پھر آپؐ نے کسی قدر اونچی آواز سے فرمایا: بخدا میں نے اسی کو حلال ٹھیرایا جسے خدا نے حلال کیا اور اسی کو حرام کیا جسے اللہ نے حرام کیا۔ پھر فرمایا: اے محمدؐ کی بیٹی فاطمہ اور اے رسول اللہ کی پھپی صفیہ! عمل صالح جاری رکھو، کیونکہ میں خدا کی طرف سے کسی چیز میں تمھیں کفایت نہیں کر سکتا]۔

اس کے بعد پیر کی صبح تک آپؐ برآمد نہ

ہوئے۔ پیر کی فجر کے وقت حجرے کا پردہ اٹھا کر دیکھا کہ لوگ خشوع و خضوع سے نماز پڑھ رہے ہیں تو آپؐ نے خوشنودی سے تبسم [کیا اور فرمایا: خدا نے میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی ہے (ابن سعد، ۲ : ۲۲۰]۔ آپؐ کے چہرۂ انور کو دیکھ کر لوگ وفور مسرت سے بے قرار ہوگئے، مگر آپؐ نے [اشارہ کیا کہ نماز مکمل کر لو۔ پھر آپؐ نے] پردہ گرا دیا اور بستر پر لیٹ گئے۔ اس وقت تک حضرت ابوبکرؓ سترہ نمازیں پڑھا چکے تھے (الطبری، ۱ : ۱۸۱۲)۔ نماز کے بعد حضرت ابوبکرؓ اندر آئے اور آپؐ کی صحت بہتر دیکھ کر مسرت کا اظہار کیا اور کہا کہ کئی روز سے رات دن یہیں ہوں؛ اجازت ہو تو بیوی بچوں کو دیکھنے کے لیے کچھ دیر کے لیے گھر ہو آؤں (جو عوالی میں جبل احد کے قریب مقام سُنح میں تھا اور کئی میل کے فاصلے پر)، مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ محض افاقۃ الموت تھا۔

اس سے ایک دن قبل، اتوار کو حضرت اسامہؓ (لشکر کے سپہ سالار) اور ان کے ساتھ پڑاؤ سے کچھ مسلمان آپؐ کو دیکھنے کے لیے آئے۔ حضرت اسامہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ بات نہ کر سکتے تھے۔ مجھے دیکھ کر دست مبارک اٹھائے؛ پھر مجھ پر رکھ دیے، گویا میرے لیے دعا فرما رہے ہیں (المقریزی، ۱ : ۵۳۸؛ [ابن ہشام: سیرۃ، ۴ : ۳۰۱])۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مہم اور اس کے سپہ سالار کو آپؐ کتنی اہمیت دے رہے تھے۔

دن بلند ہونے کے ساتھ ساتھ آپؐ پر غشی کے دورے شدت اختیار کرتے جا رہے تھے، مگر پھر افاقہ ہو جاتا۔ حضرت فاطمہؓ سے آپؐ کی یہ حالت دیکھی نہ گئی تو فرمانے لگیں: واکرب اباہ (ہائے میرے باپ کی بے چینی)! آپؐ نے فرمایا: آج کے بعد تمھارا باپ کبھی بے چین نہ ہوگا۔ وفات سے تھوڑی دیر پہلے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بھائی حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ آپؐ کی عیادت کو آئے۔ ان کے ہاتھ میں تازہ مسواک دیکھ کر آپؐ نے اس پر ایسی نظر ڈالی کہ رمز شناس زوجۂ مطہرہ جان گئیں کہ آپؐ مسواک کرنا چاہتے ہیں؛ چنانچہ انھوں نے اس سے مسواک لیکر دانتوں میں چبائی؛ پھر آپؐ کا سر مبارک اپنے زانو پر رکھ کر آپؐ کے دانت اپنے ہاتھوں سے صاف کیے جس سے چہرۂ اطہر خوشی سے تمتمانے لگا۔ مسواک ہاتھ سے رکھی ہی تھی کہ حضرت عائشہؓ کو [آپؐ کے سینے میں سانس کی گڑگڑاہٹ محسوس ہوئی۔ کان لگایا تو یہ الفاظ سنے: نماز اور غلام (ابن سعد، ۲ : ۲۵۳)۔ کچھ دیر بعد حضرت عائشہؓ کو آپؐ کے] سر مبارک کا بوجھ سا محسوس ہوا، فرماتی ہیں جب میں نے چہرے پر نظر ڈالی تو یہ جملہ سنا: الرفیق الاعلی (رفیق اعلی کے پاس)؛ تین مرتبہ یہ جملہ دہرایا اور پھر روح سچ مچ اپنے رفیق اعلی ذات کبریا کے پاس جا پہنچی، مگر میں نہ سمجھ سکی؛ پھر جب دوسری ازواج رونے لگیں تو پھر مجھے معلوم ہوا کہ کیا پیش آ گیا ہے؛ چنانچہ میں نے آہستہ سے آپؐ کے سر مبارک کو تکیے پر رکھ دیا اور کھڑے ہو کر میں بھی رونے لگی [ابن ہشام، ۴ : ۳۰۵] (اللھم صل علیه و علی آلہ و صحبہ و بارک وسلم)۔

وفات اقدس: [جمہور کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ہجرت کے دس سال پورے ہونے کے بعد پیر کے دن ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو اس دنیا سے رحلت فرمائی (ابن سعد، ۲ : ۲۷۲، ۲۷۳؛ انساب الاشراف، ۱ : ۵۶۸؛ ابن حزم: جوامع السیرۃ، ص ۲۶۵؛ ابن کثیر: السیرۃ النبویۃ، ۴ : ۵۰۷؛ ابن الجوزی: الوفا، ۷۸۹؛ اس ضمن میں بعض اور روایات بھی ہیں؛ ان کے لیے دیکھیے محولہ بالا کتب سیرت، الروض الانف، ۲ : ۲۷۲؛ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے آپؐ کا یوم وفات ۲ ربیع الاول، ۲۵ مئی ۶۳۲ء قرار دیا ہے (دیکھیے: محمد حمید اللہ: مقالہ نمبر ۱، در

اسلامک ریویو ، ووکنگ ، فروری ۱۹۶۹ء)] ۔

[وصال مبارک ہوتے ہی جسم مبارک سے ایسی خوشبو سے مہکنے لگا کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے اس جیسی خوشبو آج تک کبھی نہ سونگھی تھی، یہ خوشبو میرے ہاتھوں میں کئی دنوں تک برقرار رہی (عبدالحق محدث دہلوی : مدارج النبوۃ ، اردو ترجمہ ، کراچی ۱۳۸۲ھ ، ص ۶۴۲)] ۔ حجرۂ اطہر کے بعد مسجد میں ، پھر جلد ہی سارے شہر میں اس خبر وحشت اثر سے صف ماتم بچھ گئی ۔ اتنے میں حضرت ابوبکرؓ واپس تشریف لائے اور حضرت عائشہؓ کے حجرے میں تشریف لے گئے، جہاں آپؐ کو چادر مبارک سے ڈھانپ دیا گیا تھا ۔ حضرت ابوبکرؓ نے چادر اٹھا کر دیکھا اور احترام و ادب سے بوسہ دیا؛ پھر مسجد میں تشریف لائے ۔ [تمام صحابہ کرامؓ اس سانحۂ ہائلہ پر سخت حیران اور ششدر کھڑے تھے ۔ ان میں سے بعض کی فرط غم سے یہ حالت تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ہوش و حواس ہی معطل ہو گئے ہیں؛ بعض یوں خاموش تھے گویا قوت گویائی باقی نہیں رہی، جبکہ بعض اس طرح آہ و زاری کر رہے تھے گویا حج کا تلبیہ پڑھ رہے ہوں؛ ایک صحابی نے فرط غم سے یہ دعا مانگی کہ : الٰہی میری قوت بصارت ختم کر دے تاکہ میں جمال نبوی کے دیکھنے کے بعد کچھ اور نہ دیکھ سکوں ۔ غرض تمام صحابہ پریشان تھے ۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ فرما رہے تھے کہ آپؐ کا وصال نہیں ہوا بلکہ آپؐ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو تشریف لے گئے ہیں ۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس موقع پر یہ مختصر مگر اثر انگیز] خطبہ ارشاد فرمایا : "لوگو ! اگر کوئی حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو معبود سمجھتا تھا تو جان لے کہ حضرت محمدؐ کا وصال ہو گیا ہے ، لیکن جو اللہ کو معبود سمجھتا تھا تو جان لے کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہے ، کبھی مر نہیں سکتا ۔ ارشاد ربانی ہے : إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ (۳۹ [الزمر] : ۳۰)، یعنی آپؐ نے بھی وصال فرمانا ہے دوسرے بھی مرنے والے ہیں ۔ یہ بھی ارشاد الٰہی ہے : وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا ؕ وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ (۳ [آل عمران]: ۱۴۴)، [یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو اللہ کے رسول ہی ہیں ۔ آپؐ سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں ۔ اگر آپؐ وفات پا جائیں یا شہید کر دیے جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں پر پھر جاؤ گے ؟ جو کوئی ایسا کرے گا وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ۔ عنقریب اللہ تعالیٰ شکر گزار بندوں کو بدلہ عطا فرمائیں گے] ۔ ان آیات کو سن کر بعض صحابہؓ فرماتے ہیں کہ یوں معلوم ہوا گویا یہ آیات اسی وقت نازل ہوئی ہیں، حالانکہ یہ تقریباً سات برس قبل غزوۂ احد کے موقع پر نازل ہوئی تھیں ۔ حضرت ابوبکرؓ نے مزید فرمایا] : آپؐ نے امت میں تنظیم پیدا کی ؛ اب اسے شخصی چیز سمجھ کر ختم کر دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا بلکہ اس تنظیم کو جاری رکھنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی جگہ کسی کو مقرر کرنا ضروری نظر آتا ہے ۔ کفن دفن کے بعد آپؐ کی جانشینی کے لیے عام مشورہ ہوگا ۔ اس سے سب نے اتفاق کیا ، مگر قدرت کو یہ منظور تھا کہ دفن سے پہلے ہی جانشینی کا فیصلہ ہو جائے (دیکھیے نیچے) ۔ تجہیز و تکفین کا کام دوسرے دن سہ شنبہ کو شروع ہوا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو لباس اتارے بغیر اچھی طرح سے غسل دیا گیا ۔ [آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ ، ان کے دو بیٹوں فضل اور قثم اور حضرت علیؓ نے آپؐ کو غسل دیا ۔ حضرت اسامہؓ اور حضرت شقران (آپؐ کے مولیٰ) پانی ڈالتے رہے ۔ حضرت اوسؓ بن خولہ انصاری بدری کو بھی بطور نمائندۂ انصار شامل غسل کر لیا گیا ۔ سحول (یمن کا ایک گاؤں جہاں سفید سوتی کپڑا تیار ہوتا تھا) کے بنے

ہوئے] تین سفید سوتی کپڑوں میں آپؐ کو پورے ستر عورت کے ساتھ کفن دیا گیا ۔ اس ارشاد نبوی کے باعث کہ نبی اسی جگہ دفن ہوتے ہیں جہاں ان کا وصال ہوا ہو ، حضرت عائشہؓ کے حجرے میں ، بستر نبوی ہی کی جگہ، قبر کھودی گئی]۔ حضرت ابو طلحہؓ انصاری نے لحد والی قبر تیار کی ۔ جب آپؐ کو کفنا کر چارپائی پر لٹا دیا گیا تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ داخل ہوئے اور ان کے ساتھ انصار و مہاجرین بھی اندر آ گئے ۔ صف باندھ کر بغیر کسی امام کے فرداً فرداً نماز پڑھی ۔ جب سارے مرد نماز پڑھ چکے تو پھر عورتوں کی باری آئی ، پھر بچوں کی] ۔ ہزاروں آدمیوں نے فرداً فرداً نماز جنازہ پڑھی ۔ مدینہ منورہ کی زمین میں شور زیادہ ہونے کی وجہ سے قبر میں ایک سرخ قطیفہ (چادر) بچھا کر آپؐ کا جسم اطہر اس پر رکھا گیا ۔ [حضرت علیؓ ، حضرت فضلؓ ، حضرت قثمؓ ، حضرت شقرانؓ اور حضرت اوسؓ بن خولی انصاری نے جسم اطہر کو قبر میں اتارا] اور مکی رواج کے مطابق قبر کو مسقّف کیا گیا اور یہ کام حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے انجام دیا (انساب الاشراف ، ۱ : ۵۷۵ تا ۵۷۸) ۔ بہت سے صحابہ کرامؓ نے آپؐ کے دردناک اور پر اثر مرثیے کہے، جن میں حضرت ابوبکرؓ ، حضرت عمرؓ ، حضرت علیؓ اور حضورؐ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ اور حضرت حسان بن ثابتؓ ، [حضرت فاطمہؓ ، عاتکہؓ بنت عبدالمطلب ، عبداللہؓ بن مسلم ، ابوسفیانؓ الحارث ، ھندؓ بنت الحارث ، ام ایمنؓ ، کعبؓ بن مالک] وغیرہ کے مرثیے خاص طور پر قابل ذکر ہیں (البلاذری : انساب الاشراف ، ۱ : ۵۹۲ تا ۵۹۳ ؛ [عبداللہ بن حامد : شعر الدعوۃ الاسلامیہ، ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء ، ص ۳۸۹ تا ۴۲۹]).

جانشینی: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات پر اہل بیت ، انصار اور عام مسلمان تینوں الگ الگ رجحانوں کے حامل نظر آتے ہیں ۔ پرانی قبائلی عادت کی بنا پر غیر شعوری طور پر بعض اہل بیت نبوی کی خواہش تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے رشتہ داروں میں سے کسی کو خلیفہ بنایا جائے ۔ انصار کے علاقے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکومت کی تاسیس کی اور وہیں مدینہ منورہ دارالحکومت بنا اور وہاں اکثریت انصار ہی کی تھی ؛ اس لیے وہ خلیفہ انصار میں دیکھنا چاہتے تھے ۔ عام مسلمانانِ مدینۂ منورہ شورائیت کی طرف مائل تھے اور چاہتے تھے کہ سارے مسلمانوں میں جو سب سے زیادہ موزوں ہو اسی کو چنا جائے ۔ [اس بحث کے لیے دیکھیے شبلی : الفاروق، مطبوعہ اعظم گڑھ ؛ نیز رک بہ خلافت؛ حضرت ابوبکرؓ صدیق] .

[انھی حالات میں انصار نے سقیفہ بنی ساعدہ میں ایک ہنگامی جلسہ منعقد کیا اور اس بات کا فیصلہ کرنا چاہا کہ خلافت انصار کا حق ہے، لہذا انہیں کو ملنی چاہیے ۔ اس کے لیے حضرت سعدؓ بن عُبادہ رئیس خزرج کا نام پیش کیا جا رہا تھا ۔ ان نازک حالات کی خبر جب حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو ملی ، جو مسجد نبوی میں افسردہ و غمگین صحابہ کرامؓ کو حالات کا سامنا کرنے پر آمادہ کر رہے تھے ، تو وہ فوراً سقیفۂ بنی ساعدہ میں پہنچے ۔ انھوں نے اس فتنے کا سدباب کرنے میں اس لیے تاخیر کرنا گوارا نہ کی کہ اگر وہاں صلاح مشورہ مکمل ہو جاتا تو واضح طور پر انصار اور مہاجرین میں تصادم کی صورت پیدا ہو جاتی] ۔ اس وقت امین الامت حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح بھی اُن کے ہمراہ تھے ۔ حضرت ابوبکرؓ نے انصار کا یہ دعوی سنا تو انہیں متوقع نتائج سے ، جو اس فیصلے کی صورت میں پیش آ سکتے تھے ، آگاہ کیا اور انہیں مشورہ دیا کہ اس موقع پر قومی اور علاقائی تعصب کو دلوں میں جگہ نہ دیں ۔ اس پر انصار نے ”ایک امیر ہم میں سے اور ایک امیر تم میں سے“ کا نظریہ پیش کیا ، مگر یہ صورت حال بھی دو متوازی حکومتوں

کے قیام کا موجب بن سکتی تھی؛ اس لیے اس کو بھی کر دیا گیا]۔ اس موقع پر ایک روایت کے مطابق حضرت ابوبکرؓ نے [البلاذری: انساب، ۱: ۵۸۳] اور دوسری روایت کے مطابق ایک انصاری نے (الواقدی: کتاب الردہ، خطوطۂ بانکی پور) نے یہ حدیث نبویہ بیان کی کہ الائمۃ من قریش، یعنی خلفا قریش میں سے ہوں گے۔ رمان نبوی کے سامنے سب کی گردنیں جھک گئیں۔ ضرت ابوبکرؓ نے اس موقع پر حضرت عمرؓ اور ضرت ابوعبیدہؓ کے اسمائے گرامی خلافت کے لیے یش فرمائے، مگر حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ کو پکڑا اور چاہتے تھے کہ بیعت کریں] ۔ اس پر ایک انصاری نے کھڑے ہو کر کہا کہ آپ ذرا ٹھیریں اور سب سے پہلے مجھے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لے دیں (حوالۂ مذکور)؛ [چنانچہ سب سے پہلے حضرت عمرؓ یا ایک انصاری نے بیعت کی۔ ان کا بیعت رنا تھا کہ سقیفۂ بنی ساعدہ میں لوگ ان کی بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے (دیکھیے ابن سعد: الطبقات، ۳: ۱۸۱ تا ۱۸۸)] .

بہر حال حضرت ابوبکرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے جانشین (خلیفہ) منتخب ہوگئے، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اپنے سقیفہ بنی ساعدہ والے انتخاب کو قطعی نہ سمجھا اور شہر میں تین دن تک مسلسل منادی کرائی کہ لوگوں پر اس بیعت کی پابندی لازم نہیں؛ وہ خلافت کے لیے کسی اور موزوں شخص کا پوری آزادی سے انتخاب کر سکتے ہیں (البلاذری: انساب، ۱: ۵۸۷؛ الجاحظ: الرسالۃ العثمانیہ، ۲۳۵)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تدفین کے بعد مکرر ان کی بیعت عام ہوئی تاکہ جو لوگ سقیفۂ بنی ساعدہ میں موجود نہ تھے وہ بھی بیعت کر سکیں۔ اس موقع پر یہ بھی یاد دلایا جا سکتا ہے کہ ایک سے زیادہ لوگوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ میں کچھ دینے کا وعدہ کیا تھا اور یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر مجھ سے ملاقات نہ ہو تو حضرت ابوبکرؓ کے ہاں جانا وہ میرے وعدے کا ایفا کریں گے (البخاری، کتاب فضائل اصحاب النبیؐ، باب ۵).

[اس کے علاوہ آپؐ نے مرض الوفات میں حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا منشا ظاہر کیا تھا: (۱) وصال سے پانچ یوم قبل آپؐ نے خطبہ دیا، جس میں بطور خاص حضرت ابوبکرؓ کی تعریف کی اور فرمایا جس کا دروازہ مسجد میں کھلتا ہے وہ اپنا دروازہ بند کرے بجز حضرت ابوبکرؓ کے؛ یہ بھی در حقیقت اسی بات کا اشارہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ ہی آپؐ کے جانشین ہوں گے، کیونکہ آپؐ کے خلیفہ ہی کو مسجد میں بلا تاخیر اور ہر وقت آنے جانے کی ضرورت پیش آسکتی تھی؛ (۲) جمعرات کی عشا سے لے کر دو شنبہ کی فجر تک کی تقریباً سترہ نمازیں حضرت ابوبکرؓ نے آپؐ کے حکم سے پڑھائیں اور اس حکم کی تعمیل میں آپؐ نے سختی سے کام لیا۔ اگرچہ امّ المؤمنین حضرت عائشہؓ نے تین دفعہ اصرار کرکے اس حکم کو بدلانا چاہا، مگر آپؐ نے سختی سے ان کی درخواست کو رد کر دیا؛ البلاذری (انساب، ۱: ۵۶۰ تا ۵۶۱) کے مطابق حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے کہ آنحضرتؐ کی حیات طیبہ میں حضرت ابوبکرؓ کی امامت سے ہم لوگ خلافت صدیقی کا استشہاد کیا کرتے تھے، وہ یوں کہ آپؐ نے جس ہستی کو اپنی مذہبی و دینی مسند پر کھڑا کر دیا تو دنیوی منصب، جو اس کا تابع ہے، از خود ہی ان سے متعلق ہوگیا اور وہ بخدا اس کے اہل بھی تھے۔ ایک دوسرے موقع پر فرمایا: قدمک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الصلاۃ لماذا یؤخرک (انساب، ۱: ۵۸۷)، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے آپ (حضرت ابوبکرؓ) کو آگے کیا ہے پس تمہیں پیچھے کون کر سکتا ہے؛ (۳) ابن الجوزی (الوفاء، ۲: ۷۷۹) وغیرہ کے مطابق آپؐ

نے حضرت عبدالرّحمن بن ابی بکرؓ کو فرمایا تھا کہ میرے پاس ہڈی کا شانہ یا لکڑی (لوح) لے آؤ تا کہ میں ابوبکرؓ کے حق میں ایک دستاویز لکھ دوں تاکہ کوئی شخص اختلاف کی جرأت نہ کرے ؛ مگر جب حضرت عبدالرحمنؓ مطلوبہ چیز لینے کے لیے جانے لگے تو بلا لیا اور فرمایا : خدا اور اس کے اہل ایمان بندے ابوبکرؓ کے سوا کسی پر راضی نہ ہوں گے ؛ (م) آپؐ نے وصال مبارک سے ایک دن یا اس سے قبل ایک نماز اس حال میں پڑھائی کہ آپؐ بیٹھے ہوئے نماز پڑھا رہے تھے، حضرت ابوبکرؓ بالکل آپؐ سے ملحق کھڑے ہوئے تھے اور عام مسلمان ان سے پیچھے صفوں میں اقتدا کر رہے تھے۔ یہ بھی اس بات کا اشارہ تھا کہ آپؐ کی نیابت کا فریضہ حضرت ابوبکرؓ ہی انجام دے سکتے ہیں] .

اسوۂ حسنہ : سرور کائنات حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نبی تھے، لیکن نبی کا اسلامی تصور یہ نہیں کہ وہ عقائد ، عبادات اور احسان (تصوف) کی تعمیل تک خود کو محدود رکھے ، بلکہ اسلامی تصور میں نبی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دین و دنیا دونوں کے حسنات کا عملی راستہ بتائے۔ اسی لیے آپؐ نے دین بھی سکھایا اور ایک مملکت بھی چلا کر دکھائی۔ شادی کر کے گھربار زندگی کا ایک عمدہ نمونہ امت کے لیے چھوڑا۔ آپؐ کی زندگی کے کثیر پہلوؤں میں سے ہر ایک پر بحث تو یہاں ممکن نہیں ، [البتہ آپؐ کی عظیم شخصیت کے چند پہلوؤں کے طرف اشارے کرنا مناسب ہوگا تاکہ آپؐ کی عظمت کا کچھ اندازہ ہو سکے] .

دینی تعلیم : دین اسلام کی اساسیات مجملاً قرآن کریم میں موجود ہیں۔ اس کی تشریحات اور عملی صورتیں حدیث میں ہیں۔ ان کا خلاصہ حدیث جبریلؑ میں ملتا ہے [رک بہ اسلام ؛ ایمان] ، جسے البخاری ، مسلم اور دوسرے محدثین نے نقل کیا ہے کہ ایک دن مدینہ منورہ میں ایک غیر معروف شخص نے آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے پوچھا : ایمان کیا ہے ؟ آپؐ نے فرمایا : اللہ ، ملائکہ ، کتب ، انبیا ، یوم آخرت کو اور خیر و شر سب ہی کی تقدیر اللہ کی طرف سے ہونے کو ماننا ؛ اجنبی نے کہا : ٹھیک ہے اور اسلام کیا ہے ؟ فرمایا : ہر روز پنج وقتہ نماز پڑھنا، رمضان میں مہینا بھر روزے رکھنا ، زکوٰۃ ادا کرنا اور استطاعت ہو تو عمر میں کم از کم ایک بار بیت اللہ شریف کا حج کرنا ؛ اس نے کہا : ٹھیک ہے ؛ احسان کیا ہے ؟ فرمایا : خدا کی عبادت اس طرح کرنا گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تمھیں دیکھتا ہے ؛ اس نے کہا : ٹھیک ہے ، یہ بتائیے کہ قیامت کب آئے گی ؟ فرمایا : مجھے اس کا تم سے زیادہ علم نہیں۔ اس پر وہ اجنبی اٹھ کر چلا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے کہا : دیکھو، وہ کہاں گیا ؟ مگر وہ بالکل غائب ہو چکا تھا۔ آپؐ نے فرمایا : وہ جبریلؑ تھے ، جو تمھیں تمھارا دین سکھانے آئے تھے (البخاری : الصحیح ، کتاب الایمان ، باب ۳۷).

یہ حدیث جبریلؑ فی الواقع دین کا خلاصہ ہے۔ اس میں عقائد و عبادات بھی ہیں اور دین و دنیا کا اجتماع بھی اور ہر چیز کو بہترین طریقے سے انجام دینے کی تدابیر بھی۔ اس پر نظر ڈالیں تو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ دین گویا ایک خوبصورت عمارت ہے ، عقائد اس کی چھت ہیں ، جسے عبادات کے چاروں ستون تھامے ہوئے ہیں اور اس عمارت کی آرائش و زیبائش احسان (تصوف) کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ [تفصیلات کے لیے رک بہ اسلام ، ایمان ، عقائد ، اللہ ، وغیرہ].

معجزات : ایمان و عقائد سے قریبی تعلقات رکھنے والی ایک چیز معجزہ [رک باں] بھی ہے ، اس لیے حدیث جبریلؑ کے حصہ دوم یعنی عبادات سے

قبل اس کا مختصر ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ خارق عادت چیزیں مختلف افراد سے صادر ہوتی ہیں: پیغمبرؑ سے ہوں تو اسے معجزہ کہتے ہیں، ولی سے ہوں تو کرامت اور کسی شیطانی تعلیم دینے والے سے ہوں تو اسے استدراج [یعنی آزمائش] کا نام دیتے ہیں۔ ظاہری شکل میں ان تینوں میں باہم کوئی فرق نہ ہونے سے ان میں امتیاز دشوار ہوتا ہے، [تاہم اگر دینی اور مذہبی تعلیم اور اس پر عمل کو معیار ٹھیرایا جائے تو مسئلہ سہل ہو جاتا ہے]۔ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ ہر خارق عادت چیز خدا اور صرف خدا سے ہی صادر ہوتی ہے؛ پیغمبر تک بذات خود اس پر قادر نہیں ہوتا، بلکہ پیغمبرؑ کی شدید ضرورت کے وقت خدا اس کی تقویت کے لیے صادر کرتا ہے۔ [دراصل معجزہ تائید الٰہی کی ایک آخری صورت ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے قرآن مجید خود ایک معجزہ ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ معجزہ دیکھنے کے باوجود بری فطرتیں ایمان نہیں لاتیں۔ معجزہ ایک اتمام حجت ہے، موجب ایمان نہیں]۔ حضرت ابوبکرؓ [اور دوسرے السابقون الاولون] معجزے دیکھے بغیر ایمان لائے، لیکن پست کردار لوگ، مثلاً ابوجہل اور ابولہب، معجزات دیکھ کر بھی ایمان لانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ [غرض معجزہ برحق ہے، لیکن] قرآن مجید ایمان بالغیب کا مطالبہ کرتا ہے (۲ [البقرہ]: ۴)؛ پھر بھی اکثر پیغمبروں کے متعلق قرآن کریم نے معجزوں کا ذکر کیا ہے۔ نوحؑ کا طوفان، ابراہیمؑ کے لیے آگ کا ٹھنڈا ہو جانا، موسیٰؑ کا ید بیضا اور سانپ بننے والا عصا، عیسیٰؑ کے ہاتھوں بیماروں کا تندرست ہونا، مٹی کے پرند نما کھلونوں کا واقعی زندہ پرندہ بن جانا اور مردے کا زندہ ہونا اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے معجزات اتنے ہیں کہ ان پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں (دیکھیے سلیمان ندوی: سیرت النبیؐ، جلد سوم)، مثلاً: دوبار مردوں کا زندہ ہونا؛ کھجور کے تنے کا باآواز رونا؛ گونگے کا بات کرنے لگنا؛ شق صدر؛ شق قمر؛ درخت کا ایک جگہ سے چل کر دوسری جگہ تک چلا آنا؛ قلیل پانی اور قلیل غذا کا کثیر جماعت کے لیے کافی ہو جانا؛ ہاتھ کی انگلیوں سے کثیر مقدار میں نوشیدنی پانی نکلنا؛ آپ سے چرندوں کا باتیں کرنا، گھر کا محاصرہ کیے ہوئے لوگوں کے بیچ میں سے صاف بچ نکلنا اور ان کا خبردار نہ ہونا؛ غیب کی خبریں دینا کہ تم نے فلاں کام کیا ہے؛ فرشتوں کا آپؐ کی مدد کے لیے آنا؛ معراج [رکّ بار] میں آسمانوں سے بھی پرے حظیرۃ القدس اور قاب قوسین تک جانا؛ ایسا قرآن مجید پیش کرنا کہ اس جیسا تو کیا اس کی ایک تین آیتی سورۃ کی مثال لانا بھی جن و انس کی متحدہ زور و کوشش کے باوجود ممکن نہیں، وغیرہ۔ ہر قسم کے بکثرت معجزات آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے صادر ہوئے، لیکن قرآن مجید میں بار بار وارد ہے کہ فکر و تدبر سے کام لو؛ عقل سے اور ٹھنڈے دل سے غور کرو تو اسلام کی حقانیت خود ہی تم کو قائل کر دے گی۔ [معجزے کا انکار ناجائز ہے، لیکن ایمان لانے کے لیے معجزات پر انحصار درست نہیں۔ اسلام نے معجزات سے زیادہ عقل و فکر اور غور و تدبر پر زور دیا اور ان سے کام لے کر دینی مسائل کو سمجھنے کی تلقین کی ہے]۔

عبادات: عقائد کے بعد نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی چار بنیادی عبادتیں فرض کی گئی ہیں کہ عبد کا فریضہ عبادت ہے۔ عبادت ہر مخلوق کے فطری حالات کے مطابق ہونی چاہیے۔

نماز کی حد تک یہ نکتہ ذہن نشین رہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے، اس لیے اس کی عبادت اور نماز بھی سب کی عبادتوں سے فائق ہونی چاہیے۔ کائنات میں جمادات، حیوانات اور نباتات سبھی اپنی اپنی حیثیت کے مطابق عبادات کرتے ہیں (۷

[بنی اسرآئیل] : ۴۴) ؛ جمادات بے حرکت ادب سے کھڑے ہیں (نماز کا پہلا رکن قیام ہے) ؛ حیوانات دائمی طور پر رکوع کی حالت میں رہتے ہیں (نماز کا دوسرا رکن رکوع ہے) ؛ نباتات کا منہ ان کی جڑیں ہیں اور دائمی طور پر وہ سر بسجود سے ہیں (نماز کا تیسرا رکن سجدہ ہے) ؛ چاند سورج اور ستارے اپنی گردش کو سدا جاری رکھنے پر مامور ہیں (نماز کی رکعتوں میں بھی ایک ہی مجموعۂ اعمال کی تکرار ہوتی رہتی ہے)؛ پانی، رعد، سایہ وغیر ہر مخلوق کا ایک طرز عبادت ہے جو نماز میں سمو دیا گیا ہے۔ غرض مسلمان کی نماز کائنات کی نمازوں کا متوازن خلاصہ اور مجموعہ ہے [رک بہ صلوٰۃ] ؛

(۲) روزہ : روزہ انسان کی طاقت کے مطابق خدا کی بعض صفات سے متصف ہونے [صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (۲ [البقرۃ] : ۱۳۸)] اور روحانی قوت کی نشو و نما کی کوشش کا نام ہے کہ کھانا پینا وغیرہ چھوڑ دیا جائے۔ اسلامی روزہ صرف خانقاہ نشینوں کے لیے ہی نہیں، بلکہ ہر مرد عورت اور ہر بالغ مسلمان پر فرض ہے۔ یہ طلوع فجر سے غروب آفتاب تک رکھا جاتا ہے [نیز رک بہ صوم ؛ رمضان وغیرہ] ؛

(۳) حج بیت اللہ : خدا ہر جگہ ہے اور انسان سے اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب تر۔ اس لیے اسے کسی جگہ محدود نہیں کیا جا سکتا ہے ، [لیکن انسان چونکہ جہت کا تصور کیے بغیر خدا تعالٰی کی عبادت نہیں کر سکتا۔ اس لیے اللہ تعالٰی نے اپنی مہربانی سے ایک گھر (بیت اللہ شریف زادھا اللہ شرفاً و کرامةً) [رک بہ کعبہ] کو اپنی ذات کے لیے مخصوص کر لیا، تاکہ اللہ کے بندے اس کی جہت میں خدا تعالٰی کی عبادت بجا لا سکیں ؛ چنانچہ اس مقام معظم کی طرف منہ کرکے نماز بھی ادا کی جاتی ہے اور صاحب توفیق افراد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اس کا حج [رک بآں] ادا کریں] ؛

(۴) زکوٰۃ : اسلام کی چوتھی عبادت زکوٰۃ [رک بآں] ہے۔ نماز ، روزہ اور حج بدنی عبادات ہیں، مگر زکوٰۃ مالی عبادت ہے۔ زکوٰۃ اندوختے (سونے، چاندی اور پیسوں)، زراعت ، معدنیات ، تجارت ، مویشیوں کے ریوڑوں وغیرہ میں سالانہ طور پر واجب الادا ہوتی ہے۔ اسلام میں حسنات دارین کو جمع کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے اس کا بہترین مظاہرہ زکوٰۃ سے ہوتا ہے۔ زکوٰۃ کو عبادت قرار دیا گیا ہے اور قرآن میں بار بار ایک ہی جملے میں نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کا یکجا ذکر ہوا ہے۔ اس لیے اگر نماز کے انکاری کو کافر قرار دیا جا سکتا ہے ، تو زکوٰۃ کے انکاری کو اس سے کم گناہ کا مرتکب نہیں سمجھا جاتا۔ اس تصور میں ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ اگر حکومت کی نگرانی اور جبر کے بغیر کوئی نماز ، روزہ اور حج کے فریضے خود ہی کامل طور پر انجام دیتا ہے تو زکوٰۃ بھی اپنی خوشی سے ادا کرنی چاہیے۔ یہ نہیں کہ زکوٰۃ دین سے باہر سیاسی اور دنیوی چیز سمجھی جائے۔ حکومت جبر کرے تو دیں ، ورنہ بے پروائی سے کام لیں [تفصیل کے لیے رک بہ زکوٰۃ]۔

(۵) احسان : حدیث جبریل[۴] کا تیسرا حصہ احسان کے متعلق ہے جسے تصوف ، طریقت ، سلوک جیسے مختلف ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ روحانی تزکیہ ، اخلاق حسنہ کو طبیعت ثانیہ بنا لینا ، اور ہر وقت اور ہر مشغولیت میں خدا سے لو لگائے رکھنا ہے۔ احسان کا اجمالی اور جامع و مانع خلاصہ وہ ہے جو حدیث جبریل[۴] میں اوپر بیان ہوا۔ اس سلسلے میں مسجد نبوی کے صُفّہ [رک بہ اہل صفّہ] کا ذکر کیا جا سکتا ہے ، جو مدرسہ اور اقامتی خانقاہ دونوں پر مشتمل تھا اور وہاں دین و دنیا دونوں کی تربیت ملتی تھی۔ اس کے بڑے اصول اکل حلال اور صدق مقال ہیں۔ فرض تو ہر شخص کے لیے ہے ، احسان میں ان کے حسن ادا اور نوافل اور ان پر مواظبت کی

تاکید ہوتی ہے ۔ [نیز رک بہ تصوف ؛ زہد ؛ تقوٰی]۔

(ز) وقوعِ قیامت : حدیث جبریل[۴] کا آخری حصہ قیامت کی تاریخ سے متعلق ہے ۔ عقائد کے علاوہ قیامت کا یہ مستقل ذکر اس کی اہمیت کے متعلق ہے کہ قیامت اور حساب و کتاب کا عقیدہ ہمیں برائی سے ہر وقت بچاتا ہے ۔ غرض حدیث جبریل[۴] میں وہ ناگزیر اقل بتایا گیا ہے جو ہر مسلمان کو کرنا چاہیے ۔

تعمیل و تنظیم : پیغمبر علیہ السلام کا کام صرف تبلیغ احکام ہی نہیں تھا ، بلکہ حتی الوسع اس کا عملی نفاذ اور باقاعدہ اجرا بھی آپ[ؐ] کے فرائض میں داخل تھا ؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جب اپنے ماحول کو اللہ اور یوم آخرت کے ماننے کی دعوت دی تو اس میں نہ آپ[ؐ] کی کوئی ذاتی منفعت تھی اور نہ کوئی جاہ طلبی ۔ آپ[ؐ] بار بار فرماتے تھے: قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا (۴۲ [الشوریٰ]: ۲۳)، یعنی میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں ۔ اس کے باوجود آپ[ؐ] کی مخالفت ہوئی اور مخالفوں کی ایذا رسانی سے آپ[ؐ] کی جان کو خطرہ پیدا ہو گیا ۔ ان حالات میں دو امکان ہی تھے : یا تو آپ[ؐ] اصلاح کی کوشش سے دستبردار ہو جائیں اور اس طرح اپنے مشن کو ادھورا چھوڑ جائیں ؛ یا پھر اللہ کی وسیع و عریض زمین میں ھجرت کر کے اس کے عملی نفاذ کی کوششیں جاری رکھیں ۔ تبلیغ سے دستبردار ہونا نہ صرف خدا کے عائد کردہ فرض کے خلاف ورزی ہوتا، بلکہ برائی کے عام ہو جانے کو روا رکھنا ہوتا ۔ بالآخر ناگزیر طور پر ھجرت کا فیصلہ کیا ۔ کام آسان نہ تھا، کیونکہ تبلیغ کے مخالفوں کا مقابلہ کرنے کے لیے موافقوں اور حامیوں کی ضرورت تھی اور ان کے حصول کے لیے بھی تبلیغ ہی مؤثر ہو سکتی تھی ۔

تبلیغ پہلے دوستوں کے حلقوں میں محدود اور مخفی رہی ۔ جو شخص مسلمان ہوتا وہ تبلیغ کا ایک نیا مرکز بن جاتا ؛ ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق دعوت و ارشاد میں دن رات کوشاں رہتا ۔ ان مخلصوں کو نہ صرف صبر و تحمل رکھنا ہوتا تھا، بلکہ بتدریج اسلام کی تعلیم کو ہر شعبۂ حیات کی ضرورتوں کے لیے مکمل کرنا اور اس کو مسلمانوں تک پہنچانا، اور اس پر عمل کرنا اور عمل کرانا بھی شامل تھا۔ مسلمانوں کی تعداد صفر سے شروع ہوئی اور آغاز میں رفتار لازماً سست رہی ۔ ابتدائی بارہ سال میں بمشکل دو چار سو آدمی مسلمان ہوئے ۔ غیر محسوس طور پر ان میں تنظیم پیدا ہو گئی ۔ ایک سردار ، ایک قانون ، ایک برادری یا امت ۔ ہر مسلمان ہر ضرورت کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے رجوع کرتا اور مسلمانوں میں باہم تعاون رہتا ۔ اس مملکت کے لیے شروع میں مرکز نہ تھا ؛ تو اس کی پرواہ بھی نہ کی گئی، کیونکہ اصل مقصد تبلیغ دین تھا اور اس کے لیے صورت حال کے مطابق کام کرنا تھا ۔ ھجرت کر کے مدینہ منورہ آنے پر ایک اسلامی ریاست قائم کرنی ممکن ہوئی، لیکن آبادی کی اکثریت ہنوز غیر مسلم تھی اور ایک عنصر یہود سے بھی سابقہ تھا۔ اس لیے حکومت کا ہر شعبہ اور ہر ادارہ بتدریج قائم کرنا اور تجربے سے اس کی کارکردگی کو سدھارنا تھا ۔ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں کہ آپ[ؐ] نے شہری مملکت کس طرح قائم فرمائی اور اس کے لیے ایک تحریری دستور کس طرح تدوین کیا ۔ اب اس تنظیم کے ارتقا، تعلیم عامہ، عدلیہ ، قانون سازی ، دفاع ، مالیہ وغیرہ کے وجود میں لائے جانے کی ضرورت تھی، جو کہ آپ[ؐ] نے باحسن طریقے پر پوری فرمائی ۔

تعلیم عوام : عہد نبوی[ؐ] میں تعلیم کو بڑی اہمیت دی گئی ۔ جس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ نبی امی پر نازل ہونے والی اولین وحی کا اولین لفظ اِقْرَاْ، یعنی پڑھ تھا اور اس کے ساتھ ہی قلم کی تعریف میں یہ حقیقت یاد دلائی گئی کہ سارا انسانی علم یعنی تہذیب و تمدن قلم ہی کا رہین منت ہے اور اگلوں کے

تجربوں سے پچھلوں کا استفادہ اس کے بغیر ممکن نہیں۔ قرآن کریم نے نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منصب نبوت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: وَ یُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَ یُعَلِّمُکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (۲ [البقرة]: ۱۵۱)، یعنی آپؐ تمہیں کتاب و حکمت اور اس چیز کی تعلیم دیتے ہیں، جو تمہیں معلوم نہ تھی۔ علاوہ ازیں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے صراحت فرمائی: بُعِثْتُ مُعَلِّمًا (ابن ماجہ، فضل العلماء)؛ اس سے بھی بڑھ کر ارشاد ہے، العلماء ورثة الانبیاء (البخاری، ۳/۱۰، ۱ : ۲۸)، یعنی علما نبیوں کے وارث ہوتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ عربی زبان جو تاریخ میں پہلی دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نوعمری میں (ابو سفیان کے باپ) حرب کی سرداری کے زمانے میں مکہ مکرمہ میں لکھی جانے لگی تھی اور قرآن اولین کتاب تھی، جو عربی زبان میں نازل ہوئی۔ اسلام کی تعلیمی روح کے باعث دو سو سال ہی بعد تحریری ادب میں دنیا کی سب سے زیادہ باثروت علمی زبان بن گئی، جس میں دنیا کے سارے ہی علوم کی اعلیٰ ترین کتابیں دستیاب ہونے لگیں۔ لکھائی کے آغاز کے وقت خود اس کے خط کا یہ حال تھا کہ ۲۸ ابجد کے لیے صرف پندرہ [چودہ؟] شکلیں تھیں (ب، ت، ث، ن، ی)؛ (ج، ح، خ)؛ (د، ذ)؛ (ر، ز)؛ (س، ش) جس سے جملے کبھی صحیح اور کبھی غلط پڑھے جاتے تھے۔ رقش یعنی حروف کے نقطے نیز اعراب میں کم از کم تنوین آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔ باقی اعراب بعد میں وضع کیے گئے (دیکھیے مقالہ صنعة الکتابة فی عهد الرسول والعمارة، در مجلہ فکر و فن، ہامبورگ، دسمبر ۱۹۶۳ء) اور اعراب لگا ہوا عربی خط دنیا کا سب سے زیادہ بے التباس اور خوبصورت خط بن گیا؛ چنانچہ لاطینی میں Rahim کو رحم، رحیم اور راحیم تین طرح پڑھا جا سکتا ہے، لیکن عربی میں یہ التباس ناممکن ہے۔ خط کے استقرار کی طرح زبان کا استقرار بھی قابل ذکر ہے۔ دنیا کی زبانیں چار پانچ سو سال بعد عام طور پر ناقابل فہم ہو جاتی ہیں۔ چوسر Chaucer (م ۱۴۰۰ء) کی انگریزی کو آج کتنے لوگ سمجھ سکتے ہیں، مگر عربی زبان چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود نہ صرف و نحو میں بدلی، نہ لغت میں اور نہ املا و تلفظ میں۔

عہد نبوی میں درس کے لیے صرف ایک جامع کتاب رکھی گئی، یعنی قرآن جس میں سارے ہی علوم کی اساسی چیزیں ہیں۔ عقائد و عبادات بھی، قانون بھی، خدا کی حمد و ثنا بھی، تاریخ عالم بھی، اخلاق و طریقۂ معاشرت بھی۔ تورات بشمول زبور ایک قبیلے کی تاریخ ہیں۔ موجودہ انجیل ایک فرد کی محض سوانح عمری ہے، جبکہ قرآن انسانیت کی تاریخ اور انسان کے لیے ہر شعبۂ حیات میں راستہ بتانے والی کتاب ہے۔

ہجرت سے قبل ہی مکے میں قرآن کریم کو لکھ کر محفوظ کیا جانا شروع کیا گیا۔ مردوں کے علاوہ عورتوں کو بھی اس کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کا پڑھنا سمجھنا کسی کنبے اور کسی ایک ذات کے لوگوں سے مخصوص نہیں کیا گیا۔ ہجرت سے قبل مکہ مکرمہ ہی سے ایک عالم حضرت مصعبؓ بن عمیر کو مدینہ منورہ بھیجا گیا۔ ان کی کوشش سے سال ڈیڑھ سال میں کوئی سو کے قریب خاندان مسلمان ہو گئے۔ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں مسجد نبوی بنی تو اس میں صفّہ کے نام سے ایک اقامتی تعلیم گاہ بھی قائم کی گئی۔ اس میں لکھنے پڑھنے جیسی سادہ تعلیم سے لے کر، دین، قانون، سلوک اور اخلاق کی اعلیٰ تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ عہد نبوی میں مدینہ منورہ ہی میں مسجد نبوی کے علاوہ نو مسجدیں تھیں جن میں سے ہر ایک میں مدرسہ بھی تھا اور اہل محلہ وہیں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ابن حزم (جوامع السیرة، ص ۳۲۳) کے مطابق صحابیات میں سے بیس کے قریب صاحب فتوی فقیہ تھیں۔

شفاءؓ بنت عبداللہ جو ، جو حضرت عمرؓ کی رشتہ دار تھیں ، کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے ام المؤمنین حضرت حفصہؓ کو لکھنا پڑھنا سکھایا تھا (ابو داؤد : سنن ؛ ابن حنبل : مسند ، ٦/٣٧٢ ؛ الحاکم : المستدرک ، ٤ : ٥٦ تا ٥٧) ۔ ایک روایت (ابن حجر : الاصابہ ، نساء/ص ٦١٨) میں ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے انھیں شہر کی منڈی میں بعض خرید و فروخت کے معاملات (امر السوق) پر مامور فرمایا تھا ۔ بیرون سے مسلمان مدینہ منورہ آئے اور تعلیم و تربیت حاصل کر کے اپنے علاقوں کو واپس جا کر معلم بنتے تھے ۔ مدینہ منورہ سے بھی مدرس ہر جگہ بھیجے جاتے تھے ۔ الطبری نے سنہ ١٠ھ کے حالات میں (١ : ١٨٥٢ ، ١٩٨٣) یہ اثر انگیز واقعہ لکھا ہے کہ حضرت معاذؓ بن جبل کو جب یمن بھیجا گیا تو وہ یمن اور حضر موت کے صوبوں کے ہر ضلع میں تعلیمی دورے کیا کرتے تھے ، گویا وہ صوبۂ یمن میں تعلیم کے ناظر اعلی تھے ۔ یہی حالت دوسرے صوبوں میں بھی ہوگی ۔ سورہ ٢ [البقرۃ]: ٢٨٢ میں حکم دیا گیا کہ کوئی ادھار رقم یا معاملہ تحریر کے بغیر نہ ہو اور یہ کہ ایسی دستاویز پر فریقین کے علاوہ دو گواہوں کے دستخط بھی ہوں .

سرکاری تدبیروں کے ساتھ عوام کو بھی تعلیم پھیلانے کی پر زور ترغیب و تشویق دی جاتی رہی ۔ قرآن کریم کو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مدون کرایا ، حدیث کی تدوین متعدد صحابہؓ نے آپؐ کی اجازت سے آپؐ کے جیتے جی شروع کر دی تھی ۔ ان میں آپؐ کے خادم خاص حضرت انسؓ بن مالک خاص طور پر قابل ذکر ہیں ، جو لکھی ہوئی یاد داشتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو سنا کر تصحیح کرانے کے عادی تھے (الخطیب : تقیید العلم ، ص ٩٥ تا ٩٦ ؛ الحاکم : المستدرک) ۔ شاید حکومت کے وسائل کی کمی تھی کہ حکومت نے صرف مسلمانوں کی تعلیم پر اکتفا کیا ، مگر یہ بھی ممکن ہے کہ رواداری کا وفور تھا کہ کوئی طبقۂ رعیت بھی ایسا نہ ہو جسے اپنی ثقافت کی آزادی نہ ہو اور اس رواداری ہی کا نتیجہ ہے کہ کبھی مسلمانوں کی خانہ جنگی کے زمانے میں بھی ذمیوں نے بغاوت نہ کی اور اسلامی حکومت کو وہ اپنے ہم مذہب رومیوں وغیرہ کی حکومت پر کھلم کھلا ترجیح دیتے رہے کہ وہاں فرقہ واریت بہت زیادہ تھی ۔

عدلیہ و تشریعیہ (مقننہ) : شروع میں یگانہ حاکم عدالت آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہی تھے ۔ ہجرت کر کے مدینہ منورہ آنے پر آپؐ زیادہ تر عدالت مرافعہ بنے رہے ۔ مقدمے اولاً شیوخ قبائل کے پاس جاتے ، بجز اس کے کہ مقدمے کے فریق دو مختلف قبیلوں کے ہوں ۔ ملک میں توسیع ہوئی تو کبھی عامل ہی حاکم عدالت بھی ہوتے ؛ کبھی ایک علیحدہ با اختیار قاضی مامور کیا جاتا ۔ صوبوں سے بعض اوقات قاضی پیچیدہ مقدموں میں استصواب کرتے ؛ بعض اوقات صوبوں کے نامناسب فیصلوں کی اطلاع ملتی تو مرکز سے تنسیخ اور تصحیح و اصلاح کی ہدایتیں بھی دی جاتیں ۔ قانون (نص صریح) میں سکوت نظر آئے تو قاضیوں کو اجتہاد اور قیاس سے امثلہ و نظائر پر قیاس کر کے نیا قانون بنانے کی بھی اجازت تھی ۔ نیت کی اصلاح پر زور دیا جاتا تھا ۔ قاضیوں کو حکم تھا کہ اپنی ذاتی معلومات پر عمل نہ کریں بلکہ پیش شدہ شہادت پر ہی فیصلے کی بنیاد رکھیں ؛ نیز یہ کہ فریق ثانی کا جواب سنے بغیر یک طرفہ بیان پر فیصلہ ہرگز نہ کیا جائے ۔ ایک اہم ہدایت قاضیوں کو یہ دی گئی ! "البینة علی المدعی والیمین علی من انکر" (ثبوت پیش کرنا دعوی کرنے والے کا فریضہ ہے اور انکار کنندہ مدعی علیہ کو قسم کھا کر انکار کرنا پڑے گا) ۔ فنی چیزوں کے

لیے ماہرین سے تحقیقات کرا کر ان کے مشورے پر عمل کیا جاتا۔ قاضیوں کو تاکید ہوتی کہ پیچیدہ معاملات میں نیک اور باصلاحیت اہل علم سے مشورہ کیا کریں۔ اسلام نے کسی شخص حتی کہ حاکم ملک کو بھی قانون سے بالا قرار نہ دیا اور ہر فرد کو اس کے اعمال کا مسئول اور ذمہ دار ٹھیرایا گیا ہے۔ خلافت راشدہ کے زمانے سے ہمارے ہمعصر عہد تک مسلمان حکمرانوں کے خلاف اس کے اپنے ملک میں قاضی کے ہاں مقدمہ دائرہ ہوتا رہا ہے۔ حکمران اپنا مقدمہ آپ سننے اور فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں۔ قانون کی تکمیل کے لیے ہر نظام میں ایک تہدید ہوتی ہے جو پولیس اور فوج کی قوت اور حاکم عدالت کے فیصلوں کا نفاذ ہے۔ اسلام نے اس ظاہری تہدید کو کاملاً اپناتے ہوئے اس میں ایک مزید اور قوی تر عنصر کا اضافہ کیا جو حساب آخرت اور خدا کے ہاں ظالم کی جوابدہی ہے۔ ایک حدیث ہے کہ لوگ جھگڑے میرے پاس لاتے ہیں اور ممکن ہے کہ کوئی اپنی دلیل بیان کرنے میں زیادہ چرب زبان ہو اور میں جو سنوں اس کے مطابق فیصلہ کر دوں۔ اگر میں کسی کو اس کے بھائی کا حق مار کر کچھ دینے کا حکم دوں تو یقین جانو کہ میں اسے جہنم کی آگ کا ایک ٹکڑا دیتا ہوں (صحاح ستہ)۔

قرآن نے تعلیم کی طرح عدالتی معاملات میں بھی غیر مسلموں کو کامل خود مختاری دی ہے۔ فریقین ایک ہی ملت (مثلاً نصرانیت) کے ہوں تو انہیں کے قانون، انہیں کے حاکم عدالت اور انہیں کی ابتدائی و آخری عدالت مرافعہ ہوگی؛ اسلامی عدالت اور قاضی سے ان کو کوئی سروکار نہ ہوگا۔ حاکم عدالت کا تقرر بھی انہیں کی ملت کرتی ہے۔ انہیں اجازت ہے، جبر بالکل نہیں، کہ فریقین متفقہ طور پر چاہیں تو اسلامی حاکم عدالت کے پاس رجوع کریں۔ فریقین ایک ہی ملت کے ہوتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا طرز عمل یہ رہا ہے کہ انہیں کا قانون منگوا کر اس کے مطابق فیصلہ فرماتے۔ فریقین اگر دو مختلف ملتوں کے غیر مسلم ہوتے تو وہی آپس میں فیصلہ کرتے کہ کس قانون کی طرف رجوع کیا جائے۔ اگر وہ اسلامی عدالت میں آنے کا فیصلہ کرتے تو ان کی خواہش کے مطابق ان پر اسلامی قانون نافذ کیا جاتا، (لیکن ایسی کوئی معین مثال عہد نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام میں نہیں ملتی)۔

اگر فریقین میں سے ایک مسلمان ہوتا تو مقدمہ لازماً اسلامی عدالت میں آتا اور اسلامی قانون رو رعایت کے بغیر پورا پورا انصاف کرتا۔ (ایسی مثالیں موجود ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمان کے خلاف یہودی کے حق میں فیصلہ کیا)۔

قانون سازی کا عام اصول یہ ہے کہ انسان اپنے ماحول کے پرانے رسم و رواج اور عرف و عادت پر عمل جاری رکھتا ہے، بجز ان چیزوں کے جن سے کہ اپنے، اس کا قابل احترام سردار، منع کرے۔ نیز ان نئی چیزوں پر عمل کرے جن کا وہ حکم دے۔ اس طرح شروع ہی سے مسلمانوں میں قانون کے دو ماخذ رہے: کتاب اللہ؛ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم؛ [البتہ اضافی طور پر مقامی (مثلاً مکی یا مدنی) رواج کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے امت کی سہولت اور آسانی کی خاطر اپنی صوابدید کے مطابق کچھ تغیر و تبدیلی کے ساتھ شامل کرنے کی اجازت دے دی؛ اس طرح اس پرانے رسم و رواج کو "تقریر نبوی" ہونے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے برقرار رکھے جانے، کی سند حاصل ہوگئی اور وہ اسلامی قانون کا جزو لاینفک بن گیا اور سنت سے بنے ہوئے قانون ہی کے برابر مقدس۔ "تقریر نبوی" کا اطلاق مکے کے بعد مدینے کے رواج پر ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ مقامی رواج کی "اصلاح" اور اس کو اسلام کے مطابق بنانا بتدریج ہی ہو سکتا تھا، یعنی

اگر کسی رواج کا آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو علم ھوتا، یا رواجی عمل کی بنا پر پیدا شدہ جھگڑا فیصلے کے لیے آپؐ تک لایا جاتا تو آپؐ کچھ نہ کچھ ضرور کر دیتے ، چاھے رواج کو برقرار رکھتے یا اسے تبدیل کر دیتے ، لیکن اگر کوئی رواج آپؐ کے علم میں نہ لایا جاتا تو اس کی اصلاح کی واحد صورت یہ تھی کہ قرآن پاک ھی کے عام احکام سے استنباط کر کے اس رواج کو بعد کے فقہا برقرار رکھیں یا بدلنے کا حکم دیں اور فقہا کا یہ عمل لا متناھی ھے۔ اس کا تعلق ساری دنیا سے ھے، سارے زمانوں سے کہ قرآن و سنت معلوم و معین ھو چکے ھیں، لیکن دنیا میں اسلام کا پھیلنا ابھی مکمل نہیں ھوا ھے۔ قرآن و سنت اسلامی قانون کے اھم اور بنیادی ماخذ بھی ھیں اور مقامی پرانے رواجوں کے اصلاح کنندہ بھی؛ البتہ ان کا سمجھنا اور ان سے نئے احکام کا استنباط کرنا انتھک اور مسلسل محنت چاھتا ھے۔ فہم میں قصور ھو سکتا ھے ، مثلاً وضو کی ضرورت ھو اور پانی نہ ھو تو منہ اور ھاتھوں پر مٹی سے تیمم کرنا چاھیے، لیکن اگر ضرورت غسل کی ھو تو قرآن مجید (۴ [النساء] : ۴۳؛ ۵ [المائدۃ] : ۶) میں کافی صراحت کے باوجود بعض صحابہؓ نے قیاس کیا کہ غسل کے وقت مٹی پر لوٹ کر سارے جسم پر تیمم کرنا چاھیے۔ ایسے عمل کی اطلاع جب آپؐ کو ملی تو آپؐ نے فرمایا کہ دونوں صورتوں میں منہ اور ھاتھوں کا مسح کافی ھے۔ اسی بنا پر جب حضرت عمروؓ بن العاص کو آپؐ نے قاضی بنایا تو انھیں بتایا کہ قانون کے معلوم نہ ھونے کی صورت میں حاکم عدالت کو دیانتداری سے اجتھاد (کوشش) کر کے قیاس سے حکم شریعت معلوم کرنا چاھیے اور اس میں اگر حاکم عدالت ناکام رھے، یعنی غلط حکم دے تو بھی اسے اللہ کے ھاں ایک اجر ملے گا (نیت کی درستگی کا) ، اور اگر صحیح حکم تلاش کر لے تو اسے دو اجر ملیں گے۔ اسلام میں اھل علم میں مساوات ھے؛ اس لیے ان میں اختلاف راے قابل برداشت ھے اور امت کا یہ اختلاف اس معنی میں بھی خدا کی رحمت ھے کہ مختلف آرا اور ذھنوں کو دیکھ کر بہتر راے کا معلوم کر سکنا ممکن ھے۔ حدیث حضرت معاذؓ بن جبل کا یہاں ذکر کیا جا سکتا ھے کہ جب وہ یمن بھیجے گئے تو رخصتی ملاقات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے پوچھا: کس طرح فیصلہ کیا کرو گے؟ انھوں نے کہا: کتاب اللہ کے مطابق۔ فرمایا: اگر اس میں نہ پاؤ تو؟ انھوں نے کہا: تب سنت رسولؐ کے مطابق۔ آپؐ نے فرمایا: اگر اس میں بھی نہ ملے تو؟ کہا: تب میں اپنی راے سے اجتھاد کروں گا اور کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کروں گا۔ اس پر آپؐ نے انتھائی خوشنودی کا اظہار کرتے ھوے فرمایا: اللہ کے لیے حمد ھے کہ اس نے اپنے رسولؐ کے سفیر کو اس بات کی توفیق دی جس سے اللہ کا رسول پوری طرح راضی ھے۔ غرض قرآن مجید ، سنت نبوی اور تقریر نبوی نیز اجتھاد و استنباط عہد نبوی میں قانون سازی کے عام ذریعے تھے۔ کچھ خاص وقتی اور محدود ذریعے بھی تھے ، مثلاً قدیم پیغمبروں کی شریعتیں، کیونکہ وہ بھی خدا ھی کا حکم لائے تھے؛ اس لیے ان کی شریعتیں مسلمانوں پر بھی برقرار اور نافذ رھتی ھیں، بشرطیکہ اس کا قرآن کریم میں ذکر ھو اور اس کو قرآن یا سنت نبوی نے منسوخ نہ کیا ھو۔ چنانچہ اٹھارہ پیغمبروں کا نام لینے کے بعد قرآن ۶ [الانعام] : ۹۰ نے صراحت کی ھے کہ یہ وہ لوگ ھیں جن کو اللہ نے ھدایت دی تھی اس لیے (اے محمدؐ) ان کی ھدایت کی اقتدا کرو۔ [قانون سازی کے سلسلے میں قانون بین الممالک کے کئی احکام قرآن مجید میں بھی ھیں ، یعنی جنگ اور امن کے زمانے میں دوسری حکومتوں سے کیسا برتاؤ اور سلوک کیا جائے۔ اس ضمن میں قانون زیادہ تر سنت نبوی پر مبنی ھے ، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے غزوات اور جنگوں میں جو برتاؤ دشمن سے

روا رکھا اور یہ قانونِ جنگ دنیا کے تمام قوانین جنگ سے بدرجہا بہتر اور زیادہ انسانیت پرور ہے ۔ [نیز رک بہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بحیثیت مقنن ؛ محمد (سورہ)] ۔

دفاعی اور عسکری ادارہ : عہد نبوی ؐ کی روحانی فتوحات کہ کئی لاکھ آدمی مسلمان ھوئے ، (حجۃ الوداع میں ایک لاکھ چالیس ھزار مسلمان شریک ھوئے) اپنی جگہ ھیں، لیکن مادی فتوحات بھی کچھ کم نہیں [رک بہ غزوات] ۔ آپؐ کی جنگوں میں آپؐ کے دشمنوں کی تعداد کئی گنا زیادہ ھوتی تھی ۔ بعض اوقات دس گنا سے بھی زیادہ ، اس کے باوجود دشمن مقابلہ نہ کر سکا ۔ ھجرت مدینہ کے فوراً بعد قرآن مجید نے جہاد یعنی فوجی خدمت ھر مسلمان کا فریضہ قرار دے دیا ؛ [کیونکہ دشمن اہل اسلام کو مٹانے کے لیے پوری طرح تیاریوں میں مصروف تھے ؛ اس لیے اندیشہ تھا کہ اگر ان کے مقابلے کے لیے تیاری نہ کی گئی تو اہل اسلام کو مٹانے میں کوئی دریغ نہ کریں گے (دیکھیے ۲۲ [الحج] : ۳۹) ۔

سالک جنگجو اور ھر شخص مسلح تو پہلے سے تھا؛ اب ان کی جنگی تربیت کی تدبیریں روز افزوں اختیار کی گئیں ۔ تیر اندازی ، گھڑ دوڑ اور کُشتی وغیرہ کی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم شخصی سرپرستی فرماتے رھے [رک بہ علم فروسیۃ ؛ فرس] ؛ گھڑ دوڑ میں شرکت کرکے جیتنے والوں کو خود انعام دیتے ؛ جنگ کے لیے تربیت کے دوران میں جیتنے والے گھوڑوں کا انتخاب جس ٹیلے پر کھڑے ھو کر فرماتے وھاں مدینہ منورہ میں آج بھی مسجد السبق (گھڑدوڑ کی مسجد) باقی ھے ۔ عبادت کے قواعد ایسے ہیں کہ ان سے فوجی تربیت میں مدد ملتی ھے ۔ ھر سال مہینا بھر روزے رکھنا سپاھیوں کو بھوکے پیاسے رہ کر لڑنے کی تربیت دلاتا ھے ۔ نماز سے صبح خیزی ، صف بندی اور امام کی آواز پر حرکات و سکنات بھی فوجی تربیت میں معاون ھیں ۔ حج کے ذریعے سے ساری مملکت سے مسلمانوں کا اجتماع عام گھر کی چھت کے بجائے آسمان تلے زندگی گزارنا وغیرہ سکھاتا ھے ۔ قمری مہینوں کے اختیار کرنے کی وجہ سے ھر موسم کے روزوں کی تربیت دی جاتی ھے ۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ بچوں ، معذوروں ، اپاھجوں کو چھوڑ کر ساری مسلم آبادی مستقل فوج تھی ، جب چاھا اور جتنوں کی ضرورت ھوئی اتنوں کو بلا لیا جاتا تھا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مسجد میں نماز کے وقت رضاکاروں کی ضرورت کا اعلان کرتے اور بتاتے کہ کس کے پاس اپنے نام لکھوائیں اور کب اور کہاں جمع ھوں ۔ اور اگر خود قیادت نہ فرماتے تو سالار جیش نامزد فرماتے ۔ حسب ضرورت تبلیغی افسر بھی مامور کیے جاتے ؛ چونکہ لڑائی کا مقصد دنیوی منفعت بالکل نہ تھا، اس لیے جنگ کے عین اثنا میں بھی نمازِ خوف کا حکم نازل ھوا (۴ [النساء] : ۱۰۲)۔ اس کی تعمیل کی جاتی تھی خواہ نتائج کچھ ھی نکلیں ، اس سے اسلامی افواج کی اھلیت کا بخوبی اظہار ھوتا ھے اور دوسری طرف اس سوال پر کہ کوئی مال غنیمت کے لالچ میں ، کوئی اظہار شجاعت کے لیے لڑتا ھے ، کوئی حمیت سے ، ان میں سے راہ خدا میں لڑنے والا کسے سمجھا جائے گا ؟ آپؐ نے جواب دیا : صرف وہ جو اللہ کے نام کی سربلندی کے لیے جنگ کرے ۔ اسے نہ مال غنیمت کی چاھت ھو ، نہ کوئی اور مادی طلب [رک بہ جہاد] ۔ تنظیم کی بہر حال ضرورت تھی ۔ جس طرح عوام کی عسکری تربیت میں حکومت دلچسپی لیتی تھی، اسی طرح حکومت سے مستقل فوج کے فائدے نظر سے پوشیدہ نہ رھے ۔ فوری ضرورت کے لیے صفہ کی ”خانقاہ“ سے دن ھو کہ رات ، ھر وقت رضاکار تیار ملتے ۔ جب رفتہ رفتہ حکومت کے مالی وسائل بڑھے ، بڑی تعداد میں نیم مستقل فوج کے تیار رکھنے کے لیے وظیفہ دینے کا نظام شروع کیا گیا ۔ السرخسی (شرح السیر الکبیر ، ۲ : ۲۰ ، باب ۱۰۵ ، حیدرآباد)

نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانے میں مسلمانوں سے جو صدقات وصول ہوتے ان کو دشمنوں سے حاصل شدہ مال (فیْ) سے الگ رکھا جاتا؛ ہر ایک کے مصارف و مستفیدین جدا جدا تھے ۔ صدقات یتیموں، بوڑھوں اور غریبوں کے لیے تھے؛ پھر جب کوئی یتیم بالغ ہو کر جہاد (فوجی خدمت) کا مستوجب ہو جاتا تو اسے صدقات کے مستفیدین سے نکال کر فیْ کے مستفیدین میں منتقل کر دیا جاتا، لیکن اگر وہ جہاد میں حصہ لینا نہ چاہتا تو اسے حکومت کے مال میں سے کچھ نہ دیا جاتا، (نہ صدقات سے، نہ فیْ سے)، بلکہ اسے کہا جاتا کہ اپنا کسب معیشت خود تلاش کرے ۔ ان وظائف کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ مرد کے فوجی خدمت پر جانے کی صورت میں اس کا کنبہ وسائل حیات سے محروم نہ رہے اور ہتھیار وغیرہ بھی خرید کر تیار رکھے جا سکیں ۔ حضرت عمرؓ کے زمانے کا دیوان (دفتر) اسی کی تکمیلی اور ترقی یافتہ شکل معلوم ہوتا ہے) ۔ مدینہ منورہ سے باہر مسلمان مجاہدین کی طلبی کے لیے ان کے قبائلی سردار (شیوخ) ذمہ دار قرار دیے گئے اور وہی مطلوبہ تعداد منتخب کر کے روانہ کرتے ۔ اس کے علاوہ سرکاری خزانے میں بھی ہتھیار، گھوڑے، اونٹ، غلہ اور دیگر جنگی ضرورت کی چیزیں رکھی جاتیں ۔ خبر رسانی کے نظام کو بہت ہی عمدہ بنایا گیا ۔ دشمن کے علاقوں میں افراد مقرر کیے جاتے تھے تاکہ ہر نئی اور خطرے والی خبر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو باخبر رکھیں ۔ خصوصی جاسوس بھی عام طور پر خطرے کے دنوں میں کثرت سے بھیجے جاتے ۔ دوسری طرف اپنی خبروں کو دشمن سے چھپانے کی ممکنہ تدبیریں اختیار کی جاتی تھیں ۔ خود آپؐ کا طریقۂ جنگ بھی دلچسپ معلومات کا حامل ہے ۔ خندق [رک باں] سے اہل عرب واقف نہ تھے، اسے حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے پر اختیار کر کے عظیم فائدہ اٹھایا گیا ۔ جنگ خیبر میں دشمن نے منجنیق سے سنگباری کی تھی ۔ ایک ہی سال بعد طائف کے محاصرے میں آپؐ نے منجنیق اور دبابے (زرہ پوش گاڑیاں) استعمال کیں ۔ علم الجو سے ہمیشہ استفادہ کیا جاتا ۔ حملے کے وقت کے لحاظ سے حملے کے لیے دشمن بستی یا پڑاؤ کی ایسی جہت انتخاب کی جاتی کہ ابھرتا ہوا یا ڈھلتا ہوا سورج مسلمان سپاہیوں کی آنکھوں کے سامنے نہ رہے؛ چلنے والی ہوا مسلمانوں کے پیچھے سے چلے، سامنے سے نہیں؛ رات کے سفر میں اونٹوں کے گلے کی گھنٹیاں نکلوا دی جاتیں تاکہ آواز سے دشمن متنبہ نہ ہو جائے ۔ عہد نبوی ہی سے فوج میں طبی امداد کا انتظام نظر آتا ہے ۔ جنگ کے دوران میں مردوں کی قلت کی وجہ سے کھانا پکانے اور تیمار داری کے لیے عورتیں منتخب کی جاتیں ۔ مال غنیمت قبل از اسلام دستِ خود دہانِ خود کا مصداق تھا ۔ قرآن کریم نے حکم دیا کہ جملہ مال غنیمت کو مرکزی ملکیت سمجھا جائے اور فوج کے تمام لوگ برابر کا حصہ پائیں ۔ چاہے مال جمع کرنے میں انھوں نے حصہ لیا ہو یا کسی فوجی کام میں مشغول رہنے کے باعث انھیں اس کا موقع نہ ملا ہو ۔ اس مال کا پانچواں حصہ (خُمس) مرکزی حکومت کے خزانے میں جمع ہو جو عام رعایا کی بہبود پر خرچ کیا جائے اور باقی غانم فوج میں تقسیم کر دیا جائے [رک بہ انفال] ۔ نیز سپہ سالار سے لے کر ادنٰی سپاہی تک سب کا حصہ یکساں ہو؛ فرق ہو تو صرف اس کا کہ سپاہی کے پاس اس کا اپنا گھوڑا تھا یا یہ کہ وہ پیدل تھا (۸ [انفال] : ۱ تا ۴).

مال غنیمت کے سلسلے میں اسیران جنگ کا ذکر ناگزیر ہے ۔ دشمن کی جان اور مال کو نقصان پہنچا سکنا ہر فریق جنگ کے حقوق جنگ میں داخل ہے، لیکن اسیروں کو قتل نہیں کیا جاتا تھا، بجز اس کے کہ اسیر نے عہد سابق میں کسی اور قابل سزا جرم کا ارتکاب کیا ہو ۔ اسیروں کو بلامعاوضہ

رہا کرنا، فدیہ لے کر رہا کرنا، اپنے کسی اسیر سے جو دشمن کے قبضہ میں ہو، تبادلہ کرنا، نیز غلام بنا سکنا، عہد نبوی میں ان میں سے ہر ایک کی نظیریں ملتی ہیں۔ غلام بنانا آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو قطعی پسند نہ تھا، لیکن اس عالمگیر رواج کو یک طرفہ طور سے منسوخ کرنے میں دشواری یہ تھی کہ مسلمان قیدیوں کو دشمن غلام بنا سکتا تھا۔ اسیروں کو غلام بنانے کی جو دو ایک مثالیں عہد نبوی میں ملتی ہیں (مثلاً بنو المصطلق اور بنو ہوازن) ان میں یہ بھی تحقیق سے ثابت ہے کہ بالآخر غلام آزاد کر دیے گئے تھے (دیکھیے بالا) اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے غلامی کا جزئی انسداد کرتے ہوے فرمایا: لَا رِقَّ عَلٰی عَرَبِی، یعنی کسی عرب کو غلام نہیں بنایا جاسکتا (السرخسی: المبسوط، ۱۰: ۳، ۱۱۸؛ وہی مصنف: شرح السیر الکبیر، ۲: ۲۶۵، ۲۶۹)۔ قرآن و حدیث میں جگہ جگہ قیدیوں سے اچھا سلوک کرنے کی بڑی تاکیدیں ہیں؛ اس کے ساتھ ہی غلاموں کو آزاد کرنے کی بھی بہت سی فضیلتیں بیان کی گئی ہیں، حتّٰی کہ اسے بہت بڑی نیکی قرار دیا گیا ہے۔ [مختلف گناہوں کا کفارہ مثلاً کفارۂ قتل خطأ (۴ [النساء]: ۹۲)؛ کفارۂ حِنث (۵ [المآئدۃ]: ۸۹)؛ کفارۂ ظِہار (۵۸ [المجادلۃ]: ۳) غلام کی آزادی سے ہوتا ہے]۔ زکوٰۃ [رک بآں] جو حکومت کی آمدنی کا ایک حصہ ہے، اس میں سے ہر سال ملک کے غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کرنے کا قرآن مجید میں حکم ہے اور یہ بھی کہ اگر کوئی غلام اپنی آزادی (مکاتبت) کے لیے کچھ رقم اپنے آقا کو دینے پر آمادہ ہو تو آقا اس سے انکار نہیں کر سکتا، بلکہ اسے مطلوبہ رقم کمانے کی سہولت مہیا کرنے پر بھی مجبور ہے۔ مسلم قیدیوں کو دشمن کی قید سے رہائی دلانا اسلامی حکومت کے خرچ پر ہوتا ہے اور اس میں مسلمان اور ذمی میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ علم حرب اور علم قانون دونوں کے نقطۂ نظر سے عہد نبوی کی جنگوں کے متعلق تفصیلوں کے لیے دیکھیے [حمید اللہ: عہد نبوی کے میدان جنگ، مطبوعہ لاہور؛ نیز رک بہ غزوات]۔

مالیات: [نیز رک بہ اسلام: صدقات؛ زکوٰۃ وغیرہ]: مال کو قرآن کریم (۴ [النسآء]: ۵) میں زندگی اور اس کی بقا کا وسیلہ قرار دے کر اس کی روز مرہ زندگی میں اہمیت کی طرف ایک جامع اشارہ کیا گیا ہے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ مال ظاہری اور باطنی احوال پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے آغاز ہی سے آپؐ نے ایسی تدابیر اختیار کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا جن کا مقصد اقتصادی و معاشی حالات کو بہتر بنانا تھا؛ چنانچہ ابتدائی مکی دور میں اہل ثروت کو اہل حاجت کی امداد کرنے کا حکم دیا گیا اور اسے مالداروں پر غربا کے حق واجب سے تعبیر کیا گیا (۵۱ [الذاریت]: ۱۹؛ نیز ۷۰ [المعارج]: ۲۴)۔ مدنی دور میں اس میں مزید وسعت پیدا کی گئی اور زر نقد، سونا، چاندی، ریوڑ وغیرہ کی ایک خاص مقدار پر زکوٰۃ [رک بآں] فرض کر دی گئی [مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: ابو یوسف: کتاب الخراج؛ ابو عبید: کتاب الاموال، مطبوعہ اسلام آباد، نیز رک بہ علم (معاشیات)؛ مالیات وغیرہ]۔ علاوہ ازیں صنعت و تجارت میں ایمانداری، دیانتداری اور فرض شناسی پر خصوصی زور دیا گیا؛ چنانچہ ایک مستقل سورہ المطففین [رک بآں] میں کم تولنے اور کم ماپنے والوں کی خصوصی مذمت کی گئی۔ اس کے علاوہ معاقل [دیت رک بآں]، جسے موجودہ دور کی اصلاح میں بیمہ [کے مشابہ قرار دیا جا سکتا] ہے، کے نظام کو بہتر بنایا گیا۔ اس طرح قتل خطا کی صورت میں نہ صرف مقتول کے وارثوں کو قابل لحاظ خون بہا ملتا تھا، بلکہ قاتل کی امداد کے لیے بھی اس کے قبیلہ، اس کے خاندان اور بعض صورتوں میں قریہ کے لوگوں کو

شریک تصور کیا جاتا تھا تاکہ اس پر اور اس کے خاندان پر ضرورت سے زیادہ بوجھ نہ پڑے ۔ بعد ازاں یہ سلسلہ ترقی کر گیا اور امداد باہمی کی طرز پر بننے والی یہ انجمنیں مزید فروغ پذیر ہوئیں ؛ اسلام کی سب سے اہم اصلاح جو سرمایہ داری کو ختم کرنے کے لیے اختیار کی گئی ، وہ سود کا معاشرے سے مکمل اور غیر مشروط انسداد ہے ۔ اس کے بجائے قرض حسنہ کے جذبے کو ابھارا گیا تاکہ ضرورت مند افراد کو بغیر کسی استحصالی صورت کے امداد مل سکے ؛ البتہ ساجھے کے کاروبار [مضاربت رک بان] کو اس بنا پر بحال رکھا گیا تاکہ ایک صحت مند معاشرے کی تعمیر و توسیع میں مشترک کوشش اہم کردار ادا کرتی رہیں ۔ خلافت راشدہ کے دور میں ، باقاعدہ طور پر بیت المال [رک بان] سے ضرورتمندوں کو قرض حسنہ کے طور پر امداد دی جاتی تھی جو اس کے وظائف سے ششماہی طور پر وصول کر لی جاتی [نیز رک بہ زکوٰۃ ، ربوٰ ، بیت المال ، دیت]۔

تقویم : عبادات ، یعنی نماز ، روزہ ، زکوٰۃ اور حج میں بھی اور نظم و نسق مملکت میں بھی تقویم اور علم ہیئت کی ہر وقت ضرورت پڑتی ہے ۔ پنجوقتہ نمازوں کے اوقات حرکت شمسی کے تابع ہیں ۔ جمعہ اور عیدین کے لیے ہفتے اور سال کے ایام متعین کرنے کے لیے تقویم کی حاجت ہے ۔ روزوں میں سحری اور افطار کے لیے بھی اس علم کی ضرورت پیش آتی ہے ۔ حج کا وقت بھی تقویم سے متعین کیا جاتا ہے ۔ زکوٰۃ کا وجوب بھی سال گزرنے پر ہوتا ہے ؛ لہذا اس کے لیے بھی اس علم کی ضرورت ہے ۔

تقویم کے دو جز ہیں : اسلامی تاریخ (سنہ) کا آغاز کب سے ہو اور مہینوں کا آغاز کہاں سے ؟ عرب میں اگرچہ سال کا آغاز عام طور پر محرم سے تسلیم کیا جاتا تھا ، یعنی حج بیت اللہ کے بعد کے مہینے سے ، لیکن عرب میں سنہ [کے لیے] کوئی ضابطہ اور کوئی واقعہ مقرر نہ تھا ؛ چنانچہ مختلف قبائل میں مختلف سنہ رائج تھے ، بلکہ ایک ہی جگہ بارہا کسی اہم تر واقعے کے وقوع پر قدیم تر نقطۂ توقیت کو ترک بھی کر دیا جاتا تھا ۔ خود مکہ مکرمہ میں متعدد سنہ رائج تھے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت سے لے کر ہجرت تک عام طور پر ابرھہ کے ہاتھیوں کے حملے کی یاد میں عام الفیل سے وقت شماری ہوتی رہی ۔ مکہ مکرمہ میں یہ سنہ ۸ھ میں اس کے اسلام لانے تک نافذ رہا ۔ لیکن مدینہ منورہ میں آپؐ کے تشریف لانے کے بعد مسلمان ہجرت سے توقیت (وقت شماری) کرنے لگے ، لیکن امام بیہقی (کتاب دلائل النبوۃ) کے مطابق کچھ مہاجرین توقیت کے لیے سنہ کا آغاز اسی سال سے کرتے تھے جس کے آخر میں انہوں نے مدینہ منورہ ہجرت [رک بآں]، شروع کی ، [یعنی موجودہ اعتبار سے سنہ ۱ ق ۔ ھ سے]، کچھ اس سال کے آغاز سے جس میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ماہ ربیع الاول میں مدینہ منورہ تشریف لائے ؛ [اسی صورت کو عہد فاروقی میں صحابہؓ کے مشورہ سے مجموعی طور پر اپنا لیا گیا (رک بہ ہجرت)] اور کچھ اس سال سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی آمد مدینہ منورہ کے بعد شروع ہوا (یعنی سنہ ہجری کے ایک سال بعد سے)۔ آخر حضرت عمرؓ کے زمانے میں یکسانی کا حکم دیا گیا ؛ ورنہ اس سے پہلے ایک ہی واقعہ مختلف انداز سے توقیت کے لیے سامنے رکھا جاتا تھا ، مثلاً بنوالمصطلق کی جنگ شعبان سنہ ۴ ، ۵ اور ۶ھ تینوں میں بیان کی جاتی ہے ۔ یہ فرق اسی مختلف طریقہ ہائے توقیت کے باعث ہے ، ورنہ سب کا مقصد ایک ہی ہے ۔

قدیم زمانے ہی سے اہل عرب سال کے بارہ مہینوں پر متفق تھے ، لیکن انہوں نے جب یہ دیکھا کہ مہینوں کا آغاز اگر چاند کی رؤیت (دیکھنے) سے کیا جائے تو مہینا کبھی انتیس دن کا ہوتا ہے اور کبھی تیس دن کا اور اس طرح سال میں تقریباً ۳۵۴ دن ہوتے

ہیں؛ اگر موسموں کا تعلق شمسی سال سے ہو تو پھر ۳۶۵ دن ہوتے ہیں اور ان گیارہ دن کے فرق کے باعث بتدریج قمری مہینے کبھی سردی میں اور کبھی گرمی وغیرہ میں ہو جاتے ہیں۔ زراعت کے لیے عربوں نے آنواء (یعنی بارش کے ستاروں) کا ایک الگ سنہ بنا لیا، لیکن حج کو ہمیشہ ایک ہی موسم میں لانا مطلوب تھا، تاکہ موسم حج فصل کے کٹنے وغیرہ کے زمانے میں نہ آنے پائے۔ اس غرض کے لیے خاصے قدیم زمانے سے انہوں نے نسی (یعنی کبیسہ گری) شروع کر دی تھی کہ وقتاً فوقتاً ایک "خالی" یا گمنام مہینے کا سال میں اضافہ کردیتے۔ بعض مؤرخ کہتے ہیں کہ یہ ہر سال ہوتا، بعض کے مطابق ہر دو سال بعد، بعض کے مطابق ہر تین سال بعد، اور بعض کے مطابق حسب ضرورت ہوتا، جس سے کبھی ایک سال کا، کبھی دو سال کا اور کبھی تین سال کا وقفہ ہو کر سال تیرہ مہینوں کا شمار کیا جاتا۔ غالباً یہی صحیح ہے کیونکہ اس سے سارے اختلافات رفع ہو جاتے اور سب بیانوں کی تطبیق بھی ہو جاتی ہے (اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے محمد حمید اللہ: مقالہ نسی، در جرنل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، جنوری و اکتوبر ۱۹۶۸ء؛ اسلامک ریویو، ووکنگ، فروری ۱۹۶۹ء)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے وفات سے تین ماہ قبل خطبہ حجۃ الوداع میں قرآن کریم (۹ [التوبة]: ۳۷) کے اس حکم کا اعادہ کیا، جس میں اس رسم بد کی منسوخی کا اعلان کیا گیا ہے؛ تب سے خالص قمری سال مسلمانوں میں رائج ہے۔

تقویم کی اصلاح اور قمری سنہ کے رائج کرنے میں کئی مصلحتیں ملحوظ نظر آتی ہیں۔ اولاً دینی احتیاج ہے۔ سابق شمسی یا کبیسہ والے حساب میں مثلاً رمضان المبارک ہمیشہ ایک ہی موسم میں آتا۔ فرض کیجیے کہ وہ دسمبر کے مطابق ہے۔ یہ مہینا خط استوا کے شمال کے علاقوں میں سردی کا موسم ہے اور خط استوا کے جنوب میں وہی زمانہ گرمی کا ہے۔ منطقہ باردہ والوں کے لیے گرمی کا موسم خوشگوار ہوتا ہے اور سردیاں تکلیف دہ ہوتی ہیں تو منطقہ حارہ میں گرمیاں بار خاطر ہوتی ہیں اور ساری عمر اگر رمضان بعض ملکوں میں خوشگوار اور بعض ملکوں میں ناقابل برداشت موسم میں آتا رہے تو یہ دین حنیف کی طرف سے ان لوگوں پر بہت نا انصافی ہوتی۔ اس کے برخلاف ساری ہی دنیا میں رمضان بدل بدل کر بہار، سرما، خزاں اور گرما میں آتا رہے، تو فطرت کی غیر تغیر پذیری کے باوجود سب ہی کو کبھی سہولت اور کبھی زحمت تو ہو، لیکن شکایت اور دلشکنی کا موقع کسی کو نہ ہو اور ضمناً فائدہ یہ بھی ہے کہ دین کا دفاع کرنے والی مسلمان فوج کو ہر قسم کے موسموں میں بھوکے پیاسے رہنے کی تربیت ملتی رہے۔

ثانیاً اس کے مالی اور اداری فائدے بھی ہیں۔ ہجری تقویم کے باعث تینتیس شمسی سال میں چونتیس قمری سال ہوتے ہیں۔ یعنی ۳۳ شمسی سالوں میں محکمہ مالیہ تقریباً ۳۴ مرتبہ محاصل اس طرح وصول کرتا ہے کہ کسی کو شکایت نہیں ہوتی۔ کوئی ماہر اقتصادیات اس تدبیر کو برا نہیں کہہ سکتا۔ اس میں شک نہیں ملازمین کی ماہانہ تنخواہیں بھی (۳۳×۱۲) ۳۹۶ کی جگہ (۳۴×۱۲=) ۴۰۸ مرتبہ دینی پڑتی ہیں؛ لیکن حکومت کی ساری آمدنی چونکہ تنخواہوں پر صرف نہیں ہوتی، بلکہ رفاہ عامہ کے لیے بھی خاصی رقم بچ رہتی ہے، اس لیے اس تقویمی اصلاح سے محکمہ مالیہ کی منفعت بھی مقصود ہے۔ ضمناً یہ مصلحت بھی ہے کہ عام طور پر سالی سال کے آخر میں حکومت کے خزانے خالی ہو جاتے ہیں اور نئے محاصل کی آمد تک روز مرہ کے اخراجات کے لیے حکومت کو خاصی زحمت اٹھانی پڑتی ہے اور عام طور پر مختصر مدت والے ڈبنچر جاری کر کے مغربی حکومتیں سود پر قرض لیتی

ہیں ۔ اسلامی نظام میں محصولوں کی وصولی کے دو مختلف اوقات رکھے گئے ہیں ۔ زراعتی مالگزاری شمسی حساب سے ، اور دیگر محاصل قمری حساب سے ؛ اس لیے حکومت کی تھیلیاں کبھی خالی نہیں ہو سکتیں ۔ اگر اتفاق سے کبھی شمسی اور قمری سال دونوں بیک وقت شروع ہوں تو ان کا اتفاق ایک سال سے زیادہ کے لیے نہیں ہوتا ، بلکہ تیس بتیس سال تک دونوں سالوں میں دوری ہی رہتی ہے ۔

ایک عالمگیر اور ابدی دین کے لیے مقامات کے اعتبار سے دنوں کے چھوٹے اور بڑے ہونے کی گتھی کا حل بتانا ناگزیر تھا ؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک قول کے ضمن میں اس کا حل تجویز فرمایا جو صحیح مسلم وغیرہ میں ہے ۔ آپؐ نے فرمایا : جب دجال آئے گا تو وہ دنیا میں چالیس دن رہے گا، جس میں کا پہلا دن ایک سال کے برابر ہوگا ؛ دوسرا دن ایک ماہ کے برابر ؛ تیسرا دن ایک ہفتے کے برابر اور باقی ۳۷ دن تمہارے موجودہ دنوں جیسے ۔ کسی صحابیؓ نے عرض کیا : یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ! اس سال بھر کے لمبے دن میں کیا صرف ایک دن کی نمازیں پڑھنی کافی ہوں گی ؟ فرمایا : نہیں، بلکہ حساب کرو ۔ ایک سال کے برابر لمبا دن ۹۰ درجہ عرض بلد پر ہوتا ہے ۔ ایک مہینے کے برابر لمبا دن سال کے ایک معین مہینے میں تقریباً ۶۷ درجہ پر اور ایک ہفتے کے برابر لمبا دن ۶۵ درجہ پر ہوتا ہے ۔ چنانچہ مسلم فقہا نے اس پر قیاس کرکے یہ استنباط کیا ہے کہ فنلینڈ ، روس اور کینیڈا میں نماز روزے کے اوقات کے لیے اس حدیث دجال پر قیاس کرنا چاہیے ۔ البتہ ایک صورت غیر واضح رہی وہ یہ کہ ۶۶ تا ۹۰ درجے کے طول بلد پر رہنے والے کس طرح نمازیں پڑھیں ؟ مجلس علمائے دکن نے ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ اتفاق رائے سے تجویز کیا کہ ۴۵ درجہ عرض بلد کے اوقات طلوع و غروب ہی قطب تک کے تمام علاقوں میں سال بھر تک زیر عمل رہیں ، اس وقت بھی جب آفتاب مسلسل کئی دن تک نہ ڈوبے اور اس وقت بھی جب مثلاً ساڑھے تیئیس گھنٹے کا دن اور آدھ گھنٹے کی رات ہو۔ اس نقطۂ زمین، یعنی ۴۵ درجہ کے انتخاب میں اس واقعے کو مد نظر رکھا ہے کہ عہد صحابہؓ میں مسلمان اس مقام تک پہنچ گئے تھے اور حرکت شمسی ہی کو نماز روزے میں ملحوظ رکھتے تھے ۔ آج بھی خط استوا سے ۴۵ درجہ تک کے علاقوں میں جو مسلمان ہیں انہیں اپنی پرانی عادتوں کو بدلنے کی ضرورت نہیں ۔ رعایت شمالی یورپ اور شمالی امریکہ ، نیز جنوبی چلی اور جنوبی ارجنٹائن کے ایسے علاقوں میں ملے گی جہاں اسلام ہنوز نو وارد ہے ۔ مزید برآں ۴۵ درجہ شمالی اور ۴۵ درجہ جنوبی کے معنی اگرچہ نظریہ کی حد تک نصف کرہ ارض کے ہوتے ہیں، لیکن در اصل اس میں تین چوتھائی سے زیادہ معمور حصہ زمین شامل ہے ۔

دین میں یُسر و عُسر کا مسئلہ ؛ قرآن کریم میں ارشاد باری ہے ؛ یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَ لَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ (۲ [البقرة] : ۱۸۵) ، یعنی خدا تمہارے لیے سہولت چاہتا ہے ، دشواری نہیں چاہتا ۔ یہ اصول ہر اسلامی حکم میں کارفرما ہے ؛ عہد نبوی کے معاشرے کے لیے بھی اور ہمارے عصر حاضر کے حالات کے لیے بھی ۔ [ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اسی اصول کی وضاحت کرتے ان دو مبلغوں کو ، جنہیں ایک قبیلے کی طرف دعوت و تبلیغ کے لیے بھیجا جا رہا تھا ، ارشاد فرمایا : یَسِّرَا وَ لَا تُعَسِّرَا : یعنی تم لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنا ، دشواری پیدا نہ کرنا ۔ اسی بنا پر اسلامی احکام کی تعمیل و تکمیل کو بقدر استطاعت (۲ [البقرة] : ۲۸۶) سے مشروط فرمایا اور ہر اسلامی حکم میں اہل عذر کے لیے استثنائی احکام خود بیان فرمائے ، مثلاً پانی نہ ملنے کی صورت [illegible] میں بجائے تیمم [illegible] کرنے کا حکم ؛ سفر میں

قصر صلوٰۃ (۴ [النساء] : ۱۰۲) کا حکم ؛ حالت سفر و مرض میں روزے قضا کر لینے کی رخصت (۲ [البقرۃ] : ۱۸۳)؛ حائضہ و نفساء کے لیے نماز کی معافی وغیرہ (نیز رک بہ صلوٰۃ ، روزہ ، حج وغیرہ)] ۔

اسلام اور مسائل نسواں : دور جاہلی میں عورت کو کمتر درجہ حاصل تھا ۔ معاشرے میں اسے کوئی سماجی اور اقتصادی حقوق حاصل نہ تھے ۔ بعض قبائل میں لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کا رواج بھی موجود تھا ۔ عام تصور میں مرد کو تمام معاشرتی و سماجی حقوق حاصل تھے ۔ اسلام نے ان تمام بے ضابطگیوں کی اصلاح کی ؛ چنانچہ بعض استثنائی صورتوں کے سوا ان کو یکساں حقوق و مراعات دیے گئے ۔ جہاں مردوں کو عورتوں پر قوامون (اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (۴ [النساء] : ۳۴) ، قرار دیا، وہاں عورتوں کے بھی مردوں پر واضح حقوق و فرائض مقرر فرمائے : وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (۲ [البقرۃ] : ۲۲۸)؛ اسلامی احکام و فرائض کی تعمیل میں دونوں کو برابر کا ذمہ دار ٹھہرایا اور افضلیت کا دار و مدار تقوٰی [رک باں] پر رکھا، نہ کہ جنسی تقسیم پر (۴۹ [الحجرات] : ۱۳)؛ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ کہہ کر خواتین کی مزید حوصلہ افزائی فرمائی : الجنۃ تحت أقدام الأمہات (النسائی : سنن)؛ اسلام میں عورت کی عفت و عصمت کی حفاظت کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے ؛ اسی مقصد کے پیش نظر عورتوں اور مردوں کو نگاہ نیچی رکھ کر چلنے اور ان کے آزادانہ اختلاط کو سختی سے منع کیا گیا ہے (۲۴ [النور] : ۳۰، ۳۱) ۔ عورت کی عزت و حرمت کو بحال رکھنے کے لیے حجاب [رک باں] کا حکم نازل ہوا (۲۴ [الاحزاب] : ۶۰)۔ کسی پاکدامن عورت پر جھوٹی تہمت (قذف) لگانے والے کو ۸۰ دروں کی سزا کا مستحق قرار دیا گیا (۲۴ [النور] : ۴)۔ زنا کے انسداد کے لیے ، غیر شادی شدہ کے لیے سو کوڑے اور شادی شدہ کے لیے رجم [رک باں] حد کے طور پر مقرر کیا (۲۴ [النور] : ۲) ۔ عورت کو ایسا لباس پہننے کا حکم دیا گیا جو اس کے جسمانی حسن و جمال کو ظاہر کرنے کے بجائے اسے اجنبی آنکھوں سے مستور کرتا ہو ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان عورتوں پر لعنت فرمائی جو اس قسم کا تنگ یا باریک لباس پہنتی ہیں جس سے ان کی جسمانی آرائش و زیبائش کا اظہار ہوتا ہو ۔

اسلام سے قبل عورت کو حق وراثت سے محروم تصور کیا جاتا تھا۔ اسلام نے پہلی دفعہ اسے وراثت میں حصہ دار بنایا (۴ [النساء] : ۷، ۱۱ تا ۱۲؛ نیز کتب تفسیر بذیل آیات مذکورہ [رک بہ وراثت]) اور عورت کی الگ ملکیت کا تصور قائم کیا تاکہ وہ معاشرے میں باوقار مقام حاصل کر سکے ۔ سب سے اہم اصلاح نکاح کے معاملے میں کی گئی اور وہ یہ کہ مرد کی طرح عورت کو بھی اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا ، لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ تعلیم بھی دی کہ وہ والدین کی مرضی سے باہر نہ ہو [رک بہ نکاح] ۔ اسلام سے قبل بیویوں کی کوئی حد مقرر نہ تھی ۔ لوگ لاتعداد بیویاں اپنے گھروں میں رکھ چھوڑتے تھے (دیکھیے Encyclopaedia Britannica، بذیل مادہ)۔ اسلام نے ان کی ایک خاص تعداد یعنی چار مقرر فرما دی (۴ [النساء] : ۳) ، مگر اس میں یہ شرط رکھی کہ ایسا اسی صورت میں کیا جائے جبکہ مرد اپنی ہر بیوی سے معاملے ، سلوک ، مروت ، احسان اور محبت میں مساوات قائم رکھ سکتا ہو؛ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر ایک ہی کافی ہے (۴ [النساء] : ۱۲۹) ۔ گویا تعدد ازواج کو مخصوص حالات اور مخصوص شرائط کی موجودگی میں چار کی تعداد تک محدود کر کے ایک طرف تو عورتوں کو بھی ان کے جائز حق سے محروم نہیں کیا اور دوسری طرف مسلم معاشرے کو پاکبازی کی خوش گوار اور پرسکون زندگی اختیار

کرنے کے ایک عمدہ طریقے کی تعلیم دی ۔

ازواج مطہرات : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم صرف مردوں ہی کے مبلغ اور معلم نہ تھے ، بلکہ آپؐ عورتوں کے بھی محسن اور مربی تھے ۔ عورتوں کو ان کے نازک مسائل کی براہ راست تعلیم دینا نہ صرف نامناسب تھا بلکہ پیکر شرم و حیا صنف نازک کو قطعی طور پر ان کی تعلیم سے باز رکھنے کے مترادف بھی ہو سکتا تھا ۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خصوصی اجازت خداوندی سے متعدد نکاح فرمائے (۳۳ [الاحزاب] : ۵۰) تاکہ عورتیں عورتوں سے بہتر طور پر مسائل سیکھ سکیں ۔ اسی بنا پر تنہا حضرت عائشہؓ کے متعلق منقول ہے کہ ان سے ایک تہائی دین نقل ہوا ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے سید سلیمان ندوی : سیرت عائشہؓ) ۔ اس کے علاوہ مختلف قبائل عرب کی اس کے ذریعے تالیف قلب بھی مقصود تھی ۔ اس امر کی مزید تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ آپؐ نے اپنی جوانی کے بہترین ایام صرف ایک بیوی یعنی حضرت خدیجہؓ کی رفاقت میں گزار دیے ، جبکہ ۵۰ اور ۵۹ برس کی عمر کے درمیان آپؐ نے زیادہ تر نکاح فرمائے ۔ ظاہر ہے کہ اس میں آپؐ کو دنیاوی فائدوں سے زیادہ دینی فائدے مقصود تھے ؛ کیونکہ آپؐ کا یہ بھی ارشاد ہے : مالی فی النساء من حاجۃ (الدارمی) ، یعنی مجھے عورتوں کی کوئی خواہش نہیں ہے ۔

بہر حال آپؐ نے مختلف اوقات میں گیارہ ازواج مطہرات سے نکاح فرمایا ، جن میں سوائے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے باقی تمام بیوہ تھیں ۔ آپؐ کے نکاح میں بیک وقت زیادہ سے زیادہ نو بیویاں رہیں ۔ تفصیل حسب ذیل ہے :

(۱) حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ بنت خُوَیلد : آپؐ نے ۲۵ سال کی عمر میں ان سے نکاح فرمایا ، جبکہ حضرت خدیجہؓ کی عمر ۴۰ سال تھی (البلاذری : الانساب) ۔ ان کی وفات ۱۰ نبوی ، ۵۰ عمری (۳ ق ھ/ ۶۱۹ء) میں ہوئی (ابن الجوزی : الوفا باحوال المصطفیٰ ، ص ۶۳۶ ، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۷ء [نیز رک بآں] ؛ (۲) حضرت سودہؓ بنت زَمْعہ : رمضان المبارک ۱۰ نبوی (۵۰ عمری) میں نکاح ہوا ۔ ان کے سال وفات میں مختلف روایات ہیں مثلاً ۲۳ھ اور حضرت عمرؓ بن الخطاب نے نماز جنازہ پڑھائی (البلاذری : انساب الاشراف ، ۱ : ۴۰۷) ؛ ۵۴ھ (الذہبی : سیر اعلام النبلاء ، ۲ : ۱۹۱) [نیز رک بآں] ؛ (۳) حضرت عائشہ صدیقہؓ ، ۱۰ نبوی (۵۰ عمری) میں نکاح ہوا اور شوال المکرم ۲ھ میں ان کی رخصتی عمل میں آئی ۔ اس وقت ان کی عمر ۹ سال تھی ۔ ۵۸ھ میں بعمر ۶۶ سال انتقال فرمایا ۔ جنت البقیع میں مدفون ہیں (انساب الاشراف ، ۱ : ۴۱۱ ؛ جوامع السیرۃ ، ۳۳) [نیز رک بآں] ؛ (۴) حضرت حفصہؓ بنت عمرؓ : رمضان المبارک ۳ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے نکاح ہوا (انساب الاشراف ، ۱ : ۴۲۲ ؛ ابن حجر : فتح الباری ، ۹ : ۱۶۲ ببعد) ۔ ۴۵ھ میں ان کا وصال ہوا (انساب ، ۱ : ۴۲۷ ؛ جوامع السیرۃ ، ۳۳) ؛ [نیز رک بآں] ؛ (۵) حضرت ام سلمہؓ بنت ابی امیہ ، ۴ھ میں آپؐ سے نکاح ہوا ۔ ۸۴ سال کی عمر ۵۹ھ یا ۶۱ھ میں انتقال فرمایا (انساب ، ۱ : ۴۲۹ ؛ جوامع السیرۃ ، ۳۳ ؛ الذہبی ، سیر اعلام النبلاء ، ۲ : ۱۴۸) ، [نیز رک بآں] ؛ (۶) حضرت زینبؓ بنت جحش ، ۵ھ میں نکاح ہوا اور ۵۳ سال کی عمر میں ۲۰ھ میں انتقال فرمایا (کتب مذکورہ) [نیز رک بآں] ؛ (۷) حضرت جویریہؓ بنت الحارث بن ابی ضرار : غزوہ مریسیع میں گرفتار ہو کر آئیں ۔ آپؐ نے ۵ھ میں ان کو آزاد فرما کر نکاح کر لیا ۔ ۵۶ھ میں انتقال فرمایا (جوامع السیرۃ ، ص ۳۵) ، [نیز رک بآں] ؛ (۸) حضرت زینبؓ ام المساکین بنت خزیمہ ، ۳ھ میں نکاح ہوا ۔ دو ماہ آپؐ کے نکاح میں رہنے کے بعد ۳۰ سال کی عمر میں وفات پا گئیں (کتاب مذکور ، ص ۳۳)

[نیز رک باں]؛ (۹) حضرت ام حبیبہؓ بنت ابی سفیان: ۶ یا ۷ھ میں نکاح ہوا، ۴۴ھ میں وفات پائی (انساب الاشراف، ۱: ۴۴۰)، [نیز رک باں]؛ (۱۰) حضرت میمونہؓ بنت الحارث: ۷ھ میں نکاح ہوا اور ۶۱ھ میں اور بقول بعض ۵۱ھ میں وصال ہوا (انساب الاشراف ۱: ۴۴۴؛ سیر اعلام النبلاء، ۲: ۱۷۴؛ جوامع السیرۃ ص ۳۶)؛ [نیز رک باں]؛ (۱۱) حضرت صفیہؓ بنت حیی بن اخطب: ۷ھ میں نکاح ہوا؛ ۵۰ھ میں وفات ہوئی (انساب، ۱: ۴۴۴)؛ [نیز رک باں]؛ اس کے علاوہ مصری باندی حضرت ماریہ قبطیہؓ بھی ۶ھ میں آپؐ کے حرم میں بطور ام ولد کے آئیں اور ان سے آپؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم پیدا ہوئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی یہ تمام ازواج مطہرات نہایت اعلٰی درجہ کی عابدہ و زاہدہ اور عالمہ خواتین تھیں۔ ان میں سے ہر ایک سے متعدد روایات منقول ہیں۔ سب سے زیادہ احادیث حضرت عائشہؓ سے منقول ہیں (۲۲۱۰ احادیث)؛ ان سے کم حضرت ام سلمہؓ سے (۳۷۸ احادیث)؛ ان سے کم حضرت میمونہؓ سے (۷۶ احادیث)؛ پھر حضرت ام حبیبہ سے (۶۵ احادیث) منقول ہیں (ابن حزم: جوامع السیرۃ، ۲۷۵ تا ۳۱۵)۔ ابن حزم نے ہی حضرت عائشہؓ، حضرت ام حبیبہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت حفصہؓ کو اصحاب فتوی فقیہ افراد میں شمار کیے ہے (۳۱۹ تا ۳۳۵)؛ (مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: السہیلی: روض الانف، ۲: ۳۶۶؛ البلاذری: انساب الاشراف، ۱: ۳۱۶ تا ۴۵۳ ببعد؛ الزرقانی: شرح المواہب، ۳: ۲۱۶ تا ۲۵۵)۔

اولاد و احفاد: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زیادہ تر اولاد حضرت خدیجۃ الکبریؓ سے ہوئی، البتہ ایک بیٹے کی پیدائش حضرت ماریہ قبطیہؓ (ام ولد) سے ہونا ثابت ہے۔ تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) حضرت قاسم: ۱۱ ق از نبوی میں پیدا ہوئے۔ حضرت مجاہدؒ تابعی کے نزدیک سات دن اور ابن سعد (الطبقات، ۱: ۱۳۱) کے مطابق دو سال تک حیات رہے۔ آپؐ کی کنیت ابوالقاسم انہی سے منسوب ہے؛ (۲) حضرت زینبؓ: تقریباً ۲۳ ق ھ/ ۶۰۰ء - ۶۰۱ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کا نکاح ابوالعاص بن ربیع سے ہوا۔ ۸ھ میں انتقال فرمایا؛ ان سے دو اولادیں ہوئیں۔ امامہؓ اور علیؓ، مؤخر الذکر بچپن ہی میں فوت ہوگئے، جبکہ حضرت امامہؓ حد بلوغ کو پہنچیں اور حضرت فاطمہؓ کے بعد حضرت علیؓ کے نکاح میں آئیں۔ ان کے بعد حضرت مغیرہؓ نے ان سے نکاح کیا (ابن سعد: الطبقات، ۸: ۳۱ تا ۳۶)؛ (۳) حضرت رقیہؓ: حضرت زینبؓ کے بعد پیدا ہوئیں۔ ان کا نکاح عہد نبوت سے قبل عتبہ بن ابی لہب سے ہوا، مگر اس نے اپنے باپ ابو لہب [رک باں] کے کہنے پر رخصتی سے پہلے ہی طلاق دے دی؛ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان کا نکاح حضرت عثمانؓ بن عفان [رک باں] سے کر دیا۔ ان سے حضرت عبداللہؓ (بن عثمان) پیدا ہوئے جو دو سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ رمضان المبارک ۲ھ میں ان کا انتقال ہوا (ابن سعد: الطبقات، ۸: ۳۶ تا ۳۷)؛ (۴) حضرت ام کلثومؓ: حضرت رقیہؓ سے چھوٹی اور حضرت فاطمہؓ سے بڑی تھیں۔ ان کا نکاح آپؐ نے عتبہ بن ابی لہب سے کیا تھا، مگر اس نے بھی اپنے بھائی کی طرح رخصتی سے پہلے ہی طلاق دے دی۔ آپؐ نے حضرت رقیہؓ کی وفات کے بعد شوال ۳ھ میں ان کا نکاح حضرت عثمانؓ سے کر دیا۔ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ وفات شعبان ۹ھ میں ہوئی (حوالۂ مذکور، ۳۷ ببعد)؛ (۵) حضرت فاطمۃ الزہراءؓ: نبوت سے پانچ سال پہلے (۳۵ عمری) میں پیدا ہوئیں۔ تمام اولاد میں چھوٹی ہونے کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو سب سے زیادہ پیاری تھیں۔ ۲ھ میں آپؐ نے ان کا نکاح حضرت علیؓ [رک باں]

سے کر دیا ۔ ان سے حضرت علیؓ کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں کل پانچ بچے پیدا ہوئے : حضرت حسنؓ (م ۴۹ھ)؛ حضرت حسینؓ (ش ۶۱ھ)؛ حضرت محسنؓ؛ حضرت زینبؓ اور حضرت ام کلثومؓ۔ حضرت زینبؓ کی پہلی شادی حضرت عبداللہؓ بن جعفر سے اور حضرت ام کلثومؓ کی حضرت عمر فاروقؓ سے ہوئی ، مگر حضرت فاطمہؓ کی نسل صرف حضرت حسنؓ [رکـ بآں] اور حضرت حسینؓ [رکـ بآں] کے ذریعے دنیا میں باقی رہی (البلاذری : انساب الاشراف ، ۱ : ۴۰۲ تا ۴۰۵؛ ابن سعد : الطبقات ، ۸ : ۱۹ تا ۳۰؛ ابن العماد الحنبلی : شذرات ، ۱ : بمدد اشاریہ)؛ (۶) حضرت ابراہیمؓ : حضرت ابراہیمؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ام ولد حضرت ماریہؓ قبطیہ کے بطن سے ۸ھ میں پیدا ہوئے ۔ ابو سیف اور ام سیف ان کے رضاعی والد اور والدہ تھے ڈیڑھ سال کی عمر پا کر ۱۰ھ میں فوت ہوگئے (شذرات ، ۱ : ۱۲ تا ۱۳) ۔

ابن سعد نے مزید دو صاحبزادوں یعنی ، حضرت طیبؓ اور حضرت (عبداللہ) طاہرؓ کے نام بھی گنوائے ہیں جو زمانہ اسلام میں پیدا ہوئے اور مکہ مکرمہ ہی میں انتقال فرما گئے ۔ (الطبقات ، ۱ : ۱۳۳ تا ۱۳۴)] ۔

مآخذ : (۱) قرآن کریم ، بمواضع کثیرہ ؛ کتب تفسیر : (۲) ابن جریر الطبری (م ۳۱۰) : تفسیر جامع البیان فی تفسیر القرآن ، بولاق ۱۳۲۲ء تا ۱۳۳۰ھ ؛ (۳) ابن کثیر : تفسیر ، مطبوعہ قاہرہ ؛ (۴) البیضاوی : انوار التنزیل و اسرار التاویل ، مطبوعہ قاہرہ ، ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۰ء ؛ (۵) ابن عباس (م ۶۸ھ) : تفسیر ، مطبوعہ بولاق ؛ کتب حدیث : (۶) محمد بن اسماعیل البخاری : الجامع الصحیح ، مطبوعہ لائیڈن (بدون تاریخ) (۴ جلدیں) ؛ (۷) مسلم النیسابوری : الصحیح ، قاہرہ ۱۳۳۰ھ ؛ (۸) ابو عیسیٰ الترمذی (م ۲۷۹) : الجامع السنن ، بولاق ۱۲۹۲ھ ، ۲ جلدیں ؛ نیز شمائل ترمذی ؛ (۹) ابو داؤد : السنن ، دہلی ۱۳۸۳ھ ، ۲ جلدیں ؛ (۱۰) ابن ماجہ : السنن ، طبع محمد فؤاد عبدالباقی ، قاہرہ ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء ؛ (۱۱) الدار قطنی : السنن ، دہلی ۱۳۱۰ھ ؛ (۱۲) النسائی : السنن ، دہلی ۱۸۹۱ء ، ۲ جلدیں ؛ (۱۳) الدارمی : الجامع الصحیح المعروف بہ مسند دارمی ، کانپور ۱۲۹۳ھ ؛ (۱۴) محمد حمید اللہ : الوثائق السیاسیہ للعہد النبوی والخلافۃ الراشدۃ ، بار سوم ، بیروت ۱۹۶۹ء ؛ (۱۵) A. J. Wensinck : المعجم المفہرس لالفاظ الاحادیث النبویہ ، مطبوعہ لائیڈن ۱۹۵۵ء ؛ (۱۶) ہمام بن منبہ : صحیفہ ؛ (۱۷) معمر بن راشد : جامع ؛ (۱۸) عبدالرزاق : مصنف ؛ (۱۹) احمد بن حنبل : مسند ، قاہرہ ۱۳۱۳ھ ، ۶ جلدیں ؛ (۲۰) امام مالک : موطا ، دہلی ۱۲۱۶ھ ؛ (۲۱) الطبرانی : المعجم الصغیر ، دہلی ۱۳۱۱ھ ؛ (۲۲) ابن ابی شیبہ : مصنف ؛ کتب سیر و مغازی : (۲۳) ابن اسحٰق : المبدا والمغازی (مخطوطہ ، ترانس و دمشق) ؛ (۲۴) الواقدی : کتاب المغازی ، طبع Marsden Jones ، لندن ۱۹۶۶ء ، ۳ جلدیں ؛ (۲۵) ابن سعد : کتاب الطبقات الکبیر ، مطبوعہ بیروت ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء ، ۸ جلدیں ؛ (۲۶) ابن الجوزی : الوفا باحوال المصطفی ، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۷ء ؛ (۲۷) علی بن برہان الدین (م ۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴ء) : انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون ، الشہیر بسیرۃ الحلبیہ ، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء ؛ (۲۸) احمد بن یحیی بن جابر البلاذری : انساب الاشراف ، مطبوعہ بیت المقدس ، ۱۹۳۶ء ، جلد اول ؛ (۲۹) القسطلانی : المواہب اللدنیہ مع الزرقانی : شرح المواہب اللدنیہ ، ۸ جلدیں ، قاہرہ ۱۳۲۸ء ؛ (۳۰) ابن ہشام : السیرۃ النبویہ ، طبع مصطفی السقا ، ابراہیم الابیاری و عبدالحفیظ شلبی ، قاہرہ ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء ، ۴ جلدیں ، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۲۵ھ ؛ (۳۱) احمد زینی دحلان : السیرۃ المحمدیہ ؛ (۳۲) کرامت علی : السیرۃ المحمدیہ والطریقۃ الاحمدیہ ، مطبوعہ بمبئی ۱۲۷۰ھ ؛ (۳۳) المقریزی : امتاع الاسماع ، ۱ جلد ، مطبوعہ (باقی مخطوطہ) ؛ (۳۴) ابن حزم : جوامع السیرۃ ، مطبوعہ قاہرہ

۱۳۲۵ھ : (۳۵) محمد بن یوسف الشامی : السیرۃ الشامیۃ؛ (۳۶) الازرقی : اخبار مکۃ ، ۱۸۵۸ء طبع باعتناء Wüstenfeld : (۳۷) السمہودی : خلاصۃ الوفا فی اخبار دار المصطفیٰ، مطبوعہ بولاق ۱۲۸۵ھ : کتب تاریخ: (۳۸) الطبری : تاریخ الامم والملوک ، مطبوعہ لائیڈن ۱۸۷۶ء تا ۱۹۰۱ء : (۳۹) ابن کثیر : البدایہ والنہایہ : (۴۰) الیعقوبی : تاریخ ، مطبوعہ بیروت ۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء : (۴۱) ابن الاثیر : تاریخ الکامل، لائیڈن ۱۸۵۱ء تا ۱۸۷۱ء: (۴۲) الذہبی : دول الاسلام ، حیدر آباد ۱۳۳۳ھ ، ۲ مجلدات : عام کتب معارف : (۴۳) ابن قتیبہ الدینوری : عیون الاخبار ، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۰۷ء : (۴۴) المسعودی : التنبیہ والاشراف ، طبع ڈی خویہ ، لائیڈن ۱۸۹۳ء : (۴۵) عبدالحی الکتانی : نظام الحکومۃ النبویہ ، المسمی بالتراتیب الاداریہ والعمالات والصناعات والمتاجر والحالۃ العلمیہ التی کانت علی عہد المدینۃ الاسلامیہ فی المدینۃ المنورۃ العلیہ، مطبوعہ فاس، ۲ جلدیں: (۴۶) السرخسی : شرح السیر الکبیر، مطبوعہ حیدر آباد دکن، ۴ جلدیں: (۴۶) ابن العماد الحنبلی: شذرات الذہب فی اخبار من ذہب، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۵۰ھ، جلد اول: کتب اردو: (۴۷) شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی: سیرۃ النبی ، مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۳۴۷ھ ، ۶ جلدیں : (۴۸) قاضی سلیمان سلمان منصور پوری: رحمۃ للعالمین، ۳ جلدیں، مطبوعہ لاہور، تاریخ ندارد: (۴۹) محمد حمید اللہ: عہد نبوی کا نظام حکمرانی ، حیدر آباد دکن : (۵۰) وہی مصنف : عہد نبوی کے میدان جنگ ، مطبوعہ با تصویر ، حیدر آباد دکن : (۵۱) محمد ادریس کاندھلوی : سیرۃ المصطفیٰ ، مطبوعہ لاہور ۱۳۸۱ھ : یورپین زبانوں میں موجودہ صدی کے مجلات میں شائع شدہ مقالوں کے لیے: (۵۲) Pearson : *Index Islamicus* : عام علمی کتابوں کے لیے : (۵۳) Pfannmüller : *Handbuch der Islam-Literatur* : (۵۴) Chauvin : *Bibliographie des ouvrages arabes ou relatifs aux Arabes* : (۵۵) Sauvaget : *Introduction a l'histoire de l'Orient musulman* ، (متعلقہ فصلیں): یورپی مصنفین کی قدیم کتب سیرت میں اس قدر ایجاد و اختراع اور اتنی گالی گلوچ ھے کہ ان پر جدید مؤلفین کو شرم آتی ھے : (۵۶) William Muir : *Life of Muhammad* : (۵۷) W. Montgomery Watt : *Muhammad at Mecca* : (۵۸) وہی مصنف : *Muhammad at Medina* : (۵۹) وہی مصنف : *Muhammad Prophet and Statesman* : (۶۰) M. Gaudefroy-Demombynes : *Mahomet* ، پیرس ۱۹۵۷ء : (۶۱) Muhammad Hamidullah : *Muhammad Rasulullah* ، حیدرآباد دکن ۱۹۴۳ء ، کراچی ۱۹۷۹ء : (۶۲) وہی مصنف : *Le prophete de l' Islam (sa vie et son oeuvre)* ، پیرس ۱۹۵۹ء : (۶۳) Alois Sprenger : *Das Leben und die Lehre des Mohammad* ، ۳ جلدیں، ۱۸۶۱ء : (۶۴) G. Weil : *Muhammad der Prophet* ، ۱۸۴۳ء : (۶۵) Franz Buhl : *Das Leben Muhammeds* ، جرمن ترجمہ از Shaeder ، ۱۹۳۰ء : (۶۶) J. Wellhausen : *Skizzen und vorarbeiten, Ein Gemeinwesen ohne Obrigkeit* : (۶۷) L. Caetani : *Annali de l'Islam* ، میلان ۱۹۰۵ء تا ۱۹۲۶ء ۔

(محمد حمید اللہ [و ادارہ])

تعلیقات : شمائل و اخلاق نبوی :

(الف) حلیۂ اقدس: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا جسم اطہر متناسب ، جوڑ بند مضبوط ، بدن پُرگوشت اور کسا ہوا اور رنگ مبارک سرخی مائل سفید تھا (الترمذی : شمائل ، عن انس رض) ۔ آپ ؐ نہ تو بہت طویل القامت (الطویل البائن) تھے اور نہ چھوٹے قد کے (القصیر المتردد) ۔ آپ ؐ کا جسم مبارک میانہ تھا ۔ آپ ؐ کے قدرے بھاری سر (ضخم الراس) پر گھنے بال ، جو بعض اوقات کانوں کی لووں کو چھو رہے ہوتے (حوالۂ مذکور عن براء بن عازب)، نہ تو بہت گھنگھریالے تھے نہ بہت سیدھے ، البتہ ایک خوشنما اور ہلکا سا خم ان میں دکھائی دیتا

تھا (ابن الجوزی : الوفا ، ص ۳۹۳) ۔ چہرۂ مبارک آفتابی ، پر شکوہ اور درخشاں و تاباں تھا ۔ پیشانی کشادہ اور پر نور تھی ، جس میں سے ایک نور ابھرتا دکھائی دیتا (کتاب مذکور ، ص ۳۹۱ ببعد) ۔ ابرو دراز ، سیاہ اور بیچ میں ذرا سے غیر پیوستہ اور ان کے درمیان ایک رگ کا معمولی سا ابھار تھا، جو غصے کی حالت میں مزید نمایاں ہو جاتا تھا (شمائل عن ہند بن ہالہ) ۔ آنکھیں سیاہ مگر سرمئی مائل (اکحل و لیس باکحل) ، پتلیاں سیاہ کالی اور آنکھوں کی سفیدی میں ہلکی سی سرخی کی آمیزش تھی (حوالۂ مذکور) ، پلکیں سیاہ اور دراز ، گویا کہ ایک دوسری کو چھو رہی ہوں (ابن سعد : الطبقات، ۱ : ۴۱۰ تا ۴۱۴ ببعد) ۔ ناک ستواں اور بڑی تھی اور رخسار متوازی (سہل الخدین) ، ریش مبارک گھنی اور بہت دیدہ زیب تھی ۔ دہن مبارک کشادہ اور سامنے کے دانتوں میں ذرا سا فصلہ نمایاں تھا (ابن الجوزی : الوفا ، ص ۳۹۰) ۔ کان حسین و جمیل (تام الاذنین) اور شانے پُرگوشت اور چوڑے تھے ۔ گردن مبارک قدرے لمبی تھی ۔ سینہ کشادہ تھا ۔ کلائیوں، بازووں اور بالائی سینے پر بالوں کی کثرت تھی ، مگر پیٹ اور سینے کا نچلا حصہ بالوں سے خالی تھا ؛ البتہ سینے سے ناف تک بالوں کی ایک پتلی اور لمبی دھار (اجرد طویل السرده) تھی ۔ دونوں شانوں کے مابین "مہر نبوت" تھی، جو بالوں اور گوشت سے بنے ہوئے ابھار (کبوتر کے انڈے کے برابر سرخ غدہ) کی شکل میں تھی (ابن سعد : الطبقات ، ۱ : ۴۲۵ ببعد) ۔ ہتھیلیاں چوڑی اور پُرگوشت تھیں ۔ اسی طرح کلائیاں اور انگلیاں بھی دراز اور پر گوشت تھیں کہ مصافحہ کرنے والوں کو اتنی نزاکت اور نفاست کا احساس ہوتا کہ حریر و دیباج کا لمس بھی اس کے سامنے بے معنی تھا ۔ (حوالۂ مذکور ، ۱ : ۴۱۳ عن انسؓ) ۔ بطن مبارک کسا ہوا اور سینے کے مساوی تھا ، (گویا کاغذوں کی تہ جما دی گئی ہو ؛ (ابن الجوزی : الوفا ، ص ۳۹۷) ۔ پنڈلیاں لانبی اور پُرگوشت ، پاؤں پُرگوشت اور مضبوط اور تلوے درمیان سے خالی تھے (کہ پانی نیچے سے نکل سکے) ۔ مجموعی طور پر آپؐ کی شخصیت میں جلال و جمال کا ایسا حسین امتزاج پایا جاتا تھا کہ دیکھنے والے پر ہیبت طاری ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں آپؐ کے لیے انتہائی محبت بھی پیدا ہو جاتی (شمائل عن علیؓ) ۔ آپؐ کے پسینے سے عطر جیسی مہک آتی ؛ جسم مبارک سے ہر وقت سرور انگیز خوشبو محسوس کی جاتی (الوفا ، ص ۳۹۱، عن انسؓ) ۔ آپ کی ہنسی کبھی مسکراہٹ سے آگے نہیں بڑھی جس میں سامنے کے دانت نمایاں ہو جاتے ۔ چہرۂ مبارک غصے میں تمتما اٹھتا کہ اس پر نگاہ کا ٹھیرنا مشکل ہو جاتا ۔ چہرۂ مبارک پر پسینے کے قطرے موتی کی طرح چمکتے (البخاری، ۳ : ۱۰۸ ، المغازی ، باب ۳۴ ، واقعۂ افک) ۔ آپؐ کن انکھیوں سے کسی کی طرف نہ دیکھتے : ہمیشہ پورا چہرہ گھما کر نظر ڈالتے ؛ کسی سے ناراض ہوتے تو اس سے رخ پھیر لیتے ۔ آپؐ ہمیشہ سلام اور مصافحہ کرنے میں پہل کرتے اور ہاتھ کو اس وقت تک دوسرے کے ہاتھ میں رہنے دیتے جب تک دوسرا خود ہاتھ نہ چھوڑ لیتا (الترمذی : شمائل) ۔

گفتگو : آپؐ کی زبان نہایت شیریں اور باوقار تھی ۔ ٹھیر ٹھیر کر گفتگو فرماتے کہ مخاطب الفاظ گن سکتا تھا ۔ جس بات پر خصوصی زور دینا ہوتا اسے کئی بار دہراتے ۔ آواز اتنی بلند تھی کہ حضرت ام ہانیؓ کے بیان کے مطابق ، ان کے گھر کے صحن میں صاف سنائی دیتی تھی (ابن ماجہ : سنن، باب ما جاء فی صلوۃ اللیل) ۔ اکثر متفکر رہتے ۔ بے ضرورت کبھی گفتگو نہ فرماتے ۔ گفتگو کے دوران میں اشارہ کرنا ہوتا تو پورا ہاتھ اٹھا کر اشارہ فرماتے ۔ تعجب کا اظہار کرنا ہوتا تو ہاتھ پلٹ دیتے

(الترمذی : شمائل، عن ھند بن ابی ھالہ)۔ کلام کو بے جا طول دینے سے گریز فرماتے (ابن سعد : الطبقات، ۲ ، ۳۷۵)۔

چال : آپؐ قدم اٹھا اٹھا کر یوں چلتے گویا بلندی سے اتر رہے ہوں۔ آپؐ کی رفتار نہ تو کسی عاجز کی طرح ہوتی اور نہ کسی سست شخص کے مانند بلکہ ایسی تیز رفتاری سے قدم اٹھاتے کہ صحابہؓ بڑے تکلف سے آپؐ کو مل سکتے تھے (ابن سعد، ۲ : ۳۸۹)۔ دوران سفر میں آپؐ ادھر ادھر توجہ نہ فرماتے، خواہ آپؐ کا کپڑا ھی کسی چیز میں کیوں نہ الجھ جاتا۔

لباس : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جب کوئی نیا کپڑا زیب تن فرماتے، تو اس کپڑے کا نام لیتے اور پھر فرماتے : اللھم لک الحمد کما کسوتنیہ اسألک خیرہ و خیر ما صنع لہ و اعوذ بک من شرہ و شرما صنع لہ (ابوداود : السنن، ۴ : ۳۰۹، حدیث ۴۰۲۰)۔ کپڑوں میں عموماً آپؐ کو سفید رنگ کا کپڑا زیادہ پسند تھا (ابن سعد : الطبقات، ۱ : ۴۴۹) اور آپؐ فرمایا کرتے تھے : علیکم بالبیاض من الثیاب، فلیلبسھا احیاؤکم و کفنوا فیھا موتاکم (ابو داود، ۴ : ۳۳۲، حدیث ۴۰٦۱)، یعنی سفید رنگ کے کپڑوں کو لازم پکڑو، اسی لباس کو زندہ پہنیں اور اسی لباس میں مردے کو کفنایا جائے! ایک دوسری روایت میں آپؐ نے اسے خیر اللباس قرار دیا (الطبقات، ۱ : ۴۴۹)، تاہم آپؐ نے بعض موقعوں پر سرخ رنگ کے (غالباً دھاری دار) (انوار محمدی، شرح شمائل ترمذی، ص ۸۰)، نیز زعفران اور ورس سے رنگے ہوے زرد رنگ کے کپڑے بھی ملبوس فرمائے ہیں (ابن سعد : الطبقات، ۱ : ۴۵۰ تا ۴۵۲)۔

آپؐ کو عموماً لباس میں کسی قسم کا تکلف پسند نہ تھا۔ اکثر آپؐ کا لباس چادر، قمیص اور تہبند تھا۔ آپؐ کی چادر (حبرۃ)، جو آپؐ کو بہت پسند تھی، لمبائی میں چار ہاتھ (اذرع) اور چوڑائی میں دو ھاتھ اور ایک بالشت ھوتی تھی۔ چادروں میں آپؐ کو یمنی چادر بہت پسند تھی، جو سرخ اور خط دار اور حضرموت یا کتان کی بنی ھوتی تھی (علی جونپوری : شرح شمائل ترمذی، ص ۱۷۹)۔ آپؐ کو قمیص بہت پسند تھی۔ آپؐ کی کتان سے بنی ھوئی قمیص کی آستینیں کلائی کے جوڑ تک ھوتی تھیں، تاھم لمبائی زیادہ نہیں ھوتی تھی (ابن سعد : الطبقات، ۱ : ۴۵۸)؛ ایک دوسری روایت کے مطابق آپؐ کی قمیص ٹخنوں سے اوپر اور آستین ھاتھ کی انگلیوں تک ھوتی تھی (ابن الجوزی : الوفا، ۲ : ۵٦۳)۔ آپؐ کا ازار مبارک اگلی جانب سے نیچے اور پچھلی طرف سے کسی قدر اونچا اور ٹخنے سے نصف پنڈلی تک ھوتا تھا (ابن سعد، ۱ : ۴۵۹؛ الوفا، ۵٦۵)۔

آپؐ عموماً سیاہ رنگ کا عمامہ زیب سر فرماتے تھے۔ فتح مکہ کے دن بھی عمامہ سیاہ رنگ کا تھا (الوفا، ص ۵٦۷)۔ شملہ بعض اوقات کندھے پر اور بعض اوقات دونوں کندھوں کے درمیان ڈال لیتے تھے۔ کبھی پگڑی کو ٹھوڑی کے نیچے لا کر باندھ لیتے تھے۔ عمامہ کے نیچے سفید شامی ٹوپی کا استعمال بھی معمول تھا۔ فرمایا کرتے تھے : "ھم میں اور مشرکین میں یہی فرق ھے کہ ھم ٹوپی پر عمامہ باندھتے ہیں" (ابو داؤد : السنن، ۴ : ۳۴۱، حدیث ۴۰۷۸)۔ آپؐ سفر میں ایسی ٹوپی (قلنسوہ) پہنتے جو کانوں کو بھی ڈھانپ لیتی تھی (الوفا، ص ۵٦۷ و ۵٦۸)۔

آپؐ نو موزے استعمال کرنے کی عموماً عادت نہ تھی، مگر نجاشی نے (غالباً چرمی) موزے بھیجے تو استعمال فرمائے (ابن الجوزی : الوفا، ص ۵۷۰)۔ اسی طرح آپؐ نے ان موزوں کو بھی پہنا جو حضرت دحیہ الکلبیؓ نے ھدیۃً پیش کیے تھے (الترمذی، ۴ : ۲۴۰، حدیث ۱۷٦۹)۔ بعض اوقات آپؐ شامی عبا بھی ملبوس فرماتے تھے، جس کی آستین تنگ ھوتی تو آپؐ

نیچے سے بازو نکال کر دھویا کرتے تھے (ابن الجوزی، ص ۴۵۶؛ الترمذی، ۴ : ۲۴۰، جہاں جبۃ رومیۃ کا ذکر ہے)۔ اس کے علاوہ نوشیروانی قبا بھی استعمال فرمائی جس کی جیب اور آستینوں پر دیبا کی سنجاف تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے سوت اور کتان دونوں سے بنے ہوئے کپڑے استعمال کیے (ابن سعد: الطبقات، ۱ : ۴۵۳، ۱)۔ آپؐ کے نعلین چپل سے مشابہ تھے، مگر ان میں دو تسمے لگے ہوئے تھے (ابن الجوزی، ص ۵۸۱)۔ آپؐ کا بچھونا چمڑے کا بنا ہوا تھا جس میں خشک گھاس بھری ہوئی تھی۔ چارپائی بان کی تھی، جس سے اکثر جسم پر نشانات پڑ جاتے۔ کبھی کبھار کھجور کی چٹائی پر بھی لیٹتے تھے۔ ایک رات حضرت عائشہؓ نے گدے کو نرم کرنے کے لیے اس کی چار تہیں بنا دیں، مگر آپؐ نے اس کو دوبارہ سابقہ حالت پر لوٹانے کا حکم دیا (الطبقات، ۱ : ۴۶۴، ۴۶۵)۔ ٹیک لگانے کے لیے تکیہ بھی استعمال فرماتے تھے، جس میں کھجور کے پتے بھرے ہوئے تھے۔ آپؐ گھر میں نماز چھوٹی چٹائی پر پڑھتے تھے۔

(ب) معمولات نبوی: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے معمولات و مشاغل مبارکہ کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ آپؐ کی حیات طیبہ ہر قسم کی بے اعتدالیوں سے مبرا اور پاک تھی۔ معمولات میں ایک توازن اور تسلسل پایا جاتا تھا، البتہ موقع و محل کی مناسبت سے ان میں خفیف سی زمانی و مکانی تبدیلیاں رونما ہو جاتی تھیں۔

۱۔ روزمرہ کے معمولات: آپؐ عموماً فجر کی نماز پڑھ کر اپنی جائے نماز (مصلّٰی) پر (خاموشی کے ساتھ) آلتی پالتی مارے بیٹھے رہتے۔ یہاں تک کہ سورج نکل آتا۔ اس کے بعد صحابہؓ آپؐ کے گرد جمع ہو جاتے اور اپنی پرانی، خاص طور پر عہد جاہلی کی، باتیں یاد کر کر کے ہنستے، مگر آپؐ صرف تبسم فرماتے (مسلم، ۴ : ۱۸۱۰، حدیث ۲۳۲۲؛ ابو داؤد، ۵ : ۱۷۸، حدیث ۴۸۵۰؛ النسائی، حدیث ۱۳۵۸)۔ آپؐ کا ارشاد تھا کہ مجھے اس قوم کے ساتھ جو ذکر الٰہی میں مصروف ہو، نماز فجر کے بعد طلوع آفتاب تک اور نماز عصر کے بعد غروب آفتاب تک بیٹھنا اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں اولاد اسمٰعیل میں کے چار غلام آزاد کروں (ابو داؤد، ۴ : [illegible]، حدیث ۳۶۶۷)۔ ایک دوسری روایت کے مطابق آپؐ صبح تک صحابہؓ کو بنی اسرائیل کے حالات بتایا کرتے تھے (حوالۂ مذکور، ص ۷۰، حدیث ۳۶۶۳)۔ اسی مجالس میں اگر کسی نے کوئی خواب دیکھا ہوتا تو بیان کرتا اور آپؐ خود یا اکابر صحابہؓ میں سے کوئی ایک (مثلاً حضرت ابوبکرؓ) اس کی تعبیر (تاویل) بیان کرتے (مسلم، ۴ : ۱۷۷۷ تا ۱۷۷۹، حدیث ۲۲۹۹)۔ آپؐ حوصلہ بڑھانے کے لیے یہ فرماتے: "تم میں سے جس کسی نے کوئی خواب دیکھا ہو وہ مجھے بتائے، میں اس کی تعبیر بیان کروں گا (حوالۂ مذکور؛ البخاری، ۴ : ۳۶۳)۔ اسی بنا پر امام البخاری نے کتاب التعبیر میں ایک باب بعنوان "تعبیر الرؤیا بعد صلوٰۃ الصبح" باندھا ہے۔ انھی مجالس میں آپؐ اپنے خواب بھی بیان فرماتے (دیکھیے البخاری، ۴ : ۳۶۳ تا ۳۶۵)۔ پھر آپؐ صلوٰۃ الضحٰی ادا فرماتے، جو عموماً چار تا آٹھ رکعات پر مشتمل ہوتی تھی۔ حضرت عائشہؓ کے بقول اگر سفر سے واپسی ہوتی تو یہ نماز گھر میں ادا فرماتے (مسلم، ۱ : ۴۹۶، حدیث ۷۱۷ تا ۷۲۰)۔ فتح مکہ کے روز آپؐ نے یہ آٹھ نوافل حضرت ام ہانیؓ کے گھر میں ادا فرمائے (حوالۂ مذکور)۔ ان نوافل سے قبل اور بعد میں تسبیح کا معمول نہ تھا (مسلم، ۱ : ۴۹۸، حدیث ۲۳۶)۔

بعد ازاں آپؐ گھر تشریف لے آتے اور پوچھتے کہ گھر میں کھانے کو کچھ ہے؟ اگر بتایا

جاتا کہ گھر میں برکت ہے۔ تو آپ ؐ روزے کی نیت فرما لیتے (مسلم، ۲: ۸۰۸، حدیث ۱۱۵۴) اور اگر کچھ موجود ہوتا تو اسے تناول فرما لیتے (حوالۂ مذکور)۔ پھر دن بھر اپنے گھر کے کام کاج میں مشغول رہتے اور جب نماز کا وقت ہوتا تو نماز کے لیے متوجہ ہو جاتے (البخاری، ۴: ۱۲۲)۔ دوپہر کے وقت استراحت (قیلولہ) فرماتے۔ بعض اوقات آپ ؐ حضرت ام سُلیمؓ کے گھر تشریف لاتے اور قیلولہ فرماتے (مسلم، ۴: ۱۸۱۵، حدیث ۲۳۳۲)۔ حضرت ام سلیمؓ آپ ؐ کے لیے چمڑے کا بستر بچھا دیتیں، جس پر آپ ؐ کے جسم اطہر کے پسینے کے قطرے جمع ہو جاتے، پھر ان سے عطر بناتیں جو بہت پسند کیا جاتا تھا (حوالۂ مذکور)۔ آپ ؐ کا یہ معمول سفر میں بھی جاری رہتا (مسلم، ۲: ۸۵۳)۔

نماز عصر کے بعد باری باری تمام ازواج سے مختصر ملاقات اور مزاج پرسی کے لیے تشریف لے جاتے۔ اس موقع پر بعض ازواج کسی مشروب سے آپ ؐ کی تواضع کرتیں مثلاً حضرت زینبؓ بنت جحش اس موقع پر آپ ؐ کو شہد پیش فرماتی تھیں، جسے آپ ؐ بڑے شوق سے نوش فرماتے (البخاری، ۳: ۳۵۸)۔ ان مختصر سی ملاقاتوں کے بعد آپ ؐ اس زوجۂ مطہرہ کے پاس تشریف لے جاتے، جس کے ہاں آپ ؐ کی باری ہوتی تھی۔ عموماً ہر زوجہ کی نو ایام کے بعد باری آتی تھی (مسلم، ۲: ۱۰۸۴، حدیث ۱۴۶۲، نیز حدیث ۱۴۶۳، جہاں یہ مذکور ہے کہ حضرت سَودہؓ بنت زَمعہ نے بعد ازاں اپنی باری حضرت عائشہ صدیقہؓ کو دے دی تھی)۔ یہاں دیگر ازواج مطہرات بھی جمع ہو جاتی تھیں اور رات گئے تک یہ مجلس جاری رہتی (مسلم، ۲: ۱۰۸۴، حدیث ۱۴۶۲)۔ یہاں کبھی کبھار بعض ازواج کے درمیان معمولی تکرار بھی ہو جاتی تھی، جو ایک فطری امر تھا (حوالۂ مذکور)۔ بعض اوقات آپ ؐ کوئی دلچسپ واقعہ بھی سناتے (ابن الجوزی، ۲: ۶۲۳)۔ عشا کی نماز کے بعد (جو اکثر قدرے تاخیر سے پڑھنے کا معمول تھا) دیگر ازواج اپنے اپنے حجروں میں چلی جاتیں اور آپ ؐ نماز سے فراغت کے بعد واپس تشریف لا کر سو رہتے۔ عموماً عشا کی نماز سے پہلے سونا (مگر امام بخاری [۱: ۱۵۲] نے نماز کے انتظار میں سونے کو مستثنٰی کیا ہے) اور نماز کے بعد گفتگو کرنا آپ ؐ کو ناپسند تھا (البخاری، ۱: ۱۵۲، ۱۵۳)۔

سوتے وقت آپ ؐ وضو ضرور فرماتے تھے (ابن الجوزی، ۲: ۶۲۴) اور حضرت عائشہؓ کے بقول قضائے حاجت کے بعد ہر مرتبہ استنجا اور وضو کرنا بھی آپ ؐ کا معمول تھا (ابو داؤد، ۱: ۱۵۶، حدیث ۲۲۲)۔ سونے سے قبل وضو کے لیے پانی اور مسواک (ابو داؤد، ۱: ۴۷، حدیث ۵۶) اور زندگی کے آخری دنوں میں لکڑی کا پیالہ آپ ؐ کے پلنگ کے پاس (یا نیچے) رکھ دیے جاتے (کتاب مذکور، ۱: ۲۸، حدیث ۲۴)۔ سونے سے پہلے آپ ؐ دونوں آنکھوں میں تین تین سلائی سرمہ بھی ڈالتے تھے (ابن الجوزی، ۲: ۶۲۹)۔ ابن سعد کے مطابق پانچ اشیا سفر و حضر میں ہمیشہ آپ ؐ کے ہمراہ ہوتیں: کنگھی، شیشہ، تیل، مسواک اور سرمہ (ابن سعد: الطبقات، ۲: ۴۸۴)۔ سونے سے قبل مُسبحات [رک بآں] تلاوت فرماتے اور دوسروں کی ترغیب کے لیے فرماتے کہ ان میں ایک ایسی آیت ہے جو ہزار آیات سے افضل ہے۔ (ابو داؤد، ۵: ۳۰۴، حدیث ۵۰۵۸؛ الترمذی، ۵: ۱۸۱، حدیث ۲۹۲۱)۔ ایک دوسری روایت میں سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الزمر کے پڑھنے کی صراحت ہے (الترمذی، ۵: ۱۸۱، عدد ۲۹۲۰)۔ ان کے علاوہ سورۂ اخلاص اور معوذتین کو پڑھ کر ہاتھوں پر پھونکتے اور پھر تمام بدن پر ہاتھ پھیرتے تھے (الترمذی، ۵: ۴۷۳ تا ۴۷۴، حدیث ۳۴۰۲ تا ۳۴۰۳؛ البخاری، ۴: ۱۸۹، وغیرہ)۔ ایک صحابی

کو آپؐ نے سونے سے قبل سورۃ الکافرون پڑھنے کی بھی ہدایت فرمائی (ابو داود، ۵ : ۳۰۲، حدیث ۵۰۵۵)۔ پھر آپؐ داھنی کروٹ پر، دائیں رخسار کے نیچے ایک ھاتھ رکھ کر اور قبلہ رو ھو کر بستر پر لیٹ جاتے اور یہ دعا پڑھتے تھے : اللّٰھم باسمک اموت و احیا (البخاری، ۴ : ۱۸۸)۔ بعض اوقات یہ دعا پڑھتے : اللھم انی اسلمت نفسی الیک و وجھت وجھی الیک و فوضت امری الیک، الجأت ظھری الیک رغبۃ و رھبۃ الیک لا ملجأ ولا منجأ منک الا الیک؛ اٰمنت بکتابک الذی انزلت و بنبیک الذی ارسلت (البخاری، ۴ : ۱۸۸؛ مسلم، ۴ : ۲۰۸۱، حدیث ۲۷۱۰، و بعد؛ ابو داود، ۵ : ۲۹۹، حدیث ۵۰۴۶)۔ آپؐ کا ارشاد تھا کہ سونے سے قبل جو شخص یہ دعا پڑھے اور پھر رات کو مر جائے تو وہ فطرت اسلام پر مرے گا (حوالہ مذکور)۔ حضرت حفصہؓ کے مطابق آپؐ یہ دعا بھی تین مرتبہ پڑھتے تھے : اللّٰھم قنی عذابک یوم تبعث عبادک (ابو داود، ۵ : ۲۹۸، حدیث ۵۰۴۵)۔ حضرت ابوھریرہؓ سے منقول ہے کہ بستر پر لیٹ کر آپؐ یہ دعا بھی پڑھتے تھے : اللّٰھم رب السموات و رب کل شیء خالق الحب والنوٰی منزل التوراۃ والانجیل والفرقان، اعوذبک من شر کل ذی شر، انت اٰخذ بناصیتہ انت الاول فلیس قبلک شیءٌ و انت الآخر فلیس بعدک شیء و انت الظاھر فلیس فوقک شیء، و انت الباطن فلیس دونک شیء، اقض عنا الدین و اغننا من الفقر (مسلم، ۴ : ۲۰۸۴، حدیث ۲۷۱۳؛ الترمذی، ۵ : ۴۷۲، حدیث ۳۴۰۰)۔ حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ اس موقع پر یہ دعا پڑھتے تھے : اللّٰھم انی اعوذ بوجھک الکریم و کلماتک التامۃ من شر ما انت اٰخذ بناصیتہ اللّٰھم انت تکشف المغرم والمأثم اللھم لایھزم جندک ولا یخلف وعدک ولا ینفع ذا الجد منک الجد، سبحانک و بحمدک (ابو داود، ۵ : ۳۰۲، حدیث ۵۰۵۲)۔ آپؐ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزھراءؓ کو سونے سے پہلے ۳۳، ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ اور الحمد للہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر پڑھنے کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ یہ گنتی میں تو سو ھیں مگر میزان عمل میں پورے ہزار ھیں (البخاری ۴ : ۱۸۹؛ مسلم، ۴ : ۲۰۹۱، حدیث ۲۷۲۷؛ ابو داود، ۵ : ۳۰۶ تا ۳۰۷، حدیث ۵۰۶۲ و ۵۰۶۳)۔

جب آپؐ نیند سے بیدار ھوتے تو فرماتے : الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا و الیہ النشور (البخاری، ۴ : ۱۸۸) اور حضرت عائشہؓ کے مطابق دس مرتبہ تکبیر، دس مرتبہ تحمید، دس مرتبہ تسبیح، دس مرتبہ تہلیل اور دس مرتبہ استغفار پڑھتے اور پھر فرماتے : اللّٰھم اغفرلی و اھدنی و ارزقنی و عافنی (ابو داود، ۱ : ۴۸۴، حدیث ۷۶۶)؛ اسی موقع پر یہ دعا بھی پڑھتے : لا الہ الا انت سبحانک اللّٰھم استغفرک لذنبی و اسألک رحمتک، اللّٰھم زدنی علما و لا تزغ قلبی بعد اذ ھدیتنی و ھب لی من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب (ابوداود، ۵ : ۳۰۶، حدیث ۵۰۶۱)۔ اگر اتفاقاً رات کو آنکھ کھل جائے تو یہ دعا پڑھنے کی تلقین فرماتے تھے : لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ لہ الملک و ھو علی کل شیء قدیر، سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ و اللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ، رب اغفرلی ۔ آپؐ کا ارشاد تھا کہ اس کے بعد اگر کوئی دعا مانگی جائے تو ضرور مقبول ھو اور اگر ارادہ کرکے اٹھے اور وضو کرکے نماز پڑھے تو وہ بھی عنداللہ مقبول ھو (الترمذی، ۵ : ۴۸۰، حدیث ۳۴۱۴)۔ نماز تہجد کی تیاری کرتے ھوئے سورۃ اٰل عمرٰن کی آخری دس آیات تلاوت فرماتے (ابن الجوزی، الوفا، ۲ : ۶۲۶)۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس موقع کی یہ دعا نقل فرماتے ھیں : اللّٰھم انت نور السمٰوٰت و الارض و من فیھن ولک الحمد، انت قیم السمٰوٰت والارض ومن فیھن ولک الحمد، انت الحق و وعدک حق

و قولک حق و لقاؤک حق و الجنة حق و النار حق و الساعة حق و محمد حق اللّٰھم لک اسلمتُ و علیک توکّلتُ و بک اٰمنتُ و الیک انبتُ و بک خاصمتُ و الیک حاکمتُ فاغفرلی ما قدمتُ و ما اخرتُ و ما اسررتُ و ما اعلنتُ انتَ المقدم و انتَ المؤخر لا الہ الا انتَ ولا الہ غیرُک (البخاری ، ۱ : ۲۸۴ و ۳ : ۱۸۹)۔ پھر آپؐ قضائے حاجت سے فارغ ہو کر اچھی طرح مسواک فرماتے (ابو داوٗد ، ۱ : ۴۷ ، حدیث ۵۵)۔ پھر وضو فرماتے اور بشمولؔ وتر گیارہ رکعات ادا فرماتے (البخاری ، ۱ : ۲۸۸ و ۳ : ۱۸۸)۔ اس نماز کو آپؐ نے تمام زندگی کامل پابندی وقت کے ساتھ ادا فرمایا اور سوائے ایک یا دو راتوں کے جبکہ آپؐ کی طبیعت ناساز تھی ، آپؐ نے اس نماز کو ترک نہیں فرمایا (البخاری ، ۱ : ۲۸۴ ، ۲۸۵)۔ اس نماز کے اہتمام کا یہ عالم تھا کہ آپؐ اپنے متعلقین کو بھی اس نماز کے لیے جگاتے تھے (کتاب مذکور ، ۱ : ۲۸۵) اس نماز میں آپؐ اتنا طویل قیام فرماتے کہ آپؐ کے پائے مبارک سوج جاتے (کتاب مذکور ، ۱ : ۲۸۶)۔ حضرت حذیفہؓ کے مطابق آپؐ نے ایک مرتبہ ایک رکعت میں سورة البقرة، سورة آل عمران اور سورة النساء تلاوت فرمائی (ابن الجوزی ، ۲ : ۵۰۲ ، ۵۰۳)۔ ایک شب آپؐ نے سبع طوال تلاوت فرمائیں (حوالۂ مذکور)۔ دوران تلاوت ہر تسبیح والی آیت پر آپؐ تسبیح فرماتے ، ہر سوال والی آیت پر اللہ تعالٰی سے سوال فرماتے ، ہر پناہ والی آیت پر خدا تعالٰی سے پناہ مانگتے (حوالۂ مذکور)۔ ایک شب آپؐ نے پوری رات سورة المائدہ کی یہ آیت پڑھتے ہوئے گزار دی : اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَ اِنْ تَغْفِرْلَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (ابن الجوزی ، ۲ : ۵۰۸)۔ رمضان المبارک میں شب بیداری کا یہ اہتمام اور زیادہ بڑھ جاتا اور آپؐ لمبی لمبی نمازیں ادا فرماتے تھے (البخاری ، ۱ : ۲۹۰).

بعض اوقات وتروں سے قبل (البخاری ، ۱ : ۲۹۰) اور بعض اوقات ہر دو رکعتوں کے بعد قلیل سے وقفے کے لیے سو بھی جاتے اور پھر اٹھ کر وضو فرماتے اور بقیہ نماز پوری فرماتے تھے (ابن الجوزی ، ۲ : ۵۰۱ تا ۵۰۲)۔ رات کی یہ نماز عموماً دو دو رکعات پر مشتمل ہوتی تھی (البخاری ، ۱ : ۲۸۷)۔ اس کے رکوع اور سجدے کا یہ حال ہوتا تھا کہ ناظر یہ فرق محسوس نہیں کرتا تھا کہ قیام طویل تھا یا رکوع و سجدہ (ابن الجوزی ، ۲ : ۵۰۲ ، ۵۰۳)۔ حضرت عائشہؓ کے بقول آپؐ کا سجدہ ۵۰ آیات کی تلاوت کے مساوی ہوتا تھا (البخاری ، ۱ : ۲۸۵)۔ نماز تہجد میں آپؐ تین دن سے کم میں قرآن حکیم کا ختم کرنا ناپسند فرماتے تھے اور جب قرآن ختم ہوتا تو آپؐ کھڑے کھڑے دعا مانگتے تھے (ابن الجوزی ، ۲ : ۵۰۶)۔ وتروں میں آپؐ علی الترتیب سورة الاعلٰی، سورة الکافرون اور سورة الاخلاص پڑھتے تھے اور نماز کے اختتام پر فرماتے: سبحان الملک القدوس (تین مرتبہ اور تیسری مرتبہ ذرا دراز کرتے ہوئے؛ دیکھیے ابن الجوزی، ۲ : ۵۰۷)۔ نماز وتر کے بعد آپؐ استراحت فرماتے تھے۔ پھر جب اذان کی آواز بلند ہوتی تو اٹھ کر فجر کی دو رکعتیں ادا فرماتے (البخاری ، ۱ : ۲۸۶)۔ اس کے بعد آپؐ اپنے دائیں پہلو پر لیٹ جاتے (کتاب مذکور، ۱ : ۲۹۲ ، ۲۹۳)، لیکن بقول حضرت عائشہؓ اگر وہ جاگ رہی ہوتیں تو لیٹنے کے بجائے ان سے گفتگو فرماتے (حوالۂ مذکور) اور پھر جب مؤذن بلانے آتا تو آپؐ اٹھ کر باہر نکلتے اور نماز فجر کی امامت فرماتے۔

۲- صبح و شام کے معمولات : صبح و شام کے اوقات آپؐ کے نزدیک خاص اہتمام رکھتے تھے ، جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ قرآن کریم میں بے شمار مواقع پر صبح و شام (بکرةً و اصیلاً / عشیاً ، دیکھیے محمد فؤاد عبدالباقی : معجم المفھرس لالفاظ القرآن الکریم) کی عبادت اور التسبیح و تہلیل پر زور دیا گیا ۔ اسی بنا پر آپؐ کا یہ فرمان تھا کہ جو

شخص صبح نماز کے لیے وقت پر نہیں اٹھتا اس پر شیطان غالب آ جاتا ہے اور وہ تمام دن تھکاوٹ اور کسل مندی محسوس کرتا رہتا ہے (البخاری، ۱ : ۲۸۸ تا ۲۸۹)۔ آپؐ ان اوقات کو بہت سی دعاؤں اور اوراد سے معمور رکھتے تھے (جن کے لیے دیکھیے البخاری، ۴ : ۱۸۳ تا ۲۱۰، کتاب الدعوات؛ مسلم، ۴ : ۲۰۶۱ تا ۲۰۹۰، کتاب الذکر و الدعا و التوبة و الاستغفار؛ الترمذی، ۴ : ۵۵۷ تا ۵۸۲، کتاب الدعاء؛ و دیگر کتب حدیث)۔

۴۔ معمولات طہارت : آپؐ کو طہارت کا بہت خیال رہتا تھا۔ دن ہو یا رات آپؐ بدون طہارت کے وقت گزارنا ہرگز پسند نہیں فرماتے تھے۔ آپؐ رفع حاجت کے لیے بہت دور بعض اوقات تقریباً ۲ میل (ابن القیم: زاد المعاد، ۱ : ۱۷۱) نکل جاتے، جہاں سے بمشکل آدمی دکھائی دے سکے (ابو داود، ۱ : ۱۴، حدیث ۱ و ۲)۔ قضاے حاجت سے قبل آپؐ یہ دعا ضرور پڑھتے تھے : اعوذ باللہ من الخبث والخبٰئث (مسلم، ۱ : ۲۸۴، حدیث ۳۷۵)، یا اللّٰھم انی اعوذ بک من الخبث و الخبائث (ابن الجوزی، ۲ : ۴۸۷)۔ ابن ماجه (حدیث ۲۹۹) میں اس کے معاً بعد یہ اضافه بھی ہے۔ الرّجس النّجس الشیطان الرّجیم (نیز دیکھیے ابن قیم: زاد المعاد، ۱ : ۱۷۰ تا ۱۷۲) اور دوران قضاے حاجت قبلے کی طرف منه اور کمر کرنے سے پرہیز فرماتے (مسلم، کتاب الطہارة؛ ابن ماجه، حدیث ۳۱۳؛ النسائی، ۱ : ۲۳) اور جب تک بیٹھ نه جاتے اس وقت کپڑے نہیں اٹھاتے تھے (الترمذی، ۱ : ۲۱، حدیث ۱۴؛ ابو داود، ۱ : ۲۱، حدیث ۱۴) ہمیشہ بیٹھ کر رفع حاجت فرماتے (الترمذی، حدیث ۱۲) اور اس دوران میں ہر قسم کی گفتگو کرنے (بشمول جواب سلام) کو ناپسند فرماتے تھے (ابن ماجه، حدیث ۳۴۴؛ ابو داود، ۱ : ۲۲ تا ۲۳، حدیث ۱۵ تا ۱۷)۔ آپؐ رفع حاجت کے لیے جانے سے قبل اپنی انگوٹھی (جس پر محمد رسول اللہ کے الفاظ کندہ تھے) اتار کر رکھ جاتے تھے (ابن ماجه، حدیث ۳۰۳)۔ آپؐ (ابتدائی) استنجا ایسی اشیا سے فرماتے جو مطہر ہوتیں (مثلاً ڈھیلا وغیرہ)؛ ایسی اشیا جو غیر مطہر ہوں (مثلاً کوئلہ، وغیرہ)، ان سے استنجا کرنا آپؐ کو ناپسند تھا (ابو داود، ۱ : ۳۳ تا ۳۷، حدیث ۲۹ تا ۳۹) اور ان کے استعمال میں طاق کا لحاظ رکھتے تھے (ابن ماجه : سُنن، حدیث ۳۴۸؛ ابو داود، ۱ : ۳۳ تا ۳۴، حدیث ۳۵)۔ بعد ازاں پانی استعمال فرماتے (البخاری، ۱ : ۵۱) اور پھر زمین پر ہاتھ مار کر اپنے دونوں ہاتھ اچھی طرح رگڑ کر دھوتے تھے (ابو داود، ۱ : ۳۹، حدیث ۴۵)۔ اس سے فارغ ہو کر جب آپؐ باہر نکلتے تو فرماتے : غفرانک (الترمذی، حدیث ۷؛ ابن ماجه، حدیث ۳۰۰؛ ابن الجوزی، ۲ : ۴۸۷)۔

معمولات مسواک و وضو : مسواک آپؐ کی تمام زندگی کا معمول رہی، یہاں تک کہ آخری گھڑیوں میں بھی حضرت عائشہؓ نے آپ کا منشا پا کر آپؐ کو مسواک کرائی، جس سے چہرۂ مبارک فرط مسرت سے تمتمانے لگا تھا (ابن ہشام؛ البلاذری وغیرہ)۔ آپؐ کو مسواک اس قدر پسند تھی کہ آپؐ فرماتے تھے کہ اگر میری امت پر گراں نه ہوتا تو میں ہر نماز کے ساتھ مسواک کرنے کا لازمی حکم دیتا (النسائی، ۱ : ۱۲؛ مسلم، ۱ : ۲۲۰، حدیث ۲۵۲)۔ آپؐ ہر نماز کے لیے تازہ وضو فرماتے (البخاری، ۱ : ۶۶)، ہر وضو میں اچھی طرح مسواک فرماتے اور دوسروں کو بھی آپؐ کی یہی تلقین تھی کہ اگر ہر نماز کے لیے تازہ وضو نه کیا جا سکے تو مسواک ضرور کر لینی چاہیے (ابو داود، ۱ : ۱۴، حدیث ۴۸)۔ اسی طرح جب بھی آپ سو کر بیدار ہوتے تو ضرور مسواک فرماتے (ابو داود، ۱ : ۷۴، حدیث ۵۷)۔

وضو سے قبل آپؐ بسم اللہ ضرور پڑھتے؛ پھر

برتن میں ہاتھ ڈالنے سے قبل ہاتھوں پر پانی ڈال کر تین مرتبہ انہیں دھوتے؛ پھر ایک یا دو یا تین چلوؤں سے (ابن قیم، ۱: ۱۹۲) اچھی طرح کلی کرتے اور ناک میں پانی ڈال کر اسے صاف فرماتے؛ پھر تین مرتبہ چہرہ دھوتے؛ پھر پہلے اپنا دایاں پھر بایاں ہاتھ کہنی سمیت (دو یا تین مرتبہ) دھوتے؛ پھر اپنے سر کا مسح فرماتے؛ پھر پہلے دائیں، پھر بائیں پاؤں کو دھوتے (البخاری، ۱: ۶۰ تا ۶۱؛ مسلم، طہارۃ، ۱: ۲۰۴ و ۲۰۵، حدیث ۲۲۶؛ ابن ماجہ، حدیث ۲۹۵؛ النسائی، ۱: ۶۹، ۷۰، وغیرہ)۔ اگر موزے پہنے ہوتے تو انہیں اتارے بغیر ان پر مسح فرماتے (البخاری، ۱: ۶۱ بعد؛ مسلم، ۱: ۲۲۸، حدیث ۲۷۴)۔ دوران وضو داڑھی کا خلال اور پاؤں کی انگلیوں کے خلال کا بھی معمول تھا (ابو داؤد، ۱: ۱۰۱، حدیث ۱۳۵)۔ ابن قیم (زاد المعاد، ۱: ۱۹۵ بعد) کے مطابق دوران وضو آپؐ سے بجز ابتدا میں تسمیہ کے اور کوئی دعا منقول نہیں، البتہ وضو کے بعد آپؐ یہ دعا پڑھتے تھے: اشهد اَن لّا اله الا الله وحدهٗ لا شریک له و اشهد ان محمدا عبدهٗ و رسولهٗ اللّٰهم اجعلنی من التوابین و اجعلنی من المتطهّرین۔ آپؐ عموماً دو رطل پانی سے وضو اور ایک صاع (تقریباً چار سیر) پانی سے غسل فرما لیا کرتے تھے (ابن الجوزی، ۲: ۴۸۸)؛ پانی کی اس سے زیادہ مقدار بھی مروی ہے (ابو داؤد، ۱: ۱۶۶ و ۱۶۷، حدیث ۲۴۸)۔ وضو کے بعد بعض روایات کے مطابق کپڑے سے منہ وغیرہ صاف کرتے تھے (الترمذی، ۱: ۸۴ بعد، حدیث ۵۳، ۵۴)۔

غسل: آپؐ کے غسل کا طریقہ یہ تھا کہ آپؐ پہلے اپنے دونوں ہاتھ دو یا تین مرتبہ دھوتے؛ پھر استنجا فرماتے؛ پھر زمین پر ہاتھ مار کر انہیں اچھی طرح دھوتے، پھر کلی کرتے اور پانی ڈال کر ناک صاف فرماتے، پھر اپنا چہرہ دھوتے، اپنے تمام بدن پر پانی ڈالتے، پھر اس جگہ سے ہٹ کر اپنے پاؤں دھوتے (ابو داؤد، ۱: ۱۶۹ تا ۱۷۰، حدیث ۲۴۵؛ مسلم، ۱: ۲۵۴، حدیث ۳۱۷؛ الترمذی، ۱: ۱۷۳ تا ۱۷۴، حدیث ۱۰۳)۔ حضرت عائشہؓ کے مطابق آپؐ غسل میں بھی نماز کی طرح پورا وضو فرماتے، پھر دائیں کندھے پر پانی ڈالتے، پھر بائیں پر، پھر تین مرتبہ تمام بدن پر پانی بہاتے (ابو داؤد، ۱: ۱۶۷، حدیث ۲۴۰ و ۲۴۱؛ ابن ماجہ، حدیث ۵۷۴)۔ خصوصی ضرورت کے علاوہ جمعہ اور عیدین کے مواقع پر غسل کا شدید اہتمام ہوتا تھا (البخاری، ۱: ۲۲۴ تا ۲۲۵ و بعد، کتاب الجمعہ؛ مسلم، ۱: ۵۷۹ تا ۵۸۱، حدیث ۸۴۴ تا ۸۴۷؛ الترمذی، حدیث ۴۹۲ تا ۴۹۴) ان تقریبات پر آپؐ خوشبو کے استعمال کو پسند فرماتے تھے (ابو داؤد، ۱: ۲۴۷، حدیث ۳۴۷)۔

۴۔ معمولات نماز: آپؐ کو تمام زندگی نماز کے اہتمام کا بڑا خیال رہا۔ آپؐ کے نزدیک سب سے عمدہ عمل نماز کا اول وقت پر ادا کرنا ہے (الترمذی، ۱: ۳۲۰، حدیث ۱۷۰؛ ابو داؤد، ۱: ۲۹۶)۔ آپؐ کا ارشاد تھا کہ تین چیزوں کو کبھی مؤخر نہیں کرنا چاہیے: نماز جب اس کا وقت ہو جائے، جنازہ جب آ جائے اور جوان عورت، جب اس کا کوئی رشتہ مل جائے (احمد بن حنبل: مسند، ۱: ۱۰۵، حدیث ۸۲۸؛ الترمذی، ۱: ۳۲۰، حدیث ۱۷۱)۔ آپؐ کی زندگی مبارک میں ایک نماز کے سوا (اور وہ بھی سفر کے دوران میں تمام صحابہؓ کو نیند آ جانے کی وجہ سے) کوئی نماز قضا نہ ہوئی (مسلم، ۱: ۱۷۴، حدیث ۶۸۰؛ ابن ماجہ، حدیث ۶۹۷؛ النسائی، حدیث ۶۲۰؛ ابو داؤد، ۱: ۳۰۲ تا ۳۰۵، حدیث ۴۳۵ تا ۴۳۷)۔ فرض نمازیں مسجد میں باجماعت اور نفل نمازیں گھر میں تنہا پڑھنے کا معمول تھا۔

فجر کی نماز آپؐ اتنی روشنی میں کہ پاس بیٹھنے والا، دوسرے کو پہچان سکتا تھا ادا فرماتے تھے (مسلم ۱: ۴۴۷، حدیث ۶۴۷)، لیکن خواتین

کی شمولیت کی وجہ سے آپؐ بعض دنوں (بالخصوص رمضان المبارک) میں اتنے منہ اندھیرے نماز پڑھتے کہ عورتیں چادروں میں لپٹی ہوئی پہچانی نہ جا سکتی تھیں (مسلم، ۱ : ۴۴۶، حدیث ۶۴۶)۔

فجر کی نماز میں آپؐ عموماً ساٹھ سے سو آیات تک تلاوت فرماتے تھے (مسلم، ۱ : ۴۴۷، حدیث ۴۶۷)، مگر کبھی سورۃ المومنون کی ۵۴ یا ۹۴ آیات، کبھی سورۂ قٓ، کبھی التکویر جیسی چھوٹی سورتیں بھی پڑھنے کا معمول تھا۔ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ عموماً آپؐ قراءت میں تخفیف فرماتے تھے (مسلم، ۱ : ۳۳۶ تا ۳۳۷، حدیث ۴۵۵ تا ۴۵۸)، تاہم جمعہ کے روز نماز فجر کی پہلی رکعت میں سورۃ الٓمّٓ السّجدہ اور سورۃ الدّھر تلاوت فرماتے (مسلم، ۲ : ۵۹۹، حدیث ۸۷۹، ۸۸۰؛ نیز دیکھیے ابن القیم: زاد المعاد، ۱ : ۲۰۹ تا ۲۱۰، مطبوعہ کویت)۔ ظہر کی نماز آپؐ گرمیوں میں ذرا تاخیر سے، یعنی سایہ کے تین قدموں سے پانچ قدم ہونے کے درمیان) اور سردیوں میں ذرا جلدی (سایے کے پانچ قدم سے سات قدم کے درمیان) پڑھا کرتے تھے؛ (ابو داؤد، ۱ : ۲۸۳، حدیث ۴۰۱؛ النسائی، کتاب المواقیت، ۱ : ۲۵۰، ۲۵۱) ایک مرتبہ آپؐ نے اس وقت ظہر کی نماز ادا فرمائی جب کہ ٹیلوں کے سایے نمودار ہوگئے (البخاری؛ مسلم، ۱ : ۴۳۱، حدیث ۶۱۶؛ الترمذی، ۱ : ۲۹۶، حدیث ۱۵۷)۔ آپؐ ظہر کی ابتدائی دو رکعتوں کو آخری دو رکعتوں سے اور پہلی رکعت کو دوسری رکعت سے لمبا فرماتے تھے (مسلم، ۱ : ۳۳۳ تا ۳۳۴، حدیث ۴۵۱ تا ۴۵۲)۔ پہلی دو رکعتوں میں عام اندازے کے مطابق ۳۰، ۳۰ آیات (مثلاً سورہ ۳۲ [الٓمّٓ السجدۃ]، آیات ۳۰) اور آخری دو رکعتوں میں ۱۵، ۱۵ آیات کے بقدر قیام فرماتے تھے (حوالۂ مذکور)؛ مگر یہ تصریح بھی کی گئی ہے کہ ظہر اور عصر کی آخری دو رکعتوں میں سوائے سورۃ الفاتحہ کے کوئی اور سورت نہیں پڑھتے تھے۔ پہلی رکعت کا قیام اتنا طویل ہوتا کہ ایک شخص باسانی بقیع میں قضائے حاجت سے فارغ ہو کر، گھر میں طہارت اور وضو کرکے پہلی رکعت میں شامل ہو سکتا تھا (کتاب مذکور، ۱ : ۳۳۵، حدیث ۴۵۴)، مگر کبھی کبھار اسی نماز میں سورۃ اللیل کا پڑھنا بھی مروی ہے۔ آپؐ عصر کی نماز اس وقت ادا فرماتے جب کہ سورج کی روشنی حضرت عائشہؓ کے حجرے میں موجود ہوتی (البخاری، ۹/۱۳، ۱ : ۱۴۶) اور ایک شخص مدینہ منورہ کے انتہائی علاقے سے ہو کر سورج کے زرد ہونے سے قبل واپس پہنچ جاتا تھا (کتاب مذکور، ۱ : ۱۴۷)۔ عصر کی پہلی دو رکعتوں میں آپؐ کا قیام ظہر کی آخری دو رکعتوں کے قیام سے قدرے کم ہوتا تھا (یعنی تقریباً ۱۵ آیات کے بقدر: مسلم ۱ : ۳۳۴، حدیث ۴۵۲ تا ۴۵۳)۔ ظہر اور عصر میں قراءت مخفی ہوتی تھی، مگر کبھی کبھار، دوسروں کو بتلانے کے لیے کوئی ایک آدھ آیت آپؐ بلند آواز سے بھی پڑھ دیتے (کتاب مذکور، ۱ : ۳۳۳، حدیث ۴۵۱)۔ نماز مغرب کو جلدی پڑھنے کا معمول تھا، یہاں تک کہ نماز کے بعد تیر گرنے کی جگہ دکھائی دے سکتی تھی۔ نماز مغرب میں سورہ مرسلات یا سورہ طور (یا اس کے مطابق کوئی سورت) پڑھتے تھے۔ (مسلم، ۱ : ۳۳۸، حدیث ۴۶۲ تا ۴۶۳)۔

عشا کی نماز کو آپؐ تاخیر سے پڑھتے تھے (البخاری، ۹/۲۰، ۱ : ۱۵۰)، مگر ایک دوسری روایت کے مطابق اگر لوگ جمع ہو جاتے تو جلدی ورنہ تاخیر سے ادا فرماتے تھے (کتاب مذکور، ۹/۲۱، ۱ : ۱۵۱)۔ عشا کی نماز میں آپؐ سورۃ الاعلیٰ، سورۃ الشمس اور سورۃ التین جیسی سورتیں تلاوت فرماتے تھے (مسلم، ۱ : ۳۳۹ تا ۳۴۰، حدیث ۴۶۴، ۴۶۵)۔

نماز باجماعت میں آپؐ خود بھی تخفیف کے حکم پر عمل کرتے اور دوسروں کو بھی اسی کی تاکید فرماتے (کتاب مذکور ، ص ۳۳۰ ، حدیث ۴۶۶ ببعد) ۔ جمعہ کی پہلی رکعت میں سورۂ جمعہ دوسری رکعت میں سورۂ منافقون اور کبھی سورۃ الاعلی اور سورۃ الغاشیہ پڑھتے تھے ؛ علامہ ابن القیم (زاد المعاد ، ۱ : ۳۷۹) کے مطابق ان سورتوں کا مکمل طور پر پڑھنا سنت ہے نہ کہ بعض حصوں کا ۔ عیدین میں دونوں مؤخر الذکر سورتیں تلاوت فرماتے تھے (البخاری ، کتاب العیدین و کتاب الجمعہ ؛ نیز زاد المعاد ، ۱ : ۳۷۸ تا ۳۷۹) ۔

۵۔ معمولات صوم : آپؐ رمضان المبارک کے علاوہ بھی بہت سے روزے رکھتے تھے ، مگر آپؐ کو صوم وصال (مسلسل روزے رکھنا) پسند نہ تھا ، بلکہ آپؐ کو صوم داودؑ (ایک دن روزہ اور ایک دن افطار) ، زیادہ محبوب تھا (البخاری ، ۳۰/۵۸ ، ۱ : ۴۹۳ ؛ مسلم ، حدیث ۱۱۵۹ ، النسائی ، ۴ : ۲۰۹ ؛ ابو داؤد ، ۲ : ۸۰۷ ، حدیث ۲۴۲۶ تا ۲۴۲۷) ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم رمضان المبارک کے علاوہ پورے شعبان کے (البخاری ، ۳۰/۵۲ ، ۱ : ۴۹۱ ؛ ابو داؤد ، ۲ : ۸۱۲ ، حدیث ۲۴۳۱ ؛ الترمذی ، ۳ : ۱۱۳ ، حدیث ۷۳۷ ؛ النسائی ، ۴ : ۲۰۰) ، ہر ماہ میں تین دن ، ذی الحجہ کے نو ابتدائی ایام ، یوم عاشورہ (ابو داؤد ، ۲ : ۸۱۵ ، حدیث ۲۴۳۷ ؛ النسائی ، ۴ : ۲۰۵) ہر ماہ کی تیرھویں چودھویں اور پندرھویں (النسائی ، ۴ : ۲۲۲ تا ۲۲۴ ، حدیث ۲۴۳۴ ؛ ابو داؤد ، حدیث ۲۴۴۹) ، ہر ہفتے میں سے دو دن ، پیر اور جمعرات (ابو داؤد ، حدیث ۲۴۳۶ ؛ الترمذی ۳ : ۱۲۱ ، حدیث ۷۴۵) کے روزے رکھنے کا بھی معمول تھا ۔ اس کے علاوہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب آپؐ روزے رکھتے تو اتنے روزے رکھتے تھے کہ محسوس ہوتا تھا اب کبھی آپؐ افطار نہیں کریں گے اور جب افطار کرتے تھے تو لگتا تھا اب آپؐ کبھی روزے نہیں رکھیں گے (البخاری ، ۳۰/۵۲ ، ۱ : ۴۹۱) ۔ آپؐ کا طریقہ خود آپؐ کے اپنے بیان کے مطابق یہ تھا کہ آپؐ روزے بھی رکھتے تھے اور افطار بھی فرماتے تھے ، مگر اعتدال کے ساتھ (البخاری) ۔ آپؐ سحری کا ہمیشہ اہتمام فرماتے تھے ؛ آپؐ کے نزدیک بہترین سحری کھجور تھی (ابو داؤد ۲ : ۸۲۴ ، حدیث ۲۳۴۵) ، لیکن کبھی ایسے بھی ہوتا کہ جب گھر تشریف لاتے اور گھر میں کھانے کو کچھ نہ ہوتا تو روزے کی نیت فرما لیتے (مسلم ، حدیث ۱۱۵۴ ؛ النسائی ، ۴ : ۱۹۳ تا ۱۹۵ ، ببعد) ۔ نفلی روزوں میں یہ بتلانے کے لیے کہ بوقت ضرورت انہیں کھولا بھی جا سکتا ہے ؛ آپؐ نے بعض مواقع پر روزے کی نیت کر کے افطار کر لیا (ابو داؤد ، ۲ : ۸۲۶ ، حدیث ۲۴۵۶ ؛ الترمذی ، ۳ : ۶ ، حدیث ۷۳۲) ، مگر ان حالات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم روزے کی قضا ضروری سمجھتے تھے (ابو داؤد ، ۲ : ۸۲۶ ، حدیث ۲۴۵۷) ۔ روزے کے دوران میں مسواک کرنے ، حجامت کروانے (پچھنے لگوانے) ، سرمہ ڈالنے کا بھی معمول تھا (ابو داؤد ، حدیث ۲۳۶۴ ، ۲۳۷۲ ، ۲۳۷۸) ۔ افطار میں آپؐ ہمیشہ تعجیل فرماتے (البخاری ، ۱ : ۴۸۸ ، ۳۰/۴۵ ؛ مسلم ، حدیث ۱۰۹۸) آپؐ کا ارشاد تھا کہ جب تک امت روزے کی افطاری میں تعجیل کرتی رہے گی اس وقت تک وہ خیر پر رہے گی ۔ روزہ عموماً کھجور یا پانی سے افطار فرماتے (الترمذی ، ۳ : ۷۹ ، حدیث ۶۹۵ ؛ ابو داؤد ، ۲ : ۷۶۴ ، حدیث ۲۳۵۵ ببعد) ۔ افطار کے وقت کبھی تو فرماتے : ذَهَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوقُ وَثَبَتَ الْأَجْرُ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ (ابو داؤد ۲ : ۷۶۵ ، حدیث ۲۳۵۷) اور کبھی یہ دعا پڑھتے : اَللّٰهُمَّ لَكَ صُمْتُ وَعَلٰى رِزْقِكَ أَفْطَرْتُ (حوالۂ مذکور) ۔

۶۔ معمولات حج و عمرہ : آپؐ نے ہجرت سے قبل جو حج اور عمرے کیے ان کی صحیح

تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے (ابن حزم : جوامع السیرۃ ، ۱ ، ص ۱۵) ۔ ہجرت کے بعد آپؐ نے صرف ایک حج اور دو مفرد عمرے (عمرۃ القضا : سنہ ۷ھ/۶۲۹ء ، عمرہ از جعرانہ ، ۸ھ/۶۳۰ء) اور ایک عمرہ قران (حجۃ الوداع کے ساتھ) ادا فرمائے (تفصیل کے لیے دیکھیے ابن سید الناس : تاریخ الخمیس ۲ : ۲۸ ؛ ابن قیم ، زاد المعاد ، ۲ : ۹۷ تا ۱۰۰ ؛ ابن کثیر ، ۵ : ۲۱۵) ۔ ابن سید الناس، ابن کثیر (حوالہ مذکور) اور دوسرے بہت سے سیرت نگاروں نے عمرۂ صلح حدیبیہ کو شمار کر کے ان عمروں کی تعداد چار تک بیان کی ہے ۔

جب آپؐ حج ، عمرے یا جہاد کے سفر کے لیے روانہ ہوتے تو سب سے پہلے اپنی جگہ کسی کو مدینہ منورہ میں قائم مقام امیر مقرر فرماتے ؛ چنانچہ عمرہ صلح حدیبیہ اور حجۃ الوداع کے موقع پر ابن ام مکتوم کو اور عمرہ قضا کے موقع پر ابو رھم الانصاری کو مدینہ منورہ میں اپنا قائم مقام بنایا (دوسرے مواقع کے امیروں کے لیے دیکھیے ، الواقدی ، ۱ : ۷ تا ۸ ، مطبوعہ آکسفرڈ) ۔ اپنی ازواج میں سے عموماً ایک (بعض اوقات ایک سے زائد) کو اپنے ساتھ لے جاتے ، لیکن اس کا فیصلہ بجائے خود کرنے کے، قرعہ اندازی کے ذریعے فرماتے (البخاری، ۶۴/۴۲، ۳ : ۴۰۱ ، کتاب المغازی) عموماً حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کو زیادہ ہم رکابی کا شرف حاصل ہوتا تھا ۔

گھر سے عموماً پیر یا جمعرات کو نکلتے (ابن الجوزی ، ۲ : ۵۹۶ ، صرف یوم الخمیس ؛ ابو داؤد ۳ : ۷۹ ، حدیث ۲۶۰۵) اور عموماً فجر کے تڑکے نکلنے کا معمول تھا (الترمذی ، ۳ : ۵۱۷ ، حدیث ۱۲۱۲ ؛ ابو داؤد، ۳ : ۷۹، حدیث ۲۶۰۶) ۔ اکیلے سفر کے بجائے آپؐ جماعت (دو یا زائد افراد) کی صورت میں اور باقاعدہ ایک امیر کے تحت نکلنے کو پسند فرماتے تھے ۔ اگر آپؐ کسی قافلے میں شامل ہوتے تو اس کے امیر تو آپؐ ہی ہوتے ، ورنہ آپؐ امیر کا تقرر بھی فرماتے ۔ الوداع کے وقت آپؐ فرماتے : استودع اللہ دینکم و امانتکم و خواتیم اعمالکم (ابو داود ، ۳ : ۷۷ ، حدیث ۲۶۰۱ ؛ الترمذی ، ۵ : ۴۹۹ ، حدیث ۳۴۴۳ تا ۳۴۴۴) ۔ جب آپؐ سواری کے رکاب پر پاؤں رکھتے تو فرماتے : بسم اللہ ! پھر جب سواری پر اچھی طرح بیٹھ جاتے تو یہ دعا فرماتے : سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَ مَا کُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ۝ وَ اِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ، الحمد للہ (تین مرتبہ) اللہ اکبر (تین مرتبہ) لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نفسی فاغفرلی فانه لایغفر الذنوب الا انت ، (ابن قیم : زاد المعاد ، ۳ : ۲۳۵ ؛ ابو داود ، ۳ : ۷۷ ، حدیث ۲۶۰۲) ۔ اسی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ آپ اس دعا کے بعد مسکراتے ، پوچھا جاتا تو فرماتے خدا اپنے اس بندے کو پسند فرماتا ہے جو یہ کہتا ہے (اے رب) میرے گناھوں کی مغفرت فرما، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کے سوا کوئی گناھوں کو نہیں بخش سکتا (الترمذی، ۵ : ۵۰۱، حدیث ۳۴۴۶) ۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے مطابق سواری پر بیٹھ جانے کے بعد یہ دعا پڑھتے : اللہ اکبر (تین مرتبہ) ، سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَ مَا کُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ وَ اِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ؛ اللھم انا نسألک فی سفرنا ھذا البر والتقوی و من العمل ما ترضی ؛ اللھم ھوّن علینا سفرنا ھذا واطوعنا بعدہ ! اللھم انت الصاحب فی السفر و الخلیفة فی الاھل ؛ اللھم انی اعوذبک من وعثاء السفر و کآبة المنظر و سوء المنقلب فی المال والاھل اور جب سفر سے واپسی ہوتی تو یہ اضافہ فرماتے : آیبون ان شاء اللہ، تائبون عابدون لربنا حامدون (مسلم ، ۲ : ۹۷۸ ، حدیث ۱۳۴۲ ؛ معمولی اختلاف کے ساتھ : الترمذی ، ۵ : ۵۰۲ ، حدیث ۳۴۳۸ تا ۳۴۳۹) ۔ دوران سفر میں ہر بلندی کو چڑھتے اور ہر نشیب کی طرف اترتے ہوئے تکبیر کا ورد جاری

رکھتے تھے (الترمذی، ۵ : ۵۰۰، حدیث ۳۴۴۵) - جب کسی جگہ پڑاؤ کرتے تو فرماتے: اعوذ بکلمات اللہ التامات من شر ما خلق (کتاب مذکور، ص ۴۹۶، حدیث ۳۴۳۷) - حج اور عمرے کے سفروں میں آپؐ ذوالحلیفہ کے مقام [رک بہ میقات] سے احرام باندھتے (مسلم، ۲ : ۸۸۷، حدیث ۱۲۱۸) - تمام راستے تکبیر و تہلیل اور تلبیہ کا ورد جاری رکھتے (حوالۂ مذکور)۔ مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے قبل آپؐ ذو طوای میں شب باشی کر کے صبح غسل کرکے پھر مکہ مکرمہ کی طرف بڑھتے (مسلم، ۲ : ۹۱۹، حدیث ۱۲۵۹)- مکہ مکرمہ میں آپؐ ثنیۃ العلیا سے داخل ہوتے اور ثنیۃ السفلی سے باہر نکلتے (مسلم، ۲ : ۹۱۸، حدیث ۱۲۵۹)- بیت اللہ شریف پر نظر پڑتی تو تکبیر و تہلیل پڑھتے (ابو داؤد، ۲ : ۳۳۸، حدیث ۱۸۷۲) اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے: اللھم زد ھذا البیت تشریفاً و تعظیماً و تکریماً و مھابۃً و زد من شرفہ و کرمہ ممن حجہ او اعتمرہ تشریفاً و تعظیماً و تکریماً (عبدالحی لکھنوی: حاشیہ ھدایہ، ۱ : ۲۲۱، شمارہ ۱۰، بحوالۂ امام شافعی) - مسجد میں داخل ہوتے ہی آپؐ سیدھے حجر اسود کے پاس آتے؛ اس کے سامنے کھڑے ہو کر تکبیر و تہلیل فرماتے اور اسے چومتے (ابو داؤد، ۲ : ۳۳۹، حدیث ۱۸۷۳) - پھر بیت اللہ شریف کا طواف فرماتے - طواف کے ہر چکر میں حجر اسود کے استلام کو دہراتے، نیز رکنین یمانین کو بھی ہاتھ سے چھوتے اور دعائیں پڑھتے (کتاب مذکور، ۲ : ۳۴۰، حدیث ۱۸۷۳ و ۱۸۷۶)- طواف اور استلام حجر اسود سے فارغ ہو کر دروازے اور رکن کے مابین کھڑے ہو کر اپنا سینہ، چہرہ اور دونوں ہاتھ کہنیوں سمیت پھیلا کر بیت اللہ شریف کی دیواروں پر رکھتے اور جہنم کے عذاب سے پناہ مانگتے (ابن ماجہ، حدیث ۲۹۶۲؛ ابو داؤد، ۲ : ۷۵۲، حدیث ۱۸۹۹) - پھر مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر دو رکعت نماز ادا فرماتے جن میں سورہ الکافرون اور سورہ اخلاص تلاوت فرماتے تھے (مسلم، ۲ : ۸۸۸، حدیث ۱۲۱۷) - وہاں سے باب بنی مخزوم، یعنی باب الصفا سے صفا مروہ کی طرف نکل جاتے اور صفا مروہ کے مابین سعی فرماتے - ہر چکر میں دعاؤں اور اوراد کا سلسلہ جاری رہتا (حوالۂ مذکور) اور اسی طرح بقیہ مناسک حج ادا فرماتے - [حج اور عمرہ کے دیگر مناسک کے لیے رک بہ حج؛ عمرہ؛ احرام؛ تلبیہ؛ قربانی وغیرہ]۔

مناسک حج سے فراغت کے بعد آپؐ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی طرف سے متعدد جانور ذبح فرماتے - حجۃ الوداع میں آپؐ نے اپنی طرف سے ۱۰۰ اونٹ قربان کیے جن میں سے ۶۳ اونٹ اپنے مبارک ہاتھوں سے ذبح فرمائے (ابو داؤد، ۲ : ۳۶۷، حدیث ۱۷۶۱، ۴۵۵ تا ۴۶۴، باب صفۃ حجۃ النبیؐ، حدیث ۱۹۰۵) باقی حضرت علیؓ نے ذبح کیے۔

مدینہ منورہ کے لیے واپسی کے دوران میں بھی تکبیر و تہلیل کا سلسلہ جاری رہتا - جب مدینہ کے پاس ثنیہ یا مقام فدفد پر پہنچتے تو یہ دعا پڑھتے: "اللہ اکبر (تین مرتبہ)، لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ لہ الملک و لہ الحمد و ھو علی کل شیء قدیر آیبون تائبون عابدون ساجدون لربنا حامدون صدق اللہ وعدہ و نصر عبدہ و ھزم الاحزاب وحدہ (مسلم، ۲ : ۹۸۰، حدیث ۱۳۴۴)- دوسری روایت کے مطابق آپؐ واپسی کے سفر کے دوران میں ہر بلندی و پستی کے موقع پر مذکورہ دعا پڑھتے - آپؐ یہ التزام فرماتے تھے کہ مدینہ منورہ میں آپؐ کی واپسی (چاشت) کے وقت ہو- آپؐ سب سے پہلے مسجد میں تشریف لاتے اور دو رکعت نماز ادا کر کے وہیں بیٹھ رہتے؛ لوگ حال احوال اور مسائل پوچھنے آتے رہتے؛ ان سے فارغ ہو کر آپؐ گھر میں تشریف لے جاتے (ابن الجوزی، ص ۶۶۳ تا ۶۶۴)۔

۶۔ معمولات سفر : [نیز رک بہ معمولات حج و عمرہ] آپؐ سفر کے دوران میں (خاص طور پر سفر جہاد میں) رات کے پر سکون لمحات میں سفر کرنا زیادہ پسند فرماتے تھے (ابو داؤد)۔ سفر کرتے ہوئے سواری کو تیز تیز ہانکتے (ابن الجوزی، ص ۶۶۱)۔ دوران سفر میں اپنی سواری پر بیٹھ کر خواہ اس کا کسی طرف بھی رخ ہوتا نوافل ادا فرماتے (حوالہ مذکور)۔

۷۔ معمولات دعا : دعا کو آپؐ عبادت کا مغز (مُخ) قرار دیتے تھے (الترمذی، ۵ : ۴۵۶، حدیث ۳۳۷۱)؛ نیز فرماتے تھے کہ اللہ کے نزدیک دعا سے زیادہ مکرّم کوئی چیز نہیں (کتاب مذکور، حدیث ۳۳۷۰)؛ آپؐ فرماتے تھے جو خدا سے نہیں مانگتا، خدا اس پر غضب ناک ہوتا ہے (کتاب مذکور، حدیث ۳۳۷۳)۔ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ خود آپؐ کو دعا کا بڑا اہتمام رہتا تھا۔ آپؐ ہاتھ اٹھا کر یوں عاجزی سے دعا مانگتے جس طرح کوئی مسکین کھانا طلب کرتا ہے (ابن الجوزی، ص ۵۴۷)۔ آپؐ کا فرمان تھا کہ ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو پھیلا کر دعا مانگنی چاہیے، نہ کہ ہاتھ الٹے کر کے (ابو داؤد، ۲ : ۱۲۵، حدیث ۱۴۸۴)۔ حضرت ابن عباسؓ کے بقول دعا کے وقت ہاتھ کندھوں کے برابر ہونے چاہئیں (حوالۂ مذکور)؛ حضرت عائشہؓ کے مطابق آپؐ صرف جامع دعائیں مانگتے تھے (ابو داؤد، ۲ : ۱۶۳، حدیث ۱۴۸۲) اور آپؐ دوسروں کو بھی یہی تلقین فرماتے، مثلاً آپؐ نے فرمایا: جب تم خدا سے جنت طلب کرو گے تو اس میں جو کچھ بھی ہے تمھیں مل جائے گا؛ اسی طرح جب تم جہنّم سے پناہ مانگو گے تو جو کچھ اس میں ہے اس سے تمھیں پناہ حاصل ہو جائے گی (کتاب مذکور، ۲ : ۱۶۲، حدیث ۱۴۸۰)۔ آپؐ فرماتے تھے کہ اللہ تعالٰی کے اسماے حسنٰی کے ساتھ جس نے دعا مانگی وہ ضرور قبول ہوگی (ابو داؤد، ۲ : ۱۶۶ تا ۱۶۸، حدیث ۱۴۹۳ تا ۱۴۹۶)۔ دعا کے بارے میں آپؐ کی تعلیم یہ تھی کہ سب سے پہلے اللہ عزّ و جل کی بزرگی اور اس کی ثنا بیان کی جائے : پھر اس کے نبیؐ پر درود پڑھا جائے : پھر جو چاہے اللہ سے دعا کی جائے (کتاب مذکور، ۲ : ۱۶۲، حدیث ۱۴۸۱)۔ آپؐ دعا میں اِنْ شِئْتَ (اگر تو چاہے) کے بجائے عزیمت یعنی پختگی کے ساتھ مانگنے پر زور دیتے تھے (مسلم، ۴ : ۲۰۶۳، حدیث ۲۶۷۸-۹)۔ آپؐ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ جو مسلمان اپنے بھائی کے لیے اس کے پس پشت دعا مانگتا ہے تو ایک فرشتہ مقرر ہوتا ہے جو اس کی دعا پر آمین کہتا ہے اور نیز یہ دعا مانگتا ہے کہ یہ نعمت دعا کرنے والے کو بھی حاصل ہو (مسلم، ۴ : ۲۰۹۴، حدیث ۲۷۳۲ و ۲۷۳۳)۔

آپؐ صبح و شام کے ہر معمول کو دعا سے شروع فرماتے اور دعا ہی پر ختم فرماتے تھے۔ آپؐ کی یہ دعائیں کتب احادیث و سیر میں ہر موقع کے لیے الگ الگ اور بڑی تفصیل کے ساتھ ملتی ہیں۔ صرف نماز میں سات مواقع پر آپؐ کا معمول دعا مانگنے کا تھا : (۱) تکبیر تحریمہ کے بعد : (۲) رکوع سے قبل اور قراءت کے بعد : (۳، ۴) رکوع اور سجدے میں : مثلاً سبحانک اللھم ربنا و بحمدک اللھم اغفرلی؛ (۵) قومہ میں : (۶) دونوں سجدوں کے درمیانی قعدے میں : (۷) سلام سے قبل (مسلم و البخاری، نیز ابن القیّم) (تفصیل کے لیے دیکھیے کتب حدیث میں کتب دعا)۔

۸۔ معمولات جہاد : مدنی زندگی میں آپؐ کو بار بار دشمنان اسلام کے خلاف صف آرا ہونا پڑا اور فوجی دستوں کی قیادت کرنا پڑی۔ جنگ ہوش و عقل کے بجائے جوش و جذبے سے لڑی جاتی ہے، مگر ہمیں رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی سیرت طیبہ میں ان مواقع پر بھی اعتدال و توازن نظر آتا ہے۔ جہاد کے لیے آپؐ حسب ذیل باتوں کا اہتمام فرمایا کرتے تھے :

حسب ارشاد خداوندی : وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ (۸ [الانفال] : ۶۰) ۔ جنگ پر روانہ ہونے سے پہلے آپؐ اس جنگ کے لیے تمام ممکنہ وسائل بہم پہنچاتے تھے ۔ موجود افرادی قوت میں سے جتنی ضرورت ہوتی اس کے مطابق رضاکاروں کا انتخاب فرما لیتے ۔ چند جنگوں (مثلاً غزوہ تبوک وغیرہ) میں ہر مسلمان عاقل بالغ کا جنگ کے لیے حاضر ہونا لازمی تھا ۔ ان کے علاوہ چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کے لیے دشمن کی تعداد (ابتداءً : دس ، مگر بعد ازاں دو ، کے مقابلے میں ایک : ۸ [الانفال] : ۶۵) کی مناسبت سے افرادی قوت کا تعین فرماتے ؛ افرادی قوت کے ساتھ ساتھ تمام ممکنہ عسکری وسائل (اسلحہ ، مویشی اور باربرداری کے جانوروں) کا بھی پورا پورا انتظام فرماتے ۔ ایسے مواقع پر صحابہؓ سے دل کھول کر چندہ دینے کی اپیل کی جاتی ؛ پھر اس تمام جمع شدہ پونجی سے سامان جنگ خرید کر مجاہدین میں تقسیم فرماتے ۔ سپاہیوں کو آپؐ کی تعلیم یہ تھی کہ صرف اور صرف اعلاے کلمۃ اللہ کے لیے جنگ کریں (البخاری ، ۲ : ۲۰۵ ؛ مسلم ، ۳ : ۱۵۱۲ تا ۱۵۱۳ ؛ حدیث ۱۹۰۴ ؛ الترمذی، حدیث ۱۶۴۶)، لیکن جنگ جیتنے کی صورت میں مال غنیمت میں سے حصہ دینے کا بھی وعدہ فرماتے [رک بہ انفال ؛ فیء ؛ غنیمت] ۔ جہاد کی تیاری کے ضمن میں ہتھیاروں کی صفائی (ابو داؤد، ۳ : ۶۹، حدیث ۲۵۸۳) اور گھوڑوں اور جوانوں کی دوڑ کا بندوبست بھی فرماتے (ابو داؤد ۳ : ۵۳ ، حدیث ۲۵۷۵ ، ۲۵۷۸)؛ جہاں آپؐ کھڑے ہو کر گھوڑوں کی دوڑ کراتے ، وہیں بعد ازاں مسجد سبق الخیل بنی ہے ۔

اگر آپؐ نے خود قیادت نہ کرنا ہوتی تو آپؐ لشکر پر امیر اور نائب امیر اور بعض اوقات نائب النائب [رک بہ مؤتہ] بھی آپؐ ہی مقرر فرماتے ؛ قیادت سونپنے کا بھی وہی اصول تھا جو نماز کی امامت کے لیے مقرر تھا، یعنی آپؐ کسی صاحبِ علم اور پختہ عمر کے آدمی کو اس کا امیر مقرر فرماتے (البخاری ، ۲ : ۲۱۰) ، مگر بعض اوقات بہادری اور علم و فہم اور بعض دیگر خصوصیات کی بنا پر نوجوانوں کو بھی قیادت سونپ دیتے تھے (جیسے کہ حضرت اسامہؓ بن زید کو قیادت سونپی) ۔ لشکر کو رخصت کرتے وقت مدینہ منورہ سے باہر تک تشریف لے جاتے ۔ الوداع کرتے وقت ان کو اور ان کے دین کو اللہ کی امان میں سونپتے (ابو داؤد) ۔ روانہ کرتے وقت یہ نصیحت فرماتے تھے کہ خدا سے ہر حال میں ڈرتے رہنا اور اپنے ساتھی مسلمانوں کی خیر خواہی کرتے رہنا ۔ پھر آپؐ فرماتے : خدا کے نام پر کافروں کے خلاف جہاد کرنا ؛ خیانت اور بد عہدی نہ کرنا ؛ کسی کو مُثلہ نہ بنانا ؛ کسی بچے اور کسی عورت کو کو قتل نہ کرنا (البخاری، ۲ : ۱۵۷ ؛ مسلم، حدیث ۱۷۴۴) ۔ جب تمہارا دشمن سے مقابلہ ہو تو اس کے سامنے تین باتیں پیش کرنا : (۱) اسلام قبول کر لو ؛ (۲) اگر اسلام قبول نہیں کرتے تو جزیہ ادا کرنا قبول کرو ؛ (۳) اگر جزیہ دینا بھی منظور نہیں کرتے تو پھر لڑنے کے لیے تیار جاؤ ۔ اگر وہ اسلام یا جزیہ دینا قبول کر لیں تو ان سے جنگ روک دینا ؛ اگر وہ یہ باتیں قبول نہیں کرتے تو پھر اللہ کی مدد سے ان کے خلاف جہاد کرنا اور اگر تم کسی قلعے کا محاصرہ کرو اور قلعے کے لوگ اللہ اور اللہ کے رسول کی ذمہ داری پر اترنا چاہیں، تو تم ہرگز قبول نہ کرنا ، مگر یہ کہ وہ تمہاری ذمہ داری پر اترنا قبول کریں ؛ کیوں کہ اگر تم اپنی اور اپنے ساتھیوں کی ذمہ داری کو پورا نہ کر سکو ، تو یہ اللہ اور اللہ کے رسول کی ذمہ داری کو توڑنے سے بہتر ہے اور اسی طرح اگر کسی قلعے والے اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر اترنا قبول کریں تو ہرگز نہ ماننا ، مگر یہ کہ وہ تمہارے حکم پر اترنا منظور کریں ، کیوں کہ

تم نہیں جانتے کہ تم ان میں حکم خداوندی جاری بھی کر سکتے ہو یا نہیں (مسلم ، ۳ : ۱۳۵۷ تا ۱۳۵۸، حدیث ۱۷۳۱)۔ ایسے موقعوں پر آپؐ یہ بھی فرماتے : تم لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنا ، تنگی نہیں (کتاب مذکور، حدیث ۱۷۳۲)۔ آپؐ جنگ میں جنگی چال (خُدعہ) کے تو قائل تھے ، مگر دھوکا اور فریب (الغدر) کے ہرگز قائل نہ تھے ۔ آپؐ کا فرمان تھا کہ قیامت کے روز غدر کرنے والوں کا الگ جھنڈا ہوگا (کتاب مذکور ، حدیث ۱۷۳۵)۔ امیر کے ساتھ ساتھ عام فوج کو بھی نصیحتیں فرماتے اور انھیں خاص طور پر اطاعت امیر کا حکم دیا جاتا (کتاب مذکور، ص ۱۴۶۵، حدیث ۱۸۳۴)۔ آخر میں دعا کر کے انھیں رخصت فرماتے (ابو داؤد).

اگر آپؐ نے خود کسی جنگ کی قیادت کرنا ہوتی تو آپؐ اپنی تمام ذمہ داریاں نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے ۔ آپؐ کو جب کسی طرف سے جنگی کارروائی کی اطلاع ملتی تو آپؐ اپنے خاص احباب کی مجلس مشاورت طلب فرماتے اور اس مسئلے کو سب کے سامنے پیش کرتے ؛ جو فیصلہ بھی ہوتا ، خواہ آپؐ کی مرضی کے خلاف ہو (مثلاً غزوہ احد کے موقع پر باہر نکل کر مدافعت کرنے کا فیصلہ) ، اس کی بہرحال پابندی فرماتے ۔ دشمنوں کی مدافعت کے لیے جو بھی تدبیر سوچی جاتی آپؐ اس تدبیر کی انجام دہی میں صحابہؓ کے پوری طرح شریک رہتے ، مثلاً خندق کھودنے میں (البخاری ، ۲ : ۲۱۰)۔ اگر باہر نکل کر مدافعت کرنے کا فیصلہ ہوتا تو آپؐ پوری طرح زاد راہ لے کر نکلتے (البخاری، ۲ : ۲۳۳ ؛ باب حمل الزاد فی الغزو).

جب لشکر مدینہ منورہ سے باہر ڈیرے ڈال دیتا تو اپنے لشکر کا جائزہ لیتے ؛ اگر کوئی اس میں نابالغ ہوتا (مسلم ، ۳ : ۱۴۹۰ ، حدیث ۱۸۶۸) یا اگر کوئی ماں باپ کی مرضی کے خلاف شریک جہاد ہونا چاہتا (ابو داؤد ، ۳ : ۸۳ ، حدیث ۲۵۲۹ ؛ النسائی ، حدیث ۳۱۰۵ ؛ ابن ماجہ ، حدیث ۲۷۸۲) تو اسے واپس بھیج دیتے ؛ بقیہ لشکر کو لے کر روانہ ہو جاتے ۔

روانگی کے دوران میں دشمن کی نقل و حرکت سے باخبر رکھنے کے لیے آدمی مقرر فرماتے (البخاری، ۲ : ۲۱۲ ؛ ابو داؤد ۳ : ۲۱ ، حدیث ۲۵۰۱)۔ اگر قریبی علاقے میں دشمن کے کسی جاسوس کی اطلاع ملتی تو اسے ڈھونڈھ نکالتے (البخاری ، ۳ : ۱۳۷ ؛ مسلم ، ۴ : ۱۹۴۱ ، حدیث ۲۴۹۴ ؛ ابو داؤد ، ۳ : ۱۱۰ ، حدیث ۲۶۵۰)۔

آپؐ جنگی معلومات کو نہایت خفیہ رکھتے یہاں تک کہ آپؐ کے انتہائی قریبی ساتھیوں کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ آپؐ کا ارادہ کدھر کا ہے (غزوہ تبوک اس کلیے سے مستثنٰی ہے)۔ راستے میں آپؐ تیز تیز چلنا پسند فرماتے (البخاری، ۲ : ۲۳۷)۔ رات کے آخری پہر میں سفر کرنا آپؐ کو زیادہ پسند تھا (ابو داؤد ، ۳ : ۷۹، حدیث ۲۶۰۳)۔ راستے میں اونٹوں اور دوسرے جانوروں کی گردنوں سے گھنٹیاں (جرس) اتروا دی جاتیں (البخاری، ۲ : ۳۸۳ ؛ ابو داؤد، ۳ : ۵۳ ، حدیث ۲۵۵۳)۔ مقصد یہ ہوتا تھا کہ دشمن آپؐ کے اچانک پہنچ جانے سے حواس باختہ ہو جائے اور یوں خونریزی کی نوبت نہ آنے پائے ۔

اگر کسی جگہ رات بسر کرنے کا فیصلہ ہوتا تو رات کے پہرے داروں نیز ارد گرد کے علاقے پر دشمن کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے نگران افراد کا تقرر فرماتے (البخاری ، ۲ : ۲۰۲ ؛ ابو داؤد ، ۳ : ۲۱، حدیث ۲۵۰۱)۔ رات راستے سے ہٹ کر بسر کی جاتی ۔ دشمن کے متوقع حملے کی وجہ سے حالت جنگ کے علاوہ پہرے دار دستوں کے (بعض اوقات الگ الگ) شعائر مقرر فرماتے ، تا کہ ایک دوسرے اور دوست دشمن کی شناخت میں آسانی رہے (ابو داؤد ، ۳ : ۷۳ ، حدیث ۲۵۹۵ ببعد)۔ حملے کے لیے ، رات ہوتی تو

صبح کا اور صبح ہوتی تو دوپہر ڈھلنے کا انتظار فرماتے (البخاری، ۲ : ۲۳۹ ؛ ابو داود، ۳ : ۱۹۳، حدیث ۲۶۵۵ ؛ الترمذی، حدیث ۱۶۱۲)۔ اگر اس بستی میں مسجد کے کوئی آثار دکھائی دیتے یا اذان کی آواز سنائی دیتی تو حملہ موقوف کر دیتے (البخاری، ۲ : ۲۳۵) اور اگر اس بستی میں سے اسلام کی کوئی علامت ظاہر نہ ہوتی تو مقررہ وقت پر بلند آواز سے اللہ اکبر کے نعرے کے ساتھ دشمن پر حملہ کر دیتے (ابو داود، ۳ : ۱۹۳، حدیث ۲۶۵۶)۔ حملہ کرنے سے قبل آپؐ یہ دعا پڑھتے : اللّٰھم مُنزِلَ الکتاب مُجرِیَ السَّحاب و ھازِمَ الاَحزاب اِھزِمھم و انصرنا علیھم (البخاری، ۲ : ۲۳۹)۔ نیز حملے سے قبل : اللّٰھمّ اَنتَ عضدی و نصیری، بک اَحُول و بک اصول و بک اُقاتل (ابو داود، ۳ : ۹۶، حدیث ۲۶۳۲) بھی پڑھنے کا معمول تھا۔ ان مختصر دعاؤں کے علاوہ نماز فجر میں قنوت نازلہ (جس سے متعلقہ تمام بحثوں کے لیے دیکھیے : ابن القیم : زاد المعاد، ۱ : ۲۷۲ تا ۲۸۲، مطبوعۃ کویت ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء) اور خطبات میں نصرت خداوندی کے حصول اور اسلام کی فتح و نصرت کے لیے لمبی لمبی دعائیں بھی ضرور مانگتے۔ اس وقت آپؐ پر ایسی رقت طاری ہوتی کہ صحابہؓ آپؐ پر ترس کھاتے (دیکھیے غزوۂ بدر، ابن ہشام)۔ خیبر پر حملے کے وقت : "اللہ اکبر خربت خیبر، و انّا اذا نزلنا بساحۃ قوم فساء صباح المنذرین" (البخاری، ۲ : ۲۳۹) آپؐ کی زبان پر جاری تھا۔ آپؐ صحابہ کرامؓ کو یہ تاکید فرمایا کرتے کہ اگرچہ دشمن تم پر حملہ کر چکا ہو، پھر بھی اگر وہ تمہارے حملے کے وقت کلمہ پڑھ لے تو اس سے تلوار فوراً اٹھا لی جائے (ابو داود، ۳ : ۱۰۴، حدیث ۲۶۴۴ ؛ مسلم، ۱ : ۹۵، حدیث ۹۵)۔ حملے سے قبل صحابہؓ کو مختلف مقامات پر تعینات فرماتے اور یہ تاکید کرتے کہ فتح ہو یا شکست تم اپنی جگہ ہرگز نہ چھوڑنا (ابو داود، ۳ : ۱۱۸، حدیث ۲۶۶۳)۔ جنگ کے میدان پر آپؐ کی نظر اس قدر حاوی ہوتی تھی کہ جنگ بہر صورت آپؐ کے مرتب کیے ہوئے نقشے کے مطابق ہی لڑی جاتی۔

جنگ کے دوران میں آفاق اور قدرتی مظاہر سے بھی مدد لیتے۔ عام طور پر آپؐ سورج کو اپنے پیچھے اور دشمن کو اپنے آگے رکھتے ؛ ہوا کے رخ سے حملہ کرتے تاکہ گرد و غبار مسلم سپاہیوں کے بجائے دشمن کو پریشان کرے (ابو داود، ۳ : ۱۶۳، حدیث ۲۶۵۵)۔ آپؐ صحابہؓ کو یہ تاکید فرماتے کہ تاک تاک کر تیر چلاؤ، (زیادہ اسلحہ ضائع نہ کرو) اور تلوار اس وقت نکالو جب دشمن تمہارے سر پر پہنچ جائے (ابو داود، ۳ : ۱۱۸، حدیث ۲۶۶۴)۔ جنگ کے دوران میں مسلم خواتین کو بھی آپؐ ہمراہ لاتے تاکہ وہ زخمیوں کو پانی پلائیں اور اگر ضرورت پڑے تو انہیں اٹھا کر مدینہ منورہ یا مرکز عسکر تک پہنچا آئیں (مسلم، ۳ : ۱۴۴۲ تا ۱۴۴۳، حدیث ۱۸۰۹ تا ۱۸۱۲ ؛ الترمذی ۴ : ۱۳۹، حدیث ۱۵۷۵ ؛ ابو داود، ۳ : ۷۴، حدیث ۲۵۳۱)، دوران جنگ میں آپؐ ہمیشہ دشمن کے متصل سب سے اگلی صفوں میں ہوتے اور حضرت علیؓ جیسے شجاع بھی جنگ کی شدت میں آپؐ کے زیر سایہ پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے (ابن الجوزی، الوفاء، باب شجاعۃ النبی) ؛ اسی طرح خطرات کے موقع پر آپؐ سب سے آگے ہوتے (البخاری، ۵۶/۱۱۶، ۲ : ۲۴۰)۔ آپؐ ہمیشہ بزدلی اور جبن سے پناہ مانگتے (البخاری، ۲ : ۲۰۷)۔ لڑائی میں اگر زور اور شدت آ جاتی اور آپؐ کی سواری مضطرب ہونے لگتی تو آپؐ سواری سے کود کر نیچے آ جاتے (البخاری، ۵۲/۹۴، ۳ : ۱۴۸ ؛ ابو داود، ۳ : ۱۱۴، حدیث ۲۶۵۸)۔ فتح ہوتی یا ہزیمت آپؐ اپنی جگہ سے ایک انچ پیچھے ہٹنا بھی پسند نہ فرماتے۔ لڑائی کے دوران میں اپنے ساتھیوں کے حوصلے بڑھاتے اور فرماتے : ارموا و

ارکبوا (ابو داؤد، ۳ : ۹۲، حدیث ۲۵۱۲) کبھی ارشاد ہوتا : یا خیل اللہ ارکبی (حوالۂ مذکور).

اگر خدا تعالٰی کی مدد سے آپؐ کو فتح ہو جاتی تو سجدۂ شکر بجا لاتے (الترمذی، ۴ : ۱۴۱، حدیث ۱۵۷۸؛ ابو داؤد، ۳ : ۲۱۶، حدیث ۲۷۷۴) اور اس جگہ قیام عدل و انصاف کے لیے کم از کم تین ایام تک قیام فرما رہتے (البخاری، کتاب الجہاد؛ الترمذی، ۴ : ۱۲۱، حدیث ۱۵۵۱؛ الدارمی، حدیث ۲۴۶۱؛ ابو داؤد، ۳ : ۱۴۴)۔ علاقے کا مناسب بند و بست کرکے اور علاقے میں کسی امیر کا تقرر فرما کر، مال غنیمت سمیت آپؐ بخیر و عافیت واپس تشریف لاتے، جہاں مدینہ کے لوگ شہر سے باہر نکل کر آپؐ کا استقبال کرتے (ابو داؤد، ۳ : ۲۱۹، حدیث ۲۷۷۹؛ البخاری، الجہاد، باب ۱۹۶؛ الترمذی، ۴ : ۲۱۸، حدیث ۱۷۱۸ [مزید تفصیلات کے لیے رک بہ غزوات نبوی]).

۹۔ معمولات ملاقات [دیکھیے شمائل و اخلاق نبوی : دوستوں سے آپؐ کا سلوک].

۱۰۔ معمولات عیادت و تعزیت [دیکھیے شمائل و اخلاق نبوی : بیماروں سے آپؐ کا سلوک].

۱۱۔ معمولات خطابت [دیکھیے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بحیثیت خطیب].

۱۲۔ معمولات تبلیغ و رسالت [دیکھیے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بحیثیت مبلّغ].

۱۳۔ معمولات عدل و انصاف [دیکھیے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بحیثیت مقنّن : شمائل و اخلاق].

(ج) شمائل و اخلاق نبویؐ: یوں تو اللہ تعالٰی کی طرف سے وقتاً فوقتاً مختلف علاقوں اور خطوں میں جو انبیائے کرامؑ بھی مبعوث ہوئے، وہ سب کے سب حسن اخلاق اور اعلٰی کردار کا جامع نمونہ تھے، جن سے بھٹکی ہوئی انسانیت کو ہمیشہ اخلاق اور اعلٰی کردار کی رہنمائی حاصل ہوتی رہی ہے : ارشاد باری ہے : اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ ھَدَی اللّٰہُ فَبِھُدٰھُمُ اقْتَدِہْ (۶ [الانعام] : ۹۰)، یعنی یہ انبیاؑ وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے ہدایت دی تھی تو تم انھی کی ہدایت کی پیروی کرو۔ انبیائے کرامؑ کے اعلٰی و ارفع اخلاق کے حامل ہونے کا مقصد یہ تھا کہ اہل دنیا ان کی پیروی سے اپنے معاشرے کو باھمی بھائی چارے اور الفت و محبت کے جذبوں سے معمور رکھیں : وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ (۴ [النسآء] : ۶۴)، یعنی ہم رسول اس لیے بھیجتے ہیں کہ اللہ کے حکم سے ان کی پیروی کی جائے : مزید فرمایا : قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ (۶۰ [الممتحنۃ]: ۴)، یعنی بےشک تمھارے لیے ابراھیمؑ اور ان کے رفقا عمدہ نمونہ ہیں۔ ان تمام انبیائے کرامؑ میں، سرور دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ آپؐ کی ذات اقدس پر تمام انبیا کے مکارم اخلاق کی عظیم الشان طریقے پر تکمیل ہو گئی۔ خود آپؐ کا ارشاد ہے : بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ (کنز العمال، ۲ : ۵، مطبوعہ حیدر آباد دکن) یا حسن الاخلاق (مالک : موطأ، باب حسن الخلق) یعنی میں اس لیے بھیجا گیا ہوں تاکہ دنیا میں مکارم اخلاق کی تکمیل کر دوں (نیز دیکھیے مشکوٰۃ المصابیح، ۳ : ۱۲۹، حدیث ۴۷۷۰)۔ قرآن کریم میں آپؐ کے حسن کردار کی تعریف میں کہا گیا : وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (۶۸ [القلم] : ۴)، یعنی اور بلاشبہ آپؐ عظیم اخلاق کے حامل ہیں۔ ”خلق عظیم“ کے جملے میں جو ظاہری اور معنوی محاسن جمیلہ پوشیدہ ہیں انھیں کی بنا پر دنیائے انسانیت کو بلا امتیاز رنگ و نسل آپؐ کی اتباع اور آپؐ کی پیروی کرنے کی تلقین کی گئی ہے : لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (۳۳ [الاحزاب] : ۲۱)، یعنی البتہ تمھارے لیے آپؐ کی ذات اقدس میں عمدہ نمونہ موجود ہے۔ صرف یہی نہیں

بلکہ آپؐ کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت قرار دیا گیا : مَنْ یُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (۴ [النساء] : ۸۰) ، یعنی جو شخص آپؐ کی فرمانبرداری کرے گا تو بے شک اس نے خدا کی فرمانبرداری کی ؛ دوسری جگہ آپؐ کی پیروی کرنے والوں کو اللہ کی طرف سے محبت اور بخشش کی نوید سنائی گئی : قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (۳ [آل عمرٰن] : ۳۱) ، یعنی اے پیغمبر ! آپؐ کہہ دیجیے کہ اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو خدا بھی تم سے محبت رکھے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔

آپؐ کے مکارم اخلاق اور عادات حسنہ کے اپنے ہی نہیں، بلکہ دشمن بھی مداح تھے ، قرآن کریم میں ہے : قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَ لٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (۶ [الانعام] : ۳۳)، یعنی بے شک ہمیں خوب معلوم ہے کہ ان (کافروں) کی باتیں آپؐ کو رنج پہنچاتی ہیں ، مگر یہ آپؐ کی تکذیب نہیں کرتے ، بلکہ یہ ظالم خدا کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔ بعثت مبارکہ سے پہلے آپؐ کو مکہ مکرمہ میں اسی بنا پر محمدؐ کے بجائے "الامین" اور "الصادق" کے نام سے پکارا جاتا تھا؛ یہی وجہ تھی کہ انہیں اپنی امانتیں سونپنے کے لیے آپؐ کے سوا کوئی شخص موزوں نظر نہ آتا تھا اور آپؐ کا گھر اچھا خاصا "دارالامانت" بنا ہوا تھا۔ اسی بنا پر آپؐ کو ہجرت [رک بآں] کے موقع پر حضرت علیؓ کو یہ امانتیں ان کے مالکوں تک پہنچانے کے لیے پیچھے چھوڑنا پڑا اور انھوں نے تین دن میں یہ امانتیں ان کے وارثوں کو پہنچائیں۔ ابو سفیان سے ان کے زمانۂ کفر میں قیصر روم نے آپؐ کے بارے میں پوچھا : کیا نبوت سے پہلے آپؐ نے کبھی جھوٹ بولا ہے ؟ ابو سفیانؓ نے کہا: نہیں؛ پھر اس نے پوچھا کہ کیا کبھی آپؐ نے کسی سے دھوکا کیا ہے ؟ ابو سفیان نے کہا : نہیں (البخاری ، ۱ : ۷ ، کتاب ۱ ، باب ۶)۔ حضرت ابو ذرؓ غفاری کے بھائی اُنَیسؓ نے آپؐ کو مکہ میں دعوت و تبلیغ میں مصروف دیکھا تو اپنے بھائی ابو ذرؓ کو جا کر بتلایا : میں نے دیکھا کہ آپؐ لوگوں کو اعلٰی اخلاق اپنانے کا سبق دیتے ہیں (مسلم ، ۴ : ۱۹۲۳ ، حدیث ۲۴۷۴ ؛ البخاری ، ۴ : ۱۲۱ ، الادب)۔ بیت اللہ کی تعمیرِ نو کے موقع پر جب اہل مکہ نے ایک دوسرے کے مقابلے میں تلواریں کھینچ لی تھیں تو یہ آپؐ ہی تھے جنھیں دیکھ کر قریش نے کہا تھا : ھذا الامین قد رضینا بما قضی بیننا (ابن سعد ، ۱ : ۱۴۶) یعنی یہ تو امین ہیں ، ہم ان کے فیصلے پر راضی ہیں۔

آپؐ کے کردار کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ جن لوگوں نے آپؐ کے ساتھ کچھ وقت گزارا ہے وہ سب آپؐ کے حسن کردار کے مدّاح ہیں۔ حضرت خدیجۃ الکبرٰیؓ (م ۱۰ نبوی ۳ ق ھ/۶۱۹ء) نے آپؐ کے ساتھ تقریباً ۲۵ سال بسر کیے؛ ان کا کہنا ہے کہ آپؐ صلہ رحمی کرنے والے ، مقروض کا بوجھ اٹھانے والے ، محتاج کو کما کر دینے والے ، مہمان نوازی کرنے والے اور مصائب میں لوگوں کے مددگار تھے (البخاری ، ۱ : ۵ ، کتاب بدء الوحی)۔ حضرت عائشہؓ کو تقریباً دس سال تک آپؐ کے انتہائی قریب رہ کر اخلاق عالیہ کے مشاہدے کا موقعہ ملا۔ ان سے کسی نے آپؐ کے اخلاق کی بابت پوچھا تو فرمایا : کیا تم قرآن نہیں پڑھتے ، کیونکہ قرآن ہی آپؐ کا اخلاق تھا (ابن سعد ، ۱ : ۳۶۴) ، یعنی جو کچھ قرآن نے کہا آپؐ نے سب سے پہلے خود اس پر عمل پیرا ہو کر دکھایا۔ ایک موقع پر انھوں نے آپؐ کے اخلاق حسنہ کی یوں تعریف کی : آپؐ تمام لوگوں میں سب سے عمدہ اخلاق والے تھے ؛ آپؐ نہ تو قصداً اور نہ بلا قصد فحش گوئی کرتے ؛ نہ بازاروں میں

شور و غوغا کرتے اور نہ ہی برائی کا بدلہ برائی سے دیتے، بلکہ آپؐ معاف کرنے اور درگزر کرنے والے تھے (الترمذی: شمائل، ص ۳۲۸؛ بمع شرح انوار محمدی؛ ابن الجوزی: الوفا، ۲: ۴۱۴)۔ ایک دوسری روایت میں انہی سے منقول ہے کہ کوئی شخص بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ اچھے اخلاق والا نہ تھا؛ آپؐ کے ساتھیوں میں سے جس کسی نے بھی آپؐ کو بلایا تو آپؐ نے اس کی آواز پر لبیک کہا (الوفا)۔ ایک اور روایت کے الفاظ یہ ہیں: آپؐ نے اپنے کسی خادم یا خادمہ کو کبھی نہیں مارا پیٹا (مسلم: الصحیح، الفضائل، حدیث ۲۳۲۸؛ ابن ماجہ: النکاح، حدیث ۱۹۸۴) اور نہ ہی اپنے پر کسی زیادتی کا بدلہ لیا بجز اس کے کوئی اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو نظر انداز کر دے؛ آپؐ کے سامنے کسی نے دو باتیں پیش نہیں فرمائیں، مگر آپؐ نے انہیں میں سے، اس کے حق میں آسان کو پسند کیا، بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو (الترمذی: شمائل، ص ۳۸۹؛ ابو داؤد، ۵: ۱۴۲، حدیث ۴۷۸۵ تا ۴۷۸۶؛ مسلم، ۴: ۱۸۱۳، الفضائل، حدیث ۲۳۲۷؛ الوفا، ۲: ۴۰۰)۔ حضرت انسؓ بن مالک نے دس سال تک شب و روز بطور خادم کے آپؐ کی خدمت میں گزارے، وہ فرماتے ہیں: آپؐ نے کبھی کسی کام کو، جو میں نے کیا ہو، یہ نہیں فرمایا کہ یہ تو نے کیوں کیا ہے اور نہ ہی جو کام میں نے نہ کیا ہو، اس کی بابت یہ فرمایا کہ یہ تو نے کیوں نہیں کیا (الترمذی: شمائل، ص ۳۸۲ ببعد؛ ابن سعد (الطبقات، ۱: ۳۸۲) نے حضرت انسؓ سے یہ روایت بھی نقل کی ہے: میں نے آپؐ کی دس سال تک خدمت کی ہے، میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ آپؐ (امتیازاً) اپنے ہم مجلس سے دور ہو کر بیٹھے ہوں، یا کسی مصافحہ کرنے والے سے آپؐ نے پہلے ہاتھ کھینچا ہو، تا آنکہ وہ خود ہی ہاتھ نہ کھینچ لیتا، اور یا کسی شخص نے آپؐ سے کھڑے ہو کر گفتگو کرنا چاہی ہو اور آپؐ پہلے پھر آئے ہوں، تا آنکہ وہ خود نہ پھر جائے . . . یا کسی شخص نے اپنا سر (سرگوشی کے لیے) آپؐ کے قریب کیا ہو، اور آپؐ نے اپنا سر اس کے اپنے سر کو ہٹانے سے پہلے ہٹا لیا ہو؛ ایک دوسری روایت میں انہیں سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نہ تو برا بھلا کہنے والے تھے؛ نہ فحش گو اور نہ لعن طعن کرنے والے، جب کسی کو عتاب کرنا ہوتا تو فرماتے: اسے کیا ہو گیا اس کی پیشانی خاک آلود ہو (کتاب مذکور، ۱: ۳۹۹)۔ حضرت علیؓ، جنہوں نے نبوت کے ۲۳ برس اور اس سے پہلے کا زمانہ بھی دیکھا تھا، آپؐ کے خلق عظیم کی بابت فرمایا کرتے تھے: آپؐ خندہ جبین (دائم البشر) نرم خو اور طبعاً مہربان تھے؛ آپؐ سخت مزاج اور تنگ دل قطعاً نہ تھے؛ کوئی برا اور فحش لفظ زبان سے نہ نکالتے، کسی کی عیب جوئی اور بدگوئی نہ کرتے؛ جو آپؐ کو پسند نہ ہوتا اس سے منہ پھیر لیتے؛ آپؐ نے اپنے نفس کو تین باتوں، یعنی فضول جھگڑا، تکبر اور بے معنی گفتگو سے الگ رکھا تھا؛ دوسروں کی بابت آپؐ تین باتوں، یعنی کسی کی مذمت کرنے، عیب گیری اور تجسس کرنے سے اجتناب فرماتے تھے اور وہی بات کہتے، جو انجام کے اعتبار سے، فائدہ مند ہوتی؛ لوگوں کے ساتھ ہنسنے اور تعجب کرنے میں شریک رہتے؛ مسافر اور اجنبی کی گفتگو اور سائل کے سوال کی درشتی کو نظر انداز کر دیتے . . . . آپؐ کو صرف سچی تعریف پسند تھی؛ کسی کی بات کو درمیان سے کاٹنے سے گریز فرماتے (الترمذی: شمائل، ص ۳۹۳ تا ۳۹۴)۔ مزید فرمایا: نہایت سخی، راست گو، نرم طبیعت اور خوش مزاج تھے۔ کوئی اگر اچانک دیکھتا تو ڈر جاتا، مگر جب وہ آپؐ سے معاملہ کرتا تو محبت کرنے لگ جاتا

(حوالۂ مذکور) ۔ ایک اور صحابی حضرت ہندؓ بن ابی ہالہ عرصۂ دراز تک آپؐ کی زیر کفالت رہے، فرماتے ہیں: آپؐ نرم طبیعت تھے؛ سخت گیر نہ تھے۔ کسی کی اہانت آپؐ کو کبھی منظور نہ ہوتی؛ معمولی معمولی باتوں میں لوگوں کا شکریہ ادا کرتے؛ کسی چیز کو برا نہ کہتے؛ کھانا، جیسا بھی ہوتا کھا لیتے، کبھی اسے برا نہ کہتے؛ کبھی ذاتی معاملے میں غصہ نہ کرتے، البتہ اگر کوئی امر حق میں مخالفت کرتا تو غضبناک ہو جاتے (قاضی عیاض: الشفا، ص ۷۰؛ ابن سعد، ۱: ۴۲۲ تا ۴۲۴).

حضرت عمروؓ بن العاص کو آپؐ کے انتہائی قریب رہ کر تقریباً چار سال تک اخلاق نبوی کے مشاہدے کا موقعہ ملا۔ وہ فرماتے ہیں کہ آپؐ عام لوگوں سے گفتگو، توجہ اور عمدہ برتاؤ کے ذریعے ایسا معاملہ فرماتے کہ اسے اپنے متعلق یہ گمان ہونے لگتا کہ اس کا درجہ آپؐ کے ہاں سب سے زیادہ ہے۔ وہ خود اپنی بابت فرماتے ہیں کہ مجھے بھی اپنے متعلق یہ گمان ہوا تھا؛ پھر ایک بار موقع ملا تو میں نے پوچھا: یا رسولؐ اللہ! کیا میں (آپؐ کی نظر میں) بہتر ہوں یا ابو بکرؓ؟ فرمایا: ابو بکرؓ؛ پھر عرض کیا: میں بہتر ہوں یا عمرؓ؟ فرمایا: عمرؓ؛ پھر پوچھا: کیا میں بہتر ہوں یا حضرت عثمانؓ؟ فرمایا: عثمانؓ۔ آپؐ نے حقیقت واضح کر کے میری غلط فہمی دور کر دی۔ مجھے افسوس ہوا کہ کاش میں نے آپؐ سے یہ سوال نہ پوچھا ہوتا (الترمذی: شمائل، ص ۳۸۲ تا ۳۸۳).

علمائے سیرت نے سیرت طیبہ کے محاسن کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے: (۱) فطری و جبلی اوصاف؛ (۲) اکتسابی محاسن (دیکھیے قاضی عیاض: الشفا بتعریف حقوق المصطفٰی، ۳۸ تا ۳۹، مطبوعہ بریلی، بدون تاریخ)۔ یہ تقسیم دوسرے انسانوں کی نسبت ہے، ورنہ آپؐ کے لیے ان میں کوئی تفاوت نہ تھا؛ آپؐ کے تمام اوصاف ذاتی اور فطری تھے اور وہ آپؐ کی جبلت و فطرت کا حصہ تھے (حوالۂ مذکور)۔ ان تمام کی تفصیلات تو یہاں نہیں دی جا سکتیں، البتہ ذیل میں ان میں سے چند ایک کی طرف مختصر اشارات پیش کیے جاتے ہیں:

(الف) فطری و جبلی اوصاف: (۱) جسمانی حسن و وجاہت: آپؐ کے مختلف دیکھنے والوں (مثلاً حضرت علیؓ، انسؓ بن مالک، ابو ہریرہؓ، براءؓ ابن عازب، ام المؤمنین حضرت عائشہؓ صدیقہ، ہندؓ ابن ابی ہالہ، ابو حذیفہؓ، جابرؓ بن سمرہ، ام معبدؓ، ابن عباسؓ، معرضؓ بن معیقب، ابو الطفیلؓ، العداءؓ بن خالد، حکیم بن حزام وغیرہ) کی یہ متفقہ شہادت ہے کہ قدرت نے آپؐ کو مردانہ حسن و وجاہت کا انتہائی حسین اور باوقار پیکر بنایا تھا۔ حضرت براءؓ بن عازب فرماتے ہیں: میں نے کسی زلف والے کو سرخ (دھاری دار) جوڑے میں آپؐ سے زیادہ خوبصورت نہیں دیکھا (الترمذی: شمائل، ص ۵، مع شرح انوار محمدی)۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہا کرتے تھے: میں نے آپؐ سے حسین کسی کو نہیں دیکھا، لگتا تھا سورج اپنے چہرے کے ساتھ متحرک ہے؛ جب آپؐ مسکراتے تو دیواریں کھل اٹھتی تھیں (القسطلانی: المواہب، ۴: ۷۳)۔ حضرت براءؓ بن عازب فرمایا کرتے تھے: آپؐ کا چہرہ تلوار کی طرح، (پھر فرمایا) نہیں، بلکہ چاند کی طرح چمکدار اور مدوّر تھا (البخاری، ۲: ۳۹۲، المناقب)۔ حضرت کعبؓ بن مالک فرماتے ہیں: جب آپؐ خوش ہوتے تو سچ مچ چاند کا ٹکڑا دکھائی دیتے (کتاب مذکور، ۲: ۳۹۳؛ قاضی عیاض: الشفا، ۳۰)۔ حضرت جابرؓ بن سمرہ کہتے ہیں: آپؐ کا چہرہ تلوار، پھر کہا نہیں، بلکہ سورج اور چاند کی طرح جگمگاتا تھا اور گولائی مائل تھا (القسطلانی، ۴: ۷۳)۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ لگتا تھا

آپؐ کا بدن چاندی سے بنایا گیا (ابن الجوزی: الوفا، ۲ : ۴۰۶)۔ اس بارے میں حضرت علیؓ کی روایت بڑی جامع ہے: وہ فرماتے ہیں: جس نے آپؐ کو اچانک دیکھا، وہ دہشت زدہ ہو گیا؛ جس نے کچھ عرصہ آپؐ کے ساتھ گزارا، وہ آپؐ سے محبت کرنے لگا۔ میں نے آپؐ جیسا شخص نہ کبھی پہلے دیکھا اور نہ کبھی بعد میں (الترمذی: شمائل، ۱۱، ۱۲؛ مشکوٰۃ، ۴ : ۱۳۶، حدیث ۵۷۹۱ نیز ص ۱۳۲ تا ۱۳۸؛ الزرقانی، ۴ : ۷۰ تا ۸۰)۔

(۲) نظافت طبع: اس مردانہ حسن و وجاہت کے ساتھ ساتھ، قدرت نے آپؐ کو اعلیٰ درجے کا نظیف الطبع اور نفاست پسند بنایا تھا، آپؐ فرمایا کرتے تھے: صفائی (تو) نصف ایمان ہے (مسلم، ۱ : ۲۰۳، حدیث ۲۲۳)؛ نیز فرمایا: دین کی بنیاد ہی صفائی پر ہے (قاضی عیاض: الشفا، ص ۴۰)۔ آپؐ کو فطری طور پر ظاہری و معنوی گندگی سے شدید کراہت تھی؛ اگرچہ ایک وضو [رک بآں] سے متعدد نمازیں پڑھی جا سکتی ہیں اور صحابہؓ کرام اکثر پڑھتے بھی تھے، مگر آپؐ اکثر ہر نماز کے لیے الگ وضو فرماتے (البخاری، ۱ : ۹۵، ۶۶، کتاب الوضوء)۔ فتح مکہ کے موقع پر ایک ہی وضو سے متعدد نمازیں پڑھیں تو صحابہؓ کرام کو تعجب ہوا؛ چنانچہ حضرت عمرؓ سے نہ رہا گیا اور آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا: یا رسول اللہ! آپؐ نے آج وہ کام کیا ہے جو آپؐ پہلے نہیں کیا کرتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: اے عمرؓ میں نے دانستہ ایسا کیا ہے (تاکہ اس کا جواز ثابت ہو سکے) (مسلم، ۱ : ۲۳۲، حدیث ۲۷۷)۔ ہر جمعے کو غسل کرنے کا معمول تھا۔ آپؐ نے صحابہؓ کرام کو بھی حکم دیا تھا کہ جمعہ کے دن غسل کر کے آیا کرو (البخاری، ۱ : ۲۲۴، کتاب الجمعۃ)۔ ایک روایت میں آپؐ نے اسے واجب قرار دیا (حوالۂ مذکور)۔ اس کے علاوہ آپؐ ہمیشہ مسواک کرنے، کلی اور استنشاق کرنے کا شدت سے اہتمام فرمایا کرتے تھے (کتاب مذکور، ص ۲۲۴ تا ۲۲۵)۔ جسم مبارک کو اگرچہ فطری طور پر خوشبو کی ضرورت نہ تھی، مگر اس کے باوجود خوشبو ہمیشہ آپؐ کے استعمال میں رہی: عموماً سکہ خوشبو، جو بقول علی جونپوری، بہت سی خوشبوؤں سے بنی ہوتی تھی، آپؐ کو پسند تھی (انوار محمدی شرح شمائل، ۲۲۶)۔ اگر کوئی خوشبو تحفہ دیتا تو اسے کبھی واپس نہ کرتے (حوالۂ مذکور)۔ آپؐ کو خوشبوؤں میں مشک، عنبر اور عود کی خوشبوئیں زیادہ محبوب تھیں (ابن الجوزی: الوفا، ۲ : ۵۹۲)۔ یوں فطری طور پر آپؐ کا جسم خوشبو کا منبع تھا اور آپؐ کے جسم اطہر سے ہمیشہ خوشبو کی لپٹیں نکلتی رہتی تھیں: حضرت انسؓ کے بقول: آپؐ کے جسم مبارک کی خوشبو مشک و عنبر سے بھی زیادہ فرحت بخش ہوتی تھی (البخاری، ۲ : ۳۹۳، المناقب)۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ آپؐ جس راستے سے گزرتے تو اس راستے میں دیر تک خوشبو کی مہک بکھری رہتی (قاضی عیاض: الشفا، ص ۳۱)۔ حضرت علیؓ نے جب آپؐ کے جسم مبارک کو (بعد از وصال) غسل دیا۔ فرماتے ہیں کہ آپؐ کے بدن پر ذرہ برابر بھی میل کچیل نہ تھی، تو میں نے کہا: آپؐ زندہ رہے تو بھی پاک اور طاہر رہے اور وصال ہوا تو بھی نظافت میں فرق نہ آیا (کتاب مذکور، ص ۳۲)۔ حضرت انسؓ کی والدہ ام سلیمؓ آپؐ کے پسینے کو ملا کر انتہائی نفیس خوشبو تیار کرتی تھیں (مسلم، ۴ : ۱۸۱۵، حدیث ۲۳۳۱؛ مشکوٰۃ، ۴ : ۱۳۴ تا ۱۳۵، حدیث ۵۷۸۸)۔ آپؐ کے کپڑے اگرچہ زیادہ قیمتی نہ ہوتے، مگر ہمیشہ صاف ستھرے ہوتے تھے۔ آپؐ کا تمام زندگی، قرآن کریم کے اس حکم: وَثِیَابَکَ فَطَهِّرْ (۷۴ [المدثر] : ۴)، یعنی اور اپنے کپڑوں کو صاف ستھرا رکھیے، پر عمل رہا۔

سر مبارک پر تیل لگا کر کنگھی کرنے کا معمول تھا۔ جسم کے زائد بال صاف کرنے کا آپؐ ہمیشہ اہتمام فرماتے رہے اور ان کی صفائی کو آپؐ فطرت سے تعبیر کرتے تھے (مسلم، ۴ : ۱۸۱۹، حدیث ۲۳۳؛ ابن الجوزی: الوفا، ۲ : ۵۸۵ تا ۵۹۱؛ الترمذی: شمائل، ۴۱ تا ۵۱)۔ اسی نظافت پسندی کا یہ نتیجہ تھا کہ دوسرے افراد کو بھی آپؐ صاف ستھرا دیکھنا چاہتے تھے۔ اگر کسی کو میلے کپڑے پہنے ہوئے دیکھتے تو فرماتے: اس سے یہ بھی نہیں ہوتا کہ کپڑے دھو لیا کرے (ابو داؤد، ۴ : ۳۳۳، حدیث ۴۰۶۲)۔ اگر کسی کے بالوں کو پراگندہ دیکھتے تو فرماتے: کیا یہ اپنے بالوں میں کنگھی نہیں کر سکتا (حوالۂ مذکور)۔ اگر کوئی اپنی وسعت کے مطابق مناسب کپڑے نہ پہنتا تو فرماتے: خدا نے جو نعمت دی ہے اس کا اثر بھی شکل و صورت میں نمایاں ہونا چاہیے (کتاب مذکور، حدیث ۴۰۶۳)۔

اسی نظافت طبع کا نتیجہ تھا کہ آپؐ کو بدبو دار اشیا، مثلاً کچے پیاز اور لہسن سے نفرت تھی اور فرمایا کرتے تھے: جو کوئی ان اشیا کو کھائے وہ مسجد میں نہ آئے (الترمذی، ۴ : ۲۶۱، حدیث ۱۸۰۶، ۱۸۰۷)۔ راستوں اور سایہ دار درختوں کے نیچے بول و براز کا عام رواج تھا؛ آپؐ نے ایسے سخت ناپسند کیا اور ایسا کرنے والوں پر لعنت فرمائی۔ آپؐ مسجد کی صفائی کا بہت زیادہ اہتمام فرماتے، وہاں ایک خاتون ام محجن جھاڑو دیا کرتی تھیں؛ مسجد میں بچوں اور ہوش و حواس سے عاری لوگوں کے جانے کی ممانعت فرما دی؛ خرید و فروخت کرنا بھی سخت منع تھا۔ گاہے بگاہے مسجد میں خوشبو کی انگیٹھیاں بھی جلائی جاتی تھیں ورت بہ مسجد

(۴) شرافت حسب و نسب: آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے حسب و نسب کے اعتبار سے نجیب الطرفین۔ شریف النسب پیدا کیا تھا: آپؐ کے ددھیال اور ننھیالی خاندان کا ہر فرد عزت و حشمت اور عفت و عصمت کا بہترین نمونہ تھا۔ آپؐ کے دونوں طرف کے آبا و اجداد فیاضی، نیک نامی اور سرداری میں مرجع انام رہے۔ آپؐ انبیا میں سے حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی اولاد، اہل عرب میں سے قریش اور قریش میں سے بنو ہاشم سے تعلق رکھتے ہیں [نیز دیکھیے اس سلسلے کا ابتدائی مقالہ]۔ حضرت ابو ہریرہؓ آپؐ سے نقل کرتے ہیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے بعد، سب سے بہتر زمانے میں مبعوث کیا ہے (قاضی عیاض: الشفا، ص ۴۷)۔ حضرت عباسؓ سے ایک دوسری روایت یوں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام مخلوق میں سب سے افضل مخلوق (انسانوں) میں پیدا کیا؛ بہترین زمانے میں مبعوث کیا؛ قبیلوں میں سے سب سے بہتر قبیلہ اور گھروں میں سب سے بہتر گھر میرے لیے انتخاب کیا؛ پس میں حسب و نسب کے اعتبار سے سب سے بہتر ہوں (البیہقی)۔

(۴) فہم و فراست: اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو فطری طور پر ذکاوت طبع، نظافت نفس اور جودت عقل و فکر میں بے مثال پیدا کیا تھا؛ گو آپؐ نے کسی سے پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا تھا، پھر بھی آپؐ تمام علوم و فنون کا سرچشمہ اور حقائق و معارف کا منبع تھے۔ جتنے علوم [رک بہ علم] آپؐ کی ذات بابرکات سے نکلے ہیں، دنیا میں آج تک کسی انسان کو اتنے علوم کی ترویج کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ آپؐ کی زبان مبارک سے نکلا ہوا ہر جملہ علمی دنیا میں نئی سے نئی راہ پیدا کرنے کا موجب بنا۔ آپؐ نے اپنی زندگی مبارک میں جو عظیم الشان ورثہ چھوڑا ہے چودہ صدیاں بیت جانے کے باوجود بھی کائنات کے لیے سرچشمہ ہدایت اور بنی نوع انسان کے لیے چراغ راہ ہے۔

[illegible] سیرت طیبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ ہر

معاملے کا بڑی گہرائی اور تفصیل سے جائزہ لیتے تھے اور پھر اس کے متعلق جو فیصلہ صادر فرماتے وہ اتنا درست اور صحیح ہوتا تھا کہ تمام دنیا کے انسان باہم مل کر بھی اس سے بہتر فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔ مختلف معاملات میں آپؐ کی اختیار کردہ حکمت عملی دور جدید میں کیے جانے والے سائنسی انکشافات سے بہت قریب تھی۔

(۵) جودت طبع: خالق کائنات کی طرف سے آپؐ کو جو لازوال اوصاف عطا ہوئے تھے، ان میں آپؐ کی طبیعت کی ذکاوت و فطانت بطور خاص قابل ذکر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپؐ کے تیز اور رسا ذہن کا ٹھیک ٹھیک بیان کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔

آپؐ نے تقریباً دس سال کے مختصر عرصے میں، جتنا عظیم الشان کام کر دکھایا وہ صدیوں میں بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس عرصے (از ۱۲ ربیع الاول ۱ تا ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ) میں آپؐ کو دشمنوں کے خلاف تقریباً چھوٹی بڑی ۷۴ مہمات سر کرنا پڑیں، ان میں سے ۲۷ (غزوات) میں آپؐ نے خود بہ نفس نفیس شرکت فرمائی اور بقیہ ۴۷ (سرایا) میں دیگر صحابہؓ کرام کو قیادت سونپی گئی (الواقدی، ۱: ۷ ببعد، طبع Marsden James، آکسفورڈ ۱۹۶۶ء)۔ ان تمام کی نقشہ سازی اور منصوبہ بندی کا کٹھن کام آپؐ نے خود ہی انجام دیا۔ سرایا میں گو عملاً آپؐ شریک نہ ہوتے تھے، مگر ان تمام کی ضروری منصوبہ بندی آپؐ ہی فرماتے تھے۔ ان میں سے ایک مہم بھی انجام اور مآل کے اعتبار سے ناکام نہیں ہوئی۔ ان جنگی کارروائیوں کے ساتھ ساتھ جن کی اوسط سالانہ ۷۴ نکلتی ہے، صحابہؓ کرام کی تعلیم و تربیت اور اسلامی حکومت کی تاسیس کا کام بھی جاری رہا۔ ان امور میں سے ہر امر اپنی جگہ اتنا اہم ہے کہ اگر اسے مدت مدید میں بھی حاصل کیا جاتا تو قابل قدر تھا۔

غزوات و سرایا میں اکثر و بیشتر آپؐ کی ذکاوت طبع کا اظہار ہوتا رہتا تھا [رک بہ غزوات]۔ آپؐ حیرت انگیز طریقے سے دشمن کی تعداد کا پتہ چلا لیتے تھے، مثلاً غزوہ بدر میں دشمن کی تعداد کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ اتفاقاً دشمن کے پانی پلانے والے (سقاء) پکڑے گئے۔ انہیں آپؐ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپؐ نے ان سے پوچھا: دشمن کے لشکر کی تعداد کیا ہے؟ انہوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ آپؐ نے فرمایا اچھا یہ بتاؤ کہ وہ کتنے اونٹ ذبح کرتے ہیں؟ انہوں نے کہا، ایک دن دس اور دوسرے دن ۹۔ آپؐ نے فرمایا کہ دشمن نو سو اور ہزار کے درمیان ہے (الواقدی، ص ۳ د)۔ غزوات و سرایا میں آپ نئی سے نئی حکمت عملی اختیار فرماتے، جس سے دشمن اپنی کثرت تعداد کے باوجود مغلوب ہو جاتا: غزوۂ بدر کے موقع پر صف بندی؛ غزوہ احد میں پہاڑ کا پشت پر رکھنا؛ غزوۂ احزاب میں خندق کھودنا؛ غزوہ خیبر میں صبح سویرے اچانک دشمن کے سر پر پہنچ کر اسے حواس باختہ کر دینا؛ فتح مکہ کے موقع پر ہر قسم کی تدابیر اختیار کر کے آخر دم تک دشمن کو حملے کی خبر تک نہ ہونے دینا اور غزوہ طائف میں دبابہ اور منجنیق کا استعمال اس کی روشن مثالیں ہیں [رک بہ غزوات؛ نیز خطاب: الرسول القائد، مطبوعہ قاہرہ]۔

صحابہؓ کرام کی عملی تربیت اور ذخیرۂ احادیث کی صورت میں آپؐ نے دنیا کے لیے جو لافانی ذخیرہ چھوڑا وہ بھی آپؐ کی فطانت و ذہانت کے عملی ثبوت کے لیے کافی ہے۔ احادیث مبارکہ کا ہر جملہ اور ہر لفظ علم و حکمت، مصالح دینی و دنیوی کا منبع اور مخزن ہے۔ احادیث کی ہر ترکیب بجائے خود اتنی جامع ہے کہ اس سے فصحائے عرب پر حیرت و استعجاب کی کیفیت طاری ہو جاتی اور وہ اسلام لانے میں تامل نہیں کرتے تھے۔

(۶) وحی ربانی سے ہمہ وقتی تعلق: ان سب سے

مستزاد اور آپؐ کی سب سے بڑی خصوصیت، آپؐ پر وحی ربانی بالخصوص قرآن کریم کا نزول مبارک ہے۔ آپؐ کی یہ خصوصیت آپؐ کو جملہ انسانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ یہ خصوصیت اکتساب و اجتہاد کا نتیجہ نہ تھی، بلکہ محض انعام و اکرام خداوندی کے ظہور کا ثمرہ تھی (دیکھیے ۳ [آل عمرٰن]: ۱۷۹ ؛ ۷۲ [الجن] : ۲۶ تا ۲۸)۔ اسی وحی و الہام کے ذریعے آپؐ اللہ تعالٰی کے ہاں سے اگلی پچھلی اور دور دراز کی خبروں سے آگاہی پاتے تھے (دیکھیے ۳ [آل عمرٰن] ۴۴ : ۳۸ [صٓ] : ۶۹)۔

(۷) عصمت نبوی: اس کے علاوہ آپؐ کی عظمتوں اور رفعتوں کا یہ بھی ایک نہایت شاندار پہلو ہے کہ آپؐ ہر چھوٹی بڑی انسانی و بشری خطا و نسیان اور ہر کبیرہ و صغیرہ لغزش سے مبرا اور منزہ تھے؛ یوں تو قرآن کریم میں متعدد جگہ آپؐ کی سب اگلی پچھلی خطاؤں کی معافی کا ذکر ہے (مثلاً ۴۸ [الفتح] : ۲)، مگر واقعۃً آپؐ کی سیرت میں ذنب اور گناہ نام کی کوئی بھی ایسی چیز نہیں پائی جاتی جو دوسرے انسانوں میں موجود ہوتی ہے۔

(ب) خصائل مکتسبہ: یعنی وہ عادات شریفہ جو ہر صاحب عقل و فکر یا، بقول قاضی عیاض، جمہور عقلا کے نزدیک مدح و ستائش کی مستحق ہیں اور جن کی بنا پر ان عادات کے حامل کو عزت و عظمت کا مستحق خیال کیا جاتا ہے۔ یہ عادات عموماً طویل محنت و ریاضت کے بعد حاصل ہوتی ہیں۔ ان عادات شریفہ کا مفہوم یہ ہے کہ قوای نفس افراط و تفریط کے بجائے اعتدال و اقتصاد کی راہ پر گامزن ہو جائیں اور ان میں میل اور کجی کا شائبہ بھی باقی نہ رہے (قاضی عیاض: الشفا، ص ۳۲)۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس لحاظ سے یہ امتیاز رکھتے ہیں کہ آپؐ کی ذات بابرکات میں وہ تمام اوصاف اور محاسن خلقی اور فطری طور پر جمع تھے، جن کو سلیم الطبع اور راست فکر لوگ عظمت و رفعت کا معیار سمجھتے ہیں۔ آپؐ کو ان عادات کے لیے نہ تو تربیت کی ضرورت پیش آئی اور نہ محنت و ریاضت کی، بلکہ خالق فطرت نے آپؐ کو انہیں اوصاف پر تخلیق کیا اور ان محاسن کو آپؐ کی طبیعت میں راسخ کر دیا (الزرقانی: شرح المواھب، ۴ : ۲۳۳ تا ۲۵۳ ببعد)۔ آپؐ خود فرمایا کرتے تھے: اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَادِیْبِیْ (الشفا، ص ۳۶، حاشیہ ۲۹)، یعنی اللہ تعالٰی نے میری تربیت خود فرمائی اور خوب فرمائی ہے۔ یہ اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ زمانۂ قبل از بعثت میں بھی آپؐ محاسن و کمالات انسانیہ کا پیکر تھے؛ آپؐ نے اس وقت بھی کوئی کام ایسا نہیں کیا جسے غلط کہا جا سکتا ہو، آپؐ کا ارشاد تھا: لمّا نشأتُ بُغِضتْ الیّ الاوثانُ و بغض الیّ الشعراء و لم اُھم بشیء مما کانت الجاھلیۃ تفعلہٗ (کتاب مذکور، ص ۴۴)، یعنی مجھے پیدایشی طور پر بتوں اور ان کی پوجا نیز شعرا سے نفرت تھی اور میں نے اس وقت بھی کسی ایسے کام کا ارادہ نہیں کیا جو زمانۂ جاہلیت میں لوگ کیا کرتے تھے۔

شمائل و عادات کے سلسلے میں ایک لفظ سنت [رکَ بآں] کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا، جس کا لفظی مفہوم تو راستہ اور طریقہ ہے، مگر اصطلاحی طور پر اس سے سیرت طیّبہ کے وہ افعال حسنہ مراد ہوتے ہیں، جو آپؐ کی تمام زندگی میں التزاماً پائے جانے کی وجہ سے گویا آپؐ کی فطرت ثانیہ بن چکے تھے اور یہ عادات و خصوصیات بغیر تکلف اور تصنّع کے آپؐ کی طبیعت مبارکہ سے صادر ہونے کی بنا پر منہاج نبوی کا مرتبہ حاصل کر چکی تھیں۔ یہ نہیں کہ کبھی تو ان کا صدور ہوا اور کبھی نہیں ہوا۔ آپؐ کو ہمیشہ ایسی عادات ناپسند رہیں جو کبھی تو ہوں اور کبھی نہ ہوں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں آپؐ کے نزدیک سب سے اچھا عمل وہ تھا جس پر مداوست ہو (البخاری،

۳ : ۲۲۲)؛ آپؐ فرمایا کرتے تھے: خدا کو تمہارا وہ عمل زیادہ پسند ہے جس پر ہمیشگی اختیار کی جائے خواہ وہ عمل تھوڑا ہی کیوں نہ ہو (کتاب مذکور، ص ۲۲۳)۔ اسی بنا پر آپؐ نے جو کام بھی کیا، ہمیشہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ کی سیرت طیبہ میں ایک جیسے واقعات کی کثرت ملتی ہے، حتّٰی کہ ایک ایک وصف پر مستقل کتب لکھی گئی ہیں اور محدّثین نے اپنی کتب کے کئی کئی ابواب قائم کیے ہیں۔ اس لحاظ سے شمائل نبوی کو امتیازی خصوصیت حاصل ہے۔

آپؐ کی ایسی عادات مبارکہ کو ابتداءً دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: (الف) شخصی اوصاف؛ (ب) معاملاتی اوصاف۔

(۱) شخصی اوصاف: اوصاف ذاتیہ کی یوں تو فہرست بہت طویل ہے اور واقعہ یہ ہے کہ کوئی شخص ان کی تعریف و تکریم کا صحیح حق ادا نہیں کر سکتا؛ تاہم مختصراً چند ایک خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ آپؐ کے کردار کی عظمت کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

(۱) عزم و استقلال: آپؐ پیکر عزم و استقلال تھے؛ اسی بنا پر آپؐ کو اولوالعزم پیغمبروں میں شمار کیا گیا (۴۶ [الاحقاف]: ۳۵)۔ اس امر کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ نبوت کے بار عظیم کو جب آپؐ لے کر اٹھے تو ایک متنفس بھی آپؐ کے ہمراہ نہ تھا، مگر آپؐ کو اپنی منزل کی طرف بڑھنے میں قطعاً کوئی تذبذب نہ ہوا۔ زندگی مبارک میں کئی مواقع ایسے آئے جب آپؐ کے آہنی اور غیر متزلزل عزم و استقلال کا مظاہرہ ہوا۔ ایک موقع پر ابو طالب نے مشرکین کی مخالفت بڑھ جانے کی وجہ سے آپؐ کو مشورہ دیا کہ بت پرستی کی مذمت چھوڑ دیں۔ آپؐ نے اشکبار آنکھوں سے فرمایا: بخدا! اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے پر سورج بھی لا کر رکھ دیں تو بھی میں دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت سے نہیں رکوں گا تاآنکہ یہ فریضۂ تبلیغ و رسالت پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے یا میرا دم نکل جائے (ابن ہشام: سیرۃ، ۱ : ۲۸۳ تا ۲۸۵)۔ ایک موقع پر بعض صحابہؓ نے دشمنوں کی عداوت اور ایذا رسانی سے تنگ آ کر آپؐ سے دعا کی درخواست کی تو آپؐ نے سختی سے جواب دیا: تم سے پہلے جو لوگ گزر چکے ہیں ان کے جسموں پر آہنی کنگھیاں چلائی جاتی تھیں اور کھال کو جسم سے الگ کر دیا جاتا تھا، مگر وہ مذہب سے برگشتہ نہ ہوئے۔ بخدا! دین اسلام اپنے منتہائے کمال کو پہنچ کر رہے گا تاآنکہ صنعاء سے حضرموت تک جانے والا مسافر خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرے گا (البخاری، ۹ ۸/۱، ۳ : ۳۳۳؛ ابو داؤد، ۳ : ۱۰۸، حدیث ۲۶۴۹)۔

آپؐ کے عزم و استقلال کا اظہار اس امر سے بخوبی ہوتا ہے کہ آپؐ نے دشمنوں کے خلاف جتنے بھی معرکے لڑے ان تمام میں (بجز غزوۂ حنین کے) آپؐ کے مقابلے میں دشمن کی طاقت کئی گنا ہوتی تھی، مگر آپؐ کو ایک لمحے کے لیے بھی اپنے ارادے میں تردد محسوس نہیں ہوا؛ غزوۂ احد میں بعض نوجوانوں کے مشورے پر آپؐ کی مرضی کے خلاف، مدینہ منورہ سے باہر نکل کر دفاع کرنے کا پروگرام بنا۔ آپؐ یہ سن کر گھر میں تشریف لے گئے اور جنگی ہتھیار پہن کر باہر تشریف لائے؛ اب نوجوان صحابہؓ کو اپنے اصرار پر ندامت ہوئی اور آپؐ سے عرض کیا کہ کیوں نہ آپؐ کی مرضی کے مطابق مدینہ میں رہ کر دفاع کیا جائے؟ آپؐ نے فرمایا: کہ نبی جب زرہ پہن لیتا ہے تو پھر اس وقت تک زرہ نہیں اتارتا، جب تک اس کے اور اس کے دشمنوں کے درمیان فیصلہ نہیں ہو جاتا (ابن سعد، ۲ : ۳۸ ببعد)۔ غزوۂ حنین میں بھی آپؐ کے عزم و استقلال نے جنگ کا پانسہ پلٹنے میں اہم کردار ادا کیا۔

ایک موقع پر ایک دشمن نے آپؐ کو تنہا ایک درخت تلے استراحت فرماتے دیکھا تو تلوار سونت

لی اور کہا: اے محمدؐ! اب تم کو میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ۔ یہ جواب سن کر بدوی لرز گیا اور تلوار اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ آپؐ نے اسے معاف کر دیا (البخاری، ۲: ۲۲۶)۔

(۲) شجاعت: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پیکر شجاعت و بسالت تھے۔ زندگی مبارک کے ایک ایک واقعے سے آپؐ کی شجاعت اور جوانمردی کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ آپؐ نے مادی اور ظاہری اسباب کی کمی، بلکہ بعض اوقات فقدان کے باوجود، اپنے مخالفین کی نہ صرف تدبیروں کو ناکام بنایا، بلکہ ہر معرکے میں ان پر غلبہ بھی حاصل کیا۔ زندگی مبارک میں جتنے بھی بڑے معرکے ہوئے [بجز موتہ کے] آپؐ نے ان میں خود بہ نفس نفیس شرکت فرمائی۔ ان جنگوں میں سے ایک جنگ میں بھی آپؐ نے اپنی جگہ سے ایک انچ بھی قدم پیچھے نہیں ہٹایا۔ ان معرکوں میں حضرت علیؓ کے بقول آپ ہمیشہ آگے آگے ہوتے اور جب گھمسان کا رن پڑتا تو حضرت علیؓ جیسے بہادروں کو بھی آپؐ کے پہلو میں پناہ لینا پڑتی تھی (ابن الجوزی، ۲: ۴۴۴؛ احمد بن حنبل: مسند، ۱: ۱۲۶)۔ غزوۂ بدر میں، جو حضرت علیؓ کے بقول بہت ہی سخت معرکہ تھا صحابہؓ بار بار آپؐ کی آڑ میں پناہ لیتے، مگر آپؐ دشمن کے سب سے زیادہ قریب رہے (ابن الجوزی)۔ غزوہ حنین میں جب اچانک بنو ہوازن کے تیر اندازوں کی تیروں سے ہراول کے اور پھر پیچھے آنے والے لوگوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور پلک جھپکنے میں میدان صاف ہو گیا تو میدان میں بجز آپؐ کے اور چند صحابہؓ کے کوئی موجود نہ رہا۔ آپؐ اپنے خچر کو آگے بڑھانا چاہتے تھے، مگر جاں نثار مانع ہوتے تھے؛ ادھر دشمن نے اپنے تیروں کا رخ آپؐ کی طرف پھیر دیا تھا، مگر آپؐ کے پائے ثبات میں ذرا سی لغزش نہ آئی۔ آپؐ اپنے خچر سے کود کر نیچے اتر آئے اور فرمایا: انا النبی لا کذب، انا ابن عبدالمطلب (مسلم، ۳: ۱۳۹۸، حدیث ۱۷۷۵؛ قاضی عیاض: الشفاء، ص ۷۰ و بعد)، یعنی میں خدا کا سچا رسول اور عبدالمطلب (جیسے شجاع) کا پوتا ہوں۔ آپؐ کے ثابت قدم رہنے کی وجہ سے اہل اسلام نے یہ ہارا ہوا معرکہ دوبارہ جیت لیا۔ حضرت انسؓ فرمایا کرتے تھے: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سب سے زیادہ خوبصورت (خوب سیرت) اور سب سے زیادہ شجاع اور سخی تھے۔ ایک دفعہ مدینہ منورہ میں یہ افواہ پھیلی کہ کسی (ناگہانی) دشمن نے حملہ کر دیا ہے، جس سے لوگوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ بعض لوگ تحقیق احوال کے لیے اس طرف گئے، دیکھا تو رسالت مآبؐ گلے میں تلوار ڈالے حضرت طلحہؓ کے گھوڑے پر بغیر زین کے سوار ہیں اور واپس آ رہے ہیں اور فرما رہے ہیں: نہ ڈرو کوئی خطرہ نہیں (ابو داؤد، ۵: ۲۶۳ حدیث ۴۹۸۸؛ مسلم، ۴: ۱۸۰۲، حدیث ۲۳۰۷)۔ جنگوں میں وہی بہادر سمجھا جاتا تھا جو آپؐ کے قریب تر رہتا؛ کیونکہ آپؐ دشمن کے نزدیک ہوتے تھے (الشفا: ص ۱۰۵)۔ آپؐ صرف شجاع ہی نہیں بلکہ شجاع ساز بھی تھے! آپؐ نے ہزاروں صحابہؓ میں اپنے ارشادات کے ذریعے شجاعت اور بہادری کے ایسے اوصاف پیدا کر دیے کہ وہ کسی بڑی سے بڑی طاقت سے مرعوب نہ ہوتے تھے۔ آپؐ کا ارشاد تھا: الجنۃ تحت ظلال السیوف، یعنی جنت تلواروں کی چھاؤں میں ہے؛ نیز فرماتے تھے: والوددت انی اقتل فی سبیل اللہ ثم احیی فاقتل ثم احیی فاقتل ثم احیی فاقتل (البخاری، ۳: ۲۰۱، الجہاد)، یعنی میں چاہتا ہوں کہ میں راہ خدا میں شہید ہو جاؤں؛ پھر زندگی ملے، پھر شہید کر دیا جاؤں، پھر زندگی عطا ہو! پھر شہادت سے ہم کنار ہوں۔

آپؐ کے یہ ارشادات عسکر اسلام کے حوصلے بلند کرنے اور ان کی ہمت بڑھانے کا موجب بنتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپؐ کے ساتھیوں نے کسی

معرکے میں بھی میدان جنگ سے منہ نہیں پھیرا۔ غلط فہمی یا دشمن کے اچانک حملے کی وجہ سے اگر کبھی بھگدڑ مچی بھی تو جاں نثاران اسلام دوبارہ پہلے سے بھی زیادہ جوش اور ولولے سے آپؐ کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے اور اس طرح جنگ کا پانسہ پلٹ گیا [نیز رک بہ غزوات]۔

(۳) حزم و احتیاط: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم انتہائی شجاع اور جملہ اوصاف سے متصف ہونے کے باوجود، حزم و احتیاط کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھتے تھے۔ آپؐ جو فیصلہ کرتے، یا جو قدم بھی اٹھاتے، اسے ہر اعتبار سے سوچ سمجھ کر اٹھاتے اور اس میں حزم و احتیاط کو ہر صورت میں پیش نظر رکھتے۔ غزوۂ بدر میں مدینہ منورہ کو دشمن کی یلغار سے محفوظ رکھنے کے لیے باہر نکل کر دشمن کا مقابلہ کرنا، غزوۂ احد میں دوران جنگ پہاڑ کو اپنی پشت کی طرف رکھنا، درمیانی درے پر پچاس افراد کو بطور تیر انداز مقرر فرمانا، غزوۂ احزاب میں خندق کھودنا، اس پر جگہ جگہ حفاظت کی غرض سے عسکری دستوں کا تعینات کرنا وغیرہ آپؐ کے حزم و احتیاط کی روشن مثالیں ہیں۔ اگر یہ اوصاف (حزم و احتیاط) آپؐ کو کسی شخص میں دکھائی دیتے تو آپؐ اس کی تعریف فرماتے۔ ایک مرتبہ اشجّ عبدالقیس کو فرمایا: تم میں دو ایسی خصوصیات ہیں جنھیں خدا پسند کرتا ہے اور وہ ہیں بردباری اور عاقبت اندیشی (مسلم، ١ : ٤٩، حدیث ١٧)۔ آپؐ مزید فرمایا کرتے تھے: عجلت شیطانی امر ہے اور عاقبت اندیشی خدا کی طرف سے ہے (مشکوٰۃ، ٢ : ٦٢٥، حدیث ٥٠٥٥)۔ ایک شخص نے کسی نصیحت کی درخواست کی تو فرمایا ہر معاملے کو سوچ سمجھ کر (تدبیر سے) اختیار کر: اگر اس کے انجام میں بھلائی نظر آئے تو پھر کر گزرو (کتاب مذکور، حدیث ٥٠٥٦)۔ مزید فرمایا: تاخیر کرنا تمام کاموں میں بہتر ہوتا ہے، بجز آخرت کے امور کے (حدیث ٥٠٥٨)۔ ایک دوسری حدیث میں آپؐ نے میانہ روی اور سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے، نیز خاموشی اختیار کرنے کو نبوت کا چوبیسواں حصہ قرار دیا (الترمذی، مشکوٰۃ)۔ حضرت ابو ذرؓ سے تدبیر کی اہمیت بیان کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا: لیس العقل کالتدبیر، یعنی تدبیر جیسی کوئی عقل نہیں (مشکوٰۃ، ٢ : ٦٢٧، حدیث ٥٠٦٦)۔ ایک اور روایت میں ہے: مؤمن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جا سکتا (مسلم، ٤ : ٢٢٩٥، حدیث ٢٩٩٨)۔

آپؐ خود ہر کام سوچ سمجھ کر اور کامل حزم و احتیاط سے انجام دیتے تھے، جو مسئلہ آپؐ کے سامنے ہوتا آپؐ اس کے ہر پہلو پر غور و خوض فرماتے، پھر اس کے مطابق عمل کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ کے فیصلوں کی صداقت مسلمہ رہی ہے۔

(۴) عدل و انصاف: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم حکم خداوندی: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (١٦ [النحل] : ٩٠)، یعنی خدا تعالیٰ تم کو عدل و احسان کا حکم دیتا ہے، کے مطابق پیکر عدل و انصاف تھے۔ آپؐ نے تمام زندگی ظلم و جہالت کے مٹانے اور عدل و انصاف کے عام کرنے کے لیے جد و جہد جاری رکھی (دیکھیے البخاری، کتاب المظالم)۔ ظلم و جہالت سے آپؐ کو کس قدر نفرت تھی اس کا اندازہ اس دعا سے لگایا جا سکتا ہے جو آپؐ صبح و شام مانگا کرتے تھے: اللّٰھم انی اعوذبک ان اضل او اضل او ازلّ او ازلّ او اظلم او اظلم او اجھل او یجھل علیّ (ابو داؤد ٥ : ٣٢٧، حدیث ٥٠٩٤؛ ابن ماجہ، (الدعوات) حدیث ٣٨٨٤)، یعنی اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں کہ صحیح راہ سے بھٹکوں یا بھٹکا دیا جاؤں یا پھسلوں یا پھسلا دیا جاؤں، یا کسی پر ظلم کروں یا ظلم کیا جاؤں۔ آپؐ کے عدل و انصاف کا بتقاضائے ارشاد باری: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ھُوَ

اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (۵ [المآئدة] : ۸)، یعنی کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس پر برانگیختہ نہ کرے کہ تم ان سے نا انصافی کرو، ہر صورت میں انصاف کرو، یہی تقوٰی کے زیادہ قریب ہے۔ یہ عالم تھا کہ اس میں اپنے اور بیگانے، دوست اور دشمن کی کوئی تمیز نہ تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ظلم سے بہرحال روک دیا؛ فرمایا: اُنْصُرْ اَخَاکَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُومًا (البخاری، ۲ : ۸۹)، یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ اس کے مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ ظالم کو اس کے ظلم سے روکنا ہی اس کی مدد کرنا ہے (البخاری، ۲ : ۹۸)۔ آپؐ جن لوگوں کو حکمران بنا کر بھیجتے، انھیں فرماتے: اِتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُومِ فَاِنَّهٗ لَیْسَ بَیْنَهَا وَ بَیْنَ اللّٰهِ حِجَابٌ (کتاب مذکور، ص ۸۹) یعنی مظلوم کی بد دعا سے بچنا، کیونکہ اس کے اور خدا کے مابین کوئی حجاب نہیں ہوتا۔ ارشاد باری تعالٰی ہے: وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰی وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ (۵ [المآئدة] : ۲)، یعنی ایک دوسرے کی نیکی اور تقوٰی کے معاملے میں تو مدد کرو، مگر گناہ اور زیادتی میں تعاون نہ کرو۔

آپؐ عدل و انصاف میں کسی چھوٹے بڑے کی تمیز نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک عورت فاطمہ مخزومیہ نے چوری کی۔ خاندان کے لوگوں نے بے عزتی کے پیش نظر حضرت اُسامہؓ سے، جو آپؐ کے لاڈلے (حِبّ) تھے، سفارش چاہی۔ حضرت اسامہؓ نے سفارش کے لیے جونہی بات شروع کی تو آپؐ کے چہرے کی رنگت بدل گئی اور فرمایا: اے اسامہ! کیا اللہ کے حق میں تو سفارش کرتا ہے؟ انھوں نے معافی مانگی۔ پھر آپؐ نے خطبہ دیا اور فرمایا: تم سے پہلے لوگ اسی بنا پر ہلاک ہوگئے کہ جب قوم کا کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمزور شخص اس کا مرتکب ہوتا تو اس پر حد جاری کرتے۔ بخدا! اگر فاطمہؓ بنت محمدؐ بھی چوری کرتی تو میں اس پر بھی حد جاری کر دیتا۔ پھر آپؐ نے اس عورت کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا (مسلم، ۳ : ۱۳۱۵، حدیث ۱۶۸۸؛ الترمذی، ۴ : ۳۷ تا ۳۸، حدیث ۱۴۳۰)۔ اسی بنا پر آپؐ نے قبیلہ بنو نضیر اور بنو قریظہ کے خونبہا میں معادلت (= برابری) قائم فرمائی، اس سے پہلے اگر کوئی نضیری (بڑی قوم کا) کسی قریظی (چھوٹی قوم کے کسی شخص) کو ہلاک کر دیتا تو نصف دیت ادا کی جاتی اور برعکس صورت میں پوری دیت لازم سمجھی جاتی۔ آپؐ نے اس نا انصافی کو ختم کیا۔ (ابو داوُد، ۳ : ۱۷، حدیث ۳۵۹۱؛ النسائی، حدیث ۴۷۳۲)۔ یہود میں بھی اسی طرح اگر کوئی معزز آدمی زنا کرتا تو اسے معمولی سزا دے کر چھوڑ دیا جاتا اور غریب آدمی پر حد جاری کی جاتی۔ آپؐ نے اس عدم مساوات کو بھی ختم کیا (مسلم ۳ : ۱۳۲۶، حدیث ۱۶۹۹ تا ۱۷۰۰)۔

انصاف کرنے میں آپؐ کے نزدیک مسلم اور غیر مسلم اپنے اور بیگانے میں کوئی فرق نہ تھا۔ متعدد مرتبہ آپؐ نے مسلمان کے خلاف غیر مسلم کے حق میں فیصلہ دیا۔ ایک یہودی کا ایک مسلمان پر قرض تھا۔ غزوۂ خیبر کے دوران میں اس نے تقاضا شروع کر دیا۔ مسلمان نے مہلت مانگی، مگر یہودی نے مہلت دینے سے انکار کیا۔ اس پر آپؐ نے مقروض کو فوری ادائی کا حکم دیا اور تعمیل نہ ہونے کی صورت میں قرض خواہ کو اس کے بعض کپڑے لے جانے کی بھی اجازت دی (احمد بن حنبل: مسند، ۳ : ۴۲۳)۔ فتح خیبر کے بعد آپؐ نے کھیتی باڑی کا سارا کام یہود کے سپرد کر دیا۔ یہودیوں نے آپؐ سے شکایت کی کہ مسلمان مساقات کے بعد بھی ان کی فصلوں اور سبزیوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اس پر آپؐ نے حکم دیا کہ معاہد قوم کا مال مسلمان کے لیے حلال نہیں ہے۔ اس کے بعد مسلمان سبزی وغیرہ قیمتاً خریدنے لگے (الواقدی، ۲ : ۶۹۱)۔

عدل و انصاف کی حکمرانی کے لیے آپؐ خود بھی ہمیشہ جواب دہی کے لیے آمادہ رہتے۔ اگر آپؐ کے کسی سلوک سے (نادانستہ طور پر) کسی شخص کو ایذا پہنچتی تو آپؐ اسے اپنا بدلہ لینے کی فراخ دلانہ پیش کش فرماتے۔ ایک مرتبہ مال غنیمت کی تقسیم کے دوران میں ایک شخص کے چہرے پر، جو اپنا حصہ لینے کے لیے آپؐ پر جھک آیا تھا، آپؐ کے نیزے کا زخم لگ گیا۔ آپؐ نے فوراً اسے بدلہ لینے کی پیش کش کی، مگر اس نے معاف کر دیا (ابو داؤد، ۳ : ۷۶۳، حدیث ۴۵۳۶؛ النسائی، ۳۷۷۴)۔ ایک دوسرے موقع پر آپؐ نے ایک شخص کی کمر پر، (جو ادھر آدھر کی باتیں کرکے لوگوں کو ہنسا رہا تھا) ٹھوکا دیا، جس پر اس نے بدلہ لینے کی خواہش ظاہر کی۔ آپؐ نے اپنی کمر آگے کر دی، اس نے کہا: میں برہنہ تن تھا جب کہ آپؐ قمیص پہنے ہوئے ہیں۔ آپؐ نے قمیص اٹھا دی۔ اس نے آگے بڑھ کر مہر نبوت کو چوما اور کہا: میں تو صرف یہ چاہتا تھا (ابو داؤد، ۵ : ۳۹۴، حدیث ۵۲۲۴)۔ اسی طرح یہودی زید بن سعیہ نے نہ صرف قبل از وقت اپنے قرض کی واپسی کا مطالبہ کیا بلکہ نہایت سختی اور درشتی سے آپؐ کے خاندان کی بھی ہتک کی۔ حضرت عمرؓ نے اس کو سزا دینا چاہی، مگر آپؐ نے فرمایا: اے عمرؓ! تمھیں چاہیے تھا کہ اسے حسن تقاضا کی تلقین کرتے اور مجھے حسن ادا کی۔ پھر اس کو نہ صرف معاف کیا، بلکہ اس کے حصے سے زیادہ اسے معاوضہ عنایت فرمایا (ابن الجوزی، ۲ : ۴۲۵)۔ وصال مبارک سے چند روز قبل آپؐ نے مجمع عام میں اعلان کیا کہ جس کسی کا مجھ پر کوئی حق ہو یا تو وہ وصول کرے اور یا پھر معاف کر دے۔ ایک شخص نے چند درہموں کا مطالبہ کیا، جو فوراً ادا کر دیے گئے (احمد بن حنبل: مسند، ۱ : ۲۰۹، حدیث ۱۷۸۴؛ آپؐ کے عدل و انصاف پر مبنی فیصلوں کے لیے دیکھیے ابن القیم: زاد المعاد، جلد ۵، مطبوعہ کویت، ۱۳۹۹، ص ۵ تا ۸۳۴)۔

(۵) فیاضی و سخاوت: حضرت عبداللہ بن عباسؓ آپؐ کی سخاوت کا حال بیان کرتے ہوئے آپؐ کو چلنے والی ہوا (الرّیح المرسلۃ) سے بھی زیادہ سخی قرار دیتے ہیں، بالخصوص رمضان المبارک میں (البخاری، ۱ : ۶ تا ۷، باب کیف کان بدؤ الوحی؛ مسلم، ۴ : ۱۸۰۳، حدیث ۲۳۰۸)۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ آپؐ سے جب بھی کچھ مانگا گیا آپؐ نے کبھی انکار نہیں کیا (مسلم، ۴ : ۱۸۰۵، حدیث ۲۳۱۱؛ البخاری، کتاب المناقب)۔ غزوۂ حنین میں تقریباً چھے ہزار مرد و زن گرفتار ہوئے، جو عرب کے قدیم دستور کے مطابق ہمیشہ کے لیے لونڈی غلام بنائے جا سکتے تھے، مگر آپؐ نے ان تمام کو، ان کی قوم کے بقیہ لوگوں کے مطالبے پر، باعزت طور پر رہا فرما دیا (ابن سعد، الطبقات، ۱۵۳ تا ۱۵۵)۔ اس کے علاوہ اس موقع پر جو مال غنیمت ہاتھ لگا تھا اس میں چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی شامل تھی۔ آپؐ نے یہ تمام مال لوگوں میں تقسیم فرما دیا (الواقدی: المغازی، ۳ : ۹۴۳ و بعد)۔ اس موقع پر آپؐ نے بہت سے لوگوں کو، جن میں بعض نو مسلم اور بعض غیر مسلم بھی شامل تھے، سو سو اونٹ عنایت فرمائے۔ صفوان بن امیہ کو تین سو اونٹ مرحمت فرمائے (مسلم، ۴ : ۱۸۰۶، حدیث ۲۳۱۳؛ قاضی عیاض: الشفاء، ص ۹۴)۔ ایک مرتبہ ایک شخص کو آپؐ نے دو پہاڑوں کے درمیان پھیلا ہوا ریوڑ عنایت فرمایا۔ وہ اپنی قوم میں جا کر کہنے لگا کہ اسلام لے آؤ، کیونکہ حضرت محمدؐ اتنا دیتے ہیں کہ فقر کی پروا نہیں کرتے (مسلم، ۴ : ۱۸۰۶، حدیث ۲۳۱۲)۔ حضرت عباسؓ کو ایک مرتبہ اتنا سونا مرحمت فرمایا کہ ان سے اٹھایا نہیں جاتا تھا (قاضی عیاض: الشفاء، ص ۵۰)۔ ایک مرتبہ، جب آپؐ کو ستر ہزار درہم کی رقم پیش کی گئی تو آپؐ نے اس کو مسجد میں چٹائی پر بکھیر

دیا اور پھر جو سامنے آیا اسے دیتے گئے، یہاں تک کہ وہ رقم خرچ فرما دی (ابن الجوزی ، ۲ : ۲۴۴)۔

آپؐ کی فیاضی و دریا دلی کا یہ عالم تھا کہ اگر پاس موجود نہ ہوتا تو قرض لے کر سائل کو مرحمت فرما دیتے (قاضی عیاض : الشفا ، ۵۰)۔ فرط سخاوت سے ، بقول حضرت انسؓ ، آپؐ کے پاس کوئی چیز ذخیرہ نہیں رہتی تھی (ابن الجوزی، ص ۲۴۴)۔ ایک مرتبہ آپؐ نے اپنے ذاتی معتمد اور خازن حضرت بلالؓ کے پاس کچھ کھجوریں جمع دیکھیں تو پوچھا کہ اے بلالؓ! یہ کیا ہے؟ حضرت بلالؓ نے عرض کیا : یا رسول اللہ! کچھ ذخیرہ کر رہا ہوں تاکہ کسی برے وقت کام آ سکے۔ فرمایا : تجھے اس بات کا خوف نہیں کہ یہ جہنم کا دہکایا ہوا ٹکڑا بھی ہوسکتا ہے؟ پھر فرمایا : اے بلال! خرچ کر اور تنگی کا خوف نہ کر (حوالۂ مذکور)۔ فرط سخاوت سے آپؐ سائل کے سوال کی درشتی اور کرختگی کو بھی نظر انداز فرما دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک بدوؔ نے نہایت درشتی سے آ کر آپؐ کی چادر کو کھینچا ، جس سے آپؐ کی گردن پر نشان پڑ گیا اور پھر کہا : محمد! یہ مال تیرا ہے اور نہ تیرے باپ کا ، میرے ان دو اونٹوں پر کچھ مال لاد دے۔ آپؐ نے فرمایا : نہیں اور پھر تین مرتبہ استغفار پڑھا اور اسے نہ صرف معاف کیا بلکہ اس کے ایک اونٹ پر جَو اور دوسرے پر کھجور لادنے کا حکم دیا اور جب اونٹوں پر کھجوریں لاد دی گئیں تو فرمایا : اللہ کی برکت کے ساتھ رخصت ہو جاؤ (ابو داؤد ، ۵ : ۱۴۳ ، حدیث ۴۷۷۵ : النسائی حدیث ۴۷۸۰)۔ النسائی نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ صحابہؓ نے جب اس کی یہ بات سنی تو اسے پکڑنے کے لیے دوڑے ، مگر آپؐ نے فرمایا : میں تمہیں پختہ حکم دیتا ہوں کہ اپنی جگہ سے اس وقت تک نہ ہلو جب تک میں اس کی اجازت نہ دوں۔ یہ ہی فرط سخاوت کا نتیجہ تھا کہ اگر کوئی آپؐ کے زیر استعمال بالکل نئی چیز کو آپؐ سے طلب کرتا، خواہ وہ آپؐ کو پسند ہی ہوتی، آپؐ اتار کر سائل کو سونپ دیتے (البخاری، ۴ : ۱۲۲ ، الادب)۔ بعض اوقات جس مالک سے چیز خریدتے ، قیمت ادا کرنے کے بعد اسی کو ہبہ کر دیتے (البخاری ، ۲ : ۵ ، البیع ، باب ۳۴)۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ سے ایک اونٹ خریدا اور ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو ہبہ کر دیا۔ ایک دوسرے موقع پر حضرت جابرؓ بن عبداللہ کو ان کے اونٹ کی قیمت ادا کر دینے کے بعد وہ اونٹ انہیں کو لوٹا دیا (کتاب مذکور ، ص ۱۱۶ ، ۲۰۲، باب ۳۴ و ۴۷)۔

فرط سخاوت کا یہ عالم تھا کہ اگر بربنائے تنگی وقت کچھ مال بچ رہتا ، تو طبیعت پر گراں گزرتا اور آپؐ کا سکون و آرام ختم ہو جاتا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک شب میں نے آپؐ کو بستر پر کروٹیں بدلتے دیکھا تو عرض کیا : یا رسولؐ اللہ! کیا طبیعت ناساز ہے یا اللہ کی طرف سے کوئی نیا حکم ملا ہے؟ فرمایا : یہ بات نہیں۔ پھر اپنے تکیے کے نیچے سے تین درہم نکال کر دکھائے اور فرمایا : گزشتہ روز کچھ مال آیا تھا اور یہ درہم تقسیم ہونے سے رہ گئے تھے؛ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں اسی حال میں مجھے خدا کی طرف سے بلاوا نہ آ جائے (اعلام النبوۃ ، ص ۱۵۵)۔ ایسے ہی ایک اور موقع پر رئیس فدک نے کچھ سامان بھیجا اور وہ رات گئے تک تقسیم ہونے سے بچ رہا تو آپؐ نے یہ رات مسجد میں گزاری (ابو داؤد، ۳ : ۴۴۰ تا ۴۴۲، حدیث ۳۰۵۵)۔ آپؐ نے یہ اعلان فرمایا ہوا تھا کہ مرنے والے کا ترکہ وارثوں کے لیے ہے اور قرضہ میرے ذمے (البخاری)۔

(۶) مروّت و حیا : عرب میں شرم و حیا کا بہت کم رواج تھا؛ لوگ ایک دوسرے کے سامنے برہنہ ہونے میں کوئی قباحت نہ سمجھتے تھے حتّٰی کہ کعبہ [رک باں] کا طواف بھی بعض قبائل برہنہ کرتے

تھے، مگر آپؐ کے متعلق حضرت ابو سعیدؓ فرماتے ہیں: کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم اشد حیاء من العذراء فی خدرھا (مسلم، ۴: ۱۸۰۹، حدیث ۲۳۲۰)، یعنی آپؐ دوشیزہ لڑکی سے بھی زیادہ حیا دار تھے۔ آپؐ حیا کو ایمان کا شعبہ قرار دیتے تھے (البخاری، ۱: ۱۳، الایمان، باب ۱۹)۔ آپؐ کے نزدیک حیا ہی انسان کا اصلی سرمایہ ہے، اگر وہ نہ رہے تو انسان جو چاہے کرے: اذالم تستحی فافعل ماشئت (البخاری، کتاب الادب؛ ابو داود ۵: ۱۳۹، حدیث ۴۷۹۷؛ ابن ماجہ، حدیث ۴۱۸۳؛ احمد بن حنبل، مسند، ۵: ۲۷۳)۔ عموماً رفع حاجت کے لیے اتنی دور نکل جاتے کہ دور سے بھی کسی کو دکھائی نہ دیتے۔ فرط حیا کا یہ عالم تھا کہ بنائے کعبہ کے وقت پتھر اٹھا کر لانے والوں نے چادریں (ازار) اتار کر کندھوں پر رکھ لی تھیں۔ انھیں دیکھ کر آپؐ نے بھی ایسا ہی کیا، مگر فوراً آپؐ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ ہوش آیا تو زبان پر "ازاری، ازاری" (میری چادر) کے الفاظ جاری تھے (ابن سعد، ۱: ۱۴۵ ببعد)۔ اسی بنا پر آپؐ صحابہؓ کو اس نوع کے مسائل سمجھانے کے لیے اشاروں کنایوں سے کام لیتے (عیاض: الشفا، ۲۵)۔ فرط حیا کی وجہ سے آپؐ نے کبھی اپنی ازواج کے سامنے بھی برہنگی اختیار نہیں کی اور نہ پسند فرمائی (حوالۂ مذکور؛ نیز ابو داود، ۳: ۵۰۲ حدیث ۳۱۴۰ ببعد)۔ عموماً میت کو غسل دیتے وقت اس قسم کی بے احتیاطی ہو جاتی ہے، مگر آپؐ نے یہ دعا (گویا وصیت) فرمائی کہ اے اللہ! اس کی آنکھیں پھوڑ دے جو میرا ستر دیکھے (حوالۂ مذکور)؛ چنانچہ آپؐ کو کپڑوں سمیت غسل دیا گیا (ابو داود، ۳: ۵۰۲، حدیث ۳۱۴۱؛ ابن ماجہ، حدیث ۱۴۶۴)۔

(۷) احکام الٰہی پر عمل کا اہتمام: سیرت طیبہ کے امتیازی اوصاف میں آپؐ کا یہ وصف نمایاں حیثیت رکھتا ہے کہ آپؐ کو اپنی تمام زندگی میں احکام الٰہی پر شدت سے عمل کا اہتمام رہا۔ اسی بنا پر آپؐ کے جاننے والوں نے آپؐ کی زندگی کو مجسم قرآن قرار دیا (ابن سعد: الطبقات، ۱: ۳۶۴)۔ قرآن کریم میں آپؐ کی طرف سے بار بار یہ اعلان دہرایا گیا ہے: اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ (۶ [الانعام]: ۵۰)، یعنی میں (خود) انھی احکام کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیے جاتے ہیں۔ دوسرے مقام پر ہے: قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۶ [الانعام]: ۱۶۲)، یعنی آپؐ فرما دیجیے میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور موت صرف خدا ہی کے لیے ہے۔ آپؐ کی عملی زندگی کا یہ پہلو آپؐ کی صداقت کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کرتا ہے، کیونکہ اس سے خدائی پیغام پر آپؐ کے پختہ اور غیر متزلزل یقین کا اظہار ہوتا ہے، جو کسی متنبّی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی حکم نازل ہوتا آپؐ سب سے پہلے اس پر عمل کرتے؛ پھر دوسروں کو عمل کی دعوت دیتے۔ آپؐ کی طرف سے قرآن میں کہا گیا: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (۶۱ [الصف]: ۲)، یعنی اے اہل ایمان! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔ ایک اور جگہ یوں کہا گیا: اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ (۲ [البقرة]: ۴۴)، یعنی کیا تم دوسروں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود کو بھلا دیتے ہو۔ آپؐ کے دشمنوں کو بھی یہ تسلیم تھا کہ آپؐ مجسمۂ عہد و وفا اور پیکر مہر و محبت ہیں۔ فتح مکہ کے موقع پر جب آپؐ نے اپنے پرانے دشمنوں سے، جو سر جھکائے آپؐ کے فیصلے کے منتظر کھڑے تھے، پوچھا: تمھیں اب (مجھ) سے کیا توقع ہے؟ سب نے کہا: ہم آپؐ سے بھلائی ہی کی توقع رکھتے ہیں، کیونکہ آپؐ ایک شریف النفس باپ کے شریف النفس بیٹے ہیں (الواقدی:

المغازی ، ۲ : ۸۳۵)۔

آپؐ نے خود کو کبھی بھی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ حکم خداوندی کی تعمیل سے بالاتر خیال نہیں کیا ۔ غزوۂ خندق کے موقع پر سب کے ساتھ مل کر خندق کھودی (البخاری ، ۴ : ۲۱۱)؛ مسجد نبوی کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر عملی طور پر حصہ لیا، بلکہ آپؐ نے فرط عبودیت سے اپنے اوپر دوسروں سے کچھ زیادہ ہی پابندیاں عائد کی ہوئی تھیں ، مثلاً آپؐ خود کو اور اپنے اہل و عیال کو زکوٰۃ [رکَ بان] کا حق دار نہیں سمجھتے تھے (مسلم ۲ : ۷۵۱ ، حدیث ۱۰۶۹ تا ۱۰۷۱) ۔ آپؐ نے نماز تہجّد کا عمر بھر فرض نماز کی طرح اہتمام فرمایا (کتاب مذکور، ص ۵۰۸، حدیث ۷۳۶ بعد)۔ آپؐ نماز میں اس قدر طوالت فرماتے کہ قیام میں کھڑے کھڑے پائے مبارک متورم ہو جاتے۔ سجدے میں جاتے تو لگتا آپؐ کی روح ہی نکل چکی ہے ۔ ذاتی معاملات میں کبھی کسی سے مؤاخذہ نہ فرماتے ؛ ہاں، اگر دین کا معاملہ ہوتا تو پھر کسی کی رو رعایت نہیں کرتے تھے (مشکوٰۃ ، ۳ : ۱۹۱ ، حدیث ۵۷۱۷)۔ گویا آپؐ کی تمام زندگی اسی سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی، جس کی آپؐ دوسروں کو تعلیم دیتے تھے ۔ اس طرح آپؐ کی سیرت طیبہ کا یہ سب سے روشن پہلو ہے اور پیغمبرانہ کردار کی یہی خصوصیت ہے.

(۸) دینی معاملات میں میانہ روی : دین اور دینی مسائل کے بارے میں اتنے اہتمام کے باوجود آپؐ کو رہبانیت (ترک دنیا) کا اسلوب قطعی ناپسند تھا ۔ اگر کسی نے اپنے طبعی میلان کی وجہ سے اس کی اجازت طلب بھی کی تو آپؐ نے سختی سے منع فرما دیا ۔ خود آپؐ کا جو طرز عمل تھا اسے آپؐ نے یوں بیان فرمایا : "میں خدا سے تم سب سے زیادہ ڈرنے والا ہوں ، مگر میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا ؛ نماز بھی پڑھتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں اور اسی طرح عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں"۔ پھر فرمایا : "یہی میرا طریقہ (سنت) ہے ۔ جس نے میرے طریقے کو چھوڑا وہ میری امت سے نہیں" (البخاری ، ۳ : ۴۱۱ ، کتاب النکاح، باب ۴۱، مطبوعہ لائیڈن) ۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص نے آپؐ سے ہمیشہ روزے سے رہنے کی اجازت مانگی تو فرمایا : "زیادہ سے زیادہ تم صوم داودؑ ، یعنی ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھ سکتے ہو"۔ پھر فرمایا : "تیرے بدن کا بھی حق ہے ؛ تیرے گھر والوں کا بھی حق ہے" (کتاب مذکور ، ۱ : ۴۴۳ ، کتاب الصوم ، باب ۵۶ ، ۵۷)۔ حضرت ابو ہریرہؓ اور بعض دیگر صحابہؓ نے عدم استطاعت نکاح کی وجہ سے اپنے آپ کو جسمانی طور پر ازدواجی زندگی کے ناقابل بنانے کا ارادہ کیا تو سختی سے منع فرما دیا (کتاب مذکور ، ۳ : ۴۱۳ تا ۴۱۴)۔ ایک صحابی نے دنیا کے تمام بندھنوں سے الگ ہو کر ایک غار میں معتکف ہو کر عبادت الٰہی کرنے کی اجازت طلب کی تو فرمایا : "میں یہودیت یا عیسائیت کی طرح رہبانیت کی تعلیم نہیں لے کر آیا، بلکہ مجھے تو آسان اور سہل دین ، دین ابراهیم ، ملا ہے (احمد بن حنبل : مسند ، ۵ : ۲۶۶)۔

کتب احادیث و سیرت میں اس طرح کے بے شمار واقعات سے اس بات کی بخوبی شہادت ملتی ہے کہ آپؐ کو دنیا اور اس کے رشتوں سے قطع تعلق کرنا ہرگز گوارا نہ تھا ۔ گویا اسے آپؐ ایک طرح کا عملی زندگی سے فرار اور قنوطیت سمجھتے تھے اور آپؐ کے نزدیک زندگی کی طرف یہ منفی رویہ کسی عالمگیر اور پائدار مذہب (اور اس کے بانی) کے شایان شان نہیں تھا ۔ اس کے بالمقابل آپؐ کے رویے میں امید و رجا کا پہلو بہت نمایاں ہے ۔ آپؐ کا مسلک یہ رہا ہے کہ دنیا میں رچ بس کر دنیا کی اصلاح کی کوشش جاری رکھی جائے ۔ اگر آپؐ کا کام رہبانیت،

یعنی خود کو برائی سے بچانے تک محدود ہوتا، تو آپؐ کو اپنی عملی زندگی میں اتنی مشکلات اور مصائب و آلام کا سامنا ہرگز نہ کرنا پڑتا۔ واقعہ یہ ہے کہ معاشرے کی اصلاح کے لیے یہ ازبس ضروری تھا کہ آپؐ خود ان معاملات میں عملاً حصہ لیتے اور آپؐ نے ایسا ہی کیا۔

(۹) تواضع: بارگاہ خداوندی سے آپؐ کو وہ بلند مرتبہ ملا تھا، جو مذہبی اور سیاسی اعتبار سے دنیا کے کسی فرد کو بھی نہیں ملا۔ بایں ہمہ آپؐ ہمیشہ مجسّمۂ تواضع و انکسار رہے اور زبان مبارک سے ایسا لفظ کبھی نہ نکلا، جس سے کبر و غرور کا شائبہ تک محسوس ہوتا ہو۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے، کسی کو یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ مجھے یونس بن متّی پر فوقیت دے (مسلم، الفضائل ۴: ۱۸۴۶، حدیث ۲۳۷۷؛ البخاری، ۲: ۳۶۰، الانبیاء)۔ ایک مرتبہ ایک یہودی کی ایک مسلمان سے حضرت موسیٰؑ اور آپؐ کی فضیلت کے بارے میں تکرار ہو گئی۔ آپؐ کو پتا چلا تو فرمایا: ”مجھے موسیٰؑ پر فوقیت نہ دو، کیونکہ لوگ جب قیامت کے دن بے ہوش ہوں گے تو سب سے پہلے مجھے ہوش آئے گا۔ میں دیکھوں گا کہ حضرت موسیٰؑ عرش کا پایہ تھامے کھڑے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آ گئے ہوں گے، یا ان کو بے ہوشی سے مستثنیٰ رکھا گیا ہوگا (البخاری ۲: ۳۵۳، الانبیاء؛ مسلم، الفضائل، ۴: ۱۸۴۴، حدیث ۲۳۷۳؛ احمد بن حنبل: مسند، ۲: ۲۶۴)۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے آپؐ کو ”یا خیرَ البریۃ!“ کہہ کر پکارا۔ آپؐ نے فرمایا: ”وہ تو ابراہیمؑ تھے“ (مسلم، الفضائل، ۴: ۱۸۳۹، حدیث ۲۳۶۹؛ ابو داؤد، ۵: ۵۴، حدیث ۴۶۷۲)۔ ایک دفعہ ایک وفد آیا اور کہنے لگا: ”آپؐ ہمارے سردار ہیں“۔ آپؐ نے فرمایا: ”تمہارا (اصلی) سردار تو اللہ تعالیٰ ہے“ وفد نے عرض کیا: ”آپؐ ہم میں سب سے زیادہ افضل ہیں اور عظمت کے مالک ہیں“۔ فرمایا: ”اپنی سی بات کہو، مبادا تمہیں شیطان بہکا دے“ (ابو داؤد، ۵: ۱۵۴ تا ۱۵۵، حدیث ۴۸۰۶)۔ ایک دوسری روایت (احمد بن حنبل: مسند، ۳: ۱۵۳) میں اس کے آخر میں یہ اضافہ ہے: ”میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول محمد بن عبداللہ ہوں۔ مجھے خدا نے جو رتبہ بخشا ہے، میں پسند نہیں کرتا کہ مجھے اس سے زیادہ بڑھایا جائے“۔ ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے میری طرف یہ وحی نازل فرمائی ہے کہ تم سب انکسار اختیار کرو؛ کوئی کسی پر نہ زیادتی کرے اور نہ گالی گلوچ (ابن ماجہ، کتاب الزہد، حدیث ۴۲۱۴؛ ابو داؤد، ۵: ۲۰۳، حدیث ۴۸۹۵)۔ ایک دفعہ ایک شخص آپؐ کی خدمت میں آیا اور آپؐ کی وجاہت کو دیکھ کر مرعوب ہو گیا۔ آپؐ نے اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے فرمایا: میں بادشاہ نہیں؛ میں تو ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو خشک گوشت (= قدید) کھاتی تھی (ابن الجوزی، ۲: ۲۷۴؛ حاکم: مستدرک، ۳: ۴۸، ذکر فتح مکہ)۔

ایک بار آپؐ نے بنی اسرائیل کے دو افراد کا واقعہ بیان فرمایا جن میں سے ایک اپنے نیک اعمال کی وجہ سے تکبّر کرتا تھا اور دوسرا اپنی بد اعمالی پر نادم اور غم زدہ رہتا تھا؛ اللہ تعالیٰ نے مؤخر الذکر کو بخش دیا اور اول الذکر کی گرفت فرمائی (ابو داؤد، ۵: ۲۰۷، حدیث ۴۹۰۱)۔ صرف زبانی حد تک ہی نہیں بلکہ خورد و نوش اور دوسرے تمام معاملات میں بھی آپؐ عجز و انکسار کو پسند فرماتے تھے۔ آپؐ کا ارشاد تھا: ”میں ایک عبد کی طرح کھانا کھاتا ہوں اور ایک عبد کی طرح زمین پر بیٹھتا ہوں“ (ابن الجوزی: الوفا، ۲: ۴۳۸ [نیز دیکھیے نیچے، بذیل ضمنی عنوان: (۱۱) سادگی])۔

حقیقت یہ ہے کہ آپؐ یہ پسند نہ فرماتے تھے کہ اپنی علو شان دکھانے کے لیے دوسروں پر اپنی

فوقیت جتائی جائے، بلکہ آپؐ اس بات کو ترجیح دیتے تھے کہ آپؐ کے جاں نثاروں کے سامنے دیگر انبیا اور مشاہیر عالم کے عمدہ پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے، ورنہ آپؐ کی عظمت و جلالت تو ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے: "انا سیّد وُلد آدم، و اول من تنشق عنہ الارض، و اول شافع و اول مشفّع" (مسلم، الفضائل، ۴ : ۱۷۸۲، حدیث ۲۲۷۸؛ ابو داود، ۵ : ۵۴، حدیث ۴۶۷۳)، یعنی میں بنی آدم کا سردار ہوں اور وہ پہلا شخص ہوں، جس کے لیے زمین شق ہوگی اور جس کو سب سے پہلے شفاعت کی اجازت ملے گی اور جس کی سب سے پہلے شفاعت قبول کی جائے گی"۔ قرآن مجید میں بھی دیگر انبیا پر آپؐ کی فضیلت کا کثرت سے ذکر کیا گیا ہے (مثلاً دیکھیے ۳ [آل عمران] : ۸۱)۔

(۱۰) بے جا مدح سے گریز: طبعی انکسار اور تواضع کی وجہ سے آپؐ بے جا مدح کو سخت ناپسند فرماتے تھے اور ان موقعوں کے لیے یہ حکم دے رکھا تھا کہ ایسے شخص کے منہ میں مٹی ڈال دی جائے (مسلم، الزھد، ۴ : ۲۲۹۷، حدیث ۳۰۰۲؛ الترمذی، ۴ : ۶۰۰، الزھد، حدیث ۲۳۹۳؛ ابن ماجہ، الادب، حدیث ۳۷۴۲)۔ ایک مرتبہ ایک اعرابی آیا اور کہنے لگا: "ہم آپؐ کے ذریعے اللہ سے اور اللہ کے ذریعے آپؐ سے شفاعت کے طلب گار ہیں کہ ہمارے علاقے پر بارش ہو"۔ یہ سن کر آپؐ کو سخت غصہ آ گیا اور فرمایا: "تیرا ناس ہو"۔ پھر تسبیح پڑھی کہ اس کا اثر صحابہؓ کے چہروں پر ظاہر ہو گیا اور فرمایا: "اللہ کی شان اس سے بلند تر ہے کہ اس کے ذریعے کسی بندے سے سفارش کی جائے" (ابو داود، ۵ : ۹۵، حدیث ۴۷۲۶)۔ ایک مرتبہ کسی بچی نے کہا: "وَ فِینا نبیٌّ یعلمُ ما فی الغَد"، یعنی ہمارے ہاں وہ نبی ہیں جو کل ہونے والی باتیں بھی جانتے ہیں، تو آپؐ کو ناگوار گزرا اور فرمایا "یہ کہنا چھوڑ دو اور جو پہلے کہا کرتی تھی وہی کہو" (البخاری، النکاح؛ الترمذی، ۳ : ۳۳۹ حدیث ۱۰۹۰)۔ ابن ماجہ (باب الغناء والدف، حدیث ۱۸۹۷) نے یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ کل کی باتیں تو صرف خدا ہی جانتا ہے۔ ایک دفعہ ایک شخص آیا اور کہنے لگا: "سیدنا خیرنا و ابن خیرنا"۔ آپؐ یہ سن کر خفا ہوئے اور فرمایا: لوگو! "مجھے میرے رتبے سے زیادہ نہ بڑھاؤ" (ابن الجوزی: الوفا، ۲ : ۴۳۵)۔ آپؐ فرمایا کرتے: "میری اس طرح مدح نہ کرو جس طرح عیسائی حضرت عیسٰیؑ کی کرتے ہیں۔ میں تو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں" (البخاری، ۲ : ۳۶۹، کتاب الانبیاء)۔ ایک مرتبہ بعض صحابہؓ نے آپؐ سے تعظیمی سجدے کی اجازت چاہی جو شام و عراق کے سرداروں میں رائج تھا تو آپؐ نے سختی سے فرمایا کہ اگر سجدہ مباح ہوتا، تو میں حکم دیتا کہ عورت اپنے خاوند کو سجدہ کرے (ابو داود، ۲ : ۶۰۵، حدیث ۲۱۴۰؛ الترمذی، ۳ : ۴۶۵، حدیث ۱۱۵۹؛ ابن ماجہ، حدیث ۱۸۵۳)۔ ایک مرتبہ ایک بدو کے اونٹ کا آپؐ کی ناقہ سے مقابلہ ہوا۔ اتفاقاً بدّو کا اونٹ جیت گیا۔ صحابہؓ کو اس سے دکھ ہوا آپؐ نے فرمایا: "جو چیز بڑھتی ہے، خدا اسے گرا بھی دیتا ہے" (البخاری، ۴ : ۳۸، الجہاد؛ ابو داود، ۵ : ۱۵۲، حدیث ۴۸۰۲)۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے دوران گفتگو یہ کہہ دیا کہ جو اللہ اور اس کا رسول چاہے۔ آپؐ نے فرمایا: "تم نے مجھے اللہ کا شریک اور ہمسر ٹھہرا دیا"؛ یہ کہو کہ جو خدا چاہے (البخاری: ادب المفرد)۔

اپنے متعلق ہی نہیں، بلکہ اپنے متّبعین کے متعلق بھی آپؐ کا یہی طرز عمل تھا۔ ایک روز آپؐ کے سامنے کسی صحابیؓ نے ایک دوسرے صحابی کی تعریف کی۔ آپؐ خفا ہوئے اور فرمایا: "تو نے اسے ہلاک کر دیا" (یا یہ کہ: تو نے اس کی گردن توڑ ڈالی)

(البخاری ۴ : ۱۲۷ ، باب الادب ، ۵۴ ؛ مسلم ، ۴ : ۲۲۹۶ ، حدیث ۳۰۰۰ ؛ ابن ماجہ ، حدیث ۳۷۴۴ ، المدح).

(۱۱) سادگی: آپؐ کو کھانے پینے ، پہننے اوڑھنے میں تکلف اور تصنع سخت ناپسند تھا۔ سادگی اور بے تکلفی ہمیشہ آپؐ کا معمول رہی۔ جو کچھ سامنے آ جاتا ، کھا لیتے ؛ جو کچھ ملتا ، پہن لیتے ؛ البتہ طبیعت میں نظافت ضرور تھی؛ چنانچہ کسی ایسی چیز کو پسند نہ فرماتے جس میں ظاہری یا معنوی طور پر نفاست نہ پائی جاتی ہو۔ کچا پیاز ، لہسن اور گوہ کا گوشت ، گو آپؐ نے حرام نہیں ٹھیرایا ، مگر خود کبھی نہیں کھایا (الترمذی ، ۴ : ۲۶۱ ، حدیث ۱۸۰۶ ، ۱۸۰۷)۔ اپنے متبعین سے بھی آپؐ یہی توقع رکھتے تھے کہ ان کے رہن سہن میں سادگی اور بے تکلفی رہے۔ ایک مرتبہ آپؐ حضرت فاطمۃ الزہراء کے مکان پر تشریف لے گئے ، مگر دروازے ہی سے پلٹ آئے۔ حضرت علیؓ نے سبب دریافت کیا تو فرمایا: کسی پیغمبر کے شایان شان نہیں کہ وہ کسی ایسے گھر میں داخل ہو جس میں زیب و زینت ہو (ابو داؤد ، ۴ : ۳۸۲ ، حدیث ۴۱۴۹)۔ ہوا یہ تھا کہ آپؐ کی صاحبزادیؓ نے گھر کی سجاوٹ کے لیے رنگین پردے دروازے پر ڈال لیے تھے؛ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کے حجرے میں چھت گیر لگی دیکھی تو فوراً چاک کر دی اور فرمایا: "کپڑا خود پہننے کے لیے ہوتا ہے اینٹ کو پہنانے کے لیے نہیں" (ابو داؤد ، ۴ : ۳۸۵ ، حدیث ۴۱۵۳)۔ ایک مرتبہ کسی نے آپؐ کو کمخواب کی بنی ہوئی بہت خوبصورت قبا بھیجی۔ آپؐ نے پہنی ، مگر پھر اتار کر حضرت عمر فاروقؓ کو بھیج دی کہ فروخت کرکے اپنے کام میں لائیں (البخاری ، ۱ : ۲۳۶ ، کتاب الجمعہ ، باب ۷ ؛ مسلم ، ۳ : ۱۶۳۸ ، حدیث ۲۰۶۸)۔ اسی طرح ایک موقع پر آپؐ کو کسی نے بہت خوبصورت چادر بھیجی ، جس کے حاشیے کاڑھے ہوئے تھے۔ آپؐ نے پہنی تو بہت بھلی معلوم ہوئی ، مگر ایک شخص کے سوال کرنے پر اتار کر اسے مرحمت فرما دی (البخاری ، ۴ : ۱۲۳ ، الادب ، باب ۳۹)۔ گو عورتوں کے لیے زیور ممنوع نہیں ، مگر آپؐ اپنی ازواج کے لیے یہ تکلف بھی پسند نہ فرماتے۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن دیکھے تو فرمایا: "اگر تم ورس کے کنگنوں کو زعفران سے رنگ کر پہن لیتی ، تو بہتر ہوتا" (النسائی : السنن ، مطبوعۂ قاہرہ ، ۸ : ۱۵۹)۔ ایک مرتبہ حضرت فاطمہؓ کو سونے کی زنجیر پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا: کیا تجھے یہ بات اچھی محسوس ہوگی کہ لوگ یہ کہیں کہ رسول اللہ کی بیٹی کے ہاتھ میں آگ کی زنجیر ہے۔ پھر آپؐ بیٹھے بغیر لوٹ گئے۔ اس پر حضرت فاطمہؓ نے اس زنجیر کو بیچ کر اس کی قیمت سے ایک غلام خرید کر آزاد کر دیا ، جس پر آپؐ بے حد خوش ہوئے (کتاب مذکور ، ص ۱۵۸)۔ ایک بار حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا کہ آپؐ جمعے اور وفود وغیرہ کے اجتماعات کے لیے کوئی عمدہ لباس (حلۃ سیراء) خرید لیں۔ فرمایا: "یہ تو وہ پہنے جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہو" (ابو داؤد ، ۱ : ۶۴۹ ، حدیث ۱۰۷۶)۔ ایک مرتبہ آپؐ باہر نکلے تو ایک قبہ بنتے ہوئے دیکھا۔ دریافت فرمانے پر پتا چلا کہ یہ فلاں شخص کا ہے۔ آپؐ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ اگلے دن جب وہ شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے اس سے اعراض فرمایا۔ اس نے اپنے دوستوں سے اس کا ذکر کیا۔ انھوں نے بتایا کہ کل آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے تمھارے زیر تعمیر قبے کو دیکھا تھا۔ اس نے یہ سن کر اپنا قبہ گرا دیا (ابو داؤد : السنن ، ۵ : ۴۰۳).

آپؐ کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ اگر مجلس سے گھر

جا کر واپس آنا ہوتا تو اپنی جوتیاں وہیں چھوڑ جاتے اور برہنہ پاؤں جاتے اور واپس آتے (ابو داؤد ، ۵ : ۱۸۰ ، حدیث ۴۸۵۴) ۔ ایک مرتبہ لوگ آپؐ کو دیکھ کر کھڑے ہوگئے تو آپؐ کو ناگوار ہوا اور فرمایا : ”تم عجمیوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھ کر کھڑے نہ ہو جایا کرو (ابن ماجہ : السنن، حدیث ۳۸۳۹؛ ابو داؤد، ۵ : ۳۹۸، حدیث ۵۲۳۰)۔ گھر میں جو گدا تھا، اس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی (الترمذی ، ۴ : ۲۹۸ ، حدیث ۱۷۶۱).

(۱۲) زہد و قناعت : آپؐ کی سیرت طیبہ کا ایک اور نمایاں وصف آپؐ کا زندگی کے ہر دور میں زہد و قناعت اختیار کرنا بھی ہے ۔ آپؐ کا یہ زہد و قناعت اضطراری نہیں ، اختیاری تھا ۔ حیات مبارکہ کے مکی اور مدنی ، دونوں ادوار میں مال و دولت کی آپؐ کے پاس ہرگز کوئی کمی نہ تھی ، مگر آپؐ مال و متاع دنیوی سے ایک حد سے زیادہ استمتاع صحیح نہیں سمجھتے تھے ! چنانچہ آپؐ کے زہد و قناعت کا اس دور میں بھی ، جب کہ فتوحات سے حاصل شدہ قیمتی مال و متاع کی کچھ کمی نہ تھی ، یہ عالم تھا کہ حضرت عبداللہ کہتے ہیں ، کہ ایک مرتبہ آپؐ ایک کھجور کی چٹائی (حصیر) پر آرام فرما رہے تھے اور جسم مبارک پر اس چٹائی کے نشانات بہت واضح دکھائی دے رہے تھے! میں نے عرض کیا: ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اگر آپؐ اجازت دیں تو ہم اس سے زیادہ نرم چیز آپؐ کے نیچے بچھا دیا کریں“۔ فرمایا : ”مجھے بھلا دنیا سے کیا غرض ؟ میری مثال تو اس مسافر کی سی ہے جو تپتی دوپہر میں ذرا سی دیر سستانے کے لیے کسی سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ جائے اور پھر آرام کرکے چل دے“ (ابن الجوزی : الوفا ، ۲ : ۴۷۵) ۔ اسی طرح حضرت ابو امامہؓ نقل کرتے ہیں کہ آپؐ کے سامنے بطحاے مکہ کو سونے کا بنا کر پیش کیا گیا ، مگر آپؐ نے فرمایا : ”یا اللہ ! مجھے یہ (مال و دولت) منظور نہیں ۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ ایک دن کچھ کھانے کو مل جائے اور ایک دن فاقہ رہے ، تاکہ سیر ہو کر تیری تعریف اور شکر ادا کروں اور بھوکا رہ کر تضرع اختیار کروں اور تجھ سے دعا مانگوں“ (حوالۂ مذکور) ۔ حضرت عائشہؓ نے ایک رات بستر کو نرم رکھنے کے لیے لیف اور اذخر کے دو بچھونے بچھا دیئے ، مگر آپؐ نے ناپسند فرمایا (حوالۂ مذکور).

ام المومنین حضرت عائشہؓ ، جنہوں نے آپؐ کے ساتھ دس سال گزارے ، فرماتی ہیں کہ آپؐ نے کبھی شکم سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا اور نہ کبھی اپنے اس حال کی کسی سے شکایت کی ! فاقہ کرنا آپؐ کو غنا سے زیادہ پسند تھا ۔ اگرچہ آپؐ نے تمام رات بھوک کی شدت سے کروٹیں بدلتے ہوئے گزاری ہوتی ، پھر بھی ، آپؐ اگلے دن روزہ رکھنا نہ چھوڑتے ۔ اگر آپؐ اللہ سے زمین کے تمام خزانے اور پھل وغیرہ مانگنا چاہتے تو آپؐ کو دے دیے جاتے (مگر آپؐ نے اسے پسند نہیں فرمایا)۔ میں آپؐ کی یہ حالت دیکھ کر ، فرط محبت سے ، رو پڑتی تھی ۔ میں اپنا ہاتھ آپؐ کے شکم مبارک پر پھیرتی (کہ بھوک سے کیا حال ہوگیا ہے) اور کہتی : میری جان آپؐ پر فدا ! اگر آپؐ اتنا ہی مال دنیا قبول فرما لیا کریں جو آپؐ کی جسمانی قوت کو بحال رکھ سکے تو بہتر ہو ۔ آپؐ فرماتے : ”مجھے مال دنیا سے کیا واسطہ ؟ میرے اولوالعزم بھائیوں (سابق انبیاء) نے اپنے سخت احوال پر بھی صبر کیا ۔ پھر وہ اپنے رب کے پاس جا پہنچے ، جہاں انہیں ان اعمال کے بدلے پورا اعزاز و اکرام ملا ۔ مجھے شرم آتی ہے کہ میں عیش دنیا میں پڑ کر ان سے کم رہ جاؤں ۔ میرے نزدیک سب سے اچھی بات اپنے بھائیوں سے ملنا ہے“۔ اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد آپؐ کا وصال ہوگیا (قاضی عیاض : الشفا ، ص ۶۳)۔ جب وصال ہوا اس وقت بھی آپؐ کی ایک زرہ

ایک یہودی کے پاس گروی رکھی ہوئی تھی جس کے عوض غلہ ادھار لیا گیا تھا (الشفا ، ص ۶۲) ۔ کئی کئی مہینے گزر جاتے اور بیت نبوی میں چولھا گرم نہ ہوتا ، صرف پانی اور کھجور پر گزران ہوتی (حوالۂ مذکور) ۔ اس قسم کے واقعات کتب سیرت میں بے شمار ہیں (نیز دیکھیے ابن الجوزی ، ص ۴۷۵ تا ۴۸۳)۔

(۳۱) اپنے کام اپنے ہاتھ سے انجام دینا : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اردگرد جاں نثاروں کی کمی نہ تھی ۔ یہ جاں نثار ہر طرح کی خدمت کے لیے تیار رہتے تھے ، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بغیر عذر کے کسی سے خدمت لینا قطعاً منظور نہ تھا ۔ آپؐ اپنے زیادہ سے زیادہ کام خود کرنا چاہتے اور دوسروں پر کم سے کم بوجھ بننا پسند کرتے تھے ۔ (یہاں یہ یاد دلایا جا سکتا ہے کہ بعض صحابہؓ سے آپؐ نے یہ عہد لیا تھا کہ وہ کسی شخص سے کسی قسم کی مدد نہیں لیں گے) ۔ تعمیر خانہ کعبہ کے وقت آپؐ نے سب کے ساتھ مل کر مزدوروں کی طرح کام کیا (ابن سعد : الطبقات ، ۱ : ۱۴۵) ۔ مسجد نبوی اور مسجد قبا کی تعمیر اور بعد ازاں احزاب کے موقع پر خندق کھودنے میں بھی صحابۂ کرامؓ کے ساتھ شریک عمل رہے ۔ بلکہ خندق کھودنے کے دوران میں جب کوئی مشکل مرحلہ آ جاتا تو آپؐ ہی کو بلایا جاتا (الواقدی : المغازی ، ۲ : ۴۵۰ تا ۴۵۱)۔

خانگی امور کے متعلق آپؐ کے دیکھنے والوں کا بیان یہ ہے کہ كَانَ يَخْدِمُ نَفْسَهُ (قاضی عیاض : الشفا ، ص ۵۸) ، یعنی آپؐ اپنے کام خود کیا کرتے تھے ۔ ایک دوسری روایت کے مطابق آپؐ گھر کے کام کاج میں اپنی ازواج کا ہاتھ بٹاتے ؛ کپڑوں میں پیوند لگاتے ، گھر میں جھاڑو دیتے ، دودھ دوہ لیتے ، بازار سے سودا سلف لے آتے ، ڈول درست کر دیتے ، اونٹ کو اپنے ہاتھ سے باندھ دیتے ، غلام کے ساتھ مل کر آٹا گوندھ دیتے (البخاری : الصحیح ، ۳ : ۱۲۲ ؛ الشفا ، ص ۵۸) ، کوئی جانور بیمار ہوتا تو اسے علاج کے طور پر داغ دیتے (مسلم) ؛ کوئی چیز مرمت طلب ہوتی تو اس کی مرمت کر دیتے (احمد بن حنبل : مسند ، ۳ : ۴۶۹) ؛ دوران سفر اگر صحابہؓ کام بانٹنا چاہتے تو آپؐ بھی معاونت فرماتے۔

صرف یہی نہیں بلکہ آپؐ کو دوسروں کے کام کرنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے تھے ۔ بعض مہمانوں کی خود خدمت گزاری کرتے (قاضی عیاض : الشفا) ؛ اگر کسی صحابیؓ کے شریک جہاد ہونے کی بنا پر گھر میں کوئی ذمہ دار فرد نہ ہوتا تو آپؐ خود جا کر ان کے جانوروں کا دودھ دوہ دیتے۔

آپؐ کو کسی ادنٰی سے ادنٰی شخص کے کام کرنے میں بھی تأمل نہیں ہوتا تھا ، مثلاً کسی بیوہ یا مسکین کے ساتھ مل کر ان کا کام کر دیتے (ابن الجوزی : الوفا ، ص ۴۳۷) ۔ نیم دیوانی باندی آپؐ کو کسی کام کے لیے بلانے آئی تو آپؐ چل پڑتے اور فرماتے : ”تو جس جگہ چاہے چل ، میں تیرا کام کروں گا“ (حوالۂ مذکور) ۔ بعض بدو آتے اور آپؐ کو مسجد سے اپنے کام کے لیے لے جاتے ، ان کے بدوی لب و لہجہ کے باوجود آپؐ کو ذرا ناگواری محسوس نہ ہوتی (مسلم)۔

۲ ۔ حسن معاشرت : انسانی معاشرہ باہمی ربط و ارتباط سے تشکیل پذیر ہوتا ہے ۔ اسی بنا پر جدید سوشیالوجی (عمرانیات) کی اصطلاح میں انسان کو Social animal کہا جاتا ہے ۔ اس باہمی ارتباط سے جو رشتے استوار ہوتے ہیں (جن کے لیے اسلام میں رحم (۴ [النساء] : ۱) کی وسیع اور معنی خیز اصطلاح استعمال کی گئی ہے) ۔ ان کی خوش ادائی ہی کا نام خلق [رک بہ علم اخلاق] ہے ۔ پھر اس خوش ادائی کے بھی کئی مراحل ہیں : کسی کی نظر صرف اپنے کنبے اور خاندان تک محدود ہوتی ہے ؛ کوئی صرف اپنی ملت یا قوم کے لوگوں کو ہی خوش خلقی کا مستحق سمجھتا ہے ، جبکہ بعض لوگ اپنے ذاتی خواہشات و

مفادات ہی کو اس کا معیار ٹھہرا لیتے ہیں ، لیکن تاریخ عالم میں ایک بزرگ ہستی ایسی بھی گزری ہے جس نے پورے انسانی معاشرے کو بحیثیت ایک کنبے ، ایک قبیلے اور ایک وحدت کے تصور کیا ، بنی آدم کو بلا امتیاز رنگ و نسل ان کے جائز اور فطری حقوق عطا کیے ۔ اس کی نگاہ میں عربی اور عجمی ، کالے اور گورے کی تفریق ہمیشہ بے معنی رہی ۔ یہ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مبارک و مسعود ہستی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حیات طیبہ میں جس چیز نے سب سے زیادہ لوگوں کو متاثر کیا اور آپؐ کا گرویدہ بنایا وہ آپؐ کا حسن خلق اور جمیل طرز معاشرت ہی تھا ۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں آپؐ کی بے مثال کامیابی کو آپؐ کی نرمی اور شفقت کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے : فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (۳ [آل عمرٰن] ۱۵۹) ، یعنی پس اللہ کی مہربانی سے آپؐ ان (لوگوں) کے لیے نرم ہو گئے اور اگر آپؐ ترش رو ، سخت دل ہوتے تو سب لوگ آپؐ کے پاس سے منتشر ہو جاتے ۔ قرآن کریم میں آپؐ کو اسی بنا پر عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۹ التوبہ) : ۱۲۸) ؛ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (۳۳ (الاحزاب] : ۶) ؛ اور سب سے بڑھ کر رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۲۱ [الانبیا]: ۱۰۷) قرار دیا گیا ہے ۔ اسی سے لوگوں سے آپؐ کے سلوک کا ایک ما بہ الاشتراک کلیہ استنباط کیا جا سکتا ہے اور وہ ہے آپؐ کی بنی نوع انسان کے لیے پدرانہ و پیغمبرانہ محبت و شفقت ، نرمی اور عفو و درگزر ۔ یہ مابہ الاشتراک جذبہ آپؐ کی تمام حیات طیبہ کا خلاصہ ہے ؛ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ جذبات آپؐ کے سینۂ اطہر میں ہمیشہ موجزن رہے ، دور نبوت میں بھی اور عرصہ قبل از نبوت میں بھی ۔ آپؐ چونکہ خود یتیمی اور کس مپرسی کا زمانہ گزار چکے تھے اس لیے دوسروں کے دکھ اور غم کا آپؐ بہت اچھی طرح اندازہ لگا سکتے تھے ۔

زمانۂ ما قبل از نبوت میں بھی حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ [رک باں] کی شہادت کے مطابق (دیکھیے البخاری ، ۱ : ۵) آپؐ ہمیشہ غریبوں ، محتاجوں اور بیکسوں کے ہمدرد ، مسافروں کے بہی خواہ ، بیواؤں اور ضعیفوں کے حامی و ناصر ، بلکہ ان کو کما کر دینے والے رہے ۔ جنگ بُعاث [رَکّ باں] سے جو تباہی ہوئی ، اس نے آپؐ کے قلب اطہر پر خاص اثر کیا ؛ چنانچہ خوں ریزی کو روکنے کے لیے آپؐ نے حلف الفضول [رک باں] کے دوبارہ احیا کے لیے انتھک کام کیا (ابن سعد ، ۱ : ۱۲۹ ، مطبوعۂ بیروت) ۔ یہ عہد نامہ مظلوم کی حمایت پر کمربستہ رہنے سے متعلق تھا ۔ دوسروں کے لیے آپؐ کے دل میں جو شفقت و محبت کا بے پناہ جذبہ تھا اس کا اس امر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپؐ کے ہاں دین کی تعبیر ہی دوسروں کی خیر خواہی سے تھی ۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے : الدِّین النصیحة (البخاری ، ۱ : ۲۲ ، کتاب الایمان ، باب ۴۲ ؛ مسلم ، ۱ : ۴۷ ، حدیث ۵۵ ، کتاب الایمان ؛ ابو داؤد ، ۵ : ۲۳۳ ، حدیث ۴۹۴۴) ۔ یہ دوسروں کے لیے حد سے بڑھی ہوئی خیر خواہی ہی کا نتیجہ تھا کہ دوسروں کے ایمان قبول نہ کرنے کا غم ہمیشہ آپؐ کے لیے جان گسل رہا اور قرآن کریم کو بار بار آپؐ کی دل دہی کرنا پڑی : فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا (۱۸ [الکہف] : ۶) ، یعنی کیا آپؐ اپنی جان کو اس غم میں کہ وہ ایمان نہیں لاتے ہلاک کر ڈالیں گے۔

اسی بنا پر دوسروں سے معاملات کرنے میں ہمیشہ آپؐ کی طرف سے پیش رفت رہی ۔ آپؐ کے ہاں دوسروں سے اپنے حقوق لینے پر اصرار کے بجائے ہر شخص کو اس کے حقوق دینے کا اصول کارفرما تھا ۔

قرآن کریم کی یہ آیت آپؐ کے اس جمیل طرز معاشرت پر بخوبی روشنی ڈالتی ہے : وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَ بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ (۴۱ [حٰمٓ السجدۃ] : ۳۴)، یعنی بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی۔ آپؐ (سخت کلامی کا) ایسے طریق سے جواب دو جو بہت اچھا ہو (ایسا کرنے سے تم دیکھو گے) کہ جس شخص میں اور تم میں دشمنی تھی وہ تمہارا گرم جوش دوست ہے۔ اسی بنا پر آپؐ گفتگو کرنے، سلام و مصافحہ کرنے اور عمدہ برتاؤ کرنے میں ہمیشہ پہل فرماتے تھے۔

آپؐ کی معاشرتی زندگی کا تفصیلی بیان نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی اس کی گنجائش ہے، البتہ آپؐ کی حسین و دلآویز طرز معاشرت کے چند خصائص ذیل میں ذکر کیے جاتے ہیں، تاکہ آپؐ کے حسن معاشرت کا کچھ اندازہ ہو سکے :

(۱) جذبۂ اخوت و ہمدردی : دوسروں کے لیے آپؐ کے دل میں ہمیشہ ہمدردی اور مہربانی کے جذبات موجزن رہے۔ اس سلسلے میں آپؐ کے نزدیک اپنے بیگانے، آزاد اور غلام کی کوئی تمیز نہ تھی۔ آپؐ اکثر فرمایا کرتے تھے : "میرے سامنے دوسروں کی ایسی باتیں نہ کیا کرو جنہیں سن کر میرے دل میں ان کے متعلق کوئی کدورت پیدا ہو جائے، کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ میں سب سے صاف دل (سلیم الصدر) کے ساتھ ملوں (ابو داؤد : سنن، ۵ : ۱۸۳، حدیث ۴۸۶۰؛ الترمذی : ۵ : ۷۱۰، حدیث ۳۸۹۶، مطبوعۂ قاہرہ ۱۹۹۵ء)۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے دو افراد کے متعلق آپؐ کو کوئی شکایت پہنچائی۔ یہ سن کر آپؐ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آپؐ نے حضرت عبداللہؓ بن مسعود کو کنایۃً فرمایا کہ اس طرح کی باتیں مجھے نہ پہنچایا کرو" (الترمذی، حوالۂ مذکور : البخاری، ۴ : ۱۲۷)۔ اس کے برعکس آپؐ اپنے پاس بیٹھنے والوں کو ترغیب دلایا کرتے تھے کہ دوسروں کے حق میں اچھی باتیں کیا کرو۔ ایک موقع پر فرمایا : "لوگوں کی میرے سامنے سفارش کرو تاکہ تم اجر پاؤ اور اللہ اپنے نبیؐ کی زبان پر جو چاہے فیصلہ جاری کر دے (البخاری، الادب؛ مسلم (البر)، ۴ : ۲۰۲۶، حدیث ۲۶۲۷)۔ یہی ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ تھا کہ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے خدا سے پختہ عہد لے رکھا ہے، اگر بتقاضائے بشریت میری زبان سے کسی کے حق میں کوئی غیر مفید دعا یا جملہ نکل بھی جائے تو متعلقہ فرد کو اس کے بدلے میں رحمت، دل کی پاکیزگی اور روز قیامت کے لیے ذریعہ قربت بنا دے (مسلم، ۴ : ۲۰۰۰، حدیث ۲۶۰۰ تا ۲۶۰۴)؛ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ اخلاق کی بلندی یہ نہیں کہ تم اس کے ساتھ نیکی کرو جو تمہارے ساتھ نیکی کرے اور اس کے ساتھ برائی کرو جو تمہارے ساتھ برائی کرے، بلکہ صحیح اخلاق تو یہ ہے کہ ہر شخص سے نیک سلوک کرو خواہ وہ تم سے برے طریقے ہی سے پیش آئے یا تم پر زیادتی کرے۔ اسی بنا پر آپؐ کے نزدیک نیکی کا مفہوم ہی حسن خلق، یعنی دوسروں سے اچھا برتاؤ تھا۔ آپؐ کا ارشاد ہے : اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ (مسلم، ۴ : ۱۹۸۰، حدیث ۲۵۵۳)۔ یہ بھی آپؐ ہی کا ارشاد ہے : اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا (الترمذی : السنن، ۳ : ۴۶۶، حدیث ۱۱۶۲؛ ابو داؤد، ۵ : ۶۰، حدیث ۴۶۸۲)، یعنی ایمان کی تکمیل اخلاق اور طرز معاشرت کی تکمیل کے بغیر نہیں ہو سکتی : اِنَّ خِیَارَکُمْ اَحَاسِنُکُمْ اَخْلَاقًا (البخاری، ۴ : ۱۲۱، کتاب ۷۸، باب ۳۹)، یعنی تم میں وہی بہتر ہے جس کا اخلاق دوسروں سے اچھا ہو۔ ایک بار آپؐ نے فرمایا کہ اچھے اخلاق والے کو اچھے اخلاق کی وجہ سے روزے دار اور قائم اللیل کا درجہ مل جاتا ہے (ابو داؤد : السنن، ۵ : ۱۴۱، حدیث ۴۷۹۸)۔ آپؐ کے نزدیک حسن خلق سے مراد چہرے کی بشاشت، اچھائی کا پھیلانا اور

لوگوں سے تکلیف دہ امور کا دور کرنا ہے (الترمذی، ۴ : ۳۶۲، حدیث ۲۰۰۵)؛ صرف یہی نہیں، آپ اس جذبے کو پورے معاشرے میں رواں دواں دیکھنا چاہتے تھے، ارشاد تھا : تم اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتے جب تک دوسروں کے لیے بھی وہی پسند نہ کرنے لگو جو خود اپنے لیے پسند کرتے ہو (مسلم، ۱ : ۶۷، حدیث ۴۵؛ احمد بن حنبل : مسند، ۳ : ۲۷۲)۔ ایک موقع پر فرمایا : "ایک دوسرے پر بغض و حسد نہ کرو، نہ ایک دوسرے سے رو گردانی اختیار کرو اور نہ ایک دوسرے کے اندرونی معاملات کی خواہ مخواہ ٹوہ لگاؤ اور اے اللہ کے بندو! سب بھائی بھائی ہوجاؤ" (مسلم، ۴ : ۱۹۸۵، حدیث ۲۵۶۳؛ البخاری ۴ : ۱۲۸، کتاب الادب)۔ یہی وجہ تھی کہ نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم بھی آپ کے در دولت سے پوری طرح مستفید ہوتے رہے۔

(۲) حلم و بردباری : لوگوں کے ساتھ معاملات کرنے میں اکثر حوصلہ شکنی ہوتی ہے، ایسے مواقع پر آپ کا طرز عمل ہمیشہ عفو و بردباری کا رہا؛ چنانچہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں : "آپ نے تمام زندگی اپنے اوپر کی گئی زیادتی کا بدلہ نہیں لیا، بجز اس کے کہ خدائی حرمت کو پامال کیا گیا ہو، پس اس صورت میں آپ سختی سے مؤاخذہ فرماتے تھے (البخاری، ۳ : ۳۹۵ کتاب المناقب؛ مسلم، ۴ : ۱۸۱۲، کتاب الفضائل، حدیث ۲۳۲۷۔ آپ کا یہ بھی فرمان تھا : طاقتور وہ نہیں جو کسی کو پچھاڑ دے بلکہ اصل طاقتور وہ ہے جو غصے کے وقت خود پر قابو رکھے" (البخاری، ۴ : ۱۳۹، کتاب الادب؛ مسلم، حدیث ۲۰۱۴)۔ ایک شخص نے ایک موقع پر نصیحت سننے کی خواہش کی تو فرمایا : "غصہ نہ کیا کر اور اسے تین مرتبہ دہرایا (البخاری، ۴ : ۱۳۹)۔ ایک مرتبہ ایک بدو آیا اور پیچھے سے آپ کی چادر پکڑ کر اس زور سے جھٹکا دیا، کہ گردن مبارک پر نشان پڑ گیا۔ آپ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اس نے نہایت درشتی سے کہا : "میرے ان اونٹوں پر کچھ مال لاد دے، کیونکہ تو نہ اپنے مال سے لادے گا اور نہ اپنے باپ کے مال میں سے"۔ آپ نے فرمایا : "نہیں" اور تین مرتبہ استغفراللہ کہا۔ پھر آپ نے نہ صرف اسے معاف کر دیا بلکہ اس کے ایک اونٹ پر جو اور دوسرے پر کھجوریں لادنے کا حکم دیا (ابو داود، ۵ : ۳۳، حدیث ۴۷۷۵؛ النسائی، کتاب القسامہ، ۸ : ۳۳ و ۳۴، حدیث ۴۷۸۰)۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے اس سے پوچھا : "تجھے کس چیز نے اس گستاخی پر ابھارا؟" اس نے فوراً کہا : "آپ کے حلم اور بردباری نے"۔

ایک قبیلہ مسلمان ہوتے ہی قحط کا شکار ہو گیا۔ وسائل کی کمی کے پیش نظر آپ نے ایک یہودی زید بن سُعْنَہ سے اسی دینار قرض لے کر انہیں خوراک مہیا کر دی۔ ابھی اس کی ادائی کا وقت نہیں آیا تھا کہ زید آپ کی خدمت میں پہنچا اور نہایت درشتی اور کرختگی سے اپنے قرض کی واپسی کا مطالبہ کیا اور کہا : "بخدا تم بنو عبدالمطلب بڑے ہی نادہند ہو"۔ حضرت عمر اس کی اس گستاخی پر برافروختہ ہوگئے اور اس کا سر قلم کرنے کی اجازت چاہی، مگر آپ نے فرمایا : "اے عمر! تمہیں چاہیے تھا کہ مجھے حسن ادا کی تلقین کرتے اور اسے حسن طلب کی"۔ پھر نہ صرف اس کے قرض کی فوری واپسی کا حکم دیا، بلکہ بیس صاع (تقریباً دو من) زیادہ کھجوریں دینے کا حکم دیا۔ یہ سلوک دیکھ کر وہ مسلمان ہوگیا (خفاجی : شرح شفا؛ ابن الجوزی : الوفا، ۲ : ۴۲۵ بعد)۔

(۳) عفو و کرم : آپ جس طرح اپنوں کے لیے پیکر حلم و بردباری تھے اسی طرح دشمنوں کے لیے سراپا جود و کرم تھے۔ آپ نے حیات

مبارک میں کسی ذاتی دشمن سے انتقام نہیں لیا (الترمذی : شمائل) ۔ فتح مکہ کے موقع پر آپؐ کا اپنے خون کے پیاسے دشمنوں کو معاف کر دینا ، اپنے قتل کے لیے آنے والے قاتلوں کو بار بار چھوڑ دینا ، اس سلسلے کی روشن مثالیں ہیں (دیکھیے سطور بالا ؛ [نیز رک بہ غزوات نبوی))]۔

مدینہ منورہ میں ایک بہت بڑی تعداد منافقوں کی تھی ، جن کے رئیس عبداللہ ابن اُبَیّ بن ابی سلول نے نہ صرف ہمیشہ در پردہ دشمنوں کی حمایت کا جرم کیا تھا ، بلکہ مختلف اوقات میں وہ آپؐ کے خلاف بغاوت ، افک وغیرہ کے واقعات میں براہ راست ملوث بھی رہا ، مگر آپؐ نے نہ صرف اسے معاف کیا بلکہ مرنے کے بعد اسے اپنی قمیص پہنائی اور ستر سے زیادہ مرتبہ استغفار کرنے کا وعدہ فرمایا (البخاری ، ۱ : ۴۴۳ ، کتاب الجنائز) ۔ متعدد مرتبہ صحابہؓ نے اسے قتل کرنے کی اجازت طلب کی ۔ مگر آپؐ نے سختی سے منع فرمایا (دیکھیے مفتی محمد شفیع: معارف القرآن، بذیل سورۃ المنافقون)۔

ایک بدوی نے ایک مرتبہ مسجد نبوی میں پیشاب کر دیا ۔ صحابہؓ اسے مارنے کے لیے دوڑے ، مگر آپؐ نے روکا اور اسے اپنی حاجت سے فارغ ہونے دیا ۔ پھر آپؐ نے اس جگہ کو دھونے کا حکم دیا اور اسے نرمی سے سمجھا دیا (ابو داود ، ۴ : ۲۶۳ تا ۲۶۵، حدیث ۳۸۰؛ الترمذی، ۱ : ۲۷۶، حدیث ۱۴۷؛ البخاری ، ۱ : ۷۶ ؛ مسلم ، ۴ : ۲۳۶) ۔ آپؐ کے خدام سے اکثر غلطیاں ہوجاتیں مگر آپؐ انہیں معاف فرما دیتے (مسلم ، ۴ : ۱۸۰۴، حدیث ۲۳۱۰) ۔ اس سلسلے میں بے شمار واقعات مروی ہیں۔

(۴) دوسروں کے جذبات کا احترام : آپؐ دوسروں سے معاملہ کرنے میں ہمیشہ دوسروں کے جذبات کا احترام فرماتے ؛ کبھی کسی پر زبردستی اپنی مرضی مسلط نہیں کرتے تھے۔

حضرت عائشہؓ جب آپؐ کے عقد میں آئیں ، ابھی نوعمر تھیں ۔ اس عمر میں کھیل کود کی طرف ان کے فطری میلان کا آپؐ کو بخوبی احساس تھا ۔ اس بنا پر آپؐ نے حضرت عائشہؓ کو اپنے کھیل کود کے مشاغل جاری رکھنے سے منع نہ فرمایا ۔ خود حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں : "میرے ساتھ کھیلنے کے لیے میری ہمجولیاں میرے گھر آ جایا کرتی تھیں ۔ جب آپؐ تشریف لے آتے تو باہر نکل جاتیں ؛ جب آپؐ چلے جاتے تو پھر چلی آتیں (البخاری ، کتاب الادب ؛ مسلم ، ۴ : ۱۸۹۰ ، کتاب الفضائل ، حدیث ۲۴۴۰؛ ابو داود: السنن، ۵ : ۲۲۶، حدیث ۴۹۳۱) ۔ ایک مرتبہ کسی غزوے سے واپسی کے موقع پر جس ہودج میں حضرت عائشہؓ سوار تھیں ، ہوا کی وجہ سے اس کا پردہ ذرا سا اٹھ گیا ۔ آپؐ نے دیکھا کہ حضرت عائشہؓ کے پاس گڑیاں ہیں اور ان میں ایک گھوڑا بھی ہے ، جس کے دو پر ہیں ۔ پوچھا : "اے عائشہؓ یہ کیا ہے" ؟ کہا : "میرے کھلونے ہیں"۔ فرمایا : "درمیان میں کیا ہے" ؟ کہا : "گھوڑا" ۔ فرمایا : "یہ اس پر کیا دکھائی دے رہا ہے ؟" کہا : "یہ دو پر ہیں"۔ آپؐ نے تعجب ظاہر فرماتے ہوئے پوچھا : "گھوڑا اور اس کے دو پر" ؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا : "آپؐ نے نہیں سنا کہ حضرت سلیمانؑ کے پاس جو گھوڑا تھا اس کے کئی پر تھے"۔ یہ سن کر آپؐ اتنا ہنسے کہ آپؐ کی داڑھیں دکھائی دینے لگیں (ابو داود : السنن، ۵ : ۲۲۷، حدیث ۴۹۳۲) ۔ دوستوں اور ملنے جلنے والوں سے معاملات کرتے وقت بھی آپؐ ان کے جذبات کا خیال رکھتے تھے ۔ ایک مرتبہ آپؐ حضرت سعدؓ بن عبادہ (رئیس قبیلہ خزرج) کو ملنے کے لیے تشریف لے گئے اور اپنے معمول کے مطابق تین مرتبہ جا کر بلند آواز سے سلام کیا اور واپس پلٹنے لگے ۔ حضرت سعدؓ ، جو دانستہ پست آواز سے جواب دیتے جاتے تھے تاکہ آپؐ کی یہ دعا زیادہ

ہوئے پیچھے گئے اور عرض کیا: "یا رسول اللہ! آپؐ کیوں لوٹ رہے ہیں"؟ فرمایا: "تم نے تینوں مرتبہ سلام کا جواب نہیں دیا تھا اس لیے واپس جا رہا ہوں"۔ حضرت سعدؓ نے کہا: "یا رسول اللہ! میں اس لیے آہستہ جواب دے رہا تھا تاکہ آپؐ ہمارے حق میں اور دعا مانگیں"۔ آپؐ نے یہ سنتے ہی فرمایا: "اے اللہ! سعدؓ بن عبادہ کے اہل و عیال پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرما"۔ واپسی پر انھوں نے سواری کے لیے آپؐ کو گھوڑا پیش کیا اور خود پیدل چلنے لگے۔ آپؐ نے فرمایا: "یا تو تم بھی سوار ہو جاؤ اور یا پھر واپس پلٹ جاؤ"۔ حضرت سعدؓ نے آپؐ کے برابر بیٹھنا سوءِ ادب خیال کیا اور واپس پلٹ گئے (ابو داؤد، ۵: ۳۷۲ تا ۳۷۳، حدیث ۵۱۸۵)۔

آپؐ اپنے جاں نثاروں کے جذبات کا اس حد تک احترام فرماتے تھے۔ ارشاد تھا: میں نماز لمبی کرنا چاہتا ہوں، مگر پیچھے سے مجھے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے تو اس کی ماں کا خیال کر کے نماز مختصر کر دیتا ہوں (مسلم، ۱: ۳۴۲، حدیث ۴۷۰؛ النسائی، حدیث ۸۲۶)۔ لوگوں کی مشقت اور تکلیف کا خیال کر کے آپؐ نہایت مختصر وعظ فرماتے (ابو داؤد، ۱: ۶۶۳، حدیث ۱۱۰۷) اور دوسروں کو بھی اس کا حکم دیتے (کتاب مذکور، ۱: ۶۶۲، حدیث ۱۱۰۶)۔ جب کسی کو بطور حاکم مامور کر کے کسی جگہ بھیجتے تو فرماتے: "لوگوں کو خوشخبری دے کر اسلام سے مانوس کرنا اور انھیں (ڈرا دھمکا کر) متنفر نہ کرنا؛ ان کے لیے آسانی پیدا کرنا، مشکل نہیں (مسلم، ۳: ۱۳۵۸، حدیث ۱۷۳۲؛ ابو داؤد، ۵: ۱۷۰، حدیث ۴۸۳۵)۔

(۵) مرتبہ دانی: آپؐ کی معاشرتی زندگی کی ایک اور خصوصیت مرتبہ دانی تھی۔ آپؐ کے ہاں ہر شخص کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کا اصول کارفرما نہ تھا، (مگر یاد رہے کہ اس عزت افزائی میں بھی: اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ [۴۹ الحجرات]: ۱۳، کا اصول پیش نظر رہتا تھا)۔ آپؐ ہمیشہ یہ فرمایا کرتے تھے: انزلوا الناس منازلھم (ابو داؤد، ۵: ۱۷۳، حدیث ۴۸۴۲)، یعنی لوگوں سے ان کے مراتب کے مطابق سلوک کرو۔ آپؐ کا یہ فرمان بھی تھا: "سفید مو (بزرگ) مسلمان، وہ حامل قرآن جو اس میں نہ غلو کرتا ہو اور نہ اس سے کنارہ، نیز انصاف دوست بادشاہ کا اکرام کرنا درحقیقت اللہ تعالیٰ کا اکرام کرنا ہے" (ابو داؤد، ۵: ۱۷۸، حدیث ۴۸۴۳)۔ جب بنو قریظہ نے حضرت سعدؓ بن معاذ کے حکم ہونے پر اپنے قلعوں سے نکلنا منظور کر لیا اور حضرت سعدؓ بلاوے پر وہاں پہنچے تو آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا: قوموا الی سیدکم او خیرکم (البخاری، ۴: ۵۷، الاستئذان، باب ۲۶؛ مسلم (الجہاد)، ۳: ۱۳۸۸، حدیث ۱۷۶۸)، یعنی اپنے سردار کے استقبال کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔ مگر قانون اور حقوق میں آپؐ کے نزدیک چھوٹے بڑے سب برابر تھے: حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "تمام مسلمانوں کی ذمہ داری برابر ہے۔ ان میں سے ادنیٰ شخص بھی اگر چاہے تو کسی کو پناہ دے سکتا ہے" (الترمذی: السنن، ۴: ۱۴۲، حدیث ۱۵۸۰)۔ آپؐ نے یہاں تک فرمایا کہ ایک عورت بھی کسی کو پناہ دینے کی مجاز ہے (حوالۂ مذکور)؛ چنانچہ ایک مرتبہ آپؐ کی چچا زاد بہن حضرت ام ہانیؓ نے اپنے خاندان کے دو آدمیوں کو پناہ دے دی: آپؐ کے سامنے ذکر ہوا تو فرمایا: "جسے تو نے امان دی اسے ہم نے بھی امان دے دی" (حوالۂ مذکور)۔

اسی طرح کسی بڑے آدمی کی خاطرداری کے لیے آپؐ کو اپنے کسی ادنیٰ خادم کی دل شکنی بھی گوارا نہ تھی۔ ایک دفعہ مشرکین نے کہلا بھیجا کہ ہم اس شرط پر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے تیار ہیں کہ آپؐ اپنی مجلس سے چھوٹی قوم کے لوگوں

کو اٹھا دیں ۔ اس موقع پر آپؐ کی طرف سے قرآن کریم میں یہ جواب دیا گیا : وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (۶ [الانعام] : ۵۲)، یعنی جو لوگ صبح و شام اپنے رب کو خاص اس کی رضا کے لیے پکارتے ہیں ان کو اپنے پاس سے مت نکالو۔

(۶) دوسروں کے متعلق حسن ظن : آپؐ ہمیشہ دوسروں کے متعلق حسن ظن رکھتے تھے ۔ اسی بنا پر آپؐ کو کسی سے کوئی ایسی بات سننا گوارا نہ تھی جس سے آپؐ کے دل میں کسی کے خلاف کوئی کدورت پیدا ہونے کا احتمال ہو (الترمذی، ۵ : ۷۱۰، حدیث ۳۸۹۶)۔ آپؐ کا ہمیشہ اس آیۂ کریمہ پر عمل رہا : يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (۴۹ [الحجرات] : ۱۲)، یعنی اے اہل ایمان (دوسروں کے متعلق) بہت بدگمانی کرنے سے بچو کہ بعض گمان محض گناہ ہیں ۔ آپؐ کا ارشاد تھا : "حسن ظن اچھی عبادت ہے" (ابو داؤد، ۵ : ۲۶۶، حدیث ۴۹۹۳) ۔ ایک مرتبہ ایک شخص حاضر ہو کر کہنے لگا : "یا رسول اللہ ! میری بیوی کے ہاں سیاہ رنگ کا لڑکا پیدا ہوا ہے" (یعنی شک کا اظہار کیا) ۔ آپؐ نے فرمایا : "کیا تیرے پاس ایک کوہان والے اونٹ ہیں"؟ اس نے کہا : "ہاں"۔ فرمایا : "ان کا کیا رنگ ہے ؟" کہا : "سرخ"۔ فرمایا : "کیا ان میں مٹیالے رنگ کے بھی ہیں ؟" کہا : "ہاں"۔ فرمایا : "وہ کہاں سے آئے ؟" اس نے کہا : "شاید یہ کسی عرق نے اس کی طرف کھینچ لیا ہو"۔ فرمایا : "اپنے ہاں بھی یہی سمجھ لو" (الترمذی، ۴ : ۴۳۹، حدیث ۲۱۲۸)؛ آپؐ کا فرمان تھا : "تم خاص طور پر بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی بہت ہی بری بات ہے" (مسلم، البر، ۴ : ۱۹۸۰، حدیث ۲۵۶۳؛ الترمذی، البر، ۴ : ۳۵۶، حدیث ۱۹۸۸)۔ بدگمانی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ معاشرے کے تمام افراد ایک دوسرے سے خواہ مخواہ بدظنی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ ایک ایسی بیماری ہوتی ہے جس کی لپیٹ میں آنے سے کوئی شخص بھی نہیں بچ سکتا ۔ آپؐ اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھے ۔ اسی بنا پر خود بھی آپؐ بدگمانی سے بچتے اور دوسروں کو بھی بدگمانی سے بچنے کی تلقین فرماتے۔

اس کے ساتھ ہی آپؐ کا یہ بھی فرمان تھا کہ ان مواقع سے بھی بچو کہ جن سے دوسروں کو بدگمانی کا موقع مل سکتا ہے ۔ اسی بنا پر آپؐ عورت کو تنہا سفر کرنے، یا کسی اجنبی مرد کے ساتھ خلوت کرنے سے روکتے تھے (البخاری، ۳ : ۴۵۳، النکاح، باب ۱۱۱ و ۱۱۲؛ ابو داؤد، ۲ : ۲۴۶، ۲۴۷، حدیث ۱۷۲۳، ۱۷۲۴)؛ آپؐ خود بھی ایسے مواقع سے بچتے تھے، مثلاً ایک مرتبہ شام کو اپنی ایک بیوی کے ساتھ مصروف گفتگو تھے کہ دو صحابہؓ وہاں سے تیز تیز قدم اٹھاتے گزرنے لگے ۔ آپؐ نے فرمایا : "ٹھہر جاؤ، یہ میرے ساتھ میری بیوی صفیہؓ ہے"! انھوں نے عرض کیا : "یا رسول اللہ ! معاذ اللہ کیا آپؐ کے متعلق بھی کسی کو بدگمانی ہو سکتی ہے" ؟ فرمایا : "شیطان انسان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے ۔ کیا خبر وہ تمھیں میرے متعلق بدگمانی میں مبتلا کر دے" (کتاب مذکور، ۵ : ۲۶۷، حدیث ۴۹۹۴)۔

(۷) مکافات : معاملات میں انسانی فطرت عموماً بدلہ و مکافات کی طالب گار رہتی ہے ۔ آپؐ کو اس کا بخوبی احساس تھا ۔ اسی بنا پر آپؐ اپنے ملنے جلنے والوں کی ہمدردی کا ہمدردی سے جاں نثاری کا جاں نثاری سے اور احسان کا احسان سے بدلہ دیتے ۔ غزوۂ احد میں جب حضرت سعدؓ بن ابی وقاصؓ آپؐ کی طرف سے مدافعت میں تیر اندازی کر رہے تھے تو آپؐ ان کا ان الفاظ سے حوصلہ بڑھاتے : "ارم فداک ابی و امی" (البخاری، ۳ : ۱۵۶؛ مسلم، ۴ : ۱۸۷۶، حدیث ۲۴۱۱)، یعنی تیر اندازی کر، تجھ پر میرے ماں باپ قربان ہوں ۔ ہدایا کے بارے میں آپؐ کا یہ

التزامی معمول بیان کیا گیا ہے: كان رسول الله صلى الله عليه و آله وسلم يقبل الهدية و يثيب عليها (ابو داؤد، ۳ : ۸۰۶، حدیث ۳۵۳۶)، یعنی آپؐ ہدیہ قبول فرماتے اور اس پر بدلہ بھی مرحمت فرماتے۔ اس بارے میں آپؐ کا فرمان تھا: تَهَادُوا تَحَابُّوا (مشکوٰۃ، ۲ : ۵۵۰، حدیث ۴۶۹۳؛ مالک: موطأ) یعنی ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو، اس سے باہمی الفت بڑھتی ہے۔ بدلہ دینے میں آپؐ یہ لحاظ نہ فرماتے کہ وہ کس طبقے سے تعلق رکھتا ہے؛ چنانچہ ایک بدوی صحابیؓ زاہرؓ دیہاتی اشیا لا کر آپؐ کی خدمت میں پیش کرتے، آپؐ اس کو شہری چیزیں عنایت فرمایا کرتے اور کہا کرتے: ان زاهرًا باديتنا ونحن حاضروه (مشکوٰۃ، ۲ : ۵۹۱، حدیث ۴۸۸۹؛ ابن الجوزی، الوفا، ۲ : ۴۴۴)، یعنی زاہر ہمارا دیہاتی دوست ہے اور ہم اس کے شہری دوست ہیں۔

آپؐ کے نزدیک شکر گزاری بھی مکافات کی ایک صورت تھی؛ آپؐ کا ارشاد تھا: اگر تم میں سے کوئی کسی کو کچھ دے تو اسے اول تو اس کا بدلہ دینا چاہیے؛ اگر اس کی گنجائش نہ ہو تو ایسے ہدیہ دینے والے کی تعریف کرنی چاہیے؛ جس نے ہدیہ دینے والے کی تعریف کی اس نے اس کا شکریہ ادا کر دیا اور جس نے اسے چھپایا اس نے اس کی ناشکری کی (ابو داؤد، ۵ : ۱۵۸، حدیث ۴۸۱۳)۔ آپؐ کا یہ بھی ارشاد تھا کہ جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ خدا کا بھی شکر گزار نہیں ہو سکتا (ابو داؤد، ۵ : ۱۵۷، حدیث ۴۸۱۱؛ الترمذی)۔ ایک مرتبہ یمن کے ایک حکمران نے آپؐ کو ایک قیمتی حلّہ بھیجا، جو ۳۳ اونٹوں کے عوض خریدا گیا تھا؛ آپؐ نے قبول فرمایا اور پھر آپؐ نے ۲۰ سے کچھ زیادہ اونٹوں سے خریدا ہوا حلہ اسے ارسال فرمایا (ابو داؤد، ۴ : ۳۱۶، حدیث ۴۰۳۴)۔ اگر کوئی شخص ہدیہ دے کر اس کا بدلہ لینے سے ہچکچاتا تو آپؐ کو سخت تکلیف ہوتی؛ چنانچہ ایک بار ایک اعرابی نے آپؐ کو ایک اونٹ (ناقہ) دیا۔ تو آپؐ نے اسے اس کے بدلے میں چھ دو دو سال کے اونٹ (بکر) دینا چاہے اس نے قبول کرنے سے انکار کیا۔ آپؐ نے اس موقع پر خطبہ دیا اور فرمایا: اب میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بجز قریشی، انصاری، ثقفی اور دوسی شخص کے کسی کا ہدیہ قبول نہ کروں گا (الترمذی، ۵ : ۷۳۰، حدیث ۳۹۴۵)۔

(۷) خوش معاملگی: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم معاملات کو اس خوش اسلوبی سے نبھاتے کہ معاملہ کرنے والا شخص ہمیشہ کے لیے آپؐ کا گرویدہ ہو جاتا۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپؐ نے مجھ سے کچھ ادھار لیا۔ وقت آنے پر نہ صرف یہ کہ آپؐ نے وہ قرضہ ادا فرمایا، بلکہ اس سے بھی زیادہ دیا (النسائی (البیوع)، ۷ : ۲۸۳ تا ۲۸۴؛ ابو داؤد، ۳ : ۹۳۲، حدیث ۳۳۴۷)۔ حضرت جابرؓ کی ایک دوسری روایت سے مزید آپؐ کی خوش معاملگی پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ دوران سفر میں ان کا اونٹ ذرا سست رفتاری سے چل رہا تھا، آپؐ نے دیکھا تو پوچھا کہ اے جابرؓ! کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ یہ اونٹ سست چل رہا ہے۔ آپؐ نے دعائے خیر فرمائی جس کی برکت سے سست رفتار اونٹ تیز چلنے لگا۔ پھر فرمایا کہ کیا تو اپنے اس اونٹ کو بیچنا چاہتا ہے؟ کہا ہاں؛ آپؐ نے کچھ اوقیہ چاندی پر خرید لیا۔ مدینہ پہنچنے پر قیمت بھی ادا فرما دی اور اس اونٹ کو بھی واپس لوٹا دیا (البخاری، ۲ : ۶۱، البیوع، ۳۴)۔ اسی قسم کا واقعہ حضرت عمرؓ کے ساتھ بھی پیش آیا (دیکھیے کتاب مذکور، باب ۳۴)۔ ایک مرتبہ ایک شخص سے آپؐ نے ایک اونٹ لیا جو بکر یعنی چھوٹی عمر کا تھا۔ بعد میں اونٹ آ گئے۔ تو آپؐ نے اپنے خادم کو اس اونٹ کی واپسی کا حکم دیا۔ خادم نے آ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ان اونٹوں میں چھوٹی عمر کا (بکر) کوئی اونٹ نہیں

ہے، سارے بڑے (یعنی چھ سات سال کے) ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: وہی دے دو، کیوں کہ لوگوں میں سب سے اچھا وہی ہے جو دوسروں کو ادائیگی اچھے طریقے سے کرتا ہو (ابو داؤد، ۳: ۲۴۶؛ حدیث ۳۳۴۶؛ مسلم، حدیث ۱۶۰۰؛ الترمذی (البیوع) حدیث ۱۳۱۸)۔ ایک مرتبہ آپؐ کے ایک پرانے شریک کار حضرت سائبؓ مجلس میں آئے۔ لوگ ان کی تعریفیں کرنے لگے۔ آپؐ نے فرمایا: میں انہیں بخوبی جانتا ہوں یہ میرے شریک کار رہ چکے ہیں؛ انہوں نے کہا: کنتَ لا تُداری و لا تُماری (ابن ماجہ، (تجارات) حدیث ۲۲۸۷) یعنی آپؐ کسی کو شک و شبہے کا کوئی موقع نہ دیتے تھے (بلکہ معاملہ صاف رکھتے تھے)۔ اسی خوش معاملگی کا یہ نتیجہ تھا کہ آپؐ نے جس سے بھی معاملہ کیا، اس نے آپؐ کی تعریف کی اور وہ آپؐ کے اخلاق کا گرویدہ ہو گیا۔

(۸) **پاس وعدہ و امانت:** آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اپنے وعدے اور امانت کا ہمیشہ خیال رہتا اور کسی نازک سے نازک گھڑی میں بھی اپنی اس ذمہ داری سے خود کو سبکدوش نہ سمجھتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن ابی الحمساء زمانۂ ما قبل از بعثت کا واقعہ نقل کرتے ہیں کہ میں نے آپؐ سے معاملہ کیا، مگر میری طرف سے کچھ بقایا رہ گیا۔ میں نے کہا کہ میں ابھی گھر سے بقایا رقم لے کر آتا ہوں، مگر گھر میں آ کر اپنا یہ وعدہ بھول گیا اور تین دن کے بعد مجھے اپنا وعدہ یاد آیا تو اس جگہ پہنچا جہاں آپؐ سے وعدہ کیا تھا۔ میں جب وہاں پہنچا تو آپؐ کو اپنا منتظر پایا۔ آپؐ نے مجھے دیکھا تو فرمایا: اے نوجوان! تو نے مجھے بڑی مشقت میں ڈالا ہے، میں تین دن سے تیرا منتظر ہوں (ابو داؤد، ۵: ۲۶۸، حدیث ۴۹۹۵)۔ قبل از بعثت کے دور میں خاندان بنو ہاشم اور بعض دیگر نیک دل لوگوں کے درمیان معاہدہ حلف الفضول [رک بآں] طے پایا، آپؐ کو اس معاہدے کی اہمیت کا جس طرح احساس تھا اس کا اندازہ ابن سعد (الطبقات ۱: ۱۲۹، مطبوعۂ بیروت) کی اس صراحت سے ہوتا ہے کہ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ اگر مجھے اس سے کنارہ کش رہنے کے لیے کوئی اعلیٰ نسل کے سو اونٹ بھی دے تو تب بھی اسے قبول نہ کروں اور اگر اب بھی مجھے کوئی اس معاہدے کا نام لے کر پکارے تو میں ضرور اس کی آواز پر لبّیک کہوں۔

اہل مکہ آپؐ کی صداقت و امانت پر اس درجہ یقین رکھتے تھے کہ انہوں نے نہ صرف آپؐ کو الصادق اور الامین کے القاب دے رکھے تھے، بلکہ دشمنی کے سخت ترین ایام میں بھی وہ اپنی امانتیں آپؐ کے پاس رکھ جاتے تھے؛ چنانچہ جس وقت آپؐ نے ہجرت کی، اس وقت مکے کے بہت سے گھرانوں کی امانتیں آپؐ کے گھر میں رکھی ہوئی تھیں جن کا لحاظ کرکے آپؐ نے اپنے چچا زاد بھائی حضرت علیؓ کو پیچھے چھوڑا، جنہوں نے تین دن رہ کر یہ امانتیں لوگوں کو واپس کیں [رک بہ علیؓ؛ ہجرت]۔

(۹) **صحابہؓ کرام کی حوصلہ افزائی:** ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ آپؐ کے اخلاق عالیہ کا یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ گو آپؐ کو منہ پر تعریف پسند نہ تھی کہ اس سے دل میں بڑائی کے احساس پیدا ہونے کا امکان ہوسکتا ہے تاہم آپؐ حسب موقع اپنے متوسلین کی حوصلہ افزائی فرماتے رہتے تھے؛ چنانچہ آپؐ نے اپنے دس ساتھیوں کو نام بنام جنت کی خوش خبری سنائی [رک بہ عشرہ مبشرہ]۔ غزوۂ موتہ [رک بآں] سے جب لشکر واپس آیا تو لوگوں نے اسے میدان جنگ سے فرار کا طعنہ دیا، مگر آپؐ نے فرمایا کہ یہ تو کرّار، یعنی لوٹ کر حملہ کرنے والے ہیں۔ حضرت طلحہؓ کے گھوڑے پر ایک مرتبہ سواری کی تو فرمایا: ہم نے اسے سمندر پایا ہے اور فی الواقع وہ سمندر ہے (البخاری (الجہاد)؛ مسلم (الفضائل)، ۴: ۱۸۰۲، حدیث ۲۳۰۷؛ الترمذی،

(الجہاد) ؛ ۴ : ۱۹۹، حدیث ۱۶۸۴، ۱۶۸۶، وغیرہ) حضرت ابوبکرؓ کو فرمایا : تم میری امت میں سے سب سے پہلے جنت میں داخل ہوگے (مشکوٰۃ، ۳ : ۲۲۳، حدیث ۶۲۴) اور گو کہ تمہاری چادر (نادانستہ طور پر) ٹخنوں سے نیچے لٹک جاتی ہے، مگر تم ان (اہل کبر) میں سے نہیں ہو (البخاری، ۴ : ۱۲۷)۔ حضرت عمرؓ کو فرمایا : بخدا، شیطان تمہیں دیکھ کر اپنا راستہ بدل دیتا ہے (مسلم، ۴ : ۱۸۶۳، حدیث ۲۳۹۶)۔ حضرت زبیرؓ کی بابت فرمایا : ہر نبی کا کوئی خاص حواری ہوتا ہے اور میرا حواری زبیرؓ ہے (کتاب مذکور، ۴ : ۱۸۷۹، حدیث ۲۴۱۵)۔ حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح کو "امین ھذہ الامۃ" قرار دیا (کتاب مذکور، ۴ : ۱۸۸۱، حدیث ۲۴۱۹)۔ حضرت بلالؓ کو فرمایا : تیرے جوتوں کی آہٹ میں نے جنت میں اپنے آگے سنی ہے (کتاب مذکور، ۴ : ۱۹۱۲، حدیث ۲۴۵۸)۔ حضرت عبداللہ بن سلام کی بابت فرمایا کہ وہ دنیا میں چلتے پھرتے جنتی ہیں (البخاری، مطبوعہ لائیڈن، ۴ : ۱۲۷)۔ ایک انصاری کے گھر میں تشریف لے گئے اور ان کے لیے میں دعائے خیر فرمائی (کتاب مذکور، ص ۳۱)۔

(۱۰) عدم تجسس : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو دوسروں کے خفیہ حالات کا تجسس سخت ناپسند تھا، گویا قرآنی حکم: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا (۴۹ [الحجرات] : ۱۲)، یعنی اے اہل ایمان! بہت سے گمانوں سے بچو، کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے حالات کی ٹوہ نہ لگاؤ، پر آپؐ کا شدت سے عمل تھا۔ ایک موقع پر آپؐ نے تجسس کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا : مسلمانوں کے خفیہ حالات کی ٹوہ نہ لگاؤ، کیونکہ جو دوسروں کے حالات کی ٹوہ لگاتا ہے، اللہ تعالٰی اس کے عیوب کو ظاہر کر دیتا ہے اور جس کے عیوب کو خدا تعالٰی ظاہر کرنے پر آمادہ ہوجائے اسے دوسروں کے سامنے رسوا کر دیتا ہے (ابو داؤد : السنن، ۵ : ۱۹۴، حدیث ۴۸۸۰)۔ ان امرا کی آپؐ نے یوں مذمت کی کہ جو لوگوں کے خفیہ حالات کی ٹوہ لگاتے ہیں، کہ جب کوئی امیر لوگوں کی خفیہ باتوں کی ٹوہ میں لگا رہے تو وہ لوگوں (معاشرے) کو فاسد کر دیتا ہے (البخاری (النکاح)؛ مسلم (البر)؛ الترمذی، ۴ : ۳۵۶ حدیث ۱۹۸۸)؛ چنانچہ ایک مرتبہ آپؐ اپنے حجرے میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص دروازے کی درزوں سے اندر جھانکنے لگا، آپؐ ایک لمبا تیر لیے ہوئے تیزی سے اس کی آنکھوں کی طرف مارنے کے لیے بڑھے (ابو داؤد، ۵ : ۳۶۶، حلث ۵۱۷۱)۔ الترمذی (۵ : ۶۴، حدیث ۲۷۰۹) کے مطابق آپؐ نے اس موقع پر فرمایا: اگر مجھے تیرے دیکھنے کا علم ہوتا تو تیری آنکھیں پھوڑ دیتا : تیرا ناس ہو، اجازت مانگنے کا حکم آنکھوں کے لیے ہی تو ہے (نیز مسلم، الادب، حدیث ۲۱۵۷)۔ اسی بنا پر آپؐ کا اپنا بھی یہی معمول تھا اور دوسروں کو بھی اس کا حکم دیتے تھے کہ اجازت طلب کرنے کے لیے دروازے کے بالکل سامنے کھڑے ہونے کے بجائے ذرا ہٹ کر کھڑے ہونا چاہیے (ابو داؤد، ۵ : ۳۶۷، حدیث ۵۱۷۴)۔

(۱۱) چشم پوشی : دوسروں کے خفیہ حالات کا تجسس کرنے کے بجائے آپؐ ہمیشہ دوسروں کے عیوب سے چشم پوشی فرماتے اور اسی کا دوسروں کو حکم دیتے تھے۔ آپؐ کا فرمان تھا : جو کوئی کسی مسلمان کے عیب کو دیکھ کر چشم پوشی کرتا ہے وہ گویا کسی زندہ دفن کی جانی والی بچی کو زندگی بخشتا ہے (ابو داؤد، ۵ : ۲۰۰، حدیث ۴۸۹۱)؛ مزید فرمایا : جو کسی مسلمان کے عیب سے چشم پوشی کرے گا خدا تعالٰی قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا (مسلم، البر، حدیث ۲۵۸۰؛ الترمذی، ۴ :

۳۵، حدیث ۱۴۲۷)۔

آپؐ اگر خود بھی کسی کا عیب دیکھتے تو حتی الوسع چشم پوشی فرماتے۔ ایک مرتبہ ایک شخص حاضر ہوا اور بدکاری کا اعتراف کرتے ہوئے حد جاری کرنے کی درخواست کی۔ آپؐ نے اس سے اعراض فرمایا۔ اس نے مکرر درخواست کی؛ آپؐ نے مکرر اعراض کیا، تا آنکہ اس نے چار مرتبہ اقرار کر لیا، پھر آپؐ نے اس سے پوچھا: کیا تجھے جنون ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ تب آپؐ نے اس پر حد جاری کرنے کا حکم جاری فرمایا (مسلم، ۳ : ۱۳۱۸، حدیث ۱۶۹۱ ببعد)؛ اسی طرح ایک عورت (الغامدیہ) کے بارے میں جب تک آپؐ نے مکرر تحقیق نہ کر لی، حد کا حکم جاری نہ کیا (کتاب مذکور، ۳ : ۱۳۲۲، حدیث ۱۶۹۵)۔ تاہم جب جرم اچھی طرح ثابت ہو جاتا تو پھر آپؐ سزا دینے میں کوتاہی نہ فرماتے تھے تاکہ دوسروں کے لیے اسے عبرت بنایا جائے (حوالۂ مذکور)۔ مقصد یہ تھا کہ معاشرے میں خواہ مخواہ ایک دوسرے سے متعلق بدگمانیاں نہ پنپنے پائیں؛ ہاں اگر صریحاً کوئی جرم ثابت ہو جائے تو سزا دیگر ایسے دوسروں کے لیے عبرت کا ذریعہ بنا دیا جائے۔

(۲۱) ایذا رسانی سے گریز: آپؐ ہمیشہ اس بات کا شدت سے اہتمام فرماتے تھے کہ آپؐ کی کسی بات یا کسی طرز عمل کی وجہ سے کسی کو دلی تکلیف نہ پہنچے: آپؐ کا ارشاد تھا: سچا مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے اس کے مسلمان بھائی محفوظ رہیں (البخاری)۔ اسی بنا پر آپؐ نے اگر کسی شخص میں موجود برائی کا ذکر کرنا ہوتا تو اس کا نام کبھی نہ لیتے، البتہ یہ فرماتے: لوگوں کا کیا حال ہے؟ کہ وہ یہ کہتے یا کرتے ہیں (ابو داؤد، ۵ : ۱۳۳، حدیث ۴۷۸۸)۔ حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا: خدا کے نزدیک سب سے برا شخص وہ ہے کہ جس کی برائی کے ڈر سے لوگ اسے چھوڑ دیں (البخاری (الادب)؛ مسلم (البر) ۴ : ۲۰۰۲، حدیث ۲۵۹۱؛ مالک: موطأ، (حسن الخلق)؛ احمد بن حنبل، مسند)۔ آپؐ اپنے متوسلین کی بابت بھی یہ التزام فرماتے تھے کہ ان کی زبان اور کلام سے بھی کسی کا دل مجروح نہ ہو۔ ایک موقع پر ام المؤمنین حضرت زینبؓ نے بتقاضائے بشریت ام المؤمنین حضرت صفیہؓ کو یہودیہ کہہ دیا۔ آپؐ کو اس سے سخت صدمہ ہوا اور کئی دن تک حضرت زینبؓ سے کلام نہ فرمایا (ابو داؤد، ۵ : ۹، حدیث ۴۶۰۲)۔ ایک مجلس میں ایک شخص حضرت ابوبکرؓ کے سامنے ان کو برا بھلا کہہ رہے تھے اور حضرت ابوبکرؓ خاموش تھے، لیکن جب وہ حد سے بڑھا تو حضرت ابوبکرؓ نے اسے جواب دیا۔ یہ دیکھ کر آپؐ مجلس سے اٹھ کر چل دیے۔ حضرت ابوبکرؓ نے وجہ پوچھی تو فرمایا: پہلے تمہاری طرف سے ایک فرشتہ مامور تھا، مگر جب تم نے جواب دیا تو وہ چلا گیا اور اس کی جگہ شیطان نے لے لی اور میں کسی ایسی مجلس میں نہیں ٹھہر سکتا جہاں شیطان ہو (ابو داؤد، ۵ : ۲۰۴، حدیث ۴۸۹۶)۔ ایک مرتبہ حضرت ابو ذرؓ نے ایک صحابیؓ کو اس کی ماں کی غلامی کا طعنہ دیا۔ آپؐ کو پتا چلا تو فرمایا: اے ابو ذر! ابھی تم میں جاہلی عادات باقی ہیں اور پھر اس سے معاملہ صاف کرنے کا حکم دیا (ابو داؤد، ۵ : ۳۵۹، حدیث ۱۵۵۷)۔ لوگوں کی دل آزاری سے آپؐ کتنا گریز فرماتے تھے، اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپؐ کا یہ ارشاد تھا کہ اگر تین آدمی کسی مجلس میں ہوں تو دو الگ ہو کر باہم سرگوشی نہ کریں اس سے تیسرے آدمی کا دل دکھے گا (مسلم (تحریم مناجات)، ۴ : ۱۷۱۸، حدیث ۲۱۸۴؛ ابن ماجہ (الادب) ۳۷۷۵؛ ابو داؤد، ۵ : ۱۷۸، حدیث ۴۸۵۱)۔ اسی طرح آپؐ دو گفتگو کرنے والے افراد

کے درمیان ان کی اجازت کے بغیر بیٹھنے سے منع فرماتے تھے (الترمذی، ۵: ۸۹، حدیث ۲۷۵۲)؛ کسی مسلمان کو گالی دینا آپؐ کے نزدیک فسق (بد عملی) (کتاب مذکور، ۵: ۲۱، حدیث ۲۶۳۴، ۲۶۳۵) اور اسے کافر کہنا کفر کے مترادف ہے (کتاب مذکور، ۵: ۲۲، حدیث ۲۶۳۶ ببعد)۔

آپؐ غیبت کرنے کی بھی اسی بنا پر سخت مذمت فرماتے تھے کہ اس سے دوسروں کی دل شکنی ہوتی ہے۔ فرمایا: جنت میں چغلخور کبھی داخل نہیں ہو سکے گا (البخاری (الادب)؛ مسلم (الایمان)، ۱۵۰؛ الترمذی (البر))، ۴: ۳۷۵، حدیث ۲۰۲۶) اور آپؐ کے نزدیک غیبت کا مفہوم یہ تھا ذکرکَ اخاکَ بما یکرہ (الترمذی، ۴: ۳۲۹، حدیث ۱۹۳۴) یعنی کسی کا اس انداز سے پس پشت ذکر کرنا کہ اگر وہ سنے تو ناپسند کرے۔ اس کے برعکس ہر کام میں نرمی اور ملائمت، خوش گوئی اور مسلمان بھائی سے نیکی کے کاموں میں تعاون آپؐ کا معمول تھا (البخاری، ۴: ۱۱۹)۔

۱- مختلف طبقوں سے آپؐ کا حسن سلوک:

اولاد سے محبت و شفقت: یوں تو آپؐ کے دل میں تمام بنی نوع انسان کے لیے محبت و شفقت کے جذبات پائے جاتے تھے، مگر چونکہ فطری طور پر انسان اپنے اہل و عیال اور قبیلہ کی نسبت سے پہچانا جاتا ہے، اسی بنا پر آپؐ نے اپنی اولاد سے محبت و شفقت کا ایک اعلیٰ نمونہ قائم کیا؛ اہل عرب اپنے بچوں کو چومنا، ان سے لاڈ پیار کرنا، اپنی سرداری کے منافی سمجھتے تھے، مگر آپؐ نے ہمیشہ اس رسم بد کی مذمت فرمائی۔ آپؐ اپنے بچوں کو گود میں اٹھا لیتے، بعض اوقات کندھے پر بٹھا لیتے؛ سواری پر ہوتے تو اپنے آگے پیچھے انھیں سوار کر لیتے؛ ان کی پیشانی کو چومتے اور انھیں خیر و برکت کی دعا دیتے (البخاری، ۲: ۳۴۴، باب ۲۲)؛ آپؐ انھیں جنت کے گلدستے قرار دیتے، انھیں سونگھتے اور اپنے سینے سے چمٹا لیتے۔ ایک سردار (اقرعؓ بن حابس) نے آپؐ کو بچوں سے پیار کرتے دیکھا تو کہا: میرے دس بیٹے ہیں، میں نے آج تک ان سے پیار نہیں کیا۔ آپؐ نے یہ سنا تو فرمایا: جو کسی پر رحم نہیں کرتا، اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا (مسلم، ۴: ۱۸۰۸، حدیث ۲۳۱۸؛ الترمذی، (البر)، ۴: ۳۱۸، حدیث ۱۹۱۱)، یا اگر خدا نے ہی تیرے دل سے رحم کا جذبہ نکال دیا ہے تو میں کیا کروں (البخاری، ۴: ۱۱۴، الادب، باب ۱۸)۔ آخری عمر میں جب اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ایک بیٹا عطا کیا تو آپؐ کو از حد مسرت ہوئی۔ آپؐ نے اس کا نام ابراہیمؑ رکھا۔ ان کی دودھ پلائی ایک لوہار کی بیوی امّ سیف (امّ بردہ بنت المنذر، ابن سعد: الطبقات، ۱۳۱ تا ۱۳۷) تھیں۔ آپؐ وقتاً فوقتاً اپنے لخت جگر کو دیکھنے کے لیے ان کے ہاں تشریف لے جاتے اور دھوئیں سے معمور مکان میں بیٹھ کر اپنے بیٹے کو پیار کرتے، جب ان کا وصال ہوا تو آپؐ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ کسی نے پوچھا: آپؐ رو رہے ہیں، حالانکہ آپؐ تو رونے سے منع کیا کرتے ہیں۔ فرمایا: یہ تو فرط محبت (رحم) ہے، جبکہ میں نوحہ کرنے (النیاحة) سے منع کرتا ہوں۔ پھر دفن کرتے وقت فرمایا: دل غمگیں ہے اور آنکھیں اشکبار، مگر ہم وہی کہتے ہیں جو خدا کو پسند ہے۔ پھر فرمایا: اے ابراہیمؑ ہم تیرے جدا ہونے پر افسردہ ہیں۔ (ابن سعد، ۱: ۱۳۸ تا ۱۳۹)۔

آپؐ کی نرینہ اولاد زندہ نہ رہی؛ البتہ چار صاحبزادیاں زندہ رہیں اور شادی شدہ ہونے کے بعد واصل بالحق ہوئیں۔ آپؐ نے ان سے اور ان کی اولاد سے جو محبت اور شفقت کا برتاؤ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ حضرت زینبؓ [رک بآں] کی صاحبزادی اُمامہؓ سے آپؐ بے حد شفقت فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ اس حال میں نماز پڑھائی کہ حضرت امامہؓ آپؐ کے

کندھے پر سوار تھیں ، جب رکوع کرتے تو نیچے اتار دیتے ، جب قیام فرماتے تو دوبارہ اٹھا لیتے (البخاری ، ۱ : ۱۴۰ ، الصلوٰۃ ، باب ۱۰۶) ۔ [حضرت فاطمہؓ کے سوا سب صاحبزادیاں آپؐ کی زندگی میں اور وفد نجران کی آمد سے پہلے وفات پا چکی تھیں] ۔

آپؐ کی چھوٹی اور سب سے آخر میں وفات پانے والی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ سے آپؐ کو بے حد محبت تھی ۔ آپؐ انھیں اپنے دل کا ٹکڑا قرار دیتے (البخاری ، مناقب ، ۲ : ۵۲۶ ؛ الترمذی ، ۵ : ۶۹۹ ، حدیث ۳۸۶۹) ۔ آپؐ سفر کرنے سے پہلے سب سے آخر میں اور واپسی پر سب سے پہلے انھیں سے ملتے (احمد بن حنبل : مسند، ۵ : ۲۷۵ ، حدیث ثوبان) ۔ وہ جب آپؐ کو ملنے تشریف لاتیں تو اٹھ کر ان کا استقبال فرماتے اور شفقت سے ان کا ہاتھ چومتے اور انھیں اپنی جگہ بٹھاتے (الترمذی ، ۵ : ۷۰۰ ، حدیث ۳۸۷۲) ؛ ان کے صاحبزادوں حضرت حسنؓ و حسینؓ سے بھی آپؐ بے حد محبت آمیز برتاؤ فرماتے ؛ انھیں گود میں اٹھاتے ، چومتے اور دعا فرماتے : اے اللہ جس طرح میں ان سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت رکھ (البخاری ، ۲ : ۴۴۳) ۔ ایک مرتبہ عین خطبۂ جمعہ کے دوران میں یہ دونوں صاحبزادے گرتے پڑتے مسجد میں جا پہنچے ۔ آپؐ نے انھیں دیکھا تو سلسلۂ کلام منقطع کرکے نیچے اترے اور انھیں اپنی گود میں اٹھا لیا اور فرمایا : اللہ تعالٰی نے سچ کہا ہے کہ تمھاری اولاد اور تمھارے مال تمھارے لیے آزمائش ہیں (۶۴ [التغابن] : ۱۵) ، میں نے انھیں آتے دیکھا ، تو ضبط نہ کر سکا (ابو داؤد ، ۱ : ۶۹۳ تا ۶۹۴ ، حدیث ۱۱۰۹ ؛ الترمذی ، ۵ : ۶۵۸ ، حدیث ۳۷۷۴) ۔ آپؐ انھیں چادر میں لپیٹ لیتے اور اٹھائے رکھتے (الترمذی ، ۴ : ۶۵۲ ، حدیث ۳۷۶۹) ۔ ایک مرتبہ آپؐ انھیں اسی طرح اٹھا کر نکلے تو کسی نے کہا : اے لڑکے ! تم کتنے خوش قسمت ہو کہ تمھیں کتنی عمدہ سواری ملی ہے ۔ آپؐ نے فرمایا : اور سوار بھی تو کتنا اچھا ہے (الترمذی ، ۵ : ۶۶۱ ، حدیث ۳۷۸۴) ۔ آپؐ ایک ران پر حضرت حسنؓ کو اور دوسری پر حضرت امامہؓ کو بٹھا لیتے اور پھر انھیں ملاتے اور فرماتے : اے اللہ جس طرح میں ان پر شفقت کرتا ہوں تو بھی شفقت فرما (البخاری ، ۴ : ۱۱۵ ، ببعد) ۔

۲۔ رشتہ داروں سے مروّت و احسان : گو آپؐ کی نظروں میں خاندانی اور قبائلی حد بندیاں بے معنی تھیں، مگر پھر بھی آپؐ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ خاندان اس بڑے معاشرے کا ایک حصّہ ہیں جو پوری بنی نوع انسان سے عبارت ہے ، اس بنا پر آپؐ نے ان تعلقات کی خوش ادائی ، یعنی صلہ رحمی پر زور دیا اور آپؐ خود بھی ان تعلقات کا حق ادا فرماتے رہے ۔

خاندان ابو طالب سے جو محبت و شفقت تھی اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس خاندان کے ہر فرد سے آپؐ نے آخر تک مروّت واحسان کا سلوک جاری رکھا ۔ حضرت علیؓ کی والدہ محترمہ حضرت فاطمہؓ بنت اسد، جو اسلام لے آئی تھیں ، جب فوت ہوئیں تو آپؐ نے تبرّک کے لیے اپنی قمیص اتار کر پہنائی اور قبر میں کچھ دیر تک لیٹے رہے [رک بہ علیؓ] ؛ حضرت علیؓ کو اپنے خاندان کا ایک فرد بنایا ہوا تھا ؛ حضرت ام ہانی [رک بآں] اور ان کی والدہ (ابن سعد ، ۸ : ۲۲۲) کے گھر میں آپؐ اکثر تشریف لے جاتے اور وہیں استراحت فرماتے ۔ معراج [رک بآں] کے موقع پر بھی ایک روایت کے مطابق ، آپؐ انھیں کے گھر میں استراحت فرما تھے ۔ ایک مرتبہ جب حضرت ام ہانیؓ آپؐ کے ہاں آئیں ، تو آپؐ نے انھیں مرحبا کہا (البخاری ، ۴ : ۱۵۴) ۔ حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کئی برسوں کے بعد حبشہ [رک بآں] سے لوٹے ۔ اس وقت آپؐ خیبر کی مہم سر کر رہے تھے ۔ آپؐ نے اس موقع پر خوشی کا یوں اظہار فرمایا : میں نہیں جانتا فتح خیبر کی خوشی زیادہ ہے یا جعفرؓ کے آنے

کی (ابن سعد)؛ ایک مرتبہ حضرت جعفرؓ آئے تو آپؐ نے اٹھ کر ان کو گلے لگایا اور ان کی پیشانی کو چوما (ابو داؤد، ۵ : ۳۹۲، حدیث ۵۲۲۰)۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ (آپؐ کے چچا زاد بھائی) کو آپؐ سینے سے لگا لیتے اور فرماتے: اے خدا! اسے علم و حکمت عطا فرما (البخاری، ۲ : ۵۴۴، المناقب، باب ۲۴)؛ اپنے رضاعی ماں باپ کو ہمیشہ اپنے اصلی والدین کی نظر سے دیکھتے؛ فتح مکہ کے بعد جب آپؐ مقامِ جعرّانہ میں قیام فرما تھے تو آپؐ کے رضاعی والد تشریف لے آئے، آپؐ نے اپنی چادر بچھا دی اور اس پر باعزت طریقے سے بٹھایا۔ وہیں ان کی رضاعی ماں (یا کوئی اور رضاعی رشتہ دار خاتون) آئیں۔ آپؐ نے اسی کپڑے کے دوسرے کونے پر انھیں بٹھایا، پھر آپؐ کے رضاعی بھائی عبداللہ بن الحارث آئے، آپؐ نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا اور انھیں اپنی جگہ بٹھایا (ابو داؤد، ۵ : ۳۵۴، حدیث ۴۱۴۵)۔

۳۔ دوست احباب سے سلوک: آپؐ اپنے دوستوں [صحابہؓ؛ رکَ بآں] سے بہت مہربانی اور لطف و محبت سے پیش آتے تھے۔ ان سے جب ملتے تو مصافحہ کرتے اور بعض اوقات محبت سے انھیں اپنے سینے سے لگا لیتے (ابو داؤد، ۵ : ۳۸۰، حدیث ۵۲۱۴)؛ انھیں دیکھ کر ہمیشہ آپؐ کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر جاتی (مسلم، ۴ : ۱۹۱۵، حدیث ۲۴۷۵، مناقب جریر بن عبداللہ)؛ آپؐ کا فرمان تھا کہ آدمی کا کسی کو خندہ پیشانی (وجہ طلق) سے ملنا بھی نیکی ہے (الترمذی، ۴ : ۳۴۷، حدیث ۱۹۷۰)۔ اگر کوئی دوست ہدیہ دیتا تو اسے قبول فرماتے اور اس کا حسب توفیق بدلہ بھی دیتے: (ابو داؤد، ۴ : ۸۰۶، حدیث ۳۵۳۶؛ البخاری؛ ۳ : ۲۰۶؛ الترمذی، ۴ : ۳۳۸، حدیث ۹۹۵۳)۔ آپؐ فرماتے: باہم ہدیہ لینے دینے سے دل کی کدورت دور ہوتی ہے اور یہ کہ چھوٹی سے چھوٹی چیز، خواہ بکری کے پائے ہی ہوں، ہدیہ دینے میں حقیر نہیں سمجھنا چاہیے (الترمذی، ۴ تا ۴۴، حدیث ۲۱۳۰)۔

بعض اوقات اپنے دوستوں سے آپؐ بے تکلفی فرماتے، ان کی آنکھوں پر پیچھے سے جا کر ہاتھ رکھ لیتے (ابن الجوزی: الوفا، ۲ : ۴۴۴)؛ اپنے ایک دیہاتی دوست حضرت زاہرؓ کو آپؐ نے ایک مرتبہ بازار میں دیکھا تو پیچھے سے جا کر ان کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور فرمانے لگے اس عبد (بندے) کو کون لے گا؟ حضرت زاہرؓ نے کہا: بیچو گے تو کھوٹا پاؤ گے، فرمایا: تم خدا کے ہاں تو کھوٹے نہیں ہو (مشکوٰۃ، ۲ : ۵۹۱، حدیث ۴۸۸۹، باب المزا)۔

اپنے صحابہ کو آپؐ ہمیشہ اپنے مشوروں میں شریک رکھتے، حضرت عائشہؓ کے بقول: آپؐ سے زیادہ لوگوں سے مشورہ لینے والا میں نے کوئی نہیں دیکھا (ابن الجوزی: الوفا، ۲ : ۲۶۷)۔ مجلس میں ان کے ساتھ مل جل کر بیٹھتے کہ باہر سے آنے والے کو کوئی امتیاز محسوس نہ ہوتا، جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے؛ مجلس کے ہر شریک پر اپنی پوری توجہ دیتے کہ کوئی شخص خود سے زیادہ کسی کو آپؐ کے ہاں مقرب نہ سمجھتا (کتاب مذکور، ۴۶۷)۔ کوئی مشورہ طلب کرتا تو اسے صحیح مشورہ دیتے؛ کوئی مدد مانگتا تو اس کی حسب توفیق مدد فرماتے؛ کوئی سرگوشی کرنا چاہتا تو اس کی طرف کان جھکا دیتے اور اس وقت تک اپنا سر اس سے نہ ہٹاتے جب تک وہ اپنی بات مکمل کرکے اپنا سر پیچھے نہ ہٹا لیتا (ابو داؤد، ۵ : ۱۳۶ تا ۱۴۷، حدیث ۴۷۹۴)۔ مصافحہ کرتے وقت اپنا پورا پنجہ استعمال فرماتے اور تاوقتیکہ دوسرا شخص خود اپنا پنجہ نہ چھڑا لیتا آپؐ اپنا ہاتھ نہیں چھڑاتے (ابو داؤد، ۵ : ۱۴۶، حدیث ۴۷۹۴)۔

اپنے تمام دوستوں سے ایسا محبت بھرا سلوک کرتے کہ ان کو یہ گمان گزرتا کہ وہی آپؐ کے

نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہیں (البخاری، ۲: ۴۱۹)؛ اگر کوئی غلطی پر ہوتا تو بڑے پیار سے اسے سمجھا دیتے ۔ ایک مرتبہ آپؐ ایک مجلس میں تشریف لائے جہاں ایک شخص ادھر ادھر کی باتیں کرکے دوسروں کو ہنسا رہا تھا ۔ آپؐ نے اس کی کمر پر لکڑی چبو دی ، وہ کہنے لگا آپؐ مجھے اس کا بدلہ دیجیے ، آپؐ نے اپنی قمیص اٹھا دی اس نے اٹھ کر آپؐ کی کمر کو بوسہ دیا اور کہا کہ میں تو صرف یہ چاہتا تھا (ابو داؤد ، ۵ : ۳۹۴ ؛ حدیث ۵۲۲۴).

کوئی جان نثاری کرتا تو اس کا احسان یاد رکھتے اور اس کے حق میں دعائے خیر فرماتے۔ حضرت سعدؓ کو غزوۂ احد میں جان نثاری کرنے پر ارمِ فداکَ اَبی و اُمّی، یعنی تیراندازی کرو ، تم پر میرا باپ اور میری ماں قربان ہوں کہا (البخاری ، ۴۷ : ۱۵۶) ؛ حضرت قتادہؓ نے ایک رات پہرہ دیا ، صبح ہوئی تو فرمایا : جس طرح تم نے اپنے نبیؐ کی حفاظت کی ہے ، خدا تمہاری حفاظت فرمائے (مسلم ، ۱ : ۴۷۲، حدیث ۶۸۱) ؛ ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ کے متعلق کوئی نا زیبا بات سننے میں آئی تو فرمایا: اللہ نے مجھے تمہاری طرف مبعوث کیا تو تم نے تکذیب کی، مگر ابوبکرؓ نے تصدیق کی اور اپنے جان و مال سے میری غم‌خواری کی۔ بس کیا تم میرے لیے میرے ساتھی کو نہیں چھوڑو گے؟ (البخاری، ۲ : ۴۰۹ ، مناقب)۔ کوئی دوست بیمار ہوتا تو اس کی بیمار پرسی کے لیے جاتے؛ کوئی ملنے جلنے والا فوت ہو جاتا ہے تو اس کے جنازے میں شریک ہوتے اور اگر ایسا ممکن نہ ہوتا تو اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھتے [رکّ بہ نجاشی] یا قبر پر کھڑے ہو کر دعائے مغفرت کر آتے ۔

آپؐ اپنے ملنے جلنے والوں کو وفات یا شہید ہو جانے کے بعد بھی یاد رکھتے ۔ گاہے بگاہے قبرستان جاتے اور ان کے حق میں دعائے خیر فرماتے ۔ عمومی اجتماعات میں بھی ان کا ذکر آتا تو اشکبار ہو جاتے

اور ان کی وفاداری اور جذبہ و خلوص کی تعریف فرماتے ؛ اگر کوئی دوست تنگدست ہوتا تو اس کی مدد فرماتے ، اگر کوئی اسے پسند نہ کرتا تو اس سے کوئی چیز خرید کر اسے یا اس کے کسی عزیز کو لوٹا دیتے (البخاری ، البیوع ، باب ۳۳ ، ۳۴، ۲ : ۱۵ تا ۱۶) .

۴۔ غریبوں اور مسکینوں سے ہمدردی: آپؐ کو غربا اور مساکین کے ساتھ بہت ہمدردی تھی۔ حضرت خدیجہؓ (البخاری ، ۱ : ۵ ببعد) کے بقول آپؐ غریبوں کے بہی خواہ اور ان کو کما کر دینے والے تھے۔ آپؐ کسی کو تکلیف میں مبتلا دیکھتے تو بے حال ہو جاتے؛ جب تک اس کا بندوبست نہ ہوتا آپؐ کے چہرے پر اطمینان کی جھلک دیکھنے میں نہ آتی (مسلم، الصدقات، ۲ : ۴۰۵ تا ۷۰۵، حدیث ۱۰۱۷) : اگر کوئی شخص غربا پر اپنی تعلّی ظاہر کرتا تو آپؐ فرماتے : تمہیں جو کچھ بھی میسر ہے انہیں محنت کشوں کی وجہ سے ہے (ابو داؤد ، ۳ : ۷۳ ، حدیث ۲۵۹۴ ؛ احمد بن حنبل : مسند ، ۵ : ۱۹۸ ؛ التّرمذی ، ۲ : ۱۷)۔ کہیں سے لونڈی غلام آتے تو آپؐ اپنے رشتہ داروں حتّٰی کہ اپنے جگر گوشہ بتول جنت سے بھی زیادہ غریبوں کا حق سمجھتے (ابو داؤد : السنن ، ۵ : ۳۱۰ ، حدیث ۵۰۶۶)۔ آپؐ کو یہ منظور تھا کہ آپؐ کی بیٹی چکی پیسے ، اپنی کمر پر پانی کا مشکیزہ اٹھائے ، مگر یہ منظور نہ تھا کہ غریبوں (یتامٰی بدر) سے پہلے ان کو آنے والے مال سے حصہ ملے (ابن الاثیر : اسد الغابۃ، ترجمہ اُمّ حکیم)۔ آپؐ ظاہر سے زیادہ باطن پر زور دیتے اور فرماتے کہ اگر تمام روئے زمین بد باطن امیروں سے بھر جائے تب بھی وہ ایک پاک باطن غریب کے برابر نہیں ہو سکتے (البخاری ؛ مسلم ؛ مشکوٰۃ ، ۲ : ۴۶۶ ، حدیث ۵۳۳۶) ۔ اگر کوئی کسی غریب کو برا بھلا کہتا تو آپؐ سخت ناراض ہوتے اور اسے جاہلیت قرار دیتے (ابو داؤد، ۵ : ۳۵۹، حدیث ۱۵۵۷)۔

اگر حضرت ابوبکرؓ جیسے با اثر افراد بھی حضرت بلالؓ اور حضرت صہیبؓ جیسے غربا کو آزردہ کرتے تو آپؐ انھیں ان سے معافی مانگنے کی تلقین فرماتے اور ان کی ناراضگی کو خدا کی ناراضگی سے تعبیر فرماتے (مسلم، ۴ : ۱۹۴۷، حدیث ۲۵۰۴)۔ اگر کوئی غریب فوت ہو جاتا اور آپؐ کی اطلاع کے بغیر اسے دفن کر دیا جاتا تو معلوم ہونے پر خفا ہوتے اور قبر پر کھڑے ہوکر نماز جنازہ ادا فرماتے (النسائی : السنن، کتاب الجنائز؛ البخاری، ۱ : ۳۳۵)۔

خود آپؐ کا غریبوں کے ساتھ جو طرز عمل تھا اس کا اس ارشاد سے اندازہ ہو سکتا ہے : اے اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اٹھا اور مسکینوں کے ساتھ میرا حشر فرما (مشکوٰۃ، ۲ : ۶۶۵، حدیث ۵۲۴۴)؛ آپؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا : اے عائشہؓ! کسی مسکین کو اپنے دروازے سے خالی ہاتھ نہ پھیر، خواہ چھوہارے کا ٹکڑا ہی دو؛ کبھی فرماتے کہ تم ظاہر کی طرف نہ دیکھا کرو؛ بعض اوقات ایک پراگندہ حال شخص خدا کے ہاں یہ مرتبہ رکھتا ہے کہ اگر وہ کوئی قسم کھا لے تو خدا اسے پورا کر دے (مسلم، ۴ : ۲۰۲۴، حدیث ۲۶۲۲)۔ کبھی فرماتے جنت میں داخل ہونے والے اکثر فقرا ہی ہوں گے (مسلم، ۴ : ۲۰۹۶)؛ آپؐ غریبوں کی ہمدردی کا یوں سبق دیتے : اے عائشہؓ! غریبوں سے محبت رکھو اور ان کو نزدیک کرو خدا بھی نزدیک ہوگا (مشکوٰۃ، ۲ : ۶۶۵، حدیث ۵۲۴۴)۔ آپؐ مسجد نبوی میں تشریف لاتے تو نہایت خستہ حال غربا کے ساتھ جسم سے جسم ملا کر بیٹھتے اور فرماتے : تم کو بشارت ہو، تم دولتمندوں سے ۴۰ برس پہلے جنت میں داخل ہوگے۔ یہ ارشاد سن کر ان کے چہرے خوشی سے جگمگا اٹھتے (مشکوٰۃ، ۲ : ۶۶۸، حدیث ۵۲۵۸)۔ کبھی فرماتے : خدا نے مجھے تم میں بیٹھنے کا حکم دیا ہے (ابن الجوزی، ۲ : ۴۳۸)۔

آپؐ کی نظروں میں غریب اور امیر کی تفریق بے معنی تھی؛ اصل قدر و قیمت کی چیز انسان کا جذبہ اور اس کا خلوص تھا؛ چنانچہ غربا کے خلوص کی اس حد تک حوصلہ افزائی فرماتے کہ بعض اوقات ان کے معمولی صدقوں کو امیروں کے بڑے بڑے عطیوں پر اس خیال سے پھیلا دیتے کہ اس کی برکت سے وہ بڑے عطیات بھی قبول کیے جائیں۔

بایں ہمہ آپؐ غریبوں کو ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے اور دوسروں کے مال پر نظر رکھنے کے بجائے جدوجہد اور محنت کی تلقین فرماتے۔ آپؐ کا ارشاد تھا : دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے (مسلم، ۲ : ۷۱۷ ببعد، نیز حدیث ۱۰۳۳ تا ۱۰۴۳)؛ نیز فرمایا : بہترین روزی وہی ہے جو انسان اپنی محنت سے کمائے اور اللہ کے نبی حضرت داؤدؑ اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے۔ غریبوں کو اشد ضرورت کے سوا مانگنے سے سخت منع فرماتے اور اسے قیامت کے دن کی رسوائی قرار دیتے۔ حضرت عوف بن مالک اشجعیؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپؐ نے مجلس میں موجود چند صحابہ کرامؓ سے اس پر بھی بیعت لی کہ وہ کسی سے سوال نہیں کریں گے (مسلم، ۲ : ۷۲۱، حدیث ۱۰۴۳)۔ آپؐ سوال کرنے کے بجائے جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانے اور بازار میں فروخت کرکے روزی کمانے کی ترغیب دلاتے (البخاری، ۱ : ۴۷۳ (الزکوٰۃ) باب ۵۰؛ [نیز رک بہ مسکین، فقیر]۔

۵۔ بیوہ اور یتیموں سے خصوصی شفقت : یتیموں اور بیواؤں سے آپؐ خصوصی شفقت فرماتے اور آپؐ ہمیشہ ان کی بھلائی اور خیر خواہی کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے : الساعی علی الارملة والمسکین کالمجاھد فی سبیل اللہ او کالذی یصوم النھار و یقوم اللیل (الترمذی، ۴ : ۳۳۷، حدیث ۱۹۵۱)، یعنی جو کوئی کسی بیوہ یا مسکین کی بہتری کے لیے کوشاں رہتا ہے، وہ اللہ کے راستے

میں جہاد کرنے والے مجاہد یا دن کو روزہ رکھنے اور رات بھر نوافل پڑھنے والے عابد کی طرح ہے؛ مزید فرمایا: یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں میرے ساتھ اس طرح ہوگا جس طرح ہاتھ کی دو انگلیاں (کتاب مذکور، ص ۳۲۱، حدیث ۱۹۱۸)۔

آپؐ نے بیواؤں کے ساتھ جس ہمدردی کا سلوک فرمایا، اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اہل عرب بیواؤں سے نکاح کرنا پسند نہ کرتے تھے اور انہیں معاشی اور سماجی تحفظ سے محروم رکھتے تھے، مگر آپؐ نے نہ صرف اس کی ترغیب دی، بلکہ خود بھی، بجز حضرت عائشہ صدیقہؓ کے تمام نکاح بیوہ عورتوں سے کیے اور اس طرح نکاح بیوگان کی [illegible] و عملی ترغیب دے کر تاریخ میں ایک مثال [illegible]

۶۔ بیماروں کی تیمارداری: آپؐ کو بیماروں کا بڑا خیال رہتا تھا اور اگر کسی دوست یا کسی عزیز کی بیماری کی خبر ملتی تو اس کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے (البخاری، ۴ : ۲۴ (المرضی)؛ ابو داؤد، ۳ : ۴۷۱ ببعد، حدیث ۳۰۹۲ ببعد) اور اس میں اپنے اور بیگانے کی تمیز روا نہ رکھتے تھے، حتٰی کہ یہودیوں کی عیادت کے لیے بھی تشریف لے جاتے (البخاری، ۴ : باب ۴۴، عیادۃ المشرک) اور بیماری خواہ تھوڑی ہوتی، مثلاً آشوب چشم (ابو داؤد، ۳ : ۴۷۷، حدیث ۳۱۰۲) یا زیادہ، نیز فاصلہ تھوڑا ہوتا کہ پیدل جانا ممکن ہوتا، یا زیادہ، کہ سواری درکار ہوتی، آپؐ اس اہتمام میں فرق نہ آنے دیتے (البخاری، ۳ : ۲۲۴، تفسیر سورۃ النساء، باب ۴؛ ابو داؤد، ۳ : ۴۷۴، حدیث ۳۰۹۶)۔ حضرت سعدؓ بیمار ہوئے تو علاج اور عیادت کی آسانی کے لیے آپؐ نے مسجد ہی میں ان کا خیمہ لگوا دیا تھا (ابو داؤد، ۳ : ۴۷۷، حدیث ۳۱۰۱)۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے: جس کسی نے اپنے بیمار بھائی کی عیادت کی، ایک پکارنے والا (فرشتہ) پکارتا ہے کہ تو خوش و خرم زندہ رہے اور خوش و خرم جنت میں جائے (الترمذی، ۴ : ۳۶۵، حدیث ۲۰۰۸)۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جو کوئی باوضو حالت میں کسی مسلمان بھائی کی عیادت کرے، وہ جہنم سے ستر سال دور کر دیا جاتا ہے (ابو داؤد، ۳ : ۴۷۵، حدیث ۳۰۹۷)۔ آپؐ بیماروں کو جا کر تسلی دیتے، ان کا حوصلہ بڑھاتے اور فرماتے: اے اللہ کے بندو! اپنی بیماریوں کی دوا کرو، کیونکہ اللہ تعالی نے ہر بیماری کا علاج مقرر کیا ہے (الترمذی، ۴ : ۳۸۳، حدیث ۲۰۳۸)۔ آپؐ خود بھی لوگوں کو مختلف سادہ علاج بتلایا کرتے تھے (دیکھیے الترمذی، کتاب الطب، ص ۳۸۳ تا ۴۱۲)۔ آپؐ بیماروں سے نفرت کرنے اور ان کو الگ تھلگ رکھنے کے بھی مخالف تھے؛ چنانچہ بعض اوقات آپؐ بیمار کے ساتھ شریک ہو کر کھانا تناول فرماتے (الترمذی، ۴ : ۲۶۶، حدیث ۱۸۱۷)۔ تاہم آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو جان بوجھ کر وبائی علاقے میں جانے اور یوں کسی متعدی مرض کا شکار ہونے سے منع فرمایا (ابو داؤد، ۳ : ۴۷۸، حدیث ۳۱۰۳)۔

آپؐ بیمار کے چہرے اور پیٹ پر ہاتھ پھیرتے اور فرماتے! اے اللہ فلاں کو شفا دے (البخاری، ۴ : ۴۴)۔ آپؐ بیماروں کی تسلی کے لیے فرماتے: لا بأس طہور انشاء اللہ (کتاب مذکور، ص ۴۵) یعنی کوئی بات نہیں انشاء اللہ ٹھیک ہو جاؤ گے۔ کبھی ارشاد ہوتا: جب کسی مسلمان کو کوئی بیماری یا تکلیف پہنچتی ہے تو اس سے اس کے گناہ اس طرح جھڑتے ہیں، جس طرح سردی میں درختوں کے پتے (حوالۂ مذکور)۔ آپؐ کا ارشاد تھا کہ کسی مریض کی موت کا وقت نہ آیا ہو تو اس کے پاس یہ دعا سات مرتبہ پڑھنے سے اسے شفا ہو جاتی ہے۔ اسل اللہ رب العرش العظیم ان یشفیک (ابو داؤد، ۳ : ۴۷۹، حدیث ۳۱۰۶؛ الترمذی، ۴ : ۴۱۰، حدیث ۲۰۸۳)۔ آپؐ بیماری کی شدت میں بھی موت کی تمنا کرنے سے منع فرماتے

تھے۔ آپؐ کا ارشاد تھا کہ اگر بیماری زیادہ ہی سخت ہو جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے: اللّٰھم أحْیِنی ما کانت الحیاۃ خیرا لی و توفنی ما کانت الوفاۃ خیرا لی (البخاری، ۴: ۴۸؛ ابو داؤد، ۳: ۴۸۰، حدیث ۳۱۰۸)۔

۷۔ غلاموں سے سلوک: معاشرے کے پسماندہ طبقوں کا آپؐ کو خصوصی طور پر خیال رہتا تھا۔ جن میں غلام خاص طور پر شامل ہیں۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ آپؐ نے غلاموں کو ان کے جائز اور فطری حقوق عطا کیے جانے کی تبلیغ فرمائی [رک بہ غلامی]۔ متعدد عبادتوں میں غلاموں کی آزادی کو شامل کیا [رک بہ کفارہ] اور غلاموں کو اپنے جیسا انسان سمجھنے اور ان کی جائز ضروریات پورا کرنے کی بار بار تاکید فرمائی، حتّٰی کہ اپنی آخری وصیت میں اسے پھر دہرایا [دیکھیے بالا مقالہ (حضرت) محمدؐ]۔

آپؐ فرمایا کرتے تھے: یہ غلام بھی تمھاری طرح کے انسان اور تمھارے بھائی بند ہیں، جن کو خدا نے تمھارا مطیع کر دیا ہے، ان غلاموں کو اپنے جیسا کھانا دو، اپنے جیسا کپڑا پہناؤ اور انھیں ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دو، اگر ایسی صورت ہو تو پھر خود ان کی مدد کرو (ابو داؤد، ۵: ۳۶۰، حدیث ۵۱۵۸؛ مسلم (الایمان)، ۳: ۱۲۸۲، حدیث ۱۶۶۱؛ الترمذی (البر)، ۴: ۳۴۴، حدیث ۱۹۴)۔

آپؐ نے خود اپنے غلام حضرت زیدؓ کو آزاد کرکے اپنا متبنّٰی کر لیا تھا۔ ان کے بیٹے حضرت اسامہؓ سے اس قدر آپؐ پیار فرماتے کہ اپنے کسی رشتہ دار بچے سے بھی اتنا پیار دیکھنے میں نہ آتا تھا۔ ایک ران پر ان کو اور دوسری پر حضرت حسنؓ کو بٹھاتے اور فرماتے: اے خدا جس طرح مجھے ان پر شفقت ہے تو بھی ان پر شفقت فرما (البخاری، ۴: ۱۱۵)۔ ایک مرتبہ جب لوگوں کو آپؐ کی بارگاہ میں سفارش کی ضرورت ہوئی، تو انھیں [illegible] کوئی آپؐ کے قریب تر نظر نہ آیا (الترمذی، ۴: ۳۷۰ تا ۳۷۱، حدیث ۱۴۳۰)۔ انھیں صحابہؓ حبِّ رسول (آپؐ کے لاڈلے) کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اپنی خادمہ حضرت ام ایمنؓ کو آپؐ ہمیشہ یا امہ (اے امی) کہہ کر پکارتے (ابن سعد، ۸: ۲۲۳، ذکر ام ایمن)۔ انھیں اپنے اہل بیت میں سے شمار کرتے اور انھیں خاتون جنت قرار دیتے (کتاب مذکور)۔ انھیں آزاد کرکے آپؐ نے اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ سے بیاہ دیا تھا۔ آپؐ کو غلاموں کی فلاح و بہبود کا اس قدر خیال تھا کہ آپؐ کو ان کے حق میں لفظ غلام کا استعمال بھی پسند نہ تھا۔ آپؐ فرماتے تھے: تم میں سے کوئی اپنے غلام کو میرا غلام اور میری لونڈی نہ کہے اور نہ ہی غلام اپنے آقا کو میرے دیوتا اور میری دیوی کہا کرے، بلکہ آقا کہے: میرے بچے یا بچی، اور غلام کہے: اے میرے سردار (ابو داؤد، ۵: ۲۵۶، حدیث ۴۹۷۵)۔ ان کو مارنے کی آپؐ سختی سے مذمت فرماتے اور حکم دیتے: جس نے اپنے لونڈی غلام کو تھپڑ مارا، یا کوئی اور ضرب لگائی تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے آزاد کر دیا جائے (مسلم، (الایمان)، ۳: ۱۲۷۸، حدیث ۱۶۵۷؛ ابو داؤد، ۵: ۳۶۴، حدیث ۵۱۶۶)۔ نیز فرماتے کہ اگر دن میں ستر مرتبہ بھی خادم غلطی کرے تو اسے معاف کر دیا جائے (الترمذی، ۴: ۳۳۶، حدیث ۱۹۴۹)۔ اگر کسی خادم کی پٹائی کا آپؐ کو علم ہوتا تو آپؐ اس کے مالکان کو اسے آزاد کر دینے کی ترغیب دیتے (مسلم، الایمان والنذور، ۳: ۱۲۷۹، حدیث ۱۶۵۸؛ الترمذی، النذور، ۴: ۱۱۳ تا ۱۱۵، حدیث ۱۹۵۸)۔ اگر آپؐ کسی مالک کو اپنے کسی خادم کو مارتے دیکھتے تو فرماتے: یاد رکھو خدا تم پر اس سے زیادہ قدرت رکھتا ہے جتنی تم اس غلام پر رکھتے ہو (مسلم، ۳: ۱۲۸۱، حدیث ۱۶۵۹؛ ابو داؤد، ۵: ۳۶۱، حدیث ۵۱۵۹؛ [illegible] ۱۹۴۸)۔

آپؑ نے غلاموں کو ان کے جائز حقوق دلانے کے سلسلے میں جو اہم انتظامی اقدامات فرمائے ان میں سے ایک یہ تھا کہ آپؑ نے ان کے نکاح کی ترغیب دلائی اور ان کے مابین جبری تفریق کو بالکل باطل ٹھیرایا (ابن ماجه، سنن (الطلاق)) ۔ انھیں مال غنیمت میں سے حصہ دیا جاتا رہا (ابو داؤد، ۳ : ۱۶۹، حدیث ۲۷۲۷) ۔ آپؑ ان کی آزادی کو بہت بڑی عبادت قرار دیتے اور فرماتے جو کوئی غلام آزاد کرے، خدا اس کے ہر عضو کو جہنم سے آزاد کر دے گا (مسلم، ۲ : ۱۱۴۷، حدیث ۱۵۰۹) ۔ ان کے جذبات کا احترام فرماتے، ان کا ہدیہ قبول کرتے، (مسلم، ۲ : ۱۱۴۴، حدیث ۱۵۰۳) ۔ اگر کسی غیر مسلم کا غلام بھاگ کر آپؑ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تو آپؑ اسے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے آزاد فرما دیتے احمد بن حنبل (مسند، ۱ : ۲۴۳؛ ابو داؤد، ۳: ۱۳۸، حدیث ۲۷۰۰) ۔ آزاد شدہ غلاموں کی آباد کاری اور ضروریات زندگی کی فراہمی آپؑ کے نزدیک دوسرے کاموں سے مقدم ہوتی تھی ۔ آپؑ کو غلاموں کی فلاح و بہبود اور تعلیم و تربیت کا بہت خیال رہتا تھا ۔

۸۔ مہمانوں کی خدمت : آپؑ اپنے جد امجد حضرت ابراہیمؑ کی طرح بہت فیاض اور مہمان نواز واقع ہوئے تھے ۔ آپؑ مہمان نوازی کو جزو اسلام قرار دیتے تھے (مسلم، ۱ : ۶۸، حدیث ۴۷ تا ۴۸ بعد) ۔ آپؑ کا گھر اچھا خاصا مہمان خانہ بنا ہوا تھا ۔ ان سرکاری مہمانوں کو زیادہ تر مسجد نبوی میں ٹھیرایا جاتا اور آپؑ بنفس نفیس ان کی تواضع فرماتے تھے ۔ اس کے علاوہ دو انصاری خواتین رملہ وام شریک کے مکانات بھی دارالضیوف کا کام دیتے تھے (الزرقانی، جلد ۴ : ۱ تا ۸۰، ذکر وفود ؛ مسلم، ۲ : ۵۱۹) اور اس بارے میں مسلم یا کافر کی کوئی تمیز نہ تھی ۔ آپؑ کے پاس غیر مسلم مہمان بھی آتے رہتے تھے، جو بعض اوقات بڑی بھاری ضیافت سے شکم سیر ہوتے، مثلاً ایک مرتبہ ایک غیر مسلم مہمان نے سات بکریوں کا دودھ پی لیا (الترمذی، ۴ : ۲۶۷، حدیث ۱۸۱۹) ۔ اکثر مہمان نوازی سے آپؑ کو اور آپؑ کے گھر والوں کو فاقہ کرنا پڑتا، مگر آپؑ کی پیشانی پر کوئی شکن نمودار نہ ہوتی (احمد بن حنبل : مسند، ۶ : ۳۹۷) ۔ آپ کا یہ طرز عمل دیکھ کر کافر مشرف باسلام ہو جاتے (حوالہ مذکور) ۔ آپؑ رات کو اٹھ اٹھ کر مہمانوں کی خبرگیری فرماتے ۔ اگر گھر میں گنجائش نہ ہوتی تو آپؑ مہمانوں کو صحابہؓ میں تقسیم فرما دیتے اور فرماتے : جس کے گھر میں دو آدمیوں کا کھانا ہو، وہ تین کو لے جائے، چار کا ہو تو پانچ چھ کو لے جائے (مسلم، ۳ : ۱۶۲۷، حدیث ۲۰۵۷) ۔ مہمان بعض اوقات غلط حرکتیں کر بیٹھتے، آپؑ ان کو شفقت اور محبت سے سمجھا دیتے ۔ ایک مرتبہ ایک مہمان نے آپؑ کا حصہ بھی تناول کر لیا ۔ آپؑ نے بجز دعائے خیر کے کچھ نہ کہا (کتاب مذکور، ۱۶۲۳، حدیث ۲۰۵۳) ۔ ایک بدوی نے ایک مرتبہ صحن مسجد میں پیشاب کر دیا، صحابہؓ مارنے کے لیے دوڑے، مگر آپؑ نے منع فرما دیا (ابو داؤد، ۱ : ۲۶۳ تا ۲۶۴، حدیث ۳۸۰) ۔ کئی کئی روز قیام کے بعد جب مہمان رخصت ہونا چاہتے تو آپؑ حضرت بلالؓ کو فرماتے : اجزهم كما تجيز الوافد (ابن سعد، ۱ : ۲۹۸)، یعنی ان کو اسی طرح سامان دو، جس طرح آنے والے مہمان کو دیا جاتا ہے ۔ دستور کے مطابق بوقت رخصت عام طور پر فی کس پانچ اوقیہ چاندی دی جاتی تھی (کتاب مذکور، ص ۴۰۷) ۔

آپؑ کی مجلس میں بعض غیر مسلم مہمان آداب مجلس ملحوظ نہ رکھتے مگر آپؑ انھیں معاف فرما دیتے ۔ بعض یہودی مجلس میں آ کر السلام علیکم کے بجائے (معاذ اللہ) السام علیکم کی بد دعا دیتے، مگر آپؑ درگزر فرماتے ۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے

جواب میں و علیکم السام کے الفاظ کہے ، آپؐ نے ناپسند کیا (ابو داؤد ، ۵ : ۳۸۴ ، حدیث ۵۲۰۶)۔ یہودی اس کے علاوہ بھی طرح طرح کی بد زبانیاں کرتے (۴ [النساء] : ۴۶)۔ بعض لوگ انھیں ترکی بترکی جواب دینا چاہتے ، مگر آپؐ تحمل اور بردباری کا سلوک فرماتے (الترمذی ، ۴ : ۵۵ ، حدیث ۲۰۱۶)۔

آپؐ کے گھر میں اگر کوئی غیر مسلم مہمان آتا تو اس کی خاطر مدارت میں کمی نہ کی جاتی ؛ آپؐ خود بنفس نفیس ان کی خدمت فرماتے (دیکھیے بالا)۔ نصارائے نجران کو نہ صرف مسجد میں ٹھیرایا، بلکہ ان کو اپنے طریقے کے مطابق مسجد ھی میں عبادت کرنے کی اجازت فرما دی (ابن القیم : زاد المعاد، نیز دیکھیے البخاری کتاب الادب، باب حق الضیف، اکرام الضیف و خدمتہ ایاہ بنفسہ ، ۴ : ۱۴۲ ببعد)۔

۹۔ بچوں سے الفت : آپؐ تمام بچوں سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے اور ان سے الفت بھرا سلوک فرماتے اور یہی تعلیم دوسروں کو دیتے ، آپؐ کا ارشاد ھے : مَن لّم یرحم صغیرنا و یعرف حق کبیرنا فلیس منّا (ابو داؤد، ۵ : ۲۳۲ ، حدیث ۴۹۴۳)، یعنی جو کوئی چھوٹوں پر شفقت نہیں کرتا اور بڑوں کا حق نہیں پہچانتا وہ ھم میں سے نہیں ؛ مزید فرماتے : رحمت تو بد قسمت لوگوں کے دلوں سے ہی نکالی جاتی ھے (الترمذی ، ۴ : ۴۲۳ ، حدیث ۱۹۲۳)۔ راستے میں کھیلنے والے بچوں پر سے گزر ھوتا تو مسکرا کر سلام فرماتے (البخاری ۴ : ۱۷۱ ؛ مسلم ۴ : ۱۷۰۸ ، حدیث ۲۱۶۸ ؛ الترمذی ۵ : ۵۷ ، حدیث ۲۶۹۶)۔ اگر آپؐ سواری پر سوار ھوتے ، تو اپنے آگے اور پیچھے بچوں کو سوار کر لیتے اور اسی حال میں گھر تشریف لاتے (مسلم ، الفضائل ، ۴ : ۱۸۸۵ ، حدیث ۲۴۲۸ ؛ ابن ماجہ (الادب) ۳۷۷۳)۔

آپؐ بچوں کو چومنا، ان سے لاڈ پیار کرنا، ان کا حق سمجھتے تھے۔ اور اسے دل میں موجود جذبۂ شفقت و رحمت کا نتیجہ قرار دیتے (الترمذی، (البر)، ۴ : ۳۱۸ ، حدیث ۱۹۱۱)۔ ان والدین کی تعریف فرماتے جو اپنی اولاد، بالخصوص بچیوں، کے لیے تکالیف جھیلتے اور انھیں آسائش پہنچانے کی سعی کرتے ھیں (الترمذی ، ۴ : ۳۱۹ ، حدیث ۱۹۱۵ ؛ البخاری ، ۲ : ۱۱۳ ، باب ۱۸)۔ آپؐ تمام بچوں کو سلوک اور مروت میں یکساں سمجھنے کی تلقین فرماتے ؛ اگر کوئی صحابیؓ کسی ایک کو دوسروں پر بلاوجہ ترجیح دیتا تو اسے ظلم قرار دیتے (النسائی ، حدیث ۳۷۱۸ ؛ ابو داؤد ، ۳ : ۸۱۵ ، حدیث ۳۵۴۴ ، ۳۵۴۵)۔

آپؐ کو بچوں کی تعلیم و تربیت کا ھمیشہ خیال رہتا تھا۔ آپؐ ان والدین کو ، جو بالخصوص تین (یا دو) بچیوں کی تعلیم و تربیت کا اچھی طرح حق ادا کرکے ، ان کا مناسب گھرانوں میں نکاح کر دیتے ھیں جنت میں داخلے کی بشارت سناتے تھے۔

آپؐ کے نزدیک بچوں کو ادب سکھانا ایک صاع صدقہ کرنے سے افضل تھا (الترمذی ، ۴ : ۳۳۷ ، ۱۹۵۱)۔ اگر کسی بچے سے غلطی ھو جاتی، تو نہایت محبت اور پیار سے اسے سمجھا دیتے اور پھر شفقت سے سر پر ھاتھ پھیر کر دعا دے کر رخصت فرماتے۔ آپؐ کا طریق تربیت بڑا مشفقانہ اور حکیمانہ تھا۔ (ابو داؤد کتاب الجہاد)؛ اگر کوئی بچہ بغیر سلام کیے اور اجازت مانگے اندر چلا آتا تو آپؐ اسے نہایت نرمی سے فرماتے : پہلے باھر جا کر سلام کرو اور کہو کیا میں اندر آ سکتا ھوں۔ جب اجازت مل جائے تو پھر اندر آنا (الترمذی ، الاستیذان ، ۵ : ۶۵، حدیث ۲۷۱۰ ؛ ابو داؤد ، ۵ : ۳۶۸ ، حدیث ۵۱۷۶)۔

آپؐ کے پاس بہت چھوٹی عمر کے بچے لائے جاتے؛ آپؐ انھیں اٹھاتے ، پیار کرتے ، خیر و برکت کی دعا دیتے اور تحنیک فرماتے یعنی کھجور وغیرہ چبا کر ان کے منہ میں ڈالتے (ابوداؤد، ۵ : ۳۳۲، حدیث ۵۱۰۶)۔ بعض بچے آپؐ کے کپڑوں پر پیشاب کر دیتے، مگر آپؐ

ان کو کچھ نہ کہتے اور پانی منگوا کر کپڑے صاف فرما دیتے (البخاری، ۴ : ۱۱۵، باب ۲۱)؛ بعض بچے آپ کی مہر نبوت [رک بہ شمائل و اخلاق نبوی] سے کھیلنے لگ جاتے؛ لوگ منع کرنا چاہتے، مگر آپؐ روک دیتے (کتاب مذکور، ۷۸/۱۱، ۴ : ۱۰۳، باب من ترک صبیۃ غیرہ حتّٰی تلعب)۔ بچوں سے ان کی سمجھ بوجھ کے مطابق بات کرتے۔ حبشہ سے آنے والی ایک بچی کو اسی کے زبان میں حسنہ کے بجائے سَنَہ سَنَہ فرماتے (حوالۂ مذکور)۔ کہیں سے کوئی تحفے آتے تو ان میں بچوں کا حصہ مخصوص رکھتے؛ ایک مرتبہ سیاہ دھاری دار کپڑا آپؐ کی خدمت میں آیا تو آپؐ نے ام خالد نامی بچی کو بلایا اور اپنے ہاتھ سے پہنا کر فرمایا: پہن اور بوسیدہ کر، پہن اور بوسیدہ کر (البخاری، ۷۷/۳۲، ۴ : ۸۶)۔ کوئی میوہ ہوتا تو سب سے کم عمر بچے کو کھلاتے (الطبرانی: معجم صغیر، بذیل میم)

بچوں کو بلانا ہوتا تو یَا بُنَیَّ (اے پیارے بچے) کہہ کر بلاتے (ابو داؤد، ۵ : ۲۳۸، ۴۹۶۴)۔ بچوں سے دل لگی فرماتے: حضرت انسؓ کو بعض اوقات اے دو کانوں والے (یا ذَا الاذنین) کہہ کر پکارتے (الترمذی، ۴ : ۳۵۸، ۱۹۹۲؛ ابو داؤد ۵ : ۲۷۲، حدیث ۵۰۰۲)۔ ان کے چھوٹے بھائی عمیر کی ایک پالتو چڑیا مر گئی تو آپؐ دل لگی کے طور پر فرماتے، یا عمیر ما فعل النغیر، یعنی اے عمیر تیری نغیر نے کیا کیا (البخاری، ۷۸/۱۱۲، ۴ : ۱۵۹؛ الترمذی (الصلاۃ) ۲ : ۱۵۴، حدیث ۳۳۳)۔

القصہ آپؐ بچوں سے لاڈ پیار، شفقت و محبت کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیم و تربیت کا بہت خیال رکھتے تھے۔

۱۰۔ دشمنوں سے سلوک: آپؐ صرف اپنوں کے لیے ہی نہیں بلکہ دشمنوں کے لیے بھی مجسمہ رحمت و شفقت تھے۔ آپؐ نے کبھی کسی دشمن سے اپنی ذاتی عداوت کا انتقام نہیں لیا (ابو داؤد، ۵ : ۱۴۲، حدیث ۴۷۸۶)؛ آپؐ سے متعدد مرتبہ مشرکین کے حق میں بددعا کرنے کی درخواست کی گئی؛ آپؐ نے ایسے موقعوں پر فرمایا: اے اللہ! میری قوم کو ہدایت فرما؛ کیونکہ وہ نہیں جانتے (البخاری)۔ ایک دوسرے موقعے پر بنو دوس کے حق میں اسی قسم کی بد دعا کی درخواست کی گئی تو فرمایا: اے اللہ! بنو دوس کو ہدایت دے اور انہیں مسلمان کرکے لا (مسلم، ۴ : ۱۹۵۷، حدیث ۲۵۲۴)۔ ایک اور موقع پر فرمایا: میں ذریعہ لعنت نہیں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں (مسلم، ۴ : ۲۰۰۷، حدیث ۲۵۹۹)۔ ہجرت کے بعد مکے والوں پر کوئی قدرتی وبا (مثلاً قحط) آئی اور وہ آپؐ کے پاس دعا کے لیے حاضر ہوئے تو آپ ان کی دشمنی کے باوجود ان کے حق میں دعائے خیر فرماتے۔ (البخاری، ۳ : ۳۲۸، تفسیر (الدخان))۔ بنو ثقیف کے حق میں بددعا کی درخواست کی گئی تو فرمایا: اے اللہ! بنو ثقیف کو ہدایت دے اور ان کو مسلمان بنا کر لا (ابن سعد، ۲ : ۱۵۹)۔

جہاں تک مروت و احسان کا تعلق تھا تو اس میں آپؐ اپنے اور بیگانے میں تمیز روا نہ رکھتے۔ آپؐ مشرکین کے تحفے تحائف قبول فرماتے اور انہیں بدلہ بھی دیتے (الترمذی، ۴ : ۱۴۰، حدیث ۱۵۷۷)۔ آپؐ کی اسی وسعت قلبی کا نتیجہ تھا کہ خیبر کی ایک یہودیہ عورت نے آپؐ کو گوشت میں زہر ملا کر پیش کر دیا، گو آپؐ نے کم کھایا، مگر ایک صحابیؓ اس کو کھانے کے نتیجے میں انتقال کر گئے (البخاری، ۳ : ۱۳۲، غزوۂ خیبر)۔

آپؐ بعض یہودیوں کی عیادت کے لیے بھی تشریف لے جاتے اور انہیں اسلام کی دعوت دیتے (البخاری، ۷۵/۱۱، ۴ : ۴۴، عیادۃ المشرک)۔ اگر کوئی یہودی رضا کارانہ طور پر آپؐ کی خدمت کرنا چاہتا تو اسے منع نہ فرماتے (حوالۂ مذکور)۔ اگر کسی یہودی کا

کسی مسلمان سے ، حتیٰ کہ آپؐ اور حضرت موسیٰؑ کی فضیلت کے بارے میں بھی ، جھگڑا ہو جاتا تو آپؐ نرمی سے مسلمان کو سمجھا دیتے (البخاری ، ۲ : ۳۵۴) ۔ بعض یہودی آپؐ کی شان میں گستاخی کرتے ، مگر آپ ہمیشہ درگزر اور تحمل سے کام لیتے ۔

۱۱ ۔ حیوانات پر مہربانی : آپؐ کے قلب اطہر میں بنی نوع انسان کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام جانداروں کے لیے بھی شفقت و رحمت کا جذبہ موجزن رہتا تھا ۔ اسی بنا پر آپؐ صحابہؓ کو جانوروں کی عمدہ دیکھ بھال کرنے کی تلقین فرماتے ۔ اگر کسی جانور کو بدحال دیکھتے تو فرماتے : ان بے زبانوں کے بارے میں خدا سے ڈرو ؛ ان پر سواری بھی اچھے طریقے سے کرو اور ان کو کھانا بھی عمدہ طریقے سے دو (ابو داؤد ، ۳ : ۴۹ ، حدیث ۲۵۴۸) ۔ اگر کسی جانور کے منہ پر داغ لگے نظر آتے تو سخت خفا ہوتے اور فرماتے : کیا تمھیں میری بات نہیں پہنچی کہ میں نے بے زبانوں کے منہ پر داغ لگانے اور ان کی شکلیں بگاڑنے سے منع کیا ہے (مسلم ، اللباس ، ۳ : ۱۶۷۳ ، حدیث ۲۱۱۷ ؛ ابو داؤد ، ۳ : ۵۷ ، حدیث ۲۵۶۴) ۔ اگر کسی کو مرغ کی سحر خیزی کی وجہ سے شکایت پیدا ہوتی ہو تو فرماتے : مرغ کو برا بھلا نہ کہو ، کیوں کہ وہ نماز کے لیے جگاتا ہے ، مزید فرمایا : جب تم مرغ کی بانگ سنو تو خدا سے اس کا فضل مانگو ، کیوں کہ وہ کسی رحمت کے فرشتے کو دیکھ کر بولتا ہے (ابو داؤد ، ۵ : ۳۳۱ ، حدیث ۵۱۰۱ ، ۵۱۰۲ ؛ البخاری ، (بدؤ الخلق) ، ۴ : ۱۵۵ ؛ مسلم ، الذکر ، ۴ : ۲۰۹۱ ، حدیث ۲۷۲۹ ؛ الترمذی ، الدعوات ، ۵ : ۵۰۸ ، حدیث ۳۴۵۹) ۔ مزید فرمایا : اگر کسی کے لگائے ہوئے کھیت یا پودے کو کوئی جانور یا پرندہ چر جائے تو لگانے والے کو صدقے کا اجر ملے گا (البخاری ، ۲۷/۷۸ ، ۴ : ۱۱۷) ۔

رحمت دو عالمؐ نے نہ صرف جانوروں کے ساتھ مہربانی کے سلوک کی تعلیم دی ، بلکہ دور جاہلی کی وہ رسمیں بھی ختم کرائیں جو جانوروں کو ایذا پہنچاتی تھیں ، مثلاً زندہ جانور کا گوشت یا ان کی دم یا ایال کے بال کاٹنا ، ان کو باہم لڑانا ، ان پر نشانہ بازی کرنا وغیرہ ، ان تمام امور کو آپؐ نے بے رحمی سے تعبیر کیا اور ان کی ممانعت کی ۔

پرندوں کے انڈوں کو چرا لینا ، یا ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو پکڑ لینا عرب میں عام طور پر رائج تھا ۔ آپ کے سامنے ایک دو مرتبہ ان کو دہرایا گیا تو آپ نے ہر بار سختی سے منع فرمایا (ابو داؤد ، ۳ : ۴۶۹ ، حدیث ۳۰۸۹) ۔

خلاصہ یہ کہ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم ، تمام موجود و غیر موجود ، اپنوں اور بیگانوں ، انسانوں اور جانوروں سبھی کے لیے مجسمۂ رحمت و شفقت تھے ۔ آپؐ کی شفقت اور مہربانی بلا امتیاز رنگ و نسل ہر شخص کے لیے تھی ۔ آپؐ کے پاکیزہ اخلاق کا یہ بیان اس قدر طویل ہے کہ اس کے لیے بڑی سے بڑی ضخامت بھی ناکافی ہے ، یہ مختصر بیان جو اس مقالے میں ہوا ، صرف آپؐ کے اخلاق عالیہ کی طرف مجمل اشارات پر مشتمل تھا ؛ تفصیل کے لیے متن میں مذکور حدیث و سیرۃ کی کتابوں کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے ۔

مآخذ : متن میں مذکورہ حوالوں کے علاوہ دیکھیے مآخذ و کتب سیرت [محمود الحسن عارف رکن ادارہ نے لکھا] ۔

(ادارہ)

آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم بحیثیت مبلّغ اعظم : (لغوی اور اصطلاحی بحث کے لیے رک بہ مبلّغ / تبلیغ) ، اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں میں جو انبیاے کرام مبعوث ہوئے ان تمام کا امتیازی وصف یہ ہوتا تھا : مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ (۵ [المآئدۃ] : ۹۹) ، یعنی رسول کے ذمے تو فقط (احکام خداوندی کا) پہنچانا (بلاغ) ہی ہے ۔ اس

لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ ہر نبی بنیادی طور پر ایک داعی اور ایک مبلّغ قوم ہی ہوتا تھا جو إنذار (ڈر سنانے) اور تبشیر (بشارت دینے) کے ذریعے اقوام و ملل کو گمراھی کی دلدل سے نکالنے کی سعی بلیغ کرتا تھا (۷ [الاعراف] : ۱۸۴)۔ ان کی تبلیغ نذیر عریان کی مانند ہوتی تھی جو کسی بہت بڑے خطرے کو مسلط ہوتا ہوا دیکھ کر اپنی قوم کو خواب غفلت سے جھنجھوڑنے کی کوشش کرتا ہے اور جو لوگ اس کی آواز پر کان دھرتے ہیں وہ نجات پا جاتے ہیں اور جو لوگ مخالفت کرتے ہیں تباہ ہو جاتے ہیں (البخاری : الجامع الصحیح، کتاب الرقاق، باب ۲۶، ۴ : ۲۲۷، مطبوعہ لائیڈن)۔

نبوت و رسالت بجائے خود تبلیغ ہے اور اس لحاظ سے جملہ انبیا اصولاً مبلّغ ہی تھے، لیکن آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم کامیاب ترین مبلغ ثابت ہوے ہیں، جنھوں نے اپنے خاص الخاص طریق تبلیغ سے وہ انقلاب برپا کیا، جو تاریخ عالم میں بے مثال ہے (سید سلیمان ندوی : سیرۃ النبی، ۴ : ۳۹۸ تا ۴۰۳)۔ آپ کی تمام زندگی ایک بے مثال داعی اور کامیاب مبلّغ کی زندگی ہے۔ ہجرت مدینہ کے بعد، گو آپ کو مدینہ منورہ میں حکمران کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی، مگر آپ پھر بھی ایک مبلّغ ہی رہے (Sir Thomas Arnold : *The Preaching of Islam*، ص ۱۵، ترجمہ عنایت اللہ، کراچی ۱۹۶۴ء)۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی بے مثال کامیابی کا راز صرف اور صرف آپ کی کامیاب اور با اصول تبلیغ میں مضمر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تبلیغی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے : پہلا دور مکّی ہے جو تقریباً تیرہ سال کے عرصے پر محیط ہے؛ دوسرا مدنی دور ہے جو تقریباً دس سال کے زمانے پر حاوی ہے۔ ان دونوں عرصوں میں آپ یکساں جذبے اور وفور انہماک سے مصروف تبلیغ رہے، مگر ان دونوں ادوار میں آپ کی تبلیغ اور اس کا اسلوب قدرے مختلف رہا۔ مکی زندگی میں تبلیغ زیادہ تر نجی اور انفرادی سطح پر کی جاتی رہی، جب کہ مدنی دور میں انفرادی سطح پر تبلیغ کے علاوہ خطوط اور وفود کی صورت میں بھی تبلیغ کی گئی۔

مکی زندگی میں آپ کی تبلیغ کے تین درجے تھے: (۱) تبلیغ بہ نفس خود : یعنی وہ عرصہ جو آپ نے غار حرا میں تحنث کرتے ہوے گزارا (البخاری، ۱ : ۵، باب کیف کان بدؤ الوحی)؛ تحنث کے معنی ہیں ایک قسم کا غور و فکر، جو آپ کائنات کے متعلق اور خود اپنے متعلق فرمایا کرتے تھے (شبلی : سیرۃ النبی، ۱ : ۲۰۲) یا تزکیۂ باطن کے لیے گناہوں سے اجتناب، ملت حنیفی، یعنی دین ابراہیمی کی اتباع میں عبادات یا پھر کائنات میں گہرا غور و فکر (الزرقانی : شرح المواھب، ۱ : ۲۱۰)؛ (۲) تبلیغ بہ خویش و اقارب : اپنوں کو تبلیغ، آپ کو اس کا حکم (۲۶ [الشعرآء] : ۲۱۴) میں دیا گیا؛ چنانچہ تقریباً تین سال تک آپ نہایت خاموشی سے اپنے عزیز و اقارب اور دوست احباب میں تبلیغ فرماتے رہے، جس کے نتیجے میں تقریباً چالیس مرد و زن مشرف باسلام ہوے۔ یہ عرصہ جو فترۃ وحی کا عرصہ کہلاتا ہے، مکی دور میں تبلیغ نبوی کے کامیاب ترین ادوار میں سے ہے۔ اس عرصے میں ایسی نیک فطرت ہستیوں نے اسلام قبول کیا جنھوں نے مستقبل میں نہایت اہم کام سرانجام دیے۔ یہ چالیس نفوس قدسیہ السابقون الاولون (۹ [التوبہ] : ۱۰۰) کا مصداق ہیں (دیکھیے *The Preaching of Islam*، مترجمہ، عنایت اللہ، ص ۲۹ تا ۲۰۷؛ محمد یوسف : حیاۃ الصحابہ، ۱ : ۴۸ تا ۶۱؛ اس عرصے میں اسلام قبول کرنے والے افراد کے ناموں کے لیے ابن ہشام : سیرۃ، ۱ : ۲۵۰ تا ۲۹۰، مطبوعۂ قاھرہ ۱۹۳۶ء)۔ آپ کا یہ انداز تبلیغ نفسیات انسانی کے عین مطابق تھا، اس لیے کہ دوسروں کو تبلیغ کرنے سے

پہلے خود کو، اپنے رشتہ داروں کو اور اپنے دوست احباب کو ساتھ ملانا اور اپنی کاوش کے عملی نمونے پیش کرنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ کج طبع لوگ بہانہ بسیار تلاش کر لیتے ہیں؛ اور ویسے بھی انسان اپنی نجی زندگی میں سب سے زیادہ اپنے قریبی لوگوں کو متأثر کرتا ہے۔

۳۔ تبلیغ عام یا بعثت عامّہ: اس کے اختتام پر آپؐ کو سورہ ۱۵ [الحجر]: ۹۴ کے ذریعے حکم دیا گیا کہ آپؐ تبلیغ کے حلقے کو وسیع کر دیں اور خاص و عام کو پیغام حق پہنچائیں۔ آپؐ نے تبلیغ عامہ کا آغاز قریش مکہ کو کوہ صفا کے پاس "یا آل غالب" کہہ کر جمع کرنے اور اپنے خاندان والوں کو کھانے کی دعوت پر بلانے سے کیا (البخاری: الصحیح، ۲ : ۷۰۲؛ ابن ہشام: السیرۃ، ۱ : ۲۵۰ تا ۲۸۰)۔ آپؐ نے امر خداوندی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے فریضۂ تبلیغ ادا کیا۔ جس میں آپؐ بڑی حد تک کامیاب رہے۔

بہرحال ۱۳ سالہ مکی دور میں آپؐ نے تبلیغ کے لیے مندرجہ ذیل طریقے اختیار فرمائے: (۱) انفرادی تبلیغ: آپؐ نے تبلیغ کا آغاز انفرادی اور نجی سطح سے فرمایا، چنانچہ سب سے پہلے امّ المؤمنین حضرت خدیجہؓ کو تبلیغ فرمائی وہ اسلام لے آئیں، اپنے رفیق خاص حضرت ابوبکرؓ کو تبلیغ کی انہوں نے اسلام قبول کیا، اپنے ابن عمّ حضرت علیؓ کو دعوت اسلام دی وہ مشرف باسلام ہوگئے اور اپنے غلام زیدؓ بن حارثہ کو تبلیغ کی اور وہ اسلام لے آئے؛ حضرت ابوبکرؓ کی انفرادی سطح کی کوششوں سے تقریباً پانچ افراد نے اسلام سے قبول کیا، تین سال کے عرصے میں چالیس افراد کا اسلام قبول کرنا اس طریقۂ تبلیغ کی خصوصی نوعیت (پر امن ترغیبی روحانی طریق) کی کامیابی کی روشن دلیل ہے (ابن سعد: طبقات، ۱ : ۱۹۹ تا ۲۰۱، بیروت ۱۹۶۰ء و ابن ہشام)؛ (۲) اجتماعی تبلیغ: آپؐ نے مختلف مواقع پر اجتماع کی صورت میں بھی تبلیغ حق فرمائی۔ سب سے پہلے آپؐ نے پہاڑی والے وعظ سے اس کا آغاز فرمایا؛ پھر آپؐ نے اپنے خاندان کو کھانے کی دعوت پر بلایا، جس میں کم و بیش چالیس نفوس تھے، ان کے سامنے اسلام کی تبلیغ فرمائی (السہیلی: روض الانف، ۱ : ۱۶۵ تا ۱۷۰، قاہرہ ۱۹۱۴ء؛ شبلی نعمانی: سیرۃ النبیؐ، ۱ : ۱۱۰، مطبوعہ اعظم گڑھ)۔ اسی طرح حج کے موقع پر سارے عرب سے زائرین مکہ مکرمہ آتے تھے۔ اس لیے اس موسم میں کہی ہوئی بات بہت جلد اطراف و اکناف عرب تک پھیل جاتی تھی اور دوسرے ان دنوں آپؐ کو تبلیغ حق سے کوئی ممانعت نہ ہوتی تھی۔ شعب ابی طالب میں محصوری (۷ تا ۱۰ نبوی) کے دوران میں صرف انہی دنوں میں آپؐ کو باہر نکلنے کی اجازت ملتی تھی۔ بنابریں ان دنوں میں آپؐ کی سرگرمیاں عروج پر ہوتیں۔ آپؐ مختلف قبائل کی خیمہ گاہوں میں تشریف لے جاتے۔ ان کے سامنے نہایت پیار اور ہمدردانہ لہجے میں دعوت پیش فرماتے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا جب تک حجاج حج سے فارغ ہوکر اپنے اپنے گھروں کو نہ لوٹ جاتے۔ گو ابتدا میں اس طریقہ تبلیغ کو بہت کم پذیرائی ہوئی، مگر ۱۱ نبوی میں اسی موقع پر یثرب کے چھ حق پرست افراد کے قبول اسلام سے بالآخر یثرب (= المدینۃ المنورہ) اسلام کا مرکز بن گیا (ابن سعد: طبقات، ۱ : ۲۱۶ تا ۲۱۸؛ البلاذری: انساب الاشراف)۔ اجتماعی تبلیغ کی غرض سے ہی آپؐ عرب کے مشہور میلوں اور منڈیوں (مثلاً مجنہ، عکاظ و ذوالمجاز) میں تشریف لے جاتے اور وہاں پر آئے ہوئے تمام افراد کو تبلیغ اسلام فرماتے (شرح المواہب، ۱ : ۳۰۹)۔ ایسے موقعوں پر ابو لہب [رک بآن] اور کبھی کبھار

ابو جہل [رک بآں] آپ ؐ کا تعاقب کرتا۔ اور چلا چلا کر لوگوں کو آپ ؐ کی بات اور تبلیغ سننے سے منع کرتا رہتا (ابن ہشام: سیرۃ، ۲: ۶۴، ۶۵؛ ابن سعد: طبقات، ۱: ۲۱۶؛ سیرۃ النبی، ۱: ۲۵۲-۲۵۳)؛ (۵) تبلیغ کے لیے دور دراز کے شہروں کا سفر: آپ ؐ نے تبلیغ حق کے لیے دور دراز کے سفر بھی اختیار فرمائے؛ چنانچہ اہل طائف کی تبلیغ کے لیے کئی روز کے پر مشقت سفر کے بعد طائف تشریف لے گئے، جہاں کے باشندوں نے آپ ؐ سے روح فرسا سلوک کیا اور نہایت بیدردی سے آپ ؐ پر پتھر برسائے اور آپ ؐ کو شہر سے نکال دیا (السہیلی: روض الانف، ۱: ۲۶۰)؛ اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبلیغ و دعوت کے لیے دور دراز کے قبیلوں کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو اسلام کی دعوت پہنچائی۔ (دیکھیے محمد یوسف: حیاۃ الصحابہ ۱: ۱۰۸؛ سیرۃ النبی ۱: ۲۵۲-۲۵۳)۔ جن قبائل کے پاس آپ ؐ تشریف لے گئے ان میں بنو عامر بن صعصعہ، بنو محارب بن خصفہ، بنو فزارہ (= غطفان)، بنو غسان، بنو مرہ، وغیرہ بنو سلیم، بنو کندہ، بنو کلب، بنو حارث، بنو کعب، بنو عبس، بنو نضر، بنو البکاء، بنو عذرۃ، وغیرہ کے متعدد قبائل شامل ہیں، مگر ان میں سے کسی ایک کو بھی قبول حق کی توفیق نہ ملی (ابن سعد: طبقات، ۱: ۲۱۶؛ ابن ہشام (۲: ۶۳ تا ۶۵) اور ابن الجوزی: الوفا باحوال المصطفی، ص ۲۱۵ تا ۲۱۶) نے یہ تصریح کی ہے کہ آپ ؐ ان قبائل کو تبلیغ فرمانے کے لیے ان کے قیام گاہوں (منازلہم) میں تشریف لے جاتے تھے۔ تبلیغ کا یہ فریضہ رنج ہو یا راحت، ہر حالت اور ہر صورت میں جاری رہتا؛ شعب ابی طالب میں تین سال کی فاقہ کشی کے باوجود جب بھی آپ ؐ کو موقع ملا آپ ؐ نے تبلیغ حق کا فریضہ ادا کیا۔ سفر ہجرت میں آپ ؐ کی تبلیغ سے کئی افراد نے اسلام قبول کیا۔ (شرح المواہب، ۱: ۳۲۵ تا ۳۵۰)؛ (۶) تبلیغ کے لیے سفیروں کا تقرر: مکی دور ہی میں آپ ؐ نے دور دراز کے لوگوں کی طرف مختلف افراد بطور سفیر نامزد کرکے بھیجے تاکہ وہ آپ ؐ کی طرف سے اپنی قوموں کو خدائی پیغام پہنچائیں، چنانچہ حضرت طفیل ؓ بن عمرو دوسی کو ان کی قوم پر اور حضرت مصعب ؓ بن عمیر کو یثرب کے علاقے میں اپنی طرف سے مبلغ نامزد کرکے بھیجا (ابن ہشام، ۲: ۲۱ تا ۲۵، ۷۵ تا ۷۶)۔

مکی دور کی کامیاب اور پر عزم تبلیغ کے باعث اب آپ ؐ اس لائق ہوگئے تھے کہ اپنے جانثاروں پر اعتماد کرتے ہوئے یثرب (مدینہ منورہ) کو اپنا مستقل مرکز اور مستقر قرار دے لیں۔ چنانچہ ۱۳ نبوی ۴ ربیع الاول کو آپ ؐ نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت [رک بآں] فرمائی۔ یہاں سے آپ ؐ کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جو ایک داعی حق کے ساتھ ساتھ آپ ؐ کی حکمرانی کا دور بھی ہے، مگر اس دور میں بھی آپ ؐ کی داعی کی حیثیت تبدیل نہیں ہوئی، البتہ طریقہ تبلیغ میں کسی قدر عمومیت اور وسعت پیدا ہوگئی، جو زمانی و مکانی تبدیلیوں کا ناگزیر نتیجہ تھی۔ اس عرصے میں انفرادی تبلیغ کے علاوہ (جو تمام زندگی آپ ؐ کا شعار رہی) تبلیغ حق کے لیے آپ ؐ نے مندرجہ ذیل طریقے اختیار فرمائے:

(۱) تبلیغی وفود کی ترسیل: اس دور میں افراد کے علاوہ آپ ؐ نے وفود کو بھی تبلیغ اسلام کے لیے مامور فرمایا۔ جن میں سے دو تبلیغی وفود کے ساتھ مشرکین نے دھوکہ کیا اور فریب کاری سے قتل کر دیا۔ ان میں سے ایک وفد کو، جو ستر تربیت یافتہ قاری حضرات (= قراء) پر مشتمل تھا ۴ھ/۶۲۶ء میں، ابو براء الکلابی رئیس قبیلہ کی درخواست پر قبیلہ کلاب کی طرف بھیجا گیا مگر عامر بن طفیل الکلابی نے بئر معونہ [رک بآں] کے مقام پر ان تمام افراد کو شہید کر دیا۔ صرف ایک صحابی بمشکل جان بچا سکے؛ دوسری

جماعت کو، جو کم و بیش دس افراد پر مشتمل تھی، قبائل عَضَل و قارہ کی طرف اسی سال بھیجا گیا جنہیں مقام رجیع [رکّ بہ الرجیع] پر بنو لحیان کی مدد سے شہید کر دیا گیا (الواقدی : المغازی، ۱ : ۳۴۶، آکسفرڈ، ۱۹۶۶ء؛ السہیلی : روض الانف، ۲ : ۳۴۷)۔ آپؐ کی بعض تبلیغی رسالتیں کامیاب بھی رہیں اور ان کے نتیجے میں متعدد افراد کو قبول حق کی توفیق ہوئی۔

(۳) میدان کارزار اور فریضہ تبلیغ : مدنی دور میں غزوات و سرایا کا سلسلہ شروع ہوا جس کو مخالفین اسلام بہت زیادہ اچھالتے ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ آپؐ نے ناگزیر صورت کے سوا کبھی جنگ کو پسند نہیں فرمایا اور اسی لیے آپؐ کے واضح احکام تھے کہ عین لڑائی کی حالت میں پہلے مخالفین کو تبلیغ کی جائے۔

سریۂ مؤتہ کے موقع پر جب آپؐ نے عسکر اسلام کو الوداع کہا تو سالار جیش حضرت زیدؓ بن حارثہ کو مندرجہ ذیل نصیحت فرمائی : جب تمہارا دشمن سے مقابلہ ہو تو اس کے سامنے اولاً تین باتیں پیش کرنا؛ اگر وہ ان میں سے کوئی ایک بھی قبول کر لیں تو لڑائی سے رک جانا : (۱) ان کو قبول اسلام کی دعوت دینا؛ (۲) جزیہ ادا کرنے پر صلح کی ترغیب (۳) تیسری اور ناگزیر صورت لڑائی کی ہے، (الواقدی : کتاب المغازی، ۲ : ۷۵۵ ببعد)۔ اسی طرح غزوۂ احزاب میں حضرت علیؓ نے عمرو بن عبدود (ایک مشرک سردار) کے سامنے یہی تین شرائط پیش کیں (ابن ہشام : سیرة)۔ غرضیکہ ہر معرکے میں آپؐ کی یہ اصول پرستی دیکھنے میں آئی۔

(۴) مذہبی اجتماعات : مدنی دور میں تبلیغ نبوی کے لیے ایک سازگار ماحول میسر آیا : چنانچہ آپؐ مذہبی اجتماعات کے مواقع سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ اس ضمن میں جمعہ، و عیدین کے علاوہ، حجة الوداع کے موقع پر آپؐ نے جو وعظ فرمایا وہ تبلیغ کے باب میں اہم دستاویز ہے۔

(۴) عورتوں کے اجتماعات میں تبلیغ : **البخاری** (الصحیح، کتاب ۳، باب ۳۲، ۳۷) کے مطابق عورتوں نے آپؐ سے درخواست کی کہ ان کے لیے ایک الگ دن مقرر کیا جائے جس میں صرف عورتیں ہی شریک مجلس ہو کر آپؐ کے ارشادات سن سکیں۔ اس پر آپؐ نے ان کے لیے ایک الگ دن مقرر فرمایا۔ اس روز آپؐ حضرت بلالؓ کی معیت میں خواتین کے اجتماع میں تشریف لے جاتے اور عورتوں کو وعظ و نصیحت فرماتے۔

(۵) تبلیغی خطوط کی ترسیل : اس کے بعد آپؐ نے مختلف ممالک کے حکمرانوں اور اہل اقتدار کو تبلیغی مکتوبات ارسال فرمائے جن میں سے بعض نے اسلام قبول کر لیا۔ بعض کا جواب نفی کی صورت میں ملا۔ تبلیغی خطوط کی تفصیل یہ ہے :

۱۔ والی یمامہ ہوذہ بن علی الحنفی، قاصد حضرت سلیط بن عمرو العامری؛ ۲۔ والی بحرین منذر بن ساوی بن الاخنس التمیمی العبدی، قاصد حضرت علاء بن الحضرمی؛ ۳۔ والی عمان جیفر بن جلندی ابن عامر و عبد بن جلندی ابن عامر، قاصد حضرت عمرو بن العاص؛ ۴۔ والی دمشق حارث بن ابی شمر، قاصد شجاع بن وھب الاسدی؛ ۵۔ شہنشاہ حبش نجاشی اصحم بن ابجر، قاصد حضرت جعفر طیار و حضرت عمرو بن امیہ الضمری؛ ۶۔ حاکم مصر مقوقس (جریج بن مینا) قاصد حضرت حاطب بن ابی بلتعہ القرشی، اللخمی؛ ۷۔ شہنشاہ فارس کسری خسرو پرویز ابن ہرمز ابن نوشیروان، قاصد حضرت عبداللہ بن حذافہ القرشی، السہمی؛ ۸۔ قیصر روم ہرقل، قاصد حضرت دحیہ بن خلیفہ الکلبی؛ ۹۔ پاپائے روم ضغاطر الاسقف، قاصد نامعلوم؛ (الزرقانی : شرح المواہب، ۳ : ۳۴۳ تا ۳۷۰؛ محمد حمیداللہ : الوثائق السیاسیة،

مطبوعہ قاہرہ ۱۹۵۶ء، ص ۳۲ تا ۱۲۵، نیز Leone Caetani : *Annali dell, Islam*، ۶ : ۵۰، نیز بمدد اشاریہ ؛ A. Sprenger : *Das Leben und die Lepre des Mohammad*، ۳ : ۲۶۹، نیز بمدد اشاریہ)۔ اس کے علاوہ عرب میں آباد مختلف قبائل کے شیوخ کو بھی آپؐ نے اسی قسم کے تبلیغی خطوط ارسال کیے (الوثائق السیاسیہ ؛ نیز حفظ الرحمن سیوہاروی : بلاغ مبین، مطبوعہ بجنور ص ۲۹ - ۲۳۶)۔

اس موقع پر معاندین اسلام کے ان حربوں کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جن کا مقصد آپ کو تبلیغ حق سے روکنا اور اشاعت کی تحریک کو مسدود کرنا تھا، مگر آپ نے ان تمام مصائب کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا: ۱۔ سبّ و شتم: معاندین اسلام کی طرف سے آپؐ کو وقتاً فوقتاً (معاذ اللہ) برا بھلا کہا جاتا تھا جس کا مقصد آپؐ کو پریشان و ہراساں کرنا اور آپؐ کو اپنے مشن کی تکمیل سے روکنا تھا۔ اس کا آغاز اسی وقت سے ہو گیا تھا جب کہ آپؐ نے کوہ صفا سے اپنی رسالت حقہ کا اعلان فرمایا تھا۔ اس موقع پر ابو لہب نے کہا: تبا لک الھذا جمعتنا (ابن کثیر : تفسیر، بذیل ۱۱۱ (اللہب)؛ ابن سعد : طبقات، مطبوعہ بیروت ۱۹۶۰ء، ۱ : ۱۹۹ ببعد) یعنی (معاذ اللہ) تو ہلاک ہو، کیا تو نے ہمیں اس لیے بلایا تھا۔ اس کے علاوہ مشرکین آپؐ کو ساحر، مجنون، مفتون اور محمد کی بجائے مذمم کے نام سے پکارتے تھے (سیرۃ النبی، ۱ : ۲۵۴ تا ۲۵۵)؛

۲۔ استہزا: استہزائیہ جملے سب و شتم کے جملوں سے بھی زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ یہ حربہ جس شدت کے ساتھ آپؐ کے خلاف آزمایا گیا اس کی تاریخ میں کم ہی مثالیں ملتی ہیں۔ آپ جس طرف جاتے، لوگ استہزا کے زہریلے جملوں سے آپ کا استقبال کرتے۔ قرآن کریم میں ہے: وَ اِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِیْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ؕ (۲۵ [الفرقان] : ۴۱)، یعنی وہ جب آپؐ کو دیکھتے ہیں تو آپؐ سے تمسخر کرنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا یہی ہے جس کو خدا نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ سنہ ۱۰ نبوی میں جب آپؐ طائف تشریف لے گئے تو سرداران طائف میں سے ایک نے کہا کہ کیا خدا کو تیرے سوا نبی بنانے کے لیے کوئی اور ملا ہی نہ تھا؟ دوسرے نے کہا کہ اگر خدا نے تجھے نبی بنا کر بھیجا ہے تو کعبے کا پردہ چاک کر دیا ہے (السہیلی : روض الانف، ۱ : ۲۶۰ تا ۲۶۳)۔ بعض لوگوں، مثلاً اسود بن عبد یغوث وغیرہ نے آپؐ کا مذاق اڑانے میں بہت نام پیدا کیا تھا (حوالۂ مذکور، ص ۲۵۵)۔ اسی بنا پر قرآن کریم میں ارشاد فرمایا: انا کفینٰک المستہزءین (۱۵ [الحجر] : ۹۵)، یعنی ہم آپ کے لیے تمسخر کرنے والوں کے مقابلہ میں کافی ہیں۔

۳۔ جسمانی ایذائیں: اس کے علاوہ رحمت دو عالمؐ کو مختلف موقعوں پر جسمانی اذیتیں بھی پہنچائی گئیں۔ جب آپؐ نے پہلے پہل بیت اللہ شریف کے سامنے تبلیغ کی تو مشرکین نے آپؐ پر حملہ بول دیا۔ آپؐ کو بچانے کی غرض سے حارث بن ابی ہالہ آگے بڑھے، مشرکین نے مار مار کر انھیں شہید کر دیا۔ یہ اسلام کے پہلے شہید تھے (ابن حجر : الاصابہ فی معرفۃ الصحابہ، ذکر حارث بن ابی ہالہ)؛ ایک دفعہ غلاظت سے بھری ہوئی اوجھ عین حالت نماز میں جسم اطہر پر رکھ دی گئی (سیرۃ النبی، ۱ : ۲۵۵)۔ ام جمیل زوجہ ابی لہب [آپ کی چچی] آپؐ کے راستے میں کانٹیں بکھیرتی اور آپؐ پر غلاظت پھینک دیتی تھی (مفتی محمد شفیع : معارف القرآن، ۸ : ۸۳۰-۸۳۱)۔ ۱۰ نبوت میں آپ طائف میں بغرض تبلیغ تشریف لے گئے اور دس روز تک بنو ثقیف کو دعوت حق دیتے رہے، لیکن ان ظالموں نے آپ کو اتنا مارا کہ جسم اطہر لہولہان ہو گیا اور جوتے پاؤں سے چپک کر رہ گئے

(ابن سعد: طبقات، ۱: ۲۱۲؛ السہیلی: روض الانف، ۱: ۲۶۰؛ الزرقانی: شرح المواہب، ۱: ۲۹۶)۔

۴۔ دنیاوی منافع کا لالچ: ان سب طریقوں کے باوجود، جب آپؐ تبلیغ رسالت سے نہ رکے تو مشرکین کی طرف سے عتبہ بن ربیعہ نے آپؐ کو دعوت حق سے دستبردار ہونے کی صورت میں مکہ مکرمہ کی ریاست، بڑے گھرانوں کی خوبصورت عورتوں سے شادی اور مال و دولت کے ذخیروں کی پیشکش کی، لیکن آپؐ نے جواب میں حم، السجدۃ کی آیات تلاوت فرما کر ان کی پیشکش کو ٹھکرا دیا (ابن ہشام: سیرۃ النبویۃ، ۱: ۲۱۳)۔ ایک دوسرے موقع پر آپؐ نے فرمایا: بخدا اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند بھی لا کے رکھ دیں، تب بھی میں تبلیغ حق سے نہ رکوں گا (حوالۂ مذکور، ۱: ۲۸۲ ببعد)۔

۵۔ اہل اسلام پر ظلم و ستم: اس پر بھی جب اسلام کی اشاعت نہ رکی تو آپؐ کے ماننے والوں پر ظلم و ستم اور جور و تعدی کی انتہا کر دی گئی۔ مشرکین کے ظلم و ستم کا نشانہ بننے والے بیکس مسلمانوں میں حضرت خبابؓ بن الارت (م ۳۷ھ)، حضرت بلالؓ حبشی (م ۲۰ھ یا ۱۸ھ یا ۲۱ھ)، حضرت عمار بن یاسرؓ (م ۳۷ھ/۶۵۷ء) اور ان کی والدہؓ حضرت سمیہؓ، حضرت صہیبؓ رومی، حضرت ابو فکیہہ (م تقریباً ۲ھ)، حضرت لبینہ، زنیرہ وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں جن کو روح فرسا طریقوں سے مارا پیٹا گیا۔ (السہیلی: روض الانف، ۱: ۲۰۲؛ شبلی نعمانی: سیرۃ النبی، ۱: ۲۲۹ تا ۲۳۱)۔

۶۔ معاشی و معاشرتی عدم تعاون: اس پر بھی جب کچھ نہ ہوا تو بالآخر ۷ نبوی میں رؤسائے قریش کی باہمی مشاورت سے ایک معاہدہ ترتیب دیا گیا جس کے مطابق قریش اور ان کے حلیفوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور آپؐ کے خاندان سے معاشی و معاشرتی عدم تعاون کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس ضمن میں تین باتوں پر تمام اہل مکہ سے حلف لیا گیا: (۱) ان سے مناکحت نہ کی جائے؛ (۲) ان کو کوئی چیز فروخت نہ کی جائے، (۳) ان سے کوئی چیز نہ خریدی جائے (ابن الجوزی: الوفا باحوال المصطفیٰ، ۱: ۱۹۷)۔ اسے باقاعدہ معاہدے کی صورت میں لکھ کر بیت اللہ شریف پر لٹکا دیا گیا اور یہ سلسلہ تین سال (از ۷ھ تا ۱۰ھ) تک جاری رہا۔ اس دوران میں بنو ہاشم کے لوگوں، بالخصوص بچوں، کی حالت نہایت نازک رہی۔ یہ لوگ سوکھے چمڑے کھا کھا کر گزارا کرتے رہے، مگر دشمنوں کو اس پر ذرا رحم نہ آیا (السہیلی: روض الانف، ۱: ۲۱۹ و بعد، ۲۳۰ و بعد)۔ اندازہ کیجیے جب آپؐ اپنے خاندان کے معصوم بچوں کو بھوک سے بلبلاتا ہوا دیکھتے ہوں گے، تو آپؐ کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔

۷۔ تذلیل و تحقیر: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اور صحابہؓ کرام کی ہر ممکن طریقے سے تذلیل و تحقیر کی کوشش کی جاتی تھی، یہاں تک کہ آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔ چنانچہ مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میں دو بدترین ہمسایوں ابولہب اور عقبہ بن ابی معیط میں گھرا ہوا تھا اور وہ دونوں اپنے گھر کی غلاظت اور گندگی لا کر میرے دروازے پر ڈال دیتے تھے۔ آپؐ برآمد ہو کر صرف یہ فرماتے: اے عبد مناف کی اولاد! یہ کس قسم کی ہمسائیگی ہے؟ پھر آپؐ اسے راستے سے ہٹا دیتے (ابن سعد: الطبقات، ۱: ۲۰۱؛ ابن کثیر: تفسیر، ۴: ۵۶۳، بذیل سورہ ابی لہب)۔

۸۔ ذات نبویؐ کا تعاقب: اس کے باوجود جب روز بروز اسلام ترقی کرتا رہا تو مخالفین نے اس کی

اشاعت کو روکنے کے لیے ایک یہ تدبیر اختیار کی کہ تبلیغ کے مواقع پر ابولہب اور بعض اوقات ابوجہل آپؐ کے تعاقب میں لگا رہتا؛ آپ جس علاقے میں تشریف لے جاتے، وہ چلا چلا کر لوگوں کو آپؐ کی باتیں سننے سے روکتا (ابن الجوزی: الوفاء، ۲۱۵ تا ۲۱۶؛ حاکم: مستدرک ۱ : ۱۵ ، مطبوعہ حیدر آباد دکن، بقول مفسرین قرآن کریم (۴۱ [حٰمٓ السجدۃ] ۲۶) میں اسی کی طرف اشارہ ہے.

۸- بے سر و پا سوالات: مشرکین مکہ نے جب یہ تمام حربے ناکام ہوتے دیکھے تو بے سروپا سوالات کرنے شروع کر دیے؛ چنانچہ ایک موقع پر یہ مطالبہ کیا کہ ہم اس صورت میں آپؐ کو نبی مان سکتے ہیں کہ آپ (۱) مکہ مکرمہ کی خشک پہاڑیوں سے میٹھے پانی کے چشمے جاری کر کے دکھائیں؛ (۲) آپؐ اس سرزمین میں اپنے لیے کھجوروں، انگوروں کا باغ اگا کر دکھائیں جس کے درمیان نہریں چلتی ہوں؛ (۳) آسمان کا کوئی ٹکڑا بطور عذاب ہم پر گرا کر دکھائیں؛ (۴) خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے نمودار کر کے دکھائیں؛ (۵) یا اپنے لیے کوئی موتیوں کا محل بنا کر پیش کر دیں اور یا پھر (۶) ہمارے سامنے آسمان پر چڑھیں اور ہم سب کے نام خدا تعالیٰ کی طرف سے لکھے لکھائے خطوط لا کے پیش کریں۔ ان تمام باتوں کے جواب میں آپؐ کو حکم دیا گیا کہ آپؐ کہہ دیں کہ میں تو رسول بشر ہوں (۱۷ [بنی اسرائیل]: ۹۰ تا ۹۳، آلوسی: روح المعانی، بذیل آیات مذکورہ؛ ابن کثیر: البدایۃ والنہایۃ، ۳ : ۵۰ ، ۵۱ وغیرہ).

۹- بڑے پائے کے علمی سوالات: مشرکین کی ان باتوں کا بھی اثر نہ ہوا اور آپ اپنے موقف پر قائم رہے تو انہوں نے یہود یثرب سے کچھ ایسے علمی سوالات دریافت کیے جو انبیا کے سوا کسی کو نہ آتے ہوں؛ چنانچہ ان کے مشورے سے تین سوالات پیش کیے گئے: (۱) نفس اور روح کی حقیقت کیا ہے؟ (۲) اصحاب کہف کا کیا قصہ ہے؟ (۳) ذوالقرنین کون تھا؟ ان سوالوں کا جواب علی الترتیب ۱۷ [بنی اسرائیل]: ۸۵ ؛ ۱۸ [الکہف]: ۹ تا ۲۶ ، ۸۳ تا ۹۸ میں دیا گیا.

(۱۰) جھوٹا اور بے بنیاد پروپیگنڈہ: اس کے علاوہ اسلام کے خلاف جھوٹے اور بے بنیاد پروپیگنڈے کا حربہ جس وسیع پیمانے پر اختیار کیا گیا اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں ہر آنے جانے والے کو آگاہ کر دیا جاتا کہ یہاں ایک ساحر، مجنون رہتا ہے اس سے بچنا۔ جیسا کہ طفیل بن عمر دوسی کو روکا گیا تھا (ابن ہشام: سیرۃ، ۲ : ۲۲ و بعد)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اپنے آبائی دین کا منکر بتایا جاتا، صحابہ کرامؓ کو صابئی کہا جاتا۔ جب قرآن کریم کی تلاوت ہو رہی ہوتی تو شور و غل مچا دیا جاتا، معاذ اللہ قرآن اور صاحب قرآن کو برا بھلا کہا جاتا؛ بچوں کو پیچھے لگا دیا جاتا کہ وہ مجنون، ساحر وغیرہ کا شور برپا رکھیں، مبادا کوئی آپؐ کی بات سن کر متاثر ہو جائے جیسا کہ ضماد الازدی کو ذاتی مشاہدہ ہوا احمد بن حنبل: مسند، ۱ : ۳۰۲؛ البخاری: الصحیح، ۷۸۶؛ (۱۱) اور سب سے آخر میں، آپؐ کے خلاف ایکا کر کے معاذ اللہ آپؐ کو قتل کرنے کی ناپاک سازش تیار کی گئی جس سے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو بال بال بچا لیا (رک بہ ہجرۃ).

معاندین اسلام کے یہ وہ حربے تھے جو انہوں نے مکی دور میں روا رکھے۔ ۱۳ نبوی میں آپؐ نے اس وقت ہجرت کرنے کا فیصلہ فرمایا جبکہ تمام اہل مکہ نے آپؐ کے قتل کا ناپاک منصوبہ بنا لیا تھا۔ آپؐ نے جب ارض یثرب میں قدم رنجہ فرمایا اور وہیں سکونت اختیار کر لی تو معاندین اور مخالفین اسلام کے طریقوں میں بھی تبدیلی اور وسعت پیدا

هو گئی ۔ چنانچه مدنی دور میں آپؐ کو تبلیغ سلام سے روکنے کے لیے مندرجه ذیل طریقے اختیار کیے گئے :

(۱) قریش کا عبداللہ بن ابی کے نام خط : ابھی آپ مدینه منوره میں فروکش هوے هی تھے که قریش مکه نے عبداللہ بن ابیّ کو خط لکھا جس میں انصار مدینه کو برا بھلا کہنے کے بعد مطالبه کیا گیا که وه آپؐ کو (معاذ اللہ) مشرکین کے حوالے کر دیں ، ورنه جنگ کے لیے تیار هو جائیں (دیکھیے محمد حمید اللہ : الوثائق السیاسیه ، شماره ۳/ب) (۲) قریش اور ان کے حلیفوں کا اعلان جنگ : جب اس طرح ان کی مقصد براری نه هوئی تو قریش مکه اور ان کے حلیفوں کی طرف سے آپؐ اور صحابهؓ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا ۔ قریش مکه اور یهودان خیبر نے اپنے شعله بیان مقرروں اور آتش نوا شاعروں کے ذریعے تمام قبائل عرب کو اسلام کے خلاف متحد کر دیا ؛ چنانچه نو سال کے مختصر عرصے میں (اگر ۱۰ھ کو نکال دیا جائے) آپؐ کو مخالفین کے خلاف ۷۴ جنگیں لڑنا پڑیں - جن میں سے ۲۷ (غزوات) وه هیں جن میں آپؐ نے به نفس نفیس شرکت فرمائی اور ۴۷ (سرایا) وه که جن میں آپؐ نے صحابه کرامؓ کو مامور کرکے روانه فرمایا (ابن سعد : طبقات ، ۲ : ۵ و ۶ ؛ شرح المواهب ، ۱ : ۳۸۷ تا ۳۹۰) ؛ گویا آپؐ کو ایک سال میں آٹھ نو بار مخالفین کے خلاف صف آرا هونا پڑا ۔ اسی سے مشرکین عرب کی اسلام دشمنی کا اندازه کیا جا سکتا هے (دیکھیے غزوات) (۳) مبلغین اسلام کا قتل : بعض قبائل عرب نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کو روکنے کے لیے انوکھا اور منفرد طریقه اختیار کیا ۔ وه یه که ان کی طرف سے کوئی آدمی یا کوئی وفد آپؐ کی خدمت میں حاضر هوتا اور اپنے قبیلے کے لیے مبلغین بھیجنے کی درخواست پیش کرتا ۔ آپؐ ان کی دعوت پر مبلّغین کو ارسال فرما دیتے تو انهیں دھوکے سے راستے میں شهید کر دیا جاتا ۔ یه واقعه دو دفعه دهرایا گیا ۔ پهلی دفعه بئر معونه [رک بآں] کے مقام پر ستّر صحابهؓ کرام کو اور دوسری دفعه رجیع کے مقام پر دس صحابهؓ کرام کو نهایت بیدردی سے شهید کر دیا گیا ۔ یه صحابهؓ انهی قبائل کے سرکرده افراد کی درخواست پر تبلیغ اسلام کے پر امن مشن کے لیے جا رهے تھے ، (الیعقوبی : تاریخ ، ۲ : ۷۰۱ ، ۷۲۰ ، مطبوعهٔ بیروت ۱۹۶۰ء ؛ الواقدی : المغازی ، ۱ : ۳۴۳ تا ۳۶۳) ؛ (۴) قاصدان نبوی کا قتل : ۶ھ میں آپؐ نے ایک خط شاه بصری کے نام لکھا تھا جسے حضرت حارث بن عمیر الازدی لے کر جا رهے تھے ، شرحبیل بن عمرو الغسانی رئیس علاقه بلقاء نے انهیں مؤته کے مقام پر گلا گھونٹ کر شهید کر دیا (ابو اقدی : کتاب المغازی ، ۲ : ۷۵۵ ، مطبوعه آکسفرڈ ؛ ابن سعد : طبقات ، ۲ : ۱۲۸) .

آنحضرت صلی اللہ علیه و آله وسلم کی تبلیغی خصوصیات : آپؐ کی تبلیغی زندگی کے کوائف مختصراً بیان کرنے کے بعد مناسب معلوم هوتا هے که آپؐ کی ان تبلیغی خصوصیات کی طرف بھی اشاره کر دیا جائے ، جن کی بدولت آپؐ کی تبلیغ کو وه کامیابی نصیب هوئی جو دنیا کی کسی تحریک کو بھی نصیب نه هو سکی ۔ قرآن کریم (۱۶ [النحل] : ۱۲۵) میں آنحضرت صلی اللہ علیه و آله وسلم کو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور موعظهٔ حسنه سے دعوت دینے کا حکم هوا هے : اُدْعُ إِلٰی سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (۱۶ [النحل] : ۱۲۵) ، یعنی (اے پیغمبر ! لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے پروردگار کے رستے کی طرف بلاؤ اور بہت هی اچھے طریقے سے ان سے بحث کیجیے ۔ یه آیهٔ کریمه آنحضرت صلی اللہ علیه و آله وسلم کے طریقهٔ تبلیغ ، آپؐ کے اسلوب دعوت پر بخوبی روشنی ڈالتی هے ۔ اس آیهٔ کریمه سے آپؐ کی حسب ذیل

تبلیغی خصوصیات واضح ہوتی ہیں : (۱) پہلا اصول جو اس کے ابتدائی جملے اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ سے مستنبط ہوتا ہے (مفتی محمد شفیع : معارف القرآن ، ۵ : ۴۰۸ بذیل آیۃ)، دعوت اسلامی میں تدریج کا لحاظ رکھنا ہے۔ آپؐ نے مکی اور مدنی دونوں ادوار میں ہمیشہ تبلیغ میں اس تدریج کے اصول کو ملحوظ خاطر رکھا۔ اسی بنا پر ۱۳ سالہ مکی دور میں صرف ارکان اسلام : توحید، رسالت ، معاد ، اور مسئلہ تقدیر کی تبلیغ کی گئی اور دوسرے احکام مدنی زندگی میں رفتہ رفتہ دیے گئے۔ اس کی حکمت ام المؤمنین حضرت عائشہؓ صدیقہ یوں بیان فرماتی ہیں کہ قرآن کریم میں جو پہلی سورت نازل ہوئی اس میں جنت و دوزخ کا ذکر ہے۔ جب معتدبہ لوگ اسلام کے دائرے میں آگئے تو پھر حلال و حرام کے احکام دیے گئے۔ اگر شروع میں امتناعی احکام آجاتے تو لوگوں کو گراں گزرتے اور تعمیل میں تامّل بلکہ انکار ممکن تھا (البخاری : الصحیح ، ۶۶/۶ ، ۳ : ۳۹۵)۔ دراصل یہ طریقہ طبع انسانی کی گہری خصوصیات کے ادراک کا پتا دیتا ہے۔ آسان سے مشکل کی طرف بڑھنا زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ آپؐ نے حضرت معاذؓ بن جبل کو یمن کی طرف روانہ کرتے وقت بھی تبلیغ میں اسی اصول تدریج کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی : آپؐ نے فرمایا کہ پہلے ان کو توحید و رسالت کی دعوت دینا ؛ اگر وہ مان جائیں تو پھر ان کو نماز کی تعلیم دینا ؛ اگر وہ یہ بھی مان لیں پھر ان کو فریضۂ زکوۃ سے آگاہ کرنا (البخاری : ۴۴/۱ ، ۱ : ۳۵۲) ؛ (۲) آپؐ کی دوسری تبلیغی خصوصیت حکمت ہے۔ حکمت کے یوں تو بہت سے مفہوم بیان ہوئے ہیں ، مگر ابو حیان الاندلسی (صاحب بحر المحیط) کی یہ تعبیر عام طور سے قبول کی جاتی ہے کہ حکمت وہ کلام با سلوک ہے جس میں اکراہ کا پہلو موجود نہ ہو اور طبع انسانی اسے فوراً قبول کرے اور وہ عقل و قلب ہر دو کو متاثر کرے ؛ حکمت اس درست کلام اور مؤثر طرز ابلاغ کا نام ہے جو انسان کے دل میں اتر جائے اور مخاطب کو مسحور کر دے ؛ نیز دیکھیے مفتی محمد شفیع : معارف القرآن ، ۵ : ۴۰۸)۔ اس بارے میں آپؐ کو جو اختصاص و امتیاز حاصل تھا اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ عرب کے مشہور کاہن ضماد الازدی نے جب آپؐ کا اثر انگیز خطبہ سنا تو اعتراف کیا کہ ایسا کلام نہ کاہنوں کے پاس ہے نہ جادو گروں اور شاعروں کے پاس؛ اس پر اس نے اسلام قبول کر لیا (احمد بن حنبل: مسند، ۱ : ۳۰۲)۔ مشہور شاعر اور رئیس دوس طفیل بن عمرو الدوسی (م ۱۱ھ/۶۳۲ء) کو کلام نبوی سن کر اعتراف کرنا پڑا : ماسمعت قولاً قطّ احسن منه ، یعنی میں نے اس سے عمدہ کلام آج تک نہیں سنا۔ غزوۂ حنین کے بعد جب انصار میں کچھ بد دلی پیدا ہوئی تو آپؐ کے پر اثر خطبہ سے ان کے جملہ شکوک و شبہات کا ازالہ ہوگیا۔ (البخاری ، ۵۶/۵۹ ، ۳ : ۱۵۳ تا ۱۵۶ ؛ ابن حجر: فتح الباری، بذیل احادیث مذکورہ) ؛ (۳) آپؐ کی تیسری خصوصیت موعظۃ الحسنہ ہے۔ موعظۃ کا مادہ وعظ ہے اور وعظ کے معنی ہیں کسی کی خیرخواہی کی بات کو اس طرح اس کے سامنے بیان کیا جائے کہ جس سے اس کا ناگوار حصہ بھی قابل قبول ہو جائے اور مخاطب کا دل قبولیت کے لیے نرم ہو جائے ؛ الحسنہ کے معنی ہیں کہ اس کا عنوان بھی ایسا ہو کہ جس سے مخاطب کا قلب مطمئن ہو جائے (معارف القرآن، ۵ : ۴۰۹)۔ آپؐ کی تبلیغ و دعوت کی یہ بھی خصوصیت قابل ذکر ہے کہ آپؐ کا ظاہری انداز تبلیغ بھی ایسا دلکش اور جامع ہوتا تھا کہ سوائے ہٹ دھرم اور ضدی لوگوں کے کوئی شخص بھی آپؐ سے دور نہ رہ سکتا تھا؛ اثر انگیزی کی اسی کیفیت سے متاثر ہو کر قریش مکہ نے آپؐ کو "ساحر" (جادوگر) کا نام دیا تھا۔ خود رؤسائے قریش

مثلاً ابوجہل ، ابو سفیان ، الاخنس بن شریق جیسے لوگ رات کو چھپ چھپ کر کلام الٰہی کی معجزاتی بلاغت کو سنتے اور سر دھنتے تھے (ابن ہشام : سیرۃ، ۱ : ۳۳۷ تا ۳۳۸)۔ یہ اسی موعظۂ حسنہ کا اثر تھا کہ عمیر بن وہب الجمحی جو آپؐ کو قتل کرنے کی نیت سے گھر سے روانہ ہوا تھا آپؐ کی خدمت میں پہنچ کر مشرف باسلام ہو گیا (کتاب مذکور ، ۲ : ۳۱۶ ببعد).

(۴) چوتھی خصوصیت آپؐ کی مجادلہ احسن ہے۔ قرآن مجید میں دو قسم کے مجادلوں کا ذکر آتا ہے: (۱) مجادلۂ احسن اور (۲) مجادلۂ باطل۔ مجادلۂ باطل کو کفار و مشرکین کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ جس سے مراد بلا کسی معقول دلیل کے اپنے موقف پر اصرار، غیر متعلق باتوں میں مسئلے کو الجھا دینے کا طریقۂ بے فائدہ کج بحثیوں میں تضیع اوقات، اور خواہ مخواہ کی موشگافیاں کرنا ہے۔ یہ ہمیشہ سے اہل باطل کا شیوہ رہا ہے۔ اس کے برعکس اہل حق کو ابتداءً تو یہ تلقین کی گئی کہ جہاں تک ہو سکے معاملے کو مجادلے تک نہ پہنچنے دیں۔ اگر مجادلے کی ضرورت پیش آ ہی جائے تو مجادلے کو مجادلۂ احسن بنائیں، نیز ۱۶ [النحل] : ۱۲۵ جس کا مطلب ہے کہ مخاطب کے سامنے پہلے ان باتوں کو پیش کریں جن میں اصولی طور سے اشتراک ہے (۳ [آل عمران] : ۶۴) ؛ مخاطب کو مطمئن اور قائل کرنے کے لیے محبت ، اعتماد ، حسن اخلاق اور حسن استدلال سے کام لیا جائے (امین احسن اصلاحی : دعوت دین ور اس کا طریق کار ، ص ۱۱۵-۱۱۷)۔ سیرت نبوی میں مدینہ منورہ کی زندگی میں آپؐ کا یہودیوں سے (سیرۃ النبی، ۱ : ۳۹۵ تا ۴۰۳) اور اہل نجران کے عیسائیوں سے مباحثہ ([رک بہ مباہلہ] ؛ ابن سعد : طبقات، ۱ : ۳۵۷ تا ۳۵۹) اس کی نمائندہ مثالیں ہیں.

۵۔ ایک اور خصوصیت قول لین ہے۔ قول لین کا مطلب نرم بات ہے۔ بلا شبہ مبلغ حق کی باتوں میں نرمی کے عنصر کا پایا جانا ضروری ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میں یہ خصوصیت بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ قرآن مجید میں آپؐ کے اس وصف کا یوں ذکر کیا گیا ہے : فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (۳ [آل عمران] : ۱۵۹) ، یعنی پھر یہ اللہ کی رحمت کے سبب ہی سے ہے کہ آپؐ ان کے لیے نرم ہو گئے اور اگر آپؐ تند خو ، سخت طبع ہوتے تو لوگ آپؐ کے پاس سے منتشر ہو جاتے۔ نرمی ، ملاطفت اور مہربانی کا برتاؤ آپؐ نے جو اپنے دشمنوں سے کیا اور جس نے ابو سفیان بن حرب ، عکرمہ بن ابی جہل ، عمرو بن وہب الجمحی ، ہند بنت عتبہ اور صفوان بن امیہ جیسے بےشمار لوگوں کی کایا پلٹ دی ، وہ دنیا کی تاریخ میں ایک مثال ہے آپؐ نے اپنے جانی دشمنوں کو بھی اپنی نرمی اور شیریں گفتار سے اپنا اور اسلام کا گرویدہ کر لیا.

۶۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ایک اور تبلیغی خصوصیت تالیف قلب ہے۔ یعنی آپؐ کا وہ سلوک ہے جو غیرمسلموں اور بعض نومسلموں کے ساتھ اس غرض سے آپؐ نے کیا کہ وہ اسلام کو شفقت اور حسن سلوک کا نمونہ خیال کریں۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ نے اپنے قدیمی دشمنوں کی عام معافی کا اعلان فرمایا (السہیلی : روض الانف، ۲ : ۲۶۳ تا ۲۷۸)۔ یہ اقدام تالیف قلوب میں معاون ہوا اور صرف چند دنوں میں دو ہزار قریش مسلمان ہوگئے۔ غزوہ حنین کی فتح کے بعد مال غنیمت میں سے آپ نے بالخصوص نو مسلموں کو زیادہ حصہ دیا جس کا مقصد بھی تالیف قلب تھا۔ تفصیل یہ ہے : (۱) ابو سفیان مع اولاد ۳۰۰ اونٹ اور ۱۲۰ اوقیہ چاندی ، (۲) حکیم بن حزام ۱۰۰ اونٹ ، (۳) حارث بن ہشام ۱۰۰

اونٹ ، (۴) صفوان بن امیہ ۱۰۰ اونٹ ، (۵) قیس بن عدی ، ۱۰۰ اونٹ ، (۶) سہیل بن عمرو ۱۰۰ اونٹ ، (۷) اقرع بن حابس ۱۰۰ اونٹ ، (۸) عیینہ بن حصن فزاری ۱۰۰ اونٹ ، (۹) مالک بن عوف ۱۰۰ اونٹ ۔ اس کے علاوہ بہت سے لوگوں کو پچاس پچاس اونٹ دیے گئے ۔ آپؐ کے اس طرز عمل نے ان لوگوں کو اور مخلص بنانے میں اہم کردار ادا کیا (الزرقانی : شرح المواہب اللدنیۃ ، ۳ : ۳۵ تا ۴۲، ابن سعد : طبقات، ۲ : ۱۵۱ تا ۱۵۳، مطبوعہ بیروت).

۷۔ آپ کی تبلیغی زندگی کی اہم خصوصیت شفقت و رافت ہے ۔ آپؐ سے معاملہ کرنے والوں کا یہ متفقہ قول ہے کہ آپ مجسمہ شفقت و رافت تھے (۹ [التوبۃ] : ۱۲۸) ۔ آپؐ فرط رحمت سے امت کے عدم قبول حق کی وجہ سے مسلسل غم و فکر میں گھلتے رہتے ۔ جس پر قرآن کریم میں آپؐ کو تنبیہ کی گئی : فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا (۱۸ [الکہف] : ۶)، یعنی کیا آپ اس غم میں کہ وہ ایمان نہیں لاتے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے ۔ آپؐ کے متعلق صحابہؓ کرام کا یہ کہنا تھا کہ من رہ بداهة هابه و من خالطه معرفة احبه (شرح شمایل ترمذی ، ص ۲۲ ، مطبوعہ ۱۲۵۲ھ) ، یعنی جو کوئی آپؐ کو پہلی مرتبہ دیکھتا وہ آپؐ کے دبدبے سے مرعوب ہو جاتا اور جو آپؐ سے معاملہ کرتا وہ آپؐ سے محبت کرنے لگتا ہے ۔ ایک صحابی فرماتے ہیں کہ میں نے آپؐ سے زیادہ کسی کو مسکرانے والا نہ پایا (الترمذی : الجامع السنن ، ۲ : ۲۷۸) : اس سے آپؐ کی انسان شناسی اور فطرت انسانی کے وسیع ادراک کا پتہ چلتا ہے.

آپ کی تبلیغی زندگی میں جس وصف نے سب سے زیاد اہم کردار ادا کیا وہ آپ کی صفت عفو و درگزر اور حسن خلق ہے ۔ آپؐ نے اپنے سخت ترین دشمنوں کو عام معافی عطا فرمائی (سیرۃ النبی ، ۱ : ۵۱۵ ، ۵۲۰) : قتل کی نیت سے آنے والوں کو معاف فرمایا (ابن ہشام : سیرۃ ، ۲ : ۳۱۶) : اہل طائف کے ظلم و تعدی کے باوجود یہ کہہ کر ان کو معاف کر دیا کہ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو مجھے امید ہے کہ ان کی اولاد اس سے بہرہ ور ہوگی (ابن حجر : فتح الباری ، ۶ : ۲۲۵) ۔ غزوۂ احد میں جب مسلمانوں نے آپ کو لہولہان دیکھ کر مشرکین کے حق میں بد دعا کرنے کی درخواست کی تو رحمت مجسم نے فرمایا: "اے اللہ! میری قوم کو ہدایت فرما، کیونکہ وہ نہیں جانتے (مسلم : الصحیح ، ۲ غزوہ احد) ۔ عبداللہ ابن ابی سرح ، عکرمہ بن ابی جہل ، ہند زوجہ ابو سفیان ، صفوان ابن امیہ ، وحشی بن حرب وغیرہ کو جس طرح معافی عطا کی گئی ہے وہ تاریخ عالم کا منفرد واقعہ ہے (سیرۃ النبی ، ۱ : ۵۲۱ ، ۵۲۲) اس کے علاوہ آپ کا مضبوط کردار ، آپ کا اپنی دعوت پر منفرد طرز عمل لوگوں کے دل و دماغ کو آپ کی تبلیغ کی طرف متوجہ کرنے میں بہت مددگار تھا ، کیونکہ آپ کے عمل میں آپ کے قول کی صداقت بڑی عمدگی سے دیکھی جا سکتی تھی.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تبلیغی زندگی کی خصوصیات اتنی زیادہ ہیں کہ ان کو احاطہ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا ۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ کی تمام زندگی ایک داعی اور مبلغ کی زندگی ہے ۔ اسلامی انقلاب کے پس منظر میں سب سے زیادہ جس عامل نے کام کیا وہ آپ کی تبلیغ تھی جو نفسیات انسانی کے عمیق مطالعے پر مبنی تھی ۔ ہر شخص کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کا اصول آپؐ کی تبلیغی زندگی سے عنقا ہے ۔ حالات و طبائع میں فرق کے ساتھ آپ کے طریقہ تبلیغ میں تبدیلی آ جاتی تھی ۔ کلّموا الناس علی قدر عقولهم کا مقولہ ہمیشہ آپؐ کے پیش نظر رہا ۔

آپ ؐ نے ہر شخص سے وہی سلوک فرمایا جس کا وہ حق دار تھا ؛ آپ ؐ ہر شخص سے کامل متانت ، وفور مسرت اور مسکراتے چہرے کے ساتھ پیش آتے جس سے لوگوں کے دل باغ باغ ہو جاتے۔ اگر مخاطب ترش روئی ، تند خوئی سے پیش آتا آپ قطعاً برا نہ مناتے ؛ اگر نازیبا گفتگو کرتا آپ ؐ تحمل فرماتے۔ ایک شخص کو آپ ؐ نے اسلام کی دعوت دی ، اس نے کہا کہ مجھے سب باتیں منظور ہیں مگر میں فلاں کام نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ سن کر بعض صحابہ ناراض ہوئے، مگر آپ نے مسکراتے ہوئے اسے اپنے قریب بلایا اور نرمی سے اس کام کی قباحت ذہن نشین کرا دی کہ وہ خود ہی اس سے تائب ہوگیا۔ ایک بدو نے مسجد نبوی کے ایک گوشے میں پیشاب کر دیا۔ صحابہ ؓ اس کو مارنے کے لیے دوڑے ، مگر آپ نے منع فرما دیا۔ جب وہ حاجت سے فارغ ہوگیا تو نہایت نرمی اور پیار سے اسے مسجد کی عزت و حرمت سے آگاہ فرمایا۔ ایک بدو ضمام بن ثعلبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کئی قسمیں دے کر آپ سے پوچھا کہ کیا واقعی آپ اللہ کے فرستادہ ہیں۔ آپ ؐ نے تحمل سے جواب دیا۔ اس نے اپنے اکھڑ انداز میں اور بھی کئی سوالات کیے ، مگر آپ نے کامل بشاشت سے جواب دیا۔ جب وہ چلا گیا تو آپ ؐ نے اس کی درشتگی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی سادہ لوحی اور جذبہ اخلاص کی تعریف فرمائی (ابن سعد : طبقات ، ۱ : ۲۹۹ ، البخاری ، کتاب الایمان)۔

اختتام : بعض مستشرقین آپ ؐ کو محض ایک لیڈر اور ہیرو کے طور پر پیش کرتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ دونوں القاب درست نہیں ، اس لیے کہ آپ ؐ نبی اور رسول تھے جو تائید ایزدی سے بہرہ ور تھے۔ دوم آپ کا نصب العین کسی دنیوی قائد کی طرح مادی نہ تھا ، بلکہ روحانی تھا۔ سوم اس کے لیے کہ آپ سارے عالم کے لیے تھے کسی گروپ کے لیے نہ تھے۔

مآخذ : متن مقالہ میں مذکور ہیں (محمود الحسن عارف و کن ادارہ نے لکھا)۔

(ادارہ)

میثاق مدینہ : میثاق مدینہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بصیرت الہامی کا شاہکار ہے۔ ایک عظیم الشان ریاست کی تاسیس اور تدبیر و تنظیم سرور دو عالم کا وہ کارنامہ ہے جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ ایک ایسا شخص جسے اپنے ہم وطنوں نے وطن چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا ہو ، ہجرت کے سفر کی مشکلات برداشت کرتے ہوئے یثرب (مدینہ) پہنچتا ہے اور اس شہر کے چند محلوں پر مشتمل ایک شہری ریاست قائم کرتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے قبائلی عصبیت و قومیت کے بت کو پاش پاش کر کے اس کی جگہ ایک عالم گیر برادری قائم کی۔ رنگ ، نسل ، خاندان ، زبان اور وطن سے بالاتر ایک امت اور ملت کا قیام عمل میں لائے۔ غیر مسلموں اور مختلف مذہبی جماعتوں کے حقوق و فرائض کا تعین کیا ؛ ریاست اور شہریوں کے حقوق و فرائض کی نشاندہی کی۔ انصاف اور قانون کی حکومت قائم کی اور قانون کے سامنے مساوات کا اصول تسلیم کیا۔ انتظامیہ ، مقننہ اور عدلیہ کے اصول و ضوابط مرتب کیے۔ الغرض انسانی معاشرے کی تشکیل و تعمیر اور فلاح و بہبود نیز ایک اعلیٰ و ارفع اسلامی فلاحی مملکت کے قیام کے سلسلے میں ، جتنے بھی ضروری اقدامات ہو سکتے ہیں ، کیے گئے۔

ایک نئی ریاست کی تاسیس و تشکیل کے سلسلے میں میثاق مدینہ کو بڑی اہم اور بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف

لانے تو بہت سے مسائل کی طرف فوری توجہ دینے کی ضرورت تھی مثلاً : (۱) مسلمانوں کو یکجا اور متحد کرنے کا مسئلہ ؛ ۲۔ مسلمانوں کی روحانی و معاشرتی اصلاح و تربیت کا مسئلہ ؛ (۳) مدینے میں بسنے والے مختلف گروہوں کے باہمی تعلقات کو مضبوط کرنے کا مسئلہ۔ اس وقت مدینے میں یہود کے دس قبائل اور اوس و خزرج کے بارہ قبائل آباد تھے۔ اوس و خزرج میں مسلمان بھی تھے اور بت پرست بھی۔ اوس و خزرج اسلام کی آمد سے پہلے باہم ایک خونریز جنگ میں مبتلا رہ چکے تھے جسے جنگ بعاث کہا جاتا ہے ؛ (۴) شہر کی سیاسی تنظیم اور اس کے تحفظ و دفاع کا انتظام۔

سرور دو عالم ؐ نے حکمت نبوی سے ان تمام مسائل کو پوری کامیابی سے اس طرح حل کیا : (۱) مسلمانوں کو رنگ و نسل کے امتیازات سے بالاتر کر کے انھیں رشتۂ اخوت [مؤاخات ، رک بآں] میں منسلک کر دیا اور ایک ایسی نئی ملت تیار کی جو خالص دینی اور انسانی اقدار پر مبنی تھی۔ اسے ایک خدا ، ایک رسول ، ایک قوم اور ایک ہی مقصد زندگی سے وابستہ کر دیا ؛ (۲) مسلمانوں کی روحانی و معاشرتی تربیت و اصلاح اور ان میں مرکزیت پیدا کرنے کے لیے مسجد نبوی کی تعمیر کی اور اسے اہل اسلام کی روحانی ، سماجی ، تعلیمی و عدالتی سرگرمیوں کا مرکز و محور قرار دیا ؛ (۳ ، ۴) مدینے میں بسنے والے مختلف گروہوں کے باہمی تعلقات اور حقوق و فرائض کو متعین و منضبط کرنے کے لیے نیز اس شہر کی سیاسی تنظیم اور تحفظ و دفاع کے لیے ایک ایسا تحریری معاہدہ کیا جسے میثاق مدینہ کہا جاتا ہے۔

آپ نے اس معاہدے کی اہمیت کے پیش نظر اسے تحریر کروایا۔ اس میثاق کے لیے آپ نے "کتاب" اور "صحیفہ" کے الفاظ استعمال فرمائے جس سے اس دستاویز کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے اپنی کتاب "The First Written Constitution in the World" (لاہور ۱۹۶۸ء، ص ۴ تا ۹) میں مضبوط دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ میثاق مدینہ دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور ہے جسے خود ریاست کے حاکم اعلیٰ نے نافذ کیا (نیز رک بہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہ حیثیت مقنن)۔

میثاق مدینہ کی تفصیلات کا علم ہمیں مختلف بنیادی اور ثانوی مآخذ و مصادر سے ہوتا ہے؛ وہ اہم بنیادی مآخذ جنھوں نے اس معاہدے کی مکمل تفصیلات درج کی ہیں : (۱) محمد بن اسحاق : سیرۃ النبی (جس کا فارسی اور انگریزی ترجمہ دستیاب ہے) ؛ (۲) ابن ہشام : السیرۃ النبویۃ ؛ (۳) ابو عبید القاسم بن سلام : کتاب الاموال ؛ اور (۴) ابن کثیر : البدایۃ و النہایۃ۔

ابن سعد ، البلاذری ، ابن جریر الطبری ، ابن خلدون اور دیگر قدیم مؤرخین نے اس معاہدے کی تفصیلات درج نہیں کیں۔ البتہ اس کا ذکر ضرور کیا ہے۔ احادیث کی کم و بیش جملہ اہم کتب میں بھی اس معاہدے کا ذکر ہے ، مگر تفصیلات نہیں ہیں۔ الزرقانی ، المقریزی اور لسان العرب کے مصنف ابن منظور نے بھی میثاق مدینہ پر جزوی روشنی ڈالی ہے۔

ثانوی مآخذ میں زیادہ اہم یہ ہیں :

(۱) محمد حمید اللہ : الوثائق السیاسیۃ ، جس کا اردو ترجمہ "سیاسی وثیقہ جات" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے) ؛ (۲) وہی مصنف : عہد نبوی میں نظام حکمرانی ؛ (۳) وہی مصنف "*The First Written Constitution in the World*" ، لاہور ۱۹۷۵ء ؛ (۴) Leone Caetani : *Annali Atli' Islam* ؛ (۵) Wellhausen : *Skizzen aud vordrbalen Medina, Gemeni deardung Von* ؛ (۶) منٹگمری واٹ : *Muhammad at Medina* ؛ (۷) مجید خدوری : *The Law of War and Peace in Islam* ، لندن ؛

(۸) لیوی: *Social Structure of Islam*؛ (۹) قاضی محمد سلیمان سلمان منصورپوری: رحمۃ للعالمین؛ (۱۰) امیر علی: *The Spirit of Islam*؛

اس معاہدے کے مستند اور ثقہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ بعض اہل علم کا یہ اعتراض کہ اس معاہدے کے ضمن میں محمد ابن اسحاق اپنے سے پہلے راویوں کا ذکر نہیں کرتا، دیگر قوی تاریخی شواہد کی بنا پر رفع ہو جاتا ہے۔ ابو عبید القاسم بن سلام (م ۲۲۴ھ/۸۳۸ء) بڑے پائے کے قابل اعتماد، ثقہ اور قدیم عالم ہیں۔ انھوں نے یہ معاہدہ ابن شہاب الزہری (۵۸ھ/۶۷۸ء تا ۱۲۴ھ/۷۴۲ء) کی سند سے بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی "کتاب اموال" (۱ : ۲۵۹، اسلام آباد) میں یہ عبارت درج ہے: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا عہد نامہ جو آپؐ نے مدینہ منورہ تشریف آوری پر اہل ایمان اور اہل مدینہ کے درمیان لکھوایا، جس میں مدینے کے یہود سے مصالحت کا پیمان بھی ہے، ابن شہاب کہتے ہیں کہ مجھے روایت پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ معاہدہ تحریر فرمایا:

اس معاہدے کی ایک اہم شق کہ بنی عوف کے یہود بذات خود اور اپنے خلفا و موالی کے ساتھ مل کر مسلمان کے ساتھ ایک امت ہوں گے..." کی وضاحت کرکے ابو عبید نے بعد میں آنے والے محدثین کی الجھن دور کر دی۔ امام موصوف کہتے ہیں: معاہدے کی اس شق سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ دشمنان اسلام کے خلاف (جنگ کی صورت میں) شرط کے مطابق اخراجات کے ذریعہ مسلمانوں کی مدد کرتے رہیں گے۔ رہ گیا دین کا مسئلہ، سو وہ بالکل جداگانہ ہے۔ اس سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس سے آگے بھی آپ نے تصریح فرما دی کہ یہود اپنے دین پر کاربند رہیں گے اور اہل ایمان اپنے دین پر (کتاب مذکور، ۱ : ۲۶۴)۔ المقریزی کے بیان کے مطابق یہ تحریر شدہ دستور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تلوار سے لٹکا رہتا تھا۔ آنحضرتؐ کے بعد یہ تلوار حضرت علیؓ کو ملی۔ حضرت علیؓ نے لوگوں کو اس دستاویز کے حصے کوفہ میں پڑھ کر سنائے (المقریزی، امتاع الاسماع (مطبوعہ قاہرہ ۱ : ۴۹، ۱۰۴، ۱۰۷: محمد حمید اللہ: *The First Written Constitution in the World*، ص ۳۹ تا ۴۰، ۶۸).

اس معاہدے کے مستند ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ پوری عبارت میں کوئی بھی ایسی شق نہیں جو اسلام کی پالیسی یا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہو؛ مزید براں یہ ایک مسلسل اور مربوط عبارت ہے جو ظاہر کرتی ہے کہ اس کا مصنف ایک ہی تھا۔ پھر دور حاضر کے کم و بیش جملہ مسلمان اہل علم اور مستشرقین اس میثاق کے مستند ہونے کے قائل ہیں۔

معاہدے کی تاریخ: اس معاہدے کی تاریخ کے بارے میں قدیم مؤرخین و محدثین کے ہاں کوئی واضح اختلاف نہیں پایا جاتا۔ سبھی اسے ہجرت مدینہ کے فوری بعد اور غزوۂ بدر سے پہلے کا معاہدہ قرار دیتے ہیں۔ امام ابو عبید کی رائے سب سے وزنی معلوم ہوتی ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں: ہماری رائے میں یہ معاہدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری کے آغاز کے وقت کیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسلام کو استحکام و غلبہ حاصل نہیں ہوا تھا؛ نہ اس وقت تک اہل کتاب سے جزیہ لینے کا حکم صادر ہوا تھا۔ یہ (مدینہ کے) اہل کتاب تین گروہوں پر مشتمل تھے: بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ (کتاب الاموال، ۱ : ۲۶۴)۔ دور جدید کے اہل علم نے میثاق مدینہ کی تاریخ کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔ ولہاؤزن اور کائتانی اسے غزوہ بدر سے پہلے کی ہی دستاویز قرار دیتے ہیں؛ اسی طرح

مجید خدوری بھی بڑے یقین سے اسے غزوہ بدر سے پہلے کی دستاویز قرار دیتا ہے (دیکھیے *The Law of War and Peace in Islam* ، ۱۹۵۵ء ، ص ۲۰۶) ۔

محمد حمید اللہ نے اس معاہدے کو دو حصوں پر تقسیم کیا ہے اور یہ رائے قائم کی ہے کہ اس کا پہلا حصہ غزوۂ بدر سے پہلے کا ہے اور دوسرا حصہ غزوۂ بدر سے بعد کا ؛ انھوں نے بڑی تفصیلی بحث کی ہے اور مضبوط عقلی دلائل دیئے ہیں ، لیکن قدیم مآخذ سے کوئی واضح حوالہ نہیں دیا (دیکھیے *The First Written Constitution in the World* ، ۲۲ تا ۲۶) .

مقالہ نگار کی رائے میں یہ معاہدہ مکمل طور پر غزوۂ بدر سے پہلے ہی لکھا گیا ۔ بنو قینقاع جو اس معاہدے کے ایک فریق تھے ، انھیں غزوۂ بدر کے ایک ہی ماہ بعد ، اس معاہدے کی خلاف ورزی کرنے پر ، مدینے سے نکال دیا گیا تھا ۔ ابن اسحاق نے اس واقعے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے : ان بنی قینقاع کانوا اول یہود نقضوا ما بینھم و بین رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم و حاربوا فیما بین بدر و احد "(ابن ہشام : السیرۃ النبویۃ ، قاہرہ ۱۹۳۶ء ، ۳ : ۵۱) ، یعنی یہود میں سے بنو قینقاع پہلی جماعت تھی جس نے اس معاہدے کو توڑا جو ان کے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے درمیان ہوا تھا اور انھوں نے بدر و احد کی درمیانی مدت میں لڑائی کی ۔ اسی طرح کا بیان ابن سعد نے بھی دیا ہے (دیکھیے طبقات ، بیروت ۱۹۵۷ء ، ۲ : ۲۹) ۔ یہ عبارت اس بات کو پوری طرح سے واضح کرتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جملہ یہود سے ، جن میں بنو قینقاع بھی موجود تھے ، یہ معاہدہ غزوۂ بدر سے پہلے ہی کیا تھا ۔ رہ گیا یہ مسئلہ کہ معاہدے کے متن میں باقاعدہ طور پر بنو قینقاع ، بنو نضیر اور بنو قریظہ کا نام درج نہیں ہے ۔ تو اس کا ایک واضح جواب یہ ہے کہ ان قبائل کو اوس و خزرج کے حلفا کی صورت میں معاہدے میں شریک کیا گیا ۔ ان تینوں قبائل کا اوس و خزرج کے ساتھ حلیف ہونا مضبوط تاریخی شواہد سے ثابت ہوتا ہے ۔ ابن ہشام کی درج ذیل عبارت اس معاہدے پر خوب روشنی ڈالتی ہے :

"وکانوا اذا کانت بین الاوس و الخزرج حرب خرجت بنو قینقاع مع الخزرج و خرجت النضیر و القریظہ مع الاوس یظاھر کل واحد من الفریقین حلفاء علی اخوانہ" (ابن ہشام ، ۲ : ۱۸۸) ۔ یعنی جب کبھی اوس و خزرج میں لڑائی ہوتی تو بنو قینقاع خزرج کے ساتھ نکلتے اور بنو نضیر اور قریظہ اوس کے ساتھی بن کر نکلتے اور ان دونوں فریقوں میں سے ہر ایک اپنے حلیفوں کی مدد کرتا تھا بمقابلہ ان کے (یا اپنے) بھائیوں کے) ۔

میثاق مدینہ کا متن : ابن ہشام اور کتاب الاموال میں درج شدہ میثاق مدینہ چھوٹے بڑے ملے جلے فقروں پر مشتمل ہے ۔ دور جدید کے اکثر اہل علم نے ان فقروں کو دستوری دفعات کی صورت میں بیان کیا ہے ۔ ولہاوزن نے اس دستاویز کو ۴۷ دفعات پر منقسم کیا ہے ۔ اکثر مغربی مؤرخین نے اسی تقسیم کو تسلیم کیا ہے ۔ محمد حمید اللہ نے اس دستاویز کی باون دفعات گنوائی ہیں ، لیکن قارئین کو جو یورپی مآخذ کا مطالعہ بھی کرتے ہیں ، الجھن سے بچانے کے لیے ان دفعات کی تعداد ۴۷ ہی رکھی ہے اور بعض بڑی دفعات کو الف اور ب دو اجزا پر تقسیم کر دیا ہے ۔

یہ معاہدہ واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم ہے : پہلے حصے میں تئیس دفعات ہیں اور دوسرے میں چوبیس ۔ پہلا حصہ مسلمانوں کے باہمی تعلقات اور حقوق و فرائض کی نشاندھی کرتا ہے ، جبکہ دوسرا حصہ اہل اسلام اور یہود اور دیگر اہل مدینہ کے باہمی تعلقات ، حقوق و فرائض اور دیگر اہم امور کی وضاحت کرتا ہے ۔

مقالہ نگار کے نزدیک چونکہ امام ابو عبید القاسم بن سلام کا متن سب سے زیادہ مستند ہے ، اس لیے ذیل میں وہی درج کیا جاتا ہے، [البتہ ابن ہشام کا متن بھی جو اس سے کسی جگہ مختلف ہو جاتا ہے ، بڑی بریکٹوں کے درمیان اضافہ کر دیا گیا ہے]:

(۱) یہ محمد نبی اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کا عہد نامہ ہے جو قریشی اور مدنی مسلمانوں کے درمیان ، نیز ان لوگوں کے درمیان جو ان کی پیروی کر کے ان میں اس طرح آ ملیں اور ان کے ساتھ رہیں کہ ان کے ساتھ مل کر جہاد کریں ، کے درمیان طے پایا ؛ (۲) یہ سب لوگ مل کر دوسرے لوگوں سے الگ ہو کر ایک امت قرار پائیں گے ؛ (۳) قریشی مہاجرین اپنے نظام قبیلہ کے مطابق باہم اپنی دیتیں ادا کریں گے ؛ اسی طرح وہ اپنے قیدیوں کا فدیہ مومنوں اور مسلمانوں میں مروجہ دستور و انصاف سے ادا کریں گے ؛ (۴) بنو عوف اپنے نظام قبیلہ کے مطابق اپنی پہلی دیتیں ادا کریں گے اور ان میں سے ہر گروہ اپنے قیدیوں کو واگزار کروانے کے لیے مسلمانوں میں مروجہ دستور اور عدل و انصاف کے مطابق فدیہ دے گا] ؛ (۵) بنو الحارث [بن خزرج] اپنے نظام کے مطابق اپنی پہلی دیتیں ادا کریں گے اور ان کا ہر گروہ اپنے قیدیوں کا فدیہ مسلمانوں میں مروجہ دستور و انصاف کے مطابق دے گا؛ (۶) بنو ساعدہ؛ (۷) بنو جشم؛ (۸) بنو نجار ؛ (۹) بنو عمرو بن عوف ؛ (۱۰) بنو نبیت اور (۱۱) بنو اوس اپنے اپنے نظام کے مطابق اپنی دیتیں ادا کریں گے اور ان کا ہر گروہ اپنے قیدی کا فدیہ مسلمانوں کے مروجہ دستور و انصاف کے مطابق دے گا ؛ [آخر کی عبارت ہر جگہ دہرائی گئی ہے] (۱۲) اہل ایمان اپنے کسی زیر بار قرضدار کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑیں گے ، بلکہ قاعدے کے مطابق فدیہ ، دیت اور تاوان ادا کرنے میں اس کی مدد کریں گے ؛ (۱۳) اور یہ کہ تقویٰ شعار مسلمان متحد ہو کر ہر اس شخص کی مخالفت کریں گے جو ان میں سے مومنوں کے درمیان ظلم ، گناہ ، زیادتی ، سرکشی اور فساد و بغاوت کا موجب ہوگا ؛ وہ سب اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے خواہ وہ ظالم ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو ؛ (۱۴) کوئی مؤمن کسی مؤمن کو کافر کے عوض قتل نہیں کرے گا اور نہ کسی مؤمن کے خلاف وہ کسی کافر کی مدد کرے گا؛ (۱۵) سب مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے مددگار و کارساز ہوں گے ؛ (۱۶) یہودیوں میں سے جو بھی ہمارا تابع ہو جائے گا اس کے ساتھ دستور کے مطابق معاملہ و انصاف و مساوات کا سلوک روا رکھا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ؛ نہ ان کے خلاف کسی کی مدد کی جائے گی ؛ (۱۷) مسلمانوں کی صلح یکساں اور برابر کی حیثیت رکھتی ہے ؛ کوئی مسلمان قتال فی سبیل اللہ میں دوسرے مسلمان سے الگ ہو کر صلح نہیں کرے گا ؛ اسے مسلمانوں کے درمیان مساوات و عدل ملحوظ رکھنا ہوگا ؛ (۱۸) ہر غازی جماعت کے افراد آپس میں ایک دوسرے کی جانشینی کریں گے ؛ (۱۹) تقوی شعار مسلمان اس معاہدے کی شرائط پر کاربند رہیں گے؛ (۲۰) کوئی مشرک [یہودی] قریش کے مال کو پناہ نہیں دے گا اور نہ کسی مسلمان کے مقابلے میں وہ قریش کی مدد کرے گا ؛ (۲۱) جو کسی مؤمن کا ناحق خون کرے گا اسے مقتول کے عوض قتل کیا جائے گا ، اِلّا یہ کہ اس مقتول کا ولی اس کے عوض خون بہا لینے پر رضامند ہو جائے اور تمام اہلِ ایمان قاتل کے خلاف رہیں گے ؛ (۲۲) کسی مؤمن کے لیے جو اس معاہدے کی پابندی کا اقرار کر چکا ہے اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان لا چکا ہے ، یہ جائز نہ ہوگا کہ وہ کسی قانون شکن کی مدد کرے یا اسے پناہ دے ؛ جو ایسے مجرم کی مدد کرے گا یا پناہ دے گا تو اس پر قیامت کے دن تک اللہ تعالیٰ کی لعنت اور اس کا غضب ہو ؛ اس سے نہ بدلہ

قبول کیا جائے گا اور نہ فدیہ؛ (۲۳) اور تم لوگ جب بھی کسی معاملے میں باہم اختلاف کرو گے تو اس کے فیصلے کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

[یہاں تک کی دفعات اہل اسلام کے باہمی معاملات سے متعلق تھیں۔ بطور ذیل کی دفعات غیر مسلم قبائل سے تعلقات کی نوعیت بیان کرتی ہیں:] (۲۴) مسلمان جب تک جنگ میں مصروف رہیں گے جنگی اخراجات میں یہودی ان کے شریک رہیں گے؛ (۲۵) بنو عوف کے یہود بذات خود اور اپنے حلیفوں اور موالی کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے ساتھ ایک فریق اور جماعت ہوں گے۔ یہودی اپنے دین پر کاربند رہیں گے اور مسلمان اپنے دین پر، البتہ جس نے ظلم و گناہ کیا وہ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو مصیبت میں ڈالے گا؛ (۲۶) بنی نجار، (۲۷) بنو حارث؛ (۲۸) بنو ساعدہ (۲۹) بنو جُشَم؛ (۳۰) بنو اوس (۳۱) اور بنو ثعلبہ کے یہود کے لیے بھی وہی کچھ (مراعات، فرائض) ہے جو یہود بنی عوف کے لیے ہے۔ (آخر کی عبارت ہر جگہ دہرائی گئی ہے)، لیکن ان میں سے جس نے ظلم و زیادتی کی تو وہ اپنے آپ کو اور اپنے گھروالوں کو تباہی میں ڈالے گا؛ [(۳۲) یہ کہ بنو ثعلبہ کا بطن (شاخ) بنو جفنہ بھی بنو ثعلبہ کی طرح ہوں گے (۳۳) اور یہ کہ بنو شُطیبہ کے لیے بھی وہی کچھ ہے جو یہود بنی عوف کے لیے ہے، اور یہ کہ نیکی گناہ سے الگ ہوگی؛ (۳۴) بنو ثعلبہ کے موالی (حلفاء وغیرہ) حقوق و فرائض میں انہی کی طرح ہوں گے؛ (۳۵) اور یہ کہ یہودیوں کی کوئی شاخ ان کی ہی طرح ہوگی؛]، (۳۶) اور ان قبائل میں سے کوئی فرد حضرت محمد صلی اللہ و آلہ وسلم کی اجازت کے بغیر [مدینہ سے، معاہدے سے] باہر نہیں نکلے گا؛ (۳۶ ب) [اور یہ کہ کوئی شخص زخم (جرم) کا بدلہ لینے سے مانع نہیں ہوگا اور جو کوئی کسی کو قتل کرے گا پس وہ خود کو اور اپنے اہل خاندان کو ہی ہلاک کرے گا]؛ (۳۷) اور یہ کہ اہل اسلام پر اپنے اخراجات اور یہود پر اپنے اخراجات واجب ہوں گے؛ نیز جو اس معاہدے کے شرکا سے جنگ کرے گا تو تمام شرکا اس کے خلاف آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے؛ (۳۷ ب) وہ آپس میں ایک دوسرے کے خیر خواہ رہیں گے اور ہر حال میں مظلوم کی مدد کریں گے؛ (۳۸) [اور یہ کہ یہودی جب تک مسلمانوں کے ساتھ رہیں گے اپنا خرچہ برداشت کریں گے؛ (۳۹) اس معاہدے والوں کے لیے مدینہ کی حدود کا داخلی علاقہ حرم کی حیثیت رکھے گا؛ [(۴۰) اور بہ کہ ہمسایہ اپنے آپ کی طرح ہوگا، نہ اسے نقصان پہنچایا جائے گا اور نہ اس پر زیادتی کی جائے گی]؛ (۴۱) [اور یہ کہ کسی کی زیر کفالت چیز کو اس کی اجازت کے بغیر پناہ نہ دی جائے گی؛ (۴۲) اس معاہدے والوں کے درمیان جو بھی نیا معاملہ یا قانون شکنی کا واقعہ پیش آئے گا جس سے نقصان اور فساد کا امکان ہو تو اس کے فیصلے کے لیے اللہ اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی طرف رجوع کیا جائے گا [اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اس صحیفے میں نیکی اور تقویٰ کے مضمون پر گواہ ہیں۔]؛ (۴۳) قریش اور ان کے مددگاروں کو کوئی پناہ نہیں دے گا؛ (۴۴) اور جو کوئی یثرب (مدینہ منورہ) پر یلغار کرے گا تو یہ معاہدہ کرنے والے باہمی امداد سے اس کا مقابلہ کریں گے؛ (۴۵) ان (مسلمانوں) میں سے جو اپنے حلیف کے ساتھ صلح کرنے کے لیے یہود کو دعوت دے تو یہود اس سے صلح کریں گے۔ اسی طرح اگر وہ (یہود) ہمیں کسی ایسی ہی صلح کی دعوت دیں تو مسلمان بھی اس دعوت کو قبول کریں گے، بشرطیکہ وہ حلیف دین (اسلام) سے برسر پیکار نہ ہوں؛ (۴۵ ب) اخراجات میں تمام

لوگ اپنے حصے کے ذمہ دار ہوں گے ؛ (۴۶) قبیلۂ اوس کے یہود بذات خود اور ان کے حامی اور حلیف اس عہد نامے پر خوبی و عمدگی سے عمل پیرا ہونے والوں کے ساتھ رہیں گے۔ گناہ کی حدود سے ورے نیکی اور وفاداری ہے ؛ ہر کام کرنے والا اپنے عمل کا ذمہ دار ہوگا ؛ زیادتی کرنے والا اپنے نفس پر زیادتی کرے گا۔ اس معاہدے پر سچائی اور نیکی سے کاربند رہنے والوں کا اللہ مددگار ہوگا ؛ (۴۷) یہ معاہدہ ظالم اور گناہ گار کو اس کے عمل بد کے انجام سے نہیں بچائے گا ؛ جو (مدینے سے) باہر نکل جائے گا وہ مامون رہے گا اور جو (مدینے میں) بیٹھا رہے گا وہ بھی مامون ہوگا ، لیکن جو ظلم و گناہ کرے گا وہ مامون نہیں رہے گا۔ اللہ اور اس کا رسول نیکوکار اور متقی لوگوں کے حامی و محافظ ہیں (کتاب الاموال ، ۱ : ۳۵۹ تا ۳۶۵ ؛ محمد حمید اللہ : الوثائق السیاسیہ ، ص ۱۵ تا ۲۱ ؛ ابن ہشام ، سیرۃ ، ۲ : ۱۴۹ ببعد)۔

میثاق مدینہ کی اہمیت و افادیت : میثاق مدینہ کا غائر نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد اس معاہدے کی اہمیت و افادیت کے بارے میں جو اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں وہ یہ ہیں : (۱) اس معاہدے کی بدولت مدینے کی شہری ریاست کا آغاز ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کی طرف سے اس ریاست کے سربراہ تسلیم کر لیے گئے اور اس طرح ایک بین الاقوامی معاشرہ تشکیل دینے میں مصروف ہو گئے ؛ (۲) اس معاہدے کی بدولت ، بقول سر ولیم میور ، آپؐ نے ایک عظیم مدبّر اور سیاست دان کی طرح مختلف الخیال اور مختلف العقیدہ اور آپس میں منتشر لوگوں کو متحد اور یکجا کرنے کا کام بڑی مہارت سے سرانجام دیا۔ آپؐ ایک ایسی ریاست اور ایک ایسا معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے جو بین الاقوامی اصول پر مبنی تھا (دیکھیے سید امیر علی : *The Spirit of Islam* ، کراچی ۱۹۶۹ء ، ص ۵۸) ؛ (۳) اس میثاق کی بدولت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے عدالتی ، تشریعی ، فوجی اور تنفیذی اختیارات اپنے اور اہل اسلام کے لیے محفوظ کر لیے ؛ (۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے سیاست میں اخلاقی عناصر کو داخل کیا۔ اصل سرچشمۂ اقتدار اللہ تعالٰی کو قرار دیا اور خود اللہ تعالٰی کے نائب کی حیثیت اختیار کی ؛ (۵) حقوق شہریت ، تنظیم حکومت ، سیاسی رواداری ، فراست اور حکمت عملی کا عمدہ اظہار بھی اسی معاہدے کے ذریعے سے ہوا ؛ (۶) اسی معاہدے کی بدولت مذہبی آزادی کا اصول وضع ہوا۔ نیز جن بنیادوں پر غیر مسلموں سے اتحاد و تعاون ہو سکتا ہے اس کی نشاندہی ہوئی ؛ (۷) اسی معاہدے نے اہل اسلام کے باہمی حقوق و فرائض اور جملہ شہریوں کے آپس میں تعلقات ، فرائض اور حقوق کا تعین کیا ؛ (۸) اسی معاہدے نے ظلم ، نااتفاقی ، عدم مساوات اور ایسی ہی دیگر خرابیوں کا سدباب کیا۔ عربوں کے قتل کا بدلہ لینے کا پرانا انفرادی طریق ختم کرکے اسے اجتماعی فریضہ قرار دیا ؛ کمزوروں ، ناداروں اور مظلوموں کی داد رسی کا پورا پورا اہتمام بھی اسی معاہدے کی رو سے ہوا ؛ (۹) حالت امن اور حالت جنگ کا لائحہ عمل مرتب ہوا ؛ (۱۰) یہ معاہدہ قریش کے خلاف ایک مشترکہ اتحاد بن گیا اور دشمنان اسلام کا داخلہ مدینہ منورہ میں بند کر دیا گیا ؛ (۱۱) مدینے کو حرم قرار دیا گیا اور یوں اس نئی شہری ریاست کی حرمت قائم ہوئی ؛ نیز اس کے داخلی امن اور تحفظ و دفاع کا خاطر خواہ انتظام ہوا ؛ (۱۲) قبائل کی باہمی خانہ جنگی کا انسداد بھی اسی معاہدے کی بدولت ہوا ؛ (۱۳) اسی معاہدے نے اہل اسلام کے بڑے دشمن مشرکین مکہ کو دوسرے قبائل کو مسلمانوں کے خلاف

بر انگیختہ کرنے سے روک دیا ؛ (۱۵) اسی معاہدے نے شہریوں کے اندر قانون، اخلاق، مذہب اور انسانی قدروں کے احترام کا بھرپور جذبہ پیدا کیا ؛ (۱۶) اسی معاہدے نے اللہ تعالٰی کے احکام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے فیصلوں کو حتمی اور فائق حیثیت دے دی ؛ (۱۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے جاری کردہ اسی نظام کی بدولت ایک مضبوط اسلامی ریاست اور ایک صالح معاشرہ معرض وجود میں آیا ۔ [نیز رک بہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم بحیثیت مقنّن؛ آپؐ کا نظام حکمرانی:]

مآخذ : (۱) ابو عبیدالقاسم بن سلام : کتاب الاموال، اردو ترجمہ، مطبوعۂ اسلام آباد، ۱ : ۳۵۹ تا ۳۶۶ ; (۲) ابن ھشام : السیرۃ النبویۃ، قاہرہ ۱۹۳۶ء، ۲ : ۱۴۷ تا ۱۵۰ ; (۳) ابن کثیر : البدایۃ و النہایۃ، مطبوعۂ قاہرہ ۱۹۳۲ء، ۳ : ۲۲۴ تا ۲۲۶ ; (۴) ابن اسحاق : سیرۃ رسول اللہؐ، لنڈن ۱۹۵۵ء انگریزی ترجمہ از A. Guillaume، ص ۲۳۱ تا ۲۳۳ ; (۵) محمد حمید اللہ : *The First Written Constitution in the World*، لاہور ۱۹۷۵ء ; (۶) وہی مصنف : الوثائق السیاسیۃ للعہد النبوی و الخلافۃ الراشدۃ، بیروت ۱۹۶۹ء [ص ۱۵ تا ۲۱] ; (۷) وہی مصنف : عہد نبوی میں نظام حکمرانی، حیدر آباد دکن، ص ۶۷ تا ۱۱۱ ; (۸) Montgomery Watt : *Muhammad at Medina*، لنڈن ۱۹۵۶ء، ص ۲۲۱ تا ۲۲۸ ; (۹) مجید خدوّری : *War and Peace in the Law of Islam*، نیویارک ۱۹۵۵ء ; (۱۰) Reuben Levy : *The Social Structure of Islam*، کیمبرج ۱۹۵۷ء، ص ۲۷۲ تا ۲۷۶ ; (۱۱) ابن سعد : الطبقات، بیروت ۱۹۵۷ء، ۲ : ۲۹ ; (۱۲) المقریزی : امتاع الاسماع، قاہرہ، ۱ : ۴۹، ۱۰۳، ۱۰۷ ; (۱۳) سید امیر علی : *The Spirit of Islam*، کراچی ۱۹۶۹ء، ص ۵۸ تا ۵۹ ; (۱۴) قاضی محمد سلیمان سلمان منصورپوری : رحمۃ للعالمین، لاہور، ۱ : ۱۱۵ تا ۱۱۷۔

(امان اللہ خان [و ادارہ])

معاہدات عہد نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم :® معاہدات، جمع معاہدہ از باب مفاعلہ (مادہ ع ۔ ہ ۔ د)، یعنی قسم کھا کر پختہ عہد کرنا ۔ یہ عموماً فریقین میں طے پاتا ہے [تفصیل کے لیے دیکھیے ابن منظور : لسان العرب، بذیل مادہ] ۔ معاہدات عہد نبویؐ کا اطلاق ان معاہدات پر ہوتا ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ہجرت کے بعد اور بالخصوص قیام ریاست مدینہ کے بعد مختلف اقوام و ملل سے کیے گئے ۔ یہاں پر یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی بعثت مبارکہ کا اصل مقصد اعلاے کلمۃ اللہ تھا (۹ [التوبۃ] : ۳۳ ; ۴۸ [الفتح] : ۲۸ ; ۶۱ [الصف] : ۹)، جنگ ایک ناگزیر لائحہ عمل تھی اور صرف ایسے مجبوری کے مواقع پر یہ انتہائی قدم اٹھایا جاتا جب کہ مخالفین کسی طرح راہ راست پر نہ آتے تھے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پوری طرح کوشش فرماتے کہ کسی طرح جنگ ٹل جائے ؛ چنانچہ اس مقصد کے تحت آپؐ خود بھی اور آپؐ کے جاں نثار بھی عین میدان جنگ میں مخالفین کے سامنے شرائط صلح پیش کرتے ۔ اگر مخالفین ان میں سے کوئی ایک شرط قبول کر لیتے تو ان سے جنگ فوراً بند کر دی جاتی ۔ لڑائی کے دوران میں بھی اگر کوئی صلح کی درخواست کرتا تو آپؐ شرف قبول بخشتے ۔ اسی بنا پر، صلح اور اس کے معاہدات مزاج نبوی کے عین مطابق ہیں، کیوں کہ آپؐ کا اصلی مشن امن و امان کا قیام اور عدل و انصاف کا اجرا و نفاذ تھا ۔ صلح حدیبیہ میں آپؐ نے صحابہ کرامؓ کی ناگواری کے باوجود بعض ایسی شرائط بھی قبول فرمائیں، جو بظاہر آپؐ کے خلاف جاتی تھیں ۔ مقصد یہ تھا کہ کسی طرح امن و امان قائم ہو

جائے۔ فتح خیبر میں بھی آپؐ نے اپنی مفتوح اقوام سے ان کی مرضی کے مطابق معاہدہ فرمایا۔ اس طرح بے شمار مثالیں سیرت نبوی سے مل سکتی ہیں اور پھر اگر آپؐ کسی سے معاہدہ فرماتے تو اس کا پورا احترام فرماتے۔ آپؐ کے دشمنوں کو بھی آپؐ سے کبھی بدعہدی اور بے وفائی کی شکایت نہ ہوئی]۔

معاہدے کی پابندی پر جس قدر اسلام نے زور دیا ہے اتنا کسی دوسرے مذہب یا مکتب خیال نے نہیں دیا [رک بہ معاہدۃ]۔ معاہدات عہد نبوی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں سے ہر معاہدے کی کامل پابندی کی گئی۔ سیاسی، اور عسکری حالات میں تفاوت کے باوجود ان معاہدات کی ہر شق اب بھی اسی طرح قابل عمل اور باعث امن عالم انسانی ہو سکتی ہے۔

عہد نبوی کے معاہدوں کی مختلف نوعیتیں ہیں اور یہ مختلف نوعیتیں مختلف ادوار سے متعلق ہیں: معاہدات کا پہلا دور غزوۂ بدر سے قبل کے زمانے (۲ھ) کا ہے۔ اس دور کے معاہدات کے پس منظر میں قریش مکہ کا اعلان جنگ کارفرما ہے، اس لیے جن قبائل کے ساتھ دوستی، حلف یا ان کی غیر جانب داری سے مدینہ کی نوزائیدہ مملکت کو فائدہ پہنچ سکتا تھا ان کے ۔تو معاہدات طے پائے۔ قریش مکہ کی سیاسی اور اقتصادی برتری اور ان کے اعلیٰ معاشرتی مقام کی وجہ سے اس طرح کے معاہدوں کی تعداد زیادہ نہ ہو سکی، البتہ جو تین معاہدے اس دور میں طے پائے وہ اس دور میں مملکت مدینہ کی کمزور عسکری حالت کے پیش نظر سود مند ثابت ہوئے۔

دوسرے دور کا واحد مگر اہم معاہدہ صلح حدیبیہ ہے۔ اس معاہدے کے اثرات دور رس تھے اور سیرت نبوی کا یہ واقعہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ فقہا نے اس معاہدے کی شقوں سے امور خارجہ سے متعلق اہم اصول وضع کیے ہیں۔

معاہدات عہد نبوی کا تیسرا دور صلح حدیبیہ سے لے کر فتح مکہ تک کا ہے۔ اب وہ زمانہ شروع ہوتا ہے جب یہ معاہدے معاہدات سے زیادہ امان ناموں کا مقام رکھتے ہیں۔ یہ معاہدے یک طرفہ قسم کی ان مراعات پر مبنی ہیں، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مفتوح قبائل کو ازخود عطا فرماتے تھے، جیسا کہ وادی خیبر کی شکست خوردہ یہودی آبادی کے معاہدے سے ثابت ہوگا۔ اگر آپؐ ان مفتوح یہودیوں کو غلام بنا لیتے یا قتل کر دیتے یا ملک بدر کر دیتے تو آپؐ کا یہ عمل اس دور کے رواج اور خود شریعت موسوی کے عین مطابق ہوتا۔

فتح مکہ کے بعد تقریباً پورا عرب اسلامی مملکت میں شامل ہو چکا تھا۔ جو قبائل اسلام قبول کرتے تھے ان کے ساتھ کسی طرح کے معاہدے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، البتہ جو قبائل یا قبائل کے وہ افراد جو خارج از اسلام رہنا چاہتے تھے انہیں جزیہ کے عوض امان عطا کی جاتی تھی۔ اس دور کے عہد ناموں کو معاہدات کی فہرست میں اس لیے شامل کیا جا رہا ہے کہ ان امان ناموں میں ان مراعات کا ذکر ہے جو حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان ذمیوں کو عطا فرمائی تھی۔

میثاق مدینہ: ہجرت کے فوراً بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مدینہ منورہ کی ریاست قائم کی اور قیادت اپنے ہاتھ میں رکھی۔ مدینہ منورہ میں اس سے قبل باقاعدہ ریاست کا وجود نہ تھا۔ قبائل آزاد و خود مختار حیثیت سے زندگی گزار رہے تھے۔ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں مسلمانوں کا چھوٹا سا گروہ داخل ہوا، جو منضبط اور منظم زندگی گزارنے کی استطاعت رکھتا تھا۔ مکی زندگی کے دوران میں آپؐ نے جو تربیت اپنے اصحابؓ کو دی تھی وہ بیک وقت اجتماعی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد انصار کرامؓ

بھی اس قابل ہوگئے کہ ریاستی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہو سکیں۔ مدینہ منورہ میں ریاست کا قیام باقاعدہ آئین کے ذریعے کیا گیا تھا۔ یہ آئین میثاق مدینہ [رک بآں] کے نام سے معروف ہے۔ حالانکہ اس کی حیثیت ایک آئینی حکم نامے (Constitutional Charter) کی سی ہے، مگر چونکہ آئین ایک طرح کا عہد نامہ ہوتا ہے جو ایک طرف حکومت اور دوسری طرف افراد کے حقوق و فرائض کی حدود متعین کرتا ہے، اسی بنا پر اس کو معاھدات میں شمار کیا جا سکتا ہے، چنانچہ عہد نبوی کے عہد ناموں میں اولیت اسی دستاویز کو دی جاتی ہے۔

دوسرا اہم نکتہ جو قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ یہ دستاویز صرف مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات ہی کا احاطہ نہیں کرتی، بلکہ اس کی مخاطب پوری مدنی آبادی (مسلم، مشرک، یہودی) تھی۔ اس کا عنوان تھا: یہ دستاویز محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی جانب سے ہے [رک بہ میثاق مدینہ؛ ابن ھشام: سیرۃ، ص ۳۴۱، لائپزگ ۱۸۶۰ء]۔ اس کے یہ معنی ہوے کہ یہ دستاویز رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے عطا فرمائی۔ اس کے اندر جو فرائض اور حقوق درج تھے آپ کی طرف سے آئین کی صورت میں عطا کیے گئے تھے؛ دوم یہ کہ اس کے دو فریق تھے: پہلا فریق اہل اسلام پر اور دوسرا فریق ہر اس شخص یا ہر اس قبیلے پر مشتمل تھا، جو آزادانہ طور پر اپنی آزادی فریق اول کے حوالے کرنے کا خواہش مند ہو؛ سوم یہ کہ یہ آزادی مکمل طور پر فریق اول کے رحم و کرم پر چھوڑی جا رہی تھی، اس لیے کہ دوسرا فریق تین باتوں کو قبول کرتا تھا: ایک یہ کہ وہ مسلمانوں کے پیچھے چلے گا؛ دوم یہ کہ ان کی جماعت کا فرد بن کر رہے گا اور سوم یہ کہ جب قتال کی ضرورت ہوگی تو مسلمانوں کے شانہ بشانہ جنگ میں شریک ہوگا [اس کے لیے رک بہ میثاق مدینہ]۔ یہاں اس کی چند دفعات ذیل میں درج نکات کی رو سے قابل توجہ ہیں:

فریق اول کا امن غیر منقسم قرار دیا گیا تھا، یعنی یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کے ایک حصے سے دشمنی ہو اور دوسرے کے ساتھ دوستی۔ مسلمان ملت واحدہ قرار دیے گئے تھے۔ (دیکھیے شق ۱، ۲)۔ جنگ شروع ہونے کے بعد فریق ثانی علیحدہ صلح کرنے کا مجاز نہ تھا، یعنی مسلمانوں کے ساتھ شامل ہونے کے بعد فریق ثانی کو دشمن کے ساتھ صلح کرنے کی اجازت نہ تھی (شق نمبر ۲۰ ب)۔ فریق ثانی قریش مکہ کی جانب سے کسی معاملہ میں دخل نہ دے سکتے تھے (شق ۲۰ ب)۔ فریق ثانی کے کسی بات میں اختلاف کی صورت میں معاملہ اللہ (قانون الٰہی) اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سامنے پیش کیا جاتا تھا (شق ۲۳)۔ یہاں بھی حاکمیت اللہ کے قانون اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ہاتھ میں رکھی گئی [رک بہ میثاق مدینہ]۔

یہ دفعات اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ حکومت کے سربراہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تھے اور حزب اقتدار مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ فریق ثانی کو حکومت میں صرف اسی قدر دخل تھا، جہاں تک وہ قانون انہی پر کاربند رہتے تھے۔ انھیں جہاد میں شریک ہونے کی اجازت تھی، مگر مشروط۔ اس میثاق معاھدے کی یہودیوں نے خلاف ورزی کی اور اس کے نتیجے میں ان سے مملکت مدینہ کی شہریت واپس لے لی گئی [تفاصیل کے لیے رک بہ غزوات نبوی]۔ باغی گروھوں کو ملک بدر کرنے کا قانونی جواز عہد حاضر کی ریاستیں بھی قبول کرتی ہیں کہ جو شخص یا گروہ ملک کے آئین کی صریحًا خلاف ورزی کرتا ہے وہ اس آئین کو عملی طور پر رد کر رہا ہوتا ہے اور جو فرد یا گروہ کسی ریاست کے آئین کو قبول کرنے

پر آمادہ نہ ہو وہ اس ریاست کا شہری نہیں رہتا۔

حدود مملکت سے جن یہودی قبائل کو نکالا گیا تھا وہ بغاوت کے مجرم تھے اور یہ ان کی جائز سزا تھی، مگر آپؐ نے از راہ شفقت انھیں ملک سے چلے جانے اور اپنی تمام منقولہ جائداد اور مال ساتھ لے جانے کی بھی اجازت دے دی تھی۔

دوسرا معاہدہ: [غزوۂ ابواء میں، جسے غزوہ وَدّان بھی کہتے ہیں، بنو ضمرہ کے ساتھ صلح ہوگئی تھی۔ شرائط صلح یہ تھیں کہ بنو ضمرہ نہ مسلمانوں سے جنگ کریں گے اور نہ مسلمانوں کے کسی دشمن کی مدد کریں گے اور نہ مسلمانوں کو کبھی دھوکا دیں گے اور عند الضّرورت انھیں مسلمانوں کی امداد اور اعانت کرنی ہوگی (ابن سعد: الطّبقات، ۲: ۸، مطبوعۃ بیروت)]۔

معاہدہ سوم: جُمادی الآخرۃ سنہ ۲ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ذات العُشیرہ تشریف لے گئے، جو کہ یُنبع اور مدینے کے درمیان واقع ہے اور بنو مُدلج سے معاہدہ کرکے مدینے تشریف لائے۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ اگر کوئی مدینے پر حملہ آور ہوا تو وہ مسلمانوں کو مدد دیں گے اور اگر ان کے علاقے پر کوئی حملہ آور ہوگا تو مسلمان ان کی مدد کریں گے۔ یہ وہی علاقہ ہے جہاں سے قافلے گزرا کرتے تھے۔

میثاق مدینہ اور غزوہ ودّان کے بعد (معاہدات کے دوسرے دور میں) جو اہم معاہدہ طے پایا وہ صلح حدیبیہ کا معاہدہ تھا۔ یہ تاریخی معاہدہ وقت اور مندرجات دونوں کے اعتبار سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

یکم ذو القعدہ سنہ ۶ھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم عمرہ ادا کرنے کے لیے مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے؛ تقریبا چودہ یا پندرہ سو صحابہؓ آپؐ کے ساتھ تھے۔ چونکہ آپؐ کا ارادہ جنگ کا نہ تھا، اس لیے کسی قسم کا اسلحہ ساتھ نہیں لیا۔ جب آپؐ غدیر اشطاط پہنچے تو آپؐ کو اطلاع ملی کہ قریش نے آپؐ کی آمد کی خبر سن کر لشکر جمع کر لیا ہے اور آپؐ کے مقابلے کے لیے تل گئے ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ خالد بن ولید بطور مقدمۃ الجیش دو سو سواروں کو لے کر مقام غمیم میں پہنچ گئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ خبر سن کر وہ راستہ چھوڑ دیا اور دوسرے راستے سے نکل کر مقام حدیبیہ میں پہنچ گئے۔ حدیبیہ میں قیام کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک قاصد کے ذریعے اہل مکہ کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ ہم صرف بیت اللہ کی زیارت کے لیے آئے ہیں، لیکن آپؐ کا قاصد بمشکل جان بچا کر واپس آیا۔ اس کے بعد آپؐ نے حضرت عمرؓ کے مشورے سے حضرت عثمانؓ کو مکۂ مکرمہ بھیجا۔ حضرت عثمانؓ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو قریش نے ان کو روک لیا ادھر یہ خبر مشہور ہوگئی کہ حضرت عثمان غنیؓ شہید کر دیے گئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جب یہ خبر سنی تو آپؐ کو بہت صدمہ ہوا اور یہ فرمایا کہ جب تک میں قریش سے بدلہ نہ لے لوں گا یہاں سے نہ جاؤں گا۔ آپؐ نے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر اپنے اصحابؓ سے شہادت پر بیعت لی؛ تمام صحابہؓ اس میں شامل ہوئے۔ اس بیعت کو بیعت رضوان کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے متعلق قرآن میں ارشاد ہے: لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ (۴۸ [الفتح]: ۱۸)، یعنی اللہ ایمان والوں پر (اس وقت) راضی ہوا جب کہ وہ درخت کے نیچے آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے۔ مدنی معسکر کے باہر جو لوگ موجود تھے، انھوں نے اس بیعت کا منظر دیکھا تو اس کی اطلاع اہل مکہ تک پہنچا دی۔ قریش مکہ کو جب اس بیعت کا علم ہوا تو انھوں نے صلح کے لیے نامہ و پیام

کا سلسلہ شروع کر دیا ۔ چنانچہ انھوں نے سہیل بن عمرو کو یہ ہدایات دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں روانہ کیا کہ ہم صلح کا معاہدہ اس شرط پر قبول کرتے ہیں کہ اس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم عمرہ کیے بغیر ہی مدینہ منورہ لوٹ جائیں گے ۔ حضورؐ اقدس کا اصل مقصد ہمیشہ تبلیغ و اشاعت اسلام رہا اور تبلیغ دین صرف صلح و امن اور دوستی کے ماحول ہی میں ہو سکتی ہے ؛ اس لیے آپؐ نے صلح نامہ قبول فرما لیا ۔ [آپؐ اپنے عظیم سیاسی تدبّر کی روشنی میں یہ دیکھ رہے تھے کہ اس صلح کے عواقب و نتائج اسلام اور اہل اسلام کے حق میں کس قدر مفید ثابت ہوں گے اور اس دورِ صلح میں کس طرح اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا سازگار ماحول میسر آ سکے گا ۔ اسی بنا پر اگرچہ] ان کے سفارتی وفد کے سردار کا رویہ غیر مصالحانہ تھا، مگر آپؐ نے انتہائی تدبر اور تحمل سے کام لیا اور اس طرح آپؐ کو یہ معاہدہ کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ۔ جب صلح نامے کی شرائط طے پا گئیں تو حضرت علیؓ نے لکھنا شروع کیا اور آغاز بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم سے کیا ۔ اس پر قریشی نمائندے سہیل نے اعتراض کیا اور کہا : صرف باسمک اللّٰھم لکھو؛ چنانچہ حضرت علیؓ نے آپؐ کے حکم سے باسمک اللّٰھم لکھا ۔ اس کے بعد سہیل بن عمرو نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رسول اللہ لکھنے پر اعتراض کیا ۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا : لکھو یہ ہے جس پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بن عبداللہ نے سہیل بن عمرو کے ساتھ اتفاق کیا ۔ شرائط صلح یہ تھیں :

(۱) دس سال کے لیے باہمی جنگ و جدال کو موقوف کر دیا جائے ؛ اس دوران میں کوئی کسی سے تعرّض نہ کرے ، جو مدنی مکہ کی طرف آئے جائے یا جو مکی مدینہ منورہ کی طرف کسی بھی سلسلے میں سفر کرے اس کا جان و مال محفوظ تصور کیا جائے گا ؛ (۲) اگر کوئی مکی نوجوان اپنے ولی اور آقا کی مرضی کے خلاف مدینہ ہجرت کر جائے تو وہ واپس کیا جائے ، اگرچہ وہ مسلمان ہو کر جائے ؛ البتہ اگر کوئی مسلمان مدینہ چھوڑ کر مکہ مکرمہ چلا جائے تو قریش مکہ اسے واپس کرنے کے مکلّف نہ ہوں گے ؛ (۳) ایک دوسرے کے ساتھ کسی طرح کی عداوت نہیں رکھی جائے گی اور خفیہ طور پر کوئی بد عہدی نہ ہوگی؛ (۴) جو کوئی (قبیلہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف سے اس عہد نامے میں شرکت کرنا چاہے وہ کر سکے گا اور جو قبیلہ چاہے قریش کی طرف سے اس معاہدے میں شمولیت اختیار کر سکتا ہے ۔ ان حلیفوں کے ساتھ وہی سلوک اور برتاؤ کیا جائے گا جو اس عہد نامے کی رو سے فریقین کا حق ہے (جب یہ شرائط ضبط تحریر میں آ گئیں تو بنو خزاعہ نے اہل اسلام کے ساتھ اور بنو بکر نے قریش مکہ کے ساتھ معاہدے میں شرکت کرنے کا اعلان کیا) ؛ (۵) اس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور ان کے ساتھی عمرہ کیے بغیر واپس لوٹ جائیں گے اور اگلے سال عمرہ کے لیے آئیں گے اور مکہ مکرمہ میں تین رات قیام کر سکیں گے ؛ اس دوران میں اہل مکہ شہر خالی کر جائیں گے ۔ اس موقع پر مسلمانوں کے ساتھ سوائے تلواروں کے کوئی دوسرا ہتیار نہ ہوگا [دیکھیے الزرقانی : شرح المواہب اللدنیہ ، ۲ : ۳۹۹ تا ۳۰۸ ، مطبوعہ قاہرہ ؛ الوثائق السیاسیہ ، شمارہ ۱۱ (نیز رک بہ حدیبیہ)].

بادی النظر میں یہ شرائط مسلمانوں کے لیے سخت تھیں ، [مگر سیاسی اور عسکری نقطۂ نظر سے یہ تمام شرائط اہل اسلام کے فائدے میں تھیں] ۔ مسلمانوں کو اس سال عمرہ کی اجازت نہ ملی تھی ، جس کا ازالہ دوسرے سال تین رات کے قیام اور شہر کو مسلمانوں کی تحویل میں دیے جانے سے ہوا ۔ جس دفعہ میں کسی مسلمان کے اہل مکہ کو واپس

دینے کا ذکر تھا۔ [یہ دفعہ ابو بصیرؓ اور حضرت جندلؓ بن سہیل کی وجہ سے قریش مکہ کے لیے تلخ ثابت ہوئی، چنانچہ بعد ازاں انھوں نے خود کہہ کر] اس شرط کو عہد نامہ سے خارج کروایا؛ جو مسلمان اسلام کو چھوڑ کر مرتد ہو کر مکے چلا آتا سے واپس لینے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

صلح حدیبیہ دراصل تبلیغ اور وسعت اسلام کا دیباچہ تھی، اس لیے ارشاد باری تعالی ہے: إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا (۴۸: ۱)، یعنی ہم نے تیرے لیے فتح مبین کا فیصلہ کر دیا ہے۔

انجام: اہل مکہ نے ۸ھ میں حلیفوں کو معاہدے میں شامل کرنے والی شرط کی خلاف ورزی کی [اور بنو بکر کی حمایت میں بنو خزاعہ کا، جو مسلمانوں کے حلیف تھے، عین صحن کعبہ میں قتل عام کیا]، مگر جب انھیں [شرائط صلح حدیبیہ کے مطابق] خون بہا ادا کرنے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ جہاں تک ان کا تعلق ہے وہ صلح حدیبیہ کو ختم کر چکے ہیں۔ اس کے نتیجے میں سنہ ۸ میں مکہ مکرمہ پر حملہ کیا گیا [اور یوں فتح مکہ پر اہل اسلام اور قریش مکہ کی طویل کشمکش اختتام پذیر ہوگئی]۔

فتح خیبر کا معاہدہ: [مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست کو ایک طرف سے یہود خیبر اور دوسری طرف سے قریش مکہ ایسے خطرناک دشمنوں سے پالا پڑا تھا۔ اسلام دشمنی میں یہود خیبر قریش مکہ سے بھی بڑھ گئے تھے۔ ایک تو اس بنا پر کہ آپؐ کی آمد سے عرب کے یہودیوں کی علمی و معاشرتی برتری ختم ہوگئی تھی اور دوسرے اس لیے کہ یثرب کے دو عظیم یہودی قبیلے بنو قینقاع اور بنو نضیر مدینہ منورہ سے خارج کیے جانے کے بعد خیبر میں جا کر آباد ہوگئے تھے۔ اور وہاں یہ لوگ پورے عرب میں اہل اسلام کے خلاف جنگ اور نفرت کی آگ بھڑکانے میں مصروف تھے۔ اس طرح وہی غزوۂ خندق کا باعث ہوئے تھے، جس میں تقریبا تمام قبائل یا ان کے نمائندے شامل ہوئے تھے] اور ان کی شرارتیں ختم ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ وہ نجد کے قبیلے بنو غطفان کو بھی ابھارتے رہتے تھے، جنھوں نے اپنے ایک ہزار ہتیار بند جوان خیبر کے قلعوں کی حفاظت کے لیے روانہ کیے تھے اور دونوں کے درمیان معاہدہ طے پا چکا تھا۔ حدیبیہ سے واپسی کے دوران میں اللہ تعالی نے ایک اور بڑی فتح کی خوشخبری بھی سنائی تھی۔ آپؐ نے اس خوشخبری سے یہی نتیجہ نکالا کہ یہ فتح خیبر کی بشارت ہے۔ آپؐ کچھ دنوں کی تیاری کے بعد اپنے انہیں جاں نثاروں سمیت خیبر پر حملہ آور ہوئے اور تقریبا دو ماہ بعد خیبر کے بارہ قلعے مکمل طور پر مفتوح ہوگئے۔ اہل خیبر نے آپؐ سے معاہدہ صلح کی درخواست کی، جو قبول کر لی گئی، چنانچہ حسب ذیل شرائط پر صلح نامہ ترتیب پایا:

(الف) یہود کو خیبر (یعنی وادی خیبر) میں رہنے کی اجازت ہوگی؛ (ب) جب کبھی مدینہ منورہ کی حکومت چاہے گی انھیں خیبر خالی کرنا پڑے گا؛ (چنانچہ حضرت عمرؓ کے عہد میں انھیں خیبر خالی کرنے کا حکم دیا گیا)؛ (ج) خیبر میں قیام کے دوران میں انھیں قلعوں میں آباد رہنے کی اجازت نہ ہوگی، (اس لیے انھوں نے قلعوں سے باہر نئی بستیاں آباد کر لیں)؛ (د) وہ خیبر کی زمین پر بطور مزارع کے قابض رہ سکیں گے اور مروجہ طریقے پر فصلوں کی بٹائی مدینہ منورہ کے نمائندے کے حوالے کرتے رہیں گے (عبداللہؓ بن رواحہ سب سے پہلے صحابی تھے جو اس کام پر متعین ہوئے)؛ (ہ) وہ جنگ کے ہتیار اور اسلحہ اسلامی لشکر کے حوالے کر دیں گے (اس شق پر فوراً عمل کیا گیا)۔ اس معاہدے کے بعد بھی

اهل خیبر کی فتنه انگیزیاں جاری رهیں ؛ [چنانچه آپؐ نے یہودیوں کو جزیرۂ عرب سے نکالنے کی وصیت فرمائی] جس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنه کے دور میں عمل هوا اور اهل خیبر کو جزیره عرب سے نکال دیا گیا۔

معاهدۂ خیبر میں تین باتیں سامنے آتی هیں : اولاً یه که جونهی دشمن نے شکست تسلیم کی ، فوراً لڑائی روک دی گئی ؛ دوم یه که معاهدے میں مفتوح کی خواهشات کو پوری طرح ملحوظ خاطر رکھا گیا۔ انهوں نے مزروعه زمینوں پر بحال رهنے کی درخواست کی تو وه بھی قبول کر لی گئی ؛ سوم یه که مفتوح قلعوں سے هتیار لے لیے گئے تاکه وه دوباره فساد کا باعث نه بن سکیں۔

معاهدۂ فدک : فدک چھوٹی سی بستی تھی ، جو خیبر کے شمال میں واقع تھی ۔ یہاں بھی یہودی رهتے تھے ۔ جب انهوں نے سنا که خیبر کے یہودیوں کو شکست هو چکی هے تو انهوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیه و آله وسلم کے پاس وفد روانه کیا اور گزارش کی که ان سے بھی اهل خیبر کی سی شرائط پر صلح کر لی جائے ، چنانچه آپؐ نے ان سے بھی انهی شرائط پر معاهده فرما لیا [رکّ به فدک]۔

معاهده تیماء : وادی خیبر کے شمال میں تیماء کی ایک چھوٹی سی بستی تھی [جو مدینه منوره سے آٹھ منزل پر شام کی جانب واقع تھی (وفاء الوفاء ، ۲ : ۲۵)] ، جس میں یہودی آباد تھے ۔ انهوں نے بھی لڑائی کے بغیر اطاعت قبول کر لی اور ان کے لیے بھی وهی شرائط رکھی گئیں ، جو اهل فدک کے لیے رکھی گئی تھیں ۔ ان کے ساتھ جو معاهده طے هوا اس کے الفاظ یه تھے : اللہ کے رسولؐ کی طرف سے بنو عادیا کے لیے ، ان پر نه تو ظلم هوگا اور نه وه جلا وطن کیے جائیں گے ۔ رات (اس معاهدے کو) دراز کیا کرے گی اور دن اس میں شدت پیدا کیا کرے گا ۔ (اسے) خالد بن سعید نے لکھا [(ابن سعد : الطبقات ؛ الوثائق السیاسیه ، شماره ۹۱) ۔ یه معاهده آپؐ کے مدینه منوره لوٹنے سے پیشتر اور وادی القری کی جھڑپ اور صلح کے بعد طے پایا۔

جب عهد فاروقی میں فدک اور خیبر والوں کو جلا وطن کیا گیا تو اهل وادی القری اور اهل تیماء محفوظ رهے ۔ اس کی وجه مؤرخ یه بتاتے هیں که دونوں علاقے شام کی حدود میں واقع تھے جب که آپؐ کی وصیت جزیره عرب کو یہودیوں سے پاک کرنے سے متعلق تھی (الواقدی : المغازی ، ۲ : ۷۱۱)]۔

معاهده ایله : [ایله ساحل بحیرۂ قلزم پر واقع شام سے ملحق ایک چھوٹی سی ریاست تھی (یاقوت : معجم البلدان ، ۱ : ۲۹۱) ۔ اس زمانے میں اس پر یوحنا [یُحنّه] بن رؤبه (غالباً عیسائی) کی حکومت تھی ۔ تبوک کی مهم میں رومی لشکر سے سامنا نه هوسکا ، البته آپؐ نے اس علاقے کی ان ریاستوں کی سرکوبی ضروری خیال فرمائی جو بوقت ضرورت اهل روم کا ساتھ دیتی تھیں ؛ چنانچه] مُؤته کی لڑائی میں شمالی سرحد کے نیم عیسائی ، یہودی اور مشرک عرب قبائل نے رومی لشکر کی امداد کی تھی ۔ [آپؐ نے دومة الجندل کے حکمران اکیدر بن عبدالملک کی گرفتاری کے لیے ایک دسته روانه فرمایا ؛ اس سے خائف هو کر ایله کے حکمران نے دربار رسالت میں حاضری دی اور صلح کی درخواست پیش کی ، جو قبول کر لی گئی (المغازی ، ۳ : ۱۰۲۵ ببعد)] ۔ ایله کے قبیلے کے ساتھ جو معاهده هوا وه حقیقی معنوں میں امان نامه تھا ۔ اس کی اهم دفعات یه تھیں :

۱۔ اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے یُحنّه بن رؤبه اور اهل ایله کو امان دی جاتی هے ؛ (۲) سمندر میں ان کے جہاز اور خشکی میں ان کے مسافر مامون هوں گے ؛ (۳) اس امان نامه میں اهل ایله کے وه حلیف شامل سمجھے جائیں گے جو شام ، یمن اور

بحیرۂ قلزم کے ساحل پر آباد ہیں ۔ [چونکہ یہ لوگ تجارت پیشہ تھے اس لیے ان کے مسافروں کا بالخصوص ذکر آیا ہے] ؛ (۴) اگر کسی نے کسی طرح کی بھی معاہدہ شکنی کی تو اس کا مؤاخذہ ہوگا ؛ (۵) کسی کو یہ جائز نہیں کہ ان لوگوں کو ان چشموں پر جانے سے منع کرے جہاں وہ جایا کرتے ہیں ؛ (۶) اہل ایلہ [جن کی تعداد تین صد افراد پر مشتمل تھی] ہر سال تین سو دینار جزیہ ادا کرتے رہیں گے ؛ (۷) اگر کوئی شخص امان نامے کی ان شرائط کی خلاف ورزی کرے گا یا ان میں تبدیلی کرے گا تو اس کی دولت اسے بچا نہ سکے گی ۔ [اور جو لوگ اس کی پابندی کریں گے ان کے لیے بہتری ہے] (ابن ہشام : السیرہ ، ص ۹۰۲ ، گوٹنگن ۱۸۶۰ء ؛ الواقدی : المغازی ، ۳ : ۱۰۳۱) یہ معاہدہ معسکر تبوک میں طے پایا ؛ وہیں ایلہ کا حکمران آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا [(دیکھیے الوثائق السیاسیۃ ، شمارہ ۳۰ - ۳۱)]۔

[اہل مقنا کے ساتھ معاہدہ : ایلہ کے قریب ایک اور اہم ریاست مقنا کی تھی ، جو شام کے ساحل پر واقع تھی (معجم البلدان ، ۷ : ۱۲۸) ؛ اسی دوران میں جب آپؐ مہم تبوک کی لشکرگاہ میں موجود اور آس پاس کے علاقوں کی تسخیر میں مصروف تھے ، اہل مقنا کی طرف سے ایک وفد بارگاہ رسالت میں باریاب ہوا ، جس کی سربراہی عبید بن یاسر بن نمیر کر رہا تھا ۔ انھوں نے اپنی قوم کی طرف سے مملکت مدینہ کے لیے اطاعت کا پیغام پہنچایا ۔ آپؐ نے ان کو معاہدہ لکھ دیا ، جس میں ان کے حقوق و فرائض کا ذکر تھا (الوثائق السیاسیہ ، شمارہ ۳۳ و ۳۴ ؛ کتاب المغازی ، ۳ : ۱۰۳۲ و بعد] ؛

معاہدہ جرباء اور اذرح : [شام کی دو بستیاں ہیں ، جن کے مابین تین دن کی مسافت ہے [معجم ما استعجم ، ص ۸۴] ۔ جرباء اور اذرح کے ساتھ معاہدہ بھی غزوۂ تبوک کے دوران میں طے پایا ۔ ان پر سالانہ سو دینار جزیہ لگایا گیا اور اس کے بدلے ان کو تمام اطراف اور تمام دشمنوں سے حفاظت کا یقین دلایا گیا تھا ۔ ان کے امان نامے میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر مملکت مدینہ کا کوئی شخص سزا سے خائف ہو کر ان کے پاس آ کر پناہ لے تو اسے حکومت مدینہ کے حوالے کر دیا جائے گا ؛

اکیدر سے معاہدہ : غزوۂ تبوک کی مہم کے دوران میں اسی سلسلے میں حضرت خالد بن ولیدؓ کو دومۃ الجندل کے عیسائی سردار اکیدر کو گرفتار کرنے کے لیے روانہ کیا گیا ، انھوں نے اکیدر اور اس کے بھائی کو گرفتار کر کے دربار رسالت مآبؐ میں پیش کیا اور اکیدر اسلام لے آیا ۔ اس کے ساتھ بھی مخصوص شرائط پر صلح طے پائی ۔ اس کی ایک دفعہ کے مطابق ان کی مزروعہ زمینوں اور چراگاہوں کو حسب سابق ان کی ملکیت رہنے دیا ، البتہ ان پر خراج لگا دیا گیا ۔

[اختتام : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اور بھی چھوٹے بڑے کئی معاہدات فرمائے (دیکھیے الوثائق السیاسیہ ، وغیرہ) ، جن میں بطور خاص یہ بات قابل ذکر ہے کہ اگر کسی چھوٹے یا بڑے قبیلے نے آپؐ سے معاہدۂ صلح کرنے کی پیش کش کی تو آپؐ نے اس کی پیش کش کو شرف قبولیت بخشا اور پھر جو شرائط صلح طے ہو گئیں ان سے سرِمو انحراف نہیں کیا اور نہ اس سے کچھ تجاوز کیا ۔ چند بار ایسا ہوا کہ کسی مجاہد نے غلطی سے مفتوحین میں سے کسی شخص کے مال میں سے کچھ لینے کی کوشش کی ، مگر آپؐ نے سختی سے اس کی ممانعت فرما دی اور اسے نہبۃ ، یعنی لوٹ قرار دے کر حرام ٹھیرایا اور اس پر تاوان واجب کیا (المغازی ، ۳ : ۱۰۳۳)۔ آپؐ نے جس طرح معاہدوں کا احترام کیا اور جس طرح ان پر عمل درآمد فرمایا اس کی شہادت دشمن بھی دیتے ہیں ۔ آپؐ کے کسی حلیف کو آپؐ سے معاہدے کی خلاف ورزی کی شکایت نہ ہوئی ، بلکہ

اگر فریق ثانی بھی کسی قسم کی کوتاہی کرتا تو آپؐ اسے نرمی سے سمجھاتے، لیکن وہ اگر کسی طرح باز نہ آتا، تو مجبور ہو کر آپؐ اس پر لشکر کشی کرتے۔

اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ان معاہدات کو اچھے مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ معاہدات نبوی کو آپؐ کی جنگی حکمت عملی کے ساتھ گہرا رابطہ تھا۔ آپؐ کے مقابلے میں اگر دو جماعتیں برسر پیکار ہوتیں تو آپؐ ان میں سے ایک فریق سے قابل قبول شرائط پر صلح کر لیتے۔ آپؐ نے مدینہ منورہ تشریف لاتے ہی وہاں پر آباد مختلف اقوام سے جو معاہدہ کیا، اس نے ان فریقوں کو آپؐ کے مخالفین سے الگ کر دیا۔ شاہراہ شام پر آباد مختلف قبائل بنو ضمرہ، بنو جہینہ، وغیرہ سے معاہدات بھی آپؐ کی عسکری حکمت عملی کا نتیجہ ہیں، جس کے نتیجے میں آپؐ قریش مکہ کی اقتصادی شاہراہ کی ناکہ بندی کرنے میں کامیاب ہو گئے [نیز رک بہ غزوات]۔ غرض آپؐ کے تمام معاہدات واضح اور منظم طور پر اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں جس کا مقصد دنیا میں عدل و انصاف اور امن و امان کا قیام و رواج کرنا تھا]۔

مآخذ: [(۱) محمد حمید اللہ: مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ، قاہرہ ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۶ء؛ (۲) ابن ہشام: السیرۃ النبویۃ، طبع مصطفی السقا وغیرہ، قاہرہ ۱۳۰۵ھ/۱۹۳۶ء (نیز مآخذ مقالۂ غزوات)]۔

(گلزار احمد [و ادارہ])

⊛ غزوات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

[غزوات جمع غزوۃ (از مادہ غ۔ ز۔ و = غزا الشیءَ غزواً، یعنی کسی چیز کی تلاش کرنا، ارادہ کرنا؛ کہا جاتا ہے: غزوتُ فلاناً، یعنی میں نے فلاں کو ملنے کا قصد کیا؛ اسی مادے سے غزوۃ بمعنی وہ چیز جو طلب کی جائے، ہے غزا غزواً و غزاوۃً و غزواناً القومَ، یعنی کسی قوم کی سکونت کی طرف لڑائی یا انتباہ کے ارادے سے بڑھنا؛ غازی (ج: غُزاۃ و غُزّی و غُزّاء مؤنث: غازیہ، ج: غَوازٍ و غازیات) بمعنی جنگجو (ابن منظور: لسان العرب؛ الزبیدی: تاج العروس، بذیل مادہ)۔ ابن منظور نے بہت سی مثالیں دی ہیں، جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں اس مادے کا استعمال جنگ کے معنوں میں عام تھا؛ قرآن کریم میں عام طور پر لڑائی کے موقع پر جہاد اور قتال کے لیے اس کا استعمال ہوا ہے، تاہم ایک جگہ اس مادے سے غُزّی (جمع غازی) کا بھی استعمال ہوا ہے (معجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم، بذیل مادہ)؛ البتہ کتب سیرت میں عہد نبوی کی جنگوں کے لیے دو الفاظ ملتے ہیں: (۱) جس جنگ میں آپؐ نے بہ نفس نفیس شرکت فرمائی ہو اسے غزوہ کہا جاتا ہے؛ (۲) جس جنگ میں آپؐ نے شرکت نہ فرمائی ہو اور اپنی طرف سے کسی کو لشکر کی قیادت پر مامور کرکے روانہ فرما دیا ہو اسے سَرِیّہ (ج سرایا، از مادہ سَرَیٰ سَرْیاً و سُرْیۃً و سُرْبۃً و سَرایۃ و سَرَیاناً و مَسْرًی، بمعنی رات کو چلنا) کہا جاتا ہے؛ سریہ ایک چھوٹا فوجی دستہ، اس لیے کہ اس کا چلنا مخفی ہوتا ہے (لسان العرب، بذیل مادہ) اس کو "بَعْث" بھی کہتے ہیں (الزرقانی: شرح المواہب اللدنیۃ، ۱: ۲۸۷، قاہرہ ۱۳۲۵ھ)۔ غزوات و سرایا جہاد کا حصہ ہیں (رک بہ جہاد؛ انفال؛ نیز ابو الاعلیٰ مودودی: الجہاد فی الاسلام)]۔ چونکہ یہ تمام مہمیں انہی کوششوں کا حصہ تھیں، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم [کو اپنے اور اہل اسلام اور مملکت مدینہ کے دفاع اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کرنا پڑیں]، اس لیے غزوات و سرایا [اور تبلیغ و دعوت کی کوششوں] کا جب تک بہم مطالعہ نہ کیا جائے اس وقت تک صحیح صورت حال سامنے نہیں آتی۔

غزوات نبوی کو چند واضح ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور مکی اعلان جنگ سے شروع

ہو کر بدر کی لڑائی پر ختم ہو جاتا ہے ؛ دوسرا دور غزوۂ احد تک کا ہے ؛ تیسرا دور احد کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور غزوۂ خندق تک مشتمل ہے ؛ چوتھا دور صلح حدیبیہ سے لے کر غزوۂ خیبر کے اختتام تک ہے ؛ چھٹا دور خیبر سے لے کر فتح مکہ تک کے عرصے کو محیط ہے اور ساتواں دور فتح مکہ کے بعد غزوات اور سرایا پر مشتمل ہے ۔ ان میں اکثر ادوار کے حالات اور ان کے پس منظر میں معتدبہ فرق ہے ، اس لیے حضورؐ کو ہر دور میں مختلف قسم کے اقدامات کرنے پڑے اور یہی وجہ ہے کہ ہر دور کی تدبیرات جنگ (Strategy of war) ، جو آپؐ نے اختیار کیں ان میں بھی فرق ہے ۔ ہر اعلٰی کمان دار اپنے گرد و پیش کے حالات کے مطابق اپنی تدبیرات اور طریق (tactics) کو تشکیل دیتا ہے ۔ حضورؐ نے جو اصول جنگ (Principles of War) اور جنگی تدبیرات و طریق استعمال کیے ان کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں.

ابتدا : جب اہل مکہ نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ عنیہ و آلہ وسلم ، مدینہ منورہ پہنچنے میں کامیاب ہو چکے ہیں، تو انھوں نے باہمی مشورے سے عبداللہ بن اُبَی کو خط لکھا [جس میں انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو مدینہ منورہ میں پناہ دینے پر اظہار عتاب کیا اور آپؐ کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا اور بصورت دیگر سخت اقدامات کی دھمکی دی (ابو داؤد : السنن ، ۳ : ۴۰۴ ، باب خبر النضیر ؛ الوثائق السیاسیہ ، شمارہ ۳/ب)] ؛ یہ گویا آپؐ کے خلاف اعلان جنگ تھا.

[مشرکین مکہ کے اسلام اور اہل اسلام کے خلاف بغض و عداوت کا اس امر سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہجرت مدینہ کے کچھ عرصے بعد حضرت سعدؓ بن معاذ کا مکہ مکرمہ کے پاس سے گزر ہوا ، سوچا عمرہ کرتا چلوں ؛ ان کی صفوان بن امیہ سے دور جاہلی میں گاڑی چھنتی تھی ، وہ ان کے پاس جا کے ٹھیرے اور ان کی معیت میں نصف النہار کے قریب طواف کرنے کے لیے نکلے ؛ راستے میں ابو جہل [رک بآں] ملا ، اس نے پوچھا صفوان یہ تمہارے ہمراہ کون ہے ؟ اس نے کہا : سعدؓ ہیں ؛ ابو جہل بولا : کیا میں ان کو حالت امن میں خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں ؟ حالانکہ انھوں نے صابئین کو پناہ دی اور ہمارے خلاف ان کی مدد کی ہے ؛ پھر کہا : بخدا اگر صفوان تیرے ساتھ نہ ہوتا تو تو اپنے گھر کبھی واپس نہ لوٹ سکتا (البخاری ، ۳ : ۵۴ ، کتاب المغازی ، باب ۲) ۔ اس پر مستزاد یہ کہ انھوں نے مدینہ منورہ کے آس پاس بسنے والے قبائل میں اہل اسلام کے خلاف دشمنی کی آگ اس حد تک بھڑکا دی تھی کہ مدینہ منورہ میں کئی سال تک راتوں کو پہرہ دیا جاتا تھا ، صحابہ کرامؓ ہتھیار پہن کر سوتے ، ہر وقت کسی ناگہانی حملے کا دھڑکا لگا رہتا ۔ البخاری (۲ : ۲۲۰ کتاب الجہاد ، باب ۷۰) نے ام المومنین حضرت عائشہؓ کے حوالے سے اسی زمانے کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک رات آپؐ حملے کے خطرے کے پیش نظر دیر تک جاگتے رہے ، آپؐ نے آرام کی ضرورت کے پیش نظر فرمایا : کاش کوئی صالح شخص رات کو پہرہ دے (تاکہ میں آرام کر سکوں) ! اسی وقت باہر سے ہتھیاروں کے کھٹکنے کی آواز سنائی دی ؛ پوچھا : کون ہے ؟ جواب ملا : سعدؓ بن ابی وقاص رات کے پہرہ دینے کے لیے حاضر ہے ؛ تب آپؐ سو سکے ۔ قبائل عرب کے دلوں میں پیغمبر اسلامؐ کے خلاف اٹھائے جانے والے اسی طوفان کا ہی اثر تھا کہ ایک مرتبہ جب آپؐ ایک غزوے سے واپسی کے موقع پر ایک درخت کے نیچے استراحت فرما رہے تھے تو ایک اعرابی نے ، جو وہیں تاک میں تھا ، اچک کر آپؐ کی تلوار اٹھا لی اور اسے لہراتے ہوئے آپؐ سے کہنے لگا : تمھیں میرے ہاتھ سے کون بچائے گا ؟ آپؐ

نے فرمایا : اللہ ۔ یہ سنتے ہی اس کے ہاتھ سے تلوار گر پڑی ۔ آپؐ نے اسے معاف کر دیا (کتاب مذکور، ٢٢٦ ، ٨٣/٥٦)۔

ان حالات میں آپؐ اگر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے تو اس کا نتیجہ مدینے کی تباہی کی صورت میں برآمد ہو سکتا تھا ۔ آپؐ نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے ایسی تدابیر اختیار فرمائیں جس سے مدینے کا دفاع مضبوط ہوا اور مسلمانوں میں مقاومت کی لہر پیدا ہوئی] ۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے دفاع مدینہ کے ضمن میں دو طرح کے اقدامات فرمائے : اولاً، داخلی سطح پر آپؐ نے مدینہ منورہ کی ریاست کا باقاعدہ طور پر انتظام و انصرام کیا اور اس امر کی توثیق میثاق مدینہ [رکّ باں] کے ذریعے کی گئی ۔ میثاق مدینہ کی حیثیت بنیادی قانون (Fundamental Law) یا ملکی آئین (Constitution of the State) کی سی ہے اور اس کے دفاعی اندراجات نہایت واضح اور غیر مبہم ہیں ۔ چونکہ امور دفاع اور امور خارجہ اس آئین کی رو سے حضور اکرمؐ کے ہاتھ میں تھے، اس لیے خارجی سطح پر حضورؐ نے ایسے سفر اختیار کیے جن کے ذریعے دو طرح کے فائدے حاصل ہوئے : ایک تو یہ کہ ریاست مدینہ کی حدود کا تعین ہوا اور دوسرے ان سفروں کے دوران میں آپؐ نے مختلف قبائل کے ساتھ معاہدات کیے ؛ بعض نے ریاست مدینہ کے ساتھ شمولیّت اختیار کی اور بعض نے دفاعی سمجھوتے کیے ۔ ایک قبیلے نے جنگ کی صورت میں غیر جانب دار رہنے کی شرط پر معاہدہ کیا [ابن سعد : الطبقات ، ٢ : ٥ تا ١٠]۔ ممکن ہے بین الاقوامی سطح پر جنگ کے دوران میں غیر جانب داری کا یہ پہلا معاہدہ ہو ۔ [اس کے علاوہ آپؐ نے اس ہلچل کے ذریعے قریش مکہ کی تجارتی شاہراہ کے لیے جو بحیرۂ احمر کے ساحل کے قریب سے گزرتی تھی خطرہ پیدا کر دیا]۔

اسی طرح کے ایک سفر پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پہلی بار تشریف لے گئے تو اس سفر کو غزوہ وَدّان اور غزوہ ابواء کا نام دیا گیا [یہ غزوہ ہجرت کے بارھویں مہینے ، صفر ٢ھ ، میں پیش آیا] ۔ اس سفر کے دوران میں حضورؐ نے اپنے صحابہؓ سمیت ان دونوں مقامات پر [جن کے مابین چھے میلوں کا فاصلہ ہے] قیام فرمایا تھا ۔ یہ مقامات بحیرۂ احمر کے ساحل کے قریب واقع ہیں اور یہیں سے شام کو جانے والی شاہراہ گزرتی ہے ۔ اس علاقے پر بنو ضمرہ کا تسلط تھا [آپؐ نے بنو ضمرہ کے رئیس مَخْشِیّ بن عمرو الضمری کے ساتھ غیر جانب دار رہنے کا معاہدہ فرمایا۔ پندرہ دنوں کے بعد آپؐ مدینہ منورہ واپس آئے (ابن سعد : الطبقات ، ٢ : ٨)] ۔ اس غزوے کے دوران میں حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کو جیش مدینہ کا سفید علم اٹھانے پر مامور کیا گیا تھا ، جب کہ سعدؓ بن عبادہ کو نائب مقرر کرکے مدینہ منورہ میں چھوڑا گیا تھا ۔ حضورؐ نے [کسی سفر میں ، جس کی وضاحت نہیں ملتی] بنو جہینہ کے ساتھ بھی معاہدہ کیا ، جس کی رو سے اس قبیلے نے مکی ، مدنی جنگ کے دوران میں غیر جانب دار رہنے کا اقرار کیا ۔ اس غزوہ کے دوران میں کسی دشمن سے مقابلہ نہیں ہوا اور نہ ہی وہاں کوئی لشکر یا قافلہ موجود تھا [آپؐ کا سفر تبلیغی سفارتی تھا]۔

مہاجرین مدینہ منورہ اور اس کے گرد و نواح سے اچھی طرح واقف نہ تھے ۔ مکہ کی جانب سے اعلان جنگ ہو چکا تھا ، مگر آپؐ کو ابھی فوج کی تربیت کرنا تھی ۔ [ان سفروں سے مہاجرین کی تربیت کا پہلو بھی مدنظر تھا] اور یہ تربیت اس کے علاوہ تھی جو آپؐ مدینہ منورہ میں جاری رکھتے تھے ۔ اسی لیے ہم ان سفروں کو ، اور باتوں کے علاوہ تربیتی سفر بھی قرار دے سکتے ہیں۔

سریۂ عبیدہ بن الحارث : جب اہل مکہ نے سنا کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے شاہراہ شام پر

قابض قبائل کے ساتھ دوستانہ معاھدے کر لیے ھیں تو انھیں سخت تشویش ھوئی۔ قریش مکہ نے اس کا جواب اس طرح دیا کہ دو سو سواروں پر مشتمل ایک جیش [عکرمہ بن ابی جہل یا ابو سفیان یا مِکرَز بن حفص کی زیر قیادت] اس علاقے کی گشت پر روانہ کیا تا کہ یہ لشکر عام گشت (Flag March) کے ذریعے قریش مکہ کی برتری کو پھر سے قائم کرے؛ یا شاید مقصد یہ ھو کہ یہ لشکر قریش کے اعلان جنگ کے مطابق، اھل مدینہ کو مجبور کر دے کہ حضورؐ کو (معاذ اللہ) قتل کر دیں یا مدینہ منورہ سے نکال دیں۔ جب اس کی خبر آنحضرتؐ کو پہنچی تو آپؐ نے فوراً حضرت عبیدہؓ ابن الحارث کے زیر کمان ساٹھ [یا اسی] مہاجر صحابہؓ پر مشتمل ایک دستہ روانہ فرمایا تا کہ وہ قریش کے لشکر کو ریاست مدینہ کی حدود کے اندر داخل نہ ھونے دے۔ ثَنِیَّۃُ الْمَرَّہ کے دامن میں، حجاز کے [ایک چشمہ اَحیاء] کے قریب دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ھوا۔ لڑائی تو نہ ھوئی البتہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے اس موقع پر اسلامی لشکر کی جانب سے لشکر قریش پر تیر اندازی کی۔ دو با اثر مکی [مقداد بن عمرو اور عتبہ بن غزوان بن جابر] اپنے لشکر سے نکل کر اسلامی لشکر میں آ ملے۔ [در حقیقت یہ دونوں مسلمان ھوچکے تھے، لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچنے کے لیے موقع کی تلاش میں تھے (ابن سعد: الطبقات، ۱ : ۷؛ ابن ھشام: سیرۃ، ۲ : ۲۴۴)]۔ اھل اسلام نے واپسی کے دوران میں فوجی ترتیب (Formation) قائم رکھی۔ اس سے یہی ثابت ھوتا ھے کہ مقابلے میں ایک قافلہ نہ تھا بلکہ باقاعدہ لشکر تھا، ورنہ واپسی کے دوران میں فوجی ترتیب قائم نہ رکھی جاتی۔ یہی نہیں، بلکہ اگر قافلہ ھوتا تو اسلامی دستہ اس کو بچ کر نہ جانے دیتا۔ اس مہم کو سریۂ رابغ [رابغ جحفہ سے دس میل پر واقع مقام] کا نام بھی دیا گیا ھے۔ الواقدی اور ابن سعد نے ھجرت کے آٹھ ماہ بعد وقوع بتایا ھے (دیکھیے ابن سعد: الطبقات، ۲ : ۷؛ کتاب المغازی، ۱ : ۲)]۔ بہرحال اس طرح بغیر مزاحمت کے دونوں لشکر اپنے اپنے مستقر کی طرف لوٹ گئے۔

سریۂ سعدؓ بن ابی وقاص: ھجرت کے تقریباً آٹھ ماہ بعد حضرت سعدؓ بن ابی وقّاص کو بیس اکیس پیادہ مجاھدوں کے ساتھ الخرّار (ایک چشمہ یا وادی، جحفہ سے قریب) کی طرف روانہ کیا۔ یہ جیش مقام الخرار پر پہنچا، مگر کسی مخالف جیش سے تصادم نہ ھوا اور بخیریت واپسی ھوگئی (الزرقانی: شرح المواھب، ۱ : ۳۹۴؛ ابن سعد: الطبقات، ۲ : ۷)]۔

سریۂ حمزہؓ بن عبدالمطلب: قریش مکہ اپنی اس ناکامی پر خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ انھوں نے ایک اور لشکر تیار کیا اور اس کی کمان ابو جہل نے اپنے ھاتھ میں لی۔ اس لشکر کی تعداد تین سو تھی۔ آپؐ نے اس مرتبہ حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کے زیر کمان تیس صحابہؓ پر مشتمل لشکر روانہ کیا [ابن سعد، ۲ : ۹]۔ ان لشکروں کا ساحل سمندر پر آمنا سامنا ھوا۔ دونوں لشکر لڑائی کے لیے صف بستہ ھو چکے تھے۔ ابھی لڑائی شروع نہیں ھوئی تھی کہ [مَجدی بن عمرو الجہنی، جو دونوں کا حلیف تھا] پہنچ گیا اور اس نے دونوں لشکروں کو اپنے معاھدے کی رو سے مجبور کیا کہ لڑائی سے باز رھیں۔ ابو جہل نے اپنے ان اشعار میں اس بات کا افسوس کیا ھے [جو اس کی طرف منسوب ھیں (دیکھیے ابن ھشام: سیرۃ، ۲ : ۲۲۷)]۔

وہ اپنے اشعار [عدد ۱۳، ۱۵] میں امید ظاہر کرتا ھے کہ آئندہ ضرور مسلمانوں پر یلغار کر سکے گا۔ خلاصہ کلام یہ ھے کہ سریۂ رابغ اور سریہ سیف البحر کے متعلق جن روایات میں بتایا گیا ھے کہ یہ دونوں مہمیں قافلہ لوٹنے کی غرض سے روانہ کی گئی تھیں وہ ناقابل التفات ھیں، کیونکہ مدینہ ابھی کسی

جارحانہ کارروائی کے اہل نہ تھا ۔ یہ وہ دور ہے جس کے متعلق قرآن حکیم کی شہادت یہ ہے کہ : تم ڈرتے تھے کہ لوگ تمھیں اچک نہ لیں [۸ [الانفال] : ۲۶]۔ [ایسی حالت میں اپنے سے طاقتور دشمن کے قافلے لوٹنے کے لیے ہر دوسرے مہینے نکل کھڑا ہوتا قرین قیاس نہیں ؛ جن روایات کا سہارا لیا جاتا ہے ان کو حالات کے سیاق و سباق کی روشنی میں پڑھنا چاہیے ، جیسا کہ اوپر بیان ہوا]۔

غزوۂ بُواط : قریش کی جانب سے دو حملوں کے بعد ، توازن قائم رکھنے کے لیے ، حضور اکرمؐ کا دوبارہ ان کے علاقوں میں تشریف لے جانا ضروری تھا ۔ اس کے علاوہ جن قبائل کے ساتھ پہلے غزوات کے دوران میں معاہدے کیے جا چکے تھے ان کے ساتھ سربراہ مملکت کی سطح پر تعلقات قائم رکھنے اور ان کی ہمت بڑھانے کے لیے بھی یہ ضروری تھا ؛ اس لیے جونہیں حضرت حمزہؓ کا دستہ ، یا [آج کی فوجی زبان میں] لڑاکا گشت (Fighting Patrol) ، مدینہ منورہ واپس پہنچا ، آپؐ نے دوسری تبلیغی اور سفارتی مہم تیار کی اور [ربیع الاول ۲ھ میں] دوبارہ ساحلی علاقے کا رخ کیا ۔ اس بار لشکر اسلام کی تعداد [دو سو افراد پر مشتمل تھی (ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۹)] ۔ اس مہم میں آپؐ نے دیگر مقامات کے علاوہ رضوٰی (کوہ) کی جانب سے جبال جُہینہ کے قریب مقام بواط پر قیام فرمایا اور علاقے کی نگرانی کی ۔ اس دوران میں نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنی والدہ ماجدہ کے مزار پر بھی تشریف لے گئے ۔ اس غزوے کے دوران میں آپؐ کا سفید علم حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اٹھائے ہوئے تھے جب کہ مدینہ منورہ میں السائبؓ بن عثمان [بن مظعون] کو نائب کے طور پر چھوڑا گیا تھا ۔ اس غزوے میں بھی دشمن سے سامنا نہ ہوا [الزرقانی : شرح المواہب اللدنیہ ، ۱ : ۳۹۳] ۔

غزوۂ ذی العُشیرہ : غزوۂ بواط سے واپسی کے دو ماہ بعد] یعنی [جمادی الاُولٰی یا جمادی الآخرہ] ۲ھ میں آپؐ ایک اور سفارتی سفر پر روانہ ہوئے ؛ اس بار بھی آپؐ وادی ینبع میں ذوالعشیرہ اور دوسرے مقامات پر ٹھیرے اور شام کی اس تجارتی شاہراہ پر [بنو مُدلج اور ان کے حلفا بنو ضَمرہ (ابن ہشام : السیرۃ النبویۃ ، ۲ : ۳۳۸) سے معاہدۂ صلح کیا ۔ غالباً یہ معاہدہ بھی ریاست مدینہ میں شمولیت کا معاہدہ تھا ۔ آپؐ کے ساتھ ڈیڑھ سو یا دو سو صحابہؓ شریک سفر تھے ؛ لواء حضرت حمزہؓ کے پاس تھا ؛ (حوالۂ مذکور ؛ الزرقانی : شرح المواہب ، ۱ : ۳۹۰)]۔

غزوہ سَفَوان یا بدرالاُولٰی : اس طرح اسلام اور اہل اسلام کی طاقت روز افزوں رہی ، جو مشرکین مکّہ کے لیے ناقابل برداشت تھی ؛ چنانچہ چھاپہ مارنے کے لیے قریش مکّہ نے چھوٹی سی چھاپہ مار جماعت کُرز بن جابر الفہری [جو بعد میں مسلمان ہوئے اور ۸ھ میں فتح مکّہ کے موقع پر شہید ہوئے (ابن حجر : الاصابۃ)] کی کمان میں روانہ کی ۔ یہ جماعت رات کی تاریکی میں مدینہ منورہ کی چراگاہ پر حملہ آور ہوئی اور صبح ہونے سے قبل چند اونٹ ہانک کر تیز رفتاری سے واپس لوٹ گئی ۔ حضورؐ غزوۂ عشیرہ سے چند روز قبل لوٹے تھے ۔ [ممکن ہے وہ کسی بڑے ارادے سے آیا ہو ، مگر مدینہ منورہ آنے کے بعد] اس نے اس شب خون کو ہی کافی سمجھا۔ دوسری صبح حضورؐ کو اطلاع ملی تو آپؐ نے جلدی سے چھوٹا سا لشکر تیار کیا اور کُرز کا تعاقب کرنے کے لیے نکلے ، مگر وہ غیر معروف راستوں سے ہوتا ہوا نکل چکا تھا ۔ اس مہم میں آپؐ سفوان کے مقام تک تشریف لے گئے ؛ یہ مقام بدر کے قریب ہے ، اسی لیے اس غزوے کو غزوۂ سفوان اور غزوۂ بدرالاولٰی کہتے ہیں ۔ علمبرداری کے فرائض حضرت علیؓ بن ابی طالب کو تفویض

کیے گئے تھے۔ مدینہ منورہ میں زیدؓ بن حارثہ الکلبی کو نائب کے طور پر چھوڑا گیا تھا [ابن سعد، ۲ : ۹]۔

سریہ عبداللہ بن جحش : [رجب ۲ھ میں] حضور اقدس صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت عبداللہؓ بن جحش کو آٹھ [یا بارہ افراد] کی کمان دے کر ایک خفیہ مہم پر روانہ فرمایا اور حکم دیا کہ ملفوف اقدامی احکامات (operational orders) کو دو روز کی مسافت کے بعد کھولا جائے۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ اس میں تحریر تھا کہ مکہ اور طائف کے درمیان [مقام نخلہ میں ٹھہر] کر قریش مکہ کی نقل و حرکت اور سرگرمیوں کو زیر نظر رکھا جائے اور چند روز کے بعد واپس آ کر روداد پیش کی جائے۔ اتفاق کی بات ہے کہ جب حضرت عبداللہؓ بن جحش نخلہ کے مقام پر پہنچے تو پاس ہی قریش مکہ کا ایک چھوٹا سا تجارتی قافلہ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ حضرت عبداللہؓ نے [آپؐ کی مرضی کے بغیر] اس قافلے پر حملہ کرکے ان کے محافظوں میں سے ایک محافظ [یعنی عمرو بن الحضرمی] کو قتل کر دیا اور دو افراد [یعنی عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان] کو قیدی بنا لیا اور قافلہ لوٹ لیا۔ ایک محافظ بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔ چونکہ یہ حملہ حضورؐ کے حکم کے خلاف کیا گیا تھا؛ اس لیے آپؐ نے مقتول کا خون بہا ادا کیا؛ [البتہ خمس وصول کرکے مال غنیمت تقسیم کر دیا (ابن ہشام : سیرۃ، ۲ : ۲۵۲ تا ۲۵۳؛ الزرقانی : شرح المواہب، ۱ : ۳۹۷ ببعد)]۔ اس طرح غزوۂ بدر کے لیے اسباب پیدا ہوگئے، اور غزوات کا پہلا دور اختتام کو پہنچ گیا۔

غزوۂ بدر : اس اولین، مگر اہم ترین دور پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس دور میں چند عوامل تھے جو حالات کو بتدریج بڑی تیزی کے ساتھ کسی اہم نتیجے کی طرف لے جا رہے تھے۔ اعلان جنگ کے بعد حضورؐ کے لیے داخلی اور خارجی امور کو اطمینان بخش طور سے پائدار بنیادوں پر استوار کرنا ضروری تھا۔ اس اقدام سے قریش کے موقف میں کمزوری واقع ہوگئی۔ دوم، اہل مکہ نے بار بار کوشش کی کہ وہ اپنے گھٹتے ہوئے وقار کو سنبھالا دے کر مدینہ کی وسعت حدود کو بایں غرض روک لیں کہ بالآخر مدینہ منورہ کی ریاست کو ختم کیا جا سکے، مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ بہرحال ان کوششوں میں بتدریج تیزی آتی گئی۔ طرفین کو ایک ایک بار ہدف تک مار کرنے میں کامیابی ہو چکی تھی۔ یہ بات قریش مکہ کو گوارا نہ ہو سکتی تھی۔ [اہل بصیرت کے لیے قابل غور ہے] کہ افق پر نئی طاقت کے ابھرنے سے پرانی طاقت کو اپنی ابتدائی ناکامیوں سے ازحد مایوسی ہوئی۔ اب تک یہ اپنی عسکری برتری اور وافر مادی وسائل کو صحیح طور پر استعمال بھی نہ کر سکے تھے۔ [اس لیے یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل امر نہیں] کہ قریش کے لیے [اب اس کے سوا چارہ کار نہ رہا تھا کہ کوئی] ایسا قدم اٹھائیں جس کے ذریعے وہ اپنی پوری عسکری طاقت، اپنے حلیف قبائل کی افرادی قوت، اور اپنے مادی وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے مدینہ منورہ کی نئی اور کمزور سی ریاست کے وجود کو ختم کرکے اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کی کوشش کریں۔

قریش مکہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھے۔ وہ طاقتور ہوتے ہوئے اپنی پوری طاقت استعمال کرنے سے جھجھکتے تھے۔ اس کی دو وجوہ تھیں : اگر وہ بغیر کسی واضح اور حق بجانب وجہ کے مدینہ منورہ پر بھرپور حملہ کر دیتے تو مدینہ منورہ کے حلیف قبائل ان کا رستہ روک لیتے؛ نیز اس طرح کے جارحانہ حملے کی صورت میں قریش مکہ کے اہل انصاف حلیف، جو مسلمانوں کے ساتھ خواہ مخواہ کی عداوت کے قائل نہ تھے، ان کے ساتھ شامل نہ ہوتے اور ان کے کچھ حلیف قبائل بھی علیحدگی اختیار

کر لیتے ۔ دوسری دقت یہ تھی کہ قریش مکہ اور ان کے پڑوسی قبیلے (بنو بکر) کے درمیان پرانی دشمنی تھی ۔ اگر قریش اپنا پورا لشکر لے کر مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے لیے مکہ مکرمہ سے نکل کھڑے ہوتے تو خطرہ تھا کہ بنو بکر ان کی غیر حاضری میں مکّہ پر حملہ آور ہو جائیں گے ۔ ان دونوں دقتوں کو رفع کرنے کی غرض سے مکہ کے ارباب اختیار نے نہایت خفیہ منصوبہ تیار کیا؛ چنانچہ اسی منصوبے کے تحت شام کی طرف ایک بہت بڑا قافلہ روانہ کیا گیا ، جس کا ظاہری مقصد دیگر اشیا کے علاوہ جنگی ساز و سامان خرید کر لانا تھا۔

ابو سفیان جو اس مکی تجارتی قافلے کا سالار تھا، شام سے لوٹتے ہوئے جب مدینہ منورہ کی محاذاۃ میں ، شاہراہ شام پر پہنچا تو اسے خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں مسلمان اس پر حملہ آور نہ ہو جائیں ۔ ادھر ، اتفاقاً آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے روانہ کردہ دو افراد پر مشتمل ایک دستے کا ، جو اس علاقے میں آپؐ نے مشرکین کی سرگرمیاں معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا ، اسے سراغ مل گیا ، جو اسی شاہراہ کے آس پاس موجود تھے ۔ اس نے جنوب کی جانب زرقا کے مقام سے ضمضم بن [عمرو الغفاری] کو مکّہ مکرّمہ روانہ کیا تاکہ وہ وہاں پہنچ کر شور مچا دے کہ محمدؐ اور آپؐ کے ساتھی قافلہ لوٹنا چاہتے ہیں [ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۱۲ ببعد] ۔ قافلے کے ساتھ صرف تیس محافظ تھے [الزرقانی ، ۱ : ۴۱۰ ببعد]، اس لیے چاہیے کہ پورا مکہ اس قافلے کو بچانے کی تدبیر کرے ۔ ضمضم غفاری جب مکّے میں داخل ہوا تو اس نے [نذیر العریان کے طور پر] اپنا پیرہن پھاڑ لیا اور اونٹ کا پالان الٹا کر واویلا شروع کر دیا کہ قافلہ لٹ گیا ہے ، جلد مدد کو پہنچو ۔ اس ڈرامائی انداز سے پورے شہر میں غصے کی لہر دوڑ گئی اور فوراً لڑائی کی تیاریاں شروع ہو گئیں ، ساتھ ہی رؤسائے مکّہ بنو بکر کے پاس پہنچے اور ان سے درخواست کی کہ وہ شہر سے ان کی عدم موجودگی کے دوران میں مکّے پر حملہ نہ کریں ۔ وہ مان گئے ۔ بنو بکر کے ساتھ مباحث چار دن تک جاری رہے اور قریش کے لشکر نے بدر پہنچنے تک دس دن لیے ۔ اس کے باوجود قرآنی شہادت کے مطابق بدر کی لڑائی کے روز قریشی قافلہ بدر کے قریب نچلی جانب تھا [ارشاد ہے : إِذْ أَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَ الرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنْكُمْ ط (۸ [انفال]) : ۴۲)، یعنی جس وقت تم (میدان جنگ) کے قریب کے ناکے پر تھے اور کافر بعید کے ناکے پر اور قافلہ تم سے نیچے کی جانب تھا]۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ضمضم کو بدر سے نہیں بلکہ الزرقاء سے ہی روانہ کیا گیا تھا [الواقدی ، ۱ : ۲۸] ۔ جن روایات کی رو سے ابو سفیان نے ضمضم کو آنحضرت کے لشکر کا علم ہونے کے بعد بدر سے روانہ کیا تھا وہ روایات غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتی ہیں ۔ غور کیجیے کہ ۱۲ رمضان ۲ھ یا اس سے ایک دن قبل حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اطلاع ملی کہ ایک بہت بڑا مکی لشکر مدینہ پر حملہ کے لیے چل پڑا ہے، اس پر آپؐ نے مہاجرین و انصار کو جمع کیا اور یہ اطلاع ان کے سامنے رکھی ۔ قرآن مجید کی آیات سے واضح ہے کہ اس اجلاس کے وقت سرور دو عالمؐ کو علم ہو چکا تھا کہ میدان میں قریش مکہ کا لشکر بھی ہے اور قافلہ بھی [ارشاد باری تعالٰی ہے : وَ إِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ إِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّوْنَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَ يُرِيْدُ اللّٰهُ أَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ يَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ (۸ [انفال] : ۷)، یعنی اور اس وقت کو یاد کرو جب خدا تم سے وعدہ کرتا تھا کہ (ابوسفیان اور ابو جہل کے دو گروہوں میں سے) ایک گروہ تمہارا (مسخر) ہو جائے گا اور تم چاہتے تھے کہ جو قافلہ بے (شان و) شوکت (یعنی بے ہتھیار) ہے وہ تمہارے ہاتھ آ جائے اور خدا یہ چاہتا تھا کہ اپنے فرمان سے حق کو قائم رکھے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے] ۔ حضورؐ نے جب صحابہؓ کی

رائے دریافت کی تو مہاجر اور انصار صحابہؓ نے مقابلہ کرنے کے فیصلے کے ساتھ اتفاق کیا، [آراء معلوم کرنے کے لیے دیکھیے : البخاری : الصحیح، کتاب المغازی ؛ ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۱۴)] ۔ ۱۲ رمضان المبارک کو حضور اقدسؐ نے مسجد نبوی سے روانہ ہوکر ۱۶ رمضان المبارک کو بدر کی وادی کے شمالی سرے [العدوة الدنیا ۸ [الانفال] : ۴۲) پر پہنچے ؛ بدر ایک بستی ہے جو مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کے درمیان واقع ہے ۔ مدینہ منورہ سے اس کا فاصلہ چار منزل کے قریب (شرح مواهب ، ۱ : ۴۰۶) یا ۲۸ فرسخ ہے (معجم ما استعجم، بذیل مادہ بدر)؛ [نیز رک بہ بدر]۔ یہاں پہنچ کر آپؐ نے لشکر کو شمالی سرے پر چھوڑا اور دو صحابہ کو ساتھ لے کر قریشی لشکر کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے آگے تشریف لے گئے ۔ اتفاق سے اسی وقت قریشی لشکر کے تین افراد وہاں پانی بھرنے کے لیے پہنچے تھے ۔ آپؐ کے ساتھیوں نے ان میں سے ایک کو پکڑ لیا ۔ اس نے مکی لشکر کی تفاصیل سے حضورؐ کو آگاہ کیا ، [جس سے معلوم ہوا کہ مشرکین کا لشکر ٹیلے کی پرلی جانب پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے] ۔ اب آپؐ لشکر کو لے کر آگے بڑھے اور بدر کے چشموں کے شمال کی جانب اونچی ریتلی زمین پر اپنا معسکر قائم کیا ۔ اس مقام سے آپؐ پانی کے چشموں کو اپنی نگرانی میں رکھ سکتے تھے۔

آپؐ نے صحابہؓ کے مشورے سے ایسے مقام کو لڑائی کے لیے منتخب کیا جو کسی قدر اونچا اور عساکر مشرکین کے مشرق جانب واقع تھا ؛ اس کے پاس ہی ایک کنواں بھی تھا ۔ رات کو بارش ہوگئی ، جس سے ریت جم گئی ، مگر مشرکین کے لشکر میں کیچڑ پھیل گئی [ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۱۴ ، ۱۵] ۔ دوسری صبح ، یعنی ۱۷ رمضان المبارک [شرح المواهب ، ۱ : ۴۰۱] کو نماز فجر سے فارغ ہوکر خاتم الرسل صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے لشکر کو ترتیب دینا شروع کیا ؛ دو صفیں درست کی گئیں ۔ اگلی صف میں تلوار بند اور نیزہ بردار تھے ؛ پچھلی صف میں تیر انداز متعین کیے گئے ۔ کمان کا صدر مقام (Command Headquarter) پچھلی صف کے عقب میں ، مگر اس کے بالکل قریب اونچی زمین پر قائم کیا گیا اور اس پر سایہ کے لیے کھجور کی ٹہنیوں اور پتوں سے سائبان تیار کر دیا گیا ۔ اسی موقعہ پر ٹولیوں (Sections) اور دستوں (Platoons) کے کماندار مقرر کر گئے ۔ چونکہ دشمن کے پاس سوارہ (Cavalry) بھی موجود تھا ، اس لیے دونوں پہلوؤں پر تیر انداز متعین کیے گئے ؛ انہیں مرکزی لشکر (Main Army) سے ترچھی ترتیب میں عقب کی جانب جھکاؤ دے دیا گیا تھا ، تاکہ سوارہ کا حملہ روکنے میں آسانی پیدا ہو ۔ مبادا قریشی کماندار اپنے سوارہ کے استعمال سے اسلامی لشکر کے پہلوؤں کو لپیٹ میں لے لے ۔ اونٹوں کو لشکر کے عقب میں ایک نشیبی زمین میں پہلے سے ہی چھپا دیا گیا تھا ۔ جنوب کی جانب سے اور وادی کے بائیں کنارے کے ساتھ ساتھ جو راستہ عقب کو جاتا تھا اس پر ایک ٹولی (Section) متعین کی گئی تاکہ دشمن عقب سے حملہ آور نہ ہو سکے اور نہ ہی اونٹوں پر حملہ کر سکے ۔ لشکر کو یوں تدبیراتی (Tactical) پہلو سے ترتیب دینے کے بعد آپؐ نے قریشی لشکر کے انتظار کا وقت دعا و سجود میں گزارا ۔ آپؐ کی دعا کا ایک فقرہ روح اسلام کا نچوڑ ہے ؛ آپؐ کے الفاظ ہیں : [اَللّٰهُمَّ إِنْ تُهْلِكْ هٰذِهِ الْعِصَابَةَ الْيَوْمَ لَا تُعْبَدْ (ابن ہشام : سیرة ، ۲ : ۶۲۷) ، یعنی] اے اللہ اگر یہ چھوٹی سی جماعت آج ختم ہوگئی تو قیامت تک تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔

طلوع آفتاب کے ساتھ قریشی لشکر وادی بدر کے جنوب کی جانب العقنقل کے ٹیلے عقب سے نمودار ہوا ۔ آپؐ نے اسے دیکھا تو فرمایا : [اَللّٰهُمَّ هٰذِهِ قُرَيْشٌ قَدْ أَقْبَلَتْ بِخُيَلَائِهَا وَ فَخْرِهَا ، تُحَادُّكَ وَ تُكَذِّبُ رَسُوْلَكَ ،

اللّٰھم فنصرک الّذی وعدتنی ، اللّٰھم احنہم الغداۃ (ابن ہشام ، ۲ : ۳۶۷) ، یعنی] اے اللہ ! یہ قریش طاقت کے نشے اور غرور میں سرمست تجھ سے مقابلہ کرنے اور تیرے رسول کی تکذیب کرنے آئے ہیں ۔ اے اللہ ! ان کو ہلاک فرما ۔ پھر آپؐ نے اپنے لشکر کو آخری ہدایات دیں اور جہاد کے مقام سے روشناس [الواقدی : المغازی ، ۱ : ۵۹] ؛ جہاد کے دوران میں جس صبر و استقلال کی ضرورت ہوتی ہے، اس پر روشنی ڈالی اور حکم دیا کہ کوئی شخص اپنے مقام سے نہیں ہلے گا ۔ جب تک دشمن بالکل قریب نہ آ جائے ، اس وقت تک ہتھیار استعمال نہ ہوں ، ہر وار کارگر ہو اور اس وقت تک وار نہ کیا جائے جب تک ہدف پوری طرح زد میں نہ آ جائے [الواقدی : کتاب المغازی، ۱ : ۶۷] ۔ یہ تھا وہ اسلحی انضباط (Armament Discipline) ، جسے آج کل کی اصطلاح میں Fire Discipline کہا جاتا ہے اور جس کے بغیر کوئی فوج اپنے ہتھیاروں کا صحیح استعمال نہیں کر سکتی ۔ ان ہدایات کے بعد حضور اکرمؐ بڑھتے ہوے دشمن کے قریب آنے کا انتظار فرمانے لگے ۔ ایک طرف تعداد کی کثرت اور ہتھیاروں کی فراوانی اور دوسری طرف جذبۂ ایمان اور اللہ کے آخری رسولؐ کی تربیت یافتہ چھوٹی سی جماعت تھی ، جس کی ایمانی قوت کا امتحان منظور تھا ۔ قریش لشکر اسلامی کے قریب پہنچ کر رک گئے اور مبارزت [رک بآن] طلب کی ؛ چنانچہ قریشی لشکر سے تین افراد عُتبہ بن ربیعہ ، شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ آگے بڑھے اور دونوں لشکروں کے درمیان پہنچ کر اسلامی لشکر میں سے اپنا مبارز طلب کیا ۔ اسلامی لشکر سے تین انصاری نوجوان آگے بڑھے ۔ یہ تینوں انصار مدینہ [معاذؓ، معوذؓ اور عوف]، حارث کے بیٹے تھے [یا پھر معاذ کی جگہ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ تھے (ابن ہشام ، ۲ : ۲۲۵؛ ابن سعد : الطبقات، ۲ : ۱۷)]؛ مگر عتبہ بن ربیعہ نے انصار کے ساتھ لڑنے سے انکار کر دیا اور کہا : ہمیں تم سے لڑنے کی ضرورت نہیں ۔ [بعض روایات کے مطابق آپؐ نے خود ان صحابہؓ کا مقابلے کے لیے نکلنا ناپسند فرمایا اور ان کو واپس بلا لیا (ابن سعد ، ۲ : ۱۷) ۔ بعد ازاں] آپؐ نے حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب ، حضرت علیؓ بن ابی طالب اور حضرت عبیدہؓ بن الحارث کو مقابلے کے لیے نکلنے کا حکم دیا ۔ حضرت حمزہؓ عتبہ بن ربیعہ کے ، حضرت علیؓ ولید بن عتبہ کے اور حضرت عبیدہؓ بن الحارث اپنے ہم عمر عتبہ بن ربیعہ کے مقابلے میں نکلے ۔ حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ نے اپنے اپنے مدّ مقابل کو زیر کر کے قتل کر دیا ؛ جب کہ حضرت عبیدہؓ [جو کسی قدر عمر رسیدہ تھے] اور عتبہ نے ایک دوسرے کو زخمی کر دیا تھا ۔ مبارزت کے دستور کے مطابق جب ایک بار خون بہہ نکلے تو مبارزت میں حصہ لینے والے ایک دوسرے کی مدد کو آ سکتے تھے ؛ چنانچہ سیدالشہدا حضرت حمزہؓ نے جھپٹ کر عتبہ کو ختم کر دیا [ابن سعد ، ۲ : ۱۷]۔ قریشی کمان دار اس منظر کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے فوراً پورے لشکر کو عام حملے کا حکم دے دیا [محمد حسین ہیکل : حیاۃ محمدؐ، ص ۲۶۳]۔

ادھر آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم اسی قسم کے غیر منضبط حملے کی توقع کیے ہوے تھے ؛ گزشتہ رات کی بارش کی وجہ سے مشرکین کی سمت کسی حد تک پھسلن تھی ؛ اسلامی لشکر نسبتاً بلندی پر تھا ؛ قریشی لشکر کو سامنے سے سورج آنکھوں میں پڑ رہا تھا اور فاصلہ بھی کافی تھا ، جو دوڑ کر عبور کرنا ہر ایک کے لیے آسان نہ تھا ؛ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حملے کے جوش میں کچھ آگے بڑھ آئے اور کچھ پیچھے رہ گئے ؛ اس طرح قریش مکہ کی پیادہ فوج کے حملے میں توازن نہ رہا ۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جنگ کے لیے تدبیراتی طور پر ایک

ایسا مقام چنا تھا ، جو اسلامی جیش کے لیے فائدہ مند تھا ۔ اس کے ساتھ ہی سکی سوارہ بوں لڑائی شروع ہوتے ہی دقتوں سے دو چار ہونا شروع ہو گیا : اسلامی لشکر کے دونوں پہلوؤں پر تیر انداز متعین تھے اور ان کی ترچھی ترتیب کی وجہ سے انھوں نے دشمن کی جانب سے دائراتی (encircling) حرکت کو فوراً روک دیا ۔ زمین اور دیگر جغرافیائی دقتوں نے قریشی پیادہ اور سوارہ کی پیش قدمی (Advance) کو سست اور غیر مربوط (Uncoordinated) بنا دیا تھا ۔ اسلامی لشکر کی موزوں تدبیراتی ترتیب (Tactical Fomration) کی وجہ سے قریشی لشکر کا رسالہ رک گیا تھا اور کچھ ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ لڑائی کے میدان سے ہی خارج ہو گیا ہے ۔ رسالہ صرف اسی صورت میں لڑائی پر اثر انداز ہوا کرتا ہے جب وہ ہلّہ بولنے (Charge) کے قابل ہو ۔ اسلامی لشکر کے تیر اندازوں نے قریشی رسالہ کو اپنے قریب تک نہ آنے دیا تھا ؛ وہ ہلّہ کیسے بول سکتا تھا ۔

اس دہری رکاوٹ نے حملے کو کلیّۃً غیر متوازن (Unbalanced) بنا دیا ۔ [لشکر قریش کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ لگاتار اس کے دو کمان دار مارے گئے : عتبہ پہلے قتل ہوا ۔ عین گھمسان کی جنگ میں ابو جہل ، جو عتبہ کا قائم مقام اور فساد کی جڑ تھا ، مارا گیا ۔ اس طرح قریشی لشکر میں افراتفری سے ملتی جلتی حالت پیدا ہو گئی : تمام لشکر منتشر اور غیر مرتب ہو کر مختلف ٹولیوں میں بٹ گیا اور اس طرح جیش اسلام پر لگاتار ، مگر غیر منظم حملے جاری رہے ، جب کہ دوسری طرف جیش اسلام منظم اور مربوط وحدت بن کر استقلال سے اپنی جگہ جما رہا اور مشرکین کے تمام حملوں کے باوجود وہ اپنی جگہ سے نہ ہل سکا] ۔ دوسری طرف اسلامی کمان دار کی نظر اپنے ہیڈ کوارٹر [العریش] سے محاذ (Front) کے پیچھے پر تھی اور حسب ضرورت احکام جاری کیے جا رہے تھے ۔ دشمن کا پیادہ یوں بھی ہجوم کی شکل میں روانہ ہوا تھا ۔ (یاد رہے کہ عرب میں صف بندی کا دستور نہ تھا ، یہ بھی آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ایجاد ہے) ۔

لشکر قریش کے تیز رفتار افراد جب پتھروں کی زد میں پہنچے تو ان پر پتھروں کی بوچھاڑ کی گئی : وہ رک رک کر ہتھیاروں کی زد میں آتے اور باری باری موزوں ہتیار کے ذریعے نشانہ بنا لیے جاتے ۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم صفوں کے پیچھے کھڑے ہوئے نہایت ٹھنڈے دل سے دشمن کی ان اٹوٹی ، بڑھتی ، پھیلتی اور پھر اسلام کے مجاہدوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتی ہوئی لہروں کو بغور دیکھ رہے تھے ۔ اگرچہ دشمن کے تیر اندازوں کا ہدف آپ کا ہیڈ کوارٹر [العریش] (گھاس پھونس کا چھپر) تھا ، مگر آپ تمام خطرات سے بے نیاز تھے ۔ جب آپ نے دیکھا کہ دشمن کی بڑھتی ہوئی غیر مربوط لہروں میں وہ پہلا سا جوش نہیں رہا تو آپ نے جھک کر زمین سے مٹھی بھر کنکر اٹھائے ، ان پر کلمات دعا و برکت فرمائے اور دشمن پر پھینکتے ہوئے بلند آواز سے فرمایا : اب حملہ کرو ، ان کو شکست ہو گی ۔ [یہ گویا پیش قدمی کا حکم تھا : چنانچہ جیش اسلام "سیسہ پلائی ہوئی دیوار" کے مانند آگے بڑھنا شروع ہوا ۔ قاعدہ ہے کہ ایک ساتھ بڑھنے والی فوج کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا ؛ چنانچہ مشرکین کی فوج بھی لمحہ بھر میں پیچھے کو ہٹنا اور دوسرے ہی لمحے میں بھاگنا شروع ہو گئی ۔

اس موقع پر دشمن کے ستّر نامور افراد قتل ہوئے اور اسی قدر قید کر لیے گئے ۔ زخمیوں کی تعداد کو تحریر میں نہیں لایا گیا ، [جب کہ جیش اسلامی کے کل ۱۴ افراد ، ۶ مہاجرین میں سے اور آٹھ انصار میں سے شہید ہوئے (البخاری : الصحیح ، کتاب

المغازی ، باب ۳ تا ۱۳ : الزرقانی : شرح المواہب ، ۱ : ۴۰۶ تا ۴۳۵ ؛ ابن ہشام : سیرۃ ، ۲ : ۲۵۷ تا ۲۷۴ ؛ ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۱۱ تا ۲۷)]۔ اہل مکہ کو یقیناً ہر پہلو سے نقصان ہوا تھا۔ سب سے بڑھ کر جو نقصان ہوا وہ عزت و وقار کا نقصان تھا۔ قریش مکہ کو جزیرۃ العرب میں ممتاز مقام حاصل تھا ؛ وہ عرب کے سابقہ نظام کے داعی اور محافظ تھے اور نئے دین کے سب سے بڑے دشمن ؛ ان کو نئے نظام کی علمبردار چھوٹی سی تربیت یافتہ جماعت نے شکست دے دی تھی۔ جزیرۃ العرب کے دور دراز علاقوں میں اس انجام کا ذکر ہونا بدیہی تھا ؛ چنانچہ بدنامی سے بچنے کے لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس شکست پر خاموش سوگ منایا جائے گا ؛ کوئی اپنے مقتولین کی یاد میں (اشعار میں) گریہ و نوحہ نہ کرے گا۔ اس خاموش سوگ کے ساتھ ساتھ یہ عزم برقرار رکھا جائے کہ بدر کی شکست کا بدلہ جلد از جلد لیا جائے گا۔ رؤساے قریش ، بالخصوص ابو جہل کے قتل ہونے کی وجہ سے ابوسفیانؓ بلاشرکت غیرے مکّی فوج کا کمان دار اعظم بن چکا تھا۔ اس نے قسم کھائی کہ وہ جب تک خون کا بدلہ نہ لے گا سر پر تیل نہ لگائے گا اور اپنی بیوی سے الگ رہے گا ؛ [چنانچہ اپنی قسم پوری کرنے کے لیے اس نے برائے نام مدینہ منورہ پر حملہ کیا (دیکھیے نیچے)۔ آپؐ نے قیدیوں کے لیے عرب کے مروجہ دستور (قتل یا ہمیشہ کی غلامی) کے برعکس فدیہ لے کر رہا کرنے کا فیصلہ کیا ؛ جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے ، ان کی رہائی کے لیے دس دس افراد کو اس کی تعلیم دینا کافی قرار دیا ؛ اس طرح تمام قیدی رہا ہو گئے (ابن ہشام : سیرۃ ، ۲ : ۲۹۸ تا ۳۰۲)].

غزوۂ بنی قینقاع : فتح بدر کے نتیجے میں ، ریاست مدینہ کے بین القبائل مقام میں معتد بہ اضافہ ہوا ، کیونکہ تعداد میں معمولی لشکر ، جس کے پاس تجہیزات جنگ (Arms and Equipment) بھی ناکافی تھے ، وہ اپنے مقابلے میں تین گنا فوج پر صرف فتح مند نہیں ہوا ، بلکہ اس نے دشمن کے ستر سے زیادہ آدمی قتل کر دیے اور اتنے ہی قیدی بنا لیے تھے اور اس کی اپنی فوج کے صرف چودہ افراد شہید ہوئے تھے.

ظاہر ہے جس کمان دار کی تربیت یافتہ فوج ایسی شاندار کامیابی حاصل کر لے ، اس کی عسکری قابلیت کی شہرت فطری امر ہوتا ہے ، مگر اس کے ساتھ مخالفت کا بھی امکان تھا۔ [لہٰذا اسلامی مملکت کے آس پاس قبائل کا رد عمل ملا جلا تھا] ؛ البتہ مدینہ منورہ کے اندر جو یہودی آباد تھے اور میثاق مدینہ میں بھی شامل تھے انہیں مسلمانوں کی اس کامیابی پر از حد صدمہ ہوا۔ مدینہ منورہ کے مضافات میں یہودیوں کی تین بستیاں تھیں ، اور ان میں قلعے بھی تھے۔ ان بستیوں میں یہودیوں کے تین قبیلے آباد تھے۔ ان میں سے سب سے پہلے بنو قینقاع نے حرکت کی ، جو اہل مکہ سے ساز باز رکھتے تھے۔ [وہ فنون حرب سے واقفیت کے علاوہ خاصی افرادی قوت بھی رکھتے تھے]۔ مدنی فوج کی مدینے میں واپسی پر انہوں نے میثاق مدینہ سے انحراف کرتے ہوئے بغاوت پر آمادگی کا اظہار کیا۔ آپؐ نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی ، مگر انہوں نے بگڑ کر کہا : "کیا تم ہمیں بھی قریش مکہ کی طرح سمجھتے ہو ؟ بخدا اگر تم ہمارے ساتھ لڑو گے تو صحیح معنوں میں مردوں سے سامنا کرو گے۔ ہم لڑنا جانتے ہیں" [ابن ہشام : سیرۃ ، ۳ : ۵] ؛ چنانچہ آپ نے ۱۵ شوال ۲ھ بروز ہفتہ کو ان کے [قلعے کے محاصرہ کا حکم دے دیا۔ پندرہ دن کے شدید محاصرے سے تنگ آ کر انہوں نے بالآخر ہتھیار ڈال دیے اور مدینہ چھوڑنا قبول کر لیا]۔ حضورؐ نے ان کی بغاوت کا قصور معاف کر دیا اور

انھیں ہتھیاروں کے علاوہ باقی ساز و سامان اور مال و دولت بھی ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی [ابن ہشام : سیرۃ ، ۳ : ۵۰ تا ۵۲]۔

غزوۂ سَویق : ابوسفیان [اپنی قسم پوری کرنے کے لیے] جب مدینہ منورہ پہنچا تو بنو قینقاع مدینہ منورہ سے جلا وطن کیے جا چکے تھے ۔ وہ ایک یہودی سردار سلّام بن [مِشکم] کے گھر گیا اور وہاں اسے سب حالات معلوم ہوئے ۔ [رات کے آخری پہر میں اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ] مدینہ منورہ کے مضافات میں [مقام العُرَیض میں کچھ درختوں کو جلایا اور دو انصاری صحابہؓ کو قتل کیا] اور رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے واپس لوٹ گیا ۔ اس طرح اس نے اپنی قسم کو پورا کیا (ابن ہشام سیرۃ ، ۳ : ۴۷ تا ۴۹) کے مطابق یہ واقعہ غزوۂ بنی قینقاع سے قبل پیش آیا].

آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم اطلاع ملتے ہی اس کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے ۔ پکڑے جانے کے اندیشے سے اس نے راستے میں جا بجا ستوؤں کے تھیلے پھینکنے شروع کر دیے تاکہ وزن کم ہو جائے ، اسی بنا پر اس غزوے کو غزوہ سویق (= ستو) کا نام دیا گیا ہے [الواقدی : المغازی ، ۱ : ۱۸۱ تا ۱۸۲ ؛ ابن ہشام ، سیرۃ ، ۳ : ۴۷ تا ۴۹].

غزوہ قَرقَرۃ الکُدر : ادھر بنو سُلیم مدینہ منورہ پر حملے کی تیاریاں کر رہے تھے ۔ اس کی اطلاع آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ملی تو آپؐ نے [غزوۂ بدر سے واپسی کے سات دن بعد (ابن ہشام ، ۳ : ۴۶) یا وسط محرم الحرام ۳ھ میں (ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۳۱)] بنو سُلیم کی خیمہ گاہوں کا رخ کیا ۔ حضورؐ کا لشکر نہایت تیزی سے بنو سلیم کے علاقے [قرقرۃ الکدر یا قراۃ الکدر] میں پہنچا ، مگر وہ اطلاع ملتے ہی پہاڑوں میں چھپ گئے ؛ کچھ جانور اپنی خیمہ گاہوں کے آس پاس چھوڑ گئے جنہیں پکڑ لیا گیا ۔ اس غزوہ کو غزوۂ بنی سلیم بھی کہا جاتا ہے ۔ [جیش اسلام کی تعداد دو سو تھی (ابن ہشام : سیرۃ ، ۳ : ۴۶ ؛ الواقدی : المغازی ، ۱ : ۱۸۲ تا ۱۸۴ ؛ ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۳۱)].

غزوہ بنی سلیم ثانی : بنو سلیم نے مقام [بَحران میں جمع ہو کر] دوبارہ حملے کی تیاریاں شروع کر دیں ۔ پھر جب ان پر [ربیع الأوّل ۳ھ (ابن سعد ، ۲ : ۳۴) یا جمادی الاولی (الواقدی ، ۱ : ۱۹۶) میں] لشکر کشی کی گئی تو وہ پہاڑوں میں چلے گئے ۔ اس بار اسلامی لشکر کی تعداد [تین سو] تھی اور اس میں مہاجر اور انصار دونوں شامل تھے ۔ اس غزوہ کو غزوۂ بنی سلیم ثانی کہا گیا ہے [ابن سعد: الطبقات، ۲ : ۳۵ تا ۳۶؛ الواقدی ، کتاب المغازی ، ۱ : ۱۹۶ تا ۱۹۷) ؛ ابن ہشام: (سیرۃ ، ۳ : ۵۰) نے اس مہم کو قریش مکہ کے خلاف بیان کیا ہے].

غزوۂ بنی غطفان: [۱۲] ربیع الاوّل ۳ھ / ۶۲۴ء میں آپؐ کو اطلاع ملی کہ قریش کا دوسرا نجدی حلیف قبیلہ بنو غطفان مدینہ منوّرہ پر چڑھائی کی تیاریوں میں مصروف ہے ۔ آپؐ ساڑھے چار سو صحابہؓ کو ساتھ لے کر نجد [مقام ذی اَمَر] کی طرف روانہ ہوئے [اور اس تیزی سے دشمن کے سر پر جا پہنچے کہ دشمن حواس باختہ ہو گیا] ؛ انہیں اسلامی لشکر کی آمد پر پہاڑوں میں غائب ہو جانا پڑا ۔ اس مہم کا نام غزوۂ ذی امر بھی ہے (ابن ہشام : سیرۃ ، ۳ : ۴۹ ؛ ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۳۴)].

آپؐ کے اس طرح کے سفر اس قدر کامیاب ثابت ہوئے کہ قریش نے [آپؐ کو ایک مسلّمہ طاقت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا اور] راستے کا استعمال ترک کر دیا ، جو ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ ، مدینہ کے پاس سے گزرتا تھا ۔ انھوں نے اس کے بعد جو قافلہ روانہ کیا ، اسے نجد کے راستے سے روانہ کیا ۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم

نے شروع سے خبریں حاصل کرنے کے عسکری ذرائع (Military Intelligence) کو اعلیٰ پیمانے پر منظم کر لیا تھا۔ اس قافلے کی روانگی کی تاریخ اور اس کے سفر کی سمت معلوم ہونے پر آپ ؐ نے جمادی الآخرة ۲ھ میں حضرت زید بن حارثہ ؓ کو ایک سو افراد پر مشتمل دستۂ فوج دے کر روانہ فرمایا۔ اس قریشی قافلے کی قیادت ابوسفیان بن حرب [(ابن ہشام، ۳: ۵۳) یا صفوان ابن امیہ (ابن سعد، ۲: ۳۶)] کر رہا تھا۔ حضرت زید ؓ نے قافلے کو روک لیا اور سامان اپنی تحویل میں لے لیا۔ قافلے کے محافظ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے؛ چند ایک اسیر بھی ہوئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ آپ ؐ نے قریش مکہ کی اقتصادی ناکہ بندی کا حکم دیا۔ یہ قافلہ مکہ کے حلیف قبائل کے علاقے سے ہو کر گزر رہا تھا، مگر آپ ؐ کی عسکری منصوبہ بندی (Military Planning) اور اس پر بہتر عمل کا یہ نتیجہ تھا کہ یہ قافلہ اپنی منزل مقصود پر نہ پہنچ سکا [(الواقدی: المغازی، ۱: ۱۹۷ تا ۱۹۸؛ ابن ہشام، ۳: ۵۳)]۔ جن مہموں کے متعلق مؤرخین نے لکھا ہے کہ آپ ؐ کی فوج قافلوں کو لوٹنے کے لیے ہر دوسرے مہینے نکل کھڑی ہوتی تھی اور قافلے ہاتھ نہ آتے تھے، [یہ خیال ضعیف روایات پر مبنی ہے]۔ یہ مؤرخ عسکری یا تنظیمی منصوبہ بندی کے اصولوں کی اہمیت نہیں سمجھ سکے؛ حالانکہ ان کا تعلق محاربانی منصوبہ بندی سے ہے اور یہ ایک علم (science) ہے اور آنحضرت ؐ کو اس کا ادراک تائید ایزدی کا مرہونِ منت ہے۔ جب جنگ شروع ہو چکی تھی اور مسلسل ہو رہی تھی تو اس قسم کے اقدامات کو محض تجارتی قافلوں کی روک ٹوک تک محدود سمجھنا درست نہیں ہو سکتا۔ حالات اور واقعات کی روشنی میں ایسی روایات مبہم راوی کے دخل کی وجہ سے ناقابل اعتماد ہو جاتی ہیں۔

اس دوسرے دور کے واقعات کا خلاصہ یہ ہے کہ اس دور میں مدینہ منورہ سے آٹھ مہمیں روانہ کی گئیں۔ ان میں سے سات کی قیادت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے کی۔ جس مہم کی کمان آپ ؐ نے ایک صحابی ؓ کو عطا کی وہ انسدادی کارروائی تھی۔ اس دور میں عسکری تربیت کی طرف پہلے سے زیادہ توجہ دی گئی، البتہ مغازی سفر پہلے دور کی نسبت کم ہوئے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اب دشمن علانیہ میدان میں آ گیا تھا اور دفاعی اقدامات کی ضرورت بڑھ چکی تھی۔ اس دور میں اقتصادی ناکہ بندی کو بھی بطور ہتھیار کے استعمال کیا گیا؛ قریش مکہ کے لیے شمال اور مغرب کی تجارتی شاہراہیں بڑی حد تک مسدود کی جا چکی تھیں؛ اول الذکر کے دائیں بائیں مدینہ منورہ کے حلیف قبائل آباد تھے؛ آخر الذکر پر مکہ مکرمہ کے حلیف قبائل کی موجودگی میں قریشی قافلہ روک لیا گیا تھا۔

مدینہ منورہ کی عسکری قابلیت کی اس قدر دھاک بیٹھ چکی تھی کہ کوئی قبیلہ آسانی سے مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا؛ [چنانچہ یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ اب مخالف ضرور بڑے پیمانے پر مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوں گے، کیونکہ دشمنوں کو اندیشہ تھا کہ اگر انہوں نے یہ موقع کھو دیا تو پھر مدینہ منورہ اتنی طاقت پکڑ لے گا اور وہ خود اقتصادی طور پر اتنے کمزور ہو جائیں گے کہ ان کے لیے مسلمانوں کو شکست دینا ناممکن ہو جائے گا۔

غزوۂ احد: [ادھر قریش مکہ بھی خاموش نہ تھے، انہوں نے غزوۂ بدر کے بعد سے اب تک اس حقیقت کو ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہیں کیا تھا کہ مسلمانوں نے ان کو میدان بدر میں شکست سے ہمکنار کیا ہے؛ چنانچہ انہوں نے ایک منظم طریقے سے جنگ کی تیاریوں کا آغاز کر دیا: (۱) اپنے شعلہ بیان اور آتش نوا شاعروں کو اپنے حلیف قبائل میں روانہ کیا تاکہ اہل اسلام کے خلاف غیظ و

غضب کی آگ بھڑکا کر انفرادی قوت حاصل کی جا سکے؛ (۲) دوسری طرف تمام اہل مکہ سے چندہ لے کر سامان جنگ مہیا کیا گیا؛ اس کے علاوہ خیبر کے یہودی، بالخصوص یہود بنی قینقاع قبائل عرب کو بھڑکانے میں ان کے ہم نوا تھے (ابن ہشام: سیرۃ، ۳: ۴۴ ببعد)]۔

چنانچہ شوال المکرم ۳ھ میں ابوسفیان کی قیادت میں قریش مکہ تین ہزار کا لشکر لے کر مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوئے [جس میں احابیش، بنو کنانہ اور اہل تہامہ کے بہت سے حلیف قبائل بھی شریک تھے؛ یہ لشکر تین ہزار جنگجو افراد پر مشتمل تھا جس میں دو سو گھوڑ سوار، سات سو زرہ پوش اور تین ہزار اونٹ تھے؛ پانچ سو عورتیں بھی ہمراہ آئی تھیں (ابن سعد، ۲: ۳۷)]۔ جب کفار کا لشکر مدینہ منورہ کے باہر کوہ احد کی مغربی جانب خیمہ زن ہوا تو آپؐ نے مجلس مشاورت طلب فرمائی اور دفاع کے طریق پر غور فرمایا۔ آپؐ کا ارادہ تھا کہ شہر کے اندر رہ کر دفاع کیا جائے؛ نوجوانوں، خصوصاً وہ، جنھیں غزوۂ بدر میں حصہ لینے کا موقع نہ ملا تھا، کی خواہش تھی کہ مکی لشکر کا مقابلہ باہر نکل کر کیا جائے۔ حضور اکرمؐ نوجوانوں کے اصرار پر اٹھ کر گھر کے اندر تشریف لے گئے اور زرہ پہن [کر باہر تشریف لائے۔ اب نوجوانوں کو منشائے نبوی کے خلاف اصرار پر ندامت ہوئی، اس لیے معذرت کی اور کہا کہ آپ کی تجویز کے مطابق شہر کے اندر رہ کر دفاع کیا جائے، مگر آپؐ نے فرمایا: پیغمبر کے لیے مناسب نہیں کہ جب وہ زرہ پہن لے تو لڑائی سے قبل ہی زرہ اتار دے [ابن ہشام: سیرۃ، ۳: ۶۸]۔ اب حضورؐ نے تین نیزے منگوا کر تین عَلَم تیار کیے؛ مہاجرین کا عَلَم [جو آپؐ کا عَلَم ہونے کی وجہ سے مرکزی حیثیت رکھتا تھا]، حضرت علیؓ یا حضرت مصعبؓ بن عمیرؓ کو عطا ہوا۔ بنو اوس کا عَلَم [حضرت اُسیدؓ بن حُضیر] کو اور بنو خزرج کا عَلَم [حضرت سعدؓ بن عُبادہ کو مرحمت ہوا]۔ حضرت عبداللہؓ بن امّ مکتوم کو نائب مقرر کر کے مدینہ منورہ میں چھوڑا اور ایک ہزار کا لشکر احد کی طرف روانہ ہوا [(ابن ہشام، ۳: ۶۸)؛ لشکر میں ایک سو زرہ پوش بھی تھے (ابن سعد، ۲: ۳۹)]۔ مدینہ منورہ سے تقریباً دو میل باہر جا کر [الشیخین کے مقام] پر رات کے لیے پڑاؤ ڈالا گیا [اور لشکر کی نگہبانی پر حضرت سلمہؓ بن خالد کا پچاس جانبازوں کے ساتھ تقرر ہوا (حوالۂ مذکور)۔ دوسری طرف مشرکین کے لشکر میں عکرمہ بن ابی جہل، پچاس جوانوں کے ساتھ پہرے پر متعین تھا]۔

دوسری صبح، پو پھٹنے سے پہلے حضورؐ جب کوچ کے لیے تیار ہوئے تو عبداللہ بن اُبی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر علیحدہ ہو گیا اور وجہ یہ بتائی کہ چونکہ اس کی رائے، یعنی شہر کے اندر رہ کر لڑنے، کو قبول نہیں کیا گیا [اور چونکہ اس کے نزدیک باہر نکل کر مقابلہ کرنا صریحاً قتل ہو جانے کے مترادف ہے] اور وہ اپنے آدمیوں کو قتل کرانا نہیں چاہتا۔

اب اسلامی لشکر میں صرف سات سو کے قریب مجاہد رہ گئے تھے۔ [اگر پہلے تعداد ہزار تھی تو اب سات سو اور اگر نو سو تھی تو اب باقی رہنے والوں کی مجموعی تعداد چھ سو رہ گئی (الزرقانی، ۲: ۲۶)]؛ مگر آپؐ اس کے باوجود بڑی نہایت اطمینان سے آگے بڑھے اور جبل احد کے جنوب مشرق سے ہوتے ہوئے پہاڑ کے جنوب مغربی کونے کے قریب صف آرا ہوئے۔ آپؐ نے یہ اہتمام کیا کہ اپنے عقب کی جانب چھوٹی سی پہاڑی [عینان] پر حضرت عبداللہؓ بن جبیر کی قیادت میں پچاس تیر انداز متعین فرما دیے تاکہ دشمن اپنے سوارہ سے عقبی حملہ نہ کر سکے۔ ان

تیر اندازوں کو [تاکیدی] حکم دیا گیا کہ چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو، وہ اپنا مقام ہرگز نہ چھوڑیں (حوالۂ مذکور، ۲ : ۲۸)؛ [ابن سعد (۲ : ۴۰) کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا تم نے ہمارے عقب کی حفاظت کرنی ہے، ہمیں فتح ہو یا شکست تم نے اپنی جگہ سے ہرگز نہیں ہٹنا] ۔ اس پہاڑی کا نام جبل عینین بھی ہے اور جبل رُماۃ بھی ۔ آپؐ ان انتظامات میں مصروف تھے کہ آپؐ نے دیکھا کہ مکی لشکر کے تین ہزار سپاہی وادی قناۃ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں ۔ حضورؐ کے لشکر کا دایاں بازو جبل احد کے کونے کے ساتھ تھا اور بایاں بازو وادی قناۃ کے کنارے تک پھیلا ہوا تھا، اس لیے مکی کمان دار کو روبرو حملہ (Frontal Attack) کرنا پڑ رہا تھا اور وہ اپنے سوارہ کو پہلو سے حملے (Flanking Attack) کے لیے استعمال نہ کر سکتا تھا ۔ دشمن کو روبرو حملے پر مجبور کرنے کے علاوہ آپؐ نے محاذ اس قدر محدود چنا تھا کہ مکی لشکر کی افرادی برتری (Numerical Superiority) بروئے کار نہیں لائی جا سکتی تھی ۔

مکی لشکر اسلامی لشکر کے قریب پہنچ کر رک گیا اور ان کے علم بردار طلحہ بن ابی طلحہ نے آگے بڑھ کر مبارزت کے لیے للکارا؛ حضرت علیؓ اس کے مقابلے میں نکلے اور پہلے ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا ۔ اس کے بعد اس کے بھائی [عثمان بن ابی طلحہ] نے علم سنبھالا ۔ حضرت حمزہؓ نے اسے قتل کیا ۔ پھر زرہ پوش ابو سعد بن ابی طلحہ نے قریشی علم سنبھالا اور اسے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے قتل کر دیا ۔ اس طرح اس خاندان کے آٹھ افراد علم کے وقار پر مر مٹے؛ پھر ایک غلام آگے بڑھا، وہ بھی قتل ہو گیا ۔ اس طرح قریش مکہ کے پے در پے علم برداروں کے قتل سے علم اٹھانے والا کوئی نہ رہا تو ان کے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی ۔

مکی سوارہ خالد بن ولید کی کمان میں وادی قناۃ کے راستے اسلامی لشکر کی بائیں جانب سے ہو کر عقبی حملے کی کوشش کر رہا تھا، مگر جبل عینین پر متعین تیراندازوں نے اس کی ہر کوشش ناکام بنا دی تھی ۔ جونہی قریشی پیادے نے پسپائی (Withdrawal) اختیار کی، قریشی سوارہ بھی بھاگ کھڑا ہوا ۔ اسلامی لشکر نے بھاگتے ہوئے قریشی پیادے کے سپاہیوں کو پکڑنا اور ان کے ہتھیار جمع کرنا شروع کر دیے ۔ جبل عینین پر متعین پچاس تیر اندازوں نے جب دیکھا کہ اسلامی فوج مال غنیمت جمع کرنے میں مصروف ہے، تو ان میں سے اکثر اپنے مقام سے ہٹ گئے اور مال غنیمت سنبھالنے کے لیے چل پڑے؛ ان میں سے صرف دس مجاہد اپنے مقام پر قائم رہے ۔ خالد بن ولید [نے جب یہ دیکھا تو اپنے تین سو سوارہ کے ساتھ آگے بڑھا اور] جبل عینین پر موجود چند تیر اندازوں کو روندتے ہوئے اسلامی لشکر پر عقب سے حملہ آور ہونے میں کامیاب ہو گیا ۔ بکھری ہوئی اسلامی فوج جو شکست خوردہ قریشی قیدیوں کو جمع کرنے میں دو دو اور تین تین کی ٹولیوں میں بٹ چکی تھی، سوارہ کے اس شدید حملے کی طرف سے غافل تھی ۔ ادھر جب بھاگتے ہوئے قریشی پیادے کے سپاہیوں کو معلوم ہوا کہ اسلامی لشکر پر ان کے سوارہ نے عقب سے ہلہ بول دیا ہے تو وہ بھی پلٹ پڑے ۔ اب اسلامی لشکر دو طرفہ حملے کا شکار ہو گیا [اور چونکہ غیر منظم ہو چکا تھا، اس لیے اس حملے کی تاب نہ لا سکا ۔ اس حالت میں آپؐ کے ساتھ صرف چودہ جاں نثار باقی رہ گئے (ابن سعد، ۲ : ۴۲) ۔ دشمنوں نے جب آپؐ کو چند جاں نثاروں کے ساتھ پایا تو آپ پر شدت کے ساتھ حملہ کر دیا؛ ابن قمیئہ نے آپؐ پر تلوار کا وار کیا، جس سے آپؐ کے سامنے کا نچلا دایاں دندان مبارک شہید ہو گیا؛ رخسار اور پیشانی بھی سخت زخمی

ہو گئی ۔ ادھر حضرت مصعب رض ابن عمیر رض ، جن کی شکل و شباہت آپ ص سے ملتی جلتی تھی ، شہید ہو گئے تو اسلامی لشکر میں افواہ پھیل گئی کہ (معاذ اللہ) آپ ص کو شہید کر دیا گیا ہے ؛ ایک روایت میں ہے کہ ابن قمیئہ نے جب آپ ص کے چہرے پر تلوار کا وار کیا اور آپ اس سے شدید زخمی ہو گئے ، تو اس نے یہ افواہ مشہور کر دی کہ اس نے معاذ اللہ آپ ص کو قتل کر دیا ہے ۔ اس افواہ سے اہل اسلام میں مزید بد دلی پیدا ہو گئی ؛ آپ ص بار بار آواز دیتے تھے : اللہ کے بندو ! میرے پاس آؤ؛ میں اللہ کا رسول ہوں ۔ سب سے پہلے حضرت کعب رض بن مالک نے آپ ص کو پہچانا اور بلند آواز سے صحابۂ کرام رض کو پکارا کہ آپ ص یہاں تشریف فرما میں ، یہاں آؤ ۔ [یہ سننا تھا] کہ اکھڑے ہوئے قدم جمنا شروع ہو گئے۔ جب صحابہ رض کی معتدبہ تعداد جمع ہو گئی تو آپ ص نے پھر اپنا لشکر منظم کرنا شروع کیا اور اہل اسلام کو لے کر آہستہ آہستہ پیچھے کو ہٹتے گئے تاکہ احد کی بلندی سے فائدہ اٹھایا جا سکے ۔ یہاں دوسری بار شدت کی لڑائی لڑی گئی ۔ یہ مقام کشادہ تھا ، اس لیے قریشی سوار، بار بار پلٹ کر گھرے ہوئے اسلامی لشکر پر حملے کر رہا تھا ۔ اس کے باوجود آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم لمحہ بہ لمحہ اپنے لشکر کو احد کے قریب لیے جا رہے تھے ۔ جونہیں جیش اسلام احد کی بلندی پر پہنچا تو قریشی لشکر کا حملہ رک گیا ؛ قریشی لشکر نے بھی دوسری چوٹی تک رسائی حاصل کر لی ، مگر کسی نئے حملہ کرنے میں انہیں کامیابی نہ ہوئی ۔ اس گھمسان کی دست بدست [لڑائی میں صحابۂ کرام رض کی جان نثاری کا بھرپور اظہار ہوا ؛ ابن سعد کے مطابق آپ کے سامنے تیس نوجوانوں نے یکے بعد دیگر اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے؛ ان میں سے ہر ایک آگے بڑھتا اور عرض کرتا : میری جان آپ ص پر نثار ہو، پھر پلٹ کر واپس نہ آتا (ابن سعد ، ۲ : ۴۴)] ۔ احد کی لڑائی میں [بائیس مشرک قتل ہوئے جب کہ دوسری طرف] ستّر صحابہ رض شہید ہوئے [الزرقانی : شرح المواہب ، ۲ : ۱۸ تا ۴۴] ۔ سیدالشہداء حضرت حمزہ رض بھی ان میں شامل تھے ۔ کچھ دیر بعد قریشی لشکر مکے لوٹتا ہوا نظر آیا ۔ [آپ ص نیچے تشریف لائے، شہدا کی لاشوں کو جمع کیا ، ان پر نماز جنازہ پڑھی اور بڑی بڑی قبریں کھود کر ان میں متعدد شہدا کو دفن کر دیا گیا (ابن سعد، ۲ : ۴۲ تا ۴۴) ۔ اس سے فارغ ہو کر آپ ص] نے اپنی سپاہ کو واپس مدینہ منورہ کوچ کرنے کا حکم دیا اور یوں احد کی لڑائی ہار جیت کے بغیر اختتام کو پہنچی ؛ چنانچہ جیش اسلام نے نماز مغرب مدینہ منورہ میں آ کر ادا کی ۔

میدان جنگ سے تو مشرکین لوٹ گئے ، لیکن جب مدینہ منورہ سے آٹھ دس میل حمراء الاسد کے مقام پر پہنچے تو انہوں نے لڑائی کے انجام پر غور کیا تو انھیں پتا چلا کہ وہ جس کو مسلمانوں کی ہزیمت خیال کیے ہوئے تھے وہ خود ان کی اپنی ہزیمت ہے ، کیونکہ عساکر قریش جیش اسلام کو نہ تو میدان جنگ سے باہر نکلنے پر مجبور کر سکا اور نہ ہی کوئی اور نمایاں کامیابی حاصل کر سکا تھا ۔ اس بنا پر بعض لوگوں کی رائے یہ تھی کہ پلٹ کر دوبارہ مسلمانوں پر حملہ کر دینا چاہیے [ابن ہشام، ۳ : ۱۰۸] ۔ آپ ص کو جب اس کی اطلاع ملی تو آپ ص نے تعاقب کرنے کا فیصلہ فرمایا ؛ چنانچہ [احد کی لڑائی کے دوسرے دن (ابن ہشام ، ۳ : ۱۰۷) شوال [۳ ہجری] کو سرور کونین صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے لشکر کو تیاری کا حکم دیا ۔ جب لشکر جمع ہو گیا تو آپ ص نے قریشی لشکر کے تعاقب کے احکام صادر فرمائے ، مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ صرف وہی افراد اس لشکر میں شامل ہوں گے جو احد کی لڑائی میں حاضر تھے ۔ حضور ص اس مہم میں حمراء الاسد

کے مقام تک تشریف لے گئے۔ وہاں معسکر قائم کرنے کے بعد نظارتی گشتیں روانہ کیں، قریشی لشکر چند میل دور [الرَّوحاء] کے مقام پر خیمہ زن تھا۔ جونہی ان کو معلوم ہوا کہ حضورؐ ان کے تعاقب میں مدینہ منورہ سے [نکل کر حمراء الاسد تک آ پہنچے ہیں تو آگے بڑھ کر مقابلہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی]۔ وہ تیز رفتاری سے مکے روانہ ہو گئے، البتہ [بنو عبدالقیس کے ایک تجارتی قافلے کے ذریعے] آئندہ سال بدر کے مقام پر دوبارہ مقابلہ کرنے کا پیغام بھیج دیا۔ جب آپؐ تک یہ پیغام پہنچا تو آپؐ نے فرمایا: ہمارے لیے اللہ کافی ہے۔ اس طرح آپ مدینہ منورہ لوٹ آئے (نیز رک بہ احد]۔ غزوۂ احد میں جیش اسلام کی برائے نام ہزیمت کی خبر جونہی قبائل عرب میں مشہور ہوئی تو بہت سے قبیلے اہل اسلام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے؛ چنانچہ اس فتنے کو فرو کرنے میں آپؐ کو خاصا وقت لگا۔

جیش ابو سلمہؓ بن عبدالاسد کی قطن کو روانگی: آپؐ کو اطلاع ملی کہ عرب کے مشہور ڈاکو طلیحہ بن خویلد اور سلمہ بن خویلد مدینہ منورہ پر چھاپا مارنے کی تیاریاں کر رہے ہیں تو آپؐ نے محرم ۴ھ میں حضرت ابو سلمہ بن عبدالاسد المخزومی کو ڈیڑھ سو افراد کا دستہ دے کر روانہ فرمایا؛ چنانچہ وہ غیر معروف راستوں سے ہوتے ہوئے جبل قطن میں اچانک دشمن کے سر پر جا پہنچے۔ دشمن اس طوفانی یلغار سے حواس باختہ ہو گیا اور ان کی جمعیت منتشر ہو گئی؛ چنانچہ حضرت ابو سلمہ سالماً و غانماً واپس تشریف لے آئے (ابن سعد: الطبقات، ۲ : ۵۰؛ الواقدی: کتاب المغازی، ۱ : ۳۴۰ ببعد)۔

سریۃ عبداللہؓ بن اُنَیس: آپؐ کو اطلاع ملی کہ سفیان بن خالد الہذلی اللحیانی، عرنۃ کے مقام پر جمعیت اکٹھی کر کے مدینہ منورہ پر یلغار کرنا چاہتا ہے۔ آپؐ نے حضرت عبداللہؓ بن انیس کو ۵ محرم الحرام [۴ھ] سوموار کو اکیلے ہی روانہ فرمایا۔ انھوں نے نہایت ہوشیاری سے سفیان کو ختم کر دیا (ابن سعد، ۲ : ۵۰ تا ۵۲)۔

۴ھ میں بئر معونہ [رک بآں] اور رجیع [رک بآں] کے واقعات پیش آئے جس سے بعض قبائل کی اسلام دشمنی اور اہل اسلام کے خلاف ان کے عناد کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ تفصیل کچھ یوں ہے کہ صفر ۴ھ میں ابو براء عامر بن مالک بن جعفر ملاعب الاسنۃ الکلابی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی قوم کے لیے مبلغین بھیجنے کی درخواست کی۔ ان کی حفاظت کی ذمہ داری خود اس نے اٹھائی۔ آپؐ نے ستر تربیت یافتہ قراء کی ایک جماعت کو، جس کے امیر المنذر بن عمرو الساعدی تھے، روانہ فرمایا۔ جب یہ جماعت بئر معونہ (جہاں بنو سُلیم اور بنو عامر کی سکونت تھی) پہنچی تو عامر بن الطفیل نے، بنو سلیم کی جمعیت کے ساتھ، ان پر حملہ بول دیا، چنانچہ سوائے ایک فرد کے تمام کو شہید کر دیا گیا۔

انھی دنوں عَضَل اور القارہ (قبائل) کی ایک جماعت حاضر ہوئی اور مبلغین کو بھیجنے کی درخواست کی۔ آپؐ نے ان کے ساتھ دس قراء کی جماعت کو مرثدؓ بن ابی مرثد کی زیر قیادت روانہ فرمایا۔ یہ جماعت جب مقام رجیع کے قریب پہنچی تو ان تمام کو بھی بے دردی کے ساتھ شہید کر دیا گیا۔ یہ دو عظیم واقعات تھے، جن میں تقریباً ۷۰ تربیت یافتہ افراد شہید ہو گئے (ابن سعد: الطبقات، ۲ : ۵۱ تا ۵۶؛ الزرقانی: شرح المواهب، ۲ : ۶۴ تا ۸۰)]۔

اسی سال [یعنی ۴ھ میں] مدینہ منورہ کے مضافات میں رہنے والا دوسرا یہودی قبیلہ بنو نضیر [رک بآں] بغاوت پر آمادہ ہوا؛ یہ وہ یہودی قبیلہ

ہے جس کے سردار سلام بن مشکم نے غزوۂ سویق کے موقع پر ابوسفیان کی مہمان نوازی کی تھی اور اسے مدینہ کے حالات سے آگاہ کیا تھا۔ اس قبیلے نے [آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو (معاذ اللہ) قتل کرنے کی ناپاک سازش تیار کی۔ ان دنوں ان کا سردار حُیی بن اخطب تھا، آپؐ نے انھیں پیغام بھیجا کہ دس دن میں اپنے مکان خالی کر دو، ورنہ محاصرہ کر لیا جائے گا۔ انھوں نے رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کی شہ پر لڑائی پر آمادگی ظاہر کی؛ چنانچہ ربیع الاول ۴ھ میں ان کا محاصرہ کر لیا گیا]۔ یہ لوگ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے؛ پھر بنو نضیر نے خود ہی مدینہ منورہ سے چلے جانے کی خواہش ظاہر کی۔ آپؐ نے انھیں معاف کر دیا اور سوائے ہتھیاروں کے باقی تمام سامان انھیں لے جانے کی اجازت دے دی [ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۱۹۹ تا ۲۰۲؛ الحلبی: سیرۃ حلبیۃ، ۲: ۵۵۹ ببعد]۔

غزوۂ ذات الرقاع: بنو غطفان بدر و احد میں قریش مکہ کی مدد کر چکے تھے۔ ۴ھ میں ایک بار مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کی تیاری بھی کی تھی: جمادی الاولی ۴ھ [ابن ہشام: سیرۃ، ۳: ۲۱۳) یا ۱۰ محرم (ابن سعد: طبقات، ۱: ۶۱)] میں آپؐ کو اطلاع ملی کہ یہ طاقت ور قبیلہ مدینہ منورہ پر حملے کی دوبارہ تیاریاں کر رہا ہے۔ حضورؐ نے چار سو [یا سات سو (ابن سعد، ۱: ۶۱)] صحابہ کرامؓ کا لشکر تیار کیا اور بنو غطفان کی خیمہ گاہوں کا رخ کیا۔ جونہی انھیں حضورؐ کی روانگی کی اطلاع ملی وہ پہاڑوں میں غائب ہو گئے۔ لڑائی نہیں ہوئی؛ تاہم لڑائی کا شدید خطرہ رہا۔ اسی خطرے کے پیش نظر وہاں صلوٰۃ الخوف [رک بآں] پڑھی گئی۔ اسلامی لشکر چند روز ان کے علاقے میں خیمہ زن رہ کر واپس ہوا۔ اس مہم کا نام غزوۂ ذات الرقاع ہے [ابن ہشام: سیرۃ، ۳: ۲۱۴ ببعد؛ الزرقانی، ۲: ۸۶ ببعد]۔

غزوۂ بدر الآخرہ یا بدر الموعد: ابوسفیان نے [الروحاء] سے واپس جاتے ہوئے آئندہ سال اسی موسم میں بدر کے مقام پر دوبارہ مقابلے کی دعوت دی تھی؛ اسی لیے حضورؐ شعبان ۴ھ [(ابن ہشام، ۳: ۲۲۰)] یا ذوالقعدہ، یہی قرین قیاس ہے (ابن سعد، ۲: ۵۹)] میں ایک ہزار [یا پندرہ سو (حوالۂ مذکور)] پر مشتمل لشکر لے کر بدر کی طرف روانہ ہوئے؛ اس مرتبہ مدینہ منورہ میں عبداللہؓ بن رواحہ [(حوالۂ مذکور) یا عبداللہؓ بن عبداللہ بن ابی بن سلول الانصاری (ابن ہشام، ۳: ۲۲۰)] کو نائب مقرر کیا۔ وعدے کے مطابق ابوسفیان [دو] ہزار کا لشکر (جس میں پانچ سو کا سوارہ بھی تھا) لے کر مکہ سے روانہ ہوا، مگر دوسرے پڑاؤ [الظہران کے کنارے مقام مَجَنّہ] سے ہی واپس لوٹ گیا اور کہا کہ اس سال جانوروں کے لیے چارے کی کمی ہے، اس لیے لڑائی کرنا مناسب نہیں۔ اسلامی لشکر ۸ روز کے قیام کے بعد بدر سے لوٹ گیا [الحلبی: سیرۃ حلبیۃ، ۵۷۹ تا ۵۸۰]۔

غزوۂ دُومۃ الجَندل: جزیرۃ العرب کے شمالی علاقے کے قبائل نے [دومۃ الجندل کے مقام پر، جو دمشق سے پانچ منزل دور ہے] جمعیت فراہم کر کے شام کی شاہراہ پر کاروانوں کو تکلیف دینا شروع کر دیا تھا [اور وہ مدینہ منورہ پر یلغار کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے (ابن سعد، ۱: ۶۲)]۔ حضورؐ ایک ہزار کا لشکر لے کر [ربیع الاول ۵ھ میں] اس علاقے میں گشت کے لیے تشریف لے گئے۔ [آپ راتوں کو سفر کرتے ہوئے اچانک ان کے سر پر جا پہنچے؛ وہ حواس باختہ ہو کر منتشر ہو گئے]۔ آپؐ نے دومۃ الجندل میں کچھ دن قیام فرمایا اور [مدینہ منورہ پر متوقع حملے کے خطرے کا سد باب کرنے کے علاوہ آپؐ نے] شاہراہ کو قافلوں کے لیے

پر امن بنانے کے بعد مدینہ منورہ مراجعت فرمائی [ابن سعد : طبقات، ۲ : ۶۲].

غزوۂ بنی المُصْطَلِق : شعبان ۵ھ (شرح المواہب، ۲ : ۹۵) یا ۶ھ (ابن ہشام، ۳ : ۳۰۲)] میں بنو خُزاعہ کی ایک طاقت ور شاخ نے حارث بن ابی ضرار کی سربراہی میں مدینہ منورہ پر لشکر کشی کی تیاریاں شروع کر رکھی تھیں۔ [حضور ؐ ایک لشکر کے ساتھ حملہ آور ہوئے۔ بنو مصطلق] نے معمولی سی جھڑپ کے بعد شکست قبول کر کے معافی مانگ لی۔ آپؐ نے انھیں معاف کر دیا۔ اسی سفر میں واقعہ افک [ارک بہ عائشہؓ، ام المؤمنین] پیش آیا [الزرقانی : شرح المواہب، ۲ : ۹۵ تا ۱۰۲)].

اس دور کے واقعات کسی حد تک پچھلے دور کے واقعات سے ملتے جاتے ہیں، مگر ایک فرق نمایاں ہے : اس دور میں قریش مکہ خود تو خاموش تماشائی بنے رہے! جب کہ ان کے حلیفوں کی جانب سے مسلمانوں کے خلاف شرارت جاری رہی [غالباً در پردہ وہی انھیں بغاوت اور سرکشی پر آمادہ کر رہے تھے]۔ اس دور کی سات مہموں میں سے چھے کی کمان حضورؐ نے خود فرمائی؛ صرف ایک مہم کی کمان ایک صحابی کو دی [جس نے ایک قبیلے کی معاندانہ روش کا سدباب کیا] ؛ اس میں باقاعدہ لڑائی کا امکان نہ تھا۔ جن موقعوں پر لڑائی کا امکان تھا، ان میں حضورؐ نے کمان اپنے ہاتھ میں رکھی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ صحابہ کرامؓ کی تربیت کا پروگرام مکمل فرمانا چاہتے تھے ؛ نیز یہ کہ کمان داروں، نائب کمان داروں، بلکہ صف اول کے سپاہیوں تک کو آپؐ کے طرز عمل سے ہدایت حاصل ہوتی رہے۔ اتنی زیادہ مہموں کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ اسلامی سپاہ ہمہ وقت ذہنی اور جسمانی طور پر تربیت کے اعلیٰ معیار پر قائم رہتی۔ اس دور کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ قریش کے قافلوں پر تمام شاہراہیں مسدود ہو گئیں، مگر اسلامی قافلوں کے لیے بہت کم رکاوٹ پیش آتی تھی۔

غزوۂ احزاب یا غزوۂ خندق : [اہل مکہ اور یہود خیبر، جن میں بنو قینقاع اور بنو نضیر کے دو طاقت ور اور زبان آور قبیلے بھی شامل ہو چکے تھے، اہل اسلام کے لیے ایک بار پھر متحد ہو کر میدان عمل میں کود پڑے ؛ چنانچہ] قریش مکہ کے پاس خیبر کے یہودیوں کی سفارت گئی اور انھیں اپنی پوری امداد کا یقین دلایا اور اس بات پر اکسایا کہ وہ مدینے پر حملہ آور ہوں [ابن ہشام، ۳ : ۲۲۵ ببعد) ؛ صرف یہی نہیں بلکہ ایک مشترکہ سفارت مختلف بڑے اور افرادی قوت سے مالا مال قبائل، مثلاً بنو غطفان، قیس عیلان وغیرہ کے پاس گئی اور انھیں اسلامی حکومت کے خلاف اشتعال دلا کر اپنے ساتھ لڑائی میں شامل ہونے کی دعوت دی (کتاب مذکور، ۲۲۶ ؛ سیرۃ حلبیہ، ۳ : ۱۲۹ ببعد)].

شوال ۵ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو خفیہ پیغام کے ذریعے اطلاع ملی کہ قریشی فوج اور ان کے حلیف مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کی غرض سے روانہ ہو چکے ہیں۔ قریشی فوج کی تعداد دس ہزار [ابن سعد، ۲ : ۶۶) یا بیس ہزار (الیعقوبی : تاریخ، ۲ بذیل غزوۂ احزاب)] بتائی گئی ہے۔ اس فوج میں خیبر کے یہودی اور دوسرے قبائل اپنے اپنے لشکر ساتھ لائے تھے۔ اتنے مختلف قبائل کا ایک ہی روز مدینہ منورہ کے باہر جمع ہونا ایک غیر معمولی بات تھی۔ کتنا عرصہ منصوبہ تیار ہوتا رہا ہوگا اور کتنی سفارتیں ادھر ادھر سفر کرتی رہی ہوں گی، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ جن قبائل کے لشکروں کی تفاصیل مؤرخوں نے تحریر کی ہیں وہ یہ ہیں :

نام قبیلہ	فوج کی تعداد	کمان دار کا نام
قریش مکہ	۴۰۰۰	ابوسفیان بن حرب
بنو غطفان		[عُیینہ بن حصن]
بنو اشجع	۴۰۰	[مِسعر بن رُخیلہ]
بنو مرہ	۴۰۰	الحارث بن عوف المری
بنو فزارہ	۱۰۰۰	[عُیینہ بن حصن الفزاری]
بنو اسد	تعداد نامعلوم	[طلیحہ بن خویلد الاسدی]
بنو سلیم	۷۰۰	[سفیان بن عبد شمس]

ان کے علاوہ کچھ دوسرے قبائل [مثلاً بنو سعد ، یہود خیبر] بھی ساتھ تھے ؛ بنو بکر ، جو قریش کے پڑوسی تھے اور احد میں قریش کے ساتھ آئے تھے ، وہ بھی ضرور شامل ہوئے ہوں گے ۔ ایسا اجتماع جزیرۃ العرب نے آج تک نہیں دیکھا تھا ۔ [اس تمام لشکر کو آسانی کے لیے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ان سب کا سپہ سالار ابوسفیان بن حرب تھا (سیرۃ حلبیۃ ، ۲ : ۶۳۰ ، ۶۳۱ ؛ ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۶۶)] .

خندق : حضور اقدس ؐ نے اس بار فیصلہ کیا کہ مدینہ کا دفاع شہر کے اندر رہ کر کیا جائے ؛ چنانچہ اس غرض سے نو ہزار گز لمبی خندق کھودنے کا فیصلہ کیا گیا [رک بہ خندق] ۔ اس خندق کو آبادی اور باغات کے ساتھ ملا کر نہایت محکم دفاعی خط (Line) تیار کیا گیا ۔ لشکر اسلام کی تعداد تین ہزار تھی ، مگر ان میں منافق بھی ضرور تھے ۔ وقت بھی بہت کم تھا ۔ چنانچہ ۶ دن کے عرصے میں (ابن سعد : الطبقات ؛ ۶ ہزار گز ، یعنی ساڑھے تین میل لمبی خندق کھودی گئی ۔ ہر شخص کو دو دو ذراع (ہاتھ) خندق کھودنے کا کام سپرد ہوا ۔ تنہا حضرت سلمان ؓ نے پانچ ہاتھ خندق کھودی (الواقدی)] ۔ اس کا دفاع بڑی سوچ بچار اور تدبر سے ہی کیا جا سکتا تھا ؛ اس طویل خندق پر اگر کم از کم دو تین ہزار کا لشکر چوکنا ہو کر پہرہ نہ دیتا تو مخالف لشکر جب چاہتا خندق عبور کر سکتا تھا ۔ قریش مکہ اور ان کے حلیف مدینہ منورہ پہنچ کر [بئر رومہ پر مدینے کے شمال مغرب میں وادی العقیق میں] خیمہ زن ہوئے ؛ [جب کہ بنو غطفان اور ان کے ہمراہی وادی النعمان کے پاس ذَنَب نقمی سے جبل احد تک پھیل گئے (ابن ہشام ، ۳ : ۲۳۰)] ۔ قریشی لشکر کے پہنچنے پر آپ ؐ نے بھی اپنے لشکر کو خندق کے مختلف حصوں پر متعین فرمایا اور اپنا صدر مقام جبل سلع کی مغربی ڈھلوان پر قائم فرمایا ۔ یہاں سے خندق کا بیشتر حصہ نگاہوں کے سامنے رکھا جا سکتا تھا ؛ محفوظہ (Reserve) کو بھی قریب ہی متعین کیا گیا ؛ عورتوں اور بچوں کو محفوظ قلعہ [آطام] میں اکٹھا کیا گیا ، مگر افرادی قلت کی وجہ سے ان کی حفاظت کے لیے فوج مہیا نہ کی جا سکی ۔ خندق جنگ (Trench Warfare) کے لاتعداد مسائل ہوتے ہیں ، جو خندق کھودنے اور اس کے تیار ہو جانے کے بعد کماندار کی توجہ کے مستحق ہوتے ہیں ، خندق کا محل وقوع ، زمین کے نشیب و فراز کے پیش نظر سمت کی تبدیلیاں ، خندق کی گہرائی ، چوڑائی اور کمین گاہ کی تفصیل ، مختلف حصوں کی ذمے داری کے باعث کمان داروں کا چناؤ اور محفوظہ کے مقام سے مختلف حصوں کے راستے ، یہ سب اس طرح کے سوالات ہیں ، جن کا جواب صرف کمان دار ہی دے سکتا ہے ۔ اور وہی ان کے متعلق فیصلہ کرنے کا مجاز ہوتا ہے ۔ صحابہ کرام ؓ تربیت میں فن حرب و ضرب کی مشق کر رہے تھے ۔

قریشی لشکر کی پیش قدمی : قریشی لشکر نے تین دن تک انتظار کیا اور پھر وہ مدینہ منورہ کی طرف بڑھا ۔ جب یہ لشکر خندق کے پاس پہنچا تو

سامنے پانچ گز گہری اور دس گز چوڑی خندق اور اس کے پار کھودی ہوئی مٹی کی فصیل نما کمین گاہ دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ [قریش مکہ کے لیے خندق ایک نئی چیز تھی: چنانچہ ابوسفیان نے اپنے ایک مکتوب میں، جو اسی موقعے پر لکھا گیا، شدید حیرت کا اظہار کیا اور کہا کہ خندق کھودنا آپؐ کو سکھا کس نے دیا؟ (الوثائق السیاسیہ، شمارہ ۲، ۷)۔ قریش مکہ نے متعدد مرتبہ اس کو پھلانگنے کی کوشش کی، مگر دوسری طرف سے پتھروں اور تیروں کی شدید بارش کی وجہ سے ان کی کوئی پیش نہ جا سکی (الواقدی: کتاب المغازی، ۳۶۵ ببعد)]۔

اسلامی لشکر کو ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا تھا: پورے محاذ کی شب و روز گشت جاری رہتی۔ غزوۂ خندق کے دوران میں حٰم لا ینصرون [ابن ہشام، ۲ : ۲۲۷] کا لفظ باہمی پہچان (code word) کے لیے مقرر کیا گیا تھا تاکہ کہیں دو گشتی (Patrols) آپس میں الجھ کر اتلاف (casualties) کا باعث نہ بنیں۔ خندق پر پہنچنے کے دوسرے دن کفار کے متحدہ لشکر نے کئی مقامات پر حملہ بولنے کی کوشش کی، مگر دفاعی دستے اس خوبی سے متعین کیے گئے تھے کہ دشمن کو کہیں بھی کامیابی نہ ہو سکی، [مگر دشمن مایوس نہ ہوا۔ بالآخر اسے ایک روز] ایک مقام ایسا مل گیا، جہاں سے خندق کا پاٹ کم تھا اور سرپٹ گھوڑا خندق کے پار کود سکتا تھا: عکرمہ بن ابی جہل ایک چھوٹے سے دستے کے ساتھ [جس میں عمرو بن عبد وُد جیسا نامی پہلوان بھی شامل تھا]، اس مقام سے خندق عبور کر گیا۔ حضورؐ نے فوراً حضرت علیؓ کو ایک دستے کی کمان دے کر اس کے مقابلے کے لیے روانہ کیا: عمرو بن عبد ود نے مسلمانوں کو مبارزت کی دعوت دی۔ حضرت علیؓ نے یہ دعوت قبول کی اور اسے قتل کر دیا۔ یہ دیکھ کر عکرمہ بن ابی جہل اور اس کے ساتھی بھاگ کھڑے ہوئے، مگر نوفل [بن عبداللہ] کا گھوڑا خندق پار نہ کر سکا۔ حضرت زبیرؓ نے خندق میں اتر کر اس کا سر قلم کر دیا۔ مکی کمان دار نے [عمرو بن عبد ود] کی لاش کی واپسی کے لیے دس ہزار درہم کی پیشکش کی، مگر رحمۃ للعالمینؐ نے اس کی لاش بغیر کسی معاوضے کے لوٹا دی [الواقدی، ۲ : ۳۷۰ تا ۳۷۱؛ الزرقانی: شرح المواہب، ۲ : ۱۱۳]۔ دوسرے دن پھر پورا متحدہ لشکر جگہ جگہ حملے کرتا رہا، مگر ناکام رہا۔ صرف ایک مقام پر معمولی سا خدشہ پیدا ہوا تھا کہ شاید دفاع کمزور ثابت ہو، [مگر صحابہ کرامؓ کے بروقت اقدام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خوش تدبیری سے معاملہ رفع دفع ہو گیا (الواقدی، ۲ : ۳۶۸)]۔ خالد بن ولید، عمرو بن العاص اور عکرمہ بن ابی جہل بار بار حملے کرتے رہے، مگر بے سود۔

ان کمانداروں نے بعد کے زمانے میں اپنی معاصر دنیا کے بہترین سپہ سالاروں کو بار بار شکست دی، مگر ان کے جوہر تو اسی وقت کھلے جب قبول اسلام کے بعد انھوں نے حضورؐ کی تربیت میں کمانداری اور سپہ سالاری کے کامیاب اصول سیکھ لیے تھے: اس سے قبل اپنی صلاحیتوں کے باوصف وہ ایک ناکام فوج کے ناکام کماندار ثابت ہوئے۔

جس روز قریش کا متحدہ لشکر احد کے قریب پہنچا تھا، اسی رات خیبر کے یہودی سردار حیی بن اخطب [سردار بنو نضیر] نے مدینہ منورہ کے مضافات میں رہنے والے یہودی قبیلے بنو قریظہ کے سردار کعب بن اسد سے ملاقات کی اور اس نے کعب بن اسد کو بغاوت، بھی متحدہ لشکر کی مدد

کے لیے، اسلامی فوج پر اندر سے حملہ کرنے پر آمادہ کر لیا۔ جب اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ کیا ہوا معاہدہ یاد دلایا گیا تو اس نے کہا: ہمارا محمدؐ کے ساتھ کوئی معاہدہ یا سمجھوتہ نہیں ہے [الواقدی، ۲: ۴۵۸]۔ ایسے ماحول میں شہر کا دفاع مزید مشکل ہو گیا تھا، مگر حضور اقدسؐ کے پائے ثبات میں لغزش آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ بنو قریظہ کے یہودیوں نے اپنے قلعے کی جانب سے اسلامی دفاع کو کمزور کرنے کی کوشش کی؛ اسی جانب وہ قلعہ تھا جس میں عورتوں اور بچوں کو رکھا گیا تھا۔ ایک شام حضورؐ کی پھپھی حضرت صفیہؓ نے دیکھا کہ ایک آدمی مشکوک طریقے سے قلعے کے قریب چل پھر رہا ہے تو وہ تنہا نیچے اتریں اور ڈنڈے سے اس کا کام تمام کر دیا۔ اس کے بعد کسی یہودی کو ہمت نہ پڑی کہ اس سمت نظر اٹھا سکے۔ [جب آپؐ کو اس کا علم ہوا تو آپؐ نے دو سو اور تین سو افراد پر مشتمل دو دستے اس علاقے میں گشت کے لیے مامور فرما دیے تاکہ کسی ناگہانی صورت حال کا سامنا کر سکیں (الواقدی، ۲: ۴۶۰)۔ ایسی ہی ایک جماعت سے، جو دو سو افراد پر مشتمل تھی اور جس کی قیادت حضرت سلمہؓ بن اسلم کر رہے تھے، یہودیوں کی ایک جماعت سے تصادم ہو گیا؛ باہمی تیروں کے تبادلے کے بعد یہودی فرار ہو گئے (کتاب مذکور، ص ۴۶۲)]۔ یہودیوں نے باہمی مشورے سے ابوسفیان کو کہلا بھیجا کہ وہ اس شرط پر مربوط حملے میں حصہ لیں گے] کہ کچھ قریشی رؤسا اس بات کی ضمانت میں ان کے حوالے کر دیے جائیں کہ وہ انھیں چھوڑ کر نہیں جائیں گے]۔ اتفاق کی بات کہ یہودیوں کی اس تجویز کی خبر حضورؐ تک پہنچ گئی؛ آپؐ نے اپنے ایک جاسوس تک یہ خبر پہنچا دی کہ یہودی اس لیے قریشی رؤسا کا مطالبہ کر رہے ہیں تاکہ انھیں وہ یرغمال بنائیں۔ جاسوس نے فوراً یہ خبر ابوسفیان تک پہنچا دی۔ اسے اس پر یقین آ گیا؛ خدا کی قدرت کہ اسی رات سخت آندھی آئی اور خیمے الٹنا اور اڑنا شروع ہو گئے؛ سامان تہ و بالا ہو گیا اور لوگ سردی سے ٹھٹھرنے لگے۔ [بہت سے قبیلے یہ حالت دیکھ کر پہلے ہی کوچ کر گئے تھے]۔ ابوسفیان نے یہ حالت دیکھی تو اس نے یہ اعلان کر دیا کہ ہر کوئی اپنے اپنے علاقے کو لوٹ جائے۔ [اس طرح وہ آندھی، جو پورے جزیرۂ عرب سے اٹھی تھی خیروخوبی کے ساتھ دب دبا گئی [نیز رک بہ خندق]۔ دوسری صبح متعدد لشکروں کے معسکر خالی تھے۔ حضورؐ نے یہ دیکھ کر فرمایا: آئندہ قریش ہم پر حملہ آور نہ ہوں گے، بلکہ ہم ان پر حملہ کریں گے۔

غزوات کا چوتھا دور: غزوۂ خندق کے بعد سے غزوات نبوی کا چوتھا دور شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے، بالخصوص غزوۂ خندق کے دوران میں، قریشی جارحیت اپنے عروج پر رہی۔ یہ دور جو غزوۂ بنو قریظہ سے شروع ہوا، صلح حدیبیہ پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ چونکہ غزوات نبوی کا مقصد ہی صلح و امن کی فضا پیدا کرنا تھا؛ [اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اس معاہدہ کے بعد سے عالمگیر سطح پر اسلام کی ظاہری اور معنوی فتوحات کا آغاز ہوا، جو حجۃ الوداع پر انتہا کو پہنچ گیا]۔ اسی وقت الہ العلمین کی جانب سے تکمیل دین کی خوشخبری بھی سنائی گئی۔

مدینہ منورہ کو بظاہر بیرونی دشمنوں سے نجات حاصل ہو چکی تھی، مگر اس واقعہ یہ تھا کہ مدینہ منورہ کے اندر ابھی وہ دشمن (بنو قریظہ) موجود تھے جنھوں نے نہایت نازک وقت میں

خطرناک صورت حال پیدا کر دی تھی۔ اس قبیلے کا ہر فرد [غداری اور بغاوت کے جرم] میں موت کی سزا کا حق دار تھا۔ [ہر ملک اور ہر قانون میں] جاسوسوں اور باغیوں کے لیے امان اور معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

بنو قریظہ کے قلعے کا محاصرہ: غزوہ خندق سے لوٹنے کے فوراً بعد آپؐ نے بنو قریظہ کے قلعے کا محاصرہ کرنے کا حکم دے دیا۔ ان کا قلعہ مضبوط تھا اور ان کے پاس ہتھیار بھی کافی تھے، مگر محاصرہ برداشت کرنے کی ہمت جلد ہی ختم ہو گئی۔ بالآخر انھوں نے درخواست کی کہ ان کے پرانے حلیف قبیلۂ بنو اوس کے سردار، حضرت سعدؓ بن معاذ کو ان کے معاملے کا حکم بنایا جائے اور ان کے فیصلے کے مطابق ان سے سلوک کیا جائے۔ حضرت سعدؓ غزوۂ خندق کے دوران میں زخمی ہو گئے تھے اور اب مسجد نبوی کے صحن میں نصب شدہ خیمے میں زیر علاج تھے۔

حضورؐ نے بنو قریظہ کی درخواست قبول کر لی اور حضرت سعدؓ بن معاذ کے لیے خچر روانہ کی۔ جب وہ آپؐ کی خدمت میں پہنچے تو ان کے قبیلہ بنو اوس نے ان سے سفارش کی کہ وہ بنو قریظہ کے حق میں فیصلہ دیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ سعدؓ کے لیے وقت آ گیا ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں کسی ناراضگی کی پروا نہ کرے۔ حضرت سعدؓ نے فیصلے کا آغاز کرتے ہوئے فریقین کے مجمع سے پوچھا: کیا تم اللہ کے نام پر وعدہ کرتے ہو کہ سب میرا فیصلہ قبول کرو گے؟ دونوں فریقوں کی طرف سے اثبات میں جواب آیا تو حضرت سعدؓ بن معاذ نے جو فیصلہ سنایا وہ یہ ہے: جو مرد ہتھیار بند ہونے کے قابل ہیں انھیں قتل کیا جائے؛ ان کا مال و متاع ضبط کر لیا جائے اور عورتیں اور بچے قیدی بنا لیے جائیں [(ابن ہشام: سیرۃ، ۳: ۲۳۹ تا ۲۵۱)۔ حضرت سعدؓ کا یہ فیصلہ موسوی شریعت کے عین مطابق تھا (دیکھیے استثناء، ۲۰: ۱۰)]۔ اس فیصلے پر عمل کیا گیا، مگر جنھوں نے اسلام قبول کر لیا ان کی سزا معاف کر دی گئی۔

غزوۂ بنی لحیان: بنو لحیان نے رجیع کے مقام پر مبلغین اسلام کو دھوکے سے قتل کر دیا تھا [رک بہ الرَّجیع]۔ جمادی الاولی ۶ھ میں اطلاع ملی کہ وہ اس مرتبہ مدینہ منورہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ حضورؐ نے دو سو سوار ساتھ لیے اور ان کے علاقے [عُسفان] کا رخ کیا، مگر انھیں بر وقت آپؐ کی آمد کی اطلاع مل گئی اور وہ تیزی سے پہاڑوں میں غائب ہو گئے۔ اس غزوے کا نام غزوۂ بنی لحیان ہے [(ابن سعد: الطبقات، ۲: ۷۸ تا ۸۰)]۔

غزوۂ غابہ: دوسرے ہی مہینے عُیینہ بن حصن الفزاری نے، جو پہلے بھی مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کر چکا تھا اور غزوہ خندق میں بھی شامل تھا، مدینے کی ایک چراگاہ پر چھاپہ مارا اور [دو آدمی] قتل کیے اور [بہت سے] اونٹ ہانک کر لے گیا۔ [حضرت سلمہ بن عمرو] بن الاکوع نے اس موقع پر بے مثال شجاعت کا مظاہرہ کیا اور تن تنہا دشمن کا تعاقب کیا (ابن ہشام)۔ اطلاع ملنے پر حضورؐ نے لڑاکا گشت حضرت سعدؓ بن زید کی زیر کمان روانہ کی۔ حضورؐ خود بھی اس کے بعد روانہ ہوئے۔ حضرت سعدؓ نے دشمن تک پہنچ کر کچھ اونٹ چھین لیے، مگر دشمن کچھ جانوروں کو لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس مہم کو غزوۂ ذی قَرَد اور غزوہ غابہ کہا گیا ہے [ابن ہشام: سیرۃ، ۳، ۲۹۳ تا ۳۰۱]۔

چار دیگر سرایا: اسی مہینے آپؐ نے چار سرایا روانہ فرمائے۔ پہلا سریہ حضرت عُکّاشہؓ بن محصن الاسدی کی کمان میں چالیس مجاہدوں پر

مشتمل بنو اسد کے خلاف [مقام الغمر کی طرف] روانہ کیا گیا ۔ دشمن یہ خبر سن کر منتشر ہو گیا اور کوئی لڑائی نہیں ہوئی [(ابن سعد، ۲ : ۸۴ تا ۸۵)] ۔ دوسرا سریہ حضرت محمدؓ بن مسلمۃ کی زیر قیادت دس مجاہدوں پر مشتمل [ذُوالقَصَّہ مدینہ منورہ سے ۲۴ میل کے فاصلے پر] روانہ کیا گیا ۔ بنو ثعلبہ نے ایک سو افراد کی جمعیت کے ساتھ کمین گاہ میں بیٹھ کر ان میں سے نو مجاہدوں کو شہید کر ڈالا؛ حضرت محمدؓ بن مسلمہ زخمی حالت میں مدینہ منورہ پہنچائے گئے ۔ اس واقعے کی اطلاع ملتے ہی تیسرا سریہ حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح کی زیر کمان چالیس مجاہدوں پر مشتمل بنو ثعلبہ کے خلاف روانہ کیا گیا ۔ بنو ثعلبہ اپنا مال و اسباب چھوڑ کر بھاگ گئے ، جو ضبط کر کے مدینہ منورہ پہنچا دیا گیا ۔ چوتھا سریہ اسی مہینے میں حضرت زیدؓ بن حارثہ کے زیر کمان بنو سُلیم کے علاقے [الجَموم] میں روانہ کیا گیا؛ بنو سلیم مسلمانوں کے خلاف ہر بڑی لڑائی میں قریش کے حلیف رہے تھے؛ اس مرتبہ پھر حملے کی تیاریوں میں مصروف تھے ۔ سریہ کامیاب رہا ۔ حضرت زیدؓ نے ان کے کچھ آدمی قیدی بنا لیے ، مگر جب انہوں نے یقین دلایا کہ وہ مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں نہیں کر رہے تھے تو انہیں معافی دے دی گئی اور تمام قصور معاف کر دیے گئے [کتاب مذکور ، ۸۶].

سریۂ طَرَف : جمادَی الآخرۃ ۶ھ میں بنو ثعلبہ کو سزا دینے کے لیے حضرت زیدؓ بن حارثہ کی کمان میں [پندرہ افراد پر مشتمل] ایک لڑاکا گشت روانہ کی گئی ؛ اس بار بھی وہ پہاڑوں میں منتشر ہوگئے ۔ اس مہم کا نام سریہ [زید بن حارثہ الی] الطرف ہے ۔ [طرف مدینہ منورہ سے ۳۶ میل کے فاصلے پر ہے] .

سریہ وادی القری : رجب ۶ھ میں حضرت زیدؓ بن حارثہ کو بارہ مجاہد دے کر وادی القری کے علاقے میں روانہ کیا گیا ۔ اس علاقے کے قبائل نے کچھ عرصہ قبل حضرت زیدؓ بن حارثہ کے نو ساتھیوں کو شہید کر دیا تھا اور وہ خود بھی زخمی ہو گئے تھے ۔ [یہ قافلہ ، جس پر حملہ کیا گیا تھا ایک تجارتی قافلہ تھا ، جو وادی القری کے راستے شام کو جا رہا تھا ؛ مقام وادی القری کے قبائل نے اس قافلے پر حملہ بول دیا تھا (الواقدی ، ۲ : ۵۶۴)] ۔ جب وہ صحت مند ہو گئے تو خود انہیں کو اس علاقے میں بھیجا گیا کہ قصور وار قبیلے کو سزا دیں ۔ وہ اس مقصد میں کامیاب ہو گئے اور اس دور دراز علاقے میں مجاہدوں کی مدد سے امن و امان قائم کیا ۔ بار بار سرایا ان کی کمان میں بھیجے جانے سے ضرور یہ خیال پیدا ہوا ہو گا کہ جلد ہی حضرت زیدؓ کو کوئی اہم ذمہ داری سونپی جائے گی ۔ [جمادی الآخرۃ ۶ھ میں حضرت زیدؓ کی زیر قیادت ایک اور مہم حِسْمٰی کی طرف روانہ کی گئی ، جہاں بنو جذام کے کچھ لوگوں نے آپؐ کے قاصد حضرت دِحیہؓ کلبی پر لوٹ ماری تھی اور انہیں تمام مال و متاع سے محروم کر دیا تھا ۔ حضرت زیدؓ نے نہایت سرعت اور دانش مندی سے علاقے پر حملہ کیا اور مجرموں کو سزا دی ؛ ان کے اموال ضبط کر لیے ، جو معافی مانگنے پر انہیں واپس کر دیے گئے (ابن سعد ، ۲ : ۸۸ ؛ الواقدی : المغازی ، ۲ : ۵۵۵ تا ۵۶۰)].

دیگر سرایا : اسی مہینے میں حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف انصاری کی زیر کمان ایک تبلیغی گشت دُومۃ الجَندل کے علاقے [بنو کلب کی طرف روانہ کی گئی] ؛ یہ سریہ کامیاب رہا اور اس کے نتیجہ میں بنو کعب کے سردار [الاصبغ بن عمرو الکلبی] نے اپنے قبیلے کے بہت سے افراد سمیت

اسلام قبول کر لیا [اور اپنی بیٹی تُماضِر بنت اصبغ کو حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف سے بیاہ دیا (ابن سعد ، ۲ : ۸۹)]۔ اسی مہینے میں حضرت علیؓ کی زیر کمان ایک گشت روانہ کی گئی : اطلاع ملی تھی کہ اس علاقے میں بنو سعد مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے سلسلے میں [یہود خیبر سے ساز باز رکھتے ہیں اور انہیں مدد بہم پہنچاتے ہیں] ؛ اطلاع ملتے ہی بنو سعد اپنے کچھ جانوروں کو چھوڑ کر پہاڑوں میں غائب ہو گئے۔ حضرت علیؓ کی اس مہم کا نام سریۂ فَدَک ہے۔

اگلے مہینے یعنی شوال ۶ھ میں حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کی کمان میں تیس مجاہدین کو اسیر بن [زارم ؛ بقول بعض رازم ؛ نیز رزام ؛ ابن کثیر نے یسیر بن رِزام یہودی لکھا ہے ، السیرۃ النبویہ ، ۳ : ۴۱۸)] کی طرف روانہ کیا گیا۔ ابو رافع سلّام بن ابی الحُقیق کے قتل کے بعد اسیر یہودیوں کا امیر بنا تھا۔ وہ ان دنوں بنو غطفان وغیرہ کے ساتھ مل کر دوبارہ مدینہ منورہ پر حملے کی تدبیریں کر رہا تھا ؛ تصدیق ہو جانے پر آپؐ نے یہ مہم روانہ فرمائی۔ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نے ان کو بارگاہ نبوی میں حاضر ہونے کے لیے کہا ؛ چنانچہ تیس یہودیوں کے ساتھ وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہونے پر رضامند ہو گیا۔ یہ تمام یہودی مسلمانوں کے ساتھ سواریوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ قافلہ جب قُرقرۃ ثبار [بقول دیگر نیار ؛ خیبر سے چھے میل کی مسافت ہے] میں پہنچا تو یہودیوں نے دھوکے سے مسلمانوں کو قتل کرنا چاہا۔ بروقت مطلع ہونے پر مقابلہ ہوا ، جس میں اسیر اور اس کے ۲۸ ساتھی مارے گئے (ابن سعد ، ۲ : ۹۲)]۔ اسی مہینے کُرزؓ بن جابر الفہری کی زیر کمان بنو عرینہ کے تعاقب میں ایک گشت روانہ کی گئی ، جو کامیاب رہی۔ [انہوں نے مدینہ منورہ کے اونٹوں پر حملہ بول دیا تھا اور ان کے چرواہے حضرت یسارؓ کو انتہائی بے دردی سے قتل کر دیا تھا اور تمام اونٹ ہانک کر لے گئے تھے ؛ چنانچہ ان کے قصاص میں ان کو قتل کر دیا گیا (شرح المواہب ، ۲ : ۱۸۱)]۔

مجموعی طور پر اگر اس دور کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ متحدہ لشکر کی ناکامی کے بعد اب حملوں کا امکان کم ہو گیا تھا ، مگر ابھی تک مکمل طور پر امن و امان قائم نہیں ہوا تھا ؛ چونکہ اب صحابہ کرامؓ تجربہ حاصل کر چکے تھے ، اس لیے اب آپؐ کی زیر کمان مہموں میں کمی آ گئی تھی۔ [اب آپؐ زیادہ تر وقت مدینہ منورہ میں رہ کر کمان کرنے اور اہل اسلام کی روحانی و فوجی تربیت کرنے میں بسر فرمانے لگے تھے]۔ اب صحابی کمان داروں کی تربیت اس قدر ہو چکی تھی کہ انہیں زیادہ سے زیادہ ذمہ داری سونپی جا سکتی تھی۔ ریاست مدینہ کی روز افزوں وسعت کی وجہ سے حضورؐ کو صدر مقام میں رہ کر بین الاقوامی سیاسیات اور انتظامی امور کی طرف زیادہ توجہ دینا ہوتی تھی۔

صلح حدیبیہ : اس دور کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اہل مکہ کی دونوں اہم تجارتی شاہراہیں مسدود ہو چکی تھیں ، جس کے نتیجے میں انہیں اقتصادی ضرب محسوس ہونا شروع ہو گئی ہو گی۔ اس دور کے مبصر کی بصیرت یہ بتا رہی ہو گی کہ اب مدینہ پیش قدمی کی طرف توجہ دے گا ، البتہ اگر حضورؐ کے اصل مقصد ، یعنی تبلیغ اسلام کی طرف توجہ دی جائے تو یہ سمجھنا آسان ہے کہ آپؐ کا یہ عظیم مقصد ، صرف زمانۂ امن میں حاصل ہو سکتا ہے۔ [آپؐ کو اور مہاجرینؓ کو مکہ مکرمہ چھوڑے تقریباً چھ سال ہو چکے تھے ؛ اپنا وطن بھلا کس کو پیارا نہیں ہوتا اور پھر مکہ تو

صرف وطن ہی نہیں بلکہ اہل اسلام کا قبلہ و کعبہ بھی تھا۔ اس بنا پر تمام صحابۂ کرامؓ کے دل اس کی زیارت کو مچلتے تھے۔ ۶ھ میں، جب کہ مدینہ منورہ کے آس پاس کے قبائل کے حملہ کرنے کا امکان کم ہو گیا تو آپؐ نے مشیت ایزدی (۴۸ [الفتح] : ۲۷) سے موسم حج سے پہلے عمرہ کرنے کا ارادہ فرمایا؛ چونکہ مکہ اصولی طور پر جائے امن تھا اور قریش اپنے کسی دشمن کو بھی وہاں آنے اور عمرہ یا حج ادا کرنے سے روکنے کے مجاز نہ تھے، اس لیے آپؐ کا یہ قصد خلاف اصول بھی نہ تھا۔ آپؐ کے اس ارادے کی خبر مشہور ہوئی تو چودہ سو صحابہ کرامؓ تیار ہو گئے۔ آپؐ نے اعلان فرمایا کہ اس سفر میں تلوار کے سوا کوئی ہتھیار ساتھ نہیں لے جایا جائے گا اور قربانی کے جانور آگے آگے ہانکے جائیں گے (ابن ہشام، ۳ : ۳۲۱ ببعد)؛ چنانچہ ذوالقعدہ ۶ھ میں آپؐ مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے؛ روانگی سے قبل آپؐ نے ہر ممکن ذریعے سے اس سفر کے پر امن پہلو کو مشتہر کیا۔

قریش کو صلح کا ماحول منظور نہ تھا؛ وہ روز اول ہی سے دین اسلام کے وجود کو تسلیم کرنے سے منکر تھے اور اسے موقع نہیں دینا چاہتے تھے کہ وہ کسی طرح پھلے پھولے؛ اس لیے کہ ان کے خیال میں اگر یہ دین کبھی رائج ہو گیا تو پھر مسلمان طاقت پکڑ لیں گے اور ان پر غالب آ جائیں گے۔ قریش مکہ کی طرف سے اس طویل جنگ کی تہ میں اس انسانیاتی خدا پرستانہ نظام کا خوف تھا جس کو مان لینے سے اس دین کے پیرو چند افراد کو ان پر غلبہ حاصل ہونے کا امکان تھا۔ جب آپؐ [مقام عُسفان، جو جُحفہ [رک بہ میقات] اور مکہ کے درمیان ہے، پر پہنچے تو بِشر [بقول دیگر بُسر] بن سفیان الکعبی نے بتایا کہ اہل مکہ [کو آپؐ کی تیاری کا حال معلوم ہو گیا ہے اور انہوں نے تہیہ اور عہد کر رکھا ہے کہ وہ کسی صورت میں مسلمانوں کو مکہ مکرمہ میں داخل نہ ہونے دیں گے [ابن ہشام، ۳ : ۳۲۲)]؛ مزید پتا چلا کہ اہل مکہ کا [دو صد افراد پر مشتمل] سوارہ خالد بن ولید [یا عکرمہ ابن ابی جہل] کی زیر کمان [کُراع الغَمیم] کے مقام پر دفاعی محاذ کی اگلی چوکی کے طور پر راستہ روکے کھڑا ہے۔ حضورؐ کو یہ سن کر سخت صدمہ ہوا اور آپؐ نے فرمایا: افسوس! قریش کو جنگ نے کہیں کا نہ چھوڑا۔ ان کا کیا نقصان تھا اگر وہ مجھے عربوں سے نمٹنے کے لیے چھوڑ دیتے۔

اہل مکہ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ جونہی حضورؐ کی مدینہ منورہ سے روانگی کی خبر سنی اپنے حلیف قبائل کو بلا بھیجا اور پورے جوش و خروش سے مرنے مارنے پر آمادہ ہو بیٹھے۔

حدیبیہ: حضور اقدسؐ نے مکی سوارہ کی [کراع الغمیم] میں موجودگی کی خبر سن کر راستہ بدل دیا اور غیر معروف راستوں سے ہوتے ہوئے مکہ مکرمہ سے تقریباً ۹ میل [ابن سعد، ۲ : ۹۶]، مکہ مکرمہ اور جدہ کے درمیان جنوب کی طرف، حدیبیہ کے مقام پر فروکش ہو گئے۔ حضورؐ کے اس طرح مکہ کی دہلیز تک پہنچ جانے سے اہل مکہ میں کھلبلی مچ گئی۔ اگرچہ دستور کے مطابق [اہل مکہ مسلمانوں کو مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے نہیں روک سکتے تھے، لیکن اہل اسلام کے مقابلے میں یہ لوگ تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر مرنے مارنے پر تل بیٹھے]؛ چنانچہ انہوں نے اپنی فوج کو حدیبیہ اور مکے کے درمیان متعین کر دیا، مگر فی الحقیقت لڑنے سے خائف بھی تھے، اس لیے گفت و شنید کی کوششیں شروع کر دیں۔ سب سے پہلے قبیلہ خُزاعہ کا سردار [بُدیل بن وَرقاء الخزاعی]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور کوشش کی کہ حضورؐ مدینہ واپس چلے جائیں۔ بدیل پر حضورؐ کی گفتگو اور حسن اخلاق کا اتنا اثر پڑا کہ [اس نے واپس جا کر قریش مکہ کو کہا کہ آپؐ کے عمرہ ادا کر لینے میں کیا حرج ہے، کیونکہ آپؐ کا مقصد قطعی طور پر لڑائی نہیں ہے، مگر قریش نے بدیل کا مشورہ نہ مانا، الٹا اسے متہم کرنے لگے (ابن ہشام، ۳ : ۳۲۵)]۔

قریش نے اس کے بعد علی الترتیب مکرز بن حَفص بن الاَخیف، الحُلیس بن علقمہ یا ابن زبّان کو آپؐ کی خدمت میں بھیجا تاکہ وہ آپؐ کو واپس جانے پر آمادہ کر سکیں؛ مؤخرالذکر آپؐ کے ان اونٹوں کو دیکھ کر بہت متأثر ہوا جو آپؐ حرم میں ذبح کرنے کے لیے لائے تھے؛ چنانچہ اس نے قریش مکہ کو آپؐ کو عمرہ کرنے کی اجازت دینے پر آمادہ کرنا چاہا، مگر وہ نہ مانے۔ اس کے بعد] طائف کے سردار عُروہ بن مسعود الثقفی کو روانہ کیا گیا؛ عروہ ابوسفیان کا داماد بھی تھا۔ وہ بھی ناکام رہا اور واپس جا کر اہل مکہ کو مشورہ دیا کہ جنگ سے احتراز کریں ورنہ مسلمان مکہ پر قبضہ کر لیں گے۔ اہل مکہ نے پچاس آدمی روانہ کیے کہ مسلمانوں کی جماعت میں داخل ہو کر (معاذ اللہ) حضورؐ کو قتل کر دیں۔ ان سب کو پکڑ لیا گیا، ان کے ہتیار لے لیے گئے، مگر خود انہیں معاف کر دیا گیا۔ [عروہ کے بعد قریش کی سفارت کا سلسلہ منقطع ہوا تو آپؐ نے معاہدۂ صلح کی سلسلہ جنبانی کرتے ہوئے پہلے خِراش بن امیہ الخزاعی کو اپنے اونٹ پر مکہ مکرمہ بھیجا؛ قریش نے ان کے اونٹ کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور خراش کو بھی قتل کرنا چاہتے تھے مگر احابیش [رکّ بآں] نے انہیں قتل ہونے سے بچا لیا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ کے مشورے سے حضرت عثمانؓ کو روانہ فرمایا۔ حضرت عثمانؓ تین دن تک نہ لوٹے اور مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ انہیں قتل کر دیا گیا ہے۔ سفیر کا قتل ریاست کی آزادی و خود مختاری کے خلاف جارحانہ عمل کے مترادف ہوتا ہے؛ حضورؐ نے تمام صحابہؓ کو جمع کیا (اور تمام صحابہ کرامؓ سے خون عثمانؓ کے لیے عزم شہادت پر بیعت (رکّ بآں) لی۔ اس بیعت کو بیعت رضوان بھی کہا گیا ہے اور قرآن کریم (۴۸ [الفتح]: ۱۸ ببعد) میں اس کی مدح و ستائش کی گئی ہے [(رکّ بہ حدیبیہ)]۔ تمام صحابہ کرامؓ نے بیعت رضوان میں شرکت کی۔ مکہ کے جاسوسوں نے جب یہ اطلاع مکہ مکرمہ پہنچائی تو قریش کو صورت حال کی نزاکت کا احساس ہوا، وہ عزم شہادت کی اس بیعت کا مفہوم بخوبی سمجھتے تھے؛ چنانچہ انہوں نے نہ صرف حضرت عثمانؓ کو رہا کر دیا بلکہ سہیل بن عمرو کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معاہدے کے لیے بات چیت کرنے اور شرائط صلح طے کرنے کے لیے بھیجا۔ سہیل بدر کے قیدیوں میں شامل تھا اور اس نے فدیہ دے کر رہائی حاصل کی تھی۔ [معاہدے کی شرائط طے ہونے میں کافی ردو قدح پیش آئی (ابن ہشام، ۳ : ۳۳۱)]۔ پھر جب شرائط طے ہو گئیں تو قریش کی طرف سے معمولی معمولی باتوں، مثلاً بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے شروع میں لکھنے اور آپؐ کا نام محمد رسول اللہ کے لکھنے پر اعتراض کیا گیا۔ آپؐ قریش کو کوئی موقع نہیں دینا چاہتے تھے، اس لیے آپؐ نے ان کی آرا کو ملحوظ رکھا۔

صلح حدیبیہ کی شرائط: صلح حدیبیہ کی شرائط یہ تھیں: (۱) دس سال کے لیے باہمی جنگ بند کی جائے گی؛ [اس دوران میں دونوں فریق ایک دوسرے سے پوری طرح امن و آشتی سے رہیں گے]؛ (۲) جو کوئی حضرت محمد صلی اللہ علیہ و

آلہ وسلم کی طرف سے اس معاہدے میں شریک ہونا چاہے وہ ایسا کر سکتا ہے اور جو قریش مکہ کی طرف سے اس معاہدے میں شامل ہونا چاہے تو وہ بھی شامل ہو سکتا ہے] ؛ (۳) اگر کوئی شخص اپنے سرپرست کی اجازت کے بغیر حضرت محمدؐ کے پاس مدینہ منورہ میں جائے گا تو اسے اس کے والی کے پاس واپس بھیج دیا جائے گا ؛ اگر کوئی مسلمان قریش کے ساتھ مل جائے گا تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا ؛ (۴) حضرت محمدؐ اس سال شہر میں داخل ہوئے بغیر لوٹ جائیں گے ، البتہ آئندہ سال مکہ مکرمہ آنے کی اجازت ہو گی ۔ وہ اور ان کے اصحاب مکہ مکرمہ میں صرف تین دن ٹھہر سکیں گے ۔ اس دوران میں اہل مکہ شہر چھوڑ جائیں گے ۔ مسلمان ہتھیاروں کے ساتھ شہر (مکہ) میں داخل نہیں ہوں گے ، ماسوا تلوار کے ، جو نیام میں ہو گی ۔

[اہل مکہ اور بعض مسلمان بھی یہ سمجھتے تھے کہ یہ معاہدہ اہل مکہ کے حق میں ہے ؛ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ] اگر فریقین کے مقاصد حیات کو مد نظر رکھا جائے تو بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ [یہ معاہدہ نہ صرف آپؐ کے حق میں تھا ، بلکہ] اس سے حضورؐ اقدس کا مقصد بھی احسن طور پر پورا ہو گیا تھا ۔ اب آپؐ تبلیغ اسلام کی جانب یکسوئی سے متوجہ ہو سکتے تھے ۔ نیز آپؐ اس عرصے میں اطمینان کے ساتھ دوسرے دشمنوں (مثلاً یہود خیبر) سے نمٹ سکتے تھے ، جو نت نئے فتنے اٹھاتے رہتے تھے ۔ قریش مکہ کو بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان کی تجارت جنگ کی وجہ سے معطّل ہو چکی تھی اور اس طرح انہیں اپنی اقتصادی تباہی کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا ۔ اس معاہدے کے نتیجے میں وہ تجارت کی ازسرنو بحالی کر سکتے تھے ؛ مگر انہیں اس کی بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑی ۔ صلح کی وجہ سے مسلمان پہلے سے بھی زیادہ طاقتور ہو گئے ۔ [اسی بنا پر اس صلح کو قرآن کریم (۴۸ [الفتح] : ۱ ببعد) میں فتح مبین کہا گیا ہے ، کیونکہ اس صلح نے اسلام کے سامنے سے اس دیوار کو ہٹا دیا ، جو اس کا ایک عرصے سے راستہ روکے ہوئے تھی ۔ اس طرح اسلام کے لیے وہ سازگار ماحول میسر آ سکا جس کے نتیجے میں لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے لگے ۔ ابن ہشام اپنی کتاب (سیرۃ ، ۳ : ۳۲۶) میں امام الزہری کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ] اس سے بڑی فتح اسلام کے لیے کبھی نہ ہوئی تھی ۔ جب جنگ ممنوع قرار دی گئی اور صلح ہو گئی اور لوگ بے خوف و خطر آپس میں ملنے لگے تو مسائل پر بحثیں ہونے لگیں ، جس کے نتیجے میں لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے ۔ ان دو سالوں میں پہلے سے دگنی تعداد میں لوگ اسلام لائے ۔ جونہی یہ معاہدہ مکمل ہوا ، بنو خزاعہ نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی طرف سے اور بنو بکر نے قریش مکہ کی طرف سے اس معاہدے میں شمولیت کا اعلان کیا ۔

غزوۂ خیبر ؛ صلح کے نتائج : [خیبر بنو قینقاع اور بنو نضیر کے آباد ہونے سے اسلام کے خلاف دوسرے بڑے مرکز میں تبدیل ہو چکا تھا ۔ غزوۂ احزاب میں قریش سے زیادہ یہود خیبر کا ہاتھ تھا ۔ انہوں نے بہت سے قبائل (مثلاً بنو غطفان) کو ایک سال کی رسد کی رشوت دے کر آپؐ کے خلاف بھڑکایا تھا [رک بہ خندق] ۔ یہودی بنو غطفان جیسے طاقتور قبیلے کو اپنے ساتھ ملا کر ایک مؤثر طاقت پیدا کر رہے تھے] ۔ ان حالات میں یہود خیبر اور بنو غطفان کی جانب سے ایک بار پھر بھرپور جارحیت کا ارتکاب غیر متوقع نہیں تھا ۔

حدیبیہ سے لوٹ کر حضورؐ نے [ذوالحجہ اور محرم کے کچھ ایام تک مدینہ منورہ میں قیام فرمایا] اور جب خیبر اور بنو غطفان کی زیر اسرار

سرگرمیوں کی ، جو صلح حدیبیہ کے بعد عروج پکڑ گئی تھیں]، اطلاع ملی تو آپ ؐ نے اس مہم کی تیاری شروع کر دی ۔ [الواقدی (۲ : ۶۳۷) کے مطابق ان کی جنگی تیاریوں کا یہ عالم تھا کہ یہ لوگ ہر روز دس ہزار کی تعداد میں باہر نکل کر صف بندی (غالباً پریڈ) کرتے اور کہتے کہ ہم دیکھیں گے کہ محمد ؐ ہم پر کس طرح فتح حاصل کرتا ہے] ۔

آپ ؐ نے ہمیشہ کی طرح اپنی مہم کا ہدف خفیہ رکھا ۔ یہودی اپنے گزشتہ کردار سے واقف تھے ۔ ان کے پاس تقریباً دس ہزار ہتھیار بند افراد موجود ہونے کے باوجود انہوں نے بنو غطفان سے بھی ایک ہزار جوان منگوائے اور انہیں اپنے مضبوط ترین قلعے میں داخل کر لیا ۔ علاوہ ازیں ، دونوں کے درمیان طے پایا کہ اگر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے خیبر پر حملہ کیا تو بنو غطفان چار ہزار مزید لشکر سے اسلامی لشکر پر عقب سے حملہ آور ہو جائیں گے اور یوں مسلمانوں کے نسبتاً کم تعداد لشکر کو دو طرفہ حملے سے مکمل طور پر ختم کر دیا جائے گا ۔

روانگی : محرّم ۷ھ [(ابن ہشام ، ۳:۳۴۲) میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم اس اہم اور نہایت نازک مہم پر روانہ ہوئے ۔ کوچ کی سمت مدینہ سے شمال کی جانب تھی ۔ حضور ؐ نے خیبر جانے کے لیے جو راستہ اختیار کیا اس سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ ان دو دشمنوں [یہود و بنو غطفان] میں سے آپ ؐ کس پر حملہ کریں گے ۔ جونہی بنو غطفان کو اطلاع ملی کہ اسلامی لشکر مدینہ سے روانہ ہو گیا ہے انہوں نے اپنے چار ہزار کے لشکر کو خیبر کی جانب حرکت دی ۔ وہ ایک ہی منزل چلے تھے کہ انہیں اطلاع ملی کہ حضور اقدس ؐ الرّجیع کی وادی میں رک گئے ہیں ۔ یہ مقام ایسا تھا [جو خیبر اور بنو غطفان کے مابین واقع تھا اور] جہاں سے بنو غطفان پر بھی حملہ کیا جا سکتا تھا ۔ بنو غطفان کو اپنی خیمہ گاہوں کی فکر پیدا ہو گئی ۔ وہ فوراً پلٹ کر اپنے علاقے کی خبر گیری کی طرف متوجہ ہو گئے ۔

آپ ؐ نے [الرّجیع] میں اپنا معسکر قائم کیا ، جہاں سے مسلسل رات دن خیبر پر یلغار جاری رکھی ۔ خیبر کی وادی میں یہودیوں کے بارہ قلعے تھے ، جو وادی کی دونوں سمت تزویراتی (Strategic) نقطۂ نظر سے تعمیر کیے گئے تھے ۔ ان کی دوسری بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کو تدبیراتی (tactical) طور پر بھی کمک پہنچا سکتے تھے ۔ یہودیوں کو بنو غطفان کے علاوہ شمال میں شام کی رومی حکومت سے بھی مدد کی توقع تھی ۔ ان تمام باتوں کا علاج آپ ؐ نے اس طرح فرمایا کہ خیبر پر حملہ جنوب کی طرف سے نہ کیا جائے ، بلکہ شمال کی جانب سے کیا جائے ؛ اس طرح اگر یہودی خیبر کے قلعے خالی کرکے شام کی طرف جانا چاہتے تو ان کو روکا جا سکتا تھا ۔

ایک صبح جب خیبر کے یہودی اپنے اہل اور دیگر زرعی اوزار اٹھائے کھیتوں کو جانے کے لیے نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ اسلامی فوج نے ان کا شمالی جانب سے محاصرہ کیا ہوا ہے ۔ آپ ؐ رات ہی رات میں وہاں پہنچ گئے تھے ، مگر آپ ؐ نے ہمیشہ کی طرح حملے کے لیے صبح کا انتظار کیا ؛ چنانچہ یہودی اپنے قلعوں کی جانب یہ پکارتے ہوئے دوڑے کہ محمد ؐ اور اس کی فوج آ گئی ہے ۔ [آپ ؐ نے یہ سن کر مسلمانوں کو فتح خیبر کی بشارت دی] ۔

سب سے پہلے ناعم نامی قلعہ فتح کیا گیا ، جس میں افرادی قوت کم اور مال و متاع زیادہ تھا ۔ [اس کے فتح ہونے پر عسکر اسلام کو بہت فائدہ پہنچا] ۔ یہ یہودی سردار مرحب کا قلعہ تھا ، مگر مرحب اس قلعہ میں نہ تھا ۔ اسے جنوب کے سب سے

مضبوط قلعے خموص میں متعین کیا گیا تھا۔ ناعِم کے بعد القَموص نامی قلعہ فتح ہوا [جو خاندان بنو الحقیق اور ام المؤمنین حضرت صفیہ کا مسکن تھا؛ یہ قلعہ دوسرے تمام قلعوں سے زیادہ مضبوط اور محفوظ تھا۔ یہاں حضرت علیؓ نے خصوصی شجاعت کا مظاہرہ کیا اور اس کے بعد [دوسرے قلعے فتح ہوتے رہے] ۔

پہلے روز کے بعد قلعوں کے فتح ہونے کی رفتار قدرے سست ہو گئی۔ وادی خیبر کے محاصروں نے دو ماہ کا طول کھینچا۔ جوں جوں مفتوح قلعوں کی تعداد بڑھتی گئی، انتظامی ذمہ داریوں اور قیدیوں کی دیکھ بھال کی مصروفیتوں میں اضافہ ہوتا گیا، جبکہ اسلامی لشکر کی تعداد صرف ۱۶ سو تھی۔

یہودیوں کی مقاومت: جنگی اقدامات کے ساتھ ساتھ حضور اکرمؐ نے صلح کی کوششیں بھی جاری رکھیں؛ قلعہ النَّطاۃ، جس کا کمان دار مرحب تھا اور جس میں بنو غطفان کے چار ہزار ہتیار بند بھی متعین تھے، عسکر اسلامی کے لیے سب سے زیادہ پریشانی کا موجب بنا۔ آپؐ نے پہلے حضرت سعدؓ بن عبادہ کو عُیینہ بن حِصن [سردار بنو فزارہ (= غطفان)] کے پاس روانہ کیا کہ اسے صلح پر رضامند کرے۔ مرحب نے یہ ملاقات قلعے کے اندر نہ ہونے دی تا کہ مسلم سفیر قلعے کی تفاصیل سے آگاہ نہ ہو جائے۔ دونوں کی ملاقات قلعے سے باہر ہوئی، [لیکن قدرت کی طرف سے ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ عُیینہ کو اپنے مقامِ سکونت الرَّوحاء کی طرف لوٹنا پڑا] اور اس طرح سمجھوتا نہ ہو سکا۔ مرحب کے قلعے کا محاصرہ دس روز تک کیا گیا۔ گیارھویں روز مرحب رجز پڑھتا ہوا قلعے سے باہر نکل آیا اور مبارزت طلب کی۔ حضورؐ سے محمدؓ بن مسلمہ نے اجازت مانگی تا کہ اپنے بھائی محمودؓ کا بدلہ لیں [جسے چکی کا پاٹ پھینک کر شہید کر دیا گیا تھا]۔ آپؐ نے اجازت دے دی۔ دونوں کافی دیر تک ایک دوسرے پر پینترے بدل بدل کر وار کرتے رہے۔ مرحب نے حضرت محمدؓ بن مسلمہ کے سر پر وار کیا، انھوں نے نہایت تیزی سے یہ وار اپنی ڈھال پر لیا، تلوار ڈھال پر پڑی اور الجھ گئی اسی لمحے حضرت محمدؓ بن مسلمہ نے مرحب پر بھرپور وار کیا، تلوار اس کا سر چیرتی ہوئی گردن تک جا پہنچی [الواقدی: کتاب المغازی، ۲: ۶۵۴ تا ۶۵۶؛ ابن ہشام، ۳: ۳۴۸)۔ وہ زخمی حالت میں گر پڑا، حضرت علیؓ نے اس کا سر قلم کیا (حوالۂ مذکور)۔ دوسری روایت میں، جو عام طور پر کتب سیرت میں متداول ہے، مذکور ہے کہ حضرت علیؓ اس کے مقابلے میں نکلے تھے (ابن سعد: الطبقات، ۲: ۱۱۲)]۔ مرحب کے بعد اس کا بھائی یاسر آگے بڑھا، اسے حضرت زبیرؓ نے قتل کیا۔ اس روز حضرت علیؓ عسکرِ اسلامی کے علمبردار تھے۔ اسی طرح حصنُ الشِّق، حصن النَّطاۃ اور حصنُ الکَتیبۃ، پھر حصن الوَطیح اور السُّلالم فتح ہوئے؛ مؤخر الذکر دو قلعے دو ہفتوں کی تگ و دو کے بعد فتح ہوئے] ۔ خیبر کی پوری وادی مسخر ہو جانے پر یہودیوں نے استدعا کی کہ انھیں آدھی پیداوار کی بٹائی کی شرط پر بطور کاشت کار رہنے دیا جائے۔ حضورؐ نے ان کی یہ درخواست قبول فرما لی۔ ایک شرط یہ رکھی کہ حکومت مدینہ جب چاہے گی خیبر کی وادی یہودیوں سے خالی کروا لے گی۔ اس مہم میں انیس بیس مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا۔ دشمن کے ترانوے آدمی مارے گئے۔ [اگر آپؐ یہودیوں سے ان کی شریعت (استثنا، ۲۰: ۱۰) کے مطابق سلوک فرماتے تو ان تمام کو قتل کر دیا جاتا اور ان کے بال بچوں کو غلام بنا لیا جاتا، مگر رحمت دو عالمؐ نے فراخ دلی اور وسعت قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہودیوں کو نہ صرف معاف کیا، بلکہ نصف پیداوار کی بٹائی پر انھیں ان کی زمینوں پر بحال رہنے دیا] ۔

یہودیوں کے ساتھ جو معاہدہ کیا گیا اس کی شرائط یہ تھیں: (۱) یہودی آئندہ قلعوں میں سکونت اختیار نہیں کریں گے؛ (۲) یہودی اپنے تمام ہتھیار اور جنگی ساز و سامان مسلمانوں کے حوالے کر دیں گے؛ [حکومت مدینہ جب چاہے گی انہیں خیبر سے نکال سکے گی]؛ (۳) تمام دفینے حکومت مدینہ کے حوالے کر دیں گے؛ (۴) اگر یہودی، ان شرائط کی خلاف ورزی کریں گے تو جو سامان انہیں بخشا گیا ہے وہ واپس لے لیا جائے گا۔

اس معاہدے پر حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ نے بطور گواہ دستخط کیے۔

فدک اور تیماء: فدک اور تیماء کے یہودیوں نے لڑائی کے بغیر ہی شکست تسلیم کر لی۔ ان سے بھی تقریباً انہیں شرائط پر معاہدہ طے ہوا جن پر اہل خیبر سے ہوا تھا۔ وادی القریٰ کے یہودی بھی مدینہ کے مخالفین میں شامل رہ چکے تھے۔ ان کی درخواست پر انہیں بھی معاف کر دیا گیا اور انہیں شرائط پر آباد رہنے کی اجازت دی گئی جو اہل خیبر کے ساتھ طے ہوئی تھیں۔ بنو غطفان، جو شروع سے ہی مدینہ کے خلاف لشکر کشی کرتے رہے تھے، وہ ابھی تک دوستانہ تعلقات کی طرف مائل نہ ہوئے تھے۔ نجد میں ان کے علاوہ اور کوئی ایسا اہم قبیلہ نہ رہا تھا جس نے مدینہ کی حاکمیت قبول نہ کی ہو۔

سریۂ بنو غطفان: بنو غطفان کی شاخ بنو فزارہ نے ایک بار پھر پہل کی کوشش کی اور بنو محارب اور دوسرے قبائل کو جمع کرنا شروع کر دیا۔ حضورؐ نے مجاہدین کا ایک دستہ [حضرت ابوبکرؓ کی قیادت میں روانہ کیا، معمولی قتال کی نوبت آئی اور جیش اسلام کامیاب و کامران لوٹا؛ یہ واقعہ شعبان ۷ھ کا ہے (ابن سعد ۲: ۱۱۷ تا ۱۱۸؛ الواقدی، ۲: ۷۲۲)]۔

عرب سے باہر تبلیغ: فتح کے بعد سے جزیرۃ العرب کو متحد کرنے اور مختلف قبائل کو ایک ہی ریاست میں مدغم کرنے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ دور تبلیغ اسلام کا بھی نمایاں دور ہے۔ اس دور میں اسلام کی آواز صحرائے عرب سے نکل کر آس پاس کی طاقتور مملکتوں کے درباروں تک جا پہنچی۔ بعض نے اس آواز کو سمجھا، مگر قلب و ذہن زنگ آلود ہی رہے؛ کسی نے اس پیغام کی تضحیک کی، مگر امن و سلامتی، ایمان اور دولت دنیا صرف انہیں کو نصیب ہوئی جنہوں نے اس آواز کی دل سے تصدیق کی۔ [تبلیغ و اشاعت اسلام کے دور میں بعض ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے اسلامی دنیا کا محاذ جنگ جزیرۂ عرب سے روم و فارس کے ممالک تک وسیع کر دیا]۔

سریۂ عمرؓ بن الخطاب: بنو ہوازن کی ایک شاخ مدینہ منورہ کے قریب [مقام تُربہ میں، جو مکہ مکرمہ سے صنعاء و نجران کے راستے پر چار منزل کے فاصلے پر واقع ہے، آباد تھی، آپؐ کو پتا چلا کہ انہوں نے مدینہ پر چھاپہ مارنے کی تیاری شروع کر رکھی ہے؛ حضرت عمر فاروقؓ کی کمان میں تیس مجاہدوں کا دستہ روانہ کیا گیا۔ اسلامی سپاہ کی آمد کی خبر سن کر یہ لوگ پہاڑوں میں منتشر ہو گئے۔ [حضرت عمرؓ بغیر کسی تصادم کے مدینہ منورہ لوٹ آئے]۔

سریۂ غالب بن عبداللہ: [نجد کے ایک کنارے المیفعہ میں آباد بنو عُوال اور بنو عبد بن ثعلبہ نے] ایک بار پھر بغاوت پر آمادگی ظاہر کی۔ [ان کی سرکوبی کے لیے حضرت غالبؓ بن عبداللہ اللیثی کو ایک سو تیس مجاہدین کے ایک دستے کے ساتھ رمضان ۷ھ میں روانہ کیا گیا]۔ انہوں نے معمولی سی جھڑپ کے بعد شکست قبول کر لی اور معاف کر دیے گئے (ابن سعد، ۲: ۱۱۹)۔

[سریۂ بشیر؄ بن سعد : انھی دنوں آپؐ کو خبر ملی کہ عیینہ بن حصن الفزاری بنو غطفان کے بعض دوسرے قبائل کے ساتھ الحاق کرکے مدینہ منورہ پر زبردست چھاپہ مارنا چاہتا ہے ۔ یہ اطلاع لانے والے بشیر؄ بن سعد انصاری تھے ۔ آپؐ نے صحابۂ کرام؄ کے مشورے سے انہیں کی قیادت میں تین سو مجاہدین کا ایک جیش شعبان یا شوال ۷ھ میں یُمن کے مقام الجناب کی طرف روانہ کیا ۔ ان کی خیمہ گاہیں ویران تھیں ، لیکن جیش اسلامی کی مدینہ منورہ مراجعت کے دوران میں عقب سے انھوں نے حملہ بول دیا] ۔ سخت لڑائی کے بعد انھیں شکست ہوئی ؛ ان کے دو آدمی ہلاک اور کچھ قید ہوے ، جب کہ باقی ماندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ؛ ان کی تیر اندازی اتنی ماہرانہ تھی کہ مدنی جماعت کے کئی افراد زخمی ہو گئے تھے [الواقدی ، ۲ : ۷۲۷ تا ۷۲۹] ۔

[قبائل عرب کے خلاف مندرجہ ذیل مہمیں بھی اسی دوران میں روانہ کی گئیں] :

سریہ ابن ابی العَوجاء السُّلَمی؄ : بنو سُلیم کا شمار بھی ان اسلام دشمن قبائل میں ہوتا ہے جنھوں نے بار بار اسلامی حکومت کے خلاف خروج کی کوشش کی ۔ اس مرتبہ بھی یہ لوگ تیاریوں میں مصروف تھے کہ آپؐ کو ان کی تیاریوں کا حال معلوم ہو گیا ۔ آپؐ نے ابن ابی العَوجاء کی قیادت میں پچاس افراد کا ایک دستہ ارسال کیا ۔ بنو سلیم کی طرف سے سخت مزاحمت ہوئی ، مگر جیش اسلامی نے تیروں کی بارش میں بھی پہلے دعوت اسلام کے فریضے کو پورا کرنا ضروری خیال کیا ، لیکن جب ان پر اثر نہ ہوا تو پھر سخت لڑائی ہوئی، جس میں جیش اسلامی کا بھی خاصا نقصان ہوا ، مگر بنو سلیم کو بہت نقصان اٹھانا پڑا (ابن سعد ، ۲ : ۱۲۳) ۔

سریہ غالب؄ بن عبداللہ اللیثی : آپؐ کو اطلاع ملی کہ بنو لیث کی ایک شاخ بنو المُلَوّح ، جو مقام الکَدِید میں سکونت پذیر ہے ، اسلام دشمن سرگرمیوں میں شریک ہے : آپؐ نے صفر ۸ھ میں حضرت غالب؄ بن عبداللہ اللَّیثی کی کمان میں ۱۲ افراد پر مشتمل ایک دستہ ارسال کیا ۔ جنھوں نے نہایت کامیابی کے ساتھ بنو المُلَوّح کو ان کی بغاوت کی سزا دی ؛ کئی افراد کو قید کرکے مدینہ منورہ لایا گیا (الواقدی، ۲ : ۷۵۱ تا ۷۵۳) ۔

اسی مہینے میں حضرت غالب؄ بن عبداللہ کی قیادت میں دو سو افراد پر مشتمل ایک دستہ فَدَک کے ان قبائل کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا گیا جنھوں نے بشیر؄ بن سعد انصاری کے لشکر پر عقب سے حملہ کرکے ایسے سخت نقصان پہنچایا تھا ؛ چنانچہ یہ مہم کامیاب ہوئی ، باغی قبائل کو قرار واقعی سزا ملی (ابن سعد ، ۲ : ۱۲۶) ۔

سَریہ کَعب بن عُمیر الغفاری : آپؐ کو شام کے ایک مقام ذات اطلاح میں خلاف اسلام سرگرمیوں کی اطلاع ملی تو آپؐ نے پندرہ افراد پر مشتمل ایک دستہ ربیع الاول ۸ھ میں حضرت کعب؄ بن عمیر؄ کی قیادت میں روانہ کیا ۔ جب یہ دستہ مذکورہ مقام پر پہنچا تو وہاں قبائل کا بہت بڑا اجتماع پایا ۔ انھوں نے ان کو اسلام کی دعوت دی ، مگر انھوں نے تیروں سے جواب دیا ؛ چنانچہ جنگ ہوئی ، جس میں اسلامی لشکر کے تمام مجاہدین ، سوائے ایک زخمی کے ، شہادت سے ہم کنار ہو گئے ۔ آپؐ کو اطلاع ملی تو آپؐ ان کی سرکوبی کے لیے ایک اور لشکر بھیجنے کا خیال فرما رہے تھے کہ پتا چلا کہ وہ قبائل دور دراز علاقوں میں منتشر ہو گئے ہیں ، یہ سن کر آپؐ نے ان کو معاف فرما دیا (الواقدی، ۲ : ۷۵۲ تا ۷۵۳) ۔

سریہ شجاع بن وہب الاسدی : مقام السي

میں بھی بنو ہوازن کی ایک شاخ بنو عامر آباد تھی۔ انھوں نے بھی مملکت مدینہ کے خلاف بغاوت پر آمادگی ظاہر کی ؛ ان کے خلاف شجاعؓ بن وھب کو چوبیس مجاہدوں کی کمان دے کر ربیع الاول ۸ھ میں روانہ کیا گیا ، مگر وہ پہاڑوں میں منتشر ہو گئے۔ قبائل بار بار سرکشی کرتے رہے ، مگر جوں جوں انھیں مدینہ کے مقابلے میں اپنی کمزوری کا احساس ہوتا گیا وہ حوصلہ ہارتے گئے۔ [وہ رحمۃ للعلمین کے حضور پہنچ کر معافی مانگ لیتے اور معاف کر دیے جاتے] ؛ اس پر وہ قبائلی زندگی کی محدود آزادی کے بدلے مدینہ کی وسیع اور طاقتور حاکمیت (Sovereignty) میں شامل کر لیے جاتے۔

بیرونی فرمانرواؤں کے نام دعوت نامے : تبلیغ اسلام کے لیے امن و سکون کے جس ماحول کی ضرورت تھی وہ اب حاصل ہو چکا تھا۔ قرآن کا پیغام پوری انسانیت کے لیے تھا ؛ چنانچہ ضروری تھا کہ جزیرۃ العرب کی سرحدوں سے ماوراء بھی یہ پیغام پہنچایا جاتا۔ سلامتی و امن کی آواز ، بہ طریق صلح ھی پہنچائی جا سکتی تھی۔ حضورؐ نے مختلف فرمانرواؤں کی طرف دعوت نامے روانہ فرمائے تاکہ وہ اسلام لے آئیں اور اس طرح اپنی ذمے داریوں کو پورا کریں کہ ان کے زیر تسلط سر زمین پر عدل و انصاف قائم ہو جائے۔ ان فرمانرواؤں میں قیصر بوزنطیہ ھرقل اور کسرائے ایران بھی شامل تھے۔ بوزنطی شہنشاہ دربار رسالت کے سفیر کے ساتھ احترام سے پیش آیا ، مگر کسرائے ایران [خسرو پرویز] نے حضورؐ کے خط کو پھاڑ ڈالا ! گورنر مصر نے سفیر کے احترام و اکرام کے علاوہ کچھ تحائف بھی آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے لیے بھیجے۔

اس صلح پرور دور میں حضورؐ ذوالقعدہ ۷ھ میں بیت اللہ شریف کے عمرہ کے لیے تشریف لے گئے [رکِ بہ عمرہ]۔ سفر کے دوران میں عسکری ترتیب قائم رکھی گئی ، جیسا کہ حضورؐ کو توقع تھی۔ اس سفر کے نتیجے میں مکّی نوجوانوں نے برملا اسلام کی جانب اپنا میلان ظاہر کرنا شروع کر دیا ؛ ان نوجوانوں میں حضرت خالدؓ بن ولید اور عمروؓ بن العاص جیسے نامور سپاہی شامل تھے۔

جنگ مؤتہ : دین اسلام کی وسعت پذیری پڑوسی حکومتوں کو ہرگز گوارا نہ ہو سکتی تھی۔ بوزنطی حکومت نے بھی ریاست مدینہ کو دلچسپی سے دیکھنا شروع کیا۔ یہودی قبائل کے تعلقات شام کے ساتھ پہلے بھی تھے ؛ ان کی شکست نے انھیں رومی حکومت کی طرف مزید مائل کر دیا۔ عرب کے شمالی علاقے میں جو عیسائی اور نیم عیسائی قبائل آباد تھے سب سے زیادہ انھوں نے رومی حکومت کو مدینہ کی طرف متوجّہ ہونے کا مشورہ دیا : چنانچہ شہنشاہ ھرقل نے بہت بڑا لشکر تیار کرنا شروع کیا۔

ریاست کی شمالی سرحد پر سرحدی قبائل کے ایما پر پڑوسی طاقتور سلطنت کے لشکر کا جمع ہونا کسی طرح برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔

[تصادم کی ایک فوری وجہ یہ ہوئی تھی کہ ایک قاصد نبوی حضرت حارثؓ بن عُمیر الازدی کو، جو شاہ بُصریٰ کے نام آپؐ کا نامۂ اقدس لے کر جا رہے تھے ، رئیس علاقہ بلقاء شرحبیل بن عمرو الغسّانی نے مؤتہ کے مقام پر گلا گھونٹ کر شہید کر دیا تھا (الواقدی، ۲ : ۷۵۵)۔ یہ صریحاً سفارتی قوانین کی خلاف ورزی تھی۔ اس بنا پر آپؐ نے فوری طور پر ظالم کی سزا دہی کا بندوبست کیا]۔ ان حالات کو دیکھ کر حضورؐ نے اپنے لشکر کی تربیت و تنظیم کا حکم دیا۔ تین ہزار کا لشکر تیار کیا گیا۔ مقابلے پر ۲½ لاکھ کی تعداد تھی۔ تین ہزار کا لشکر ادھر اور مقابلے پر کتنا بڑا لشکر، مگر اصول (مشن) پر مبنی جنگ میں تعداد کا انتظار نہیں کیا جاتا ؛ نہ اس پر انحصار کیا جاتا ہے۔ مشن میں معاملہ جذبے

کی صداقت اور ایمان کا ہوتا ہے۔ تعداد کا نہیں ۔

رومی لشکر سے مقابلہ : لشکر کی روانگی کے وقت رسالت مآب ؐ نے بہ نفس نفیس معسکر جا کر کمانڈار کو دعائے خیر و برکت سے نوازا ۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اسلامی فوج بیرون عرب کی اسلام دشمن طاقت کے خلاف نبرد آزما ہونے جا رہی تھی! ۔ حضور ؐ نے اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ بن حارثہ کو سالار لشکر مقرر کیا اور فرمایا کہ اگر حضرت زیدؓ شہید ہو جائیں تو حضرت جعفرؓ بن ابی طالب لشکر کی کمان سنبھالیں اور اگر وہ بھی شہادت کا مقام حاصل کر لیں تو حضرت عبداللہؓ بن رواحہ اس گرانقدر ذمے داری کو سنبھالیں اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو پھر لشکر خود اپنا کمانڈار چن لے اور اس کے احکام پر عمل کرے ۔

[جمادی الاولیٰ ۸ھ میں روانہ ہو کر] جب یہ لشکر وادی القریٰ میں پہنچا تو حضرت زیدؓ نے چند روز آرام کرنے کا فیصلہ کیا ۔ اس دوران میں دشمن کے متعلق معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ۔ جب یہ جیش معان پہنچا تو معلوم ہوا کہ شہنشاہ ھرقل دو لاکھ کے لشکر کے ساتھ [سر زمین بلقاء میں مقام مآب پر پہنچ چکا ہے] ۔ عیسائی مؤرخین نے ھرقل کے بجائے اس کے بھائی کی موجودگی لکھی ہے ، تاہم لشکر کی تعداد دو لاکھ ہی بتائی ہے ؛ اس خبر پر حضرت زیدؓ نے جنگی مشاورتی مجلس (War council) کے انعقاد کا حکم دیا ۔ کسی نے رائے دی کہ لشکر آگے نہ بڑھے اور مدینہ سے مزید احکام منگوائے جائیں ؛ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نے زور دار طریقے سے کہا : حضور ؐ اپنا حکم صادر کر چکے ہیں ۔ کیا ہم تعداد (اعداد و شمار) پر بھروسا کرتے ہیں یا اپنے خدا پر ؟ حصول شہادت یا مقام مجاہد ، دونوں میں سے ایک نہ ایک یقینی ہے ۔ ہمیں آگے بڑھنا چاہیے ! چنانچہ دو یوم کے مذاکرات کے بعد اسلامی لشکر آگے بڑھ گیا ۔

دونوں لشکروں کا آمنا سامنا بحیرہ مردار کے ساحل [سر زمین بلقاء] پر مشارف کے مقام پر ہوا ۔ حضرت زیدؓ چھے دن رومی لشکروں کے ارد گرد تدبیرات ضرب و فرار (Hit and Run Tactics) کے اصول کے مطابق کبھی اس مقام پر حملہ آور ہوتے اور کبھی دوسرے مقام پر ؛ کبھی رومی لشکر کے سامنے سے نمودار ہوتے اور کبھی پہلو سے اور ہر بار دشمن کے کے بے ہنگم فوج کے پرے (Phalanxes) کو وار کرنے کا موقع ہی نہ دیتے اور صحرا میں غائب ہو جاتے ۔ ساتویں دن حضرت زیدؓ سامنے سے کچھ اس طرح نمودار ہوئے کہ گویا جم کر مقابلہ کریں گے ، مگر جونہی رومی فوجی پرے بڑھنے لگے انہوں نے پسپائی (Withdrawal) اختیار کرلی ۔ اسلامی لشکر کچھ اس انداز سے پیچھے ہٹا کہ رومی لشکر کے کمانداروں نے سمجھا کہ مسلمان بھاگنے لگے ہیں؛ رومی پرے آگے بڑھے ، مگر دو لاکھ کی فوج اور پہلوؤں پر چالیس پچاس ہزار قبائلی لشکر کے لیے اس عجلت میں اپنی ترتیب قائم رکھنا ممکن نہ رہا ۔ مؤتہ کے مقام پر حضرت زیدؓ اپنے لشکر کے ساتھ رومیوں کے انتظار میں تھے ۔ جونہیں رومی فوج کا اگلا حصّہ بے ترتیبی سے سامنے آیا، حضرت زیدؓ نے بھرپور حملے کا حکم دے دیا ۔ رومی فوج کا بہت تھوڑا سا حصّہ اس حملے کا ہدف بنا تھا، مگر رومی فوج کے جس حصے پر یہ زد پڑی وہ اسے برداشت نہ کر سکا ؛ چنانچہ رومیوں نے راہ فرار اختیار کی ۔ اصولاً فوجی پرے کے لیے بھاگنا مشکل ہوتا ہے ؛ سو صفیں اور وہ بھی بے ترتیبی کے حالت میں ، نہ آگے بڑھ سکتی ہیں اور نہ پسپائی اختیار کر سکتی ہیں ۔

رومی فوج اب اپنے ہی ساتھیوں کو روندتی ہوئی چاروں طرف کھلا میدان حاصل کرنے کی کوشش

کر رہی تھی ۔ ان کی ترتیب (Formation) اتنی گنجان تھی کہ کسی کو ہتیار بلند کرنے کی مہلت نہ مل رہی تھی۔ ادھر اسلامی لشکر، انسانی اجسام کے اس گھنے جنگل کو روندتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا ۔ حضرت زیدؓ پر چاروں طرف سے وار ہو رہے تھے ۔ بالآخر خون زیادہ بہ جانے کی وجہ سے وہ گھوڑے سے گر پڑے ۔ حضرت جعفرؓ بن ابی طالب، حکم نبوی کے مطابق فوراً آگے بڑھے اور علم تھامتے ہی پیادہ ہو کر لڑنا شروع کر دیا ۔ حضرت جعفرؓ نے لشکر میں نئی روح پھونک دی ، مگر وہ بھی ستر سے زائد زخم کھانے کے بعد شہید ہو گئے ۔ اب حضرت عبداللہؓ بن رواحہ آگے بڑھے اور علم انہوں نے سنبھالا ۔ حضرت عبداللہؓ رجز پڑھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے ۔ اب رومی لشکر میں فوج والی کوئی بات نہ رہ گئی تھی ۔ اسلامی لشکر ہزاروں آدمیوں کو دھکیلے جا رہا تھا اور باقی ماندہ کو پتا بھی نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے ۔ جہاں کہیں کسی رومی کو موقع ملتا وہ پلٹ کر قریب والے مسلمان پر حملہ کرتا اور پھر بھاگ کھڑا ہوتا ۔ حضرت عبداللہؓ کے رجز نے فوج کو نیا عزم عطا کیا ۔ بالآخر حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کی آرزوے شہادت بھی پوری ہو گئی اور وہ بھی شہید ہو گئے ۔ جب وہ گرے تو ثابتؓ بن اقرم نے بڑھ کر علم اسلامی کو تھاما ۔ اب آنحضرتؐ کے حکم کے مطابق فوج نے میدان جنگ ہی میں اپنا کماندار چننے کا فرض ادا کیا ۔ فوج نے یہ قرعۂ فال حضرت خالدؓ بن ولید کے نام ڈالا ۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے قیادت سنبھالتے ہی فیصلہ کیا کہ اب منظم پسپائی کے ذریعے میدان جنگ سے علیحدگی اختیار کی جائے اور پھر مدینہ کی طرف مراجعت اختیار کر لی جائے ۔ واپسی کے دوران میں اسلامی لشکر نے رومی فوج کے میسرہ کے عرب کماندار مالک بن زافلہ [نیز زافلہ] کو قتل کیا ۔ جب حضرت خالدؓ کی کمان میں یہ لشکر مدینہ منورہ پہنچا تو کچھ لوگوں نے کہا کہ راہ حق کی لڑائی سے انہیں واپس نہیں آنا چاہیے تھا، مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: یہ بھاگے ہوئے نہیں ہیں (اللہ کو منظور ہوگا تو) یہ پھر لڑیں گے [ابن ہشام : ۴ : ۱۵ تا ۳۰] اور تاریخ شاہد ہے کہ ایسا ہی ہوا ۔

رومی لشکر کو زبردست نقصان پہنچانے کے باوجود اس مہم کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی ، یعنی سرحد پر امن و سکون قائم نہیں کیا جا سکا تھا ۔ اس لیے حضورؐ نے جمادی الآخرہ ۸ھ میں حضرت عمروؓ بن العاص کی کمان میں تین سو مجاہدوں کا لشکر شمالی سرحد کے علاقے [ذات السّلاسل کی طرف جو وادی القُریٰ سے پرے واقع ہے] میں امن و امان قائم کرنے کے لیے روانہ کیا ؛ یہاں بنو قضاعہ جمع ہو کر مدینہ منورہ پر لشکر کشی کی تدبیریں کر رہے تھے ۔ اس لشکر میں تیس سواروں کا دستہ بھی شامل تھا ۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے وہاں جا کر محسوس کیا کہ باغی قبائل کی تعداد کے پیش نظر ان کے لشکر کی تعداد کم ہے ؛ چنانچہ انہوں نے آنحضرتؐ سے کمک کی درخواست کی ۔ آپؐ نے حضرت ابو عبیدہؓ کو مزید دو سو مجاہدین دے کر روانہ کیا ، جس میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ جیسے صحابۂ کرامؓ بھی شامل تھے ۔ یہ متحدہ لشکر شمال کے سرحدی علاقوں میں [موجود قبائل بَلِیّ ، عُذرہ ، بَلقین کو سزا دینے اور ان کو منتشر کرنے میں کامیاب رہا [ابن سعد ، ۲ : ۱۳۱] ۔

سریۃ الخَبط : رجب ۸ھ میں حضرت ابوعبیدۃؓ الجرّاح کی کمان میں تین سو مجاہدوں کا لشکر ساحل سمندر کے ساتھ شاہراہ پر امن و امان قائم کرنے کے لیے روانہ کیا گیا ۔ [یہاں بنو جُہینہ کی ایک شاخ مصروف فساد تھی ۔] یہ بھی سرحدی علاقہ

تھا اور یہ قبائل تجارتی قافلوں کی آمد و رفت میں مزاحم ہو رہے تھے۔ [مذکورہ قبائل منتشر ہو گئے ، اس طرح] یہ مہم بھی کامیاب رہی ۔ نجد کے صوبے میں بنو غطفان کی شاخ فزارہ کے لوگ کئی بار مدینہ منورہ پر حملہ کر چکے تھے ۔ [اس سال پھر ایک مہم حضرت ابو قتادہؓ [حارثؓ] بن ربعی انصاری کی زیر قیادت کی سرکوبی کے لیے روانہ کی گئی ؛ یہ مہم کامیاب رہی اور مال غنیمت کے ساتھ مدینہ منورہ لوٹی] .

فتح مکہ کے اسباب : صلح حدیبیہ کے وقت بنو خُزاعہ نے اعلان کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے حلیف ہونے کی حیثیت میں اس دس سالہ معاہدے میں شامل ہیں ، جو حدیبیہ کے مقام پر ہوا تھا ؛ جب کہ بنو بکر نے قریش مکہ کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا تھا ۔ [بنو بکر اور بنو خُزاعہ دو متحارب فریق تھے ، جن میں عرصۂ دراز سے چپقلش چلی آ رہی تھی؛ چنانچہ] بنو بکر ماضی میں بنو خزاعہ کے ہاتھوں زک اٹھا چکے تھے اور وہ خلش ان کے دل میں باقی تھی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ خلش اور قریش کا صلح حدیبیہ کو اپنے مقصد میں حائل سمجھنا [ایک ہی مربوط سلسلے کی کڑیاں ہیں] ۔ بنو خزاعہ نہ صرف مسلمانوں کے حلیف تھے ، بلکہ ابتدا سے ہی وہ اسلامی حکومت کے ساتھ گہری ہمدردی رکھتے تھے ؛ غزوۂ خندق کے موقعہ پر انہیں نے تیز رفتار اونٹوں پر سوار ہو کر قریش مکہ اور ان کے حلیفوں کے متحدہ لشکروں کی مدینہ منورہ پر چڑھائی سے آپؐ کو آگاہ کیا تھا ۔ اس بنا پر بنو بکر ہی نہیں ، بلکہ خود قریش مکہ بھی ان سے خار رکھتے تھے ۔ قریش مکہ نے ایک مربوط منصوبے کے تحت ریاست مدینہ کے خلاف راست اقدام کا فیصلہ کیا ، یعنی یہ کہ پہلے مسلمانوں کے ان حلیف اور ہمدرد قبیلے والوں سے نمٹا جائے ، جو ان کی ہر حرکت پر کڑی نظر رکھتے تھے ؛ بعد ازاں تیاری کرکے دوبارہ مدینہ منورہ پر یلغار کر دی جائے ؛ [چنانچہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت] بنو بکر نے شعبان ۸ھ میں بنو خُزاعہ پر شب خون مار کر ان کا بہت سا نقصان کیا۔ [قریش مکہ نے ہتھیاروں کے علاوہ ان کی فوجی و عملی مدد بھی کی ۔ کئی قریشی نوجوان (مثلاً عکرمہ بن ابی جہل، وغیرہ) رات کے اس حملے میں بنو بکر کے ساتھ شریک تھے (ابن ہشام ، ۴ : ۲۳۲) ، حتٰی کہ عین حرم کعبہ میں بھی ان کا بے دریغ قتل عام کیا گیا ۔ یہ قریش مکہ اور بنو بکر کی طرف سے واضح طور پر معاہدے کی خلاف ورزی تھی ؛ چنانچہ] بنو خزاعہ نے مدینہ پہنچ کر دربار رسالت مآبؐ میں شکایت پیش کی ۔ آپؐ نے ان کو تسلی دی اور واپس بھیج دیا ۔ چونکہ حضورؐ معاہدہ توڑنا نہیں چاہتے تھے ، اس لیے آپؐ نے قریش مکہ کو کہلا بھیجا کہ یا تو بنو خزاعہ کے مقتولین کا خون بہا ادا کیا جائے [یا بنو بکر سے لا تعلقی کا اعلان کیا جائے اور اگر یہ منظور نہ ہو] تو پھر معاہدہ حدیبیہ کے توڑنے کا اعلان کر دیا جائے ۔ قریش مکہ نے آخری دفعہ قبول کرنے کا اعلان کیا ، مگر جلد ہی ان کو ندامت ہوئی اور ابو سفیان کو مدینہ منورہ روانہ کیا کہ دوبارہ صلح کے لیے سلسلہ جنبانی کرے ۔ حضور اقدسؐ نے ابو سفیان کی کسی بات کا جواب نہ دیا ، اس طرح ابو سفیان ناکام ہو کر مکہ مکرمہ لوٹ گیا .

فتح مکہ : ۱۰ رمضان المبارک ۸ھ یکم جنوری ۶۳۰ء کو سرور دو عالمؐ دس ہزار مجاہدوں کا لشکر لیے کر مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے۔ اس میں آپؐ کے اتحادیوں ، مثلاً بنو سُلیم اور بنو مُزینہ کے ایک ایک ہزار کے لشکر بھی شامل تھے ؛ حضرت زبیرؓ کی کمان میں دو سو مجاہدوں کا سوارہ طلایہ (Advance Guard) کے فرائض انجام دے رہا تھا ۔ مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر ساتویں

دن لشکر نے مرّالظّہران کے مقام پر پڑاؤ کیا۔ یہ مقام مکہ سے صرف ایک دن یا اس سے بھی کم فاصلے پر واقع ہے۔ [یہاں آپ نے رات کو تمام لشکر والوں کو الاؤ روشن کرنے کا حکم دیا۔ آپؐ اہل مکہ کو اچانک اپنی نمود دکھلا کر مرعوب کرنا چاہتے تھے؛ چنانچہ اہل مکہ نے پورے علاقے میں آگ اور روشنی دیکھی تو وہ گھبرا گئے؛ تحقیق احوال کے لیے ابو سفیان، حکیم بن حِزام، بدیل بن ورقاء کو بھیجا گیا؛ حضرت عباسؓ نے ابو سفیان کو پناہ دی۔ جس سے اس کی جان بخشی ہو گئی]۔ حضورؐ نے دوسری صبح اسے شرف باریابی بخشا اور فرمایا کہ جا کر اعلان کر دو کہ جو شخص مکان بند رکھے گا یا حرم کعبہ میں پناہ لے گا یا ابو سفیان کے گھر پناہ لے گا اسے ہماری طرف سے امان ہے۔

اسلامی لشکر چار بریگیڈوں میں تقسیم ہو کر مختلف سمتوں سے مکہ مکرمہ پر قبضہ کرنے کے لیے آگے بڑھا، مگر حضورؐ کا سخت تاکیدی حکم تھا کہ جب تک مزاحمت نہ ہو تلواریں نیاموں سے نہ نکالی جائیں۔ حضرت زبیرؓ کو شمال سے داخل ہونے کا حکم تھا؛ حضرت خالدؓ جنوب سے داخل ہو رہے تھے، [قیس] بن سعدؓ بن عبادہ انصاری مغرب کی سمت سے بڑھ رہے تھے اور حضرت ابو عبیدہؓ مہاجرین کے ساتھ مشرق سے مکہ مکرّمہ میں داخل ہو رہے تھے؛ لشکر کا صدر مقام اسی بریگیڈ کے ساتھ تھا۔ [خود آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم مکہ مکرمہ کے بالائی حصے، مقام اذاخر میں فروکش تھے، جہاں سے آپؐ تمام فوجوں کی کمان فرما رہے تھے]۔ داخلہ کی ترتیب ایسی تھی کہ چاروں بریگیڈ ایک دوسرے کی مدد کر سکتے تھے۔ صرف شہر کے جنوبی حصے میں حضرت خالدؓ کے جیش کی مزاحمت ہوئی، مگر خالدؓ بن ولید نے جلد ہی دشمن پر قابو پا لیا۔ حضورؐ نے دور سے تلواروں کی چمک دیکھی تو فرمایا: کیا میں نے حکم نہیں دیا تھا کہ لڑائی نہ کی جائے؟ مگر جب صورت حال بیان کی گئی تو آپؐ نے فرمایا: مشیّت الٰہی میں یقیناً بہتری ہے۔ جب اہل مکّہ حرم کعبہ میں جمع ہوئے تو ندامت سے سر جھکائے ہوئے تھے۔ حضور اقدسؐ نے پہلے خطبہ ارشاد فرمایا اور پھر پوچھا: تمہیں مجھ سے کس طرح کے سلوک کی توقع ہے؟ اجتماع نے کہا: ہمیں ایک کریم بھائی کے کریم فرزند سے اچھے سلوک کی توقع ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: آج کے دن تم سے کوئی باز پرس نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔

غزوات کا آخری دور: فتح مکہ کے بعد سے غزوات نبوی کا آخری دور شروع ہوتا ہے۔ ابھی مکہ اور گرد و نواح کا نظم و نسق مکمل نہیں ہوا تھا کہ اطلاع ملی کہ بنو ہوازن مکہ مکرمہ پر حملے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ حضور اکرمؐ نے [۶ شوّال ۸ھ] میں لشکر کو کوچ کا حکم دیا۔ اب لشکر میں دو ہزار مکی نو مسلموں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ آپؐ نے بنو ہوازن کے پہاڑوں کا رخ کیا۔ بروز بدھ، بوقت صبح حنین کی وادی میں داخل ہوئے۔ وادی زیادہ چوڑی نہ تھی اور دائیں بائیں تنگ سی گھاٹیاں تھیں۔ بنو ہوازن کے کمان دار نے ان گھاٹیوں میں آدمی چھپا رکھے تھے۔ جونہی حضرت خالدؓ کی زیر کمان بنو سُلیم کے جوانوں پر مشتمل طلایہ ان کے پاس سے گزرا تو انہوں نے اچانک حملہ کر دیا۔ بنو سلیم کے جوان پوری طرح تربیت یافتہ نہ تھے۔ ناگہانی حملے سے حواس باختہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ [ان کی دیکھا دیکھی نو مسلم بھی بھاگ نکلے۔ اس طرح بہت سے مسلمان تتّر بتّر ہو گئے۔ اب میدان میں رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم اور آپؐ کے چند جاں نثار باقی رہ گئے۔ آپؐ نے یہ صورت حال دیکھی تو خچّر سے نیچے چھلانگ لگائی اور فرمایا: أَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ أَنَا ابْنُ عَبْدِالْمُطَّلِبْ،

یعنی میں خدا کا سچا نبی اور عبدالمطلب کا بیٹا ہوں؛ ادھر میدان میں تیروں کی بارش کا رخ آپؐ اور آپؐ کے چند جاں نثاروں کی طرف تھا ۔ آپؐ نے حضرت عباسؓ کو ، جو جہیر الصوت تھے ، حکم دیا کہ انصار ، اور بیعت رضوان کرنے والوں اصحاب کو پکاریں ؛ چنانچہ اس آواز کا بلند ہونا تھا کہ صحابہؓ اس طرح پلٹے جس طرح اونٹنی اپنی اولاد پر پلٹتی ہے ۔ جب کچھ تعداد جمع ہو گئی تو آپؐ نے دوبارہ صف بندی کی اور منظّم طریقے سے بنو ہوازن پر حملہ کیا] ۔ اب گھمسان کی جنگ ہوئی اور بنو ہوازن پیچھے ہٹنا شروع ہو گئے اور پھر جلد ہی بھاگ کھڑے ہوے ۔ ان کا دور دور تک تعاقب کیا گیا ۔ بہت سے قید ہوے؛ جو بچ گئے وہ طائف کے قلعے میں محصور ہو گئے ۔ آپؐ نے قلعۂ طائف کا محاصرہ کر لیا، مگر جلد ہی طائف کا محاصرہ اٹھا لیا اور فرمایا کہ اهل طائف خود ہی مدینہ منورہ آ کر اسلام قبول کر لیں گے ۔ [ان کے تمام اموال و املاک ، جس میں، چھے ہزار کے قریب ان کی عورتیں اور بچے بھی تھے ، گرفتار کر لیے گئے ؛ آپؐ نے کئی دنوں تک ان کے وفد کی آمد کا انتظار کیا ، جب کوئی شخص مصالحت کی بات چیت کرنے نہ آیا تو آپؐ نے تمام اموال مسلمانوں میں تقسیم فرما دیے ۔ تاهم جب ان کا وفد باریاب ہوا تو آپؐ نے ان کے چھے ہزار قیدی فوراً آزاد فرما دیے (ابن سعد، ۲ : ۱۴۹ تا ۱۵۷)] .

سفارتوں کا سال : فتح مکہ اور حنین سے واپسی پر اهل عرب کی سفارتوں کا سلسلہ شروع ہوا ۔ اسی بنا پر ۹ ہجری کو سفارتوں کا سال (عام الوفود) کہا گیا ہے ۔ بعض قبائل اسلام کے نظام زندگی میں برابر کے شریک ہونا نہیں چاہتے تھے ۔ انہیں جزیہ دینا پڑا ، مگر ایسے قبائل سے حق دفاع لے لیا جاتا تھا ۔ غزوۂ حنین کے بعد چند چھوٹے لشکر روانہ کیے گئے ۔ جدہ کے سامنے بحرالاحمر کے ایک جزیرے پر بحری قزاقوں نے قبضہ کر لیا تھا؛ [چنانچہ ربیع الاول ۹ھ میں حضرت عَلْقمہ بن مُجَزِّز المدلجی کو تین سو افراد دے کر] ان کے خلاف روانہ کیا گیا ۔ [انھوں نے جزیرے پہنچ کر] ان قزاقوں کا قلع قمع کیا [ابن سعد، ۲ : ۱۶۳] ؛ حضرت علیؓ کی کمان میں ایک مہم [بنو طَیّ کے خلاف] ربیع الاول ۹ھ میں روانہ کی گئی [جو ڈیڑھ سو افراد پر مشتمل تھی] ۔ یہ مہم کامیاب رہی ۔ عدی بن حاتم طائی بھاگ جانے میں کامیاب رہا، مگر اس کی بہن قید کر لی گئی ۔ جب دربار رسالت میں پیش ہوئی تو آپؐ نے نہایت احترام سے جگہ دی اور سفر خرچ اور تحائف دے کر واپس کیا ۔ بہن نے عدی کو خط لکھا اور مشورہ دیا کہ ایسے دربار سے دور رہنا بڑی کوتاہ اندیشی ہے ؛ چنانچہ وہ دربار رسالت میں حاضر ہوا اور قبیلے کی سرداری پر فائز کیا گیا اور بعد کی مہموں میں دلیری سے لڑا [کتاب مذکور، ۱۶۴] .

غزوۂ تبوک : اسی دوران میں اطلاع ملی کہ بوزنطی حکومت دوبارہ مدینۂ منورہ پر حملے کی تیاریاں کر رہی ہے ۔ [آپؐ نے صحابۂ کرامؓ کو ہنگامی طور پر تیار ہونے کا حکم دیا ، کیونکہ آپؐ نہیں چاہتے تھے کہ بوزنطی حکومت کے خلاف جنگ میں سر زمین عرب میدان جنگ بنے ۔ یہ پہلا موقع تھا کہ آپؐ نے اپنی اس تیاری اور مہم کا مقصد پوشیدہ نہیں رکھا ؛ چنانچہ] شعبان ۹ھ (اکتوبر ۶۳۰ء) میں تیس ہزار کا لشکر مدینہ منورہ سے آپؐ کی قیادت میں روانہ ہوا ۔ مقام تبوک میں ، جو سرحد پر واقع ہے ، جا کر معلوم ہوا کہ شہنشاہ ہرقل نے مدینہ پر حملہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے ؛ اب کسی بیرونی خطرے کا امکان نہ تھا ۔ حضورؐ نے سرحدی قبائل کے ساتھ معاهدے کیے ۔ اس مہم کو غزوۂ تبوک کا نام دیا گیا ہے ۔ تبوک میں دس روز

قیام کیا اور پھر آپؐ واپس مدینہ لوٹ آئے۔

غزوات نبوی کے عمیق مطالعے کے بغیر سیرت نبوی کو صحیح طور پر سمجھنا مشکل ہے۔ حضورؐ کے مدنی دور کی مدت دس سال ہے۔ اس میں سے نو سال حرب و ضرب اور اس کی تیاریوں میں صرف ہوئے۔ غزوات کے سلسلے میں مدنی زندگی کا تقریباً پانچواں حصہ میدان جنگ میں گزرا۔ جو وقت سرایا کی تیاری، ان کی روانگی، ان کی کارکردگی پر غور، ان کے متعلق خبروں کے حاصل کرتے رہنے اور عسکری استخبارات کرنے پر صرف ہوا ہوگا اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ بتایا گیا ہے کہ اولین سالوں میں حضورؐ راتوں کو پہرا بھی دیا کرتے تھے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ان نو سالوں کے دوران میں مدینہ منورہ کی فضا پر ہمہ وقت جنگ منڈلاتی رہتی تھی۔ عجیب اتفاق ہے کہ سیرت نگاری کا آغاز غزوات نگاری سے ہوا اور وہی موضوع ایسا ہے جسے تبع تابعین کے بعد سے نظر انداز کیا گیا ہے۔ یہ موضوع اہم ہونے کے علاوہ اس قدر بسیط بھی ہے کہ اس کے لیے محکم بنیادوں پر قائم اداروں کی ضرورت ہے۔ یہ کام افراد کے بس کا نہیں اور شاید اسی لیے اب تک تشنۂ تحقیق ہے۔ [ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ حضورؐ کے طریق کار اور اسوۂ حسنہ کا مطالعہ کیا جائے۔ اعلائے حق کے لیے بلاخوف فوری پیش قدمی، مگر معاف کرنے، شفقت کا طریقہ اختیار کرنے، انتقام کے شائبے تک سے پاک ہونے کے جو نمونے غزوات سے ظاہر ہوتے ہیں ان کی مثال ملنی محال ہے]۔

مآخذ: کتب احادیث: (۱) محمد بن اسمٰعیل البخاری: الصحیح، ج ۲، کتاب الجہاد، ج ۳، کتاب المغازی، مطبوعہ لائیڈن، بدون تاریخ؛ (۲) مسلم النیساپوری: الصحیح، ۵: ۱۳۹ - ۲۰۰، کتاب الجہاد و السیر، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۳۲ھ؛ (۳) احمد بن حنبل: مسند، حیدر آباد دکن، بمواضع کثیرہ؛ تفاسیر بسلسلۂ آیات ذیل: ۲ [البقرۃ]: ۱۹۰ تا ۱۹۵، ۳ [آل عمران]: ۱۲ تا ۱۳، ۱۲۱ تا ۱۷۵؛ ۸ [الانفال]: ۱ تا ۷۵؛ ۹ [التوبۃ]: ۱ تا ۱۵، ۲۵ تا ۲۹، ۸۰ تا ۱۲۳؛ (۴) البیضاوی: انوار التنزیل و اسرار التاویل، مطبوعۂ قاہرہ ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء؛ (۵) القرطبی: الجامع لاحکام القرآن، مطبوعہ مصر؛ (۶) الطبری: جامع البیان فی تفسیر القرآن، بولاق ۱۳۲۲ تا ۱۳۳۰ھ؛ (۷) ابن کثیر: تفسیر، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۰۲ھ؛ (۸) الزمخشری: الکشاف عن حقائق التنزیل، بولاق ۱۲۸۱ھ؛ (۹) فخر الدین الرازی: مفاتیح الغیب المعروف بہ تفسیر الکبیر، بولاق ۱۲۷۹؛ کتب تاریخ: (۱۰) الطبری: تاریخ الرسل و الملوک، ج ۱، مطبوعہ لائیڈن؛ (۱۱) ابن کثیر: البدایۃ و النہایۃ، مطبوعۂ قاہرہ؛ (۱۲) امین سعید: حروب الاسلام؛ (۱۳) ابن الاثیر: الکامل فی التاریخ؛ (۱۴) ابن خلدون: تاریخ؛ (۱۵) الیعقوبی: تاریخ، ۱ و ۲ مطبوعۂ بیروت ۱۹۶۰ء؛ کتب سیر و مغازی: (۱۶) الواقدی: کتاب المغازی، ۳ جلدیں، طبع Marsden Jones، آکسفرڈ ۱۹۶۶ء؛ (۱۷) ابن سعد: کتاب الطبقات الکبیر، ج ۱ تا ۸، مطبوعۂ بیروت ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء؛ (۱۸) علی بن برہان الدین الحلبی: انسان العیون فی سیرۃ الامین و المأمون المعروف بالسیرۃ الحلبیہ، ج ۱ تا ۲، قاہرہ ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۳ء؛ (۱۹) ابن الجوزی: الوفا باحوال المصطفیٰ، مطبوعۂ لاہور، بار دوم، ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء، ۲ جلدیں؛ (۲۰) ابن ہشام: السیرۃ النبویۃ، طبع مصطفی السقا وغیرہ، قاہرہ ۱۳۵۵ھ/۱۹۲۶ء، ج ۱ تا ۴؛ (۲۱) القسطلانی: المواہب اللدنیہ، مع محمد بن عبدالباقی الزرقانی: شرح المواہب اللدنیہ، ۸ جلدیں مطبوعہ قاہرہ ۱۳۲۵ھ؛ (۲۲) ابن القیم: زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، مطبوعۂ قاہرہ ۱۳۲۵ھ؛ (۲۳) محمد شیث خطاب: الرسول القائد، اردو ترجمہ از رئیس احمد جعفری: آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم بہ حیثیت سپہ سالار، کراچی؛

(۲۴) محمد حمید اللہ : عہد نبوی کے میدان جنگ، مطبوعۂ حیدر آباد دکن (بدون تاریخ) ؛ (۲۵) شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی : سیرۃ النبی، ج ۱ و ۲، مطبوعۂ اعظم گڑھ، بار ششم ؛ (۲۶) سلیمان منصور پوری : رحمۃ للعالمین، ج ۱ تا ۳، مطبوعۂ کراچی ؛ (۲۷) محمد حسین ہیکل : حیاۃ محمد، مطبوعۂ قاہرہ، ۱۹۳۷ء.

(گلزار احمد [و ادارہ])

عہد نبوی میں نظم و نسق مملکت : آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم جس دین کو لے کر آئے تھے، حکمت ایزدی کا تقاضا تھا کہ اسے باقاعدہ عملی شکل میں نافذ کرکے دنیا کے سامنے ایک جامع اسوہ پیش کیا جائے ؛ چنانچہ ارشاد باری ہے : هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (۴۸ [الفتح] : ۲۸)، یعنی وہی ذات ہے کہ جس نے اپنا رسول بھیجا پیغام ہدایت اور دین حق دے کر، تاکہ سچے دین کو تمام ادیان پر غالب کر دے].

رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم مکہ مکرّمہ میں پیدا ہوئے۔ زندگی کے ترپن سال وہیں گزارے [ابن العماد : شذرات، ۱ : ۱۳]۔ پھر مدینہ منورہ جا بسے اور دس سال بعد رفیق اعلٰی سے جا ملے (ربیع الاوّل ۱۱ھ/۶۳۲ء)۔ اسلام سے پہلے مکہ مکرمہ میں ایک سادہ شہری ریاست نما نظام قائم تھا۔ وہاں کوئی بادشاہ تو نہ تھا، لیکن شہر کے دس ممتاز تر قبیلوں کے سردار وہاں کی مجلس حکومت کے رکن ہوتے تھے، جن کے عہدے غیر متغیر بلکہ موروثی ہوتے۔ اس کی تاریخ اور تفصیل میں گئے بغیر (جس کے لیے دیکھیے محمد حمید اللہ : عہد نبوی میں نظام حکمرانی، باب شہری مملکت مکہ) اس قدر ذہن میں رکھنا کافی ہوگا کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اپنے قبیلے بنو ہاشم کو جو خدمت [منصب، ذمے داری] ملی تھی اس میں ایک تو چاہ زمزم کی تولیت، یعنی حاجیوں کے آب نوشیدنی کا انتظام اور دوسرے حرم کعبہ میں ادب ملحوظ رکھوانا اور شور و غل نہ ہونے دینا داخل تھا۔ [نیز افادہ، یعنی تجارت کے لیے سہولتیں حاصل کرنے اور اسی مقصد کے لیے دوسری اقوام سے رابطہ رکھنا بھی بنو ہاشم کے پاس تھا (ابن سعد : الطبقات، ۱ : ۷۷)]۔ اس کے علاوہ خارجہ معاملات کی ذمے داری بنو عدی میں (حضرت عمرؓ کے پاس) تھی ؛ دیوانی عدلیہ بنو تیم میں (حضرت ابو بکرؓ کے پاس) ؛ علمبرداری (لواء) اور الحجابۃ [بیت اللہ شریف کی کنجی برداری اور دارالندوہ میں اجلاس کی طلبی اور انتظام (ابن سعد : الطبقات، ۱ : ۷۷)] بنو عبدالدار میں ؛ فوج کی کمان بنو امیّہ میں (حضرت ابو سفیان کے پاس) ؛ سوار فوج کی قیادت بنو مخزوم میں (حضرت خالدؓ بن الولید کے پاس) تھی، لیکن یہ واضح نہیں کہ متعلّقہ فرائض سے خارج [یا متعلّق] اس مجلس مناصب کا کبھی عام اجتماع بھی ہوتا تھا یا نہیں، مگر (کسی اہم معاملے کے در پیش ہونے پر) شہر کے دارالندوہ (سہولت کے لیے پارلیمان کہ لیجیے) کا البتہ وقتاً فوقتاً اجلاس طلب کیا جاتا، جس میں شہر کے چالیس سالہ یا زیادہ عمر کے سب باشندے شریک ہو سکتے تھے.

بنو ہاشم کا عہدہ ایک زمانے میں جناب عبدالمُطّلب کے پاس تھا ؛ پھر ان کے بیٹے ابو طالب کو وراثت میں ملا۔ قبیلے کی سرداری ابو طالب کے بھائی ابو لہب کو ملی۔ ابو طالب نے تنگ دستی کے باعث اپنا عہدہ سِقایہ اپنے بھائی حضرت عباسؓ کو دے دیا۔ ابو لہب کو اس میں کوئی دخل نہ رہا، بلکہ وہ حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد میں متوارث ہو گیا۔

جب بعثتؐ [۱۳ ق ھ] سے اسلام کی تبلیغ کا آغاز ہوا تو اگرچہ قریشی بت پرستوں نے شدید

مخالفت اور اہل اسلام کی ایذا رسانی سے اس کا استقبال کیا، لیکن اسی صورت حال نے مسلمانوں میں یکجہتی [پیدا کر دی۔ مسلمانوں کے باہمی نظم و نسق نے آئے دن ترقی کی اور اس طرح] نظم و نسق بجز اراضی کے، جملہ عناصر مملکت اس جماعت میں پیدا ہو گئے۔ [مملکت اصولاً ہے ہی یہی کہ] ایک امیر جس کی سب اطاعت کریں، اسے عدل گستری کے لیے قانون سازی کا حق بھی حاصل ہو؛ ان چیزوں کا مکے میں موجود ہونا مملکت کے وجود کا کافی ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ کسی حد تک زرعی پیداوار سے کچھ حصہ راہ خدا میں صرف کرنے کا جب کہ وہ گھر آ جائے (۶ [الانعام] : ۱۴۱) اور اپنا دفاع آپ کرنے کے ارشاد خداوندی (۴۲ [الشوریٰ] : ۳۹ تا ۴۱) سے اس کی تنظیم اساسی میں مزید شدت آ گئی۔ زکوٰۃ ابھی سرکاری طور سے واجب الادا تو نہیں تھی، لیکن تجارت وغیرہ کی آمدنی سے غالباً قبل اسلام اہل مکہ جو رقم بتوں کے چڑھاوے میں خرچ کرتے تھے وہ اب مکی مسلمان قیاساً آنحضرت ؐ کی خدمت میں، یا حاجت مندوں کو براہ راست دے دیتے ہوں گے، تاکہ ان کی مدد مرکزی طور پر کی جا سکے؛ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مکی دور میں مسلمان مملکت در مملکت کی حالت میں تھے [نیز دیکھیے آنحضرت ؐ بہ حیثیت مقنن]؛ بلکہ قرآن کی ایک آیت (۴۲ [الشوریٰ]: ۳۸) سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس دور میں اہل اسلام کی ایک شورائی مجلس معرض وجود میں آ چکی تھی۔ تمام صحابۂ کرام رض اس مجلس مشاورت کے رکن تھے۔ کسی بھی ضرورت کے پیش آنے پر وہیں مشورے سے فیصلہ کیا جاتا ہوگا۔ اس کا اجتماع دار ارقم رض بن ابی ارقم میں ہونا اقرین قیاس ہے کہ وہی آپ ؐ کے لیے اور اہل اسلام کے لیے مکی مرکز کا کام دیتا تھا۔

جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہ ایسا مقام تھا جہاں گاؤں اور قبائلی بستیاں تو تھیں، لیکن کوئی بڑی یا چھوٹی مملکت نما قسم کی کوئی چیز بالکل نہ تھی اور شاید جلد قائم بھی نہ ہو سکتی، کیونکہ اوس اور خزرج کے خونریز جھگڑے ان کو آسانی سے متحد نہ ہونے دیتے تھے، لیکن ہجرت نبوی ؐ پر مشرکین مکہ نے انصار مدینہ کو دھمکی دی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو قتل یا شہر بدر کر دیں، ورنہ اہل مکہ مناسب تدبیر خود اختیار کریں گے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے دفاعی ضرورتوں کے بارے میں شہر کے مسلمانوں اور غیر مسلموں سے مشورہ کیا کہ کیوں نہ ایک شہری نظام قائم کیا جائے جس سے شہر کے تمام لوگوں کی حفاظت کا اہتمام ہو سکے؛ شہر کے اکثر لوگوں نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ (اوس کے چار خاندانوں کے خارج رہنے کا ذکر آتا ہے جو غالباً ابو عامر راہب کے رشتہ دار اور عیسائی تھے)۔ باقی سب، یعنی مہاجرین مکہ و انصار مدینہ نیز مدینہ منورہ کے غیر مسلم عرب اور یہودی سب، اس میں شریک ہوئے۔ اس موقع پر متفقہ طور پر [غیر مسلموں کی طرف سے آپ ؐ کو اپنا سردار مان لینے سے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سیاسی فتح پر روشنی پڑتی ہے وہاں اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بے پناہ سیاسی و عسکری تدبر کی بھی بھرپور عکاسی ہوتی ہے]۔

اس مملکت (= ریاست) کا ایک تحریری دستور مرتب ہوا، جسے تاریخ نے محفوظ رکھا ہے (دیکھیے محمد حمید اللہ: *The first written-consitution in the world*، مطبوعۂ لاہور: [نیز رک بہ میثاق مدینہ]) اور اس میں حکومت کے ذمے داروں اور حکومت کے اطاعت گزاروں، الغرض دونوں اطراف، کے حقوق و فرائض کافی وضاحت سے بیان کیے گئے ہیں اور

غیر مسلموں کے حقوق کو بھی نہیں بھلایا گیا۔ اس میں انھیں دینی و عدالتی معاملات میں داخلی خود اختیاری ہی نہیں، بلکہ معاقل (سماجی مالی تحفظ) وغیرہ میں مسلمانوں کے ساتھ مساوات عطا کی گئی ہے۔ اس دستور کو اصل میں بیعت عقبۂ ثانیہ کا تتمہ سمجھنا چاہیے، جس میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے انصار کے لیے اپنی طرف سے مختلف قبائل پر بارہ نقیب مامور فرمائے تھے اور ایک کو نقیب النقباء نامزد کرکے گویا مرکزیت پیدا کر دی تھی [نیز رک بہ مدینہ]۔ مدینہ منورہ میں اسلام سے قبل کسی مملکت کا ڈھانچا موجود نہ تھا؛ صرف قبیلے بستے تھے اور ان میں سے ہر ایک میں اپنا اپنا غیر منظّم "نظم و نسق" پایا جاتا تھا، جو قبیلے کے سردار کی ذات سے مربوط ہوتا تھا۔ جب وہاں پہلی دفعہ نظم و نسق کا ایک شہری نظام قائم کیا گیا تو ظاہر ہے ہر چیز کو از سرنو قائم کرنا اور بتدریج ترقی دینا تھا۔ [حالت یہ تھی کہ] مرکزی انتظامیہ کے ملازمین نہ تھے، خزانہ نہ تھا، فوج نہ تھی، عدالت نہ تھی؛ شروع میں ہر مشکل مسئلے میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم سے رجوع کیا جاتا اور ہر کام رضاکارانہ ہوتا تھا اور چونکہ پرانا نظام فوری ضرورتوں کے لیے کافی تھا، اس لیے بغیر کسی معقول وجہ کے قبائل کی خود اختیاری میں دخل نہیں دیا گیا۔

اصول کے طور پر ہوا ہو، یا سہولت کی خاطر، بہرحال غیر مسلموں کو نظم و نسق میں ہی نہیں، قانون اور عدل گستری میں بھی کامل خود مختاری رہی۔ ان پر اسلامی قانون نافذ نہ کیا گیا اور یوں بھی بجز دو ایک مرکزی امور کے (مثلاً دفاع اور بین القبائل نزاعات میں آخری فیصلہ) ہر قبیلے کو اندرونی خود مختاری رہی۔ اس تنظیم کا ناگزیر نتیجہ یہ نکلا کہ غیر مسلم مدنی قبیلوں میں قبیلہ وار پنچائتیں برقرار رہیں۔ مزید برآں مسلمان قبائل میں ایک مرکزی "پارلیمان" کی ضرورت تھی اور وہ فوراً وجود میں بھی آ گئی اور یہ مسجد نبوی تھی۔ سارے مسلمان، مرد ہوں کہ عورتیں، گویا اس کے رکن تھے۔ اس پارلیمان کا ہر روز پانچ بار اجلاس ہوتا اور رائے عامہ سے مسلسل رابطہ رہتا، کیونکہ وہاں نئی ریاست کا سربراہ روزمرّہ کے سیاسی اور اجتماعی مسائل سے بھی بحث کرتا؛ ضرورت پڑنے پر غیر معمولی اجلاس بھی ہوتے۔ نمازوں سے باہر بے وقت لوگوں کو جمع ہونے کا اعلان کیا جاتا تو تمام لوگ بھاگے چلے آتے۔ تحیّۃ المسجد سے فارغ ہونے کے بعد آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم منبر پر چڑھ کر واقعات بیان کرتے اور مشورہ طلب فرماتے اور خاص کر ہر قبیلے کے نمائندے یعنی سردار سے توقع کی جاتی کہ وہ تائید یا اختلاف کے لیے ضرور رائے دے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعض افراد سے انفرادی مشورے بھی ہمیشہ ہوتے رہے؛ غالباً اسی لیے حضرت عبداللہؓ بن عبّاسؓ کا قول ہے کہ حضرت "ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ رسول اللہؐ کے دو وزیر تھے" (الذہبی: تذکرۃ الحفاظ، ۱: ۲ ببعد، ۹ تا ۸)۔ امام احمد ابن حنبل (مسند، حدیث ۹۵، ۱۲۰۵ وغیرہ) نے خود رسولؐ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ گزشتہ پیغمبروں کے سات وزرا ہوتے تھے؛ اللہ تعالیٰ نے مجھے چودہ وزیر عطا کیے ہیں"۔ ممکن ہے اس سے مراد اوس اور خزرج کے بارہ نقیب اور مہاجرین میں سے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم اجمعین ہوں۔ ہجرت مدینہ سے قبل ہی قرآن مجید کی سورۃ الشوریٰ نازل [عدد تلاوت ۴۲] ہو چکی تھی اور اس میں مشاورت لازم قرار دی گئی تھی۔ بیعت عقبہ کے بعد، لیکن ہجرت سے قبل، مدینہ منورہ میں مسجدیں بن گئی تھیں اور وہ بھی مسلمانوں کی گویا مشاورت گاہ تھیں۔ ہجرت کے بعد اور قبا سے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی مدینہ منورہ منتقلی پر آپؐ نے

بنو النجار کی زمین قیمتاً حاصل کر کے اس پر مسجد نبوی کی بنیاد رکھی ۔ یہ مسجد مقام عبادت ہونے کے علاوہ مرکزی پارلیمان کا کام بھی دیتی ۔ اس کے ساتھ ازواج مطہّرات کے کمروں کے علاوہ ایک کمرہ زور (یعنیٰ ملاقاتوں کا مقام) اور ایک عُلّیہ (یعنی بالا خانہ) بھی بنایا گیا ، جو سرکاری خزانے اور سٹور کا کام دیتا تھا ۔ حضرت بلالؓ ، جو مؤذن بھی تھے ، اس خزانے کے نگران تھے ۔ صدقہ ، خیرات، مال غنیمت اور دیگر ساری سرکاری چیزیں وہاں رکھی جاتی تھیں اور آنحضرتؐ کے ارشاد کے مطابق ان کو خرچ کیا جاتا تھا ۔

شروع میں تو حضرت بلالؓ اور دیگر مستقل یا جز وقتی کاتبوں کو کوئی معاوضہ دینے کا سوال نہ تھا ، بعد میں عین ممکن ہے آپؐ [بغیر تعین کے کچھ نہ کچھ ان کی مالی امداد فرماتے ہوں]؛ کیونکہ البخاری (کتاب الزکوٰۃ ، باب ۵۱ : من اعطاہ اللہ شیئًا من غیر مسئلہ») کے مطابق آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے ایک بار حضرت عمرؓ کو کچھ عطیہ دیا تو انھوں نے لینے سے یہ کہ کر انکار کیا کہ کسی محتاج کو وہ رقم دے دی جائے ، مگر آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے فرمایا کہ جو عطیہ بغیر مانگنے اور بغیر ذلّت اٹھانے کے ملے اسے لے لینا چاہیے ۔ بہرحال ، مدینہ منوّرہ میں شروع ہی سے متعدد کاتب موجود تھے ، کچھ آپؐ کے خطوط اور پروانے لکھتے ، کچھ قرآن کے نازل ہونے والے اجزا کو قلمبند کرتے اور غالباً ان کی چند نقلیں بھی تیار کر کے مسجد میں اور امّت میں پھیلاتے ؛ کچھ مال غنیمت کی تفاصیل قلمبند کرتے ۔ پھر توسیع مملکت پر صوبہ جات میں انتظامی افسر مامور ہونے ناگزیر تھے ۔ [آپؐ صرف ایک عظیم منتظم ہی نہ تھے، بلکہ منتظم شناس بھی تھے؛ چنانچہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم دور جاہلی کے خصوصی خاندانی امتیازات کا لازمی لحاظ فرماتے تھے ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ پہلے سے تربیت یافتہ ہوتے تھے؛ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپؐ نے غزوۂ بدر میں جنگ کا لواء (جھنڈا) اس کو دیا] جو موروثی طور پر لوا بردار تھا اور فرمایا کہ اسلام حق رسانی کا حکم دیتا ہے ۔

کسی گفت و شنید کے لیے ایک سفیر کو بھیجنے کی ضرورت ہوتی تو مکّے کے موروثی سفیر حضرت عمرؓ کا انتخاب فرماتے اور اگر کسی وجہ سے وہ خود اس کی معذرت کرتے ، تو پھر کسی اور کو بھیجا جاتا ، جیسا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عثمانؓ کو مکّے جا کر گفت و شنید کرنے کا حکم دیا گیا ۔ حضرت خالدؓ بن ولید مسلمان ہوئے تو انھیں سوار فوج کی کمان سپرد کی گئی جو مکّہ مکرمہ میں ان کی موروثی خدمت تھی ؛ فتح مکہ پر کعبے کی چابی اور چاہ زمزم کی نگرانی قدیم موروثی ذمے داروں کے لیے برقرار رکھی گئی اور تبدیلی قبول نہ فرمائی۔ (آپؐ نے عرفات اور مزدلفہ کے انتظامات حج بھی سابقہ لوگوں ہی کو دینا چاہے ، مگر وہ لاوارث مر چکے تھے) ۔

دفاعی انتظامات میں کئی باتیں قابل ذکر ہیں:

شروع میں سرکاری خزانہ خالی تھا ۔ اس لیے تنخواہ دار فوج رکھنے کا سوال ہی نہ تھا ۔ اس کا حل یوں کیا گیا کہ جہاد ہر عاقل بالغ مسلمان (مرد) کا فریضہ قرار دیا گیا [اور فوجی خدمت کے صلے میں مال غنیمت (رک بہ انفال) کے پانچ حصوں میں سے چار حصے مصروف جہاد فوج میں تقسیم کرنے کا اعلان کیا گیا] ۔ فوجی خدمت لازمی تو ہو گئی لیکن ہر وقت سارے لوگوں کی ضرورت نہ ہوتی تھی اور محض مطلوبہ مقدار میں لوگ لیے جاتے ۔ ان کا ایک افسر نامزد کیا جاتا ، یا آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم خود مرکز میں تشریف فرما رہ کر اور بعض اوقات موقع پر جا کر کمان کرتے ۔ رضا کاروں کی مسجد

میں عام اعلان کے ذریعے طلبی ہوتی تو ایک رجسٹر کھولا جاتا، جس میں لوگ اپنے نام درج کراتے۔ اگرچہ ہر شخص اپنے مصارفِ حمل و نقل، اسلحہ اور غذا خود برداشت کرتا، لیکن حکومت بھی حسب ضرورت اور حسب امکان مدد کرتی۔ نظم و ضبط بڑھانے کے لیے مال غنیمت، کسی فرد خاص کا نہیں بلکہ تمام فوج کا مساوی حق قرار دیا گیا۔ تشویق کے لیے یہ حکم دیا گیا کہ اموال غنیمت مرکزی حکومت کو خُمس ($\frac{1}{5}$) اور فوج کے سپاہیوں کو $\frac{}{5}$ تقسیم کیے جائیں گے؛ چنانچہ سپہ سالار اور معمولی سپاہی کو مساوی حصہ ملتا، البتہ سوار کو پیادے سے دوگنا حصہ دیا جاتا کہ اس پر گھوڑے کی غذا کا بھی بار رہتا تھا۔ اگر مدینہ منورہ پر حملہ ہوتا تو مسلم اور غیر مسلم سبھی آنحضرتؐ کی کمان میں مدافعت میں حصہ لیتے؛ [اگر کبھی اس مقصد کے لیے مدینہ منورہ سے باہر جانا پڑتا] تو دستور نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ جس کو چاہیں غداری کے احتمال پر فوج میں شریک ہونے سے روک دیں۔

حقیقی اطمینان۔ اسی وقت ہو سکتا تھا کہ اس شہری مملکت میں مسلمان اکثریت حاصل کر لیں۔ اس کے لیے سنہ ۱ھ جیسے ابتدائی زمانے میں مدینہ منورہ کے محلہ بین (= ی ی ن) میں قبیلہ اسلم کی نو آبادی بس گئی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ بے شمار قبیلہ وار محلے مدینے میں نظر آنے لگے، جو دور دراز کے قبائل کے افراد سے مختص تھے، مثلاً جہینہ، مزینہ، بنو اشجع وغیرہ۔

فوج کے معنی صرف سپاہیوں اور اسلحہ کے نہیں، بلکہ افراد میں حربیاتی مہارت، مقصد کے لیے جان دینے کی امنگ، غذا اور پانی جیسی اساسی چیزوں سے محرومی کو برداشت کرنے کی عادت اور دیگر ایسی ہی چیزیں ہیں، اسی لیے پورے سال مدینہ منورہ میں تیر اندازی، دوڑ وغیرہ کی مشق کرائی جاتی؛ تشویق کے لیے اس میں اور گھڑ دوڑ میں انعام دیے جاتے؛ شہید کے لیے جنّت کی لازوال نعمتوں کا مژدۂ جانفزا سنایا جاتا۔ پھر رمضان المبارک کے روزے فرض قرار دیے گئے اور جہاد کو جزو اسلام قرار دیا گیا۔ پنجوقتہ نماز کا وجوب اور نماز تہجّد کی تشویق فوجی ضرورتوں کے لیے بھی بڑی مفید چیزیں تھیں۔ جنگ کا مقصد دشمن کو جان و مال کا نقصان پہنچانا نہیں، بلکہ اعلاے کلمة اللہ تھا؛ اس لیے ممکنہ حد تک خونریزی کم کی جاتی۔ نفسیاتی لمحے میں دشمن سے نرمی بھی کی جاتی کہ صرف ماتحت ہی نہیں، دل سے مسلمان بھی ہو جائے اور تن من دھن سے ساتھی بن جائے۔ جب حکومت کے وسائل بڑھے تو عہد نبوی ہی میں وہ نظام شروع ہوا جو بعد میں دیوان کے نام سے حضرت عمرؓ کی شہرت کا باعث ہوا ہے: چنانچہ السَّرَخسی نے شرح السیر الکبیر (۲: ۲۵۶) میں امام محمد الشیبانی سے یہ روایت کی ہے کہ "فکانت تجمع الاخماس و کانت الصدقات علٰحدة لها اهل، و للفیء اهل و کان یعطی من الصدقة الیتیم و الضعیف و المسکین فاذا اختلم الیتیم و جب علیه الجهاد نُقل الی الفیء و ان کره الجهاد لم یعط من الصدقة شیئاً و امر بان یکتسب لنفسه" یعنی عہد نبوی ہی میں غنیمتوں کا پانچواں حصہ اور صدقات یعنی زکوٰة کی رقمیں الگ الگ جمع کی جاتی تھیں اور اس (زکوٰة) کے مصارف الگ تھے، جبکہ فیء (مال غنیمت) کے مستحق الگ ہوتے؛ آپؐ زکوٰة سے یتیم، ضعیف اور مسکین کی مدد فرماتے؛ یتیم جب بالغ ہو جاتا اور اس پر جہاد فرض ہو جاتا تو اسے فیء کے مستحقین میں منتقل کر دیا جاتا، لیکن اگر وہ جہاد سے کتراتا تو اسے زکوٰة سے کچھ نہ دیا جاتا اور اسے حکم دیا جاتا کہ وہ خود کما کر کھائے۔ ان امدادی وظائف کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان چوبیس

گھنٹے فوجی خدمت کے لیے تیار رہتے ، اور خاندان ، وسائل کسب معیشت سب کچھ چھوڑ کر فوراً سفر پر جانے کے لیے حاضر رہتے ۔ غزوۂ بدر میں عورتیں ساتھ نہ لی گئیں ، بعد میں وہ نرس ، باورچی وغیرہ کی صورت میں معقول تعداد میں نظر آتی ہیں ؛ [یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ مسلمان مال غنیمت کے حصول کے لیے جہاد نہیں کرتے تھے ، بلکہ ان کا اصل مقصد جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ سربکف رہتے ، رضائے خداوندی کا حصول ، اور دین اسلام کی عمومی نشر و اشاعت تھا ۔ مال غنیمت کا حصول ایک ثانوی چیز ہے ، جس پر کبھی مجاہدین کی نظر نہیں رہی]۔

جب قبول اسلام یا فتح کے باعث مختلف علاقوں کا اسلامی مملکت سے الحاق عمل میں آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے انتظامی امور کے لیے مندرجہ ذیل طریقہ اختیار فرمایا : یا تو وہاں پرانے سردار کو مسلمان ہو جانے کے بعد برقرار رکھا جاتا؛ (معاہدہ ہونے کی صورت میں بھی اس علاقے کے انتظامی ڈھانچے کو تبدیل نہ کیا جاتا) ، ورنہ کسی نئے نو مسلم شخص کو نامزد کیا جاتا ، اور اس سلسلے میں عموماً دیکھا یہ جاتا کہ اسے قرآن کتنا یاد ہے ۔ [وجہ یہ تھی کہ ایسے شخص کی وفاداری پر اعتماد کیا جا سکتا تھا] ؛ عمر کی قید نہ ہوتی ۔ بڑے علاقوں میں قبائلی سرداروں کے علاوہ عامل (گورنر) ، قاضی (حاکم عدالت) ، معلم ، مُحصّلِ زکوۃ مامور کیے جاتے اور بعض اوقات ایک ہی فرد کو بوقت ضرورت متعدد فرائض انجام دینے پڑتے ۔ کوئی حکمران اپنی پوری حکومت کے ساتھ مسلمان ہو جاتا تو اسے اس کی حکومت پر باقی رکھا جاتا اور وہاں مرکز کے ایک نمائندے کو بطور مندوب مامور کرکے انتظامی کام بانٹ دیا جاتا ، مثلاً عُمان میں جُلَنْدی کے دو بیٹے جیفر اور عبد مشترکہ حکمران تھے ، دونوں مسلمان ہوگئے تو ان کے ہاں حضرت عمروؓ بن العاص کو بطور نمائندہ مرکز مامور کیا گیا ۔ غیر مسلموں کے معاملات حسب سابق کُلِّیَۃً مقامی حکمرانوں سے متعلق رہے ، جبکہ اسلامی معاملات ، مثلاً مسلمانوں کی تعلیم ، عدلیہ ، زکوۃ وغیرہ مرکز کے نمائندے سے متعلق ہوئے ۔ ممکن ہے کہ تعلیم کے لیے مددگار بھی مامور ہوئے ہوں ۔ نجاشی حکمران حبشہ غالباً مسلمان ہو گیا تھا ، کیونکہ اس کی وفات پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے غائبانہ نماز جنازہ پڑھی ، لیکن وہاں کسی نمائندے کے بھیجے جانے کا پتا نہیں چلتا ، جس کی وجہ یہ ہے کہ نجاشی اصحمہ کا جانشین غیر مسلم تھا اور اس نے کبھی اسلام قبول نہ کیا ، گویا اصحمہ شخصی حیثیت میں رسول اکرمؐ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ماتحت تھا ، حکمران کی حیثیت سے نہیں ، اسی لیے حبشہ کے اسلامی مملکت سے کوئی سیاسی روابط نظر نہیں آتے ۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا انتظامی امور میں ایک معمول یہ بھی تھا کہ اگر کسی عہدے پر کسی مہاجر کو مامور فرماتے تو کسی انصاری کو بھی کسی مماثل خدمت پر نامزد کرتے [تاکہ کسی کو اپنی حق تلفی کا احساس نہ ہو] ذمہ داری تفویض کرنے میں اخلاق تربیت ہمیشہ پیش نظر رہتی؛ چنانچہ البخاری نے متعدد دفعہ یہ حدیث نبویؐ نقل کی ہے کہ "ہم کسی عہدے کے خواہشمند کو اس خدمت پر مامور نہیں کرتے"۔ اسی طرح ایک مرتبہ محصّل زکوۃ نے جب واپسی پر آ کر کہا کہ "یہ سرکاری مال ہے اور یہ مجھے تحفہ دیا گیا ہے" تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سخت خفا ہوئے اور منبر پر چڑھ کر فرمایا : ایسے لوگ کیوں نہ اپنے گھر بیٹھے رہیں اور دیکھیں کہ انھیں کتنے تحفے آتے ہیں"۔

مال کو قرآن (۴ [النساء] : ۵) میں اجتماعی قیام کے لیے اساس قرار دیا گیا ہے [جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا]۔

افراد کی طرح حکومتوں کو بھی اس کی ضرورت رہتی ہے اور بدرجۂ اولٰی۔ ظاہر ہے کہ حکومت یہ مال اپنی رعایا سے ہی حاصل کر سکتی ہے، مگر لوگوں کو جبر کے تحت اپنے مال کا کچھ حصہ کسی کو دینا ناگوار گزرتا ہے۔ اس گتھی کا حل ضروری تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں عرب کے بڑے شہروں، مثلاً مکّہ مکرمہ میں رفادہ کے نام سے ایک جبری خیرات موجود تھی اور خوش حال لوگ خواہی نہ خواہی اس کے عادی ہوگئے تھے۔ عام قبائل میں لوگ اپنی زرعی پیداوار اور جانوروں کے ریوڑوں کا کچھ حصّہ ہر سال خدا کے لیے اور کچھ حصّہ بتوں کے لیے دینے کے عادی تھے (دیکھیے ٦ [الانعام] : ١٣٦ تا ١٤١) اور اس خیرات کو "حق" تسلیم کیا جاتا تھا۔ اسلام نے بتوں سے چھڑا کر اسے خدا کا حق بتایا اور مرکزیت کی ترغیب دی اور اسے زکوٰۃ، صدقات، حق، انفاق فی سبیل اللہ کے مختلف معنی خیز ناموں سے یاد کیا۔ شروع میں یہ کام رضاکارانہ ہوتا تھا اور مقدار اور وقت کا تعیّن بھی نہ تھا۔ بتدریج یہ عناصر بڑھائے گئے۔ وہی چیز جو پہلے خیرات تھی اب زکوٰۃ کی صورت میں ایک مربوط اور مستحکم شکل میں نافذ کی گئی، جس میں وقت، فی صد مقدار اور نظم بھی آ گئے، اور زکوٰۃ کے علاوہ بھی لوگوں کو عام رضاکارانہ خیرات اور غریبوں کی مدد کی ترغیب دی گئی کہ اس کی جزا خدا دے گا۔

زکوٰۃ کے مداخل کی قرآن میں تفصیل کم ہے، لیکن مصارف کو (٩ [التوبة]: ٦٠) متعین کر دیا، یا آج کی زبان میں، بجٹ کے اصول بتا دیے گئے۔ مسلمانوں سے ہر مد پر لی جانے والی رقم زکوٰۃ ہی کہلاتی ہے: زکوٰۃ الارض، زکوٰۃ التجارۃ، زکوٰۃ المعادن، زکوٰۃ المواشی وغیرہ [نیز رک بہ عشر، مالیات، علم (معاشیات) وغیرہ]۔ غیر مسلم رعیّت سے جزیہ اور خراج کے نام سے ٹیکس لیا جاتا اور اس میں کچھ عملی نوعیت کا فرق تھا، یعنی بعض اسلامی صدقات غیر مسلموں پر معاف تھے (یا کم از کم ان کی اپنی مذہبی تنظیم کے لیے چھوڑ دیے گئے تھے) اور بعض مدّوں میں فی صد بڑھا دیا گیا اور بعض حرفتوں سے بھی غیر مسلموں کو مستثنٰی کر دیا گیا (مثلاً سود، شراب کی تجارت وغیرہ میں، جس سے ان کو خاصی، فوری اور جلد جلد آمدنی ہوتی تھی، لہٰذا ٹیکس بھی زیادہ دینا چاہیے تھا)۔ مسلمانوں کی آمدنی سے مؤلّفۃ القلوب کی حد تک تو غیر مسلم بھی مستفید ہوتے تھے۔ ابو یوسف نے اپنی کتاب [کتاب الخراج] میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے مدینہ منورہ کے ایک یہودی کا روزینہ مقرر کرتے ہوئے زکوٰۃ سے متعلقہ آیت سے استدلال کیا اور کہا "ھذا من مساکین اھل الکتاب" گویا ان کی رائے میں "فقرا" اور "مساکین" سے مسلمان اور غیر مسلم دونوں مراد ہیں۔ البلاذری نے شام کے عیسائیوں کے متعلق بھی حضرت عمرؓ کے مماثل طرز عمل کا ذکر کیا ہے۔ ابو عبید نے تو اپنی کتاب الاموال میں صدقۂ فطر کے متعلق بھی صراحت کی ہے کہ مسلمان ان کے زمانے میں غریب راہبوں اور پادریوں کو بھی دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ غیر مسلم رعایا سے آنے والے ٹیکس سے مسلمان بھی مستفید ہوتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ ساری رعایا خوش حال رہے اور اسلامی عملداری میں خدا ہی کا بول بالا ہو۔ اسی لیے قرآن (٥ [المائدة] : ٢) غیر مسلم دشمنوں سے بھی، وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ، یعنی ایک دوسرے سے نیکی اور تقوی پر تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی میں تعاون نہ کرو کا حکم دیتا ہے۔

عوام کے، یعنی سرکاری، مال میں غبن اور بیجا تصرف کو روکنا حکمران کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔ اس سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا طریقہ کتنا مؤثر تھا اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ زکوٰۃ میرے، میرے

اہل خاندان ، میرے اہل قبیلہ حتیٰ کہ میرے حلیف قبیلہ بنو عبدالمطّلب کے لیے بھی ہمیشہ کے لیے حرام تھے ۔ جب حکمران کے یہ اعزہ و اقارب اس میں تصرف بیجا نہیں کر سکتے تو ظاہر ہے کہ حکمران اپنے ماتحت سرکاری ملازمین ، وزرا وغیرہ کی زیادہ آسانی سے نگرانی کر سکتے ہیں ۔ رشوت ستانی اور دیگر ممنوعات و محرمات کی طرح بیک وقت مادی اور روحانی تعزیرات مقرر کی ہیں کہ ان جرائم کی صورت میں حکومت بھی سزا دے گی اور آخرت میں بھی خدا کے ہاں جوابدہی ہوگی ۔

حکومتوں کے لیے عدل گستری بھی لازم و ملزوم قرار دی گئی حتی کہ عربی لفظ "حکومت" کے معنی ہی تحکیم اور عدل گستری کے ہیں ۔ مدینے میں عہد نبوی ہی میں مفتی (شرعی مشیر) بھی پائے جاتے تھے اور وقت بوقت پنچ بھی مامور ہوا کرتے تھے ۔ مرکز سے دور قاضی مامور ہوتے رہتے اور قلت کار کے باعث متعدد فرائض ایک ہی شخص کے سپرد بھی کر دیے جاتے ، مثلاً حضرت معاذؓ بن جبل یمن میں بھیجے گئے تو وہ قاضی بھی تھے ، مدرّس بھی ، عامل بھی ، محصّل زکوٰۃ بھی اور ناظر تعلیمات بھی کہ گاؤں گاؤں دورہ کریں (جیسا کہ الطبری نے صراحت کی ہے) : ان کو احکام قرآن ، حدیث اور اجتہاد سے حاصل ہوتے تھے ۔

تعلیم پر شروع ہی سے بڑی توجہ مبذول کی جاتی رہی ۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ ہجرت سے قبل مکّے میں جیسے ہی کوئی وحی نازل ہوتی آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم اسے فوراً مردوں کے اجتماع میں ، پھر عورتوں کے جلسے میں تلاوت اور تبلیغ فرماتے ؛ مدینہ منورہ آتے ہی مسجد نبوی کی تعمیر ہوئی تو اس میں ایک حصہ بطور صُفّہ مختص کیا گیا ، جہاں دن میں معمولی ابتدائی تعلیم سے لے کر ہر قسم کی اعلیٰ تعلیم کا بندوبست تھا ، تو رات میں وہی مقام غریب اور بے گھر طلبہ کے لیے دارالاقامہ کا کام دیتا ۔ ان کے کھانے کا بھی انتظام تھا اور وہ خود بھی کچھ نہ کچھ محنت مزدوری کر کے کما لیتے تھے ۔ ان پر ایک عریف (مانیٹر) بھی مامور ہوتا تھا ۔ مدینے میں عہد نبوی میں کم از کم نو اور مسجدیں تھیں ۔ وہاں بھی اہل محلہ مبتدیوں اور بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی ۔ اساتذہ کو غالباً کچھ مدد معاش دلائی جاتی ، لیکن انہیں شاگردوں سے کچھ لینے کی سختی سے ممانعت تھی ؛ اسے جہنم کی آگ قرار دیا گیا تھا [نیز رک بہ المتعلم و المعلم] ۔

عام انتظامات میں تجارت اور بازار کی نگرانی ہوتی تھی ۔ یہ انتظام غبن اور دھوکا نہ ہونے دیتا ۔ باہر سے آنے والے کاروانوں سے چنگی وغیرہ کی وصولی کا سلسلہ غالباً قبل از ہجرت کے زمانے سے مدینہ میں موجود تھا ؛ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے اس کی اصلاح فرمائی اور اس کو ترقی بھی دی ۔ بظاہر ، سابق میں وہاں تاجروں اور بیوپاریوں سے ہر روز کچھ ٹیکس وصول کیا جاتا تھا ، جو اس سردار کو ملتا جس کے قبیلے میں بازار لگتا (جیسا کہ بازار بنی قینقاع کے متعلق نظر آتا ہے) ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ ٹیکس اسلامی بازار میں منسوخ کر دیا ۔ بازار کی نگرانی کے افسروں میں مسلمان عورتیں بھی نظر آتی ہیں ۔ ہمارے ماخذ ابن حجر نے ان کے فرائض نہیں بتائے ، [ممکن ہے] کہ یہ گھروں کے اندر خرید و فروخت کی نگرانی کرتی ہوں ؛ ایک ایسی نگران خاتون لکھنا پڑھنا بھی جانتی تھی ۔ شاید انہیں بیرونی کاروانوں کی چنگی سے کوئی تعلق رہا ہو ؛ شہری تعمیرات میں گلیوں کی چوڑائی کا لحاظ رکھا جانے لگا کہ کم از کم دو لدے ہوئے اونٹ بیک وقت آ اور جا سکیں ۔ گلیوں کی صفائی کا بھی انتظام ہونے لگا ۔ ڈاک کا انتظام البتہ غیر سرکاری اور غیر معیّن سا تھا ۔ کوئی شخص ، عورت ہو کہ مرد ،

کبھی سفر پر جاتا تو لوگ اس کو اس مقام کے لیے خطوط دیتے جہاں وہ جاتا ، یا جہاں سے وہ گزرتا ۔ حوالہ ، یعنی ایک مقام سے دوسرے مقام کو رقم بھیجنے ، کا کام ایسے مالدار تاجر کرتے ہوں گے ، جن کے دوست یا رشتہ دار دوسرے مقام پر رہتے ہوں ۔ خاص کر یہودیوں میں ، لیکن ایسی کوئی معیّن مثالیں مقالہ نگار کو نہیں ملیں ۔

مساجد کی امامت ، مؤذنی ، صفائی ، روشنی وغیرہ کی کافی تفصیلیں ملتی ہیں ۔ عام طور پر امامت امیر عسکر کے سپرد ہوتی ؛ اس طرح امامت امارت کے لوازم میں سے تھی [رک بہ مسجد] ۔ چونکہ اسلامی حکومت کا مقصد وحید ہی تبلیغ دین اور اعلاے کلمۃ اللہ تھا ، اس لیے اس کے لیے رات دن ہر ممکن تدبیر اختیار کی جاتی ، لیکن جبر و اکراہ کو قرآن نے ممنوع قرار دیا ۔ عہد نبوی میں عرب کے مختلف علاقوں کے قبیلوں اور عرب و بیرونِ عرب کے حکمرانوں کو تبلیغ کے لیے خطوط لکھے جاتے رہے اور ظاہر ہے کہ نامہ بر ایک عالم ہوتا ، جو دریافت پر تشریح اور توضیح بھی کر سکتا تھا ۔ تبلیغ ہر فرد مسلم کا فریضہ قرار دیا گیا ، اس لیے نو مسلم بھی مبلّغ بن جاتے اور اپنے ماحول میں تبلیغ کرتے اور کارکردگی اس طرح روز افزوں ہوتی جاتی ۔ اس کے نتائج کا اندازہ عہد نبوی کے مسلمانوں کی تعداد سے کیا جا سکتا ہے ، اگرچہ صحیح تعداد بیان کرنی ممکن نہیں ۔ بخاری شریف میں ایک مردم شماری کا ذکر بھی ہے ، جس میں پندرہ سو مردوں اور عورتوں کا اندراج ہوا تھا اور بظاہر یہ ہجرت کے عین بعد مدینے سے متعلق ہے ۔ حجۃ الوداع میں ایک لاکھ چالیس ہزار مرد اور عورتیں بیان کی گئی ہیں ! یہ حضورؐ کی وفات سے تین مہینے پہلے کا واقعہ ہے ، ظاہر ہے کہ تمام مسلمان اس وقت حج کو نہ آئے ہوں گے اگر ان کو جملہ مسلمانوں کی چوتھائی تعداد بھی فرض کر لیا جائے تو اس وقت کے جملہ مسلمان کم از کم پانچ لاکھ متصوّر ہوتے ہیں ۔ عہد نبوی کے آخر میں سارا عرب اور جنوبی عراق اور جنوبی فلسطین کے علاقے اسلامی مملکت میں داخل ہو چکے تھے ۔ ان کا رقبہ تیس لاکھ مربع کیلومیٹر (تقریباً بیس لاکھ مربّع میل) ہوتا ہے ۔ ان فتوحات میں میدان جنگ میں دشمن کے ماہانہ دو آدمی بھی قتل نہ ہوے ؛ اس سے انسانی خون کے احترام کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔

بیرونی تعلقات کے لیے سفارت کا طریقہ قدیم زمانے سے پایا جاتا تھا ۔ اسلام نے بھی اسے نہ صرف برقرار رکھا ، بلکہ ترقی دی ۔ اہل اسلام کی ہجرت مدینہ اور غزوۂ بدر میں اہل مکّہ کی ہزیمت پر مشرکین مکہ نے اس غرض سے سفیر حبشہ بھیجے تھے کہ وہاں جو مسلمان پناہ گزیں تھے ان کی تحویل کی کوشش کریں ۔ اس سازش اور شرارت کی اطلاع آپؐ کو ملی تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بھی ایک سفیر حبشہ بھیجا (جو اپنے مشن میں کامیاب رہا) ۔ یہ سفیر عمروؓ بن امیّہ الضّمری تھے ۔ تبلیغ اسلام کے لیے بھی سفیر بھیجے جاتے رہے اور دیگر ضرورتوں کے لیے بھی اور خود آپؐ کے پاس بھی سفیر آتے رہے ۔ ان سے ملاقات کے لیے مسجد نبوی میں ایک مقام معین تھا جہاں آج تک اسطوانۃ الوفود ، اس کی یادگار ہے ۔ ایک ایسے موقع پر آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کا قانونی قول مشہور ہے کہ آپؐ نے فرمایا ”لَوْ لَا اَنَّ الرُّسُلَ لَا يُقْتَلُ لَضَرَبْتُ اعناقکما“ یعنی اگر سفیروں کا قتل ممنوع نہ ہوتا تو میں تم دونوں کی گردن اڑا دیتا ؛ یہ مسیلمہ کذّاب کے بھیجے ہوے مرتد سفیروں سے متعلق ہے ۔ اسی طرح نصاریٰ نجران کے سفیر تبلیغ عیسائیت کے

لیے آئے تھے ، بحث اور گفت و شنید کے دوران میں ایک روز وہ جلسہ ملتوی کرکے باہر جانے لگے اور وجہ یہ بتائی کہ یہ ان کی عبادت کے اوقات ہیں ، اس پر آپؐ نے فرمایا : مسجد نبوی کے اندر بھی وہ اپنی عبادت کر سکتے ہیں ۔ مؤرخ ابن ہشام نے بیان کیا ہے کہ وہ لوگ مشرق کی طرف منہ کرکے اپنی عبادت کرتے رہے ۔ صلح حدیبیہ کے وقت مسلمانوں کے سفیر حضرت عثمانؓ کو مکے میں نظر بند کر دیا گیا اور ان کے قتل کی خبر اڑی تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے بیعت تحت الشّجرہ لی تاکہ اس کا بدلہ لیں ۔ پھر اہل مکہ سے صلح ہوئی تو دشمن کے سفیروں کو اس وقت تک روک رکھا گیا جب تک حضرت عثمانؓ صحیح و سالم واپس نہ آ گئے ۔ رومی (بوزنطی) علاقے میں مسلمانوں کے ایک سفیر کو جان سے مار ڈالا گیا اور قیصر روم نے مجرموں کو سزا دینے سے انکار کیا اور نہ صرف ایک لاکھ کی فوج بھیج کر مؤتہ میں مسلمانوں کے خلاف جنگ کی ، بلکہ معان کے بوزنطی گورنر کے مسلمان ہونے پر اس کو سولی کی سزا دی ۔ مؤتہ ، پھر تبوک کی مہمیں اسی سلسلے میں پیش آئیں ۔ آنحضرت صلّی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلّم نے بستر مرگ پر حضرت اُسامہؓ بن زید کو اسی سلسلے میں [اہل اُبنٰی (ایک شامی قصبہ، جسے آجکل الزیت کہتے ہیں) کے خلاف] بھیجنے کی وصیت فرمائی ۔ زندگی کی آخری وصیتوں میں رسول اکرمؐ نے یہ بھی فرمایا تھا: "اَجیزوا الوفودَ کما کُنتُ اجیزُھم" یعنی سفیروں، وفدوں کو اسی طرح تحفے تحائف دیتے رہو جیسے میں دیتا رہا ہوں ۔ مستقل سفیروں کی ابھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی ، لیکن حضرت عمروؓ بن العاص کا عُمان کے حکمرانوں کے ہاں متعین رہنا شاید اس چیز کے مماثل سمجھا جا سکتا ہے جو برطانوی ہند میں دیسی ریاستوں میں ریزیڈنٹ (مندوب) سے موسوم تھا اور جو ٹونس اور مراکش میں فرانسیسی مندوب کہلاتا تھا ۔ عہد نبوی میں، آپؐ کی ہدایات کے تحت اور آپؐ کی نگرانی میں مملکت مدینہ کے نظم و نسق کی یہی صورت رہی ۔ مزید تفصیلات کے لیے ماخذ کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے ۔

مآخذ : اس باب کے ماخذ بھی وہی ہیں جو رسول اکرمؐ کی حیات مبارکہ کے سلسلے میں درج ہو چکے ہیں، بطور خاص ملاحظہ ہوں : (۱) محمد حمید اللہ: عہد نبوی میں نظام حکمرانی ، دہلی ۱۹۳۶ء؛ (۲) وہی مصنف : عہد نبوی کے میدان جنگ : [(۳) وہی مصنف : رسول اکرم کی سیاسی زندگی ، لاہور ۱۹۵۳ء؛ (۴) وہی مصنف : مقالہ "Budgeting and Taxation in the Time of the Holy Prophet ، در *Pakistan Historical Society Journal* ، کراچی ، ۳ جنوری ۱۹۵۵ء [نیز دیکھیے (۵) ابن تیمیہ: السّیاسۃ الشّرعیہ فی اصلاح الرّاعی و الرّعیۃ : (۶) ابو الفرج، قدامہ بن جعفر : کتاب الخراج ، حیدر آباد دکن ، ۱۳۲۱ھ : (۷) ابو الکلام آزاد : مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب ، کلکتہ ۱۹۲۰ء : (۸) ابوالاعلٰی مودودی : اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ، علی گڑھ ، ۱۹۴۰ء : (۹) وہی مصنف : نبیوں کے حقوق ، مطبوعۂ لاہور : (۱۰) وہی مصنف : اسلام کا نظریۂ سیاسی ، مطبوعہ لاہور : (۱۱) ابو یوسف : کتاب الخراج : (۱۲) الماوردی : الاحکام السّلطانیہ : (۱۳) ابو عبید القاسم بن سلامؒ : کتاب الاموال ، مطبوعۂ اسلام آباد وغیرہ] ۔

(محمّد حمید اللہ [و ادارہ])

⊕ **رسول اکرمؐ بطور مقنّن :** [یہ اسلام کا خاص امتیاز ہے کہ اس میں قانون اور اخلاق دست بدست چلتے ہیں ، قانون اخلاق کا پاسدار ہے اور اخلاق قانون کا محافظ : یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم بیک وقت معلّم اخلاق بھی تھے اور مقنّن بھی ۔ بالعموم] نبی کا

تعلق اولاً عقائد و عبادات کی تعلیم یا تزکیۂ اخلاق اور تصفیۂ قلوب سے ہوتا ہے، ثانیاً کسی اور شے سے؛ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعلق بیک وقت دونوں سے ہے۔ اس کی وجہ بظاہر یہ تھی کہ اکثر انبیاؑ کسی ایسے مقام پر مبعوث ہوتے رہے ہیں، جہاں پہلے ہی کوئی منظم حکومتی معاشرہ، کوئی مملکت اور کوئی حکمران بھی موجود تھا؛ [اس لیے وہاں صرف تزکیۂ نفس کی ضرورت تھی]، لیکن مدینہ منورہ ایک ایسا مقام تھا جہاں ہجرت نبوی کے وقت کوئی منظم سیاسی حکمرانی تنظیم موجود نہ تھی، نہ شہری ریاست اور نہ کوئی بین القبائل مشترکہ فرمانروائی۔ عبداللہ بن اُبی بن ابی سلول کو اوس اور خزرج کے مشترکہ بادشاہ بنانے پر اتفاق ضرور ہو گیا تھا اور تاج شہرباری کی فرمائش شہر کے یہودی سناروں سے کی جانے کی بھی امام البخاری نے روایت کی ہے، لیکن اس تجویز کے عملی شکل اختیار کرنے سے قبل رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ بنو اوس و بنو خزرج کے لوگوں نے بکثرت اسلام قبول کر لیا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اولیں انتظامی تدبیروں کے بعد صرف اوس و خزرج کا بادشاہ بننا ایک بے معنی اور بعد از وقت چیز ہو گئی تھی۔ مہاجرین کی آمد کے بعد، آبادی میں ایک نئے عنصر کا اضافہ ہو گیا تھا؛ ان وجوہ سے ایک شہری ریاست مدینہ کا قیام اور اس کا تحریری دستور ضروری ہو گیا تھا: تحریری دستور میں مہاجرین، انصار، اوس و خزرج اور یہود اور ان کے حقوق و فرائض کا صراحت سے ذکر ہے، نیز یہ بعض غیر مسلموں کا بھی ذکر کرتا ہے، جو غالباً مدینے کے مشرک عرب تھے، ان سے عیسائی عرب مراد نہیں، جو قبیلہ اوس کے ابو عامر راہب کے حلقہ بگوش تھے (اور مدینے کی اس وفاق شہری ریاست Confederal City State سے خارج رہے)۔ اس کے ذریعے مقامی غیر مسلموں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کو شخصی حیثیت میں، نہ کہ بطور نبی کے، اپنا حکمران مان لیا تھا۔ اس کے فوراً بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مدینہ منورہ کے شمال، جنوب، مشرق و مغرب کے مشرک عرب قبائل سے عسکری اور دفاعی معاہدے بھی کرتے رہے، پھر قریش سے جنگیں چھڑ گئیں۔ ان حالات میں اہل مدینہ کو عملاً اتنی مصروفیت رہنے لگی کہ وہ کسی اور چیز کو سوچ بھی نہیں سکتے تھے، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سیاسی قیادت روز بروز وسیع تر اور اقتدار مستحکم تر ہی ہوتا [گیا اور ظاہر ہے کہ یہ اقتدار] حکیمانہ، منصفانہ اور عوام النّاس کے لیے بہی خواہانہ تھا: اس میں ذاتی جاہ طلبی بالکل نہ تھی۔

جب ایک مملکت قائم ہو گئی تو مسائل دفاع اور کم از کم مُرافعہ (اپیل) کی حد تک عدل گستری بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لیے ناگزیر ہو گئی؛ اس کے لیے حسب ضرورت [آئے دن قرآن کریم میں] نئے احکام [اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف سے ارشادات] صادر ہوتے رہے، جو کم و بیش سارے ہی مسائل کے متعلق ہوتے تھے، کیونکہ آپؐ کے سامنے تجارتی جھگڑے بھی آتے، نکاح و طلاق جیسے مسائل بھی، [اخلاقی جرائم بھی اور دیوانی تنازعات بھی]، آپؐ ان سب کے بارے میں احکام صادر فرماتے۔ اصول کار یہ رہا کہ آپؐ اپنے قوانین کی اساس اولاً قرآن مجید پر رکھتے، یا قرآنی احکام کی روشنی میں نئی ہدایات وضع فرماتے؛ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپؐ جن پرانے عرف و عادات کو روح قرآنی کے مطابق پاتے ان کو اختیار کر لیتے۔ [بعض جدید محققین کا یہ استنباط صحیح معلوم

نہیں ہوتا کہ آپ ؐ نے جملہ عرف و عادت کو ایک قانونی اساس قرار دیا ؛ آپ نے تو صرف ان عرف و عادت کو اختیار کیا تھا ، جو روح قرآنی کے مطابق تھے ۔ نامناسب اور بے آہنگ عرف و عادت کو رد کرکے] رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم مسلمانوں کے لیے نئے احکام صادر [کیا کرتے تھے ؛ لہذا عرف و عادت کو ایک مستقل قانونی اساس سمجھنا درست نہیں ہے ۔ بہر حال یہ] سلسلہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی وفات تک جاری رہا ۔ یہ قانون سازی اتنی مفصل اور جامع تھی کہ بعد میں تین تین برّاعظموں پر حکومت کرنے والی اسلامی حکومتیں اپنی عام ضرورتوں کے لیے صراحت سے احکام اس میں پاتی رہیں اور یہ اس قدر واضح تھا کہ فقہا ان سے بآسانی مطلوبہ احکام استنباط کر سکے ۔

مکی دور تشریع : نبوت کے ابتدائی تیرہ سال مکے میں گزرے اور وحی (قرآن) کے نزول کا سلسلہ وہیں شروع ہوا ۔ مکی دور میں نبی کریم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے مسلمانوں کے لیے [تدریج کے اصول کو اپنایا ۔ بعض نامناسب پختہ عادتوں کے بارے میں ڈھیل اور لچک کا انداز اختیار کیا] ۔ کچھ نئے قوانین بھی نافذ ہوتے رہے اور کچھ پرانی جائز چیزیں حرام یا مکروہ بھی قرار دی جاتی رہیں ۔ اس کی مکمل تفصیل تو یہاں نہیں دی جا سکتی، لیکن اس کا معلوم کرنا آسان ہے ۔ اس کے لیے قرآن کریم کی مکی سورتوں کو تاریخ نزول کے حساب سے مرتب کر کے پڑھنے اور ان میں بیان کردہ احکام پر [غور کرنے سے ساری بات واضح ہو جاتی ہے کہ مکی اور مدنی احکام میں فرق یہ ہے کہ مکی زندگی میں اتباع شخصیت رسول ؐ کا ہوتا رہا اور مدنی زندگی میں ایک شہری ریاست کے قائد و رہنما کی حیثیت سے احکام کا نفاذ اور اتباع ہوتا رہا ، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ مکی احکام بھی مکمل ضابطۂ قوانین میں داخل ہیں ، ماسوا ان کے جن کی بعد میں ترمیم یا تنسیخ ہو گئی ۔ اس معاملے میں ہمارے محققین اور بعض فقہا کو التباس سا ہو جاتا ہے، حالانکہ آنحضور ؐ کے دیے ہوئے قوانین میں مکی زمانے کے احکام کو بھی (بعد کی ترمیم و تنسیخ کے اصول کے تابع) شامل سمجھنا چاہیے ، مثلاً درج ذیل احکام کو دیکھیے] :

مکّی دور میں عبادات کے ابواب میں نماز ہی نہیں اللہ کے راستے میں خرج کرنے کا بھی کئی بار ذکر آتا ہے ، مثلاً ۶ [الانعام] : ۱۴۲ : [وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ] [یعنی پھلوں کے توڑنے اور فصل کاٹنے کے دن اس کا حق ادا کر دیا کرو ؛ دوسری جگہ ارشاد ہے : وَ الَّذِيْنَ فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۙ لِّلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ (۷۰ [المعارج] : ۲۴ تا ۲۵) ، یعنی اور وہ لوگ جن کے مالوں میں سائل اور مفلوک الحال کا حق متعین ہے] ۔ مسلمان وہاں حج میں بھی حصہ لیتے تھے ۔ بیعت ہائے عقبہ حج کے زمانے ہی میں واقع ہوئیں ۔ البخاری [الصحیح : کتاب الصیام] نے صراحت کی ہے کہ ہجرت سے قبل آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم عاشورا کا روزہ رکھتے تھے ؛ لازماً دوسرے مسلمان بھی رکھتے ہوں گے ۔ دفاع کے فطری حق اور چھوٹے بہانے پر مدافعت کرنے کا بھی ذکر ہے : وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ (۴۲ [الشورای] : ۳۸) ، [یعنی اور وہ لوگ جب ان پر زیادتی ہوتی ہے تو وہ بدلہ لیتے ہیں] ؛ تجارت کی خرابیوں کا بھی ذکر ہے (۸۳ [المطففین] : ۱ تا ۳)؛ نیز انبیائے سلف کے ذکر میں قوموں کی تجارتی بدمعاملگی پر ان کی سرزنش کا بھی ؛ یہ اخلاق امور بھی مدنظر رہے : فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ (۹۳ [الضحی] : ۹ ، ۱۰)، [یعنی پس آپ بھی یتیم پر سختی نہ کیجیے اور سائل کو مت جھڑکیے] ۔ کتب سیرت کی مدد سے احادیث میں بھی ایک حد تک مکی

اور مدنی کی ترتیب قائم کی جا سکتی ہے ۔ [اس کے معنی یہ ہوے کہ قانون (تشریع) کا سلسلہ نزول قرآن کے آغاز ہی سے شروع ہو چکا تھا ۔ مکّی زندگی میں نئے معاشرے کی تشکیل شروع ہوگئی ؛ اعلان ایک نبیؐ کی طرف سے ہوتا رہا ۔ اسی معاشرے کی جب مدینہ منوّرہ میں تشکیل ہوکر ایک منظم ریاست کی صورت میں تکمیل ہوئی تو نبیؐ نے بطور قائد اپنا مثالی کردار اور (مکّی مدنی سورتوں کو ملاکر) قوانین کا اعلان و نفاذ کیا] ۔ اس قانون سازی کا طریقہ سادہ تھا : رسول اکرمؐ فرماتے : یہ کرو ؛ یہ نہ کرو ؛ اہل ایمان اس پر آمنّا و صدّقنا کہتے ۔ یہ تشریع کبھی قرآن کی آیات پر مبنی ہوتی ، کبھی حدیث و سنّت کا جزو ہوتی ، جن کے متعلق بھی قرآن نے مکی دور ہی میں کہہ دیا تھا کہ : وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (۵۳ [النّجم] : ۳)، [یعنی آپؐ اپنی مرضی سے نہیں بولتے ، بلکہ یہ تو وحی ربانی ہے جو آپؐ کی زبان سے صادر ہوتی ہے]۔

ان واقعات سے ذیل کے نتیجے نکالے جا سکتے ہیں :

(۱) خدا ہی سرچشمۂ قانون اور شارع اصلی ہے ، رسولؐ اس کے احکام امت تک پہنچاتا ہے ؛ (۲) قرآن کے اجمال یا سکوت کی صورت میں نبیؐ سرچشمۂ قانون ہے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا (اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۵۳ [النجم] : ۳) ؛ (۳) قرآن و حدیث کے سکوت کی صورت میں رسم و رواج اور عرف و عادت برقرار رہتے ہیں [بشرطیکہ ان میں کوئی بات روح قرآنی کے منافی نہ ہو اور مقاصد شرع اسلامی پر زد نہ پڑتی ہو] ؛ یہ شریعت ابراہیمؑ و موسیٰؑ کے باقیات الصالحات بھی ہو سکتے ہیں اور خالص انسانی عقل اور تجربے کے [انسانیت پرور] نتائج بھی ؛ (۴) لہٰذا عرف و عادت مستقل اساس شرع نہیں ، یہی وجہ ہے کہ عرف و عادت سے صرف وہی امور ماخوذ ہوے جو مزاج قرآنی سے ہم آہنگ تھے ۔ قرآن و حدیث کے تابع عرف و عادت کی تبدیلی بھی ہوتی رہی ہے ؛ (۵) آنحضرت صلّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے جو قانون سازی کی اس میں فطری تقاضوں کا پورا لحاظ رکھا گیا ، مثلاً حکم ہوا کہ نکاح کریں ۔ انسانی جبلّتوں کی تسکین بطریق اعتدال تابع مقاصد شرع ہو ، مثلاً خوش حال رہنے کی خواہش ، عز و وقار کی خواہش کی تسکین ، جھوٹے توکّل کی جگہ خواہش تعمیر و ترقی کے زیر اثر کائنات سے استفادہ کیا جائے : وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (۲۸ [القصص] : ۷۷) ، نیز ، وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۵۳ [النجم] : ۳۹) ؛ (۶) تشریع میں تدریج ملحوظ رہی ، شاید اس لیے کہ پرانی بری عادتیں آسانی سے نہیں چھٹتیں ، مثلاً شراب کی ممانعت ، کہ مکّی دور میں کہا گیا : وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا (۱۶ [النحل] : ۶۷) ؛ یہاں نشہ اور رزق حسن کو دو الگ چیزیں بتایا گیا ہے ، یعنی نشہ رزق حسن نہیں ہے اور غیر مستحسن رزق ہے اور لطیف انداز میں اسلامی سیاست سمجھنے والوں کو بات سمجھا دی گئی [کہ اصل شے رزق حسن ہے ، دوسری شے پرکشش ضرور ہے ، مگر رزق حسن نہیں] ؛ اگرچہ اس وقت صراحت مناسب نہیں سمجھی گئی ، یہ بتقاضاے تدریج ایسا کیا گیا ہے ؛ (۷) ایک بنیادی اصول یہ رہا کہ سہولت [تیسیر] رہے تاکہ دین کے احکام عوام اور ہر قسم کے کم سمجھ رکھنے والے انسانوں کے لیے بھی قابل عمل رہیں اور دین مٹھی بھر فرشتہ صفات انسانوں سے مختص ہو کر نہ رہ جائے : "اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا" (۹۴ [الانشراح] : ۶) ۔ پھر مدنی دور میں مزید صراحت کی گئی : يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (۲ [البقرۃ] : ۱۸۵) ۔ احادیث میں بھی اس اصول کا بکثرت ذکر ہے : (۸) برائیوں سے روکنے اور نیکیوں کی ترغیب کے

سلسلے میں بھی طبع انسانی کے محرّکات کا خیال رکھا گیا؛ محض سزاے دنیوی اور تہدید ظاہری کافی نہیں سمجھی گئی۔ اس کے لیے گہرے روحانی مؤثرات کو بھی کام میں لایا گیا ہے؛ چنانچہ روز آخرت کی جزا و سزا کو بھی اس میں شامل رکھا گیا ہے؛ [مطلب یہ کہ دنیا میں کوئی شخص برے عمل کی سزا سے بچ بھی نکلا تو کیا ہوا؛ ایک یوم الحساب اور بھی ہے]۔ چنانچہ ممنوعات کے لیے دوزخ کی صورت میں تہدید و ترہیب اور اوامر ترغیب و تشویق کے لیے جنّت [کے تصور کو معاون مؤثر بنا دیا، کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ محض دنیوی قانون انسداد ممنوعات کے لیے کافی نہیں]۔ اگرچہ خدا کے بندے ہونے کی حیثیت میں اوامر کی تعمیل پر کسی جزا و انعام کی ضرورت نہ تھی، لیکن خدا نے اپنے فضل و کرم سے اُخروی انعام کا بھی پختہ وعدہ کیا۔ مکّی زندگی میں امکان نہ تھا کہ مادی تہدید، یعنی تعزیرات اور عقوبات نافذ کی جائیں؛ ان کا نفاذ مدنی دور میں ہوا، [مگر روحانی تہدید وہاں بھی ساتھ رہی؛ کیونکہ روحانی داخلی مؤثرات ہی برائی کا صحیح قلع قمع کر سکتے ہیں]؛ (۹) [اصولاً انبیاے سلف کی شریعتیں] سُنَن من کان قبلکم، بعض احکام کے سلسلے میں جن کا قرآن میں بالصراحت ذکر ہے برقرار رکھی گئیں، بجز ان کے جن کی قرآن و حدیث کے ذریعے ترمیم و تنسیخ کی گئی ہو: اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ ہَدَی اللّٰہُ فَبِہُدٰہُمُ اقْتَدِہْ (۶ [الانعام]: ۹۰)؛ وجہ ظاہر ہے کہ پرانا قانون بھی خدا کا ہے اور نیا بھی اور جب قانون ساز ایک ہی مسئلے پر یکے بعد دیگرے متعدد احکام دے تو تازہ ترین حکم ہی قابل عمل رہتا ہے، [لیکن قانون ساز سابقہ کی تنسیخ نہ کرے، بلکہ اس کو جاری رکھنے کا حکم دے تو] سابقہ منسوخہ احکام بھی برقرار رہتے ہیں؛ (۱۰) [آنحضرت ؐ نے جو قانون دیا اس میں دارین (دنیا اور عقبیٰ) کے حسنات کو] مطمح نظر بنایا، اس لیے نماز کے ساتھ زراعت، حرفت اور تجارت کو بار بار خدا کا انسانوں پر فضل بتایا گیا ہے اور دینی احکام میں دنیوی اور دنیوی احکام میں دینی پہلو ملحوظ رہا؛ (۱۱) قانون اور اخلاق کو باہم پیوست کر دیا گیا، مگر لچک بھی رکھی گئی تاکہ ادنیٰ، اوسط اور اعلیٰ، ہر قسم کے لوگوں کے لیے دین کے روحانی اور مادی احکام قابل عمل رہیں، مثلاً یہ نہیں کہا جائے گا کہ اگر کسی کو تمانچہ لگے تو وہ شخص اپنا دوسرا گال بھی ظالم کے سامنے رکھ دے اور یہ بھی نہیں کیا گیا کہ ایک کا دس گنا بدلہ لے، بلکہ فرمایا: وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُہَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ (۴۲ [الشّوریٰ]: ۴۰)، [یعنی برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہے، ہاں جو شخص معاف کر دے اور معاملے کی اصلاح کر دے، پس اس کا اجر اس کے خدا کے ذمے ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ظالموں سے محبت نہیں کرتا]؛ (۱۲) ایک اعلیٰ قانون جامع اور انسان کی ساری ضرورتوں کا کفیل ہوتا ہے: دینی اور روحانی، دنیوی اور مادی، انفرادی اور اجتماعی [سب ضرورتیں اس سے پوری ہونی چاہییں]، یہ نہیں کہ مسجد اور قصر شاہی میں تفریق و تباین رہے۔ پھر ان احکام میں درجہ بندی بھی ہونی چاہیے: [واجب، مستحب اور مباح ایک طرف اور حرام و مکروہ دوسری طرف۔ یہ درجہ بندی عمل کی نوعیت اور تعداد کے مطابق لازمی ہے۔ قرآنی قوانین میں اس کا پورا پورا لحاظ موجود ہے]؛ (۱۳) قانون اور مملکت لازم و ملزوم سمجھے جاتے ہیں۔ غالباً اس لیے کہ حق کا اعلان کافی نہیں؛ اس کا نفاذ بھی لازم ہے اور یہ ملّت کی اجتماعی قوت یعنی حکومت کے بغیر ممکن نہیں۔ مکّی دور میں اس کا اطلاق نہ ہو سکا، کیونکہ مملکت کے عناصر میں سے اگرچہ

تنظیم بھی تھی اور حاکم بھی موجود تھا ، لیکن مملکت موجود نہ تھی : ایسے مملکت در مملکت کہنا بھی مشکل ہے ۔ اسے مستقبل کی ایک مملکت کی تیاری کہا جا سکتا ہے ۔ یہ واقعی (De facto) مملکت نہ تھی؛ البتہ اسے استحقاق (De Jure) مملکت کا نام دینا ممکن ہے ۔ بہرحال مکّی دور میں بھی اس اسلامی "مملکت" کا قانون بتدریج وجود میں آنے لگا تھا اور روز بروز جامع تر ہوتا جا رہا تھا ۔ اس کا نصب العین یہ تھا کہ وہ انسان کی ساری ضرورتوں کو ایک ہی قانون ساز اور ایک ہی شریعت کے تابع بنانے میں مصروف عمل تھا ، تاکہ ایک پہلو پر اکتفا کر کے دوسرے پہلو کو تشنہ نہ چھوڑا جائے اور انسان کی اس طرح ادھوری یا نامکمل پرورش نہ ہو ؛ اور نہ یہ کہ ایک قانون کو تو خدائی کہہ کر اس کی زیادہ تکریم و تعمیل ہو اور دوسرے کو انسانی سمجھ کر اس سے بے پروائی برتی جائے ۔ غرض حقیقت پسندانہ انداز میں ارتقا تدریجی طور سے ہو رہا تھا؛ [چنانچہ ابتدائی مکّی دور میں اپنے ریوڑ اور اپنی زراعت میں سے راہِ خدا میں خرچ کرنے کا عمومی انداز میں ذکر ہوا (۶ [الانعام] : ۱۴۱) ، مگر اس کی مقدار ، اس کا نصاب اور طریقۂ تحصیل کا ذکر نہیں کیا گیا] ۔ تحصیل و تقسیم کی تنظیم ابھی قبل از وقت تھی ؛ غالباً نصاب بھی معین نہ تھا ۔ ممکن ہے کہ رواجی مقدار لوگ براہ راست غربا کو دے دیتے ہوں ۔ تمثیل میں مصر و سبا کے حکمرانوں کا اور ان کے طرز حکومت کا بھی ذکر ہے اور حضرت داودؑ و سلیمانؑ جیسے بادشاہت والے نبیوں کا بھی ذکر ہے اور ان کے عدل و انصاف کا بھی ۔ یقیناً مسلمان اپنے اندرونی مقدمے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم ہی کے پاس لایا کرتے تھے ۔ توریت کے احکام عشرہ [جو کتاب خروج ، باب ۲۰ ، اور کتاب تثنیہ ، باب ۵ میں مذکور ہیں] زیادہ مشہور ہیں ، لیکن سورۃ [بنی اسرائیل] : ۲۳ تا ۳۹) میں رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو معراج کے وقت بارہ جامع تر احکام دیے گئے اور کچھ عرصے بعد احکام لقمانی (۳۱ [لقمٰن] : ۱۳ تا ۱۹) بھی یاد دلائے گئے ۔ [قصہ مختصر ، مکّی دور میں قانون سازی کی حد اور شکل بھی نظر آتی ہے] ۔

مدنی دور : ھجرت سے قبل ہی بیعت عقبۂ ثانیہ کے موقعہ پر آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے انصار مدینہ (اوس اور خزرج قبائل) کی بارہ شاخوں پر ، متعلقہ لوگوں کے مشورے سے ، بارہ نقیب ، اور ایک نقیبُ النقبَاء یا نائب السلطنت نامزد فرما کر گویا شہری ریاست مدینہ کا آغاز فرما دیا تھا ۔ مدینہ منورہ میں تشریف آوری کے چند ہفتے بعد ایک سیاسی ہیئت وجود میں آ گئی اور اس شہر کے ایک بڑے حصے میں ایک شہری ریاست قائم ہوگئی ، جس میں مہاجرین اور انصار ہی نہیں غیر مسلم عرب اور یہودی باشندے بھی ، اقتدار اعلٰی ایک فرد ، یعنی آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم ، کے سپرد کر دیتے ہیں اور ایک "معاہدہ عُمرانی" حکمران اور حکمرانی کو تسلیم کرنے والوں میں عمل آتا ہے ۔ اس ریاست کا دستور تحریری طور پر مدوّن ہوا ، جو تاریخ نے محفوظ رکھا ہے ۔ اس چھوٹی سی ریاست کی روز افزوں توسیع (کہ دس سال کے عرصے میں وہ صفر سے تیس لاکھ مربع کیلو میٹر رقبے پر پھیل گئی)، قانون سازی کی توسیع کا بھی لازماً باعث بنی ۔

اس دس سالہ دور میں نازل شدہ قرآنی سورتوں میں تمام ہی مسائل پر احکام ملتے ہیں ؛ یہی حال احادیث کا بھی ہے ۔

اس دور میں جنگیں بھی ہوئیں ؛ معاہدے بھی عمل میں آتے رہے ؛ بیرونی حکمرانوں سے خط و کتابت بھی ہوتی رہی ۔ نظم و نسق کے لیے بتدریج شعبے قائم کیے جاتے اور تجربے سے ترقی کرتے رہے ۔

حکومت کے لیے مستقل آمدنی کے وسائل بھی مہیا کیے گئے۔

قانون سازی کے سلسلے میں چند نہایت اہم چیزیں اس دور سے تعلق رکھتی ہیں: اول یہ کہ قانون کے مآخذوں (اساسیات) میں ایک نئی چیز کا اضافہ کیا گیا جس سے اس کے حال اور مستقبل کی ضمانت مہیا ہو جاتی ہے۔ الترمذی وغیرہ میں حدیث معاذؓ بن جبل کے مطابق، اگر کسی مسئلے کے متعلق قرآن اور حدیث و سنت میں بھی کوئی حکم نہ ملے تو [قیاس سے کام لیا جا سکتا ہے؛ اسی کو] اجتہاد بالرآی، بعد میں اصطلاحاً استنباط، استصلاح اور استحسان کا نام دیا گیا، رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے اصول فقہ (یعنی استنباط احکام اور وضع احکام) کی بنیاد رکھ دی۔ دوسری اہم چیز یہ ہوئی کہ غیر مسلم افراد مملکت کے لیے کامل داخلی خود مختاری تسلیم کی گئی۔ دین و ایمان اور عبادت ہی کے لیے نہیں، قانون ان کے داخلی معاملات (یعنی خصومات باہمی اور حقوق شخصی) میں دخل نہ دیتا۔ یہ معاملات دیوانی کے ہوں یا فوجداری کے، غیر مسلم فریقین کو اجازت دی گئی کہ اگر وہ اپنی عدالت کی جگہ اسلامی عدالت سے رجوع کریں تو ان میں انصاف سے دریغ نہ کیا جائے گا۔ اس پیشکش کی بنیادی وجہ غالباً یہ تھی کہ جب مقدمے کے فریقین میں سے ایک یہودی اور ایک عیسائی ہو تو [اس صورت میں اختیار دیا گیا کہ وہ اگر چاہیں تو ان کے مابین اسلامی قانون فیصلے کے لیے موجود ہے]۔ تیسری قابل ذکر چیز یہ نظر آتی ہے کہ خاص کر بیرونی تعلقات کے سلسلے میں معاہدات میں شرائط طے ہوتی تھیں، یعنی معاہدے کو بھی ایک ضمنی و وقتی قانون کی اساس تسلیم کر لیا گیا: صلح حدیبیہ اس کی ایک نظیر ہے، (مگر اس اساس کو مستقل حیثیت نہیں دی جا سکتی)۔

چوتھی اہم چیز یہ ہوئی کہ جرائم کی مسئولیت عاقل و بالغ، اور جان بوجھ کر کرنے والے انسانوں تک محدود کر دی گئی، ورنہ زمانۂ جاہلیت میں جانور، کنواں یا کوئی مماثل غیر ذوی العقول کسی انسان کی موت کا باعث بنتے تو وہ جانور کنواں مقتول کے ورثا کو بطور خون بہا دیے دیا جاتا تھا۔ البئر جبار، المعدن جبار، العجماء جبار [یعنی جانوروں، کانوں اور کنووں کا جرم ناقابل اعتبار ہے] کی حدیث سے (البخاری: الصحیح، کتاب الدیات، باب ۲۸ و ۲۹؛ ابوداؤد: السنن، کتاب الدیات، باب ۲۷؛ ابو یوسف: کتاب الخراج) ایسی ذمہ داری برخاست کر دی گئی۔ یہ بھی یاد دلایا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک، مثلاً انگلستان میں کسی درخت، دیوار، گاڑی، جہاز وغیرہ کو بھی کسی انسان کی موت کا باعث بننے پر قانوناً سزائے موت دی جاتی اور اسے لیست و نابود کر دیا جاتا تھا (دیکھیے Hobhouse : *Morals in Evolution*، باب Law and Justice)۔ ذیلی قانون سازی کی ضرورت سب سے زیادہ قاضیوں اور مفتیوں کو پیش آتی ہے۔ رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے دور دراز مقاموں کے لیے ناگزیر قاضی مامور فرمائے؛ مفتیوں کی نامزدگی کا بھی پتا چلتا ہے اور سوالات اور استفسارات پر خود جواب دینے کے بجائے بعض اوقات فرما دیتے کہ فلاں (مثلاً ابوبکرؓ) سے پوچھ لو۔ قاضیوں کو ادب القاضی کے متعلق ہدایتیں بھی دی جاتی رہیں: حضرت علیؓ، حضرت عمروؓ بن العاص وغیرہ کو متعلقہ ہدایتیں تاریخ میں محفوظ ہیں۔ انصاف طلبی کو فرد کا نجی معاملہ سمجھنے کے بجائے اسے مرکز یعنی عدالت کے سپرد کرنا دنیا کی تاریخ میں ایک انقلابی اصلاح تھی۔ ایک کی جگہ کم از کم دو اور بعض قسم کے مقدموں میں چار گواہوں کی ضرورت بھی ایک اہم اصلاح تھی۔ شبہے کا فائدہ

ملزم کو دیا جانے لگا۔ قتل میں خطا اور عمد ہی نہیں، مشابہ عمد بھی تسلیم کیا گیا۔ مقتول کے وارثوں کو قصاص کی جگہ خون بہا قبول کرنے کی اجازت دی گئی۔ نیت کو اساسی اہمیت دی گئی [إنما الأعمالُ بالنیّات ؛ تیروں اور جانوروں کی بولیوں سے فال لینے اور کاهنوں اور عرافوں سے استفسار کرنے وغیرہ] جیسے توهمات اور خرافات کو عدل گستری سے خارج کر دیا گیا۔ فنی خصوصی مسائل میں ماهرین سے خود رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم مشورہ لیتے اور یہ بعد کے لیے نظیر بن گیا۔ خصوصی حالات میں سخت فیصلے کی جگہ استحسان [رک بآں] ، یعنی قیاس کو چھوڑ کر عوام کے لیے سہولت کے فیصلے کو اپنانے (المبسوط، ۱۰ : ۱۴۵) کو روا رکھا گیا۔ قوانین کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا : خاصہ [Private Law] اور عامّہ [Public Law]؛ قوانین خاصّہ میں مسلم فقہا معاملات، عقوبات اور وراثت و وصیّت هی کو نہیں ، بلکہ عبادات کو بھی شامل کرتے هیں۔ اس میں ایک نکتہ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ سرکاری واجبات کو بھی عبادات میں شامل کیا گیا ہے : زکوٰۃ کے مصارف قرآن (۹ [التوبة] : ۶۰) میں بیان هوے هیں؛ ان سے صاف نظر آ جاتا ہے کہ زکوٰۃ صرف فقرا و مساکین کے لیے هی نہیں، بلکہ حکومت کی کشوری و عسکری ضرورتوں کے لیے بھی ہے اور صرف نقد اندوختے هی پر نہیں ، بلکہ تجارت ، معدنیات ، زراعت وغیرہ کے سارے هی محاصل کا نام ہے۔ مسلمانوں سے لیے هوے محاصل زکوٰۃ کہلاتے هیں ، ذمّی اور اجنبی غیر مسلموں سے جنگ و صلح سے آنے والی آمدنی کو خراج، جزیہ، غنیمت وغیرہ مختلف زمروں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ زکوٰۃ کی ادائی کو ارکان اسلام اور عبادات میں شامل کرنا بڑا معنی خیز امر ہے؛ [ایک معنی اس میں منجملہ دیگر کے یہ ہے کہ اس میں مقاصد انسانی کے لیے دولت کو صرف کرنا عبادت (مثلاً صلوٰۃ) کے مانند قلبی تسکین اور روحانی خوشی کا موجب بن جاتا ہے۔ برعکس عام (غیر عبادتی) ٹیکس کے کہ اس کے ادا کرتے وقت تکدّر سا هوتا ہے ، اس کے علاوہ دنیوی امور اور روحانی امور کے مابین کوئی فصل بھی نہیں رهتا] ۔ قوانین عامہ میں نظم و نسق، یعنی دستور اور خارجہ پر امن اور جنگی تعلقات یعنی قانون بین الممالک [International Law] خاص طور پر قابل ذکر هیں۔ قوانین عامہ میں سے دستور کا مختصر ذکر کم از کم امام شافعیؒ نے کتاب الاُمّ میں نماز کے ضمن میں امام کی بحث میں کیا ہے کہ نماز کی امامت حکمران کے امتیازات میں داخل ہے اور خلیفہ کو امام بھی کہتے رہے هیں۔ قانون بین الممالک کا ذکر فقہ کی بلا استثنا ساری کتابوں میں آتا ہے اور ایسے وهاں کتاب السِیَر کے عنوان سے ایک مستقل باب میں رکھا جاتا ہے۔ ان دونوں قوانین عامہ کا مختصر سا بیان یہاں بے محل نہ هوگا :

دستور اور نظم و نسق : رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے نہ صرف ایک ایسے علاقے میں جو سیاسی تنظیم سے قطعاً عاری تھا ایک شہری مملکت قائم فرمائی (جو روز افزوں وسعت حاصل کرتی رهی) ، بلکہ اُمّی هونے کے باوجود اس مملکت کے لیے ایک تحریری دستور بھی مدوّن اور نافذ فرمایا۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تاریخ عالم میں پہلا دستور ہے جو تحریری طور پر مدوّن هوا اور کسی حکمران کی طرف سے نافذ کیا گیا اور حاکم اور عوام دونوں کے حقوق اور فرائض کی اس میں تصریح کی گئی۔ هندوستان میں کاوٹیلیا [تقریباً ۳۲۱ تا ۳۰۰ ق م کے درمیان [دیکھیے J.F. Fleet : مقدمہ *Kautilyas Arthasastra*، بار سوم ۱۹۲۹ء، ص vii)] کی ارتھا شاسترا نامی ایک سنسکرت کتاب ضرور ہے ، جو نصیحة الملوک صنف کی تالیف ہے نہ کہ کسی

حکمران کا نافذ کردہ حکمنامہ۔ راجا آزاد تھا کہ ارتھا شاستر پر عمل کرے یا نہ کرے۔ یونان میں دو نام ملتے ہیں: ایک تو سولن (Solon) تھا، جسے کہتے ہیں کہ ایتھنز کی شہری ریاست کے دستور میں ترمیمات پیش کرنے پر مامور کیا گیا تھا، مگر اول تو یہ مکمل دستور نہ تھا، بلکہ چند ترمیمی دفعات تھیں؛ دوسرے ایتھنز کا اصل دستور غیرتحریری ہی تھا۔ اگر سولن کی تجویزوں کو وہاں کی مجلس حکومت نے منظور بھی کیا تو اس سے سابقہ غیرتحریری قواعد کی حیثیت تحریری دستور کی نہیں ہو جاتی۔ اسلام سے قبل دوسری کوشش ارسطو کی کتاب "ایتھنز کا دستور" ہے، مگر یہ دستور نہیں۔ اسے زیادہ سے زیادہ تاریخ دستور کہا جا سکتا ہے، کیونکہ ارسطو کے زمانے میں ایتھنز کوئی شہری مملکت نہ تھا، بلکہ سکندر اعظم کی شہنشاہی کا پایۂ تخت تھا اور ارسطو کی کتاب اس شہنشاہی کا دستور نہیں، بلکہ سابق شہری مملکت ایتھنز کے دستوری ارتقا کی تاریخ تھی۔ مزید برآں ارسطو کوئی بادشاہ نہ تھا، بلکہ محض وزیر تھا۔ بادشاہ پر اس کے مشوروں کو قبول کرنے کی کوئی پابندی نہ تھی۔ بائیبل میں یہودیوں کے ہاں کے ایک "تحریری دستور" کا ذکر آتا ہے، مگر ایسے دستور کہنا لطیفہ سا معلوم ہوتا ہے! چنانچہ پہلی کتاب سموئیل (اشموئیل نبی)، باب ۸، آیت ۵ میں ہے کہ جب نبی عمر رسیدہ ہو گئے تو قوم نے ان سے مطالبہ کیا کہ ایک شخص کو وہ بادشاہ نامزد کریں۔ انھوں نے کہا (باب ۸، آیت ۱۱ تا ۱۷): بادشاہ معزز مردوں اور عورتوں کو ذلیل خدمتیں کرنے پر مجبور کرے گا؛ تمہارا مال چھینے گا اور تم سب اس کے غلام بن جاؤ گے۔ اس کے بعد بھی قوم کا اصرار رہا تو نبی نے بادشاہ کے مذکورہ سارے حقوق کو لکھ کر قوم سے صریح اقرار لیا کہ وہ اسے قبول کرتے ہیں۔ پھر ساول (طالوت) کو بادشاہ نامزد کیا۔ بائیبل کا مذکورہ دستور بس اتنا ہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اولین مکمل دستور کو مدون کرنے اور ایک حکمنامے کے طور پر نافذ کرنے کا امتیاز نبی امی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہی کو حاصل ہوا اور اس کا متن تاریخ نے محفوظ بھی رکھا ہے (دیکھیے الوثائق السیاسیہ، شمارہ ۱، ص ۱۵)۔ اس کا پہلا جملہ ہی یہ ہے: [هٰذا كِتَابٌ من مُحَمَّد النَّبي (رَسُولِ اللّٰه) بَيْنَ المُؤْمِنِينَ من قُرَيش و اهل يَثْرِبَ وَ من تَبِعَهم و لَحِق بهم و جاهد معهم] یعنی یہ ایک تحریری معاہدہ (کتاب=میثاق) ہے اللہ کے رسول حضرت محمدؐ کا، قریش اور اہل یثرب میں سے ایمان اور اسلام لانے والوں اور ان لوگوں کے مابین جو ان کے تابع ہوں اور ان کے ساتھ شامل ہو جائیں اور ان کے ہمراہ جنگ میں حصہ لیں" (اس میں توسیع مملکت کی صورت میں بھی لچک ہے)۔ دوسرا فقرہ ہے: تمام دنیا کے لوگوں کے بالمقابل ان کی ایک علیحدہ امت ہوگی یا سیاسی معاشرہ ہوگا۔ اس کے بعد قبیلہ وار اجتماعی تحفظات کا ذکر ہے۔ قتل خطا پر خون بہا اور دشمن کی قید سے رہائی کا فدیہ دینے کا بار فرد پر نہیں، بلکہ مجموعی تحفظاتی ادارے یا خاندان پر پڑے گا (ف ۳ تا ۱۱)۔ ف ۳ میں ایک انقلاب انگیز حکم ہے کہ سارے مہاجرین کا ایک نیا اور واحد قبیلہ ہوگا (خونی رشتے کی قومیت کو برخاست کر کے عقیدے اور ہم خیالی کی اساس پر "قوم" بنانے کا یہ گویا آغاز تھا)۔ اگلی دفعات میں امت مسلمہ کو ایک وحدت بنا کر احکام دیے گئے ہیں (۱۲ ببعد)۔ ولاء کا حق مرکز کی جگہ ہر فرد رعیت کو دیا گیا ہے کہ وہ معاہداتی بھائی چارہ کرکے کسی اجنبی کو اپنے قبیلے یا خاندان کا رکن بنا سکتا ہے۔ عدل گستری فرد سے لے کر مرکز کے سپرد کر کے (ف ۱۲) اس وقت کے عربی معاشرے میں ایک مزید انقلاب برپا کیا گیا۔ پناہ دینے کا حق بھی (ف ۱۵) ہر فرد رعیت کو دیا گیا ہے۔ غیرمسلموں کو مساوات

کی اساس پر (ف ۱۶) شہری بننے کی اجازت ہے۔ جنگ اور صلح (ف ۱۷) مرکزی امور قرار دیے گئے ہیں۔ مسلمانوں کے آخری عدالتی حکم کو "اللہ اور حضرت محمدؐ" سے متعلق قرار دیا گیا ہے۔ ف ۴۲ میں یہودیوں کے لیے بھی یہی اصول قرار دیا گیا ہے اور بظاہر یہ ان جھگڑوں کے متعلق ہے جو وہ خود اندرونی طور پر اپنی مذہبی یا خاندانی عدالت میں طے نہ کر سکیں۔ دفاع ایک مشترکہ امر ہے، جس میں مسلم و غیر مسلم سب پر مساوی ذمہ داری ہے (ف ۴۴)۔ اس دستور میں آمدنی کے مسائل یا سرکاری واجبات کا ذکر نہیں ہے، لیکن یہ دستور سنہ ۱ھ کا ہے، جبکہ سرکاری واجبات کا حکم بعد میں دیا گیا۔ البتہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی لوگ تجارتی کاروان لاتے تو ان سے قدیم سے جو چنگی لی جاتی تھی وہ برقرار رہی۔ ہجرت سے قبل مدینے میں نقیب النقبا کی نامزدگی کا اوپر ذکر آ چکا ہے، مگر متعلقہ فرد کی وفات پر وہ عہدہ برخاست کر دیا گیا [نیز رک بہ میثاق مدینہ]۔

سِیَر (بین الاقوامی تعلقات): رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے طریقے کی اساس پر مسلمان قانون کی ایک نئی شاخ کے بانی بنے؛ اسے کم از کم زید بن علی [م ۱۲۲ھ، شذرات، ۱: ۱۵۸] کے زمانے سے سِیَر کا نام دیا جانے لگا۔ اس میں بیرونی ممالک سے جنگ، امن اور غیرجانبداری کی حالت کے تعلقات کا ذکر ہوتا ہے۔ اسے اب انگریزی میں انٹرنیشنل لاء (Internationl Law) کہتے ہیں، لیکن چونکہ اس میں قوموں سے نہیں بلکہ مملکتوں سے بحث ہوتی ہے؛ اس لیے "بین الاقوامی" کی اصطلاح سے بہتر "بین الممالک" ہے اور خود مغرب میں اب اسے انٹرسٹیٹل، کہنا بہتر سمجھا جانے لگا ہے۔

قدیم زمانے میں بیرونی تعلقات کے قواعد دو قسم کے ہوتے تھے: دوستوں کے ساتھ معینہ قاعدے مقرر تھے، جب کہ دشمنوں کے ساتھ صرف صوابدید کو بروئے کار لایا جاتا تھا۔ یونانی دور میں یہ "ترقی" ہوئی کہ دشمن بھی اگر ہم نسل اور ہم مذہب ہو تو اس سے بھی معین قواعد کے مطابق برتاؤ کیا جاتا۔ اس کے بعد جب رومی دور آیا تو دنیا کے تین حصے قرار دیے گئے: رومی، معاہداتی دوست اور باقی دنیا۔ معاہداتی ملک سے اگر کبھی جنگ چھڑ جائے تو اعلان جنگ تک معین قاعدہ رہتا؛ پھر جنگ کی اثنا میں صوابدید رہتی۔ سترھویں صدی عیسوی کے متعلق کروٹیوس وغیرہ نے لکھا ہے کہ "عیسائیت جیسے محبت سکھانے والے مذہب کو قبول کرنے کے باوجود یورپی حکمرانوں کے روابط کا یہ حال تھا کہ اس پر وحشی جانوروں کو بھی شرم آئے"۔ ہمارے زمانے میں فرنگی قانون "مہذب اور غیر مہذب" کا فرق کرتا ہے۔ سنہ ۱۸۵۶ء تک "مہذب" سے مراد عیسائی لیے جاتے تھے؛ پھر نہ مجلس اقوام میں اور نہ اس کی جانشین مجلس اقوام متحدہ میں کوئی مملکت رکن بن سکتی ہے، جب تک کہ دو رکن مملکتیں نئے امیدوار کے مہذب ہونے کی گواہی نہ دیں۔ اسلام وہ پہلا اور تاحال واحد قانون ہے جو حکم دیتا ہے کہ سارے اجنبی مساوی ہیں اور دشمن چاہے وحشیانہ سلوک کرے، ہم اپنے اصول پر عمل کریں گے۔ قرآن مجید (۹ [التوبة]: ۷) میں غیر مسلموں سے معاہدے کی پابندی کا حکم ہے۔ خیانت کے خطرے پر طرز عمل (۸ [الانفال]: ۵۸)؛ مذہبی رواداری (۲ [البقرة]: ۲۵۶؛ ۱۰ [یونس]: ۹۹ تا ۱۰۰)؛ کافروں کو پناہ طلبی پر پناہ دہی (۹ [التوبة]: ۶)؛ انتقامی جنگ (۲ [البقرة]: ۱۹۰ تا ۱۹۲)؛ دفاعی جنگ (۴ [النساء]: ۷۵؛ ۲۲ [الحج]: ۳۹)؛ نیکی کے کاموں میں دشمن سے بھی تعاون (۵ [المائدة]: ۲)؛ مفتوحہ اراضی کے احکام (۷ [الاعراف]: ۱۰۰؛ ۵۹ [الحشر]: ۴ ببعد)؛ جنگی قیدیوں سے برتاؤ (۴۷ [محمد]: ۴؛ ۷۶ [الدھر]:

۸ تا ۹)؛ قانون غیر جانبداری (۴ [النساء]: ۱۰۵ تا ۱۰۹؛ ۵۹ [الحشر]: ۱۱ تا ۱۲)۔ غرض بکثرت احکام ملتے ہیں اور احادیث میں تو سارے ہی مسائل کے قواعد کی تفصیل ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے محمد حمید اللہ: عہد نبوی ؐ میں نظام حکمرانی)۔ پرانے اسلامی قواعد نہ صرف آج بھی کارآمد ہیں، بلکہ متعدد مسائل میں مغربی قواعد سے زیادہ مہذب اور انسانیت پرور ہیں، مثلاً مستأمن وغیرہ کے حقوق۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ ہجرت کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے خون کے پیاسے دشمنوں کی امانتیں واپس [کرنے کے لیے اپنے چچا زاد بھائی حضرت علیؓ کو ننگی تلواروں کی چھاؤں میں چھوڑنا تو گوارا کیا، لیکن امانت میں خواہ خون کے پیاسے دشمن ہی کی ہو، خیانت کرنا گوارا نہیں کیا]۔

قانون تغیر پذیر حالات میں: انسانی معاشرہ ایک تغیر پذیر چیز ہے۔ اگر آئندہ کوئی نبی نہ آ سکے اور قانون تا قیامت بدل نہ سکے تو اصولاً اس سے ناقابل حل پیچیدگی پیدا ہو سکتی ہے، لیکن اسلامی قانون رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا واقعی ایک قانونی معجزہ ہے کہ آپؐ کے دیے ہوئے احکام میں چودہ سو سال (یعنی ۱۴۰۰ھ) تک تبدیلی کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، بلکہ ان کی مخالف اقوام اپنے قوانین بدلنے پر مجبور ہوگئیں (مثلاً عیسائیوں کے ہاں طلاق، یا عورت کے انفرادی اور کامل حقوق ملکیت کا مسئلہ، جس میں ترمیم کی گئی)۔ بعض اسلامی احکام پر بعض کج فہم جو اعتراض کرتے رہے ہیں ان کا آخر میں یہاں ذکر بے محل نہ ہوگا: قرآن مجید (۵ [المائدۃ]: ۵) میں غیر مسلم (کتابیہ) عورت سے مسلمان کے لیے نکاح جائز قرار دیا گیا ہے اور حدیث میں اختلاف دین کو وراثت کا مانع قرار دیا گیا ہے۔ یہ بیوی کے حق میں ظلم ہوتا، لیکن عام قاعدے کو بدلنے کی جگہ اس کا حل [ایک تہائی تک) وصیت اور ہبہ [ترکہ یا بان] کے ذریعے کر دیا گیا، جو غیر مسلموں کے حق میں بھی کیے جا سکتے ہیں۔

وراثت میں قریب تر کی موجودگی میں بعید تر محروم ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اس منطقی قاعدے سے ناانصافی نظر آ سکتی تھی، مثلاً ایک شخص کی وفات پر اس کا ایک بیٹا زندہ ہو اور دوسرا مر تو چکا ہو لیکن ایک بیٹا چھوڑ گیا ہو، جو موجودہ متوفی کا پوتا ہوتا ہے۔ بیٹے کو حصہ ملے گا، لیکن پوتا محروم ہوگا، جس کے باپ کو اس کے اپنے باپ سے قبل مرنے کی وجہ سے باپ کی وراثت میں کوئی حصہ نہیں ملا تھا۔ اس کا حل بھی وصیت اور ہبے کے ذریعے با سانی ہوتا ہے: قانون کو بدلنے کی ضرورت نہیں۔ وراثت ہی میں لڑکے کو لڑکی سے دگنا حصہ ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لڑکی کو ہمیشہ نفقہ باپ، شوہر، بیٹے، بھائی کسی نہ کسی مرد سے ملتا ہے اور اسے مہر بھی مزید برآں ملتا ہے۔

شریعت میں تعدد ازدواج (Polygamy) کی اجازت ہے، وجوب نہیں۔ خواتین اور ان کے بے جا حمایتی اس کے خواہمخواہ مخالف ہیں۔ ان کی خاطر بعض "اسلامی" مملکتوں میں قرآنی اجازت کو ممنوع بھی قرار دیا گیا ہے، لیکن اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اسلام میں نکاح ایک معاہدہ ہوتا ہے اور سارے قانونی معاہدوں کی طرح اس میں ایک تو فریقین کی فرداً فرداً رضامندی لازمی ہے اور دوسرے اس معاہدے میں شرائط بھی طے کی جا سکتی ہیں۔ ایک بیوی کی موجودگی میں نئی شادی (Polygamous marriage) کا سوال ہو تو اس دوسری عورت پر کوئی جبر نہیں، وہ نکاح سے انکار کر سکتی ہے۔ اس طرح مسئلہ تعدد ازدواج ختم ہو جائے گا، یا پھر اگر باقی رہے تو ایسی عورتوں میں جو تعدد ازدواج کو برا نہیں سمجھتیں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ خود پہلی

بیوی بھی عقد نکاح میں یہ شرط لگا سکتی ہے کہ اس کا شوہر اس زوجہ کی موجودگی میں کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کرے گا [اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ یہ اجازت مشروط ہے محبت، برتاؤ اور سلوک میں کامل مساوات کے ساتھ، جو عام طور پر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتی ہے۔ اس بنا پر نکاح ثانی کی اجازت عام نہیں ہو سکتی]۔ کہا جاتا رہا ہے کہ مسلمان بیوی کو طلاق کا حق نہیں، صرف شوہر ہی کو ہے۔ یہ بھی ناواقفیت پر مبنی ہے۔ نکاح کے وقت عورت مرد سے اختیار طلاق (خیار طلاق) لے سکتی ہے کہ وہ جس وقت چاہے خود کو اس سے علیحدہ کر سکتی ہے۔ طلاق کا حکم بعد میں بھی عورت کی طرف منتقل ہو سکتا ہے، بشرطیکہ شوہر منظور کرے۔ جہاں تک چوری پر ہاتھ کاٹنے کے حکم کا تعلق ہے [تو اس کا مقصد انسداد جرائم ہے نہ کہ تربیت جرائم اور واقعہ یہ ہے کہ ایسے جرائم پر ڈھیلی ڈھالی سزاؤں سے جرائم کی پرورش ہوتی ہے، انسداد نہیں ہوتا، جس کی عبرت ناک تصویر آج ہم اپنے معاشرے کے علاوہ یورپ میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ حجاز میں جہاں چوری کی بہتات تھی]، سلطان ابن السعود نے اسے دو چار ہفتوں ہی میں ختم کر دیا۔ دو چار آدمیوں کے ہاتھ کٹتے ہیں، پھر چوری کے واقعات شاذ و نادر ہی پیش آتے ہیں۔ ارتداد کی ممانعت پر اعتراض کرنے والے دو چیزیں بھول جاتے ہیں: ایک تو سزائے ارتداد کے عدم نفاذ، بلکہ مسلمانوں کے علاقوں پر غیر مسلم اقتدار اور وہاں عیسائیت وغیرہ کی پرزور تبلیغ کے باوجود، مسلمان شاذ ہی مرتد ہوئے ہیں، دوسرے الفاظ میں ارتداد پر سزا کے ڈر سے نہیں، بلکہ اپنے دین کی حقانیت کے باعث مسلمان مرتد نہیں ہوتا، گویا یہ سزا عملاً غیر موجود ہے۔ دوسرے یہ واقعہ بھی لوگ بھول جاتے ہیں کہ یہ سزا مثلاً بوزنطی عیسائیوں کے ہاں بھی رہی ہے، اگرچہ اسلام اسے اپنے لیے حجت اور دلیل نہیں بناتا۔

غرض، یہ اور دیگر مثالیں واضح کر سکتی ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتویں صدی عیسوی میں دیے ہوئے احکام اتنے معقول اور مناسب ہیں کہ ان میں تبدیلی کی کم از کم اب تک تو کسی سنجیدہ شخص کو ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ تاریخ قانون عالم میں یہی ایک بات حیران کن معجزے سے کم نہیں۔

مآخذ: (۱) ابن القیم: احکام اهل الذمة؛ (۲) وهی مصنف: اعلام الموقعین؛ (۳) وهی مصنف: الطرق الحکمیة؛ (۴) ابو یعلی الفراء: الاحکام السلطانیة، مطبوعة قاهره؛ (۵) القرطبی: اقضیة رسول اللہؐ، مطبوعه قاهره؛ (۶) الماوردی: الاحکام السلطانیة، مطبوعة قاهره (اردو ترجمه بھی شائع ہو چکا ہے)؛ (۷) وکیع: اخبار القضاة، مطبوعة قاهره؛ (۸) محمد حمید اللہ: عہد نبوی میں نظام حکمرانی؛ (۹) وهی مصنف: رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی؛ (۱۰) وهی مصنف: قانون بین الممالک کے اصول اور نظیریں؛ (۱۱) وهی مصنف: الوثائق السیاسیة للعهد النبوی و الخلافة الراشدة، مطبوعه قاهره ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۶ء؛ (۱۲) وهی مصنف: *Le Prophete De L'Islam, sa vie et son oeuvre* (فرانسیسی)، ۲ جلدیں، جہاں ف ۱۳۵۱ تا ۱۳۹۱ میں دستور اور ف ۱۴۹۲ تا ۱۵۱۰ میں قانون سازی کا ذکر ہے؛ (۱۳) وهی مصنف: *The First Written Constitution in the World*؛ (۱۴) وهی مصنف: *Battlefields of the Prophet Muhammad*، اردو ترجمه عہد نبوی کے میدان جنگ، مطبوعهٔ حیدر آباد (دکن)؛ (۱۵) Enost Nys: *Les origines du droit international*؛ (۱۶) Le droit des gens dans les rapports des Arabes et des Byzantins، در *Revue du droit international et legislation comparee*، ج ۱، Bruxelles ۱۸۹۳ء؛ (۱۷) Walker: *History of the Law of Nations*، ج ۱، باب ۵م تا ۶۶، مطبوعه کیمبرج؛ (۱۸) Holtzendarff: *Handbuch des Voelkerrechts*، ج ۱؛ (۱۹) Wellhausen:

Ein Gemeinwesen ohne Obrigkeit، گوٹنگن ۱۹۱۰ء، در *Gemeindeordnung von Medina*، *Shizzen und Vorarbeiten*، ج ۱؛ (۲۰) Majid Khadduri: *The Law of war and peace in Islam*، ۱۹۵۵ء؛ (۲۱) *The Islamic Law of Nations, Shybani's Siyar*، ۱۹۶۶ء؛ (۲۲) *Islam and the Modern Law of Nations*، در *American Journal of International Law*، ص ۳۵۸ تا ۳۷۲، ۱۹۵۶ء؛ (۲۳) Hans Kruse: *Islamische Voelkerrechtslehre*، گوٹنگن ۱۹۵۳ء؛ (۲۴) Heffening: *Das Islamische Fremdenrecht*، ہنوور ۱۹۲۵ء۔

(محمد حمید اللہ [و ادارہ])

آنحضرت صلّی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلّم بحیثیت خطیب: خطابت نبوت کے لوازم میں شامل ہے۔ مشیت ایزدی کا تقاضا بھی یہی رہا ہے کہ انسانیت کی ہدایت و رہنمائی کے لیے جو انبیاے کرام مبعوث ہوے انھیں فصاحت کلام اور بلاغت بیان سے نوازا جائے تاکہ وہ پیغام ربانی کو کھول کر بیان کر سکیں اور اپنی امت کی رہنمائی کرنے کا فرض منصبی انجام دے سکیں (دیکھیے القرآن الحکیم، ۱۴ [ابراہیم]: ۴؛ روح المعانی، ۱۳: ۵۷؛ الجاحظ: البیان و التبیین، ۱: ۸ تا ۹؛ شبلی: سیرت النبی، ۲: ۲۳۳؛ احمد حسن زیات: تاریخ الادب العربی، ۱۸ ببعد؛ احسان النصر: الخطابۃ العربیۃ، ص ۳۸)۔ اہل عرب خطابت میں فصاحت و بلاغت کی بلندیوں پر تھے، جنھیں فارس و یونان کے فکر و فن کے عوض اللہ تعالی نے فصاحت لسان اور بلاغت بیان سے نوازا تھا (الجاحظ: البیان و التبیین، ۱: ۶۷، ۹۸؛ عبدالرحمن البرقوقی: مقدمہ شرح دیوان حسان، ص ۷)۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم افصح العرب تھے، کیونکہ آپؐ قریش میں پیدا ہوے اور بنو سعد میں آپؐ کی پرورش ہوئی تھی۔ فصاحت و بلاغت میں یہی دو قبائل تمام عرب میں ممتاز تھے اور ان کی زبان سب کے لیے ایک نمونہ تھی۔ قریش کی زبان کو ہی اللہ تعالی نے عربی مبین قرار دیا ہے (۲۶ [الشعراء]: ۱۹۵؛ روح المعانی، ۱۹: ۱۲۷؛ البیان و التبیین، ۱: ۹۰ ببعد)۔ آپؐ کی فصاحت و بلاغت کی عرب فصحا و بلغا نے ستائش کی ہے اور کلام اللہ کے بعد آپؐ ہی کے کلام کو بلیغ ترین تسلیم کیا ہے (احسان النصر: الخطابۃ العربیۃ، ص ۳۸؛ البیان و التبیین، ۲: ۱۵ ببعد: تاریخ الادب العربی، ص ۱۸؛ الادب العربی و تاریخہ، ۱: ۳۳)۔

آپؐ کی فصاحت و بلاغت اور آپؐ کا اسلوب بیان چونکہ فیضان الہی کا نتیجہ تھا، اس لیے وہ وحی الہی کے مشابہ تھا (تاریخ الادب العربی، ص ۱۸، ببعد)۔ آپؐ سلیس الفاظ میں نازک معانی بیان فرماتے تھے۔ تمام قبائل عرب کے لہجات و لغات کا اللہ نے آپؐ کو علم عطا کیا تھا (الادب العربی و تاریخہ، ۱: ۳۴ ببعد)۔ الجاحظ نے لکھا ہے کہ نہ تو آپؐ نے الفاظ کی تلاش میں کبھی مشقت کی اور نہ معانی پیدا کرنے کے لیے تکلف سے کام لیا (البیان و التبیین، ۱: ۲۷۱؛ ۲: ۷۷)۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ تکلف و تصنع والی خطابت سے میں پرہیز کرتا ہوں؛ مجھے وہ لوگ اچھے نہیں لگتے جو باتونی اور زبان دراز ہوتے ہیں (کتاب مذکور، ۱: ۱۳؛ ۳: ۳۹)۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے آپؐ کے خطبات میں ہمیشہ صحت زبان، صداقت اور اخلاص کو جلوہ گر دیکھا۔ آپؐ کبھی زبان کی غلطی نہ کرتے اور ہمیشہ تائید ربانی آپؐ کے شامل حال رہتی (کتاب مذکور ۳: ۳۱)۔

الجاحظ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے متعدد جوامع الکلم اور خطبات نقل کرنے کے علاوہ آپؐ کی فصاحت و بلاغت کی بھی بڑی اچھی تشریح کی ہے (البیان و التبیین، ۱: ۱۳، ۱۵، ۲۷۱، ۳۱۳؛ ۲: ۱۵ ببعد؛ ۳: ۱۳۲، ۳۰۴ ببعد)،

وہ آپؐ کے انداز خطابت کے بارے میں کہتا ہے ۲ : ۱۶ تا ۱۸) کہ آپؐ کا کلام قلت الفاظ کے باوجود کثرت معانی (ثروت معانی) سے متصف تھا۔ آپؐ تصنع اور تکلف سے اجتناب کرتے تھے اور صحیح معنوں میں اللہ کے اس ارشاد کی عملی تفسیر ہوتے تھے جس میں اللہ تعالی نے آپؐ سے فرمایا ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم! کہہ دیجیے کہ میں تکلف کرنے والوں میں سے نہیں ہوں [وَ مَآ اَنَا مِنَ الْمُتَکَلِّفِیْنَ (۳۸ [ص] : ۸۶)]۔ جہاں تفصیل کی ضرورت ہوتی آپؐ شرح و بسط سے کام لیتے، اور جہاں اختصار کا موقع ہوتا آپؐ مختصر خطاب فرماتے۔ آپؐ کے کلام میں نہ تو غیر مانوس الفاظ ہوتے اور نہ عامی الفاظ۔ آپؐ جب بھی بولتے، حکمت کے چشمے پھوٹتے نظر آتے۔ آپؐ کے اسلوب بیان کو اللہ کی حمایت و تائید اور توفیق حاصل تھی۔ آپؐ کا بیان معجز نظام ایسا تھا جسے اللہ کی جانب سے محبوب و مقبول ہونے کا شرف بخشا گیا تھا؛ جس میں رعب و دبدبہ بھی تھا اور شیرینی بھی؛ جو قلت الفاظ کے ساتھ ساتھ حسن تفہیم کا پہلو بھی رکھتا تھا۔ آپؐ کی بات اس قدر واضح اور عام فہم ہوتی کہ جسے دہرانے یا دوبارہ سننے کی حاجت نہ رہتی تھی، (پھر بھی اگر کوئی دہرانے کی درخواست کرتا تو آپؐ رد نہ فرماتے تھے)۔ آپؐ کے کلام میں کبھی لغزش یا نقص نہ پیدا ہوا۔ آپؐ کا بیان مدلل ہوتا تھا اور آپؐ کو کوئی خطیب کبھی بھی لاجواب نہیں کر سکا۔ آپؐ کے طویل خطبات میں جملے پرمغز و مختصر ہوتے تھے۔ حق و صداقت کی بات کرتے؛ الفاظ کے ہیر پھیر کا سہارا لینے یا عیب جوئی سے ہمیشہ اجتناب فرماتے؛ نہ سست روی سے کام لیتے نہ جلد بازی سے، نہ حد سے زیادہ طول دیتے اور نہ بات کرنے سے عاجز آتے، بلکہ آپؐ کے کلام سے زیادہ فائدہ بخش، لفظ و معنی میں متوازن، بلند مقصد کلام کسی کا نہ تھا۔ اثر میں کامل، ادا میں آسان، لفظوں میں فصیح اور مقصد میں بلیغ۔

آپؐ کے عہد کے شعرا و بلغا اکثر بھی کہتے تھے کہ آپؐ کو اور کچھ بھی عطا نہ ہوتا تو بھی صرف فی البدیہہ خطبات کی فصاحت و بلاغت کا معجزہ ہی کافی تھا (ابن قتیبہ: عیون الاخبار، ۱ : ۳۳۳؛ البیان و التبیین، ۱ : ۱۵؛ ابن ہشام: سیرۃ، ص ۲۹۷)۔ حضرت سعید بن المسیب سے پوچھا گیا کہ سب سے زیادہ بلیغ (اَبْلَغُ النَّاس) کون ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم ہیں (البیان و التبیین، ۱ : ۳۱۳)۔ محمد بن سلام نے یونس بن حبیب کا قول نقل کیا ہے کہ فصاحت و بلاغت کے جو اعلیٰ ترین نمونے ہمیں آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے کلام سے میسّر آئے ہیں وہ کسی خطیب کے کلام سے میسر نہیں آ سکے (البیان والتبیین، ۲ : ۱۸)۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ آپؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں بلاد عرب میں اکثر گھوما پھرا ہوں؛ عرب کے بے شمار فصحا کی باتیں سنی ہیں، مگر آپؐ سے زیادہ فصیح و بلیغ کوئی نہیں دیکھا۔ آپؐ کو فصاحت و بلاغت کا یہ کمال کیونکر حاصل ہوا۔ آپؐ نے جواب دیا کہ مجھے میرے رب نے ادب سکھایا ہے اور بہت ہی خوب سکھایا ہے (الادب العربی و تاریخہ، ۱ : ۳۳؛ عبدالکریم الجیلی: الانسان الکامل، ص ۱۲۷)۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم خطیب کی شستہ بیانی کو پسند فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپؐ سے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ! انسان کا حسن [شاید بمعنی تہذیب و شائستگی] کس بات میں ہے تو آپؐ نے جواب میں فرمایا کہ انسان کا حسن و جمال اس کی زبان ہے (العقد الفرید، ۲ : ۱۲۲؛ عیون الاخبار، ۲ : ۱۶۸)۔

آپ؃ متانت سے گرے ہوئے کلام سے ہمیشہ اجتناب کرتے تھے اور باچھیں کھول کر تقریر کرنے سے منع فرماتے تھے۔ آپ؃ کا ارشاد تھا کہ اللہ تعالٰی ایسے خطبا کو (جو دوسرے اعتبار سے فصیح و بلیغ ہی کیوں نہ ہوں) ناپسند کرتا ہے جو اپنی تقریر کے دوران میں زبان اس طرح ہلاتے ہیں جس طرح کوئی گائے جگالی کرتی ہے (الترمذی : الجامع السنن، باب ماجاء فی الفصاحة و البیان، ۲ : ۱۱۴)۔ اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ؃ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم عام لوگوں کی طرح جلدی جلدی نہیں بولتے تھے، بلکہ آپ؃ کا انداز کلام تو بالکل واضح اور صاف ستھرا (بکَلَامٍ بینَہٗ فصل) ہوا کرتا تھا (الترمذی : الجامع السنن، [۵ : ۶۰۰، حدیث ۳۶۳۹]) اور مجلس میں بیٹھنے والا آپ؃ کی باتوں کو آسانی سے حفظ کر سکتا تھا (حوالۂ مذکور)؛ بخاری (الجامع الصحیح، کتاب العلم، باب من اعاد الحدیث ثلاثًا، ۱ : ۸۵) کی روایت ہے کہ آپ؃ جب گفتگو فرماتے تو اپنی بات کو تین تین مرتبہ دہراتے، تاکہ سننے والے آپ؃ کی بات اچھی طرح سمجھ کر یاد کر سکیں۔ اگر کوئی شخص آپ؃ کی بات کے الفاظ گننا چاہتا تو گن سکتا تھا۔ آپ؃ کا کلام بے ساختہ ہوتا اور آپ؃ کے اسلوب میں ترتیل اور سلیقہ نمایاں ہوتا تھا (ابن سعد : الطبقات، ۱ : ۳۷۵)۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالٰی نے باد صبا کے ذریعے (غزوۂ احزاب [رکَ بآں] میں) مجھے فتح و نصرت عطا فرمائی اور مجھے جوامع الکلم (مختصر مگر جامع و پرمغز انداز بیان) بھی عنایت فرمایا ہے (البیان و التبیین، ۴ : ۲۹)۔

الجاحظ (البیان و التبیین، ۴ : ۲۸) نے بیان کیا ہے کہ صحابۂ کرام؃ نے کئی اہم مواقع پر آپ؃ کے طویل خطبات بھی سنے تھے، مگر محض بات بڑھانے کے لیے یا طویل گفتگو پر قدرت کے اظہار کی خاطر آپ؃ نے کبھی طویل خطبہ نہ دیا، لیکن جب معانی کی کثرت ہوتی تو الفاظ کی بھی کثرت ہوتی تھی اور فالتو الفاظ بالکل استعمال نہ فرماتے تھے۔ آپ؃ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ انداز بیان بھی ایک جادو ہے اس لیے تم لوگ نماز کو تو طول دیا کرو، مگر خطبات میں اختصار سے کام لیا کرو (عیون الاخبار، ۲ : ۱٦۸)۔ ابوالحسن المدائنی کا بیان ہے کہ ایک دن حضرت عمار؄ بن یاسر نے تقریر کی، مگر اختصار سے کام لیا، لوگوں نے مزید تقریر پر اصرار کیا، لیکن انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّمؐ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ نماز کو طول دیں اور خطبات میں اختصار سے کام لیا کریں (البیان و التبیین، ۱ : ۳۵۳)۔

خطابت میں حُسنِ صوت یا خوش آواز ہونے کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ انبیا علیہم السّلام میں سے حضرت داؤد؃ کو فصلُ الخطاب (فیصلہ کن کلام (۳۸ [صٓ] : ۲۰) کے ساتھ ساتھ خوش الحلقی اور حسن صوت سے بھی نوازا گیا تھا (۳۴ [سبا] : ۱۰؛ کتاب البیان و التبیین، ۴ : ۲۹۲)۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم خوش آواز بھی تھے اور بلند آواز بھی؛ چنانچہ حضرت قتادہ؃ سے روایت ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کو حُسن صورت کے ساتھ ساتھ حسن صوت کی نعمت بھی عطا فرمائی گئی تھی (ابن سعد : الطبقات، ۱ : ۳۷٦)۔ آپ؃ کی آواز اتنی دور دور تک سنائی دیتی تھی، جتنی دور کسی اور کی آواز سنی نہیں جا سکتی۔ آپ؃ نے منٰی میں جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا اسے لوگوں نے دور دور تک سنا تھا (حوالۂ مذکور)۔ حضرت اُم؃ ہانی سے روایت ہے کہ آدھی رات کے وقت جب آپ؃ خانہ کعبہ میں قرآن مجید کی تلاوت فرماتے تھے تو ہم اپنے گھروں کی چھتوں پر آپ؃ کی آواز سنا کرتے تھے

(ابن ماجہ: سنن، باب ما جاء فی القراءۃ فی صلوۃ اللیل، ۱ : ۴۲۹) ۔ ترمذی (شمائل، ص ۱۵ تا ۱۶) کی ایک اور روایت ہے کہ آپؐ اکثر خاموش رہتے اور صرف ضرورت کے وقت بات کرتے۔ جب آپؐ بات کرتے ہوئے اشارہ کرتے تو پوری ہتھیلی سے اشارہ فرماتے۔ جب تعجب کا اظہار کرتے تو ہتھیلی کو الٹ کر اشارہ کرتے۔ جب بات کرتے تو دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے اندرونی حصے سے ملاتے؛ جب ناراض ہوتے تو رخ انور دوسری طرف پھیر لیتے؛ جب خاموشی کا اظہار فرماتے تو آنکھیں موند لیتے تھے۔ آپؐ کے ہنسنے کی حد ایک مسکراہٹ تھی، آپؐ مسکراتے ہوئے یوں لگتے تھے جیسے بادل کی ٹھنڈک ہو۔

علمائے نقد و ادب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی فصاحت و بلاغت اور آپؐ کے ارشادات و خطبات کے ادبی مقام و مرتبہ سے بحث کی ہے۔ آپؐ کے عہد کے حالات، ماحول اور آپؐ کی تربیت پر اثر انداز ہونے والے اسباب و عوامل کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عربی زبان کا علم و ذوق رکھنے والا ہر منصف مزاج عاقل و دانش مند شخص یہ تسلیم کرتا ہے کہ کلام عرب میں فصیح ترین کلام کلام الٰہی ہے اور اس کے بعد فصاحت و بلاغت میں آنحضرتؐ کے ارشادات کا مرتبہ ہے (بکری امین: ادب الحدیث النبوی، ص ۱۷۱)۔ محققین نے آپؐ کے افصح العرب ہونے کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اولین سبب تو یہ تھا کہ آپؐ بنی ہاشم میں پیدا ہوئے اور قریش میں نشو و نما پائی، دوسرا سبب یہ تھا کہ آپؐ کی رضاعت و تربیت بنو سعد بن بکر (بنو ہوازن) میں ہوئی تھی جن کی فصاحت و بلاغت قریش کے بعد مسلّم تھی۔ اس کے علاوہ آپؐ کے ننہال بنو زہرہ تھے اور آپؐ کی رفیقۂ حیات حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا بنو اسد سے تھیں۔ یہ قبائل بھی فصاحت و بلاغت میں نمایاں مقام رکھتے تھے؛ تیسرا سبب یہ ہے کہ اللہ کا آخری کلام قرآن مجید عربی مبین میں نازل ہوا، جس کے معجزانہ اسلوب بیان کے سامنے تمام فصحائے عرب اور جنّ و انس عاجز تھے۔ اس کتاب مبین کے اسلوب اعجاز نے بھی رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی قوت بیان کو برکت عطا کی تھی؛ چنانچہ آپؐ کے کلام پر کلام اللہ کی چھاپ نمایاں تھی؛ چوتھا اور سب سے بڑا سبب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی فطرت سلیمہ تھی، جس میں عنایت ایزدی نے تمام کمالات و دیعت فرما دیے تھے (ادب الحدیث النبوی، ص ۱۰۲ ببعد؛ تاریخ الادب العربی، ص ۱۸ ببعد)۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ کا فصیح و بلیغ کلام بعد کے اہل علم و ادب کے لیے ایک روحانی غذا ثابت ہوا۔ آپؐ کے اقوال حفظ کرکے ادب کو مزیّن کیا گیا۔ احادیث کے اقتباسات سے اہل علم نے اپنی نگارشات کو سجایا۔ آپؐ کے ارشادات و خطبات سے اہل علم نے جو فوائد حاصل کیے ان میں سے چند یہ تھے کہ فقہا نے دینی مسائل کا استنباط کیا۔ محدثین نے آپؐ کے ارشادات کی تفسیر و تشریح کی۔ اہل لغت و ادب نے محاورات و تراکیب حاصل کیں۔ علمائے بلاغت کو آپؐ کے کلام میں اعلیٰ نمونے ملے۔ عام اہل ادب کو فصاحت و بلاغت کا ایک ذخیرہ میسّر آ گیا (حوالۂ مذکور)۔

الباقلانی (اعجاز القرآن، ص ۱۶۴، قاہرہ ۱۹۵۱ء) نے لکھا ہے کہ قرآن مجید کے معجز نما اسلوب بلاغت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے فصیح و بلیغ ارشادات کے درمیان جو لفظی اور معنوی فرق ہے، اسے عربی ادب کا ہر طالب علم بآسانی محسوس کر سکتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے خطابت

کے اسلوب ، مقاصد اور طریقوں میں بعض ایسی تبدیلیاں پیدا کیں جو قدیم عرب خطبا کے ہاں مروج نہ تھیں ۔ حمد و ثنا اور صلاۃ و سلام سے خطابت کا آغاز آپؐ نے فرمایا ۔ آغاز تقریر میں ایک قول کے مطابق امّا بعد (= اب اس کے بعد) کا لفظ بھی سب سے پہلے آپؐ ہی نے استعمال کیا ، جو بعد میں امت کے روزمرہ کا ایک معمول بن گیا (بخاری : الجامع الصحیح ، ۱ : ۶۴ ؛ ۲ : ۱۸۹ ؛ ادب الحدیث النبوی ، ص ۱۰۱ ببعد) ۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم سے قبل خطباے عرب محض فصاحت و بلاغت کے اظہار یا اپنے قبیلے کی مدح سرائی یا دشمن کی تنقیص کے لیے خطابت کا سہارا لیتے تھے ، مگر آپؐ نے خطابت کو اشاعت توحید ، وعظ و نصیحت ، دعوت حق و عمل صالح ، اصلاح ذات البیَن ، ترغیب جہاد اور انسانیت کی دنیوی اور اخروی فلاح کے لیے صرف فرمایا (ابن الاثیر : الکامل ، ۲ : ۲۰ ؛ ابن ہشام : سیرة ، ۳ : ۵ ؛ احمد زکی : جمہرة خُطب العرب ، ۱ : ۵۱ تا ۶۰) ۔

ابن عبد ربّہ (العقد الفرید ، ۲ : ۲۲۱ ببعد) نے بیان کیا ہے کہ میں نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے خطبات کا مسلسل مطالعہ کرنے کے بعد یہ دیکھا ہے کہ آپؐ کے خطبات کا آغاز ہمیشہ حمد و ثنا ، استغفار اور توکل علی اللہ کے جملوں سے ہوتا تھا ، سواے خطبۂ عیدین کے کہ اس کا آغاز آپؐ تکبیر (اللہ اکبر) سے کیا کرتے تھے ۔ بیشتر خطبات میں آپؐ خوف خداوندی کی وصیت فرماتے تھے ۔ آپؐ کے ان خطبات میں جوش و جذبہ زیادہ ہوتا تھا جو آپؐ میدان قتال میں جہاد کا شوق ابھارنے کے لیے ارشاد فرماتے تھے یا جن میں توحید کا درس ہوتا یا جہنم سے ڈرانا مقصود ہوتا (عبدالکریم : الانسان الکامل ، ص ۱۳۱ ؛ شبلی و سلیمان ندوی : سیرة النبیؐ ، ۲ : ۲۲۴) ۔ تقریر ارشاد فرماتے وقت افصح العرب والعجم پر جو کیفیت طاری ہوتی تھی اسے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے مختلف اوقات میں بیان کیا ہے ۔ جوش خطابت کے وقت آپؐ کی آنکھیں سرخ ہو جاتی تھیں ؛ آواز گرج دار اور بلند ہوتی تھی ؛ چہرۂ مبارک پر جلال کے آثار نمایاں ہو جاتے تھے ؛ جوش و جذبے کے عالم میں انگلیاں اٹھتی جاتی تھیں اور لگتا تھا کہ آپؐ لشکر اسلام کو جہاد کے لیے ہاتھ کے اشاروں سے جوش دلا رہے ہیں ؛ جسم مبارک جھومنے لگتا تھا ۔ ہاتھوں کی حرکت سے پٹھوں کے چٹخنے کی آوازیں سنائی دیتی تھی ؛ دوران تقریر میں کبھی مٹھی بند کر لیتے اور کبھی کھول دیتے تھے (شبلی : سیرة النبیؐ ، ۲ : ۲۳۵ ؛ ابن قیم : زادالمعاد ، ۱ : ۴۸ ؛ مسلم : الجامع الصحیح ، ۱ : ۲۸۴) ۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے آپؐ کے ایک خطبے کے دوران میں جوش خطیبانہ کی تصویر پیش کرتے ہوئے بتایا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کو برسر منبر یہ فرماتے ہوئے سنا کہ خالق جبار ارض و سما کو مٹھی میں لے لے گا اور آپؐ ساتھ ہی اپنی مٹھی کبھی بند کرتے اور کبھی کھولتے جاتے تھے ۔ میں نے حضورؐ کو دیکھا کہ آپؐ کبھی دائیں جانب جھکتے ، کبھی بائیں جانب جھکتے حتّٰی کہ میں منبر نبوی کو ہلتے ہوئے دیکھ کر یہ سوچنے لگا کہ کہیں یہ منبر گر نہ پڑے (ابن ماجہ : السنن ، ۲ : ۲۴۷ ؛ سیرة النبیؐ ، ۲ : ۲۳۳ ، ببعد) ۔

عقاد (عبقریة محمدؐ ، ص ۱۰۸) نے لکھا ہے چونکہ ابلاغ اور تبلیغ آپؐ کا مشن اور منصب تھا اس لیے بلاغت ہی آپؐ کے کلام کی نمایاں خصوصیت تھی ۔ آپؐ خطبہ حجة الوداع (البیان و التبیین ، ۲ : ۳۱ ؛ ابن ہشام : سیرة ، ۴ : ۳۵ ؛ جمہرة خطب العرب ، ۱ : ۵۹ ببعد) میں

بار بار یہ لفظ دہراتے تھے : اَلَاھَلْ بَلَّغْتُ (کیا میں نے اچھی طرح خدا کا پیغام پہنچا دیا ہے) ۔ عطیۃ الابراشی (عظمۃ الرسول صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم ، ص ۲۷۵) نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو اللہ تعالٰی نے تمام قبائل عرب کی لغات و لہجات کا علم عطا کیا تھا، اس لیے ہر قبیلے کے لوگوں سے آپؐ ان کے لب و لہجے میں گفتگو فرماتے ؛ چنانچہ قریش و انصار اور اہل نجد و حجاز کے ساتھ آپؐ جو انداز گفتگو اختیار کرتے وہ اس سے مختلف تھا جو آپؐ قحطانی عربوں سے بات چیت کرتے ہوئے استعمال کرتے تھے ۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جب تعجب سے اس فصاحت و بلاغت کا سبب دریافت کرتے تھے تو آپؐ فرماتے تھے کہ میرے رب نے میری تربیت کی ہے اور قرآن مجید میری ہی زبان کے ذریعے اللہ نے نازل فرمایا ہے (حوالۂ مذکورہ ، ص ۸۲ ؛ الادب العربی و تاریخہ ، ۱ : ۳۴) ۔

آپؐ جب میدان جہاد میں مجاہدین اسلام سے خطاب فرماتے تو اپنی کمان کا سہارا لیتے تھے، کبھی کسی سہارے کے بغیر خطبہ ارشاد فرماتے اور کبھی اونٹنی پر سوار ہو کر خطاب فرماتے (سیرۃ النبیؐ، ۲ : ۲۳۳) ۔ ہجرت کے بعد جب آپؐ نے مسجد نبوی میں مسلمانوں سے مختلف مواقع پر خطاب کا آغاز کیا تھا تو کھجور کے ایک تنے کے سہارے تقریر کرتے تھے ۔ جب اہل اسلام کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تو صحابۂ کرامؓ نے آپؐ کے لیے ایک منبر بنوا دیا تھا تاکہ سب آپؐ کا دیدار کر سکیں (ابن سعد : الطبقات، ص ۹ تا ۱۲) ۔ کبھی آپؐ عصا کے سہارے خطبہ دیا کرتے تھے ۔ الجاحظ (البیان و التبیین، ۱ : ۶۹) نے بیان کیا ہے کہ یہ عصا خلفاے راشدین کو منتقل ہوتا رہا اور وہ اس سنت نبویؐ پر عمل کرتے رہے ۔ آخری اموی خلیفہ نے اپنا انجام دیکھ کر اپنے غلام کو حکم دیا تھا کہ چادر نبوی اور آپؐ کا عصا کہیں دفن کر دے، لیکن اس نے یہ دونوں چیزیں عباسی خلفا کو پہنچا دیں ۔

حضور صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے ارشادات جوامع الکلم کے سلسلے میں جاحظ نے لکھا ہے کہ بعض اقوال و کلمات نبویؐ ایسے ہیں جو آپؐ سے پہلے کسی عرب کی زبان پر وارد نہیں ہوئے ۔ آپؐ کے جوامع الکلم ضرب المثل بن کر عربی زبان و ادب کا حصہ بن گئے ہیں ، مثلاً مجاہدین اسلام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا : یَا خَیْلَ اللہِ ارْکَبِیْ (اے اللہ کے گھوڑو یا شہسوارو ! سوار ہو جاؤ !) یہ محاورہ آپؐ سے قبل کسی نے استعمال نہیں کیا ؛ لَا تَنْتَطِحُ فِیْہِ عَنْزَانِ (اس میں دو بکروں کے سینگ نہیں ٹکراتے ، یعنی یہ بات جھگڑے کی نہیں !) ۔ جنگ کی شدت کے بارے میں یہ محاورہ بھی سب سے پہلے عربی زبان میں آپؐ ہی نے استعمال کیا تھا : اَلْآنَ حَمِیَ الْوَطِیْسُ ، (یعنی اب تنور گرم ہو گیا ہے مطلب یہ کہ معرکہ گرم ہوا ہے !) ۔

آپؐ کے جوامع الکلم : (۱) رأسُ العقل بَعْدَ الْاِیْمَانِ باللہ مداراۃ الناس ، یعنی اللہ تعالٰی پر ایمان لانے کے بعد عقل کی سب سے بڑی بات انسانوں کی دلجوئی کرنا ہے (البیان والتبیین ، ۲ : ۲۰ ؛ ادب الحدیث النبوی ، ص ۱۰۹ ؛ عظمۃ الرسول ، ص ۲۷۸) ؛ (۲) اَلَا اَدُلُّکُمْ عَلٰی خَیْرِ مَا یَکْنِزُ الْمَرْءُ ؟ اَلْمَرْأَۃُ الصَّالِحَۃُ : اِذَا نَظَرَ اِلَیْھَا سَرَّتْہُ وَ اِذَا غَابَ عَنْھَا حَفِظَتْہُ فِیْ مَالِہٖ وَ عِرْضِہٖ ، یعنی کیا میں تمھیں ایک مرد کے بہترین سرمایہ کا پتا نہ دوں ؟ وہ ایسی نیک عورت ہے کہ اگر مرد اسے دیکھے تو اسے مسرت ہو اور اگر وہ اس سے دور ہو تو اس کے مال و عزت کی حفاظت کرے (ادب الحدیث النبوی ، ص ۱۰۵ ؛ عظمۃ الرسول ، ص ۲۷۷) ؛ (۳) مَا ھَلَکَ امْرُؤٌ عَرَفَ قَدْرَہٗ ، یعنی جس نے اپنا مرتبہ پہچان لیا

وہ ہلاکت سے بچ گیا (البیان والتبیین ، ۲ : ۲۳) ؛ (۴) لَوْ تَكَاشَفْتُمْ لَمَا تَدَافَنْتُمْ ، یعنی اگر تمھیں ایک دوسرے کے بھید معلوم ہو جائیں تو بوجہ نفرت ایک دوسرے کو دفن بھی نہ کرو (المبرد : الکامل ، ص ۱۷۱ ؛ البیان والتبیین ، ۲ : ۲۳) ؛ (۵) مَنْ كَانَ آمِنًا فِي سِرْبِهِ ، مُعَافًى فِي بَدَنِهِ ، عِنْدَهُ قُوتُ يَوْمِهِ كَانَ كَمَنْ حِيزَتْ لَهُ الدُّنْيَا بِحَذَافِيرِهَا ، یعنی جو اپنے گھر والوں میں امن و اطمینان ، صحت و عافیت سے رہتا ہو ، اس کے پاس ایک دن کی خوراک بھی موجود ہو تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے تمام دنیا و مافیہا اس کے لیے جمع کر دی گئی ہے (المبرد : الکامل ، ص ۱۹ ؛ عظمة الرسول ، ص ۲۷۶) ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا اوّلین خطبہ ، جو تاریخ میں محفوظ ہے اس میں آپؐ نے اپنی نبوت کا اعلان کرتے ہوئے قریش مکہ اور عرب و عجم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا : إِنَّ الرَّائِدَ لَا يَكْذِبُ أَهْلَهُ ، وَ اللّٰهِ لَوْ كَذَبْتُ النَّاسَ جَمِيعًا مَا كَذَبْتُكُمْ وَ لَوْ غَرَرْتُ النَّاسَ جَمِيعًا مَا غَرَرْتُكُمْ وَ اللّٰهِ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ إِنِّي رَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ خَاصَّةً وَإِلَى النَّاسِ كَافَّةً وَاللّٰهِ لَتَمُوتُنَّ كَمَا تَنَامُونَ وَ لَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُونَ وَ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُونَ وَ لَتُجْزَوُنَّ بِالْإِحْسَانِ إِحْسَانًا وَّ بِالسُّوءِ سُوءًا وَإِنَّهَا لَجَنَّةٌ أَبَدًا أَوْ لَنَارٌ أَبَدًا (یعنی کوئی بھی خبر لانے والا اپنوں سے جھوٹ نہیں بولتا ! بخدا اگر میں سب لوگوں سے بھی جھوٹ بولتا تو بھی تم سے کبھی جھوٹ نہ بولتا اور اگر میں سب دنیا والوں کو بھی دھوکا دیتا تو تمھیں پھر بھی کبھی دھوکہ نہ دیتا ؛ قسم ہے اللہ کی ، جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ میں اللہ کا رسول ہوں ، جیسے تمھاری طرف خصوصاً بھیجا گیا ہے اور باقی تمام انسانوں کی طرف بھی بھیجا گیا ہوں ، واللہ ! تم اسی طرح مر جاؤ گے جس طرح تم سوتے ہو اور اسی طرح اٹھو گے جس طرح تم بیدار ہوتے ہو ! تمھیں اپنے اعمال کا حساب دینا ہی ہوگا ۔ پھر (یاد رکھو) بھلائی کا بدلہ بھلائی اور برائی کا بدلہ برائی ہوگا ، پھر یا تو ہمیشہ کے لیے جنت ہوگی یا جہنم (ابن الاثیر : الکامل ، ص ۲۷ ؛ سیرة النبی ، ۲ : ۲۳۶ ؛ الحلبية ، ۱ : ۲۷۲ ؛ جمهرة خطب العرب ، ۱ : ۵) ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے تبوک میں جو خطبہ ارشاد فرمایا ، وہ مختصر ہونے کے باوجود نہایت جامع اور دانش و حکمت کا گنجینہ ہے (ابن قیم : زاد المعاد ، ۱ : ۲۲۴ ، مطبوعۂ قاہرہ) ۔

خطبۂ حجة الوداع میں آپؐ نے ارشاد فرمایا تھا : أَيُّهَا النَّاسُ ! إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ وَ لَا يَحِلُّ لِامْرِئٍ مَالُ أَخِيهِ إِلَّا عَنْ طِيبِ نَفْسٍ مِنْهُ ، أَلَا هَلْ بَلَّغْتُ ؟ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ ! فَلَا تَرْجِعُنَّ بَعْدِي كُفَّارًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ فَإِنِّي قَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا إِنْ أَخَذْتُمْ بِهِ لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِي : كِتَابَ اللّٰهِ أَلَا هَلْ بَلَّغْتُ ؟ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ ! أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَ إِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ كُلُّكُمْ لِآدَمَ وَ آدَمُ مِنْ تُرَابٍ ، أَكْرَمُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ وَ لَيْسَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ فَضْلٌ إِلَّا بِالتَّقْوَى ، أَلَا هَلْ بَلَّغْتُ ؟ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ ! قَالُوا : نَعَمْ ! قَالَ فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ (یعنی اے لوگوں ! تمام مومن بھائی بھائی ہیں ، کسی کے لیے اپنے بھائی کا مال حلال نہیں ہے ہاں اگر وہ خوشی سے دے تو ٹھیک ہے ۔ سنو ، کیا میں نے (خدائی پیغام) پہنچا دیا ہے ؟ اے اللہ گواہ رہنا ! تم میرے بعد کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو ۔ کیونکہ میں نے تم میں ایک ایسی چیز چھوڑی ہے اگر تم اس کے پابند رہے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے اور وہ ہے اللہ کی کتاب ! تو کیا میں نے (خدائی پیغام) پہنچا دیا ؟ اے اللہ گواہ رہنا ! اے لوگو ، تمھارا رب ایک ہے ، تمھارا باپ بھی ایک ہے ، تم سب آدمؑ سے ہو ، اور آدمؑ مٹی سے تھے ، تم میں سب سے زیادہ معزز وہی ہے جو سب سے زیادہ

متقی ہو، کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں سوائے تقویٰ کے۔ تو کیا میں نے (خدائی پیغام) پہنچا دیا؟ اے اللہ! گواہ رہیو: لوگوں نے کہا: ہاں! آپؐ نے فرمایا: تو جو حاضر ہے وہ غائب کو پہنچا دے (البیان والتبیین، ۲: ۳۳؛ ابن الاثیر: الکامل، ۲: ۱۳۶؛ ابن ہشام: السیرۃ، ص ۲۵۰ ببعد؛ الباقلانی: اعجاز القرآن، ص ۱۱۱؛ العقد الفرید، ۲: ۳۳۲؛ شرح نہج البلاغہ، ۱: ۱۳؛ جمہرۃ خطب العرب، ۲: ۲۳۶؛ البخاری: الجامع الصحیح؛ السیرۃ الحلبیۃ، ۳: ۲۵۹)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے خطبات کتب حدیث و سیرت، تاریخ، ادب اور بلاغت میں ملتے ہیں، جن میں سے بیشتر خطبات احمد زکی صفوت (جمہرۃ خطب العرب فی عصور العربیۃ الزاہرۃ، ۱: ۱۵ تا ۶۰) نے یکجا کر دیے ہیں۔

مآخذ: (۱) المبرد: الکامل، مطبوعہ لائپزگ؛ (۲) ابن قتیبہ: عیون الاخبار، قاہرہ ۱۹۲۲ء؛ (۳) وہی مصنف: ادب الکاتب، لائیڈن ۱۹۰۰ء؛ (۴) ابن عبد ربہ: العقد الفرید، مطبوعۂ قاہرہ (بدون تاریخ)؛ (۵) احمد زکی صفوت: جمہرۃ خطب العرب فی عصور العربیۃ الزاہرۃ، قاہرہ ۱۳۵۲ھ؛ (۶) الجاحظ: البیان والتبیین، قاہرہ ۱۹۶۰ء؛ (۷) احمد حسن الزیات: تاریخ الادب العربی، مطبوعۂ قاہرہ؛ (۸) محمود شکری آلوسی: روح المعانی، مطبوعۂ قاہرہ، (بدون تاریخ)؛ (۹) احمد ضیف: مقدمۃ لدراسۃ بلاغۃ العرب، قاہرہ ۱۹۲۱ء؛ (۱۰) ابوالقاسم الزمخشری: اطواق الذہب فی المواعظ والخطب، قاہرہ ۱۳۲۸ھ؛ (۱۱) محمد عبدالغنی حسن: الخطب والمواعظ، قاہرہ ۱۹۰۰ء؛ (۱۲) ابن الاثیر: المثل السائر فی ادب الکاتب والشعر، قاہرہ ۱۳۱۲ھ؛ (۱۳) سعید الافغانی: اسواق العرب فی الجاہلیۃ والاسلام، دمشق ۱۹۳۷ء؛ (۱۴) جواد علی: تاریخ العرب قبل الاسلام، بغداد ۱۹۵۵ء؛ (۱۵) عبدالمالک المحاسنی المکی: سمط النجوم العوالی، قاہرہ ۱۳۸۰ھ؛ (۱۶) عبدالوہاب عزام: موقع عکاظ، ۱۹۵۰ء؛ (۱۷) النویری: نہایۃ الارب فی فنون العرب، قاہرہ ۱۹۵۱ء؛ (۱۸) الباقلانی: اعجاز القرآن، قاہرہ ۱۹۵۱ء؛ (۱۹) ابن ہشام: السیرۃ النبویۃ، قاہرہ ۱۹۳۷ء؛ (۲۰) القلقشندی: صبح الاعشی، قاہرہ ۱۹۶۳ء؛ (۲۱) شبلی: سیرۃ النبی، اعظم گڑھ ۱۳۳۳ھ؛ (۲۲) الترمذی: السنن، مطبوعۂ دہلی، بدون تاریخ؛ (۲۳) البخاری: الجامع الصحیح، مطبوعہ قاہرہ؛ (۲۴) ابن کثیر: السیرۃ النبویۃ، قاہرہ ۱۹۶۳ء؛ (۲۵) بکری امین: ادب الحدیث النبوی، قاہرہ ۱۹۷۵ء؛ (۲۶) العقاد: عبقریۃ محمدؐ، بیروت ۱۹۶۹ء؛ (۲۷) محمد عطیہ الابراشی: عظمۃ الرسول، قاہرہ ۱۹۶۶ء؛ (۲۸) محمد المبارک: الامۃ العربیۃ، دمشق ۱۹۶۳ء؛ (۲۹) ابن تیمیہ: اقتضاء الصراط المستقیم، قاہرہ ۱۹۰۷ء؛ (۳۰) حسن کامل: رسول اللہ فی القرآن الکریم، قاہرہ ۱۹۷۱ء؛ (۳۱) العقاد: مطلع النور او طوالع البعثۃ المحمدیہ، مطبوعۂ بیروت؛ (۳۲) عبدالحی الکتانی: نظام الحکومۃ النبویہ، مطبوعۂ بیروت؛ (۳۳) احسان النص: الخطابۃ العربیۃ، قاہرہ ۱۹۶۲ء۔

(ظہور احمد اظہر)

خواتین کے حقوق و حیثیت حضورؐ کی نظر میں: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے معاشرے میں خواتین کو جو بلند اور باوقار مقام عطا کیا اور ان کے ساتھ جس مہر و محبت اور شفقت و رافت سے پیش آنے اور پیش آنے کا حکم دیا، اس کی تفصیل میں جانے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ازمنۂ قدیمہ اور عہد حاضر کی متمدن اقوام نے عورت کو جو مقام دیا ہے، اس کا سرسری سا جائزہ پیش کر دیا جائے۔

عورت قدیم تہذیبوں اور مذاہب میں: بنی نوع انسان کی بقا کا مدار مرد و زن کے باہمی تعاون و

اشتراک پر منحصر ہے ، لیکن تاریخ کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ قدیم متمدن معاشروں میں ترقی صرف ایک صنف، یعنی مرد، کی کوششوں تک محدود سمجھی جاتی رہی ہے ۔

ہندوستان کے قریب ترین مذاہب ہندو دھرم اور بدھ مت میں عورت کو بدی کی جڑ کہا گیا اور اسے نہایت حقیر و ذلیل سمجھا جاتا تھا ؛ چنانچہ ان کے ہاں لڑکی کے لیے لفظ "دوھتر" (دور کر دی گئی) اور بیوی کے لیے "پتنی" (کنیز) کے الفاظ اور "ستی" ہونے کی رسم اس بات کی تصدیق کے لیے کافی ہیں (نیز دیکھیے منو سمرتی، ۵ : ۱۴۵ ؛ ۹ : ۳ ، ۱۷ وغیرہ)

ترقی و تمدن کے گہوارے یونان میں اسے شیطان [سے مشابہ قرار دیا گیا اور اہل یونان نے عورت کی ناقدری بڑھانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی]۔ شوہر کو بیوی پر پورا اختیار حاصل ہوتا تھا ۔ وہ عورت کو جب چاہتا گھر سے نکال سکتا ، بحیثیت مجموعی باعصمت یونانی عورت کا مرتبہ نہایت پست تھا ۔ اس کی زندگی غلامی میں بسر ہوتی تھی ۔ طلاق کا حق اسے قانوناً ضرور حاصل تھا ، تاہم وہ عملاً اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی تھی ۔ اگر افلاطون نے عورت کی آزادی اور مساوات کا دعوی کیا بھی تو یہ محض زبانی تعلیم تھی؛ عملی طور پر اس کی حالت کو بہتر بنانے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ۔ غلاموں کی طرح عورت سے خدمت لی جاتی تھی ۔ بوزنطی مملکت میں اس کے قانونی حقوق کچھ نہ تھے (روم کے مختلف ادوار میں عورت کی سماجی و معاشرتی حیثیت کے لیے دیکھیے : *Encyclopaedia Britannica* ، ج ۱۹ ، بذیل Rom ؛ نیز لیکی: تاریخ اخلاق یورپ ، ص ۳۵ ، ۴۴ تا ۴۵ ، ۸۱ تا ۸۳ ، ۲۸۹ ، ۲۹۱ ، ۲۹۳ ، ۳۰۱ تا ۳۰۵ ، ۳۶۲ تا ۳۶۸ ، ۵۶۵ تا ۵۶۸؛ Will Durant : *The life of Greece* ، ص ۵۶۵ تا ۵۶۸)۔

عورت کو ایک بے جان قالب سمجھا جاتا اور کہا جاتا کہ وہ بنی آدم کو بہکانے کا ایک دلکش آلہ ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے *Encyclopaedia Britannica* ، ج ۱۰ ؛ Will Durant : *Our Orient Heritage* ؛ Stewart : *Heritage of the Ancient World*) ۔

بابل و ایران کی حالت روم و یونان سے چنداں مختلف نہ تھی ۔ عورت کو یہاں بھی نہایت بے وقعتی کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا [. . . . . بعض دوسرے مذاہب میں بھی صورت حال بہتر نہ تھی] ۔

عرب معاشرے میں بھی عورت کی حالت ناگفتہ بہ تھی ۔ بعض قبائل میں لڑکیاں زندہ درگور کرنے کا رواج تھا ۔ نکاح و طلاق پر کوئی پابندی نہیں تھی ۔ عورت کو وراثت میں کوئی حصہ نہ ملتا تھا [محمود شکری آلوسی : بلوغ الارب ، ۲ : ۳ تا ۵۶ ، مطبوعۂ بغداد ، ۱۳۱۴ھ ، بار اول] ۔

عصر جدید : [عصر جدید میں آزادی نسواں کے نعروں کے باوجود ، عورتوں کے ساتھ ایک دوسرے طریق سے فریب کھیلا جا رہا ہے ، وہ یوں کہ زندگی اور تمدن کے لیے مرد و زن کے مابین اشتراک اور تعاون و محبت کی ضرورت ہے ۔ مغربی تحریکیں بجائے تالیف کے مخاصمت اور تفریق کی تبلیغ کرکے بیگانگی کی خلیج وسیع کر رہی ہیں اور تعاون کے بجائے باہمی بیزاری پیدا کی جا رہی ہے اور آزادی کے نام پر ان کو بے راہ روی اور مادر و پدر آزادی سکھائی جا رہی ہے] ۔

مغرب کی تقلید میں مشرق اور دیگر مسلمان ممالک کو بھی یہی صورت حال در پیش ہے ۔ مصر، شام، عراق، ترکی، ایران، افغانستان، اور پاکستان میں بھی آج اس تحریک کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے ۔ موجودہ تہذیب نے عورت کو جو آزادی

دی ہے [وہ بھی ایک فریب اور ملمع سازی ہے، ورنہ در حقیقت یہ آزادی نہیں، بلکہ یہ تو عہد عتیق کی غلامی سے بھی بدتر ہے۔ صحیح آزادی وہی ہے جو پیغمبر اسلام علیہ الصلاۃ والسلام نے عورتوں کو عطا کی، جس سے عورتوں کو ان کے جائز حقوق بھی مل جاتے ہیں اور اس سے ایک صالح معاشرہ بھی تشکیل پا سکتا ہے] .

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا عظیم اصلاحی کارنامہ: حقیقت یہ ہے کہ معاشرے میں مرد و زن کے صحیح رشتے کو متعین کرنے میں قدیم و جدید تمام تصورات یکطرفہ اور ناقص ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے دنیا کو یہ بتایا کہ زندگی مرد و زن دونوں کے ارتباط کی محتاج ہے۔ آپؐ نے بڑے واضح الفاظ میں عورت اور مرد کے [لازمی ارتباط پر زور دیا اور یہ واضح کیا ہے کہ نسلی اور فطری اعتبار سے کسی صنف کو دوسری صنف پر برتری حاصل نہیں بجز تقوی کے]۔ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے: یٰاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّ خَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَ بَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّ نِسَآءً (۴ [النساء]: ۱) [یعنی اے لوگو، اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بکثرت مرد اور عورتیں پھیلا دیے]؛ پھر دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ دونوں کے باہمی حقوق ہیں اور دونوں کے باہمی فرائض بھی: وَلَھُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْھِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (۲ [البقرۃ]: ۲۲۸)، [یعنی اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ عورتوں پر حق ہے موافق (دستور) شرعی کے]۔ اسی طرح قرآن مجید نے تقوی اور فلاح دارین کا جو معیار مرد کے لیے مقرر کیا ہے وہی عورت کے لیے بھی کیا ہے: مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّہٗ حَیٰوۃً طَیِّبَۃً وَّ لَنَجْزِیَنَّھُمْ اَجْرَھُمْ بِاَحْسَنِ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۱۶ [النحل]: ۹۷)، [یعنی نیک عمل جو کوئی بھی کرے گا، مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ صاحب ایمان ہو، تو ہم اسے ضرور پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور ہم انہیں، ان کے کاموں کے عوض میں، ضرور اجر دیں گے]۔ پھر ایک اور جگہ ارشاد ہے: اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ بَعْضُکُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ (۳ [آل عمران]: ۱۹۵)، [یعنی میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے، خواہ مرد ہو یا عورت، عمل کو ضائع ہونے نہیں دیتا]؛ لیکن مساوات کے اس اعلان کے ساتھ قرآن مجید نے اسلامی معاشرے میں مسلمان عورت کے فرائض اور اس کی تگ و دو کے خطوط کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اسلام نے دونوں کے طبعی و فطری رجحانات کو مد نظر رکھ کر ہر ایک کے لیے علیحدہ دائرہ عمل بھی مقرر کر دیا، جس کی نوعیت میں فرق ضرور ہے، لیکن اہمیت اور قدر و قیمت میں کوئی فرق نہیں اور ہر صنف کا کمال اسی میں ہے کہ اس کی طبعی صلاحیتیں منشائے قدرت کی تکمیل میں صرف ہوں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم [جن پر قرآن مجید نازل ہوا]، جو اس کے کامل مفسر، شارح بلکہ مجسم قرآن ہیں، خود ان کا خواتین کے ساتھ کیسا رویہ اور سلوک تھا اور وہ کون سے حقوق ہیں جن پر آپؐ نے اپنی عملی زندگی میں زور دیا۔ [آپؐ نے مردوں کی طرح عورتوں کے حقوق محفوظ کیے، اسی طرح ان کے کچھ فرائض بھی مقرر کیے۔ اور تکمیل پر حسن اجر کا وعدہ کیا]۔ آپؐ نے واضح طور پر فرما دیا کہ زندگی میں عورت کا دائرۂ عمل مرد کے دائرۂ عمل سے مختلف ہے۔ [زندگی عبارت ہے فرائض و اعمال سے]، مرد گھر سے باہر کی دنیا کا ذمہ دار ہے، تو عورت گھر کی ذمہ دار [یہ تقسیم عمل ہر طرح عقلی اور فطری

ہے]۔ دیگر مذاہب اور معاشروں میں رشتوں کی حرمت کا کوئی خیال نہیں کیا گیا۔ آپؐ نے محرم و نامحرم رشتوں کی وضاحت فرمائی؛ عورت کو نا محرم کے سامنے زیب و زینت کرنے اور ایسا لباس استعمال کرنے سے منع فرمایا جو باریک ہو اور ساتر نہ ہو [یا جو اتنا تنگ ہو کہ اس سے جسم کے ابھار نمایاں ہوتے ہوں؛ خلاف ورزی کی صورت میں جہنم کی وعید سنائی] (مسلم : الجامع الصحیح، ۶ : ۱۵۸، مطبوعۂ قاہرہ ۱۳۳۲ھ)۔ [نیز مردوں کو حکم دیا کہ اگر دفعۃً کسی عورت سے سامنا ہو جائے تو نگاہ جھکا لیا کریں] (الترمذی : الجامع السنن، ابواب الادب، ص ۱۳۸، مطبوعہ قاہرہ، ۱۲۹۲ھ)۔ آپؐ نے باہر نکلتے وقت زیب و زینت کو چھپانے اور مردوں سے الگ تھلگ رہنے کی تاکید فرمائی (ابو داؤد : الجامع السنن، ۴ : ۸۶ تا ۹۰)۔ آپؐ نے عورت کو نامحرم کے ساتھ سفر کرنے اور تنہائی میں اس کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی ممانعت فرمائی ہے (البخاری : الجامع الصحیح، ۷ : ۴۸؛ الترمذی، ۵ : ۱۲۱)۔ آپؐ کا خود یہ طریقہ تھا کہ خواتین سے بیعت لیتے وقت ان کا ہاتھ مس نہیں کرتے تھے (البخاری : کتاب مذکور، ۷ : ۶۳)۔ خوشبو اور عطریات، جو جذبات کو برانگیختہ کرنے والے ہیں، آپؐ نے خواتین کو گھروں سے باہر نکلتے وقت استعمال کرنے سے منع فرمایا (مشکوۃ المصابیح، ۱ : ۳۳۴)۔ یہ تھے وہ اصول و ضوابط جو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے عورت کو اندرون خانہ اور بیرون خانہ ملحوظ رکھنے کے سلسلے میں تلقین فرمائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے عورت کو جو حقوق عطا فرمائے ان کی فہرست بڑی طویل ہے: ان حقوق نے عورت کی زندگی میں جو تبدیلی پیدا کی اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے اس قول سے ہوتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں ہم لوگ عورتوں کو بالکل ہیچ سمجھتے تھے، مدینے میں نسبتاً ان کی قدر تھی، لیکن جب اسلام آیا اور ان کے متعلق آیات نازل ہوئیں تو ہم کو ان کی قدر و منزلت کا صحیح احساس ہوا (البخاری، النکاح، باب ۸۳، ۳: ۴۴۳ تا ۴۴۴)۔ اس سے بخوبی علم ہو جاتا ہے کہ اسلام نے عورتوں کو صرف چند حقوق ہی عطا نہیں کیے، بلکہ ان کو معاشرے میں ان کا جائز مقام دلا کر انسانیت کی تکمیل کی ہے؛ چنانچہ آپؐ کا ارشاد گرامی ہے: مرد اپنے اہل خانہ کا راعی ہے اور ان سے متعلق اس سے جواب طلبی ہوگی اور عورت شوہر کے گھر کی محافظ و نگہبان ہے اور اس سے اس کے متعلق باز پرس ہوگی (البخاری [کتاب مذکور، باب ۶۷/۹۰ (۳: ۴۴۶)]؛ احمد بن حنبل : مسند، ۷ : ۱۶۰؛ نیز ۸ : ۱۹۸)۔ آپؐ نے مرد کو قوّام اور اہل خانہ کے نان و نفقے کا ذمہ دار بنایا (۴ [النساء] : ۳۴)، تو عورت کو اس سے بھی مشکل، لیکن اہم اور نازک کام یعنی تربیت اولاد کی ذمہ داری سونپی (حوالۂ مذکور)۔ عورتوں کو نازک آبگینوں سے تشبیہ دی۔ ایک سفر میں جب کہ ازواج مطہرات بھی ساتھ تھیں اور حدی خوان ذرا تیز آواز سے سواریوں کو چلا رہے تھے، تو آپؐ نے فرمایا: انجشہ رویدک بالقواریر (الاصابہ، ۴ : ۴۳۰)، [یعنی نازک آبگینوں (خواتین) کا خیال رکھو اور نرم روی اختیار کرو]۔ آپؐ نے علم کے دروازے مرد و عورت دونوں کے لیے یکساں طور پر کھول دیے، فرمایا: طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم (مشکوۃ، ۱ : ۷۶)، [یعنی علم کی طلب ہر مسلمان پر فرض ہے]۔ صحابیات آپؐ کی مجالسِ وعظ و تلقین میں شریک ہوتی تھیں، لیکن مردوں کی کثیر تعداد کی وجہ سے بسا اوقات آپؐ کے ارشادات سن نہ سکتیں تو اس پر عورتوں نے آپؐ سے ان کے لیے علیحدہ دن مخصوص کرنے کی درخواست کی، جو قبول کر لی گئی؛ چنانچہ

آپؐ گاہے بگاہے عورتوں کو خطاب فرماتے (البخاری : الجامع الصحیح ، کتاب ۳، باب ۳۲، ۱ : ۳۷) ۔

عورتوں کو احکام دین سیکھنے کے لیے مساجد میں آنے اور نماز عیدین میں بھی شریک ہونے کی اجازت دی، [بشرطیکہ زمانہ فتنے کا نہ ہو اور شرکت کی صورت میں (دھکم پیل) سے بچنے اور اختلاط سے محفوظ رکھنے کی خاطر] یہ وضاحت بھی فرما دی کہ عورتیں با جماعت نماز میں سب سے آخری صف میں کھڑی ہوں (مشکوۃ المصابیح ، ۱ : ۴۴ ؛ الترمذی، ۳ : ۱۰۳ ؛ الدارمی، ۱ : ۲۹۱) ، مگر یہ بھی فرمایا کہ بیوتھن خیر لھن (مشکوۃ ، ۱ : ۲۴۴) ؛ [یعنی عبادت وغیرہ کے لیے ان کا گھر ان کے لیے بہترین جگہ ہے ، کیونکہ باہر کی زندگی میں فتنوں کی کثرت ہے ، جس سے وہ کمزور ہونے کی وجہ سے بچ نہیں سکتیں] ۔ خواتین سے شفقت آمیز سلوک کا مظہر اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ خواتین بلا تکلف آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتیں ، ذاتی نوعیت کے مسائل کا حل دریافت کرتیں ، یہاں تک کہ شوہروں کی بد سلوکی کے بارے میں شاکی ہوتیں ، جس پر آپؐ شوہروں کو تنبیہ فرماتے (ابو داؤد : السنن ، ۲ : ۲۴۰) ۔ ایک دن خواتین دربار رسالت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی کہ آپؐ [زن و مرد دونوں کے لیے] رسول ہیں؛ ہم [عورتیں آپؐ پر (مردوں ہی کی طرح)] ایمان لائیں ، مگر ہم پردہ دار ہیں ، گھر کی رکھوالی کرنے اور بچوں کی دیکھ بھال کرنے والی ہیں ، جبکہ مرد نماز باجماعت، جنازہ اور جہاد میں شرکت کی وجہ سے سبقت لے گئے [اور عورتیں ان فضیلتوں سے محروم رہتی ہیں۔ اس پر آپؐ نے] فرمایا : عورتوں کا شوہر کی خدمت کرنا، ان کی مرضی کے مطابق کام کرنا ان سب کاموں پر بھاری ہے (اسد الغابۃ، ۵ : ۳۹۸ تا ۳۹۹) ۔ [مطلب یہ کہ مردوں کی ذمے داریاں سخت ہیں ، جن کو عورتیں اپنی طبعی اور جسمانی ساخت کی بنا پر پورا نہیں کر سکتیں ۔ یہ سخت کام مرد ہی کر سکتے ہیں ۔ عورتیں ان گراں خدمات انجام دینے والوں (مردوں) سے اپنی حدود میں اور اپنی استعداد کے مطابق تعاون کریں اور ان کو آرام پہنچائیں تاکہ وہ جہاد جیسی مشقت کو بخوشی برداشت کرنے کے قابل رہیں] ۔ آپؐ عورتوں کی عیادت کے لیے بھی تشریف لے جاتے؛ ان کی دلجوئی فرماتے اور بطور شفقت تحائف بھی دیتے۔ام خالد کے بارے میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں ایک چادر بطور ہدیہ دی (ابن سعد : الطبقات، ۸ : ۲۴۴) ۔ آپؐ نے مختلف مواقع پر اپنی بعض رشتے دار عورتوں کے ہاں قیام فرمایا (اسد الغابہ ، ۵ : ۲۷۷ تا ۲۷۸ ؛ الطبقات ، ۸ : ۲۲۲) ۔ آپؐ جب بھی قباء تشریف لے جاتے اپنی رضاعی خالہ کے ہاں قیام فرماتے اور ان کے ہاتھ کا تیار کردہ کھانا تناول فرماتے اور انھی کے گھر آرام بھی فرماتے ۔

ایک مرتبہ بعض قرابت دار عورتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ بیٹھی گفتگو کر رہی تھیں کہ حضرت عمرؓ آئے تو وہ اٹھ کر چلی گئیں ۔ آپؐ نے تبسم فرمایا تو حضرت عمرؓ بولے : خدا آپؐ کو خنداں رکھے ! کیوں تبسم فرمایا ؟ فرمایا: ان عورتوں پر تعجب ہوا کہ تمھاری آواز سنتے ہی آڑ میں چھپ گئیں ۔ حضرت عمرؓ نے خواتین سے پوچھا کہ کیا تم مجھ سے ڈرتی ہو اور آنحضرتؐ سے نہیں ڈرتیں ؟ انھوں نے جواب دیا کہ نبی کریمؐ کی نسبت آپ ذرا سخت مزاج ہیں ۔ اسی طرح آپؐ ایک دن حضرت عائشہؓ کے گھر منہ ڈھانپ کر سوئے ہوئے تھے ، عید کا دن تھا ۔ لڑکیاں بالیاں گا بجا رہی تھیں ۔ اس اثنا میں حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے تو خفا ہوئے [کہ حضورؐ سو

رہے ہیں اور تم نیند میں خلل ڈال رہی ہو ؟ اس پر] آپ ؐ نے فرمایا انہیں کچھ نہ کہو، یہ ان کی عید کا دن ہے (مسلم : الجامع الصحیح ، ۳ : ۲۱ تا ۲۲) .

دنیا کی اکثر اقوام نے عورت کو کسی نہ کسی طرح میراث سے محروم رکھا ، لیکن اسلام نے عورت کو بحیثیت بیٹی ، بیوی اور ماں [اور دیگر ممکن رشتوں کے] میراث سے حصہ دلایا ۔ جاہلی عرب معاشرے میں لڑکی کی پیدائش کو منحوس قرار دیا جاتا اور وہ ہر قسم کے حقوق سے محروم رہتی تھی ۔ بعض قبائل میں بچی کو پیدا ہونے کے ساتھ ہی زندہ دفن کردیا جاتا [محمود شکری آلوسی : بلوغ الارب ، ۳ : ۴۱۳ ببعد] ، لیکن آنحضرت ؐ نے بچی کی پیدائش کو نزول رحمت سے تعبیر فرمایا اور پھر بچیوں کی تربیت کی تلقین کی اور بالغ ہونے پر نکاح کرنے والوں کے لیے جنت کی نوید سنائی ؛ چنانچہ آپ ؐ کا ارشاد ہے کہ جس نے دو بیٹیوں ، یا بہنوں کی ، بالغ ہونے تک پرورش کی اور ان پر لڑکوں کو ترجیح نہ دی ، وہ اور میں قیامت کے دن، اپنی دو انگلیوں کو اکٹھا کرکے اشارے سے ظاہر کیا ، اس طرح اکٹھے ہوں گے (مشکوۃ ، ۲ : ۶۰۵) .

آپ ؐ خود ان تعلیمات کا مکمل نمونہ تھے ۔ آپ ؐ اپنی صاحبزادیوں اور ان کے بچوں کے لیے سراپا شفقت تھے ۔ حضرت فاطمۃ الزہراؓ [رک بآں] سے آپ ؐ کو جو محبت تھی اس کا اندازہ اس قول مبارک سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ : فاطمہؓ میرے جگر کا ٹکڑا ہے ، اس کے دکھ سے مجھے تکلیف ہوتی ہے (مسلم : الجامع الصحیح، ۷ : ۱۴۱) ۔ آپ ؐ کا معمول تھا کہ جب بھی حضرت فاطمہؓ تشریف لاتیں تو ان کا کھڑے ہو کر استقبال فرماتے اور خوشی کا اظہار کرتے (البخاری: الجامع الصحیح ، ۷ : ۱۴۱) ۔ آپ ؐ کی (ننھی) نواسی حضرت امامہؓ بنت زینبؓ ، نماز کے دوران میں آپ ؐ پر سوار ہو جاتیں ، جب آپ ؐ قیام فرماتے تو آپ ؐ انہیں گود میں اٹھا لیتے (مشکوۃ المصابیح ، ۱ : ۳۱۲) ۔ [حکم سکون آنے سے پہلے نماز میں حرکت جائز تھی (دیکھیے ۲ [البقرۃ] : ۲۳۸ ؛ نیز روح المعانی ، ۲ : ۱۵۸)۔

لڑکی کے نکاح کے معاملے میں باپ اور ولی کے لیے لازمی قرار دیا کہ اس معاملے میں لڑکی کی رائے لیں (مسلم : الجامع الصحیح ، ۴ : ۱۴۰ تا ۱۴۱ ؛ ابو داؤد ، ۲ : ۲۱۱) ۔ خنساء بنت خذام [انصاری خاتون ، جو ثَیِّبہ تھیں] کے والد نے ان کا نکاح ان کی مرضی کے بغیر کر دیا ، وہ دربار رسالت میں والد کی شکایت لے کر پہنچیں تو آپ ؐ نے انہیں نکاح کو رد کرنے کا حق دے دیا (مشکوۃ ، ۲ : ۱۷۰ ، حدیث ۳۱۳۶)، بخاری شریف (۳ ، کتاب النکاح ، باب ۴۲) میں ایک ایسی ہی روایت باکرہ کے متعلق بھی ہے .

بیویوں کے بارے میں حضور ؐ کا عمل اور ارشادات : اسلام نے بیویوں کے انفرادی تشخص کو تسلیم کرکے ان کے فرائض کے ساتھ ساتھ ان کے حقوق بھی بیان کیے ہیں [آنحضور ؐ نے خاندانی زندگی میں فرائض اور حقوق کی حد بندی کرتے ہوئے بھی بیویوں کے الگ وجود کو تسلیم کرایا] ، آپ ؐ نے فرمایا : اَلدُّنْیَا کُلُّھَا مَتَاعٌ وَ خَیْرُ مَتَاعِ الدُّنْیَا الْمَرْأَۃُ الصَّالِحَۃُ (مشکوۃ المصابیح ، ۲ : ۱۵۸) [یعنی ساری کی ساری دنیا نعمت ہے اور بہترین نعمت نیک بیوی ہے] ؛ مزید فرمایا : تم میں بہتر وہی ہے جس کا سلوک اپنی بیویوں سے اچھا ہے اور میرا سلوک میری بیویوں سے سب سے اچھا ہے [الترمذی : السنن، ۳ : ۳۲۲ ، قاہرہ ۱۳۹۲ھ] ؛ آپ ؐ نے مزید فرمایا کہ کوئی شخص بیوی کو] غلام یا باندی کی طرح نہ مارنے بیٹھے (البخاری : الجامع الصحیح ، ۳ : ۴۳۸ ، کتاب ۶۷ ، باب ۹۳] ؛ اگر شوہر کو بیوی کی کوئی عادت ناپسند ہو تو یقیناً کوئی عادت

پسندیدہ بھی ہوگی [یعنی پسندیدہ عادت کی قدر کرے اور ناپسندیدہ پر درگزر اور صبر کرے اور تدریجی اصلاح کی کوشش کرے] (مسلم : الجامع الصحیح ، ۳ : ۱۷۸ ؛ مشکوۃ ، ۲ : ۱۹۸) ۔ [ھاں اگر وہ ان جرائم میں سے کسی کا ارتکاب کرے ، جن کی سزا اسلام نے ضروری قرار دی ھے تو وہ مستحق سزا ھے]۔ خطبۂ حجة الوداع میں آپؐ نے فرمایا : "عورتوں کے معاملے میں خدا سے ڈرو ، وہ تمھیں اللہ کی امانت کے طور پر ملی ھیں اور خدا کے حکم سے تم نے ان کا جسم اپنے لیے حلال بنایا ھے ۔ تمھاری طرف سے ان پر یہ ذمے داری ھے کہ وہ کسی غیر کو (جس کا آنا تم کو گوارا نہیں ھے) اپنے پاس گھر میں نہ آنے دیں ، اگر وہ ایسا کریں تو تنبیہ کا حق مردوں کو ھے (الترمذی : الجامع السنن، ۵ : ۱۱۱ ؛ ابن ھشام : السیرۃ ، ۳ : ۲۵۱ ، قاھرہ ۱۹۳۶ ء) ۔

[آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے شوھر پر بیوی کی معاشی کفالت لازم قرار دی ھے (کیوں کہ وہ گھر کی ذمے داریوں کی وجہ سے خود اپنے لیے معاش کا بندوبست نہیں کر سکتی ؛ ابو داؤد : السنن ، ۲ : ۳۲۸)] اور پھر معاشی طور پر اس کی حالت مزید مستحکم کرنے کے لیے مرد پر ادائیگی مہر کی ذمے داری ڈالی (ابو داؤد : السنن ، ۲ : ۳۲۸ ؛ البخاری، ۷ : ۲۵ و بعد ؛ مسلم : الجامع الصحیح ، ۴ : ۱۴۳ و بعد ؛ الترمذی ، ۵ : ۳ تا ۱۰) ۔ اگر شوھر خوشحالی کے باوجود بیوی بچوں کے اخراجات برداشت نہیں کرتا تو آپؐ نے عورت کو اجازت دی ھے کہ وہ اپنی اور اپنی اولاد کی ضرورت کے مطابق اس کے مال میں سے وصول کر سکتی ھے (البخاری : الجامع الصحیح، [۳ : ۳۸۸]).

آپؐ ازواج مطھرات کے لیے سراپا محبّت تھے ، [گویا ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ کی مجسّم تصویر تھے : لاڈ پیار ، ناز برداری ، روٹھنا ، منانا دلچسپی کے پہلو پیدا کرنا ، رائے لینا اور ناموافق رائے کو برداشت کرنا ، وغیرہ وغیرہ ، وہ سب امور جو ازدواجی زندگی میں پیش آتے ھیں ؛ آپؐ ان سب میں محبت ، رفق، اور مودت و رحمت کا پیکر تھے (مسلم : الجامع الصحیح ، ۷ : ۱۳۵)]۔

دنیا کی اکثر اقوام میں بیوہ کی کوئی حیثیت نہ تھی ۔ ھندو مذھب میں شوھر کی موت کے ساتھ اس کو بھی اپنی زندگی ختم کرنا پڑتی تھی ۔ عربوں کا دستور تھا کہ جب باپ وفات پا جاتا تو بڑا لڑکا اپنی سوتیلی ماں کا جائز وارث سمجھا جاتا ۔ [اسلام نے بیوہ کا حق وراثت تسلیم کیا ۔ بعض اقوام میں بیوہ سے شادی ممنوع تھی ، لیکن اسلام نے شادی کی تلقین کی اور حضور پاکؐ نے خود بھی اس پر عمل کیا] ۔ آپؐ ھمیشہ ازواج مطھراتؓ کے درمیان عدل و انصاف سے کام لیتے ۔ حضرت عائشہؓ خود اس بات کی گواھی دیتی ھیں ، فرماتی ھیں : کہ آپؐ نے ھماری باریاں مقرر کر رکھی تھیں اور ھمیشہ ھم سب کے درمیان عدل سے کام لیتے (ابو داؤد : السنن، ۲ : ۳۲۶) ۔

ازواج مطھراتؓ کے ساتھ یہ مہر و محبّت کا سلوک ان کی زندگی تک ھی محدود نہ تھا ، حضرت عائشہؓ فرماتی ھیں : وفات حضرت خدیجہؓ کے بعد جب کبھی گھر میں جانور ذبح ھوتا ، تو آپؐ ان کی سہیلیوں کو بھجواتے اور آپؐ اکثر حضرت خدیجہؓ کا ذکر کرتے (مسلم : الجامع الصحیح ، ۷ : ۱۳۴) ۔

آپؐ نے رشتۂ نکاح کو پائدار بنانے اور استحکام بخشنے کے لیے ھر ممکن اقدام فرمایا اور اس میں رخنہ ڈالنے والے ، یا زوجین میں تفریق کرانے والے کو وعید سنائی کہ وہ ھم میں سے نہیں جو یہ کام کرے (ابو داؤد : السنن ، ۲ : ۳۳۲) ۔ عورتوں کو نصیحت فرماتی کہ عورت ، کسی دوسری عورت

کی طلاق کی خواہاں نہ ہو ؛ اگر ان کوششوں کے باوجود زوجین کی ناچاقی ختم نہ ہو سکے اور معاملات کی اصلاح نہ ہو سکے تو اس تعلق کو ختم کیا جا سکتا ہے (مشکوة المصابیح ، ۲ : ۲۰۹)، [لیکن طلاق کی ناگواری کو محسوس کرکے اسے ابغض الحلال کہا] ۔ عورت کو خلع کا حق بھی دیا اور ساتھ ہی صراحت فرما دی کہ جس عورت نے معقول وجہ کے بغیر مرد سے طلاق کا مطالبہ کیا وہ منافقہ ہے اور وہ جنت کی خوشبو سے محروم رہے گی (الترمذی : السنن ، ۵ : ۱۶۲ ؛ مشکوة المصابیح ، ۲ : ۲۰۹) ۔

عورت بحیثیت ماں : قرآن و سنت کی رو سے ماں کا درجہ معراج انسانیت ہے ۔ قرآن کریم (۲ [البقرة] : ۸۲ ؛ ۱۷ [بنی اسرآئیل] : ۲۳ تا ۲۴ ؛ ۲۹ [العنکبوت] : ۸ ؛ ۳۱ [لقمان] : ۱۴ - ۱۵) میں بالتصریح ارشاد ہے کہ توحید کے بعد والدین کی اطاعت کا درجہ ہے اور والدین میں بھی (خدمت میں) والدہ کا حق فائق ہے ۔ کسی صحابیؓ نے آپؐ سے پوچھا کہ میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے تو آپؐ نے تین مرتبہ فرمایا تمہاری ماں ، چوتھی بار فرمایا تمہارا باپ (مسلم : الجامع الصحیح ، ۸ : ۲ ؛ الترمذی : السنن ، ۸ : ۹۲ ؛ مشکوة المصابیح ، ۲ : ۵۹۷) ؛ والدین کی نافرمانی کو آپؐ نے کبیرہ گناہ (اکبر الکبائر) سے تعبیر فرمایا ۔ حسن سلوک کے اس دائرے کو حقیقی والدین سے بڑھا کر رضاعی والدین اور دیگر اعزہ و اقارب تک وسیع کر دیا ۔ والدہ اگر غیر مسلمہ بھی ہو تو اس صورت میں بھی اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کا حکم دیا (الترمذی : الجامع السنن، ۸ : ۹۸؛ مشکوة المصابیح، ۲: ۲۰۹).

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا باندیوں سے حسن سلوک : اسلام نے مختلف گناہوں کے کفارے میں غلام کی آزادی کی شرط لگائی (۴ [النساء]: ۹۲ ؛ ۵ [المائدة] : ۸۹ ؛ ۵۸ [المجادلة] : ۳) .

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے لونڈیوں کو آزاد کرنے اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے اور ان سے نکاح کرنے کی مسلمانوں کو تاکید کی اور آقاؤں کو ان کا سرپرست قرار دیا ۔ آپؐ لونڈیوں کو آزاد کر دیتے ، ان کے نکاح کا انتظام کرتے ۔ آزاد ہونے پر انہیں وہی حقوق حاصل ہوتے جو ایک آزاد عورت کو حاصل ہوتے ہیں۔ ام ایمنؓ کو، جو آپؐ کی آزاد کردہ لونڈی [اور آپؐ کی خدمت گزار تھیں] آپؐ یا امہ (اے ماں) کہہ کر مخاطب فرماتے اور جب آپؐ ان کی طرف دیکھتے تو فرماتے یہ میرے اہل بیت میں سے ہے ۔ ان کی خدمت و سعادت کو دیکھ کر فرماتے : جو کسی جنتی خاتون کو دیکھنا چاہے تو وہ ام ایمن کو دیکھ لے : آپؐ اس سے مزاح بھی فرماتے (ابن سعد : الطبقات ، ۸ : ۲۲۳ ، ۲۲۴) ۔ آپؐ نے جب حضرت بریرہؓ کو آزاد کیا تو انہیں زمانۂ غلامی کے نکاح کے فسخ کا اختیار دیا ۔ حضرت بریرہؓ نے اس اختیار کو استعمال کیا اور جدائی اختیار کی ۔ ان کے شوہر کو ان سے بے حد محبت تھی ۔ روایات میں ہے کہ اس تفریق کے بعد وہ مدینۂ منورہ کی گلیوں میں پریشان حال پھرنے ۔ آپؐ کو اس کی حالت پر رحم آیا اور حضرت بریرہؓ سے ان کی طرف رجوع کرنے کے لیے کہا تو بولیں : یا رسول اللہ ! کیا یہ آپؐ کا حکم ہے ؟ آپؐ نے فرمایا کہ میں سفارش کرتا ہوں ۔ اس پر حضرت بریرہؓ نے جواب دیا : تو پھر مجھے اس کی ضرورت نہیں (البخاری: الجامع الصحیح ، ۷ : ۶۱ ؛ الطبقات ، ۸ : ۲۵۹ ببعد ؛ الاصابہ ، ۴ : ۲۴۵) .

تعلیم نسواں : پرانے معاشروں میں عورت پر تعلیم کے دروازے بند تھے ، لیکن آپؐ نے آغاز ہی سے اس کی طرف توجہ مبذول فرمائی ۔ آپؐ کا

فرمان : طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِم ، یعنی علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے ۔ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ حصول علم کسی ایک صنف سے مخصوص نہیں ، بلکہ یہ مرد و عورت دونوں کا حق ہے ۔ آپؐ نے خواتین کو دین کے احکام سیکھنے کے لیے مسجدوں میں آنے کی اجازت دے رکھی تھی ۔ اس کے علاوہ صحابیاتؓ کو جب کوئی مسئلہ در پیش ہوتا تو کاشانۂ نبوت میں حاضر ہوتیں اور آپؐ سے براہ راست یا بواسطۂ ازواج مطہرات استفادہ کرکے لوٹتیں ۔ اس معاملے میں خواتین انصار پیش پیش تھیں ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالٰی عنہا فرماتی ہیں کہ عورتوں میں انصاری عورتیں خوب ہیں کہ انھیں دین کی تعلیم میں حیا مانع نہیں ہوتی (مسلم : الجامع الصحیح ، ۱ : ۱۸۰) ۔ معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمی مجالس میں خواتین بڑے شوق سے حاضر ہوتیں ۔ حضرت خولہؓ بنت قیس کہتی ہیں : میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کا خطبہ جمعہ کے دن سب سے پچھلی صف میں بیٹھی ہوئی سنتی تھی (الاصابہ ، ۴ : ۲۸۶) اور اگر آپؐ کو کسی وقت یہ محسوس ہوتا کہ خواتین آپؐ کی بات کو سمجھ نہیں سکیں یا ان تک بات پوری نہیں پہنچی تو آپؐ اس کا اعادہ فرما دیتے تھے (البخاری: الجامع الصحیح ، ۱ : ۳۶ ، کتاب ۳ ، باب ۳۰) ، لیکن جب عورتوں کی اس طرح تسلی نہ ہوئی تو آپؐ نے ان کی درخواست پر ان کے لیے ایک علیحدہ دن مقرر کر دیا (کتاب مذکور ، ۱ : ۳۷ ، کتاب ۳ ، باب ۴۶) ۔ ایسا بھی ہوتا کہ آپؐ اس خدمت پر اپنی طرف سے کسی نمائندے کو مقرر فرما دیتے ۔ حضرت ام عطیہؓ روایت کرتی ہیں کہ آپؐ جب مدینہ تشریف لائے تو آپؐ نے انصاری خواتین کو ایک گھر میں جمع کیا اور ہمارے پاس حضرت عمرؓ بن الخطاب کو وعظ و نصیحت کے لیے بھیجا ۔ انھوں نے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر سلام کیا اور کہا میں تمھارے پاس آپؐ کے قاصد کی حیثیت سے آیا ہوں : حضورؐ نے حکم دیا ہے کہ عیدین میں نوجوان اور حائضہ عورتیں بھی عیدگاہ چلیں (مگر مؤخرالذّکر نماز میں شریک نہ ہوں) اور یہ کہ عورتوں پر جمعہ فرض نہیں ۔ اور آپؐ نے عورتوں کو جنازے کے پیچھے چلنے سے منع کیا (ابو داؤد : السنن ، ۱ : ۴۰۶) ۔ آپؐ نے والدین اور شوہروں کو اس بات کی تلقین فرمائی کہ وہ اپنی بچوں کو دین کے احکام سے روشناس کرائیں ۔ آپؐ نے اس صنف کو فکری اور عملی اعتبار سے آگے بڑھانے کی مختلف طریقوں سے ترغیب دلائی ، کہیں آپؐ نے ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنے والوں کے لیے جنت کی بشارت سنائی (البخاری : الجامع الصحیح ، ۳/۳۱ ، ۱ : ۳۶) اور کہیں فرمایا کہ مہر کے عوض بیوی کو چند سورتیں ہی سکھا دی جائیں، کتاب مذکور ، ۳ : ۴۳۳ ، کتاب ۶۷ ، باب ۳۲ ، ۳۳۴ ، باب ۵۰) ۔ آپؐ نے ضروری خیال فرمایا کہ یہ صنف زبانی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ کتابت سے بھی واقف ہو ۔ آپؐ نے حضرت شفاءؓ بنت عبداللہؓ سے فرمایا کہ تم نے حضرت حفصہؓ کو جس طرح کتابت سکھائی ہے اس طرح چیونٹی کے کاٹنے کی دعا بھی سکھا دو (ابو داؤد : السنن ، ۴ : ۱۵ ؛ مشکوٰۃ المصابیح ، ۲ : ۵۱۷ ، حدیث ۴۵۶۱) ۔

آپؐ کی اسی توجہ اور تعلیم کا نتیجہ تھا کہ نہایت قلیل عرصے میں صحابیاتؓ کی ایک کثیر تعداد مختلف اساسی علوم میں ماہر ہوگئی، حضرت عائشہؓ، حضرت ام سلمہؓ اور ام ورقہؓ نے پورا قرآن مجید حفظ کر لیا تھا (فتح الباری ، ۹ : ۴۷) ۔ حضرت ہند بنت اُسَیدؓ ، حضرت امّ ہشامؓ بنت حارثہ اور

اُمّ سعدؓ قرآن کریم کے بعض حصوں کی حافظہ تھیں؛ اُمّ سعدؓ تو قرآن مجید کا درس بھی دیتی تھیں (ابن سعد: الطبقات، ۵: ۵۸٦)۔ تفسیر میں حضرت عائشہؓ کو خاص درک حاصل تھا۔ صحابیات کی ایک کثیر تعداد نے آپؐ سے احادیث کی روایت بھی کی ہے؛ امہات المؤمنین کے علاوہ اُمّ عطیہؓ، اسماء بنت ابی بکرؓ اور فاطمہؓ بنت قیس کا شمار بھی کثیر الروایت صحابیات میں ہوتا ہے۔

فقہ میں صحابیاتؓ کو خاصا درک حاصل تھا اور ان کی فہم و بصیرت نے لوگوں کی راہنمائی کا اہم فریضہ سر انجام دیا ہے؛ فقہ میں حضرت عائشہؓ کا درجہ تو اتنا بلند ہے کہ ان کا شمار مجتہدین صحابہ میں ہوتا ہے (الاستیعاب، مع الاصابہ، ۴: ۳۴۸)۔

علوم اسلامیہ کے علاوہ دیگر علوم میں بھی صحابیاتؓ کو عبور حاصل تھا؛ حضرت عائشہؓ کو طبّ، تاریخ عرب اور حضرت اُمّ سلمہؓ کو علم اسرار الدین میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ حضرت اُمّ سلمہؓ کی فراست و ذہانت کا اندازہ حدیبیہ کے اس واقعے سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ جب صلح حدیبیہ کی شرائط کی وجہ سے بد دلی پھیلی تو آپؐ نے صحابۂ کرامؓ کو اپنے جانور ذبح کرنے کا تین بار حکم دیا، لیکن وہ اتنے شکستہ خاطر تھے کہ ان میں سے کوئی بھی اپنی جگہ سے نہ اٹھا: آپؐ حضرت اُمّ سلمہؓ کے پاس تشریف لائے اور واقعہ بیان کیا تو انھوں نے کہا: آپؐ باھر نکل کر خود قربانی کیجیے اور عملی نمونہ پیش فرمائیے؛ چنانچہ آپؐ نے ایسا ہی کیا۔ آپؐ کو دیکھ کر صحابۂ کرامؓ بھی اٹھے اور آپؐ کو دیکھ کر قربانی کی اور بال کٹائے (البخاری: الجامع الصحیح، ٦: ۲۳۴)۔ حضرت اسماءؓ بنت سکن اتنی عمدہ خطیبہ تھیں کہ ایک موقعہ پر آپؐ نے ان کی فصاحت و بلاغت کا اعتراف فرمایا تھا (اسد الغابہ، ۵: ۳۹۸ تا ۳۹۹؛ الاصابہ، ۴: ۲۲۹؛ تہذیب التہذیب، ۱۲: ۳۹۹)۔ علم تفسیر میں حضرت اسماءؓ بنت عُمیس کا شہرہ تھا (تہذیب، ۱۲: ۳۹۸ تا ۳۹۹؛ الاصابہ، ۴: ۲۲۵؛ اسد الغابہ، ۵: ۳۹۵)؛ علم طبّ میں حضرت عائشہؓ کے علاوہ رُفیدہ اسلمیہ (الاصابہ، ۴: ۲۹٦)، ام مطاعؓ (الاصابہ، ۴: ۴۷۳)، امّ کبشہؓ (الاصابہ، ۴: ۴٦۳)، امّ عطیہؓ (الاصابہ، ۴: ۴۵۵)، ربیعؓ بنت معوّذ (الاصابہ، ۴: ۲۹۳) کے نام قابل ذکر ہیں۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رُفیدہؓ کا خیمہ، جس میں سامان جراحی ہوتا تھا، مسجد نبوی کے پاس تھا (الاصابہ، ۴: ۳۴۷؛ اسد الغابہ، ۵: ۴۵۳؛ الطبقات، ۸: ۲۹۱)۔ صحابیاتؓ کو زبان و ادب پر بھی پورا ملکہ حاصل تھا؛ اس صنف نازک نے شاعری کو اپنے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ صحابیاتؓ میں اَرْوٰیؓ بنت عبدالمطلب اور ان کی بہن آمنہ، ہندؓ بنت حارث، سُعدٰی، میمونہؓ وغیرہا شاعری میں زیادہ معروف ہیں اور حضرت خنساء بنت عمرو السُّلَمِیّہ تو چوٹی کی شاعرہ تھیں (ان تمام صحابیاتؓ کے لیے دیکھیے الاصابہ، ج ۴؛ ابو داؤد: السنن، ۴: ۴۹۷)۔

عورت میدان عمل میں: یہ حقیقت ہے کہ اسلام نے عورت کا حقیقی میدان عمل اس کا گھر قرار دیا ہے اور معاشی مشقت کے جھمیلوں سے حتی الامکان اسے دور رکھا ہے اور مرد کو عورت کا معاشی کفیل بنایا ہے، اس لیے نہیں کہ وہ عورت سے معاشی استقلال یا حق عمل چھین لے، کیوں کہ انفرادی اور اجتماعی ضرورتوں میں اس کے اس حق کی ضمانت دے دی گئی ہے۔ مرد کو عورت کا کفیل اس لیے بنایا گیا کہ عورت اپنے فرائض یعنی گھر کی دیکھ بھال، بچوں کی تربیت عمدگی سے کر سکے اور دوسری طرف

مرد اپنی بھرپور قوتوں کے ساتھ زندگی کے مشقت طلب اعمال اور ضروریات زندگی کے حصول میں لگا رہے ، لیکن ہنگامی صورتوں میں عورت باہر کی عملی زندگی میں بھی حصہ لے سکتی ہے ، [لیکن اس میں شدید ضرورت اور ہنگامی غیر معمولی حالات خاص طور سے مدنظر رہیں] ۔ آپ نے بعض مخصوص حالات میں کسب معاش کی اجازت دے کر یہ بات واضح کر دی ہے کہ عورت اپنی ہنر مندی ، ذہانت اور فطانت سے دوسرے کام بھی سر انجام دے سکتی ہے ۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خواتین نے کھیتی باڑی ، تجارت اور صنعت و حرفت میں بھی حصہ لیا ہے ۔ مدینہ منورہ میں بعض انصاری عورتوں کا مشغلہ کاشتکاری تھا (البخاری : الجامع الصحیح ، ۷ : ۳۵) ۔

بعض صحابیات تجارت کے پیشے سے بھی وابستہ تھیں : امّ المؤمنین حضرت خدیجہ کی تجارت وسیع پیمانے پر مختلف علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی ؛ قیلہ امّ انمار ، حضرت اسماء بنت مخربہ ، خولہ ، مُلَیکہ وغیرہا عطر کی تجارت کرتی تھیں (ابن سعد : الطبقات ، ۸ : ۳۰۰ ، ۳۱۱ ؛ الاصابہ ، ۴ : ۳۱۸ ، ۳۲۶ ؛ اسد الغابہ ، ۵ : ۴۳۲ ، ۵۴۸) ۔ صحابیات مختلف صنعتوں سے بھی آگاہ تھیں : امّ المؤمنین حضرت سودہ کے بارے میں ہے کہ وہ کھالوں کی دباغت کا کام جانتی تھیں (اسد الغابہ ، ۵ : ۴۴) ؛ حضرت زینب امور دستکاری میں ماہر تھیں (اسد الغابہ ، ۵ : ۴۶۵) ؛ ایک اور صحابیہ حضرت ریطہ [بنت عبداللہ] بھی دستکاری میں مہارت رکھتی تھیں (ابن سعد : الطبقات ، ۸ : ۲۹۰) ۔

دینی خدمات : یہ بھی حقیقت ہے کہ خواتین نے اپنے دین کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں ۔ حضرت سمیّہ والدۂ عمار بن یاسر کو راہ حق میں ثابت قدم رہنے کی پاداش میں ابو جہل نے سخت تکالیف کا نشانہ بنایا اور بالآخر وہ راہ حق میں شہید ہو گئیں (الاصابہ ، ۴ : ۳۳۱) ۔

مذہبی خدمات کے سلسلے میں سب سے اہم خدمت جہاد ہے ۔ خواتین نے [غیر معمولی اور شدید ضرورت کے وقت] جس عزم و حوصلے سے یہ خدمت انجام دی ہے اس کی نظیر ملنی مشکل ہے ۔ تاہم بیرون خانہ عورت کی سرگرمیوں کی آپ نے ہمیشہ حوصلہ شکنی فرمائی اور گھر کو لازم پکڑنے کی تلقین کی ۔ ایک دفعہ حضرت عائشہ صدیقہ نے جہاد میں شرکت کی اجازت طلب کی تو فرمایا کہ تمہارا جہاد حج ہے (البخاری : الجامع الصحیح ، ۳ : ۲۴ : ۴ : ۳۹) ۔ آپ نے ایک اور موقع پر یہ حقیقت یوں واضح کر دی تھی کہ عورت کا شوہر کی خدمت اور بچوں کی دیکھ بھال کرنے کا ثواب مردوں کے جہاد اور باجماعت نماز میں شرکت سے بڑھ کر ہے (اسد الغابہ ، ۵ : ۳۹۸) ، لیکن بوقت ضرورت آپ نے خواتین کو جہاد میں شرکت کی اجازت دی اور اس شرکت کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے پیشگی اجازت لینی ضروری تھی ۔ اگر آپ کسی عورت کے مزاج ، اس کی گھریلو مصروفیات اور حفاظت کے تمام انتظامات سے مطمئن ہوتے تو اس کو شرکت کی اجازت دے دیتے تھے ۔ جنگ احد میں جس وقت کفار نے عام حملہ کر دیا تھا اور آپ کے ساتھ چند جاں نثار رہ گئے تھے تو اس افراتفری میں حضرت ام عمارہ بنت کعب النّجاریہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس پہنچیں اور سینہ سپر ہو گئیں ۔ کفار جب آپ کی طرف بڑھتے تو حضرت ام عمارہ ان کو تیر اور تلوار سے روکتی تھیں اور اس طرح وار کو روکنے کی کوشش میں خود شدید زخمی ہوئیں ۔ آپ نے اس موقع پر ان کی شجاعت کی تعریف فرمائی (ابن ہشام : السیرۃ ،

۲ : ۸۶ ، ۸۷ ؛ الاصابہ ، ۴ : ۷۵۴ ؛ ابن سعد : الطبقات ، ج ۸) ۔ غزوۂ خندق میں حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب نے جس پامردی سے ایک یہودی کو قتل کیا اور قلعہ میں موجود عورتوں کی حفاظت کی وہ نہایت حیرت انگیز ہے ؛ ان کے متعلق غزوۂ احد [رک بہ احد] میں بھی دشمن پر نیزے سے حملہ کرنے کی شہادت موجود ہے (ابن ہشام : سیرۃ ، ۳ : ۲۳۹ ؛ الاصابہ ، ۴ : ۳۴۰ ؛ اسد الغابہ ، ۵ : ۴۹۳) ۔ غزوۂ حنین [رک بہ حنین] میں حضرت ام سُلیمؓ کا یہ حال تھا کہ وہ خنجر لیے پھرتی تھیں ، تاکہ جہاں دشمن دین نظر آئیں ان کا پیٹ چاک کر دیں (مسلم ، ۵ : ۱۹۶ ؛ الاصابہ ، ۴ : ۴۴۴) ۔ حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم اپنے ساتھ حضرت ام سلمہؓ اور دیگر انصاری عورتوں کو جنگوں میں لے جاتے تھے اور وہ سپاہ اسلام کو پانی پلانے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کی خدمت انجام دیتی تھیں (مسلم ، ۵ : ۱۹۶ ؛ ابوداؤد : السنن ، ۳ : ۲۶) ۔

کعیبہؓ بنت سعد [سعید] کے بارے میں روایت ہے کہ وہ آپؐ کے ساتھ غزوۂ احزاب اور غزوۂ خیبر میں شریک ہوئیں ۔ جنگ خندق میں جب حضرت سعدؓ بن معاذؓ زخمی ہوئے تو ان کا علاج بھی وہی کرتی رہیں (ابن سعد : الطبقات ، ۸ : ۲۹۱) ۔ حضرت ربیعؓ بنت معوذؓ بھی آپؐ کے ساتھ جنگوں میں شریک ہوتیں : مجاہدوں کو پانی پلانا ، جنگ میں کام آنے والوں اور زخمیوں کو مدینہ منورہ پہنچانا ان کے ذمے تھا (البخاری ، ۴ : ۴۰) ۔

حضرت ابو طلحہؓ کہتے ہیں کہ انھوں نے جنگ احد کے موقعہ پر حضرت عائشہؓ اور ام سَلیطؓ کو زخمیوں کو پانی پلاتے دیکھا (مسلم ، ۵ : ۱۹۷ ؛ البخاری ، ۵ : ۱۲۵ ، ۱۲۸) ۔ غزوۂ احد کے موقعہ پر حضرت فاطمہؓ نے بھی یہی خدمات سر انجام دیں اور جب آپؐ زخمی ہوئے تو حضرت فاطمۃ الزہراءؓ نے ہی زخم کو چٹائی کی راکھ سے بھرا تھا (البخاری ، ۵ : ۱۳۰) ۔ حضرت حمنہؓ بنت جحش بھی آپؐ کے ساتھ غزوات میں شریک ہوئیں : جنگ احد میں پانی پلانا اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا ان کے ذمے تھا (الاصابہ ، ۴ : ۲۶۶) ۔ ام زیادؓ اور چند دوسری عورتوں نے غزوۂ خیبر [رک بہ خیبر] کے موقعے پر چرخہ کات کر مسلمانوں کی مدد کی ؛ وہ میدان جنگ سے تیر اٹھا کر لانے اور مجاہدین کو ستو پلانے پر مامور تھیں (اسد الغابہ ، ۵ : ۴۵۱) ۔

بعض خواتین نے دین حق کی مدافعت شمشیر و سنان سے کی ، جب کہ بعض نے یہ فریضہ اپنی زبان و بیان اور درہم و دینار سے ادا کیا ۔ اَروی‌ؓ بنت عبدالمطلب کے بارے میں روایت ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مدد کرنے اور آگے بڑھنے کی ترغیب دلاتی تھیں (الاستیعاب ، ۴ : ۲۲۱) ؛ ہند بنت عتبہ نے حضرت حمزہؓ اور دیگر شہدائے احد کے خلاف اشعار کہے ، تو ہندؓ بنت اثاثہ نے ان کا اسی لہجے میں جواب دیا (الاصابہ ، ۴ : ۴۰۷) ۔ آپؐ نے جنگ میں شامل عورتوں کو مال غنیمت میں سے حصہ بھی دیا (مسلم ، ۵ : ۱۹۷) ۔

حقیقت تو یہ ہے کہ آپؐ نے طبقۂ نسواں کو ہر حیثیت اور ہر اعتبار سے حقوق عطا فرمائے ، [لیکن ظاہر ہے کہ جہاں حقوق کا سوال آتا ہے وہاں فرائض کا ذکر بھی لازم ہے ، جہاں رعایتوں اور آزادیوں پر زور دیا جاتا ہے وہاں ان قیود و شرائط کا لحاظ بھی ضروری سمجھا گیا ہے جو رعایتوں کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں ، مگر آج کل ان پر نظر نہیں رکھی جاتی] ۔

مآخذ : (۱) محمد فؤاد عبدالباقی : معجم المفہرس

لالفاظ القرآن الکریم : (۲) ابن کثیر : تفسیر ، مطبوعۂ قاہرہ ، ۱۳۴۳ھ ، بمواضع کثیرہ ؛ (۳) البخاری : الجامع الصحیح ، قاہرہ ۱۳۴۵ھ [و لائیڈن] ؛ (۴) مسلم بن حجاج القشیری : الجامع الصحیح ، قاہرہ ۱۳۳۴ھ ؛ (۵) الترمذی : الجامع (یا السنن)، مع شرح ابن العربی، مطبوعۂ قاہرہ ، ۱۳۵۲ھ ؛ (۶) ابو داود : السنن ، قاہرہ ۱۹۵۰ء ؛ (۷) الدارمی، السنن، دمشق، ۱۳۴۹ھ؛ (۸) محمد بن عبداللہ خطیب التبریزی : مشکوة المصابیح ۲، مطبوعۂ دمشق ، (۳ جلدیں) ؛ (۹) ابن ہشام : السیرة النبویہ، قاہرہ ۱۹۳۶ء (۴ جلدیں) ؛ (۱۰) ابن سعد : کتاب الطبقات الکبیر ، بیروت ۱۹۶۰ء (۸ جلدیں) ؛ (۱۱) ابن حجر العسقلانی : الاصابہ فی تمییز الصحابة ، قاہرہ ، ۱۳۵۸ھ ؛ (۱۲) وہی مصنف : تہذیب التہذیب ، مطبوعۂ حیدر آباد (دکن) ؛ (۱۳) ابن عبدالبر: الاستیعاب فی اسماء الاصحاب (مع الاصابہ)، مطبوعۂ قاہرہ ؛ (۱۴) ابن الاثیر : اسد الغابہ فی معرفة الصحابہ ، تہران ؛ (۱۵) ہنری مارٹن : فطرت نسوانی ، اردو ترجمہ از عبدالسلام ندوی ، منڈی بہاؤ الدین ۱۹۴۴ء ؛ (۱۶) *Our Oriental Heritage* : Will Durant ، مطبوعۂ نیویارک ، ۱۹۵۴ء ؛ (۱۸) Steward Easton : *The Heritage of Ancient World* .

(جمیلہ شوکت [و ادارہ])

معجزات نبوی : معجزات (واحد معجزة) ، مادہ (ع - ج - ز) عَجَزَ یَعْجِزُ عَجْزاً؛ عجز کے لغوی معنی کسی چیز سے پیچھے رہ جانے ، یا اس کے اس وقت حاصل کرنے کے ہیں جب کہ اس کے حصول کا وقت گزر چکا ہو ، لیکن عام طور پر اس کا استعمال کسی کام کے کرنے سے قاصر رہنے پر ہوتا ہے اور یہ القدرة کی ضد ہے ؛ قرآن کریم میں ہے : اَعَجَزْتُ اَنْ اَکُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوْءَةَ اَخِیْ ج (۵ [المآئدة] : ۳۱)، یعنی میں اس بات سے بھی قاصر رہا کہ اس کوے کی طرح اپنے بھائی کے مردہ جسم کو چھپا سکتا (دیکھیے الراغب الاصفہانی : مفردات فی غریب القرآن ، بذیل مادہ)۔ اسی مادے سے معجزة ہے (اصل میں معجز تھا ، حرف تا ء یا تو مبالغے کے لیے ہے اور یا صفت محذوف ہے (ابن حجر العسقلانی : فتح الباری شرح صحیح البخاری ، مطبوعہ لاہور ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء ، ۶ : ۵۸۱ تا ۵۸۲) اور اس سے مراد انبیا علیہم السلام سے صادر ہونے والے وہ خارق عادت افعال ہیں ، جن کا اہل زمانہ معارضہ نہ کر سکیں (حوالۂ مذکور) ۔ علامات (یا آیات) نبوت اور معجزات میں فرق یہ ہے کہ معجزات فقط وہ ہوتے ہیں جن کے ساتھ نبی کی طرف سے مخالفین کو تحدی (چیلنج) بھی ہو ، مثلاً یوں : اگر میں یہ کام کر دکھاؤں تو میں سچا ورنہ جھوٹا ہوں گا ، جب کہ آیات و علامات کے لیے تحدی کا ہونا شرط نہیں ہے۔ گویا ان میں باہم عام خاص کی نسبت ہے (حوالہ مذکور) ۔

قرآن حکیم میں معجزے کا اس کے اصطلاحی مفہوم میں استعمال مفقود ہے (لغوی معنی کے استعمال کے لیے دیکھیے ۹ [التوبہ] : ۲) ؛ قرآن حکیم میں اس کے بجاے آیات (واحد آیة) کی اصطلاح اختیار کی گئی ہے ، جو معجزہ کے لفظ سے زیادہ وسعت و عمومیت کی حامل ہے (دیکھیے بالا) ۔

ہر شخص کی زندگی میں کم و بیش ایسے حالات ضرور رونما ہوتے ہیں جن کی انسان اپنی تمام تر کاوش کے باوجود کوئی توجیہ نہیں کر سکتا : حادثے سے بال بال بچ جانا ، مہلک بیماری سے نجات پا جانا، موت کے منہ سے بچ کر چلے آنا ، اچانک کسی غیر متوقع خوشی کا سامنا ہو جانا ، یا دفعةً حالات کا کوئی غیر متوقع رخ اختیار کر لینا ، وغیرہ ۔ ایسے مواقع پر اکثر و بیشتر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ تو کوئی معجزہ ہو گیا ہے ورنہ یہ توقع تو نہ تھی ؛ لیکن انبیا علیہم السلام کو دعواے نبوت کے بعد عطا کیے جانے والے معجزات اس سے قطعی مختلف اور اس سے

کہیں زیادہ بلند سطح کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ کہنا درست نہیں کہ معجزات نظام کائنات کو مختل کر دینے کا نام ہے۔ دراصل نظام کائنات کے جس تصور سے ہم آشنا ہیں وہ قطعی اور مکمل تصور ہرگز نہیں ہے، بلکہ یہ تصور ابھی معرض تحقیق میں ہے۔ کچھ بھی ہو، انسان ابھی کائنات کے تمام اسرار و غوامض کو قطعی طور پر نہیں جان سکا۔ اسی بنا پر خود اس کی اپنی ذات سے متعلق بھی ابھی بہت سے مسائل تصفیہ طلب ہیں۔

معجزات در حقیقت قانون قدرت کے مطابق ہی ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ قدرت کا اعلٰی و ارفع قانون ہوتا ہے، جس کے پس منظر اور پیش منظر کو جاننا ہمارے بس میں نہیں ہوتا (شبیر احمد عثمانیؒ: معجزات و کرامات، مطبوعہ لاہور، ۱۳۷۱ھ/ ۱۹۵۲ء، ص ۸۱ تا ۸۷)۔ ان معجزات کو انبیائے کرام کی روحانی و معنوی تائید کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ ان کے لیے (حیرت انگیز طور پر) فطرت کے بعض قوانین بدل دیے جاتے ہیں یا ان کی صورت تبدیل کر دی جاتی ہے۔ ان کی عنداللہ مقبولیت کو واضح کرنے کے لیے ان کے ہاتھوں سے غیر معمولی کارنامے انجام پاتے ہیں۔ اسی بنا پر کم و بیش معجزے کا تصور عالمگیر حیثیت رکھتا ہے اور ہر مذہب نے اسے اپنی اساس قرار دیا ہے۔ حضرت نوحؑ کا طوفان، حضرت ہودؑ کی بد دعا پر قوم عاد کی تباہی، ناقۂ صالح [رک بہ صالحؑ] کی کونچیں کاٹنے پر قوم ثمود کی بربادی، قومِ لوطؑ کی نافرمانی پر نزول عذاب، حضرت ابراہیمؑ [رک بآں] پر آتش نمرود کا سرد ہونا، ان کی نسل میں برکت کا ہونا، حضرت موسیٰؑ [رک باں] کی بددعا پر فرعون مصر اور اس کے حواریوں پر ہلکے ہلکے عذابوں کے بعد غرق کی تباہی کا نازل ہونا، ان کے ہاتھ کا سفید (یدبیضاء) اور ان کے عصا کا سانپ بن جاتا، حضرت عیسیٰؑ [رک باں] کا مُردوں کو زندہ کرنا، بیماروں کو ہاتھ پھیر کر صحت یاب کر دینا، اندھوں کو بینائی کا مرحمت ہونا، یہ سب تائید الٰہی کے ایسے مظاہر ہیں جو تاریخ کا ایک حصہ بن چکے ہیں، تاہم جن مذاہب میں معجزات کو اساس مذہب کی حیثیت دی گئی، وہ فی الواقع درست نہ تھیں۔

قرآن کریم کے مطابق معجزات کسی آسمانی مذہب کی تائید و حمایت کے لیے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ابتدائی اور اساسی اہمیت عقل و فکر کو اور اس پیغمبر کی سیرت و کردار اور اس کی تعلیمات کو حاصل ہوتی ہے۔ اسی بنا پر قرآن حکیم میں معجزات کی طلب پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا اور عقل و خرد سے کام لینے کی ضرورت پر زور دیا گیا، فرمایا: اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ط وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا (۴ [النسآء]: ۸۲)، یعنی یہ لوگ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے، اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔ یہودیوں کے انکار رسالت کے لیے آتشیں معجزہ پیش نہ کرنے کے عذر پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا: قُلْ قَدْ جَآءَکُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِیْ بِالْبَیِّنٰتِ وَبِالَّذِیْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْھُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۳ [آل عمران]: ۱۸۳)، یعنی اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ مجھ سے پہلے کئی پیغمبر تمہارے پاس کھلی ہوئی نشانیاں اور صحیفے اور روشن کتابیں لے کر آئے اور وہ (آتشیں معجزہ) بھی جو تم کہتے ہو، تو اگر تم سچے ہو تو تم نے ان کو قتل کیوں کیا۔ قریش مکہ کے مطالبات کی ایک طویل فہرست پیش کرنے پر بطور تبصرہ ارشاد فرمایا: قُلْ سُبْحٰنَ رَبِّیْ ھَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (۱۷ [بنی اسرآئیل]: ۹۳)، یعنی آپؐ کہہ دو کہ میرا پروردگار پاک ہے، میں تو صرف پیغام پہنچانے والا انسان ہوں۔ ایک دوسرے موقع پر عجیب و غریب اور بے سروپا

سوالات کرنے والوں کو متنبہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا : قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ (۶ [الانعام] : ۵۰)، یعنی آپ کہ دیجیے کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں ؛ میں تو صرف اس حکم پر چلتا ہوں، جو مجھے خدا کی طرف سے وحی کیا جاتا ہے ۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا : وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ (۶ [الانعام] : ۳۵) ، یعنی اور اگر ان کی روگردانی آپ ؐ پر شاق گزرتی ہے تو اگر طاقت ہو تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈ نکالو ، یا آسمان پر سیڑھی (تلاش کر لو) پھر ان کے پاس کوئی معجزہ لے آؤ ۔ ان تمام مقامات سے اس مضمون کی شہادت ملتی ہے کہ خدا تعالیٰ کو معجزات کا طلب کرنا اور ان کو مدار ایمان قرار دینا قطعی پسند نہ تھا ۔

اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ قرآن حکیم نے سرے سے معجزات کے وجود کا ہی انکار کر دیا ہے ۔ خود قرآن حکیم سابقہ انبیا ؑ کے علاوہ آپ ؐ کے متعدد معجزات کا بھی ذکر کرتا ہے اور متعدد مقامات پر آپ ؐ کے معجزات کی واضح صراحت کی گئی ہے، سورۃ قمر میں ہے : وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (۵۴ [القمر]: ۲)، یعنی اور اگر (کافر) کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایک ہمیشہ کا جادو ہے ۔ ایک اور مقام پر فرمایا : وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا (۷ [الاعراف] : ۱۴۶)، یعنی اگر یہ سب نشانیاں بھی دیکھ لیں تب بھی ان پر ایمان نہ لائیں ۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے: وَلَىِٕنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ (۳۰ [الروم] ۵۸)، یعنی اور اگر تم ان کے سامنے کوئی نشانی پیش کرو تو کافر کہ دیں گے کہ تم تو جھوٹے ہو ۔ ان تمام مقامات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے معجزات کی طرف اشارہ ہے ۔

محولہ بالا تمام مقامات میں ہر جگہ آیت سے مراد معجزہ قرآن نہیں ہو سکتا، کیونکہ قرآن کو پڑھا تو جاتا ہے، دیکھا نہیں جاتا ۔ جب کہ محولہ بالا آیات میں نشانی دیکھنے اور اس کے باوجود اس پر ایمان نہ لانے کا ذکر ہے (نیز دیکھیے ۲۱ [الانبیاء] : ۳ ؛ ۳۷ [الصّٰفّٰت] : ۱۴ تا ۱۵ ؛ ۴۳ [الزخرف] : ۳۰ ؛ ۵۲ [الطور] : ۲۹ ؛ ۶۱ [الصّفّ] : ۶ ؛ نیز دیکھیے نیچے) ۔

قرآن حکیم کا بڑا مقصد اس حقیقت کو ذہن نشین کرنا ہے کہ معجزات سے کسی قوم یا ملت کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی ، بلکہ بعض اوقات ان کی کثرت معاندانہ و باغیانہ روش کا موجب بن جاتی ہے ۔ جن لوگوں نے ایمان قبول کرنا ہوتا ہے ، ان کے لیے عقل و بصیرت کی نشانی ہی کافی ہے اور جنھوں نے ہدایت قبول ہی نہ کرنی ہو ، انھیں چاند کو دو نیم کر کے دکھانے سے بھی ہدایت نہیں مل سکتی ۔

امام غزالی ؒ اس قرآنی طرز فکر کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اخلاق حمیدہ ، آپ ؐ کی سیرت و کردار، آپ ؐ کا حسن تدبیر سیاست و معاملات ، آپ ؐ کا مختلف المزاج لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا ، آپ ؐ کے ارشاد فرمودہ قوانین شریعت ، معارف و حقائق اور کلمات طیبات سبھی آپ ؐ کی نبوت و رسالت کا ناقابل تردید ثبوت بہم پہنچاتے ہیں ، کیونکہ اتنے عظیم الشان اہمیت کے حامل امور کسی متنبی سے اور بغیر تائید الٰہی ہرگز انجام نہیں پا سکتے اور اس پر مستزاد یہ کہ آپ ؐ اُمّی محض تھے :

آپؐ نے نہ تو اپنے شہر میں تعلیم حاصل کی اور نہ ہی بغرض تعلیم کسی دوسرے شہر کا سفر اختیار کیا۔ یہ ظاہری امور آپؐ کی صداقت و حقانیت کے لیے کافی تھے، لیکن بعض طبائع ظاہری امور کے ساتھ ساتھ باطنی امور میں بھی تائید الٰہی کی طالب ہوتی ہیں ان کے لیے کچھ باطنی تائیدات (یعنی معجزات) کا ذکر بھی کیا جاتا ہے (احیاء علوم الدین، ۲ : ۱۳۳، کتاب آداب المعیشۃ و اخلاق النبوۃ، مطبوعۃ قاہرہ ۱۳۵۲ھ، الزبیدی : اتحاف شرح احیاء العلوم، ۷ : ۱۹۸)۔

امام موصوف دوسری جگہ (المنقذ من الضلال، ص ۵۵ تا ۵۹، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۱ء) اس موضوع پر مزید روشنی ڈالتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کی نسبت یہ شبہہ ہو کہ یہ نبی ہے یا نہیں تو اس کی تصدیق صرف اس کے احوال کی معرفت سے ہی ہو سکتی ہے؛ اس معرفت کے دو طریقے ہیں: یا تو ذاتی مشاہدے سے ہو، جیسے صحابہؓ کو تھی اور یا خبر متواتر سے ہو، جیسے اب عام لوگوں کو ہے۔ اب جس شخص کو نبوت کے آثار و کیفیات کی ذوق شناسی ہوگی وہی مائل بہ تصدیق ہوگا۔ دوسرا نہیں، مثلاً اگر فن طبابت سے کچھ مس ہو تو تبھی کسی طبیب کو دیکھ کر اس کی طبابت میں مہارت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح جالینوس کی طبابت اور امام شافعیؒ کے تفقہ کا علم ان کی سوانح اور تصنیفات کے ذریعے معلوم کیا جا سکتا ہے، و علی ہذا القیاس۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم گو ہم میں موجود نہیں، مگر آپؐ کی سیرت طیبہ اور شریعت و تعلیمات موجود ہیں، ان کے مطالعے سے ہر شخص آپؐ کی نبوت و رسالت کی تصدیق کر سکتا ہے۔

امام الرازی نے بھی قریب قریب یہی موقف اختیار کیا ہے۔ امام موصوف فرماتے ہیں کہ نبوت کے ماننے والوں کی دو اقسام ہیں : ایک وہ جو معجزے کو نبوت کی دلیل ٹھہراتے ہیں۔ یہ جمہور اہل مذاہب کا مسلک ہے؛ دوم وہ جو کہتے ہیں کہ پہلے ہمیں خود غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے کہ فی نفسہٖ صداقت و راستی کیا ہے۔ اس کے بعد ہم ایک شخص کو دعوائے نبوت کے بعد لوگوں میں وعظ و نصیحت کرتا ہوا پاتے ہیں اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس کی دعوت مؤثر ہے اور اس کے ذریعے مختلف اشخاص کو ہدایت نصیب ہو رہی ہے تو ہم یقین کر لیں گے کہ یہ سچا پیغمبر ہے! یہ طریقہ قریب العقل اور قریب الشہادت ہے۔ امام موصوف کے مطابق اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسانیت کا کمال قوت علمی و عملی کی تصحیح، تکمیل اور تزکیہ ہے۔ اس قوت کے لحاظ سے انسانوں کے تین طبقے ہیں: ایک وہ جو ناقص ہیں، یعنی جن کی نظری و عملی دونوں قوتیں کمزور ہیں، یہ عوام الناس ہیں؛ دوسرے وہ جو خود کامل ہیں، مگر دوسروں کو کامل نہیں کر سکتے، یہ اولیا و صلحا ہیں: سوم وہ جو خود بھی کامل ہیں اور ان کی تربیت دوسروں کو بھی کامل بنا دیتی ہے، یہ انبیا اور رسول ہیں۔ اس کمال و ناقص کے ہزاروں درجے متفاوت ہیں، انھی کے لحاظ سے ان کی قوت و نقص کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان کی علمی قوت کے سامنے تمام مقدمات بدیہی ہوتے ہیں اور جملہ معارف الٰہی پر ان کو عبور حاصل ہوتا ہے اور ان کی قوت عملیہ اس عالم جسمانی میں تصرفات کرتی ہے اور یہی معجزات کا مقصد بھی ہے۔ اس قوت علمی و عملی کے کمال کے ساتھ یہ لوگ ناقصوں کو اپنے فیض صحبت سے کامل کر دیتے ہیں؛ یہی ان کی نبوت کی سب سے بڑی دلیل ہوتی ہے۔ آگے چل کر امام موصوف اسی طریقے کو قرآن حکیم میں اختیار کردہ اثبات نبوت کا طریقہ قرار دیتے

میں (الرازی : مطالب عالیہ ، ضمیمہ در شبلی نعمانی : علم الکلام ، اور الکلام ، ص ۳۲۸ تا ۳۳۷ ؛ مطبوعہ کراچی ۱۹۶۳ء) ۔

امام الرازیؒ کا معجزات کو انبیا علیہم السلام کی قوت عملیہ کے عملی تصرفات قرار دینا محل نظر ہے ، کیونکہ قرآن حکیم بار بار اس ایک نکتے پر زور دیتا ہے کہ کسی بھی معجزے یا نشان کا پیش کرنا انبیا کے بس سے باہر ہوتا ہے ، بلکہ بعض اوقات ان کی خواہش پر بھی معجزے کا ظہور نہیں ہوتا (دیکھیے (۶ [الانعام]: ۳۵)؛ اس کے برعکس معجزات یا خوارق عادت کا ظہور محض اور محض اللہ تعالٰی کے فضل و کرم کا نتیجہ ہوتا ہے ، اسی بنا پر قرآن حکیم میں انبیا کے معجزات کے ذکر کے موقع پر ایک جگہ باذن اللہ (۳ [آل عمران] : ۴۹) اور دوسری جگہ باذنی (۵ [المائدۃ] : ۱۱۰) کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے ۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو قدرت کی طرف سے جو معجزات عطا ہوئے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے ۔ امام بیہقی ، اور احناف میں سے علامہ الزاہدی نے معجزات نبوی کی تعداد ایک ہزار ، امام نووی ، (صاحب شرح صحیح مسلم) نے بارہ سو ، اور بعض نے تین ہزار تک بیان کی ہے (ابن حجر العسقلانی : فتح الباری ، ۶ : ۶۸۳) ۔ شیخ جلال الدین السیوطی نے الخصائص الکبرٰی میں ایک ہزار معجزات شمار کیے ہیں ، ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جو مستند اور معتبر رواۃ سے منقول ہوئے ہیں اور ان میں سے کسی ایک کا بھی اس زمانے کے کسی آدمی سے انکار ثابت نہیں ۔ اس طرح مجموعی طور پر روایات معجزات کو تواتر کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے ، اگرچہ ان میں سے بعض روایات طریقۂ احاد سے مروی ہیں (کتاب مذکور ، ص ۵۸۲ ببعد) ۔

معجزات نبوی کی پھر مزید دو اقسام بیان کی گئی ہیں : (۱) وہ معجزات جن کے معارضے پر لوگ قادر تھے ، مگر بوجوہ نہ کر سکے ، مثلاً یہود کے لیے تمنائے موت ، یا تمام دنیائے کفر کے لیے قرآن حکیم کی کسی چھوٹی سے چھوٹی سورت کی مثل پیش کرنے کا حکم (۲ [البقرۃ] : ۲۳) ؛ (۲) دوسری قسم ان معجزات کی ہے کہ جن کا معارضہ کرنا کسی انسان کے بھی بس کا نہیں ، مثلاً انگلیوں کے درمیان سے پانی کا رواں ہونا ، تھوڑے کھانے کا زیادہ افراد کے لیے کافی ہونا ، وغیرہ (قاضی عیاض : الشفا بتعریف حقوق المصطفٰی ، مطبوعہ بریلی (بدون تاریخ) ، ص ۱۲۲) ۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ہاتھوں پر یہ دونوں اقسام کے معجزات صادر ہوئے ، جو آپؐ کی تائید ایزدی کا بین ثبوت ہیں ۔ ایک اور اعتبار سے بھی معجزات دو اقسام پر منقسم ہیں : (۱) اول وہ جن کا علم کسی قطعی ذریعۂ علم سے ہوا ہے ، مثلاً قرآن کریم اور اس میں مذکور معجزات ؛ ان کا انکار کرنا خود نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور اسلام کے انکار کے مترادف ہے اور ایسے ہی ہے گویا مکمل قرآن کا انکار کر دینا یا کسی اسلامی رکن کا انکار کر دینا ؛ (۲) دوسری قسم کے معجزات وہ ہیں جو اس درجہ معتبر اور مستند تو نہیں ، مگر وہ ثابت ضرور ہیں ؛ ان کی آگے پھر متعدد اقسام ہیں : (الف) مشہور اور منتشر ، یعنی وہ معجزات جن کے انفرادی اور جزئی واقعات تو خبر احاد سے بہم ہوئے ہوں مگر مجموعی طور پر اس قسم کے واقعات کی بکثرت موجودگی کا پتا چلتا ہو اور اس نوع کے واقعات کو تعداد کثیر نے نقل کیا ، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی خبر خوب پھیل گئی ہے ، مثلاً دست مبارک کی انگلیوں سے

چشمۂ آب کا جاری ہونا وغیرہ، مشتہر اور منتشر معجزات کہا جاتا ہے؛ (ب) وہ معجزات جنھیں چند ایک آدمیوں نے نقل کیا ہے اور اسی بنا پر وہ حصہ اول کی طرح مشہور اور مشتہر تو نہیں، تاہم اگر ان روایات کو بالمعنی جمع کیا جائے تو راویوں کی تعداد کثیر ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں اقسام قطعی الدلالۃ ہوتی ہیں، ان میں سے کسی کا انکار نقص ایمان پر دال ہوتا ہے؛ (ج) وہ معجزات جو محض خبر احاد سے ثابت ہوے ہوں؛ ان میں سے بھی بیشتر، راوی کے منفرد ہونے کے باوجود، اپنے رواۃ کی ثقاہت و دیانت کی بنا پر، واضح الثبوت ہوتے ہیں۔ ان کا انکار بھی درست نہیں ہوتا (قاضی عیاض: الشفا، ص ۱۲۳ تا ۱۲۵؛ ابن حجر: فتح الباری، ۶: ۵۸۴)۔

معجزات کی تقسیم عقلی اور نقلی اعتبار سے بھی کی گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ امتیاز اور تفوق بھی حاصل ہے کہ آپؐ کو دونوں قسم کے معجزات مرحمت فرمائے گئے: (۱) عقلی معجزات سے مراد وہ خوارق عادت امور ہیں جن کے فہم و ادراک میں عقل کو دخل ہوتا ہے؛ (۲) حسی معجزات وہ معجزات ہیں جن کا ادراک حواس سے کیا جاتا ہے۔ تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) عقلی معجزات: سیرت نگاروں نے حسب ذیل خوارق عادت امور کو عقلی معجزات شمار کیا ہے: (۱) وحی الٰہی اور خدا تعالٰی اور ملائکہ سے شرف ہم کلامی: قرآن کریم اور تواتر احادیث سے یہ امر ثابت ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ آپؐ پر وحی نازل ہوتی تھی [رک بہ وحی؛ (نیز محمد فؤاد عبدالباقی: معجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم، مطبوعہ قاہرہ، بذیل مادہ)]۔ وحی ایک قسم کی خداوند تعالٰی سے ہم کلامی ہے، جو عام طور پر کسی فرشتے کی وساطت سے ہوتی ہے۔ بعض انبیا کو براہ راست بھی خدا تعالٰی سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا رہا ہے (۲ [البقرۃ]: ۲۵۳؛ ۴ [النسآء]: ۱۶۴)۔ خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ شرف کئی بار حاصل ہوا، بالخصوص شب معراج میں (علی حسب الاقوال؛ دیکھیے قاضی عیاض: الشفاء، ذکر معراج) جہاں بقول بعض عبد و معبود کے درمیان سے ہر حجاب اٹھا لیا گیا تھا، اس لیے فرمایا: فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی (۵۳ [النجم]: ۱۰)، یعنی پھر خدا نے اپنے بندے کی طرف جو چاہا وحی کی۔ اس کے علاوہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تک خدا تعالٰی کا پیغام حسب ذیل صورتوں میں پہنچتا تھا: (۱) رویاے صادقہ؛ (۲) نفث فی الروع یا القا فی القلب (دل میں کسی پیغام کا پھونکنا یا ڈالنا)؛ (۳) صلصلۃ الجرس (گھنٹی کی طرح کی آواز)؛ (۴) فرشتے کا اپنی اصلی شکل و صورت میں نظر آ جانا (ابن القیم: زادالمعاد، ۱: ۷۸ تا ۸۰، مطبوعہ کویت، ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء)۔

آخری صورت کے مطابق فرشتے بعض اوقات صحابہ کرامؓ کو بھی نظر آتے تھے (دیکھیے مثلاً مسلم: الصحیح، حدیث ۹۸)، تاہم اس کی انتہائی صورت یہ تھی کہ فرشتہ اپنی اصلی شکل و صورت میں حضورؐ کو نظر آتا تھا (مسلم، حدیث ۷۷؛ الترمذی، حدیث ۳۲۷۷؛ زاد المعاد، ۱: ۸۰)۔ اللہ تعالٰی سے اور فرشتوں سے ہم کلام ہونا (جس کی شہادت انتہائی معتبر ذرائع سے ملی ہے) آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا عظیم عقلی معجزہ ہے۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے کمالات علمیہ: خداوند قدوس کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو علمی اور عملی محاسن

وکمالات مرحمت ہوئے وہ دنیا کے کسی بھی انسان کو نصیب نہیں ہو سکے۔ علمی کمالات کا یہ عالم تھا کہ آپؐ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ علمائے اسلام کی تحقیق و کاوش کا صدیوں مرکز بنا رہا اور ماہرین اپنی طویل عمروں میں بھی ان کے حقائق اور رموز و اسرار کو کماحقہ نہ جان سکے۔ احادیث کے ہر جملے سے کئی کئی مسائل ونکات معلوم کیے گئے۔ معلومات کا یہ عالم کہ جس طرف روے سخن پھر گیا، معلوم ہوتا کہ یہی آپؐ کا اصلی میدان ہے۔ الفاظ اس طرح کے مہذب و شائستہ کہ اہل علم کی زبانیں اس کی تعریف کرنے سے قاصر ہیں۔ علم و عرفان کی یہ وسعت اور سیرت و کردار کی عظمت آپؐ کی نبوت کی زبردست دلیل ہے۔ اسی بنا پر امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے آپؐ کے اخلاق، افعال، احوال و عادات اور سیاسیات و معاملات کا، نیز آپؐ کے بلند پایہ علمی مقام کا، کہ مشکل سے مشکل سوالات کے فی البدیہہ ایسے جوابات دیے جن کی حقیقت دریافت کر کے انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے، مطالعہ کیا ہے، اس نے یہ یقین کر لیا ہے کہ حضورؐ اللہ کے سچے نبی تھے، کیونکہ اس طرح کے علمی و عملی کمالات کا جمع ہونا اذن ربی کے بغیر ناممکنات میں سے ہے (احیاء العلوم، ۲: ۳۴۴)؛ (۳) آپؐ کی امیت: آپؐ کی زبان مبارک سے معجزۂ قرآنی ظاہر ہوا، جو دنیا میں سب سے بڑی کتاب اور علوم و معارف کا سب سے بڑا مخزن ہے۔ اس کے علاوہ ہر موضوع پر آپؐ کے اقوال و ارشادات کثیر تعداد میں مروی ہیں، مگر اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ آپؐ امی محض تھے، نہ کسی سے آپؐ نے پڑھنا لکھنا سیکھا، نہ اس مقصد کے لیے کوئی سفر کیا اور اسی بنا پر قرآن کریم میں ارشاد ہے: اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ (۷ [الاعراف]: ۱۵۷)، یعنی وہ جو (محمدؐ) رسول (اللہ) [illegible] پیروی کرتے ہیں۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: وَ مَا کُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ کِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِکَ (۲۹ [عنکبوت]: ۴۸)، یعنی اور تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اسے اپنے ہاتھ سے لکھ ہی سکتے تھے۔ سورۂ یٰس میں اعلان کیا گیا: وَ مَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَ مَا یَنْبَغِیْ لَهٗ (۳۶ [یٰس]: ۶۹)، یعنی اور ہم نے ان (پیغمبر) کو شعر گوئی نہیں سکھائی اور نہ ان کو شایان ہے۔ قریش مکہ آپؐ کو ابتدا سے جانتے تھے اگر یہ دعواے امیت خلاف واقعہ ہوتا تو قریش ضرور اس کی تردید کر دیتے، مگر تاریخ میں کسی بھی دشمن اسلام کی طرف سے بہ صراحت تو کیا، اشارہ و کنایہ بھی نہیں ملتا کہ یہ ثابت کیا گیا ہو کہ آپؐ نے کسی شخص کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیے تھے۔

(۴) اعجاز قرآن: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے عقلی معجزات میں آپؐ کا سب سے عظیم، لافانی اور ابدی معجزہ قرآن حکیم ہے: قرآن حکیم اپنے الفاظ اور معانی دونوں اعتبار سے معجزہ ہے۔

اعجاز قرآن پر گفتگو ”وجوہ اعجاز قرآن“ کہلاتی ہے (تاریخی اور تصنیفی بحث کے لیے [رک بہ قرآن: اعجاز قرآن]) اور ہر سیرت نگار یا مفسر نے، اس موضوع پر اپنے اپنے خیال سے بحث کی ہے اور مجموعی طور پر کوشش کی ہے کہ اس پیکر فصاحت و بلاغت کے وجوہ اعجاز کو نمایاں کیا جائے؛ ان تمام مصنفین کی کاوشوں میں، گو اپنی اپنی انفرادیت کی جھلک بھی پائی جاتی ہے، مگر مجموعی طور پر کچھ باتوں میں سب کا اشتراک ہے، تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) فصاحت و بلاغت قرآن: قرآن حکیم کی سب سے [illegible] خصوصیت اس کی سادگی

اور سلاست کے ساتھ ساتھ اعلٰی درجے کی لفظی و معنوی فصاحت و بلاغت بھی ہے ، جس کا معارضہ فصحاے عرب کوشش کے باوجود نہیں کر سکے۔ قرآنی فصاحت و بلاغت کے حسب ذیل پہلو لائق توجہ ہیں : (الف) لفظی محاسن : قرآن حکیم میں لفظوں اور جملوں کی بندش ، فقرات و کلمات کی برجستگی اور مختلف تراکیب کی چستگی اپنے منتہاے کمال پر دکھائی دیتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ اهل عرب اس فن میں اس درجہ مہارت رکھتے تھے کہ وہ اپنے سوا ہر قوم کو عجمی (گونگے) کہا کرتے تھے اور یہ فصاحت و بلاغت گویا ان کو فطری طور پر وراثت میں ملی تھی ؛ پیدائشی طور پر ہر بچہ فصیح زبان سنتا اور بولتا تھا۔ ان میں سے کوئی قبیلہ دوسرے قبیلے سے فصاحت و بلاغت میں مرعوب نہیں ہوتا تھا ، مگر اس کے باوجود قرآن حکیم کو سن کر ، اس کی تلاوت کا حظ اٹھا کر وہ ہر کلام کی لذت اور حلاوت کو بھول گئے۔ یہ تبھی ممکن ہے جب یہ تسلیم کیا جائے کہ قرآنی فصاحت و بلاغت کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ولید بن مغیرہ کی نسبت منقول ہے کہ اس نے ایک آیت قرآنی کو سن کر کہا : بخدا ! اس میں حلاوت اور رونق و حسن ہے ، اس کا باطن پانی سے لبالب معمور (مغدق) اور اس کا ظاهر ثمر آور ہے اور یہ کسی انسان کا کلام نہیں (الشفا ، ص ۲۲۷) ؛ ایک اعرابی نے آیت قرآنیہ سن کر سجدہ کیا ، پھر کہا کہ میں نے اس کی فصاحت و بلاغت کو سجدہ کیا ہے (حوالۂ مذکور)۔ حضرت عمر فاروق ؓ ایک مرتبہ مسجد میں استراحت فرما رہے تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ ان کے سرھانے دو بوزنطی بطریق کلمۂ شہادت پڑھ رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ انہوں نے روم میں ایک مسلمان قیدی کی زبان سے ایک آیت سنی تھی۔ اس کے الفاظ کی شان و شوکت اور اس کے معانی پر غور و فکر کرنے سے ان پر راہ حق و صداقت واضح ہوگئی (کتاب مذکور ، ص ۲۲۸)۔ حلاوت قرآن کا یہ عالم ہے کہ مشہور دشمن اسلام ابو جہل بن ہشام اور اس کے دو ساتھی (ابو سفیان اور الاخنس بن شریک) مسلسل تین روز چھپ چھپا کر آیات قرآنیہ سنتے رہے (ابن ہشام : السیرۃ النبویہ ، ۱ : ۳۳۷ تا ۳۳۸) ؛

(ب) اسلوب قرآن کی انفرادیت : اهل عرب میں عام طور پر کلام کی تین اقسام رائج تھیں : (۱) نظم : شعر و اشعار ؛ (۲) نثر ، روزمرہ کی بول چال اور خطوط اور خطبات کی زبان ؛ (۳) سجع ، یعنی مقفّٰی و مسجع عبارت ، جو عام طور پر کاهن بولتے تھے اور جس میں الفاظ زیادہ سے زیادہ پر شوکت ، مگر معانی انتہائی بے وقعت ہوا کرتے تھے (دیکھیے الجاحظ : البیان والتبیین ؛ المبرد : الکامل ؛ ابن قتیبہ : عیون الاخبار ؛ الآلوسی : بلوغ الارب ؛ احمد زکی : جمہرہ خطب العرب ؛ ابن عبد ربہ : العقد الفرید ؛ الیاقوت الحموی : معجم الادبا ، وغیرہ میں مختلف قبیلوں کے فصحا و بلغا کا کلام)۔ قرآن حکیم نے ان سب سے ایک منفرد اور ایک الگ تھلگ اسلوب اپنایا ، جو نہ شعر تھا ، نہ نثر اور نہ ھی سجع ، بلکہ یہ کلام کہیں چھوٹی چھوٹی آیات (قطعات) پر مشتمل ہے اور کہیں بڑی بڑی آیات سے عبارت ہے ، مگر ہر جگہ الفاظ کی رونق اور چمک دمک کے ساتھ ساتھ معانی کا ایک بحر بیکراں موجیں مارتا ہوا دکھائی دیتا ہے ، اسی بنا پر فصحاے عرب کو اس کلام کی صنف متعین کرنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑا ؛ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ولید بن المغیرہ نے قرآن کی کوئی آیت سنی ، اس سے متأثر ہوا۔ ابوجهل نے

جب اسے متاثر دیکھا تو اس کا اثر دور کرنے کے لیے کہا کہ یہ نظم کی کوئی قسم ہے۔ ولید بن المغیرہ نے کہا: بخدا مجھ سے زیادہ تم میں عربی اشعار کا جاننے والا کوئی نہیں؛ شعر سے اس کلام کو کوئی مناسبت نہیں۔ ایک دوسرے موقع پر کسی نے آپؐ کو کاہن، جادو گر، یا مجنون کہنے کی تجویز پیش کی، ولید نے مخالفت کی اور کہا، نہ تو یہ کاہن ہیں، کیونکہ ان کے کلام کو کاہنوں کے کلام سے کوئی واسطہ نہیں اور نہ ہی جادو گر اور مجنون (الشفا، ص ۲۲۹)۔ عتبہ بن ربیعہ سردار قریش نے یہ کلام سنا تو کہا: بخدا! آج تک میں نے ایسا کلام کبھی نہیں سنا، نہ تو یہ شعر ہے اور نہ سحر (کتاب مذکور، ص ۱۳۰)۔ اسی طرح انیس (برادر ابی ذرؓ) نے، جو خود بھی ایک بلند پایہ شاعر تھا، اسلوب قرآن کی نسبت یہ گواہی دی: میں نے آپؐ کا کلام سنا، مگر آپؐ کے کلام کو شعر سے کوئی تعلق نہیں، آپؐ کے بلند پایہ کلام سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ آپؐ جو کچھ کہتے ہیں سچ ہے اور آپ کے دشمن جھوٹے ہیں (حوالۂ مذکور)؛ (ج) صوتی ترنم و تنغّم: قرآن حکیم کے ہر ایک مطلع و مقطع میں ایک خاص قسم کا حسن و جمال پایا جاتا ہے، یہ الفاظ کی نغمگی اور جملوں کی موسیقیت، اوزان و قوافی سے مبرا و منزہ ہونے کے باوجود ہر جگہ فراوانی کے ساتھ محسوس ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے اگر مزید غور کیا جائے تو قرآنی آیات کو تین حصوں میں منقسم دیکھتے ہیں: طویل آیات، مثلاً سورۃ البقرہ میں؛ اوساط مثلاً الاعراف اور الانعام میں؛ قصار مثلاً سورۃ الرحمٰن اور المرسلٰت میں۔ ان سب میں قرآنی آیات کے الفاظ و حروف کا ایک خاص اسلوب ہے۔ معانی کی وسعت کے ساتھ آیات کے حروف و اصوات ایک خاص منظر اور ایک خاص لذت پیدا کرتی ہیں؛ جب یہ آیات پڑھی جا رہی ہوں تو باہمی موزونیت اور روانی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی دریا رواں ہے؛ آواز کے اتار چڑھاؤ سے بلاشبہہ کسی آبشار کے گرنے کا سماں بندھتا ہے۔ اسی بنا پر اشعار و نظم سے معرّا ہونے کے باوجود یہ واحد کتاب ہے جس کو پڑھنے (تلاوت کرنے) کا خاص فن (فن تجوید و قراءت [رک بہ قرآن]) پیدا ہوا اور اس نے وہ عروج حاصل کیا کہ ہر زمانے میں ہزارہا افراد اس فن سے وابستہ رہے ہیں اور روز بروز اس کو ترقی نصیب ہو رہی ہے۔

قرآنی آیات کے ترنم و تنغّم کا یہ عالم ہے کہ باوجود اس کے کہ بہت سے لوگ اس زبان سے ناواقف ہیں، مگر پھر بھی ہر سننے والا کان بھرپور طریقے سے اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح ایک ایسا سماں بندھتا ہے جس میں پوری کائنات خاموش محسوس ہوتی ہے اور قرآن کے الفاظ پوری طرح فضا پر چھا جاتے ہیں؛ (د) ایجاز و اطناب: علما نے بلاغت کی ایک تعریف یہ بھی کی ہے کہ بلیغ کلام وہ ہے جس میں موقع و محل کے مطابق بات کی گئی ہو۔ اختصار کے موقع پر مختصر اور اطناب کے موقع پر مفصل (السیوطی: الاتقان، ۳: ۱۰۹)۔ ان ظاہری خوبیوں کے ساتھ ساتھ قرآنی آیات بیّنات کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ اس میں ایجاز و اختصار بھی کامل درجے کا ہے۔ کسی جگہ خوامخواہ مضمون کو طول دینے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اگر مضمون تین آیات میں پورا ہو گیا ہو تو چوتھی آیت کا اضافہ نہیں کیا گیا اور اس پر لطف کی بات یہ ہے کہ معانی کی وہ وسعت ہے کہ سینکڑوں تفاسیر لکھی جانے کے باوجود اس کی توضیح و تشریح

کا حق ادا نہیں ہو سکا۔ ایک ایک آیت اور ایک ایک سورۃ کی تفسیر کئی کئی مجلدات میں بھی مرتب کی گئی ہے۔ خود حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ میں سورۂ فاتحہ کی اگر تفسیر لکھنے بیٹھ جاؤں تو ستر اونٹ کتابوں سے بھر سکتے ہیں (علی نقی لکھنوی: مقدمۂ تفسیر، مطبوعہ ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۱ء؛ عربی ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء)، لیکن بایں ہمہ یہ ایجاز و اختصار کسی مقام پر مغلق و مبہم کے درجے کو نہیں پہنچا۔ ایجاز کی مختلف اقسام اور قرآن میں ان کی مثالوں کے لیے دیکھیے السیوطی: الاتقان، مطبوعہ ۱۹۷۵ء، ۳: ۱۷۹ تا ۲۱۶۔

اسی طرح جہاں ضرورت پڑی ہے اور موقع ہوا ہے اطناب بھی اختیار کیا گیا ہے، مگر اس اطناب میں بھی اعلیٰ درجے کی نزاکت و مہارت کا خیال رکھا گیا ہے اور وہاں واقعات کے ایسے پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے کہ جن سے خاص نتائج پیدا ہونے کی توقع ہو سکتی ہے، مثلاً سورۃ المؤمن میں فرشتوں کے ذکر میں: يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ (۴۰ [المؤمن]: ۷)، یعنی وہ (فرشتے) اپنے رب کی تعریف کے ساتھ تسبیح پڑھتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں، میں یؤمنون بہ کا اضافہ ایمان کی اہمیت جتلانے کے لیے کیا گیا ہے (السیوطی: الاتقان، ۳: ۲۱۶)۔ اسی طرح سورۂ حٰمٓ السجدہ میں مشرکین کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی طرف زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی بات کا منسوب کرنا (۴۱ [حٰم السجدۃ]: ۷) مؤمنین کو ادائے زکوٰۃ کی طرف راغب کرنے کے لیے کیا گیا (کتاب مذکور، ۳: ۲۱۷، ۲ تا ۲۲۲)؛ (ھ) فواصل القرآن: قرآن حکیم کی تمام آیات کو ایک خاص نہج پر ختم کیا گیا؛ ان کو فواصل قرآن یا خواتم الآیات کہا جاتا ہے۔ عام طور پر نثر میں جملوں کو ایک نسق پر چلانا ممکن نہیں ہوتا، خاص طور پر ایک مدلل و مفصل گفتگو میں تو یہ اور بھی مشکل ہو جاتا ہے، مگر قرآن حکیم کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ اس میں تمام آیات کو ایک خاص انداز پر ختم کیا گیا جس سے آیات قرآنیہ میں ایک نظم، تسلسل اور روانی نظر آتی ہے۔

علما نے فواصل آیات کو چار اقسام پر تقسیم کیا ہے: (۱) تمکین؛ (۲) التصدیر؛ (۳) التوشیح اور (۴) ایغال؛ ان میں سے ہر ایک کا جدا جدا اصول ہے (دیکھیے الاتقان، ۳: ۲۳۵ بعد)۔ یہ فواصل اس پائے کے ہیں کہ محض ان کے جاننے سے پوری آیت کا مضمون سامنے آ جاتا ہے اور اگر ان میں سے کوئی لفظ ادھر ادھر ہو جائے تو اس کا فوراً اندازہ ہو جاتا ہے۔ امام السیوطیؒ نقل فرماتے ہیں کہ ایک بدو نے ایک شخص کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا: فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۲ [البقرۃ]: ۲۰۹) جسے، قاری نے عزیز حکیم کے بجائے غفور رحیم پر ختم کیا؛ یہ اعرابی فوراً بول اٹھا کہ اللہ کے کلام میں ایسا نہیں ہو سکتا، بعد میں تحقیق کی گئی تو اعرابی کا گمان درست نکلا (الاتقان، ۳: ۲۳۷)۔

(و) الفاظ سے معانی پر دلالت: قرآن حکیم میں مختلف مقامات پر جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، ان میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں کہ اگر ذرا سا ذوق لطیف ہو تو قاری محض لفظوں کی مدد سے ان کے مطالب تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔

(ز) بدائع و صنائع: قرآن حکیم کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بدائع اور صنائع کا بکثرت استعمال کیا گیا ہے، یعنی ان لفظی و معنوی اصولوں کا، جن کی وجہ سے کوئی کلام درجۂ کمال کو پہنچتا ہے؛ چند مثالیں

حسب ذیل ہیں: (۱) امام السیوطی سورۃ ہود کی آیت: وَ قِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَ غِيْضَ الْمَآءُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ اسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَ قِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (۱۱ [ہود]: ۴۴)، یعنی اور حکم دیا گیا کہ اے زمین اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان تھم جا اور پانی خشک کر دیا گیا، اور حکم تمام ہوا اور کشتی جودی (پہاڑ) پر آ ٹھہری اور فرمایا گیا کہ دور ہوں ظالم لوگ! کی نسبت ابن ابی الاصبع کا قول نقل فرماتے ہیں کہ میں نے آج تک اس کلام کی مثال نہیں دیکھی، اس میں ۱۷ الفاظ ہیں اور بیس بدائع (الاتقان فی علوم القرآن، ۲: ۲۳۰)؛ (۲) امام السیوطیؒ نے سورۂ آل عمران کی آیت: اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۲ [البقرۃ]: ۱۷۹) پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے اور اس کے ۱۲۰ بدائع بیان کیے ہیں (کتاب مذکور)؛ (۳) الاصمعی فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے ایک لڑکی سے کچھ اشعار سنے تو ان کی تعریف کی اور کہا، اے جاریہ تم کتنی فصیح ہو! وہ کہنے لگی کہ کیا اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَ لَا تَخَافِيْ وَ لَا تَحْزَنِيْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَ جَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (۲۸ [القصص]: ۷) کے بعد بھی میرے ان اشعار کو فصاحت کہا جائے گا، کہ جس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو امر، دو نہی، دو خبریں اور دو بشارتیں ایک ہی جگہ جمع کر دی ہیں (الشفاء، ص ۱۲۸)؛ (۴) قرآن کریم میں ارشاد ہے: وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ (۲ [البقرۃ]: ۱۷۹)، یعنی اور تمہارے لیے قصاص میں ہی زندگی کا راز مضمر ہے۔ امام السیوطی کے بقول اس میں بیس صنائع ہیں۔ صرف چند آیات پر ہی موقوف نہیں، قرآن حکیم کی تمام آیات اسی نسق و نہج کی بلاغت پر مشتمل ہیں (تفصیلات کے لیے دیکھیے: السیوطی: الاتقان فی علوم القرآن، ۲: ۲۸۳ تا ۳۳۱، فی بدائع القرآن؛ الزرکشی: الاعلام فی علوم القرآن؛ مختصر المعانی؛ الباقلانی: اعجاز القرآن، مطبوعۂ قاہرہ، طبع سید احمد صقر؛ عبد القاہر الجرجانی: دلائل الاعجاز، مطبوعۂ قاہرہ)۔

(ج) تکرار آیات و قصص: عام طور پر الفاظ اور واقعات کا بار بار تکرار ذوق لطیف پر گراں گزرتا ہے، مگر قرآن حکیم کی ایک منفرد خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں بہت سے مقامات پر الفاظ و تراکیب کا اعادہ کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہاں حسن و لطافت میں کمی آنے کے بجائے اضافہ ہوا ہے، مثلاً سورۃ الرحمٰن میں آیت فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ، یعنی پس تم میری کون کون سی نعمتوں کا انکار کرو گے، کا اکتیس (۳۱) بار، سورۃ المرسلٰت میں وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ کا دس مرتبہ، سورۃ الشعراء میں آیت: اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ کا آٹھ مرتبہ اور سورۂ قمر میں آیت: وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (یعنی اور ہم نے قرآن سمجھنے کے لیے آسان کر دیا ہے تو کوئی ہے جو سمجھے) کا چار مرتبہ تکرار کیا گیا ہے، مگر اس کے باوجود ان مقامات پر حسن و بلاغت میں کمی کے بجائے اضافہ ہوا ہے اور ہر جگہ ان آیات کے تکرار نے نئے معانی پیدا کیے ہیں۔ الفاظ کے تکرار کے ساتھ ساتھ اکثر جگہ مضمون کا تکرار بھی کیا گیا ہے، مگر ہر جگہ کوئی نہ کوئی نیا نکتہ پیدا ہوتا ہے اور تکرار و تشابہ کے باوجود مضمون کی وسعت و گہرائی میں فرق نہیں آنے دیا گیا (دیکھیے السیوطی: الاتقان، ۳: ۲۲۳ تا ۲۳۳)۔ علامہ السیوطی کے مطابق البدر بن جماعہ

نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب (المقتنص فی فوائد تکرار القصص) تصنیف کی، جس میں قصص کو بار بار دہرانے کے فوائد بیان کیے گئے ہیں (الاتقان، ۴ : ۲۳۰).

(۲) جامعیت و کاملیت : الفاظ و حروف کی اس درجہ فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم کی ایک نمایاں خصوصیت اس کی جامعیت و کاملیت بھی ہے یہ شرف آج تک دنیا کی کسی کتاب کو حاصل نہیں ہوا ۔ جامعیت کے سلسلے میں ارشاد باری ہے : وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ (۱۷ [بنی اسرائیل] : ۸۹)، یعنی اور ہم نے اس قرآن میں سب باتیں طرح طرح سے بیان کر دی ہیں، مگر اکثر لوگوں نے انکار کے سوا قبول نہ کیا : دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا : وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا (۲۵ [الفرقان] : ۳۳)، یعنی اور یہ لوگ تمھارے پاس جو اعتراض کی بات لاتے ہیں، ہم تمھارے پاس اس کا معقول اور مشرح جواب بھیج دیتے ہیں ۔ اسی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا : علیکم بھذا القرآن فما وجدتم فیہ من حلال فاحلوہ و ما وجدتم فیہ من حرام فحرموہ (ابو داؤد، ۵ : ۱۱، حدیث ۴۶۰۵؛ الترمذی ۲۶۶۶؛ ابن ماجہ، حدیث ۱۲)، یعنی تم کتاب اللہ کو مضبوطی سے پکڑ لو، جو اس میں حلال ٹھیرایا گیا ہے اس کو حلال اور جو حرام قرار دیا گیا ہے اس کو حرام جانو ۔ اگر کتاب اللہ میں کوئی کمی رہ گئی ہوتی تو یہ دعوی ہرگز نہیں کیا جا سکتا تھا : واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ہر دینی، مذہبی، عائلی، خاندانی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی و اقتصادی مشکلات کا تسلی بخش حل اس کتاب میں مذکور ہے، اس لیے یہ کتاب ایک منشور اور دستور حیات کی حیثیت رکھتی ہے ؛ البتہ اس کتاب کے اشارات و تلمیحات اور اس کے کنایات و مجازات کو سمجھنے کے لیے مہبط وحی نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ارشادات کو سامنے رکھنا اشد ضروری ہے اور خود قرآن مجید کی تصریحات کے مطابق، یہ تعلیمات نبوی حیطۂ قرآن سے باہر نہیں، بلکہ اسی کے اندر ہیں ۔ اسی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا : میں تم میں دو بنیادی چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، اگر تم ان کو مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے اور وہ ہیں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ (البخاری) ۔ اس جامعیت کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کی کاملیت کا یہ عالم ہے کہ سورۃ المائدہ میں ارشاد باری ہے : اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۵ [المائدہ] : ۳)، یعنی آج ہم نے تمھارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمھارے لیے دین اسلام پسند کیا ۔ یہ خصوصیت صرف اور صرف قرآن حکیم کو حاصل ہے کہ اس پر اتمام دین ہوا، ورنہ پہلی امتیں اس خوش خبری سے محروم رہیں ۔ امام بخاری (۳ : ۲۳۳، مطبوعۂ لائڈن) نے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں ایک یہودی حاضر ہوا ؛ اور اس نے آ کر عرض کیا کہ اے عمرؓ! تم اپنی کتاب میں ایسی آیت پڑھتے ہو جو اگر ہم پر نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس دن کو جشن عید کی طرح منایا کرتے ۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا : مجھے معلوم ہے کہ وہ کون سی آیت ہے ؛ کون سے دن اور کون سے مقام پر نازل ہوئی ۔ القصہ، قرآن حکیم جامع و مانع بھی ہے اور کامل و مکمل بھی ۔ اب اس کتاب میں نہ کمی کی گنجائش ہے اور نہ اضافے کی ۔ قرآن حکیم کا یہ اتمام و اکمال

اس کا عظیم معجزہ ہے۔

(ب) عدم تناقض و تعارض: قرآن حکیم کے مضامین میں اس وسعت و تنوع کے باوجود اس کے مضامین میں کسی جگہ تعارض و تناقض نہیں ہے، بلکہ قرآن کریم کی آیات ایک دوسری کی تصدیق و تفسیر کرتی ہیں (القرآن یفسر بعضها بعضاً)۔ قرآن حکیم میں ایک واقعہ بعض اوقات ایک سے زائد مرتبہ بیان ہوا ہے، ہر چند کہ موقع و محل اور سیاق و سباق مختلف ہیں، مگر اس کے باوجود اصل واقعے اور اس کے متعلقات میں خفیف سا بھی کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ اس کے ساتھ یہ بھی پیش نظر رہے کہ یہ قرآن ایک موقع کی تصنیف نہیں، بلکہ اس کا نزول تئیس سال کے عرصے میں پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔ اس کا آغاز غار حرا کے گوشۂ تنہائی سے ہوا اور تکمیل حجّۃ الوداع کے موقع پر ہزاروں کے مجمع میں ہوئی؛ اس کے باوجود اس کے معانی میں کسی باریک سے باریک فرق کو بھی محسوس نہیں کیا جا سکتا (آیات متشابہات کی وضاحت کے لیے دیکھیے السیوطی: الاتقان، ۲: ۳۹۰ تا ۳۹۶)۔

(ج) انتشار مطالب: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ قرآنی علوم و معارف پانچ انواع پر منقسم ہیں: علم الاحکام؛ (۲) علم المخاصمۃ؛ (۳) علم التذکیر بآلاء اللہ (۴) علم التذکیر بایام اللہ؛ (۵) علم التذکیر بالموت و ما بعدہ (الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص ۱ تا ۲، مطبوعۂ لاہور، ۱۳۷۱ھ)، جس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن حکیم اس بات کی رعایت نہیں کرتا کہ اس سورۃ میں یا اس حصے میں صرف فلاں قسم کے مضامین مذکور ہوں گے اور دوسری نوع کے دوسری سورت میں، اس کے برعکس ایک ہی سورۃ میں یکے بعد دیگرے متعدد قسم کے مضامین مذکور ہوئے ہیں۔ مضامین کے اس تنوع کے وجود نہ تو مضمون کے تسلسل اور روانی میں کوئی فرق آتا ہے اور نہ ہی قاری کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب پرانے موضوع کی جگہ نیا موضوع شروع ہو رہا ہے، حالانکہ اگر کسی دوسری کتاب میں یہ انداز بیان اختیار کیا جائے تو یقیناً گراں گزرے۔ معانی اور مضمون کے انتشار کے ساتھ الفاظ و انداز بیان بھی بدلتے رہتے ہیں: ابھی صیغۂ غائب ہے تو ابھی حاضر، ابھی حاضر ہے تو ابھی متکلم، مگر ان سب کے باوجود معانی کی لذت دوبالا ہوتی ہے (دیکھیے مختصر المعانی، وغیرہ)۔ یہ قرآن حکیم کی چند خوبیاں ہیں، [اس موضوع پر تفصیل کے لیے رک بہ قرآن]۔ واقعہ یہ ہے قرآن مجید کی ہر آیت بلکہ ہر سطر میں ایسے ایسے ظاہری اور معنوی محاسن پوشیدہ ہیں کہ جنھیں محسوس تو کیا جا سکتا ہے، مگر بیان نہیں کیا جا سکتا! اس کی حلاوت شعوری اور ادراکی بھی ہے اور وجدانی بھی۔

ان سب خصوصیات کے جمع ہونے سے قرآن مجید ایک ایسے کلام کے طور پر دنیا میں موجود ہے جس کا کوئی ثانی و مثیل نہیں اور بار بار کے اعلانات کے باوجود دنیائے کفر انفراداً اور نہ اجماعاً اس کی کوئی نظیر پیش کر سکی (دیکھیے نیچے پیش گوئیاں)۔ یہ تمام کی تمام خوبیاں کسی انسان کے کلام میں جمع نہیں ہو سکتیں، بلکہ ضرور ہے کہ ان کے پیچھے کوئی غیر معمولی قوت کام کر رہی ہو؛ یہ قوت وحی کی قوت ہے، جو کسبی نہیں بلکہ وہبی حقیقت ہے۔

(۳) اخبار غیب: قرآن حکیم کی تیسری خصوصیت اس میں غیب کی خبروں کا بکثرت ہونا ہے، چنانچہ ارشاد باری ہے: تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ

قَبْلِ هٰذَا (١١ [هود]: ٤٩)، یعنی یہ (حالات) منجملہ غیب کی خبروں کے ہیں، جو ہم تمہاری طرف بھیجتے ہیں اور اس سے پہلے نہ تم ہی ان کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم ہی ان سے واقف تھی۔ دوسری جگہ فرمایا: ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ (٣ [آل عمران]: ٤٤)، یعنی (اے محمدؐ) یہ باتیں اخبار غیب میں سے ہیں، جو ہم تمہارے پاس بھیجتے ہیں، اور جب وہ لوگ اپنے قلم (بطور قرعہ) ڈال رہے تھے کہ مریم کا متکفل کون ہو؟ تو اس وقت آپ ان کے پاس نہیں تھے۔

قرآن حکیم میں مندرج اخبار غیب کو دو اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے: (الف) اخبار ماضیہ اور (ب) اخبار مستقبلہ: (الف) اخبار ماضیہ: آپؐ چونکہ اُمّی محض تھے (دیکھیے بالا)، اس لیے آپؐ کی زبان سے ان خبروں کا ادا ہونا، گو وہ کسی سابقہ کتاب میں بھی موجود ہوں، آپؐ کے لیے علم غیب پر اطلاع کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ضمن میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں ان کی تین اقسام ہیں: (١) سابقہ کتب کی مطابقت؛ (٢) سابقہ کتب کی مخالفت؛ (٣) بالکل نئے واقعات؛ تفصیل حسب ذیل ہے: (١) سابقہ کتب کی مطابقت: نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اُمّی ہونے کے باوجود بعض ایسے واقعات کی خبریں دیں جو موازنہ کرنے پر کتب سابقہ میں بھی ہو بہو ویسے ہی پائے گئے، مثلاً دیکھیے یوسف علیہ السلام، موسی علیہ السلام، وغیرہ کے واقعات۔ اس قسم کے واقعات کی متعدد اہل کتاب نے نہ صرف تصدیق کی ہے بلکہ آپؐ کی رسالت و نبوت کی گواہی بھی دی (مثلاً عبداللہ بن سلام، کعب احبار، وہب بن منبہ وغیرہ)۔ متعدد مواقع پر ایسا بھی ہوا کہ یہودیوں نے خود یا مشرکین کے ذریعے اپنی سابقہ کتب میں مذکور کسی خاص واقعے کی نسبت استفسار کیا اور یہ ظاہر کیا کہ ان واقعات کی اطلاع کسی نبی کے سوا اور کسی کو نہیں ہو سکتی، مثلاً روح کی نسبت (١٧ [بنی اسرائیل]: ٨٥)، اصحاب کہف (١٨ [الکہف]: ٩ تا ٢٦) اور ذوالقرنین (١٨ [الکہف]: ٨٣ ببعد) کے متعلق استفسارات (ابن ہشام: السیرۃ النبویۃ، ١: ٣٠٥ تا ٣٣٥، بعنوان: ما دار بین رسول اللہؐ و بین رؤساء قریش و تفسیر سورۃ کہف): (٢) کسی سابقہ کتاب میں بیان کیے گئے واقعے کی اصلاح: قرآن حکیم نے صرف اہل کتاب کے موافق ہی واقعات بیان نہیں کیے، کہ یہ کہا جا سکے یہ تو ان کی ہو بہو نقل ہے، بلکہ اکثر و بیشتر ان کتابوں میں مذکور غلط بیانیوں اور تحریفات و ترمیمات کی وضاحت بھی فرمائی ہے، مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام کی جادوگری اور بت پرستی کی نسبت یہودیوں کے خیال کی تردید (٢ [البقرۃ]: ١٠٢)، جادو کے من جانب اللہ نازل ہونے کی تردید (٢ [البقرۃ]: ١٠٢)؛ آدم علیہ السلام کی غلطی کی تردید، اس کی جگہ نسیان کا نظریہ پیش کیا (٢٠ [طٰہٰ]: ١١٥)؛ ابراہیم علیہ السلام کے یہودی یا عیسائی ہونے کی تردید (٣ [آل عمران]: ٦٧)؛ عیسٰی علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے کی تردید (٢٠ [طٰہٰ] ٨٨، ٩٣)۔ ظاہر ہے کہ یہ تردید کوئی بھی شخص محض اپنی عقل اور سوجھ بوجھ سے نہیں کر سکتا، خاص طور پر اس لیے بھی کہ جب مقابلے پر دنیا کے دو مقبول ترین اور قدیم ترین مذہب ہوں۔ آپؐ کو اپنے ان دعووں پر یہاں تک اعتماد اور یقین تھا کہ آپؐ کی طرف سے انہیں کہا گیا: قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ (٣ [آل عمران]: ٩٣)، یعنی اگر میری بات غلط ہے اور تم سچے ہو تو تورات لے آؤ، اسی طرح نصارائے نجران

کو مباہلے [رک باں] کی دعوت دی گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ حالت اذعان و یقین اسی کو نصیب ہو سکتی ہے جس کے پاس کوئی مافوق البشری ذریعۂ معلومات ہو اور وہ وحی ہے۔ اسی لیے ارشاد فرمایا: قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ (۱۸ [الکہف]: ۱۱۰)، یعنی آپؐ کہہ دو کہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں، (البتہ) میری طرف وحی آئی ہے۔

(۳) نئے واقعات کا بیان: قرآن حکیم صرف سابقہ کتب میں مذکورہ واقعات کی موافقت یا مخالفت ہی نہیں کرتا، بلکہ بعض نئے واقعات بھی بیان کرتا ہے جن کے ذکر سے کتب سابقہ کے اوراق خالی ہیں، مثلاً ملاے اعلٰی میں آدمؑ کی خلافت کے متعلق فرشتوں کا تبصرہ، قوم عاد (عاد ارم، عاد اولٰی)، قوم ثمود کے حالات، سیل عرم کا عظیم الشان واقعہ، فرعون کے غرق کے بعد کچھ عرصے کے لیے مصر میں یہودیوں کی حکومت کا قیام، عیسٰی علیہ السلام کے کارنامے، حضرت مریمؑ کے اقنوم ہونے کا غلط تصور، خانہ کعبہ کا سب سے پہلے تعمیر ہونا، ہر قوم میں الگ الگ انبیا کا آنا، آنحضرتؐ کا خاتم النبیین ہونا وغیرہ (دیکھیے قاضی سلیمان سلمان منصور پوری: رحمة للعالمین، ۳: ۳۲۵ تا ۳۲۶)۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن حکیم کا ماخذ و مصدر کتب سابقہ ہرگز نہیں، بلکہ ان سے اور سب انسانی حواس و ذرائع سے بھی برتر کوئی ذریعہ ہے، اور یہ ذریعہ صرف اور صرف وحی الٰہی ہی ہو سکتا ہے۔

(ب) اخبار مستقبلہ: قرآن حکیم میں نہ صرف پچھلی امتوں اور پیغمبروں کے حالات و واقعات سے آگاہ کیا گیا ہے، بلکہ آئندہ زمانے کی نسبت بھی ایسی اہم پیشین گوئیاں کی گئی ہیں جو قرآن حکیم کے من جانب اللہ ہونے کی زبردست شہادت ہے: حسب ذیل چند پیشین گوئیاں ملاحظہ فرمائیے:

(۱) غلبۂ روم کی پیشین گوئی: یہ پیشین گوئی سب سے حیرت انگیز ہے۔ بعثت نبوی کے پانچویں سال، تقریباً ۶۱۵ – ۶۱۶ء میں جب کہ ایرانیوں کے مقابلے میں رومیوں کی شکست کا آغاز ہو چکا تھا۔ سورۂ روم میں یہ پیشین گوئی کی گئی کہ اگرچہ اہل روم اب مغلوب ہو رہے ہیں، مگر چند ہی سالوں میں (بضع سنین=۹ سالوں؛ دیکھیے ترمذی، ۵: ۳۴۲ تا ۳۴۳، حدیث ۳۱۹۱) میں دوبارہ غالب ہوں گے (۳۰ [الروم]: ۲ تا ۴)۔ اس لڑائی میں جو روم پر اہل فارس نے مسلط کی تھی اور جس میں مسلمانوں کی ہمدردیاں اہل کتاب ہونے کی بنا پر اہل روم کے ساتھ اور مشرکین کی، اہل شرک یعنی اہل فارس کے ساتھ تھیں۔ ابتدا میں اہل روم کا بھاری جانی و مالی نقصان ہوا اور بہت سا علاقہ بھی ان سے چھن گیا۔ بظاہر حالات ایسے نہیں دکھائی دیتے تھے کہ اہل روم کو کبھی غلبہ بھی حاصل ہو سکے گا، مگر دنیا نے یہ منظر حیرت و استعجاب سے دیکھا کہ ۶۲۴ء/ ۲ھ، سال ہجرت میں رومیوں کے تن مردہ میں پھر جان پیدا ہوئی اور ۶۲۲-۶۲۳ء/ ۲ھ یعنی پیشین گوئی سے صرف ۹ سال بعد اہل روم نے ایرانیوں کو باسفورس اور نیل کے ساحلوں سے ہٹا کر دجلہ اور فرات کے کناروں تک پہنچا دیا۔ اس پیشین گوئی کے ظہور پر بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے (رحمة للعالمین، ۳: ۳۲۵)؛ (۲) غزوۂ بدر میں فتح و نصرت کی پیشین گوئی: سورۂ روم میں ارشاد ہے کہ جس روز رومیوں کی فتح کی خبر آئے گی اس روز مسلمان بھی اللہ کی مدد سے خوش ہوں گے (۳۰ [الروم]: ۴ تا ۵)؛ اسی سورت میں آگے جا کر

ارشاد فرمایا: وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ (۳۰ [الروم]: ۴۷)، یعنی اور مسلمانوں کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے؛ چنانچہ یہ دونوں پیشین گوئیاں، جو ہجرت سے تقریباً ۷ سال قبل کی گئی تھیں، سنہ ۲ھ/ ۶۲۳ - ۶۲۴ء میں حرف بحرف پوری ہوئیں۔ اسی روز غلبۂ روم کی خبر آئی اور اسی روز مسلمانوں نے دنیائے کفر کو پہلی شکست سے دو چار کیا (رحمۃ للعالمین، ۲: ۳۲۴)؛ (۳) غزوۂ احزاب میں فتح کی پیشین گوئی: سورۂ قمر میں ارشاد ہے: أَمْ يَقُولُونَ نَحْنُ جَمِيعٌ مُّنتَصِرٌ ○ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ (۵۴ [القمر]: ۴۴-۴۵)، یعنی کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ (ہماری جماعت بہت مضبوط ہے اور) ہم سب باہم مجتمع ہیں؟ عنقریب یہ جماعت شکست کھائے گی اور یہ لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔ یہ آیت مکی دور میں نازل ہوئیں۔ اس وقت کسی کے سان گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ کبھی کفار مسلمانوں کے خلاف اتنا بڑا گٹھ جوڑ قائم کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے، مگر اس سورت میں نہ صرف اس گٹھ جوڑ کی خبر دی گئی، بلکہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جانے کی بھی پیشین گوئی فرمائی؛ چنانچہ ۵ھ میں جب تمام کفار نے ایکا کرکے مسلمانوں پر یلغار کی تو اس پیشین گوئی کی صداقت آنکھوں کے سامنے آ گئی، اس طرح یہ پیشین گوئی بھی حرف بحرف پوری ہوئی؛ (۴) فتح مکہ کی پیشین گوئی: ۶ھ/ ۶۲۸ء میں آپؐ صحابہ کرامؓ کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کی نیت سے مکہ مکرمہ کو روانہ ہوئے۔ راستے میں دشمنوں نے روک لیا۔ باہمی گفت و شنید سے دس سال کے لیے ایک باہمی معاہدہ طے پا گیا۔ اس وقت کسی کو یہ خیال بھی نہیں آ سکتا تھا کہ اہل اسلام کبھی مکہ کو فتح کر سکیں گے، لیکن عین انھی دنوں سورۃ الفتح نازل ہوئی، جس میں فتح مکہ کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا: إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا (۴۸ [الفتح]: ۱)، یعنی اے محمدؐ! ہم نے آپ کو فتح دی ہے، فتح بھی صریح و صاف؛ چنانچہ اس سورۃ کے نزول کے صرف دو سال بعد مکہ مکرمہ بغیر کسی واضح خون ریزی کے فتح ہو گیا؛ (۵) فتح خیبر کی اطلاع: سورۂ فتح ہی میں فتح خیبر کی پیشین گوئی نازل ہوئی اور فرمایا: سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انطَلَقْتُمْ إِلَىٰ مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا نَتَّبِعْكُمْ (۴۸ [الفتح]: ۱۵)، یعنی عنقریب جب تم لوگ غنیمتوں کو لینے چلو گے تو جو لوگ (صلح حدیبیہ میں) پیچھے رہ گئے تھے وہ کہیں گے ہمیں بھی اجازت دیجیے کہ ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں؛ چنانچہ اگلے ہی سال، یعنی ۷ھ/۶۲۹ء میں یہ پیشین گوئی بھی پوری ہو گئی؛ (۶) اس کے علاوہ مجموعی طور پر یہ پیشین گوئی کی گئی تھی: وَإِنَّ جُندَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ (۳۷ [الصّٰفّٰت]: ۱۷۳) اور یقیناً ہمارا ہی لشکر کامیاب رہتا ہے؛ چنانچہ مسلمان اپنی تعداد اور اسلحے کی واضح کمی کے باوجود ہر جنگ میں اپنے دشمن پر غالب ہی رہے۔ ان کے مقابلے میں غیر مہذب عربوں سے لے کر روم و فارس کی متمدن سلطنتوں تک سبھی آئے، مگر سب کو ناکامی ہوئی اور اللہ کی طرف سے کی گئی یہ پیشین گوئی پوری ہو کر رہی؛ (۷) قیام خلافت اور قیام امن و امان کی پیشین گوئی: سورۂ نور میں قیام خلافت کی خبر دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ۚ (۲۴ [النور]: ۵۵)، یعنی جو لوگ تم میں سے ایمان لے آئے اور نیک کام کرتے رہے، ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا،

جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے ، مستحکم اور پائدار کرے گا اور خوف کے بعد امن بخشے گا ؛ چنانچہ یہ وعدۂ الٰہی بھی حرف بہ حرف پورا ہوا اور مسلمان نصرت اور امن و سلامتی سے شاد کام ہوے؛ مزید فرمایا : وَ یَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ (۲۷ [النمل] : ۶۲)، یعنی تمھیں زمین میں اگلوں کا جانشین بنائے گا ۔ اس آیت کے مصداق تمام مسلمان تھے ۔ اسی پیشین گوئی کا ظہور ہے کہ عہد فاروقی سے لے کر آج تک مختلف علاقوں میں ہزاروں کی تعداد میں مسلم خانوادوں نے حکومت کی ؛ (۸) اس کے علاوہ تنگ دستی کے بعد غنا کی خبر دیتے ہوے ارشاد فرمایا : وَ اِنْ خِفْتُمْ عَیْلَةً فَسَوْفَ یُغْنِیْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖۤ اِنْ شَآءَ (۹ [التوبہ] : ۲۸) ، یعنی اگر تم کو مفلسی کا خوف ہے تو خدا چاہے گا تو تم کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا ؛ چنانچہ کبھی تو تنگ دستی کا یہ عالم تھا کہ اکثر صحابہؓ بھوک سے نڈھال رہتے تھے اور پھر رزق کی فراوانی کا یہ عالم ہوا کہ غریب سے غریب صحابی بھی آرام سے زندگی گزارنے کے لائق ہو گیا ! (۹) اس کے ساتھ ہی قرآن مجید نے یہ پیشین گوئی بھی کر دی تھی کہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد غیر عرب اقوام مسلمان ہوں گی اور اسلام کی نمایاں خدمت انجام دیں گی ، ارشاد ہے : وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ (۴۷ [محمد] : ۳۸)، یعنی اگر تم منہ پھیر لوگے تو اللہ تمھاری جگہ اور لوگوں کو لے آئے گا اور وہ تمھاری طرح کے نہ ہوں گے ؛ چنانچہ دوسری صدی ہجری سے ہی سیاسی اور مذہبی قیادت غیر عربوں کے ہاتھ آ گئی اور انھوں نے اسلام کی خدمت و اشاعت میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا (۱۰) غلبۂ دین کی پیشین گوئی : قرآن حکیم کے تین مقامات پر یہ اعلان دہرایا گیا : هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ (۹ [التوبہ] : ۳۳ ؛ ۴۸ [الفتح] ، ۲۸ : ۶۱ (الصف) : ۹) ، یعنی وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبرؐ کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ وہ اس دین کو دنیا کے تمام ادیان پر غالب کرے ۔ گو ابتدا میں حالات بڑے ناسازگار تھے ، دشمنوں کی طاقت و قوت کا پلہ ہر سطح پر بھاری تھا ، مگر آہستہ آہستہ حالات بدلتے گئے اور قرآنی پیشین گوئی حق و صداقت بن کر منظر عام پر آ گئی ؛ بالآخر دوسرے وعدوں کی طرح یہ وعدۂ الٰہی بھی پورا ہوا اور چار دانگ عالم میں اسلام کی قوت و شوکت کا چرچا ہونے لگا ، لیکن اس کا قطعاً یہ مفہوم نہیں کہ اسلام کی اشاعت بزور شمشیر ہوئی ۔ کیونکہ اسلام کی اشاعت تو ان ممالک میں بھی ہوئی جہاں مسلمانوں کی شمشیر نہیں پہنچی ، مثلاً چین ، روس کے دور دراز علاقے وغیرہ مسلمانوں کی حکومت سے ہمیشہ باہر رہے ، اس کے باوجود وہاں بکثرت مسلمان پائے جاتے ہیں ؛ (۱۱) اسی سلسلے میں دوسری پیشین گوئی یہ ہے کہ اسلام کا نور مکمل ہو کر رہے گا : وَ اللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (۶۱ [الصف] : ۸)، یعنی اور اللہ تعالٰی اپنی روشنی کو پورا کرکے رہے گا ، خواہ کافر ناخوش ہی ہوں ۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب بظاہر دین اسلام کے مقصد کی تکمیل مشکل نظر آتی تھی اور صحابۂ کرامؓ کو یہ بھی میسر نہ تھا کہ وہ اطمینان سے بیٹھ کر دو وقت کا کھانا کھا سکیں؛ مگر دوسری پیشین گوئیوں کی طرح یہ پیشین گوئی بھی پوری ہوئی ؛ (۱۲) اسی سلسلے کی ایک اور پیشین گوئی قرآن حکیم کا خود کو ایک شجرۂ طیبہ سے تشبیہ دینا

بھی ہے (۱۴ [ابراھیم] : ۲۴) ، جس کا مقصد یہ ہے کہ شجر اسلام روز بروز پھلے اور بڑھتا چلا جائے گا اور ہر آنے والا دن اس کی جڑوں کو استحکام بخشنے کا ذریعہ ثابت ہوگا ؛ چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔

(۳) فتنۂ ارتداد اور اس پر قابو پانے کی پیشین گوئی : آپؐ کے وصال کے فوراً بعد ہی جزیرۂ عرب میں فتنۂ ارتداد کی ایک ایسی لہر اٹھی جس نے عرب کے بہت سے قبیلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور حالت یہ ہو گئی کہ مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کے سوا کوئی شہر اس کی لپیٹ میں آنے سے نہ بچ سکا ۔ ان نازک حالات کی بھی قرآن حکیم میں پیشین گوئی کر دی گئی تھی ، ارشاد ہے : یا ایھا الذین امنوا من یرتد منکم عن دینه فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم و یحبونه (۵ [المائدہ] : ۵۴) ، یعنی اے اہل ایمان اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو خدا ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے گا اور وہ اسے دوست رکھیں گے ؛ چنانچہ ارتداد ہوا ، مگر اس کو ختم کرنے والے بھی مخلص لوگ پیدا ہو گئے ۔

(۴) قرآن مجید کی اپنے متعلق پیشین گوئیاں : قرآن حکیم نے اپنے متعلق سات پیشین گوئیاں کی ہیں : عدم مثلیت : کہ اگر جن و انس باہم متحد اور متفق بھی ہو جائیں تو اس کی نظیر بنا کر پیش نہیں کر سکیں گے (۱۷ [بنی اسرائیل] : ۸۸) ؛ چنانچہ پہلے پورے قرآن حکیم کی (حوالۂ مذکورہ) ، پھر دس سورتوں (۱۱ [ھود] : ۱۳) ، پھر ایک سورۃ (۲ [البقرۃ] : ۲۳ ؛ ۱۰ [یونس] : ۳۸) کی مثال پیش کرنے کا چیلنج کیا گیا ، مگر باوجود اس کے کہ ان کے پاس شعرا اور فصحا کی کمی نہ تھی ، انھوں نے اس کے مقابلے میں [illegible] سب سے آخر میں یہ پیشین گوئی کی گئی : فان لم تفعلوا و لن تفعلوا (۲ [البقرۃ] : ۲۴) ، یعنی اگر ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے ۔ حافظ ابن حجر (فتح الباری ، ۶ : ۳۸۰ تا ۳۸۱) فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم کی سب سے چھوٹی سورت سورہ الکوثر ہے ، جس کی کل تین آیات ہیں ، تو اگر دنیا کے کفار باہم مل کر تین آیات کی سورت بنا کر پیش کر دیتے یا اپنے سے پیشتر زمانے کی نثر میں سے ان کی کوئی مثال تلاش کر کے پیش کر دیتے تو قرآن حکیم کی پیشین گوئی کو غلط ثابت کر سکتے تھے ، مگر وہ یا ان کے بعد آنے والے کبھی ایسا نہیں کر سکے اور نہ ہی کر سکیں گے ؛ (۵) حفاظت قرآن کریم کا وعدہ : ارشاد ہے : انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحفظون (۱۵ [الحجر] : ۹) ، یعنی ہم نے اس قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں ۔

قرآن حکیم ، اس حقیقت کے باوجود کہ پہلی کتب مقدسہ دنیا میں زیادہ عرصے تک محفوظ نہ رہ سکیں (دیکھیے رحمت اللہ کیرانوی : اظہار الحق ؛ نیز اردو ترجمہ : بائبل سے قرآن تک ، مطبوعہ کراچی مع : تقی عثمانی : مقدمہ ؛ [نیز رک بہ توریت ؛ انجیل]) ، آج تک نہ صرف صحیح و سلامت ، بلکہ اپنی اسی آب و تاب اور شکل و صورت میں کہ جس میں اس کا نزول ہوا تھا ، صفحۂ کائنات پر موجود ہے ؛ باوجود اس حقیقت کے کہ دنیا کے مختلف خطوں میں اس کے لاکھوں نسخے موجود ہیں ، مگر ان میں ایک لفظ یا ایک حرف کا بھی فرق نہیں تلاش کیا جا سکتا ؛ (۶) جمع و تدوین قرآن : ارشاد باری ہے : ان علینا جمعه و قرانه (۷۵ [القیامۃ] : ۱۷) ، یعنی اس کا جمع کرنا اور پڑھوانا ہمارے ہی ذمہ ہے ۔

[illegible] قرآن حکیم توریت کی طرح لکھا لکھایا نازل

نہیں ہوا، بلکہ یہ تئیس سال کے عرصے میں پایۂ تکمیل کو پہنچا، گو یہ تمام کلام مجید عہد نبوی ہی میں مرتب اور مدون ہو چکا تھا، لیکن چونکہ آیات کا نزول وقفے وقفے سے ہوتا رہا اور کتابت کے لیے بھی کوئی ایک شخص مقرر نہ تھا، بلکہ متعدد کاتبین وحی اس کام پر مامور تھے، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اس کی تدوین کی بڑی فکر رہتی تھی: سورۂ قیامہ کی مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ پیشین گوئی فرمائی کہ قرآن مدون و مرتب شکل میں ہمیشہ موجود اور برقرار رہے گا؛ (۱۷) حفظ کیے جانے کی پیشین گوئی: ارشاد ہے: بَلْ هُوَ آيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (۲۹ [العنکبوت]: ۴۹)، یعنی بلکہ یہ روشن آیتیں ہیں، جن کو علم دیا گیا ان کے سینوں میں (محفوظ) ہیں؛ کسی کتاب کو حفظ کرنے کا تصور ایک نیا تصور تھا۔ اہل عرب قصیدوں کو حفظ کر لیتے تھے، مگر ایک ضخیم کتاب کو حفظ کرنے کی ان کے خیال میں کوئی گنجائش نہ تھی۔ قرآن حکیم نے اعلان کیا کہ اس کتاب کو حفظ کیا جا سکے گا اور اس کو لوگ کثیر تعداد میں حفظ کریں گے۔ اس پیشین گوئی کی صداقت کسی تعارف کی محتاج نہیں؛ (۱۸) حفظ کرنا سہل ہوگا، ارشاد ہے: وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۵۴ [القمر]: ۱۷، ۲۲، ۳۲، ۴۰)؛ (۱۹) کتابت و اشاعت قرآن، ارشاد ہے: وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ○ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (۵۲ [الطور]: ۲ تا ۳)، یعنی قسم ہے اس کتاب کی جو لکھی ہوئی ہے، کشادہ اوراق میں؛ یہاں رق کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا مفہوم باریک جھلی ہے، جو عام طور پر کتابت کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ مفسرین کے مطابق، یہاں قرآن حکیم کی قسم کھائی گئی ہے، یہ قسم ایک طرح کی پیشین گوئی ہے اور اس میں یہ امر واضح کر دیا گیا ہے کہ قرآن کی نشر و اشاعت بذریعہ کتابت اور چھپائی ہمیشہ جاری رہے گی؛ (۲۰) باطل سے حفاظت کا وعدہ: ارشاد ہے: لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (۴۱ [حم السجدۃ]: ۴۲)، یعنی اس پر باطل کا اثر نہ آگے سے ہو سکتا ہے اور نہ پیچھے سے؛ بقول قاضی سلیمان سلمان منصور پوری، فلسفہ قدیم (باطل من بین یدیہ) اور فلسفہ جدید (باطل من خلفہ) نے بہت زور مارا، مگر وہ اس پر اثر انداز ہونے سے قاصر رہا (رحمۃ للعالمین، ۳: ۲۷۰ تا ۲۷۱)؛ عام مفسرین کے مطابق، اس سے مراد ہر قسم کا باطل ہے، خواہ انسانوں میں سے ہو، جنات میں سے یا کسی اور جنس سے، قرآن حکیم ہر قسم کی تحریف اور تلبیس سے محفوظ رہے گا؛ یہ ایک طرح سے حفاظت معانی قرآن کی پیشین گوئی ہے؛ یہود کے متعلق پیشین گوئیاں: (۲۱) مسلمانوں کو ان سے در پردہ سازشوں کے علاوہ، یا سب و شتم کے علاوہ کوئی نمایاں قسم کی ایذا نہ پہنچ سکے گی (۳ [آل عمران]: ۱۱۱)؛ (۲۲) ان پر ذلت و مسکنت طاری رہے گی، تاوقتیکہ وہ اللہ یا بندوں کی رسی نہ تھام لیں (۳ [آل عمران]: ۱۱۲)؛ اگرچہ اب یہودیوں نے اپنی الگ مملکت قائم کر لی ہے، مگر دنیا جانتی ہے کہ یہ حکومت پوری طرح امریکہ اور دیگر یورپین ممالک کے زیر اثر بلکہ ان کی دست نگر اور انہیں کے سہارے پر قائم ہے؛ (۲۳) موت کی تمنا نہیں کر سکیں گے، انہیں دو مقامات پر (۲ [البقرۃ]: ۹۴؛ ۶۲ [الجمعۃ]: ۶) یہ چیلنج کیا گیا کہ اگر وہ سچے ہیں تو سامنے آئیں اور موت کی تمنا کر دکھائیں، مگر انہوں نے سامنے آنے سے انکار کیا اور دنیا کی زندگی سے محبت کی تانیں بڑھاتے رہے؛ (۲۴) یہودیوں کی باہمی فرقہ بندیوں کی پیشین گوئی: ارشاد ہے:

وَ اَلقَینَا بَینَھُمُ العَدَاوَۃَ وَ البَغضَآءَ اِلٰی یَومِ القِیٰمَۃِ (۵ [المائدہ] : ۶۴)، یعنی ہم نے ان کے درمیان باہمی بغض و عداوت قیامت تک کے لیے ڈال دیا ہے ؛ چنانچہ اسی کا یہ اثر ہے کہ اس وقت بھی یہودیوں میں دو مختلف کتب (سامریہ ، یونانیہ) موجود ہیں اور ہر کتاب کے پیرو کار دوسرے کو کافر خیال کرتے ہیں : (۵ ۲) نصاری کے متعلق پیشین گوئیاں : نصاری کی بابت بھی یہ پیشین گوئی فرمائی گئی کہ ان کے آپس میں بھی قیامت تک دشمنی اور عداوت قائم رہے گی (۵ [المائدہ] : ۱۴) ؛ اس کی صداقت کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اب تک عیسائیوں میں دو متوازی چرچ چلے آتے ہیں ، ہر ایک میں کئی فرقے ہیں اور ہر ایک دوسرے کی تکفیر کرتا ہے ۔

(۵) احوال آخرت کا بیان : قرآن حکیم میں صرف دنیا کے ماضی اور مستقبل کے حالات ہی بیان نہیں کیے گئے ، بلکہ اس میں اُس زندگی کے احوال بھی زیر بحث لائے گئے ہیں جسے عالم آخرت سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔

آخرت کی زندگی کا کم و بیش بنیادی تصور تو ہر مذہب میں موجود ہے ، مگر اس کی مکمل اور صحیح شکل و صورت صرف قرآن مجید ہی میں بیان کی گئی ہے ۔ قرآن حکیم عالم برزخ سے لے کر ، صور پھونکنے ، روز قیامت کے برپا ہونے ، نامۂ اعمال کے ہاتھوں میں تھمائے جانے ، خداوند ذوالجلال کے فرشتوں کے جلو میں نزول اجلال فرمانے ، پھر ہر شخص سے حساب و کتاب لیے جانے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق جزا و سزا دیے جانے ، جنت کے انعامات اور دوزخ میں دوزخیوں پر گزرنے والے احوال تک ہر ایک کیفیت اور حالات کی تفصیلی خبر دیتا ہے ؛ اس بنا پر بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن نے عالم آخرت کا پہلی مرتبہ ایک مکمل نقشہ پیش کیا اور اس کی کیفیات سے پہلی دفعہ بنی نوع انسان کو آگاہ کیا ۔ پھر لطف یہ ہے کہ یہ سب احوال اس انداز اور لب و لہجے میں ارشاد ہوئے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ کیفیات اس کتاب کے نازل کرنے والے کے سامنے ہیں اور وہ ان احوال کی جزئیات تک سے آگاہ ہے ۔ کوئی پہلو اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے ، مثلاً ایک جگہ ارشاد ہے : وَ لَو تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُونَ فِی غَمَرٰتِ المَوتِ وَ المَلٰٓئِکَۃُ بَاسِطُوۤا اَیدِیھِم ۚ اَخرِجُوۤا اَنفُسَکُم (۶ [الانعام] : ۹۳) ، یعنی اور کاش تم ان ظالم ، یعنی مشرک ، لوگوں کو اس وقت دیکھو جب یہ موت کی سختیوں میں مبتلا ہوں اور فرشتے ان کی طرف (عذاب کے لیے) ہاتھ بڑھا رہے ہوں کہ نکالو اپنی جانیں ؛ ایک اور مقام پر ارشاد ہے : وَلَو تَرٰۤی اِذِ المُجرِمُونَ نَاکِسُوا رُءُوسِھِم عِندَ رَبِّھِم ؕ (۳۲ [السجدۃ] : ۱۲)، یعنی اور (تم تعجب کرو) جب دیکھو کہ گنہگار اپنے پروردگار کے سامنے سر جھکائے ہوں گے ۔ اس قسم کے دو چار نہیں سینکڑوں مقامات ہیں ، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ سنی سنائی باتیں نہیں ، بلکہ ٹھوس حقائق ہیں ، جو کھلی ہوئی کتاب کی طرح قرآن مجید کے نازل کرنے والے کے سامنے ہیں ۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ عرب کے ایک امیؐ ، جس نے نہ کبھی کسی سے پڑھنا سیکھا اور نہ پرانے مذہب کی کتابوں اور تاریخ سے کوئی واقفیت بہم پہنچائی ، وہ ان تمام احوال اور کیفیات کی اس جامع پیرائے میں خبر دے کہ یہ محسوس ہو کہ یہ کانوں کا سماع نہیں آنکھوں دیکھا بیان ہے ۔ یہ تبھی ممکن ہے جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آپؐ پر یہ کتاب اللہ رب العزت نے نازل فرمائی ہے ، اور آپؐ مہبط وحی اور مرکز فیوضات الٰہیہ

ہیں اور قرآن کے نازل کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے جو عالم الغیب اور خالق کائنات ہے۔ الغرض احوال آخرت کے بیان سے بھی قرآن حکیم کے من جانب اللہ ہونے کی توثیق و تصدیق ہوتی ہے۔

(۶) احکام اسلام: اعجاز قرآن کا سب سے بڑا ثبوت اس میں بیان شدہ احکام و قوانین ہیں۔ یہ احکام جس طرح تشکیل دیے گئے ہیں اور جس طرح انہیں ایک باہمی مربوط و منظم شکل میں پیش کیا گیا ہے اور جس طرح ایک فرد کی انفرادی سطح سے لے کر اجتماعی سطح پر قیام مملکت تک کی تمام ضرورتوں اور تقاضوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے، اور جس طرح ان احکامات کے سلسلے میں تدریجی پیش رفت کو ملحوظ رکھا گیا ہے، یہ سب کچھ انسانی طاقت و قوت سے باہر ہے اور یہ اعجاز قرآنی کا ایک روشن پہلو ہے۔ کسی ایک فرد کے لیے، جو امی بھی ہو، ہرگز یہ ممکن نہیں کہ وہ اس طرح کے احکام و قوانین وضع کرکے پیش کر سکے، جن میں آفاقیت اور ابدیت کے تمام تقاضے ملحوظ رکھے گئے ہوں، جو ہمیشہ اقوام کی عادتوں اور طبائع سے یکساں مناسبت رکھتے ہوں۔ پھر ان میں طبع سلیم کی جو رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے اور جو ہر جگہ یکساں طور پر دکھائی دیتی ہے وہ اس بات کا قوی ترین ثبوت ہے کہ اس کتاب کو کسی انسان نے مرتب نہیں کیا۔ اسلام کے ان احکام کا اگر دوسری ملتوں اور قوموں کے احکام و قوانین سے موازنہ کیا جائے تو یقیناً ترجیح کا پہلو قرآن کے لیے ہی نکلتا ہے (دیکھیے: رحمت اللہ کیرانوی: بائبل سے قرآن تک، مطبوعۂ کراچی؛ فرانسس موکائیے: بائبل قرآن اور سائنس (اردو ترجمہ)، مطبوعہ کراچی)۔ اسلام نے ہر مسئلے میں ایسے احکامات دیے ہیں جو کسی جغرافیائی یا علاقائی سطح تک محدود نہیں، بلکہ ان کی وسعت پورے کرۂ ارضی کو محیط ہے، مثلاً اسلام کا تصور توحید، رسالت، معاد، عبادات، معاملات اور جزا و سزا وغیرہ۔ اسی لیے قرآن حکیم میں یہ دعوٰی کیا گیا: قُلْ فَاْتُوْا بِکِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ ھُوَ اَھْدٰی مِنْھُمَآ اَتَّبِعْہُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۲۸ [القصص]: ۴۹)، یعنی کہ دو کہ اگر تم خدا کے پاس سے کوئی کتاب لے آؤ جو ان دونوں کتابوں سے بڑھ کر ہدایت کرنے والی ہو، تاکہ میں بھی اس کی پیروی کروں، تو تم سچے ہوگے۔

قرآن حکیم کو یہ غیر معمولی شرف حاصل ہے کہ ایک طرف اس کے احکام و اوامر آفاقی اور ابدی نوعیت کے ہیں اور دوسری طرف اس میں ہر قسم کی طبائع انسانی کے جذبوں، امنگوں اور تصورات کا بڑے ہی جامع انداز میں لحاظ رکھا گیا ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے جس میں ان پڑھ دیہاتی سے لے کر ترقی یافتہ دنیا کے ایک مہذب ترین فرد تک کے لیے احکام اور قوانین موجود ہیں۔

پھر اس کتاب میں بعض ایسے احکام بھی ہیں جو آج سے چودہ سو سال پہلے اس وقت نازل ہوئے جب دنیا اس کے مفہوم کو سمجھنے سے قاصر تھی، مگر آج ان کی اہمیت اچھی طرح واضح ہو چکی ہے، مثلاً حقوق و مراعات میں تمام انسانوں اور تمام قوموں کی برابری (۴۹ [الحجرات]: ۱۳)، استحقاق و اہلیت کا معیار کسب ہے نہ کہ حسب و نسب (۴ [النساء]: ۷)، حرمت و حریت انسانی (۱۷ [بنی اسرائیل]: ۷۰)؛ عورتوں کی وراثت میں شرکت (۴ [النساء]: ۱۱)، آزادی غلامان کا عالم گیر تصور (۹۰ [البلد]: ۱۳)، غربا و مساکین کو ان کو حق دینا (۵۱ [الذاریات]: ۱۹)؛ یہ اصطلاح صدقہ و خیرات دینے سے وسیع

مفہوم رکھتی ہے) اور نوع بنی انسان کے حقوق وغیرہ۔ یہ وہ چند نکات ہیں جن کو وسعت دینے سے موجودہ زمانے میں بین الاقوامی سطح پر حقوق انسانی کا ایک منظم و مربوط نظام تشکیل دیا گیا۔

قرآن حکیم کا ایک نمایاں اعجاز واقعات، احکام اور مسائل میں اس کی گہری حقیقت پسندی بھی ہے۔ اس کتاب مبین میں ہر جگہ اور ہر مقام پر انسانوں کو فطرت اور حقیقت سے روشناس کرایا گیا ہے اور یوں تخیل پرستی کے بجائے حقیقت پسندی کے جذبے کو تقویت دی ہے اور کائنات کی وسعتوں میں موجود حقائق جاننے کی طرف رغبت دلائی گئی ہے (مثلاً دیکھیے ۲ [البقرۃ]: ۱۶۴؛ ۳ [آل عمران]: ۱۸۹، تا ۱۹۵)؛ انسانوں کو غیر حقیقی تصورات سے ہٹا کر موجودہ وقت یعنی حال پر توجہ دینے کی طرف راغب کیا گیا (اسلام کے مختلف احکام پر عقلی و نقلی بحث کے لیے دیکھیے: قاضی سلیمان سلمان منصور پوری: رحمۃ للعالمین، ۳: ۲۲۷ تا ۲۴۰)۔

(۷) قرآن حکیم کے اثرات و برکات: کسی کتاب کو جانچنے اور اس کے معیار کو پرکھنے کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کتاب کا پڑھنے اور سننے والوں پر اثر کس قسم کا ہوتا ہے۔ قرآن مجید خود اپنی نسبت خبر دیتے ہوئے بیان کرتا ہے: اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِیۡثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِہًا مَّثَانِیَ تَقۡشَعِرُّ مِنۡہُ جُلُوۡدُ الَّذِیۡنَ یَخۡشَوۡنَ رَبَّہُمۡ ۚ ثُمَّ تَلِیۡنُ جُلُوۡدُہُمۡ وَ قُلُوۡبُہُمۡ اِلٰی ذِکۡرِ اللّٰہِ ؕ (۳۹ [الزمر]: ۲۳)، یعنی خدا نے نہایت اچھی باتیں نازل فرمائی ہیں، (یعنی) کتاب جس کی آیتیں (باہم) ملتی جلتی (ہیں) اور دہرائی جاتی (ہیں) جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں ان کے بدن کے (اس سے) رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، پھر ان کے بدن اور دل نرم (ہو کر) خدا کی ذات کی طرف (متوجہ) ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ وَ اِذَا تُلِیَتۡ عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتُہٗ زَادَتۡہُمۡ اِیۡمَانًا (۸ [الانفال]: ۲)، یعنی مؤمن تو وہ ہیں کہ جب خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے۔

اس لحاظ سے قرآن حکیم واحد آسمانی کتاب ہے جس نے تاریخ انسانیت پر گہرے، انمٹ اور لازوال اثرات چھوڑے ہیں۔ قرآن حکیم کے ذریعے نہ صرف اشاعت اسلام ہوئی، بلکہ اسلام قبول کرنے والوں میں اخلاق و معاشرتی، سماجی اور مذہبی اقدار کو استوار رکھنا، آزادی و غلامی، ترقی و تنزل، الغرض ہر دور میں ان کے ذہنی جذبے (Morale) کو نہ صرف بلند رکھنا بلکہ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے پر آمادہ کرنا، قرآن حکیم کا ایک نمایاں اعجاز ہے۔ اگر مسلمانوں کے پاس یہ کتاب نہ ہوتی، تو شاید دنیا میں ان کی آج وہ علمی اہمیت نہ ہوتی جو دیکھنے میں آ رہی ہے۔

نہ صرف مسلمانوں، بلکہ اکثر اوقات غیر مسلموں پر اس کے سننے سے واضح اثرات دیکھنے میں آئے (مثلاً دیکھیے، ابن سعد: الطبقات، جلد اول؛ ابن ہشام: السیرۃ النبویہ؛ البلاذری: انساب الاشراف، ج ۱؛ الطبری: تاریخ، وغیرہ)۔ کسی انسانی کتاب کے اتنے مثبت نتائج کبھی نہیں نکلے اور نہ ہی نکل سکتے ہیں، اس لیے اثرات و برکات کی اس آفاقیت سے بھی اعجاز قرآن کا ایک نمایاں پہلو سامنے آتا ہے۔

(۵) سیرت طیبہ: آپؐ کی سیرت طیبہ بھی دیکھنے والوں کے لیے ایک بہت بڑے معجزے کی حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ آپؐ جن جن مراحل سے گزرے: عقل باور نہیں کرتی کہ کوئی شخص تائید ایزدی کے بغیر، ان مراحل سے کامیابی سے گزر سکتا ہے: آپؐ ابھی شکم مادر میں تھے کہ سایۂ پدری سے محروم ہوگئے؛ چھے سال عمر ہوئی تو والدہ اللہ کو پیاری ہوگئیں؛ آٹھ سال کے ہوئے تو پیارے دادا آپؐ کو داغ مفارقت دے گئے۔ پھر آپؐ نے اپنے چچا ابو طالب کے زیر کفالت پرورش پائی۔ ان حوادث نے آپؐ میں ناداری کا احساس پیدا کر دیا! چنانچہ آپؐ کو روزی کمانے کے لیے پہلے کھلے آسمانوں تلے بکریاں چرانا پڑیں اور پھر تجارت کا پیشہ اپنانا پڑا، تا آنکہ حضرت خدیجہؓ سے رشتۂ مناکحت استوار ہو گیا۔ چونکہ یتیم کی دیکھ بھال میں عام طور پر کوتاہی ہو جاتی ہے اور پھر اگر یتیم مال و دولت سے بھی محروم ہو تو اس کی حالت اور بھی کسمپرسی کی ہوتی ہے اسی بنا پر یتیم بچوں کے بننے کی نسبت بگڑنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اس پر معاشرتی اور سماجی برائیاں اور گمراہیاں اور اخلاقی بے راہ روی مستزاد تھی۔ پورے جزیرۃ العرب میں بد عملی اور بدکرداری کا دور دورہ تھا۔ لوگ علانیہ جرم کرتے اور پھر ان جرائم پر فخر کا اظہار کرتے (دیکھیے مثلاً امرؤالقیس کا معلقہ)۔ خود آپؐ کے دوست ساتھی اکثر گانے بجانے کی مجلسوں میں شرکت کے لیے مکہ مکرمہ آتے جاتے رہتے تھے، مگر ان سب کے باوجود آپؐ ہر اخلاقی عیب، ہر انسانی و بشری کمزوری سے مبرا و منزہ رہے۔ اس دور میں بھی کوئی بڑے سے بڑا دشمن آپؐ کی سیرت و کردار پر انگشت نمائی نہ کر سکا۔ خود قرآن مجید میں آپؐ کی حیات طیبہ کے ان ادوار کو دلیل نبوت کے طور پر پیش کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ○ وَ وَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی ○ وَ وَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی (۹۳ [الضحیٰ]: ۶ تا ۸)، یعنی بھلا اس (خدا) نے تمھیں یتیم پا کر جگہ نہیں دی اور رستے سے ناواقف دیکھا تو سیدھا رستہ دکھایا، اور تنگ دست پایا تو غنی کر دیا۔ نبوت و رسالت سے سرفرازی کے بعد آپؐ نے کوہ صفا سے قریش مکہ کو جو پہلا خطاب کیا اس میں بھی اپنی گزشتہ زندگی کے حوالے سے ہی بات شروع کی اور فرمایا: اگر میں تمھیں یہ خبر دوں کہ اس پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر تم پر عنقریب حملہ کرنے والا ہے تو کیا تم مان لو گے، انھوں نے کہا ہاں (ابن الجوزی: الوفا، ۱: ۱۸۱ ببعد)۔ اور قرآن میں آپؐ کی طرف سے یہ اعلان دہرایا گیا: فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْکُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰ [یونس]: ۱۶)، یعنی میں اس سے پہلے تمھارے درمیان میں رہا ہوں۔ اگر آپؐ کے سر پر سایۂ ایزدی نہ ہوتا تو آپؐ کا ان مراحل سے کامیابی و کامرانی سے گزرنا محال تھا؛ بار نبوت سنبھالنے کے بعد بھی آپ کو جن کٹھن حالات سے گزرنا پڑا اور جس طرح آپؐ نے راہ حق و صداقت میں پامردی دکھائی، اور پھر مختصر مدت میں اتنا عظیم الشان کارنامہ سر انجام دیا، جس کی مثال تاریخ عالم پیش کرنے سے قاصر ہے، اس اعتبار سے زندگی مبارک کا یہ دور بھی تائید ایزی کا مظہر ہے۔ مسئلہ صرف فتوحات اور جنگوں کا ہی نہیں تھا، بلکہ آپؐ کا اصل مشن قلوب و اذہان کو اخلاقی اور معنوی گندگیوں سے صاف کر کے ان کو نیکی اور پاکیزگی کی راہ پر ڈالنے کا تھا، جو آپؐ نے اپنی دیگر تمام مصروفیات کے ساتھ انجام دیا۔ اس کے علاوہ آپؐ کی سیرت مبارکہ ایک کامل ترین انسان کی زندگی کا بہترین نمونہ پیش کرتی

ہے ، یعنی ایک ایسے انسان کا جو ہر اعتبار سے کامل و مکمل ہے ، یعنی اپنے قوائے نفس ، قوائے جسم ، قوائے ظاہری و باطنی ، اپنے احساسات و ادراکات ، اپنی قوت بدنی ، اپنے خلق عظیم ، زندگی کی طرف اپنے رویے، انسانوں کے ساتھ اپنے معاملات، خود عمل کرنے ، دوسروں کو عمل پر آمادہ کرنے، دوسروں کے سامنے خود کو نمونۂ عمل بنانے اور جملۂ بشری محاسن و کمالات مثلاً جود و کرم، عفو و درگزر ، بلند حوصلگی ، شجاعت ، عزت نفس ، لطافت طبع، جودت ذہن، نظافت قلب، معاملہ فہمی، قوت خطابت ، فصاحت و بلاغت ، ہر قسم کی مشکلات کا تحمل ، دنیا کو اپنے رنگ میں رنگنے کا حوصلہ ، دشمنوں کی دشمنی اور ایذا رسانی سے مرعوب نہ ہونے الغرض جو اپنی ہر وصف اور ہر صفت میں مرتبہ کمال پر فائز ہے۔ اسی بنا پر تمام بنی نوع بشر کے لیے آپؐ کی زندگی کو نمونۂ قرار دیا گیا (۳۳ [الاحزاب] : ۲۱) ۔ کسی انسان کو یہ حیثیت حاصل نہ ہو سکی جو آپؐ کو نصیب ہوئی ؛ اور پھر آپؐ کی سیرت طیبہ چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود بھی جس طرح اپنی تمام تر جزئیات میں اس وقت دنیا کے سامنے ہے ، کہ ایک ادنی سے ادنی معاملے سے لے کر اعلی سے اعلی معاملے (ہر ایک کے سامنے ہیں ، یہ حیثیت بھی آج تک کسی انسانی زندگی کو حاصل نہ ہو سکی (سید سلیمان ندوی : خطبات مدراس).

(۶) غیب کی خبریں دینا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ایک اہم علمی و عقلی معجزہ آپؐ کا غیبی خبریں دینا بھی ہے (نیز دیکھیے بالا معجزۂ قرآنی) ۔ قرآن کریم میں مذکورہ غیبی خبروں کے علاوہ احادیث سے بھی ہمیں تین طرح کی غیبی خبریں ملتی ہیں: (الف) زمانہ ماضی کی خبریں: آپؐ نے متعدد مواقع پر اُمّی محض ہونے کے باوجود لوگوں کو گزشتہ قوموں ، بالخصوص یہود و نصاریٰ کے واقعات اور ان کے حالات سے آگاہ کیا ۔ اکثر یہودی آپؐ کی مجلس میں دروغ گوئی کرتے تھے ، مگر آپؐ ان کی غلطیاں پکڑ لیتے تھے، مثلاً ایک دفعہ ایک یہودی جوڑے کو بدکاری کے جرم میں ماخوذ کیا گیا ، آپؐ نے یہودی علما سے بدکاری کی سزا کے متعلق استفسار کیا ۔ انھوں نے کہا کہ ہماری کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ امیر آدمی کا منہ کالا کر دیا جائے اور غریب پر رجم کیا جائے۔ آپؐ نے فرمایا: تم جھوٹ بولتے ہو، اپنی کتاب لے کر آؤ۔ کتاب لائی گئی تو واقعی آپؐ کا فرمانا صحیح نکلا (البخاری، کتاب الحدود؛ ابو داؤد، ۴: ۵۹۳ تا ۵۹۵، حدیث ۴۴۴۶ تا ۴۴۵۰؛ مسلم، ۳: ۱۳۲۶ حدیث ۱۶۹۹، مطبوعۂ قاہرہ) ۔ اس کے علاوہ آپؐ ان کو بتلاتے تھے کہ میری بعثت کی خبر تمھاری تمام کتابوں میں لکھی ہوئی ہے۔ ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا : میں دعائے ابراہیم اور نوید مسیحؑ ہوں (ابن الجوزی: الوفا، ص ۴۹)؛ (ب) زمانۂ حال کی خبریں: غیب کی دوسری قسم یہ ہے کہ آدمی موجودہ زمانے کے حوادث و وقائع سے مطلع ہو جائے۔ آپؐ کے متعلق متعدد صحابہؓ سے منقول ہے کہ آپؐ کو دور دراز کی خبریں وحی الٰہی سے پہنچ جایا کرتی تھیں، چنانچہ غزوہ مؤتہ کے موقع پر آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو مسجد نبوی میں جمع کیا اور فرمایا (میں تمھیں معرکے کے حالات بتاتا ہوں) : اب جھنڈا زیدؓ بن حارثہ کے ہاتھ میں ہے اور اب وہ شہید ہو گئے ہیں ۔ پھر فرمایا: اب علم لشکر حضرت جعفرؓ نے لے لیا ہے ، اب وہ بھی شہید ہو گئے ہیں ، اب عبداللہؓ بن رواحہ نے جھنڈا پکڑ لیا ہے ، اب وہ بھی شہید ہو

گئے ہیں؛ جب آپؐ یہ خبر دے رہے تھے، اس وقت آپؐ کی آنکھیں نمناک تھیں، پھر فرمایا: اب یہ علم اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار (خالدؓ بن ولید) کے ہاتھ میں ہے (البخاری، ۶۴/۴۴، ۳: ۱۳۵)۔ اس میں یہ صراحت بھی ہے کہ آپؐ نے یہ اطلاع قاصد کے مدینہ منورہ پہنچنے سے پہلے دی تھی (حوالۂ مذکور)۔ اسی طرح فتح مکہ کے موقع پر ایک صحابی حاطبؓ بن ابی بلتعہ نے قریش مکہ کو آپؐ کی جنگی تیاریوں سے خبردار کرنے کے لیے ایک عورت کے ہاتھ ایک خط روانہ کیا۔ جیسے ہی یہ عورت مدینہ منورہ سے باہر نکلی، آپؐ نے حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ کو بلایا اور فرمایا کہ تم سیدھے مقام روضہ خاخ پر پہنچو، وہاں تمہیں ایک عورت ملے گی، اس کے پاس ایک جاسوسی خط ہے، اسے برآمد کرکے لاؤ؛ چنانچہ یہ صحابہؓ جب وہاں پہنچے تو انہیں ایک مسافر عورت سے مذکورہ خط مل گیا (البخاری، ۶۴/۴۶، ۳: ۱۳۷)۔ کتب حدیث و سیرۃ میں اس نوع کے اور بھی بہت سے واقعات مروی ہیں؛

(ج) حالات مستقبلہ کی پیشین گوئیاں: آپؐ کے عظیم معجزات میں سے یہ معجزہ بھی ہے کہ آپؐ نے مختلف مواقع پر آئندہ زمانے سے متعلق، جو پیشین گوئیاں کیں، وہ اپنے اپنے وقت پر حرف بحرف پوری ہوئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ان پیشین گوئیوں کا ظہور مختلف حالتوں میں ہوا۔ مثلاً کبھی وحی قرآنی کی صورت میں، کبھی رؤیائے صالحہ اور کبھی زبان مبارک سے فوری اطلاع کی صورت میں (قرآنی پیشین گوئیوں کے لیے دیکھیے بالا اعجاز قرآن)؛ ذخیرۂ احادیث میں آپؐ کی بے شمار پیشین گوئیاں مذکور ہیں، چند ایک کا تذکرہ حسب ذیل ہے:

(۱) کثرت ساز و سامان اور مال و دولت کی پیشین گوئی: حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مجھ سے پوچھا اے جابرؓ! کیا تمہارے پاس قالین ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: عنقریب تم قالینوں پر بیٹھو گے؛ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ بالآخر وہ دن آیا کہ ہم قالینوں پر بیٹھے (البخاری، ۲: ۱۰۴)۔ ایک دوسرے موقع پر ارشاد فرمایا: بخدا! مجھے تم پر فقر و فاقہ یا مشرک ہو جانے کا ڈر نہیں، البتہ یہ خطرہ ہے کہ تم پر پہلی امتوں کی طرح دولت کی بہتات کر دی جائے، پھر تم اس میں مبتلا ہوکر ایک دوسرے سے حسد و رقابت کرنے لگو اور یوں پہلی قوموں کی طرح غفلت میں جا پڑو (البخاری، ۵۸/۱، ۲: ۲۹۲؛ ۸۱/۷، ۴: ۲۱۳)۔ ایک دفعہ فرمایا: قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تمہاری یہ حالت نہ ہو جائے کہ صدقات کا مال لینے والا کوئی نہ رہے (البخاری، ۴: ۳۸۰)۔ ایک اور موقع پر خبر دی: تم پر عنقریب وہ زمانہ آنے والا ہے کہ تمہارے سامنے رات کو ایک پیالہ اور صبح کو دوسرا پیالہ ہوگا اور کعبہ کے پردوں کی طرح تمہارا لباس بیش قیمت ہوگا (احمد بن حنبل: مسند، حدیث طلحۃ النضر)۔

(۲) فتوحات عظیمہ کی پیشین گوئی: نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مختلف مواقع پر فتوحات کی خبریں دیں، جو ان حالات میں بظاہر ناممکن نظر آتی تھیں۔ غزوۂ خندق کے موقع پر خندق کھودنے کے دوران میں ایک سخت پتھر نکلا، جسے صحابہؓ توڑنے سے قاصر رہے تو آپؐ نے چادر اتار کر خندق کے کنارے رکھی اور کدال (معول) سے تین ضربیں لگائیں۔ ہر ضرب کے بعد چنگاری اڑی اور آپؐ بلند آواز سے فرماتے: و تمّت کلمةُ ربک صدقا و عدلا ط لا مبدل لکلمٰتہ۔

صحابہؓ نے وجہ پوچھی تو فرمایا: میری پہلی ضرب سے جو روشنی پھیلی اس میں مجھے کسریٰ کے محلات اور اس کے آس پاس کی تمام اشیا دکھائی دیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ان کی فتح کے لیے دعا کیجیے۔ آپؐ نے دعا فرمائی؛ پھر فرمایا: دوسری ضرب میں قیصر کے شہر اور آس پاس کے علاقے نظر آئے، حاضرین نے ان کی فتح کے لیے بھی دعا کی درخواست کی جو قبول ہوئی؛ پھر فرمایا: تیسری ضرب میں حبشہ کے شہر اور گاؤں نگاہوں کے سامنے آئے۔ پھر فرمایا: حبشہ والوں سے تعرض نہ کرنا تاوقتیکہ وہ تم سے تعرض کریں (النسائی، کتاب الجہاد، ۲ : ۶۴ تا ۶۵؛ مطبوعۂ قاہرہ ۱۳۰۹ھ)۔ دوسرے موقع پر صراحۃً ان کی فتح کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: تم لوگ جزیرۂ عرب میں لڑوگے؛ تمھیں فتح ہوگی۔ پھر فارس سے لڑوگے، کامیاب ہوگے۔ پھر روم سے معرکہ ہوگا، تم شادکام رہوگے اور آخر میں دجال سے معرکہ آرائی میں بھی کامیاب رہوگے (مسلم، ۴ : ۲۲۲۵، حدیث ۲۹۰۱)؛ اس کے علاوہ نام بنام مختلف علاقوں کی فتح کی بشارتیں بھی منقول ہیں۔ شام کی فتح کی خبر دیتے ہوئے فرمایا: شام مفتوح ہوگا تو لوگ اپنی سواریوں کو ہانکتے ہوئے مع اہل و عیال وہاں رہائش پذیر ہونے کے لیے جائیں گے اور اگر وہ جائیں تو مدینہ ان کے لیے بہتر ہے (مسلم، ۲ : ۱۰۰۸، حدیث ۱۳۸۸)۔ مسند امام احمد بن حنبلؒ میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: تم لوگ عنقریب شام کو ہجرت کروگے اور وہ تمہارے لیے فتح کر دیا جائے گا (ابن حنبل مسند، ۵ : ۱۴۴)۔ یمن کی فتح کی بشارت بھی دی اور فرمایا: یمن مفتوح ہوگا اور لوگ اپنی سواریوں اور اہل و عیال کو لیے ہوئے وہاں جائیں گے (مسلم، ۲ : ۱۰۰۸، حدیث ۱۳۸۸ و ۱۳۸۹)۔ یہی الفاظ عراق کی فتح سے متعلق بھی ملتے ہیں (حوالۂ مذکور)۔ اسی طرح فتح مصر کی بشارت دی اور فرمایا: تمہارے لیے عنقریب مصر فتح ہوگا اور یہ قیراط کی سرزمین ہے۔ جب تم اس کو فتح کرو تو وہاں کے باشندوں کے ساتھ نیکی سے پیش آنا، کیونکہ تمہارے اور ان کے درمیان رشتہ ہے (حضرت ہاجرہ ام اسماعیلؑ مصر کی تھیں؛ مسلم، ۴ : ۱۹۷۰، حدیث ۲۵۴۳)۔ اسی طرح بیت المقدس (البخاری، کتاب الجزیہ، ۵۸ / ۱۵، ۲ : ۲۹۸) قسطنطینیہ و روما (النسائی، کتاب الجہاد، ۲ : ۶۳ تا ۶۴؛ احمد بن حنبل: مسند، بروایت ابو عبداللہ بن ابی سیر الخثعمی، ایضا عن ابی قبیل التابعی) وغیرہ کی پیشین گوئیاں بھی آپؐ نے امت کو سنائیں۔ یہ تمام علاقے مسلمانوں نے فتح کیے اور ان پر اپنی حکومت و سیادت قائم کی؛ (۳) قیام خلافت اور مدت خلافت کی پیشین گوئی: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مختلف مواقع پر یہ بھی خبر دی کہ میرے بعد خلفا ہوں گے اور بہت ہوں گے (مسلم، ۳ : ۱۵۵۲ ببعد)۔ ان میں سے بارہ ایسے ہوں گے کہ جن سے اسلام کی حمایت و نصرت کا کام لیا جائے گا (حوالۂ مذکور)، مگر خلافت راشدہ کا زمانہ تیس برس ہوگا؛ (۴) خلفائے راشدین کی نام بنام پیشین گوئی: آپؐ نے صرف مدت خلافت ہی کی تصریح نہیں فرمائی تھی، بلکہ اپنے بعد آنے والے خلفا کے ناموں سے لوگوں کو آگاہ کر دیا تھا۔ خلافت راشدہ کے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں۔ ان کی خلافت کا آپؐ نے متعدد ارشادات میں اشارہ فرمایا تھا؛ امام بخاری (۲ : ۴۱۹، کتاب فضائل اصحاب النبیؐ) کے مطابق آپؐ نے ایک سے زیادہ افراد کو کچھ دینے کا وعدہ فرمایا تھا اور اس کے ساتھ یہ بھی بتلا دیا

تھا کہ اگر تمھاری مجھ سے ملاقات نہ ہو تو ابوبکرؓ کے پاس آنا، وہ میرے وعدے کو پورا کر دیں گے؛ وصال اقدس سے پانچ روز قبل دیے ہوئے خطبے میں بطور خاص حضرت ابوبکرؓ کے مناقب بیان فرمائے اور یہاں تک فرما دیا کہ میں ہر شخص کے حقوق ادا کر چکا ہوں سوائے ابوبکرؓ کے؛ مزید فرمایا کہ ابوبکرؓ کے سوا ہر شخص اپنا مسجد میں کھلنے والا عقبی دروازہ (خوخہ) بند کر لے؛ نیز اپنی حیات طیبہ ہی میں انھیں اپنے مصلے پر کھڑا کیا؛ ابن الجوزی (۲ : ۷۷۹) کے مطابق آپؐ نے وصال سے کچھ عرصہ پہلے حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے عبدالرّحمٰن بن ابی بکرؓ کو فرمایا تھا کہ میرے پاس ہڈی کا شانہ یا لکڑی (لوح) لے آؤ تاکہ میں خلافت صدیقی کی تحریر لکھ دوں، مگر جب عبدالرّحمٰنؓ مذکورہ چیز لینے کے لیے تشریف لے جانے لگے، تو فرمایا: خدا اور اہل ایمان بندے ابوبکرؓ کے سوا کسی پر راضی نہ ہوں گے (نیز دیکھیے مسلم، ۴ : ۱۸۵۷ حدیث ۲۳۸۷، جہاں عبدالرحمنؓ کی جگہ حضرت عائشہؓ کا نام ہے)۔

حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت کی خبر ایک خواب کے ذریعے بھی آپؐ نے امت کو سنائی تھی۔ آپؐ نے فرمایا: میں نے دیکھا کہ میں ایک کنویں پر کھڑا ہوا پانی کے ڈول نکال رہا ہوں۔ پھر میرے ہاتھ سے رسی اور ڈول ابوبکرؓ نے لے لیے۔ انھوں نے ایک یا دو ڈول نکالے (خلافت صدیقی کی مدت دو سال چار ماہ ہے) اور ان کے ڈول نکالنے میں کمزوری تھی؛ اللہ انھیں معاف فرمائے۔ ان کے ہاتھ سے پھر یہ ڈول عمر فاروقؓ نے لے لیا اور متعدد ڈول نکالے۔ آپؐ نے فرمایا: میں نے کسی طاقتور کو عمر فاروقؓ کی طرح ڈول نکالتے نہیں دیکھا، یہاں تک کہ حوض لبالب پانی سے بھر گیا (البخاری، ۱۹ / ۲۸ تا ۳۰، ۳ : ۳۵۶ تا ۳۵۷)۔

خلفائے راشدین میں سے تین خلفا شہید ہوئے ہیں، ان میں سے ہر ایک کی شہادت کی خبر بھی آپؐ نے سنائی۔ حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت کی خبر دیتے ہوئے فرمایا: عمر فاروقؓ فتنوں کے درمیان ایک بند دروازے کی طرح حائل ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اس روایت کے راوی (حضرت حذیفہؓ) سے پوچھا کہ یہ دروازہ کھولے گا یا توڑے گا؟ انھوں نے فرمایا کہ نہیں بلکہ توڑے گا؛ چنانچہ ایسا ہی ہوا (البخاری، ۲ : ۴۰۲)۔ ایک مرتبہ وہ پہاڑ پر آپؐ کے ساتھ تشریف رکھتے تھے؛ پہاڑ پر زلزلے کی سی کیفیت طاری ہوئی۔ آپؐ نے پہاڑ پر پاؤں مارا اور فرمایا: ٹھہر جا؛ کیونکہ تیرے اوپر ایک نبی، ایک صدیق اور ایک شہید ہے (کتاب مذکور، ۲ : ۴۲۷)؛ دوسری روایت میں دو شہیدوں کا ذکر ہے (کتاب مذکور، ص ۴۲۴)۔

خلفائے راشدین میں سے دو خلیفے بڑے مصائب و آلام سے دوچار ہوئے اور پھر وہ دونوں شہید کر دیے گئے۔ ان پر وارد ہونے والے ان حالات کی بھی آپؐ نے پیشین گوئی کر دی تھی۔ حضرت عثمانؓ سے فرمایا: تمھیں ایک مصیبت پڑنے پر جنت کی بشارت ہے (البخاری، ۲ : ۴۲۴؛ مسلم، ۴ : ۱۸۶۷، حدیث ۲۴۰۳) اور صحابہؓ سے فرمایا: کہ عنقریب ایک فتنہ اٹھے گا۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ اس کے متعلق آپؐ کا کیا حکم ہے؟ فرمایا: میں تمھیں امیر اور اس کے جاں نثاروں کی حمایت کرنے کی تلقین کرتا ہوں (الحاکم: مستدرک، ۳ : ۹۹، مطبوعہ حیدر آباد دکن، ۱۳۴۱ھ)۔ ایک دوسری روایت میں آپؐ نے حضرت عثمانؓ سے فرمایا: اے عثمانؓ! خدا

تعالیٰ تمہیں ایک قمیص پہنائے گا۔ کچھ لوگ اسے اتارنا چاہیں گے، مگر تم ہرگز نہ اتارنا (کتاب مذکور، ص ۱۰۰)۔ اسی طرح حضرت علیؓ کو بھی آپؐ نے متعدد ارشادات میں پیش آنے والے مصائب سے آگاہ فرما دیا تھا۔ ایک موقع پر فرمایا: اے علیؓ! تمہیں میرے بعد بڑی مشکلات درپیش ہوں گی۔ حضرت علیؓ نے پوچھا: کیا میرا دین سلامت رہے گا؟ فرمایا: ہاں (مستدرک، ۳: ۱۴۰) اور پھر یہ بھی فرما دیا تھا کہ تمہیں تلوار کی دھار سے شہید کیا جائے گا (حوالۂ مذکور)۔

حضرت علیؓ کے بڑے فرزند حضرت حسنؓ بن علیؓ دو اسلامی لشکروں کے درمیان مصالحت کراتے ہیں۔ آپؐ نے اس کی بھی پیشین گوئی فرما دی تھی۔ ابوبکرہؓ ایک صحابی رسولؐ روایت کرتے ہیں کہ آپؐ ایک مرتبہ منبر پر چڑھے، آپؐ کی گود میں حضرت حسنؓ تھے۔ آپؐ نے فرمایا: یہ میرا بیٹا سردار ہے: شاید اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی دو جماعتوں میں مصالحت کے اسباب پیدا کر دے (البخاری، ۶۱/۲۵، ۲: ۴۱۱)؛

(۵) امن و امان قائم ہونے کی اطلاع: ان سب سے بڑھ کر پورے جزیرۂ عرب میں امن و امان قائم ہونے کی اطلاع دی اور فرمایا: اے عدیؓ کیا تم نے شہر حیرہ دیکھا ہے؟ عدیؓ نے عرض کیا کہ نہیں یا رسول اللہ، البتہ مجھے اس کے حالات معلوم ہیں: آپؐ نے فرمایا: اگر تم زندہ رہے تو دیکھو گے کہ حیرہ سے ایک ہودج نشین عورت چل کر خانۂ کعبہ کا طواف کرے گی اور اس کو خدا کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔ حضرت عدیؓ فرماتے ہیں میں نے اس پیشین گوئی کی صداقت اپنی آنکھوں سے دیکھ لی ہے (البخاری، باب علامات النبوۃ)؛

(۶) فتنوں اور باہمی اختلاف و انتشار کی اطلاع: امن و امان قائم ہونے کی خوشگوار اور مسرت انگیز خبر کے علاوہ آپؐ نے مسلمانوں کے باہمی اختلافات اور مناقشات کی بھی اطلاع دی۔ ایک موقع پر صحابہ کرامؓ کے ساتھ مدینہ منورہ سے باہر نکلے اور مدینہ منورہ کی طرف دیکھا اور فرمایا: میں دیکھ رہا ہوں تمہارے گھروں پر فتنے بارش کی طرح برس رہے ہیں (البخاری، ۶۱/۲۵، ۲: ۴۰۳)۔ اور یہ بھی فرمایا کہ یہ فتنے شہادت فاروقؓ کے بعد وارد ہوں گے (البخاری، ۹۲/۱۷، ۴: ۳۷۵)۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی نسبت اطلاع دی کہ وہ فتنوں اور آزمائشوں میں فریق حق ہوں گے (دیکھیے بالا) اور یہ بھی فرمایا کہ فتنوں کا زیادہ تر ظہور مشرقی جانب سے ہوگا، جدھر سے سورج نمودار ہوتا ہے (البخاری، ۹۲/۱۶، ۴: ۳۷۴)؛ چنانچہ حضرت عمرؓ کا قاتل بھی ادھر سے تعلق رکھتا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کا مسکن بھی یہی علاقہ رہا۔ جنگ جمل اور جنگ صفین کی معرکہ آرائی بھی انھی میدانوں میں اور مشرقی علاقوں کے لوگوں کی شرانگیزیوں سے ہوئی۔ خوارج سے لے کر معتزلہ، جبریہ، قدریہ تک بہت سے نت نئے گروہ بھی اسی علاقے میں پیدا ہوئے۔ الغرض کئی صدیوں تک یہ مشرقی علاقے فتنوں اور شورشوں کا منبع اور مرکز رہے؛

(۷) مختلف لوگوں کی وفات کی خبریں: نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے من جانب اللہ اطلاع پا کر مختلف لوگوں کی ہلاکت یا وفات کی بھی قبل از وقت خبریں دیں، مثلاً صفوانؓ کے قتل کی اطلاع دی (البخاری، ۶۴/۲، ۳: ۵۳)؛ غزوہ بدر میں دشمنان اسلام کے قتل اور موضع قتل کی پیشین گوئی فرمائی۔ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ وہ سب لوگ اسی جگہ قتل ہوئے جس کی آپؐ نے اطلاع دی تھی (مسلم، ۳: ۱۴۰۳،

حدیث ۴۲۷۷)۔ جنگ موتہ میں تین صحابہؓ حضرت زیدؓ بن حارثہ، عبداللہؓ بن رواحہ اور جعفرؓ بن ابی طالب کو یکے بعد دیگرے امیر مقرر کیا اور فرمایا کہ اگر جعفرؓ بھی شہید ہو جائیں تو مسلمان جس کو چاہیں امیر چن لیں (ابن ہشام: السیرۃ، ۳: ۱۵ ببعد)۔ اس موقع پر بعض یہودی موجود تھے، انھوں نے کہا کہ اگر آپؐ سچے نبی ہیں تو یہ تینوں بزرگوار شہید کر دیے جائیں گے؛ چنانچہ ایسا ہی ہوا، یہ تینوں یکے بعد دیگرے شہید کر دیے گئے (الواقدی: المغازی، ذکر غزوۂ موتہ)۔

(۸) متعدد مواقع پر اپنے وصال کی خبر دینا: وصال سے چند روز پیشتر خطبہ دیا، جس میں آپؐ نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو دنیا میں رہنے یا اس کے پاس آنے میں مختار کیا ہے اور اس بندے نے خدا کے پاس جانے کو ترجیح دی (البخاری، ۶۲/۳، ۲: ۳۱۸)۔ حجۃ الوداع کے خطبے میں ارشاد فرمایا: لوگو! میری باتیں توجہ سے سنو، ہو سکتا ہے کہ تم اس سال کے بعد مجھے اپنے اندر نہ پاؤ (الوثائق السیاسیہ، عدد ۲۸۷/الف)۔ حضرت معاذؓ بن جبل کو یمن رخصت کرتے وقت فرمایا: معاذؓ! اب اس کے بعد تم مجھ سے نہ مل سکو گے، واپس آؤ گے تو میری مسجد اور میری قبر کے پاس سے تمھارا گزر ہوگا (احمد بن حنبل: مسند، ۵: ۲۳۵)۔ وصال سے چند روز پیشتر حضرت فاطمہؓ کے کان میں سرگوشی کی، جس سے وہ رو پڑیں۔ دوبارہ کچھ فرمایا تو وہ مسکرا دیں۔ بعد از وصال، حضرت عائشہؓ کے استفسار پر انھوں نے بتایا کہ پہلے آپؐ نے مجھے یہ بتایا تھا کہ آپؐ اس بیماری سے جانبر نہ ہو سکیں گے، اس پر وہ رو پڑی تھیں؛ دوسری مرتبہ جب آپؐ نے خبر دی کہ وہ (حضرت فاطمہؓ) اہل بیت نبوی میں سب سے پہلے آپؐ سے ملاقات کریں گی۔ اس خبر کے سنتے ہی وہ خوش ہو گئیں (مسلم، ۴: ۱۹۰۴، حدیث ۲۴۵۰)۔ ازواج مطہرات میں سب سے پہلے انتقال پانے والی زوجۂ مطہرہ کی خبر دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ وہ خاتون ہوں گی جن کا ہاتھ لمبا (فیاض) ہوگا؛ چنانچہ ام المساکین حضرت زینبؓ سب سے پہلے انتقال فرما گئیں (البخاری: الجامع الصحیح)۔ حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ کی شہادت پانے کی پیشین گوئیاں فرمائیں (دیکھیے بالا)۔ ایک صحابیہ ام ورقہ کو گھر میں شہادت کی خبر سنائی، چنانچہ ان کی باندی اور غلام نے انھیں گلا گھونٹ کر شہید کر دیا (ابو داؤد، باب الامامۃ)۔ حضرت عمارؓ بن یاسر کی نسبت فرمایا: انھیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا (مسلم، ۲۲۳۶، حدیث ۲۹۱۶)۔ اس کے علاوہ بہت سے صحابہؓ و صحابیات کے متعلق اس نوع کی پیشین گوئیاں مروی ہیں۔

(۹) فتنۂ ارتداد کی اطلاع: آپؐ نے مختلف ارشادات میں فتنۂ ارتداد کی خبر دی اور فرمایا: کچھ لوگ حوض کوثر پر میرے سامنے آئیں گے، میں انھیں پہچان کر ان کی طرف بڑھوں گا، مگر مجھے یہ کہہ کر روک دیا جائے گا کہ یہ آپؐ کے بعد دنیا میں اپنی ایڑیوں پر پھر گئے تھے (مسلم، ۴: ۱۷۹۴، حدیث ۲۲۹۴)؛ نیز فرمایا: مجھے دو کنگن پہنائے گئے؛ میں نے پھونک ماری تو وہ گر گئے، فرمایا: یہ دو جھوٹے نبی (مسیلمہ اور اسود عنسی) ہیں (البخاری، ۹۱/۴۰، ۴: ۳۹۱)؛ چنانچہ اسود عہد نبوی میں اور مسیلمہ عہد ابی بکرؓ میں مارا گیا۔ نیز فرمایا: قیامت سے پہلے تیس کاذب دجال پیدا ہوں گے، جن میں سے ہر ایک یہی کہے گا کہ وہ اللہ کا نبی

ہے، آگاہ ہو جاؤ! میں خدا کا آخری نبی ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا (الزرقانی: شرح المواہب، ۷: ۲۳۱)۔

(۱۰) منکرین حدیث کے بارے میں اطلاع: آپؐ نے متعدد ارشادات میں یہ خبر بھی دی تھی کہ میں تم میں سے کسی کو نہ پاؤں کہ وہ اپنی مسند پر تکیہ لگائے بیٹھا ہو اور اس کے پاس میرے کاموں میں سے کوئی کام، جس کے کرنے کا میں نے حکم دیا یا منع کیا، بیان کیا جائے، تو وہ کہے ہم نہیں جانتے، ہم جو قرآن میں ہے اسی کو مانتے ہیں (ابو داؤد، ۵: ۱۰ تا ۱۲، حدیث ۴۶۰۴، ۴۶۰۵؛ الترمذی، العلم، حدیث ۲۶۶۵، ۲۶۶۳؛ ابن ماجہ، حدیث ۱۲)۔

(۱۱) فتنۂ خوارج کی اطلاع: فتنۂ خوارج کی اطلاع دیتے ہوئے فرمایا: کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو تمھاری طرح نماز پڑھیں گے اور تمھاری طرح قرآن پڑھیں گے، مگر قرآنی اثرات ان کے گلے سے نیچے نہیں اتریں گے، وہ مسلمانوں کو قتل کریں گے؛ یہ لوگ اسلام سے چھو کر اس طرح باہر جا نکلیں گے جس طرح تیر اپنے نشانے کو لگ کر باہر جا نکلتا ہے (مسلم، ۲: ۷۴۱ تا ۷۴۳، حدیث ۱۰۶۴)۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ ان کا خروج مسلمانوں کے باہمی اختلاف کے موقع پر ہوگا (مسلم، ۲: ۷۴۵)؛ چنانچہ عین جنگ صفین کے موقع پر یہ جماعت مسلمانوں سے الگ ہو گئی اور ہر طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا

(۱۲) قدریہ کے بارے میں کی اطلاع: قدریہ کی خبر دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: قدریہ اس امت کے مجوس ہوں گے (الزرقانی: شرح المواہب، ۷: ۲۰۳)۔

(۱۳) سازشوں کی اطلاع: آپؐ کو آپؐ کے خلاف کی جانے والی سازشوں کا بھی اللہ کی طرف سے قبل از وقت علم ہو جاتا تھا۔ قریش مکہ میں سے صفوان نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو قتل کرنے کے لیے عمیر کو مدینہ منورہ بھیجا اور اس کے اہل و عیال کی کفالت اور قرض کی ادائی کی ذمہ داری خود اٹھائی۔ وہ آپؐ کی خدمت میں پہنچا تو آپؐ نے دیکھتے ہی فرمایا کہ اس نے اور صفوان نے قتل سازش کی تھی۔ یہ سن کر عمیر مسلمان ہو گیا (الوفا، ۱: ۳۰۹؛ قاضی عیاض: الشفاء، ص ۱۷۰)۔ یہود مدینہ بنو نضیر نے ایک مرتبہ آپؐ کو قتل کرنے کی سازش تیار کی۔ جب آپؐ ان کے محلے میں ایک کام کی غرض سے تشریف لے گئے تو انھوں نے مکان کے اوپر سے چکی کا پاٹ گرا کر (معاذ اللہ) آپؐ کا کام تمام کر دینا چاہا؛ اس مقصد کے لیے ایک یہودی عمرو بن جحاش بن کعب مکان کے اوپر چڑھ گیا۔ آپؐ کو اطلاع ہو گئی۔ آپؐ کسی کام کا بہانہ کر کے وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بعد میں فرمایا کہ یہود نے یہ سازش تیار کی تھی (ابن سعد: الطبقات، ۲: ۵۷، غزوۂ بنو النضیر)۔ فتح مکہ کے موقع پر جب آپؐ اس عظیم الشان فتح کی تیاریوں میں مصروف تھے، ایک صحابی حاطب بن ابی بلتعہ نے ایک عورت کے ذریعے اہل مکہ کے نام خط پہنچانے کی کوشش کی۔ آپؐ نے من جانب اللہ مطلع ہو کر حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ کو اس عورت سے خط برآمد کرنے کے لیے بھیجا۔ تلاشی لی گئی تو اس کے بالوں میں گندھا ہوا خط برآمد ہوا (البخاری، ۳: ۳۰۹)۔ آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ جس وقت گرفتار ہو کر مدینہ منورہ لائے گئے تو ان سے فدیے کا مطالبہ کیا گیا۔ انھوں نے ناداری کا عذر کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم نے اپنی بیوی ام الفضل (لبابہ بنت الحارث، حضرت خدیجہؓ اور فاطمہؓ بنت عباس کے بعد پہلی مسلم خاتون) کے پاس جو مال رکھوایا تھا اسے کیا ہوا۔ حضرت

عباسؓ نے تعجب کا اظہار کیا اور فرمایا کہ اس کا علم صرف ان کو تھا یا ام الفضل کو ، اور فرمایا کہ آپؐ سچے رسول ہیں (الوفا، ۱ : ۲۱۴؛ قاضی عیاض : الشفاء ص ۱۷۱) ۔ انھیں وجوہات کی بنا پر آپؐ کے زمانے میں لوگ خلوت میں بھی کوئی ایسی بات کرنا پسند نہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ چپ ہو جاؤ ؛ بخدا ! آپؐ کو کسی شخص نے نہ بھی بتایا تو بطحاء کے یہ پیغمبرؐ پھر بھی بتا دیں گے (کتاب مذکور، ص ۱۷۲) ۔ غزوۂ خیبر کے دوران میں کنانہ بن ابی الحقیق یہودی نے آپؐ سے وعدہ کیا کہ وہ کوئی چیز آپؐ سے نہیں چھپائے گا ، مگر پھر اس نے خود ہی خلاف ورزی کی اور کچھ زیورات چھپا لیے ۔ آپؐ نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا کہ اس نے کوئی چیز آپؐ سے نہیں چھپائی ۔ آپؐ نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ فلاں جگہ جاؤ اور وہاں سے چھپا ہوا مال نکال لاؤ ؛ چنانچہ وہاں سے وہ مال برآمد ہو گیا (الوفا، ۱ : ۳۱۳) ۔ ابو سفیانؓ کے ساتھ بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا ۔ جب فتح مکہ کے موقع پر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ہمراہ تھے ۔ آپؐ نے طواف کے دوران میں ان سے فرمایا کہ تم نے اور تمھاری بیوی ھندہ نے یہ یہ باتیں کی ھیں ۔ ابو سفیان نے دل میں خیال کیا کہ شاید ھندہ نے یہ راز فاش کیا ھے ۔ میں ذرا اس سے ملوں تو پھر پوچھوں گا ۔ آپؐ جب طواف سے فارغ ہو گئے تو ابو سفیان کے قریب آئے اور فرمایا : ھندہ پر زیادتی نہ کرنا ؛ کیونکہ اس نے تمھارا کوئی راز فاش نہیں کیا ۔ یہ سنتے ہی ابو سفیانؓ پکار اٹھے کہ میں گواھی دیتا ھوں کہ آپؐ اللہ کے سچے رسول ھیں ، ورنہ میرے دل کا بھید آپؐ کو کون بتا سکتا ھے (ابن الجوزی : الوفا، ۱ : ۴۱۴) ۔ اسی طرح ایک موقع پر ایک صحابیہؓ نے آپؐ کو اور صحابہؓ کو کھانے پر بلایا ۔ آپؐ کے سامنے جونہی کھانا رکھا گیا ، آپؐ نے صحابہؓ کو ھاتھ اٹھا لینے کا حکم دے دیا ۔ صحابہؓ کے تعجب پر آپؐ نے فرمایا : یہ ایسی بکری کا گوشت ھے جو بلا اجازت ذبح کی گئی ھے ؛ تحقیق کرنے پر یہ بات سچ ثابت ہوئی (کتاب مذکور، ص ۳۱۴) ۔

(۱۲) زمانۂ مستقبل کی پیشین گوئیاں : (الف) جہاد بحری کی اطلاع : آپؐ کے پُر صعوبت زمانے میں کبھی یہ وھم و گمان بھی نہیں ھو سکتا تھا کہ مسلمان کبھی جہاد بحری کرنے کے اھل بھی ھو جائیں گے ، مگر آپؐ نے حضرت ام حَرامؓ بنت ملحان (ایک صحابیہ) کو جہاد بحری کی خبر دیتے ہوئے فرمایا : میں نے امت کے ان مجاھدوں کو دیکھا جو سمندر میں جہاد کے لیے سفر کریں گے اور جہازوں پر اس طرح بیٹھے ہوں گے جس طرح بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھتے ہیں اور فرمایا کہ وہ سب جنتی ھیں ؛ حضرت ام حرام نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ ! دعا کیجیے کہ میں بھی انھیں خوش نصیبوں میں سے ھو جاؤں ۔ آپؐ نے دعا فرما دی ۔ آپؐ کا یہ فرمان عہد امیر معاویہؓ میں پورا ھوا ، جب مسلمانوں نے قسطنطنیہ پر بحری راستے سے پہلا حملہ کیا (البخاری، ۹۵/۳۳، ۲ : ۱۰۲) ؛ (ب) عرب ممالک کی حجاز سے قطع تعلق کی پیشین گوئی : حضرت ابو ھریرہؓ سے مروی ھے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا : عراق نے اپنے درھم و قفیز ، شام نے اپنے درھم و دینار ، اور مصر نے بھی اپنے دینار روک لیے اور پھر آپؐ نے تین مرتبہ فرمایا : تم ویسے کے ویسے رہ گئے ، جس طرح کے شروع میں تھے (مسلم، ۴ : ۲۲۲۰ تا ۲۲۲۱، حدیث ۲۸۹۶) ؛ چنانچہ عہد بنی امیہ میں یہ پیشین گوئی پوری ھو گئی جب دمشق میں سلطنت اموی کا قیام عمل میں آ گیا اور حجاز کو ان علاقوں سے نہ غلہ پہنچتا تھا نہ نقدی ؛

(ج) ایک اعرابی سُراقہ بن مالک بن جُعشم کو کسرٰی کے کنگن پہنائے جانے کی اطلاع: آپؐ نے سراقہ بن مالک بن جعشم کو فرمایا: تمہارا اس وقت کیا حال ہوگا جب تمہارے ہاتھوں میں کسرٰی کے کنگن پہنائے جائیں گے (البیہقی؛ الزرقانی: شرح المواہب، ۷: ۲۰۸)؛ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں مدائن فتح ہوا اور کسرٰی کے کنگن حاضر کیے گئے تو انھوں نے سراقہ کو بلا کر ان کے ہاتھ میں اپنے ہاتھوں سے پہنائے (کتاب مذکور)؛ (د) مدینہ منورہ میں ایک بڑی آگ کی پیشین گوئی: بخاری (۹۲/۳۳، ۴: ۳۸۰) اور مسلم (۴: ۲۲۲۷، حدیث ۲۹۰۲) دونوں کی روایت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک حجاز میں ایسی آگ نہ بھڑکے، جو بُصرٰی کے اونٹوں پر روشنی ڈالے گی۔ آپؐ کی یہ پیشین گوئی ۶۵۴ھ / ۱۲۶۵ء میں، یعنی آپؐ کے وصال سے ۶۴۳ سال بعد پوری ہوئی اور مدینہ منورہ میں پہاڑ کی آتش فشانی سے بہت بڑی آگ لگی۔ عینی شاہدوں کے مطابق یہ آگ اتنی بڑی تھی کہ اس کی روشنی میں بُصرٰی کے بدوؤں نے اپنے اونٹوں کو دیکھا اور شناخت کیا (قاضی سلیمان سلمان منصور پوری: رحمۃ للعالمین، ۳: ۱۶۱ تا ۱۷۰)۔ یہ آگ یکم جمادی الآخرۃ کو لگی اور کئی روز تک شعلہ زن رہی؛ (ھ) غزوۂ ہند کی خبر: ہندوستان میں محمد بن قاسم، سلطان محمود غزنویؒ اور دیگر مسلمان حکمرانوں نے متعدد بار جہاد کیا: اس کے بارے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد مبارک امام نسائی نے یہ نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ وعدہ فرمایا کہ مسلمان ہندوستان میں جہاد کریں گے (نسائی: سنن، ۲: ۶۴، کتاب الجہاد، باب غزوۃ الہند)؛ (و) ترکوں کے حملے اور مملکت اسلامیہ پر قبضے کی پیشین گوئی: ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء میں تاتاریوں نے ہلاکو خان کی سرکردگی میں بغداد پر حملہ کرکے اسلامی سلطنت کے مرکز پر قبضہ کر لیا اور لاکھوں آدمیوں کو تہ تیغ کر دیا۔ اس اہم واقعے کی خبر دیتے ہوئے آپؐ نے فرمایا: اس وقت تک قیامت برپا نہ ہوگی جب تک تم ان ترکوں سے جنگ نہ کرو گے جن کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی، چہرے سرخ، ناک چپٹے، اور چہرے ڈھال کی طرح چوڑے ہوں گے (البخاری، مسلم، ۴: ۲۲۳۳، حدیث ۲۹۱۲)؛ مزید فرمایا: ترکوں کو اس وقت نہ چھیڑنا جب تک وہ تمہیں نہ چھیڑیں۔ یہی وہ قوم ہے جو میری امت سے ملک چھین لے گی (الطبرانی و ابو نعیم)؛ (ز) خاندان بنو شیبہ میں کلید کعبہ رہنے کی پیشین گوئی: فتح مکہ (۸ھ/۶۳۰ء) کو آپؐ نے کعبہ کے پرانے کلید بردار خاندان کے شیبہ بن عثمان اور عثمان بن طلحہ کو کعبہ کی کنجیاں حوالے کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: یہ کنجی سنبھال لو، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے؛ تم سے یہ کنجی ظالم کے سوا کوئی چھین نہیں سکے گا؛ چنانچہ آج تک یہ کلید بنو شیبہ کے پاس ہے اور یزید بن معاویہ کے سوا کسی نے انہیں چھینی (رحمۃ للعالمین، ۳: ص ۱۷۱)؛ (ح) فتح قسطنطینیہ کی خبر: سلطان محمد فاتح نے قسطنطینیہ کو ۸۵۵ھ/۱۴۵۳ء میں فتح کیا، مگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس کی اطلاع بہت پہلے دے دی تھی، اور فرمایا تھا کہ ایک بہترین امیر اور بہترین سپاہ قسطنطنیہ کو فتح کریں گے (ابو داؤد: سنن، ۴: ۴۸۲، حدیث ۴۲۹۴؛ احمد بن حنبل: مسند (عن ابی ہریرہؓ)؛ مسلم، ۴: ۲۲۲۱، حدیث ۲۸۹۷؛ الزرقانی: شرح المواہب، ۷: ۲۰۵ ـ

۰۴۴)؛ (ط) ہلاکت کسریٰ کی خبر: آپؐ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا: جب کسریٰ ہلاک ہو جائے گا تو اس کے بعد کوئی اور کسریٰ نہیں ہو سکے گا (مسلم، ۴: ۲۲۳۷، حدیث ۲۹۱۹)؛ چنانچہ جب کسریٰ یزدگرد عہد عثمانؓ (۲۵ تا ۳۹ھ) میں ہلاک ہو گیا تو آج تک کوئی اور کسریٰ نہیں پیدا ہو سکا؛ اسی طرح فرمایا: جب قیصر ہلاک ہوگا تو اس کے بعد کوئی اور قیصر نہ ہو سکے گا (حوالۂ مذکور)؛ (ی) مسلمانوں کے درمیان باہمی قتل و غارت گری کی خبر: صحیح مسلم میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ایسا وقت مسلمانوں پر ضرور آئے گا جب مسلمان ایک دوسرے کا تلوار سے مقابلہ کریں گے اور ان دونوں کا دعوٰی ایک ہی ہوگا (مسلم، ۳: ۲۲۱۳، حدیث ۲۲۸۸؛ ۲۲۱۴، حدیث ۱۵۷) - ایک دوسرے موقع پر فرمایا: میری امت کی ہلاکت آپس میں قتل و خون ریزی کی وجہ سے ہوگی (کتاب مذکور، ص ۲۲۱۵، حدیث ۲۸۸۹) - ایک دوسری روایت کے مطابق آپؐ نے فرمایا: میری امت تبھی ہلاک ہوگی جب اس کے گناہ بڑھ جائیں گے یا وہ خود ایک دوسرے سے عذر کریں گے، یعنی کام سے جی چرائیں گے (ابو داؤد، ۴: ۵۱۵، ۴۳۴۷)۔

(ک) آپؐ کا مستجاب الدعوات ہونا: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے عقلی معجزات میں آپؐ کا مستجاب الدعوات ہونا بھی شامل ہے۔ آپؐ نے مختلف مواقع پر جو دعائیں مانگیں، خداوند قدوس کی طرف سے جلد یا بدیر ان کی قبولیت کے آثار نمایاں ہوئے۔ یہ خصوصیت کسی متنبی کو ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی۔ مختلف مواقع پر آپؐ نے جو دعائیں مانگیں اور جس طرح وہ مقبول بارگاہ خداوندی ہوئیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(الف) قریش مکہ پر عذاب کا آنا اور دور ہونا: قریش مکہ نے اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کو ستانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی؛ اس لیے ان کی ہدایت کے لیے اب ایک ہی راستہ تھا کہ ان پر کوئی ہلکا پھلکا عذاب آئے، جو انہیں خواب غفلت سے جگا سکے؛ چنانچہ آپؐ نے قریش مکہ کے بارے میں قحط اور غلے کی کمی کی دعا مانگی؛ یہ دعا مقبول ہوئی اور اہل مکہ سخت ترین قحط سالی میں مبتلا کر دیے گئے حتی کہ انہوں نے اس عرصے میں سوکھے چمڑے تک کھائے۔ (جس طرح قریش مکہ کے تین سالہ معاشی مقاطعہ کے زیر اثر خاندان بنی ہاشم پر بھی دور ابتلا آیا تھا)۔ جب وہ آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے تو انہیں دھواں سا نظر آتا۔ جب یہ مصیبت حد سے متجاوز ہوئی تو انہوں نے خدمت نبویؐ میں حاضر ہو کر دعا کی درخواست کی۔ آپؐ نے ان کی آہ و زاری سے متاثر ہو کر دعا مانگی، جس سے پورے علاقے پر فوری طور خوب بارش برسی (البخاری، ۳: ۱: ۳۲۸۲۵۹؛ کتاب التفسیر، سورۃ الدخان)؛ اسی طرح رؤسائے قریش نے عین صحن حرم میں آپؐ کی شان اقدس میں گستاخی کی، چونکہ یہ کعبۂ معلی اور نماز جیسے اسلام کے بنیادی رکن اور خدا کے حضور میں کھڑے ہوئے خدا کے پیارے نبیؐ کی توہین تھی، اس لیے آپؐ نے شر پسندوں کے نام لے کر دعا مانگی؛ چنانچہ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے ان کو غزوۂ بدر میں ذلت کی موت مرتے دیکھا (البخاری، ۴/۸، ۱۱۰: ۳۰۱۳ تا ۳۰۱۴)؛ (ب) ثقیف کے حق میں دعائے خیر: آپؐ اس امید پر کہ چونکہ قریش مکہ انکار پر مصر ہیں، شاید بنو ثقیف ہی دعوت اسلام قبول کر لیں، طائف تشریف لے گئے۔ اس موقع پر بنو ثقیف نے آپؐ سے جو سلوک روا رکھا وہ دنیا کی تاریخ میں ایک

اندوہناک اور افسوسناک واقعہ ہے۔ آپؐ کو اتنے پتھر مارے گئے کہ جسم اطہر لہو لہان ہو گیا۔ بنو ثقیف کے اس ناروا سلوک سے رحمت حق کو جوش آیا اور ملک الجبال، حضرت جبرئیلؑ کی معیت میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بنو ثقیف کو تباہ کرنے کی اجازت طلب کی۔ آپؐ نے فرمایا: کہ اگر بنو ثقیف ایمان نہیں لائے، تو عین ممکن ہے کہ ان کی اولاد کو یہ شرف حاصل ہو جائے (ابن الجوزی: الوفا، ١ : ٢١٢ تا ٢١٣)۔ آپؐ کا یہ ارشاد گویا اس قوم کے لیے دعائے خیر تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سنہ ۹ھ/ ۶۳۱ء میں پوری قوم بنو ثقیف رضا و رغبت سے دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئی، اور یوں آپؐ کی دعا کی قبولیت کے آثار نمایاں ہو گئے؛ (ج) بنو دوس کے لیے دعا: سردار قبیلۂ بنو دوس، طفیلؓ بن عمرو دوسی مشرف با اسلام ہو کر اپنی قوم میں دعوت اسلام کی اجازت کے ساتھ اپنے مستقر کو لوٹ گئے۔ انھوں نے تبلیغ دین کا سلسلہ جاری رکھا، مگر ان کی قوم ذرا بھی متاثر نہ ہوئی۔ اس پر وہ خدمت نبویؐ میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ قوم دوس کے حق میں بددعا مانگی جائے۔ آپؐ نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی اور فرمایا: اے اللہ! قوم دوس کو ہدایت عطا فرما اور مسلمان کر کے لا۔ آپؐ کی یہ دعا قبول ہوئی اور تمام بنو دوس مشرف باسلام ہو گئے (البخاری، ۶۵/ ۱۰۰، ۳ : ۲۲۲)؛ (د) قریش مکہ کے حق میں دعائے خیر: غزوۂ احد میں مسلمانوں کو اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ آپؐ ایک خندق میں گر پڑے اور خود آپؐ کے دانتوں میں پیوست ہو گئی، سارا چہرہ لہو لہان ہو گیا۔ آپؐ کی یہ [illegible] تکلیف دیکھ کر صحابہؓ نے درخواست کی کہ ان کے حق میں بددعا فرمائیے، آپؐ نے فرمایا: اے اللہ! میری قوم کو ہدایت عطا فرما، کیونکہ وہ (میرا مرتبہ) نہیں جانتے (مسلم، ۳ : ۱۴۱۷، حدیث ۱۷۹۲)؛ (ہ) غزوۂ بدر اور غزوۂ احزاب میں دشمن کی ہزیمت کی دعا: غزوۂ بدر میں قریش مکہ اور غزوۂ احزاب [رک بہ خندق: غزوات] میں پورے جزیرۂ عرب کے عرب قبائل اتحاد کر کے مدینہ منورہ کے خلاف جارحانہ عزائم لے کر حملہ آور ہوئے تھے۔ غزوۂ بدر کے موقع پر آپؐ نے دعا مانگی: اے اللہ! یہ قریش طاقت و غرور کے نشے میں سرمست چلے آتے ہیں، ان کے مقابلے پر ہماری مدد فرما (ابن ہشام، ۲ : ۲۲۱) اور غزوۂ احزاب کے موقع پر آپؐ یہ دعا مانگتے رہے: اے اللہ! لشکروں کو شکست دے اور ان کے قدم ڈگمگا دے (البخاری، ۵۶/ ۹۸، ۲ : ۲۳۱)؛ چنانچہ دونوں معرکوں میں مسلمان سرخرو رہے؛ (و) بارش کے لیے دعا: ایک دفعہ عہد نبویؐ میں قحط پڑا۔ انھی دنوں آپؐ ایک خطبہ جمعہ دے رہے تھے کہ ایک اعرابی خدمت اقدسؐ میں حاضر ہوا اور کہا: اے اللہ کے رسولؐ! مال تباہ ہو گیا اور عیال بھوک سے نڈھال ہو گئے، ہمارے لیے دعا فرمائیے۔ آپؐ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ اس وقت آسمان بالکل صاف تھا۔ بخدا آپؐ نے ہاتھ ابھی نیچے بھی نہیں کیے تھے کہ ایک گوشے سے بادل نمودار ہوئے اور آپؐ ابھی منبر پر تھے کہ آپؐ کی ریش مبارک پر بارش کے قطرے نظر آنے لگے۔ بارش کا یہ سلسلہ دراز ہو گیا۔ پورا ہفتہ بارش ہوتی رہی۔ اگلے جمعے کو پھر آپؐ خطبۂ جمعہ دے رہے تھے کہ پھر وہی اعرابی کھڑا ہوا اور کہنے لگا: حضورؐ! مکانات بھی گرنے لگے! دعا کیجیے کہ بارش ختم ہو جائے۔ آپؐ نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی اور فرمایا: الٰہی! گرد و نواح پر برسے، ہم پر نہ

برسے۔ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ اسی وقت بادل چھٹ گئے اور نماز ختم ہونے سے پہلے صاف دھوپ نکل آئی (البخاری، ۱۲/۱۵، ۱ : ۲۵۹)؛ (ز) مدینہ منورہ کی آب و ہوا کے لیے دعا: جب آپؐ ہجرت کرکے مدینہ منورہ آئے تو یہاں کا موسم اتنا خوشگوار نہیں تھا؛ اکثر صحابہؓ بیمار پڑ گئے اور انھیں بار بار اپنا وطن یاد آنے لگا۔ آپؐ نے صحابہؓ کی یہ حالت دیکھی تو فرمایا: الٰہی! مدینہ منورہ کو بھی ہمارے لیے ویسا ہی محبوب بنا دے جیسا کہ مکہ تھا، بلکہ اس سے بھی زیادہ؛ الٰہی! ہمارے صاع اور مد میں برکت دے، اور اس کو ہمارے لیے صحت بخش اور خوشگوار بنا دے (مسلم)۔ یہ دعا حرف بحرف پوری ہوئی۔ اس علاقے کا موسم اور ماحول اتنا خوشگوار ہو گیا کہ مہاجرین اس سے پوری طرح مانوس ہوگئے اور اپنے سابقہ وطن کو بھول گئے۔ موسم کی خوشگواری کا یہ عالم تھا کہ ۶۵۴ھ میں جب یہاں آتش فشاں کے پھٹنے سے بہت بڑی آگ لگی تو راویوں کا کہنا ہے کہ اس آگ کے باوجود مدینہ میں ہوا ٹھنڈی آتی رہی (رحمۃ للعالمین، ۳ : ۱۷۰)؛ (ح) امت کے لیے دعائے خیر و برکت: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اکثر فوج کو صبح کے تڑکے روانہ فرماتے۔ صبح خیزی آپؐ کو ہمیشہ پسند تھی اور ہمیشہ کا معمول بھی رہی۔ ایک موقع پر آپؐ نے صبح سویرے اٹھنے والوں کے حق میں دعائے خیر و برکت کرتے ہوئے فرمایا: اے اللہ! میری امت کو صبح کے اٹھنے میں برکت دے۔ ایک تجارت پیشہ صحابیؓ فرماتے ہیں کہ اس فرمان نبویؐ پر عمل کرتے ہوئے میں ہمیشہ اپنا سامان تجارت صبح سویرے روانہ کرتا ہوں اور اس کی برکت سے مال کی اتنی کثرت ہے کہ رکھنے کو جگہ نہیں ملتی (ابو داؤد)؛ (ط) سلطنت کسریٰ کی تباہی کی بد دعا: کسریٰ ایران نے نہ صرف مکتوب نبویؐ کی توہین کی تھی، بلکہ اس نے گورنر یمن باذان کو حکم دیا تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو گرفتار کرکے اس کے سامنے پیش کرے۔ اس کی اطلاع ملنے پر آپؐ نے بد دعا کی اور فرمایا: اے اللہ جس طرح کسریٰ نے میرے خط کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں، تو اسی طرح کسریٰ کی سلطنت کو پارہ پارہ کر دے (البخاری، ۵۶/۱۰۱، ۲ : ۲۳۲؛ ابن الاثیر: الکامل، ۲ : ۸۱)؛ چنانچہ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں یہ بد دعا پوری ہوئی اور سلطنت کسریٰ اسلامی قلم رو میں شامل کرلی گئی اور آخری حکمران کسریٰ یزد گرد خلافت عثمانی میں ایک کسان کے ہاتھوں مارا گیا؛ (ی) امت کے حق میں تین دعائیں: آپؐ کا ارشاد مبارک ہے کہ میں نے امت کے بارے میں خدا تعالیٰ سے تین دعائیں مانگی تھیں، دو قبول ہو گئیں اور ایک قبول نہیں ہوئی۔ قبول ہونے والی دو دعائیں یہ ہیں کہ اے خدا! میری امت پر کوئی اس طرح کا قحط (عذاب) نہ بھیجنا، جو ان کو مکمل طور پر ہلاک کر دے اور کسی باہر کے ایسے دشمن کو ان پر مسلط نہ کرنا جو ان کو پوری طرح ہلاک کر دے؛ قبول نہ ہونے والی دعا یہ تھی کہ خدا تعالیٰ امت کو آپس کے اختلاف اور انتشار سے محفوظ رکھے (مسلم، ۴ : ۲۲۱۵ تا ۲۲۱۶، حدیث ۲۹۸۹ تا ۲۹۹۰)۔

(ک) مختلف صحابہ کرامؓ کے لیے انفرادی دعائیں: ان اجتماعی دعاؤں کے علاوہ آپؐ نے مختلف صحابہ کرامؓ کے لیے بھی خیر و برکت اور دیگر مقاصد میں کامیابی کے لیے دعائیں کیں، جو پوری طرح مستجاب ہوئیں؛ ایک صحابی ضمرہؓ بن ثعلبہ کے لیے آپؐ نے دعا فرمائی: اے اللہ مشرکین

پر ان کا خون حرام کر دے؛ چنانچہ یہ صحابی بے دھڑک دشمنوں کی صفوں میں گھس جاتے اور پھر صحیح سلامت لوٹ آتے تھے (الطبرانی: معجم الاوسط)؛ حضرت عمر فاروقؓ کے اسلام لانے کے لیے دعا کرتے ہوئے فرمایا: اے اللہ! ابو جہل بن ہشام اور عمر فاروقؓ میں سے جو تیرے نزدیک زیادہ محبوب ہو، اس سے اسلام کو عزت بخش۔ خود آپؐ کے نزدیک عمر فاروقؓ زیادہ محبوب تھے (الترمذی، ۵ : ۶۱۷، حدیث ۳۶۸۱)؛ یہ دعا حضرت عمرؓ کے بارے میں قبول ہوئی۔

ایک صحابی نے آپؐ سے عفت و عصمت کے لیے دعا کی درخواست کی۔ آپؐ نے دعا فرمائی تو اس کا نتیجہ یہ تھا کہ انھیں دوبارہ کبھی اس قسم کا خیال بھی نہ آتا تھا (احمد بن حنبل: مسند؛ البیہقی: شعب الایمان)۔ سراقہ بن مالک بن جعشم نے سفر ہجرت [رک باں] کے دوران میں آپؐ کا اور حضرت ابوبکرؓ کا تعاقب کیا، وہ جب نزدیک آیا تو آپؐ نے اس کے شر سے محفوظ رہنے کی دعا مانگی، اس کے اثر سے اس کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے۔ معافی مانگنے پر آپؐ نے مکرر دعائے خیر کی تو اس کی جان بخشی ہوئی (البخاری، الہجرۃ، ۳ : ۹ تا ۱۴)۔ نجیر بن بجرہ، جو قبیلۂ بنی طے میں سے تھا، اس کے لیے آپؐ نے دعا مانگی کہ خدا تعالیٰ تمھارے دانت سلامت رکھے؛ چنانچہ نوے سال کی عمر تک ان کے دانت سلامت تھے (البیہقی؛ السیوطی: خصائص الکبریٰ، ۱ : ۲۷۸)۔ حضرت انسؓ بن مالک چھوٹے سے تھے۔ ان کی والدہ ان کو آپؐ کی خدمت میں لائیں اور بطور خادم کے پیش کیا اور دعا کی درخواست کی۔ آپؐ نے حضرت انسؓ کے مال اور اولاد میں ترقی کی دعا کی (مسلم، ۴ : ۱۹۲۸ تا ۱۹۲۹، حدیث ۲۴۸۰ تا ۲۴۸۱)۔ اس کا یہ اثر تھا کہ حضرت انسؓ فرمایا کرتے تھے کہ میرے پاس مال و دولت کی بھی کثرت ہے اور اولاد کی بھی؛ چنانچہ لڑکوں، پوتوں وغیرہ کی تعداد ۱۰۰ کے قریب پہنچ گئی تھی۔ ان کا باغ سال میں دو مرتبہ پھل دیا کرتا تھا (الترمذی، ۵ : ۶۸۳)۔ حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف فرمایا کرتے تھے کہ مجھے ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بارک اللہ لک (اللہ تجھے برکت دے) فرمایا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر میں پتھر بھی اٹھا لاتا ہوں تو اس سے بھی مجھے توقع ہوتی ہے کہ یہ سونا اور چاندی ہو جائے گا (البخاری)۔ حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ کو دعائے علم دیتے ہوئے فرمایا: اے اللہ! ان کو دین کی سمجھ عطا فرما اور انھیں تاویل (تفسیر) کا علم سکھا (مسلم، ۴ : ۱۹۲۷، حدیث ۲۴۷۷)۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مبہمات مسائل بھی ان پر آسان ہو گئے تھے اور انھوں نے حبر الامۃ کا لقب پایا۔ ایک مرتبہ مالکؓ بن ربیعہ السلولی کو کثرت اولاد کی دعا دی۔ حضرت مالکؓ فرماتے ہیں کہ میرے لڑکوں کی تعداد اسی کے قریب ہے (ابن عساکر: مستدرک)۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے لیے صحت یابی کی دعا مانگی تو ان کی شدید بیماری دور ہو گئی (النسائی، ۲ : ۱۲۶، کتاب الوصیۃ)۔ انھی کے بارے میں منقول ہے کہ آپؐ نے ان کے مستجاب الدعوات ہونے کی دعا مانگی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ ان کی ہر دعا قبول ہو جاتی تھی (البخاری، الصلوۃ)۔ ایک مرتبہ حضرت ابو طلحہؓ کا ایک بچہ رحلت کر گیا۔ اسی رات ابو طلحہؓ سفر سے واپس لوٹے تھے۔ ان کی بیوی نے اس خیال سے کہ ان کے خاوند کو پریشانی ہوگی بتانا مناسب نہ سمجھا اور خود تنہا جاگ کر رات گزار دی؛ آپؐ کو پتہ چلا تو آپؐ نے اس جوڑے کے لیے خیر و

برکت کی دعا کی۔ ایک انصاری کہتے ہیں کہ میں نے ابو طلحہؓ کی نو اولادیں دیکھی ہیں اور سب کی سب قرآن کی حافظ (البخاری، کتاب الجنائز ۱ : ۳۲۸)۔ اسی طرح حضرت عروہؓ کے حق میں دعاے خیر و برکت کی۔ حضرت عروہؓ فرماتے ہیں کہ اس کا اثر یہ ہوا کہ اگر میں مٹی میں بھی ہاتھ ڈالتا ہوں تو وہ سونا ہو جاتی ہے (البخاری)۔ ایک مغرور شخص الٹے ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ سیدھے ہاتھ سے کھانا کھاؤ۔ اس نے کہا میں نہیں کھا سکتا، آپؐ نے فرمایا: خدا کرے ایسا ہی ہو! چنانچہ اس کے بعد وہ فی الواقع اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر منہ تک نہیں لے جا سکتا تھا (مسلم)۔ حضرت ابو ہریرہؓ اپنی والدہ کے بارے میں اکثر پریشان رہتے تھے۔ ایک دفعہ خدمت اقدسؐ میں حاضر ہوئے تو ماں کے شرک اور کفر کی وجہ سے سخت کبیدہ خاطر تھے اور تقریباً روتے ہوئے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! میری والدہ کی ہدایت کے لیے دعا کیجیے۔ آپؐ نے اسی وقت دعا مانگی۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں گھر لوٹا تو ماں کو غسل کرتے پایا۔ غسل فرما چکیں تو کنڈی کھولی اور کلمۂ طیبہ پڑھ کر مسلمان ہو گئیں (مسلم، ۴: ۱۹۳۸ تا ۱۹۳۹، حدیث ۲۴۹۱)۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی قوت حافظہ کے لیے دعا مانگی تو ان کا حافظہ اتنا قوی ہو گیا کہ جو بات ایک دفعہ سن لیتے تھے کبھی بھولتے نہیں تھے (مسلم، ۴ : ۱۹۳۸، حدیث ۲۴۹۲ تا ۲۴۹۳)۔ عوام الناس میں ان کی محبت و مقبولیت کے لیے دعا مانگی تو اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر دیکھنے والا ان سے محبت کرتا تھا (مسلم، ۴ : ۱۹۳۹، حدیث ۲۴۹۱)۔ حضرت جریرؓ بن عبداللہ گھوڑے پر ٹھیک طرح بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ آپؐ نے ان کے گھوڑے پر ثابت قدم رہنے کے لیے دعا مانگی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ تیز سے تیز دوڑ میں گھوڑے پر ثابت قدم رہتے تھے (کتاب مذکور، ۴ : ۱۹۲۶، حدیث ۲۴۷۶)۔ اس قسم کی بے شمار دعائیں منقول ہیں، جن سے آپؐ کی عنداللہ مقبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

(۲) حسی معجزات: حسی معجزات سے مراد وہ معجزات ہیں جن کو حواس خمسہ کے ذریعے محسوس کیا جا سکتا ہے اور جن کی خبر عینی شاہدوں اور پھر محسوس کرنے والوں کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے۔ حسی معجزات کو پھر دو اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(الف) قرآن مجید میں بیان شدہ معجزات؛

(ب) احادیث میں مندرج معجزات۔

(الف) قرآن مجید میں بیان شدہ معجزات: قرآن مجید بذات خود بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے عظیم اور لافانی معجزات میں سے ہے (دیکھیے بالا)۔ اس کے علاوہ اس میں آپؐ کے متعدد معجزات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے، چند حسب ذیل ہیں:

(۱) شق قمر: روایت ہے کہ بعض مشرکین نے یہ مطالبہ کیا کہ انھیں چاند کو دو ٹکڑے کر کے دکھایا جائے۔ آپؐ نے اشارہ فرمایا تو چاند دو نیم ہو گیا۔ اس واقعہ کے متعلق ارشاد ہے: اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ○ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (۵۴ [قمر] : ۱ تا ۲)، یعنی قیامت قریب آ گئی اور چاند دو شق ہو گیا۔ اور اگر (کافر) کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایک ہمیشہ کا جادو ہے۔ انشقاق قمر کا یہ معجزہ امام بخاری (۵۴/۶۵، ۳ : ۳۴۱)، مسلم، الترمذی (۳ : ۲۹۷، حدیث ۳۲۸۵ دو مرتبہ کی تصریح سے)، ابو داؤد

الطیالسی، الحاکم، البیہقی، ابو نعیم وغیرہ نے بالتصریح نقل کیا ہے، اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، انسؓ بن مالک، جبیرؓ بن مطعم نوفلی، علیؓ ابن ابی طالب اور حذیفہؓ بن یمان وغیرہ کی روایت سے منقول ہے، ان کی یہ روایت ذاتی شہادت پر مبنی ہے، یعنی ان صحابہ کرامؓ نے اپنی آنکھوں سے چاند کو دو ٹکڑے دیکھا؛ اس وقت کہ ایک ٹکڑا پہاڑ کے ایک طرف تھا اور دوسرا دوسری طرف (تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے سید سلیمان ندوی: سیرة النبی، ۳: ۵۶۰ تا ۵۶۷؛ قاضی سلیمان سلمان منصور پوری: رحمة للعالمین، ۳: ۱۵۸ تا ۱۶۲ بہم معجزہ شق القمر کے وقت اور مختلف ممالک کے اوقات کا ٹائم ٹیبل)؛ (۲) جنات کی حاضری اور قبول اسلام: جنات [رک بہ جن] ایک لطیف اور غیر مرئی مخلوق ہیں، مگر اللہ تعالٰی کے حکم سے بعض افراد انسانی پر ان کو آشکارا کر دیا جاتا ہے؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت اقدس میں متعدد مرتبہ جنات کی جماعتیں حاضر ہوئیں اور انھوں نے اسلام قبول کیا؛ قرآن مجید میں ارشاد ہے: وَ اِذْ صَرَفْنَآ اِلَیْکَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا (۴۶ [الاحقاف]: ۲۹)، یعنی اور جب ہم نے جنوں میں سے کئی شخص تمہاری طرف متوجہ کیے کہ قرآن سنیں تو جب وہ پاس آئے تو کہنے لگے کہ خاموش رہو۔ نیز فرمایا: قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (۷۲ [الجن]: ۱)، یعنی اے پیغمبرؐ (لوگوں سے) کہہ دو کہ میری طرف وحی کی گئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے اس کتاب کو سنا تو کہنے لگے کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا۔ حضورؐ کے سامنے جنات کا ظاہر ہونا اور آپؐ کی نبوت و رسالت پر ایمان کا اظہار کرنا، خوارق عادت میں سے ہے، جو تائید ایزدی کے بغیر ناممکن ہے؛ (۳) شہب ثاقب کی کثرت: آپؐ کے زمانۂ اقدس میں ایک غیر معمولی امر جس نے جنات جیسی سرکش اور متمرد قوتوں کو جستجوئے حق پر آمادہ کیا، شہب ثاقب کی کثرت بھی تھا۔ ارشاد باری ہے: وَّ اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِیْدًا وَّ شُهُبًا ۙ (۷۲ [الجن]: ۸)، یعنی (اور جنات کہنے لگے) ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو اس کو مضبوط چوکیداروں اور انگاروں سے بھرا پایا۔ شہب ثاقب کا اگرچہ عام دنوں میں بھی نزول ہوتا رہتا ہے، مگر آپؐ کے زمانۂ اقدس میں اس کا خصوصی اور بکثرت نزول، غیر معمولی باتوں میں سے ایک ہے؛ (۴) قریش پر قحط سالی کا عذاب: سورۃ الدخان میں ارشاد ہے: فَارْتَقِبْ یَوْمَ تَاْتِی السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِیْنٍ ۝ یَّغْشَی النَّاسَ ؕ هٰذَا عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۴۴ [الدخان]: ۱۰ تا ۱۱)، یعنی تو اس دن کا انتظار کر کہ آسمان سے صریح دھواں نکلے گا جو لوگوں کو چھپا لے گا، یہ درد دینے والا عذاب ہے۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود فرماتے ہیں کہ قریش پر ان کے انکار اور معاندانہ رویے کی بنا پر سخت قسم کی خشک سالی اور قحط کی حالت مسلط کر دی گئی۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگوں نے بھوک کی وجہ سے مردار کے چمڑے تک کھائے۔ جب وہ آسمان کی طرف دیکھتے تو انھیں دھواں نظر آتا، بالآخر آپؐ کی دعا سے یہ عذاب ان سے موقوف ہوا (البخاری، ۶۵/۴۴، ۳: ۳۲۸)؛ (۵) سفر معراج: آپؐ کی زندگی مبارک کا جو سب سے انوکھا اور منفرد واقعہ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے وہ آپؐ کا سفر معراج ہے؛ یہ عجیب و غریب، اور کسی انسانی طاقت سے ماورا سفر ایک ہی رات بلکہ ایک ہی لمحے میں مکمل ہوا۔ یہ سفر خواب میں

نہیں تھا، کیونکہ خواب میں کسی شخص کا سفر، سفر نہیں کہلاتا اور نہ ہی خواب میں دیکھی ہوئی چیز کو سیر کرنا کہتے ہیں۔ سفر معراج دو مرحلوں (مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک اور بیت المقدس سے عرش معلٰی تک) میں مکمل ہوا۔ ان میں سے پہلے مرحلے کا قرآن مجید میں صراحۃً ذکر کیا گیا ہے، ارشاد ہے: سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا (۱۷ [بنی اسراءیل]: ۱)، یعنی وہ (ذات) پاک ہے جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام (یعنی خانہ کعبہ) سے مسجد اقصی (یعنی بیت المقدس) تک، جس کے گردا گرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں، لے گیا تاکہ ہم اسے اپنی (قدرت کی) کچھ نشانیاں دکھوائیں۔ دوسرے مرحلے کا ذکر قرآن مجید (۵۳ [النجم]: ۸ تا ۱۲) میں کنایۃً اور متفقہ روایات میں صراحۃً و تفصیلاً کیا گیا ہے۔ الزرقانی (شرح المواهب اللدنیہ) کے بقول اس واقعے کے ناقلین کی مجموعی تعداد ۴۵ کے قریب ہے، اور حدیث و سیر اور تاریخ کی تقریباً سبھی کتابوں میں منقول و مشہور ہے۔ راویوں میں حضرت ابو ذرؓ، مالک بن صعصعہؓ، انسؓ بن مالک، عبداللہؓ بن عباسؓ، ابو ہریرہؓ، جابرؓ بن عبداللہ اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر راوی ایسے ہیں جنھوں نے یہ واقعہ خود حضورؐ کی زبان اقدس سے سنا (تفصیلات کے لیے دیکھیے الزرقانی: شرح المواهب، ۶: ۳۵۵ تا ۳۵۸؛ قاضی عیاض: الشفاء، مطبوعہ بریلی، ص ۸۰ - ۹۶؛ ابن القیم: زاد المعاد، ۳: ۳۳ تا ۳۴، مطبوعہ بیروت ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء؛ شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغہ، کراچی، ص ۲۰۰ تا ۲۰۷؛ سید سلیمان ندوی: سیرۃ النبی، ۳: ۳۹۳ تا ۴۸۴ [نیز رک بہ اسراء؛ معراج])؛ (۶) ہجرت کے موقع پر دشمنوں نے آپؐ کے گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور اس بات پر اتفاق کر لیا تھا کہ (معاذ اللہ) آپؐ کا قضیہ ہی ختم کر دیا جائے، مگر آپؐ دشمنوں سے بچتے ہوئے نکل آئے۔ دوران سفر بھی کئی مواقع ایسے آئے کہ جب دشمن آپؐ کے سر پر پہنچ گئے تھے، مگر تائید ایزدی نے آپؐ کو دشمنوں کی دسترس سے محفوظ رکھا، ارشاد ہے: وَاِذْ یَمْكُرُ بِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ اَوْ یُخْرِجُوْكَ ؕ وَیَمْكُرُوْنَ وَیَمْكُرُ اللّٰهُ (۸ [الانفال]: ۳۰)، یعنی اور (اے محمدؐ) اس وقت کو یاد کرو جب کافر لوگ تمہارے بارے میں چال چل رہے تھے کہ تم کو قید کر دیں، یا جان سے مار دیں یا وطن سے نکال دیں تو ادھر تو وہ چال چل رہے تھے اور ادھر خدا چال چل رہا تھا اور خدا سب سے بہتر چال چلنے والا ہے۔ سورۃ التوبہ میں ارشاد فرمایا: اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِیْنَتَهٗ عَلَیْهِ وَاَیَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا (۹ [التوبہ]: ۴۰)، یعنی اگر تم پیغمبرؐ کی مدد نہ کرو گے تو خدا ان کا مددگار ہے، (وہ وقت تم کو یاد ہوگا) جب ان کو کافروں نے گھر سے نکال دیا (اس وقت) دو (ہی شخص تھے جن) میں (ایک ابوبکرؓ) دوسرے (خود رسول اللہؐ) جب وہ دونوں غار (ثور) میں تھے اس وقت پیغمبرؐ اپنے رفیق کو تسلی دیتے تھے کہ غم نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے، تو خدا نے ان پر تسکین نازل فرمائی اور ان کو ایسے لشکروں سے مدد دی جو تم کو نظر نہیں آتے۔ ان دونوں آیات میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ گرچہ دشمنوں کی تدبیریں بڑی سخت تھیں، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو تائید ایزدی حاصل تھی؛ اسی بنا پر آپؐ ان جملہ مشکلات سے

گزر گئے۔ (سفر ہجرت کی تفصیلات کے لیے [رک بہ ہجرت]) ؛ اس موقع کے معجزات کی تفصیل کے لیے دیکھیے البخاری ، ۶۳/۴۵ ، ۳ : ۴۳ تا ۴۴ ؛ السیوطی : الخصائص الکبری ، ۱ : ۱۲۱ تا ۱۲۲) ؛ (۷) غزوۂ بدر کے موقع پر نزول ملائکۃ : ارشاد باری ہے : اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّىْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ (۸ [الانفال] : ۹)، یعنی جب تم اپنے پروردگار سے دعا کرتے تھے اس نے تمہاری دعا قبول کر لی اور فرمایا کہ (تسلی رکھو) ہم ہزار فرشتوں سے ، جو ایک دوسرے کے پیچھے آتے جائیں گے تمہاری مدد کریں گے۔ ملائکہ ایک لطیف و غیر مرئی مخلوق ہیں۔ ان کا نزول تائید ایزدی کا مظہر ہے ، جو جنگ کے نتیجے سے بخوبی ظاہر ہو رہا ہے ؛ (۸) آپؐ کا دشمن پر کنکریاں پھینکنا : غزوۂ بدر کے دوران میں آپؐ نے اپنے ہاتھ میں کنکریاں لیں اور انھیں دشمن پر پھینک دیا۔ چونکہ دشمن کا رخ مسلمانوں کی طرف تھا ، اور ہوا ان کے سامنے سے پیچھے کو چل رہی تھی ، اس لیے یہ تدبیر کارگر ہوئی اور اس طرح دشمنوں کے سامنے میدان جنگ کا منظر اوجھل ہو گیا ، دوسری طرف مسلمانوں کی تلواریں اپنا کام دکھا رہی تھیں ، اس موقع کے لیے ارشاد ہے : وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۸ [الانفال] : ۱۷) ، یعنی اور (اے محمدؐ) جس وقت تم نے وہ ریت یا کنکریاں پھینکی تھیں تو وہ تم نے نہیں پھینکی تھیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ کنکریاں پھینک دینا تو بلاشبہہ آپؐ کا فعل تھا ، مگر ان کو دشمن کی آنکھوں میں پہنچا دینا اور پھر اس معمولی سے فعل کو جنگ کی قسمت کا فیصلہ کر دینے والا بنا دینا خدا کی تائید اور مشیت کے بغیر ممکن نہیں ؛ (۹) غزوۂ احد میں نیند کا طاری ہونا : غزوۂ احد میں مسلمانوں کو بظاہر خاصا جانی نقصان اٹھانا پڑا اور رہے سہے مسلمان بھی حواس باختہ ہو کر جوہر شجاعت کھو بیٹھے تھے ، چنانچہ مشیت ایزدی نے ان میں یہ وصف دوبارہ پیدا کرنے کے لیے اور ان میں غزوۂ بدر والی ہمّت و چستی بیدار کرنے کے لیے ان پر نیند کا خمار طاری کر دیا ، جس کے بعد وہ دوبارہ چاک و چوبند دستوں میں بدل گئے تھے اور سابقہ کا غم ان کے دلوں سے دور ہو گیا تھا ، ارشاد ہے : ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ (۳ [آل عمران] : ۱۵۴) ، یعنی پھر خدا نے رنج و غم کے بعد تم پر تسلی نازل فرمائی یعنی نیند کہ تم میں سے ایک جماعت پر طاری ہو گئی (ابو طلحہؓ کی عینی شہادت کے لیے دیکھیے البخاری ۶۵/۳ ، ۳ : ۲۱۸) ؛ (۱۰) غزوۂ احزاب کا وقوع اور اس میں فتح کا وعدہ : غزوۂ احزاب میں عرب کے شمالی اور جنوبی علاقوں سے تعلق رکھنے والے بہت سے قبیلوں نے مسلمانوں کے خلاف باہمی اتحاد کر لیا تھا۔ دشمن کی اہل اسلام کے خلاف یہ سب سے بڑی جارحیت تھی۔ اس طرح کی جارحانہ کارروائی کی عرب کی گزشتہ تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس متحدہ عرب قوت کے حملے کی پیشگی اطلاع دے دی تھی ، اس لیے جب مسلمانوں نے عرب کے متحدہ لشکر کو آتا دیکھا تو انھیں اللہ پر اور اللہ کے رسول برحق پر یقین اور مستحکم ہو گیا ؛ ارشاد ہے : وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ز وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا (۳۳ [الاحزاب] : ۲۲) ، یعنی جب مومنوں نے (کافروں کے) لشکر کو دیکھا تو کہنے لگے یہ وہی ہے جس کا خدا اور اس کے پیغمبرؐ نے ہم سے

وعدہ کیا تھا اور خدا اور اس کے پیغمبرؐ نے سچ ہی کہا تھا اور اس سے ان کا ایمان اور اطاعت اور زیادہ ہو گئی؛ (۱۱) ہواؤں سے نصرت: غزوۂ احزاب میں اللہ تعالٰی نے مسلمانوں کی تند و تیز آندھی سے مدد فرمائی، جس نے تمام دشمنوں کو منتشر ہونے پر مجبور کر دیا۔ یہ آندھی اتفاقیہ واقعہ نہ تھا، بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تائید غیبی کا مظہر تھا۔ ارشاد ہے: یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا وَّ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا (۳۳ [الاحزاب] : ۹)، یعنی اے اہل ایمان خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جو (اس نے) تم پر (اس وقت) کی، جب فوجیں تم پر (حملہ کرنے) آئیں تو ہم نے ان پر ہوا بھیجی اور ایسے لشکر (نازل کیے) جن کو تم دیکھ نہیں سکتے۔ اسی بنا پر آپؐ اکثر فرمایا کرتے تھے: صدق اللّٰہ وعدہٗ و نصر عبدہٗ و ھزم الاحزاب وحدہٗ (البخاری) اللہ تعالٰی نے اپنا وعدہ پورا کیا، دشمن کو تنہا ہزیمت دی اور اپنے بندے کو کامیاب کیا؛ (۱۲) مکہ مکرمہ میں فاتحانہ داخلے کی اطلاع: ۶ھ میں آپؐ نے اپنے ایک خواب سے اطلاع پا کر فتح مکہ کی خبر دی۔ صحابہ کرامؓ یہ خبر سن کر بڑے خوش ہوے، مگر جب لشکر اسلام مقام حدیبیہ میں پہنچا تو دشمن نے روک لیا اور بالآخر صلح ہو گئی اور اسی صلح کے نتیجے میں دو سال بعد مکہ فتح ہو گیا۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے: لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْیَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ مُحَلِّقِیْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ مُقَصِّرِیْنَ لَا تَخَافُوْنَ (۴۸ [الفتح] : ۲۷)، یعنی بے شک خدا نے اپنے پیغمبرؐ کو سچا (اور) صحیح خواب دکھایا کہ خدا نے چاہا تو تم مسجد حرام میں اپنے سر منڈوا کر اور اپنے بال کتروا کر امن و امان سے داخل ہوگے اور کسی طرح کا خوف نہ کروگے؛ (۱۳) صلح حدیبیہ میں بیعت رضوان دو عظیم فتوحات کا پیش خیمہ تھی: صلح حدیبیہ میں آپؐ کو جب دشمنوں نے مقام حدیبیہ پر روک لیا اور واپس لوٹ جانے پر اصرار کیا اور ادھر قاصد نبوی حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر لشکر اسلام میں پہنچی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر بیعت لی، جسے اصطلاح قرآن میں بیعت رضوان کہا جاتا ہے۔ یہ بیعت رضاے خداوندی کے عین مطابق تھی۔ ارشاد باری ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ ۚ (۴۸ [الفتح] : ۱۰)، یعنی جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں، وہ خدا سے بیعت کرتے ہیں، خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ بالآخر یہی بیعت دو عظیم فتوحات، یعنی فتح خیبر اور فتح مکہ کا باعث ہوئی؛ (۱۴) غزوۂ حنین میں فتح و نصرت: غزوۂ حنین آپؐ کی زندگی کا واحد غزوہ ہے کہ جس میں مسلمانوں کی تعداد دشمن سے زیادہ تھی (تقریبًا ایک اور تین کی نسبت تھی) اور اسی بنا پر بعض صحابہ کرامؓ کو اپنی ظاہری طاقت و قوت پر بھروسا ہو گیا تھا، لیکن جس وقت لشکر اسلام ہوازنی تیر اندازوں کی زد میں آیا تو ہراول کے قدم اکھڑ گئے۔ اس کے ساتھ ہی تمام لشکر میں موجود مجاہدین نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا اور میدان جنگ میں صرف آپؐ اور چند جاں نثار باقی رہ گئے تھے؛ ایک لحاظ سے مسلمان تقریبًا یہ جنگ ہارنے کو تھے کہ اسی وقت آسمان سے فتح و نصرت نازل ہوئی اور آپؐ کے بلانے پر بھاگنے والوں کے قدم واپس مڑنے لگے۔ آپؐ نے صفوں کو دوبارہ منظم کیا اور یک بارگی حملے سے دشمن کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور

کر دیا۔ اس جنگ میں فتح و نصرت یقیناً امداد غیبی کی رہین منت تھی، اسی لیے ارشاد فرمایا: لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۝ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَعَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا (۹ [التوبہ] : ۲۵ تا ۲۶)، یعنی خدا نے بہت سے موقعوں پر تم کو مدد دی ہے، اور (جنگ) حنین کے دن بھی جب کہ تم کو اپنی (جماعت کی) کثرت پر غرہ تھا، تو وہ تمہارے کچھ بھی کام نہ آئی، اور زمین باوجود (اتنی بڑی) فراخی کے تم پر تنگ ہو گئی پھر تم پیٹھ پھیر کر پھر گئے، پھر خدا نے اپنے پیغمبر ؐ پر اور مومنوں پر اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی (اور تمہاری مدد کو فرشتوں کے) لشکر جو تمہیں نظر نہیں آتے تھے (آسمان) سے اتارے: (۵) علوم غیب پر اطلاع: نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا سب سے حیرت انگیز وصف آپ ؐ کا علوم غیب پر اطلاع پانا ہے (دیکھیے بالا): خود قرآن حکیم اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، لیکن آپ ؐ کی وحی صرف قرآن تک ہی محدود نہیں ہوتی تھی بلکہ قول حال اور ہر قسم کی گفتگو بھی اسی کے زیر سایہ پروان چڑھتی تھی، اسی لیے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (۵۳ [النجم] : ۳ تا ۴)، یعنی اور نہ آپ ؐ خواہش نفس سے منہ سے بات نکالتے ہیں، یہ تو حکم خدا ہے جو ان کی طرف بھیجا جاتا ہے، اسی وحی کے ذریعے آپ ؐ ہر قسم کی مخفی باتوں پر اطلاع پاتے تھے حتی کہ دشمن کی خفیہ باتوں پر سے پردے اٹھاتے تھے، اسی لیے ارشاد فرمایا: يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ (۹ [التوبہ] : ۶۵)، یعنی منافق ڈرتے رہتے ہیں کہ ان (پیغمبر ؐ) پر کوئی ایسی سورت نہ اتر آئے کہ ان کے دل کی باتوں کو مسلمانوں پر ظاہر کر دے، کہہ دو ہنسی کیے جاؤ، جس بات سے تم ڈرتے ہو خدا اس کو ضرور ظاہر کرے گا (نیز دیکھیے بالا).

(ب) کتب احادیث میں مذکور معجزات: معجزات نبوی ؐ کی دوسری قسم وہ ہے، جن کا ذکر کتب احادیث میں ملتا ہے، تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) معجزات یمن و برکت: قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ وہ احادیث جن میں آپ ؐ سے یمن و برکت کے ظاہر ہونے کا ذکر ہے، کثیر تعداد میں مروی ہیں (الشفا، ص ۱۴۱؛) اور اس نوع کی روایات کو ہر امام حدیث نے اپنے احادیث کے مجموعے میں جگہ دی ہے: (الف) امام بخاری ؒ (۲ : ۳۹۸)، حضرت انس ؓ کے حوالے سے نقل فرماتے ہیں کہ حضرت ابو طلحہ ؓ (زید بن سہل انصاری) نے ایک مرتبہ آپ ؐ کی آواز سے یہ محسوس کیا کہ آپ ؐ کئی روز سے بھوکے ہیں: انھوں نے اپنی اہلیہ (ام سلیم ؓ) کے مشورے سے آپ ؐ کی ضیافت کا اہتمام کیا: کھانا اتنا کم تھا کہ بمشکل ایک دو آدمیوں کو کفایت کر سکتا تھا، مگر آپ ؐ اپنے ساتھ قریب اسی آدمی لے آئے، اور کھانا منگوا کر اس پر کچھ پھونکا، پھر دس دس آدمیوں کی ٹولیوں نے (سات یا آٹھ مرتبہ) اسے پیٹ بھر کر کھایا۔ ابن حجر کے مطابق افراد ۸۰ سے بھی زائد تھے، ان کے شکم سیر ہونے کے بعد آپ ؐ نے بھی کھایا، پھر اس سے گھر والوں نے کھایا، مگر پھر بھی وہ کھانا بچا رہا (فتح الباری، ۶ : ۵۹۱): (ب) اسی طرح کی ایک روایت حضرت جابر ؓ سے بھی مروی ہے: وہ فرماتے ہیں کہ مجھ پر میرے والد کا لیا ہوا بہت سا قرض تھا۔ ادائی کا واحد ذریعہ

کھجوریں تھیں۔ جب وہ پک گئیں، تو میں اس خیال سے کہ مبادا قرض خواہ مجھ سے بد سلوکی کریں، آپؐ کو بلا کر لے گیا۔ کھجوروں کے ڈھیر سے بظاہر یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان سے قرض اتارا جا سکے گا۔ آپؐ نے کھجوروں کے ڈھیر کا ایک چکر لگایا اور دعا فرمائی اور پھر فرمایا: ماپنا شروع کر دو۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ آپؐ کے قدوم میمنت کی برکت سے میں نے اسی ڈھیر سے تمام قرض چکا دیا اور پھر تقریباً اتنی ہی تعداد میں کھجوریں بچ بھی رہیں (البخاری، ۲ : ۲۱۹)؛ (ج) اسی طرح حضرت ابوبکرؓ کے گھر سے آئے ہوئے کھانے کو جو بمشکل دو آدمیوں کو کفایت کر سکتا تھا، بارہ سے زائد آدمیوں نے کھایا (کتاب مذکور، ص ۴۰۰؛ فتح الباری، ۶ : ۵۹۶ تا ۵۹۸)؛ (د) ایک صحابیہ ایک برتن میں سے حضورؐ کو گھی دیا کرتی تھیں۔ گھی ختم ہو گیا، مگر اس کے باوجود جب بھی وہ اس میں ہاتھ ڈالتیں گھی نکل آتا، یہاں تک کہ اس نے اس کو نچوڑ لیا، آپؐ نے فرمایا اگر تم اسے نہ نچوڑتیں تو ہمیشہ اس میں گھی باقی رہتا (مسلم، ۴ : ۱۷۸۴، حدیث ۲۲۸۰)؛ (ہ) حضرت جابرؓ نے غزوۂ خندق کے موقع پر آپؐ کی نقاہت دیکھ کر آپؐ کی دعوت کا اہتمام کیا۔ گھر میں موجود ایک بکری کا بچہ ذبح کیا اور تھوڑا سا آٹا گوندھ کر آپؐ کو اطلاع دی؛ کھانا اتنا کم تھا کہ بمشکل پانچ آدمیوں کا گزارا ہو سکتا تھا، مگر آپؐ نے آواز دے کر اپنے ساتھ پورے لشکر کو بلا لیا اور حضرت جابرؓ سے فرمایا کہ جب تک میں نہ آ جاؤں ہنڈیا کو چولھے سے نہ اتارا جائے اور نہ روٹیاں پکانی شروع کی جائیں؛ ایسا ہی کیا گیا۔ آپؐ تشریف لائے تو دونوں میں لعاب دہن ڈال کر دعا دی اور پھر حضرت جابرؓ کی اہلیہؓ سے فرمایا کہ روٹیاں پکا پکا کر دیتی رہو، چنانچہ ایک ہزار کے قریب صحابہؓ نے شکم سیر ہو کر یہ کھانا کھایا اور پھر بھی گوشت اور آٹا جوں کا توں رہا، آخر میں گھر والوں نے اور پھر آپؐ نے تناول فرمایا (البخاری، ۶۴/۲۹، ۳ : ۹۴ تا ۹۵، باب غزوۂ خندق)؛ (و) ایک دفعہ ایک شخص نے آپؐ سے کچھ مانگا، آپؐ نے اسے جو کی تھوڑی سی مقدار مرحمت فرما دی۔ وہ شخص روزانہ اس میں سے اپنے اہل و عیال اور مہمان کے لیے خرچ کرتا، مگر وہ غلہ جوں کا توں موجود رہا، آخر میں اس نے اس میں موجود تمام جو نکالے اور انہیں تول لیا۔ آپؐ کو علم ہوا تو فرمایا، اگر تم نہ تولتے تو ہمیشہ ایک حالت پر قائم رہتا (مسلم، ۴ : ۱۷۸۴)؛ (ز) اسی طرح غزوۂ خیبر کے دوران سفر میں زاد راہ کی کمی ہو گئی۔ آپؐ نے ہر شخص سے اپنا اپنا سامان پیش کرنے کو کہا۔ جب سب نے ایسا کر دیا، تو آپؐ نے دعائے خیر فرمائی۔ اس کی برکت سے وہ سامان اتنا بڑھا کہ ہر شخص نے اپنے برتن اس سے بھر لیے اور پیٹ بھر کر کھانے کے باوجود بھی بچ رہا (مسلم، ۱ : ۵۷، حدیث ۲۷)؛ (ح) ایک دوسرے سفر میں ایک صاع آٹے اور ایک بکری کے گوشت سے ۱۳۰ کے قریب صحابہؓ کے شکم سیر ہونے کا ذکر ملتا ہے (البخاری، ۷۰/۶، ۳ : ۴۹۳، کتاب الاطعمة)؛ (ط) حضرت زینبؓ کے نکاح کے ولیمے کے موقعہ پر ایک تھال (طشت) میں معمولی سے حیس (ایک قسم کا میٹھا کھانا) میں اتنی برکت ہوئی کہ دس دس کی ٹولیوں میں تقریباً تین سو آدمیوں نے شکم سیر ہو کر کھایا، مگر پھر بھی اتنا کھانا بچ رہا کہ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نہیں جان سکا کہ جب کھانا رکھا گیا تھا

اس وقت زیادہ تھا، یا جب اٹھایا گیا، اس وقت اس کی مقدار زیادہ تھی (مسلم، ۲ : ۱۰۳۸، تا ۱۰۵۲، حدیث ۱۳۲۸)؛ (ی) دودھ کے ایک پیالے سے اصحاب صُفّہؓ میں سے ستر افراد نے پیٹ بھر کر دودھ پیا، مگر پھر بھی اس کی مقدار کم نہ ہوئی (البخاری، ۸۱ / ۱۷، ۴ : ۲۲۰ تا ۲۲۱، کتاب الرقاق)؛ (ک) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب آپؐ کا وصال ہوا تو گھر میں کھانے کو جو کے ایک وسق (ایک مقدار) کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہم اسی میں سے کھاتے رہے اور وہ ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا، یہاں تک کہ ہم نے اس میں موجود جو نکال کر تول لیے، جس سے اس کی برکت جاتی رہی (البخاری)؛ (ل) ایک موقع پر آپؐ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو تھوڑی سی کھجوریں برکت کی دعا کے ساتھ عنایت فرمائیں۔ وہ اتنی بڑھیں کہ وہ مدتوں اس توشہ دان میں سے نکال نکال کر کھاتے رہے اور ۵۰ وسق تو راہ خدا میں خیرات کر ڈالیں، مگر اس کے باوجود اس میں کھجوریں کم نہ ہوئیں (مسند احمد، مسند ہریرہؓ).

(۲) پانی جاری ہونا: برکت ہی کی ایک قسم آپؐ کی انگلیوں میں سے پانی کا رواں ہونا بھی ہے، مگر فرق یہ ہے کہ کھانے وغیرہ میں برکت محض مخفی طریقے سے ہوتی تھی، جب کہ پانی کا رواں ہونا ظاہر و باہر تھا۔ قدیم انبیا میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام واحد نبی ہیں جن کے عصا مارنے سے پتھر میں سے پانی کے چشمے رواں ہوئے، مگر سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے متعدد مواقع پر یہ معجزات ظاہر ہوئے؛ (الف) امام بخاریؒ حضرت انسؓ سے نقل فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپؐ مقام الزوراء میں تھے کہ آپؐ کے سامنے ایک پانی کا برتن لایا گیا، آپؐ نے اس میں ہاتھ ڈالا تو پانی آپؐ کی انگلیوں کے درمیان سے جوش مارنے لگا۔ پھر اس چھوٹے سے برتن سے تقریباً تین سو افراد نے وضو کیا (البخاری، ۲ : ۳۹۷)؛ (ب) ایک دوسرے موقع پر نماز عصر کے وقت وضو کے ایک برتن سے پانی کے چشمے رواں ہو گئے اور تمام لشکر نے وضو کیا (حوالۂ مذکور)؛ (ج) ایک چھوٹے سے پیالے میں معمولی سا پانی تھا۔ آپؐ کی انگلیاں جیسے ہی اس پانی سے مس ہوئیں اس میں سے پانی جوش مارنے لگا، یہاں تک کہ ستر کے قریب صحابہؓ نے اس میں سے وضو کیا (حوالۂ مذکور)؛ (د) یوم حدیبیہ میں صحابہ کرامؓ کو سخت پیاس لگی۔ پانی کا صرف ایک ہی برتن (رکوۃ) تھا، آپؐ نے اس میں اپنا ہاتھ مبارک ڈال دیا۔ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس برتن میں سے پانی کے کئی فوارے پھوٹ پڑے ہوں۔ اس پانی سے وہاں پر موجود تقریباً ۱۴ سو صحابہ کرامؓ نے وضو بھی کیا اور شکم سیر ہو کر پیا بھی، مگر اس کے باوجود وفور آب کا یہ عالم تھا کہ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ اگر ایک لاکھ آدمی بھی ہوتے تو ان سب کو کافی ہوتا (البخاری، ۲ : ۴۹۷)؛ (ہ) حضرت براءؓ بن عازب صلح حدیبیہ ہی کے موقعہ کی ایک دوسری روایت نقل فرماتے ہیں کہ مقام حدیبیہ میں پانی کا صرف ایک ہی کنواں تھا۔ ہم لوگ اس میں سے پانی پیتے رہے، یہاں تک کہ اس کا آخری گھونٹ نکال لیا۔ اور پھر پانی کی شدید قلت پیدا ہو گئی۔ آپؐ کو اطلاع دی گئی تو آپؐ کنویں کی منڈیر پر بیٹھ گئے اور کچھ پانی منگوایا؛ پہلے کلی کی اور پھر بقیہ پانی بھی کنویں میں ڈال دیا؛ ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ وہ کنواں پانی سے لبالب بھر گیا، جس سے تمام صحابہ کرامؓ، جن کی مجموعی تعداد ۱۴ سو تھی،

اور ان کی تمام سواریوں نے پیٹ بھر کر پانی پیا (البخاری، ۲ : ۳۹۸)؛ (و) اسی طرح ایک غزوہ کے دوران میں پانی کی شدید قلت پیدا ہو گئی۔ اس وقت عسکر اسلام ایک چٹیل میدان میں خیمہ زن تھا۔ تلاش بسیار کے بعد ایک عورت ملی جو پانی کا مشکیزہ اٹھائے ہوئے گزر جا رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ یہاں آس پاس کہیں پانی موجود نہیں ہے اور یہ کہ اس کے گھر کا فاصلہ ایک دن اور رات کا ہے۔ آپؐ نے اس مشکیزے پر ہاتھ پھیرا اور اس کے منہ کو کھولنے کا حکم دیا۔ اس وقت لشکر میں تقریباً ۴۰ آدمی تھے، انہوں نے شکم سیر ہو کر پانی پیا پھر مشکیزے کا منہ بند کر دیا، مگر پھر بھی مشکیزہ جوں کا توں رہا۔ یہ دیکھ کر وہ عورت مسلمان ہو گئی (البخاری، ۲ : ۳۶۹)؛ (ز) غزوۂ تبوک کے موقع پر ایک چشمے سے لشکر اسلام کا گزر ہوا، مگر اس چشمے میں پانی بہت ہی کم تھا۔ آپؐ تشریف لائے اور اس میں اپنے ہاتھ اور منہ دھو کر پانی ڈال دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ چشمہ پانی سے پوری طرح بھر گیا، یہاں تک کہ تمام لوگوں نے شکم سیر ہو کر پانی پیا (مسلم، ۴ : ۱۷۸۴، حدیث ۷۰۶)؛ (ح) حبان بن بُحّ الصدائی کے بقول آپؐ نے انہیں سفر کے دوران میں پانی کا ایک برتن دیا، جس میں اس نے وضو کیا، پھر آپؐ نے اس برتن میں ہاتھ ڈالا تو پانی جوش مار کر ابلنے لگا (احمد بن حنبل : مسند، ۴ : ۱۶۸ تا ۱۶۹)۔ اس موضوع پر اور بھی بہت سی روایات ملتی ہیں۔

(۴) شفاے امراض: آپؐ کی ذات منبع خیر و برکت تھی۔ اس کا اظہار اس سے بھی بکثرت ہوا کہ آپؐ کے ہاتھ سے مریضوں کو فوری شفایابی ہوئی۔ چند مثالیں حسب ذیل ہیں: (ا) ٹوٹی ہوئی ٹانگ کا ٹھیک ہونا: حضرت عبداللہؓ بن عتیق کی ٹانگ پر، جو ایک مہم کے دوران میں بلندی سے چھلانگ لگانے کی وجہ سے ٹوٹ گئی تھی، آپؐ نے اپنا دست مبارک پھیرا تو وہ بالکل ٹھیک ہو گئی (البخاری، ۶۴/۱۶، ۳ : ۶۷ تا ۷۰)؛ (ب) آشوب زدہ آنکھوں کا صحت یاب ہونا: غزوۂ خیبر کے دوران میں حضرت علیؓ کی آنکھیں آشوب زدہ تھیں۔ آپؐ کے لعاب دہن کی برکت سے فوری طور پر ٹھیک ہو گئیں (مسلم، ۴ : ۱۸۷۱، حدیث ۲۴۰۴)؛ (ج) نابینے کا بینا ہونا: ایک صحابیؓ نابینا تھے۔ انہوں نے آ کر خدمت نبویؐ میں اپنی تکالیف بیان کیں۔ آپؐ نے انہیں فرمایا کہ وضو کرکے میرے وسیلے سے دعا مانگو، انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اور قدرت خداوندی سے شفا پائی (حاکم : مستدرک، ۱ : ۵۱۹، ۵۲۶ تا ۵۲۷، علی شرط البخاری)؛ (د) ابن الجوزی (الوفا، ۲ : ۳۳۳) نے ابو قتادہؓ بن النعمان کے متعلق نقل کیا ہے کہ غزوۂ احد میں ان کی آنکھ حلقے سے باہر گر پڑی، انہوں نے آپؐ کی خدمت میں اپنی تکلیف بیان فرمائی، آپؐ نے اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر آنکھ کو حلقے میں لگا دیا اس پر ان کی بینائی بحال ہو گئی؛ (ہ) تلوار کے زخم سے صحت یابی: غزوۂ خیبر میں ایک صحابی حضرت سلمہؓ بن اکوع کی ٹانگ پر تلوار کا زخم آ گیا تھا، جس میں اکثر تکلیف رہتی تھی۔ آپؐ نے اس پر تین مرتبہ دم کیا، اس کے بعد انہیں پھر کبھی تکلیف محسوس نہ ہوئی (البخاری، ۶۴/۳۸، ۳ : ۱۲۴)؛ (و) آسیب کے اثر سے محفوظ ہونا: ایک مرتبہ آپؐ ایک سفر میں تشریف لے جا رہے تھے کہ ایک عورت اپنے بچے کو اٹھائے ہوئے لائی اور کہا کہ اس میں کسی بلا کا دورہ ہوتا ہے، آپؐ نے تین مرتبہ فرمایا: اے دشمن خدا اس میں سے نکل جا، آپؐ کے یہ

فرماتے ہیں وہ بچہ بالکل تندرست ہو گیا اور پھر اس کے بعد وہ بلا کبھی واپس نہ آئی (احمد بن حنبل : مسند، ۴ : ۷۰، ۷۱)؛ (ز) عارضۂ جنون سے افاقہ : ایک صحابی کے بھائی پر جنون کا اثر تھا۔ وہ اسے لے کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ کے دم کرنے سے اس کا ہر قسم کے جنون کا عارضہ جاتا رہا؛ (ح) گونگے کا قوت گویائی پانا : ایک عورت کا بچہ گونگا تھا۔ وہ اسے آپؐ کی خدمت میں لائی۔ آپؐ نے پانی منگوا کر ہاتھ دھوئے اور کلی کی؛ پھر وہ پانی اس بچے کو پلانے اور اس پر چھڑکنے کے لیے دیا۔ صرف پلانے سے وہ بچہ بالکل ٹھیک ہوگیا اور بولنے لگا (ابن ماجہ : السنن، باب النشرہ؛ ابو نعیم، ص ۱۶۷)؛ (ط) مرض نسیان سے شفا : حضرت ابو ہریرہؓ نے قلت حافظہ کی شکایت کی۔ آپؐ نے فرمایا : دامن پھیلاؤ۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ آپؐ نے دامن میں ہاتھ ڈالا اور فرمایا: اس کو سمیٹ لو۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں اس دن کے بعد کوئی بات نہیں بھولا (البخاری، ۲ : ۴۱۵؛ مسلم، ۴ : ۱۹۴، حدیث ۲۴۹۲)۔ اسی طرح حضرت عثمانؓ بن ابی العاص (عامل طائف) اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نسبت مذکور ہے کہ ان دونوں صاحبان کو نسیان کی بیماری لاحق تھی اور آپؐ کی دعا یا دم کی برکت سے وہ بیماری زائل ہوگئی (ابن ماجہ : السنن، باب الفزع والارق؛ الترمذی عن علی، ۴ : ۵۹۳ تا ۵۹۵، حدیث ۳۵۷۰؛ حاکم : مستدرک، ۱ : ۳۰۶)؛ (ی) آگ میں جلے ہوئے بچے کی صحت یابی : ایک صحابیؓ محمد بن حاطب، بچپن میں آگ میں گرنے کی بنا پر بری طرح جھلس گئے۔ آپؐ نے ان پر لعاب دہن لگایا اور دعا کی؛ روایت کے مطابق ان کی والدہ ابھی انھیں اس مجلس میں سے لے کر اٹھنے بھی نہ پائی تھیں کہ وہ بالکل صحت یاب ہو گئے (ابو داؤد الطیالسی : مسند، ص ۱۶۵؛ احمد بن حنبل : مسند، ۴ : ۲۰۹)۔

(۴) جمادات میں اثر : جمادات اگرچہ شعور و ادراک سے محروم وجود ہیں، مگر قرآن حکیم ان میں ایک خاص قسم کے شعور و ادراک پر زور دیتا ہے اور وہ ہے اپنے خالق و مالک کی پہچان اور اس کے تکوینی احکام بجا لانے کا شعور (دیکھیے ۱۷ [بنی اسرائیل] : ۴۴)۔ موجودہ سائنس بھی جمادات میں ایک معمولی درجے کے احساس کی قائل ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ جمادات اپنے رب کی مرضی کو پہچانتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نبوت و رسالت کی تصدیق کرنے میں جمادات بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے؛ چند مثالیں حسب ذیل ہیں :

(ا) اسطوانۂ حنانہ کا ہلنا اور رونا : مسجد نبوی میں ایک کھجور کا تنا تھا، جس کے ساتھ ٹیک لگا کر آپؐ خطبہ دیا کرتے تھے، منبر تیار ہوا تو آپؐ نے اس پر بیٹھ کر خطبہ دینا شروع کر دیا۔ عین اسی وقت اس اسطوانہ سے بچے کے رونے کی آواز پیدا ہوئی (بعض روایات میں اونٹنیوں کی طرح بلبلانے کا ذکر ہے)۔ یہ دیکھ کر آپؐ نیچے اترے اور اسطوانہ کو سینے سے لگا لیا تو وہ آواز ختم ہوگئی۔ یہ رونا بالکل ایسا تھا، جس طرح کوئی شخص کسی سے بچھڑ کر اس کے فراق میں روتا ہے (البخاری، ۶۱/۲۵، ۲ : ۴۰۰)؛ یہ روایت ۱۰ مختلف صحابہ کرامؓ سے منقول ہے (دیکھیے سید سلیمان ندوی : سیرۃ النبی، ۳ : ۶۱۵، حاشیہ ۲)۔ مولنا قاسم نانوتوی کے مطابق آپؐ کا یہ معجزہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے احیاے موتی کے معجزات سے بڑھ کر ہے، کیونکہ بہرحال حضرت موسیٰؑ کا عصا اژدھے کی شکل میں آ کر زندہ ہوا، اور اس نے اژدہوں جیسی حرکات

کیں؛ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کی بنائی ہوئی اشیاء پرندوں کی اصلی شکل و صورت میں آ کر حیات ہوئیں، مگر آپؐ کی برکت سے اسطوانہ، لکڑی ہوتے ہوئے زندہ ہوا اور زندوں جیسی حرکات اس سے صادر ہوئیں۔ لہذا آپؐ کا یہ معجزہ اپنے پیشروؤں کے معجزات سے بڑھ کر ہے۔ دیکھیے حبیب الرحمن: دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا، مطبوعۂ دیوبند ۱۳۶۵، ص ۱۰۳)۔

(ب) ہلتے ہوئے پہاڑ کا ساکن ہو جانا: ایک مرتبہ آپؐ ایک پہاڑ پر کھڑے تھے کہ وہ پہاڑ ہلنے لگا۔ آپؐ نے اس پر پاؤں کی ایک ضرب لگائی اور فرمایا: ٹھہر جا، تیری پشت پر ایک پیغمبرؐ، ایک صدیق، ایک شہید ہے (البخاری، المناقب؛ الترمذی، ۵: ۶۲۴، حدیث ۳۶۹۷) چنانچہ وہ پہاڑ ٹھہر گیا؛ (ج) پہاڑوں اور درختوں میں سے آواز کا آنا: حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ حضورؐ کے ہمراہ تھے۔ راستے میں انھوں نے سنا کہ آپؐ جس درخت یا پتھر کے پاس سے گزرتے ہیں، اس میں سے آواز آتی ہے: السلام علیک یا رسول اللہؐ (الترمذی، ۵: ۵۹۳، حدیث ۳۶۲۶)۔ اسی طرح کی ایک روایت کے راوی حضرت جابرؓ بن سمرہ ہیں۔ وہ حضورؐ سے نقل فرماتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: میں مکے کے ایک پتھر کو اچھی طرح جانتا ہوں، جو مجھے مبعوث کیے جانے کے بعد سلام کیا کرتا تھا (کتاب مذکور، حدیث ۳۶۲۴)؛ (د) کھانوں سے تسبیح کی آواز: حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ عہد نبویؐ میں ہمیں کھانوں سے تسبیح کی آواز سنائی دیا کرتی تھی (البخاری، ۶۱.۲۵، ۲: ۳۹۹)؛ (ہ) زمین کا ایک مرتد کو قبول نہ کرنا: عہد نبویؐ میں ایک نصرانی مسلمان ہوا اور کچھ دنوں تک کتابت وحی کی خدمت انجام دیتا رہا، بعد ازاں مرتد ہو گیا اور یہ دعوی کرنے لگا کہ (معاذ اللہ) جو کچھ اس نے کتابت کیا ہے (سورۃ البقرۃ و آل عمران) آپؐ اس کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے لوگوں کے لیے عبرت بنانا چاہا تو اسے موت دے دی، جس کے بعد اس کے ساتھیوں نے اسے دفن کر دیا، مگر اگلی صبح انھوں نے قبر کو کھلا اور اس کے مردہ جسم کو اوپر پڑے ہوئے دیکھا تو خیال کیا ضرور یہ کسی صحابیؓ کی کارروائی ہوگی؛ چنانچہ اب کی مرتبہ پہلے سے بھی زیادہ گہری قبر کھودی اور اسے دفنا دیا، مگر میت اگلی صبح پھر باہر تھی؛ اس روز مزید قبر کو گہرا کیا گیا اور میت کو دفنا دیا گیا، مگر تیسری صبح پھر میت کا یہی حال تھا۔ اس پر لوگوں نے باور کر لیا کہ یہ کارروائی کسی انسان کی نہیں ہو سکتی، اور اسے یونہی پڑا رہنے دیا گیا (البخاری، ۶۱/۲۵، ۲: ۳۰۹؛ الترمذی، ۵: ۵۹۷، حدیث ۳۶۶۳)؛ (و) کنکریوں سے تسبیح کی آواز: ایک مرتبہ ایک مجلس میں آپؐ نے سات کنکریاں اٹھائیں تو ان میں تسبیح کی آواز پیدا ہوئی۔ آپؐ نے انھیں رکھ دیا تو وہ آواز رک گئی (ابن الجوزی: الوفاء، ۱: ۳۲۳)۔

(۵) نباتات میں اثر: نباتات میں گو ایک ابتدائی درجے کا شعور و ادراک موجود ہوتا ہے، مگر پھر بھی ان میں اتنا شعور و ادراک نہیں ہوتا کہ وہ آدمی میں تمیز کر سکیں یا کسی پاس سے گزرنے والے کو سلام کر سکیں، جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذات اقدس کو نباتات نہ صرف جانتے تھے، بلکہ حیرت انگیز طریقے پر آپؐ کے احکام کی تعمیل بھی کرتے تھے، سطور بالا میں حضرت علیؓ کے حوالے سے یہ گزر چکا ہے آپؐ کو راستے کا ہر درخت اور ہر پتھر سلام کرتا تھا، اس کے علاوہ

چند واقعات حسب ذیل ہیں : (الف) درختوں کا چل کر آنا : ایک مرتبہ آپؐ رفع حاجت کے لیے تشریف لے گئے۔ حضرت جابرؓ پانی لیے ہوئے ہمراہ تھے۔ میدان ہموار ہونے کی بنا پر کوئی آڑ نہ ملی تو آپؐ نے دور کھڑے ہوئے دو درختوں کو اشارہ کیا۔ وہ وہاں سے چل کر آئے اور باہم مل گئے۔ آپؐ نے ان کی اوٹ میں حاجت سے فراغت حاصل کی؛ پھر انہیں اپنی جگہ پر چلے جانے کا حکم دیا، انہوں نے ایسا ہی کیا (مسلم، حدیث جابرؓ؛ مشکوٰۃ، ۳ : ۱۷۱، حدیث ۵۸۸۵)۔ اسی طرح کے ایک موقع پر جب آپؐ کچھ مغموم تھے، حضرت جبرائیل علیہ السلام کے فرمانے پر آپؐ نے ایک درخت کو قریب بلایا۔ وہ درخت قریب آ گیا؛ پھر اسے حکم دیا تو واپس چلا گیا (ابن ماجہ : السنن، الدارمی؛ مشکوٰۃ، ۳ : ۱۸۸، حدیث ۵۹۲۴)؛ (ب) درختوں کا صداقت اسلام کی گواہی دینا : ایک دوسرے موقع پر ایک بدو نے آپؐ کی نبوت کی دلیل طلب کی۔ آپؐ درخت کے پاس تشریف لے گئے اور اس سے پوچھا: کیا تو گواہی دیتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ درخت کی تمام شاخیں زمین سے پیوست ہوگئیں۔ پھر آپؐ نے درخت کو اپنی اصلی حالت پر لوٹ آنے کا حکم دیا؛ چنانچہ وہ درخت اپنی سابقہ کیفیت پر لوٹ آیا۔ یہ دیکھ کر وہ اعرابی مسلمان ہو گیا (الترمذی، ۵ : ۵۹۴، حدیث ۳۶۲۹)؛ (ج) حیوانات کا آپؐ کے منصب اعلیٰ کو جاننا : حیوانات نباتات سے شعور و ادراک سے اونچا درجہ رکھتے ہیں، مگر ان میں کبھی اچھے اور برے، نیک اور بد کا شعور نہیں دیکھا گیا، البتہ آپؐ کے خوارق عادت میں سے ایک یہ امر بڑی بے مثال اہمیت رکھتا ہے کہ جانوروں نے نہ صرف آپؐ کے مرتبے کو جانا، بلکہ آپؐ کو اپنے مالکوں کی شکایات بھی کیں۔ چند مثالیں حسب ذیل ہیں : (الف) سواری کا تیز ہونا : مختلف روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ حلیمہ سعدیہ جب آپؐ کو گود لے کر واپس ہوئیں تو ان کی سواری، جو پہلے ان کی ہمجولیوں کی سواریوں سے پیچھے رہ جاتی تھی، سب سے آگے آگے تھی۔ ان کی ہمجولیاں بار بار تعجب کا اظہار کرتی تھیں کہ کیا یہ وہی سواری نہیں ہے جو آتی مرتبہ تمہارے پاس تھی؟ حلیمہ کہتیں کہ ہے تو وہی، مگر اب اس کی شان ہی نرالی ہے (ابن ہشام : السیرۃ النبویہ، ۱ : ۱۷۲ تا ۱۷۳، مطبوعۂ قاہرہ)؛ (ب) اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت ابو طلحہؓ کے سست رفتار گھوڑے کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ آپؐ نے ایک مرتبہ اس کی سواری فرمائی اور واپسی پر فرمایا : یہ تو دریا ہے، آپؐ کے اس فرمانے کا نتیجہ تھا کہ اب کوئی گھوڑا رفتار میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا (البخاری، کتاب الجہاد، باب اس رکوب علی الدابہ؛ ابن الجوزی، ۱ : ۳۰۳ تا ۳۰۴)؛ (ب) بے دودھ کی بکری کا دودھ دینا : حضرت عبداللہؓ بن مسعود فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ بکریاں چرا رہا تھا کہ آپؐ اور حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے اور پینے کے لیے کچھ دودھ مانگا، مگر میں نے معذرت کر دی۔ آپؐ نے پوچھا کہ اچھا بکری کا کوئی بچہ ہے؟ میں نے کہا : ہاں ہے۔ آپؐ نے اسے حاضر کرنے کا حکم دیا؛ چنانچہ آپؐ کے ہاتھ کی برکت سے اس بکری کے بچے نے دودھ دیا، جسے پہلے آپؐ نے پھر حضرت ابوبکرؓ اور پھر میں نے پیا (ابن سعدؒ، ۱ : ۱۲۲)؛ سفر ہجرت کے دوران میں بھی ام معبد کی بکری کے دودھ دینے اور اس پر اس کے ایمان لانے کا ذکر آتا ہے (مشکوٰۃ، ۲ : ۱۹۵)؛ (د) جانور کا آپؐ کے مرتبے کو پہچاننا : ایک مرتبہ ایک انصاری کا اونٹ باؤلا

ہو گیا۔ آپؐ کو اطلاع دی گئی۔ تو آپؐ اس کو پکڑنے کے لیے آگے بڑھے۔ صحابہؓ نے روکا کہ مبادا آپؐ کو کاٹ لے، مگر آپؐ نے فرمایا: مجھے اس کا کوئی ڈر نہیں۔ یہ کہہ کر آپؐ آگے بڑھے تو اس اونٹ نے اپنا سر آپؐ کے آگے ڈال دیا۔ آپؐ نے اسے پکڑ کر اس کے مالک کے حوالے کر دیا اور فرمایا: ہر مخلوق جانتی ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں، مگر گنہگار انسان اور نافرمان جن (احمد بن حنبل: مسند، عن انس؛ ابن الجوزی، ۱: ۳۰۲)۔ اسی طرح آپؐ ایک مرتبہ ایک انصاری کے باغ میں تشریف لے گئے، جہاں ایک اونٹ کھڑا گھرا رہا تھا، آپؐ کو دیکھ کر بلبلانے لگا اور اس کی دونوں آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ آپؐ نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا تو وہ خاموش ہو گیا۔ پھر آپؐ نے اس کے مالک کو بلایا اور فرمایا یہ اونٹ مجھ سے شکایت کر رہا ہے کہ تم اسے بھوکا رکھتے ہو (ابو داؤد، باب الشفقة علی البھائم)۔ اسی طرح ایک مرتبہ آپؐ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے کہ ایک اونٹ نے آ کر آپؐ کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ آپؐ نے فرمایا: یہ اونٹ کس کا ہے؟ یہ مجھ سے اپنے مالک کی شکایت کر رہا ہے۔ تحقیق پر یہ بات درست ثابت ہوئی تو آپؐ نے اس اونٹ کو اس کے مالک سے لے کر صدقہ کے اونٹوں میں بھیج دیا (ابن الجوزی، ۱: ۳۰۰ تا ۳۰۲) ابن الجوزی (۱: ۳۰۲ تا ۳۰۳) اور دیگر سیرت نگاروں نے اس نوع کے متعدد واقعات نقل کیے ہیں۔

سیرت نگاروں نے ارشاد خداوندی: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (۲۱ [الانبیاء]: ۱۰۷) یعنی اور ہم نے آپؐ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کے بھیجا ہے، سے استشہاد کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ جس طرح آپؐ کی نبوت کل عالم کے لیے تھی، اسی طرح حضورؐ کو تمام عوالم میں معجزات سے تائید فرمائی گئی ہے۔ اقسام عالم حسب ذیل ہیں: (۱) عالم معانی (غیر قائم بالذات ذوات، یعنی خواص اور عوارض وغیرہ)؛ (۲) عالم ملائکہ؛ (۳) عالم انسان؛ (۴) عالم جنات؛ (۵) عالم علوی، افلاک، کواکب؛ (۶) عالم بسائط، یعنی عناصر؛ (۷) عالم جمادات؛ (۸) عالم نباتات؛ (۹) عالم حیوانات اور (۱۰) عالم کائنات الجو۔ ان میں سے ہر ایک عالم میں آپؐ کو معجزات سے مشرف فرمایا گیا ہے۔ تفصیل حسب ذیل ہے: (۱) عالم معانی، مثلاً معجزہ قرآنی اور حضورؐ کا غیب کی خبریں دینا؛ (۲) عالم ملائکہ: ملائکہ ایک نورانی اور لطیف مخلوق ہیں جو ہماری ظاہری آنکھوں اور دیگر آلات کی مدد سے نہیں دیکھی جا سکتی اور نہ ان سے کسی قسم کا رابطہ پیدا کرنا ممکن ہے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خصوصیت ہے کہ آپؐ کے پاس ملائکہ اکثر وحی لے کر اور جنگوں میں فتح و نصرت لے کر نازل ہوتے تھے؛ (۳) عالم انسان: عالم انسان میں حضورؐ کے سب سے زیادہ معجزات منکشف ہوئے، جن میں آپؐ کی دعا سے بعض قوموں اور بعض افراد کے قبول ہدایت سے لے کر مریضوں کی صحت یابی تک اور ہر قسم کی غیر معمولی باتوں کے اظہار تک امور شامل ہیں؛ (۴) متعدد قرآنی آیات اور احادیث سے جنات کا آپؐ پر ایمان لانا ثابت ہوتا ہے؛ (۵) عالم علوی و کواکب میں چاند کا دو نیم ہونا، شب معراج میں آپؐ کا افلاک سے گزر کر عرش و کرسی تک پہنچنا سبھی خوارق شامل ہیں: (۶) عالم عناصر میں، مثلاً آپؐ کی بد دعا سے سراقہ کے گھوڑے کے پاؤں کا زمین میں دھنسنا؛ زمین کا ایک مرتد کو قبول نہ کرنا

اور اسی طرح تھوڑے پانی سے زیادہ آدمیوں کا سیراب ہو جانا؛ حضرت جابرؓ کے گھر میں دعوت کے موقع پر آگ جلنے کے باوجود اس کا سالن کو ختم اور خشک نہ کرنا؛ غزوۂ احزاب میں دشمنوں پر یخ اور تند و تیز ہوا کا چلنا وغیرہ امور شامل ہیں؛ (۷) عالم جمادات میں ہلتے ہوئے پہاڑوں کا تھم جانا یا کسی پتھر سے سلام کی آواز کا آنا وغیرہ آپؐ کے معجزات ہیں؛ (۸) عالم نباتات میں درختوں کا آپؐ کے سامنے تعظیمًا جھک جانا، یا آپؐ کے بلانے سے ان کا چلا آنا وغیرہ آپؐ کے خوارق عادت امور ہیں؛ (۹) عالم حیوانات میں مختلف جانوروں کا آپؐ کو پہچان لینا اور آپؐ کے آگے گردن جھکا دینا اسی نوع کے واقعات ہیں؛ (۱۰) کائنات الجو میں آپؐ کی دعا سے بادلوں کا چھا جانا، برسنا اور پھر ان کا چھٹ جانا وغیرہ آپؐ کے معجزات ہیں (تفصیل کے لیے اشرف علی تھانوی: نشر الطیب، ص ۱۹۲ تا ۲۰۳؛ الکلام المبین؛ السیوطی: خصائص کبریٰ وغیرہ)۔

مآخذ: متن مقالہ میں مذکور ہیں۔ [محمود الحسن عارف، رکن ادارہ نے لکھا]

(ادارہ)

مآخذ: سیرت (الف) بنیادی مآخذ (Primary Sources)، (صرف عربی): (۱) قرآن حکیم بمواقع کثیرہ بمدد اشاریہ: محمد فؤاد عبدالباقی: معجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم؛ سیرت نبوی کا سب سے مستند، مفصل اور متداول ذریعہ معلومات کتب حدیث ہیں: (۲) محمد بن اسماعیل البخاری (م ۲۵۶ھ/۸۷۰ء): الجامع الصحیح، (مطبوعۂ لائیڈن، قاہرہ اور دہلی)؛ (۳) مسلم النیشاپوری (م ۲۶۱ھ/ ۸۷۵ء): الجامع الصحیح (مطبوعۂ قاہرہ، دہلی اور استنبول)؛ (۴) ابو داؤد (م ۲۷۵ھ/ ۸۸۸ء): الجامع السنن، (مطبوعۂ دہلی، [illegible] الخصوص مصر [illegible] و تعلیق ۱۳۸۸ھ / ۱۹۶۹ء)؛ (۵) ابو عیسیٰ الترمذی (۲۰۹ - ۲۷۹ھ): الجامع السنن، (مطبوعۂ دہلی و قاہرہ) و شمائل؛ (۶) النسائی (م ۳۰۳ھ/ ۹۱۵ء): السنن، مطبوعۂ لکھنؤ و دہلی؛ (۷) ابن ماجہ القزوینی (م ۲۷۳ھ/ ۸۸۶ء): السنن، (مطبوعۂ دہلی و قاہرہ)؛ (۸) امام مالک: الموطا، (مطبوعۂ دہلی)؛ (۹) البیہقی: سنن، و شعب الایمان؛ (۱۰) امام احمد بن حنبل: مسند، (مطبوعۂ حیدرآباد دکن و قاہرہ)؛ (۱۱) عبدالرزاق (م ۲۱۱ھ/ ۸۲۶ء): مصنف، بیروت ۱۹۷۲ء؛ (۱۲) ابن ابی شیبہ (م ۲۳۵ھ/ ۸۴۹ء): مصنف، مطبوعۂ حیدرآباد دکن؛ (۱۳) علی متقی: (م ۹۷۵ھ/ ۱۵۶۷ء) کنزالعمال فی السنن والاقوال (مطبوعۂ حیدر آباد دکن و حلب)؛ (۱۴) الحاکم (م ۴۰۵ھ/ ۱۰۱۴ء): المستدرک علی الصحیحین، مطبوعۂ حیدرآباد دکن وغیرہ (۱۳۳۴ھ)؛ (۱۵) خطیب تبریزی: مشکوٰۃ المصابیح (مطبوعۂ قاہرہ وغیرہ)؛ کتب شروح حدیث: (۱۶) ابن حجر العسقلانی (۷۷۳ - ۸۵۲ھ): فتح الباری شرح صحیح البخاری، مطبوعۂ قاہرہ و لاہور ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء؛ (۱۷) بدر الدین عینی (۷۶۲ - ۸۵۵ھ): عمدۃ القاری فی شرح البخاری، مطبوعۂ استانبول ۱۳۰۸ - ۱۳۱۱ھ؛ (۱۸) القسطلانی: ارشاد الساری شرح صحیح البخاری، مطبوعۂ قاہرہ؛ (۱۹) النووی: (۶۳۱ - ۶۷۶ھ) المنہاج فی شرح صحیح مسلم بن الحجاج، (مطبوعۂ قاہرہ)؛ (۲۰) ملا علی قاری (م ۱۰۱۴ھ/ ۱۶۰۵ء): مرقاۃ المفاتیح مشکوٰۃ المصابیح، مطبوعۂ قاہرہ؛ کتب سیر و مغازی: (۲۱) محمد بن اسحاق (م ۱۵۰ھ/ ۷۶۷ء): المغازی، طبع محمد حمید اللہ، مراکش؛ (۲۲) الواقدی (م ۲۰۷ھ/ ۸۲۲ء): کتاب المغازی، طبع مارسڈن جونز (Marsdun Jones)، آکسفرڈ ۱۹۶۶ء؛ (۲۳) ابن ہشام: (م ۲۱۸ھ/ ۸۳۳ء): کتاب سیرۃ رسول اللہ صلی اللہ و آلہ وسلم و المغازی، المعروف بہ سیرۃ ابن ہشام، مطبوعۂ قاہرہ (اس کے متعدد زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں)؛ (۲۴) البلاذری [illegible]: انساب الاشراف، جلد اول، (مطبوعۂ

قاہرہ ۱۹۵۹ء) : (۲۵) عبدالرحمن السہیلی : شرح الروض الانف (مطبوعۂ قاہرہ ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء، ۲ جلدیں): (۲۶) ابن عبدالبر (م ۴۶۳ھ/۱۰۷۰ء) : تلخیص سیرت ابن ہشام بعنوان الدرر فی اختصار المغازی و السیر، (طبع شوقی ضیف، قاہرہ ۱۹۶۶ء) : (۲۷) محمد بن سعد الکاتب (م ۲۳۰ھ / ۸۴۵ء) : کتاب الطبقات الکبیر، (مطبوعہ لائیڈن، نیز بیروت ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء) : (۲۸) سلیمان بن موسی الکلاعی الاندلسی (م ۶۳۴ھ/۱۲۳۶ء) : الاکتفاء فی مغازی رسول اللہ و الثلاثة الخلفاء، مطبوعۂ قاہرہ، ۳ مجلدات : (۲۹) ابن سید الناس (م ۷۳۴ھ / ۱۳۳۳ء) : عیون الاثر فی فنون المغازی و السیر، مطبوعۂ قاہرہ نیز شرح ابراہیم بن محمد : نور النبراس : (۳۰) ابن کثیر (م ۷۷۴ھ/ ۱۳۷۲ء) : السیرة النبویہ، مطبوعۂ قاہرہ ۱۹۶۴-۱۹۶۶ء، ۴ جلدیں) - جو دراصل البدایہ و النہایہ کی ابتدائی دو جلدوں کا مجموعہ ہے : (۳۱) المغلطائی (م ۷۶۲ھ / ۱۳۵۹ء) : الاشارة الی سیرة النبویہ : (۳۲) المقریزی : إمتاع الأسماع، بما الرسول من الاسماع و المتاع، مطبوعۂ قاہرہ : (۳۳) یحیی بن ابی بکر العامری : (م ۸۹۳ھ / ۱۴۸۸ء) : بہجة المحافل فی السیر و المعجزات و الشمائل، (مطبوعۂ قاہرہ ۱۳۳۰ء) : (۳۴) القسطلانی : مواہب اللدنیہ فی منح المحمدیہ، مع شرح الزرقانی (م ۱۱۲۲ھ/ ۱۷۱۰ء) مطبوعۂ قاہرہ ۱۳۲۵-۱۳۲۸ھ، ۸ جلدیں : (۳۵) شمس الدین الصالحی شامی (م ۹۴۲ھ/۱۵۳۵ء) : سبل الہدی و الرشاد فی سیرہ خیر العباد، المعروف بہ سیرة شامیہ مطبوعۂ قاہرہ : (۳۶) ابن الجوزی (م ۵۹۷ھ/ ۱۱۸۳ء) : الوفا باحوال المصطفی، مطبوعۂ قاہرہ ۱۹۶۶ء : (۳۷) ابن حزم (م ۴۵۶ھ / ۱۰۶۳ء) : جوامع السیرة، (مطبوعۂ قاہرہ و گھکھڑ منڈی، ضلع گوجرانوالہ : (۳۸) علی بن برہان الدین الحلبی (م ۱۰۴۴ھ / ۱۶۳۵ء) : انسان العیون فی سیرة الامین المامون الشہیر بالسیرة الحلبیہ، مطبوعۂ قاہرہ ۱۳۸۳ھ/۱۹۶۳ء : کتب تاریخ : (۳۹) الطبری (م ۳۱۰ھ/۹۲۳ء) : تاریخ الرسل و الملوک، (مطبوعۂ لائیڈن) بالخصوص جلد اول : (۴۰) ابن الاثیر : (م ۶۳۰ھ/۱۲۳۲ء) : الکامل فی التاریخ، (مطبوعۂ لائیڈن ۱۸۴۶ء)، بالخصوص جلد اول : (۴۱) المقریزی (م ۸۴۵ھ/ ۱۴۴۲ء) الخطط، مطبوعۂ قاہرہ : (۴۲) حسین بن محمد الدیار بکری : (م ۹۶۶ھ / ۱۵۵۸ء) : تاریخ الخمیس فی احوال انفس نفیس، مطبوعۂ بیروت : (۴۳) ابوحنیفہ الدینوری (م ۲۸۲ھ / ۸۹۰ء) : الاخبار الطوال : (۴۴) الیعقوبی (م ۲۸۴ھ / ۸۹۷ء) : تاریخ : (۴۵) ابن قتیبہ (۲۷۶ھ / ۸۸۹ء) : المعارف، (مطبوعۂ) : (۴۶) المسعودی (م تواح ۳۴۵ھ/۹۵۶ء)؛ تاریخ : (۴۷) الازرقی : (م ۲۲۳ھ/ ۸۳۷ء) : اخبار مکہ، مطبوعۂ لائپزگ : (۴۸) ابو المحاسن ابن تغری بردی (م ۸۷۴ھ/۱۴۶۹ء)؛ النجوم الزاہرہ فی ملوک مصر و القاہرہ، ابتدائی جلد : (۴۹) عمر بن شبہ (م ۲۶۲ھ/ ۸۷۵ء) : اخبار مدینہ : کتب شمائل و اخلاق و معجزات : (۵۰) ابوالفضل قاضی عیاض : الشفا بتعریف حقوق المصطفی، (مطبوعۂ قاہرہ، خاص دمشق و برلن) نیز شرح الخفاجی : نسیم الریاض : (۵۱) البیہقی : (م ۴۳۰ھ / ۱۰۳۸ء) : دلائل النبوة، مطبوعۂ قاہرہ : (۵۲) ابو نعیم الاصبہانی (م ۴۳۰ھ/۱۰۳۸ء) : دلائل النبوة، (مطبوعۂ حیدر آباد دکن : (۵۳) السیوطی : خصائص کبری، مطبوعہ حیدر آباد دکن (تین جلدیں) : (۵۴) ابن کثیر (م ۷۷۴ھ/ ۱۳۷۲ء) : شمائل الرسول، طبع مصطفی عبدالاحد قاہرہ ۱۹۶۷ء): (۵۵) ابن القیم : زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، (مطبوعۂ کانپور و قاہرہ)، کتب معارف : (۵۶) ابن قتیبہ الدینوری : عیون الاخبار، مطبوعۂ قاہرہ ۱۹۰۷ء : (۵۷) المسعودی : التنبیہ و الاشراف، طبع ڈخویہ لائیڈن، ۱۸۹۳ء : (۵۸) السرخسی : شرح السیر الکبیر، مطبوعۂ حیدرآباد دکن، چار جلدیں : (۵۹) ابن العماد الحنبلی : شذرات الذہب فی اخبار من ذہب، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۵۰ء، جلد اول : (۶۰) السمہودی : خلاصة الوفا فی اخبار دارالمصطفی، مطبوعۂ بولاق ۱۲۸۵ء : (۶۱) ابو عبید قاسم بن سلام : کتاب الاموال : (۶۲) ابو یوسف : کتاب

اخراج ۔

مآخذ : (۱) C. A. Brockelmann : *G.A.L.*، مع تکملہ مطبوعۂ لائیڈن ؛ (۲) F. Rosenthal : *A History of Muslim Historiography*، مطبوعۂ لائیڈن ؛ (۳) ابن الندیم : الفہرست، مطبوعۂ لائپزگ، طبع Flugal ؛ (۴) حاجی خلیفہ : کشف الظنون، بار دوم، استانبول ؛ (۵) جرجی زیدان : تاریخ الآداب اللغۃ العربیہ، طبع شوقی ضیف، بیروت ؛ (۶) السخاوی : الاعلان بالتوبیخ لمن ذم اہل التواریخ، مطبوعۂ دمشق ۱۳۴۹ھ ؛ (۷) الزرکلی : الاعلام، قاہرہ ۱۹۵۴-۱۹۵۶ء ؛ (۸) احمد امین : ضحی الاسلام، ۲ : ۳۲۹-۳۳۸، بار چہارم، مطبوعۂ بیروت ؛ (۹) شبلی : سیرت النبی، مقدمہ، ۲۲-۳۷، بار ششم، مطبوعۂ اعظم گڑھ ؛ (نیز رک بہ سیرت نگاری)۔

(۱) جدید عربی کتب سیرت : دور جدید میں سیرت نبوی پر بہت سی کتب شائع ہوئی ہیں جن میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں : (۱) محمد الخضری : نور الیقین فی سیرۃ سید المرسلین، (قاہرہ کی متعدد طباعتیں) ؛ (۲) محمد حسین ہیکل : حیاۃ محمد، (بار چہارم)، قاہرہ ۱۹۴۷ء ؛ اس کا اردو (حیاۃ محمد) اور فارسی (زندگانی محمد) زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے ۔ یونیسکو کی طرف سے انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے)۔ (۳) محمد عزہ دروزہ : سیرۃ الرسول صور مقتبسۃ من القرآن الکریم، (دو جلدیں)، قاہرہ ۱۹۴۸ء ؛ (۴) محمد جاد المولی : محمد المثل الکامل، بار چہارم، قاہرہ ۱۹۵۱ء ؛ (۵) عز الدین خرنج : نبی الاسلام فی مرآۃ الفکر الغربی، قاہرہ ۱۹۵۳ء ؛ (۶) محمد لطفی جمعہ : ثورۃ الاسلام و بطل الانبیاء، قاہرہ ۱۹۵۹ء ؛ (۷) جواد علی : تاریخ العرب قبل الاسلام، (السیرۃ النبویہ)، بغداد ۱۹۶۱ء ؛ (۸) محمد فرج : العبقریہ العسکریہ فی غزوات الرسول، تقدیم انوار السادات، تعارف محمد ابو زہرہ، قاہرہ ۱۹۶۳ء ؛ (۹) محمد احمد باشمیل : غزوۃ احد، ریاض ۱۹۶۶ء ؛ (۱۰) وہی مصنف : غزوۃ الاحزاب، بار اول، بیروت ۱۹۶۵ء ؛ (۱۱) ابراہیم خلیل احمد : محمد فی التوراۃ والانجیل، ۱۹۶۹ء ؛ (۱۲) سید محمود ابو الفیض المنوفی : سیرۃ سید المرسلین صاحب الشریعۃ الاسلامیہ و القرآن، بار ثانی، قاہرہ ۱۹۶۳ء ؛ (۱۳) محمد ابراہیم الشریف : مکہ و المدینۃ فی الجاہلیۃ و عصر الرسول، بار ثانی، قاہرہ ۱۹۶۵ء ؛ (۱۴) عبدالرحمن عزام : بطل الابطال، (قاہرہ) ؛ (۱۵) محمد الغزالی : فقہ السیرۃ، بار ششم، قاہرہ ۱۹۶۵ء ؛ (۱۶) محمد شبلی : شخصیۃ محمد، بار اول، قاہرہ ۱۹۶۷ء ؛ (۱۷) محمد جمال الدین سرور : قیام الدولۃ العربیہ فی حیاۃ محمد، بار پنجم، قاہرہ ۱۹۶۶ء ؛ (۱۸) محمد عطیہ الابراشی : عظمۃ الرسول، بار ثانی، قاہرہ ۱۹۶۶ء ؛ (۱۹) عمر ابو النصر : اعظم قصۃ فی التاریخ سیرۃ محمد بن عبداللہ، بیروت ۱۹۶۷ء ؛ (۲۰) محمود شیت خطاب : الرسول القائد، (بغداد، بیروت اور قاہرہ کی متعدد طباعتیں (اردو ترجمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بحیثیت سپہ سالار، بھی شائع ہو چکا ہے) ؛ (۲۱) عباس محمود العقاد : مطلع النور او طوالع البعثۃ المحمدیہ، بار اول، قاہرہ ۱۹۶۵ء نیز بیروت ۱۹۶۶ء ؛ (۲۲) وہی مصنف : عبقریۃ محمد، (قاہرہ اور بیروت کی متعدد طباعتیں) ؛ (۲۳) محمد حسن کامل المطاوی : رسول اللہ فی القرآن الکریم، قاہرہ ۱۹۷۲ء ؛ (۲۴) عماد الدین خلیل : دراسۃ فی السیرۃ، قاہرہ ۱۹۷۳ء ؛ (۲۵) عبدالعزیز خیر الدین : السیرۃ المطہرہ محمد خاتم الرسل، قاہرہ ؛ (۲۶) عبدالحمید جودۃ السحار : محمد رسول اللہ و الذین معہ، مطبوعۂ قاہرہ ؛ (۲۷) ابو الحسن علی ندوی : السیرۃ النبویہ، بیروت ۱۹۷۷ء ؛ (۲۸) محمد ابو زہرۃ : خاتم النبیین، (۳ جلدیں) قاہرہ ۔

مآخذ : جرجی زیدان : تاریخ الآداب اللغۃ العربیہ، طبع شوقی ضیف، بیروت ؛ (۲) الزرکلی : الاعلام، قاہرہ ۱۹۵۴ء ؛ (۳) محمد امین : ضحی الاسلام، ۲ : ۳۲۹ تا ۳۳۸، بار چہارم مطبوعۂ بیروت ؛ (۴) شبلی : سیرت النبی، مقدمہ، ص ۲۲ تا ۳۷، بار ششم، مطبوعۂ اعظم گڑھ ۔

(۵) Library of Congress Catalogue، [illegible] (بذیل مادہ محمد) (نذیر حسین ادارہ) نے لکھا)۔

[ادارہ]

۲۔ کتب سیرت فارسی : فارسی زبان میں بھی اس موضوع پر بہت سی تصنیفات مرتب ہوئیں، چند ایک حسب ذیل ہیں: (۱) عباس شوستری (مہرین): خاتم النبین و اموزش اسلام، مطبوعۂ برق کوثر، دہلی ۱۹۳۰ء، ایک جلد؛ (۲) شاہ عبدالحق محدث دھلوی : مدارج النبوۃ، مطبوعۂ نولکشور؛ (۳) جعفر سبحانی : فروغ ابدیت، ج ۱، ۲، تہران، تیر ماہ ۱۳۴۹ھ؛ (۴) وھی مصنف : در مکتب وحی، تہران ۱۳۸۸ء؛ (۵) خواجہ کمال الدین : کردار و گفتار محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم، ترجمہ از ابو القاسم طاھری، تہران، تاریخ ندارد؛ (۶) محمد باقر مجلسی : حیات القلوب، ج ۲، (زندگانی محمد پیامبر اسلام)، تہران، ۱۳۷۸ھ؛ (۷) معین الدین کاشفی الروسی : معارج النبوۃ، سکھر (پاکستان) ۱۹۵۸ء؛ (۸) آقای زین العابدین: پیامبر، جلد ۱ (زندگانی حضرت رسول اکرم)، تہران: آذر ۱۳۳۰ھ؛ (۹) شیر محمد : حیات فخر کائنات، ۲ جلدیں؛ (۱۰) قاضی محمد ثناء اللہ محدث پانی پتی : شرح شمائل ترمذی، (مخطوطہ) مملوکہ مولینا ابی اللہ عثمانی، سرگودھا (مقبول بیگ بدخشانی نے لکھا)۔

(ادارہ)

۳۔ کتب سیرت اردو : (۱) ولی ویلوری : روضۃ الانوار، (تصنیف ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء)؛ (۲) محمد صدیق لاھوری (م ۱۱۹۲ھ/۱۷۷۸ء) : ملک الدرر، (غیر منقولہ سیرت)؛ (۳) محمد اجمل : سیرت تراتیہ، (تصنیف ۱۷۵۵ء/۱۸۳۹ء)؛ (۴) مفتی محمد عنایت احمد : تاریخ حبیب اللہ، (۱۲۸۱ھ/۱۸۶۵ء)؛ (۵) عنایت احمد کاکوروی : السید الاخبار، (۱۲۸۳ھ/۱۸۶۷ء)؛ (۶) سر سید احمد خان : خطبات احمدیہ، (سر ولیم میور کے جواب میں)، مطبوعہ ۱۳۰۹ھ/۱۸۸۷ء؛ (۷) سرور غنی : سوانح عمری حضرت محمد [illegible] سیرت الرسول، ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء؛ (۹) ابو خالد : ھادی اعظم، ۱۳۲۸ھ/۱۹۰۹ء؛ (۱۰) قاضی سلیمان منصور پوری : رحمۃ للعالمین، ۳ جلدیں، مطبوعۂ لاھور وغیرہ؛ (۱۱) شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی: سیرت النبی، مطبوعۂ اعظم گڑھ، کراچی وغیرہ؛ (۱۲) سید سلیمان ندوی : خطبات مدراس، سیرت پر آٹھ جامع خطبات کا مجموعہ؛ (۱۳) حافظ محمد عبدالتواب : سیرۃ الحبیب؛ (۱۴) حکیم ابو البرکات دانا پوری : اصح السیر، (۱۹۳۲ء)؛ (۱۵) مناظر احسن گیلانی : النبی الخاتم، مطبوعۂ لاھور؛ (۱۶) چوھدری افضل حق رئیس احرار : محبوب خدا؛ (۱۷) مولانا اشرف علی تھانوی : حبیب خدا؛ (۱۸) وھی مصنف : نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب، مطبوعۂ کراچی؛ (۱۹) محمد ابراھیم میر سیالکوٹی: سیرت المصطفیٰ، ۳ جلدیں؛ (۲۰) محمد طاھر فاروقی : سرور دو عالم، (۱۹۳۳ء)؛ (۲۱) ابراھیم العمادی : خاتم النبین، (۱۹۳۶ء)؛ (۲۲) معین الدین ندوی : تاریخ اسلام، جلد اول، مطبوعۂ اعظم گڑھ؛ (۲۳) غلام رسول مہر : سرور دو عالم؛ (۲۴) مفتی یار محمد : سلطنت مصطفیٰ، (۱۹۳۳ء)؛ (۲۵) محمد خالد : سرورِ دو عالم، (۱۹۳۵ء)؛ (۲۶) مفتی محمد شفیع : آداب النبی، (۱۹۳۸ء)؛ (۲۷) سیماب اکبر آبادی : سیرۃ النبی، (۱۹۳۹ء)؛ (۲۸) ماھر القادری : در یتیم، (۱۹۳۹ء)؛ (۲۹) رئیس احمد جعفری : رسالت مآب، (۱۹۳۹ء)؛ (۳۰) عبدالعلی : حیات النبی، (۱۹۴۹ء)؛ (۳۱) محمد حمید اللہ : رسول اکرم کی سیاسی زندگی، (۱۹۵۰ء)؛ (۳۲) ابو القاسم دلاوری : سیرت الکبریٰ، (۱۹۵۱ء)؛ (۳۳) ملا واحدی : حیات سرور کائنات، ۱۹۵۳ء؛ (۳۴) عبدالماجد دریا بادی : خطبات، (۱۹۵۸ء)؛ (۳۵) امداد صابری : رسول خدا کا دشمنوں سے سلوک، ۱۹۵۹ء؛ (۳۶) قاری محمد طیب : در یتیم، (۱۹۵۹ء)؛ (۳۷) قاضی محمد زاھد : رحمت کائنات، (۱۹۵۹ء)؛ (۳۸) نعیم صدیقی : [illegible] لاھور ۱۹۶۳ء)؛ (۳۹)

محمد آصف قدوائی: مقالات سیرت، ریاض ۱۹۵۹ء؛ (۴۰) احتشام الحسن کاندھلوی: مقالات مبارک خیر البشر (مطبوعہ دہلی)؛ (۴۱) محمد عاشق الٰہی میرٹھی: اسلام اور حضرت محمدؐ، مطبوعہ دیوبند؛ (۴۲) ابوالقاسم دلاوری: شمائل کبریٰ؛ (۴۳) محمد جعفر پھلواری: پیغمبر انسانیت؛ (۴۴) محمد ادریس کاندھلوی: سیرت مصطفیٰؐ، ۳ جلدیں، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۷ء؛ (۴۵) محمد حنیف یزدانی: محمد رسول اللہ غیر مسلموں کی نظر میں، ۱۹۶۹ء؛ (۴۶) ابوالکلام آزاد: رسول رحمت، مرتبہ غلام رسول مہر؛ (۴۷) تذکار محمدؐ، شائع کردہ ہمدرد دواخانہ، (مختلف علما کی تحریرات کا مجموعہ)؛ (۴۸) عبدالحی: اسوۂ رسول اکرمؐ، ۱۹۷۵ء؛ (۴۹) نصیر احمد ناصر: سیرت خیر البشر، (سعودی عرب سے پہلی انعام یافتہ کتاب)؛

خصوصی اشاعتیں: (۱) انتخاب سیرت پاک ماہ نو کی خصوصی اشاعتوں کا انتخاب، ۱۹۶۹ء؛ (۲) سیارہ ڈائجسٹ رسول نمبر (۱۹۷۳ء)۔

مآخذ: غلام مصطفیٰ خان: اردو کا دینی ادب، در تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند، لاہور ۱۹۷۲ء؛ (۲) عبدالحق: قاموس الکتب اردو، جلد اول، کراچی ۱۹۶۱ء؛ (۳) عبدالجبار خان: مقالہ اردو میں سیرت نبوی کا سرمایہ، (مخطوطہ سندھ یونیورسٹی، حیدرآباد)۔

(عبدالجبار خان)

۴- بنگلہ کتب سیرت: بنگلہ زبان میں بھی سیرت طیبہ پر خاصا کام ہوا ہے، چند تصنیفات حسب ذیل ہیں:

(۱) مولوی سراج الدین: سیرت النبی، ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۸ء؛ (۲) شیخ عبدالرحیم (۱۸۵۹-۱۹۳۱ء): جیون چرت (سیرت پیغمبر)، ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء؛ (۳) وہی مصنف: تاریخ الاسلام، ۲ جلدیں، ۱۹۱۰ء؛ (۴) رانی ہرانی گپتا (ہندو ادیب): حضرت محمدؐ، ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۴ء؛ (۵) ابوالحسن: حضرت محمد جیونی، ۱۹۰۴ء؛ (۶) مہاکوی ستیہ الحق احمد: سابرات پیغمبر، (منظوم سیرت شائع ہوئی)؛ (۷) محبوب علی چودھری (۱۸۸۰-۱۹۵۰ء): سیرت مختصر، (تاج اسلامیہ) ۱۹۱۹ء؛ (۸) محمد اکرم خاں، مولانا: مصطفیٰ چرت، ۱۹۲۵ء؛ (۹) ذوق غلام مصطفیٰ (۱۸۹۷-۱۹۶۴ء): شیو نبی، (پیغمبر اعظم، نثر مرصع)، ۱۹۲۲ء؛ (۱۰) عبدالخالق: سید المرسلین؛ (۱۱) محمد واجد علی: مرو بھاسکر، (پیغمبر صحرا)، ۱۹۳۲ء؛ (۱۲) قاضی نذر الاسلام: مرو بھاسکر، (پیغمبر صحرا)، (نظم)؛ (۱۳) روشن یزدانی: خاتم النبیین، ۱۹۶۰ء؛ (۱۴) محمد ممتاز الدین: نبی پارہ سایر (Nabi Paracaver)، ۱۹۶۲ء؛ (۱۵) علی مہر رحمت: نبی دو جہاں، ۲ جلدیں، ۱۹۶۲ء؛ (۱۶) معصوم والی: سرا جہانارا نبی، ۱۹۶۲ء؛ (۱۷) اے۔ ای۔ ایم عبدالخالق: بشرا نبی را کاری دو لار، ۱۹۶۳ء؛ (۱۸) قاضی عبد الودود: ہمارا محمد اسلام، ۱۹۶۶ء۔

مآخذ: (۱) تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، بنگالی ادب؛ (۲) *Library of Congress Catalogue*، زیر عنوان مادہ محمد۔

۵- ترکی کتب سیرت: دوسرے بلاد اسلامیہ کی طرح ترکی میں بھی سیرت طیبہ پر بہت کم ہوا ہے، چند کتابیں حسب ذیل ہیں:

(۱) علی اکنکی (Ali Akinki): عاہر زمان پیغمبر حضرت محمد، استانبول ۱۹۴۹ء؛ (۲) برکت علی ہمت: خاتم الانبیاء حضرت محمد وحیاتہ، ۱۹۶۰ء؛ (۳) اکسیکی احمد حمدی (۱۸۸۰-۱۹۴۹ء): پیغمبر حضرت محمد علیہ السلام و دوستو ماتلک، ۱۹۶۰ء؛ (۴) مصطفیٰ عاصم اوکسالی: حضرت محمد علیہ السلام، انقرہ ۱۹۶۶ء۔

۶- چینی زبان میں کتب سیرت: چین میں مسلمانوں کی خاصی آبادی ہے۔ انہیں اسلام اور پیغمبرؐ اسلام سے گہری محبت ہے۔ سیرت طیبہ کے موضوع پر تصنیف کی جانے والی چند کتب حسب ذیل ہیں:

(۱) Lew chih (اٹھارہویں صدی) : The true Annals of the prophet of Arabia ، بعد الحلبی (۹۷۵-۱۰۴۴ھ): انسان العیون فی سیرۃ الامین و المامون ، روسی ترجمہ از Archimandrite palladius: انگریزی ترجمہ ، Isaac mason : Life of Mohammad the Arabian Prophet ، (مطبوعہ شنگھائی ۱۹۲۱ء) ؛ (۲) Hasing chen tsung : Ma-ham-mo-techuam ؛

مآخذ : Library of congress catalogue ، تکملہ ۱۹۶۵-۱۹۶۹ء ، ۱۶ : ۲۰۰ ببعد ؛ (۲) Isaacmason: مقدمہ ، The Arabian Prophet ، مطبوعہ شنگھائی۔

[محمود الحسن عارف رکن ادارہ نے مرتب کیا]۔

(ادارہ)

۷۔ سندھی کتب سیرت : سندھی زبان میں سیرت طیبہ پر خاصا کام ہوا ہے ، چند کتب حسب ذیل ہیں : (۱) مخدوم میاں مورہو (پ ۱۱۵۰ھ / ۱۷۳۵ء) : کنزالعبرت ، (تصنیف ۱۱۷۵ھ) ، واقعات سیرت کا اجمالی تذکرہ ، قدیم اور جدید سندھی میں طبع ہو چکی ہے ؛ (۲) وہی مصنف : مجموعہ ، (پانچ رسائل کا مجموعہ، جن میں سے ایک رسالہ غزوات اور دوسرا شجاعت خیر انام پر ہے)؛ (۳) حکیم فتح محمد سیوہانی: حیات النبی، بار اول ۱۹۰۴ء؛ (۴) وہی مصنف : اخلاق النبی ؛ (۵) فضل محمد غزنوی: سیرۃ النبی ، (۲ جلدیں) ؛ (۶) محمد بخش واصف : اساتجو پیارو رسول ، ۱۹۳۵ء ؛ (۷) وہی مصنف : دریتیم ، ۱۹۳۸ء ؛ (۸) وہی مصنف : رسول پاک ، ۱۹۳۰ء ؛ (۹) مخدوم محمد صالح بھٹی : ثمل رعنا ؛ (۱۰) خیر محمد نظامانی : اساتجو نبی ؛ (۱۱) غلام محمد شہوانی و عبدالواحد سندھی : رسول پاک ؛ (۱۲) علی خان ابڑو : حالات نبی ؛ (۱۳) مرزا قلیچ بیگ : سیرت پاک ؛ (۱۴) حسین علی شاہ : معجزات محمدی ؛ (۱۵) عبدالرحیم مگسی : سیرۃ النبی ؛ (۱۶) قاضی عبدالرزاق : اساتجو پیارو نبی ؛ (۱۷) محمد یعقوب ابڑو : شاہ عرب ؛ (۱۸) وحید احمد لاشاری [illegible] مصنف ؛ (۱۹) محمد عزت اللہ مرکز مدینہ۔

مآخذ : (۱) تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ۱۳ : ۲۳۵-۲۵۵ (سندھی ادب) ؛ (۲) Library of congress catalogue ، بذیل محمد ؛ (۳) شیخ محمد صدیق: تاریخ سندھی ادب ، جلد اول و دوم؛ (۴) ماہنامہ المعارف، اگست ۱۹۸۰ء ، ص ۳ تا ۱۱؛ [محمود الحسن عارف رکن ادارہ نے لکھا]۔

(ادارہ)

۸۔ پشتو کتب سیرت : (۱) اخون درویزہ (م ۱۰۴۸ھ / ۱۶۳۸ء) : مخزن الاسلام ؛ (۲) ملا عبدالرشید : رشید البیان ، (تصنیف ۱۱۲۹ھ/۱۷۱۶ء) ؛ (۳) میاں مجدی بن محمد عمر چمکنی : شمائل نامہ ؛ (۴) ملا احمد جان : جواہر الانبیاء (تصنیف ۱۳۲۲-۱۳۴۲ھ)؛ (۵) ملا نعمت اللہ : قصص الانبیاء ؛ (۶) پیر بخش : زمونگ محمد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ؛ (۷) خان میر ہلالی : دنیانو امام ؛ (۸) وہی مصنف : بنگلے رسول ؛ (۹) امیر ترخوی : دوست د خدائے ؛ (۱۰) عبدالحمید قریشی : زما رسول ؛ (۱۱) عبدالوہاب : زینۃ الاسلام ؛ (۱۲) سید روح اللہ : تاریخ سردار عالم ؛ (۱۳) امین گل : سیرت الرسول ؛ (۱۴) غلام نبی : سیرت خیر البشر ، (دو جلدیں) ؛ (۱۵) مرزا عبدالرحیم : سردار عالم ؛ (۱۶) میر محمد عباس قادریہ : کتاب سیرۃ النبی ؛ (۱۷) سید اکبر صابر : سیرت النبی ؛ (۱۸) محمد تقدیم الحق کاکا خیل : تاریخ امت ، (پہلا حصہ)۔

(پریشان خٹک)

۹۔ یورپی زبانوں میں کتب سیرت: یورپ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سیرت طیبہ کا مطالعہ بڑی حد تک بے خبری سے کیا گیا ہے اور بعض تصانیف سے تو تنگدلی کا تاثر ملتا ہے ۔ بہر حال اس موضوع پر فضلائے مغرب کی چند تصانیف و تحریرات قابل ذکر ہیں، مگر انہیں بھی بڑی احتیاط سے مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے ۔ بعض تصانیف حسب ذیل ہیں :

موجودہ صدی کے مجلات میں سیرۃ پر جو مقالے شائع ہوئے ہیں ان کے لیے دیکھیے Pearson : Index Islamicus ، عام یورپین علمی کتب جن میں سیرۃ پر مواد ہے ان میں : (۱) Pfannmüller : Handbuch der Isl'am Literatur : (۲) Chauvin : Bibliograpie des ourages arabeson relatifs aux arabes ; (۳) Sauvaget : Introduction al histoire del' orient musulman ، متعلقہ تصحیح :

(الف) سیرۃ پر انگریزی میں عام کتابیں : (۵) Sir William Muir : The life of Mahammet : لندن ۴ جلدیں ۱۸۵۸ء تا ۱۸۶۱ء ، ایک غیر محتاط تصنیف ، جس کے اعتراضات کے مختلف علما نے تفصیلی جوابات دیئے ہیں ؛ (۶) Stanley Lane Poole (۱۸۳۲-۱۸۹۵ء) : The Prophet of Islam ، ۱۸۷۹ء ؛ (۷) وہی مصنف : The Speeches and table talk of the Prophet Mohammad : (۸) Sir Thomas Arnold ، (۱۸۶۳ - ۱۹۳۰ء) ; The Preaching of Islam ، ۱۸۹۶ء ، (ابتدائی حصہ متعلق بہ سیرت) : (۹) Sir Thomas Carlyle ، (۱۷۹۵ - ۱۸۸۱ء) ; Sastus Resartus on Heroes and Hero Worship ، مقالہ دوم بعنوان : The hero as Prophet ، مطبوعہ لندن ، ص ۲۷۷ تا ۳۱۰ ، یہ مقالہ ۱۸۴۰ء میں بطور لیکچر پڑھا گیا ؛ (۱۰) Irving Washington : The life of Mohammed ، (نیو یارک ۱۸۴۹ء) ، عربی ترجمہ از حسنی الخربوطلی بعنوان حیاۃ محمد ، قاہرہ بار ثانی ۱۹۶۶ء ؛ (۱۱) Bosworth Smith : Mohammed and Mohammedanism ، مطبوعہ ۱۸۷۵ء ؛ (۱۲) S.W. Koell : Mohammed and Mohammedanism critically considered ، (۱۸۸۸ء) ؛ (۱۳) John Stone : Mohammed and his Power ، ۱۹۰۱ء ، سلسلہ World Epoch Maker ؛ (۱۴) Morgolrouth (Davids) ، (۱۸۵۸-۱۹۴۰ء) ; Mohammed and the Rise of Islam ، نیو یارک ۱۹۰۵ء ؛ (۱۵) Townsend [Meredith W.] : The Great Arabian ، ۱۹۱۲ء ، سلسلہ Modern biographies ؛ (۱۶) Dreycott [G. M.] : Mohammed Founder of Islam ، ۱۹۱۶ء ؛ (۱۷) A. J. Wensinck : A Handbook of Mohammedan Tradition ، ۱۹۲۷ء ، [عربی ترجمہ از محمد فؤاد عبدالباقی : مفتاح کنوز السنۃ ، قاہرہ و لاہور] ؛ (۱۸) Bodley, Renald (V. C.) : The life of Mohammad The Messenger ، لاہور ۱۹۴۰ء ؛ (۱۹) W. Montgomery Watt ، Muhammad at Mecca ، آکسفرڈ ۱۹۵۳ء ؛ (۲۰) وہی مصنف : Muhammad at Medina ، آکسفرڈ ۱۹۵۶ء ؛ (۲۱) وہی مصنف : Muhammad : Prophet and Statesman ، آکسفرڈ ۱۹۶۱ء ؛ (۲۲) R. A. Nicholson : A literary History of the Arabs ، کیمبرج ۱۹۳۰ء ۔

(ب) دیگر زبانوں کی تصنیفات : (۲۳) J. Gagnier : La Vie de Mahomet ، ۳ مجلدات ۱۷۴۸ء ؛ (۲۴) Lamaitress و Dujarric : Vie de Mahomet 'd' apris La tradition ، ۱۸۹۷ - ۱۸۹۸ء ؛ (۲۵) Th. Nöldeke : Das Leben Muhammed'e nach den Quellen popular dargestellt ، ۱۸۶۳ء ؛ (۲۶) A. Krehl : Das leben des Muhammed ، ۱۸۸۴ء ؛ (۲۷) R. Dozy : Essai Sur l' histoire de l' Islamism ، ۱۸۷۹ء ؛ (۲۸) H. Grimme : Mohammed ، ۲ جلدیں ، ۱۸۹۲-۱۸۹۵ء ؛ (۲۹) Leone Caetani ، (۱۸۶۹ - ۱۹۲۶ء) ; Annali dell' Islam ، میلان ۱۹۰۵ء ، جلد ۱ و ۱/۲ ؛ (۳۰) E. Dermenghem : La Via de Mohamet ، بار اول پیرس ۱۹۲۹ء ، بار دوم ۱۹۵۰ء ؛ (۳۱) A. Sprenger : Das Leben und die Lehre des Mohammad ، ۳ جلدیں ، ۱۸۶۱-۱۸۶۵ء ؛ (۳۲) G. Weil : Muhammed der Prophet, Sein Leben und Sein Lehre ، ۱۸۴۳ء ؛ (۳۳) Franz Buhl : Muhammeds liv ، ۱۹۰۳ء ؛ (۳۴) Das Leben Muhammeds ، لائپزگ ۱۹۳۰ء ؛ (۳۵) J. Wellhausen : Skizzen Und Vorabeiten ، [illegible] ؛ (۳۶) M. Gaudefroy : Mahomet ، پیرس ۱۹۵۷ء ،

۱۰- یورپی زبانوں میں مسلم مصنفین کی تصانیف : (۱) سید امیر علی (۱۸۴۹-۱۹۲۸ء) : *A critical examination of the life and Teachings of Muhammad*، لنڈن ۱۸۷۳ء ؛ (۲) وهی مصنف : *The Spirit of Islam, A history of the evolution and ideas of Islam with a life of the Prophet*، (متعدد اشاعتیں) ؛ (۳) عبداللہ یوسف علی : *The Personal life of Muhammad*، در سلسلہ Progressive Islamic Prophet، شمارہ ۲، لنڈن ۱۹۲۹ء ؛ (۴) سردار اقبال : *Mohammad the Prophet*، ۱۹۳۲ء ؛ (۵) خالد لطیف گابا : *The Prophet of the Desert*، ۱۹۳۴ء ؛ (۶) محمد حمید اللہ : *Muhammad Rasulullah*، حیدرآباد دکن ۱۹۷۴ء، کراچی ۱۹۷۹ء ؛ (۷) وهی مصنف : *Le Prophete de l' Islam*، دو جلدیں، پیرس ۱۹۵۹ء ؛ (۸) وهی مصنف : *Corpus de Documents*، پیرس ۱۹۳۵ء ؛ (۹) قاسم علی جیراجپوری : *Muhammad, a Mercy to all the Nations*، ۱۹۳۷ء ؛ (۱۰) سلیمان بن ابراهیم، (Dinet' Et.) : *La vie Mohammed*، (مستشرق Dinet، کے اسلام کے متعلق دیکھیے نجیب العقیقی : المستشرقون، ۱ : ۲۳۵) ؛ (۱۱) مارما ڈیوک پکتھال (Marmaduke Pickthal) و اللہ بخش یوسفی : *Life of the Holy Prophet Mohammad* : Al-Amin، مطبوعۂ کراچی ۱۹۵۹ء ؛ (۱۲) عبدالسمیع مصری : *Muhammad the Prophet of Islam*، قاهره ۱۹۶۸ء ؛ (۱۳) عبدالحمید صدیقی : *Life of Muhammad*، لاهور ۱۹۶۹ء ؛ (۱۴) ثروت صولت : *The life of Mohammad*، ۱۹۷۶ء .

۱۱- کتب سیرت سے متعلق جدید فهرستیں اور کتابیات : (۱) *General Catalogue of Printed books to 1955 in the British Museum, London*، فوٹو لیتھو گرافک ایڈیشن، ج ۱۶۶، مطبوعۂ ۱۹۶۳ء، ک ۵۹ - ۴۷۳ ؛ (۲) *Five yearly Supplement of British Museum General catalogue*، ۱۹۵۶ - ۱۹۶۰ء، ۲۷ : ۳۰۸ بعد ؛ (۳) *Catalogue of Printed books in the British Museum, London*، مطبوعۂ ۱۹۷۰ء، ج ۱، ک ۹۹۹ بعد ؛ (۴) کتاب مذکور، ده ساله تکمله ۱۹۵۶-۱۹۶۵ء، ج ۳۲، ک ۳۰۸ بعد ؛ (۵) *Library of Congress Catalogue*، ۱۹۵۰ تا ۱۹۶۰ء، ۲۷ : ۳۱۰ - ۳۲۰ ؛ (۶) کتاب مذکور : تکمله، ۱۹۶۰ - ۱۹۶۴ء، ۳۰، ج ۱۲۶، ص ۱۳۶ - ۱۳۷ ؛ (۷) کتاب مذکور : تکمله، ۱۹۶۵-۱۹۶۹ء، ج ۴۳، بذیل محمد ؛ (۸) نجیب العقیقی : المستشرقون، ۳ جلدیں، بمواقع کثیره بمدد اشاریه ؛ (۹) *Encyclopaedia of Islam*، لائیڈن، بذیل ماخذ مقاله حضرت محمدؐ ؛ (۱۰) *Encyclopaedia Britannica*، بذیل ماخذ مقاله حضرت محمدؐ ؛ (۱۱) Carl Brockelmann : *Geschichte der Arabischen Litteratur*، جلد ۱، بذیل ماخذ مقاله محمد و قرآن ؛ (۱۲) Humphrey Prideux : *Life of Mahomet*، مطبوعۂ ۱۶۹۷ء، ص ۲۵۰ تا ۲۶۳ ؛ (۱۳) پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاهور کی کارڈ کیٹلاگ ؛

[محمود الحسن عارف رکن اداره نے لکھا] .

(اداره)

۱۲- جدید عربی کتب : (۱) بنت الشاطی : ام الرسول محمدؐ ؛ (۲) محمد خالد : خاتم النبیین ؛ (۳) عبدالمتعال الصعیدی : شباب قریش ؛ (۴) محمد عزت دروزه : عصر النبیؐ و بیئته قبل البعثة ؛ (۵) طٰه حسین : علی هامش السیرة ؛ (۶) محمد الغزالی : فقه السیرة ؛ (۷) محمد حسین هیکل : فی منزل الوحی ؛ (۸) توفیق الحکیم : محمد صلی اللہ علیه وسلم ؛ (۹) محمد عبدالفتاح ابراهیم : محمدؐ القائد ؛ (۱۰) محمد احمد جاد المولی : محمدؐ المثل الکامل ؛ (۱۱) محمد رضا : محمد رسول اللہ صلی عایه وسلم ؛ (۱۲) عبدالرحمن بن عزام : بطل الابطال (او ابرز صفات النبی محمدؐ) ؛ (۱۳) محمد جمال الدین سرور : قیام الدولة العربیة الاسلامیه فی حیاة محمد صلی اللہ علیه وسلم ؛ (۱۴) محمد الطیب النجار : القول المبین فی سیرة سید المرسلین، قاهره (۱۹۸۳ء) ؛ (۱۵) عماد الدین خلیل : دراسة فی السیرة

(بیروت ۱۹۷۵ء) : (۱۶) عبدالحلیم محمود : الرسول صلی اللہ علیه وسلم : (۱۷) ابن ابراهیم شموط و محمود زیادہ : الحقیقة المثالیه . (۱۸) عبدالفتاح شحاته : تاریخ العرب و عصر الرسول ؐ : (۱۹) محمود زیادہ : درسات اسلامیه : (۲۰) محمد مصطفی النجار : سیرة الرسول ؐ : (۲۱) حسن ابراهیم حسن : تاریخ الاسلام السیاسی و الدینی و الثقافی ، جلد اول ؛ (۲۲) امین دویدار : صور من حیاة الرسول ؐ (۱۹۵۸ء) : (۲۳) محمد بن عبدالوهاب : مختصر سیرة الرسول ؐ : (۲۴) عبداللہ بن محمد بن عبدالوهاب : مختصر سیرة الرسول ؐ : (۲۵) مخدوم محمد هاشم الهندی التتوی : بذل القوة فی حوادث سنی النبوة : حیدرآباد (پاکستان) ۱۹۶۶ء : (۲۶) عروة بن الزبیر (۲۳ تا ۹۴ھ) : مغازی رسول اللہ صلی اللہ علیه و سلم (بروایت ابی الاسود) : استخراج و طبع محمد مصطفی الاعظمی ، الریاض ۱۹۸۱ء (صفحات ۲۹۳) بالخصوص مقدمه کتاب : (۲۷) محمد فرج : العبقریة العسکریة فی غزوات النبی صلی اللہ علیه وسلم : (۲۸) مصطفی فہمی : محمد رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ؛ (۲۹) ابن قیم الجوزیة : الطب النبویة ، بیروت : (۳۰) ابو الحسن علی علاء الدین الحموی الکحال : الاحکام النبویة فی الصناعة الطبیة .

۱۳۔ جدید اردو کتب سیرت : (۱) محمد ولی رازی : هادیٔ عالم (پوری کتاب کی عبارت غیر منقوطه ہے) : (۲) محمد عبدالحی : اسوۂ رسول اکرم ؐ : (۳) وحید الدین خان : پیغمبر ؐ انقلاب : (۴) سید اسعد گیلانی : رسول اکرم ؐ کی حکمت انقلاب ؛ (۵) عبدالعزیز عرفی : جمال مصطفی ؐ (۴ جلدیں) : (۶) شیر علی خان راؤ : سیرت محسن کائنات ؐ : (۷) محمد شریف قاضی : اسوۂ حسنه : (۸) محمد صدیق قریشی : رسول اکرم ؐ کی سیاست خارجه : (۹) خواجه محمد اسلام : محبوب ؐ کے حسن و جمال کا منظر ؛ (۱۰) امیر افضل خان : جلال مصطفی ؐ (حضور پاک کی جنگی حکمت عملی اور تدبیرات کا فوجی تجزیه) : (۱۱) گلزار احمد : غزوات رسول اللہ صلی اللہ علیه و سلم : (۱۲) قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی : سیرت طیبه : (۱۳) سید ابو الحسن علی ندوی : نبی رحمت صلی اللہ علیه و سلم (۲ جلدیں) : (۱۴) عبد الرزاق ملیح آبادی (ترجمه) : اسوۂ حسنه : (۱۵) اسد القادری : سیرت الرسول صلی اللہ علیه وسلم ؛ (۱۶) ابن خلدون : تاریخ ، جلد اول ، عہد رسالت (اردو ترجمه از شیخ عنایت اللہ) : (۱۷) غلام عزیز ربانی : سیرت طیبه ؐ (۲ جلدیں) .

۱۲۔ جدید فہرستیں : (۱) Horowitz : *The Earliest Biographies of the Prophet and their Authors* در *Islamic culture* ، ۱ (۱۹۲۷ء) : ۵۳۵ تا ۵۵۹ ، ۲ (۱۹۲۸ء) : ۲۲ تا ۵۰ ، ۱۶۴ تا ۱۸۲ ، ۴۹۵ تا ۵۲۶ : (۲) فؤاد سزگین : تاریخ التراث العربی ، المجلد الاول ، قاهره ۱۹۷۷ء ، ص ۳۰۹ تا ۳۱۲ ، ۳۴۳ تا ۳۸۵ : (۳) W. M. Watt : *The Materials used by Ibn Ishaq* ، در *Historians of the Middle East* : (۴) محمد حمید اللہ : (*Le Prophete de l. Islam*) : اور (۵) عبدالحمید صدیقی : (*The life of Muhammad*) دونوں نے مصادر و ماخذ کے تحت کتب سیرت کی مفصل فہرستیں درج کر دی ہیں : (۶) حافظ احمد یار خان : فہرست کتب سیرت (اردو و پنجابی) ؛ (۷) نویں قومی سیرت کانفرنس (۱۹۸۴ء) کے موقع پر اسلام آباد میں کتب سیرت کی ایک شاندار نمائش کا اهتمام کیا گیا تھا ۔ امید ہے کہ عنقریب اس کی فہرست بھی طبع ہو جائے گی ۔ [عبدالقیوم رکن اداره نے لکھا] .

(اداره)

۱۳۔ عربی ، فارسی ، اردو اور دیگر باثروت زبانوں کی طرح ترکی زبان بھی اسلامی ادب سے مالا مال ہے ۔ آج بھی ترکیه میں اسلامی مخطوطات کے قابل رشک وافر ذخائر موجود ہیں ؛ البته دیگر اسلامی موضوعات کے مقابلے میں سیرت النبی ؐ کے موضوع پر اہل علم نے بدیر توجه دی ۔ بڑے بڑے علما و شعرا نے اس صنف ادب میں بھر پور حصه لیا ۔ ابتدا میں زیادہ تر اعتماد و انحصار عربی و فارسی کتب سیرت النبی کے تراجم پر رہا ۔ پھر

قدیم کتب سیرت کے اختصار اور تبویب و تشریح پر بھی خاصا کام ہوا۔ اس سلسلے میں سیرت ابن ہشام، شمائل ترمذی اور قاضی عیاض کی شفا کے تراجم و اختصارات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نظم و نثر میں سیرت پر مستقل تالیفات کا بھی خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ چند اہم کتابوں کے نام ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

(۱) مصطفی بن یوسف بن عمر الارزن الرومی الضریر: ترجمہ سیرت النبیؐ (ترجمۃ الضریر و تقدمۃ الظہیر)۔ مترجم نے سیرت ابن ہشام کا ترکی زبان میں ترجمہ ۷۹۰ھ میں مکمل کیا۔ پھر مملوک سلطان مصر سیف الدین برقوق کی خدمت میں پیش کیا۔ بعد کے آنے والے مصنفین سیرت نے اس ترجمے سے بڑا استفادہ کیا: (۲) محمد نبی (م ۱۱۶۶ھ): ترجمۃ الشفا فی شمائل صاحب الاصطفاء، قاضی عیاض کی الشفا کا ترکی ترجمہ ۱۱۶۱ھ میں مکمل ہوا: (۳) ابراہیم حنیف (م ۱۱۸۹ھ): خلاصۃ الوفا فی شرح الشفاء، مصنف نے قاضی عیاض کی کتاب الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ کی شرح ترکی زبان میں چار جلدوں میں رقم کی ہے، استانبول ۱۳۱۳ھ تا ۱۳۱۷ھ: (۴) عبدالباقی بن محمد المعروف بباقی (م ۱۰۰۸ھ): معالم الیقین فی سیرۃ سید المرسلین، یہ کتاب القسطلانی کی المواہب اللدنیۃ کا ترکی ترجمہ ہے جو مترجم نے ۹۸۶ھ میں مکمل کیا۔ جلد اول، استانبول ۱۳۲۲ھ، جلد دوم ۱۳۲۶ھ؛ (۵) محمود المغنیساوی نے بھی المواہب اللدنیۃ کا ترکی ترجمہ کیا: (۶) احمد بن خیرالدین اسحاق خواجہ سی البروسوی (م ۱۱۲۰ھ) اقوم الوسائل فی ترجمۃ الشمائل، امام ترمذی کی کتاب الشمائل النبویہ کا ترکی ترجمہ جو ۱۱۱۱ھ میں مکمل ہوا۔ استانبول ۱۲۸۷ھ، ۱۳۲۲ھ، پھر ۱۳۲۶ھ: (۷) محمد الآق کرمانی: ترجمہ الشمائل النبویہ، شمائل ترمذی کا ترکی ترجمہ: (۸) حسین بن محمد بن حسن الشہیر بحسام الدین نقشبندی (م ۱۲۴۸ھ): شرح الشمائل الشریفۃ، بولاق ۱۲۵۴ھ: (۹) احمد عاصم عینتابی (م ۱۲۳۵ھ): السیرۃ الحلبیۃ، بولاق ۱۲۴۸ھ در حقیقت یہ کتاب ابراہیم بن مصطفی الحلبی (م ۱۱۹۱ھ) کی شرح منظومۃ السیرۃ الحلبیہ کا ترکی ترجمہ ہے جو ۴۰۵ صفحات پر مشتمل ہے: (۱۰) حافظ بن سلیمان: کفایۃ الانوار، قاضی عیاض کی کتاب الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ کا ترکی ترجمہ: (۱۱) لامعی چلبی بن محمد بن عثمان (م ۹۳۸ھ): ترجمہ شواہد النبوۃ لتقویۃ یقین اہل الفتوۃ؛ اس ترکی شاعر نے عبدالرحمن جامی (م ۸۹۸ھ) کی کتاب کو ترکی زبان میں منتقل کیا: (۱۲) عبدالحلیم بن محمد بن نور اللہ الشہیر بہ حلیمی آخی زادہ (م ۱۰۱۳ھ) نے ۱۰۰۹ھ میں جامی کی مذکورہ بالا کتاب کا ترکی ترجمہ مکمل کیا: (۱۳) جلال زادہ مصطفی چلبی (م ۹۷۵ھ): (ترجمہ معارج النبوۃ فی مدارج الفتوۃ، معین الدین محمد الفراہی المعروف بملا مسکین (م ۹۱۰ھ) نے کتاب معارج النبوۃ فارسی میں لکھی اور مترجم جلال زادہ نے اس کا یہ ترکی ترجمہ ۹۵۹ھ میں مکمل کیا: (۱۴) محمد بن محمد الاسکوبی المعروف بابن الجعفرتجی (م ۱۰۳۳ھ): دلائل نبوت محمدی و شمائل فتوت احمدی۔ یہ بھی معارج النبوۃ فی مدارج الفتوۃ کا ترکی ترجمہ ہے اور پہلے ترجمے سے زیادہ مقبول و مروج ہے: (۱۵) محمود المغنیساوی المعروف بیکلی زادہ (م ۱۱۳۰ھ): ترجمہ روضۃ الاحباب فی سیرت النبی والآل والاصحاب، ۱۱۰۳ھ میں فارسی سے ترکی میں ترجمہ کیا: پہلی جلد میں سیرۃ النبی، دوسری میں حیات خلفائے راشدین اور تیسری میں حضرت حسن و حسین اور اموی و عباسی خلفا کے حالات، استانبول ۱۲۶۸ھ: (۱۶) احمد وحی زادہ الازنیقی (م ۱۰۱۸ھ): صحائف العبیر و لطائف السیر (ترجمہ سیر گازرونی)، فارسی زبان سے ترکی میں یہ ترجمہ ۱۰۰۳ھ میں مکمل ہوا: (۱۷) عبدالعزیز قرہ چلبی زادہ (م ۱۰۶۸ھ): ترجمہ سیر گازرونی (فارسی سے ترکی میں ترجمہ): (۱۸) لطف اللہ احمد: حیات حضرت محمد (تین جلدیں)، استانبول ۱۳۲۲ھ: (۱۹) محمد سعد الدین آفندی بن حسن: الرسالۃ الشمائلیۃ: (۲۰) یوسف شکری بن

عثمان الخربوطلي : سلسلۃ الصفا لمحمد المصطفی : بولاق ۱۲۸۷ھ : (۲۱) ازمیرلی اسماعیل حقی : سیر جلیلۂ نبویہ، استانبول ۱۳۳۲ھ ؛ (۲۲) محمد ضیا : سیر نبی، استانبول ۱۹۲۶ء : (۲۳) عاطف : سیرۃ النبی، استانبول ۱۳۳۸ھ : (۲۴) عبدالباقی عارف افندی (م ۱۱۲۵ھ) : سیرۃ النبی (منظوم) : (۲۵) ابراھیم حنیف افندی (م ۱۲۱۷ھ) : سیر النبی (منظوم)، اس ترکی ادیب نے یہ کتاب ۱۲۰۴ھ میں مکمل کی ؛ (۲۶) محمد حاکم الروسی (م ۱۱۸۴ھ) : سیر النبی (عجائب الاخبار فی اخبار سید الاخیار) ؛ (۲۷) احمد رفیق : غزوات جلیلۂ پیغمبری، صرف غزوات النبی پر مشتمل ہے (صفحات ۲۲۴)، استانبول ۱۳۲۴ھ : (۲۸) عبدالعزیز قرہ چلبی زادہ (م ۱۰۶۸ھ) : القوائح النبویہ فی السیرۃ المصطفویۃ : (۲۹) یحیوا بک دوقاکین زادہ (م ۹۹۰ھ) : گل صدرنگ (منظوم)، مشتمل بر معجزات نبوی : (۳۰) محمد بن ابراھیم بن احمد العمادی (م ۱۱۲۰ھ): کواکب الانوار الاحمدیۃ فی اسرار المعجزات المحمدیۃ : (۳۱) اویس بن محمد الاتیرلی الاسکوبی الشھیر بویسی (م ۱۰۳۷ھ) : درۃ التاج فی سیرۃ صاحب المعراج (۲ جلدیں)، مشہور ترکی ادیب ویسی نے مغلق اسلوب میں صنعت لفظی کا اہتمام کرتے ہوئے عربی و فارسی الفاظ بکثرت استعمال کیے ہیں۔ کتاب کا ایک حصہ مکی زندگی پر مشتمل ہے اور دوسرا مدنی پر۔ دوسرا حصہ غزوہ بدر پر ختم ہو گیا، استنبول ۱۲۸۶ھ : (۳۲) یوسف الرھاوی المشہور نابی (م ۱۱۲۳ھ) : ذیل سیر ویسی، درۃ التاج کا تکملہ، غزوہ بنی قینقاع تا فتح مکہ، بولاق ۱۲۳۸ھ : (۳۳) وھی مصنف : ذیل ذیل ثانی (۹۵ تکملہ): (۳۴) نظمی زادہ مرتضی البغدادی (م ۱۱۳۴ھ) نے درۃ التاج فی سیرۃ صاحب المعراج کو مکمل کیا ؛ (۳۵) محمد توفیق پاشاہ : لوامع النور، استانبول ۱۳۰۸ھ ؛ (۳۶) ایوب صبری : محمود السیر، استانبول ۱۲۸۷ھ ؛ (۳۷) یوسف سعاد : مرآت محمدیہ و مناقب احمدیہ، استانبول ۱۳۱۳ھ ؛ (۳۸) جوابی : معجزات النبویۃ ؛ (۳۹) حافظ محمد زھدی : نظم السیر، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غزوات کو مثنوی کے انداز میں نظم کیا گیا ہے، طرابزون ۱۳۳۴ھ ؛ (۴۰) احمد بن ابراھیم طوپ خانہ وی : موھبۃ سنیہ من السیرۃ الزکیۃ : (۴۱) محمد راتف افندی : مختصر شمائل شریفیہ ترجمہ سی، استانبول ۱۳۰۴ھ : (۴۲) یوسف سعاد : اقوم السیر، الجزء الاول، استانبول ۱۳۲۷ھ ؛ (۴۳) عزیزی : اوصاف و معجزات النبی، استانبول ۱۳۱۳ھ ؛ (۴۴) میرزا زادہ احمد نیلی (م ۱۱۶۱ھ) الاولی فی ترجمۃ الوفاء ؛ (۴۵) محمد خاقانی (م ۱۰۱۵ھ): حلیہ خاقانی۔ مثنوی کی طرز پر شاعر نے نظم کیا ہے، استانبول ۱۲۶۳ھ، ۱۳۰۷ھ وغیرہ : (۴۶) وزیر محمد راغب پاشا (م ۱۱۷۶ھ) : حنینیہ، غزوہ حنین کے واقعات کو نظم کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر نیز دیکھیے سہ ماھی مجلہ عالم الکتب، جلد ۱، عدد ۳ (۱۹۸۰) و جلد ۲، عدد ۳ (۱۹۸۱ء)، الریاض؛ [عبدالقیوم رکن ادارہ نے مرتب کیا، نیز متن مقالہ میں اضافے کیے]۔

(ادارہ)

اللّٰھم صلّ علی محمد و اٰلہ و بارک و سلّم

⊛ **مُحَمَّد (سورۃ)** : قرآن مجید کی ایک مدنی سورت، اس میں کل ۴ رکوع اور ۳۸ آیات ہیں؛ موجودہ ترتیب تلاوت کے اعتبار سے اس کا عدد ۴۷ اور نزول کے اعتبار سے ۹۵ ہے۔ اس سے ما قبل سورۃ الاحقاف اور مابعد سورۃ الفتح ہے۔ اس سورت کو خاتم النبیین آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے نام نامی سے موسوم کیا گیا ہے۔

اس سورہ کے دو نام ہیں: مُحَمَّد اور قتال؛ اول الذکر نام آیۂ مبارکہ: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ (۴۷ [محمد]: ۲)، یعنی اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور جو کتاب حضرت محمدؐ پر نازل ہوئی اسے مانتے رہے اور وہ ان کے پروردگار کی طرف سے برحق ہے، (اللہ تعالیٰ نے) ان سے ان کے گناہ دور کر دیے اور ان کی حالت سنوار دی، سے ماخوذ ہے اور اس اعتبار سے یہ مقام ان تین قرآنی مقامات میں سے ہے، جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر کسی صفاتی نام کے بجائے ذاتی نام سے کیا گیا ہے (بقیہ دو: ۳ [آل عمران]: ۱۴۴؛ ۴۸ [الفتح]: ۲۹)۔ اس سورۃ کا دوسرا نام، جو اس کے موضوع کے زیادہ قریب ہے (سید قطب: فی ظلال القرآن، ۲۶: ۴۴)، اس کی آیت ۲۰ سے ماخوذ ہے.

ایک روایت کے مطابق اس سورہ کا آغاز نزول اس وقت ہوا جب آپؐ ہجرت مدینہ کے لیے پردۂ شب میں جوار حرم سے نکل کر عازم غار ثَور ہو چکے تھے اور حرم مقدس پر نظر ڈالتے ہوئے یہ ارشاد فرما رہے تھے: اے سر زمین مکہ تو مجھے روئے زمین کی بستیوں سے زیادہ محبوب ہے اور اگر تیرے یہ باشندے مجھے اس میں سے باہر نہ نکالتے تو میں ہرگز تجھ سے جدا نہ ہوتا۔ ابھی آپؐ راستے ہی میں تھے کہ یہ سورت نازل ہوئی جس میں بطور خاص یہ اعلان کیا گیا: وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ (۴۷ [محمد]: ۱۳)؛ یعنی اور کتنی ہی بستیاں تمہاری اس بستی سے جس کے باشندوں نے تمہیں وہاں سے نکال دیا، زور و قوت میں کہیں بڑھ کر تھیں، کہ ہم نے انہیں ہلاک کر دیا اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوا۔ اسی بنا پر حضرت ابن عباسؓ اور قتادہؒ نے آیت مذکورہ کو مدنی کے بجائے مکی قرار دیا ہے (روح المعانی، ۲۶: ۳۶).

سورۂ مبارکہ کی بعض اندرونی شہادتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سورہ حکم قتال (۲۲ [الحج]: ۳۹؛ ۲ [البقرۃ]: ۱۹۰) کے بعد اور عملی جہاد سے قبل نازل ہوئی (ابوالاعلی مودودی: تفہیم القرآن، ۵: ۷، ۱۱ تا ۱۲)، مگر بعض نے اسے غزوۂ بدر سے متاخر بھی قرار دیا ہے (دیکھیے القرطبی: الجامع لاحکام القرآن، ۸: ۲۲۲ ببعد).

اس سورۃ کا بنیادی موضوع قتال اور اس سے متعلقہ مسائل و احکام ہیں۔ سورہ کے آغاز میں (بغیر کسی تمہید اور ابتدائیہ کے) ایمان و اہل ایمان اور کفر و اہل کفر کی حقیقت بیان کی گئی ہے اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ اہل ایمان، جن کے رہنما حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جس مشن کو لے کر اٹھے ہیں اور جو دنیائے انسانیت کی فلاح و نجات کا واحد ذریعہ ہے، اہل کفر اس کے سامنے سد راہ بن کر کھڑے ہو گئے ہیں (آیت ۱ تا ۴)۔ کفر کے اس طوفانی حملے کو روکنے اور ان کی مکروہ سازشوں کو ناکام و نامراد کرنے کے لیے اہل اسلام پر سعی و جہد، جس کی انتہائی شکل قتال و جہاد [رک بآں] ہے، لازم کر دی گئی ہے۔ اللہ، اس کے رسولؐ اور اہل ایمان کی طرف سے گویا امر

اعلان جنگ (فی ظلال القرآن، ۲۶ : ۴۷) کے بعد اہل اسلام کو قتال اور اس سے متعلقہ قوانین کی ہدایات (دیکھیے نیچے) دی گئیں (آیت ۴) اور مسلمانوں کو ہر طرح کی ظاہری و معنوی فتح و نصرت کا یقین دلایا گیا۔ جبکہ مخالفین اسلام کو ذات باری کی تائید و نصرت سے محرومی کے علاوہ دنیوی اور اخروی عذابوں کی وعید بھی سنائی گئی (۴ تا ۹، ۱۱، ۱۳)۔ مدینہ منورہ میں موجود منافقوں کو بھی خبردار کیا گیا کہ انہیں شناخت کر لیا گیا ہے اور اب ان کی سازشیں زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہ سکتیں۔ اب یا تو اسلام کا ساتھ دو یا کفر کا۔ اس کے ساتھ ھی انہیں طرح طرح کے عذابوں کی وعیدیں سنائی گئیں (۱۶، ۲۰ تا ۳۱)۔ اختتام پر دوبارہ کفار کو ان کی غلط روی پر سرزنش کی گئی، جبکہ اہل اسلام کو ہر طرح کی آزمائشوں کے لیے تیار رہنے کی تلقین کی گئی (۳۱)۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں پامردی دکھانے (۳۳) اور دشمن کے مقابلے میں ہمت ہارنے کے بجائے حوصلہ بلند رکھنے (۳۵) اور راہ خداوندی میں کھلے دل سے خرچ کرنے (۳۷، ۳۸) کی تلقین کی گئی۔ سورت کے آخری جملے میں وعید آمیز پیرائے میں فرمایا کہ اگر تم (یعنی اہل عرب) ہمارے اس دین کی ذمہ داری اٹھانے سے قاصر رہے تو ہم تمہاری جگہ کسی اور قوم کو دین کی نصرت و حفاظت کے لیے نامزد کر دیں گے (۳۸)۔

یہ سورہ اس اعتبار سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں صلح و جنگ سے متعلقہ احکام کا نزول ہوا۔ یہ احکام زیادہ تر اس سورت کی آیت ذیل سے ماخوذ ہیں، جس میں ارشاد ہے: فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ط حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ لا فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (۴۷ [محمد]: ۵)، یعنی جب تم کافروں سے بھڑ جاؤ تو ان کی گردنیں اڑا دو، یہاں تک کہ جب ان کو خوب قتل کر چکو تو (جو زندہ پکڑے جائیں ان کو) مضبوطی سے قید کر لو۔ پھر اس کے بعد یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دینا چاہیے یا کچھ مال لے کر، یہاں تک کہ (فریق مقابل) لڑائی (کے) ہتھیار (ہاتھ سے) نہ رکھ دے۔ اس آیۂ مبارکہ سے حسب ذیل احکام مستنبط کیے گئے ہیں: (۱) مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ اس وقت تک اپنی توجہ قیدیوں اور مال غنیمت اکٹھا کرنے کی طرف مبذول نہ کریں، جب تک کہ دشمن کی طاقت پوری طرح نہ کچلی جائے؛ (۲) اہل اسلام کے امیر کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ اسیران جنگ کو اگر چاہے تو احسان کر کے چھوڑ دے اور چاہے تو زر نقد لے کر رہا کر دے، جس سے حسب ذیل اصول اخذ کیے گئے: (الف) چونکہ اس آیت میں اسیران جنگ کو قتل کرنے کا ذکر نہیں ہے اس بنا پر ان کو (بجز کسی استثنائی صورت (دیکھیے ب) کے) قتل نہ کیا جائے (القرطبی: الجامع لاحکام القرآن، ۱۶: ۲۲۶، ۲۲۷)۔ اسی بنا پر بعض نے اسے ۹ [التوبۃ]: ۵ کا ناسخ یا اس سے متاخر قرار دیا ہے (حوالۂ مذکور)؛ (ب) اسیران جنگ کے قتل سے صاف ممانعت نہ ہونے کی وجہ سے اگر سربراہ مملکت اسلامیہ کسی خاص فرد کو، اس کی شر انگیزی کی بنا پر، قتل کی سزا دینا چاہے تو ایسا کر سکتا ہے (مثلاً دیکھیے مسلم، ۳: ۱۳۸۸، حدیث ۱۷۶۳)۔ اسی بنا پر آپ نے اسیران جنگ بدر اور غزوۂ احد میں سے بعض کو قتل کرنے کا حکم دیا (الجصاص: احکام القرآن؛ القرطبی، ۱۶: ۲۲۸؛ سید قطب: فی ظلال القرآن، ۲۶: ۵۱)؛ (ج) دوران قید میں اسیروں سے حسن سلوک کیا جائے، یعنی انہیں غذا، لباس اور

علاج معالجے کی سہولت دی جائے؛ ان کی تعذیب سے احتراز کیا جائے (تفہیم، ۵ : ۳۰)؛ جیسا کہ آپ نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں صحابہؓ کو حسن سلوک کی تاکید فرمائی (ابن ہشام)؛ (د) احسان کی ایک صورت یہ ہے کہ انھیں ذمی بنا کر ملک کی رعایا بنا لیا جائے (تفہیم، ۵ : ۱۵)؛ (ہ) اگر امام چاہے تو کسی قیدی کو بغیر زر نقد کے رہا کردے (مثلاً دیکھیے مسلم، ۳: ۱۳۸۵، حدیث ۱۷۶۴)؛ جیسا کہ آپؐ نے ہر غزوے (خاص طور پر غزوہ حنین) کے بعد بہت سے قیدی بلا معاوضہ رہا فرمائے؛ (و) آزادی کے لیے جسمانی (مثلاً فرائض معلمی) یا مالی معاوضے کی ایک حد مقرر کی جا سکتی ہے جیسا کہ غزوۂ بدر کے قیدیوں کے لیے مقرر کی گئی؛ (ز) اگر دشمن تبادلے پر راضی ہو جائے تو اپنے قیدیوں کے بدلے ان کے قیدی رہا کیے جا سکتے ہیں (مثلاً دیکھیے مسلم، ۳ : ۱۳۷۵ تا ۱۳۷۶، حدیث ۱۷۵۵، جہاں دشمن کی ایک قیدی عورت کے معاوضے میں متعدد مسلمانوں کو رہا کرائے جانے کا ذکر ہے)۔

دشمن سے لڑائی کے سلسلے میں دی جانے والی یہ ہدایات موجودہ قوانین اسیران جنگ (بابت جنیوا کنونشن) کے انتہائی قریب ہیں اور آج سے چودہ صدیاں پیشتر کے عہد میں انسانی حرمت و تکریم کے اسلامی جذبے کی غماز ہیں۔

مآخذ: (۱) البخاری: الصحیح، مطبوعہ لائیڈن، ۳ : ۳۳۱ تا ۳۳۲، کتاب تفسیر القرآن، سورہ ۴۷؛ (۲) مسلم: الصحیح، مطبوعۂ قاہرہ ۱۹۵۵ء، ۳ : ۱۳۷۵، ۱۳۷۹، حدیث ۱۷۵۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۸، ۱۴۴۲، وغیرہ؛ (۳) القرطبی: الجامع لاحکام القرآن، ۸ : ۲۲۲ تا ۲۵۸، مطبوعۂ بیروت؛ (۴) ابو بکر الجصاص: احکام القرآن، بذیل سورہ؛ (۵) الآلوسی: روح المعانی، ۲۶ : ۳۶ تا ۴۲، مطبوعہ ملتان؛ (۶) احمد مصطفی المراغی: تفسیر المراغی، ۲۶ : ۴۴ تا ۵۷، قاہرۃ ۱۳۶۵ھ/۱۹۴۶ء؛ (۷) قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی: التفسیر المظہری، ۸ : ۴۳۰ تا ۴۴۴، مطبوعہ دہلی، بار دوم؛ (۸) سید قطب: فی ظلال القرآن، ۲۶ : ۴۴ تا ۸۰، مطبوعہ بیروت؛ (۹) سید امیر علی: مواہب الرحمٰن، ۲۶ : ۹۴ تا ۹۸، مطبوعہ لاہور؛ (۱۰) ابو الاعلی مودودی: تفہیم القرآن، ۵ : ۷ تا ۳۳؛ (۱۱) مفتی محمد شفیع: معارف القرآن، جلد ہشتم [محمود الحسن عارف رکن ادارہ نے لکھا]۔

(ادارہ)

* **محمد بن ابراہیم**: رکّ بہ ابوالحسن۔

* **محمد بن ابراہیم عادل شاہ**: (۱۰۳۵ھ/۱۶۲۶ء تا ۱۰۷۰ھ/۱۶۶۰ء)، اپنے باپ کی وفات کے بعد بیجاپور کے تخت پر بیٹھا۔ ۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴ء میں شہنشاہ شاہ جہاں کی افواج نے دکن پر حملہ کیا اور بیجا پور کے علاقوں کو تاخت و تاراج کر ڈالا۔ دولت آباد اور دوسرے قلعوں کے سر ہو جانے کے بعد محمد بن ابراہیم عادل شاہ نے شہنشاہ دہلی کو بہت بھاری خراج دینا منظور کر لیا۔ یہ بیجا پور کا آخری بادشاہ تھا، جس نے اپنے نام کا سکہ چلایا۔ اس کے دور حکومت کے آخر میں اس کے ایک باجگذار رئیس سیوا جی نے، جو ساھو بھوسلا کا بیٹا تھا، چالبازی اور غداری کے بل پر بڑی طاقت حاصل کر لی اور بیجا پور کی سلطنت کی بنیاد کمزور ہو گئی۔ یہ بادشاہ ۱۰۷۰ھ/۱۶۶۰ء میں فوت ہوا اور اسے بیجا پور ہی میں دفن کیا گیا جہاں اس کے مقبرے کو ”گول گنبد“ کہتے ہیں۔

مآخذ: (۱) قزوینی استرآبادی: فتوحات عادل شاہی، ورق ۳۱۳ ب؛ (۲) *Imperial Gazetteer of India*، ۸ : ۱۸۹۔

(اہم ہدایت حسین)

* **محمد بن ابی بکرؓ** : حضرت ابو بکرؓ صدیق کے بیٹے، جو ان کی زوجہ اسماء [بنت عمیس] کے بطن سے تھے۔ حضرت اسما قبیلۂ خثعم سے تھیں۔ وہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے آخری سال میں پیدا ہوئے تھے اور اس طرح وہ اپنے والد ماجد صاحب سے بھی کچھ زیادہ مستفید نہ ہو سکے، مگر حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یاد ان کے خاندان میں برابر تازہ رہتی تھی، اس لیے وہ آپؐ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ہوں گے۔ ابن قتیبہ انہیں قریش کے بہترین نُسّاک (زاہد اور پرہیزگار اشخاص) میں شمار کرتا ہے۔ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں [ایک خاص ذہن کے لوگوں نے بنو امیہ اور حضرت عثمانؓ کے خلاف پروپیگنڈے کی مہم شروع کی تو کچھ لوگ نا سمجھی سے ان کے فریب میں آ گئے، انھی میں محمد بن ابی بکر بھی تھے : انہوں نے اس مہم میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔] انہوں نے محمد بن ابی حذیفہ کے ساتھ مل کر مصر کے لوگوں کو خلیفہ کے خلاف بھڑکانا شروع کیا۔ اس کے بعد وہ دوسرے شورش پسندوں کے ساتھ مدینے گئے۔ حضرت عائشہؓ نے، جو ان کی سوتیلی بہن تھیں، انہیں بہت سمجھایا کہ وہ ان کے ساتھ مکے چلے چلیں اور باغیوں کا ساتھ چھوڑ دیں، لیکن وہ نہ مانے اور ان لوگوں میں شامل ہو گئے جو حضرت عثمانؓ کے مکان میں زبردستی گھس گئے تھے۔ اسی موقع پر ان کے ایک ساتھی نے حضرت عثمانؓ پر مہلک وار کر کے انہیں شہید کر دیا۔ محمد بن ابی بکر قبیلۂ قریش کے ان افراد میں سے تھے، جنہوں نے حضرت علیؓ کا ساتھ دیا۔۔۔ جنگ جمل کے خاتمے پر حضرت علیؓ نے انہیں یہ کام سپرد کیا کہ وہ اپنی بہن [حضرت عائشہؓ] کو بصرے لے جائیں۔ مصر میں ان کی زندگی کے آخری حصے کے متعلق مآخذ میں ایک دوسرے سے قدرے مختلف بیانات ملتے ہیں۔ بقول الواقدی و البلاذری، ابو مخنف (الطبری، ۱ : ۳۳۹۲ ببعد) اور بقول الیعقوبی حضرت علیؓ نے قیس بن سعد کو واپس بلا کر محمد کو مصر کا والی مقرر کر دیا، لیکن حضرت علیؓ نے جلد ہی یہ محسوس کر لیا کہ ایک نوجوان کو جو جنگ آزمودہ بھی نہیں ہے، ایسے اہم عہدے پر مقرر کر دینا مصلحت کے خلاف ہے : چنانچہ انہوں نے اپنے قابل ترین پیرو الأشتر [رکّ باں] کو مصر کی افواج کا سپہ سالار مقرر کر کے بھیج دیا، لیکن یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی، کیونکہ الاشتر کو راستے ہی میں القلزم کے مقام پر زہر دے دیا گیا۔ الزہری (الطبری، ۱ : ۳۲۳۲) کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ نے قیس کو واپس بلا لینے کے بعد الاشتر کو مصر کا حاکم مقرر کر کے بھیجا تھا اور جب اسے زہر دے دیا گیا تو پھر اس کی جگہ محمد بن ابی بکر کو مقرر کیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک تیسری روایت (ابن الکلبی اور المسعودی) یہ ہے کہ الاشتر کو محمد بن ابی بکر کی وفات کے بعد بھیجا گیا تھا، لیکن یہ بیان پہلی روایت کے بارے میں غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال محمد بن ابی بکر کا انتخاب ہر لحاظ سے خلاف مصلحت تھا، کیونکہ وہ ناتجربہ کار نوجوان تھے جنہیں کوئی رسوخ و اقتدار حاصل نہ تھا۔ ان کے مقابلے میں حضرت امیر معاویہؓ اور عمروؓ بن العاص جیسے تجربہ کار لوگ تھے۔ بہرحال حضرت عمروؓ بن العاص ایک فوج لے کر آگے بڑھے اور المُسَنّات (بتد آب) کے مقام پر جنگ ہوئی، جس میں حضرت عثمانؓ کا اصلی قاتل کنانہ بن بشر مارا گیا۔ اس پر مصریوں نے ہمت ہار دی اور وہ سب محمد بن ابی بکر کو اکیلا چھوڑ کر چلے گئے، انہیں گرفتار کر لیا گیا

اور انجام کار شہید کر دیے گئے (۳۸ھ/۶۵۸ء).

مآخذ: (۱) البلاذری، طبع لخویه، ص ۲۲۸؛ (۲) الطبری، طبع لخویه، ۱: ۲۸۶۹ تا ۳۴۰۱ و مواضع کثیرہ، بمدد اشاریه؛ ۳: ۳۰۷۲؛ (۳) الدینوری، طبع Guirgas، ص ۱۶۰ ببعد؛ (۴) ابن قتیبه: کتاب المعارف، طبع Wüstenfeld، ص ۸۷، ۹۸؛ (۵) المسعودی: مروج، طبع Barbier de Meynard، ۴: ۲۷۷، ۲۷۹ تا ۲۸۱ و ۳۰۴ ببعد؛ (۶) الیعقوبی، طبع Houtsma، ۲: ۲۰۳ ببعد، ۲۲۶ ببعد؛ (۷) Wellhausen: *Das Arabischee Reich*، ص ۵۹ تا ۶۲.

(F. R. Buhl [تلخیص از ادارہ])

* **محمد بن ابی بکر**: رک بہ ابن قیم الجوزیہ؛ (۲) ابن سید الناس.

* **محمد بن ابی زینب**: رک بہ ابو الخطاب الاسدی.

* **محمد بن ابی السّاج**: ابو عبید اللہ بن ابو الساج دیوداد، ماوراء النہر کے علاقۂ اشروسنہ کا ایک مشرقی ایرانی (نہ کہ ترک) امیر (دیکھیے Barthold: *Turkistan*، سلسلۂ یادگار گب، ص ۱۶۹) [اس کی زندگی کے ابتدائی حالات کے لیے رک بہ ابو السّاج (آل)]۔ خمارویہ سے بگاڑ کے بعد وہ بغداد واپس آ گیا (۲۷۶ھ/۸۸۹ء) اور بظاہر وہ وہیں رہا (دیکھیے الطبری، ۳: ۲۱۲۲) یہاں تک کہ ۲۷۹ھ/۸۹۲ء میں آذربیجان کا حاکم مقرر ہوا. اگرچہ یہاں پہنچ کر اس نے ارمینیا کے بغراتی بادشاہ سمبٹ (سن جلوس ۸۹۰ء) سے دوستانہ روابط قائم کر لیے تھے، تاہم مراغہ پر قبضہ کر لینے کے بعد اس نے آرمینیا پر سب سے پہلا حملہ ۲۸۰ھ/۸۹۳ء میں کیا، جس میں اسے کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بغداد میں بھی اپنی بیٹی کی شادی المعتضد کے معتمد خاص سپہ سالار بدر المعتضدی سے کر کے اپنی حیثیت مضبوط کر لی تھی۔ اس کا خادم سپہ سالار وصیف بھی اس کے ساتھ آ ملا، جس نے عمر بن عبدالعزیز الدلفی کو (۲۸۱ھ/۸۹۴-۸۹۵ء میں) الجبال میں شکست دی تھی، اگرچہ وہ اس کے علاقے پر قبضہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ اس نے (۲۸۲-۲۸۳ھ/۸۹۵-۸۹۶ء) میں آرمینیا میں دوسری مہم بھیجی اور قارص، دوین اور بسفرخان (Waspurakan) پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ہی اس نے سمبٹ سے صلح کر لی، لیکن اس کا بیٹا دیوداد محمد کی وفات تک دوین کا حاکم رہا۔ ۲۸۴ھ/۸۹۷-۸۹۸ء میں محمد نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا، لیکن خلیفہ المعتضد کے مقابلے کی تاب نہ لا کر اس نے جلد ہی اطاعت قبول کر لی اور اسے معاف کر دیا گیا۔ اس سے اگلے سال اسے سرکاری طور پر آذربیجان کے علاوہ آرمینیا کا حاکم بھی تسلیم کر لیا گیا۔ اسی زمانے میں غالباً اس نے الافشین کا لقب اختیار کیا، جو اس کے سکوں پر بھی مضروب ہے، جس کا مقصد بظاہر اس کے اس دعوے کا اظہار تھا کہ وہ اشروسنہ کے قدیم شاہی خاندان کی نسل میں سے ہے (دیکھیے مادہ افشین؛ نیز Justi: *Iran Namenbuck*، بذیل مادہ Pisina)۔ ۲۸۷ھ/۹۰۰ء میں اس نے اپنی مملکت کی حدود کو ان علاقوں تک وسیع کرنے کی کوشش کی، جو طولونیوں کی گرفت سے نکلے جا رہے تھے۔ اس مقصد کے لیے اس نے ملطیہ پر قبضہ کر لینے میں وصیف کی حوصلہ افزائی کی اور خلیفہ سے درخواست کی کہ اسے کیلیکیا (Cilicia) کا حاکم تسلیم کر لیا جائے، لیکن المعتضد نے یہ معلوم کر کے کہ یہ کاروائی وصیف اور الافشین کی جانب سے دیار مضر پر قبضے کا پہلا قدم ہے، وصیف پر اچانک حملہ کر کے ان کے اس منصوبے کا خاتمہ کر دیا اور خود وصیف کو گرفتار کر لیا گیا۔ الافشین بھی چند ماہ کے بعد بردعہ

کے مقام پر فوت ہو گیا (ربیع الاول ۲۸۸ھ/ مارچ ۹۰۱ء).

مآخذ: ان تصانیف کے علاوہ جو متن مقالہ میں اور مادہ ابوالساج میں مذکور ہیں، دیکھیے: (۱) المسعودی: مروج الذهب، ۷: ۱۴۴ تا ۱۴۵، ۱۹۶ تا ۲۰۰؛ (۲) الکندی: ولاۃ مصر (طبع Guest)، ص ۲۲۸؛ (۳) ابن خلکان، مترجمہ de Slane، ۱: ۵۰۰؛ (۴) *Histoire de l'Armenie par le patriarche Jean VI*، ترجمہ از J. st Martin (پیرس ۱۸۴۱ء)، ص ۱۲۲، ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۵۳، ۱۵۹ تا ۱۶۵، ۱۶۹، ۱۷۳ تا ۱۷۸؛ (۵) M. F. Brosset: *Collection d'historiens armeniens*، (سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۴ء تا ۱۸۷۶ء)، ۱: ۱۸۷ تا ۱۸۹، ۱۹۳ تا ۱۹۶؛ ۲: ۲۴۸؛ (۶) R.R. Vasmer: *O mon'etakh sadjidov* (باکو ۱۹۲۷ء)، ۳ تا ۸؛ (۷) J. Markwart: *Sudarmenien und die Tigrisquellen*، وی آنا ۱۹۲۷ء، ص ۱۱۶ تا ۱۱۷.

(H. A. R. GIBB)

* **محمد بن ابی عامر:** رک بہ المنصور بن ابی عامر.

* **محمد بن ابی القاسم:** رک بہ ابن ابی دینار.

* **محمد بن ابی محمد:** رک بہ ابن ظفر.

* **محمد بن احمد:** رک بہ (۱) ابن علقمی؛ (۲) ابن ایاس؛ (۳) ابن رشد.

* **محمد بن ادریس الشافعی:** رک بہ الشافعی.

* **محمد بن اسحٰق:** رک بہ (۱) ابن اسحٰق؛ (۲) الندیم.

* **محمد بن اغلب:** رک بہ اغالبہ (اغلب (بنو)).

* **محمد بن الیاس:** رک بہ الیاسیہ.

* **محمد بن انوشتگین:** رک بہ خوارزم شاہ.

* **محمد بن بقیہ بن علی:** رک بہ ابن بقیہ.

* **محمد بن تغلق:** رک بہ محمد تغلق.

* **محمد بن تکش:** رک بہ خوارزم؛ خوارزم شاہ.

* **محمد بن تُومَرت:** رک بہ ابن تومرت.

* **محمد بن جریر الطبری:** رک بہ الطبری، ابو جعفر.

* **محمد بن الجزری:** رک بہ ابن الجزری.

* **محمد بن حبیب:** رک بہ ابن حبیب.

* **محمد بن الحسن:** رک بہ (۱) ابن درید؛ (۲) ابن حمدون؛ (۳) الشیبانی.

* **محمد بن حسین:** ایک عثمانلی امیر اور مؤرخ جس نے بغداد کے پہلے والی درویش محمد پاشا کی درخواست پر (ثریا: سجل عثمانی، ۲: ۳۳) علی بن شہاب ہمدانی کی تاریخ کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب فارسی زبان میں دس ابواب پر مشتمل تھی؛ اس نے دو باب اور بڑھا دیے اور اس کا نام تحفۃ المامون رکھا۔ یہ تصنیف صرف قلمی نسخے کی شکل میں محفوظ ہے.

مآخذ: (۱) بروسہ لی محمد طاہر: عثمانلی مؤلفلری، ۲: ۱۳۳؛ نیز دیکھیے حاجی خلیفہ: کشف الظنون، بولاق ۱۲۷۴ھ، ۱: ۴۰۴، جہاں ترکی مترجم مصطفی شعبان کو بتایا گیا ہے۔

(۲) محمد خلیفۂ کنہکار، جو دربار کا ایک امیر تھا اور تین سلطانوں کے عہد حکومت میں ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا (مراد رابع ۱۰۳۲ھ تا ۱۰۴۹ھ/ ۱۶۲۳ء تا ۱۶۴۰ء؛ ابراہیم ۱۰۴۹ھ تا ۱۰۵۸ھ/ ۱۶۴۰ء تا ۱۶۴۸ء؛ اور محمد رابع ۱۰۵۸ھ تا ۱۰۹۹ھ/ ۱۶۴۸ء تا ۱۶۸۷ء) وہی شخص [یعنی محمد بن حسین] نہ تھا۔ اس نے اپنے زمانے کے وقائع تاریخ غلمانی کے نام سے قلمبند کیے ہیں، جو ۱۰۶۰ تا ۱۰۷۵ھ/ ۱۶۵۰ تا ۱۶۶۵ء کے واقعات پر محتوی ہیں۔ یہ تصنیف جس کے تین

باب اور ایک خاتمہ ہے (جن میں سے دوسرے باب کی دو اور تیسرے باب کی ۳۱ فصلیں ہیں) احمد رفیق نے گیارھویں ضمیمہ کے طور پر *T.O.E.M.* کے جزو ۷۸ تا ۸۳ کے ساتھ استانبول سے ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۴ء میں شائع کی تھی۔

محمد خلیفہ بن حسین کے نام کا بھی شاید یہی شخص ہے، کیونکہ وہ بھی انھیں تینوں سلاطین کے دربار کا امیر تھا اور اس نے اپنے زمانے کی ایک تاریخ لکھی تھی، جس میں ۱۰۳۳ھ تا ۱۰۷۰/ ۱۶۳۲ء تا ۱۶۵۹ء تک کے واقعات درج ہیں۔ اس کا ایک معروف واحد قلمی نسخہ وی آنا میں ہے۔

مآخذ: (۱) احمد رفیق: تاریخ غلمانی کا سوانحی مقدمہ؛ (۲) Flugel: *Katalog*، ۲: ۲۷۱؛ (۳) Babinger: *G. O. W.*، ص ۲۰۹، عدد ۱۷۹ (متن میں غلطی سے ۱۷۰) اور ۱۸۰۔

(Th. Menzel)

* **محمد بن الحسین**: رک بہ (۱) ابوالحسن؛ (۲) ابو سعد؛ (۳) ابن مُقلۃ؛ (۴) الشریف الرُضی۔

* **محمد بن الحنفیہ**؄: خولہ سے حضرت علی؄ کے بیٹے تھے۔ خولہ بنو حنفیہ میں سے تھیں، جنھیں عقرباء [رک باں] کی جنگ کے بعد مدینہ منورہ میں لایا گیا اور انھیں حضرت علی؄ کے سپرد کیا گیا (دیکھیے سید الحمیری کی نظم، در کتاب الاغانی، ۷: ۴؛ وہ گھر کی ملازمہ تھی)۔ محمد بن حنفیہ ۱۶ھ میں پیدا ہوئے۔ وہ اگرچہ طبعاً بہت عزلت گزین واقع ہوئے تھے اور ہمیشہ پھونک پھونک کر قدم رکھا کرتے تھے، مگر پھر بھی حضرت امام حسن؄ اور حضرت امام حسین؄ کی طرح حالات سے مجبور ہو کر اس وقت کے سیاسی نزاعات میں الجھ گئے۔ جب حضرت امام حسن؄ اپنے حقوق سے دست بردار ہوگئے اور حضرت امام حسین؄ ۶۱ھ/ ۶۸۰ء میں میدان کربلا میں شہید ہوگئے تو بہت سے لوگ انھیں آل علی؄ کا سربراہ سمجھ کر ان سے عقیدت رکھنے لگے۔ اس سے عبداللہ بن زبیر؄ کو، جو حضرت امام حسین؄ کی شہادت کے بعد علی الاعلان خلافت کا دعوی کر رہے تھے، شکوک پیدا ہوگئے۔ یہ حقیقت ہے کہ محمد بن حنفیہ کو امویوں کی مخالف جماعت سے کوئی ہمدردی نہ تھی، لیکن یہ معاملہ زیادہ اس لیے نزاکت اختیار کر گیا کہ ایک طالع آزما [مختار بن عبید الثَّقفی؛ رک باں] نے ان کو اپنے ساتھ ملانے کی کئی کوششیں کیں، مگر ناکام رہا۔ تب اس نے ۶۶ھ/ ۶۸۵ء [میں محمد بن حنفیہ کو حضرت علی؄ کا جانشین، ان کا وصی اور مہدی وقت ظاہر کر کے دعوت شروع کر دی]۔ اس موقع پر بھی محمد بن حنفیہ؄ نے بڑی احتیاط اور تحمل سے کام لیا اور اس بات سے انکار کر دیا کہ انھیں المہدی کے اہم لقب سے پکارا جائے (دیکھیے الطبری، ۲: ۶۱۰ اور ابن سعد، ۵: ۶۸، جسے Lammens نے یقیناً غلط سمجھا ہے)۔ یہ بات ظاہر ہے کہ انھیں مختار کا کوئی پاس نہ تھا اور ان کے پاس اس امر کو باور کرنے کی کافی وجوہ تھیں کہ اس کی سرگرمی اور عقیدت حقیقی نہیں ہے، لیکن ان بے شمار خطرات کو مد نظر رکھتے ہوئے جن میں انھوں نے اپنے آپ کو محصور پایا اور غالباً کسی حتمی فیصلے پر نہ پہنچنے کے باعث وہ اس کی کھلم کھلا مخالفت بھی نہیں کرنا چاہتے تھے، اس لیے جب کوفہ سے کئی آدمی اس غرض سے آئے کہ ان سے مختار کی بابت رائے دریافت کریں تو انھوں نے گول مول جواب دیا، جس سے ان پر کسی قسم کی ذمے داری عائد نہ ہوتی تھی (دیکھیے کسی قدر مختلف بیانات ابن سعد: ۵: ۷۲؛ الیعقوبی، ۲: ۳۰۸؛ طبری، ۲: ۶۰۷) اور اس پر الکامل کا بیان بھی قابل توجہ ہے جس کے مطابق مختار ان کا آدمی نہ تھا۔ نتیجہ

یہ ہوا کہ یہ تحریک بہت پھیل گئی اور حضرت امام حسینؓ اور دوسرے علویوں کی شہادت کا انتقام لینے کے سلسلے میں بڑی خونریزی ہوئی [دوسری طرف ابن زبیرؓ نے بیعت لینے کے لیے ابن حنفیہؒ پر دباؤ ڈالا] اور ان کو عبداللہ بن عباسؓ اور دوسرے رشتے داروں سمیت مکہ میں چاہ زمزم کے قریب قید کر دیا، تو ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ وہ مختار کی امداد طلب کریں۔ یہ مختار کی منہ مانگی مراد تھی؛ چنانچہ اس نے فوراً کوچ سوار مکہ مکرمہ بھیج دیے اور عین وقت پر انھوں نے ابن حنفیہؒ اور دوسرے قیدیوں کو رہا کرا لیا، لیکن محمد بن حنفیہؒ کے صریح احکام کی تعمیل میں انھوں نے ابن زبیرؓ کی فوج سے کچھ تعرض نہ کیا، کیونکہ خونریزی سے حرم پاک کی سرزمین کی بے حرمتی ہوتی تھی۔ اس کے بعد محمد بن حنفیہؒ نے اپنے اہل و عیال کے ساتھ منٰی میں جا کر پناہ لی (دیکھیے الکامل، ص ۵۵۵، ۵۹۷؛ کتاب الاغانی، ۸: ۳۲؛ کمیت، طبع Horovitz، ۱: ۸۷) اور کچھ دیر بعد وہ طائف چلے گئے۔ بعد ازاں انھوں نے مختار کی خدمات سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا، لہذا جب ۶۷ھ/۶۸۶-۶۸۷ء) میں مختار کی تحریک ناکام ہو گئی اور اس کا علم بردار مارا گیا، تو وہ اس واقعہ سے بے تعلق رہے۔ ابن زبیرؓ کی دھمکیوں اور خلیفہ عبدالملک کے پیہم اصرار کے باوجود انھوں نے ان دونوں مدعیان خلافت میں سے کسی کی بیعت نہ کی اور اپنے اس اصول پر قائم رہے، کہ وہ صرف اسی حکمران کی اطاعت قبول کریں گے، جس کو ہماری امت مسلمہ متحد ہو کر قبول کر لے گی؛ چنانچہ وہ ۶۸۸ء کے حج کے موقع پر جہاں زبیری اموی اور خارجی بھی آئے ہوئے تھے وہ ایک آزاد فریق کے سردار کے طور پر مسلح ہو کر غیر جانبداری کا اظہار کرتے ہوئے پہنچ گئے۔ ابن زبیرؓ کی شہادت (۷۳ھ/۶۹۲ء) کے بعد کہیں جا کر ان کے مطالبے، یعنی اتفاق رائے عامہ، نے حقیقت کی شکل اختیار کی اور انھوں نے عبدالملک کو حقیقی حکمران تسلیم کر لیا اور وہ خلیفہ کی خدمت میں ۷۸ھ/۶۹۷-۶۹۸ء میں بمقام دمشق گئے۔ اس کے بعد وہ مدینۂ منورہ میں واپس آ گئے، جہاں ۸۱ھ/۷۰۰-۷۰۱ء میں فوت ہو گئے۔ میدان سیاست میں ان کی خاموش اور محتاط روش کو روایات میں خالصةً دینی احساسات کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ حضرت علیؓ کی اولاد کو ان کا حق خدائے قدیر ہی دلائے، انسانی طاقت نہیں دلا سکتی [لیکن بعض کے نزدیک، یہ ان کی امن پسندانہ افتاد طبع کا نتیجہ تھا]۔ بیعت کے بعد خلیفہ عبدالملک نے ابن حنفیہؒ کو قرضہ ادا کرنے کے لیے گراں قدر رقم دی اور ان کے بال بچوں، رشتہ داروں اور متوسلین کے سالانہ وظائف بھی مقرر کر دیے [جس کی وجہ سے، وہ اچھی خوشحالی کی زندگی بسر کرتے رہے]۔ یہ بات زیادہ حیرت‌انگیز ہے کہ ان سے محبت میں غلو کرنے والے گروہ نے ان کی وفات کے بعد، موزوں موقعہ سمجھ کر یہ کہانی مشہور کر دی کہ وہ مرے نہیں، بلکہ ایک قسم کے عالم ارواح میں مدینہ منورہ کے مغرب میں رضوٰی کی پہاڑی پر زندہ موجود ہیں جہاں سے وہ ایک فاتح لشکر کے قائد کی حیثیت سے واپس آئیں گے (الاغانی، ۷: ۳ ببعد و ببعد؛ ۸: ۳۲)۔ رجعت امام کا یہی عقیدہ تھا، جو عبداللہ بن سبا [رک بآں] نے حضرت علیؓ (دیکھیے Friedlander در Z.A، ۲۳: ۳۰۹ ببعد) سے منسوب کیا تھا۔ اس عقیدے کو اب محمد بن الحنفیہ کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ جنگ پسند آدمی نہ تھے اور خاموش زندگی گزارنے کے رویے پر ہی عمل پیرا رہے۔

مآخذ: (۱) الطبری، طبع لخویہ، ۲: ۱۲۲۹، ۲: ۱۲۸۳، بمواضع کثیرہ (بمدد اشاریہ)؛ ۳: ۲۲۳۶، ۲۲۴۹، ۲۵۳۰؛ (۲) ابن سعد، طبع زخاؤ، ۵: ۶۶ تا ۸۹؛ (۳) البلاذری: انساب الاشراف، در Z. D. M. G.، ۳۸: ۳۹۳؛ (۴) المسعودی: مروج، طبع Barbier de maynard، ۵: ۱۶۹ ببعد: ۲۶۷ ببعد؛ (۵) الیعقوبی، طبع Houtsma، ۲: ۲۶۷، ۳۰۸، ۳۱۱ تا ۳۱۳، ۳۲۲؛ (۶) المبرد: الکامل، طبع Wright، ص ۲۹۹، ۵۵۳، ۵۸۰ ببعد، ۵۹۶ ببعد؛ (۷) النووی: تہذیب الاسماء و اللغات، طبع وسٹنفلڈ، ص ۱۰۳ تا ۱۱۵؛ (۸) الدینوری: الاخبار الطوال، طبع Goirgas، ص ۱۵۹ ببعد، ۱۸۶ ببعد؛ ۲۲۲ ببعد، ۲۳۲، ۲۴۳، ۲۹۷ ببعد، ۳۰۳ تا ۳۱۵؛ (۹) T. W. Arnold: المعتزلہ، ص ۱۰ ببعد؛ (۱۰) V. Vloten: *Recherches Sur la Domination arabe etc*، ۱۸۹۴ء؛ (۱۱) H. Banning: محمد بن الحنفیہ، (Dissert)، ۱۹۰۹ء؛ (۱۲) Fr. Buhl: *Det Danske Videnskabernes Selskab*، Oversigter، ۱۹۱۰ء، ص ۳۵۵ ببعد؛ (۱۳) H. Lammens: *Etudes sur le regene du Calife Omaiyade Moawiya*، ص ۱۶۶، ۱۶۹ ببعد۔

(FR. BUHL)

* **محمد بن داؤد:** رک بہ (۱) ابن آجُرُّوم؛ (۲) الاصفہانی۔

* **محمد بن دُشْمَنْ زِیار:** رک بہ کاکویہ، (بنو)۔

* **محمد بن رائق:** رک بہ ابن رائق۔

* **محمد بن رزین:** رک بہ ابو الشیص۔

* **محمد بن سالم:** رک بہ ابن واصل۔

* **محمد بن سعد:** رک بہ (۱) ابن مرْدَنیش؛ (۲) ابن سعد۔

* **محمد بن سعود:** رک بہ غُوری (خاندان)۔

* **محمد بن سعود:** (صحیح سعود) بن محمد، قبیلۂ عنزہ کی شاخ مُقرن کا ایک فرد؛ [اس خانوادے کا بانی حکمران تھا جو ابھی تک السعودیہ میں حکمران ہے؛ رک بہ مادہ ابن سعود]، جو ۱۱۳۷ھ/۱۷۲۴ء یا ۱۱۴۰ھ/۱۷۲۷ء میں اپنے باپ کی جگہ درعیہ کا امیر بنا۔ مصلح عالم محمد بن عبدالوہاب سے اس کی راہ و رسم ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد سے لے کر اس کی وفات (اواخر ربیع الاول ۱۱۷۹ھ/ستمبر ۱۷۶۵ء-۱۷۶۶ء) تک اس کے دور حکومت کی تاریخ ہمسایہ بستیوں اور الحسا کے بنو خالد کے خلاف ایک لامتناہی اور بحیثیت مجموعی غیر فیصلہ کن کشمکش پر مشتمل ہے۔ اس نے خود ان جنگی کاروائیوں میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا اور اس کی اپنی شخصیت پر مصلح مذکور اور اس کے اپنے بیٹے عبدالعزیز کی شخصیتیں غالب نظر آتی ہیں، تاہم اس کے سیاسی تدبر کی وجہ سے ایک سے زیادہ مرتبہ اس کی ریاست اپنے دشمنوں کے وفاق کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچتی رہی، بالخصوص ۱۷۶۴ء میں نجران کی فوجوں سے حائر کے مقام پر تباہ کن شکست کھانے کے بعد [نیز رک بہ ابن سعود]۔

مآخذ: (۱) مکمل مآخذ صرف ایک ہی کتاب یعنی کتاب الغزوات (ج ۲، روضۃ الافکار)، مصنفہ حسین بن غنام (م ۱۲۲۵ھ) ہے، مخطوطہ در موزۂ بریطانیہ، عدد Add ۲۳۳۴۵، ورق ۲-و تا ۹۳-ب (بمبئی کی سنگی طباعت [۱۳۳۷ھ] بہت غلط ہے، جس کا خلاصہ H. St. J. Philby نے بعنوان *Arabia* کیا ہے (لنڈن ۱۹۳۰ء، ص ۱۲ تا ۲۲)؛ نیز دیکھیے (۲) A. Musil: *Northern Negd*، نیویارک ۱۹۲۸ء، ص ۲۵۸ تا ۲۵۹؛ (۳) امین الریحانی: تاریخ نجد الحدیث، بیروت ۱۹۲۸ء، ص ۵۰ تا ۵۳ اور عام تصانیف کے لیے مآخذ بذیل مادہ ابن سعود۔

(H. A. R. GIBB)

* **محمد بن سیرین:** رک بہ ابن سیرین۔

* **محمد بن طاہر**: حاکم خراسان، اسے اپنے باپ محمد کی وفات کے بعد خراسان کی حکومت ملی (رجب ۲۴۸ھ/ستمبر ۸۶۲ء) ۔ ۲۵۰ھ/۸۶۴-۸۶۵ء میں علوی الحسن بن زید نے بغاوت کر دی جس کی وجہ سے ایک طویل اور خطرناک قسم کی لڑائی شروع ہو گئی [رک بہ محمد بن عبداللہ] ۔ السجزی نے یعقوب بن اللیث الصفار کے خلاف بغاوت کی اور اس نے محمد بن طاہر سے امداد کی درخواست کی، جس نے اسے طبسین اور قہستان کا حاکم مقرر کر دیا تھا، تو یعقوب کو خراسان پر حملہ کرنے کا بہانہ مل گیا ۔ محمد بن طاہر نے اس کے پاس اپنا ایک سفیر بھیجا ۔ چونکہ یعقوب کو بہت سے ناخوش اور غیر مطمئن خراسانیوں کی حمایت حاصل ہو چکی تھی، اس لیے ساری گفت و شنید ناکام ہو گئی ۔ شوال ۲۵۹ھ/اگست ۸۷۳ء، یا ایک اور بیان کے مطابق ۲۵۸ھ میں، وہ بلا مزاحمت نیشاپور میں داخل ہو گیا اور اس نے طاہریہ خاندان کا خاتمہ کر کے محمد بن طاہر کو قید کر لیا، لیکن جب اس نے خلیفہ المعتمد کے خلاف بغاوت کی تو رجب ۲۶۲ھ/اپریل ۸۷۶ء میں اسے خلیفہ کے بھائی المُوَفّق نے شکست دی اور محمد بن طاہر، جسے وہ پا بہ زنجیر کر کے اپنے ساتھ لایا تھا، بھاگ نکلا۔ خلیفہ نے محمد بن طاہر کو خراسان میں اس کے عہدے پر بحال کر دیا، لیکن جلا وطن طاہری کو حکومت کے فرائض ادا کرنے کا موقع نہ ملا۔ بعد ازآں اسے غالباً ۲۷۰ھ/۸۸۳-۸۸۴ء میں وزیر سعید بن مخلد نے اپنے نائب کی حیثیت سے بغداد کا فوجی حاکم مقرر کر دیا اور وہ اس عہدے پر المعتضد کی تخت نشینی (۲۷۹ھ/۸۹۲ء) تک فائز رہا ۔ وہ ۲۹۶ھ/۹۰۸-۹۰۹ء میں فوت ہوا ۔

مآخذ: (۱) الیعقوبی، طبع Houtsma، ۲: ۳۰۲ ببعد، ۴۹۹؛ (۲) الطبری، ج ۳، بمدد اشاریہ؛ (۳) المسعودی: مروج، مطبوعہ پیرس، ۸: ۴۲، ۵۵؛ (۴) ابن الاثیر، طبع Tornberg، ۷: ۷۷ تا ۲۹۴؛ ۸: ۴۲؛ (۵) ابن خلدون: العبر، ۳: ۳۰۹ ببعد؛ (۶) Weil: *Gesch. d. Chalifen*، ۲: ۳۷۹ ببعد، ۳۹۴، ۴۲۸، ۴۴۲، ۴۴۷؛ (۷) Noldeke: *Orientalische Skizzen*، ص ۱۹۴ ببعد؛ (۸) Rothstein، در *Orient Studien. Th. Noldeke gewidmet*، ص ۱۳۴ ببعد؛ (۹) Barthold، *ebenda*، ص ۱۸۵ ببعد.

(K. V. ZETTERSTEEN)

* **محمد بن طاہر**: رک بہ ابن القیسرانی.

محمد بن طُغْج: بن جُف (یا جَف) بن یَلتکین بن فوران بن فوری بن خاقان، ابو بکر، جو خلیفہ الراضی کے ۳۲۷ھ/۹۳۹ء میں دیے ہوئے لقب الاخشید کے نام سے معروف ہے؛ وہ مصری خاندان اخشیدیہ [رک باں] کا بانی تھا۔

وہ ۲۶۸ھ/۸۸۲ء میں بغداد میں پیدا ہوا اور لڑکپن اس نے غالباً شام میں گزارا، کیونکہ اس کے باپ کو جو تقریباً انہیں دنوں طولونیوں کی ملازمت میں شامل ہوا تھا، ۲۷۶ھ کے لگ بھگ طبریہ اور دمشق کا حاکم بنایا گیا تھا، اور وہ اس منصب پر کم و بیش پندرہ سال تک مامور رہا۔ وہ خود بھی کچھ عرصے تک طبریہ میں اپنے باپ کے نائب کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ ۲۹۲ھ/۹۰۴ء میں طولونی خاندان کے خاتمے پر اسے بغداد میں قید کر دیا گیا۔ ۲۹۴ھ/۹۰۷ء میں اسے رہا کر دیا گیا اور اسے وزیر العباس بن الحسن کے عملے سے منسلک کر دیا گیا؛ چونکہ وہ اس وزیر کے قتل کے معاملے میں ملوث ہو گیا تھا، لہٰذا اسے ۲۹۶ھ/۹۰۸ء میں، المعتز [رک باں] کی سازش کے ناکام ہو جانے پر، فرار ہونا پڑا۔ وہ بھاگ کر شام چلا گیا اور وہاں کسمپرسی کی حالت میں رہا۔ اگلے سال وہ مصر چلا گیا، جہاں کے حاکم تکین کی اس پر نظر عنایت ہو گئی اور اس نے اسے مصر میں بھی اور شام میں بھی

اپنے ساتھ رکھا، جہاں یکے بعد دیگرے اسے حاکم کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے بھیجا جاتا رہا (۳۰۲ تا ۳۰۷ھ اور ۳۰۹ تا ۳۱۱ھ) ۔ تکین نے اسے کئی اہم عہدوں پر بھی ترقی دی.

اس زمانے میں محمد بن طغج نے بااقتدار مادرائی خاندان سے تعلقات پیدا کر لیے اور جب مونس [رک بآں] فاطمی حملوں کی وجہ سے مصر آیا تو وہ اس کی خدمت میں بھی رہا ۔ ۳۰۶ھ کے ایک کارنامے کی بدولت اس نے دربار بغداد کی توجہ بھی اپنی جانب مبذول کرا لی تھی ؛ چنانچہ ۳۱۶ھ/۹۲۸ء میں دارالخلافہ میں اپنے اثر و رسوخ کے ذریعے وہ رملہ کا حاکم مقرر ہو گیا اور تکین کی ملازمت کو اچانک چھوڑ کر چلا گیا ۔ ۳۱۹ھ میں اس نے اپنی تبدیلی دمشق میں کرا لی ، جہاں وہ بہت طاقتور ہو گیا اور ۳۲۱ھ میں بشریٰ کو شکست دینے کے بعد اس نے تمام ملک شام پر اپنا تسلط جما لیا ۔ اسی سال (مارچ ۹۳۳ء) میں تکین فوت ہو گیا اور محمد بن طغج اس کی جگہ حاکم مصر کا عہدہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ، لیکن یہ تقرر محض برائے نام تھا اور صرف ایک ماہ (ستمبر ۹۳۳ء) تک قائم رہ سکا ۔ دو سال بعد اس نے ایک زبردست فوج اور طاقتور بیڑے کی مدد سے فسطاط میں داخل ہو کر ملک پر قبضہ کر لیا ۔ وہ المادرائی (محمد بن علی) کی مزاحمت پر غالب آیا ، جو بغداد کے حکم نامے کی رو سے مصر کے معاملات کا سربراہ تھا اور حاکم مصر اس کی ہدایت کے مطابق (تحت تدبیرہ) کام کرتا تھا، تاہم المادرائی سے بالاتر الفضل بن جعفر الفرات [جس کے لیے رک بہ ابن الفرات] تھا، جو مصر اور شام کا وزیر نگران (وزیر کشف) تھا اور جسے خاص طور پر مکمل انتظامی اختیارات بھی تفویض کر دیے گئے تھے ۔ محمد بن طغج نے یہ کام الفضل کے ایما سے کیا تھا اور اس کے بعد (۳۲۳ھ) خلیفہ الراضی سے یہ کہہ کر منظوری بھی حاصل کر لی گئی کہ مصر کے صوبے کو بھی شام کے ساتھ شامل کر دیا جائے جس کا وہ پہلے ہی سے حاکم تھا ۔ غالباً اسی زمانے میں اسے یمن کے حقوق فرمانروائی اور مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے مقدس شہروں کی حکومت بھی مل گئی ، کیونکہ اس سے اگلے سال شہنشاہ رومانوس Romanus کے نام ایک خط میں وہ ان مقامات کا ذکر، اپنی مملکت میں شامل ہونے کی حیثیت سے، فخریہ انداز میں کرتا ہے ۔ بظاہر جمادی الآخرۃ ۳۲۷ھ/مارچ ۹۳۹ء میں الفضل کی موت تک وہ کم از کم نظری اعتبار سے ایک حد تک اس کے زیر نگرانی کام کرتا رہا .

۳۲۳ھ میں محمد بن طغج نے اسکندریہ کے قریب ایک فیصلہ کن فتح حاصل کی (جنگ ابلوق ، ۳۱ مارچ ۹۳۶ء) جس نے فاطمیوں کے تیسرے حملۂ مصر کو بالکل کچل کر رکھ دیا اور فاطمی خلیفہ القائم کو صلح کی سلسلہ جنبانی کرنے پر مجبور کر دیا، جس کا بالآخر کوئی نتیجہ نہ نکلا ۔ البتہ تین سال بعد محمد بن طغج نے یہ فیصلہ ضرور کر لیا تھا کہ وہ فاطمیوں کی سیادت تسلیم کر لے اور اس نے یہ حکم دیا کہ مصر میں القائم کی خلافت کا اعلان کر دیا جائے ، کیونکہ وہ بغداد کی عباسی حکومت سے ناراض ہو گیا تھا ، لیکن اسے اس فیصلے پر نظر ثانی کرنے کے لیے راضی کر لیا گیا .

خلیفہ الراضی کی جانب سے اسے الاخشید کا خطاب ملے ہوئے ابھی ایک مہینہ ہی گذرا تھا (رمضان ۳۲۷ھ/ جون - جولائی ۹۳۹ء) کہ اسے رقہ کی جانب سے ابن رائق [رک بآں] کے حملے کا خطرہ محسوس ہوا اور اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے صوبے اس کے حریف کے حوالے کر دیے گئے ہیں ۔ بحکم [رک بآں] امیر الامرائے بغداد

نے اس کی درخواست کا صرف یہ جواب دیا کہ اس بات کا فیصلہ بزور شمشیر ہونا چاہیے ؛ بے بس خلیفہ اس معاملے میں کچھ بھی نہ کہہ سکا ۔ ابن رائق نے بڑی سرعت سے شام پر قبضہ کر لیا اور اس نے ان فوجوں کو مار بھگایا، جو اس کے مقابلے کے لیے بھیجی گئی تھیں ۔ اس کے علاوہ اس نے رملہ پر بھی بہت جلد قبضہ کر لیا (اکتوبر ۹۳۹ء) ۔ محمد بن طغج خود ایک فوج کے ساتھ فرما کے مقام پر اس کے مقابلے میں آیا ۔ معمولی سی مڈبھیڑ کے بعد اس نے صلح کی گفت و شنید شروع کر دی ۔ فیصلہ یہ ہوا کہ وہ شام کا طبریہ سے شمال کی جانب کا علاقہ ابن رائق کے حوالے کر دے ، بشرطیکہ رملہ اور اس کے دیگر مقبوضات اسے واپس کر دیے جائیں ۔ ابن رائق نے بہت جلد اس عہد نامے کو توڑ دیا اور پھر پیش قدمی شروع کر دی۔ اس دفعہ محمد بن طغج نے اس کا مقابلہ العریش کے مقام پر کیا اور اسے دندان شکن شکست دی (۵ رمضان ۳۲۸ھ/۲۴ جون ۹۴۰ء) ، لیکن جب اس نے شام میں بھی اس کا تعاقب جاری رکھا تو اسے خود بھی ایک ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا ، کیونکہ اس کے ایک دستہ فوج پر اچانک حملہ ہوا اور لجّون کے مقام پر اس نے زبردست شکست کھائی (۸ اگست) ۔ اس کے بعد پہلی شرائط پر ہی صلح کی تجدید ہو گئی اور محمد بن طغج نے ایک لاکھ چالیس ہزار دینار سالانہ خراج ادا کرنا بھی قبول کر لیا ۔ وہ اکتوبر میں مصر لوٹ آیا ۔

۳۲۹ھ/اپریل ۹۴۱ء میں بجکم کی وفات پر ابن رائق بغداد واپس آ گیا اور محمد بن طغج کو جلد ہی اس سے پورے طور پر نجات مل گئی ، کیونکہ ایک سال بعد اسے حمدانیوں نے قتل کر دیا ۔ محمد بن طغج نے ملک شام پر دوبارہ قبضہ کرنے میں تاخیر نہ کی ، جہاں وہ خود گیا (جون ۹۴۲ء) ۔ اس ملک میں کوئی چھ مہینے قیام کرنے کے بعد مصر واپس آیا ۔ غالباً اسی زمانے میں اس نے رقہ کی جانب سے شام پر چند حملوں کو پسپا کر دیا ہوگا ، یعنی عدل (البجکمی) اور بدر الخرشنی کی جانب سے ، جن کا ذکر بلا کسی تفصیل کے آیا ہے ، البتہ اسے حمدانیوں کی طرف سے زیادہ زبردست حملوں کا مقابلہ کرنا پڑا ۔ ۳۳۲ھ/مارچ ۹۴۴ء میں ان میں سے ایک الحسین بن سعید نامی نے اس سے حلب کا علاقہ چھین لیا اور ماہ مئی میں وہ اسے واپس لینے کے لیے روانہ ہوا ۔ اس کے علاوہ خلیفہ المتّقی نے اپنے آپ کو حمدانیوں کی حفاظت میں امیرالامرا توزون سے غیر محفوظ پا کر اس سے امداد کی درخواست بھی کی تھی ۔ اس کے قریب آنے پر اس کا دشمن مقابلے سے ہٹ گیا اور شہر حلب پر دوبارہ قبضہ کرنے کے بعد وہ رقہ کی طرف روانہ ہوا، جہاں وہ خلیفہ سے ملا (۷ ستمبر ۹۴۴ء) ۔ اس وقت اس کا خیال تھا کہ اسے امیر الامرا بنا دیا جائے گا ۔ اس نے المتقی سے بمنت یہ درخواست کی کہ وہ اس کے ساتھ شام اور مصر چلے ، بلکہ اس نے خود خلیفہ کے ساتھ بغداد جانے کی پیشکش بھی کی ۔ اس نے خلیفہ سے التجا کی کہ وہ اپنی حفاظت کے لیے توزون پر اعتماد نہ کرے ، لیکن وہ اسے اس سے باز نہ رکھ سکا ۔ چند مسرت انگیز القاب حاصل کرنے کے بعد وہ رخصت ہو گیا ۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے واپسی کے سفر میں فسطاط پہنچے ، سیف الدولہ حمدانی [رک باں] حلب پر دوبارہ قابض ہو چکا تھا (اکتوبر ۹۴۴ء) ۔ اس نئی دست برد کے خلاف جو مصری فوج مقابلے کے لیے بھیجی گئی ، اسے حمص کے قریب رستن کے مقام پر شکست ہوئی اور سیف الدولہ دمشق کی جانب پیش قدمی کر کے شہر میں داخل ہو گیا (اپریل ۔ مئی ۹۴۵ء) ۔ محمد بن طغج پھر اپنے لشکر کے

ساتھ مصر سے آیا اور اس نے سیف الدولہ کو پسپا ہونے پر مجبور کیا۔ پھر اس نے سیف الدولہ کا تعاقب کر کے اسے قنسرین کے مقام پر معرکہ آرائی کرنے پر مجبور کر دیا (مئی - جون ۹۴۴ء) اور اسے شکست دی۔ فتح پانے کے بعد محمد نے پھر آسان شرائط صلح پیش کیں: سیف الدولہ کے پاس شام میں دمشق کے شمال کا علاقہ رہا اور اسے امدادی وظیفہ بھی دیا گیا۔ یہ عہد نامہ ربیع الاول ۳۳۳ھ/اکتوبر - نومبر ۹۴۴ء میں ہوا اور اس کے بعد محمد دمشق چلا گیا اور وہیں مقیم رہا، یہاں تک کہ چند مہینوں کے بعد اس کا انتقال ہو گیا (۲۱ ذوالحجہ ۳۳۴ھ/۲۴ اگست ۹۴۶ء)۔ اس کی وفات بوزنطی سفیر کی آمد کے چند روز بعد واقع ہوئی، جو قیدیوں کے تبادلے کے سلسلے میں آیا تھا اور جس کے متعلق اس نے گفت و شنید شروع کر رکھی تھی۔

اس کے عہد حکومت میں مصر کے اندرونی واقعات کے متعلق تقریباً کچھ معلوم نہیں: اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانے میں ملک میں امن و امان کا دور دورہ تھا۔ کہتے ہیں کہ اس ملک کی سالانہ آمدن بیس لاکھ دینار تک پہنچ گئی تھی اور اس کا حساب کتاب اب بغداد میں نہیں بھیجا جاتا تھا اور مرکزی خزانے کو کوئی باقاعدہ ادائیگی نہیں ہوتی تھی، لیکن وہ کبھی کبھار خلیفہ کو گرانبہا تحائف بھیج دیا کرتا تھا اور اس لیے خلیفہ الرّاضی اسے ایک مثالی باجگزار سمجھتا تھا۔

اپنی موت کے وقت اس نے ستر لاکھ دینار علاوہ دیگر خاصی بڑی جائداد، ترکے میں چھوڑے۔ اس کے زمانے میں کسی خاص اہمیت کے تعمیری کام نہیں ہوئے۔ فُسطاط میں اس نے ساحلی سرزمین پر جہازوں کا کارخانہ دوبارہ بنوایا اور جزیرۃ روضہ میں اس کی جائے وقوع پر ایک باغ المختار کے نام سے لگوایا۔ جس دارالامارہ میں وہ سکونت پذیر تھا اس نے اس کی توسیع کرائی۔ یہ طولونی زمانے کی ایک عمارت تھی، جو القاضی بکار کے مقبرے کے پاس تھی (یہ مقبرہ اب بھی موجود ہے) اور اس کے ساتھ ایک میدان کا اضافہ کیا۔ اس نے ایک اور باغ بھی لگوایا، جو بعد میں الکافوری کے نام سے مشہور ہوا اور اس کے بعد اسی جگہ پر قاہرہ میں مغربی فاطمی خلفا کا محل تعمیر ہوا۔ بعض اوقات اس کی افواج کی تعداد بہت زیادہ ہو جایا کرتی تھی۔ اَیلوق کی جنگ کی بابت بیان کیا جاتا ہے کہ مصریوں کے سواروں کی تعداد پندرہ ہزار کے قریب تھی اور قنسرین کی جنگ میں پچاس ہزار فوج نے حصہ لیا۔ اتنی بڑی تعداد غالباً خاص ضرورت کے وقت امدادی افواج کے اجتماع کی وجہ سے ہو جاتی ہوگی، جن کی بابت کہتے ہیں کہ اس نے ایک سے زیادہ مرتبہ بھرتی کی۔ ایک موقع پر اس کے ذاتی غلاموں کی تعداد جن پر وہ زیادہ تر بھروسا کیا کرتا تھا، پانچ سو تک ہو گئی۔ اکثر جو یہ کہا جاتا رہا ہے اور اسے عام طور پر صحیح بھی مانا جاتا ہے، کہ اس کی فوج کی تعداد چار لاکھ اور اس کے ذاتی محافظ سپاہی آٹھ ہزار تھے، اسے ایک مضحکہ خیز بات سمجھ کر نظر انداز کر دینا چاہیے۔ اگرچہ مصنفین یہ بات التنوخی (م ۳۸۴ھ) کی قدیم سند سے لکھتے ہیں اور اس کے ساتھ اس کہانی کو بھی کہ اس کی عادت تھی کہ جب کبھی وہ کسی مہم پر جاتا تو وہ اپنی خواب گاہ کا مقام بدلتا رہتا تھا۔

اس کے مشہور ترین پیروؤں میں سے کافور [رک باں] تھا۔ اس کے غلاموں میں سے ایک اور شخص فاتک نے بھی کافی شہرت پائی۔ علی بن محمد بن کلا دمشق اور مصر دونوں جگہ اس کا کاتب رہا۔

محمد بن علی المادرائی چند ماہ (٣٢٨ھ تا ٣٢٩ھ) اس کا وزیر رہا۔ محمد بن علی بن مُقاتل، جو پہلے ابن رائق کا کاتب تھا، اس کی موت کے وقت اس کا وزیر تھا۔ اس کے چاروں بھائی اس سے عمر میں چھوٹے تھے: الحسن جنگ ابلوق میں سپہ سالار تھا اور اس کی غیر حاضری کے زمانے میں اس کے نائب کے طور پر مصر میں کام کیا کرتا تھا۔ الحسین لَجّون کی لڑائی میں سر عسکر تھا اور وہیں مارا بھی گیا۔ عبیداللہ شام میں اس کا نائب تھا اور علی کی ابتدائی زمانے ہی سے کوئی خبر نہیں ہے۔

نامی گرامی مصری مصنفین میں سے، جو اس کے عہد حکومت میں نیک نام ہوئے، یہ تھے: ابن الدایہ (م ٣٣٣ھ)، مؤرخ الکندی (م ٣٥٠ھ) اور عبداللہ الفرغانی (م ٣٦٢ھ)۔ مؤخر الذکر ٣٢٩ھ میں مصر میں آیا اور ٣٣٣ھ میں رقّہ میں اس کے معتمدین میں سے تھا۔ اس کے علاوہ المسعودی بھی ٣٣٠ھ میں مصر گیا تھا، شاعر المتنبّی نے، جو اس زمانے میں شہرت حاصل کر رہا تھا، ایک دفعہ شام میں اس کے دربار میں آ کر اپنا کلام سنایا اور ایک یا دو شعر بھی اس کی اور اس کے بھائی عبیداللہ (م ٣٣٢ھ بمقام رَملہ) کی شان میں کہے۔

محمد بن طغج جسمانی اعتبار سے مضبوط آدمی تھا، لیکن بعض اوقات اسے مالیخولیا کا دورہ پڑ جایا کرتا تھا۔ اس کی خصائل اور اس کے کردار کا حال چند واقعات سے معلوم ہوتا ہے، جو ہر طرح معتبر ہی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ایک سخت گیر حکمران ضرور تھا، لیکن کینہ توز اور بے رحم نہ تھا۔ وہ اکثر اوقات اپنے عُمّال سے باز پرس کیا کرتا تھا اور انھیں قید اور جرمانے کی سزا دینے کے بعد پھر ان پر مہربان ہو جایا کرتا تھا اور انھیں ان کے منصب پر بحال کر دیا کرتا تھا۔ اس کے عہد حکومت میں شاید ہی کسی کو سزائے موت دی گئی ہو۔ وہ ملازموں سے بد سلوکی اور ایذا دہی کی ہرگز اجازت نہ دیتا تھا، حالانکہ اس کے زمانے میں اس کا عام دستور تھا۔ اس کی مصلحت اندیشی اور دانائی نمایاں تھی۔ اس کی زندگی معقول اور دل پسند تھی اور اس کے عمال اور رعایا دونوں اسے عزیز رکھتے تھے۔ اس کے برعکس روپے پیسے کی تحصیل سے متعلق بعض معاملات میں وہ یقیناً تشدد اور بے انصافی سے بھی کام لے لیتا تھا اور اگرچہ وہ بعض اوقات سخاوت اور عالی حوصلگی کا مظاہرہ بھی کرتا تھا، تاہم معمولی معاملات میں وہ بخل اور کمینگی کی طرف مائل رہتا تھا۔ دو بڑے نقص جو اس سے اس کی زندگی میں اور اس کے رو برو بھی منسوب کیے جاتے تھے یہ تھے کہ وہ کنجوس اور بزدل تھا۔ یہ دونوں نقص بالکل بے بنیاد نہیں ہیں۔ بزدل ہونے کی نسبت ایک خاص موقع کے متعلق جو صفائی اس نے خود دی ہے وہ درست معلوم ہوتی ہے۔

اس کی عملی زندگی احمد بن طولون [رکّ باں] کی زندگی سے بہت ملتی جلتی ہے، یہاں تک کہ اتفاقی اور ہنگامی واقعات میں بھی اس کے مماثل اور مشابہ ہے۔ اس کی قابلیت اور اہلیت کے متعلق کسی قسم کا شک و شبہہ نہیں ہو سکتا اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ کبھی کبھار وہ ضرورت سے زیادہ محتاط ہو جایا کرتا تھا، تو اس سے یہ ہرگز ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ ڈرپوک تھا؛ اگرچہ اس نے اپنے پیش رو کی طرح بڑا نام حاصل نہیں کیا، لیکن وہ اس سے زیادہ نرم مزاج اور شاید اس سے بہتر حکمران ضرور تھا۔

مآخذ: (۱) ابن سعید: المُغرب (طبع Tallqvist، لائیڈن ١٨٩٩ء) اس میں بنیادی ماخذ کا متن موجود ہے۔ ایک فہرست بھی ہے، جس میں ثانوی ماخذ مذکور

ہیں اور جرمن زبان میں مفصل سوانح حیات ہے جسے دونوں ماخذوں سے نقل کر کے مرتب کیا گیا ہے۔ سب سے زیادہ اہم محمد بن طغج کے وہ طویل اور مفصل سوانح حیات ہیں جو ابن سعید کی تصنیف کا حصہ ہیں اور جو معلوم ہوتاہے ان سوانح سے ماخوذ ہیں، جو ابن زولاق نے ۳۵۰ھ اور ۳۵۵ھ کے درمیان مرتب کیے تھے اور جنہیں بالکل لفظ بلفظ تو نہیں، لیکن تقریباً نقل کر دیا گیا ہے؛ (۲) دوسرا بڑا ماخذ الکندی کی کتاب الولاۃ ہے، طبع Guest ۔ جو کتابیں المغرب کے بعد شائع ہوئیں ان سے بہت کم ایسا مواد ملتا ہے جو قابل اضافہ سمجھا جائے۔ [مزید ماخذ کے لیے دیکھیے الزرکلی: الاعلام، بذیل مادہ].

(R. GUEST)

* **محمد بن عباس**: رک بہ قاهار.

* **محمد بن عبداللہ**: رک بہ (۱) ابن الابار؛ (۲) ابن الخطیب؛ (۳) ابن مالک.

* **محمد بن عبداللہ**: طاہریہ [رک بآں] خاندان کا حاکم بغداد، جو ۲۰۹ھ/۸۲۴-۸۲۵ء میں پیدا ہوا۔ ۲۳۷ھ/۸۵۱ء میں خلیفہ نے اسے بغداد میں طلب کرکے فوجی حاکم مقرر کر دیا تاکہ اس وقت جو بد نظمی پھیل رہی تھی اس کا انسداد کر کے امن قائم کرے۔ طاہریوں کی زبردست طاقت کے باوجود جو خراسان میں عملی طور پر خود مختارانہ حکومت کر رہے تھے، گو نام نہاد طریق سے وہ خلیفہ کی سیادت کو بھی تسلیم کرتے تھے، جو کام اس کے سپرد کیا گیا وہ چنداں سہل نہ تھا۔ جب المستعین تخت نشین ہوا (۲۴۸ھ/۸۶۲ء) تو اس نے محمد بن عبداللہ کو اس عہدے پر مستقل کر دیا اور اس کے ساتھ ہی اسے ولایت عراق کی حکومت بھی عطا کر دی اور مکے اور مدینے کے مقدس شہروں کا انتظام بھی اسی کے سپرد ہوا۔ اس سے اگلے سال بغداد اور سامرا میں شورش برپا ہو گئی۔ عربوں کو بوزنطیوں نے شکست دی اور عاہا کے غیظ و غضب کا نزلہ خلیفہ پر گرا، تاہم وزیر اُطمش آخر کار امن قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کام میں دو ترک سپہ سالاروں واصف اور بغا الصغیر نے اس کی مدد کی۔ علوی بھی کئی مرتبہ حکومت کی دردسری کا باعث بنے۔ حضرت علیؓ کی اولاد میں سے ایک شخص یحیٰی بن عمر نے کوفے میں بغاوت کر دی اور اس نے شہر کے حاکم کو نکال دیا، لیکن جب محمد بن عبداللہ نے ایک فوج اس کے مقابلے میں بھیجی اور اس نے اسے بھی تتر بتر کر دیا تو عباسی سپہ سالار الحسین بن اسماعیل نے اس پر حملہ کیا اور ایک دوسری فوج اس پر پیچھے سے حملہ آور ہوئی اور اس طرح وہ میدان جنگ میں مارا گیا (رجب ۲۵۰ھ / اگست ۸۶۴ء)۔ ایک اور علوی الحسن بن زید کو کچھ زیادہ کامیابی نصیب ہوئی۔ طبرستان میں دو سرکردہ آدمیوں نے جو طاہریوں کی حکومت سے ناخوش تھے، ۲۵۰ھ میں الحسن بن زید سے امداد کی درخواست کی اور بہت جلد اسے تمام طبرستان کا بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ رَےّ اور قزوین کے طاہری حاکموں کو بھگا دیا گیا اور ان کی جگہ علوی حاکم مقرر ہوئے۔ محمد بن طاہر حاکم خراسان نے، جو حاکم بغداد کا بھتیجا تھا، الرَّےّ کے خلاف ایک لشکر بھیجا۔ علوی حاکم کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار ہوگیا۔ اس پر شہر کو اطاعت قبول کرنا پڑی، لیکن وہ پھر علویوں کے قبضے میں آ گیا۔ جب طبرستان کے سابق حاکم سلیمان بن عبداللہ نے اس صوبے پر حملہ کر کے اسے پورے طور پر فتح کر لیا تو الحسن بن زید کو دیلم کی طرف بھاگ جانا پڑا، جہاں محمد بن طاہر نے اسے شکست دی (۲۵۱ھ/۸۶۵-۸۶۶ء)۔ چند سالوں (۲۵۷ھ/۸۷۰-۸۷۱ء) کے بعد الحسن نے

محمد بن طاہر کو جرجان میں شکست دی اور ۲۵۹ھ/۸۷۲-۸۷۳ء میں خراسان کا بادشاہ بن گیا جہاں اس نے علوی خاندان کی حکومت قائم کر لی، جو تقریباً ساٹھ سال تک رہی۔ عرب بھی علویوں کی سازشوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ حضرت علیؓ کی اولاد میں سے ایک شخص اسمٰعیل بن یوسف نے ۲۵۱ھ/۸۶۵ء میں شورش برپا کی۔ اس نے مکے اور مدینے کو تاراج کیا اور اکثر حاجیوں کو قتل کیا کہ لوگ اسے السفاک کہنے لگے۔ دارالخلافۃ میں بھی ہمیشہ فساد ہی رہتا تھا۔ اسی سال محرم کے مہینے (فروری ۸۶۵ء) میں المستعین سامرا سے روانہ ہو کر بغداد گیا۔ اس وقت المعتز [رک بآں] کو جبراً سامرا کے قید خانے سے رہا کرا کے خلیفہ بنا دیا گیا۔ اس نے اپنے بھائی ابو احمد کو جو بعد میں خلیفہ المعتمد کے ساتھ نائب السلطنت بھی مقرر ہوا، المستعین اور اس کے حاکم کے خلاف لڑنے کے لیے سپہ سالار بنا کر بھیجا۔ جب مصالحت کی گفت و شنید ناکام ہو گئی تو المستعین کو ہتیار اٹھانا پڑے، لیکن اسے کئی مرتبہ شکست ہوئی۔ سال بھر تک یہ صورت رہی کہ بغداد کے نواح میں لڑائی کا میدان گرم رہا۔ کبھی ایک فریق کو کامیابی ہوتی اور کبھی دوسرے کو اور صوبوں میں فوضویت بڑھ گئی۔ آخر کار جب محمد بن عبداللہ نے ابو احمد سے سلسلۂ گفت و شنید شروع کیا تو اس پر غدّاری کا الزام لگا دیا گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ خلیفہ کو خود فوج کے حملوں سے بچانا پڑا، جو اس کے خلاف مشتعل ہو چکی تھی، لیکن جب محمد کے دوستوں نے اسے بتایا کہ المستعین اپنے آپ کو قربان کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو اس نے ابو احمد سے صلح کر لی۔ خلیفہ کو بادلِ ناخواستہ عہد نامے کی توثیق کرنا پڑی اور وہ اپنے حریف المعتزّ کے حق میں تخت سے دست بردار ہو گیا (ذوالحجہ ۲۵۱ھ/جنوری ۸۶۶ء) اور المعتز تخت نشین ہوا۔ محمد بن عبداللہ نے ذوالقعدہ ۲۵۳ھ/ نومبر ۸۶۷ء میں انتقال کیا۔

مآخذ: (۱) الیعقوبی، طبع Houtsma، ۲: ۵۹۲، ۶۰۲، ۶۰۸، ۶۱۰ ببعد، ۶۱۳؛ (۲) الطبری، ج ۳، بمدد اشاریہ؛ (۳) المسعودی: مروج (پیرس)، ۷: ۲۵۵ ببعد؛ (۴) ابن الاثیر (طبع Tornberg)، ۷: ۳۳، ۷۲ تا ۱۲۵؛ (۵) ابن خلدون: العبر، ۳: ۲۸۳ ببعد؛ (۶) Weil: *Gesch. der Chalifen*، ۲: ۳۷۹ تا ۳۹۰، ۴۰۲؛ (۷) Muir: *The Caliphate, its Rise, Decline and Fall*، بار سوم، ص ۵۳۵ ببعد؛ (۸) Le Strange: *Baghdad during the Abbasid Caliphate*، ص ۱۱۹، ۳۱۱ تا ۳۱۲؛ (۹) Rothstein، در *Orient. Studien, th. Noldeke gewidmet*، ص ۱۶۵ ببعد۔

(K. V. ZETTERSTEEN)

محمد بن عبداللہ: [النفس الزّکیہ]؛ * حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے بڑے بیٹے حضرت امام حسنؓ کے پوتے، جو علوی خاندان کے ان افراد میں سے تھے، جنھوں نے اپنی دعوت [برائے خلافت] میں خاموشی اور صبر سے انتظار نہیں کیا، بلکہ اس کے حصول کے لیے ذاتی طور پر عملی کوشش بھی کی۔ الواقدی کے قول کے مطابق انھیں اور ان کے بھائی ابراہیم کو ہونے والے حکمرانوں کی سی تعلیم و تربیت دی گئی تھی اور محمد بن عبداللہ کو ان کے والد "المہدی" کے لقب سے پکارا کرتے تھے۔ اموی خلیفہ ہشام کے دور حکومت ہی میں المغیرہ [رک بآں] اور بیان [رک بآں] دو فرقہ پرستوں نے جو محمد بن علی الباقرؒ [رک بآں] کو امام تسلیم نہ کرتے تھے، محمد بن عبداللہ کے حق میں دعوت دینے کی کوشش کی تھی۔

جب ولید کی وفات پر بنو امیہ کے فوری زوال کی علامات نظر آنے لگیں ، تو عبداللہ کے خاندان نے ان کے حکم سے محمدؐ کے ہاتھ پر بیعت کر لی ، لیکن [حضرت] امام باقرؒ کے بیٹے [امام] جعفر [الصادقؒ] نے ایسا نہ کیا ۔ اس سے زیادہ وسیع حلقوں میں بھی انہیں جائز وارث تسلیم کر لیا گیا، جن میں فرقہ معتزلہ بھی شامل تھا جس نے اس زمانے میں نمایاں طور پر زاہدانہ زندگی اختیار کر رکھی تھی ۔ اس زمانے میں ابو جعفر ، جو بعد میں عباسی خلیفہ ہوا ، معتزلی مذہب سے تعلق رکھتا تھا اور یہ واقعہ کئی جگہ منقول ہے کہ وہ بھی ان لوگوں میں شامل تھا، جنہوں نے محمد کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی ۔ یہ بات بجائے خود کسی طرح غیر اغلب نہیں ہو سکتی ، بلکہ اس سے ان کی جانب اس کے مخالفانہ رویے کی بخوبی توجیہ ہوتی ہے ، گو یہ امر قابل ذکر ہے کہ بعد میں کبھی ، حتی کہ اپنے مناظرانہ مکتوبات میں بھی محمد نے اس واقعے کی جانب کوئی اشارہ نہیں کیا ۔ بنو امیہ کے حاکم ابن ہبیرہ نے بھی ، جب وہ ۱۳۲ھ/ ۷۵۰ء میں واسط میں محصور ہو گیا تھا ، ان سے مل جانے کا ارادہ کیا تھا ، لیکن جب اس کے خط کا کوئی جواب نہ ملا تو اس نے یہ بات آئی گئی کر دی ۔

آخر کار جب عباسی ابو العباس اسی سال خلیفہ بننے میں کامیاب ہو گیا اور علویوں کو میدان مقابلہ سے نکال دیا ، تو یہ دونوں بھائی غائب ہو گئے اور اس حرکت سے انہوں نے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ اس کی خلافت تسلیم نہ کریں گے ۔ اب ان کی زندگی کا ایک دور ایسا شروع ہوا، جو خطرات اور آزمائشوں سے پر تھا، خاص طور پر جبکہ ۱۳۶ھ/ ۷۵۴ء میں ابو جعفر خلیفہ ہوا ۔ وہ ایک مقام سے دوسرے مقام پر اپنے حامیوں کی تلاش میں خفیہ طور پر جاتے رہتے تھے ؛ وہ اپنے آپ کو خلیفہ کی دستبرد سے کسی جگہ بھی محفوظ نہ پاتے تھے ، لیکن لوگ بحیثیت مجموعی ان سے انس و محبت رکھتے تھے اور کم از کم ان سے غداری کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے ۔ اس طرح وہ نہ صرف بصرے اور کوفے میں گئے ، بلکہ عدن کے راستے سندھ تک بھی پہنچے؛ تاہم عام طور پر وہ عرب ہی میں مقیم رہے، جہاں وہ اپنے آپ کو قبیلۂ جہینہ میں زیادہ محفوظ پاتے تھے ، جن کے علاقے میں رَضوٰی کی پہاڑی تھی، جس کا ذکر علویوں کی تاریخ میں اکثر آتا ہے ۔ خلیفہ کو ان کی پیہم تلاش میں ناکامی کی وجہ سے بڑی پریشانی ہوئی ؛ اس نے بارہا غم و غصہ کا اظہار کر کے مدینے کے حاکموں سے مطالبہ کیا کہ انہیں تلاش کر کے پیش کیا جائے اور جلدی جلدی ان میں سے کئی ایک کو برخاست بھی کر دیا، کیونکہ وہ اپنی مساعی میں غیر مؤثر اور کچھ لاپروا معلوم ہوتے تھے ، گو یہ لاپروائی غالباً بلاوجہ نہ تھی ۔ خلیفہ نے بذات خود بھی اس کوشش میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا ، لیکن نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا ۔ ۱۴۰ھ/۷۵۸ء میں جب وہ حج کے لیے آیا تو اس نے محمد اور ابراہیم کے والد کو قید خانے میں ڈال دیا ، کیونکہ وہ ان کی چھپنے کی جگہ نہ بتاتے تھے اور پھر ایک آیندہ حج کے موقع پر (۱۴۴ھ/۷۶۲ء) عبداللہ کے بھائی حسن کے بیٹوں اور پوتوں کا بھی یہی حشر ہوا ۔ انہیں اور عبداللہ کو کوفے میں لے جا کر ان پر بڑا تشدد کیا گیا اور انہیں قید خانے میں ڈال دیا گیا ، جہاں ان میں سے زیادہ تر فوت ہو گئے ۔ ابراہیم کے خسر محمد بن عبداللہ سے بھی جو [حضرت] عثمانؓ کی اولاد میں سے تھے، یہی سلوک روا رکھا گیا ۔ ان کا سر قلم کر کے خلیفہ نے خراسان میں بھجوایا اور اس کے ساتھ ایک حلفیہ

یمن بھی لکھ کر بھیج دیا کہ یہ سر علوی محمد کا ہے تاکہ ان پیروؤں کو جو وہاں تھے، خائف کیا جائے۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے (دسمبر ۷۶۱ء) بالآخر اسے اپنی مرضی کا ایک والی ریاح بن عثمان مل گیا؛ جس نے خاطر خواہ سرگرمی سے یہ تلاش شروع کی، لیکن اسے اس سلسلے میں زیادہ کاوش نہ کرنا پڑی، کیونکہ رجب ۱۴۵ھ/ نومبر ۷۶۲ء میں محمد مدینے میں ظاہر ہو گئے اور انہوں نے وہاں انقلاب برپا کر دیا اور ان کے بھائی ابراہیم نے بصرے میں جا کر بھی کیا۔ یہ بات واضح نہیں ہو سکی کہ آیا یہ اقدام ان دونوں بھائیوں نے اس وجہ سے کیا کہ محمد کی رائے میں اس کام کے لیے موزوں وقت آ چکا تھا، یا حالات نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ اپنی تجاویز کو جلد عملی شکل دے دیں۔ بہرحال اس اقدام کی تیاری ٹھیک سے نہ کی گئی تھی، کیونکہ ان کے پیرو اگرچہ بصرے اور مصر میں بہت تھے، جہاں علی بن محمد کو خلیفہ کے حاکم نے گرفتار کر لیا۔ اسی طرح ان کے حامی خراسان بلکہ سندھ میں بھی تھے، جہاں عبداللہ کے ایک اور بیٹے الاشتر کو بھیجا گیا تھا۔ اس اقدام میں کسی باقاعدہ تنظیم کا سوال ہی نہ تھا، اور جیسا کہ اکثر ہوتا رہا، علویوں کے لیے جوش و خروش تنکوں کی آگ کی مانند تھا، جو جلدی بھڑک اٹھتی ہے، لیکن اتنی ہی تیزی سے بجھ بھی جاتی ہے۔ مدینے میں جہاں اس انقلاب نے ریاح بن عثمان کو اچانک آ لیا تھا، محمد نے اپنے بلند کردار کے مطابق بڑی نرمی سے کام لیا؛ انہوں نے قید خانے کے دروازے کھول دیے، ہر قسم کی خونریزی کی ممانعت کر دی اور محض ریاح کو گرفتار کر لینے پر قناعت کی۔ جب امام مالکؒ بن انس نے یہ فتویٰ دیا کہ جو بیعت انہوں نے عباسیوں کی کی تھی، وہ باطل ہے تو عمائدین شہر ان کے طرفدار ہو گئے اور مکہ بھی نئے حکمران کے تصرف میں آ گیا۔ اس بغاوت کی وجہ سے ابو جعفر کو اطمینان سا ہو گیا، کیونکہ وہ کہتا تھا کہ اب لومڑی اپنے بھٹ سے نکل آئی ہے۔ وہ بڑی عجلت میں بغداد سے روانہ ہوا، جس کی تعمیر میں وہ منہمک تھا، اور کوفے پہنچا جو خطرے کا خاص مقام تھا۔ اپنی ذکاوت و ذہانت سے وہ سمجھ گیا کہ بغاوت کا کمزور مقام مدینہ ہی ہے، جس پر پہلے حملہ کرنا چاہیے، کیونکہ اس دور افتادہ مقام میں سامان حرب بہت کم مقدار میں موجود ہے اور وہاں جانے کے تمام راستے آسانی سے بند کیے جا سکتے ہیں؛ تاہم کوئی کارروائی کرنے سے پہلے اس نے محمد کو مکمل معافی کی پیش کش کی؛ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخصوص نوعیت کی خط و کتابت شروع ہو گئی، جس میں ایک نے دوسرے کے حسب و نسب پر لے دے کی۔ اس کے بعد اس نے اپنے ایک رشتے دار عیسیٰ بن موسیٰ کو چار ہزار سپاہی دے کر محمد کے خلاف بھیجا، لیکن ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کر دی کہ اگر مصالحت کے ذریعے فیصلہ ممکن ہو تو کر لیا جائے۔ اس کے آنے سے اہل مدینہ کچھ ٹھنڈے پڑ گئے اور ان میں سے بعض نے تو اس تکلیف دہ صورت حالات سے مخلصی پانے کے موقع کو غنیمت جانا، تاہم محمد بالکل مایوس نہ ہوئے۔ انہوں نے متعدد اشخاص کے اس نیک نیت مشورے کو مسترد کر دیا، کہ وہ مدینے کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں، کیونکہ اس میں وہ اس شہر کی بے حرمتی سمجھتے تھے، لیکن انہوں نے اپنے آدمیوں کو یہ فیصلہ کرنے کی اجازت دے دی کہ وہ ان کے ساتھ رہیں یا نہ رہیں۔ انہیں محض اللہ کی ذات پر بھروسہ تھا، جس کی جانب سے فتح ملتی ہے اور جس کے ہاتھ میں

معاملہ ہے" [منہ النصر و بیدہ الامر]۔ انھوں نے ان سب باتوں کی تقلید کی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے وقت میں کی تھیں، مثلاً انھوں نے اس خندق کو دوبارہ کھدوایا، آپؐ کی تلوار لٹکائی اور ان کا نعرۂ جہاد بھی وہی تھا جو جنگ حنین میں لگا تھا؛ حتٰی کہ جنگ شروع ہونے سے پہلے ایک ایک آدمی کی لڑائی [مبارزت] کے دستور کی بھی تجدید کی۔ ایسے حالات میں نتیجے کا اندازہ آسانی کے ساتھ لگایا جا سکتا تھا۔ عیسی نے چند روز تک عام معافی کا اعلان جاری رکھا، لیکن بے سود۔ اس نے خندق پر چند دروازے ڈلوا کر اسے عبور کر لیا اور مدینے میں داخل ہو کر جنگ شروع کر دی جس میں محمد کے حامی روز بروز کم ہونے لگے، یہاں تک کہ ان کے سردار (محمد) بھی سہ شنبہ کے دن ۱۴ رمضان ۱۴۵ھ/۶ دسمبر ۷۶۲ء کو میدان کارزار میں شہید ہو گئے۔ ان کا سر کاٹ کر خلیفہ کے پاس بھیج دیا گیا۔ (اس بغاوت کے دوسرے واقعات کے متعلق دیکھیے مادہ ابراہیم بن عبداللہ)۔

محمد بن عبداللہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ دراز قد، تنومند اور بہت سانولے رنگ کے تھے اور اسی وجہ سے خلیفہ انھیں طنزاً المُحَمَّم (سیاہ فام) کہا کرتا تھا۔ انھیں بجا طور پر النفس الزکیہ کہا جاتا ہے (الطبری، ۳ : ۲۰۰)، کیونکہ وہ ایک مثالی شخصیت کے مالک تھے: ذاتی شجاعت کے باوجود وہ بہت نرم مزاج تھے، لیکن ان میں وہ ضروری صفات موجود نہ تھیں جو کسی مدعی سلطنت کے لیے ایسے حالات میں درکار ہوتی ہیں۔

مآخذ: (۱) الطبری، طبع de Goeje، ۳ : ۱۶۶، ۱۳۳ تا ۲۵۹، ۲۵۹ ببعد، ۲۵۰۸ ببعد؛ (۲) *Fragmenta historicorum arab*، طبع de Goeje، (I)، ۲۰۹، ۲۳۰ تا ۲۳۶؛ (۳) المسعودی: مروج، طبع Barbier de Meynard، ۶ : ۱۸۹ تا ۱۹۲؛ (۴) وہی مصنف: التنبیہ، در *BGA*، ۸ : ۳۴۱؛ (۵) الیعقوبی، طبع Houtsma، ۲ : ۳۱۸، ۳۳۳، ۳۴۱ ببعد، ۳۵۰، ۳۵۲ ببعد؛ (۶) المبرد: الکامل، طبع Wright، ص ۱۳۹، ۳۰۲، ۵۲۵، ۷۸۶ ببعد؛ (۷) Noldeke: *Orientalische Skizzen*، ص ۱۲۶ تا ۱۳۲؛ (۸) V.Vloten در *ZDMG*، ۵۲ : ۲۱۳ تا ۲۱۸، ۲۲۵۔

[Fr. Buhl]

محمد بن عبداللہ حسّان: المہدی، * سومالیہ کا مشہور و معروف مہدی [مجاہد رہنما] جسے انگریز [بربنائے نفرت] "مجنون ملا" (mad mullah) کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ وہ سومالی الاصل تھا اور اوگدین (Ogaden) بہ جیری (bah Geri) قبیلے اور اس کی شاخ ریر حمر (Rer Hamar) سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ نواح ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوا اور جوانی ہی میں تحصیل علم دین اور تزکیۂ باطن کی تکمیل میں مصروف و منہمک ہو گیا۔ ۱۸۹۵ء میں اس نے فریضۂ حج ادا کیا اور مکہ مکرمہ کے دوران قیام میں اس کی ملاقات سید محمد صالح [دیکھیے سومالیہ] سے ہوگئی، جس کا وہ عقیدت مند مرید بن گیا۔ سومالیہ میں واپس آنے پر وہ پہلے ضولبہنۃ کے قبیلے کے علاقے میں آ کر آباد ہوا اور اس نے طریقۂ صالحیہ کی بڑے زور شور سے تبلیغ و تلقین شروع کی اور سومالی مسلمانوں کو پابند شریعت زندگی بسر کرنے کی ترغیب دینا شروع کی۔ چونکہ وہ ایک بڑا فصیح عالم تھا اور فی البدیہ شعر گوئی میں اسے کمال مہارت حاصل تھی (جو سومالی بدویوں میں اپنے خیالات کو رائج کرنے کا بہترین طریقہ ہے)، اس لیے اسے سابق برطانوی سومالیہ کے ذولبہنتہ قبیلے اور حبشہ کے اپنے ہی اوگدین قبیلے میں بے حد

مقبولیت حاصل ہو گئی۔ اس کے اثر و رسوخ کا علم بربرہ Berbera کی حکومت کو بھی ہو گیا اور انگریز حکام بھی بعض اوقات اس کے ذریعے ان تنازعات کا فیصلہ کرانے لگے، جو بدوی قبائل کے گروہوں میں پیدا ہو جایا کرتے تھے۔ مارچ ۱۸۹۹ء میں اس نے اچانک وعظ و تذکیر کو چھوڑ کر کھلم کھلا انگریز [استعماری حکومت] کی مخالفت شروع کر دی۔ ماہ اگست ۱۸۹۹ء میں اس نے اپنے معتقدین کو بُراؤ کے مقام پر جمع کر کے اپنے مہدی ہونے اور کفار کے خلاف جہاد کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے خلاف پہلی مہم اہل حبشہ نے بھیجی تاکہ اوگدین میں مزید بغاوت نہ پھیلنے پائے، لیکن گراز ماچ بانتی، جو اس فوج کا سردار تھا، ایک نہایت سخت حملے کے بعد، جو اس نے اوگدین قبیلے کی شاخ زیر علی پر کیا تھا، ہرر کی طرف پسپا ہو گیا۔ ۱۹۰۱ء میں کرنل سوین Swayne نے محمد (مہدی) کو اطالوی شمالی سمالی لینڈ [صومالیہ] کی حدود تک مار بھگایا اور اسے ۱۶ جولائی ۱۹۰۱ء کو فرضفین کے مقام پر شکست دی۔ ۱۹۰۲ء میں ایک دوسری انگریزی مہم کے سلسلے میں ۶ اکتوبر کو انگریزوں کو ایرگو کے مقام پر ایک اور فتح حاصل ہوئی۔ ۱۹۰۳ء میں یہ فیصلہ ہوا کہ مہدی کے خلاف تین فوجوں پر مشتمل ایک بہت بڑی مہم بھیجی جائے: یعنی ایک انگریزی فوج، انگریزی اطالوی معاہدے کے مطابق، جو اسی سال طے پایا تھا، ہوبیہ Hobya سے روانہ ہو اور دوسری انگریزی فوج بربرہ سے اور تیسری ایک حبشی فوج جو ہرر سے کوچ کرے۔ انگریزی افواج کی قیادت جنرل Manning کے سپرد ہوئی، لیکن پہلی فوج ایک کمین گہ میں پھنس گئی اور اسے گمبری کے مقام پر ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء کو مہدی نے شکست دے دی۔ دوسری فوج کو ۲۲ اپریل ۱۹۰۳ء کو درتولہ پر ایک خونریز جنگ میں بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ حبشہ کی فوج نے معمول کے مطابق اوگدین کے قبائل پر شبیلہ کی وادی میں ایک یلغار کی۔ ۱۹۰۴ء میں ایک چوتھی انگریزی مہم نے مہدی کو ۹ جنوری ۱۹۰۴ء کو جدبالی کے مقام پر شکست دی اور اس کے بعد جب ایک بحری فوج بحر ہند کے ساحل پر اتر آئی تو اِلگ کے مقام پر جو اطالوی سرحد میں واقع تھا، ایک اور شکست بھی دی۔ اس دوران سید محمد صالح نے انگریزی و اطالوی حکومت کی دعوت پر صومالیہ کے علما کو ایک خط لکھا جس میں مہدی کے خلاف یہ اعلان تھا کہ اس نے طریقۂ صالحیہ کے آداب اور دستور العمل کی خلاف ورزی کی ہے اور اس اعتبار سے وہ سلسلہ صالحیہ کے راسخ الاعتقاد پیرووں کی بد دعا کا مستحق ہے؛ تاہم انگریزوں کی فتوحات زیادہ تر اس وجہ سے کہ ان کے ذریعے اندرون ملک پر مستقل قبضہ نہ کیا جا سکا، اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے ناکافی ثابت ہوئیں، اس لیے اس بات کی کوشش کی گئی کہ انگریزوں، اطالویوں اور مہدی کے درمیان ایک معاہدہ ہو جائے اور اس کی تکمیل اس طرح ہوئی کہ مہدی کو یہ رعایت دے دی گئی کہ وہ اطالوی علاقے میں سے وادیٔ نوگال لے لے اور اِلگ کو اپنا صدر مقام بنا لے۔ مہدی نے ۵ مارچ ۱۹۰۵ء کو ان شرائط پر رضامندی ظاہر کی، لیکن اپنے دستخط کے ساتھ یہ جملہ بڑھا کر دیا کہ "والقنصل یعرف حالی" (اور قونصل میرے حال سے واقف ہے) جس کے یورپ میں یہ معنے سمجھے گئے کہ اسے قونصل پر پورا اعتماد ہے، لیکن اس کے برعکس صومالیہ میں اس کے صوفی ہونے کی وجہ سے اس کا یہ مطلب لیا گیا کہ وہ صوفی ہونے کی حیثیت سے کسی صورت میں بھی ایسے معاہدے کی تعمیل کا ذمے دار نہیں ہے

جو عارضی سیاسی حالات کے ماتحت کفار سے کیا گیا ہو: چنانچہ جنوری ۱۹۰۸ء میں مہدی نے انگریزی اور اطالوی رعایا پر واقعی پھر حملے شروع کر دیے۔ انگریزوں نے اس کے خلاف کوئی بڑی مہم نہ بھیجی، بلکہ وہ اپنی نو آبادی کی اندرونی حدود سے پیچھے ہٹ آئے۔ شتر سواروں کی ایک فوج یلغاروں کی روک تھام اور مہدی کے حملہ آور گروہوں کے خلاف سرعت کے ساتھ جنگی کاروائی کرنے کے لیے بھرتی کر لی گئی، لیکن متعدد کامیاب اور شجاعانہ حملوں کے بعد اس شتر سوار فوج کو ۹ اگست ۱۹۱۳ء کو دُلمہ دوبہ کے مقام پر مہدی کی ایک کثیر التعداد فوج سے مقابلہ کرنا پڑا، جس میں اس فوج کا سپہ سالار سر رچرڈ کورفیلڈ Richard Corfield مارا گیا۔ اس دوران اطالویوں نے جنوبی صومالیہ کے اندرونی حصوں میں ایک نہایت کامیاب حکمت عملی کے ذریعے اپنا پورا عمل دخل کر لیا، جس میں فوجی کاروائی کی زیادہ ضرورت بھی پیش نہ آئی۔ اس طرح انھوں نے شمالی صومالیہ میں دو سلطانوں کو (سلطان مَجیرتین اور سلطان ہوبیہ) کو مطیع و منقاد کر لیا، اور اس کے علاوہ اطالویوں نے سلطان کی افواج کو مرتب کرکے انہیں مہدی کے خلاف استعمال کرنے کے لیے تیار بھی کر لیا۔ اس طرح ان کی نو آبادی کی شمالی سرحدوں کی مدافعت کا انتظام ان کی منشا کے مطابق ہو گیا۔ وہاں انھوں نے صومالی امدادی فوج کے ذریعے مہدی کے پیروؤں کے خلاف بالخصوص وادیٔ شبیلہ کے شمالی انقطاع اور لُوگال کی اطراف میں یلغاروں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا، جہاں جربّان اور گرِعد کے مقامات پر سلطان ہوبیہ نے قبضہ بھی کر لیا۔ ان سرگرم فوجی کاروائیوں کے باعث، جو یورپ کی [پہلی] جنگ عظیم کے زمانے میں بھی جاری رہیں، مہدی کی افواج کمزور ہونے لگیں، مہدی کا سیاسی اقتدار ایک بہت بڑے رقبے میں ڈھیلا پڑ گیا اور وہاں کی آبادی نے اطالیہ کے ساتھ پر امن رہنے کے معاملات طے کر لیے، چنانچہ مہدی کو اس بات پر بھی مجبور ہونا پڑا کہ وہ ہمیشہ اپنے جنوبی علاقے کی حفاظت و مدافعت میں ہی مصروف رہے، بہرحال جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد انگریزی حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ بربرہ کی جانب سے مہدی پر حملہ کرکے اس کی بساطِ حکومت الٹ دی جائے۔ جنوری - مارچ ۱۹۲۰ء میں مہدی کے مورچوں پر ہوائی جہازوں کے ذریعے شدید گولہ باری کرنے کے بعد ایک انگریزی فوج تلیح کی طرف بڑی، جو مہدی کا آخری گڑھ تھا۔ شتر سوار دستوں اور صومالیہ کی امدادی فوج نے بڑی تیزی سے اس کا تعاقب کیا، لیکن مہدی اوگدین کی طرف فرار ہو گیا اور پھر کرنلا قبیلے کے علاقے میں پہنچا، جہاں وہ ۲۳ نومبر ۱۹۲۰ء کو فوت ہو گیا۔

صومالی فطرت کو سمجھنے کے لیے مہدی کی سرگذشت ایک بہترین نمونہ ہے۔ اس نے اپنی تحریک کو طریقۂ صالحیہ کا خلیفہ ہونے کی حیثیت سے شروع کیا تھا۔ اس کے بعد اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت نے اس کے عزائم اور تمناؤں کے لیے وسیع میدان مہیا کر دیا، اس لیے اس نے اپنی تبلیغ و تلقین کو سختی سے مذہبی بنیادوں پر قائم کرکے تمام صومالی قوم کا سردار بننے کی کوشش کی اور ہم مذہبی (اسلام) کو قبائلی روابط پر غالب کرنے کا ارادہ کیا، صومالیہ میں اس قسم کی تحریک کو فروغ دینے کا یہی ایک واحد طریقہ ہے، جہاں اسلام ہی کو قبائل کے درمیان اخوت کا رابطہ سمجھا جا سکتا ہے، جو ایسی باہمی جنگوں اور انتقام جوئیوں سے بھری ہوئی تاریخ کی وجہ سے آپس میں بٹے ہوئے رہتے ہیں؛ چنانچہ محمد بن عبداللہ حسان

خود ھی اپنی ایک نظم میں اس حقیقت کو واضح کرتا ہے۔ ”کیا میں نے اپنا سجادہ اس سمندر پر اس لیے نہیں بچھایا کہ مسلمانوں کو آپس میں متحد کر دوں، جو پہلے بھائی بھائی نہ تھے۔“ اس میں وہ اپنے اس تعلق کو بھی ظاہر کرتا ہے جو صالحیہ طریقے کے ذریعے اس کا عرب سے تھا، اسی لیے اس کی یہ خواہش بھی تھی کہ اس کے معتقدین اپنے آپ کو ”دراویش“ کہا کریں اور اپنے اپنے قبائل کے پہلے ناموں کو بھی فراموش کر دیں اور اسی لیے جب اسے سرکاری خط و کتابت میں ”محمد عبداللہ، اوگدین بہ جبری“ کے لقب سے مخاطب کیا جاتا تھا تو وہ بڑی ناراضگی کا اظہار کیا کرتا تھا۔ وہ اپنے دستخط کے ساتھ صرف اپنی نسبت ”ھاشمی“ لکھا کرتا تھا، یعنی الہاشمی (صومالی قوم کی اصل کا حوالہ دیتے ہوے جو عقیل بن ابی طالب کی اولاد میں سے ہیں، [دیکھیے مادہ صومالی لینڈ]).

اس کے علاوہ اس نے قبائلی افواج کی جگہ خاص مسلح جیوش بنائے، جن کے وہ نئے نئے نام رکھا کرتا تھا، مثلاً حکتو (نوچنے والے“)، جو ھبر جدر سے بھرتی کیے گئے، اور ضوگد جو مکاھیل سے بھرتی کیے گئے (ضوگد یعنی تیر انداز) اور قیاد جو ضوالبھنتہ سے بھرتی کیے گئے؛ لیکن وہ آخر تک اپنی اس حکمت عملی پر قائم نہ رہا۔ اساق قبیلے کے بیشتر حصے کی مخالفت جو قبیلۂ اساق اور دارود کی پرانی دشمنی کو تازہ کرتی رہتی تھی، برقرار رہی۔ اس کے علاوہ محمد صالح کے خط کی وجہ سے اسے یقینی طور پر بڑا صدمہ پہنچا، کیونکہ اس نے قادریہ طریقے کے لوگوں کو تو پہلے ھی سے اپنا مخالف بنا رکھا تھا، اب اسے صرف صالحیہ طریقے کی امداد و تائید کا بھروسا باقی تھا۔ اس بات کی بھی ضرورت تھی کہ وہ اپنے سپاہیوں کے لیے مال غنیمت مہیا کرتا رہے، کیونکہ اس کے بغیر ان کا اس کے ساتھ رہنا ناممکن نظر آتا تھا۔ ان تمام اسباب اور خود اس کی اپنی افتاد طبع کا اثر یہ ہوا کہ مہدی کا دینی اقتدار آہستہ آہستہ زوال پذیر ہونا شروع ہوا اور وہ بتدریج صرف اپنے قبیلے ھی کا سردار رہ گیا۔ وہ یقیناً ایک بہت بڑے قبیلے کا طاقتور سردار تھا، کیونکہ دراویش مختلف عناصر پر مشتمل تھے اور اس اعتبار سے یہ فرقہ ان متعدد برادریوں کے مماثل تھا، جن سے صومالیہ کے رواجی قانون کے مطابق لوگ بخوبی آشنا ہیں؛ چنانچہ یہ لوگ آہستہ آہستہ اپنے قدیم صومالی دستور کی جانب لوٹ آئے۔

الغرض مہدی کی یہ کوشش کہ وہ اسلام کے نام پر قبائل کی باہمی رنجشوں اور رقابتوں پر غالب آ جائے اور صومالیہ کو متحد کر کے یورپی قوموں کو اس ملک سے نکال دے، ان دو وجوہ کی بنا پر کامیاب نہ ہو سکی کہ ایک تو یورپی افواج [جو جدید اسلحہ سے مسلح تھیں] طاقتور تھیں، دوسرے وہ شدید مزاحمت و مخالفت، جو بسا اوقات غیر ارادی ہوتی تھی اور جو خود صومالی لوگ اپنی قدیم قبائلی تنظیم اور رواجی قانون کی حمایت میں کیا کرتے تھے۔

مآخذ: (۱) M. MacNeill: *In Pursuit of the mad Mullah*، لنڈن ۱۹۰۲ء؛ (۲) J.W. Jennings: *With the Abyssininans in Somaliland*، لنڈن ۱۹۰۵ء؛ (۳) اطالوی کتاب اخضر: *Somalia Italiana Settontrionale*، Legislatura Session XXII، ۴: ۱۹۰۶ء، روم ۱۹۰۶ء؛ (۴) برطانوی کتاب ازرق: *Correspondance relating to affairs in Somaliland* (C.D ۷۰۶۶)، لنڈن ۱۹۱۳ء؛ (۵) Douglas Jardine: *The Mad Mullah of Somaliland*، لنڈن ۱۹۲۲ء۔

(ENRICO CERULLI)

* **محمد بن عبدالرحیم**: رک بہ ابن الفرات۔

* **محمد بن عبدالملک**: رک بہ (۱) ابن طفیل؛ (۲) ابن زہر۔

* **محمد بن عبدالملک**: ابو جعفر المعروف ابن الزیات، جو متعدد عباسی بادشاہوں کا وزیر رہا۔ ابن الزیات نے اپنی ملازمت بغداد کے دیوان وزارت میں کاتب کی حیثیت سے شروع کی اور جب المعتصم کو اس کی لیاقت اور علم و فضل کا حال معلوم ہوا تو اس نے اسے اپنا وزیر مقرر کر دیا (۲۱۹-۲۲۰ھ/۸۳۴-۸۳۵ء)۔ الواثق کے عہد میں بھی وہ اس عہدے پر مامور رہا، لیکن چونکہ اس نے الواثق کے بھائی جعفر کی، جو بعد میں المتوکل کے لقب سے خلیفہ ہوا، کچھ بے ادبی کی تھی، اس لیے وہ اس سے ناراض ہو گیا۔ ذوالحجہ ۲۳۲ھ/اگست ۸۴۷ء میں الواثق کی وفات کے بعد ابن الزیات کی خواہش یہ تھی کہ الواثق کے بیٹے محمد کے ہاتھ پر بیعت کی جائے، لیکن ترکی سپہ سالار وصیف نے اس کی صغر سنی کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے اس قابل نہ سمجھا، اس لیے جعفر کی خلافت کا اعلان المتوکل کے لقب سے کر دیا گیا۔ پہلے تو اس وزیر کو اس کے عہدے پر برقرار رکھا گیا، لیکن اگلے سال ہجری کے ماہ صفر میں (ستمبر ۸۴۷ء) میں اسے گرفتار کر لیا گیا، اس کا مال و متاع ضبط ہوا اور اسے ایک ایسے ظالمانہ طریقے سے ایذا دی گئی جو اس نے خود ہی ایجاد کیا تھا۔ ہولناک ترین ظلم و تشدد کے بعد وہ ربیع الاول ۲۳۳ھ/نومبر ۸۴۷ء میں فوت ہو گیا۔

مآخذ: (۱) الیعقوبی، طبع Houtsma، ۲: ۵۸۸، ۵۹۰؛ (۲) الطبری، ۳ اشاریہ؛ (۳) المسعودی: مروج، پیرس، ۳: ۳۰۲؛ ۴: ۱۰۲ ببعد، ۱۳۶ تا ۱۳۸، ۱۹۳، تا ۱۹۷، ۲۱۵؛ (۴) ابن الاثیر، طبع Tornberg، ۶: ۳۲۰، ۳۳۸، ۳۶۵ ببعد، ۳۲۳؛ ۷: ۲۰، ۲۲ تا ۲۹؛ (۵) ابن خلکان [وفیات الاعیان]، طبع Wüstenfeld، عدد ۷۰۹، ترجمہ de Slane، ۳: ۲۴۹ ببعد؛ (۶) ابن الطقطقی: الفخری، طبع Derenbourg، ص ۳۰۲، ۳۲۲ تا ۳۲۹؛ (۷) Weil: *Gesch. der Chalifen*، ۲: ۳۳۷ ببعد، ۳۳۸ ببعد۔

(K. V. ZETTERSTEEN)

⊛ **(الشیخ) محمد بن عبدالوہاب**: نجد کے مشہور عالم اور مصلح؛ عیینہ کے قبیلہ بنو تمیم میں ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء میں پیدا ہوے۔ ان کا قبیلہ علم وفضل اور دنیوی وجاہت کے اعتبار سے پورے نجد میں مشہور تھا۔ شیخ کے مقام پیدائش عیینہ کو شیخ محمد بن عبدالوہاب کی وجہ سے "بلد الشیخ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

محمد بن عبدالوہاب کی شہرت سے قبل یہ خاندان آل مشرف کے نام سے معروف تھا۔ اب اسے "آل الشیخ" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ شیخ کے والد عبدالوہاب شہر عیینہ کے قاضی تھے اور بعد میں حریملا منتقل ہو گئے تھے۔ ان کے دادا سلیمان بن علی اپنے دور کے نامور عالم اور علماے نجد کے مرجع تھے۔ محمد بن عبدالوہاب ابھی دس برس کی عمر کو بھی نہ پہنچے تھے کہ قرآن مجید حفظ کر لیا اور اپنے والد گرامی شیخ عبدالوہاب سے فقہ حنبلی کی کتابیں پڑھ لیں، نیز تفسیر و حدیث کی اکثر کتابوں کا مطالعہ کر لیا۔ اسی عمر میں انھوں نے فریضۂ حج بھی ادا کیا اور دو مہینے مدینہ منورہ میں مقیم رہنے کے بعد عیینہ واپس آ گئے۔

۱۱۳۵ھ میں جب بیس برس کی عمر کو پہنچے تو مزید حصول علم کے لیے حجاز چلے گئے۔ اور کئی علماے کرام سے، مثلاً شیخ عبداللہ بن ابراہیم بن سیف نجدی مدنی، شیخ عبداللہ بن ابراہیم کی

وساطت سے ، شیخ محمد حیات سندھی (م ۱۱۵۵ھ)، شام کے ممتاز عالم شیخ علی داغستانی (م ۱۱۹۹ھ) ، شیخ محمد بن سلیمان کردی مدنی (م ۱۱۹۴ھ) سے بھی استفادہ کیا ، جو مدینہ منورہ کے مشہور محدث تھے ۔ بعد ازاں بصرہ میں شیخ محمد نے مجموعی سے حدیث و لغت کی کتابیں پڑھیں ۔

۱۱۳۹ھ/۱۷۲۶ء میں ان کے والد عُیینہ سے منتقل ہو چکے تھے ۔ یہاں آنے کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو تبلیغ توحید اور رد بدعات کے لیے وقف کر دینے کا فیصلہ کر لیا ؛ چنانچہ حریملا ہی میں وعظ و تدریس کا سلسلہ شروع کیا ۔ ان کے مواعظ نہایت پر اثر ہوتے ۔ ان کی مشہور تصنیف "کتاب التوحید" اسی زمانے کی یادگار ہے ۔

۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء میں ان کے والد شیخ عبدالوھاب انتقال کر گئے ۔ ان کے انتقال کے بعد وہ دعوت و تبلیغ میں پوری طرح سرگرم عمل ہو گئے ۔ ان دنوں نجد میں قبائلی نظام رائج تھا ۔ مختلف علاقے ، مختلف قبائلی سرداروں کے زیرنگیں تھے ۔ خود حریملا میں دو قبیلے سرداری کے لیے ایک دوسرے سے پنجہ آزما تھے ۔ ان حالات میں انھوں نے ضروری سمجھا کہ اپنے تبلیغی نظام کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے اہل نجد کے باہمی اختلافات کو ختم کرائیں اور اس کو ایک امیر کی سرکردگی میں لانے کی مہم شروع کریں ۔ اس کے لیے عیینہ کے امیر عثمان بن محمد عمر سے خط و کتابت کی ۔ اس نے اس تجویز کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی تو (۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء) میں عیینہ چلے گئے ۔ امیر عیینہ نے گرم جوشی سے ان کا خیرمقدم کیا اور بہت عزت و احترام کے ساتھ پیش آیا ۔ اپنی بھتیجی ان کے عقد میں دے دی ، جس کی وجہ سے تعلقات اور زیادہ مضبوط ہو گئے ۔

عثمان ۔ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں شیخ سے پورے تعاون کا عہد کیا، شیخ نے امیر عیینہ کو نماز با جماعت کی تاکید کی، اس کی پابندی نہ کرنے والوں کے لیے سزائیں تجویز کیں ، حکام کی طرف سے جو مختلف قسم کے ٹیکس وصول کیے جاتے تھے ، وہ ختم کر دیے گئے ؛ صرف ادائے زکوٰۃ کو باقی رکھا ۔ شیخ نے وہاں کچھ تبلیغی رسائل بھی لکھے ، لیکن بالاخر شیخ کو عیینہ کی سکونت ترک کرنا پڑی اور قبائل میں بے چینی بھی پیدا ہو گئی (۱۷۴۵ء یا ۱۱۵۸ھ) ۔ وہاں سے شیخ نے درعیہ کا رخ کیا ۔

شیخ محمد بن عبدالوھاب اور آل سعود کے درمیان یہ پہلا رابطہ و تعلق تھا ، جس میں روز بروز مضبوطی پیدا ہوتی گئی اور جس نے آل سعود اور آل شیخ کو ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے وابستہ و منسلک کر دیا ۔

درعیہ میں شیخ کے شاگرد احمد بن سویلم کا مکان ، جہاں وہ اقامت گزین تھے ؛ دعوت توحید کے مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا ۔ لوگ علانیہ اور خفیہ طور پر آتے اور شیخ کے علم و فضل سے مستفید ہوتے ؛ لیکن یہ صورت حال اطمینان بخش نہ تھی ۔ درعیہ کو مستقل مرکز تبلیغ قرار دینے کے لیے شیخ محمد بن عبدالوھاب ، امیر محمد بن سعود سے براہ راست اس موضوع سے متعلق بات کرنا چاہتے تھے ؛ چنانچہ اس ضمن میں امیر کے بھائیوں کے ذریعے سلسلہ جنبانی کی ۔ امیر کی بیوی مرضیٰ بنت ابی دمطان نے بھی امیر کو آمادہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا ۔

امیر محمد بن سعود ، جو پہلے سے ہی نیکی اور حسن اخلاق کا حامل تھا ، بیوی کی مختصر ، مگر مؤثر، گفتگو سے بہت متاثر ہوا اور اس کے دل میں شیخ کی عقیدت بیٹھ گئی بعدازاں شیخ نے بالمشافہہ گفتگو

سے امیر کے سامنے اپنا نصب العین پیش کیا۔ امیر اس سے متاثر ہوا اور ساتھ دینے کا عہد کیا۔

اس کے بعد امیر نے شیخ کے ہاتھ پر بیعت کی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور کتاب و سنت پر عمل پیرا ہونے کا یقین دلایا۔ یہ ۱۱۵۷ھ یا ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۴-۱۷۴۵ء کا واقعہ ہے۔

اس کے ساتھ ہی قبائل میں یہ دعوت عام ہو گئی اور لوگ بیعت اور استفادے کی غرض سے شیخ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے، جن میں نامور لوگ بھی شامل ہوتے تھے۔

جو لوگ سب سے پہلے شیخ کے حلقۂ عقیدت و ارادت میں داخل ہوئے، ان میں خاندانی وجاہت کے اعتبار سے امیر محمد بن سعود کے علاوہ اس کے تین بھائی مشاری، ثنیان اور فرحان ذی علم حضرات میں سے احمد بن سویلم اور عیسیٰ بن قاسم اور عام معاشرتی اثر و رسوخ کے لحاظ سے محمد الحزیمی، عبداللہ بن دعیر، سلیمان ابو شیقیرکا اور احمد بن حسین کے نام آتے ہیں۔

درعیہ اور اس کے اطراف و جوانب میں شیخ کی مقبولیت دیکھ کر حاکم عیینہ عثمان بن محمد بن معمر اپنے گذشتہ طرز عمل پر، جو اس نے شیخ کے ساتھ روا رکھا تھا، نہایت نادم ہوا اور شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر طالب عفو و درگذر ہوا اور اپنے ساتھ عیینہ تشریف لے جانے کی درخواست کی، مگر شیخ نے بلطائف الحیل ٹال دیا۔

بہر حال درعیہ کے دوسرے سال ۱۱۵۸ھ یا ۱۱۵۹ھ میں امیر عثمان اور اہل حریملا نے بھی شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی۔ خود محمد بن سعود کی شیخ سے عقیدت کی یہ حالت تھی کہ زکوٰۃ اور دیگر ذرائع سے حاصل ہونے والی رقوم بھی وہ شیخ کے حوالے کر دیتا اور شیخ اسے راہ خدا میں خرچ کر دیتے۔ امیر محمد بن سعود کے جانشین عبدالعزیز بن محمد بن سعود، جو ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء میں اپنے والد کی وفات کے بعد منصب امارت پر فائز ہوئے، شیخ کی عقیدت و احترام کا اس قدر گہرا جذبہ رکھتے تھے کہ ان کی اجازت کے بغیر نہ کچھ خرچ کرتے اور نہ کوئی چیز اپنے پاس رکھتے تھے۔

اب شیخ کی دعوت کا سلسلہ اور وسیع ہو گیا۔ ان کی آواز نجد کے علاقوں، یعنی عیینہ، درعیہ، حریملا وغیرہ، کی حدود سے نکل کر یمن اور دیگر مقامات میں بھی جا پہنچی۔ گرد و نواح کے اہل علم اور ذی اثر حضرات سے خط و کتابت شروع ہو گئی اور لوگ بڑے شوق سے ان کے حلقۂ دعوت میں شرکت کرنے لگے، جن میں یمن کے شہر صنعاء کے ممتاز عالم و مجتہد امیر محمد بن اسماعیل (م ۱۱۸۲ھ) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے شیخ کی دعوت سے متاثر ہو کر ایک قصیدہ بھی لکھا، جو بڑا مقبول ہوا۔ ان کی شرکت سے شیخ کی دعوت توحید و جہاد کو بہت تقویت پہنچی۔

اس زمانے میں ریاض کا حاکم دہام بن دواس، یوں تو شیخ اور ان کے مشن کا پہلے ہی مخالف تھا، مگر ۱۱۵۹ھ میں تو شیخ اور امیر محمد بن سعود کی مخالفت میں بہت آگے بڑھ گیا۔ شیخ اور ان کے ساتھیوں سے اس کی جنگی جھڑپیں بھی ہوتی رہتی تھیں (۱۱۵۹ تا ۱۱۸۷ھ)۔ بالآخر ۱۱۸۷ھ کے آخر میں امیر عبدالعزیز بن محمد بن سعود نے ریاض پر ایک زبردست حملہ کر کے اسے فتح کر لیا اور نجد پر اپنا قبضہ مستحکم کر لیا۔

مقبولیت کے ساتھ ساتھ شیخ کی مخالفت بھی زیادہ ہوتی گئی۔ مخالفین ان کی تحریک احیائے سنہ و توحید کو غلط رنگ میں دیکھتے تھے، اور ان پر متعدد الزامات عاید کیے جاتے تھے۔ وہ کتاب و

سنت کی روشنی میں ان کا جواب دینے اور دعوت و تبلیغ میں اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے۔ انھوں نے اپنی سرگرمیوں سے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ ان کی تحریک اصلاح و موعظت کی تحریک ہے اور اس کا تعلق صرف کسی ایک علاقے سے نہیں، پورے عالم عرب سے ہے۔

شیخ کی دعوت اصلاح اور تحریک جہاد میں مرکز دعوت درعیہ کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ ۱۸۱۸ھ تک اس کو یہی حیثیت حاصل رہی، پھر ابراہیم پاشا کے حملے سے یہ شہر بالکل تباہ ہو گیا۔

[شیخ کی شخصیت مخصوص عقائد و افکار کے باعث متنازعہ رہی ہے، تاہم ان کے حامی] کہتے ہیں کہ عقاید و اعمال میں شیخ محمد بن عبدالوہاب سلف کے پیروکار تھے۔ حدیث پر انہیں اصرار تھا۔ فروع فقہ میں البتہ امام احمد بن حنبلؒ کے مسلک پر عامل تھے، لیکن مسلک حنابلہ کے خلاف بھی، اگر کوئی حدیث مل جاتی، تو اسی پر عمل کرتے۔ صفات باری تعالیٰ میں وہ مسلک سلف کے حامی تھے اور قرآن مجید احادیث صحیحہ میں جو صفات باری بیان کی گئی ہیں، انہیں حرف بحرف صحیح تسلیم کرتے ان میں تاویل کے بالکل قائل نہ تھے۔ فروع میں ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ شافعی کو صحیح طور سے شافعی اور حنفی کو صحیح طور سے حنفی بنتے اور اپنے امام کے اصلی مسلک پر قائم رہنے اور اس کی پابندی کرنے کی دعوت دی جائے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ بدعات اور غیر شرعی امور کو جب کوئی امام بھی جائز نہیں سمجھتے تو ان کو کیوں نہ ترک کیا جائے [لیکن ان کے مخالفین نے ان سب امور میں، ان کے خیالات کو ہدف طعن بنایا اور ثابت کیا ہے کہ وہ ائمہ کو تسلیم نہ کرتے تھے]۔ ان کے حامیوں کے بیان کے مطابق محمد بن عبدالوہاب امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم اور ان کی کتابوں سے قلبی تعلق رکھتے تھے، ان کا اپنا دعویٰ یہ تھا کہ ان کی تحریک خالص کتاب و سنت پر مبنی ہے [لیکن مخالفین اس کو نجد کی تحریک وہابیت کہتے ہیں]۔

شیخ نے مسلسل پچاس برس دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیا اور باختلاف روایت ماہ شوال یا ذی قعدہ ۱۲۰۶ھ/جون یا جولائی ۱۷۹۲ء میں اکیانوے برس کی عمر پا کر وفات پائی۔

شیخ کا حلقہ درس بہت وسیع تھا، اسی نسبت سے ان کے تلامذہ کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی۔

انھوں نے اپنے پیچھے چار بیٹے حسین، عبداللہ، علی اور ابراہیم چھوڑے۔ ان کے علم و فضل کا یہ عالم تھا کہ ان میں سے ہر ایک کے مکان کے قریب مدرسہ قائم تھا، جس میں بیرونی طلبا تعلیم حاصل کرتے تھے اور ان کے مصارف کی کفالت بیت المال کرتا تھا۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب کی اولاد و احفاد اب بھی پورے نجد میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے اور "آل شیخ" کہلاتی ہے۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب ایک اچھے مصنف بھی تھے۔ ان کی تصانیف سادہ و عام فہم اسلوب کی حامل ہیں، تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) کتاب التوحید: یہ ان کی سب سے زیادہ مشہور تصنیف ہے۔ اس کا پورا نام کتاب التوحید الذی حق اللہ علی العبید ہے۔ اس میں توحید کی حقیقت، اس کی تعریف، اس کی حدود، شرک اور اس کی قباحتیں، نذر، توسل، استغاثہ، استعانت از غیر اللہ وغیرہ مسائل وضاحت سے بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب اردو میں بھی منتقل ہو چکی ہے۔ علمائے نجد نے اس کی شرحیں بھی لکھی ہیں! (۲) کشف الشبہات من التوحید: اسے کتاب التوحید کا

تتمہ کہنا چاہیے۔ اس میں ان شبہات کا ازالہ کیا گیا ہے، جو توحید کے بارے میں مختلف ذہنوں میں ابھرتے ہیں؛ (۳) شروط الصلوٰة وارکانہا: اس میں شرائط نماز کی وضاحت کی گئی ہے اور ارکان نماز کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے؛ (۴) الاصول الثلاثہ وادلتہا: یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے: اس میں معرفت خدا، معرفت دین اسلام اور معرفت رسول کی وضاحت کی گئی ہے؛ (۵) نصیحة المسلمین: اس کتاب میں دین کے تمام شعبے بیان کیے گئے ہیں اور ان کے علیحدہ علیحدہ ابواب مقرر کر کے ہر باب میں اس سے متعلق احادیث درج کی گئی ہیں؛ (۶) کتاب فضل الاسلام: اس میں شرائط اسلام کی وضاحت کی گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی بدعت و شرک کی قباحتوں کی تفصیل سے نشاندھی کی گئی ہے؛ (۷) اصول الایمان: اس کتاب میں احادیث کی روشنی میں ایمان کے مختلف ابواب کی تشریح کی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتاب پر شیخ کی اولاد میں سے کسی نے کچھ اضافات بھی کیے ہیں؛ (۸) اربع قواعد: یہ ایک رسالہ ہے، جس میں توحید کے بعض گوشوں کو مؤثر طریق سے بیان کر کے مشرکین کا رد کیا گیا ہے؛ (۹) کتاب الکبائر: اس میں تمام اقسام کبائر کو الگ الگ ابواب میں بیان کیا گیا ہے۔ ہر باب کو نصوص قرآن و حدیث سے مؤثق کیا گیا ہے؛ (۱۰) تفسیر الفاتحہ: یہ سورہ فاتحہ کی ایک مختصر تفسیر ہے، جس میں شیخ کا اپنا اسلوب خاص نمایاں ہے؛ (۱۱) تفسیر شہادة ان لا الہ الا اللہ: کلمہ لا الہ الا اللہ کی تفسیر؛ (۱۲) ستة مواضع من السیرة: سیرت طیبہ کے چھ مقامات کی تشریح میں ایک چھوٹا سا رسالہ ہے؛ (۱۳) مسائل الجاہلیہ: ایک سو اکتیس ایسے مسائل، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل جاہلیت اور ان کے معتقدات کی مخالفت کی ہے؛ (۱۴) کتاب السیرة: یہ سیرت ابن ہشام کا خلاصہ ہے جو چھپ چکا ہے؛ (۱۵) التفسیر علی بعض سور القرآن: یہ مختلف آیات و سور پر ان کے حواشی و تعلیقات کا ایک مجموعہ ہے۔ اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ شیخ نے ایک ایک آیت سے کئی کئی مسائل مستنبط کیے ہیں؛ (۱۶) الہدی النبوی: یہ امام ابن قیم کی معروف تصنیف زاد المعاد کا اختصار ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی رسائل لکھے۔

[شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک بنیادی طور پر ایک اصلاحی اور ابلاغی تحریک تھی، جس نے آگے چل کر کچھ سیاسی رنگ بھی اختیار کر لیا۔ اساسی طور پر اس کا مقصد عرب معاشرے کی اصلاح اور تعمیر نو کرنا تھا؛ ضرورت کے تحت اس تحریک کو تشدد کا بھی سہارا لینا پڑا، جس کی بنا پر اس کی مخالفت بھی بہت ہوئی۔ بعد ازاں یہ تحریک نجد اور عرب تک محدود نہ رہی، اور دوسرے ممالک میں بھی رواج پذیر ہوئی، خصوصاً برصغیر پاک و ہند میں اس نے سیاسی کردار بھی ادا کیا۔ یہاں ان کے معتقد خود کو اہل حدیث کہتے ہیں، برصغیر میں ان کو وہابی کہہ کر ان کے مخالفین نے سخت مخالفت کی اور کتابیں اور رسالے تحریر کیے چنانچہ موردتمان (J. H. Mordtmann) نے اپنے مقالے ابن سعود [رک باں] میں مستشرقانہ مصالح کی بنا پر سعودی خاندان کو وہابی لکھا ہے۔ ابتداء سیاسی مقاصد کے تحت تحریک آزادی کی ایک تحریک کو یہ نام دیا گیا۔ مخالفت کا زور ابتدا میں سید احمد بریلوی‍ؒ اور شاہ اسمعیل‍ؒ شہید کے خلاف رہا، بعد میں پھیل گیا اور دیگر فرقے اور گروہ بھی اس کی زد میں آ گئے؛ غرض سیاسی مقاصد کے تحت اس نام کو کافی استعمال کیا گیا]۔

مآخذ: (۱) حسین بن غنام احسائی: روضة

الاذکار و الافهام لمرتاد حال الامام و تعداد غزوات ذوی الاسلام، مطبوعه ریاض، قاهره ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۹ء : (۲) الجبرتی : عجائب الآثار فی التراجم والاخبار، مطبوعه قاهره ۱۲۹۷ھ : (۳) احمد بن زینی دحلان : خلاصه الکلام فی امراء البلد الحرام : (۴) عثمان بن بشر نجدی : عنوان المجد فی تاریخ نجد، ریاض، بار سوم ۱۳۵۸ھ : (۵) رتبه بن علی حنبلی : مشیر الوجد فی معرفه انساب ملوک نجد : (۶) الشوکانی : البدر الطالع : (۷) حافظ وهبه : جزیرہ العرب فی القرن العشرین : (۸) محمد حامد فقی : اثر الدعوة الوهابیه فی جزیرة العرب، مطبوعۂ قاهره : (۹) محمود شکری الآلوسی : تاریخ نجد، مطبوعۂ قاهره ۱۳۴۳ھ : (۱۰) محب الدین خطیب : الزهراء : (۱۱) عجاج نویهض : حاضر العالم الاسلامی، مع تعلیقات و حواشی، امیر شکیب ارسلان، مطبوعه قاهره، ۱۳۴۳ھ : (۱۲) محمد لبیب البتنونی : الرحلة الحجازیة : (۱۳) صدیق حسن خان : التاج المکلل، مطبوعه بمبئی، بار ثانی ۱۳۸۳ھ/۱۹۶۳ء : (۱۴) خیرالدین الزرکلی : الاعلام، ۷ : ۱۳۷ تا ۱۳۸ : (۱۵) محمد اسلم جیراج پوری : تاریخ نجد : (۱۶) مسعود عالم ندوی : محمد بن عبدالوهاب، کراچی، بار چهارم ۱۳۷۳ھ : (۱۷) محمد بن یوسف بن محمد مورق : مقدمه کتاب التوحید : اردو ترجمه : (۱۸) سلیمان بن سحمان نجدی : مجموعه الهدیة السنیه، اردو ترجمه : (۱۹) سید سلیمان ندوی : سلاطین نجد کا مذهب، در معارف (اعظم گڑھ)، نومبر ۱۹۲۳ء، [نیز رک به اهل حدیث و الوهابیة] .

([محمد اسحاق بھٹی [و اداره])

* **محمد بن عبیدالله** : رک به ابو المعالی .

* **محمد بن عثمان** : رک به ابو زیان اوّل .

* **محمد بن علی** : رک به (۱) الجواد الاصفهانی؛ (۲) ابن العربی : (۳) ابن عسکر؛ (۴) ابن بابویه؛ (۵) ابن الطقطقی؛ (۶) ابن وحشیه .

* **محمد بن علی** : (ابو جعفر باقرؒ) : حضرت امام حسین بن علیؓ کے پوتے ۔ ان کی کنیت ابو جعفر تھی اپنے علم و فضل کی وجه سے وه الباقر (محقق) کے اعزازی لقب یا نام سے مشهور تھے ۔ علم حدیث میں ان کو سند مانا جاتا تھا اور ان کے چند متبرک مقولے بھی مشهور هیں ۔ انهیں اس کے ساتھ هی اپنے خاندان کے مخصوص شوق کی وجه سے حاشیه دار ریشمیں لباس اور رنگ بهت پسند تھے ۔ به ظاهر هے که شیعی گروه کے لوگوں نے ان کو، ان کے خاندان کے دیگر افراد کی طرح، امام مشهور کر دیا ۔ صبر اور سکون کے ساتھ مدینه منوره هی میں قیام فرما رهے ۔ انهوں نے سیاست میں کوئی حصّه نهیں لیا، گو ان کا هر طرح احترام کیا جاتا تھا، جیسا که عمر ثانی کی مثال سے ظاهر هے ۔ المغیره اور بیان ایسے کٹر قسم کے شیعه کھلم کھلا طور پر ان کی امامت سے انکاری تھے ۔ جب اس فریق نے، جو ان کے بھائی زید کا طرف دار تھا، اس کا ساتھ چھوڑ دیا تو وه ان سے بھی عقیدت رکھنے لگے ۔ لیکن چونکه ان کا تو انتقال هو چکا تھا، لهذا لوگ ان کے بیٹے (حضرت امام جعفر) کے پیرو هو گئے (دیکھیے جعفر بن محمد) ۔ حضرت زید سے ان کے اختلاف وجه یه بتائی جاتی هے که زید پهلے دو خلفا کو برائی کے ساتھ یاد کرنا نا پسند نه کرتے تھے، جس پر ان کے معتقدین مصر تھے، لیکن یه بات اس حقیقت سے لگا نهیں کھاتی که (طبقات) ابن سعد میں محمد کی نسبت جو کچھ مذکور هے اور جس میں غالباً بڑی مبالغه آمیزی سے بھی کام لیا گیا هے اس سے یه ظاهر هوتا هے که ان کو بھی حضرت ابو بکر اور حضرت عمر سے بڑی محبت تھی ۔ ان کی تاریخ وفات کے متعلق اختلاف هے یعنی ۱۱۴ھ، ۱۱۷ھ یا ۱۱۸ھ بیان کی جاتی هے .

مآخذ : (۱) الطبری طبع ڈخویه، ۲ : ۱۶۹۹ ببعد، ۱۷۲۹ ببعد : ۳ : ۲۱۳۳، ۲۳۰۹ ببعد : (۲) *Fragm*

Historicorum arab، طبع ڈخویہ ص ۹۹ ببعد و ۲۰۲ ؛ (۳) یعقوبی، طبع Houtsma، ۲ : ۳۶۵ ببعد و ۳۸۳ ببعد ؛ (۴) النووی: *Biographical Dictionary* [تہذیب الاسماء]، طبع وستنفلڈ، ص ۱۱۲ ۔

(Fr. Buhl)

* **محمد بن علی الرضا**: اثنا عشری شیعوں کے نویں امام، رمضان ۱۹۵ھ/جون ۸۱۱ء میں بمقام مدینہ پیدا ہوے ۔ بقول ابو الفرج الاصفہانی: مقاتل الطالبین (تہران ۱۳۰۷ھ) ص ۱۹۵، سطر ۱۸ وہ سانولے رنگ کے تھے ۔ یہ بات شاید درست ہو کیونکہ ان کی والدہ ایک کنیز تھیں جن کے تین مختلف نام مشہور ہیں سبیکہ، دُرّہ اور خیزران ؛ وہ نوبیہ (ملک حبشہ) کی رہنے والی تھیں، ان کی عالی نسبی کے سلسلہ میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ماریہ قبطیہ کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں ۔ جب المامون نے علی الرضا کو اپنے درباریوں میں شامل کر لیا تو اس نے اپنی ایک بیٹی کا آپ سے نکاح کر دیا جس کا نام ام الفضل تھا جسے ۲۱۵ھ/ ۸۳۰ء میں رخصت کر کے ان کے ہاں بھیج دیا گیا ۔ المعتصم نے اپنی تخت نشینی کے موقع پر انھیں بغداد میں بلایا ۔ وہ وہاں ۲۲۰ھ کی ابتدا میں پہنچے اور ذوالقعدہ (نومبر ۸۳۵ء) میں ان کا انتقال بھی ہو گیا شیعوں کے نزدیک اور ان کے نظریہ شہادت کے عین مطابق آپ کو زہر دیا گیا تھا ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ زہر خورانی المعتصم کی انگیخت پر ام الفضل کے ذریعہ ہوئی تھی جو بے اولاد ہی رہی، لیکن مذکورہ بالا کتاب مقاتل میں ہر علوی کے قتل کا تذکرہ موجود ہے، مگر اس واقعہ سے متعلق کوئی ذکر نہیں ۔ محمد بن علی الرضا کا ذکر شیعوں کی کتابوں کے علاوہ دوسری تصانیف میں کبھی کبھار ان کے والد کے ذکر کے ساتھ آ جاتا ہے مثلاً ابن واضح الیعقوبی: تاریخ، طبع Houtsma (لائیڈن ۱۸۸۳ء) ۲ : ۲۵۲ اور طبری: تاریخ ۳ : ۱۰۲۹، ۱۱۰۲ ۔ مسعودی: مروج الذھب، (پیرس ۱۸۶۱ء ببعد) ۷ : ۱۰۲ کے بیان کے مطابق محمد بن علی الرضا ۲۱۹ھ میں فوت ہوے ؛ ۷ : ۱۲۱ کے مطابق آپ الواثق کے عہد حکومت تک فوت نہیں ہوے یعنی ۲۲۷ھ کے بعد تک ۔ اہل تشیع کے نزدیک بھی آپ کی زندگی کچھ خاموش اور غیر متحرک ہی سی تھی ۔ آپ کے والد کے درد ناک انجام کے بعد شیعوں میں سے زیدی عقیدہ رکھنے والے لوگ جن کو یہ امید تھی کہ جب آپ خلیفہ بنیں گے تو انہیں علوی مجاہدین کے سیاسی لائحہ عمل کو نافذ کرنے کا موقع مل جائے گا آپ سے الگ ہو کر اپنی راہ پر ہو لیے اور وہ لوگ جو امامیہ عقائد کے پابند تھے، کیونکہ ایسی حالت میں ایک نہ ایک گروہ اس قسم کا ضرور ہوتا تھا، بکے واقفیہ بن گئے ۔ ایک اور فرقے نے آپ کے ایک بھائی احمد کو اپنا امام منتخب کر لیا، کیونکہ محمد اس وقت صرف سات برس کے تھے ۔ وہ لوگ جنھوں نے اپنی بیعت کا سلسلہ آپ سے قائم رکھا ان کے لیے شروط الامامت کا مسئلہ نکل آیا کہ ایک امام صغیر سن کے علم کا کیا درجہ ہوتا ہے ۔ یہ مسئلہ بعد کے تین اماموں کے حق میں بھی پیش آیا، لیکن تعلیم دینی کا کام ان لوگوں کے ہاتھ میں تھا جن کی سرگرمیاں متعدد امامتوں کے زمانوں پر پھیلی ہوئی تھیں ۔ مجلسی (دیکھیے Bibl.) : ۱۲ : ۱۲۵ بذیل مرزا محمد الاسترآبادی: منہج المقال (تہران ۱۳۰۶ھ) ص ۲۱ ؛ ابو عمرو الکشی: معرفة اخبار الرجال (بمبئی ۱۳۱۷ھ)، ص ۳۵۳ ببعد ؛ طوسی: فہرست کتب الشیعہ (Bibl. Ind. شمارہ ۶۰) شمارہ ۱۲۴ و ۱۵۰، ص ۲۸۹، حاشیہ ۱، عقیدہ زیر بحث کے تدریجی ارتقا کی کیفیت جس کا تعلق حضرت

عیسیٰ کے بعالم طفلی تکلم فی المہد مذکورہ قرآن مجید (۱۹ [مریم] : ۳۰) سے ہے، پوری طرح واضح نہیں کہ اس عقیدے کے ارتقا کو مختلف اماموں کے لیے کس طرح تقسیم کیا جائے۔ عالمان بدعات بشمول النوبختی : فرق الشیعہ (Bibl. Isl.، عدد ۴)، ص ۷۴ ببعد، ان اعتقادات کی تفصیل صغر سن اماموں کا نام بتائے بغیر دیتے ہیں؛ اس کے علاوہ ان ناموں میں التباس بھی ہے (جو یورپین کتابوں کے اشاریوں میں بھی آ گیا) کیونکہ محمد بن علی ان کے پوتوں میں سے بھی ایک کا نام تھا جو اپنے باپ کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تھے، یعنی دسویں امام علی النقی، مگر وہ اولاد چھوڑ کر فوت ہوئے تھے۔ آپ کے معتقدین نے ان بیٹوں کے ذریعہ اثنا عشریوں کے مقابلہ میں سلسلہ امامت کو اور آگے تک جاری رکھا؛ وہ بارھویں امام محمد المہدی کے وجود کے منکر ہیں اور نویں امام محمد بن علی الرضا کے بھائی اور گیارھویں امام حسن العسکری کا بیٹا تسلیم نہیں کرتے۔ شیعہ تصانیف میں اس التباس کو دور کرنے کے لیے نویں امام کی کنیت ابو جعفر الثانی لکھی گئی ہے۔ ان کا مسلمہ لقب التقی یعنی خدا ترس ہے اور عرف عام الجواد یعنی "سخاوت کرنے والا" ہے۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنے باپ کے قرضے بیباق کیے تھے۔ آپ نے اپنے پیش رو امام علی الرضا کی طرح عثمان بن سعید العَمری المشہور سمّان یا زیات کو اپنا وکیل یا باب مقرر کر رکھا تھا۔ ائمۃ کی کرامتوں کے متعلق ابو جعفر الصفار (م ۲۹۰ھ) اپنی تصنیف بصائر الدرجات (در مجلسی ۱۲ : ۱۰۸) میں لکھتا ہے کہ نویں امام ایک عابد کو ایک رات ملک شام سے میدان کربلا کے مقدس مقامات اور کوفے اور مدینے اور مکے تک لے گئے۔ ان کی یاد آج کل کے زمانے تک اس لیے تازہ ہے کہ آپ کو اپنے دادا یعنی ساتویں امام موسی الکاظم (رک بآن) کے پہلو میں دفن کیا گیا اور اس طرح یہ مقام مشہد الکاظمین کے نام سے مشہور ہوا۔

مآخذ : (۱) پوری تفصیل اور صحیح حوالے محمد باقر بن محمد تقی المجلسی کی بحار الانوار، جلد ۱۲ (تہران ۱۳۰۲ھ)، ص ۹۹ تا ۱۲۶ میں موجود ہیں؛ (۲) اس سے پہلے زمانے کی کتابوں میں خاص طور پر المفید (رک بآن) : الارشاد (تہران تاریخ ندارد، بلا اعداد صفحات، اماموں کی ترتیب کے مطابق مرتب ہوئی)؛ (۳) نیز دیکھیے الزرکلی : الاعلام، بذیل مادہ، بالخصوص مآخذ؛ (۴) محمد بن وہبان : اخبار ابی جعفر الثانی۔

(R. Strothmann)

● [شیعی نقطہ نظر] : اثنا عشری شیعوں کے نویں امام اور عام مسلمانوں کے واجب التعظیم بزرگ حضرت امام محمد تقی علیہ السلام جن کے احوال شیعہ و سنی دونوں نے لکھے ہیں۔ (دیکھیے فہرست مآخذ)۔

امام محمد تقی علیہ السلام کا مقدس آبائی سلسلہ سات واسطوں سے حضرت فاطمۃ الزہراء بنت حضرت مصطفیٰؐ اور حضرت علیؑ مرتضیٰ علیہم السلام سے جا ملتا ہے۔ امام محمد التقی ابن امام علی الرضا ابن امام موسی الکاظم ابن امام جعفر الصادق ابن امام محمد الباقر ابن امام علی السجاد ابن امام حسین الشہید ابن امام علی المرتضی ابن ابی طالب علیہم السلام۔ والدۂ ماجدہ : ام الحسن سبیکۃ الخیزران جن کا خاندانی رشتہ حرم الرسولؐ ماریۃ القبطیہؓ سے ملتا ہے، کتب مناقب و حدیث میں جناب سبیکہ کے فضائل بیان کیے گئے ہیں۔

تفصیلی و تحقیقی تذکرہ عبدالرزاق المقرّم نے وفاۃ الامام الجواد (ص ۵) میں قلمبند کیا ہے۔

المسعودی نے بطور خلاصہ لکھا ہے کہ آپ افضل اماءِ عہد تھیں (اثبات الوصیة ، ص ۲۰۹) .

امام تقی علیہ السلام کی ولادت ۱۹۵ھ/۸۱۱ء میں ہوئی ؛ تاریخ و ماہ میں اختلاف ہے ۔ کچھ حضرات ماہ رمضان اور کچھ ماہ رجب بتاتے ہیں (تفصیل کے لیے دیکھیے، وفاۃ الامام الجواد ، ص ۷ ؛ اعیان الشیعہ ، ص ۳۳ ؛ ۲۱۵ رسول ؐ و اہل بیت رسول ، ۳ : ۱۱) ۔ عام طور پر ۱۰ رجب کو معتبر مانا گیا اور اسی دن شیعوں کے ہاں خوشی منائی جاتی ہے .

امام محمد تقی علیہ السلام امام علی رضاؑ کی آغوش میں پلے اور اماموں کی طرح پرورش پائی جو اس گھر کی قدیم روایت تھی ۔ وہی عبادت، و تقوی وہی علم و عمل ، وہی احترام و عزت . مدینۂ منورہ میں اس وقت ان کے اجداد کرام کے طرف داروں کی کثرت تھی ۔ مختلف صوبوں اور تمام اسلامی دنیا میں ان کے حامیوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا ۔ امام علیہ السلام مدینۂ منورہ میں اور بیرون مدینہ صریا (المناقب ، ج ۵ ، ص ۱۰۶) اور خاخ میں (عمدۃ الاخبار ، ص ۱۳۶) املاک رکھتے تھے ، اس لیے حج کے علاوہ اکثر مدینہ ہی میں رہے .

بنی عباس کی حکومت جتنی وسیع ہو چکی تھی اسی قدر اندرونی خلفشار بڑھ رہا تھا ۔ [خلافت کے بارے میں اہل بیت اور غیر اہل بیت کی نزاع بنی امیہ کے زمانے سے چلی آ رہی تھی ، جو بنی عباس کے زمانے میں پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ۔ منصور کے زمانے میں نفس الزکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم نے خروج کیا ، لیکن دونوں نے شکست کھائی اور شہید ہوئے ۔ ان کے بعد بھی اہل بیت کے ہوا خواہ ملک کے مختلف مقامات سے خروج کرتے رہے ، لیکن ناکام رہے ۔ ان ناکام بغاوتوں کے نتیجہ میں اہل بیت پر سختیاں ہوئیں] ۔ امین نے خلافت سنبھال رکھی تھی ۔ مامون نے سب سے پہلے امین کو شکست دی ، پھر وہ علویوں کی طرف متوجہ ہوا ۔ اس نے خاندان کے سربراہ اور امت کے محترم امام حضرت علی رضا علیہ السلام کو مدینے سے مرو بلایا اور ولی عہدی کا اعلان کیا .

امام محمد تقی علیہ السلام اپنے والد کی نص کے مطابق امام ہوئے ۔ انہوں نے مسجد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اپنی امامت کا اعلان فرمایا (بحار الانوار ، احوال امام محمد الجواد) ۔ لوگ اب ان کی طرف رجوع کرنے لگے ۔ مامون رشید نے احترام و عقیدت کا عالم دیکھا تو امام کو مرکز سے دور رکھنے کا ارادہ کیا ۔ لوگوں کا دل رکھنے اور عوام کو اپنی محبت جتانے کے لیے انھیں مدینے سے بلا کر بڑے احترام کا مظاہرہ کیا ۔ بغداد میں امام کی غیر معمولی علمی صلاحیتیں لوگوں کے سامنے آ چکیں تو خلیفہ نے اہل دربار سے کہا : میں اپنی دختر کا عقد فرزند رسول ؐ سے کرنا چاہتا ہوں ۔ (الارشاد ص ۳۰۰ ؛ رسول و اہل بیت رسول ص ۳۹) .

اس کے بعد امام محمد تقیؑ سے کہا خطبہ پڑھیے ، انھوں نے خطبہ پڑھا اور مأمون نے ام الفضل ان کے عقد میں دے دی ۔ یہ واقعہ ۲۰۲ھ کا ہے (وفاۃ الامام الجواد ، ص ۴۵) ۔ عقد کے بعد امام محمد تقی علیہ السلام ایک سال بغداد میں رہے ۔ علما و فقہا ان سے درس لیتے اور مشکلات حل کرتے رہے (الاحتجاج، ص ۴۲؛ المناقب، ۵ : ۱۰۹ ؛ رسول و اہل بیت رسول، ص ۴۲) .

بغداد سے امام محمد تقیؑ مدینۂ منورہ واپس آ گئے اور انتہائی توجہ کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے لگے ۔ عبداللہ بن رزین کا بیان ہے کہ امام محمد تقی وقت زوال مسجد میں تشریف لاتے اور

سیدھے مزار انور پیغمبرؐ پر سلام کرنے حاضر ہوتے؛ پھر بیت فاطمہؑ میں جاتے اور اول وقت نماز ظہر ادا فرماتے (المناقب، ۵ : ۱۰۳)۔ امام محمد تقی کے حلقۂ درس سے سیکڑوں اصحاب و تلامذہ فیض یاب ہوئے۔ ان میں راوی بھی تھے اور مصنف بھی؛ ابو جعفر الطوسی نے کتاب الرجال میں تقریباً دو سو پچاس نام الف بائی ترتیب سے درج کیے ہیں (الرجال، ص ۳۹۷)۔ ان میں سے چھے اہم شخصیتوں کا تذکرہ شیخ عباس قمی نے منتہی الآمال (۲ : ۲۵۵) میں لکھا ہے، چار بڑے مصنف عالموں کے احوال قلمبند کرتے ہوئے امام محمد تقی کے چند مکاتیب بھی جمع کیے گئے ہیں۔ (دیکھیے، رسولؐ و اہل بیت رسول، ص ۶۵)۔

ابو محمد حسن بن علی حرانی (م ۳۳۲ھ) نے تحف العقول عن آل الرسول، محمد باقر مجلسی (م ۱۱۱۱ھ) نے بحار الانوار (جلد ۱۲) اور محمد ہارون زنگی پوری (م ۱۳۳۹ھ) نے نوادر الادب من سادة العجم و العرب میں آپ کے خطبات و ملفوظات کا ایک ذخیرہ نقل کیا ہے۔ تبلیغ و تعلیم کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ امام موسی کاظم علیہ السلام کے بعد ایک فرقہ واقفیہ کے نام سے پیدا ہو گیا تھا۔ امام محمد تقی نے اس فرقہ کو اپنے کردار و عمل و استدلال کے ذریعے اپنی امامت منوا لی اور یہ فرقہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

۲۱۸ھ/۸۳۳ء میں مامون نے رحلت کی اور معتصم تخت نشین ہوا۔ اس نے امام محمد تقی علیہ السلام کے خلاف الزام تراشیاں کر کے عبدالملک زیات کو ام الفضل اور امام کو بغداد بھیجنے کا حکم لکھا۔ بغداد میں امام کی تشریف آوری سے پھر نئی چھل پہل شروع ہو گئی (رسول و اہل بیت رسول، ص ۸۲؛ مجموعۂ زندگانی چہار دہ معصوم ج ۲، ص ۵۴۰)۔ کہا جاتا ہے کہ امام نے زہر خورانی سے ۲۹ ذی قعدہ یا ۱۰ رجب ۲۲۰ھ کو سفر آخرت کیا اور بغداد میں اپنے جد بزرگوار امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے پہلو میں محو خواب ہوئے۔ آج کل اس مزار کو کاظمین اور "الجوادین" کہا جاتا ہے [رک بہ آں]۔

امام محمد تقیؑ حامل علوم انبیاء و اوصیا، وارث اخلاق و صفات رسولؐ و ائمہ تھے، فقرا و مساکین سے بے حد محبت تھی۔ رات کو یتیموں اور بیواؤں کے گھروں پر آزوقہ پہنچاتے؛ سائلوں کو ان کی طلب سے زیادہ دیتے؛ نماز و روزہ و حج ان کا پسندیدہ عمل تھا، کبھی زمین پر کبھی کرسی پر تشریف فرما ہوتے؛ ہر ایک سے یوں ملتے تھے کہ وہ گرویدہ ہو جاتا تھا؛ لہجہ میں شیرینی، تحریر میں پاکیزگی تھی۔ مسئلوں اور خطوط کے جواب خوشی خوشی دیتے تھے۔ صاف و سفید، سادہ لباس اور کبھی قیمتی لباس زیب تن فرماتے تھے، غسل فرماتے اور حمام جانے کے پابند تھے۔ لوگوں نے انہیں جسم اقدس پر مہندی ملتے بھی دیکھا ہے (بحار الانوار و اعیان الشیعہ)۔ انگشتری مبارک پر "نعم القادر اللہ" نقش تھا۔ متعدد غلام اور کنیزیں تھیں؛ انہیں آزاد کر کے بہت خوش ہوتے تھے۔ آزاد کردہ غلاموں میں بعض حضرات ان کے دامن دولت سے ہمیشہ وابستہ اور خدمت گزار رہے؛ ان میں حسین بن سعید، احمد بن نصر بزنطی، احمد بن محمد خالد برقی کے نام مشہور ہیں (رسول و اہل بیت رسول ص ۹۶)۔

امام علیہ السلام کی اولاد میں دو فرزند باقی رہے۔ ان میں سے کوئی اولاد ام الفضل سے نہیں ہے۔

مآخذ: (۱) ابن خلکان: وفیات الاعیان، مطبوعہ قاہرہ؛ (۲) عبید اللہ امرتسری: ارجح المطالب، مطبوعہ

لاہور ؛ (۳) علی نقی : نوید امام ، مطبوعہ لاہور ؛ (۴) محمد شریف : ترجمہ عیون المعجزات ، مطبوعہ ملتان ؛ (۵) ابن واضح الیعقوبی : تاریخ ، مطبوعہ بیروت ، لبنان ؛ (۶) المسعودی : اثبات الوصیة ، نجف ۱۳۷۴ھ ؛ (۷) وہی مصنف : مروج الذہب ، ج ۴ ، قاہرہ ۱۳۶۷ھ ؛ (۸) ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم : دلائل الامامة ، مطبوعة نجف ۱۳۶۹ھ ؛ (۹) الشیخ المفید : کتاب الارشاد ، طہران ۱۳۷۷ھ ؛ (۱۰) ابو جعفر محمد بن الفتال : روضة الواعظین ، قم ۱۳۷۷ھ ؛ (۱۱) محمد بن علی ابن شہر آشوب : مناقب آل ابی طالب ، بمبئی ۱۳۱۳ھ ؛ (۱۲) حسین بن علی بن حسین الحرانی : تحف العقول عن آل الرسولؐ ، طہران ۱۳۷۶ھ ؛ (۱۳) ابو جعفر محمد بن حسن الطوسی : کتاب الرجال ، نجف ۱۳۸۱ھ ؛ (۱۴) ابو جعفر محمد بن یعقوب الکلینی : الاصول من الکافی ، طہران ؛ (۱۵) محسن الامین العاملی : اعیان الشیعہ ، الجزء الرابع، القسم الثانی ، بیروت ۱۹۲۰ھ ؛ (۱۶) محمد باقر مجلسی : بحارالانوار ، جلد ۱۲ ؛ (۱۷) وہی مصنف (اردو ترجمہ عبدالحسین) : جلاء العیون ، مطبوعہ لکھنو ؛ (۱۸) علی بن الحسین الہاشمی : المطالب المہمة ، نجف ؛ (۱۹) شیخ عباس قمی : منتہی الآمال ، طہران ۱۳۸۰ھ ؛ (۲۰) شیخ سلیمان حنفی : ینابیع المودة، بمبئی ۱۳۱۱ ؛ (۲۱) محمد ہاشم خراسانی : منتخب التواریخ ، طہران ۱۳۷۸ھ ؛ (۲۲) محمد بن طلحہ القرشی : مطالب السؤول ، لکھنو ۱۳۰۲ھ ؛ (۲۳) محمد علی شاہ عبدالعظیمی : مختصر الکلام فی وفیات النبی والائمہ ، نجف ۱۳۳۰ھ ؛ (۲۴) شمس الدین محمد بن مکی : الدرة الباہرة من الاصداف الطاہرة ، نجف ۱۳۸۸ھ ؛ (۲۵) سید ہاشم البحرانی : الانصاف فی النص علی ائمة الاثنی عشر ، قم ۱۳۸۶ھ ؛ (۲۶) سید محمد ہارون زنگی پوری : نوادر الادب من سادة العجم والعرب ، لکھنو ؛ (۲۷) عماد الدین حسین اصفہانی : مجموعۂ زندگانی چہاردہ معصوم ، ج ۲ ، طہران ۱۳۳۱ھ شمسی ؛ (۲۸) ابو منصور احمد الطبرسی : کتاب الاحتجاج ، نجف ۱۳۵۰ھ ؛ (۲۹) محمد عباس شروانی : تاریخ آل امجاد ، دہلی ۱۲۹۱ھ ؛ (۳۰) مظفر حسین : ترجمۂ اردو تذکرة الخواص لسبط ابن جوزی ، لاہور ۱۹۶۸ء ؛ (۳۱) علی حیدر : تاریخ ائمہ ، کھجوا ۱۳۵۶ھ ؛ (۳۲) مرتضی حسین فاضل : رسول و اہل بیت رسول ، ج ۳ ، کراچی ۱۹۶۷ء ؛ (۳۳) عبدالرزاق المقرم : وفاة الامام الجواد ، نجف ۱۳۷۱ھ ؛ (۳۴) سید اولاد حیدر فوق : تحفة المتقین، دہلی ۱۹۱۶ء۔

(مرتضٰی حسین فاضل)

محمد بن عمر : رکّ بہ ابن القوطیہ۔ *

محمد بن عمار : رکّ بہ ابن عمار۔ *

محمد بن عیسٰی : رکّ بہ عیساویہ۔ *

محمد بن فرامرز : رکّ بہ خسرو ملا۔ *

⊛ **محمد بن القاسم الثقفی** : محمد بن القاسم بن محمد بن الحکم بن ابی عقیل (البلاذری ، ص ۴۳۶ ؛ [نیز دیکھیے جمہرة انساب العرب ، ص ۲۶۷]) ۔ عرب کے مشہور قبیلہ بنو ثقیف کے سربرآوردہ خاندان آل ابی عقیل کا ایک [نامور قائد اور فاتح] ۔ اس کے والد کا نام القاسم اور والدہ کا نام حبیبة العظمٰی تھا ۔ اس کی ولادت تقریباً ۷۵ھ میں غالباً شہر طائف میں ہوئی ۔ اس کے والد قاسم حجاج بن یوسف کے سگے چچا زاد بھائی تھے ؛ (لہذا حجاج رشتے میں محمد کا چچا تھا) ؛ چنانچہ جب حجاج (بعد از سنہ ۷۵ھ) عراق کا حاکم اعلیٰ ہوا ، تو اس نے قاسم کو بصرے کا عامل مقرر کردیا۔ اس وقت بصرہ ایک بڑا علمی، ثقافتی اور عسکری مرکز تھا ۔ محمد بن قاسم نے غالباً بصرے ہی میں تعلیم پائی، جہاں اس کا باپ والی کے عہدے پر فائز تھا۔ بچپن ہی میں محمد بن قاسم اپنی ذہانت کے علاوہ طبعاً ایک لطیف ذوق کا مالک تھا ؛ چنانچہ اسے موسم بہار کے ایک خوشبو دار پودے البہار سے خاص شغف تھا اور

اسی وجہ سے اس کی کنیت ابو البہار ہو گئی [تاج العروس ، بذیل مادہ] ۔ چچ نامہ میں اس کا لقب عماد الدین محض فارسی مترجم علی الکوفی کی خوش اعتقادی کا نتیجہ ہے (چچنامہ ، ص ۹۳ تا ۹۴) .

حجاج کو محمد بن قاسم سے خاص محبت تھی۔ اس نے اپنی بہن زینب کو محمد بن قاسم یا ایوب بن حکم سے شادی کی ترغیب دی ، مگر (غالباً عمر کی مناسبت سے) زینب نے ایوب سے شادی کر لی ۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم کی شادی بنو تمیم کے قبیلۂ سعد بن زید میں ہوئی ۔ شاعر رؤبۃ بن العجاج نے اپنے رائیہ ارجوزے میں اس قبیلے کو محمد بن قاسم کے "آباء و اجداد کی ننھیال" بتایا ہے [چچ نامہ (ص ۲) ؛ تاریخ فرشتہ (۱ : ۶۰۴) اور طبقات اکبری (ص ۶۳۲) میں محمد بن قاسم کو حجاج کا داماد قرار دیا گیا ہے] ، مگر بقول ابو محمد (ابن السیرافی) رؤبۃ نے اپنے دوسرے ارجوزے سینیہ میں اس قبیلے کو خود محمد بن قاسم کے بیٹے قاسم ہی کی (ننھیال) قرار دیا ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم کی شادی قبیلہ سعد بن زید میں ہوئی تھی۔ لہذا چچنامہ میں حجاج کی لڑکی یا راجا داہر کی بیوی لاڈی سے محمد بن قاسم کی شادی کے بیانات محض افسانہ ہیں [زوجۂ داہر کسی اور لڑائی میں قتل ہوئی (تاریخ فرشتہ، ص ۶۰۷، س ۲ از آخر) ؛ ابن الاثیر کا بیان ہے کہ وہ ستی ہو کر مر گئی (کتاب مذکور، ص ۲۵۸ ، س ۲۰) ؛ نیز دیکھیے طبقات اکبری میں (ص ۶۳۳ ببعد) جہاں عورتوں کے ستی ہونے کا ذکر ہے ، اس لیے چچنامہ کا یہ بیان درست نہیں کہ لاڈی محمد بن قاسم کی ام ولد (ملک یمین) تھی (چچنامہ ، ص ۱۸۵ ، نیز ص ۱۸۶ ، س ۴)۔ حجاج کی دختر سے محمد بن قاسم کی شادی کا قصہ کتاب مذکور میں (ص ۱۹۰ پر) مذکور ہے، جو درست نہیں۔ مقالہ نگار نے محمد بن قاسم کی شادی قبیلۂ سعد بن زید میں جن قرائن پر مبنی ٹھیرائی ہے وہ قابل اعتماد ہیں ، اس لیے لاڈی اور دختر حجاج سے اس کی شادی کو محض افسانہ ہی کہا جا سکتا ہے ، بالخصوص جب کہ ثقہ لوگ اس کا ذکر نہیں کرتے] .

محمد بن قاسم کی اولاد میں سے صرف دو فرزند ہی معلوم اور مشہور ہیں: (۱) عمرو بن محمد، جو نہایت ہوشیار اور بہادر سپہ سالار تھا اور جس نے سندھ کے حاکم الحکم بن عوانۃ الکلبی کے عہد (۱۱۰ تا ۱۲۱ھ) میں کچھ اور گجرات کی طرف نمایاں فتوحات حاصل کیں اور ان فتوحات کی یادگار میں سندھ کے پایۂ تخت المنصورہ کی بنیاد ڈالی [المنصورہ کا ذکر ابن الاثیر (۴ : ۲۵۸) نے کیا ہے ، لیکن عمرو کو اس کا بانی نہیں کہا گیا ہے (دیکھیے معجم البلدان، ص ۶۶۳)]۔ الحکم کے بعد عمرو سندھ کا حاکم مقرر ہوا اور تقریباً ساڑھے چار سال (۱۲۱ تا ۱۲۶ھ) تک حکمران رہا ، تا آنکہ ماہ رجب (؟) ۱۲۶ھ (مئی ؟ ۷۴۴ء) میں المنصورہ میں شہید ہوا ؛ محمد بن قاسم کا دوسرا بیٹا قاسم تھا جو خلیفہ ہشام کے عہد (۷۲۴ تا ۷۴۳ء) میں تقریباً پانچ سال اور کچھ مہینے تک بصرے کا حاکم رہا ۔ یہ شاعر رؤبۃ کا خاص ممدوح تھا .

محمد بن قاسم کی شہرت اور عظمت اس کے عسکری اور انتظامی کارناموں کی وجہ سے ہے، جو اس نے بالکل چھوٹی عمر میں انجام دیے ۔ تقریباً ۹۰-۹۱ھ میں جب کہ اس کی عمر ۱۵ برس کی تھی ، حجاج نے اسے فارس میں کرد قبائل کی سرکوبی کے لیے ایک فوجی مہم کا قائد مقرر کیا

اور محمد نے ان قبائل کی طاقت کو توڑ کر انہیں مطیع کر دیا۔

اس کے علاوہ فارس کے انتظامی امور کی تکمیل کے لیے شہر شیراز کی بنیاد ڈالی اور اسے فارس کا پایۂ تخت بنایا۔ سابور اور جرجان کی طرف مزید فتوحات حاصل کیں اور آخر میں رے [= رَیّ] پر حملے کی تیاریاں کر چکا تھا کہ حجاج نے محمد کو سندھ کی فتح کے لیے نامزد کیا۔ اس وقت محمد کی عمر ۱۷ برس کی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ فارس میں صرف دو سال کے قلیل عرصے میں محمد بن قاسم نے یہ سارے کارنامے انجام دیے۔

۹۲ھ کے نصف آخر میں محمد بن قاسم شیراز سے فتح سندھ کے لیے روانہ ہوا اور مکران [اور ارمائیل] فتح کرتے ہوئے دیُبل کی بندرگاہ کو فتح کیا۔ اس کے بعد دریاے سندھ [مہران] کے دائیں کنارے نیرون [بقول البلاذری بیرون]، کوٹ سیہون اور بدُھیہ [نیز بودھیہ] کے علاقے فتح کر کے اپنی فنی مہارت اور حکمت عملی سے کشتیوں کا پل باندھ کر بائیں سندھ کے مثلث دھانے میں سے دریاے سندھ کو پار کیا اور ۱۰ رمضان ۹۳ھ/ جون ۷۱۲ء کو راوڑ [بقول البلاذری الرور (روھڑی)] کے قلعے کے نزدیک سندھ کے راجا داہر کے لشکر کو شکست دی اور راجا داہر مارا گیا۔ محمد بن قاسم اب آگے بڑھا اور دریاے سندھ کے بائیں جانب کے سارے قلعے بہرور، دھلیلہ، برھمنا باد اور آخر میں پای تخت ارور فتح کر لیے۔ پھر آگے بڑھ کر اوچ اور ملتان کے علاقے فتح کیے۔ [نیز کشمور] تک اپنی سیاسی حدود کو بڑھا لیا۔ وہاں سے ملتان پہنچ کر راجپوتانے میں بیلمان (بھنمل ؟) اور کاٹھیا واڑ میں سُرست (سوراشترا) پر فوجیں بھیجیں۔ وہاں کے حکمرانوں نے اطاعت قبول کر کے صلح کے معاہدے کر لیے۔ خود محمد بن قاسم نے گجرات کے پایۂ تخت کیرج (کیرا، نزد احمد آباد) پر لشکر کشی کی اور راجا شکست کھا کر بھاگ گیا۔ اب محمد بن قاسم نے شمالی ہندوستان کی طرف توجہ کی اور قنوج کے راجا کو اطاعت اور صلح کا پیغام بھیجا، مگر اس نے انکار کیا، لہذا محمد بن قاسم قنوج پر حملے کی تیاریاں مکمل کر کے روانہ ہوا اور شہر اودھاپور (؟) میں پہنچا تھا کہ دارالخلافۃ سے اس کی معزولی کا حکمنامہ پہنچا۔ سندھ کے نئے حاکم یزید بن ابی کَبشۃ السُکسکی نے محمد کو گرفتار کر کے واپس عراق بھیج دیا۔ [ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ سلیمان نے یزید بن ابی کبشہ کو سندھ کا حاکم مقرر کیا اور اس نے محمد کو گرفتار کر کے عراق روانہ کیا، لیکن خلیفہ کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی صالح بن عبدالرحمٰن نے، جو خارجی تھا اسے واسط میں قید کر لیا، کیونکہ صالح کے بھائی کو حجاج نے قتل کیا تھا، جس کا انتقام اس نے محمد بن قاسم سے لیا اور اذیت و عذاب پہنچا کر اسے قتل کر دیا (الکامل، ۴ : ۲۸۲، ص ۴۰، از آخر و بیعد؛ البلاذری، ص ۴۴۰، س آخر بیعد)]۔

محمد بن قاسم کی معزولی اور گرفتاری کا سبب یہ تھا کہ خلیفہ ولید نے اپنے بھائی سلیمان کو خلافت سے محروم کرنے کے لیے اپنے بیٹے عبدالعزیز کے لیے بیعت لینا شروع کی تھی۔ حجاج نے اس سازش میں ولید کی پوری حمایت کی اور خود محمد بن قاسم کو بھی لکھا کہ سلیمان کی بیعت ترک کر دی جائے، مگر یہ سیاسی سازش کامیاب نہ ہوئی، کیونکہ حجاج رمضان ۹۵ھ میں مر گیا اور اس کے بعد خلیفہ ولید بن عبدالملک بھی جُمادی الآخرۃ ۹۶ھ میں فوت ہو گیا۔ اب سلیمان نے ولید کے تمام حامیوں سے انتقام لینے کی ٹھان لی اور حجاج کے بدلے محمد بن قاسم کو ولید کی طرفداری

کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ چنانچہ اسے معزول کر کے گرفتار کر لیا گیا۔ چچنامہ میں محمد بن قاسم کی گرفتاری اور موت کا بیان محض ایک افسانہ ہے جس کی تاریخ سے کوئی تصدیق نہیں ہوتی.

محمد بن قاسم اپنے عدل و انصاف اور رواداری کی وجہ سے سندھ میں بہت مقبول ہو چکا تھا، لہٰذا جب اسے گرفتار کر کے واپس بھیجا گیا تو یہاں کے لوگ اس صدمے کی وجہ سے رونے لگے اور شہر کیرج (کیرا) میں اس کی مورتیاں بنائی گئیں [دیکھیے البلاذری: فتوح البلدان، ص ۴۴۰]. محمد بن قاسم کو نئی حکومت کی اس غیردانشمندانہ روش پر افسوس ہوا اور اس نے شاعر العرجی کا یہ شعر مثال کے طور پر پڑھا:

اَضَاعُونِی وَ اَیَّ فَتًی اَضَاعُوا
لِیَومِ کَرِیْہَۃٍ وَّ سِدَادِ ثَغْرِ

["مجھے یہ لوگ کھو بیٹھے اور کیسے بڑے جوانمرد کو کھو بیٹھے، جو جنگ کے دن اور سرحد کی حفاظت کے لیے کام آیا کرتا تھا"].

محمد بن قاسم کو عراق کے شہر واسط میں وہاں کے عامل صالح بن عبدالرحمن کے قید خانے میں بند کر دیا گیا۔ صالح کو حکم تھا کہ وہ حجاج کے رشتہ داروں کو اذیتیں دے کر مار ڈالے؛ چنانچہ صالح نے عبدالملک بن المہلب کو محمد بن قاسم اور دوسرے قیدیوں پر سختیاں کر کے مار ڈالنے پر مقرر کیا۔ محمد بن قاسم اسی ہولناک قید خانے میں وفات پا گیا۔ یہ ۹۶ھ/۷۱۵ء کا واقعہ ہے.

محمد بن قاسم کے حالات اور کارناموں کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ فطری طور پر ان تمام صفات سے متصف تھا جو ایک زعیم، قائد اور سردار میں ہونی چاہییں۔ وہ ایک ہوشیار سپہ سالار، کامیاب سیاستدان اور اعلیٰ درجے کا منتظم حکمران تھا۔ ذاتی طور پر ایک مخلص دوست، خوش مزاج انسان اور بلند پایے کا شاعر تھا۔ بقول المرزبانی کان من رجال الدھر، یعنی اکابر زمانہ میں سے تھا.

مآخذ: (۱) فتح نامہ (چچنامہ)؛ (۲) ابن حزم: جمهرة انساب العرب، [ص ۲۶۷، ۲۶۸]؛ (۳) تاج العروس، مادہ ب م ر؛ (۴) الاغانی؛ (۵) رؤبة بن العجاج: دیوان؛ (۶) التبریزی: کتاب تہذیب الالفاظ؛ (۷) ابن قتیبہ: عیون الاخبار؛ (۸) الاصطخری: کتاب المسالک والممالک، صرف سندھ کے شہروں کے نام؛ (۹) ابن حوقل: کتاب المسالک والممالک؛ (۱۰) یاقوت: معجم البلدان؛ (۱۱) القلقشندی: صبح الاعشٰی؛ (۱۲) نبی بخش خان بلوچ: محمد بن قاسم کا خاندان اور اس کی شخصیت، در *Islamic Culture*، اکتوبر ۱۹۵۳ء، حیدرآباد دکن؛ (۱۳) البلاذری: فتوح البلدان؛ (۱۴) ابن الاثیر: الکامل فی التاریخ؛ (۱۵) الطبری: تاریخ الرسل والملوک؛ (۱۶) المرزبانی: معجم الشعراء؛ (۱۷) فرشتہ: تاریخ، مقالہ ہشتم، ص ۳۰۶؛ (۱۸) نظام الدین احمد ہروی: طبقات اکبری، ص ۶۳۳، ۶۳۴، لکھنؤ ۱۸۷۵ء؛ (۱۹) *Gazetteer of the Province of Sind*، ۱۸۷۵ء، ص ۲۳، ۲۵؛ (۲۰) *Imperial Gazetteer of India*، ۲: ۳۵۱؛ ۲۱: ۳۹۵؛ (۲۱) *Cambridge History of India*، جلد ۳، باب اول؛ (۲۲) ابو ظفر ندوی: تاریخ سندھ، اعظم گڑھ؛ (۲۳) اعجاز الحق قدوسی: تاریخ سندھ، لاہور ۱۹۷۱ء].

(نبی بخش خان بلوچ [و ادارہ])

* **محمد بن القاسم**: رک بہ (۱) ابو العیناء؛ (۲) الانباری.

* **محمد بن محمد**: رک بہ (۱) ابوعلی؛ (۲) ابو الوفاء؛ (۳) الغزالی؛ (۴) ابن عاصم؛ (۵) ابن بطوطہ؛ (۶) ابن جبیر؛ (۷) ابن الہباریہ؛ (۸) ابن نباتہ؛ (۹) عماد الدین.

* **محمد بن محمود**: ابو شجاع غیاث الدنیا

والدین، ایک سلجوق سلطان (۵۴۷ھ/۱۱۵۳ء تا ۵۵۴ھ/۱۱۵۹ء)، جو ۵۲۲ھ/۱۱۲۸ء میں پیدا ہوا۔ اس کے بھائی ملک شاہ کی طرح اسے بھی اتابک بُزبہ نے تعلیم دی اور اس نے ان دونوں کو اپنے چچا مسعود کے خلاف تخت کا دعویدار بنا کر کھڑا کیا۔ جب ۵۴۲ھ/۱۱۴۷-۱۱۴۸ء میں بُزبہ ایک خونریز جنگ میں قید ہو کر قتل کر دیا گیا تو مسعود نے اپنے بھتیجے محمد کو اپنا لیا اور اس کی شادی اپنی بیٹی سے کر دی۔ غالباً اس کا یہ خیال تھا کہ وہ ملک شاہ کی بجائے محمد کو اپنا وارث بنائے جیسا کہ ابن الاثیر اور دوسرے مصنفین کا قول ہے، کیونکہ اس کی موت کے بعد محمد واقعی تخت نشین ہو گیا۔ اس وقت محمد کہیں باہر گیا ہوا تھا، لیکن تین ماہ کے اندر اندر طاقتور امیر خاص بیگ نے اس کے ہمذان میں واپس آنے پر اسے سلطان تسلیم کر لیا، کیونکہ ملک شاہ بالکل نااہل ثابت ہوا تھا۔ اس لئے سلطان نے اپنی شکر گزاری کا حق یوں ادا کیا کہ خاص بیگ کو غداری سے قتل کرا دیا اور اس کے بریدہ سر کو اس امید میں مراغہ اور آذربیجان کے امرا کے پاس بھجوا دیا کہ وہ اس کے طرفدار ہو جائیں گے، لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ یہ لوگ اگرچہ خاص بیگ سے نفرت کرتے تھے: تاہم انہوں نے اس ظالمانہ فعل سے خوف زدہ ہو کر اسے ترجیح دی کہ وہ محمد کے چچا سلیمان کی بیعت کر لیں جو سالہا سال کی قید کے بعد مسعود کی موت پر قید خانے سے نکل بھاگا تھا۔ اس پر محمد اصفہان کی طرف فرار ہو گیا۔ سلیمان چونکہ بلا کا شرابی تھا، لہذا وہ ہمذان میں اپنے قدم نہ جما سکا اور جب وہ وہاں سے چلا گیا تو محمد لوٹ آیا اور امرا نے اسے اپنا سلطان تسلیم کر لیا۔ اس دوران میں سلیمان بھاگ کر لحف جا پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے خلیفہ المکتفی لامراللہ سے روابط قائم کر لیے۔ المکتفی اپنی جگہ کسی حد تک کامیابی سے یہ کوشش کر رہا تھا کہ وہ کسی طرح سلجوقیوں سے بے نیاز ہو جائے۔ اس نے سلیمان کو بغداد آنے کی اجازت دے دی (۵۵۰ھ/۱۱۵۵ء) تاکہ وہ اسے محمد کے خلاف اپنا آلۂ کار بنا سکے۔ اس نے ملک شاہ کو بھی راضی کر کے ایک فوج جمع کرنے پر آمادہ کر لیا؛ تاہم اس فوج کو محمد نے امیر الموصل مودود کی مدد سے منتشر کر دیا اور سلیمان کو دوبارہ قید کر لیا۔ محمد اب اپنے آپ کو اتنا مضبوط سمجھنے لگا تھا کہ اس نے خود خلیفہ پر بھی حملہ کر کے بغداد کا محاصرہ کر لیا۔ عماد الدین، جو اس وقت شہر میں موجود تھا اس محاصرے کا مفصل حال لکھتا ہے (*Rec. Hist.* Crois.، ۲: ۲۴۶ ببعد)۔ محمد کو جب یہ خبر ملی کہ ایلدگز نے ملک شاہ و ارسلان کی ہمراہی میں ہمذان پر قبضہ کر لیا ہے (۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء) تو اس نے بہت جلد محاصرہ اٹھا لیا۔ جس وقت سلطان وہاں پہنچا تو وہ جا چکے تھے، لیکن وہ اپنی وفات یعنی ۵۵۴ھ/۱۱۵۹ء تک ان سے لڑتا بھڑتا ہی رہا۔

مآخذ: دیکھیے مادہ سلجوق۔

(M. TH. HOUTSMA)

* **محمد بن مروان**: بنو امیہ کا ایک حاکم۔ ۶۵ھ/۶۸۴-۶۸۵ء میں اس کے باپ خلیفہ مروان اول نے اسے عراق بھیجا اور جب ۷۲ھ/۶۹۱ء میں اس کے بھائی خلیفہ عبدالملک نے دیر جاثلیق کی جنگ میں مصعب ابن الزبیر کو شکست دی جو شام کی ہراول فوج کا قائد تھا۔ اس سے اگلے سال عبدالملک نے عراق اور ارمینیا کی حکومت اس کے سپرد کر دی جس کے ساتھ بوزنطی جنگوں کی سپہ سالاری بھی شامل تھی۔ آب و ہوا کے حالات کے مطابق عرب مہمات ہمیشہ موسم گرما میں شروع

ہوا کرتی تھیں۔ ۷۳ھ/۶۹۲ء میں شہنشاہ جسٹینین Justinian ثانی کو سبسطہ یا سبستو پولیس Sebasto Polis علاقہ کیلیکیا (Cilicia) میں شکست دی گئی۔ ۷۵ھ/۶۹۴ء میں محمد نے پھر بوزنطیوں کے خلاف معرکہ آرائی شروع کی اور ان کے خلاف مرعش کی جنگ میں کامیاب ہوا، اور اس سے اگلے سال اس نے ارمینیہ پر حملہ کیا۔ ۸۲ھ/۷۰۱ء میں اسے اپنے بھتیجے عبداللہ بن عبدالملک کے ساتھ الحجاج کے پاس بھیج دیا گیا تاکہ وہ باغی عبدالرحمن بن محمد بن الاشعث کے خلاف اس کی مدد کرے۔ خلیفہ کی دیرالجماجم کی لڑائی سے پہلے عراقیوں سے گفت و شنید میں محمد اور عبداللہ ہی نے خلیفہ کی طرف سے نمائندگی کی خدمات انجام دیں۔ اسی سال محمد نے ارمینیا کے خلاف ایک فوج کی قیادت کی اور پھر ۸۴ھ/۷۰۳ء اور ۸۵ھ/۷۰۴ء میں بھی یہی فرائض انجام دیے۔ الولید کی تخت نشینی (شوال ۸۶ھ/اکتوبر ۷۰۵ء) کے بعد محمد بتدریج پس پشت چلا گیا اور خلیفہ کا بھائی مسلمہ ہی حقیقت میں سپہ سالاری کے فرائض انجام دینے لگا، لیکن محمد کچھ عرصے تک حاکم کے عہدے پر بدستور مامور رہا، تا آنکہ ۹۱ھ/۷۰۹-۷۱۰ء میں یہاں بھی مسلمہ کو اس کی جگہ دے دی گئی۔ محمد نے ۱۰۱ھ/۷۱۹-۷۲۰ء میں وفات پائی۔

مآخذ: (۱) ابن سعد، ۵: ۱۷۶؛ (۲) الیعقوبی، طبع Houtsma، ۲: ۳۲۴ ببعد، ۳۲۹، ۳۵۰؛ (۳) البلاذری، طبع de Goeje، ص ۱۸۸، ۲۰۰، ۲۰۵، ۳۳۲؛ (۴) الطبری، ۲: ۵۹۴، ۸۰۳ تا ۸۰۸، ۸۵۳، ۸۶۳، ۱۰۴۳، ۱۰۵۰ تا ۱۰۹۹، ۱۸۵۰؛ ۳: ۵۱؛ (۵) المسعودی: مروج، طبع پیرس، ۵: ۲۲۳ ببعد؛ ۶: ۴۷؛ (۶) ابن الاثیر، طبع Tornberg، ۴: ۲۹۳ تا ۲۹۷، ۲۹۸ ببعد، ۳۰۳، ۳۱۷، ۳۲۰ تا ۳۲۸، ۳۴۷ ببعد، ۳۸۲، ۳۸۵، ۳۹۹، ۴۱۱؛ ۵: ۹، ۵۲، ۳۲۸؛ (۷) Weil: Gesch. d. Chalifen، ۱: ۳۰۶ ببعد، ۳۵۵، ۳۶۸ ببعد، ۴۷۲؛ (۸) Brooks: *The Arabs in Asia Minor* (641-750)، در *The Journal of Hellenic Studies*، ۱۸: ۱۸۲ ببعد؛ (۹) Wellhausen: *Die Kampfe der Araber mit den Romaern*، در *N G W Gottingen*، ۱۹۰۱ء، ص ۴۲۰ ببعد۔

(K. V. ZETTERSTEEN)

محمد بن المستنیر: رَک بہ قطرب۔ *

محمد بن المظفر: رَک بہ مظفر۔ *

محمد بن مکرم: رَک بہ ابن منظور۔ ⊗

محمد بن ملک شاہ: ابو شجاع غیاث الدنیا والدین قسیم امیر المومنین، ایک سلجوق سلطان (۴۹۸ تا ۵۱۱ھ/۱۱۰۵ تا ۱۱۱۸ء) جو ۱۸ شعبان ۴۷۴ھ/۲۳ جنوری ۱۰۸۲ء کو پیدا ہوا۔ وہ ایک کنیز کے بطن سے تھا جو سنجر کی ماں بھی تھی اور اس کا ترکی نام تپر رکھا گیا۔ اپنے باپ کی موت کے بعد وہ پہلے ترکان خاتون کے پاس رہا، لیکن پھر وہ اپنے بھائی برکیاروق کے پاس چلا گیا جس نے اسے گنجہ کا شہر عطا کر دیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اران پر بھی قبضہ کر لیا اور مؤید الملک بن نظام الملک کے بہکانے سے اس نے اپنے بھائی کا نام خطبے سے خارج کر دیا۔ اس سے بعد کے سالوں میں دونوں بھائی ایک دوسرے سے لڑتے بھڑتے رہے، کبھی کسی کو کامیابی ہوتی اور کبھی کسی کو، تا آنکہ ۴۹۳ھ/۱۱۰۰ء میں برکیاروق ممالک محروسہ کے مغربی صوبوں سے ہٹ کر اصفہان چلا گیا اور محمد کو یہیں چھوڑ گیا تاکہ وہ ان ممالک کے حاکموں سے اپنے آپ کو سلطان تسلیم کرا لے۔ برکیاروق اس کے بعد جلد ہی یعنی ۱۱۰۴ء کے آخر میں فوت ہو گیا۔ محمد پہلے بغداد کی طرف متوجہ ہوا، کیونکہ اسے یقین تھا کہ خلیفہ اس کی عقیدت مندی کو قبول کر لے گا،

اس لیے کہ وہ اس سے پہلے دونوں بھائیوں کو آداب دربار کے مطابق شرف حضوری بخش چکا تھا (دیکھیے تفصیلی حالات در ابن خلکان، بولاق ۱۲۹۹ھ، ۲ : ۳۳۳)۔ اس نے امیر ایاز کو جس نے پہلے ملک شاہ بن برکیاروق کے نام کا خطبہ پڑھوایا تھا، غداری سے قتل کرا دیا اور عرب بادشاہ صَدقہ کو اس کے پای تخت الحلہ میں یہ حکم دے کر واپس بھیج دیا کہ وہ بصرے میں اور اس کے نواح کے عرب قبائل میں امن و امان قائم کرے۔ اس کے بعد وہ جلد جلد کوچ کر کے اصفہان پہنچا جہاں باطنیہ فرقے نے برکیاروق کے پر آشوب دور حکومت میں بڑی کامیابیاں حاصل کر لی تھیں اور آس پاس کے کئی پہاڑی قلعوں پر قبضہ جما لیا تھا۔ ان کے ایک سردار ابن عَطّاش نے حملہ کر کے دِزکوہ یا شاہ دِز کے قلعے پر قبضہ کر لیا تھا جسے ملک شاہ نے تعمیر کرایا تھا۔ سلطان نے اپنا پہلا فرض یہ سمجھا کہ ان ملحدوں کو مطیع کرے اور اگر ممکن ہو سکے تو ان کی پوری بیخ کنی کر دی جائے۔ اس نے اپنی افواج کو اس قلعے کا محاصرہ کرنے کے لیے بھیجا اور جب اس پر قبضہ ہو گیا تو اسے منہدم کر کے زمین کے برابر کر دیا، اور جو باطنیہ وہاں گرفتار ہوئے انھیں بڑی بے رحمی سے قتل کرا دیا (۵۰۰ھ/۱۱۰۷ء؛ دیکھیے اس روداد کا متن جو اس نے خلیفہ کے وزیر کو تحریر کر کے بھیجی، یہ روداد القلانسی، طبع Amedroz، ص ۱۵۲ ببعد میں منقول ہے)۔ اس نے اپنے وزیر سعد الملک ابوالمحاسن الآبی کو اصفہان کے دروازے پر قتل کرانے میں ذرا دریغ نہ کیا: اس کے متعلق بقول انو شیروان غلط طور پر یہ شبہ کیا جاتا تھا کہ وہ باطنیہ فرقے سے تعلق رکھتا ہے (دیکھیے *Roc. Hist. Crois*، ۲ : ۹۱)۔

ابھی محمد اصفہان ہی میں تھا کہ امیر چاولی سقاو نے جو فارس اور خوزستان کے درمیانی علاقے میں حکومت کرتا تھا، اس کی اطاعت قبول کر لی۔ سلطان جو کئی بار امیر مودود کے ذریعے اسے مطیع بنانے کی ناکام کوشش کر چکا تھا، اس بات سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے الموصل کا شہر اسے عطا کر دیا جس کے امیر جکرمش نے صرف باامر مجبوری اس کی اطاعت قبول کر لی تھی اور وہاں حکومت کر رہا تھا۔ جکرمش ان احکام کی تعمیل کا کوئی ارادہ نہ رکھتا تھا، لیکن چاولی سے مقابلہ ہو جانے پر اسے گرفتار کر لیا گیا؛ تاہم چاولی اس شہر پر امیر کی حیثیت سے قبضہ نہ کر سکا، کیونکہ جکرمش کے حامیوں نے اس کے بیٹے زنگی کی تائید کی اور آق سنقر البرسقی حاکم بغداد صدقہ اور الروم کے سلجوق قلج ارسلان سے مدد کی درخواست کی۔ ان میں سے صرف سلجوق روم ان کی درخواست کے جواب میں ایک فوج لے کر الموصل میں آ گیا، جہاں اس نے خود سلطان کی حیثیت سے لوگوں سے حلف اطاعت لیا، لیکن اس کے بعد ہی ایک ناکام لڑائی کے بعد واپسی کے وقت وہ خابور دریا میں ڈوب کر مر گیا۔ چاولی کو اب اس شہر پر قبضہ کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی اور وہ آیندہ کے کام یعنی صلیبی سورماؤں کے خلاف جنگ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اگر ہم اس جنگ کے مختلف واقعات کا ذکر کرنے لگیں تو اپنے موضوع سے بہت دور چلے جائیں گے، اس لیے قارئین کو Weil : *Gesch. der. Chal*، ۳ : ۱۶۱ ببعد کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اپنی غیر حاضری کے دوران وہ ایک دفعہ پھر خلیفہ کی نگاہوں سے گر گیا جو اس عرصے میں بغداد میں واپس آ گیا تھا۔ اس نے اپنی افواج کو صدقہ پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا کیونکہ وہ اس سے بھی ناراض تھا۔

سلطان نے مودود کو الموصل میں بھیج دیا اور اسے وہی مرتبہ عطا کیا جو اس نے جاولی کو دیا تھا۔ امیر جاولی نے کچھ مدت کے بعد سلطان سے صلح کر لی اور وہ فارس کا اتابک مقرر ہوا جہاں اس نے سرکش عناصر کی بیخ کنی کرنے میں بڑی سرگرمی دکھائی (قب ابن الاثیر، طبع Tornberg، ۱۰ : ۳۶۶ ببعد)؛ تاہم باطنیوں نے جب تک وہ الموت کے قلعے پر قابض رہے، محمد کو چین سے نہ بیٹھنے دیا، لہٰذا ابو نصر احمد کو جو نظام الملک کا بیٹا تھا جو سعد الملک کے بعد سلطان کا وزیر ہو گیا تھا، حکم دیا گیا کہ وہ اس قلعے کو فتح کرے، لیکن جب اسے کامیابی نہ ہوئی تو اسے ۵۰۴ھ/۱۱۱۰ء میں موقوف کر دیا گیا۔ اس دوران میں سلطان سے یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ وہ صلیبی سورماؤں کے خلاف زیادہ زور و شور سے جنگ آزمائی کرے، چنانچہ وہ مغربی صوبوں کے حاکموں کو یہ ترغیب دینے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ متحد ہو کر عیسائیوں پر مودود کی قیادت میں جس کے ساتھ نوجوان شہزادہ مسعود بھی تھا، حملہ کر دیں۔ مودود کے قتل (۵۰۷ھ/۱۱۱۳ء) کے بعد آق سنقر البرسقی نے اس فوج کی قیادت سنبھالی اور اس کے بعد خود برسق نے، لیکن ترکی امرا کی باہمی چپقلش، صلیبیوں کی شجاعت اور شام کی پیچیدہ صورت حالات کے باعث کوئی فیصلہ کن کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس مہم کی تفصیلات کے لیے ہم قاری کو Weil : کتاب مذکور، ص ۴۹، ببعد اور صلیبیوں کے مؤرخین کی تصانیف کا حوالہ دیتے ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری سالوں میں سلطان نے امیر انوش تگین شیرگیر کو الموت کے باطنیوں کے خلاف بھیجا، لیکن وہ ۲۴ ذوالحجہ ۵۱۱ھ/۱۸ اپریل ۱۱۱۸ء کو قلعے کی فتح سے پہلے ہی فوت ہو گیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف ۳۷ برس کی تھی اور یہی وجہ ہے کہ Weil نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اس کی موت میں باطنیوں کا ہاتھ ضرور ہوگا، لیکن اس نظریہ کی تائید میں مشرقی تاریخوں میں کوئی شہادت نہیں ملتی۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو عملۂ خاص میں تھے، بالخصوص الحاجب الکبیر علی بار، اس معاملے میں بالکل بے گناہ معلوم نہیں ہوتے، کیونکہ انھوں نے اپنے متعلق شبہات کو رفع کرنے کی غرض سے سلطانہ گُہر خاتون اور مشہور شاعر الطغرائی کو مورد الزام ٹھہرایا کہ سلطان کی بیماری ان کے تعویذ گنڈاں کے اثر کا نتیجہ تھی۔ سلطانہ کو اندھا کر کے محمد کی موت کے دن ہی گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا۔ رہا کے Matthias نے اس کا جو سبب بیان کیا ہے (.Doc. Arm، ۱ : ۱۲۰) وہ غلط ہے۔ سلطان کا یہ کام قابل تحسین ہے کہ اس نے اپنے بھائی سنجر کی امداد سے جو خراسان اور ملحقہ ممالک میں حکومت کرتا تھا سلجوقی سلطنت کی شان و شوکت کو دوبارہ زندہ کر دیا جو ملک شاہ کی موت کے بعد زوال پذیر ہو چکی تھی، اور وہ اس لیے بھی ستائش کا مستحق ہے کہ اس نے سنی مذہب اور عباسی خلفا کا سرگرم حامی ہونے کی حیثیت میں کفار اور ملاحدہ کے خلاف بڑی سرگرمی سے جہاد کیا۔ بقول Rec. Hist. Crois، ۲ : ۱۱۸ وہ سلجوقیوں کا کامل ترین بادشاہ تھا اور ان کا سب سے بڑا "شتر نر" [فَحل]۔

مآخذ: مادہ سلجوق میں مذکور ہیں

(M. TH. HOUTSMA)

* **محمد بن موسی بن شاکر**: رکّ بہ موسی (بنو).

* **محمد بن الولید**: رکّ بہ ابن ابی زندقہ.

* **محمد بن ہانی**: رک بہ ابن ہانی.

* **محمد بن الہذیل** : رَکّ بہ ابو الہذیل.

* **محمد بن یاقوت** : ابو بکر ، بغداد کا ایک صاحب الشرطہ؛ محمد، جس کا باپ خلیفہ المقتدر کا صاحب الکبیر تھا ، ۳۰۸ھ/۹۲۰ء میں بغداد کا صاحب الشرطہ مقرر ہوا۔ اس زمانے میں دارالخلافے میں قیام امن کی جانب توجہ بہت کم تھی اور محافظ دستوں کی بدولت باقاعدہ طور پر خوف و ہراس کا دور دورہ تھا۔ پیادہ اور سوار فوج کے درمیان کچھ جھگڑا ہو جانے پر محمد بن یاقوت نے سواروں کی حمایت میں مداخلت کی : ان کے مخالفین کو قتل کر دیا گیا اور بعض کو شہر سے باہر نکال دیا گیا اور صرف حبشیوں کی کچھ تعداد، جس نے فوراً ہتھیار ڈال دیے، بچ گئی (محرم ۳۱۸ھ/فروری ۹۳۰ء) . چند ماہ بعد ان حبشیوں نے غدر کر کے زیادہ تنخواہ کا مطالبہ کیا ، لیکن محمد نے انہیں شہر سے باہر نکال دیا اور پھر امیر الامرا مؤنس [رکّ بآں] نے انہیں واسط کے قریب مکمل شکست دی۔ مؤنس اور محمد کے درمیان اختلاف ہونے کی وجہ سے انتشار میں مزید اضافہ ہو گیا۔ مؤنس کی انگیخت پر محمد کو جمادی الآخرہ ۳۱۹ھ/جون۔ جولائی ۹۳۱ء میں معزول کر دیا گیا ، لیکن اس سے بھی مؤنس کی تسلی نہ ہوئی، بلکہ اس نے مطالبہ کیا کہ اس کے حریف کو، جس سے اسے نفرت تھی، جلا وطن کر دیا جائے۔ پہلے تو خلیفہ نے اس کی درخواست کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ، لیکن جب مؤنس نے اس کے خلاف طاقت استعمال کرنے کی دھمکی دی تو اسے یہ ماننا پڑا۔ اس پر محمد سجستان چلا گیا (رجب ۳۱۹ھ/جولائی ۹۳۱ء)۔ اس کے بعد ہی خلیفہ کا مؤنس سے جھگڑا ہو گیا اور اس نے محمد کو واپس بلا لیا۔ محرم ۳۲۰ھ/جنوری ۹۳۲ء میں محمد بغداد واپس آ گیا۔ اس کے بعد خلیفہ نے ایک لشکر کے ہمراہ اسے تکریت کے علاقے میں المشوق کی جانب بھیجا ، لیکن جب مؤنس نے موصل کی طرف سے پیش قدمی کی تو خلیفہ کی فوجیں ، جو محمد اور سعید بن ہمدان کی سرکردگی میں تھیں ، دشمن کا مقابلہ کیے بغیر بغداد لوٹ آئیں۔ مؤنس کی فتح اور اسی سال ماہ شوال میں المقتدر کے قتل کے بعد (اکتوبر ۹۳۲ء) المقتدر کا بیٹا عبدالواحد ، محمد اور اپنے دوسرے حامیوں کے ساتھ المدائن کی طرف بھاگ گیا اور وہاں سے واسط چلا گیا۔ جب نئے خلیفہ القاہر کی افواج یَلْبَق کی قیادت میں وہاں پہنچیں تو عبدالواحد اور محمد دونوں بھاگ کر تُستر چلے گئے۔ محمد مغرور اور خود غرض ہونے کی وجہ سے لوگوں میں مقبول نہ تھا ، چنانچہ اس کے ساتھیوں میں سے سب نے یکے بعد دیگرے ہتھیار رکھ دیے اور آخر کار عبدالواحد نے بھی اطاعت قبول کر لی۔ محمد نے یَلْبق سے صلح کی گفت و شنید کی اور خلیفہ نے بھی اسے معاف کر دیا۔ وہ پھر بغداد واپس آ گیا اور اس نے القاہر کے دربار میں رسوخ پیدا کر لیا۔ جمادی الاولیٰ ۳۲۲ھ/ اپریل ۹۳۴ء میں الراضی کی تخت نشینی پر محمد تھوڑے ہی عرصے میں حقیقی معنوں میں حکمران بن گیا۔ خلیفہ نے اسے حاجب اعلیٰ مقرر کیا اور اس کے ساتھ ہی اسے سرعسکر بھی بنا دیا، حالانکہ وزیر ابن مُقلہ کی حیثیت ایک زیر دست کی سی رہ گئی۔ جب المقتدر کے عم زاد بھائی ہارون بن غریب نے ، جسے القاہر نے ماہ الکوفہ، الدینور اور ماسبذان کا حاکم مقرر کیا تھا، بغاوت کی، تو محمد کو ایک فوج کی کمان دے کر اس کے خلاف بھیجا گیا۔ لڑائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ محمد کو شکست ہوئی (جمادی الآخرہ ۳۲۲ھ/مئی ۹۳۴ء)، لیکن اس کے بعد ہارون اپنے گھوڑے پر سے گر پڑا اور اسے محمد کے ایک غلام نے قتل کر ڈالا۔ فوج کے قائد کے مرتے ہی ہارون کے حامیوں کو

تاب مقابلہ نہ رہی اور یہ قصہ ختم ہو گیا ؛ تاہم محمد اپنے اقتدار اور اپنی طاقت کو زیادہ عرصے تک برقرار نہ رکھ سکا ۔ ابن مُقلہ کے مشورے سے، جو اس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خائف تھا، الراضی نے اسے اور اس کے بھائی المظفّر اور کاتب ابو اسحاق القراریطی کو ۵ جمادی الاولی ۳۲۳ھ/۲، اپریل ۹۳۵ء کو گرفتار کر لیا ۔ محمد اسی سال قید خانے میں مر گیا ۔

مآخذ : (۱) العریب (طبع de Goeje)، ص ۱۳۵ ببعد ؛ (۲) ابن الاثیر (طبع Tornberg)، ۸ : ۱۶۰ ببعد ؛ (۳) ابن خلدون : العبر، ۳ : ۳۹۰ ببعد ؛ (۴) Weil : *Gesch. d. Chalifen*، ۲ : ۵۶۵ تا ۵۳۷، ۶۳۵ ببعد، ۶۵۲، ۶۵۶ تا ۶۵۸ ۔

(K. V. ZETTERSTEEN)

* **محمد بن یحیی** : رک بہ ابن باجہ ۔
* **محمد بن یزید** : رک بہ (۱) ابن ماجہ ؛ (۲) المبرّد ۔
* **محمد بن یوسف** : رک بہ ابو حیان ۔
* **محمد اول تا سوم** : رک بہ (بنو) معاویہ ۔
* **محمد اول (بہمنی)** : دکن کے بہمنی خاندان کا دوسرا بادشاہ، حسن علاء الدین بہمن شاہ کا سب سے بڑا بیٹا، جسے عام طور پر، لیکن غلطی سے حسن گنگو کہتے ہیں ۔ وہ ۷۶۰ھ/۲۱ فروری ۱۳۵۸ء کو اپنے باپ کی جگہ تخت نشین ہوا اور اس نے بڑی احتیاط سے اپنی سلطنت کے چاروں صوبوں کی حکومت کو منظم کیا اور فوج کے نظام کو درست کیا ۔ اس نے جو طلائی سکہ جاری کیا تھا، اسے ہندو ساہوکاروں اور صرافوں نے مستقل ہٹ دھرمی اور جسارت سے پگھلانا شروع کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس فرقے کا قتل عام شروع ہو گیا اور اس اقدام کی وجہ سے اس کی ورنگل اور وجیانگر کی ہندو ریاستوں سے جنگ چھڑ گئی ۔ اس نے ورنگل کے کانہیا کی مملکت پر تین دفعہ حملہ کیا، اس کے بیٹے ونایک دیو کو موت کے گھاٹ اتارا، اور اسے مجبور کیا کہ وہ بھاری تاوان ادا کرے اور گولکنڈہ کا شہر اور ضلع اس کے حوالے کر دے ۔ اس کامیابی کے بعد اس نے وجیانگر کے بکّہ اول کی اس طرح سے سخت توہین کی کہ اس نے چند نچنے والیوں کو اپنی ایک ہنڈی بکّہ کے خزانے کے نام پر لکھ کر دے دی ۔ بُکّہ نے رائچور دوآب پر حملہ کر کے مُدگل پر قبضہ کر لیا اور وہاں کی ساری قلعہ نشین فوج کو قتل کر دیا ۔ محمد نے اس پر چڑھائی کی اور تیزی کے ساتھ حملہ کر کے اسے شکست دی اور مُدگل پر دوبارہ قبضہ کر کے موسم برسات کے دوران وہاں قیام کیا ۔ ۱۳۶۷ء میں کوتھل کے مقام پر اس کی بکّہ سے پھر مڈبھیڑ ہوئی اور اس نے اسے دوبارہ شکست دے کر اس کی رعایا کا بے دریغ قتل عام کیا، جس میں چار لاکھ آدمی مارے گئے اور ان کے حوصلے پست ہو گئے ۔ بکّہ نے صلح کی درخواست کی اور اس نے اس ہنڈی کی رقم ادا کرنے کے علاوہ تاوان بھی ادا کیا ؛ اس کے عوض اسے یہ یقین دلا دیا گیا کہ آیندہ کی لڑائیوں میں غیر فوجی آبادی کو تہ تیغ نہیں کیا جائے گا ۔ گو اس معاہدے کی بعض اوقات خلاف ورزی بھی ہوئی، تاہم کسی حد تک ان دونوں ریاستوں کے درمیان نہ ختم ہونے والی لڑائیوں کے ہولناک مظاہروں میں کچھ کمی ضرور ہو گئی ۔ وجیانگر سے واپس آ کر اس نے ۱۳۶۷ء میں گلبرگہ کی جامع مسجد کی تکمیل کرائی اور پھر اپنے عم زاد بھائی بہرام خان مازندرانی کے خلاف متوجہ ہوا جس نے چند سال سے دولت آباد میں بغاوت کر رکھی تھی ۔ اس نے اس کی فوج کو شکست دی اور اس کے سرداروں کو گجرات کے علاقے میں بھگا دیا ۔ اس کا انتقال ۷۷۹ھ/۱۳۷۷ء میں

ہوا اس کی جگہ اس کا بڑا بیٹا مجاہد تخت نشین ہوا.

مآخذ : (۱) محمد قاسم فرشتہ : گلشن ابراہیمی، بمبئی ۱۸۳۲ء؛ (۲) منتخب اللباب، ج ۳ (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی *Bibl. Ind. Series*)؛ (۳) برہان مآثر (مخطوطات) اور ترجمہ از Major J. S. King (*The History of the Bahmani Dynasty*)؛ (۴) *An Arabic History of Gujarat*، طبع Sir. E. Denison Ross (*Indian Text Series*)؛ (۵) *The Cambridge History of India*، ج ۳، باب ۱۵.

(T. W. HAIG)

* **محمد دوم** : دکن کے بہمنی خاندان کا پانچواں بادشاہ، خاندان بہمنی کے بانی علاء الدین بہمن شاہ کے سب سے چھوٹے بیٹے محمود خان کا بیٹا، جو اپنے چچا داؤد شاہ کے قتل کے بعد ۷۸۰ھ/ ۲۰ مئی ۱۳۷۸ء کو تخت نشین ہوا۔ فرشتہ کا یہ بیان کہ اس بادشاہ کا نام محمود تھا، تمام یورپی مؤرخین کی غلط فہمی کا باعث ہوا ہے، لیکن اس بیان کی تردید کتبوں، سکوں پر کے سجعوں اور دوسرے مؤرخین کی تحریروں سے ہوتی ہے.

محمد ثانی امن پسند شخص تھا۔ اسے شعر و سخن اور ادبیات کا شغف تھا اور اس کا دور حکومت غیر ملکی جنگوں سے مامون رہا۔ اس نے حافظ شیرازی کو اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی اور یہ شاعر عظیم اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے شیراز سے روانہ بھی ہو گیا، لیکن خلیج فارس کے ایک طوفان کو دیکھ کر ایسا گھبرایا کہ وہ جہاز سے اتر کر شیراز واپس چلا آیا، جہاں سے اس نے اپنی معذوری کے اظہار میں محمود کو ایک غزل لکھ بھیجی، جو بہت مشہور ہے [اور جس کا مطلع ہے کہ

دمی با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد
بمی فروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد]

۱۳۸۷ء سے ۱۳۹۵ء تک دکن میں شدید قحط سالی رہی اور بادشاہ کی امدادی تجاویز میں یہ بھی شامل تھا کہ غلے کی درآمد پر کوئی محصول نہ لیا جائے، مدرسے کھولے جائیں جن میں سرکاری خرچ پر بچوں کی تعلیم اور ان کے طعام و قیام کا انتظام ہو۔ نیز اندھوں اور قرآن خوانوں کے لیے خاص وظائف مقرر کیے جائیں [اس طرح] ان مراعات سے ہندوستان کے مسلمانوں کو نفع پہنچا۔ ۲۰ اپریل ۱۳۹۷ء کو اس نے بعارضۂ بخار وفات پائی اور اس کی جگہ اس کا بڑا بیٹا غیاث الدین سریر آرائے سلطنت ہوا.

مآخذ : دیکھیے (۱) (ذیل مادہ) محمد اول؛ نیز (۲) J. A. S. B، ج ۷۳، حصہ اول ۱۹۰۴ء.

(T. W. HAIG)

* **محمد سوم لشکری** : دکن کے بہمنی بادشاہوں کا تیرھواں بادشاہ، ہمایوں شاہ کا چھوٹا بیٹا تھا اور نو سال کی عمر میں اپنے بڑے بھائی نظام شاہ کی جگہ ۸۶۸ھ/ ۳۰ جولائی ۱۴۶۳ء کو تخت پر بیٹھا۔ اس کا وزیر مشہور و معروف محمود گاوان ملک التّجار خواجہ جہاں تھا۔ ۱۴۶۷ء میں مالوہ پر جو حملہ کیا گیا وہ ناکام رہا، لیکن ۱۴۶۹ء اور ۱۴۷۰ء کے درمیان محمود گاوان نے جنوبی کوکن کو فتح کر لیا۔ ملک حسن بحری نظام الملک نے، جو برہمن نژاد تھا اور وجیانگر میں گرفتار ہوا تھا اور جس کی تعلیم و تربیت ایک مسلمان کی طرح ہوئی تھی، ۱۴۷۲ء میں جنوبی اڑیسہ پر کامیاب حملہ کیا اور اسے اس کے صلے میں تلنگانہ کی حکومت دے دی گئی۔ فتح اللہ عماد الملک ایک اور برہمن زادہ جس کی کہانی بھی اسی قسم کی تھی، برار کا حاکم مقرر ہوا اور یوسف عادل خان ترک کو دولت آباد کا صوبہ سپرد ہوا۔ اسی سال محمد نے بنکاپور اور

باگاؤں کے قلعوں کو فتح کر کے ان پر قبضہ کر لینا اور باگاؤں کے قلعہ کی فتح کے وقت جو کارنامے اس نے دکھائے ان کی وجہ سے وہ لشکری ، یعنی سپاهی، کے لقب سے مشہور ہو گیا۔ ۸۷۹ھ/۱۴۷۴ء میں دکن میں بڑا سخت قحط پڑا جو دو سال تک رہا ، اور ۸۸۱ھ/۱۴۷۶ء میں کونڈہ ویر کی ایک بغاوت کے سلسلے میں اسے تلنگانہ جانا پڑا۔ اس نے ملک حسن کو ، جو راج مہندری کے مقام پر محصور تھا ، مخلصی دلائی ، اڑیسہ پر حملہ کر کے راجا کی سرزنش کی، جس نے باغیوں کی حمایت کی تھی ، اور ۱۴۷۸ء میں اپنی واپسی پر کونڈہ ویر پر قبضہ کر کے غازی کا لقب اختیار کیا .

اس کے بعد وہ کرناٹک کو فتح کرنے کے لیے روانہ ہوا ، لیکن اس سے پہلے اس نے تلنگانہ کو دو حکومتوں میں تقسیم کر دیا جس سے یہاں کے حاکم ملک حسن کو بہت صدمہ پہنچا۔ اس قسم کی تقسیم اس منصوبے کا جزو تھی ، جو محمود گاوان نے مرتب کیا تھا اور جس کا اطلاق مملکت محروسہ کے ہر صوبے پر کیا جانے والا تھا .

محمد نے کرناٹک پہنچ کر کونڈہ پلی [کند پور پلی] کو اپنا صدر مقام بنایا اور کانجیورم پر ایک دلیرانہ یلغار کرنے کے بعد وہ یہاں واپس آ گیا۔ کونڈہ پلی سے اس نے ایک فرمان جاری کیا جس کی رو سے اس نے اپنی مملکت کے باقی تین صوبوں ، یعنی برار ، دولت آباد اور گلبرگہ کو بھی دو دو حکومتوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ اقدام بے حد نامقبول ہوا ، لیکن صرف ملک حسن ہی ایک ایسا کینہ توز شخص تھا، جس نے اس کی عملی طور پر مخالفت کی۔ اس کی رائے میں ان غیر مقبول اور ناپسندیدہ منصوبوں کا کرتا دھرتا محمود گاوان ہی تھا اور ایک جعلی خط کے ذریعے اس نے نوجوان بادشاہ کو یہ سمجھایا کہ اس کا وزیر ممالک محروسہ کے غیر ملکی دشمنوں سے ساز باز رکھتا ہے۔ محمد اس وقت شراب کے نشے میں تھا۔ اس نے اپنے وفادار وزیر کو طلب کیا اور ۵ اپریل ۱۴۸۱ء کو کسی قسم کی تحقیقات کیے بغیر اس کا سر قلم کرا دیا۔ اس کی موت کے فوراً بعد ہی اس کی بے گناہی ثابت ہو گئی اور یوں سمجھنا چاہیے کہ اس کے غیر منصفانہ قتل کی تاریخ ہی سے بہمنی سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔ ملک میں دو فریق تھے : ایک فریق کا ، جو تمام کا تمام غیر ملکیوں پر مشتمل تھا، سردار یوسف عادل خان تھا جس نے بیجا پور میں قدم جما لیے تھے اور دوسرے فریق کی قیادت جس میں اہل دکن کا معتدبہ معزز طبقہ شامل تھا ، فتح اللہ عماد الملک حاکم برار کے ہاتھ میں تھی۔ یہ دونوں فریق یا ان کے سردار بادشاہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کرتے تھے ، لہٰذا وہ قاتلوں کے اس گروہ کے اثر میں آ گیا جس کا سردار ملک حسن تھا۔ امرا محمد کے ہمراہ بیدر گئے اور اس کے بعد باگاؤں کی مہم پر بھی روانہ ہوئے ، لیکن وہ راستے میں شاہی افواج سے الگ پڑاؤ ڈالتے تھے ، بادشاہ کی کورنش دور ہی سے بجا لاتے تھے اور اس کے دربار میں حاضری سے انکار کر دیتے تھے۔ محمد اس توہین کے رنج و الم کو شراب نوشی کے ذریعے غلط کرتا رہتا، جس کے اثر سے وہ ۸۸۷ھ/۲۲ مارچ ۱۴۸۲ء کو بیدر میں فوت ہو گیا۔ اپنی موت کے آخری لمحات میں وہ چیخ چیخ کر کہتا تھا کہ محمود گاوان مجھے قتل کر رہا ہے۔ اس کا بیٹا محمود اس کا جانشین ہوا، جو محض نام کا بادشاہ تھا.

مآخذ : دیکھیے محمد اول (پہلا مادہ).

(T. W. Haig)

[سلطان] محمد اول : موجودہ نظریے کے * مطابق خاندان عثمانیہ کا پانچواں سلطان، جس نے

۱۴۱۳ء میں سلطنت کی بحالی کے بعد مسلّمہ فرمانروا کے طور پر ۱۴۲۱ء تک حکومت کی۔ سلطنت عثمانیہ کی پہلی صدی کے دور حکومت کے بعض واقعات کی طرح اس سلطان کا سال پیدائش بھی معلوم نہیں۔ سجل عثمانی، ۱: ۶۶ میں ۷۸۱ھ یا ۷۹۱ھ/ ۱۳۷۹ء یا ۱۳۸۹ء درج ہے۔ اس امر پر عام اتفاق ہے کہ وہ بایزید اول کے چھے بیٹوں میں سب سے چھوٹا تھا، اور اسی وجہ سے غالباً Von Hammer اس کا سال پیدائش ۷۹۰ھ صحیح سمجھتا ہے۔ تیمور کے حملے کے وقت محمد اماسیہ میں مقیم تھا اور انقرہ کی لڑائی میں موجود تھا (اواخر جولائی ۱۴۰۲ء)۔ یہاں سے وہ وزیر بایزید پاشا کی مدد سے بھاگ نکلا اور اماسیہ اور توقاد میں ینکمار کے تیموری حاکم اور ترکمانوں کے جتھوں کے علی الرغم حکومت کرتا رہا۔ ۱۴۰۳ء میں بایزید کی موت کے بعد قرہ مان اور ذوالقدر خاندانوں کی امداد سے اس نے اپنے بھائی عیسی سے بروسہ [بورسہ] چھین لیا، جو انقرہ کی لڑائی کے بعد بھاگ کر وہاں پہنچا تھا۔ اس کے بعد اس کی اپنے دوسرے بھائی سلیمان سے جنگ چھڑ گئی جو ادرنہ کو بھاگ گیا تھا۔ لیکن ازمیر اوغلو کے ساتھ بیک وقت دوستانہ اور معاندانہ تعلقات کی وجہ سے پھر اناطولیا میں واپس آ گیا تھا۔ سلیمان نے بروسہ فتح کر لیا، لیکن اسے مجبوراً روم ایلی کی طرف پسپا ہونا پڑا جہاں محمد نے اپنے ایک بھائی موسیٰ کو بھیج رکھا تھا (جو انقرہ کی لڑائی کے بعد کچھ عرصہ گرمیان اوغلو کی قید میں رہا تھا)۔ ۱۴۱۰ء میں سلیمان اور موسیٰ کے درمیان جنگ ہوئی، جس میں موسیٰ فتحیاب ہوا۔ اناطولیا میں محمد کو کافی طاقت حاصل ہو گئی تھی، اس لیے اب اسے موسیٰ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ پہلے تو روم ایلی کے فتح ہونے کی زیادہ توقع نہ تھی، لیکن جب بعض بڑے بڑے امرا مثلاً چاندار اوغلو ابراہیم پاشا، (دیکھیے Taschner اور Wittek در Islam، ۱۸: ۵۹) اور اورینوس ایسے امرا کے پرانے خاندانوں کے نمایندے، موسی سے الگ ہو کر اس کے طرفدار بن گئے، اور بوزنطی سلطنت کا بادشاہ مینوئل Manuel بھی اس کا حلیف بن گیا، تو محمد نے موسی کو چمورلو [سرویا] کی جنگ میں شکست دے کر اس کا قلع قمع کر دیا (جولائی ۱۴۱۳ء)۔ اس جنگ کے بعد سلطنت عثمانیہ کی وحدت و سالمیت از سرنو قائم ہو گئی، با ایں ہمہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انقرہ کی جنگ کے باوجود اناطولیا اور جزیرہ نمائے بلقان کے کے مسلمان اور عیسائی امرا پر خاندان آل عثمان کی برتری برابر قائم رہی اور اس پر کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا۔ ایشیا میں ان کا پشتینی دشمن قرہ مان اوغلو محمد، جس نے اس دوران میں بروسہ تک کا محاصرہ کر لیا تھا، ۱۴۱۴ء میں جانک کے مقام پر زیر کر لیا گیا اور اسی زمانے میں ازمیر اوغلو جنید کو بھی ازمیر (سمرنا) سے بھگا دیا گیا۔ ۱۴۱۶ء میں سلطنت عثمانیہ نے بنادقہ (اہل وینس) کے ایک بحری بیڑے کو گیلی پولی میں شکست دے کر بحیرۂ ایجین میں بھی اپنی طاقت پیدا کر لی۔ اسی سال آیدین اور جزیرہ نما قرہ بورون میں درویشوں کی ایک نہایت خطرناک بغاوت رونما ہوئی، جو سیماونہ اوغلو بدرالدین کے نام سے منسوب ہے (دیکھیے Babinger کا اس موضوع پر رسالہ در Islam، ۱۱: ۱ تا ۱۰۶، اور تاریخ کی بابت، ص ۲۲ ببعد) جسے فرو کرنے کے لیے اناطولیا کے ہر حصے سے بایزید پاشا کے ماتحت افواج کو اکٹھا کرنا پڑا۔ مملکت محروسہ کے یورپی حصے میں سلطان نے بوزنطی شہنشاہ سے دوستانہ تعلقات قائم رکھے۔ تاہم ترکوں نے

ولاشیا Wallachia میں جہاں تخت نشینی کا سوال زیر بحث تھا، مداخلت کی اور انھوں نے ڈینیوب کے شمالی کنارے پر جرجیو (ترکی یرکیوکو) کے مقام پر ایک قلعہ بھی تعمیر کر لیا ۔ اسی زمانے میں (۱۴۱۹ء) ترکی افواج کی یلغاریں ھنگری، بوسنہ اور آسٹریا (Styria) کی حدود تک پہنچ گئیں ۔ ایشیائی جوانب میں قسطمونی کے امیر کے مقبوضات کے بڑے بڑے حصے، بشمول توسیہ اور کنغری مملکت عثمانیہ میں شامل کر لیے گئے ۔ ۱۴۱۶ء سے محمد کو ایک اور مدعئ تخت سے مقابلہ کرنا پڑا، جو اپنے آپ کو اس کا بھائی بتاتا تھا اور جس کا نام مصطفٰی تھا ۔ اس دوزمہ [جعلی؟] مصطفٰی کو ایک حلیف جنید بھی مل گیا ۔ دونوں کو سیلانیک کے مقام پر شکست ہوئی اور انھوں نے قسطنطینیہ میں جا کر پناہ لی ۔ اناطولیا سے واپسی کے بعد ہی، یعنی ۱۴۲۱ء میں، سلطان کا ادرنہ میں انتقال ہو گیا ۔ اس کی موت کی خبر چالیس روز تک فوج سے پوشیدہ رکھی گئی، تا آنکہ وارث تخت سلطان مراد بروسہ میں آ پہنچا ۔

سلطان محمد اول ایک نرم مزاج اور کشادہ دل حکمران ہونے کی حیثیت سے مشہور ہے ۔ اسے اکثر اوقات چلبی کے عرف کے ساتھ بھی یاد کرتے ہیں (اس کے بھائی بھی اسی عرف سے پکارے جاتے تھے) ۔ اس کا دوسرا عرف کورشجی یعنی "پہلوان" بھی تھا جو یورپی ماخذ میں مختلف شکلوں میں استعمال ہوا ہے (Regusn کی دستاویزات میں، جن کا حوالہ Babinger نے اپنے مقالے مندرجہ Isl.، ص ۳۴، پر دیا ہے، Crixia تحریر ہے) ۔ اس کے عہد حکومت کے اہم انتظامی اقدامات کا کہیں ذکر نہیں آیا ۔ اس کی تمام طاقت اور قابلیت سیاسی اور مذہبی اتحاد کے قیام اور لوگوں کو ٹھنڈا کرنے میں صرف ہوئی ۔ بعض مشہور عمارتیں اس کے نام سے منسوب ھیں ۔ اس نے ادرنہ میں اولو جامع کی تعمیر مکمل کرائی اور اسی نام کی ایک مسجد بروسہ میں بنوائی ۔ اس سلطان کے زمانے کی ایک نئی تعمیر مشہور و معروف یشیل جامع بروسہ میں ہے (دیکھیے اولیا چلبی : Travels، ۲ : ۱۵).

مآخذ : (۱) قدیم ترکی تاریخیں عاشق پاشا زادہ اور تواریخ آل عثمان، طبع Giese ؛ (۲) اروج بے، طبع Babinger اور بعد کے مورخین خصوصاً عالی : کنه الاخبار ؛ (۳) بوزنطی مصنفین میں سے اس دور کا ذکر : (۴) Phrantzes، Ducas اور Chalcondylas نے لکھا ہے ؛ اس کے علاوہ (۵) Von Hammer : *G. O. R.*، ۱ : ۲۶۱ ببعد ؛ (۶) Zinkeisen : *Gesch. des Osm. Reiches*، ہامبرک ۱۸۴۰ء، ۱ : ۳۸۸ تا ۵۰۰ ؛ (۷) Jorga : *Gesch. des Osm. Reiches*، ۱ : ۳۶۱ تا ۳۷۷ ۔

(J. H. KRAMERS)

* **[سلطان] محمد دوم** : کنیت ابو الفتح یا زیادہ مقبول عام صرف فاتح، سلطنت عثمانیہ کا ساتواں بادشاہ جس نے ۱۴۵۱ء سے اپنی وفات، یعنی ۱۴۸۱ء تک حکومت کی ۔ سجل عثمانی، ۱ : ۶۷ کے مطابق وہ رجب ۸۳۳ھ/اپریل ۱۴۲۹ء میں پیدا ہوا تھا اور اپنے والد [سلطان] مراد ثانی کی زندگی میں مغنیسہ (Magnisia) کا حاکم رہا ۔ ۱۴۴۳ء میں اپنے بھائی علاء الدین کی وفات کے بعد وہ ولی عہد بن گیا ۔ آخر کار اپنی تخت نشینی سے پہلے محمد دو مرتبہ ادرنہ میں [سلطان] مراد ثانی کی حکومت سے دست برداری کی وجہ سے سلطان رہ چکا تھا، پہلی مرتبہ جون ۱۴۴۴ء میں جب ھنگری سے ایک دس سالہ معاہدۂ صلح طے ہوا ۔ جب اس عہد نامے کے باوجود ھنگری اور اس کے حلیفوں نے جولائی کے مہینے میں پھر جارحانہ کاروائی شروع کر دی، تو سلطان مراد مغنیسہ سے جہاں وہ گوشہ نشین ہو گیا تھا واپس آیا اور اس نے وارنا

کی جنگ میں فتح پائی (۱۰ نومبر ۱۴۴۴ء)۔ پھر سلطان مراد دوسری دفعہ تخت سے دست بردار ہوگیا، لیکن ینگ چریوں کی ایک خطرناک بغاوت کی وجہ سے جو ادرنہ میں ہوئی، خلیل پاشا صدر اعظم نے مجبور ہو کر اسے دوبارہ بلا لیا اور محمد کو پھر ایک دفعہ اناطولیہ کا حاکم بنا کر بھیج دیا گیا جہاں وہ اپنے باپ کی وفات تک رہا.

۹ فروری ۱۴۵۱ء کو یہ نیا سلطان ادرنہ میں وارد ہوا اور شروع میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا میلان امن و صلح کی جانب ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے دور حکومت میں اس کی اپنی قیادت ہی میں فتوحات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہونے کو تھا۔ اس نے اپنی حکومت کے ابتدائی زمانے میں تقریباً ہر اہم مہم میں بنفس نفیس حصہ لیا۔ اس کی فتوحات سے مملکت محروسہ کی ان حدود میں جو سلطان مراد ثانی کے زمانے میں قائم ہوچکی تھیں چنداں زیادہ اضافہ تو نہ ہوا، لیکن اتنا ضرور ہوا کہ بہت سے ایسے ممالک، علاقے اور شہر، جو اب تک ترکی سیادت کے تحت مقامی حکمرانوں کے ہاتھ میں تھے، براہ راست ترکی حکومت میں آ گئے۔ اس طرح [سلطان] محمد کی فتوحات کی بدولت سولھویں صدی میں سلطنت عثمانیہ کی بے اندازہ وسعت پذیری کا امکان پیدا ہوگیا.

اس کے دور حکومت کا پہلا اور سب سے زیادہ نمایاں فوجی کارنامہ قسطنطینیہ کی تسخیر تھا، جہاں مراد ثانی کی نرم مزاجی کی وجہ سے پیلائیولوگ Palaeologue قسطنطین اب تک حکومت کر رہا تھا [یہ فتح اس لیے بھی یادگار اور باوقار خیال کی جاتی ہے کہ اس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے پیشینگوئی فرمائی تھی، لہٰذا اس کو فتح کرنے کے لیے اب تک متعدد حملے ناکافی ثابت ہوئے تھے، دیکھیے استانبول، بذیل مادہ]۔ اس قابل یادگار محاصرے کے لیے ۱۴۵۲ء سے تیاریاں شروع ہوئیں، جب رومیلی (روم ایلی) حصار تعمیر ہوا (اس میں زغنوس پاشا، ایک میر عمارت، کا کتبہ مورخہ ۸۵۶ھ/۱۴۵۲ء موجود ہے؛ دیکھیے خلیل ادھم در *TOEM*، ۲: ۳۸۴ تا ۳۹۷)۔ اس کے علاوہ دوسری تیاریاں بھی کی گئیں، مثلاً ایک بہت بڑی قلعہ شکن توپ ڈھالی گئی۔ ۲۹ مئی ۱۴۵۳ء کو قسطنطینیہ فتح ہوگیا اور اس کے بعد غلطہ نے بھی بہت جلد ہتھیار ڈال دیے [رک بہ استانبول؛ قسطنطینیہ]۔ اگلے سال سلطان کو سربیا کے خلاف کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ اور تراخان نے موریہ [مورہ] کے امور میں مداخلت کی جہاں قدیم پیلائیولوگ خاندان کے آخری مطلق العنان البانیا والوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔ قسطنطینیہ فتح کرنے کے بعد ہی سلطان نے صدر اعظم خلیل پاشا کو موقوف کر کے قتل کرا دیا، کیونکہ سلطان کے دل میں اس کے خلاف ذاتی اور سیاسی اختلافات کی وجہ سے رنجش پیدا ہوگئی تھی (دیکھیے Täeschner اور Wittek در *Islam* ۱۸: ۱۰۵ ببعد)۔ کوئی ایک سال کے بعد اس کی جگہ محمود پاشا [رک بآں] کو مقرر کیا گیا، جو بعد کے بارہ سال تک سلطان محمد فاتح کی فتوحات کے لائحہ عمل میں سرگرم ممد و معاون ہونے کے اعتبار سے کوئی معمولی حیثیت نہیں رکھتا۔ ۱۴۵۵ء میں یہ دونوں سربیا اور بحیرۂ ایجئین کے ساحلی علاقے میں موجود تھے، جہاں بڑی فتوحات اینوس Ainos اور جزیرہ لیمنوس Lemnos [رک بآں] میں ہوئیں۔ ۱۴۵۶ء میں وہ بلغراد کے محاصرے میں ناکام رہے۔ ۱۴۵۸ء اور ۱۴۵۹ء میں سربیا کا ملک براہ راست سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا۔ سمندرہ Semendra کو [سلطان] محمد نے ۱۴۵۹ء میں فتح کر لیا اور اسی سال اور ۱۴۶۰ء میں سلطان نے موریہ [مورہ] کی متعدد مہمات میں حصہ لیا، جس کا شمالی حصہ پیلائیر

لوگ Palacologues خاندان سے فتح کر لیا گیا۔ اسی زمانے کے قریب البانیا میں سکندر بیگ [رک بآں] سے ایک عارضی سمجھوتا ہو گیا۔

اس کے بعد ۱۴۶۲ء میں ایشیا کی حیرت انگیز مہم شروع ہوئی۔ اماسرہ (Amastris) اہل جینوآ سے اور اسی طرح سینوب [رک بآں] آخری اسفند یار اوغلو سے چھین لیا گیا۔ آق قویونلو کے اوزون حسن سے لڑائی شروع ہونے کے بعد طربزون بھی بہت جلد فتح ہو گیا [رک بہ طربزون]۔ اگلے سال سلطان کے لشکر نے افلاق (Wallochia) کے مشہور و معروف حکمران ولد درکل (Wlad Darcul) کو اس کی ریاست سے نکال دیا جو اس کے بھائی رادل Radul کو دے دی گئی، اور سال کے آخر میں [سلطان] محمد اور [صدر اعظم] محمود دونوں نے لیسبوس Lesbos جینوئی کی حکومت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ ۱۴۶۳ء اور ۱۴۶۴ء کے دو سال زیادہ تر بوسنہ کی سلطنت کا الحاق کرنے میں صرف ہوئے ۱۴۶۳ء میں وینس [بندق] کے خلاف جنگ شروع ہو گئی جو ۱۷ برس تک جاری رہی۔ اس لڑائی کا میدان جنگ عام طور پر موریہ [مورہ] کا علاقہ رہا۔ گو بحیرۂ ایجین کے جزائر میں بھی بنادقہ کے بحری بیڑوں سے متواتر مڈبھیڑیں ہوتی رہیں۔

۱۴۶۴ء میں قرہ مان اوغلو [رک بآں] ابراہیم کی موت پر پہلی بار سلطان کو مداخلت کی ضرورت پیش آئی تھی، اور تھوڑے ہی عرصے میں اس سلطنت کے تمام بڑے بڑے شہر جو کسی زمانے میں بڑی زبردست ریاست شمار ہوتی تھی [سلطان] محمد کی ۱۴۶۶ء کی مہم میں فتح ہو گئے (جنگ لارندہ)۔ اسی سال [سلطان] محمد کو البانیا میں بھی کامیابی حاصل ہوئی، جہاں اس نے اِلبصان [رک بہ سکندر بیگ] کے شہر کو مستحکم کیا۔

قرہ مان کی مہم کے اختتام پر محمود پاشا صدر اعظم کو برطرف کر دیا گیا تھا اور اس کی جگہ روم محمد پاشا مقرر ہو گیا تھا، لیکن گیلی پولی کے حاکم کی حیثیت سے یہ محمود پاشا اور قپودان پاشا ہی تھے، جنھوں نے ۱۴۷۰ء میں بنادقہ [اہل وینس] سے نگرو پونٹے Negroponte (یوبوای Euboea) کے جزائر فتح کرنے میں سلطان محمد کی امداد کی۔ اسی سال روم محمد اور گدک احمد پاشا کے ماتحت قرہ مان اوغلو خاندان کے آخری افراد کے مقبوضہ شہروں کے خلاف مہموں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا، جن کی مدد ایک طرف تو اوزون حسن [رک بآں] اور دوسری، یعنی سمندر کی طرف، عیسائی بحری بیڑے کر رہے تھے۔ باوجود اس کے کہ اوزون حسن نے جارحانہ کارروائی کر کے توقات [توقاد] کا شہر بھی فتح کر لیا، سلطان نے ایک نئی ایشیائی مہم کے لیے بڑے زور شور سے تیاریاں شروع کر دیں، اور محمود پاشا کو دوبارہ صدر اعظم مقرر کر دیا۔ ۱۴۷۳ء میں سلطان کے لشکر کو اَرزنجان کی عظیم الشان فتح حاصل ہوئی جس سے اس جانب کا خطرہ دور ہو گیا۔ اس مہم میں شہزادہ مصطفیٰ ولی عہد نے بھی حصہ لیا اور اس نے ۱۴۷۴ء میں ایچ ایلی (کیلیکیا) کی فتح کی تکمیل کی، لیکن اس کے بعد جلد ہی وہ فوت ہو گیا۔ محمود پاشا کو پھر وزارت عظمیٰ سے معزول کر کے اگست ۱۴۷۴ء میں قتل کر دیا گیا۔ اب گدک پاشا اس کا جانشین ہوا۔

اس کے بعد کے سالوں میں، یعنی ۱۴۸۰ء تک، سلطان نے زیادہ تر توجہ یورپ کی فتوحات کی جانب منعطف رکھی۔ ۱۴۷۱ء میں اس نے بلغراد کے قریب سیرمہ میں بوگوردژن (Sabaes) کا قلعہ تعمیر کیا اور اس کی افواج نے اس علاقے میں اور اس سے اگلے سال ہنگری میں بلکہ آسٹریا کی حدود تک حملے کیے۔ ادھر وینس (بندق) سے لڑائی جاری

تھی اور ۱۴۷۴ء میں البانیا کے شہر سقوطری (اشقودرہ) کا بھی ناکام محاصرہ ہوا۔ ۱۴۷۵ء میں اہل جینوا سے کفّہ کا شہر چھین لینے میں اہم کامیابی ہوئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کریمیا [قرم] کے علاقے میں بھی سلطنت عثمانیہ کا اقتدار و قبضہ قائم ہوگیا، اور کریمیا کے تاتاری خوانین عثمانلی اقتدار کے ماتحت آ گئے۔ ۱۴۷۶ء میں خود سلطان کو مولدیویا میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی، لیکن بعد کے سالوں میں ترکی افواج کو البانیا اور جنوبی موریہ [موره] میں بنادقه (اہل وینس) کے خلاف کوئی زیادہ کامیابی نہ ہوسکی۔ آخرکار ۱۴۷۸ء میں سلطان محمد خود البانیا گیا اور وہاں اس نے کروِیہ (Croia) کو فتح کر لیا۔ سقوطری کا محاصرہ بھی طویل عرصے تک جاری رہا، لیکن اس نے بنادقه سے صلح کی گفت و شنید کے بعد ہی اطاعت قبول کی۔ اس گفت و شنید کے بعد صلح کا عہد نامہ ہوا (اس کی توثیق ۲۶ جنوری ۱۴۷۹ء کو ہوئی)، جس کی رو سے البانیا اور موریا کے کچھ شہر حکومت وینس کے پاس رہ گئے۔ تاہم ۱۴۷۹ء میں ایک بحری بیڑے نے گدک احمد پاشا کے زیر قیادت جزائر آلیونین Ionian فتح کر لیے، جس نے اس کے علاوہ جنوبی اطالیا کی حدود تک مار کی، اور اوٹرینٹو Otranto کو فتح کر لیا۔ اسی سال جزیرۂ روڈس Rhodes کو فتح کرنے کی کوشش بھی ہوئی لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔

[سلطان] محمد کی آخری مہم ۱۴۸۰ء میں ہوئی، جب اس نے ذوالقدر (رک بآں) کے خاندانی جھگڑوں میں مداخلت کی۔ اس کی وجہ سے مصر سے ان بن کا آغاز ہوا۔ اگلے سال ۱۴۸۱ء میں وہ پھر ایشیا کی ایک نئی مہم پر روانہ ہوا، جس کا اصل مقصد اب تک معلوم نہیں ہو سکا لیکن بظاہر وہ بھی اسی ان بن سے متعلق ہوگی۔ یہاں وہ اچانک تکفور چایری یا خنکر چایری کے مقام پر جو سقوطاری اور گبزه کے درمیان واقع ہے، فوت ہو گیا (۳ مئی ۱۴۸۱ء)۔ اس کی لاش کو قسطنطینیه میں پہنچایا گیا، جو جامع فاتح کے مقبرے (تربه) میں دفن کر دی گئی۔

ایک عظیم فاتح ہونے کے علاوہ محمد ثانی بڑی شاندار عمارتوں کا بانی بھی تھا۔ سب سے پہلے اس نے قسطنطینیه میں جامع فاتح اور مسجد ایوبی تعمیر کرائی (حدیقة الجوامع، ۱ : ۸ ببعد، ۲۴۳ ببعد)۔ ان کے علاوہ درہ دانیال کے قلعے اور بحری اور بری اہمیت کے دوسرے مستحکم مقامات بھی تعمیر کرائے۔ فوجی نظام میں وہ ینگی چریوں میں ضبط و نظم قائم کرنے میں کامیاب ہوا اور اس نے ان میں سگبانوں کی ایک فوج شامل کر دی۔ اس کے علاوہ اس کا نام سلطنت عثمانیه کے پہلے قانون نامه کی وجہ سے بھی مشہور ہے (تتمے کے طور پر *T O E M* میں شائع ہو چکا ہے)۔ اس نے سائنس کی تعلیم اور اس کے مطالعے کی حوصلہ افزائی کی اور ادبیات اور شعر و سخن میں بھی دلچسپی لی ۱۲ ترکی شعرا اس کے وظیفه خوار تھے [وہ خود بھی شاعر تھا اور عونی تخلص کرتا تھا]۔ اس نے اطالیا میں فنون کی نشاۃ ثانیه (Renaissance) کی بھی حوصلہ افزائی کی، چنانچہ اس نے جنٹائل بلینی Gentile Bellini کو قسطنطینیه میں طلب کیا جس نے اس کی تصویر بنائی (دیکھیے نیز Tschudi : *Vomalten Osmanischen ich Reich*، ۱۹۳۰ء، توبنگن ص ۱۸)۔

مآخذ : (۱) ابتدائی زمانے کے مآخذ میں بوزنطی مؤرخین (Ducas, Phranzes، Chacondyles) سب سے زیادہ اہم ہیں : (۲) محمد کی زندگی کے حالات Critobulos یونانی نے بھی لکھے ہیں، جن کا ترکی زبان میں ترجمہ ہوگیا ہے (تتمه *T O E M*، ج ۱ و ج ۲) : (۳) قدیم عثمانلی وقائع نویس (نشری اور دوسرے لوگ) اکثر

اوقات سلطان محمد کے دور حکومت کا ذکر اپنے وقائع کے آخری حصے میں کرتے ہیں ؛ (۴) بعد کے تاریخی مآخذ (سعد الدین، عالی ، فریدون) اس زمانے کے بارے میں شاید ھی قابل اعتبار سمجھے جائیں ؛ ان کے علاوہ (۵) V. Hammer : G O R ، ج ۱ ، ۲ ؛ (۶) Zinkeisen ، ج ۲ ، اور Jorga ، ج ۱ ؛ (۷) Heyd : Histoire du Commerce du Levant ، ج ۲ ؛ (۸) L. Thuasne : Gentile Bellini et Sultan Mohammed II ، پیرس ۱۸۸۸ء۔

(J. H. Kramers)

[سلطان] محمد سوم : سلطنت عثمانیہ کا تیرھواں بادشاہ جو ۱۶ مئی ۱۵۶۷ء کو پیدا ھوا سلطان مراد ثالث اور وینس کی خاتون بفہ Baffa کا بیٹا تھا ۔ اس نے ۲۷ جنوری ۱۵۹۳ء سے اپنی وفات یعنی ۲۲ دسمبر ۱۶۰۳ء تک حکومت کی ۔ یہ وہ آخری سلطان تھا جو اپنی ولی عہدی کے زمانے میں مغنیسہ میں حاکم کی حیثیت سے مامور رھا ۔ اپنے مختصر دور حکومت میں وہ سلطنت کی حکمت عملی پر کچھ زیادہ اثر انداز نہیں ھو سکا کیونکہ اس پر زیادہ تر اپنی والدہ کا اثر تھا جو بحیثیت والدۂ سلطان امور سلطنت میں اپنے متوسلین کے ذریعے جو محل کے اندر اور باھر دونوں جگہ موجود تھے ، دخل انداز ھوتی تھی ، چنانچہ اس کی مرضی کے بالکل برخلاف ایکن فوج کے ایک بہت بڑے حصے اور بڑے بڑے امرا کے اصرار پر محمد ثالث کو ۱۵۹۶ء کی ایک مہم میں حصہ لینا پڑا ، جس میں ھنگری کے شہر ارلو Erlau (اگری) پر ترکوں نے قبضہ کر لیا (ستمبر ۱۵۹۶ء)۔ یہ مہم اس جنگ کا ایک حصہ تھی جو اس کے پورے دوران حکومت میں آسٹریا کے خلاف ھوتی رھی اور اس کے لیے ھر سال ھنگری یا ولاچیہ (افلاق) کے خلاف ایک فوجی مہم بھیجنا پڑتی تھی ۔ اس سلطان کے عہد میں کم از کم بارہ مرتبہ وزارت عظمی کے عہدے میں تبدیلی ھوئی ۔ سب سے نمایاں صدر اعظم داماد ابراھیم پاشا (رک بآن) تھا جو اس کا برادر نسبتی اور والدہ سلطان کے متوسلین میں سے تھا ۔ ابراھیم کے پاس تین دفعہ مہر سلطانی رھی ۔ تین اور صدر اعظم ایسے ھوئے جن کا عہدہ انہیں سزائے قتل ملنے پر ختم ھوا ۔ اسی سال ارلو کی فتح کے سلسلے میں ترکوں نے کرسزتس Keresztes کی جنگ میں اھل آسٹریا اور ھنگری پر فتح پائی ، چغالہ سنان صدر اعظم کی سختی اور تشدد کی وجہ سے فوج کے بہت سے سپاھی بھاگ کر چلے گئے اور بعد میں فراری اور جلالی کے نام سے واپس آ کر ایشیاے کوچک میں انہوں نے خطرناک شورشیں برپا کر دیں جو تیس سال تک برابر جاری رھیں ۔ ان شورشوں کا آغاز ۱۵۹۹ء میں قرہ یازیجی (رک بآن) کے اورفہ پر قبضہ کرنے سے ھوا ۔ ھنگری کی لڑائی کا ایک تیسرا قابل یادگار واقعہ یہ تھا کہ ابراھیم پاشا نے ۱۶۰۰ء میں قنیژہ کو فتح کر لیا ۔ سلطنت کے دوسرے حصوں میں صورت حالات مقابلتاً پر سکون رھی ۔ صرف کریمیا کی ریاست میں دو مخالف مدعیان تخت کے درمیان جنگ ھوئی جس میں ترکی حکومت کو دخل دینا پڑا ۔ یورپی طاقتوں سے تعلقات خوش گوار رھے ۔ فرانس نے اپنے سفیر کے ذریعے کافی اثر و رسوخ پیدا کر لیا تھا ۔ ایران سے ۱۶۰۳ء تک صلح رھی ۔ اس کے بعد عباس اول نے تبریز اور نخچوان فتح کر کے جنگ کی ابتدا کر دی ۔

مملکت محروسہ میں اب تک سلیمان کے عہد کی قدیم روایات قائم تھیں ، لیکن مضبوط حکومت کے فقدان کی وجہ سے کئی قسم کی بدنظمیاں پیدا ھو گئی تھیں ، بالخصوص تیماروں [جاگیروں] کے نظم و نسق اور مالیات کے نظام میں بڑی خرابی

قوی ۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ ۱۶۰۳ء میں قسطنطینیہ میں سپاہیوں نے خطرناک بغاوت کردی ، جن کا مطالبہ یہ تھا کہ دارالخلافے میں حرم کی حکومت کو ختم کیا جائے اور اناطولی میں حکومت کے اختیارات کو بحال کر دیا جائے ۔ اس بغاوت کی وجہ سے حرم کے دو بڑے عہدے دار مارے گئے ۔ صدر اعظم یمشجی حسن نے ینگی چریوں کی امداد سے سپاہیوں کا مقابلہ کیا جس کی وجہ سے ینگی چریوں اور سپاہیوں کی دونوں فوجوں میں باہمی مخالفت پیدا ہو گئی ، لیکن اسی سال اکتوبر کے مہینے میں اس نفرت انگیز حکمت عملی کی وجہ سے خود صدر اعظم معزول ہو کر قتل کر دیا گیا .

محمد ثالث کو مسجد ایاصوفیا کے مقبرے (تربه) میں دفن کیا گیا ۔ اپنی موت سے کچھ پہلے اس نے اپنے بیٹے محمود کے قتل کا حکم دے دیا تھا ۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے متقی ہونے کی بہت نمائش کیا کرتا تھا اور اس کے ہم نشینوں میں خواجہ سعد الدین (م ۱۵۹۹ء) ایسے بعض بہت اچھے مشیر تھے ، جنہوں نے اسے ۱۵۹۶ء کی مہم میں لشکر کے ہمراہ جانے پر مجبور کیا تھا ، لیکن بحیثیت مجموعی اس کی والدہ کا اثر غالب رہا اور اس کی وجہ سے سلطان زیادہ تر محل اور حرم کے اندر ھی بند رہا .

مآخذ : ترک مؤرخین میں سے تصانیف (۱) عالی (۱۵۹۹ء تک) ؛ (۲) سیلانکی (۱۶۰۰ء تک)؛ (۳) پیچوی اور (۴) حسن بیگ کی تصانیف بحیثیت ہم عصر مآخذ کے اہم ھیں : اس کے علاوہ (۵) نعیما ج ۱ ؛ اور (۶) حاجی خلیفه : (۷) Hammer : GOR، ج ۴ اور (۸) Zinkeisen تصانیف (ج ۳) اور Jogra (ج ۳) ۔ ہم عصر یورپی مآخذ میں سے (۹) Laz. Soranzo : *Ottomanus sive de rebus turcicis liber continens descriptionem Potentiae Mahometis III*، ۱۶۰۰ء .

(J. H. KRAMERS)

[سلطان] محمد چہارم : سلطنت عثمانیہ کا انیسواں بادشاہ جو ۲ دسمبر ۱۶۴۲ء کو پیدا ہوا اور ۸ اگست ۱۶۴۸ء کو اپنے والد سلطان ابراہیم کی معزولی اور پھر جلد ھی قتل کے بعد تخت نشین ہوا ۔ اس وقت حکومت کا اقتدار ایک طرف دربار شاھی اور دوسری جانب ینگی چریوں اور سپاھیوں کی باغی افواج کے درمیان منقسم تھا اور دربار کی عنان حکومت بوڑھی والدہ سلطان کوسم اور سلطان محمد کی والدہ ترخان کے ہاتھ میں تھی ۔ اس زمانے میں حکومت کی بے ثباتی کا حال اس حقیقت سے واضح ہے کہ ۱۶۵۶ء میں وزارت عظمی کے منصب پر کوپرولو محمد کے فائز ہونے سے پہلے کوئی تیرہ وزرای اعظم تبدیل ہو چکے تھے ۔ ۱۶۵۱ء میں بوڑھی والدہ سلطانہ کوسم قتل کردی گئی اور اس کے ساتھ ھی ینگی چریوں کا زور بھی ٹوٹ گیا ۔ درباری فریق کی جو حکومت سلطان کی والدہ کے زیر قیادت برسر اقتدار آئی اس سے معاملات رو براہ نہ ہو سکے ، صدر اعظم اِبشِر پاشا (۱۶۵۴ تا ۱۶۵۵ء) پر جو پہلے صورت حالات کے مطابق مطلوبہ مرد آھنین سمجھا گیا تھا ، اس کا حریف مراد پاشا جلد غالب آ گیا اور یہ وزارت بھی ختم ہوئی ۔ اس عرصے میں وینس کے خلاف جنگ کریٹ (اقریطش) کی وجہ سے سلطنت کے وسائل بھی ختم ہو رہے تھے ، مارچ ۱۶۵۶ء میں ایک فوجی بغاوت کے باعث سلطان اپنے کئی ایک منظور نظر درباریوں کو قتل کی سزا دینے پر مجبور ہو گیا .

کوپرولو محمد پاشا (رک بآن) (۱۵ ستمبر ۱۶۵۶ تا ۳۱ اکتوبر ۱۶۶۱ء) حقیقی معنوں میں ایک مضبوط آدمی ثابت ہوا ؛ اس نے فوراً ھی حرم کے رسوخ کی بیخ کنی کر دی جو امور سلطنت پر

بہت بری طرح اثر انداز ہو رہا تھا ، اور وہ اپنی وفات تک ساری سلطنت پر حقیقی معنوں میں حکمران رہا ۔ اس کے عہد حکومت کے آغاز ہی میں بنادقہ (اہل وینس) نے درۂ دانیال پر ترکوں کو ایک بحری شکست دی ، لیکن اگلے ہی سال اس نے سرعسکر کی حیثیت سے ٹرانسلوینیا میں کئی فتوحات حاصل کیں اور اس کے ساتھ ہی وہ ڈینیوب کی ریاستوں میں ترکوں کا سیاسی اور سیادتی اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔ یہاں خان کریمیا [قرم] سے اشتراک بہت سود مند ثابت ہوا ۔ ۱۶۵۸ء اور ۱۶۵۹ء میں اس نے ایشیاے کوچک میں کئی بغاوتوں کو فرو کیا اور بنادقہ سے جنگ میں بنادقہ اور ان کے دوسرے عیسائی اتحادیوں کا ایک بحری بیڑا کریٹ میں ترکوں کی افواج کے خلاف کامیاب نہ ہو سکا ۔ اس کی وفات (۳۱ اکتوبر ۱۶۶۱ء) کے بعد اس کا بیٹا کوپرولو احمد پاشا اس کا جانشین ہوا جس نے اپنے باپ کے کام کی تکمیل یوں کی کہ کریٹ کو قطعی طور پر فتح کر لیا ۔ (سقوط کندیہ Kandia ، ۴ ستمبر ۱۶۶۹ء) ، اور اس کے بعد وینس سے صلح ہو گئی ، ۱۶۶۱ء میں آسٹریا کے ساتھ پھر جنگ چھڑ گئی ، جس میں سلطان محمد رابع نے کئی سہمات میں خود حصہ لیا ، بالخصوص ۱۶۶۳ء کی جنگ میں ، جس میں اُجوار (Neuhausel) فتح ہو گیا ، ۱۶۶۴ء میں سینٹ گوتھرڈ St. Gotthard کی مشہور لڑائی ہوئی جس میں ایک اتحادی فوج نے ترکوں کو شکست دی : اس فوج کا ایک حصہ فرانسیسیوں پر مشتمل تھا ۔ اس کے باوجود جو صلح ۱۶۶۴ء میں آسٹریا سے ہوئی ، اس میں ترکوں ہی کو فائدہ رہا ۔ ۱۶۷۲ء میں سلطان نے پولینڈ کے خلاف ایک جنگ میں حصہ لیا ، کیونکہ یوکرینی Ukranian کاسکوں Cossacks نے پولینڈ کے بادشاہ کے خلاف حکومت عثمانیہ سے مدد کی درخواست کی تھی ، پولینڈ کی جنگ ۱۶۷۶ء کے ایک عہد نامے کی رو سے ختم ہوئی اور اس طرح شمالی اطراف میں ترکوں کی طاقت اور بھی مضبوط ہوگئی ، گو اس عرصے میں سلطان بہت افسردہ اور متلون مزاج ہو گیا تھا اور وہ احمد کوپرولو کا اتنا احترام نہ کرتا تھا ، جتنا کہ اس کے باپ کا ، پھر بھی وہ اندرون ملک کے دشمنوں کے خلاف اپنے آپ کو برقرار رکھ سکا اور نئی افواج (یشلی اور گوکنلو) کی بھرتی اس کے لیے بہت کچھ ممد و معاون ثابت نہ ہوئی جو سپاہیوں اور ینگی چریوں سے کہیں زیادہ قابل اعتبار تھیں ۔ تاہم وہ درباری تعیش کی فضول خرچیوں کا خاتمہ نہ کر سکا ، جن پر بے اندازہ روپیہ ضائع ہوتا تھا ، سلطان کو بڑے پیمانے پر شکار کھیلنے کا بے حد شوق تھا ، جس کا اہتمام ادرنہ کے نواح میں صرف خطیر سے ہوا کرتا تھا ، کیونکہ وہ اس شہر کو قسطنطینیہ کی نسبت اپنی سکونت کے لیے زیادہ پسند کرتا تھا ۔

احمد کی وفات کے بعد سلطان نے امور حکومت کی زمام اپنے ہاتھ میں نہ لی ، بلکہ اس نے قرہ مصطفی پاشا (رک بآں) کو اپنا صدر اعظم مقرر کیا ۔ اس نے بھی جنگ و جدال کی غیر ضروری روایت کو قائم رکھا ، ۱۶۷۷ء اور ۱۶۷۸ء میں اس نے کاسکوں (قازقوں) کے خلاف کامیابیاں حاصل کیں ، جن کے پیچھے ماسکو کی طاقت تھی ، جس نے اب ترکی کے معاملات میں اہمیت حاصل کرنا شروع کر دی تھی ۔ ۱۶۸۲ء میں آسٹروی سلطنت کے خلاف پھر جنگ چھڑ گئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکوں نے دوسری مرتبہ پھر وی آنا کا محاصرہ کر لیا (۱۳ جولائی تا ۱۲ ستمبر ۱۶۸۳ء) ، جو پولینڈ کے بادشاہ سوبیسکی Sobeiesky کی مداخلت کی بدولت ترکوں کی ہزیمت پر منتج ہوا ۔ اس ہزیمت کی قیمت قرہ مصطفی کو اپنے عہدے اور اپنی جان کی شکل

میں ادا کرنا پڑی اور اس کے ساتھ ہی حرم سرائے کا اثر و رسوخ پھر غالب آ گیا۔ اب جو وزرای اعظم مقرر ہوتے رہے وہ اپنے عہدے کے لیے نااہل ثابت ہوتے اور ۱۶۸۵ء تا ۱۶۸۷ء میں آسٹروی فوجوں نے ہنگری کا سارا ملک فتح کر لیا (۲۲ جون ۱۶۸۷ء کو موھاکس Mohacs کے مقام پر ترکوں کی شکست)۔ اسی زمانے میں وینس [بندقی] کے برخلاف موریا اور مجمع الجزائر میں پھر لڑائی شروع ہو گئی۔

ان تمام تباہیوں کی وجہ سے فوجیں میدان جنگ ہی میں باغی ہو گئیں۔ وہ ستمبر ۱۶۸۷ء میں حلب کے سیاووش پاشا کی قیادت میں دارالخلافے پر چڑھ آئیں اور اس دفعہ سلطان خود ان کا شکار ہو گیا۔ اسے ۸ نومبر ۱۶۸۷ء کو قائم مقام کوپرولو مصطفی پاشا نے معزول کر دیا اور اس نے عزلت گزینی اختیار کر کے اپنی باقی زندگی ادرنہ میں گذار دی جہاں ۱۷ دسمبر ۱۶۹۲ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔ وہ اپنی ماں کے پہلو میں ینی جامع میں دفن ہوا۔

مآخذ: (۱) نعیما (ج ۲)، حاجی خلیفہ اور ۱۶۹۰ء تک راشد کی تاریخ، نہایت اہم ترکی ماخذ ہیں؛ (۲) اولیا چلبی کے سیاحت نامہ میں اس دور حکومت کی بہت سی مہمات کا تذکرہ ہے اور وہ اور اعتبار سے بھی قیمتی معلومات کا ذریعہ ہے؛ (۳) یورپی ماخذ میں اس زمانے کا ذکر P. Ricaut نے اپنی تصنیف *Histoire des trois derniers empereurs des Turcs depuis 1624 jusqu'a 1677*، پیرس ۱۶۸۳ء؛ اور اس کے علاوہ (۴) V. Hammer: *GOR*، ج ۵ و ۶؛ اور (۵) Zinkeisen: تصانیف (ج ۴ و ج ۵)؛ اور (۶) Gorgo (ج ۴)؛ نیز دیکھیے احمد رفیق کے مخصوص مقالات: (۷) کوپرولولر، قسطنطینیہ، ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء؛ (۸) قادینلر سلطنتی، قسطنطینیہ، ۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۴ء؛ اور (۹) فلاکت سنہ لری (۱۰۹۴ھ تا ۱۱۱۰ھ)، قسطنطینیہ ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء؛

[J. H. Kramers]

[سلطان] محمد پنجم رشاد: سلطنت عثمانیہ * کا پینتیسواں سلطان، جو ۲ نومبر ۱۸۴۴ء کو پیدا ہوا اور سلطان عبدالمجید کا بیٹا تھا۔ اپنے بھائی عبدالحمید ثانی کے دور حکومت میں وہ عزلت گزینی کی زندگی بسر کرتا رہا تھا۔ عبدالحمید اس کی موجودگی ہی سے اتنا خائف تھا کہ رشاد نام کے لوگوں کا ذکر بھی اس کے سامنے نہ کیا جاتا تھا (دیکھیے Snouck-Hurgronje: *Verspreide Geschriften*، ۳: ۲۳۲)۔ وہ نرم مزاج آدمی تھا اور اس کی تخت نشینی (۲۷ اپریل ۱۹۰۹ء) محض نوجوان ترکوں کی فتح کی وجہ سے ممکن ہوئی؛ اس کے علاوہ وہ ترکوں کی آئینی حکومت کا پہلا بادشاہ تھا، لیکن وہ ان مختلف النوع سیاسی رجحانات کی رہنمائی کرنے کے ناقابل تھا جو پارلیمنٹ کے اندر اور باہر انقلاب کے بعد کے سالوں میں رونما ہوتے رہے۔ جنوری ۱۹۱۳ء میں انجمن اتحاد و ترقی کی قطعی فتح کے بعد محمد خامس کو اپنی مرضی کے خلاف ان کی حکومت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اس کی حکومت کے آغاز ہی میں بوسنہ اور ہرزیگووینا میں ترکوں کا رہا سہا اقتدار بھی جاتا رہا اور ان صوبوں کو آسٹریا ہنگری نے اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ بلغاریا نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا (۵ اکتوبر ۱۹۰۹ء) اور اس طرح یہ ملک بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ حسین حلمی پاشا کی وزارت ۱۸ جنوری ۱۹۱۰ء تک اور اسمعیل حقی پاشا کی وزارت (رک بآں، ۲۹ ستمبر ۱۹۱۱ء تک) دونوں اندرون ملک میں امن قائم رکھنے سے قاصر رہے (البانیا کی بغاوت)۔ حقی پاشا کو اطالیا کے اعلان جنگ کی وجہ سے مستعفی ہونا پڑا، سعید پاشا (رک بآں) کی وزارت عظمی کے زمانے میں اطالوی جنگ کی وجہ سے طرابلس سے ہاتھ دھونا پڑے اور اس کی توثیق اوچی Ouchy

کے عہد نامے (۱۵ اکتوبر ۱۹۱۲ء) کی رو سے ہوگئی۔ یہ صلح نامہ انجمن اتحاد و ترقی کی مخالف وزارت احمد مختار پاشا کے زمانے میں طے ہوا، لیکن اسی مہینے میں جنگ بلقان شروع ہو گئی، جو بلقان کی اتحادی ریاستوں کے خلاف تھی۔ کامل پاشا کی رجعت پسند وزارت دول یورپ کے بیچ بچاؤ کے سامنے (لنڈن کانفرنس) جلد ہی تباہی آمیز صلح کرنے پر آمادہ ہوتی نظر آنے لگی۔ اس حالت میں ۲۳ جنوری ۱۹۱۳ء کو انجمن اتحاد و ترقی نے حکومتی انقلاب برپا کر دیا اور محمود شوکت پاشا کی قیادت میں اتحاد پارٹی کی حکومت برسر اقتدار آ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ پھر شروع ہو گئی اور بلغاریا کی شکست کے بعد ادرنہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا گیا (۲۲ جولائی ۱۹۱۳ء)۔ اس اثنا میں محمود شوکت کو حزب اختلاف کی لبرل پارٹی کے آدمیوں نے قتل کر دیا، لیکن اس سے سیاسی حالات میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ اس کی جگہ سعید حلیم پاشا مقرر ہوا جس کی حکومت نے بلغاریا سے ۲۹ ستمبر ۱۹۱۳ء کو، یونان سے ۱۴ نومبر اور سربیا سے ۱۴ مارچ ۱۹۱۴ء کو صلحناموں پر دستخط کیے۔ اس وقت سے لے کر انجمن اتحاد و ترقی، جس نے محمد رشاد کی حکومت کے آغاز ہی سے اپنی پس پردہ کاروائیوں کو جاری رکھا تھا، بہت مقتدر ہو گئی اور اس کے رہنما طلعت نے اور انور بے بیش از پیش میدان سیاست میں آگے نکل آئے۔ اس کے بعد جنگ عظیم کے شروع میں جب حکومت عثمانیہ نے اپنی غیر جنبہ داری کا فیصلہ کیا تو اتحاد پارٹی کی ہمدردی جرمنی کے ساتھ رہی جس کی وجہ سے ترکی اور اتحادیوں کے درمیان مناقشت بتدریج بڑھتی چلی گئی (گوبن Goeben اور برسلا Breslaw جہازوں کا واقعہ) تا آنکہ ترکی وسطی یورپی طاقتوں کا ساتھ دے کر جنگ میں شامل ہو گیا (ترکی بیڑا بحر اسود میں ۲۹ اور ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو)۔ فروری ۱۹۱۷ء میں طلعت پاشا خود صدر اعظم مقرر ہو گیا۔ اتحاد ثلثہ کی یہ کوشش کہ وہ کسی طرح درۂ دانیال میں گھس آئیں، جنوری ۱۹۱۶ء میں قطعی طور پر ترک کر دی گئی اور اس مدت میں ترک، مصر، عراق روس اور ایران کے سرحدی محاذوں پر لڑتے رہے۔ جنگ ختم ہونے سے پہلے محمد خامس ۳ جولائی ۱۹۱۸ء کو اچانک انتقال کر گیا۔

مآخذ: (۱) De la Jonquière: *Histoire de L'Empire Ottoman*، ۱۹۱۴ء، ج ۲؛ (۲) احمد امین: *Turkey in the World War*، New Haven ۱۹۳۰ء؛ ان کے علاوہ جنگ اور ترکی کی عام سیاست کے متعلق بہت سی کتابیں۔

(J. H. Kramers)

[سلطان] محمد ششم: وحید الدین، * سلطنت عثمانیہ کا آخری بادشاہ، جو ۱۴ جنوری ۱۸۶۱ء کو پیدا ہوا۔ وہ سلطان عبدالمجید کا بیٹا تھا۔ وہ ۳ جولائی ۱۹۱۸ء کو اپنے بھائی محمد خامس رشاد کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا کیونکہ سابق ولی عہد یوسف عز الدین بن عبدالعزیز کا انتقال ۱۹۱۶ء میں ہو چکا تھا۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو یعنی اس کی تخت نشینی کے کوئی چار مہینے بعد ہی، مدروس Mudros کے عارضی صلح نامے پر دستخط ہوگئے۔ اب وہ ایک ایسی سلطنت کا بادشاہ تھا جو محض اس کے سابقہ دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دی گئی تھی۔ ان کی افواج نے دارالخلافے پر قبضہ کر رکھا تھا اور ترکی کے دوسرے غیر مفتوحہ علاقے بھی انھیں کے قبضے میں تھے۔ اس کے علاوہ انجمن اتحاد و ترقی کی طاقت ٹوٹ چکی تھی، لیکن ۱۹۱۹ء کی ابتداء میں اناطولیا کے علاقے پر غیر ملکی قبضے کے برخلاف مخالفت

ترقی پذیر تھی اور اس کے ساتھ ہی انہیں حکومت قسطنطنیہ کی اطاعت سے بھی کچھ نفرت سی پیدا ہوگئی تھی۔ اب محمد سادس کو اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ وہ اپنا اور اپنے وزیر داماد فرید پاشا کا مستقبل اتحادیوں کے سپرد کر دے؛ چنانچہ وہ اتحادیوں سے مل گیا اور اس کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح قوم پرست عناصر کی سرگرمیوں کو دبا دیا جائے (آغاز ۱۹۲۰ء)۔ اس اقدام کو جو قومی مفاد کے منافی تھا، شیخ الاسلام کے ایک فتوے کے ذریعے جائز بھی قرار دے دیا گیا۔ چونکہ قومی تحریک کو بیش از بیش قوت حاصل ہوگئی تھی، اس لیے سلطان کا اقتدار و اختیار صرف قسطنطنیہ کی حدود میں اتحادیوں کی مدد سے قائم رہ سکا۔ اس کی حکومت کو سیورے Severes کے عہد نامے پر دستخط کرنا پڑے (۱۰ اگست ۱۹۲۰ء) اور توفیق پاشا کی وزارت نے اس عہد نامے کی توثیق کے لیے پارلیمنٹ کا اجلاس طلب کرنے کی کوشش کی، لیکن ۱۹۲۱ء میں معاملات اس قدر خراب ہو چکے تھے کہ اس نے اپنی حکومت کو ترکی کی نمایندگی کرنے کے لیے ناقابل پایا۔ قوم پرستوں کی آخری فتح کے باعث جو انہیں یونانیوں کے خلاف حاصل ہوئی (فتح سمرنا، ۹ ستمبر ۱۹۲۲ء) مُدانیہ کی عارضی صلح طے ہوگئی (۱۱ اکتوبر ۱۹۲۲ء) اور اس میں سلطان کی حکومت بطور فریق شامل نہ ہوئی۔ پھر بھی اسے لوزان Lausanne کی مؤتمر صلح میں انقرہ کی حکومت کے نمایندوں کے ساتھ ترکی کی نمایندگی کرنے کے لیے بلا لیا گیا، لیکن اس بات کو بویوک مجلس ملی نے قبول نہ کیا جس نے یکم نومبر ۱۹۲۲ء کو یہ اعلان کر دیا کہ عثمانی سلطنت ۱۶ مارچ ۱۹۲۰ء (تاریخ قبضۂ قسطنطنیہ) سے ختم ہو چکی ہے۔ توفیق پاشا کی وزارت اس اعلان کے مطابق مستعفی ہوگئی (۴ نومبر ۱۹۲۲ء) اور محمد سادس خلیفہ کی حیثیت میں قسطنطنیہ میں رہا۔ وہ ۱۰ نومبر کو اپنی آخری سلاملق تقریب کے لیے لوگوں کے سامنے آیا، لیکن جب چند روز کے بعد بویوک مجلس ملی نے وحید الدین پر غداری کے الزام میں مقدمہ چلانا چاہا تو یہ آخری عثمانی سلطان پناہ گزین کی حیثیت سے ایک انگریزی جہاز پر سوار ہو کر قسطنطنیہ کو چھوڑ کر چلا آیا (۱۷ نومبر ۱۹۲۲ء)، اور اس کے اگلے ہی روز حکومت انقرہ نے اس کے منصب خلافت سے محروم کر دیے جانے کا اعلان بھی کر دیا۔ پہلے وہ مالٹا گیا اور پھر شریف حسین شاہ مکہ کے پاس بطور مہمان جا ٹھہرا۔ یہاں سے اس نے اسلامی دنیا کے نام ایک اعلان شائع کرتے ہوئے اس امر کا اظہار کیا کہ خلافت کا سلطنت سے علیحدہ کر دینا خلاف شریعت ہے (متن در Oriente Moderno، ۲: ۶۰۲ تا ۶۰۷)۔ اس اپیل کا اسلامی دنیا پر بمشکل ہی کوئی اثر ہوا۔ یہ آخری عثمانی سلطان مکے سے روانہ ہو کر سان ریمو San Remo میں سکونت اختیار کرنے کے لیے چلا گیا جہاں ۱۶ مئی ۱۹۲۶ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔ ۱۹۲۴ء میں اس نے شریف حسین شاہ مکہ کے دعوے خلافت کو بھی تسلیم کر لیا تھا۔

مآخذ: (۱) Jaschke und Pritsch: *Die Turkei seit dem Weltkriege*، در *WI*، ج ۱۰، ۱۹۲۷ء/۱۹۲۹ء؛ اور ج ۱۲، حصہ (Heft) ۱-۲، ۱۹۳۰ء، جہاں تمہید میں تمام ترکی اور مغربی مآخذ تحریر کر دیے گئے ہیں۔

(J. H. KRAMERS)

محمد: ابو احمد، جلال الدولہ و جمال الملۃ * ابو احمد محمد، سلطان محمود غزنوی کا دوسرا بیٹا جو ۳۸۷ھ/۹۹۷ء کے قریب پیدا ہوا۔ اس کی شادی جوزجانان کے فریغونی بادشاہ ابونصر محمد بن ابوالحارث احمد بن محمد کی بیٹی سے ہوئی۔ ۴۰۱ھ/

۱۰۱۰-۱۰۱۱ء میں ابونصر محمد کی وفات کے بعد سلطان محمود نے اپنے بیٹے محمد کو جوزجانان کی حکومت سپرد کر دی۔ ۴۱۷ھ/۱۰۲۶ء میں سلطان محمود کی ترغیب پر عباسی خلیفہ القادر باللہ نے اسے جلال الدّولہ و جمال الملّۃ کا خطاب عطا فرمایا۔ اپنی زندگی کے آخر میں سلطان محمود نے اپنی سلطنت اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دی، چنانچہ غزنہ، خراسان اور ہندوستان محمّد کو دے اور رَیّ، جبال اور اصفہان مسعود کو ملے، اور اس نے دونوں بھائیوں سے حلف لیا کہ وہ اس کی تقسیم کا احترام کریں گے۔ جب ربیع الثانی ۴۲۱ھ/اپریل ۱۰۳۰ء میں محمود فوت ہو گیا تو محمّد غزنہ میں تخت نشین ہوا، لیکن مسعود نے اپنے حلف کا پاس نہ کرتے ہوئے، اصفہان سے غزنہ پر قبضہ کرنے کے ارادے سے کوچ کیا۔ اس دوران میں امراے غزنہ نے ۳ شوال ۴۲۱ھ/۹ اکتوبر ۱۰۳۰ء کو محمّد کو معزول کر دیا اور مسعود کے نام پر خطبہ پڑھا گیا، مسعود کے حکم سے محمّد کی آنکھیں نکلوا دی گئیں اور اسے ایک قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ اس نے صرف چھے ماہ تک حکومت کی۔

۴۳۱ھ میں سلطان مسعود کو سلجوقیوں نے تباہ کن شکست دی اور اس نے ہندوستان میں مستقل طور پر سکونت اختیار کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ۴۳۲ھ/ستمبر ۱۰۴۰ء میں غزنہ کا انتظام اپنے بیٹے مودود اور اپنے وزیر کے حوالے کر کے وہ اپنے تمام خزانوں سمیت ہندوستان کی طرف روانہ ہوا، لیکن ۱۳ ربیع الثانی ۴۳۲ھ/۲۱ دسمبر ۱۰۴۰ء کو اس کے غلاموں نے اسے معزول کر دیا اور اس کی جگہ محمّد کو تخت پر بٹھا دیا۔ اس سے کچھ ہی عرصے بعد مسعود کو قتل کر دیا گیا۔ یہ سن کر مودود نے ایک بہت بڑا لشکر ہمراہ لے کر اپنے باپ کی موت کا انتقام لینے کی غرض سے چڑھائی کی، اس نے محمّد کو دُنپور کے قریب ۳ شعبان ۴۳۲ھ/۸ اپریل ۱۰۴۱ء کو شکست دی اور اسے قتل کر دیا۔ محمّد کا دوسرا دور حکومت صرف ۴ مہینے تک قائم رہا۔

محمّد اپنے باپ کا فرمانبردار بیٹا تھا اور نہایت ہی خوش اخلاق آدمی تھا۔ وہ شکل و صورت میں اپنے باپ سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا۔

مآخذ: (۱) ابو سعید عبدالحیّ بن الضّحاک الگردیزی: کتاب زینُ الاخبار، طبع محمّد ناظم، در *Browne Mem. Series*، ج ۱؛ (۲) العُتبی: کتاب الیمینی، (مطبوعہ لاہور)، ص ۲۹۴ تا ۲۹۵؛ (۳) بے شمار منتشر حالات در تاریخ مسعودی، مصنفہ ابو الفضل بیہقی؛ (۴) ابن الاثیر (طبع Tornberg)، ۹: ۲۸۱، ۲۸۳ تا ۳۳۱، ۳۳۱ تا ۳۳۳؛ اور (۵) تاریخ فرشتہ (مطبوعہ بمبئی، ۱۸۳۲ء)، ص ۶۰ و ۶۸ تا ۶۹۔

(محمّد ناظم)

محمد آباد: رک بہ بیدر (محمد آباد)۔

* **محمد احمد بن عبداللہ:** مہدی سوڈانی!

وہ ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۳ء کے قریب دنقلہ کے جزیرۃ میں پیدا ہوا جو اَلعوردہ کے شمال میں واقع مجمع الجزائر ارگو کا ایک حصہ ہے۔ وہ نوبیہ کے عرب برابرہ میں سے کُنوز خاندان کا ایک فرد تھا، بعد کی زندگی میں مہدی نے حضرت علیؓ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم سے اپنی قرابت داری اور سلسلہ بیعت کو ثابت کرنے کے لیے اپنے حسب نسب کی جو تفصیل دی ہے اس کی رو سے باپ کی جانب سے اس نے حضرت امام حسنؓ سے اور والدہ کی جانب سے حضرت امام حسنؓ اور حضرت عباسؓ سے صلبی نسبت ظاہر کی۔ وہ جہاز میں کام کرنے والے ایک بڑھئی کا دوسرا بیٹا تھا؛ اس سے بڑی ایک بہن تھی اور تین بھائی بھی تھے۔ ابتدائی زمانے ہی سے اس کی طبیعت

تصوّف کی طرف مائل تھی اور معمولی ابتدائی تعلیم کے بعد اس نے ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۱ء میں سلسلۂ سمّانیہ میں شیخ محمّد شریف سے بیعت کی ۔ سات سال کی مریدی کے بعد شیخ محمّد شریف نے اسے اس سلسلے کی خلافت سے ممتاز کیا ۔ کچھ عرصہ خرطوم میں قیام کرنے کے بعد جہاں اس نے شادی بھی کر لی وہ نیل ابیض سے آبا نامی جزیرے میں چلا گیا جو کوستی کے شمال میں واقع ہے ۔ یہاں اس نے ایک جامع مسجد اور ایک خانقاہ بھی تعمیر کرائی اور مُریدوں کو اپنے گرد جمع کر کے وہاں قیام پذیر ہو گیا ۔ اس کے پیر و مرشد شیخ محمّد شریف بھی جن سے اس نے اپنے تعلقات برابر قائم رکھے تھے ، ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۲ء میں اس کے قریب ہی آ بسے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات محمّد کو کچھ ناگوار گزری ۔ اس واقعے کے کچھ عرصے بعد محمّد کے دل میں یہ القا ہوا کہ وہ مہدی المُنْتَظَر ہے ۔ یہ کیفیت ان روایات کے زیر اثر پیدا ہوئی جو مسلمانوں میں حضرت مہدی کے متعلق پائی جاتی ہیں ۔ اس وجہ سے اس کے تعلقات اپنے پیر و مرشد سے بگڑ گئے ۔ اب وہ اپنے پہلے شیخ طریقت کے حریف شیخ القرشی سے جا ملا اور ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء میں اسی کا سجّادہ نشین بھی بن گیا ۔ دُنقلہ سے سنار اور نیل ازرق سے کردفان تک کے علاقے میں سیاحت کے دوران اس نے بھانپ لیا کہ لوگوں میں بد دلی اور بے اطمینانی موجود ہے اور ان پر مصری حکومت کی جانب سے تشدّد ہو رہا ہے ۔ سوڈان کی شورہ پشت اور مخلوط آبادی ، اس کا مذہبی جنون ، ترکوں اور عربوں کا باہمی نفاق ، ترکوں کے حکمران طبقے سے شیعوں کی دیرینہ مخالفت ، یہ سب باتیں ایسی تھیں جو اس کی مہدویت کے دعوے کے لیے بار آور ثابت ہو سکتی تھیں ۔ محمّد احمد نے جو تحریک شروع کی وہ اس کے خطوط اور اعلانات کے مطابق اس کے روحانی واردات پر مبنی تھی جس کا اسے پورا یقین تھا ، اور شروع ہی سے یہ تحریک سیاسی اور معاشرتی خیالات سے مخلوط ہو گئی جو مشرق میں مذہب سے علٰیحدہ نہیں کیے جا سکتے ؛ آخر میں اس تحریک نے کچھ منفی رخ بھی اختیار کیا ۔ روایات میں بیان شدہ کلیے کے مطابق محمّد احمد نے یہ دعوٰی کیا کہ وہ دنیا کو "بدکاری اور بُرائی سے پاک کرنے" کی غرض سے آیا ہے ، اس غرض کے لیے اس نے سب سے پہلے تو لوگوں کو "ترکوں" کے خلاف جہاد کرنے کی دعوت دی ۔ اس سے قبل وہ کُردفان اور دارفُور کے متعدد سرداروں کو بیعت کے ذریعے حلف وفاداری ، [رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم] کے طریقے کے مطابق [متن کے لیے دیکھیے Dietrich ، در *Islam* ، ۱۹۲۵ء ، ص ۳۹] اپنے سے وابستہ کر چکا تھا اور عبداللہ التّعایشی ، جو بعد میں اس کا خلیفہ ہوا ، کے سے مردان کار کو اپنے ساتھ ملا چکا تھا ۔ اس کے علاوہ اس نے مختلف رسالوں اور فرمانوں کے ذریعے لوگوں کو اپنی تائید پر مائل کر لیا کہ حضرت رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے اسے زیارت سے مشرف فرمایا ہے اور آپؐ ہی نے اسے مہدی مقرر کیا ہے ، نیز یہ کہ اس نے حضرت خضرؑ ، جبرئیلؑ اور اقطاب، کی زیارت بھی کی ہے ، اور انہیں دعوت دی کہ "مذہبی زندگی کی تطہیر کریں"، لوگ "ہجرت" کر کے اس کے پاس آئیں اور اس کی بیعت کریں ، اسے مہدی مان کر اس کے پیچھے چلیں اور جہاد کریں وغیرہ وغیرہ ۔ دار تُوبہ میں قَدیر کی پہاڑی اس کی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی ۔ شعبان ۱۲۹۸ھ/جولائی ۱۸۸۱ء میں وہ پہلی مرتبہ المہدی کی حیثیت سے منظر عام پر آیا ۔ محمّد احمد کی جو

گُفت و شنید خرطوم کی حکومت سے ہوئی وہ بے سود ثابت ہوئی۔ ابو السُّعود کی قیادت میں فوج کے جو دو دستے اس کے خلاف بھیجے گئے، وہ تباہ کر دیے گئے؛ اس سے اسے اور فتوحات حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ مزید برآں مصری حکومت کو عرابی پاشا کی بغاوت کی وجہ سے زیادہ شدید کارروائی کرنے کا موقع نہ ملا۔ فاشودہ کے حاکم رشید پاشا، یوسف پاشا الشلّالی (گدیر میں، مئی ۱۸۸۲ء) اور اور ہکس Hicks پاشا شَیکان یا کَشگل میں) کی مہمات سب کی سب ناکام ہوئیں۔ اس طرح مہدیہ سلسلہ بلا روک ٹوک کُرد فان سے بحر الغزال کی راہ سے مشرقی سوڈان تک پھیل گیا۔ وہاں سَواکِن میں عثمان دِقنہ جو غلاموں کا تاجر تھا اور بعد میں مہدی کا قابل ترین سپہ سالار ثابت ہوا، محمد احمد کی ملازمت میں داخل ہو گیا۔ مہدی کی یہ خواہش بھی تھی کہ وہ المغرب کی جانب بھی اپنی طاقت کو بڑھائے، اور اس غرض سے اس نے محمد السنوسی سے جَغبُوب میں اور مراکو سے تعلقات و اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ وہ اپنے پورے عروج پر تھا کہ ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء کی مہم اسے خرطوم لے گئی جہاں جنرل گورڈن Gordon نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا، لیکن یہ مقام ۲۶ جنوری ۱۸۸۵ء کو مہدی کے قبضے میں آ گیا اور گورڈن مارا گیا۔ اس فتح کے بعد محمد احمد خود بھی زیادہ عرصے تک زندہ نہ رہ سکا؛ وہ ۹ رمضان ۱۳۰۲ھ/۲۲ جون ۱۸۸۵ء بعارضہ تپ محرقہ اُم دُرمان میں جو خرطوم کے قریب ہے، فوت ہو گیا۔ یہاں اس کے جانشین خلیفہ عبداللہ نے اس کے مزار پر ایک قُبّہ تعمیر کرایا۔ اب یہ مہدیوں کا صدر مقام بن گیا تاآنکہ کچنر Kitchener نے ۱۸۹۸ء میں عبداللہ کی حکومت اور سلسلۂ مہدیہ دونوں کا خاتمہ کر دیا۔

محمد احمد کی قیادت میں مہدیہ سلسلے کی تنظیم خاصی ترقی پا چکی تھی۔ یہ تنظیم جو ابتدا میں سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی پیروی کی دعوے دار تھی، بعد میں خالصۃً فوجی بن گئی کیونکہ جہاد کو حج سے زیادہ اہم مانا جاتا تھا۔ اس کے چار خلیفے اس کے پاس رہتے تھے جن میں سے التّعایشی اس کا بے حد گہرا دوست تھا اور اس میں شبہ نہیں کہ مہدی پر اس کا اثر نہایت گہرا تھا۔ مال غنیمت کی تقسیم میں خاص توجّہ سے کام لیا جاتا تھا اور اسی طرح بیت المال کے انتظام میں بھی احتیاط برتی جاتی تھی۔

محمّد احمد کی تعلیمات کی بعض خصوصیات سے نہایت مقبول عام تصوّف کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کا زاہدانہ رویّہ دنیاوی ترقی کے منافی تھا۔ مہدیۂ سلسلہ چونکہ رسمی تعلیم کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا، اس لیے تعلیم یافتہ طبقہ اس کے حلقۂ مریدین سے بالکل الگ تھلگ رہا؛ ان کے نزدیک قرآن پاک کے علاوہ اگر کسی چیز کو کوئی وقعت حاصل تھی تو وہ مہدی کے احکام تھے یا راتب (وظائف و اذکار کا مجموعہ) اور مجلس نامی ایک کتاب جس میں محمّد احمد کی جمع کردہ اور تالیف کردہ سنّہ (مجموعہ احادیث) تھی جو سنّت کی پہلی کتابوں کی جگہ مستعمل تھی، لیکن وہ نامکمل ہی رہ گئی۔ چاروں [فقہی] مذاہب کے ترک کرنے میں اس "اختلاف" کا اظہار ہوتا ہے جو صوفیہ میں اکثر پایا جاتا ہے۔ بعض قواعد و ضوابط میں وہّابیت کے اثرات کا زیادہ غلبہ معلوم ہوتا ہے، مثلاً آرایش و زیبایش، موسیقی، شادی بیاہ پر فضول خرچی، تمباکو نوشی، اور شراب نوشی منع تھی، بالخصوص پیر پرستی اور جھاڑ پھونک، تعویذ، گنڈوں کی مخالفت میں بھی بڑے غلو سے کام لیا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ محمّد احمد اپنی موت سے کچھ

پہلے اپنے پیروؤں اور معتقدین کی نظروں میں ایک دیوتا سا بن گیا تھا۔

محمد احمد نے [پانچ] ارکان سنہ کی جگہ حسب ذیل چھے ارکان مقرر کیے۔ (۱) صلوٰۃ، نماز باجماعت پر بے حد زور دیا گیا تھا؛ (۲) جہاد اہل سنت والجماعۃ کے عمل کے خلاف حج کے بدل کے طور پر؛ (۳) اللہ کے احکام کی اطاعت؛ (۴) اضافہ شدہ کلمۂ شہادت؛ (۵) تلاوت قرآن؛ (۶) راتب (یعنی وظائف واذکار)۔

چند خیالات اور بھی تھے، مثلاً یہ کہ امیر و غریب برابر ہیں۔ کچھ تو قدیم شیعیوں کی انقلابی خصوصیات کی باز گشت تھے اور کچھ اس وقت کے سیاسی اور معاشرتی حالات کے اقتضا کا نتیجہ تھے۔ عملی طور پر مہدیہ فرقے میں اتحاد و مساوات کا اصول بدرجۂ کمال کارفرما تھا، غلام اور غلاموں کے سوداگر ایک ہی جھنڈے تلے شانہ بہ شانہ ہو کر لڑتے تھے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بھی بلند ترین مرتبے پر پہنچ جاتا تھا۔ محمد احمد کے مسائل معاد اس امر پر مرکوز ہیں کہ مہدی کا تمام دنیا پر غلبہ ہو جائے گا۔ سوڈان کی فتح کے بعد مصر، مکّہ اور قسطنطینیہ کی فتح کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔

محمد احمد کی ذات کے متعلق طرح طرح کے افسانے ابتدا ہی میں مشہور ہونے لگ گئے تھے، بعض اوقات غالی معتقدین اس کے مکشوفات اور کرامات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے۔ اس کے ارشاد کی تعمیل میں اس کے درباری وقائع نویس اسمٰعیل عبدالقادر نے ایک مبالغہ آمیز سیرت موسومہ کتاب المُسْتَہدی الی سیرۃ الامام المَہْدی لکھ ڈالی۔ اس میں ۱۲۹۸ھ سے ۱۳۰۲ھ تک کے واقعات درج تھے لیکن اسے خلیفہ عبداللہ کے زمانے میں جلا دیا گیا۔ مصری مصنّف شُقَیر (دیکھیے نیچے) یہ دعوٰے کرتا ہے کہ اس کے ہاتھ اس کتاب کا ایک نسخہ لگ گیا تھا جو اس دستبرد سے بچ رہا تھا۔

مآخذ: (۱) نَعُوم شُقَیر: تاریخ السّودان، قاہرہ ۱۹۰۳ء (تیسرے حصے میں شُقیر نے محمد احمد، اور خلیفہ عبداللہ کے فرامین سے استفادہ کرتے ہوئے جنھیں جمع کر کے خلیفہ نے چھپوا دیا تھا اور اس کے علاوہ مذکورہ بالا سیرت اور اپنے تجربے کی بنا پر جو اسے انگریزی مصری فوج کی ملازمت کے دوران میں حاصل ہوا، محمد احمد اور خلیفہ عبداللہ کے عہد مہدیہ کا مفصل حال لکھا ہے)؛ (۲) جُرجی زیدان: روایات اسیر المُتَمہدی
قاہرہ ۱۸۹۲ء؛ (۳) مہدیہ کے خلاف مصری حکومت
کے دو فتووں کے متعلق دیکھیے Dietrich، در IsL،
۱۹۲۵ء، ص ۸۳؛ (۴) F.R. Wingate: Mahdiism
in the Egyptian Sudan، لنڈن ۱۸۹۱ء؛ (۵) وہی
مصنف: The Rise and Wane of the Mahd i religion
لنڈن ۱۸۹۳ء؛ (۶) Jos. Ohrwald: Aufstand u.
Reich des Mahdi، Innsbruck ۱۸۹۲ء؛ (۷) Slatin
Pasha: Fire and Sword in the Sudan، لنڈن ۱۸۹۶ء؛
(۸) Hasenclever، Geschichte Ägyptens im 19
Jahrhundert، Halle ۱۹۱۷ء؛ (۹) .Ernst L
Dietrich: Der Mahdi Mohammad Ahmad nach
arabischen Quellen، در Islam، ۱۹۲۵ء، ص ۱ تا ۹۰؛
(۱۰) J. Darmesteter: The Mahdi (مع دیگر مآخذ)،
لنڈن ۱۸۸۵ء؛ [(۱۱) محمد احمد الجابری: فی شان اللہ
اور تاریخ السّودان، مطبوعہ قاہرہ]۔

(DIETRICH)

محمد اسحاق خان (ہزارہ): صوبہ ⊛ بلوچستان میں اگرچہ اکثریت بلوچوں اور پشتونوں کی ہے مگر کچھ دوسرے قبائل کے علاوہ ہزارہ قبیلہ بھی نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے کوئٹہ اور نواح میں آباد ہے۔ ہزارہ قبیلہ کے

سربراہ کے طور پر سردار محمد اسحاق خان کا گھرانہ مسلم ہے۔ سردار صاحب پاکستان کی بری فوج کے ایک سابق کمانڈر انچیف اور سابق گورنر مغربی پاکستان جنرل موسیٰ خان کے چھوٹے بھائی تھے، والد کا نام سردار یزدان خان تھا۔ ۱۹۱۶ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ سردار محمد اسحاق خان نے کوئٹہ میں میٹرک تک تعلیم پائی، پھر پولیس میں ملازمت کر لی۔ انسپکٹر کا عہدہ چھوڑ کر ۱۹۵۳ء میں سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور مسلم لیگ میں شامل ہوئے، ہزارہ قبیلہ کی بڑی خدمات انجام دیں، کوئٹہ میں مری آباد اور قائد آباد نام کی دو بستیاں ہزاروں کیلئے انہیں کی بسائی ہوئی ہیں۔ سردار یزدان خان ہائی اسکول انہوں نے ہی قائم کرایا۔ اس کے متصل جامع امامیہ شیعہ رجسٹرڈ مدرسہ ہے۔ یہ بھی ان کی سعی و کوشش سے قائم ہوا۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دنوں میں رضا کاروں کی بھرتی اور وطن کی خدمات کے باعث ستارہ خدمت کا اعزاز ملا۔ وحدت مغربی پاکستان کے زمانے میں دو مرتبہ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ بلوچستان ریونیو کنٹرول بورڈ کے ممبر بھی تھے۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۷۳ء منگل کی صبح انتقال ہوا پسماندگان میں ایک بیوہ، دو بیٹے اور چھ بیٹیاں چھوڑیں۔ ایک بیٹا سردار محمد آصف خان فارن آفس میں ڈپٹی چیف آف پروٹوکول کے عہدے پر فائز ہوا۔

(غوث بخش صابر)

* **محمد اسعد**: رک بہ اسعد آفندی احمد

* **محمد اسعد**: رک بہ غالب دده

● **محمد اسماعیل بن عبدالغنی الشہید**: رک بہ اسمٰعیل شہید، شاہ

● **محمد اعلیٰ تھانوی**: مولوی محمد اعلیٰ بن علی بن محمد حامد بن محمد صابر، فاروقی نسباً، حنفی مسلکاً، تھانہ بھون ضلع مظفر نگر (بھارت) کے ایک نامور اہل علم و فضل خاندان کے چشم و چراغ، اپنے عہد کے جلیل القدر اور عظیم المرتبت عالم اور مصنف گزرے ہیں۔ متداولہ علوم عربیہ و اسلامیہ کی تحصیل و تکمیل اپنے والد مولانا علی بن محمد حامد سے کی جو جید عالم تھے۔ مولوی محمد اعلیٰ کے دادا قاضی محمد حامد عہدہ قضا پر فائز رہ چکے تھے۔ اور اپنے پردادا محمد صابر کو وہ خود اتقی العلماء کے لقب سے یاد کرتے ہیں (کشاف اصطلاحات الفنون، ص ۱)۔ مولانا محمد اعلیٰ سلطان عالمگیر اورنگ زیب کے عہد میں تھانہ بھون کے قاضی بھی رہے اور ان کی مہر پر یہ الفاظ کندہ تھے: خادم شرع والا قاضی محمد اعلیٰ (نزهۃ الخواطر، ۶: ۲۷۸)۔ ان کا علمی شاہکار کشاف اصطلاحات الفنون ہے جسے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۲ء میں کلکتہ سے شائع کیا [اس کی نقل حال ہی میں بیروت سے شائع ہوئی ہے]۔ یہ عظیم اور مفید کتاب بڑی تقطیع کے ۱۵۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے آخر میں نجم الدین الکاتبی القزوینی کے علم منطق سے متعلق دو رسالے بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔ یہ ضخیم کتاب ۱۳۱۷ھ میں آستانہ سے بھی شائع ہوئی۔ پھر اسے ۱۹۶۶ء میں بیروت سے شرکت خیاط نے شائع کیا جو طبع کلکتہ کا عکسی ایڈیشن ہے۔ کتاب کے سر ورق پر عنوان یوں درج ہے: موسوعۃ اصطلاحات العلوم الاسلامیہ المعروف بکشاف اصطلاحات الفنون۔

مصنف کشاف اصطلاحات الفنون نے اپنی کتاب کے دیباچے میں یہ بات رقم کی ہے کہ میں نے علوم عربیہ و شرعیہ کی تحصیل کے بعد علوم حکمت فلسفیہ یعنی طبیعیات اور الٰہیات، علم حساب، ہندسہ، ہیئت، اصطرلاب وغیرہ علوم کا مطالعہ ماہر اور تجربہ کار اساتذہ] کی زیر نگرانی

شروع کیا۔ پھر ایک عرصے تک ان علوم سے متعلق کتابوں کے مطالعے میں منہمک رہا۔ اس مطالعے کے دوران میں مختلف علوم و فنون کی مصطلحات کے اقتباسات جمع کر کے ان کو الگ الگ ابواب کے تحت، بترتیب حروف تہجی، مرتب کر دیا۔ کئی برسوں کی محنت اور کاوش سے ایک جامع کتاب تیار ہو گئی، جس کی ضرورت علوم اسلامیہ کے طلبہ شدت سے محسوس کرتے تھے۔ مؤلف موصوف اس کتاب کی تالیف و تدوین سے ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۵ء میں فارغ ہوئے اور اس کا نام کشّاف اصطلاحات الفنون رکھا۔ مولانا تھانوی کی محنت اور مطالعہ قابل داد اور لائق تحسین ہے کہ انہوں نے اسلامی علوم و فنون کے محققین کے لیے ایک نہایت مفید اور قیمتی ذخیرۂ معلومات جمع کر کے بے شمار اور مختلف النوع کتابوں کی ورق گردانی کی زحمت سے بچا لیا۔ در حقیقت یہ کتاب اسلامی علوم و فنون کا ایک قیمتی دائرۂ معارف ہے۔ کتاب کے صفحہ ۲ سے مقدمۂ کتاب شروع ہوتا ہے، جس میں علوم و فنون پر بڑی معلوماتی بحثیں آ گئی ہیں۔

اس اہم اور قیمتی کتاب کے علاوہ مصنف موصوف نے چند اور کتابیں بھی تحریر کی ہیں، جن میں سے سبق الغایات فی نسق الآیات (مطبوعہ ۱۳۱۶ھ) قابل ذکر ہے۔ تذکرہ علمائے ہند میں ایک کتاب متعلقہ اراضی ہند (مخطوطہ مسلم یونیورسٹی لائبریری، علی گڑھ) کا ذکر بھی ہے۔ تاریخ وفات کے بارے میں سوانح نگار خاموش ہیں۔ یہ امر تو یقینی ہے کہ وفات ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۵ء کے بعد تھانہ بھون میں ہوئی اور وہیں مدفون ہیں اور ان کا مزار مرجع زائرین ہے۔

مآخذ: (۱) سرکیس: معجم المطبوعات العربیہ، عمود ۶۳۵؛ (۲) عبدالحی الحسنی: نزہۃ الخواطر، ۶: ۲۲۸؛ (۳) رحمٰن علی: تذکرہ علمائے ہند، طبع و ترجمہ محمد ایوب قادری، کراچی ۱۹۹۱ء، ص ۵۸۸؛ (۴) جرجی زیدان: تاریخ آداب اللغۃ العربیہ، بیروت ۱۹۶۸ء، ۳: ۳۴۷؛ (۵) اسماعیل بغدادی: ایضاح المکنون (ذیل کشف الظنون)، ۲: ۳۵۲؛ (۶) خیرالدین الزرکلی: الاعلام، بذیل مادہ محمد بن علی تھانوی [عبدالقیوم رکن ادارہ نے لکھا]۔

(ادارہ)

محمد الیاسؒ: مولانا؛ حافظ محمد اسمٰعیل ⊛ صدیقی جھنجانوی کے صاحبزادے، کاندھلہ میں (جو ان کا ننہیال ہے) ۱۳۰۳ھ میں پیدا ہوئے (تاریخی نام: اختر الیاس)؛ والدہ بی بی صفیہ مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ (خلیفۂ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ؛ بعد میں حضرت سید احمد شہیدؒ سے بھی بیعت کی تھی) کے خاندان سے تھیں۔ بی بی صفیہ حافظۂ قرآن تھیں اور عابد و زاہد، متبع سنت، اور تقویٰ شعار گھرانے سے تھیں۔

مولانا محمد الیاس کے والد مولانا محمد اسمٰعیل، دہلی کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے سمدھیانے میں بچوں کو تعلیم دیتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد وہ بستی نظام الدین میں بنگلہ والی مسجد میں (جو تبلیغ کا مرکز ہے) رہنے لگے اور اسی مسجد میں بقیہ زندگی بسر کی۔ وفات کے بعد اسی مسجد کے جنوب مشرقی گوشے میں مدفون ہوئے۔ مسجد کے اطراف میں جو مسلمان آباد ہیں، وہ مولانا محمد اسمٰعیل کے فیوض سے مستفید ہوتے رہے۔ مولانا کی پہلی بیوی سے مولانا محمدؒ تھے، جنہوں نے اپنے والد کے انتقال کے بعد بہت کچھ دینی خدمات انجام دیں۔ اصلاح میوات کا کام انہی سے شروع ہوا تھا، لیکن بالکل ابتدائی درجے میں تھا۔ ان سے پہلے مولانا محمد اسمٰعیلؒ صاحب اپنی وسعت اخلاق اور بزرگانہ صفات کے ذریعہ میوات سے کچھ ربط و تعلق پیدا کر چکے تھے۔

مولانا محمد الیاس نے خاندانی دستور کے مطابق بچپن ہی میں قرآن شریف حفظ کر لیا اور ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ فارسی کی تحصیل بھی کی ۔ شوال ۱۳۱۱ھ میں ان کے حقیقی برادر کلاں مولانا محمد یحییٰ (والدِ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ محدث مظاہر العلوم سہارنپور) مولانا رشید احمدؒ گنگوہی کی خدمت میں گنگوہ چلے گئے اور وہیں قیام اختیار کر لیا ۔ بھائی کو بھی وہیں لے گئے اور ان کو پڑھانا شروع کیا ۔ یہ ۱۳۱۴ھ یا شروع ۱۳۱۵ھ کی بات ہے ، گنگوہ اس وقت صلحا و فضلا کا مرکز تھا ۔ تقریباً دس برس تک ان کو مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی صحبت اور مجالس کی شرکت شب و روز حاصل رہی ۔ اس دینی و روحانی ماحول نے بھی ان کی زندگی پر بڑا اچھا اثر ڈالا ۔ مولانا گنگوہیؒ بالعموم بچوں اور طالب علموں کو بیعت نہیں کرتے تھے ، لیکن محمد الیاسؒ کی ذہانت اور ان کے غیر معمولی حالات کی بنا پر انھیں بیعت کر لیا ۔

۱۳۲۶ھ میں دارالعلوم دیو بند میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور صحیح بخاری اور جامع ترمذی کی سماعت کی ۔ اس کے کئی سال بعد شب و روز کی مسلسل محنت کے ساتھ اپنے بھائی مولانا محمد یحییٰؒ سے دورۂ حدیث مکمل کیا ۔ مولانا گنگوہیؒ کی وفات ۱۳۲۳ھ کے بعد انھوں نے شیخ الہندؒ سے تجدید بیعت کی درخواست کی ۔ شیخ الہندؒ نے مولانا خلیل احمد انبیٹھویؒ شارح ابو داؤد سے بیعت ہونے کا مشورہ دیا؛ چنانچہ ان سے تعلق قائم کر کے ان کی رہنمائی میں منازل سلوک طے کیں ۔

۱۳۲۸ھ میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں مدرس ہو گئے اور کئی سال وہاں درس دیا ۔ ۱۳۳۴ھ میں مولانا محمد یحییٰؒ نے اور اس کے دو سال بعد ۱۳۳۶ھ میں ان کے بڑے بھائی مولانا محمدؒ نے انتقال کیا ۔

مولانا محمدؒ بستی نظام الدین میں تبلیغی و دینی فضا تیار کر رہے تھے؛ ان کی کوشش سے وہاں ایک چھوٹا سا مدرسہ بھی قائم ہو گیا تھا، جس میں میواتی و غیر میواتی طلبہ پڑھتے تھے ۔ اب اس مدرسے کے انتظام کے لیے مولانا الیاسؒ کو آنا پڑا ۔ مدرسے کی کوئی مستقل آمدنی نہ تھی ۔ بڑی تنگی کے ساتھ گزران ہوتی تھی ۔ کبھی کبھی فاقے تک کی نوبت بھی آ جاتی تھی ۔ وہ تعلیم و تدریس میں خاص طرز رکھتے تھے ۔ طلبہ میں علمی رنگ شروع ہی سے پیدا کرنا چاہتے تھے ۔ حدیث کا درس دیتے تو پہلے وضو کرتے ، پھر دو رکعت نفل پڑھتے اور فرماتے کہ حدیث کا حق تو اس سے بھی زیادہ ہے ، یہ اقل درجہ ہے ۔ حدیث پڑھاتے وقت کسی سے بات نہ کرتے ۔ کوئی معزز آدمی آ جاتا تو درس چھوڑ کر اس کی طرف التفات نہ کرتے ۔

انھوں نے تین حج کیے ؛ پہلا حج ۱۳۳۳ھ میں ، دوسرا ۱۳۴۴ھ میں ۔ اس مرتبہ ان کا حرمین شریفین میں پانچ ماہ قیام رہا ۔ آخری حج ۱۳۵۶ھ میں کیا ۔ اس مرتبہ مکہ مکرمہ میں مختلف مقامات پر آپ نے اجتماعات کیے اور لوگوں کو خطاب کیا ۔ حکومت حجاز و نجد کے بعض اعیان و علما سے دینی جد و جہد کے بارے میں گفتگو بھی کی ۔

۱۹۲۳ء میں شدھی تحریک نے زور پکڑا ۔ انھوں نے ایسے وقت میں میوات کے علاقے میں بڑے پیمانے پر پوری قوت صرف کر کے کام شروع کر دیا ۔ میوات کا علاقہ وسیع ہے اور میواتی قوم کئی لاکھ کی تعداد میں ہے ۔ ان کا پیشہ کاشتکاری اور مویشی پالنا تھا ، لیکن یہ لوگ حد درجہ لڑاکا اور جرائم پیشہ تھے ۔ کہنے کو مسلمان تھے ، لیکن کام اور نام تک مسلمانوں کے نہیں تھے ۔ انھوں نے میوات کے علاقے کا دورہ کیا ۔ کبھی میلوں پیدل

چل کر اور کبھی بیل گاڑی میں بیٹھ کر اور جہاں سڑک تھی موٹر پر پورے علاقے میں سالہا سال پھرتے رہے اور جگہ جگہ مسجدوں اور مکتبوں کا انتظام کیا۔ ہر جگہ وعظ کہا۔ لوگوں سے ملے، انھیں دین سے مانوس کیا، کلمہ سکھایا، اس کا مفہوم بتایا۔ دینی تعلیم دی۔ جو جان چکے اور سیکھ چکے ان کو آگے بڑھایا اور دوسروں کو سکھانے کا کام ان کے سپرد کیا۔ جو اہل نظر آئے ان کو ذکر و فکر کی تلقین کی؛ جو تعلیم دینے کے اہل معلوم ہوئے ان کو تحصیل علم پر مامور کیا۔ ان کے وفود، اس شرط کے ساتھ کہ وہ کھانے پینے اور سفر کا کل خرج اپنی جیب سے کریں گے، گاؤں گاؤں پہنچے۔ اس طرح میوات کی زمین مخلص مبلّغین کا مرکز بن گئی۔ میوات کے کام کے ساتھ دہلی اور یو۔ پی میں بھی اس دینی تحریک کو عام کرنے کی کوشش کی گئی۔ پنجاب اور یو۔ پی کے خصوصاً دوآبے کے بہت سے مقامات پر جماعتیں بھیجیں اور جماعتوں میں اہل علم اور دیندار حضرات سے دینی تعلیم حاصل کرنے کی طلب پیدا کی۔ خود بھی بڑی بڑی جماعتوں کے ساتھ یو۔ پی کے علاقے میں تشریف لے گئے۔ ان کو سواحل پر کام پھیلانے کی بڑی آرزو تھی؛ چنانچہ ان کی زندگی میں دو مرتبہ کراچی کو تبلیغی وفود روانہ ہوئے۔ انھوں نے عبادات، علم و ذکر، اخلاص اور اکرام مسلم پر بہت زور دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنی خامیوں کا احساس پیدا کرنے اور دینی فضاؤں کو ترقی دینے کے لیے تمام مسلمان جد و جہد کریں اور اپنے فارغ اوقات میں ہر طبقے اور ہر گروہ کے مسلمان جماعتیں بنا بنا کر باہر نکلیں۔ ان کے نزدیک کچھ عرصے کے لیے اپنے ماحول سے باہر نکلنا مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو سنوارنے اور آخری زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے ضروری تھا۔ اس سلسلے میں ایک واضح طریق کار اور نظام کار ان کے پاس تھا جس کے علمی نمونے انھوں نے اپنے فیض یافتگان اور صحبت یافتگان کے سامنے پیش کیے۔ اس طریقے پر کام کرنے سے بہت اچھے اثرات مرتب ہوئے اور بیس سال کے عرصے میں میوات و بیرون میوات میں لاکھوں افراد پر مشتمل ایک صالح اور دیندار سوسائٹی ظہور پذیر ہو گئی۔

۲۱ رجب ۱۳۶۳ھ / ۱۳ جولائی ۱۹۴۴ء پنجشنبہ کی رات وفات پائی اور اپنے والد اور بھائی کے پہلو میں بستی نظام الدین کی مرکزی مسجد کے گوشے میں مدفون ہوئے۔

ان کے پسماندگان میں ایک فرزند مولانا محمد یوسفؒ تھے جو اپنے والد کے جانشین بنے۔ انھوں نے اس دعوتی کام کی رفتار کو تیز سے تیز تر کر کے اسے عالم اسلامی کے گوشے گوشے تک پہنچایا۔ ایک صاحبزادی (اہلیہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ) تھیں۔

ان کے خلفا حسب ذیل ہیں:

(۱) صاحبزادہ مولانا محمد یوسفؒ؛ (۲) مولانا حافظ مقبول حسن گنگوہی؛ (۳) مولانا سید رضا حسن (نبیرۂ مولانا سید احمد دہلوی، سابق مدرس دارالعلوم دیوبند)؛ (۴) قاری محمد داؤد؛ (۵) مولانا احتشام الحسن کاندھلویؒ؛ (۶) مولانا انعام الحسن۔

مآخذ: (۱) سید سلیمان ندوی: یاد رفتگاں، کراچی ۱۹۸۳ء؛ (۲) سید ابو الحسن ندوی: مولٰنا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت، در الفرقان، ۱۳۶۳ھ۔

(ابو الحسن علی ندوی)

محمد امین میر: رک بہ برہان الملک * سعادت خان۔

محمد انور شاہ (سید): نامور محدث، ⊗ ممتاز مصلح عالم اور دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس۔ وہ ۲۷ شوال ۱۲۹۲ھ/۲۶ نومبر ۱۸۷۵ء کو

دودھواں (علاقہ نولاب، کشمیر) میں پیدا ہوئے۔ قرآن پاک کے علاوہ فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم مولانا غلام محمد سے حاصل کی۔ دارالعلوم دیوبند کی شہرت سن کر ۱۳۰۷ھ-۱۳۰۸ھ میں بعمر سولہ سترہ سال دیوبند چلے گئے۔ وہاں انھوں نے چار سال رہ کر مولانا محمود حسنؒ [رک باں] اور مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ اور دیگر اساتذہ سے استفادہ کیا اور ۲۰-۲۲ برس کی عمر میں نمایاں شہرت کے ساتھ سند فراغ حاصل کی۔ دیوبند سے فارغ ہو کر مولانا رشید احمد گنگوہیؒ [رک باں] سے بیعت ہوئے اور ان سے سند حدیث کے علاوہ فیوض باطنی بھی حاصل کیے۔ طب کی تعلیم کے لیے حکیم واصل خاں کی خدمت میں دھلی حاضر ہوئے اور ان سے علم طب کی کتابیں پڑھیں (بدر عالم میرٹھی: مقدمۂ فیض الباری، ص ۱۷ تا ۲۰، قاہرہ ۱۹۳۸ء؛ انظرشاہ مسعودی: نقش دوام، ۲۷ تا ۳۲، دھلی ۱۹۷۸ء)۔

تعلیم سے فارغ ہو کر وہ تین چار سال تک مدرسۂ امینیہ دھلی میں بطور مدرس اول کام کرتے رہے۔ ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں وہ بعض مشاہیر کشمیر کی رفاقت میں زیارت حرمین الشریفین سے مشرف ہوئے۔ سفر حجاز میں انھوں نے شیخ حسین جسر طرابلسی (مصنف رسالہ حمیدیہ) سے سند حدیث حاصل کی۔ اس کے بعد دارالعلوم دیوبند کے مشہور جلسہ دستار بندی میں شرکت کے لیے دیوبند مدعو کیے گئے اور جلسے کے بعد دارالعلوم ہی میں مدرس مقرر ہو گئے اور کئی برس تک کتب حدیث کا درس دیتے رہے (محمد ازہر شاہ: حیات انور، ص ۴ تا ۶، دھلی ۱۹۵۵ء)۔

حضرت شیخ الہندؒ کی وفات (۱۹۲۰ء) کے بعد شاہ صاحبؒ باضابطہ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ ان کے زمانہ صدارت میں ایک طرف بنگال، برما اور ملائشیا اور دوسری طرف ترکستان اور سواحل افریقیہ سے طلبہ نے دیوبند پہنچ کر ان سے علمی فیض حاصل کیا (محمد یوسف بنوری: مشکلات القرآن، ص ۳ تا ۴، دھلی ۱۳۵۷ھ و کراچی)۔

اکتوبر ۱۹۲۷ء میں انھوں نے جمعیۃ علماے ہند کے سالانہ اجلاس بمقام پشاور کی صدارت کی۔ خطبہ صدارت میں انھوں نے صوبہ سرحد کی جغرافیائی اہمیت، انگریزوں کے مظالم اور آزاد قبائل کی مزاحمت کا ذکر کیا۔ صوبہ سرحد کے لیے دوسرے صوبوں کے برابر آئینی اصلاحات و مراعات کا مطالبہ کیا؛ نیز مظلوم مسلمان عورتوں کے ارتداد کے تدارک، رسوم قبیحہ کی اصلاح اور لڑکیوں کے لیے باپ کے ورثے میں شرعی حق دینے کی دعوت دی (انظر شاہ مسعودی: نقش دوام، ص ۲۰۲ تا ۲۴۷، دھلی ۱۹۷۸ء)۔

اجلاس کے بعد جب منتظمین دارالعلوم سے بعض اصلاحات کے سلسلے میں اختلاف ہوا تو وہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا بدر عالم میرٹھیؒ اور بہت سے علما اور کئی سو طلبہ کی ایک جماعت کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (سورت) تشریف لے گئے اور وہاں ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۱ء تک تعلیم و تدریس کا مشغلہ جاری رکھا۔

عمر کے آخری دور میں شاہ صاحب کی توجہ قادیانیت کی تردید و ابطال پر مرکوز ہو گئی تھی۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کو تبلیغ و اشاعت اور تصنیف و تالیف سے اس کے مقابلے کی دعوت دی۔ علامہ اقبال نے شاہ صاحب کی تحریک پر اپنا مبسوط مقالہ *Islam and Ahmadism* لکھا (نیز دیکھیے مفتی محمد شفیع: قادیانی فتنہ، در حیات انور، مؤلفہ محمد ازہر شاہ، ص ۲۴۷ تا ۲۹۹، دھلی ۱۹۵۵ء)۔ ۱۹۲۳ء میں انھوں نے ڈسٹرکٹ جج

بہاول پور کی عدالت میں وہ تاریخی بیان دیا، جو قادیانیت پر سیر حاصل تبصرہ اور بانی قادیانیت کے دعاوی اور مزعومات پر برہان قاطع کا درجہ رکھتا ہے۔ ۳ صفر ۱۳۵۲ھ/۲۹ مئی ۱۹۳۳ء کو فوت ہوئے اور دیوبند ہی میں آسودۂ خواب ہوئے۔

علم و فضل: بقول سید سلیمان ندوی "مولانا محمد انور شاہ وسعت نظر، قوت حافظہ اور کثرت حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے، علوم حدیث کے حافظ اور نکتہ شناس، علوم ادب میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعر و سخن سے بہرہ مند اور زہد و تقوٰی میں کامل تھے" (یادرفتگان، ص ۱۳۶، مطبوعہ کراچی)۔ ان کی جلالت قدر کے لیے یہ امر کافی ہے کہ مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی . . . اور علامہ اقبالؒ بعض علمی مشکلات کے لیے ان سے رجوع کیا کرتے تھے (سعید احمد اکبر آبادی: ایسے کہ مجموعہ خوبی بچہ نامت خوانم، در حیات انور، ص ۱۹۳ تا ۱۹۹)۔

شاہ صاحب کے حلقہ درس سے ہزاروں طلبہ فیض یاب ہو کر نکلے۔ ان میں ممتاز ترین یہ ہیں: مولانا مناظر احسن گیلانی، مفتی محمد شفیع (کراچی)، محمد ادریس کاندھلوی، بدرعالم میرٹھی، محمد یوسف بنوری (کراچی)، مولانا محمد طیب، مہتمم دارالعلوم دیوبند، حبیب الرحمن اعظمی (مئو، اعظم گڑھ)، سعید احمد اکبر آبادی اور محمد چراغ (گوجرانوالہ)۔ ان میں سے ہر ایک کی دینی اور علمی خدمات اپنی جگہ گراں قدر ہیں (عبدالرشید ارشد: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ۲۹۷ تا ۲۹۸)۔

تصانیف: شاہ صاحب نے قرآن مجید، احادیث و فقہ اسلامی کی بعض مشکلات، علم کلام کے مسائل، خلافیات امت اور عقاید محمدیہ کے اہمات و اصول پر بعض رسائل یادگار چھوڑے ہیں اور یہ عربی زبان میں ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے درس حدیث کی تقاریر اور مختلف یادداشتوں کو ان کے تلامذہ نے مرتب کر کے شائع کیا ہے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) مشکلات القرآن (مطبوعۂ دہلی)، قرآن مجید کی بعض مشکل آیات کی تشریح پر یادداشتوں کا مجموعہ، جسے محمد یوسف بنوری نے شائع کیا ہے۔ ابتدا میں فاضل مرتب کا ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں مختلف تفاسیر، ان کی امتیازی خصوصیات کا بیان اور علوم اعجاز القرآن کے بارے میں بصیرت افروز معلومات ہیں؛ (۲) فیض الباری بشرح صحیح البخاری (قاہرہ ۱۹۳۸ء)، یہ شاہ صاحب کے درس صحیح بخاری کی املائی شرح ہے، جسے مولانا بدر عالم میرٹھیؒ اور مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے عربی زبان میں مرتب کر کے چار ضخیم جلدوں میں قاہرہ سے شائع کرایا ہے۔ یہ شرح قرآن، حدیث، کلام، فلسفہ اور معانی و بلاغت کے اہم مباحث پر مشتمل ہے؛ (۳) انوار المحمود فی شرح سنن ابی داؤد، سنن ابی داؤد کے درس کی املائی شرح و تقریر ہے، جسے مولانا محمد صدیق نے جمع کر کے دو جلدوں میں شائع کیا ہے؛ (۴) عرف الشذی بشرح جامع الترمذی، شاہ صاحب کے درس جامع ترمذی کی املائی شرح، جس کو مولانا محمد چراغ (گوجرانوالہ) نے بوقت درس قلمبند کیا تھا، اس کا دوسرا ایڈیشن حال ہی میں شائع ہوا ہے؛ (۵) عقیدة الاسلام فی حیاة عیسٰی علیہ السلام: اس کتاب میں عقیدہ حیات مسیح علیہ السلام کے بارے میں قرآن مجید کی آیات کی تفصیل ہے؛ (۶) تحیة الاسلام فی حیاة عیسٰی علیہ السلام: اس میں عقیدة الاسلام کی تعلیقات اور اس پر اضافات ہیں؛ (۷) التصریح بما تواتر فی

نزول المسیح (مطبوعۃ بیروت) ، نزول مسیح علیہ السلام کے متعلق احادیث و آثار صحابہؓ کو بڑی تحقیق و دیدہ ریزی سے جمع کر دیا گیا ہے۔ مفتی محمد شفیعؒ نے اس پر مقدمہ بھی لکھا ہے ؛ (۸) اکفار الملحدین فی ضروریات الدین ، ۱۲۸ صفحہ کا ایک معلومات افروز رسالہ ہے جس میں کفر و ایمان کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے ؛ (۹) فصل الخطاب فی مسئلۃ ام الکتاب : اس کا موضوع فاتحہ خلف الامام کا نزاعی مسئلہ ہے، جس پر حنفی نکتہ نظر سے اظہار خیال کیا گیا ہے ؛ (۱۰) نیل الفرقدین فی مسئلۃ رفع الیدین (مطبوعۃ دھلی) ۱۴۵ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں مسئلہ خلافیہ نماز میں رکوع سے پہلے اور بعد میں ہاتھ اٹھانے پر تحقیق فرمائی ہے ؛ (۱۱) ضرب الخاتم علی حدوث العالم (مطبوعہ دھلی) ، علم کلام و فلسفہ کے معرکۃ الآرا موضوع حدوث عالم پر براہین و دلائل اور شواہد کو چار سو اشعار میں پیش کیا ہے۔ علامہ اقبال کو یہ رسالہ بہت پسند تھا ؛ (۱۲) خاتم النبیین (فارسی) ، عقیدہ ختم نبوت میں مفید رسالہ ہے ، اس کے مباحث نہایت دقیق ہیں ؛ (۱۳) خزینۃ الاسرار (مطبوعہ دھلی)، اس میں دمیری کی کتاب حیاۃ الحیوان سے کچھ مجربات اور اذکار وغیرہ جمع کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ مسئلہ وتر اور علم غیب پر بھی رسائل ہیں (محمد یوسف بنوری : نفحۃ العنبر ، ص ۱۱۱ تا ۱۳۹).

مآخذ : (۱) محمد یوسف بنوری : نفحۃ العنبر ، کراچی ۱۹۶۹ء ؛ (۲) وہی مصنف : مقدمہ مشکلات القرآن ، ص ۲ تا ۳ ، مطبوعہ دھلی ؛ (۳) بدر عالم میرٹھی مقدمہ فیض الباری ، ص ۱۷ تا ۲۰ ، قاھرہ ۱۹۳۸ء ؛ (۴) عبدالحی : نزھۃ الخواطر ، ۸ : ۸۰ تا ۸۳ ، مطبوعہ حیدر آباد دکن ؛ (۵) کریم بخش : جزاء الاحسان، لاھور ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء ؛ (۶) محمد ازھر شاہ : حیات انور ، دھلی ۱۹۵۵ء ؛ (۷) انظر شاہ مسعودی : نقش دوام ، دھلی ۱۹۷۸ء ؛ (۸) عبدالرشید ارشد : بیس بڑے مسلمان، ص ۳۷۰ تا ۴۰۰، لاھور ۱۹۷۰ء ؛ (۹) سید سلیمان ندوی : یاد رفتگان ، ص ۱۴۶ ، مطبوعہ کراچی [نذیر حسین رکن ادارہ نے لکھا] ؛

(ادارہ)

محمد ایوب خان : رک بہ پاکستان. ⊗

محمد باقر مجلسی : مجلسی اول محمد تقی ® کا تیسرا بیٹا اور مؤلف کتاب بحار الانوار ؛ وہ ۱۰۳۷ھ میں اصفہان میں ایک صوفی منش گھرانے میں پیدا ہوا اور اس کی پرورش بھی عرفانی ماحول میں ہوئی۔ اس نے گیارھویں صدی میں جب اس کی عمر چالیس برس کی تھی ، مذھب شیعہ کی دائرۃ المعارف بحار الانوار کی تالیف شروع کی۔ ۱۰۹۸ھ میں جب وہ اکسٹھ سال کا تھا شیخ الاسلام کے سرکاری منصب پر مامور ہوا اور ۲۷ رمضان ۱۱۱۰ھ کو وفات پائی اور اسی شہر کی پرانی مسجد جامع میں دفن ہوا۔ مجلسی کی شہرت خود اس کی زندگی میں بھی بہت کچھ تھی۔ شاہ عبدالعزیز دھلوی نے تحفہ اثنا عشریہ (ص ۱۰۸ ، مطبوعہ نولکشور ۱۸۸۵ء) میں اسے شیعوں کا سب سے بڑا عالم شمار کیا ہے۔ مجلسی گیارھویں صدی کے مشہور فارسی مصنفین میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی تصانیف نے شیعی مذھب رکھنے والوں کو ایسا متاثر کیا کہ اس کی عربی تالیفات بھی بعد میں فارسی میں ترجمہ ہوئیں اور ان میں سے بعض کا ترجمہ اردو اور ترکی میں بھی ہوا۔

مجلسی کا خاندان اور اس کے باپ دادا : صاحب ریاض العلماء ابو نعیم اصفہانی (۳۳۶-۴۳۰ھ) کے حالات میں لکھتا ہے کہ وہ خاندان مجلسی کا جد امجد تھا ، لیکن خود مجلسی کے باپ دادا کے نام کے متعلق جو کچھ معلوم ہے وہ یہ ہے :

محمد باقر بن محمد تقی بن مقصود علی ۔

محمد تقی کا باپ یعنی مقصود علی صوفی و شاعر تھا اور مجاسی تخلص کرتا تھا اور شاید اس تخلص کا کچھ ربط صوفیوں کی مجلسوں اور سماع کے ساتھ بھی ہو ۔ شاعروں کے تذکروں میں چند اشخاص کا مجلسی کے نام سے ذکر آیا ہے اور مقصود علی ان میں سے ایک ہے (ذریعہ، ۹ : ۹۶۶) اور کہتے ہیں کہ یہ محتشم کاشانی کا شاگرد تھا ۔

محمد تقی کی والدہ ملا درویش محمد اصفہانی کی دختر تھی جو شہید دوم کا شاگرد اور شیخ حسن عاملی کا فرزند تھا ۔

محمد تقی (۱۰۰۳ تا ۱۰۷۰ھ) نے اصفہان میں اسی صوفی خاندان میں نشو و نما پائی ۔ ۱۰۳۸ھ میں نجف کا سفر کیا ۔ فیض القمی نے مرآۃ الاحوال سے نقل کیا ہے کہ مجلسی جب تک نجف میں رہا اس بات میں مشہور ہوا کہ وہ اشغال صوفیہ میں مشغول رہتا ہے ۔ شیعہ علما میں محمد تقی ”مجلسی اول“ مشہور ہے اور کبھی اسے (ملای مجلسی) بھی کہتے ہیں اور اس کے بیٹے محمد باقر مجلسی دوم کو علامہ مجلسی کہتے ہیں ۔

محمد تقی مجلسی ملا عبداللہ شوشتری (م ۱۰۲۱ھ) اور شیخ بہائی (م ۱۰۳۰ھ) کا شاگرد تھا اور خود اس کے بھی بہت سے شاگرد ہیں ۔

اسی ضمن میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مجلسی اول کی مشہور کتابوں اور ان کی اولاد کا ذیل میں ذکر کر دیا جائے :

(۱) و (۲) کتاب من لا یحضرہ الفقیہ کی دو شروح، ایک فارسی میں دوسری عربی میں ، جن میں سے پہلی ایران میں سنہ ۱۳۳۱ھ کے اندر چھپ چکی ہے ؛ (۳) شرح تہذیب ، نا تمام ؛ (۴) شرح زیارت جامعہ ؛ (۵) اصول کافی پر حاشیہ ؛ (۶) شرح صحیفۂ سجادیہ ؛ (۷) شرح مشیخۃ من لا یحضرہ الفقیہ ؛ (۸) رسالہ در رضاع ؛ (۹) رسالہ در حج ۔

محمد تقی مجلسی کے تین بیٹے تھے ، جن کے نام حسب ذیل ہیں : ۱۔ عزیز اللہ ؛ ۲۔ عبداللہ ؛ ۳۔ محمد باقر (مجلسی دوم، صاحب بحار) ؛ اور چار بیٹیاں بھی تھیں، جن میں سے ہر ایک کی شادی اس زمانے کے کسی نہ کسی عالم سے ہوئی: (۱) زوجۂ ملا صالح مازندرانی ”آمنہ بیگم“ صاحب قلم (مصنف) اور محمد باقر مجاسی کی شریک کار تھی؛ نیز اپنے شوہر کی تالیفات میں بھی شریک رہی؛ (۲) زوجۂ ملا محمد علی استر آبادی ؛ (۳) زوجۂ محمد حسن شیروانی صاحب تعلیقات جو مشہور فلسفی ہے ؛ (۴) زوجۂ میرزا کمال فسائی شارح شافیہ ۔

ان تین بیٹوں اور چار بیٹیوں کی اولاد آج تک ایران میں خاندان مجلسی کے نام سے مشہور ہے اور ان میں بہت سے عالم اور مصنف ہوئے ہیں ۔

مجلسی اور تصوف : دسویں صدی ہجری کے آغاز میں ایران میں حکومت صفویہ کی بنیاد امرا کے گروہ کی بدولت جو صوفی منش تھے استوار ہوئی ۔ اس صدی کے سب شاعر گرم رفتار صوفی اور وحدت الوجودی تھے ۔ اس صدی کے آخری ربع میں منظم ادارے نہ ہونے کی وجہ سے صوفیوں کے پیشواؤں میں اختلافات رونما ہوئے اور اس کے نتیجے میں دربار ، جو ان کا سیاسی مرکز تھا ، اضطراب سے دو چار ہو گیا ۔ شاہان صفویہ نے ارادہ کیا کہ صوفیوں کے سرگروہوں اور مغل سپاہیوں کے غلبے سے اپنے آپ کو آزاد کرائیں : چنانچہ شاہ عباس نے جو ۹۹۶ھ میں تخت پر بیٹھا اس کام کا نقشہ جمایا اور ۱۰۰۲ھ میں صوفیوں کے سرداروں کی گرفتاری ، صوفیوں کے قتل عام اور قزوین کے فلسفی و عرفانی مکاتب کو منتشر کرنے میں لگ گیا ۔ ان میں سے جو کوئی قتل ہونے سے بچ گیا وہ بھاگ کر ہمسایہ ملکوں خصوصاً ہندوستان چلا گیا ۔

یہی کشت و خون اس کا باعث ہوئے کہ شاہ عباس قزوین میں نہ ٹک سکا اور اس کے بجائے ۱۰۰۶ھ میں دارالسلطنت اصفہان کو قرار دیا۔ اس کارروائی کی بدولت یہ ممکن ہو گیا کہ وہ اپنے منتخبہ جدید نظام روحانی کو آگے بڑھائے، لیکن صوفیانہ طرز فکر، جو ایک صدی تک ایران پر چھایا رہا اور جس نے اس سے پہلے کئی صدیوں تک اس ملک کے ظالم حکام کے مقابلے میں مقاومت سلبیہ کے رگ و ریشے پھیلا دیے تھے، قزوین کے قتل عام سے منہدم نہ ہوا۔ اس لیے اصفہان میں جدید روحانی نظام کے معمار مجبور ہوئے کہ اس اپنی جدید عمارت کی بنیاد تصوف اور فلسفہ کو جڑ سے مٹا کر قائم کریں تاکہ اس کے دوبارہ جی اٹھنے کا خوف نہ رہے۔

فقیہ اور صوفی کے باہم جھگڑے اور نزاع گیارھویں صدی ہجری میں سلطنت صفوی کی جدید سیاست کی بدولت پیدا ہوئے تھے اور اسی وجہ سے ہمیشہ فقیہوں کی فتح پر ختم ہوتے تھے۔ صوفیہ سے متعلق نازیبا الفاظ ایسے لوگوں کی کتابوں تک میں دیکھے جاتے تھے، جو خود کسی وقت صوفیوں میں شامل تھے۔ اسی سبب سے مجلسی خاندان کے افراد، جس میں سب کے سب عارف و صوفی تھے، محمد تقی مجلسی کی عمر کے آخری نصف میں صوفی بننے کو بظاہر کچھ زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔

محمد باقر مجلسی نے گیارھویں صدی کے دوسرے نصف میں جب شیخ الاسلام کا سرکاری منصب حاصل کر لیا اور ایسے زبردست رقیبوں کا، جیسے محمد طاہر قمی شیرازی (استاد سابق مجلسی) اور میر لوحی مد مقابل ہوا تو اپنے عہدے کی حفاظت کے لیے اپنے اور اپنے باپ کے صوفی ہونے سے بالکل منکر ہو گیا اور فلسفہ و علم کلام کی تعلیم اپنی درس گاہ میں روک دی اور وجہ یہ بیان کی کہ یہ طلبہ کے خیالات خراب کرتی ہے۔ روش کے اسی تغیر کے سبب جو خاندان مجلسی میں پیدا ہو گیا تھا، ان کی تالیفات میں متصوفین کے متعلق مختلف نظریات دیکھنے میں آتے ہیں؛ اسی لیے ادھر صوفیہ مجلسی کو صوفی شمار کرتے ہیں اور ادھر صوفیوں کے مد مقابل فقیہ بھی اس کو اپنوں (فقیہوں) میں سمجھتے ہیں۔

گیارھویں صدی میں ایران کے صوفیوں اور فقیہوں کے منازعات کی بابت اور ان کتابوں کی فہرست کے لیے جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں معلومات حاصل کرنے کے لیے دیکھیے فہرست کتاب مرکزی دانشکدہ تہران، تالیف علی نقی منزوی، ج ۲، ص ۲۰۸۔

استادان و شاگردان مجلسی: مجلسی کے استادوں اور شاگردوں کے زمرے میں متعدد علما کا نام لیا گیا ہے۔ ۷۱ نام اس کے استادوں کے اور ۳۴ شاگردوں کے گنوائے گئے ہیں۔ ممکن ہے ان ناموں میں کچھ وہ بھی ہوں جنھوں نے مجلسی کو محض اجازت عطا کی، یا مجلسی نے انھیں اجازت دی اور اصطلاحاً یہ ان کے روایتی استاد یا وہ ان کے روایتی شاگرد ہوئے۔ اس نے ایک علمی خاندان میں پرورش پائی تھی، لہذا اس کی تحصیلات علمی کا پہلا مرحلہ اس کے خاندان ہی کے افراد سے شروع ہوا۔ مجلسی کے اساتذہ درج ذیل ہیں۔

۱- خود اس کا والد محمد تقی مجلسی (م ۱۰۷۰ھ)؛ ۲- اس کا بہنوئی ملا صالح مازندرانی (م ۱۰۸۱ھ)؛ ۳- شیخ عبداللہ بن جابر عاملی، اس کا ننھیالی رشتے دار۔ دوسرے مرحلے میں مجلسی نے اصفہان کے علما سے استفادہ کیا: ۴- ملا محسن فیض کاشانی (م ۱۰۹۱ھ) مصنف وافی جو اس صدی کے حدیث کے چار مجموعوں میں سے ایک ہے؛ ۵- سید میرزا جزائری ابن شرف الدین علی حسینی، جو مجلسی کی طرح خود بھی جوامع الکلام نامی ایک کتاب میں حدیثیں جمع کی ہیں اور

اس کی کتاب بھی اس صدی کے چار مجموعہ احادیث میں سے ایک ہے ؛ ۶۔ ملا حسین علی پسر ملا عبداللہ شوشتری (م ۱۰۷۵ھ) ؛ ۷۔ میر رفیع الدین نائینی (م ۱۰۸۲ھ) صاحب تعلیقات و حواشی اصولی و فلسفی ؛ ۸۔ سید محمد بن شریف رویدشتی اصفہانی ، جس کی بیٹی حمیدہ (م ۱۰۸۷ھ) اصفہان میں معلمہ تھی ؛ ۹۔ شیخ علی صاحب الدر المنثور (۱۰۱۳ تا ۱۱۰۳ھ) ؛ ۱۰۔ ملا محمد قمی (م ۱۰۹۸ھ) اس صدی کے صوفیوں کا مخالف ، جو آخر عمر میں مجلسی کا مخالف رہا ہے ۔ ذیل کے دو شخصوں نے مجلسی کو اجازت روایت عطا کی : ۱۱۔ شیخ حر عاملی (م ۱۱۰۴ھ) صاحب وسائل ، یہ بھی ان چار اشخاص میں سے ہے جنہوں نے اس صدی میں حدیث جمع کی ۔ اس نے مجلسی کو اجازت (مُدبّجہ) دی تھی اور اس سے اجازت (مدبجہ) لی تھی ؛ ۱۲۔ قاضی میر حسین جس نے مجلسی کو (فقہ الرضا) کی اجازت دی ۔ مندرجہ ذیل چار اشخاص بھی ، جنہوں نے اصفہان سے باہر زندگی بسر کی ، مجلسی کے استادوں میں شمار کیے گئے ہیں ، شاید اس کے روایتی استاد ہوں : ۱۳۔ میر محمد مؤمن استرآبادی ، ساکن مکہ ، مقتول سنہ ۱۰۸۸ھ ؛ ۱۴۔ شرف الدین علی بن حجۃ اللہ شولستانی ، ساکن مشہد (م ۱۰۶۰ھ) ؛ ۱۵۔ سید علی خان مدنی شیرازی (۱۰۵۲ تا ۱۱۲۰ھ) ؛ ۱۶۔ ملا خلیل قزوینی (۱۰۰۱-۱۰۸۹ھ) ۔ مندرجہ ذیل دو شخصوں کا نام بھی مجلسی کے استادوں میں لیا گیا ہے ، لیکن کہیں اور ان کا نام نہیں ملتا : ۱۷۔ میر محمد قاسم کوہ پایہ ای شاگرد شیخ بہائی ؛ ۱۸۔ محمد محسن استر آبادی بن محمد مؤمن ۔

مجلسی کے شاگرد : ملا عبداللہ افندی نے ریاض العلماء میں اپنے استاد مجلسی دوم کے شاگردوں کی تعداد ایک ہزار بیان کی ہے اور مجلسی کے دوسرے شاگرد سید نعمت اللہ جزائری نے انوار نعمانیہ میں مجلسی کے شاگرد ہزار سے زیادہ بتائے ہیں اور ان میں سب سے زیادہ مشہور چھیالیس اصفہانی علماء ہیں جن کا ذکر فیض القدسی اور مجلسی کے لیے لکھی ہوئی دوسری سوانح عمریوں میں موجود ہے ۔

تالیفات : مجلسی دوم کی مؤلفات کی سطور کا اندازہ حدائق المقربین میں محمد صالح خاتون آباد کے قول کے مطابق اور فیض القدسی میں نوری کے بیان کے موافق تقریباً چودہ لاکھ ہے ۔

مجلسی کی عربی تصنیفات : ۱۔ بحار الانوار : مجلسی کی سب سے بڑی تصنیف جو اس کی شہرت کا سبب ہوئی ، بحار الانوار ہے جو گیارھویں بارھویں صدی کی مذہب شیعہ کی دائرہ معارف سمجھی جاتی ہے ۔ یہ ۲۶ جلدوں میں ہے ۔ پہلی پندرہ جلدوں کا مبیضہ خود اس کے زمانے میں تیار ہو گیا تھا ؛ باقی اس کے مرنے کے بعد اس کے داماد ملا صالح کے پاس تھا ۔ ملا عبداللہ آفندی نے اس سے لے کر اس کی تکمیل کی جو اس کے مرنے کے بعد اس کے وارثوں کے قبضے میں تھا ۔ سید نصر اللہ حائری شہید نے ۱۱۶۱ھ میں انھیں خرید لیا تھا ۔ ان جلدوں میں سے بعض کے اصلی نسخے اب بھی دانشگاہ تہران کے مرکزی کتاب خانے میں موجود ہیں ۔ یہ کتاب چھبیس بڑی جلدوں میں ، چاپ سنگی ، ۱۳۰۲ تا ۱۳۱۵ھ تہران میں طبع ہوئی ہے ؛ ۲۔ کلینی (م ۳۲۹ھ) کی کافی کی شرح موسوم بہ (مرآت العقول فی شرح اخبار آل الرسول) بارہ جلدوں میں ؛ ۳۔ شیخ طوسی (م ۴۶۰ھ) کی تہذیب کی شرح جس کا نام (ملاذ الاخیار ہے) ۴۔ شرح اربعین ؛ ۵۔ صحیفۂ سجادیہ کی شرح الفوائد الطریفہ مرتب نہیں ہے ؛ ۶۔ وجیزۃ در رجال ، چھپ چکی ہے ؛ ۷۔ رسالہ اعتقادات ، دو بار فارسی میں اور ایک بار اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے ۔

الاوازان ؛ ۹- سلوک ؛ ۱۰- مسائل ھندیه ، ان مسائل کے جواب میں لکھی گئی ھے جو ان کے بھائی ملا عبداللہ نے ھندوستان سے بھیجے تھے ؛ ۱۱- حواشی کتب اربعه ، (تہذیب ، استبصار ، کافی ، من لایحضر ؛ ۱۲- رسالہ در اذان ؛ ۱۳- کتاب دعا ، ذیل صحیفه سجادیه.

مجلسی کی فارسی تالیفات : ۱- عین الحیات ، ایران میں متعدد بار چھپی ھے۔ ایک دفعه اردو میں اور ایک دفعه عربی میں ترجمه بھی ھوا ھے ؛ ۲- مشکاة الانوار ، عین الحیات کا اختصار ھے ؛ ۳- حق الیقین ، ان کی آخری تالیف ھے ، جو طبع ھو چکی ھے۔ ایک دفعه اردو میں اور ایک مرتبه عربی میں ترجمه بھی ھو چکا ھے ؛ ۴- حلیة المتقین ، متعدد بار چھپی ھے۔ ایک دفعه اردو میں اور ایک مرتبه عربی میں ترجمه بھی ھوا ھے ؛ ۵- حیاة القلوب ، تین جلدوں میں طبع ھو چکی ھے ؛ ۶- تحفة الزائر ، متعدد بار چھپ چکی ھے ؛ ۷- جلاء العیون ، سید عبداللہ شبر نے ایک مرتبه عربی میں ترجمه کیا اور ایک دفعه اختصار کیا۔ ایک بار اردو میں بھی ترجمه کیا گیا ھے ۸- مقیاس المصابیح ، ۱۳۱۱ھ میں طبع ھوئی ؛ ۹- ربیع الاسابیع ، طبع ھو چکی ھے ؛ ۱۰- زاد المعاد کئی بار چھپی ھے ؛ ۱۱- دیات ، ۱۲۶۲ھ میں مطبع نولکشور میں چھپی تھی ؛ ۱۲- شکیات ؛ ۱۳- اوقات (خطی) ، (ذریعه : ۳۸۰) ؛ ۱۴- رجعت ؛ ۱۵- ترجمۂ عهد مالک ؛ ۱۶- اختیارات ایام ، نیز ان کا ایک رساله اختیارات اس سے بڑا ھے ؛ ۱۷- جنت و نار ، مخطوطه (ذریعه ، ۵ : ۱۲۳) ؛ ۱۸- مناسک حج ؛ ۱۹- مناسک حج ، (کلاں) ؛ ۲۰- مفاتیح الغیب ، استخاره کے متعلق ؛ ۲۱- حکم اموال ناصبی ؛ ۲۲- کفارات ؛ ۲۳- آداب تیر اندازی ؛ ۲۴- زکات ؛ ۲۵- نماز شب ؛ ۲۶- آداب نماز ، خطی نسخے ملتے ھیں (ذریعه ، ۱ : ۲۱) ؛ ۲۷- تفسیر السابقون السابقون ؛ ۲۸- فرق صفات ذاتی و فعلی ؛ ۲۹- تعقیبات نماز ؛ ۳۰- ترجمۂ دعائے جوشن صغیر ؛ ۳۱- ترجمه حدیث عبداللہ بن جندب ؛ ۳۲- بداء ، مطبوعه ۱۲۶۵ھ ؛ ۳۳- جبر و تفویض ، خطی ، (ذریعه ، ۳ : ۹۶) ؛ ۳۴- نکاح ؛ ۳۵- ترجمه کتاب فرحة الغری ابن طاوس ، (ذریعه ، ۴ : ۱۲۲) ؛ ۳۶- ترجمه توحید مفضل ، مطبوعه ۱۲۸۷ھ ؛ ۳۷- ترجمۂ توحید رضا ، تحفة الرضویه کے آخر میں ۱۲۸۸ھ میں چھپی ؛ ۳۸- ترجمه حدیث رجاء بن ابی ضحاک ؛ ۳۹- ترجمۂ زیارت جامعه ؛ ۴۰- ترجمۂ دعائے کمیل ؛ ۴۱- ترجمۂ دعائے مباھله ؛ ۴۲- ترجمۂ دعائے سمات ؛ ۴۳- ترجمۂ قصیدۂ دعبل ؛ ۴۴- ترجمۂ حدیث ستة اشیاء ؛ ۴۵- انشاءات مجلسی ؛ ۴۶- صواعق الیهود ، جزیه کے متعلق ؛ ۴۷- مناجات ؛ ۴۸- مشکوٰة الانوار ؛ ۴۹- اجوبۂ مسائل ؛ ۵۰- شرح دعائے جوشن کبیر ؛ ۵۱- زیارت اھل قبور ؛ ۵۲- ترجمۂ نماز ؛ ۵۳- تذکرة الائمه ؛ ۵۴- تعبیر خواب ؛ ۵۵- صراط النجات۔

جیسا که ھم دیکھ چکے ھیں مجلسی کا سب سے زیاده اھم کام بحار الانوار ھے۔ چونکه اس کی تالیف میں ان کتابوں سے استفاده کیا گیا ھے جو مجلسی کی کثیر کوششوں اور دربار صفوی کے اقتدار کے ذریعے مہیا ھوئی تھیں اور اس کے بعد کے اکثر علماء کو اس کے مصادر و مآخذ تک دسترس نه ھوئی ، اس لیے انھوں نے بالعموم بحار سے نقل کیا ھے اور یه کتاب سابق مؤلفین کی تالیفات کا سب سے زیاده اھم مآخذ ھے۔ اس کے علاوه بہت سے علما نے بحار کی ھر جلد کے متعلق یا سب جلدوں کی بابت یکجا بہت سے کام انجام دیے ھیں۔

مثلاً ترجمہ ، شرح ، اختصار ، فہرست ، حاشیہ و تعلیقات ۔ ذریعہ ، ۳ : ۱۹-۲۷ میں ایسے کاموں کی تعداد ان کی طباعت کے شمار اور تاریخ سمیت ذکر ہے ۔

بحار کی جلدوں کی فہرست: پہلی جلد ، کتابہائے عقل و جہل اور کتاب بحار کی تالیف کے ماخذ و مصادر پر مشتمل چالیس باب بارہ ہزار سطور ۔ اس جلد کا ایک بار ہندی شاہزادے بلند اختر کے لیے فارسی میں ترجمہ ہوا اور دوسری مرتبہ عین الیقین کے نام سے فارسی ہی میں ترجمہ ہوا ہے (ذریعہ ، ۳ : ۱۸) ؛ دوسری جلد ، توحید خدا اور دو کتابوں : توحید ، مفضل اور اہلیلجہ پر مشتمل ہے ۔ اس میں تیس باب سولہ ہزار سطریں ہیں ۔ اس جلد کا بھی شاہزادہ بلند اختر کے لیے فارسی میں ترجمہ ہوا ہے اور اس کے بعد دوسری دفعہ جامع المعارف کے نام سے ترجمہ ہوا اور ایران میں چھپا ہے ؛ تیسری جلد ، عدل ، مشیت ، قضا و قدر اور دیگر کلامی مسائل اور فلسفہ مذہبی پر مشتمل ہے ۔ اس میں انسٹھ باب ، تیس ہزار سطریں ہیں ؛ چوتھی جلد ، اس میں مناظرات کلامی پر مشتمل تراسی باب ، سولہ ہزار سطریں ہیں ؛ پانچویں جلد ، پیغمبروں کے حالات پر مشتمل ہے ، اس میں بھی تراسی باب ، سولہ ہزار سطریں ہیں ؛ چھٹی جلد ، پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کے حالات اور اعجاز کی بحث پر مشتمل ہے ۔ اس میں بہتر باب ، سترسٹھ ہزار سطریں ہیں ۔ اس جلد کا فارسی میں ترجمہ ہوا ہے (ذریعہ ، ۳ : ۱۹) ؛ ساتویں جلد ، امامت اور اماموں کے حالات پر مشتمل ہے ، اس میں ایک سو پچاس باب ، اکتیس ہزار سطریں ہیں ۔ اس جلد کا آقا رضی بن محمد نصیر بن عبداللہ مجلسی کے ذریعے اختصار ہوا ہے اور اسے آقا نجفی اصفہانی نے بھی مختصر کر کے جامع الانوار نام رکھا ہے (ذریعہ ، ۳ : ۱۹) ؛ آٹھویں جلد ، پیغمبر اسلام کے بعد سے خلافت علی تک کے حادثات ۔ اس میں باسٹھ باب اور اکسٹھ ہزار سطریں ہیں ۔ اس جلد کا مجاری الانہار کے نام سے فارسی میں ترجمہ ہوا ہے اور محمد نصیر بن عبداللہ مجلسی نے بھی فارسی میں دوبارہ ترجمہ کیا ہے (ذریعہ ۳ : ۲۰) ؛ نویں جلد ، امیرالمؤمنین علی اور ان کے ساتھیوں کی سرگزشت اور ان کی امامت کا ثبوت ۔ اس میں ایک سو اٹھائیس باب اور پچاس ہزار سطریں ہیں ۔ اس جلد کا آقا رضی بن محمد نصیر اصفہانی نے فارسی میں ترجمہ کیا ہے (ذریعہ ، ۳ : ۲۰) ؛ دسویں جلد ، حضرت فاطمہ ، حسن ، حسین عاشورا کے حادثات اور مطالبۂ خون حسین میں مختار کی جنگ ۔ اس میں پچاس باب اور انتیس ہزار سطریں ہیں ۔ اس جلد کا ایک بار میر محمد عباس شوشتری ، لکھنوی نے فارسی میں ترجمہ کیا ہے اور دوسری دفعہ میرزا محمد علی مازندرانی نے ۔ تیسری مرتبہ محن الابرار کے نام سے بھی ترجمہ ہوا ہے ۔ اس کا ایک بار اردو میں بھی ترجمہ ہوا ہے (ذریعہ ، ۳ : ۲۰ و ۴ : ۱۱۵) ؛ گیارھویں جلد ، امام حسین کے بعد چار اماموں ، زین العابدین ، باقر ، صادق ، کاظم اور ان کے اصحاب کی سرگزشت ۔ اس میں چھیالیس باب اور اٹھارہ ہزار سطریں ہیں ؛ بارھویں جلد ، دیگر چار اماموں ، علی الرضا ، محمد تقی ، علی تقی ، حسن عسکری اور ان کے اصحاب کی سرگزشت ۔ اس میں اتالیس باب اور بارہ ہزار سطریں ہیں ؛ تیرھویں جلد ؛ مہدی موعود ، شیعوں کے بارھویں امام اور ان کی غیبت صغری و کبری کے واقعات پر مشتمل ۔ اس میں چھتیس باب اور اکیس ہزار سطریں ہیں ۔ اس جلد کا ایک بار محمد حسن ارومی نے فارسی میں ترجمہ کیا ، جو تہران میں چھپا ہے ، دوسری بار میرزا علی [illegible]

ہے اور تیسری بار سلطان نصیر الدین حیدر کی بیگم کے لیے ہند میں ترجمہ ہوا ہے (ذریعہ ۴ : ۲۱) اور چوتھی مرتبہ علی دوانی نے فارسی میں اس کی تفسیر لکھی ہے جو ۱۹۶۰ء میں قم میں چھپی ہے اور حاجی میرزا حسین نوری نے اس جلد پر جنۃ الماوی، کے نام سے ایک ذیل لکھی اور چھاپی ہے۔

مجلسی نے یہ تیرہ جلدیں باقاعدہ تاریخی ترتیب سے تالیف کی ہیں، لیکن اس جلد کے بعد سن ۱۰۸۱ء حج کے لیے مکے گئے اور وہاں بائیسویں جلد تالیف کی ہے۔ اس لحاظ سے بحار کی جلدوں کی تاریخ تالیف ترتیب وار نہیں ہے۔

چودھویں جلد، جہان اور اس کی پیدائش، افلاک، ملائکہ، جن و انس اور عناصر پر مشتمل ہے۔ اس جلد میں دو کتابیں، سب الشی، اور طب الرضا، بھی شامل کر دی گئی ہیں اور اس میں مجموعی طور پر دو سو دس باب اور اسی ہزار سطریں ہیں۔ یہ جلد ۱۱۰۴ھ میں تالیف ہوئی اور آقا نجفی اصفہانی (م ۱۳۳۲ھ) نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے؛ پندرھویں جلد، ایمان اور کفر پر مشتمل ہے۔ اس جلد میں ایک سو آٹھ باب اور بیس ہزار سطریں ہیں۔ اس جلد میں ایک حصہ اخلاق مذہبی بھی شامل تھا، لیکن بعد میں اس سے الگ ہو کر ایک مستقل جلد بن گیا ہے؛ سولھویں جلد، اخلاق اور لوگوں سے مجموعی طور پر برتاؤ۔ ایک سو اکتیس باب پر مشتمل ہے۔ اس جلد کا جوامع الاخلاق کے نام سے ترجمہ کیا گیا ہے؛ ایک اور سولھویں جلد: مشتمل بہ عشرت (لوگوں سے برتاؤ اور ملنا جلنا)، اس جلد میں ایک سو سات باب اور انیس ہزار سطریں ہیں۔ یہ جلد ۱۱۰۴ھ کے بعد تالیف ہوئی اور چونکہ مجلسی نے اٹھارھویں اور بائیسویں جلدیں پہلے تالیف کر لی تھیں اور سولھویں جلد کی تالیف کے وقت اس کا طویل ہو جانا محسوس کیا لہٰذا دو جلدوں میں تقسیم کر دیا؛ سترھویں جلد، میں مذہبی پند و نصائح ہیں؛ اس میں تہتر باب اور سولہ ہزار سطریں ہیں۔ یہ جلد آقا نجفی کی وساطت سے حقائق اسرار کے نام سے ترجمہ ہوئی ہے اور حاجی میرزا حسین نوری نے معالم العبر کے نام سے اس کے لیے ایک ذیل لکھی جو چھپ چکی ہے؛ اٹھارھویں جلد، احکام فقہی کی ابتدا، طہارت اور نماز پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک سو اکسٹھ باب اور ایک لاکھ سطریں ہیں۔ شاذان جبرئیل کا کتابچہ ازاحۃ العلۃ اس جلد میں شامل کر دیا گیا ہے۔ یہ جلد ۱۰۹۷ھ میں تالیف ہوئی ہے۔ اس جلد کا اختصار بھی کیا گیا ہے (ذریعہ ۳ : ۲۷)؛ انیسویں جلد، ۱۔ قرآن اور تفسیر نعمانی کے متعلق، ۲۔ دعاؤں، طلسموں اور "صحیفۂ ادریس" کے متعلق ہے۔ اس جلد میں ایک سو اکتیس باب اور تیس ہزار سطریں ہیں؛ بیسویں جلد، زکوٰۃ، خمس اور اعتکاف پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک سو بائیس باب اور بیس ہزار سطریں ہیں؛ اکیسویں جلد، حج اور عمرہ کے متعلق ہے۔ اس میں چوراسی باب اور نو ہزار سطریں ہیں؛ بائیسویں جلد زیارت ناموں پر مشتمل ہے۔ اس میں چونسٹھ باب اور تیس ہزار سطریں ہیں۔ اس کا ایک استر آبادی شخص نے ترجمہ کیا ہے (ذریعہ ۳ : ۲۵)۔ یہ جلد مجلسی نے ۱۰۸۱ھ میں مکے کے سفر میں تالیف کی تھی؛ تئیسویں جلد، عقود و ایقاعات کے قوانین پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک سو تیس باب اور گیارہ ہزار سطریں ہیں؛ چوبیسویں جلد، کتاب دیات تک باقی فقہ پر مشتمل ہے۔ اس میں اڑتالیس باب اور تین ہزار سطریں ہیں؛ پچیسویں جلد، فہرست منتجب الدین سمیت گذشتہ علما کے اجا

شاگردون کو دیے ھوئے بہت سے اجازت نامون کے متون ، سلافۃ العصر کے ایک حصے اور ابن طاوس کی کتاب اجازات کے ایک حصے پر مشتمل ھے ۔

وہ کام جو ”بحار“ کے متعلق یکجا انجام دیے گئے ھیں : ۱۔ بحار کا انتخاب درر البحار ؛ ۲۔ الشافی فی الجمع بین البحار والوافی ؛ ۳۔ العوالم جس میں بحار الانوار کو دوسرے طریق سے ترتیب دیا ھے ؛ ۴۔ مستدرک بحار از میرزا محمد تہرانی سامرائی ، جس نے صرف پچیسویں جلد کا چار جلدون میں استدراک کیا ھے ؛ ۵۔ تلخیص بحار و مستدرک وافی ؛ ۶۔ بحار کی جلدون کا ایک انتخاب ۔

وہ فہرستیں جو بحار کے لیے تیار ھوئی ھیں :

۱۔ سفینۃ البحار ، از شیخ عباس قمی متوفی ۱۳۵۹ھ ۔ مضامین کی بترتیب حروف تہجی فہرست ھے ۔ دو جلدون میں نجف میں ۱۳۵۵ھ میں چھپی ھے ؛ ۲۔ فہرست ابواب بحار جو مفتاح الابواب کے نام سے تہران میں ۱۳۵۲ھ میں چھپی ھے ؛ ۳۔ فہرست احادیث بحار ؛ ۴۔ فہرست ماخذ و مدارک بحار ، جو بحار کی ایک جلد کی پہلی فصل کی ایک شرح ھے ؛ ۵۔ بحار کے منتخب مضامین کی فہرست ؛ ۶۔ مصابیح الانوار فی فہرس ابواب البحار ۔

افسوس ھے کہ ان فہرستون میں سے کوئی بھی کامل نہیں ، سب ناقص ھیں اور بحار کے لیے اب بھی ایک بڑی اور عام فہرست کی ضرورت ھے ؛

اصفہان کی دانشگاہ و مجلسی دوم : گیارھویں صدی ھجری کے نصف آخر اور بارھویں صدی ھجری کے آغاز میں اصفہان کی مرکزیت کے سبب اس دانشگاہ نے نسبۃً قابل توجہ ترقی کی اور گران قدر شاگردوں کی تربیت کی اور ایسی تالیفات پیش کیں جو اگرچہ مذھبی تھیں، مگر بہت قدر و قیمت رکھتی تھیں اور اگر افغانون کا حملہ نہ ھوتا تو یہ دانشگاہ ایران کے طور طریق میں بہت زیادہ اثر باقی چھوڑتی۔ جیسا کہ معلوم ھے چار موسوعے اور شیعون کے مذھبی بڑے مجموعے جو ”مجامیع اربعۂ متاخرہ“ کے نام سے مشہور ھیں ان میں سے ایک مجلسی کی بحار ھے جو اسی صدی میں تالیف ھوئی ۔ (مجامیع اربعۂ متاخرہ ، مجامیع اربعۂ متقدمہ کے مقابلے میں ھے ، جس سے مراد وہ چار کتابیں ھیں جو چوتھی اور پانچویں صدی ھجری میں تالیف ھوئیں اور ان میں لوگون کے اجتماعی اور انفرادی حقوق اور عبادات کے بارے میں مذھبی احادیث و اخبار جمع ھیں ۔ وہ چار کتابیں یہ ھیں : (الف) کافی از کلینی (م ۳۲۹ھ) ؛ (ب) من لا یحضرہ الفقیہ از صدوق ابن بابویہ (م ۳۸۰ھ) ؛ (ج) استبصار از شیخ طوسی محمد بن حسن متوفی ۴۶۰ھ ؛ (د) تہذیب از ھمان شیخ طوسی اور چونکہ صفوی عہد میں محسوس کیا گیا کہ گزشتہ چھ صدی میں بہت سی احادیث و اخبار دستیاب ھوئی ھیں ، جو ان قدیم چار کتابون میں نہیں ھیں، لہذا ان دست یاب شدہ احادیث و اخبار کے جمع کرنے کا احساس ھوا اور چار شخصون نے یہ کام کیا : (الف) سید میرزا جزائری ، جس نے جوامع الکلم لکھی ؛ (ب) : ملا محسن فیض جس نے وافی لکھی ؛ (ج) : مجلسی ، جس نے بحار الانوار مہیا کی ؛ شیخ حر عاملی (م ۱۱۰۴ھ) جس نے تفصیل وسائل الشیعۃ لکھی۔ ان کے مؤلفون میں سے سید میرزا جزائری مؤلف جوامع الکلم و ملا محسن فیض کاشانی مؤلف وافی مجلسی کے استادون میں سے تھے اور تینون دانشگاہ اصفہان ھی کے تربیت یافتہ تھے نہ صرف ان میں سے چوتھے شیخ حر عاملی مشہد خراسان کے قاضی القضاۃ ہوئے اور بقول خراسان کا ادارہ علمی بنی اس وقت ادارہ علمی

اصفہان کے تابع رہا تھا ۔ اس علمی ادارے یا دانشگاہ کی صدارت اصفہان میں اس وقت کے شیخ الاسلام کے ہاتھ میں تھی اور یہ عہدہ ہفتہ ۴ جمادی الاولی ۱۰۹۸ھ کو شاہ سلیمان صفوی کی طرف سے محمد باقر مجلسی کے سپرد ہو گیا ۔ مجلسی اس اقتدار و اختیار کو ، جو اسے اس رتبے کے سبب سے حاصل ہو گیا تھا ، کتابیں اور مآخذ و مصادر جمع کرنے اور شاگردوں ، متبعوں اور محققوں کی تعلیم و تربیت کے کام میں لایا ؛ حتی کہ اس نے کتابیں جمع کرنے کے لیے ایک وفد ملک یمن کو بھی بھیجا (فیض القدسی) ۔

متحدہ کام : بحار الانوار کا سا بڑا کام انجام دے لینا بذات خود اصفہان کی دانش گاہ میں شرکت کار اور جماعت کے متحدہ کام کی دلیل ہے ۔ تنکابنی نے (قصص العلماء ، ص ۱۵۱) مجلسی کے شاگردوں میں کام کی تقسیم کی کیفیت بیان کی ہے ۔ وہ بحار کی تکمیل میں اپنے ہم عصروں کے نظریات تک سے بھی فائدہ اٹھاتا تھا ۔ ان میں سے ایک کا خط جو قابل توجہ تجاویز پر مشتمل ہے اور اس نے مجلسی کو بھیجا ہے "اجازات بحار" کے آخر میں چھپا ہے ۔ جو لوگ بحار کی تالیف میں مجلسی کے شریک کار رہے ہیں وہ سب کے سب عالم اور اصفہان کی دانش گاہ کے فاضل اور "العلماء الصدور" کے لقب سے ملقب ہیں اور ان میں سے مندرجہ ذیل کا نام بیان کیے جا سکتے ہیں : ۱ ۔ ملا عبداللہ افندی ، مجلسی کا کتاب دار تھا اور مجلسی کی وفات کے بعد بحار کی پندرھویں سے آخر تک کی سب جلدیں جو مسودے کی حالت میں تھیں ان کا مبیضہ تیار کیا ؛ ۲ ۔ آمنہ بیگم : مجلسی اول کی بیٹی ، مجلسی دوم صاحب بحار کی بہن اور محمد صالح مازندرانی کی زوجہ جو عالم عورتوں میں سے تھی ؛ ۳ ۔ سید نعمۃ اللہ جزائری جو انوار نعمانیہ میں کہتا ہے کہ میں نے بحار کی چند جلدوں کی تالیف میں مدد کی ہے ؛ ۴ ۔ میر محمد صالح خاتون آبادی اصفہانی (۱۰۵۸-۱۱۲۶ھ) مجلسی کا شاگرد اور داماد ، جسے مجلسی نے بحار کے باقی ماندہ مسودے کا مبیضہ تیار کرنے کی وصیت کی تھی اور اس نے یہ کام ملا عبداللہ افندی کے سپرد کیا تھا ۔

مآخذ : (۱) شیخ حر عاملی : حرف ب ، قسم دوم ، امل الآمل جو دو مرتبہ چھپی ہے ؛ (۲) محمد باقر خوانساری : در حرف ب ، روضات ، تین مرتبہ چھپی ہے ؛ (۳) محمد صالح خاتون آبادی : حدائق المقربین ، نسخہ خطی ، روضات کی نقل کے مطابق ؛ (۴) حاج محمد اردبیلی : جامع الرواۃ ، چاپ تہران ؛ (۵) شیخ یوسف بحرینی : در لؤلؤۃ البحرین ، چاپ سنگی ؛ (۶) آقا احمد کرمان شاہی بن محمد علی : مرآت الاحوال ، یا سفر نامۂ ہند ۱۲۰۹ھ ، نسخۂ خطی ، کتاب خانہ ملی ؛ (۷) ملا عبداللہ افندی : ریاض العلماء نسخۂ خطی ؛ (۸) حاجی میرزا حسین نوری ، فیض القدسی جو ۱۳۰۲ھ میں تالیف کی اور مقدمہ بحار چاپ امین الضرب میں اسی سال چھپی ہے ؛ (۹) ملا محمد شفیع : الروضۃ البہیہ ، ص ۴۶ ، بنقل کرمانی در مقدمۂ بحار ؛ (۱۰) عبد الحسین خاتون آبادی بن محمد باقر : تاریخ وقایع الایام والسنین ، نسخہ خطی مجلس شورای ملی تہران ؛ (۱۱) سلسلۃ النسب مجلسی از حیدر علی بن عزیزاللہ بن محمد تقی الماس ؛ سالنامہ دبیرستان فرہنگ اصفہان کے سنہ ۱۳۲۹ش کے ضمیمے میں چھپی ؛ (۱۲) کشف الحجب والاستار ، مطبوعہ کلکتہ ؛ (۱۳) ذریعہ ، ۳ : ۱۹-۲۷ اور اس کی دیگر چودہ جلدیں ؛ (۱۴) فہرست کتاب خانہ رضوی ، ج ۱ و ۵ ، (۱۵) فہرست کتاب خانۂ مرکزی دانشگاہ ، ج ۵ ، ص ۲۲۳ ؛ (۱۶) فہرست سپہ سالار ج ۱ ؛ (۱۷) ریحانۃ الادب ، ۲ : ۳۵۵ ؛ (۱۸) قصص العلماء ، ص ۱۵۴ ؛ (۱۹) اسماعیل پاشا : ہدیۃ العارفین فی اسماء

المؤلفین، ۲ : ۳۰۹ ؛ (۲۰) شیخ یوسف بحرینی : لؤلؤۃ البحرین، طبع ایران ؛ (۲۱) شیخ عباس قمی : ھدیۃ الاحباب، ص ۱۳۲ ؛ (۲۲) عبدالرحیم ربانی در مقدمہ جلد اول، طبع جدید بحار الانوار در ۱۳۳۳ ش تہران ؛ (۲۳) شیخ علی دوانی : وحید بہبہانی و در مقدمہ طبع جدید ترجمہ جلد سیزدہم بحار الانوار.

(علی نقی منزوی)

* **محمد بختیار خلجی :** غور [رک بآں] کا باشندہ تھا۔ جب وہ سن بلوغ کو پہنچا تو غزنی [رک بآں] گیا اور اپنے آپ کو رضا کار کی حیثیت میں محمد غوری کے افسروں کے سامنے پیش کیا، لیکن انھوں نے اسے بھرتی کے قابل نہ سمجھا ؛ چنانچہ وہ دہلی چلا گیا جہاں قطب الدین ایبک [رک بآں] نے نواح ۵۹۶ھ/۱۱۹۹ء میں اسے بہار کا علاقہ فتح کرنے کے لیے ایک فوج کا سالار بنا کر بھیج دیا۔ یہاں اسے بہت کامیابی ہوئی۔ اس کے بعد اسے حکم ہوا کہ وہ بنگال پر حملہ کرے۔ ۶۰۰ھ/۱۲۰۳ء - ۶۰۱ھ/۱۲۰۴ء میں وہ بنگال کے پاے تخت ندیا میں جا پہنچا اور بغیر کسی قسم کی خونریزی کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کی آخری کوشش بھوٹان اور تبت پر حملہ کرنے پر مرکوز تھی، لیکن اسے ہزیمتیں ہوئیں اور وہ واپس آنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ دیوی کوٹ (بنگال) تک آ پہنچا تھا کہ وہاں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی لاش بہار لے گئے جہاں وہ ۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء میں دفن ہوا.

مآخذ : (۱) عبدالباقی نہاوندی : مآثر رحیمی، حصہ اول، ص ۲۹۲ تا ۲۹۳ ؛ (۲) Stewart : *History of Bengal*، لندن ۱۸۱۳ء، ص ۳۸ تا ۵۰ ؛ (۳) Wheeler : *History of India*، ۳ : حصہ اول لندن ۱۸۸۶ء ص ۳۶ ؛ (۴) Beale : *Oriental Biographical Dictionary*، لندن ۱۸۹۴ء، ص ۲۶۱.

(محمد ہدایت حسین)

محمد بقاء : بن شیخ غلام محمد ۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۷ء میں پیدا ہوے۔ پہلے اپنے والدین سے تعلیم پاتے رہے۔ اس کے بعد شیخ عبداللہ سے، جو میاں حضرت کے نام سے مشہور تھے۔ نیز شیخ نور الحق بن عبدالحق دہلوی سے بھی تعلیم حاصل کی۔ چند سال بعد انھوں نے اپنے وطن میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ پہلے آپ اپنے والد ہی کے مرید ہوے۔ ان کی وفات کے بعد محمد معصوم سرھندی سے روحانی تعلق پیدا کیا۔ افتخار خان میر خانساماں کی ترغیب پر وہ اورنگ زیب کے دربار میں آئے جہاں انھیں بخشی اور واقعہ نگاری کا منصب سونپا گیا۔ یہاں خاص نوازش شاہانہ کی بدولت انھیں بڑی فرصت رہتی تھی ؛ چنانچہ وہ تصنیف وتالیف کے کام میں مصروف رہتے تھے۔ ان کا انتقال ۱۰۹۴ھ/۱۶۸۳ء میں سہارنپور میں ہوا۔ ان کی علمی یادگاریں درج ذیل ہیں : (۱) مرآت جہان نما (ایک عام تاریخ جو اورنگ زیب کے عہد میں مدون ہوئی) ؛ (۲) ریاض اولیاء ؛ (۳) تذکرۃ الشعراء.

مآخذ : (۱) بختاور خان : مرآت العالم، ورق ۸۷ ب ؛ (۲) Elliot and Dowson : *A History of India*، ۸ : ۱۴۵ تا ۱۶۵ ؛ (۳) Rieu : *Cat. Pers. Mss. Br. Mus.*، ۳ : ۸۹۰ الف ؛ (۴) Ethe : *Cat. of Persian MSS. India office*، ص ۳۹ .

(محمد ہدایت حسین)

⊛ **محمد بوٹا :** [رک بآں] میاں محمد بوٹا.

* **محمد بے ابو ذہب :** رک بہ علی بے.

* **محمد بے عثمان الجلال :** ۱۸۲۶ء میں مصر میں پیدا ہوا تھا۔ عدالت مرافعہ کے جج یوسف الحسنی کا بیٹا تھا۔ کم سنی میں اس نے انگریزی، فرانسیسی اور ترکی کی تعلیم مدرسۃ الالسن میں حاصل کی۔ جب اس کی عمر ۱۶ برس کی ہوئی تو

اس کو سرکاری محکمۂ ترجمہ میں ملازمت مل گئی۔ اس کے مربی انجینیر کلاٹ بے نے اسے کونسل ڈی ہیڈیسن میں ملازم کرا دیا۔ ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء میں وہ محکمہ وزارت جنگ سے وابستہ ہوا اور پانچ سال بعد وزارت داخلہ میں کام کرنے لگا۔ ۱۸۷۹ء میں خدیو توفیق پاشاہ نے اسے اپنی کابینہ کا رکن بنا لیا اور متعدد مرتبہ اسے اپنے دوروں میں اپنے ہمراہ بھی لے گیا۔ خدیو کی وفات کے بعد وہ قاہرہ میں جج مقرر ہوا۔ ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء میں اس کی پنشن ہو گئی اور ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء کے آخر تک یعنی اپنی وفات تک وہ ادبی کاموں میں مصروف رہا.

کلاٹ بے کے ساتھ مل کر اس نے محمد علی کے عہد حکومت کی ایک مختصر تاریخ اور عربی اور فرانسیسی زبانوں کی ابتدائی صرف ونحو کی کتابیں تالیف کیں اور خدیو کی ہمراہی میں جو سفر کیے تھے ان کے متعلق ایک سفر نامہ نظم کیا. اس کے بعد وہ شعر و سخن کے تراجم میں مشغول ہوگیا۔ پہلے لافونٹین کی حکایات کا ترجمہ کیا، پھر ناول *Paul et Virginie* اور Racine کی المیہ کتابوں *Alexander le Grand* ، *Esther* اور *Iphigenie* کا ترجمہ کیا۔ ان تینوں کا ترجمہ اس نے کلاسیکی عربی میں کیا ہے، لیکن اس کی بطور مترجم اہمیت مولیئر Molière کے طربیہ ڈراموں میں نمایاں ہے جن کا ترجمہ اس نے مصر کی موجودہ روز مرہ کی عربی زبان میں کیا اور نفس مضمون کو بڑی آزادی کے ساتھ عربی ماحول کے سانچے میں ڈھال دیا . (۱) کتاب *Tartufe* کو اس نے شیخ متلوف کا نام دیا جسے Vollers نے بعنوان *Is sch Matlut* (دیکھیے *Z. D. M.G* ، ۴۵ : ۱۷ ببعد اور اس پر Socin : کتاب مذکور، ۴۶ : ۱۳۱ ببعد) طبع کیا ہے ؛ (۲) مدرسة الأزواج (*L'Ecole des Maris*) جس کا M. Sobernheim نے ترجمہ کیا ہے (برلن ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء)؛ (۳) النساء العالمات (*Les Femmes Savantes*) منقول و مترجمہ Fr. Kern، برلن ۱۸۹۸ء ؛ (۴) مدرسة النساء (*L'Ecole des Femmes*)؛ (۵) روایة الثقلاء (*Les Facheux*)، ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء۔ اس کی مقبول عام نظموں کا مجموعہ حمل زجل بھی میں طبع ہوا.

مصریوں میں وہ طربیے کچھ زیادہ مقبول نہ ہوئے جو ملکی زبان میں ترجمہ ہوئے تھے۔ ان کتابوں کی یہ زبان مصری عوام کو کچھ شستہ معلوم نہ ہوتی نہ تو انھیں کبھی سٹیج پر دکھایا گیا اور نہ اس شکوہ الفاظ پر جو ان طربیوں میں ہیں موجودہ عربی زبان کے شائقین نے کبھی غور کیا ہے اور نہ ان الفاظ کو کبھی استعمال کیا ہے .

مآخذ : (۱) عروض اور زبان کے متعلق دیکھیے Sobernheim ، Socin اور Kern ، محل مذکور ؛ (۲) نیز دیکھیے Brockelmann : *G.A.L.* ، ۲ : ۴۷۹ ببعد ؛ (۳) شاعر کی خود نوشت سوانح حیات در الخطط الجدیدة، مصنفہ علی پاشا مبارک ، ۱۷ : ۶۲ ؛ (۴) الآداب العربیة فی القرن التاسع عشر، ۲ : ۹۱ ببعد ؛ (۵) سرکیس : معجم المطبوعات العربیة ، عمود ۱۲۰۶ ؛ [(۶) الزرکلی : الاعلام ، بذیل محمد عثمان جلال].

(M. SOBERNHEIM)

محمد بیرام : (محمد بن مصطفی بن محمد * بن محمد بن محمد بن حسین بن احمد بن محمد بن حسین بن بیرام) ایک تونسی محب وطن اور عالم جو ۱۲۵۶ھ / ۵ مارچ - ۳ اپریل ۱۸۴۰ء کو تونس میں پیدا ہوا۔ بدھ کے روز ۲۵ ربیع الآخر ۱۳۰۷ھ / ۱۸ دسمبر ۱۸۸۹ء کو حلوان (مصر) میں انتقال کیا اور

قاہرہ میں امام شافعی کے مقبرے کے قریب دفن ہوئے ۔

وہ بیرام خاندان کے فرد تھے ۔ سنان پاشا کی جس فوج نے ۲۵ جمادی ۹۸۱ھ/۲۰ستمبر ۱۵۷۳ء کو تونس مسخر کیا اس میں اس خاندان کا مورث اعلی بیرام بھی شامل تھا ۔ اس خاندان کے کئی افراد تونس کے مفتی اعظم کے عہدے پر فائز رہے ۔ محمد بیرام نے جامع الزیتونہ میں تعلیم پائی ۔ ان کے اساتذہ میں سے الطاہر بن عاشورالشاذلی بن صالح، احمد بیرام، مصطفی بیرام اور شیخ الاسلام محمد بن معاویہ اور دوسرے لوگ تھے ۔ ۱۷ برس کی عمر میں انہوں نے ایک کُناش مرتب کی ، اس میں ضوابط احکام اور اداری قاعدے جمع کیے جن کے نافذ کرنے کا حکم امیر محمد پاشا نے حکام کو دیا تھا ۔

ان کے چچا بیرام رابع کے انتقال کے بعد انہیں ۹ جمادی الاول ۱۲۷۸ھ/۱۰ نومبر ۱۸۶۱ء کو مدرسہ العُنقیہ کا سربراہ بنا دیا گیا اور اس سے اگلے مہینے کی نو تاریخ (۱۳ دسمبر) کو یہ جامع الزیتونہ کے شیخ جامعہ بھی بن گئے ۔ اس کے بعد مطلق العنان حکومت کی پیدا کردہ تکالیف کی وجہ سے علاقہ تونس میں بے چینی اور بدامنی پیدا ہو گئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نمائندہ مجالس بند کر دی گئیں جن میں انہیں دلچسپی تھی ۔ انہوں نے "رائد" یعنی سرکاری گزٹ میں دو سیاسی مضمون شائع کرائے ، جن میں حکام وقت کے ظلم کی مذمت کی گئی تھی ۔ ان سے پہلے علاقۂ تونس میں سیاسی مضمون شائع نہیں ہوتے تھے ۔ ان میں آزادی کی محبت کی تلقین کی گئی تھی اور حکومت سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ کشادہ دلی اختیار کرے اور رعایا کو نمائندہ مجالس عطا کر دے ۔

۱۷ صفر ۱۲۹۱ھ/۶ اپریل ۱۸۷۴ء کو انہیں ناظم اوقاف بنا دیا گیا ۔ اوقاف کی تنظیم جدید میں انہوں نے بڑی سرگرمی سے کام لیا ۔ سخت محنت کرنے کی وجہ سے ان کی صحت بگڑ گئی اور مجبوراً انہیں بحالی صحت کے لیے یورپ کا سفر اختیار کرنا پڑا ۔ اسی اثنا میں اپنی تصنیف صفوۃ الاعتبار شروع کر دی ۔ شوال ۱۲۹۲ھ/۳۱ اکتوبر ۔ ۲۸ نومبر ۱۸۷۵ء میں پیرس گئے ۔ اس سال صادق کالج قائم ہوا تو انہوں نے قواعد و ضوابط اور نصاب تعلیم کی تیاری کے کام میں حصہ لیا جو یورپ کے تعلیمی اداروں کے طریق پر مرتب کیا گیا تھا ۔ سب سے پہلے جن لوگوں نے اپنے بچوں کو اس کالج میں داخل کرایا ان میں یہ بھی تھے ۔ مقصد یہ تھا کہ ان کے ہم رتبہ لوگوں کو اس قسم کی نئی چیزوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملے ۔

یکم جُمادی الآخرہ، ۱۲۹۲ھ/۷ مئی ۱۸۷۵ء کو انہیں سرکاری مطبع کا مہتمم بھی مقرر کر دیا گیا جس کے انتظام کو انہوں نے از سر نو درست کیا ۔ انہیں محمد السنوسی تونسی، اور حمزہ فتح اللہ قاہری جیسے نائب مل گئے ۔ انہوں نے رائد کو باقاعدگی کے ساتھ شائع کرنا شروع کیا ۔ اسی زمانے میں انہوں نے جامع الزیتونہ کے ساتھ ساتھ مکتبہ الصادقیہ کے نظام کو بھی از سر نو درست کیا ۔

۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء میں انہوں نے ترکی کو سرویہ اور مونٹینیگرو کے خلاف جنگ میں بھی امداد دی ۔ نقد روپیہ فراہم کیا اور گھوڑے اور اونٹ بھی بھیجے ۔ سیاسی مشکلات کی وجہ سے رضا کار روانہ نہ کیے جا سکے ۔

۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء کے موسم گرما میں یہ دوبارہ پیرس گئے ۔ وہاں کی نمائش دیکھی ۔ صدر اعظم میکمہون نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی ۔ لندن اور انگلستان کی سیاحت کرنے کے لیے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور واپسی پر الجزائر بھی گئے ۔

انھوں نے شفاخانہ صادقیہ کی بحالی یا یوں کہیے کہ اس کے قیام میں بھی نمایاں حصہ لیا جس کا افتتاح ۱۸ صفر ۱۲۹۶ھ / ۱۱ فروری ۱۸۷۹ء کو ہوا تھا۔ اس کے علاوہ یہ ان دو ثالثوں میں سے ایک تھے، جنھیں ہنشیر سیدی ثابت اور حکومت فرانس کے مقدمہ کا فیصلہ کرنے کے لیے حکومت نے مقرر کیا تھا۔ اسی سال کے وسط میں انھیں وزیر اس غرض سے مقرر کیا کہ وہ بظاہر تو پیرس جا کر اپنا علاج کرائیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ وہاں جا کر Gambetta سے درخواست کریں کہ فرانسیسی قونصل کو واپس بلا لیا جائے، جو نہ صرف ملک کے اندرونی معاملات میں دخل دیتا تھا، بلکہ ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔ لیکن قونصل نے وزیر اور بیرام دونوں کی تجویزوں پر پانی پھیر دیا۔ اس نے واپس آ کر وزیر کو بتایا کہ فرانس کا ایک ارادہ تو یہ ہو رہا ہے کہ وہ تونس کا الحاق ہی کر لے۔ مصطفی بن اسماعیل وزیر کی تکلیف دہ اذیت رسانیوں نے انھیں اس قدر پریشان کیا کہ تنگ آ کر انھوں نے بڑی کوششوں کے بعد حج کعبۃ اللہ کے سفر پر جانے کی اجازت حاصل کر لی اور تونس سے ۱۶ شوال ۱۲۹۶ھ/۳ اکتوبر ۱۸۷۹ء کو ایسے روانہ ہوئے کہ پھر واپس نہ آئے۔ اسکندریہ اور قاہرہ کے راستے تشریف لے گئے۔ قاہرہ میں خدیو مصر نے انھیں شرف ملاقات بخشا۔ وہاں سے سیدھے حجاز چلے گئے اور مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ اس کے بعد یہ ینبوع اور نہر سویز کے راستے بیروت پہنچے، جہاں لوگوں اور وہاں کے گورنر مدحت پاشا نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ وہاں سے قسطنطینیہ گئے۔ سلطان عبدالحمید کی شان میں ایک قصیدہ بھی لکھا۔ حکومت تونس نے فرانسیسی قونصل کی انگیخت پر، جسے یہ خوف تھا کہ کہیں تونس اور ترکی کے درمیان گہرے تعلقات قائم نہ ہو جائیں، ان کی واپسی کا مطالبہ کیا لیکن باب عالی نے چالاکی سے یہ درخواست وصول ہی نہ کی۔

یہاں قسطنطینیہ میں انھوں نے صفوۃ کی اشاعت کے لیے اس کی پہلی دو جلدیں مکمل کر لیں۔ ملک تونس میں فرانسیسیوں کا عمل دخل ہو جانے کی وجہ سے بیرام کو سخت صدمہ پہنچا۔ باب عالی نے انھیں ملک تونس کے پہلے وزیر خیر الدین کے ساتھ اس کام پر مقرر کیا کہ وہ اس صورت حالات پر ایک رپورٹ تیار کریں جو فرانس نے پیدا کر دی تھی۔ وطن مالوف کو واپس جانے کے ارادے سے مایوس ہو کر لیگہارن چلے گئے۔ وہاں ان کے کنبے کے لوگ بھی آ گئے۔ یہاں سے جنیوا گئے۔ اپنے بیٹے کو تعلیم ختم کرنے کی غرض سے وہیں چھوڑ کر خود ویانا اور بخارسٹ کی سیاحت کو چلے گئے۔ وہاں سے واپس آ کر قسطنطینیہ میں آباد ہو گئے۔ سلطان کو یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ شہنشاہ فریڈرک ثالث شہنشاہ جرمنی کو کچھ گھوڑے تحفۃً بھیجے اور بیرام کے سپرد یہ کام ہوا کہ وہ اس عطیہ کے ساتھ جانے والے خط کا مسودہ تیار کرے۔ انھوں نے اٹھارہ مہینے ترکی کے دارالخلافہ میں قیام کیا۔ اس عرصہ میں انھیں ۲۵ ترکی پونڈ ماہانہ بطور وظیفہ ملتے رہے۔ اس دوران میں انھوں نے صفوۃ کی تیسری جلد بھی تیار کر لی۔

کسی بیماری کی وجہ سے ان کی صحت خراب ہو گئی تھی اور یہ علالت روز روز بڑھتی جا رہی تھی۔ چونکہ اخراجات پورے نہ ہوتے تھے اور یہ خوف بھی لاحق تھا کہ انھیں بدنام کرنے والے یہ چالیں چل رہے ہیں کہ وہ ایسی قابلیت کے آدمی کو قسطنطینیہ سے نکلوا دیں وہ یکم محرم ۱۳۰۲ھ/

۲۱ اکتوبر ۱۸۸۳ء کو مصر جانے کے ارادے سے قسطنطنیہ سے روانہ ہوگئے جہاں خدیو توفیق پاشا نے ان سفارشی خطوط کی وجہ سے، جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے، ان کی بڑی عزت و توقیر کی اور وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔

اسی سال ۲۵ ربیع الاول ۱۳۰۲ھ/ ۱۳ جنوری ۱۸۸۳ء کو انھوں نے ایک سیاسی اور علمی رسالہ الاعلام نکالا۔ دو سال بعد ملکہ وکٹوریا کے جشن جوبلی میں شریک ہونے کی غرض سے لندن گئے۔ پیرس میں اپنا علاج کرایا اور برلن اور ویانا ہوتے ہوئے مصر واپس آ گئے۔ اس کے بعد اپنی اس تصنیف کو مکمل کر لیا جو قسطنطنیہ میں شروع کی تھی۔ اس کتاب کا نام تجرید السنان للرد علی الخطیب رینان (Ranan) ہے جس میں ان دلائل کی تردید کی گئی ہے جو ۲۹ مارچ ۱۸۸۳ء میں رینان نے سوربون کی ایک کانفرنس میں اسلام اور سائنس *Isalmisme et la Science* (پیرس ۱۸۸۳ء) کے موضوع پر پیش کیے تھے جن کا مفہوم یہ تھا کہ مسلمانوں کے اندر سائنس کے علوم کو رائج کرنے کی راہ میں مذہب ایک رکاوٹ ہے۔ محمد بیرام کی تردید ٹھوس دلائل پر مبنی تھی۔ اس نے ایک رسالہ بھی شائع کیا جس میں یہ ثابت کیا کہ کسی اسلامی حکومت کے قرضہ کے تمسکات یا حصص کی خرید جائز ہے تاکہ مسلمانوں کا روپیہ ملک سے باہر نہ جائے، نیز یہ کہ اس قسم کے داد و ستد میں سود کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ ایک رپورٹ بھی لکھی کہ عربی زبان کو لازمی طور پر ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے اور جدید عربی ہی کے ذریعے تعلیم دی جائے۔ انھوں نے صفوۃ کی چوتھی جلد بھی مکمل کر لی۔ ۱۲ جمادی الاولی ۱۳۰۶ھ/۱۳ جنوری ۱۸۸۹ء کو Tribunal de Ier Instance قاہرہ کے جج مقرر ہوئے۔ تبدیل آب و ہوا کے لیے حلوان جا رہے تھے کہ ذات الجنب کا عارضہ ہو گیا اور ۲۵ روز کی علالت کے بعد فوت ہو گئے۔ محمد بیرام حدیث، فقہ، قدیم و جدید تاریخ اور تاریخی اور سیاسی جغرافیہ کے متبحر عالم تھے۔

ان تصانیف کے علاوہ جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے انھوں نے بے شمار رسائل تالیف کیے ان میں سے رسائل ذیل قابل ذکر ہیں (۱) تحفۃ الخواص فی حل صید بندوق الرصاص، طبع قاہرہ ۱۱۱۳ھ۔ اس میں انھوں نے یہ دعوے کیا ہے کہ بندوق سے مارے ہوئے شکار کا گوشت کھانا شرعاً حلال ہے؛ (۲) علم عروض پر ایک رسالہ؛ (۳) ایک رسالہ جس میں متعدد فقہاء کی رائے کے خلاف لکھا ہے کہ مردوں کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ لمبے بال رکھیں جو ہوا میں لہرائیں؛ (۴) التحقیق فی مسئلۃ الرقیق، ایک تبصرہ جس میں انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ شریعت کے مطابق غلامی کی حقیقت کیا ہے۔ اس میں یہ بھی بتایا ہے کہ غلام کس طرح بنائے جاتے ہیں اور ان کے متعلق قواعد کیا ہیں اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جس قسم کے غلاموں کی تجارت آج کل ہوتی ہے وہ آزاد مرد ہیں اور اسلامی حکومتیں جو ان کی تجارت کی ممانعت کرتی ہیں، وہ شریعت کے مطابق عمل کر رہی ہیں؛ (۵) صفوۃ الاعتبار بمستودع الأمصار قاہرہ میں ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۳ء، ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء، ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء، ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء، میں چھ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ چھٹی جلد خود مصنف کے سوانح کے لیے مخصوص ہے اور اسے ان کے ہمنام بیٹے ہی نے تالیف کیا ہے، غالباً کتاب مذکور سیاسی جغرافیہ کے موضوع پر عربی کی بہترین کتاب ہے، جو آج تک لکھی گئی ہے۔

مآخذ: (۱) سوانح حیات جو ان کے بیٹے نے لکھے اور صفوۃ کے آخر میں شائع ہوئے۔ (۲) فانڈیک

۱ : E. Van Dyck : اکتفاء القنوع قاہرہ ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۶ء، ص ۳۰۹ ؛ (۳) جرجی زیدان : تاریخ آداب اللغة العربیة قاہرہ ۱۳۳۰ھ تا ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۱ء تا ۱۹۱۴ء، ۴ : ۲۸۹۔

(محمد بن شنب)

محمد پاشا : رک بہ (۱) محمد داماد پاشا، (۲) محمد گرجی پاشا ؛ (۳) قرہ مانی محمد پاشا ؛ (۴) صوقوللی۔

محمد پاشا : رک بہ قرہ مانی محمد پاشا۔

محمد پاشا الماس : وزیر اعظم (ترکیہ) ایک جہاز کے کپتان کا بیٹا تھا جو نواح ۱۰۷۰ھ/۱۶۶۰ء، عسپزوب کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ طرابلس کے پاشا کی ملازمت میں رہنے کی وجہ سے اس کی تعلیم محل کے خاص اودہ میں ہوئی۔ ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۷ء میں وہ سلحدار مقرر ہوا۔ تھوڑے ھی عرصے بعد وہ نشانجی کے عہدے پر ترقی کر گیا اور اسے وزیر کا منصب ملا۔ احمد ثانی کے عہد حکومت میں وہ بوسنہ کا پاشا تھا لیکن اس وقت تک اس نے کوئی نمایاں خدمت انجام نہ دی تھی۔ گو یہ مشہور ہے کہ وہ سلطان کے منظور نظر لوگوں میں سے تھا۔ مصطفی ثانی کی تخت نشینی کے بعد وہ شاہی رکابداروں کا قائم مقام بن گیا اور جب ینی چریوں کی ایک بغاوت میں سوریلی علی پاشاہ وزیر اعظم کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے تو اسے اس کی جگہ اس عہدے پر سرفراز کیا گیا (۱۱۰۷ھ/اپریل ۱۶۹۵ء)۔ وہ ۱۱۰۷ھ/۱۶۹۵ء و ۱۱۰۸ھ/۱۶۹۶ء و ۱۱۰۹ھ/۱۶۹۷ء میں آسٹریا کے خلاف مہمات میں نئے سلطان کا ہم رکاب رہا۔ ۱۱ ستمبر ۱۶۹۷ء کو آسٹریا کے لشکر نے پرنس یوجین کے زیر قیادت ترکی فوج پر حملہ کر دیا، جس وقت وہ زنتہ کے قریب تھیس Theiss سے گزر رہی تھی اور سگدن Szegedin کی طرف کوچ کر رہی تھی۔ سلطان دریا کے بائیں کنارے پر پہنچ چکا تھا لیکن وزیر اعظم چند بڑے بڑے فوجی افسروں سمیت اس روز لڑائی میں مارا گیا جس سے ترکی افواج کو بڑا بھاری نقصان پہنچا۔ الماس محمد اس فوجی مہم کا مخالف تھا لیکن مجلس کے دوسرے افراد نے اس کے خلاف رائے دی تھی۔ اس کا لقب الماس اس لیے مشہور ہوا کہ وہ بہت وجیہ اور شکیل آدمی تھا۔

مآخذ : (۱) تاریخ رشیدی بہترین ترکی ماخذ ہے اس کے علاوہ : (۲) عثمان زادہ تائب : حدیقة الوزراء ص ۱۲۱ ببعد ؛ (۳) سجل عثمانی، ۱ : ۴۹۵ ؛ فان ہیمر Von Hammer : G. O. R.، ۶ : ۴ ؛ (۴) Jinkeisen : Gesch. des Osm. Reiches ج ۵ ؛ (۵) Jorga : Gesch. des Osm. Reiches ج ۴ ؛ (۶) احمد رفیق : تالکت سن لری، ۱۳۳۲ھ۔

(J. H. KRAMERS)

محمد پاشا بالطه جی : وزیراعظم ۱۰۷۰ھ/۱۶۶۰ء کے قریب عثمان جیق کے شہر میں پیدا ہوا۔ اور شاہی محلات میں تعلیم پانے کے بعد بالطہ جی جیش میں بھرتی ہو گیا۔ خوش الحان ہونے کی وجہ سے کچھ عرصہ موذن کے فرائض ادا کرتا رہا۔ بعد میں منشی مقرر ہوا اور پھر بڑی سرعت سے ترقی پاتا گیا۔ ۱۷۰۳ء میں احمد ثالث کی تخت نشینی پر وہ میر آخور بنا اور ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء نومبر میں قپودان پاشا کے عہدے پر فائز ہوا۔ اس سال ماہ دسمبر میں قلیلی پاشا کی جگہ وزیر اعظم مقرر ہوا جس کے خلاف، اس امر کے باوجود کہ وہ بھی اس کے ساتھ کا بالطہ جی تھا، اس نے ساز باز کرنے میں اپنی ساری طاقت صرف کر دی۔ جس کی وجہ سے وہ بدنام ہوا اور ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء، ۳ مئی کو وہ بقول مورخ رشد ناقابلیت کی وجہ سے برطرف کر دیا گیا۔ وہ جہاز پر سوار ہو کر لمنوس چلا گیا، لیکن اس کے احباب نے کوشش کر کے اسے ارز روم کا گورنر نامزد کرا دیا۔

۱۱۲۱ھ/جنوری ۱۷۰۹ء میں وہ حلب کا گورنر مقرر ہوا اور یہاں ۱۱۲۲ھ/اگست ۱۷۱۰ء میں اسے دوسری مرتبہ وزارت عظمی کے لیے طلب کیا گیا کیونکہ کوپرولو نعمان پاشا نظام حکومت کو مستحکم نہ کرسکا، جس کی اس سے توقع تھی۔ اس زمانے میں روس سے پہلی بڑی جنگ نزدیک آ رہی تھی۔ چارلس دوازدھم شاہ سویڈن پولتاوہ کی لڑائی کے بعد ترکی ھی میں رہ گیا تھا۔ اس لیے بالطہ جی محمد کی دوسری وزارت کا زمانہ روس سے جنگ کی تیاریوں کے مسائل و مشکلات سے پُر تھا جس کا فیصلہ ایک مجلس عظمی نے ۱۱۲۲ھ/ نومبر ۱۷۱۰ء میں کیا اور شیخ الاسلام کے ایک فتوے کی رو سے اس پر مہر تصویب ثبت ھوئی۔ اس قابل یادگار مہم کا سر عسکر وزیر اعظم کو بنایا گیا۔ اس جنگ کا خاتمہ دریاے پروتھ کے کنارے فالچیو Falkoeu (ترکی فلچی) کی لڑائی میں جلد ھی یعنی ۱۱۲۳ھ/ ۲۰، ۲۲ جولائی ۱۷۱۱ء کو ھو گیا۔ پیٹر اعظم کی افواج بےسرو سامانی اور مایوسی کی حالت میں بیکار ھوکر رہ گئیں۔ لیکن اس کے جرنیل وزیر اعظم سے عارضی صلح کرنے میں کامیاب ھو گئے۔ شرائط صلح کی رو سے روسی افواج کو پسپا ھونے کی اجازت دے دی گئی اور ازوف ترکوں کے حوالے کر دیا گیا۔ عثمانی تاریخی روایات سے یہ معلوم ھوتا ھے کہ بالطہ جی محمد کو رشوت دے دی گئی تھی۔ کچھ بھی ھو اس کے دشمنوں کو اس کے خلاف قسطنطنیہ میں ریشہ دوانی کرنے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ دارالسلطنت کی طرف واپسی کے دوران میں اسے اپنی برطرفی کی اطلاع ادرنہ میں ۱۱۲۳ھ/نومبر ۱۷۱۱ء کو مل گئی۔ پروتھ کی عارضی صلح چارلس دوازدھم کو بھی بہت ناگوار گزری۔ اس نے وزیر اعظم پر اعتراض کیا تو اس کا ھتک آمیز جواب یہ دیا گیا کہ اگر پیٹر کو گرفتار کر لیا جاتا تو اس کی جگہ کوئی حکومت نہ کر سکتا اور عام طور پر یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ بادشاہ اپنا ملک چھوڑ دیں (Histoire de Charles et de Pirre I :Voltaire)۔ بالطہ جی کو لسبوس میں جلا وطن کر دیا گیا اور پھر لمنوس میں، جہاں وہ پچاس برس سے کچھ اوپر عمر پا کر فوت ھو گیا۔

اس وزیر اعظم نے ترکی کی تاریخ میں جو بڑی شہرت حاصل کی اور جس کی تائید فان ھیمر von Hammer بھی کرتا ھے، اس کی تصدیق مغربی ماخذ سےنہیں ھوتی (Jorga، ۴ : ۳۰۸).

مآخذ : (۱) سب سے بڑی ترکی سند تاریخ رشید کی ھے۔ روس کےخلاف مہم کا حال تاریخ سوسکوف میں بھی ھے جو مسلی کے مورخ حسن کی تصنیف میں منقول ھے اور سیونغ کے ایک مخطوطہ میں بھی ملتا ھے (Babinger : G. O. W، ص ۲۰۷، ۳۱۰)؛ (۲) دلاور زادہ : ذیل حدیقۃ الوزراء، ص ۷، ببعد؛ (۳) سجل عثمانی، ۴ : ۳۰۸ ببعد؛ (۴) فان ھیمر، G. O. R.، ۷ : ۱۱۱ بعد ۱۴۸ ببعد؛ (۵) Jorga : Gesch des Osm. Reiches ج ۴، جہاں دوسرے مغربی ماخذ بھی منقول ھیں؛ (۶) احمد رفیق : عالیک عثمانیہ دہ دس‌بالی نرول، قسطنطنیہ ۱۹۱۰ء؛ (۷) احمد مختار : *Rus menabi'ine gore Baltadji Mehmed Pashanin prut sefari*, T. O. E. M.، ج ۸، ص ۱۶۰ ببعد، ۲۳۸ ببعد.

(J. H. KRAMERS)

محمد پاشا ترباکی : محمود اول کے عہد حکومت کا وزیر اعظم ۱۰۹۱ھ/۱۶۸۰ء میں قسطنطنیہ میں پیدا ھوا۔ اس کا باپ ایک "ینی چری" تھا۔ وہ پہلے پہل بطور منشی مقرر ھوا۔ پھر رفتہ رفتہ اہم عہدوں پر ترقی کر گیا۔ ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء میں اس نے بلغراد میں آسٹریا کے ساتھ صلح کی گفت و شنید میں خدمات انجام دیں۔ وہ وزارت عظمی میں کد خدا، یعنی وزیر داخلہ کے عہدے *

پر مامور تھا کہ سلطان نے اپنے نئے قزلر آغاسی کے زیر اثر ، جسے بشیر اصغر بھی کہتے تھے ، اس کے پیش رو حسن پاشا کو برطرف کر کے اسے وزارت عظمٰی کا منصب سنبھالنے کے لیے طلب کیا [۱۱۵۹ھ/ اگست ۱۷۴۶ء]۔ پہلے بارہ مہینے تو خیریت سے گزر گئے۔ اس زمانے میں کوئی لڑائی نہ ہوئی، بلکہ اہم سیاسی گفت و شنید جاری تھی جس میں اسے نئے وزیر داخلہ (کدخدا) محمد سعید کی ، (جو بعد میں وزیراعظم مقرر ہوا) اور "رئیس آفندی" مصطفٰی کی تائید حاصل تھی ۔ یہ دونوں سیاست فرنگ سے بخوبی واقف تھے ۔ تریاکی محمد کی وزارت میں نادر شاہ شاہ ایران سے صلح ہوئی [۱۱۶۰ھ/ ۴ ستمبر ۱۷۴۷ء]۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اسے نشہ آور ادویات کے استعمال کی بری عادت تھی اور اسی وجہ سے اس کا نام بھی تریاکی پڑ گیا ۔ اس کے علاوہ وہ جھگڑالو اور منتقم طبیعت کا آدمی بھی تھا ، جس کی وجہ سے اس نے اپنے کئی دشمن پیدا کر لیے تھے ، خصوصاً طبقہ علماء تو اس کا بے حد مخالف تھا ۔ اس کے زوال کے بعد وہ کئی ایالتوں کا گورنر رہا مثلاً ایچ ایلی ، موصل ، بغداد ، خندہ ۔ وہ ۱۷۵۱ء میں کریٹ میں ردیمو کے مقام پر فوت ہوا ، جہاں وہ سبکدوش ہونے کے بعد سکونت پذیر تھا ۔ بقول سجل عثمانی وہ وزیر اعظم مقرر ہونے سے پہلے ایک قابل عہدے دار تھا ، لیکن بعد میں وہ ہر عہدے کے لیے نااہل ثابت ہوا ۔

* مآخذ : (۱) تاریخ عزّی (۲) دلاور زادہ عمر : ذیل حدیقۃ الوزراء، ص ۷۳ ببعد؛ (۳) سجل عثمانی : ۴ : ۷۲۲ (جہاں تاریخیں غلط دی ہیں) von Hammer : G.O.R.، ج ۹.

(J. H . KRAMERS)

محمد پاشا ، روم : وزیر اور بعض مآخذ کے مطابق سلطان محمد ثانی کے عہد حکومت میں وزیر اعظم تھا ۔ جیسا کہ اس کے عرف نام سے ظاہر ہے ، وہ یونانی الاصل نو مسلم معلوم ہوتا ہے ۔ محل میں تعلیم پانے کے بعد اس کی قسمت میں فوجی بننا لکھا تھا ۔ وہ ایک دفعہ بکلر بک بھی ہو گیا ۔ اس کی تاریخ پیدائش اور مختلف عہدوں پر ترقی پانے کی تاریخیں کہیں درج نہیں ۔ ۸۷۱ھ/ ۱۴۶۶ء میں اس نے سلطان محمد ثانی کی آخری مہم میں جو قرہ مان کے خلاف تھی حصہ لیا تھا اور سلطان نے محمود پاشا [رک بآں] کے بجائے اس کو یہ کام سپرد کیا کہ وہ مفتوحہ علاقے کی آبادی کو قسطنطینیہ میں منتقل کر دے ، کیونکہ بموجب مآخذ محمود پاشا نے یہ کام بڑی نرمی کے ساتھ سر انجام دیا تھا ۔ جب سلطان قسطنطینیہ میں واپس آیا تو اس نے محمود کو اپنے عہدے سے معزول کر کے اس کی جگہ روم محمد کو مقرر کر دیا جو ۱۴۷۰ء تک وزیر اعظم رہا ۔ اس عرصے میں محمد ثانی اپنی مہم البانیہ [دیکھیے سکندر بیگ] اور نگرو پونتہ میں مصروف رہا ۔ یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ روم محمد نے بھی ان مہمات میں کوئی حصہ لیا ہو لیکن مآخذ کا مطالعہ تنقیدی نظر سے کرنے پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے ذمے قسطنطینیہ کو دوبارہ آباد کرنے کا کام لگا دیا گیا تھا اور قرہ مان کی آبادی کا انتقال بھی اسی مسئلہ کا ایک جزو تھا ۔

چونکہ جدید دارالخلافہ کو دوبارہ آباد کرنے کے اقدامات اسلامی حلقوں میں پسندیدہ نظروں سے نہ دیکھے گئے ہوں گے اس لیے یونانی اور نصرانی عناصر کو وہی مراعات دے دی گئیں جو مسلمانوں کو اس شہر میں آباد ہونے کے لیے حاصل تھیں ۔ قدیم عثمانی وقائع میں محمد پاشا کے خلاف رائے زنی کی گئی ہے ۔ اس پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے قسطنطینیہ میں مکانوں کا کرایہ یعنی

"مقاطعہ" دوبارہ عائد کر دیا اور یہ بات جدید مسلمان آباد کاروں کے حق میں نا انصافی تصور کی گئی۔ کہتے ہیں کہ مقاطعہ سلطان نے عائد کیا تھا۔ پھر اسے منسوخ کر دیا گیا اور اس وزیر اعظم نے دوبارہ لگا دیا جیسا کہ F. C. Giese نے عاشق پاشا زادہ اور طرسون (دیکھیے Isl : ۱۹ ، ۱۹۳۱ء، ص ۲۶۸ ببعد) کے متن کا تجزیہ کرتے ہوئے ظاہر کیا ہے۔ یہ اقدامات سلطان کی حکمت عملی کا ایک جزو تھے۔ اور ان کا نفاذ ایک قائمقام وزیر اعظم سے غالباً صرف اس غرض سے کرایا گیا کہ وہ یونانی الاصل ہونے کے باعث ایسے مشکل کام کو سر انجام دینے کی اہلیت رکھتا تھا۔ یہ آخری بات اس کی حیثیت کو مورخین کی نظروں میں اور بھی زیادہ مشتبہ کر دیتی ہے۔ اس لیے ہمیں یہ باور کر لینا چاہیے کہ ان ماخذ میں ترہ مان کی آبادی پر تشدد کی داستان کے متعلق مبالغہ آمیزی سے کام لیا گیا ہے، تاکہ اس کے پیش رو محمود پاشا کی عزت و توقیر میں اضافہ ہو جس کی یاد ایک قومی بطل کے طور پر زندہ ہے۔ یہ سوال بھی خارج از بحث نہیں کہ آیا روم محمد حقیقتاً کبھی وزارت عظمی کے منصب جلیلہ پر فائز ہوا (سجل عثمانی)۔ حدیقۃ الوزراء (ص ۱۰) میں محمود پاشا کے زوال کا باعث یہ بتایا جاتا ہے کہ روم محمد نے اس کے خلاف خفیہ ساز باز کی تھی۔ لیکن محمود کا جانشین جو وزارت عظمی پر فائز ہوا، اسحق پاشا بیان ہوتا ہے دوسرے مورخین بھی یہی لکھتے ہیں۔

وہ ۸۷۵ھ/۱۴۷۰ء میں اپنے عہدے سے برطرف کر دیا گیا اور اس کے بعد (بموجب سجل عثمانی) ۸۷۹ھ/۱۴۷۴ء میں اسے قونیہ کا والی بنا دیا گیا تاکہ وہ اس نئے مفتوحہ علاقہ میں امن و سکون پیدا کرے۔ تاہم اسے قبیلہ ورسک نے کیلیکیا کے دروں میں شکست دی۔ تھوڑی مدت بعد وہ فوت ہو گیا۔ غالباً سلطان کے حکم سے اسے مار ڈالا گیا (عاشق پاشا زادہ طبع Giese، ص ۱۴۳)۔ ان واقعات کی تاریخوں کی ترتیب کچھ غیر یقینی ہے۔

روم پاشا کو اسی مسجد میں دفن کیا گیا جو اس نے اشقودرہ میں تعمیر کرائی تھی۔

مآخذ: (۱) ابتدائی تاریخوں میں سے تصانیف نثری و عاشق پاشا زادہ اور بعد کے مورخین میں سے بالخصوص علی؛ (۲) سجل عثمانی ۴ : ۱۰۴؛ (۳) von Hammer : G.O.R.، بار دوم، ۱ : ۴۸۸، ۴۹۹؛ (۴) حافظ حسین الایوان سرائی : حدیقۃ الجوامع ۲ : ۱۹۵۔

(J. H. KRAMERS)

* **محمد پاشا، سلطان زادہ:** سلطان ابراہیم کے عہد حکومت کا وزیر اعظم نواح ۱۰۰۹ھ/۱۶۰۰ء میں پیدا ہوا۔ عبدالرحمن بے ابن احمد پاشا سابق وزیر اعظم (مراد ثالث کے عہد میں) کا بیٹا تھا۔ محلات میں بطور قپوجی باشی رہنے کے بعد اس نے فوجی ملازمت اختیار کی اور ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء میں قبہ وزیری ہو گیا۔ ۱۶۳۸ء میں اسے مصر کا گورنر مقرر کیا گیا۔ ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء میں اسے سہم ازوف (زرک بان) کی کمان سپرد کی گئی جسے کاسکوں Cossacks نے واگذار کرنے سے پہلے جلا دیا تھا اور اس نے اسے دوبارہ تعمیر کرایا۔ وہاں سے واپسی پر اس نے سلحدار یوسف پاشا اور سلطان کے منظور نظر جنیجی خواجہ سے مل کر ایک مجلس ارباب ثلاثہ قائم کی جسے والدۂ کوسم [زرک بان] کی تائید حاصل تھی۔ انہوں نے وزیر اعظم قرہ مصطفی پاشا کے خلاف خفیہ ریشہ دوانی شروع کی جس نے اس خطرہ کو رفع کرنے کے لیے یہ کوشش کی کہ سلطان زادہ محمد کو ۱۰۵۳ھ/۱۶۴۳ء میں والی مقرر کر کے دمشق بھیج دیا۔ جب قرہ مصطفی پاشا یکم جنوری ۱۶۴۴ء کو قتل کر دیا گیا

تو سلطان زادہ محمد کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ اس عہدے پر فائز ہونے کے بعد اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ بادشاہ کی خوشامد کرنے میں بڑا طاق نکلا اور اس طرح وہ اپنی پُر اسراف خواہشات کے لیے ہر ممکن ذریعہ سے روپیہ حاصل کرتا تھا اور اس نے ابراہیم کے منظور نظر لوگوں کو سنجق کے سنجق دینا شروع کر دیے۔ اس زمانے میں آسٹریا سے صلح تھی جس نے اگست ۱۶۴۴ء میں ایک غیر معمولی سفارت صلح کی تصدیق کے لیے بھیجی تھی۔ ایران سے بھی صلح تھی گو Rakoczy شہزادۂ ٹرانسلوینیہ نے ترکوں کو آسٹریا سے لڑا دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ البتہ اس بات کی زبردست خواہش موجود تھی کہ وینس (بندق) سے جنگ کر کے اقریطش (کرید) کو فتح کر لیا جائے۔ چنانچہ وہ اپریل ۱۶۴۶ء میں روانہ ہوا اور اہل وینس کو تندوس سے نکال دیا جو انہوں نے اچانک حملہ کر کے فتح کر لیا تھا۔ کنیہ (Canea) میں پہنچنے کے تھوڑا عرصہ بعد اس کا انتقال ہو گیا [۱۰۵۶ھ/ جولائی ۱۶۴۶ء]۔ اسے اشقودرہ کے تکیہ ہدائی میں دفن کیا گیا۔

مآخذ: (۱) نعیما: تاریخ سب سے بڑا ترکی ماخذ ہے۔ اس زمانے کی قیمتی معلومات اولیا چلبی کے سیاحت نامہ میں بھی درج ہیں جو ازوف کی مہم میں خود بھی گیا تھا۔ اس کے علاوہ: (۲) ذیل تواریخ آل عثمان مصنفہ لصوح پاشا زادہ (قب Babinger : G. O. W، ص ۲۱۱) اور ایک نامعلوم مصنف کا نصیحت نامہ (G. O. W، ص ۱۵۲ نوٹ)؛ (۳) عثمان زادہ تائب: حدیقۃ الوزراء، ص ۸۳ ببعد؛ (۴) سجل عثمانی، ۳: ۱۹۱؛ (۵) von Hammer: G.O.R.، ج ۵۔

(J. H. KRAMERS)

* **محمد پاشا صوقوللی:** رک بہ صوقوللی۔

محمد پاشا قرہ مانی: رک بہ قرہ مانی محمد پاشا۔

محمد پاشا لالا: احمد اول کے دور حکومت کا وزیر اعظم۔ وہ بوسنوی الاصل اور محمد صوقوللی پاشا کا ایک رشتے دار تھا۔ اس کا سال پیدائش کہیں درج نہیں ہے۔ محل میں تعلیم پانے کے بعد وہ میر آخور ہوا اور ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء میں ینی چریوں کا آغا بن گیا۔ دو سال بعد اس نے آسٹریا کی جنگوں میں حصہ لیا۔ وہ روم ایلی کا بکلربک تھا اور استرغون Eaztgom (Gran) کا قائد تھا۔ جب کہ ۱۰۰۳ھ/ ستمبر ۱۵۹۵ء میں اس شہر نے آسٹروی فوجوں کے سامنے ہتیار ڈال دیے۔ بعد کے سالوں میں لالا محمد پاشا کئی مرتبہ ہنگری میں سر عسکر رہا اور ۱۰۱۲ھ/ جولائی ۱۶۰۳ء میں جب وزیر اعظم یاوز علی ہنگری کے جنگی محاذ پر جاتے ہوئے بلغراد میں فوت ہو گیا تو سلطان نے مہر سلطانی لالا محمد کے پاس بھجوا دی۔ گو صلح کی کوشش جاری تھی تاہم ترک وزیر اعظم نے واچ (Waitzen) کے شہر پر قبضہ کر لیا لیکن استرغون کا محاصرہ ناکام رہا۔ اگلے سال کی مہم میں لالہ محمد نے استرغون پر بھی قبضہ کر لیا۔ ۱۰۱۴ھ/ ۲۹ ستمبر ۱۶۰۵ء اور نومبر کے مہینے میں اس نے ہنگری کے Bocskay کو ہنگری اور ٹرانسلوینیا کا بادشاہ قرار دے کر تاج شاہی پہنا دیا (ان علاقوں کے سوا جن پر ترکوں کا قبضہ ہو چکا تھا)۔ اسی سال ترکوں کے مشرقی لشکر کو جو چغالہ پاشا کے ماتحت تھا، ایرانیوں نے شکست دی اور وہ فوج جو اناطولی کی بغاوت کی سرکوبی کے لیے بھیجی گئی تھی، اسے بلاوا دین کے مقام پر دلدان شکن شکست ہوئی۔ اس کی واپسی پر یہ فیصلہ ہوا کہ اگلے سال وزیر اعظم دارالخلافہ ہی میں مقیم رہے اور دونوں محاذوں پر

جنگ کی قیادت کرے اور اگر ممکن ہو تو آسٹریا سے جو طویل گفت و شنید جاری رہی ہے، اسے کامیابی کے ساتھ ختم کرے؛ تاہم نوجوان سلطان نے قپودن پاشا درویش کی خواہشات کے مطابق جو لالہ محمد پاشا کے خلاف اپنی ریشہ دوالیوں میں مصروف تھا اپنا ارادہ بدل لیا؛ چنانچہ لالہ محمد پاشا کو حکم ہوا کہ وہ ایران کے خلاف فوج کی کمان سنبھال لے ۔ وہ اشقودرہ کے مقام پر خیمہ زن ہو چکا تھا، لیکن اپنی تجاویز پر پانی پھر جانے کی وجہ سے اسے اتنا صدمہ ہوا کہ اسے مرگی کا دورہ پڑ گیا اور تین روز ہی کے بعد فوت ہو گیا (۱۰۱۵ھ/ ۲۳ مئی ۱۶۰۶ء) اور اسے صوقوللی پاشا کی تربت کے قریب دفن کیا گیا ۔

مآخذ: (۱) پیچوی کی تاریخیں جو بطور کاتب لالا محمد کی ملازمت میں کئی مرتبہ رہ چکا تھا (قب Babinger : *G. O. W*، ص ۱۹۲)؛ (۲) نعیما اور حسن بے زادہ؛ (۳) عثمان زادہ تائب: حدیقۃ الوزراء، ص ۵۲ ببعد؛ (۴) سجل عثمانی، ۴: ۱۰۴؛ (۵) فان ہیمر: *G.O.R.*، ج ۳ ۔

(J. H. Kramers)

* **محمد پاشا یگن**: محمود ثانی کے زمانے کا وزیر اعظم، اسے یگن "بھتیجا" اس لیے کہتے تھے کہ وہ کل یوسف آفندی کا بھتیجا تھا جو محکمۂ خزانہ کے ایک عہدہ جلیلہ پر مامور تھا (سجل عثمانی، ۴: ۶۵۹)؛ اس نے بھی محکمۂ خزانہ ہی سے ملازمت شروع کی تھی ۔ وہ کئی عہدوں پر فائز رہا اور وزیر اعظم طوپال عثمان پاشا (۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء) کا قپی کدخدا سی بھی تھا ۔ ۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء میں وہ عبداللہ پاشا وزیر اعظم کی عدم موجودگی میں قسطنطینیہ میں قائمقام بھی رہا ۔ عبداللہ پاشا کو اس سال آسٹریا والوں کے خلاف ڈینیوب کی سرحد پر کامیابی حاصل ہوئی تھی (فتح اسلام)، لیکن اس کے باوجود اس کی واپسی پر اسے موقوف کر دیا گیا اور یہ موقوفی قزلر آغاسی بشیر کے زیر اثر ہوئی ۔ یگن محمد اس کی جگہ مقرر ہوا (دسمبر ۱۷۳۲ء) ۔ اس نے بھی آسٹریا اور روس سے صلح کی گفت و شنید برابر جاری رکھی جو فرانس کی نمایندہ (Villeneuve) اور دول بحریہ کی باہمی رقابت کی وجہ سے بھی زیادہ پیچیدہ صورت اختیار کر گئی تھی کیونکہ یہ طاقتیں بھی ثالث بالخیر بننے کی متمنی تھیں ۔ وزیر اعظم خود تو جنگ جاری رکھنے کے حق میں تھا، لیکن بے حد گھمنڈی اور مغرور تھا، اس لیے یہ گفت و شنید مشکل تر ہو گئی ۔ ۱۱۵۰ھ/ جون ۱۷۳۷ء میں وہ سردار کی حیثیت سے آسٹروی محاذ پر گیا اور سمندرہ اور سوہ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا (اگست) ۔ نومبر کے مہینے میں وہ دارالخلافہ میں واپس آ گیا ۔ سال کے ختم ہونے پر روسی فوج اوچاکوف اور کلبرنو سے پیچھے ہٹ گئی جس کی وجہ سے ترکی کو صلح کی گفت و شنید کے اس لامتناہی سلسلے میں، جس میں پولینڈ بھی شامل ہو گیا تھا، سازگار حیثیت حاصل ہو گئی ۔ یہ وزیر ابھی جنگ ختم کرانے میں کامیاب نہ ہوا تھا کہ انھیں اثرات کے ماتحت جن کی وجہ سے اس کا پیش رو برطرف ہوا تھا، اسے بھی ۱۱۵۲ھ/مارچ ۱۷۳۹ء میں برطرف کر دیا گیا ۔ اس کے بعد یگن محمد، کریٹ، بوسینا، آیدن اور انا دول کا گورنر رہا ۔ جب وہ انا دول کا گورنر تھا تو اسے سردار کی حیثیت سے قارص ۱۱۵۸ھ/ مارچ ۱۷۴۵ء کے محاذ پر ایرانیوں کے خلاف جنگ آزمائی کے لیے طلب کیا گیا ۔ اسے مختلف علاقوں سے بڑی فوجی کمک ملی اور اس نے اپنی طاقت کو کافی مضبوط سمجھتے ہوئے نادر شاہ کے پڑاؤ پر جو اریوان کے قریب تھا، حملہ کیا ۔ لڑائی کا نتیجہ ترکوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوا ۔ اس شکست کی بڑی وجہ یہ تھی کہ

بے ضابطہ افواج یعنی ”لوند“ نے بغاوت کر دی۔ غالباً انھیں باغیوں نے یگن کو اگست ۱۱۵۸ھ/ ۱۷۴۵ء میں قتل بھی کر ڈالا تھا۔

مآخذ: (۱) ترک مؤرخین صبحی عزی؛ (۲) دلاور زادہ عمر: ذیل حدیقۃ الوزراء، ص ۶۰ ببعد؛ (۳) سجل عثمانی، ۴: ۴۴۴؛ (۴) فان ہیمر: G. O. R.، ۷؛ (۵) Zinkeisen: *Gesch. des. Osm. Reiches*، ج ۵؛ (۶) Jorga: *Gesch. des. Osm. Reiches*، ج ۵۔

(J. H. KRAMERS)

* **محمد تُغلق**: دھلی کے تغلق خاندان کا دوسرا بادشاہ تھا، یعنی خاندان کے بانی غیاث الدین تغلق کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ غاصب سلطان ناصر الدین خسرو کے مختصر عہد حکومت میں اس کی جان خطرے میں تھی، لیکن وہ چپکے سے فرار ہو کر اپنے باپ سے جا ملا جو فوج کشی کر کے دھلی کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اسے پہلے جونا خان کہا کرتے تھے، لیکن اسے الغ خان کا خطاب دے کر ۷۲۱ھ/ ۱۳۲۱ء میں ورنگل بھیج دیا گیا تاکہ وہ راجہ پرتاپ رودرا دیو ثانی کو مطیع کرے۔ اس دور دراز ملک میں پہنچ کر اس نے اپنی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کی فوج کو اس کی خود ساختہ کہانی کا یقین نہ آیا کہ اس کا باپ دھلی میں فوت ہو گیا ہے، اس لیے انھوں نے اسے اپنا بادشاہ تسلیم نہ کیا۔ آخر اسے جلد ھی کوچ کر کے دارالحکومت میں واپس آنا پڑا۔ یہاں آ کر یا تو اس نے اپنے باپ کو یہ یقین دلا دیا کہ وہ اس معاملے میں بالکل بے گناہ تھا یا اس نے معافی مانگ لی، کیونکہ اس کے شریکان کار سے ساز باز رکھنے والوں کو تو بڑی بے رحمی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ اس کو بار دیگر ۷۲۳ھ/ ۱۳۲۳ء میں تلنگانہ بھیج دیا گیا۔ اس دفعہ اس نے راجہ کو ہتھیار ڈالنے دینے پر مجبور کر دیا اور اسے دھلی بھیج دیا گیا۔ اس سے اگلے سال اس نے اپنے باپ کی جگہ، جو بنگال میں ایک سہم کے ساتھ گیا تھا، نائب السلطنت کے طور پر فرائض حکومت سر انجام دیے، لیکن اس کی عام روش سے شک پیدا ہوا اور اس کے باپ نے بنگال سے اس کو ملامت آمیز خط لکھے۔ اس کی واپسی پر اس نے اپنے باپ کا استقبال ایک لکڑی کے محل میں کیا، جس کی تعمیر میں یہ رعایت رکھ لی گئی تھی کہ صرف ایک شہتیر کے الگ کرنے سے سارے کا سارا ڈھانچہ دھڑام سے زمین پر آ رہے اور اس ترکیب سے اس نے اپنے بوڑھے باپ کا کام تمام کر دیا [بقول برنی جس وقت دستر خوان بچھایا گیا، اسی وقت نو تعمیر محل پر بجلی گری اور اس کے ٹوٹنے سے سلطان اور شہزادہ محمود چھت کے نیچے دب گئے، باقی اکثر حاضرین ہاتھ دھونے کے لیے باہر آ گئے تھے (ص ۲۵۳)۔ اس ناگہانی بجلی گرنے کی روایت نے بھی لوگوں کا شک دور نہیں کیا اور کئی تاریخوں میں لکھا ہے کہ محمد تغلق نے عموماً یہ قصر ایسا بنوایا تھا کہ گر پڑے اور بادشاہ ھلاک ہو جائے [منتخب التواریخ، ص ۲۲۵] - ۷۲۵ھ/ فروری ۱۳۲۵ء میں اس کی جگہ خود تخت نشین ہو گیا۔

محمد تغلق ایسے آدمی کی سیرت کا تجزیہ جو نہ صرف پیچیدہ ہے، بلکہ متضاد بھی ہے، کوئی آسان کام نہیں۔ وہ ان غیر معمولی بادشاھوں میں سے تھا جو کبھی کبھی تخت نشین ہوئے۔ لکھ لٹ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی طبیعت میں اندھا دھند قسم کی بے رحمی بھی تھی۔ اسلامی شریعت کے مطابق عام فرائض و احکام کا وہ سختی سے پابند تھا، لیکن امور سلطنت میں اس قانون کو کبھی کبھی نظر انداز بھی کر دیتا تھا۔ ایک طرف تو وہ ان تمام قابل تعظیم، عالی نسب اور متقی لوگوں سے بڑی

عقیدت رکھتا تھا، لیکن دوسری جانب جب کبھی اس کی تند خوئی غالب آ جاتی تو پھر وہ کسی کے ذاتی تقدس کا لحاظ نہیں رکھتا تھا۔ نظام حکومت کے متعلق اس کے بعض اقدامات اور اس کے اکثر فوجی اور انتظامی منصوبے انتہائی قابلیت کے آئینہ دار ہیں [مثلاً بقول برنی (تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۶۸، ۷۳) بادشاہ ہوتے ہی محمد تغلق کی سخت نگرانی کی وجہ سے سلطنت کے قریب و بعید صوبوں کا فرق مٹ گیا۔ جس تفصیل سے نواح دہلی کی جمع بندی اور سرکاری آمد و خرچ کے گوشوارے دیوان وزارت میں موجود رہتے تھے، اسی طرح بنگال و دکن کے ایک ایک پرگنے کے کاغذات مرتب و مہیا ہو گئے۔ قصر ہزار ستون میں شاہی دفتر قائم ہوا۔ جس باریک بینی سے مضافات دہلی کے عاملوں اور اہل کاروں کے حسابات کی جانچ پڑتال ہوتی، فاضلات و بقایا میں چند پیسے کی بھول چوک بھی نا ممکن تھی۔ ایک نیا محکمہ (دیوان) محض شاہی فرامین کی تحریر و اجرا اور جوابات کی وصولی کے لیے قائم کیا گیا (بحوالہ ہاشمی فرید آبادی، ۱ : ۳۰۸، ۳۰۹-۳۱۰].

اس کے عہد حکومت کی تاریخ زیادہ تر بغاوتوں اور شورشوں کے حالات سے پر ہے جن کی سرکوبی کے لیے اس نے سخت سزائیں دیں۔ اس کی حکومت کے دوسرے ہی سال اس کے عمزاد گرشاسپ نے دکن میں بغاوت کی، جس کی جیتے جی کھال اتروا دی گئی۔ ۱۳۲۷ء میں اس نے دیوگیر دوبارہ تعمیر کرا کے اس کا نام دولت آباد رکھا اور اسے اپنا پایۂ تخت بنایا۔ دو سال بعد وہ دہلی کی تمام آبادی وہاں لے گیا [دہلی سے ان دنوں وہ قدیم شہر مراد ہوتا تھا جو ایبک اور التتمش نے موجودہ مہرولی میں آباد کیا تھا۔ "شہر نو"، سیری وغیرہ کئی بستیاں بعد میں آباد ہوئیں۔ یہ صاف طور پر پتا نہیں چلتا کہ محمد تغلق نے صرف پرانے شہر کی آبادی منتقل کی تھی یا سب بستیوں کی (سید ہاشمی فرید آبادی: تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت، ج ۱، حاشیہ ص ۱۳۳)]۔ ۱۳۲۸ء میں کشلو خان نے ملتان میں بغاوت کی۔ اس نے شکست کھائی اور وہ قتل ہوا۔ ۷۳۰ھ/۱۳۲۹ء میں علاءالدین ترما شرین مغل نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اسے ملک سے باہر نکال دیا گیا۔ اسی سال گنگا دوآب میں مالیانہ بڑھا دیا گیا تو لوگوں نے بغاوت کر دی اور جو اقدامات اس بغاوت کو دبانے کے لیے کیے گئے، ان کی وجہ سے سارا علاقہ غیر آباد ہو گیا۔ اسی زمانے کے قریب قریب محمد تغلق نے اپنا مشہور و معروف خود ساختہ سکہ جاری کیا اور حکم دیا کہ اس کے چلائے ہوئے پیتل کے علامتی سکوں کو چاندی کے تنکوں کے برابر سمجھا جائے [اس کی وجہ بقول برنی یہ تھی کہ ان دنوں ہندوستان میں سونے چاندی کے سکے کا ایسا قحط ہو گیا تھا کہ زراعت و تجارت میں بڑی رکاوٹ پڑنے لگی تھی۔ بیرونی مہمات اور ملکی مصارف کے لیے حکومت کو زر خالص کی ضرورت تھی [تاریخ فیروز شاہی، ص ۵۷۴]۔ اس سلسلہ میں لوگوں کے جعلی سکوں کے بنانے کے متعلق کوئی احتیاطی تدابیر اختیار نہ کی گئیں اور جب یہ تجربہ ناکامیاب ثابت ہوا تو ان پیتل کے تنکوں کو خزانہ میں واپس داخل کرنے کا حکم ہوا تو پیتل کے انبار در انبار سکے چاندی کی قیمت پر خریدنے پڑے۔

۷۳۲ھ/۱۳۳۱ء میں بہرام خان نے بنگال میں ایک بغاوت کو فرو کیا، لیکن ۷۳۹ھ/۱۳۳۸ء میں اس کا انتقال ہو گیا اور ایک دوسری بغاوت کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوبہ بنگال سلطنت دہلی سے علیحدہ ہو گیا۔ ۷۳۴ھ/۱۳۳۴ء میں سید جلال الدین احسن نے مدورا میں اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی۔ محمد تغلق نے اسے سزا دینے کی غرض سے فوج کشی

کی ، لیکن اس کی فوج میں وبا پھیل جانے کی وجہ سے اسے پسپا ہونا پڑا اور واپس آ کر اس نے دکن میں بیش قرار رقوم کے عوض مالیانہ اراضی کا ٹھیکہ دینے کا تباہ کن طریق نافذ کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مفلس اور قلاش کاشتکاروں اور نادہند ٹھیکہ داروں نے بغاوت کر دی ۔ دولت آباد کے ہوشنگ نے بادشاہ کی موت کی افواہ سن کر بغاوت کر دی ، لیکن جب وہ گرفتار ہو گیا تو اسے معاف دے دی گئی۔ اس بادشاہ کے مراحم خسروانہ کی یہ ایک شاذ مثال تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی پنجاب کی ایک بغاوت کو بڑی بے رحمی کے ساتھ دبا دیا گیا۔

۷۳۸ھ/۱۳۳۷ء میں شمالی ہند ایک سخت آفت میں مبتلا ہو گیا ، یعنی غضب کا قحط پڑا اور پورے سات سال تک جاری رہا۔ بادشاہ نے قحط سالی کا سدباب کرنے کے لیے جو تدابیر اختیار کیں وہ بحیثیت مجموعی سب دور اندیشی پر مبنی تھیں اور ان کا عمل درآمد بھی اعلیٰ طریق سے ہوا ۔ اودھ میں غلہ فراواں تھا جس سے ثابت ہوا کہ قحط محض مصنوعی اسباب کی وجہ سے ہو گیا ہے۔ بادشاہ نے ایک عارضی شہر سرگ دواری (سنسکرت: سورگ دوارہ بمعنی باب الفردوس) دریائے گنگا کے مغربی کنارے پر تعمیر کرایا اور وہاں دہلی کے باشندوں کو لے گیا اور حاکم اودھ عین الملک کی امداد سے ان کی خوراک کا انتظام اودھ کے اناج کے ذخائر سے کرایا ۔

۷۴۰ھ/۱۳۳۹ء میں دکن کی ایک سازش کا قلع قمع کیا گیا حتی کہ عین الملک جیسے وفادار سردار نے بھی تنگ آ کر بغاوت کردی، لیکن اس کی گذشتہ خدمات کا لحاظ کرتے ہوئے اسے سزائے موت دینے کے بجائے قید کر دیا گیا ۔ اس کے فوراً بعد ہی شاہو افغان ملتان میں بگڑ بیٹھا، لیکن بادشاہ کے غیظ و غضب کی تاب نہ لاتے ہوئے افغانستان کی طرف بھاگ گیا ۔ اس وقت قحط سالی انتہا پر تھی۔ محمد تغلق اب ایسے قواعد و ضوابط مرتب کرنے میں مصروف ہوا جس سے زراعت کاری کو ترقی ہو اور آیندہ کے لیے قحط کے خطرات دور ہو جائیں ۔ اس زمانے کا مورخ ارادی یا غیر ارادی طنز کے ساتھ لکھتا ہے، اگر یہ تجویز قابل عمل ہوتیں تو ان کے ذریعہ غلہ کی ایسی فراوانی ہو جاتی کہ وہ دنیا بھر کے لیے کافی ہوتا۔ ان میں مالیانہ کو ٹھیکہ پر دینے کے طریقے کو وسعت دینا بھی شامل تھا ۔ ان تجاویز نے انتشار پھیلایا اور بغاوتوں کو ترقی دی ۔ ان کیفیات کا رد عمل بادشاہ کی طبیعت پر یہ ہوا کہ وہ اپنی رعایا ہی کو اپنا قدرتی دشمن سمجھنے لگا اور اپنے مطلقانہ اقتدار کے سارے حربے لے کر رعایا پر ٹوٹ پڑا۔ ابن بطوطہ نے قتل کی سزاوں کی بیزاری اور تفصیلات لکھی ہیں ۔ سنام ، سامانہ ، کیتھل ، گہرام ، کڑہ اور دکن سب جگہوں کی بغاوتیں بادشاہ کی تحصیل مالیانہ کی خرابیوں سے پیدا ہوئیں ، لیکن دکن کی بد دلی کو اس نے اپنے عمائد و حکام کی سرکشی پر محمول کیا اور (اس کے انسداد کے لیے) ایک ایسے بدبخت شخص کو بھیجا جس نے ۸۰ حکام کو سرد مہری کے ساتھ قتل کرا دیا ۔ اس وحشیانہ سلوک سے مشتعل ہو کر جو بغاوت ہوئی ، اس میں وہ خود بھی ہلاک ہوا۔ محمد تغلق نے گجرات کے علاقے میں فوج کشی کی اور بنفس نفیس مالیانہ سرکار کے بقائے وصول کرنے شروع کیے۔ دکن کے عمال ایسے گھبرائے کہ انہوں نے دولت آباد کے قلعے پر قبضہ کر لیا اور ایک افغان اسمٰعیل مُخ کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ بادشاہ نے دولت آباد کی طرف کوچ کیا اور شہر پر قبضہ کر کے باغیوں کو قلعے میں محصور کر دیا، لیکن اسے گجرات کی طرف لوٹنا پڑا جہاں طغی نامی ایک شخص نے بڑی زبردست بغاوت برپا

کر دی تھی، وہ تین سال تک متواتر اس باغی کے تعاقب میں گجرات اور کاٹھیا واڑ کے علاقوں میں پھرتا رہا۔ اسے اس نے سندھ کی طرف بھگا دیا اور وہاں بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ ۷۵۲ھ/ ۲۰ مارچ ۱۳۵۱ء کو ٹھٹھ سے چند میل کے فاصلے پر فوت ہو گیا، جہاں اس باغی نے پناہ لے رکھی تھی۔ ایک مورخ لکھتا ہے کہ "اس طرح بادشاہ نے اپنی رعایا سے اور رعایا نے بادشاہ سے خلاصی پائی" اس کی سلطنت کی زیادہ سے زیادہ وسعت میں سارا ہندوستان ہی شامل تھا، البتہ چولا اور پانڈیہ راجاؤں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں جو راس کماری کے نواح میں تھیں اور کاٹھیاواڑ کا صوبہ گرنار اس سے مستثنے تھا۔ وفات سے قبل بنگال، صوبہ دکن، کاٹھیاواڑ اور سندھ اس کے ہاتھ سے جاتے رہے اور وہ اپنی باقی مملکت کو ایسی حالت میں چھوڑ مرا جب کہ ہر طرف بد دلی پھیل رہی تھی۔

مآخذ: (۱) ضیاءالدین برنی: تاریخ فیروز شاہی (Bibl. Ind) اور بعد کے مورخین: (۲) ابن بطوطہ: تحفة النظار فی غرائب الامصار: (۳) *The Cambridge History of India*، ج ۳، باب ۶، نیز دیکھیے *J R A S* جولائی ۱۹۲۲ء:

(T. W. Haig و ادارہ)

⊗ **میرزا محمد تقی بہار**: ملک الشعراء؛ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۰۴ھ/۹ دسمبر ۱۸۸۶ء کو مشہد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ملک الشعراء میرزا محمد کاظم متخلص بہ صبوری، دادا محمد باقر۔ کاشانی، صدر حریر بافان اور پردادا عبدالقادر ملک باف کاشان کے رہنے والے تھے۔ بہار کے والد شاہنشاہ ایران ناصر الدین قاچار (۱۲۶۴ھ/۱۸۴۸ء- ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۶ء) کے ہم عصر تھے۔ قصیدہ گوئی میں انھیں کمال حاصل تھا۔ اسی بنا پر انھیں ملک الشعراء کے خطاب سے نوازا گیا۔ بہار فطرةً شاعر تھے۔ فطری ذوق کی بنا پر انھوں نے شعر و ادب ہی کو سرمایۂ حیات قرار دیا اور اسی میں شہرت دوام حاصل کی۔

بہار اٹھارہ برس کے تھے کہ ان کے والد فوت ہو گئے (۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء)۔ کچھ عرصے بعد قاچار بادشاہ مظفر الدین شاہ (۱۳۱۳ھ/۱۸۹۶ء-۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۷ء) مشہد آیا تو بہار نے دربار شاہی میں قصیدہ پیش کیا۔ یہ ان کا اولین اور آخرین روایتی قصیدہ تھا اور کسی شاہنشاہ وقت کے ساتھ ان کی ملاقات بھی اولین اور آخرین تھی۔ اس دربار شاہی میں بہار کو ان کے والد کا اعزاز یعنی ملک الشعرا کا خطاب ملا (۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء) ایران میں "تحریک مشروطیت" کی ابتدا ناصر الدین قاچار کے دور میں ہوئی تھی، جو وقت کے ساتھ ساتھ زور پکڑتی رہی۔ اس کی وجوہ یہ تھیں کہ اس دور میں حکومت ایران کے داخلی معاملات میں انگریزوں اور روسیوں کا عمل دخل زیادہ ہو گیا تھا، انھیں طرح طرح کے امتیازات حاصل ہوئے تھے اور سربراہ مملکت خود مستبداد پسند شخص تھا۔ ان وجوہ کی بنا پر آزادی خواہوں کے دلوں میں بے چینی کی لہر دوڑ رہی تھی (مختاری: تاریخ بیداری ایران، تہران، ص ۳۵-۳۴) چنانچہ غیر ملکی اقتدار اور شاہی استبداد کو ختم کرانے اور آئینی حکومت قائم کرنے کے لیے یہ تحریک شروع ہوئی (کسروی: تاریخ مشروطۂ ایران، تہران، ص ۷-۸) ناصر الدین شاہ کی وفات پر مظفر الدین شاہ تخت نشین ہوا تو یہ تحریک زیادہ زور پکڑ گئی، جسے کامیاب بنانے کے لیے ہر پیرو جوان قربانیاں دینے کو تیار تھا۔ بہار فطرةً آزادی خواہ تھے، چنانچہ بیس برس ہی کی عمر میں وہ مجبور ہو گئے کہ اس پر آشوب دور

میں تحریک کے علم برداروں کا ساتھ دیں (۱۳۲۴ھ) اس سلسلے میں آزادی وطن اور غیر ملکی دباؤ کے موضوعات پر ان کے ہیجان خیز مقالات و منظومات روز ناموں میں شائع ہونا شروع ہوئے۔ آزادی خواہوں کو قید و بند کے مرحلوں سے گزرنا پڑا، لیکن تحریک آزادی کا زور روز بروز بڑھتا رہا۔ تحریک مشروطیت کی ہمہ گیری کے پیش نظر مظفر الدین شاہ نے ۱۴ جمادی الثانی ۱۳۲۴ھ/۵ اگست ۱۹۰۶ء کو عوام کا مطالبۂ مشروطیت تسلیم کر لیا۔ ۱۹۰۷ء میں مظفر الدین شاہ فوت ہو گیا اور اس کا بیٹا محمد علی شاہ قاچار (۱۳۲۴ھ/۱۹۰۷ء-۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء) تخت نشین ہوا تو اہل ایران کو استبداد اور بیداد گری سے دوچار ہونا پڑا۔ اس نے شروع میں تو اس "قانون اساسی" کی تصدیق کر دی اور وعدہ بھی کیا کہ اس قانون پر عمل ہوگا، لیکن حقیقت میں وہ مجلس شوریٰ کا سخت مخالف تھا۔ وہ مختار مطلق کی حیثیت میں حکومت کرنا چاہتا تھا، چنانچہ آزادی خواہوں کو کچلنے کے لیے اس نے طرح طرح کے ظلم و تشدد کیے، لیکن محب وطن اراکین مجلس کے سامنے اوضاع اجتماعی کی بہبود کا ایک واضح پروگرام تھا، جس پر وہ بڑی تن دہی اور جاں نثاری سے عمل پیرا رہے۔ مجلس شوریٰ سے شاہنشاہ کی خصومت انتہا کو پہنچ گئی۔ اس کے نتیجے میں شاہ کے حلیف روسی بریگیڈیر نے مجلس شوریٰ کی عمارت "بہارستان" پر بمب گرائے، جن سے عمارت کو شدید نقصان پہنچا اور متعدد اراکین مجلس شہید ہوئے اور کچھ گرفتار کر لیے گئے (دیوان اشعار محمد تقی بہار، ج ۱، مقدمہ، ص ل) اس بربریت سے جاں نثاری اور آزادی خواہی کا جذبہ اور زیادہ شدید ہو گیا۔ بہار نے جو تہران کی بگڑتی ہوئی حالت سے سخت بد دل اور بے چین تھے، رفقا سے مل کر روز نامہ خراسان کے نام سے خفیہ طور پر اخبار نکالا، جو رات کی تاریکیوں میں شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ پہنچ جاتا تھا۔ اس میں بہار کی پر آشوب اور ہیجان خیز نظمیں اور مقالات بغیر نام کے چھپتے تھے (دیکھیے رسالہ ایران، ۲۰ بہمن ماہ، ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء فروری، ص ۲) جن سے ہر پیر و جوان کے جذبات بھڑک اٹھے۔ آذربیجان وغیرہ کے لوگ بھی بہت متاثر تھے۔ تبریز کے بختیاری سرداروں نے باقاعدہ سر بازوں کی جمعیت تیار کر لی اور دارالحکومت تہران کا رخ کیا۔ جولائی ۱۹۰۹ء میں وہ وہاں پہنچے تو شاہی لشکر کے ساتھ ان کی شدید جنگ ہوئی، جس میں شاہی لشکر کو شکست ہوئی۔ اس شکست کے نتیجے میں محمد علی شاہ تخت و تاج سے دست بردار ہو کر روسی سفارت خانے میں پناہ گزین ہو گیا۔ آزادی خواہوں کے جشن فتح پر بہار نے قصائد پڑھے جن سے محب وطن لوگوں میں حیات تازہ پیدا ہوئی۔ (تاریخ انقراض قاچاریہ، دیباچہ، ص م)۔

محمد علی شاہ کے بعد اس کے خرد سال بیٹے احمد شاہ (۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء-۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء) کو تخت نشین کیا گیا۔ بالآخر یہ قاچاری دور رضا شاہ پہلوی کے ہاتھوں ختم ہوا۔ احمد شاہ کے عہد میں انگریزوں اور روسیوں نے الگ الگ اپنا اقتدار مستحکم کر لیا، ادھر آزادی خواہ دو حصوں میں بٹ گئے، ایک اعتدال پسند تھے، دوسرے انتہا پسند۔ بہار نے نو بہار کے نام سے روزانہ اخبار شائع کرنا شروع کیا (تاریخ انقراض قاچاریہ، مقدمہ ص ھ) اس اخبار میں بہار دوسرے اہم ملکی معاملات کے علاوہ سیاست داخلی میں روسیوں کی مداخلت سے متعلق تند و تیز مقالات اور نظمیں لکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں مشہد سے تہران بھیج کر نظر بند کر دیا گیا۔ روزنامہ نوبہار بند ہو گیا۔

اب بہار نے روزنامہ نوبہار کے بجائے نیا روزنامہ تازہ بہار کے نام سے جاری کیا ۔ اس میں انھوں نے اپنے آتشیں افکار سے قوم کو جہاد کی ترغیب دی ، لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ بہار کا یہ روزنامہ بھی ضبط ہو گیا ۔ انھیں تہران لے جا کر نظر بند کر دیا گیا (تاریخ انقراض قاچاریہ ، مقدمہ ، ص و) آٹھ ماہ کی تبعید کے بعد انھیں رہائی ملی ۔ بہار ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۲ء کے آخر میں مشہد واپس آئے اور ۱۹۱۳ء میں پھر سے روزنامہ نوبہار جاری کیا ۔ ان کی توجہ اب زیادہ تر آزادی نسواں ، ترک پردہ اور قدامت پسندی کی مخالفت پر تھی ۔ ان موضوعات پر مضامین چھپتے رہے ۔ ان کے عنوانات زن مسلمان ، تجدد و انقلاب ، اصلاحات دینی و اخلاق ، تعدد ازدواج اور ترک پردہ تھے ۔

اس عرصے میں جنگ عظیم اول چھڑ گئی ۔ بعض آزادی خواہوں کے ساتھ بہار بھی دوسرے غیر ملکیوں سے کینہ رکھنے کی وجہ سے جرمنی کی فتح مندی کے خواہاں تھے ۔ بہار نے اپنے روزنامہ میں جرمن فوج کے ساتھ اپنی ہمدودی کا اظہار بڑی آب و تاب سے کیا ۔ (دیوان اشعار مذکور "شرح حال بہار ، ص ن) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اخبار نوبہار پھر سے ضبط کیا گیا اور بہار اسیر کر لیے گئے ، لیکن جلد ہی اس گہری عقیدت کی بنا پر جو ان کی علمی جد و جہد اور پیہم قربانیوں کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوئی تھی ، بہار درگز ، کلات اور سرخس کی طرف سے مجلس شوریٰ سوم کے رکن منتخب ہوئے اور آزاد ہوئے تو تہران آ گئے ، لیکن اس مجلس کے دوران ان کے مقالات جو آزادی نسواں کے سلسلے میں نوبہار میں شائع ہوئے تھے ، ان کی بنا پر اعتدال پسندوں اور رجعت پسند علماء نے ظاہراً اور باطناً ان کے خلاف سرگرمیاں جاری رکھیں ۔

ابھی مجلس سوم کا دور ختم نہیں ہوا تھا کہ ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۶ء میں روسی لشکر نے قزوین سے تہران کا رخ کیا ۔ غیر ملکیوں کی مداخلت اور ملکی استبداد کی بنا پر آزادی خواہ بطور احتجاج تہران سے ہجرت کر کے قم چلے گئے ۔ بہار بھی ان مہاجرین میں شامل تھے ۔ انھیں پہلے خراسان میں نظر بند کیا گیا ، پھر بجنورد میں زیر حراست رکھا گیا ۔ بہار کی اس حراست اور بیماری کی بنا پر اہل بجنورد کو ان سے اور زیادہ ہمدردی پیدا ہوئی ۔ اس دوران میں مجلس شوریٰ چہارم کا انتخاب ہوا تو بہار عقیدت مندوں کے اس شہر سے منتخب ہو گئے ۔ (دیوان اشعار مذکور "شرح حال بہار" ص س) ۔ مدت حراست ختم ہونے کے بعد بہار تہران آئے اور پھر سے اخبار نوبہار جاری کیا ۔ اس مرتبہ کے نوبہار سے بہار کی ادبی سرگرمیوں کا آغاز ہوا ۔ ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء کو انھوں نے "انجمن دانشکدہ ادبی" کی تاسیس کی اور انجمن ہی کے نام پر دانشکدہ ادبی کے نام سے رسالہ جاری کیا ۔

مجلس شوریٰ ملی کے پانچویں دور میں بہار پھر منتخب ہوئے ۔ اس دور میں سلطنت قاچاریہ غیر معمولی بحران سے دو چار ہوئی اور شدید سیاسی حالات سے سابقہ پڑا ۔

۱۹۲۵ء میں قاچاری دور ختم ہو گیا ، حکومت کی باگ ڈور رضا شاہ پہلوی (۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۱ء) نے سنبھالی ۔ مجلس ششم کے لیے انتخاب ہوا تو بہار اپنی مقبولیت کی بدولت باوجودیکہ ان کی مخالفت بھی تھی ، تہران سے منتخب ہو گئے ۔

مجلس ششم کے دوران مجلس کے حزب مخالف (جس میں بہار بھی شامل تھے) اور شاہنشاہ رضا شاہ کے مابین سیاسی اختلاف نے شدت اختیار کی ۔ مجلس کے دور آخر میں سیاسی حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ بہار نے سیاسیات سے کنارہ کشی

اختیار کرلی (تاریخ انقراض قاجاریہ، مقدمہ، ص ی ب)۔ اس سلسلے میں انہوں نے لکھا ہے: "مجلس کا یہ دور ختم ہوا تو شہنشاہ کے حسب الحکم آقای تقی زادہ اور بندہ کو خدمات تعلیم و تدریس سونپ دی گئیں۔ میں دانشگاہ تہران میں قبل از اسلام سے موجودہ دور تک ادبیات ایران کا درس دیتا رہا"۔ دیوان اشعار مذکور "شرح حال بہار، ص ع) اس عرصے میں بہار تاریخ سیستان، ترجمہ تاریخ طبری، مجمل التواریخ اور جامع الحکایات ولوامع الروایات کی تصحیح کا کام انجام دیتے رہے۔ علمی خدمات کے دوران بعض فتنہ پردازوں کے خود ساختہ اتہامات کے باعث بہار زندان میں ڈال دیے گئے (۱۹۳۰ء) پھر اصفہان میں انہوں نے اہل خانہ کے ساتھ، جن میں ان کی خانم اور چھ فرزند تھے، چند ماہ نظر بندی میں گزارے، آخر فروغی لقمان الملک اور بعض دوسرے صاحب اقتدار خیر خواہوں کی مدد سے بہار کو رہائی ملی (عبدالحمید عرفانی: احوال و اشعار بہار، مطبوعہ تہران ۱۳۳۵ شمسی، ص ۹۳) قید و بند اور نظر بندی کا یہ زمانہ ان کی زندگی کا اہم حصہ تھا۔ اس عرصے میں انہوں نے متعدد معرکہ آرا اور جاودانی حیثیت کی نظمیں لکھیں (کوھی کرمانی: تاریخ معاصر ایران، تہران، ص ۱۰۵)۔

بہار کم و بیش سترہ سال تک سیاسیات سے کنارہ کش ہو کر تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ رسالہ مہر میں مقالات کا سلسلہ "تاریخ مختصر احزاب سیاسی" کے عنوان سے شروع کیا، جو بعد میں جداگانہ تصنیف کی صورت میں اسی نام سے منظر عام پر آیا۔ ۱۳۲۴ ھ ش میں احمد قوام وزیر اعظم کے زمانے میں بہار کو وزارت تعلیم کا منصب سونپا گیا، وہ اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں "آخر وزیر شدم و اے کاش کہ آقائے قوام مرا بوزارت دعوت نمیکرد و آن چند ماہ شوم را کہ بے ہیچ گناہ و جرمے در دوزخم افگندہ بودم، نمی دیدم" (دیوان اشعار "شرح حال بہار" ص ف) اس منصب پر تھوڑا ہی عرصہ فائز رہے۔ یہاں سے وہ شدت کار اور روحانی بے اطمینانی کی بنا پر مستعفی ہو گئے۔

حکومت ایران کے برصغیر پاکستان و ہند کی مغلیہ حکومت سے ہمیشہ خوشگوار تعلقات رہے محمد رضا شاہ پہلوی کے دور میں جب خدا داد مملکت پاکستان عالم وجود میں آئی (۱۴ اگست ۱۹۴۷ء) تو یہ روابط از سر نو قائم ہو گئے۔ صدر پاکستان کی دعوت پر ۱۹۴۸ء میں فرمانروائے ایران پاکستان آئے۔ اس موقع پر بہار نے اپنے احساسات صمیمانہ کی بنا پر جو انہیں نئی اسلامی حکومت پاکستان کے ساتھ تھے، ایک قصیدہ بعنوان "یادگار بہار بہ پاکستان" لکھا اس کا مطلع یہ ہے:

ہمیشہ لطف خدا باد یار پاکستان
بکین مبادفلک با دیار پاکستان

یہ قصیدہ ان کی زندگی کے آخری دور کا ہے، اس زمانے میں انہیں سینے کا درد لاحق ہو گیا جو دراصل مرض سل کا پیش خیمہ تھا۔ بیماری کے اس دور میں بھی وہ تہران سے مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہو گئے، لیکن تکلیف کی وجہ سے اور مجلس میں اختلاف کے باعث وہ کام نہ کر سکے اور اسی سال سوئٹزر لینڈ چلے گئے۔ وہاں علاج ہوا تو حالت کچھ بہتر ہو گئی۔ آخر جب واپس آئے تو تکلیف شدت پکڑ گئی اور وقت نہایت اذیت اور پریشانی میں گذرا۔

۲۱ اپریل ۱۹۵۰ء کو ایران کے سفارت خانہ پاکستان میں یوم علامہ اقبال کی تقریب منعقد ہوئی جس میں ملک الشعرا کسالت طبع کے باوجود شریک ہوئے اور علامہ کے شعر و فکر پر بھر پور انداز میں اظہار خیال کیا۔ ایک نظم بھی پڑھی

جس میں انہوں نے اسلامی دور کی عظیم الشان ثقافت کے ساتھ ساتھ برصغیر کے نامور شعرا کا ذکر کیا۔ ان میں بیدل، غالب اور شبلی کے نام آتے تھے۔ نظم کے مطلع میں شاعر مشرق علامہ اقبال سے اپنی عقیدت کا اس طرح اظہار کیا ہے:

ایزدی بود آشنای ہاے ما
آشنا داند صدایے آشنا

(تفصیل کے لیے دیکھیے راقم الحروف: سیارہ ڈائجسٹ، اقبال نمبر).

ملک الشعراء بہار نے اسی مرض میں ۲۱ اپریل ۱۹۵۱ء کو وفات پائی۔ بہار سر زمین ایران کے عظیم شاعر اور قصیدہ سرا تھے۔ اس فن کی بدولت انہوں نے شہرت دوام پائی۔ قصیدہ گوئی میں ان کے اپنے قول کے مطابق "انہوں نے سبک کلاسیک (سبک خراسانی) کا تتبع کیا۔ (دیوان اشعار مذکور، ج ۱، ص ق) اس انداز خاص میں وہ نامور شعرا رودکی، فرخی، لبیبی، مسعود سعد سلمان، منوچہری اور امیر معزی سے بہت متاثر تھے، لیکن اس اسلوب میں انہوں نے اپنا منفرد مقام پیدا کیا۔ ان کی انفرادیت اس بات میں بھی ہے کہ انہوں نے قصائد کا روائتی انداز اختیار نہیں کیا، کسی کی مدح سرائی نہیں کی، طلب جاہ میں کسی دنیاوی منبع فیوض کی تعریف و توصیف میں قلم کو ملوث نہیں کیا۔ انہوں نے جو مشہور نظمیں اجتماعیت، مشروطیت، معیشت و معاشرت، زندانی کیفیات، حب وطن، بیداری ایران اور روسیہ وغیرہ موضوعات پر لکھیں، انہیں بہار نے قصائد ہی کا نام دیا ہے۔

بہار نے رباعیات، غزلیات، مثنویات، تصنیف (صنف سخن) اور مستزاد بھی لکھیں، انہیں قبول عام حاصل ہوا۔ ان کی اکثر غزلیں ان کے سیاسی عقائد کی ترجمان ہیں، ایسی غزلیں بھی ہیں جو کلاسیکی انداز میں ہیں، یہ ان کی قدرت کلام کی مظہر ہیں۔ ان میں عراقی اور جامی کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔

جہاں تک نثر کا تعلق ہے، بہار خود لکھتے ہیں کہ "میں نے شروع میں تاریخ بیہقی کے اسلوب کو اظہار خیال کے لیے اختیار کیا، لیکن جلد ہی مجھے محسوس ہوا کہ سیاسی حالات پر اظہار خیال اور عوام سے رابطے کا تقاضا ہے کہ نثر سادہ اور رواں ہو، چنانچہ میں نے یہی انداز اختیار کیا" سبک شناسی کو جو تین جلدوں میں ہے، نثری تالیفات میں اہم ترین مقام حاصل ہے۔ یہ گرانمایہ تصنیف بھی سادہ انداز میں لکھی گئی ہے۔

تصنیفات: (۱) دیوان، ج ۱، مطبوعہ تہران ۱۳۳۵ھش، ج ۲ مطبوعہ تہران ۱۳۳۶ھش؛ (۲) سبک شناسی، تین جلد، مطبوعہ تہران، تاریخ ندارد؛ (۳) تاریخ انقراض قاجاریہ یا تاریخ مختصر احزاب سیاسی (انقلاب مشروطیت سے احمد شاہ قاجار کے اواخر سلطنت تک)؛ (۴) قبر امام رضا (روسیوں کی بمباری سے متعلق)؛ (۵) کنیزان سفید (رومان)؛ (۶) داستان نیرنگ سیاہ؛ (۷) مقالات ادبی بہار، (۸) دستور زبان فارسی۔

تراجم: (۱۰) یادگار زریران (قدیم فارسی زبان پہلوی سے جدید فارسی میں)؛ (۱۱) درخت اسوریگ (پہلوی سے جدید فارسی میں)۔

تصحیحات: (۱۲) تاریخ سیستان؛ (۱۳) تصحیح و ترجمہ تاریخ طبری؛ (۱۴) تصحیح مجمل التواریخ والقصص، تصحیح جامع الحکایات و لوامع الروایات محمد عوفی۔

مآخذ: بہار (۱) تاریخ انقراض قاجاریہ؛ (۲) کسروی: تاریخ مشروطہ ایران، تہران؛ (۳) مختاری: تاریخ بیداری ایران، تہران؛ (۴) دیوان اشعار محمد تقی بہار، ۱۳۳۵ شمسی؛ (۵) عبدالحمید عرفانی: شرح

احوال و آثار بہار، ۱۳۳۵ش؛ (۶) کوھی کرمانی: تاریخ معاصر ایران؛ (۷) راقم الحروف: تاریخ ایران از ظہور اسلام تا عصر حاضر، لاہور ۱۹۷۱ء؛ (۸)
Arnold (۹) *The New Persia* : Vincent Sheam
. *Persia* : Wilson

(مقبول بیگ بدخشانی رکن ادارہ نے لکھا)
(ادارہ)

* **محمد ثالث**: شاہان دہلی کے تغلق خاندان کا چھٹا بادشاہ، فیروز تغلق کا بیٹا تھا، فیروز کی وفات کے بعد اس کے بڑے بیٹے فتح خان کا بیٹا ۷۹۱ھ/۲۰ ستمبر ۱۳۸۸ء کو غیاث الدین تغلق ثانی کے لقب سے تخت نشین ہوا، لیکن ۷۹۲ھ/۱۹ فروری ۱۳۸۹ء کو وہ قتل ہو گیا اور اس کی جگہ اس کا عمزاد ابو بکر بن ظفر خان تخت پر بیٹھا۔ یہ ظفر خان، فیروز خان کا دوسرا بیٹا تھا، تیسرے بیٹے محمد نے اس کی تخت نشینی کی مخالفت کی۔ ایک سے زیادہ ھزیمتیں تو اٹھائیں، لیکن بالآخر محمد نے دہلی پر قبضہ کرلیا اور ۷۹۳ھ/۳۱ اگست ۱۳۹۰ء کو سریر آرائے سلطنت ہوا۔ ابو بکر نے میوات کے علاقے میں بہادر ناہر کے ہاں جا کر پناہ لی، لیکن اس کا تعاقب ہوا اور وہ شکست کھا کر میرٹھ میں قید ہوا، جہاں وہ تھوڑے عرصے بعد فوت ہو گیا۔ فیروز کے پرانے نمک خوار جو مشرقی ھندوستان کے رھنے والے تھے اور امور سلطنت میں سارے فتنہ و فساد کے موجب تھے، تہ تیغ کر دیے گئے۔ انھیں قتل کرنے سے پہلے ان کی جانچ پڑتال ان کی روز مرہ کی زبان کے کلمات امتیازی کے ذریعہ کر لی گئی تھی، جن کی وجہ سے وہ دہلی والوں کے مقابلے میں ممیز ہو جاتے تھے۔

اسی سال ظفر خان نے گجرات کی ایک بغاوت فرو کی۔ وہ خود ۷۹۹ھ/۱۳۹۶ء میں اسی صوبے میں خود مختار بھی ہو گیا، ۷۹۵ھ/۱۳۹۲ء میں محمد نے دوابے میں ایک اور سازش کا قلع قمع کیا اور اٹاوہ پر قبضہ کرلیا، قنوج اور دلمن کو تاخت و تاراج کر ڈالا۔ جلیسر کے قریب اس نے ایک قلعہ تعمیر کیا جس کا نام محمد آباد رکھا، اسی سال اس نے اپنے وزیر اسلام خان کو اپنے حکم سے قتل کرایا، کیونکہ وہ بغاوت برپا کرنے کے متعلق ساز باز کر رھا تھا اور اس کی جگہ خواجہ جہان کو مقرر کیا۔ جنوبی دوابہ میں بھی اسی طرح کی ایک اور سازش کا قلع قمع کیا گیا اور ۱۳۹۳ء میں محمد نے میوات پر حملہ کر کے اسے لوٹ لیا اور جلیسر واپس آ گیا، یہاں آ کر وہ بیمار ہو گیا، بہادر ناہر نے اس کی علالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دہلی کے نواح میں چند قصبوں کو لوٹ لیا۔ محمد پھر میوات پر چڑھ آیا اور اسے شکست دے کر بھگا دیا لیکن جب وہ محمد آباد واپس آیا تو بد نظمی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ۷۹۶ھ/۲۰ جنوری ۱۳۹۴ء کو اس نے اپنے بیٹے ھمایوں خان کو کھوکھروں پر چڑھائی کرنے کا حکم دیا ہی تھا، جو لاھور پر قبضہ کرنے کے بعد پنجاب کو تاخت و تاراج کر رہے تھے کہ اس کا انتقال ہو گیا۔

مآخذ: (۱) منتخب التواریخ، طبع و ترجمہ جی۔ ایس۔ اے رینکنگ؛ (۲) طبقات اکبری، طبع و ترجمہ انگریزی (Bibl. Ind.)؛ (۳) محمد قاسم فرشتہ: گلشن ابراهیمی (بمبئی ۱۸۳۲ء)۔

(T.W. Haig)

(ملک) محمد جائسی: ملک محمد نام، محمد تخلص، سولھویں صدی عیسوی میں بھاشا کے مشہور شاعر۔ کم سنی میں والدین کا سایۂ سر سے اٹھ گیا۔ سات سال کی عمر میں چیچک سے ایک آنکھ جاتی رہی تھی۔ شکل و صورت بھی غیر پسندیدہ تھی۔ فقیروں، پنڈتوں اور جوگیوں کی صحبت میں رہے۔ مخدوم سید اشرف جہانگیر

کچھوچھوی کے مرید ہوئے اور رموز طریقت اور اسرار معرفت سے آگاہی حاصل کر کے مرجع خاص و عام بنے۔ اودھ کے قصبہ جائس میں سکونت اختیار کی۔

نو عمری میں شعر کہنے شروع کر دیے تھے ان کے دوہے اور بارہ ماسے لوگوں کی زبان پر رواں ہو گئے لیکن نظم پدماوت سے انہیں خاص شہرت حاصل ہوئی۔ ہندی ادب میں اس کی نظیر نہیں۔ راگنی سورات کے نام سے ان کی ایک اور تصنیف ہے، جو ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانے میں محفوظ ہے اور ۱۵۶۹ء کی یعنی عہد اکبر کی تالیف سمجھی جاتی ہے۔

پدماوت سلطان ابراہیم لودی (۹۲۳-۹۳۰ھ/ ۱۵۱۷-۱۵۲۶ء) کے عہد میں ۹۲۷ھ/۱۵۲۰-۱۵۲۱ء میں شروع ہوئی۔ اس بات کا ذکر محمد جائسی نے خود ایک شعر میں کیا ہے اور خود ہی یہ بھی کہا ہے کہ یہ لاجواب نظم سلطان دہلی شیر شاہ سوری کے دور میں مکمل ہوئی۔ یہ ایک حسین و جمیل راجکماری پدماوت کی المیہ داستان ہے جو پر سوز لہجے میں بیان ہوئی ہے۔ زبان شیریں اور فصیح بھاشا ہے۔ فارسی الفاظ کی آمیزش بہت کم ہے۔ جگہ جگہ نکات تصوف کا بیان ہے اور حصول عرفان کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ تیرھویں صدی ہجری کے آغاز میں میر ضیاء الدین دہلوی عبرت نے پدماوت کی داستان کو ریختہ میں نظم کرنے کا ارادہ کیا۔ قصے کا چوتھا حصہ لکھ پائے تھے کہ وفات پا گئے۔ عبرت کے بیان میں بڑا درد ہے۔ اگر وہ اسے مکمل کر پاتے تو ادب اردو کی تاریخ میں مثنوی سحر البیان کے بعد پدماوت کا نام لکھا جاتا۔ آخرکار سید غلام مشہدی المتخلص بہ عشرت نے ۱۲۱۱ھ/۱۷۹۶ء میں یہ قصہ ریختہ میں مکمل کیا۔ مگر عشرت کے کلام میں عبرت والا درد و سوز نہیں۔

مآخذ: (۱) امیر احمدی علوی: ملک محمد جائسی کی پدماوت در مجلہ نگار، جولائی ۱۹۳۹ء، ص ۳-۵۰؛ (۲) S. Lane-Poole : *Mohammadan Dynasties*، بیروت ۱۹۶۶ء [محمد عبدالغنی رکن ادارہ نے لکھا]۔

ادارہ

* (میرزا) محمد جعفر قراجہ داغی :

جلال الدین میرزا شہزادۂ قاچار کا منشی اور آذر بیجان کے تمثیل نگار میرزا فتح علی اخوند زادہ کے مشہور طربیہ ڈراموں کا مترجم تھا۔ جب یہ ڈرامے ۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ء میں شائع ہوئے تو میرزا فتح علی نے ان کی ایک جلد شہزادۂ قاچار کے پاس اس غرض سے بھیجی کہ وہ اس کی قدر کرے گا لیکن یہ کتاب کئی سال تک شہزادے کے کتابخانے کے طاق نسیاں میں پڑی رہی، تا آنکہ محمد جعفر نے محض اتفاقیہ طور پر اسے کھول کر پڑھا۔ وہ ان سے ایسا محظوظ ہوا کہ اس نے فوراً ان کا ترجمہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کوئی شخص اس کام میں اس کی مدد نہ کرسکا تو اسے یہ ترجمہ اپنے ہی خرچ پر شائع کرنا پڑا، جس کی وجہ سے وہ مالی مشکلات میں مبتلا ہو گیا۔ یہ ترجمہ ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء میں تمثیلات کے نام سے سنگی چھاپ میں تہران میں شائع ہوا. ترجمہ شائع ہونے کے بعد محمد جعفر نے اس کے مصنف سے خط و کتابت شروع کی اور اسے تب معلوم ہوا کہ وہ ایک دوسرے کے قرابت دار بھی ہیں۔ فارسی ترجمہ ایران کے "تھیئٹر" کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اس سے طبعزاد تمثیلات لکھنے کا ذوق پیدا ہو گیا۔ اخوند زادہ کا اثر ملکم خان بلکہ زمانۂ حال کے تمثیل نگاروں، مثلاً محمودی پر بہت زیادہ نمایاں ہے۔ فنکاری کے لحاظ سے محمد جعفر کے تراجم کامیاب نہیں کہلا سکتے

کیونکہ ان کی زبان بہت بھدی ہے اور ان میں آذر بیجان کی اصطلاحات کثرت سے ہیں۔ یہ بات تعجب خیز ہے کہ مستشرقین یورپ کو اخوند زادہ کی تصانیف کا علم ان کے فارسی تراجم کے ذریعہ سے ہوا اور انھوں نے ان تراجم کو (دیکھیے مآخذ) فارسی روزمرہ کے مطالعہ کے لیے درسی کتابوں کی صورت میں شائع کرایا۔ گو یہ تراجم زبان دانی کے اعتبار سے موجودہ فارسی کا نمونہ قرار نہیں دیے جا سکتے۔

مآخذ: (۱) H. Ethe : *Grundriss*، ۲ : ۳۱۹؛ (۲) W. H. D. D. Haggard اور G. Le Strange : وزیر لنکران لنڈن ۱۸۸۲ء)؛ (۳) اس کتاب کا تبصرہ از A. Chodzko : *Bulletin de l'Athenee Orientale* پیرس ۱۸۸۳ء اور Barbier de Meynard *Revnue critique* پیرس ۱۹ مارچ ۱۸۸۴ء؛ (۴) Barbier de Meynard و S, Guyard. : *Trois comedies traduites du dialects turc ateri en persan* پیرس ۱۸۸۵ء؛ (۵) A.Wahrmund : *Monsieur Jowardan, der perisar Botaniker in Qarabag. Neuperisisches Lustspiel von Muh. Gaef Oaraga dagi* وی انا ۱۸۸۹ء تبصرہ از V. Zhukovski : *Zap* ہ (۱۸۹۰ء) ص ۱۲۹ تا ۱۳۲؛ (۷) A. Rogers : *Three Persian Pjays* لنڈن ۱۸۹۰ء؛ (۸) ایک نسخہ "حکیم نباتات" جس پر مصنف کا نام درج نہیں ہے لنڈن ۱۸۹۲ء؛ (۹) A Krimski : *Perski t'eata Zwidki win uzavs Keiw i Jak rozwator*، ۱۹۲۵ء ص ۸۲ تا ۸۹ (Ukraininan)؛ E. Berthels : *Ocerk istoru persidskoj literaturi*، ۱۹۲۸ء ص ۱۳۰ (روسی)۔

E. BERTHELS

⊛ **محمد جمال حافظ ملتانی**: بن محمد یوسف بن حافظ عبدالرشید: اہل علم و عمل ہونے کے ساتھ ساتھ مجاہدانہ صفات سے بھی متصف تھے مروجہ علوم میں دسترس حاصل کرنے کے بعد مہار میں حضرت نور محمد مہاروی (م ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء) سے بیعت ہوئے اور ملتان میں ارشاد و تبلیغ کے لیے مامور کیے گئے، ملتان اسلامی ہند کی ابتدا سے سہروردیہ سلسلہ کا مرکز رہا ہے۔ جس بزرگ نے چشتیہ سلسلے کا کام سب سے پہلے ملتان میں شروع کیا، وہ حافظ محمد جمال ملتانی تھے۔

حافظ صاحب ذی علم بزرگ تھے۔ دقیق سے دقیق مسائل کے نہایت شافی جواب دیتے تھے۔ مسئلۂ وحدت الوجود سے خاص رغبت تھی۔ محی الدین ابن عربی اور مولانا جامی کی تصانیف پر پورا عبور حاصل تھا۔ علامہ عبدالعزیز پرہاروی لکھتے ہیں "جب ہمیں کوئی مشکل سے مشکل مسئلہ در پیش ہوتا، گو وہ کسی علم سے متعلق ہو، ہم ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ وہ اس کی ایسی وضاحت کرتے، جس سے بہتر ممکن نہیں" (عبدالعزیز گلزار جمالیہ، ص ۴)۔ انھوں نے ملتان میں اپنا مدرسہ بھی قائم کیا۔ خواجہ گل محمد احمد پوری (م ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء) مصنف تکملہ سیرالاولیاء نے دو سال تک اس مدرسے میں پڑھا تھا (گل محمد: تکملہ سیرالاولیا، ص ۱۳۵)۔

جس زمانے میں وہ ملتان میں تھے، پنجاب پر سکھوں کا تسلط تھا، سکھوں نے کئی بار ملتان پر بھی حملہ کیا، لیکن حافظ صاحب کی زندگی میں وہ ملتان پر قابض نہ ہو سکے (مناقب المحبوبین، ص ۱۲۴)۔ حافظ صاحب عملی جہاد کے لیے بھی لوگوں کو تیار کرتے تھے۔ ان کی شجاعت، ہمت اور استقلال نے مسلمانوں میں نئی روح پھونک دی تھی۔ تیر اندازی میں مہارت تھی اور اس کی باقاعدہ تعلیم دیتے تھے (کتاب مذکور، ص ۱۳۴)۔ ۵ جمادی الاول ۱۲۲۶ھ/ ۱۸۱۱ء کو وفات پائی۔ کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ مزار

بیرون دولت دروازہ ملتان میں ہے۔ ان کے خلیفہ مولوی خدا بخش خیر پوری سجادہ نشین ہوئے، جنہوں نے توحید پر ایک رسالہ توفیقیہ لکھا تھا (تکملہ سیرالاولیاء، ص ۱۳۵)۔ حافظ صاحب کے اور بھی خلفاء تھے۔ ملفوظات کے مندرجۂ ذیل مجموعے ہیں:

(۱) خصائل الرضیہ مرتبہ عبدالعزیز پرہاروی (اس کا فارسی و اردو ترجمہ آگرہ سے ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء میں شائع ہو چکا ہے)؛ (۲) انوار جمالیہ مرتبہ منشی غلام حسن شہید ملتانی؛ (۳) اسرار الکمالیہ جامع، مرتبہ زاہد شاہ مثھوئی۔

مآخذ: (۱) عبدالعزیز پرہاروی: گلزار جمالیہ، اردو ترجمہ خصائل الرضیہ ترجمہ از محمد برخوردار، آگرہ ۱۳۲۵ھ؛ (۲) تذکرۂ اعیان چاچڑاں، مصنف نامعلوم، قلمی مملوکہ مولانا عبد الرشید سیالکوٹی، کتابخانہ رشیدیہ، لاہور؛ (۳) نجم الدین شوخا وانی: مناقب المحبوبین، لاہور ۱۳۱۲ھ؛ (۴) نظام الملک غازی الدین: مناقب فخریہ، دہلی ۱۳۱۵ھ؛ (۵) گل محمد احمد پوری: تکملہ سیرالاولیاء، دہلی ۱۳۱۲ھ؛ (۶) غلام سرور مفتی لاہوری: خزینۃ الاصفیاء، لکھنؤ ۱۸۷۳ء؛ (۷) وہی مصنف: حدیقۃ الاولیاء، لکھنؤ ۱۹۰۶ء؛ (۸) امام الدین: حدیقۃ الاسرار فی اخبار الابرار؛ (۹) رکن الدین: مقابیس المجالس معروف بہ اشارات فریدی، حصۂ دوم، آگرہ ۱۳۲۱ھ؛ (۱۰) خلیق احمد نظامی: تاریخ مشائخ چشت، ج ۴، دہلی ۱۹۵۳ء؛ (۱۱) قیصر محمد الیاس: خیر البلاد (احوال خواجہ خدا بخش خلیفہ حافظ محمد جمال)، بہاولپور ۱۹۷۳ء؛ (۱۲) نور احمد خان فریدی: تاریخ ملتان، جلد دوم، ملتان ۱۹۷۳ء۔

(محمد اقبال مجددی)

⊗ **محمد جمال الدین القاسمی:** محمد جمال الدین بن محمد سعید بن قاسم المعروف بہ القاسمی: انیسویں صدی کے اواخر میں بلاد شام میں جن ارباب علم و فضل اور صلاح و تقویٰ نے علوم دینیہ اور رشد و ہدایت کی شمع فروزاں رکھی، ان میں محمد جمال الدین القاسمی سرفہرست ہیں۔

وہ ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں دمشق میں پیدا ہوئے۔ ان کا گھرانا علم و دینداری کی وجہ سے ممتاز تھا۔ دادا شیخ قاسم "فقیہ الشام" کے نام سے معروف تھے۔ شیخ محمد جمال الدین نے مکتبی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم مدرسۃ الظاہریہ میں حاصل کی، علوم شرعیہ اور فنون عربیہ کی تکمیل شیخ سلیم العطار اور شیخ عبدالرزاق البیطار سے کی، جغرافیہ، ہندسہ اور علم ہیئت کی تعلیم شیخ عبدالوہاب الانکلیزی سے حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد والد کے مدرسے میں جو جامع سنانیہ میں تھا، درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔

۱۳۰۸ھ میں والیٔ دمشق نے انہیں شام کے مختلف قصبوں اور شہروں میں تعلیم و تبلیغ کے لیے مامور کیا اور وہ پانچ برس تک (۱۳۰۸ تا ۱۳۱۳ھ) یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد مصر چلے گئے، وہاں سے مدینۂ منورہ گئے اور پھر وطن واپس آ گئے اور تعلیم و تعلم میں مصروف ہو گئے (ظافر القاسمی: جمال الدین القاسمی، دمشق؛ کرد علی: خطط الشام، ج ۴، دمشق)۔

شیخ جمال الدین سلفی العقیدہ تھے، لیکن جدید علوم و فنون اور نئی اختراعات سے استفادے کے قائل تھے۔ سیاست میں بھی دلچسپی رکھتے تھے بلکہ سیاست کو دین کا جزو سمجھتے تھے۔ ان کی بعض آراء سے علمائے عصر اختلاف بھی رکھتے تھے؛ چنانچہ ۱۳۱۳ھ میں ان کے حاسدوں نے والیٔ دمشق سے شکایت کی کہ شیخ جمال الدین خود اجتہاد کے مدعی ہیں اور ایک نئے مذہب کی دعوت دیتے ہیں جس کا نام مذہب جمالی ہے۔ اس الزام میں

حکومت نے انہیں گرفتار کر لیا، لیکن ان کے شافی جوابات سن کر دوسرے دن رہا کر دیا۔ اب وہ مطالعہ و تحقیق، درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور دعوت و ارشاد میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ انہوں نے ۴۹ برس کی عمر میں ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء دمشق میں انتقال کیا (عبدالرزاق البیطار: حلیة البشر فی التاریخ القرن الثالث العشر، ۱ : ۴۳۵ تا ۴۳۸، دمشق ۱۹۶۱ء؛ (۲) سامی الکتانی: ادب العربی المعاصر فی سوریة، ص ۴۷ تا ۷۷، قاہرہ ۱۹۵۹ء)۔

شیخ جمال الدین نے عمر بھر فاسد عقائد، مشرکانہ رسوم و بدعات اور خرافات کے خلاف زبانی و علمی جہاد جاری رکھا، عوام کو توحید اور اتباع سنت کی دعوت دی؛ چنانچہ اہل شام کو جیسا فائدہ ان کی ذات سے پہنچا، وہ کسی معاصر عالم سے کم پہنچا ہوگا (سید رشید رضا: جمال الدین القاسمی، در المنار، ۱۷ : ۱۳۳۲ھ قاہرہ؛ (۲) عبدالحیّ الکتانی: فہرس الفہارس، ۱ : ۲۵۸، فاس ۱۳۴۶ھ)۔ ان کے حلقۂ درس سے سیکڑوں علماء فیض یاب ہوئے۔ ان میں قابل ذکر شیخ محمد بہجة البیطار تھے جو عالم اسلام میں خاص قدر و منزلت سے دیکھے جاتے تھے۔

علم و فضل: شیخ جمال الدین القاسمی کا شمار چودھویں صدی ہجری کے مصلحین امت اور مجددین ملت میں ہے (سید رشید رضا: مقدمہ، قواعد التحدیث من فنون مصطلح الحدیث، ص ۱۲، بار دوم، قاہرہ ۱۹۶۱ء)۔ علوم دینیہ میں امامت کا درجہ رکھتے تھے؛ چنانچہ امیر شکیب ارسلان نے اپنے منفرد اسلوب میں انہیں خراج تحسین ادا کیا ہے اور ان کے علم و فضل اور اخلاق فاضلہ کی دل کھول کر داد دی ہے (کتاب مذکور، ص ۶ تا ۸ قاہرہ ۱۹۶۱ء)۔ شیخ موصوف نرم خو، نرم دل اور شگفتہ مزاج تھے، اس لیے ان کے مواعظ اثر انگیز ہوتے تھے۔ وہ ملت کی دینی اصلاح اور دنیوی فلاح کا شدید جذبہ رکھتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے المنار (قاہرہ) اور المقتبس (دمشق) میں بے شمار مضامین لکھے۔ وہ دینی علوم میں تبحر کے ساتھ علم ہیئت، جغرافیہ اور علم الٰہیات سے بھی باخبر تھے (علم التوحید، ص ۴۶، مطبوعۂ قاہرہ)۔ نئے تقاضوں اور نئی ضروریات سے آگاہ تھے، زراعت کے فروغ کے لیے میکانکی آلات اور کرم کش ادویات کے استعمال کی تاکید کرتے تھے (تعطیر الشام، ج ۳، بحوالہ ظافر القاسمی: جمال الدین القاسمی)۔

شیخ جمال الدین القاسمی شعر و سخن کے بھی دلدادہ تھے۔ دل بہلانے کے لیے کبھی کبھی شعر بھی کہا کرتے تھے۔ شیخ عبدالرزاق البیطار نے حلیة البشر فی التاریخ القرن الثالث العشر (۱ : ۴۶۶ تا ۴۷۹) میں ان کے اشعار دیے ہیں، لیکن دعوت و تبلیغ کے بعد ان کی سرگرمیوں کا اصلی میدان تصنیف و تالیف ہی تھا۔

اسلوب بیان اور تصانیف: شیخ جمال الدین شروع میں عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی کے شائق تھے۔ محمد کرد علی ان کی رنگین بیانی کے شاکی ہیں (المذکرات، ۳ : ۷۸۶ تا ۷۹۹، دمشق ۱۹۴۹ء)، لیکن مفتی محمد عبدہ کے زیرِ اثر انہوں نے جلد ہی سادہ بیانی اختیار کر لی، اگرچہ وہ اپنی کتابوں کے ملتمات مقفی و مسجّع عبارت ہی میں لکھتے رہے۔ بحیثیت مجموعی ان کا اسلوب بیان صاف، سادہ مگر پُر زور، مدلل اور دلنشین ہے۔ انہوں نے ایک سو کے قریب چھوٹی اور بڑی کتابیں لکھی ہیں جن میں قابل ذکر یہ ہیں: (الف) تفسیر: محاسن التاویل یا تفسیر القاسمی (قاہرہ ۱۹۵۷ء تا ۱۹۵۸ء)، سترہ جلدیں، تمام قدیم اور مستند تفاسیر کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔

(ب) حدیث : قواعد التحدیث من فنون مصطلح الحدیث (بار دوم ، قاهره ۱۹۶۱ء) ، اصول حدیث اور فنون حدیث میں ایک مفید کتاب ہے (کتاب پر نقد و تبصره کے لیے دیکھیے محمد کرد علی : المذکرات ، ۳ : ۶۸۷ تا ۶۹۷ ، دمشق ۱۹۴۹ء).

(ج) توحید ، فقه اور کلام : دلائل التوحید (دمشق ۱۳۳۰ھ) ؛ (۲) النفحة الرحمانیه شرح متن المیدانیه فی التجوید (دمشق ۱۳۳۲ھ) ؛ (۳) المسح علی الجوربین (دمشق ۱۳۳۲ھ) ؛ (۵) اصلاح المساجد من البدع العوائد (مطبوعة دمشق) ؛ (۶) ارشاد الخلق الی العمل بالبرق (دمشق ۱۳۲۹ھ) ؛ (۷) الاسراء والمعراج (دمشق ۱۳۳۱ھ) ؛ (۸) الاوراد المأثوره (بیروت ۱۳۲۰ھ) ؛ (۹) تنبیه الطالب الی معرفة الفرض و الواجب (قاهره ۱۳۲۶ھ) ؛ (۱۰) جوامع الآداب فی اخلاق الانجاب (قاهره ۱۹۲۱ء) ؛ (۱۱) الشای القهوة و الدخان (قاهره ۱۳۲۰ھ) ؛ (۱۲) شرف الاسباط (دمشق ۱۳۲۲ھ) ؛ (۱۳) الطائر المیمون فی حل لغز الکنز المدفون (دمشق ۱۳۲۲ھ) ؛ (۱۴) مذاهب الاعراب و فلاسفة الاسلام فی الجن (دمشق ۱۳۲۲ھ)، جنون کے بارے میں علمائے لغت ، فلاسفه اور متکلمین کے اقوال ؛ (۱۵) موعظة المؤمنین من احیاء علوم الدین (قاهره ۱۳۳۱ھ) امام غزالی کی مشهور تصنیف احیاء علوم الدین کا اختصار ؛ (۱۶) اوامر مهمه فی اصلاح القضاء الشرعی (مطبوعة دمشق) ؛ (۱۷) خطب (دمشق ۱۳۲۵ھ).

(د) فتاوی : (۱) الاجوبة المرضیة (دمشق ۱۳۲۶ھ) ؛ (۲) فتاوی مهمة فی الشریعة الاسلامیة (قاهره ۱۳۳۱ھ) ؛ (۳) الفتوی فی الاسلام (دمشق ۱۳۲۹ھ).

(ہ) سیرت و تاریخ : شذرة من السیرة المحمدیة (قاهره ۱۳۲۱ھ) ؛ (۲) حیاة البخاری (صیدا ۱۳۳۰ھ) ؛ (۳) تاریخ الجهمیة و المعتزلة (صیدا ۱۳۳۰ھ) ؛ (۴) تعطیر المشام فی مآثر دمشق الشام (غیر مطبوعه).

مآخذ : (۱) براکلمان : GAL ، تکمله ، ج ۲ ، لائیڈن ؛ (۲) ظافر القاسمی : محمد جمال الدین القاسمی ، مطبوعة دمشق ؛ (۳) عبدالرزاق البیطار : حلیة البشر فی التاریخ القرن الثالث العشر ، ۱ : ۳۲۵ تا ۳۲۸ ، دمشق ۱۹۶۱ء ؛ (۴) محمد کرد علی : خطط الشام ، ج ۳ ، مطبوعة دمشق ؛ (۵) وهی مصنف : المذکرات ، ۳ ، ۶۸۷ تا ۶۹۷ ، دمشق ۱۹۴۹ء ؛ (۶) سامی الکیالی : ادب العربی المعاصر فی سوریة ، ص ۳۷ تا ۷۷ ، قاهره ۱۹۵۹ء ؛ (۷) شکیب ارسلان : مقدمه قواعد التحدیث من فنون مصطلح الحدیث ، ص ۶ تا ۸ ، بار دوم ، قاهره ۱۹۶۱ء ؛ (۸) محمد عبدالحی الکتانی : فهرس الفهارس ، ۱ : ۳۵۸ ، فاس ۱۳۴۶ھ ؛ (۹) تقی الدین : منتخبات التاریخ لدمشق ، ۲ : ۱۶ ، مطبوعة دمشق ؛ (۱۰) الشطی : تراجم اعیان دمشق ، ص ۱۱۸ ، مطبوعة دمشق ؛ (۱۱) رشید رضا : شیخ جمال الدین ، در المنار (قاهره) ، ج ۱۷ (۱۳۳۲ھ) ؛ (۱۲) سرکیس : معجم المطبوعات ، ۲ : ۱۴۸۳ تا ۱۴۸۶ ، قاهره ۱۹۲۸ء ؛ (۱۳) الزرکلی : الاعلام ، ۲ : ۱۳۱ ، بار دوم قاهره. [نذیر حسین و رکن اداره نے لکھا].

(اداره)

(ملا) محمد حسن براهوئی : آغا علی خان ⊛ کی اولاد میں سے تھے جو میر نصیر خان اول (۱۷۵۱ء - ۱۷۹۳ھ) کے هاں ملازم تھے ۔ آغا علی خان کا بیٹا عبدالرحمن مدت تک کچھی کا نایب رہا ۔ اس کے تین بیٹے تھے جن میں ملا محمد حسن براهوئی ممتاز شخصیت کے حامل سمجھے جاتے هیں ۔ والیان ریاست کا قرب حاصل کرنے کے بعد وہ وزیر مقرر هوئے ۔ نصیر خان دوم (۱۸۴۰-۱۸۵۷ء) اور ملا موصوف کے تعلقات اچھے نه رہ سکے ؛ چنانچه

خان قلات نے انھیں قید میں ڈال دیا ، جہاں وہ ۵ رمضان المبارک ۱۲۷۲/۱۸۵۶ء کو وفات پا گئے.

ملا محمد حسن نے علم وادب اور شعر وسخن کے میدان میں بھی شہرت پائی - ملا صاحب بیک وقت بلوچی، براھوئی ، فارسی (قریباً بچیس ھزار اشعار موجود ھیں) اور اردو میں شعر گوئی کا ملکہ رکھتے تھے - ان کے پانچ قلمی دیوان دستیاب ھوئے ھیں - ان میں چار تو فارسی زبان میں ھیں ، پانچویں قلمی نسخے کے دو حصے ھیں ، پہلا حصہ فارسی میں ھے اور اکتالیس اوراق پر مشتمل ھے۔ اس میں صرف مسدس ھیں - حصہ اردو کے اوراق اکتیس (صفحات ۶۲) ھیں - اسے راقم مقالہ نے مرتب کیا اور مجلس ترقی ادب لاھور نے ۱۹۷۶ء میں شائع کیا .

ملا محمد حسن براھوئی کا اردو کلیات ۱۸۴۷ء میں اختتام پذیر ھوا اور انگریزوں کا بلوچستان پر باقاعدہ تسلط تیس سال بعد ھوا۔ اس کلیات کا اختتام گویا انگریزی تسلط سے تیس سال پہلے اور جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) سے دس سال پہلے ھوا - کلیات میں میرزا محمد رفیع سودا کی غزلیات پر تضمین کی گئی ھے۔ معلوم ھوتا ھے ریاست قلات کے کم از کم بالائی طبقے میں انیسویں صدی کے نصف اوّل میں اردو زبان خاصی مقبول ھو چکی تھی .

اس کی وجہ یہ نظر آتی ھے کہ عرب "ایرانی" اور بلوچستانی تہذیبوں اور زبانوں کا پہلا سنگھم قزدار (خضدار) تھا جہاں رابعہ بنت کعب چوتھی صدی ھجری/دسویں صدی عیسوی میں ایک فارسی گو شاعرہ گذری ھے - دکن ، دھلی اور آگرہ کی طرح قزدار بھی ایک ایسا مقام نظر آتا ھے جہاں اردو کا آغاز ھوا ھوگا - لہذا اس خطے کے لیے اردو زبان کو اپنانا چنداں مشکل نہ تھا - ملا محمد حسن براھوئی کا اردو کلیات اس بات کا بھی ثبوت ھے۔ ان کی غزلیات کی زبان خاصی منجھی ھوئی ھے۔ قوافی اور الفاظ کے تکرار سے وہ ترنم پیدا کرتے ھیں۔ بعض غزلیں سنگلاخ زمینوں میں ھیں۔ ملا حسن کے کلام کا انداز اردو کے پہلے باقاعدہ شاعر ولی دکنی سے ملتا جلتا ھے .

مآخذ : (۱) انعام الحق کوثر : بلوچستان میں فارسی شاعری ، کوئٹہ ۱۹۶۸ء ؛ (۲) وھی مصنف : بلوچستان میں اردو ، لاھور ۱۹۶۸ء ؛ (۳) وھی مصنف : شعر فارسی در بلوچستان ، لاھور ۱۹۷۵ء ؛ (۴) محمد حسن براھوئی : کلیات، لاھور ۱۹۷۶ء ، مرتبۂ انعام الحق کوثر ؛ (۵) داستان پیوستہ آمدن یک داستان سخن، تہران، دورہ پانزدھم شمارہ ۳ ؛ (۶) شیر علی خان : گلدستہ قلات ، لاھور ۱۹۷۷ء ؛ (۷) محمد صدیق اخوند : تاریخ بلوچستان (قلمی) ؛ (۸) محمد حسن براھوئی ، کلیات (قلمی)، لاھور ۱۲۶۷ھ ؛ (۹) سولا داد ؛ دیوان (قلمی) ؛ (۱۰) ھتو رام : تاریخ بلوچستان ، لاھور ۱۹۰۷ء .

(انعام الحق کوثر)

محمد حسن خان : ایک ایرانی ادیب * (م ۱۹ شوال ۱۳۱۳ھ/ ۳ اپریل ۱۸۹۵ء ؛ ۱۸۹۶ء) - اس کے اعزازی خطابات "صنیع الدولہ" اور اعتماد السلطنہ تھے - والدہ کی جانب سے وہ قاچاروں [رک بہ قاچار] کا قرابت دار تھا اور باپ کی طرف سے وہ اپنے آپ کو مغول حکمرانوں کی اولاد میں سے بتاتا تھا۔ اس کا والد حاجی علی خان مراغی ناصر الدین شاہ قاچار کا وفادار ملازم تھا۔ ۱۲۶۹ھ/ ۱۸۵۲ء میں اس نے سلیمان خان کی سازش کا پتا لگایا تھا - ان کا بیٹا عنفوان شباب ھی سے دربار میں ملازم ھو گیا تھا.

محمد حسن خان مدرسہ "دارالفنون" کا پہلا طالب علم تھا جو ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء میں قائم ھوا اور جہاں اس نے بارہ سال تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد جب اس کا باپ عربستان کا حاکم مقرر ھوا

تو وہ اس کے ساتھ چلا گیا۔ ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء میں وہ سفارت پیرس میں کاتب ثانی (سکریٹری دوم) مقرر ہوا اور وہاں ساڑھے تین سال تک مقیم رہا۔ تہران میں واپس آنے کے بعد وہ شاہ کا ترجمان مقرر ہوا اور اس حیثیت سے وہ شاہ کی سیاحت میں اس کا همرکاب رہا۔ ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء میں وہ دارالترجمہ اور دارالطباعۃ کا رئیس بھی مقرر ہوا۔ اس کے علاوہ روزنامہ دولتی کا مہتمم بھی اس کو بنایا گیا۔ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں اسے منصرم محلات اور نائب وزیر انصاف کا منصب سونپا گیا، اس طرح وہ درجہ بدرجہ ترقی پاتا گیا۔

ای۔ جی۔ براؤن E. G. Browne نے درشت الفاظ میں اس پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ اس نے وہ کتابیں جو نادار عالموں کی تصانیف تھیں، انھیں خود اپنے نام سے شائع کرایا۔ اس کے برعکس یوکوفسکی Joukovsky نے اس کی تصانیف کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے بیشمار علمی منصوبوں کی سرپرستی کی، مثلاً اشاعت قرآن مجید مع فارسی ترجمہ بین السطور، حوالہ جات متن و اشاریہ؛ رومن حروف میں ایک چھاپہ خانہ کا قیام؛ مدرسۂ مشیریہ کا قیام؛ روزانہ اخبارات وغیرہ کی حوصلہ افزائی۔ البتہ بمبئی میں شیخ ہاشمی شیرازی کی ایک ہجو آمیز تصنیف چھپنے کے بعد محمد حسن خاں کی تجویز پر پریس پر احتساب قائم کر دیا گیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ محمد حسن خاں کی مبینہ تصنیف شدہ کتابوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ کتابیں بیشتر صورتوں میں بہت مفید بھی ہیں۔ ان میں سے بعض کتابیں ایسی ہیں جو سکریٹریوں (کاتبوں) کی امداد کے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ کچھ بھی ہو، کم از کم محمد حسن خاں کو یہ اعزاز ضرور حاصل ہے کہ اس نے ایسی کتابوں کے لکھنے کی ہدایت کی۔ اس کی اہم تصانیف ایران کی تاریخ اور جغرافیہ سے متعلق ہیں اور زیادہ تر تقویم کی شکل میں ہیں۔ ان تصانیف کی تفصیل یہ ہے: مرآت البلدان، ج ۱ دو طباعتیں [۱۸۷۶ء / ۱۲۹۳ھ] و ۱۸۷۷ء]؛ جغرافیہ کی لغت (حروف ا تا ب)؛ ج ۲ [طبع ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء] (تاریخ سال ۱ تا ۱۵، عہد ناصر الدین اور تقویم)؛ ج ۳ (۱۶ تا ۳۲ سال عہد ناصر الدین اور تقویم)؛ ج ۴، طبع ۱۲۹۶ھ (جغرافیہ حروف ث تا ج اور ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸ء کی تاریخ)، جغرافیائی حصوں میں یاقوت اور یورپی سیاحوں کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ حواشی بھی ہیں، جو مقامی حکام نے تیار کیے تھے۔ مرآت البلدان کا ایک خلاصہ تاریخ بابل و نینوا کے نام سے ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء میں بمبئی میں بھی شائع ہوا تھا؛ تاریخ منتظم ناصری، ۳ حصے، طبع [۱۲۹۸ھ/۱۸۸۰ء تا ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء] (ہجرت کے وقت سے لے کر موجودہ وقت تک کی تاریخ)؛ ج ۳ تاریخ قاچار (از ۱۱۹۴ھ/۱۷۸۰ء تا ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء) (مطلع الشمس، ۳ جلدیں، [۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء تا ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء]۔ سفر خراسان کا تذکرہ مع اہم مواد متعلقہ آثار قدیمہ، ج ۲، ص ۱۰۵ تا ۲۱۳ میں شاہ طہماسپ کی خود نوشت توزک بھی ہے۔ اور ج ۲، ص ۳۹۹ تا ۵۰۰ میں مشہد مقدس کے کتاب خانہ کی فہرست شامل ہے؛ کتاب الحجۃ السعادہ فی حج الشہادہ، تہران طبع ۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۶ء تبریز، مطبوعہ ۱۳۱۰ھ (شہدائے کربلا کی تاریخ)؛ خیرات حسان (دیکھیے ۵۵ [الرحمن]: ۷۰)، ۳ جلدیں، طبع [۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء تا ۱۳۰۷ھ] (مشہور خواتین اسلام کے سوانحات)؛ کتاب درر التیجان فی تاریخ بنی اشکان مطبوعہ [۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء تا ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء]

۲ جلدیں (تاریخ اشکانیان)؛ کتاب المآثر و الآثار طبع ۱۳۰۹ھ (تاریخی جنتری ناصر الدین کے عہد حکومت کی چالیسویں سالگرہ پر)؛ کتاب التدوین فی احوال جبل شروین ۱۳۱۱ھ (تاریخ و جغرافیہ سواد کوہ در مازندران)۔

ادبیات کے میدان میں محمد حسن خان کی صرف مترجم کی حیثیت تھی (Swiss Family Robinson، Romances of Jules Verne، Discovery of America، تاریخ الکشاف ینگی دنیا، تہران ۱۲۸۸ھ؛ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کی یاد داشتیں)۔ اس نے جغرافیہ اور فرانسیسی زبان پر چند درسی کتابیں بھی تالیف کیں۔

مآخذ: (۱) V.A. Joukovsky (Zukowski)؛ انتقال محمد حسن خان، در Z. V. O.: ۱۰، ۱۸۹۶ء، ص ۱۸۵ تا ۱۹۱؛ (۲) براؤن: *Persian Literature in Modern Time*، ص ۴۵۳ تا ۴۵۶؛ (۳) Edwards: *Catalogue of Persian Books of the Br. Mus.*، ص ۴۷۹ تا ۴۸۰۔

(V. MINORSKY)

● **محمد حسین بٹالوی (مولوی)**: شیخ عبدالرحیم (معروف بہ رحیم بخش) بن ذوق محمد بٹالوی کے بیٹے تھے اور پنجاب کے معروف علمائے اہل حدیث سے تھے۔ احناف اور اہل حدیث کے اختلافی مباحث کے علاوہ، انہیں سرسید اور مرزا غلام احمد قادیانی پر تنقیدی تحریرات کے سلسلے میں بھی شہرت حاصل ہوئی۔

۱۷ محرم الحرام ۱۲۵۶ھ/ ۱۸۴۰ء کو بٹالہ ضلع گورداسپور (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی۔ اعلٰی تعلیم کے حصول کے لیے دہلی، علی گڑھ اور لکھنو کا رخ کیا۔ ان کے اساتذہ میں مفتی صدر الدین خان آزردہ، مولانا گلشن علی جونپوری اور مولانا نور الحسن کاندھلوی جیسے علما کے نام ملتے ہیں، جن سے متداولہ علوم معقول و منقول نیز فقہ و اصول کی تکمیل کرکے ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء میں سند فراغت حاصل کی (دیکھیے محمد حیات سندھی: الایقاف فی سبب الاختلاف (مع اردو ترجمہ، محمد حسین بٹالوی، ترتیب و تقدیم: عطاء اللہ حنیف، ص ۷)۔ سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی (معروف بہ میاں صاحب) سے انہوں نے صحاح ستہ اور دیگر کتب حدیث سبقاً پڑھیں۔ انہیں میاں صاحب کی طویل صحبت اور توجہ خاص سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ میاں صاحب کی کتاب معیار الحق کی تدوین و تالیف میں محمد حسین بٹالوی کی سعی و معاونت کو خاصا دخل تھا (کتاب مذکور، ص ۷)۔

عبدالحی لکھنوی کے بیان کے مطابق، بٹالوی تحصیل علم سے فارغ ہو کر اپنے وطن واپس آئے جہاں انھوں نے تصنیف و تالیف اور تدریس و مواعظ کا سلسلہ شروع کیا (عبدالحی لکھنوی: نزہۃ الخواطر، ۸: ۴۲۷)۔ الایقاف کے مقدمہ نگار نے تصریح کی ہے کہ دہلی سے واپس آ کر محمد حسین بٹالوی نے لاہور کی مسجد چینیاں والی میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا تھا (الایقاف، مع اردو ترجمہ، مقدمہ، ص ۸)۔ درس و تدریس کے ساتھ، بٹالوی صاحب تبلیغی مضامین لکھنے کی طرف بھی بہت میلان رکھتے تھے۔ یہ کام انھوں نے عہد طالب علمی ہی سے شروع کر دیا تھا۔ ان کے مضامین کی اشاعت کا آغاز امرتسر کے اخبار سفیر ہند سے ہوا۔ جس میں ضمیمے کی صورت میں شیخ محمد حسین بٹالوی کے مضامین پر مشتمل ۱۳- اپریل ۱۸۷۸ء سے دس صفحات شائع ہوتے تھے (کتاب مذکور، ص ۸)۔ پہلے تین شمارے

اسی صورت میں نکلے، البتہ چوتھے شمارے پر پرچے کا نام اشاعة السنة مستقلاً موجود ہے، جو ۲۲ جون ۱۸۷۸ء کو میڈیکل پریس امرتسر سے شائع ہوا (حوالہ مذکور).

عبدالحی لکھنوی نے بھی محمد حسین کے مجلہ اشاعة السنة کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ موصوف فرق مبتدعہ، چکڑالویہ، قادیانیت اور متبعین سرسید وغیرہ کی تردید میں منہمک رہتے تھے (نزهة، ۸ : ۳۲۸)۔ ان کا مسلک و موقف ان کے اپنے الفاظ میں کچھ اس طرح تھا کہ وہ سلف صالحین کے ان عقائد پر قائم ہیں جو احادیث نبوی سے ثابت ہیں اور یہ کہ وہ معتقدات اہل سنت سے باہر نہیں۔ فروع میں وہ محدثین (اہل حدیث) کا مذہب (ظواہر نصوص کے مطابق) رکھتے ہیں۔ علمائے امت کے اقوال کو وہ نصوص کتاب و سنت کی روشنی میں خود پرکھنے کے بعد ہی قبول یا عدم قبول کا فیصلہ کرتے ہیں (کتاب مذکور، ۸ : ۳۲۸)۔ ابتدا میں مخالفین کی تردید میں وہ شدت اختیار کر جاتے تھے، مگر عبدالحی لکھنوی کہتے ہیں کہ بعد میں وہ نسبتاً نرم روی اور مصالحانہ طریقے کی طرف مائل ہو گئے (نزهة الخواطر ۸ : ۳۲۹)۔ الایقاف کے مقدمہ نگار نے اشاعة السنة کے بارے میں اور ان کے اسلوب تحریر کے متعلق یوں اظہار رائے کیا ہے : ماهنامہ اشاعة السنة النبوية ۔۔۔ سے اسلام اور اہل حدیث کے مذہب کی خوب اشاعت ہوئی۔ مرحوم کی تحریریں تبحر علمی اور تحقیقات بدیعہ کی آئینہ دار ہوتی تھیں۔ دقیق سے دقیق مبحث کو آسان پیرائے میں لکھنا ان کا کمال تھا (الایقاف، مقدمہ، ص ۸)۔ ماهنامہ اشاعة السنة کے علاوہ انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار صحیح بخاری اور مشکوٰة المصابیح کے تعلیقات اور حواشی میں بھی کیا (نزهة الخواطر، ۸ : ۳۲۹).

ان کا انتقال ٦ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۸ھ / ۲۷ جنوری ۱۹۲۰ء کو بعارضہ فالج ہوا۔ انہیں ان کے وطن بٹالہ ہی میں دفن کیا گیا.

مذکورہ بالا ماهنامے (اشاعة السنة) کے علاوہ ان کی ۳۲ تالیفات کے نام معلوم ہیں۔ جن میں سے بعض یہ ہیں : (۱) البرهان الساطع؛ (۲) التبیان فی رد البرهان؛ (۳) الاقتصاد فی مسائل الجهاد؛ (۴) مفتتح الکلام فی حیاة المسیح علیه السلام؛ (۵) اعاذۂ رحمانی؛ (٦) بغض و تہاجر؛ (۷) تقدیر اور جبر و اختیار؛ (۸) الاقتصاد فی بیان الاعتقاد (فی صفات الباری جل مجده)؛ (۹) الاقتصاد فی حکم الشهادة و المیلاد؛ (۱۰) کشف الاستار عن وجه الاظهار؛ (۱۱) منح الباری فی ترجیح البخاری؛ (۱۲) اثبات نبوت؛ (۱۳) تورات وانجیل کی نسبت اسلامی عقائد.

مآخذ : (۱) افضل حسین مظفر پوری: الحیاة بعد المماة ("سوانح عمری مولانا سید محمد نذیر حسین محدث دهلوی")، آگرہ، مطبع اکبری ۱۹۰۸ء (اس کتاب کے ص ۳۵۸ پر میاں صاحب کے تلامذہ ضلع گورداسپور میں، محمد حسین بٹالوی صاحب کا نام اور مختصر تذکرہ درفہرست ہے)؛ (۲) اشاعة السنة النبوية (مولوی محمد حسین بٹالوی کی ادارت میں نکلنے والا ماهنامہ، جو پہلے امرتسر اور بعد میں لاہور سے شائع ہوتا رہا۔ اس پرچے کا فائل از ۱۸۷۸ء تا ۱۹۱۷ء عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے ذاتی کتابخانے میں موجود ہے)؛ (۳) محمد حیات سندھی، شیخ: الایقاف فی سبب الاختلاف (اردو ترجمہ: محمد حسین بٹالوی، ترتیب و تقدیم: عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، لاہور، المکتبة السلفیة، ۱۹۵۹ء، ص ۷ تا ۱۰)؛ (۴) ابراہیم میر سیالکوٹی: تاریخ اہل حدیث، لاہور اسلامی پبلشنگ کمپنی ۱۹۵۳ء؛ (۵) عبدالحی حسنی لکھنوی: نزهة الخواطر، ج ۸ مرتبہ ابو الحسن علی ابن

المولف، ص ۴۲۷، ۴۲۸؛ (۶) اخبار مشیر ہند، امرتسر؛ (۷) محمد ادریس نگرامی، مولوی: تذکرہ علماے حال، ص ۷۷؛ (۸) اخبار اہل حدیث امرتسر جلد ۱۸ (اگست ۱۹۲۱ء)، شمارہ ۳۰/۳۱، ص ۶، ۷۔

(عبدالنبی کوکب)

● **محمد حسین پیر مرادؒ**: قطب الاقطاب حضرت سید؛ والد کا نام سید احمد ہے۔ ٹھٹھہ (سندھ) کے رہنے والے تھے۔ سلسلۂ نسب بیسویں پشت میں حضرت امام موسیٰ کاظمؒ سے ملتا ہے۔ ان کے دادا سید محمد حسینی شیراز سے سلطان مبارز الدین بن مظفر الدین کے زمانے (۷۱۳ھ/۱۳۱۳ء تا ۷۶۵ھ/۱۳۶۳ء) میں پہلے سیہون (سندھ) میں وارد ہوئے، جہاں انہوں نے حضرت لال شہباز قلندر [رک بآں] کی زیارت کی۔ محمد حسین پیر مراد کی ولادت ۸۳۱ھ/۱۴۲۷ء میں ہوئی۔ ان کی عمر چالیس برس ہوئی تو بیعت لینی شروع کی۔ ان کی پرہیز گاری، عبادت گزاری، دینداری اور بزرگی کو دیکھ کر ہزارہا لوگ مرید ہوئے۔ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی [رک بآں] کے نواسے شیخ صدر الدین بھی ان کے مداح تھے۔ ملتان سے ٹھٹھہ ان کی ملاقات کے لیے آئے اور ان کی بزرگی اور کرامات دیکھ کر کہا: بیشک جناب ہمارے مشائخ کی مراد ہیں۔ اس طرح ان کا لقب "پیر مراد" پڑ گیا۔ شیخ حسین سومرو ان کے خاص مرید تھے۔ پیر مرادؒ نے ٹھٹھہ میں مسجد صفّہ تعمیر کرائی۔ سمّہ خاندان کا بادشاہ جام نظام الدین نندا ان کا بڑا معتقد تھا۔ ۲۰ ربیع الاول ۸۹۳ھ/۲۵ فروری ۱۴۸۸ء کو وفات پائی۔ جام نندا نے ہی نماز جنازہ پڑھائی اور کوہ مکلی [رک بآں] کے مشہور قبرستان میں اپنے والد کی پائنتی دفن ہوئے۔ ان کے مزار پر عقیدت مند حاضر ہوتے ہیں۔ ان کے بعد ان کے خلفا سید جلال بن سید علی کلاں اور شیخ حاجی محمد حسین صفائیؒ وغیرہم نے ان کا کام جاری رکھا۔

مآخذ: (۱) اعجاز الحق قدوسی: تذکرۂ صوفیاے سندھ، کراچی ۱۹۵۹ء، ص ۲۰۸ تا ۲۱۲؛ (۲) علی شیر قانع ٹھٹھوی: تحفة الکرام، ترجمہ اختر رضوی، کراچی ۱۹۵۹ء، ص ۴۶۰، ۴۶۲؛ (۳) *District Census Report Thatta*، ۱۹۶۱ء، ص ۱۹؛ [عبدالغنی رکن ادارہ نے لکھا]۔

(ادارہ)

* **محمد حسین تبریزی**: مشہور ایرانی خوش نویس جو مشہورِ زمانہ میر سید احمد مشہدی کا شاگرد اور مشہور و معروف میر عماد کا استاد تھا۔ فن خوش نویسی میں اسے ایسی مہارت تامہ حاصل تھی کہ اسے ''سہین استاد'' کا اعزازی لقب حاصل ہوا، کیونکہ اس فن کو ایران میں بڑی مقبولیت حاصل ہے۔ اس کا والد مرزا شکر اللہ صفوی بادشاہ طہماسپ کے زمانے میں مستوفی الممالک تھا (۹۲۸ھ/۱۵۲۱ء تا ۹۸۱ھ/۱۵۷۶ء) اور استاد خود بھی مشرقی مآخذ کی رو سے شاہ اسمعیل ثانی کا وزیر رہا (۹۸۴ھ/۱۵۷۶ء تا ۹۸۶ھ/۱۵۷۸ء)۔ جب اپنے آقا کی نظروں میں گر گیا تو ہندوستان آ گیا جہاں وہ مرتے دم تک مقیم رہا۔

ریو Rieu لکھتا ہے کہ وہ نواح ۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء میں فوت ہوا، لیکن یہ بیان اس کی زندگی کے بعض دوسرے حالات سے مطابقت نہیں رکھتا اور غیر اغلب بھی معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات کہ اس نے اپنی بقیہ عمر ہندوستان ہی میں گزاری، اس حقیقت سے بھی ثابت ہے کہ اس کے بہت سے مخطوطات، جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں، ہندوستان ہی میں مکمل ہوئے تھے۔ جو کتبات تبریز کی مساجد اور خانقاہوں پر کندہ ہیں، ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اس کے کمال کا بہترین نمونہ ہیں، لیکن بد قسمتی

ہے وہ سب کے سب زلزلوں میں تباہ ہو چکے ہیں۔ ان کتبات کو ختم کرنے کے بعد وہ فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے مکہ مکرمہ چلا گیا اور وہاں سے واپس آ کر اس نے اپنے آپ کو فارسی شاعری کے شاہکاروں کی نقل کرنے کے لیے وقف کر دیا، ایرانی شاعر امیر شاہی کا دیوان جو اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، کیمبرج یونیورسٹی کے کتابخانے میں موجود ہے۔

مآخذ: (۱) Cl. Huart: *Les calligraphes et les miniaturistes de l'oirent Musulman*، پیرس ۱۹۰۸ء، ص ۲۲۶؛ (۲) E. Browne: *A catalogue of the Persian MSS. in the Library of Camb. University*، ۱۸۹۶ء، عدد ۲۶۵، ص ۳۵۲؛ (۳) مرزا حبیب: خط و خطاطان، قسطنطنیہ ۱۳۰۶ھ؛ (۴) تاریخ عالم آرائے عباسی، تہران ۱۳۱۳ھ، ص ۱۲۹؛ (۵) Ch. Rieu: *Catalogue of the Persian MSS in the British Museum*، ص ۷۸۲ الف، ۷۸۳ الف و ۷۸۵ الف۔

(E. BERTHELS)

محمد حسن گیسو دراز: رک بہ گیسو دراز

* **محمد حیات سندھیؒ**: شیخ محمد حیات بن ابراہیم السندھی المدنی بڑے جلیل القدر اور مشہور عالم دین، نامور محدث اور شہرہ آفاق مدرس تھے۔ سندھ کے چاچڑ قبیلے کے چشم و چراغ تھے۔ یہ قبیلہ علاقہ بھکر کے قصبہ عادل پور کے نواح میں آباد تھا اور اسی علاقے کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں شیخ محمد حیات پیدا ہوئے۔ اس عہد میں ٹھٹہ علم و ادب کا مرکز تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی ٹھٹہ کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر شاہ ولی اللہ دھلویؒ کے شاگرد رشید اور ٹھٹہ کے نامور عالم دین شیخ محمد معین بن محمد امین (م ۱۱۶۱ھ)، مصنف دراسات اللبیب (مطبوعہ)، کی شاگردی اختیار کی۔ فاضل استاد کی رہنمائی اور نگرانی میں علوم دینیہ میں دسترس حاصل کی۔ پھر عالم شباب ہی میں تکمیل علوم دین کی خاطر حرمین شریفین کے لیے رخت سفر باندھا۔ حج سے فارغ ہوتے ہی مدینہ منورہ میں حاضری دی۔ پھر وہاں کے شیوخ اور علمائے حدیث سے اکتساب فیض کیا۔ بالخصوص شیخ عبداللہ بن سالم المصری (م ۱۱۳۴ھ)، شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم الکردی (م ۱۱۴۵ھ) اور شیخ حسن ابن علی العجیمی (م ۱۱۱۳ھ) سے حدیث پڑھی اور اجازت حاصل کی؛ البتہ مدینہ منورہ کے استاد بزرگ اور صحاح ستہ کے شارح شیخ ابو الحسن محمد بن عبدالہادی سندھی (م ۱۱۳۹ھ) سے بہت زیادہ وابستہ رہے اور انہیں سے بیشتر فیض پایا اور انہیں کی بدولت علم حدیث میں مہارت حاصل کی۔ علوم دینیہ کی تحصیل و تکمیل کے بعد شیخ محمد حیات نے مدینہ منورہ ہی میں متاہل زندگی کا آغاز کیا اور اپنے استاد شیخ ابو الحسن سندھی کی وفات (۱۱۳۹ھ) کے بعد انہیں کی مسند تدریس پر بیٹھ کر چوبیس برس تک مسجد نبوی میں حدیث شریف کا درس دیا۔ حرمین شریفین، مصر و شام اور ہندوستان میں شیخ محمد حیاتؒ کی بڑی علمی شہرت تھی اور دور دراز سے طلبہ حدیث ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ بیشمار لوگ ان کے حلقہ درس سے فیض یاب ہوئے۔ بہت سے نامور محدثین کو ان سے شرف تلمذ حاصل ہے، جن میں شیخ ابو الحسن بن محمد صادق سندھی، شیخ احمد بن عبد الرحمن سندھی، شیخ عبد الکریم داغستانی، سید علی بن ابراہیم العیسی، شیخ علی بن عبد الرحمن اسلامبولی، شیخ علیم اللہ بن عبدالرشید لاہوری، شیخ خیر الدین سورتی، مولینا فاخر الہ آبادی اور سید غلام علی آزاد بلگرامی

ایسے نامور علما خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شیخ محمد حیات سندھی بڑے متقی اور پرہیزگار عالم باعمل تھے۔ طبعاً خلوت پسند تھے، لیکن اس کے باوجود درس و تدریس کا سلسلہ بڑی باقاعدگی سے جاری رکھا۔ مسجد نبوی میں نماز فجر سے پہلے وعظ فرمایا کرتے اور صف اول میں شامل ہو کر نماز با جماعت ادا کیا کرتے تھے۔ شیخ موصوف ۱۱۶۳ھ/۱۷۵۰ء میں مدینہ منورہ میں فوت ہوئے اور جنت البقیع میں دفن کیے گئے۔

درس و تدریس اور مجالس وعظ کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ان کی تصنیفات میں المنذری کی ترغیب و ترہیب کی شرح (۲ جلدیں)، شرح الاربعین النوویہ، شرح الحکم العطائیہ، مقدمہ فی العقائد، تحفة الانام فی العمل بحدیث النبی علیہ الصلوۃ والسلام، مختصر الزواجر عن اقتراف الکبائر اور الایقاف علی سبب الاختلاف بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ مؤخر الذکر رسالے کا اردو ترجمہ شیخ ابو سعید محمد حسین بٹالوی نے اپنے ماہنامہ اشاعة السنہ میں مع حواشی شائع کیا تھا، جو ۱۹۵۹ء میں الگ رسالے کی صورت میں مع اردو ترجمہ و حواشی لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔

مآخذ: (۱) سید غلام علی آزاد بلگرامی: مآثر الکرام، دکن ۱۹۱۰ء، ص ۱۹۳ تا ۱۹۵؛ (۲) وہی مصنف: سبحة المرجان، ص ۹۵ تا ۹۶؛ (۳) صدیق حسن خان: ابجد العلوم، ص ۹۰۹؛ (۴) وہی مصنف: اتحاف النبلاء، ص ۳۰۳ تا ۳۰۴؛ (۵) المرادی: سلک الدرر فی اعیان القرن الثانی عشر، ۴: ۳۴؛ (۶) عبد الحی الکتانی: فہرس الفہارس، ۱: ۳۶۴؛ (۷) سید عبدالحی الحسنی: نزهة الخواطر، ۶: ۳۰۱ تا ۳۰۴۔

(عبدالقیوم رکن ادارہ نے لکھا)

(ادارہ)

محمد خان بنگش: نواب غضنفر جنگ قبیلہ بنگش کا ایک روہیلہ سردار تھا۔ فرخ آباد کا شہر اس نے اپنے مربی فرخ سیر کے نام پر آباد کیا۔ جب محمد شاہ دہلی کا بادشاہ ہوا تو اس نے ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء میں اس کو مالوہ کا حاکم مقرر کر دیا، لیکن وہ مرہٹوں کے متواتر حملوں کو نہ روک سکا اور اسے ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء میں وہاں سے ہٹا کر الہ آباد کا حاکم مقرر کر دیا گیا۔ محمد خان نے بندیلوں کو زیر کرنا چاہا جن کا سردار راجہ چتر سال تھا۔ اس نے بعض مقامات کو مسخر کر لیا، لیکن اسے گزرگاہوں کا علم نہ تھا، اس لیے چتر سال نے باجی راؤ پیشوا کی مدد سے اسے اچانک ایک فوج کے ساتھ گھیر لیا۔ نواب نے جیت گڑھ کے قلعہ میں پناہ لی۔ اس پر اس کے بیٹے قاسم جنگ نے افغانوں کا ایک لشکر جمع کر کے جیت گڑھ کی طرف کوچ کیا اور اپنے والد کو بحفاظت تمام الہ آباد لے آیا۔ شاہی وزیروں نے اسے برطرف کر دیا۔ اس کا انتقال ۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء میں ہوا۔

مآخذ: (۱) مآثر الاصراء ۲: ۷۷۱ تا ۷۷۳؛ (۲) تاریخ فرخ آباد (نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی) ورق ۹، ۱۳، ۱۸، ۲۰، ۲۶ اور ۴۶ تا ۴۸ اور Imperial Gazetteer of India ۱۲: ۳۴ تا ۶۵۔

(ایم ہدایت حسین)

نواب محمد خان جوگزئی: نواب مینگل* خان جوگزئی کے بڑے صاحبزادے ۱۸۸۴ء میں ژوب کے مقام پر پیدا ہوئے۔ اپنے والد کے قتل کے بعد ۱۹۰۹ء میں قبیلے کے سربراہ بنے۔ ۱۹۲۳ء میں سردار درغون خان اور شہزادہ خان کے ساتھ ہو کر انگریزوں کے خلاف بغاوت کی اور کچھ عرصہ نظر بند رہے۔ مگر حراست سے فرار ہو کر مسلم باغ (ہندو باغ) کے پہاڑوں میں روپوش ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں جب بلوچستان میں مسلم لیگ

قائم ہوئی تو مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۴۶ء میں دستور ساز اسمبلی کا انتخاب ہوا تو ان کے مقابلے میں کانگرس نے عبد الصمد خان اچکزئی کو کھڑا کیا مگر جوگزئی جیت گئے اور رکن منتخب ہوئے۔ پاکستان کے حق میں شاہی جرگہ کے ووٹ حاصل کرنے میں انھوں نے اور میر جعفر خان جمالی نے تاریخی خدمات انجام دیں اور قیام پاکستان کے بعد اپنے علاقے کی تعمیر و ترقی میں توجہ صرف کی اور ۱۹۶۹ء کے مارشل لاء کے بعد سیاست کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔ پچانوے سال عمر پا کر ۱۹۷۸ء میں وفات پائی۔ قلعہ سیف اللہ میں دفن ہیں۔ قائد اعظم ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ نواب محمد خان کثیر الاولاد تھے۔

(عرش بخش صابر)

محمد خلیفہ: رک بہ محمد بن حسین۔

محمد داماد پاشا: وزیر اعظم اوکوز محمد پاشا کے نام سے بھی مشہور ہوا۔ وہ قسطنطینیہ کے ایک نعل بند کا بیٹا تھا، اس کی تعلیم فوجی خدمات کے لیے شاہی محلات میں ہوئی (جو قسطنطنیہ کے لڑکے کے لیے اس زمانے میں ایک غیر معمولی بات تھی)۔ وہ محلات سے سلحدار بن کر نکلا لیکن ہمیں اس کی معاشی دوڑ دھوپ کا اس وقت تک کچھ پتا نہیں چلتا جب تک کہ وہ ۱۰۱۶ھ/ ۱۶۰۷-۸ء میں مصر کا حاکم مقرر نہیں ہو گیا۔ یہاں اس نے بڑی کامیابی کے ساتھ ایک مملوک بغاوت کو دبا دیا اور جب ۱۰۱۹ھ/۱۶۱۰ء میں وہ دو سال کا خراج وصول کر کے دارالخلافہ میں واپس آیا تو اسے قپودان پاشا مقرر کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی اسے سلطان احمد کی ہفت سالہ لڑکی گوہر خانم (جس کی شادی بعد میں رجب پاشا اور اس کے بعد سیاوش پاشا سے ہوئی۔ دیکھیے سجل عثمانی ۱ : ۴۳) سے بیاہ دیا جس کی وجہ سے اسے داماد کے لقب کا بھی حق حاصل ہو گیا۔ قپودان پاشا کی حیثیت سے اسے اس شکست کا ذمہ دار گردانا گیا جو ۱۶۱۳ء میں اس کے بحری بیڑے کے ایک حصہ کو جیوس کے جزیرے سے پرے ہسپانیہ اور سسلی کے ایک چھوٹے سے بحری بیڑے نے دی۔ اس صدمے کی وجہ سے ترکی بیڑا ملک شام میں اس مہم کے لیے اپنی فوجیں خشکی پر نہ اتار سکا جو دروزس Druses کے خلاف بھیجی گئی تھیں۔ داماد محمد کو قپودان کے عہدے سے ہٹا کر وزیر دوم بنایا گیا اور نصوح پاشا کو سزائے موت دینے کے بعد ۱۷ اکتوبر ۱۶۱۴ء/ ۱۰۲۳ھ میں اسے وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ اس عہدے پر فائز ہونے کے بعد ایران کے خلاف ایک نئی مہم میں سر عسکر کی حیثیت سے اس نے افواج کی سپہ سالاری کی کیونکہ اس سے کچھ پہلے کی گفت و شنید ناکام ہو چکی تھی، تاہم اس سال کوئی فوجی کارروائی نہ ہو سکی کیونکہ علم نجوم کے حساب سے حالات ناموافق تھے۔ وزیر اعظم نے موسم سرما حلب میں گزارا۔ اس سے اگلے سال ایرانیوں پر آرمینیہ میں حملہ کیا گیا جہاں وہ کچھ کامیابی حاصل کر چکے تھے، ۲۵ روز کے محاصرے کے بعد جولائی ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء کے آغاز میں اریوان نے اطاعت قبول کر لی۔ تاہم ترکی افواج کو خراب آب و ہوا اور ناکافی رسد رسانی کی وجہ سے شدید نقصان اٹھا کر واپس آنا پڑا۔ داماد محمد کو جنوری ۱۶۱۷ء میں موقوف کر دیا گیا اور اس کی جگہ خلیل پاشا [رک بآں] مقرر ہوا۔ وینس کی Relazioni میں خلیل پاشا اور محمد پاشا ہی دو افراد ایسے مذکور ہوئے ہیں جن کو شاہی ایوان میں کسی وقعت کے قابل سمجھا گیا ہے۔ اگلے سال عثمان ثانی کی تخت نشینی کے بعد اس سال کی مہم میں وہ خلیل پاشا کا قائم مقام بن گیا اور جب خلیل پاشا

معتوب ہوا تو اسے دوسری دفعہ وزیراعظم مقرر کیا گیا (۱۰۲۸ھ/۱۸ جنوری ۱۶۱۹ء)۔ وہ اس عہدہ جلیلہ پر صرف ایک سال فائز رہا۔ اس عرصے میں ایران سے مصالحت ہوگئی۔ اس کی موقوفی کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ قپودان گوزلجہ علی پاشا (رک بآں) سے اس کا اختلاف ہوگیا تھا جو سلطان کا منظور نظر تھا (جنوری ۱۰۳۰ھ/۱۶۲۰ء)۔ داماد محمد حلب کا گورنر مقرر ہو کر چلا گیا، لیکن وہاں جانے سے پہلے اس کے جانشین کے استحصال کی وجہ سے اس کی ساری دولت ضائع ہوگئی۔ حلب پہنچنے کے بعد اس کا انتقال ہوگیا اور اسے شیخ ابوبکر کے تکیہ میں دفن کر دیا گیا جہاں اس نے اپنی تربت تعمیر کرا لی تھی۔

مآخذ : (۱) بڑے بڑے ترکی مآخذ نعیما اول، پیچوی اور حاجی خلیفہ (فذلکہ اور تحفۃ الکبار) ہیں؛ (۲) اس کے علاوہ V. Hammer : G.O.R.، ۳ : ۳۳۴، ۳۶۸، ۳۷۵ ببعد، ۵۰۰ ببعد جہاں بعض اہم مآخذ کا بھی ذکر ہے؛ (۳) عثمان زادہ: حدیقۃ الوزراء، ص ۶۱؛ (۴) سجل عثمانی، ۴ : ۱۴۷۔

(J. H. Kramers)

محمد درفشان شئے : بلوچستان کے فارسی گو شاعر، والد کا نام شئے جلال تھا اور نانا میر عبداللہ جنگی گیارھویں صدی ہجری میں سمرقند کے حاکم تھے۔ میر عبداللہ جنگی عارف ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ درفشان کی والدہ بھی ایک دین دار اور اہل علم خاتون تھیں۔ عربی فارسی کی تعلیم انہوں نے اپنی والدہ سے حاصل کی۔ شئے محمد درفشان کا رجحان سید محمد جونپوری (رک بآں) کے مہدویہ فرقے کی طرف ہوگیا تھا۔ ان کے دیوان کا نام "دُردِ وجود" ہے جو اب تک غیر مطبوعہ ہے۔ تاریخ وفات واضح نہیں ہے، بعض کے نزدیک حج بیت اللہ کرنے ۱۷۰۷ء میں گئے تھے اور مکہ مکرمہ ہی میں وصال ہوا، لیکن بعض کے نزدیک یہ روایت غائت عقیدت کے سبب ہے۔ اولاد میں شئے سلیمان معروف ہوئے، جو خود بھی فارسی کے اچھے شاعر تھے اور ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۶ء میں زندہ تھے۔

(غوث بخش صابر)

محمد دین فوق : اردو کے انشاء پرداز، شاعر، اخبار نویس اور مورخ تھے۔ ان کے پردادا حسن ڈار کشمیر سے ہجرت کر کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں پنجاب آئے اور موضع گھڑتل (سیالکوٹ) میں آباد ہوئے۔

منشی محمد دین فوق فروری ۱۸۷۷ء میں کوٹلی ہرنرائن میں پیدا ہوئے، جو سیالکوٹ سے جنوب کی جانب دو تین کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ تعلیم گھڑتل، جامکے، گوجرانوالہ اور لاہور میں حاصل کی، مگر مڈل سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ۱۸۹۳ء میں اپنے والد کی نگرانی میں پٹوار کا کام سیکھا، پھر چند ماہ جموں چونگی میں اور چند ماہ فیصل آباد آبادکاری میں گزارے۔ ۳۱ جنوری ۱۸۹۶ء کو پیسہ اخبار لاہور کے دفتر میں ملازم ہوگئے اور چار سال وہاں رہ کر اخبار نویسی میں اچھی خاصی مشق حاصل کی۔

۱۹۰۱ء میں اپنا ہفتہ وار اخبار پنجۂ فولاد جاری کیا جو ۱۹۰۶ء تک جاری رہا۔ کشمیری مخزن فوق نے خواجہ کمال الدین مشہور مبلغ کے ساتھ مل کر کشمیری برادری کی تنظیم اور اصلاح کے لیے جاری کیا جو ۱۹۰۵ء تک چھپتا رہا

۱۹۰۶ء میں ماہنامہ کشمیری میگزین جاری کیا جو جنوری ۱۹۲۱ء میں ہفتہ وار ہوگیا۔ یہ ہفت روزہ اخبار ۱۹۳۴ء تک کشمیر اور کشمیریوں کی علمی، سیاسی اور سماجی خدمات انجام دیتا رہا۔

انہوں نے ہر جگہ کے پسماندہ لوگوں کو

تعلیم کے میدان میں ترقی کرنے کے گُر بتائے۔ جو خاندان غربت، افلاس اور جہالت کی وجہ سے احساس کمتری کا شکار تھے، انھیں بزرگان سلف کی روایات یاد دلا کر جرأت مند اور باحوصلہ بنایا۔ کشمیری عام طور پر فوج کے ناقابل سمجھے جاتے تھے۔ ان کی فوجی سپرٹ کو اتنا ابھارا کہ وہ فوجی ملازمت کے اہل سمجھے گئے۔ ان کے بنیادی انسانی حقوق کے لیے ساری عمر جنگ کی، بیگار وغیرہ جیسے مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ ۱۹۱۲ء سے پہلے ریاست جموں و کشمیر میں کوئی شخص محکمۂ امداد باہمی اور قانون انتقال اراضی کا نام تک نہ جانتا تھا، فوق نے پنجاب کی طرح زمیندارہ سوسائٹیوں کے اجراء اور قانون انتقال اراضی کے نفاذ کے لیے آواز بلند کی؛ چنانچہ ریاست کے لوگوں کو دونوں سہولتیں حاصل ہوگئیں۔ انھوں نے علامہ اقبال کی تحریک سے متاثر ہو کر رسمانہ طریقت اور نظام جاری کر کے تصوف کی خدمت کی اور سجادہ نشینوں کی اصلاح کے لیے قلمی جہاد بھی کیا۔

مورخ کی حیثیت سے تاریخ کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جہاں تحقیق کی مشعل لے کر نہ پہنچے ہوں۔ صبح شباب سے لے کر شام پیری تک مختلف موضوعات پر چھوٹی بڑی ۹۵ کے قریب کتابیں تصنیف و تالیف کیں (تفصیل کے لیے دیکھیے لاہور نمبر)۔

(۱) مکمل تاریخ کشمیر (تین جلدوں میں)؛ (۲) راہنمائے کشمیر؛ (۳) تاریخ اقوام کشمیر (تین جلدوں میں)؛ (۴) مشاہیر کشمیر؛ (۵) خواتین کشمیر؛ (۶) کشمیر کی رانیاں؛ (۷) شباب کشمیر؛ (۸) حکایات کشمیر؛ (۹) کشمیری زمیندار؛ (۱۰) تاریخ بڈشاہی (سلطان زین العابدین کے حالات)؛ (۱۱) تاریخ اقوام پونچھ (دو جلدوں میں)؛ (۱۲) روایات اسلام؛ (۱۳) تاریخ حریت اسلام؛ (۱۴) تاریخ سیالکوٹ و سوانحات علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی؛ (۱۵) تذکرۃ الصالحین؛ (۱۶) سوانح داتا گنج بخش؛ (۱۷) مآثر لاہور؛ (۱۸) یاد رفتگان (تذکرہ صوفیائے لاہور)؛ (۱۹) اخبار نویسوں کے حالات؛ (۲۰) تذکرہ علماء و المشائخ؛ (۲۱) لاہور عہد مغلیہ میں؛ (۲۲) تاریخ کا روشن پہلو؛ (۲۳) بتان حرم؛ (۲۴) کلام فوق؛ (۲۵) نغمۂ و گلزار (شعری مجموعہ) وغیرہ۔

۱۹۴۵ء کی گرمیوں میں یہ کشمیر گئے ہوئے تھے کہ وہاں بیمار ہوگئے۔ علاج معالجے سے صحت بحال نہ ہوئی تو لاہور واپس چلے آئے اور ۱۴ ستمبر ۱۹۴۵ء کو جمعہ کے روز انتقال کیا۔ ان کی کئی کتابیں ابھی غیر مطبوعہ ہیں، جن میں سے دلچسپ سرگزشت فوق ہے جو راقم مقالہ کی تحویل میں ہے۔

مآخذ: متن میں مذکور ہیں۔

(محمد عبداللہ قریشی)

محمد رشید رضا سید: بیسویں صدی ⊛ عیسوی کے مشہور مصلح عالم، قرآن مجید کے مفسر، عربی زبان کے ممتاز انشا پرداز، خطیب، اتحاد اسلامی کے داعی اور نقیب۔ وہ ۲۷ جمادی الاولی/ ۱۹ ستمبر ۱۸۶۵ء کو طرابلس الشام (لبنان) سے تین میل دور بحیرۂ روم کے ساحلی گاؤں قلمون میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان علم و تقویٰ میں ممتاز تھا۔ انھوں نے اپنے گاؤں کے مکتب میں قرآن مجید (ناظرہ) اور معمولی نوشت و خواند کی تعلیم پائی۔ اس کے بعد الفیہ ابن مالک، صحیح مسلم اور حریری کے بعض مقامات حفظ کیے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے طرابلس کے مدرسۂ اسلامیہ میں داخل ہوئے۔ مدرسہ کے مہتمم شیخ حسین الجسر (م ۱۳۲۷ھ)، رسالہ حمیدیہ کے مصنف سے عقلی اور ادبی علوم کی

تحصیل کی ۔ حدیث و فقہ کے لیے شیخ محمود نشّابہ کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا اور عبدالغنی رافعی سے نیل الاوطار کا کچھ حصہ پڑھا ۔ زمانۂ طالب علمی میں انھیں الغزالی کی احیاء علوم الدّین سے بڑی دلچسپی تھی ۔ حدیث کا اعلٰی ذوق الزّبیدی کی شرح احیاء علوم الدّین اور الذّہبی کے میزان الاعتدال کی رہنمائی میں پیدا ہوا .

تعلیم سے فراغت کے بعد وہ عبادت و ریاضت اور دعوت اور ارشاد میں مصروف ہو گئے ۔ سب سے پہلے انھوں نے بدعات اور مولویہ سلسلے کے رقص و سرود کے خلاف آواز اٹھائی اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے ۔ وہ فارغ اوقات میں بیروت کے اخبار کے لیے مضامین لکھا کرتے اور کبھی کبھی دل بہلانے کے لیے شعر بھی کہا کرتے تھے ۔ اس اثنا میں انھیں سید جمال الدّین افغانی اور مفتی محمد عبدہ کے العروہ الوثقی کے بعض شمارے مل گئے ۔ ان کے مطالعے سے انھیں فکر و نظر کے نئے راستے دکھائی دیے اور مسلمانوں کی دینی اور سیاسی بد حالی سے آگاہی ہوئی ۔ اپنی تحریرات میں انھوں نے بجا طور پر اس کا اظہار کیا اور العروۃ الوثقی کو الغزالی کی تصانیف کے بعد دوسرا راہنما تسلیم کیا ہے (سید رشید رضا: المنار و الازہر، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۵۲ھ) ۔ اس سے انھیں سید جمال الدین سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا ، لیکن ان کے انتقال کی وجہ سے سید رشید رضا کی آرزو پوری نہ ہو سکی ۔ اس دوران میں مفتی محمد عبدہٗ ایک دفعہ طرابلس الشام گئے تھے ، جہاں سید رشید رضا ان سے مل کر ان کے خیالات کے گرویدہ ہو گئے ۔ اب انھوں نے اپنے فکر و عمل کے لیے طرابلس الشام کا میدان تنگ پا کر مفتی محمد عبدہٗ کی خدمت میں قاہرہ جانے کا فیصلہ کر لیا اور رجب ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء میں قاہرہ پہنچ گئے (شکیب ارسلان : السید رشید رضا و اخاء اربعین سنة، ۲۲ تا ۳۴، دمشق ۱۹۳۷ء).

قاہرہ پہنچ کر وہ دوسرے دن مفتی محمد عبدہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھیں مربی و مرشد مان لیا ۔ ان کی یہ رفاقت روز بروز بڑھتی چلی گئی ۔ سید رشید رضا نے تحریک کی کہ صحیح اسلام کی دعوت اور مسلمانوں کی اصلاح کے لیے ایک ہفتہ وار اخبار المنار جاری کیا جائے ۔ اس کا پہلا شمارہ ۱۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو شائع ہوا ۔ دوسرے سال کے آغاز میں یہ ماہانہ مجلہ بن گیا اور سید رشید رضا کی وفات (اگست ۱۹۳۵ء) تک برابر نکلتا رہا ۔ رسالے کا مقصد شریعت اسلامیہ اور افکار عصریہ میں تطبیق اور توحید خالص اور اتباع سنت کی دعوت تھی ۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی صلاح و فلاح پر مضامین ہوتے تھے ، مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم کی اصلاح اور علوم جدیدہ کی تحصیل و ترغیب پر زور دیا جاتا تھا ، مسلمانوں کی معاشی و سیاسی بد حالی پر تبصرے ہوتے تھے ، اسلام پر غیر مسلموں کے اعتراضات کی تردید اور دنیاے اسلام سے آمدہ فتاوی کے جوابات دیے جاتے تھے اور سب سے بڑھ کر مفتی محمد عبدہ کی تفسیر کے اجزا بھی المنار میں بالالتزام شائع ہوتے تھے ۔ یہ رسالہ جلد ہی اسلامی دنیا کا مؤقر ترین علمی رسالہ شمار ہونے لگا ۔ المنار کی اصلاحی دعوت کی باز گشت ملائشیا انڈونیشیا اور ہندوستان جیسے غیر عرب مسلم ممالک میں بھی سنی گئی (*Whither Islam* : H.A.R. Gibb، ص ۹۸، ۲۹۸ تا ۲۹۹، ۳۳۴، لنڈن ۱۹۳۲ء) اور نواب محسن الملک ، مولانا شبلی اور ان کے تلامذہ کے مضامین المنار کے صفحات کی زینت بننے لگے (السید رشید رضا : تاریخ الاستاذ الامام محمد عبدہٗ ، ج ۱ ، قاہرہ ۱۹۳۱ء).

جامعۂ اسلامیہ : سید رشید رضا اتحاد عرب کے

علاوہ وحدت اسلامیہ کے بھی داعی اور مبلغ تھے، اس کے لیے انہوں نے تجویز پیش کی کہ خلیفۃ المسلمین کی سر پرستی میں ایک انجمن الجامعۃ الاسلامیہ کے نام سے قائم کی جائے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ایک کتاب، ایک شریعت، اور ایک زبان کی بنا پر تمام مسلمانوں کو متحد کیا جائے اور عثمانی سلطان کی سر پرستی میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرح تمام مسلم ممالک کا ایک وفاق بنایا جائے جس کے تمام ممالک اندرونی نظم و نسق میں خود مختار ہوں، لیکن مصر کے قوم پرستوں نے اس کی مخالفت کی اور یہ تجویز کامیاب نہ ہو سکی (المنار، ۱۴، ۲۴۰، قاهره)۔

جمعیۃ الدعوۃ والارشاد: مفتی محمد عبدہٗ کی تحریک کا بنیادی اصول عربی مدارس کے طریقہ تعلیم اور نصاب تعلیم کی اصلاح اور قدیم و جدید خیالات کی تطبیق تھا۔ انہوں نے ازہر کے نظام تعلیم کو جدید ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق مرتب کرنے کی کوشش کی، لیکن جامد علما کے سامنے پیش نہ گئی۔ سید رشید رضا بھی ازہر کے طریقۂ تعلیم کے علاوہ سرکاری نظام تعلیم پر نکتہ چینی کرتے رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہی علما اسلام کی اچھی طرح تبلیغ کر سکتے ہیں جو قدیم و جدید دونوں علوم سے بہرہ ور ہوں۔ ۱۹۰۸ء میں نوجوان ترکوں نے انقلاب برپا کر کے ایک نیا آئین نافذ کیا تو سید رشید رضا کو ایسے دارالعلوم کے قیام کا خیال دامنگیر ہوا جس میں اعلی دینی تعلیم کے علاوہ علوم جدیدہ کی تدریس کا بھی انتظام ہو۔ اس کے لیے انہوں نے قسطنطنیہ کا سفر کیا اور قسطنطنیہ میں سال بھر ٹھہرے رہے، لیکن حکومت نے دارالعلوم کے قیام کے لیے ایسی شرائط عائد کر دیں جنھیں وہ قبول نہ کر سکے اور وہ دل برداشتہ ہو کر قاهره لوٹ آئے۔ یہاں انہوں نے فیصلہ کیا کہ یہ دارالعلوم قاهره میں قائم کیا جائے؛ چنانچہ دارالعلوم کی رسم افتتاح ۱۲ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ/۳ مارچ ۱۹۱۲ء کو ہوئی اور اگلے دن کلاسیں جاری کر دی گئیں۔ دارالعلوم میں عرب ممالک کے علاوہ دور دراز کے مسلم ممالک، مثلاً ہندوستان، انڈونیشیا اور چین کے طلبہ بھی تعلیم پاتے تھے، لیکن یہ دارالعلوم زیادہ دیر تک چل نہ سکا اور انگریز اور مصری حکومت کی نگاہ عتاب اسے گھائل کر گئی (السید رشید رضا: تاریخ الاستاذ الامام محمد عبدہٗ، ج ۱، قاهره ۱۹۳۱ء؛ (۲) Charles C. Adams: *Islam and Modernism in Egypt*، ۱۷۷ تا ۲۰۴، لنڈن ۱۹۳۳ء)۔

بر صغیر پاک و ہند کا سفر: مدرسہ دارالدعوۃ والارشاد کے قیام کے سلسلے میں سید رشید رضا اور مولانا شبلی میں خط و کتابت ہوتی رہتی تھی؛ چنانچہ انہوں نے مولانا شبلی کی دعوت پر ہندوستان کا دورہ کیا اور لکھنؤ پہنچ کر ۶ اپریل ۱۹۱۲ء کو ندوۃ العلماء کے اجلاس کی صدارت کی اور عربی زبان میں ایک نہایت دلآویز اور فصیح تقریر فرمائی، جس سے سماں بندھ گیا (سید سلیمان ندوی: حیات شبلی، ص ۴۹۹ تا ۵۰۱، مطبوعہ اعظم گڑھ)۔

جنگ عظیم اول میں ان کی ہمدردیاں عرب احرار کے ساتھ تھیں کیونکہ وہ تحریک تورانیت کے خلاف تھے، پھر بھی وہ انگریزوں کی نظروں میں معتوب رہے۔ مؤتمر اسلامی الفلسطینی کا پہلا اجلاس ۱۹۲۱ء میں جنیوا میں ہوا تو سید رشید رضا بھی جنیوا گئے۔ اجلاس کے اختتام پر انہوں نے امیر شکیب ارسلان کی معیت میں سوئٹزرلینڈ اور جرمنی کی سیاحت کی اور ماہرین سیاست سے اسلامی ممالک کی سیاست پر گفتگو کی۔ ۱۹۲۶ء میں انہوں نے حجاز کی موتمر اسلامی میں شرکت کی اور مسلم

ممالک کے نمائندگان کے ساتھ حجاز کے ملی معاملات پر بحث و تمحیص میں حصہ لیا۔ اس کے بعد وہ زیادہ تر تصنیف و تالیف میں منہمک اور تفسیر المنار کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ وہ سورۂ یوسف کی ان آیات "رب قد اٰتیتنی من الملک وعلمتنی من تاویل الاحادیث فاطر السمٰوٰت والارض انت ولی فی الدنیا والاٰخرۃ توفنی مسلما والحقنی بالصالحین [۱۲ (یوسف) : ۱۰۱] کی تفسیر لکھ کر فارغ ہوئے تھے کہ پیغام اجل آ پہنچا۔ ۲۲ اگست ۱۹۳۵ء کو سلطان ابن السعود سے مل کر سویز سے قاہرہ آ رہے تھے کہ موٹر کار میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے (شکیب ارسلان : السید رشید رضا و اخاء اربعین سنہ، ص ۶۱ تا ۷۱، دمشق ۱۹۳۷ء)۔

فضل و کمال : سید رشید رضا عربی کے ممتاز انشا پرداز اور خطیب تھے۔ ان کی انشا پردازی قدیم و جدید دونوں کی بہترین خصوصیات کی حامل تھی۔ وہ علم الکلام اور تفسیر میں ید طولیٰ رکھتے تھے، حدیث اور بلاغت کے امام تھے (محمد بہجتہ البیطار : سید محمد رشید رضا، در مجلہ مجمع العلمی العربی، دمشق ج ۱۵، ۳۸۵ تا ۳۷۴ ؛ (۲) سید سلیمان ندوی، در معارف اعظم گڑھ، ج ۳۶ (۱۹۳۵ء)، ۲۴۲ تا ۲۴۳)۔

شکیب ارسلان نے صحیح لکھا ہے کہ المنار کی جلدیں حقیقی معنوں میں اسلامی علوم کا دائرہ المعارف ہیں، جن سے اس عہد میں کوئی مسلمان بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ان کی تفسیر جس کے ذریعہ قدرت نے اپنے اسرار و حقائق کی گرہ کشائی کا کام لیا ہے، ان کا بے مثال کارنامہ ہے، جس نے انہیں مشاہیر اسلام کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ اس طرح دفاع اسلام، صحیح عقائد کی تبلیغ اور غیر مسلمانوں کے اعتراضات کی تردید اور ان کی دوسری خدمات ایسی ہیں، جن کی گرد کو اس زمانے کا کوئی عالم نہیں پہنچ سکتا (حاضر العالم الاسلامی، ۱ : ۲۸۴ تا ۲۸۶، قاہرہ ۱۳۵۵ھ)۔

سید رشید رضا ہندی محدثین کے علمی اور تصنیفی کارناموں کے معترف اور مرتبہ شناس تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر عصر حاضر (گیارھویں، بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری) میں ہمارے برادر ہندوستانی علما علم حدیث کی طرف توجہ نہ کرتے تو آج یہ علم معدوم ہو گیا ہوتا، کیونکہ بلاد شام، مصر، عراق اور حجاز میں یہ علم دسویں صدی ہجری ہی میں زوال پذیر ہو چکا تھا (مقدمہ، مفتاح کنوز السنۃ، ص ق، قاہرہ ۱۹۳۳ء)۔ امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم کے افکار نے بھی ان کی بدولت نئی زندگی پائی۔

مصر کے قوم پرستوں، ترکیہ کے ترقی پسندوں اور ازہر کے جامد علما سے ان کی کبھی بن نہ سکی۔ جامعہ اسلامیہ کے قیام کا خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، لیکن سعودی حکومت کے قائم ہونے پر انہیں خاصا اثر و رسوخ حاصل رہا اور سلطان ابن سعود ان کے مشوروں کی قدر کرتے رہے۔ ان کے ممتاز شاگردوں میں شام کے مشہور سلفی عالم شیخ محمد بہجۃ البیطار قابل ذکر ہیں، جنہوں نے ایک عرصے تک شام میں دعوت و ارشاد کی مشعل فروزاں رکھی۔

تصنیف و تالیف : سید رشید رضا نے ہزاروں صفحات لکھے، لیکن ان کی علمی زندگی کا اہم کارنامہ تفسیر المنار ہے۔ اس تفسیر کا آغاز مفتی محمد عبدہٗ نے سید رشید رضا کی استدعا پر کیا تھا۔ مفتی صاحب ازہر میں قرآن مجید کا درس دیا کرتے تھے، سید رشید رضا اس درس کی یادداشتیں مرتب کر کے مفتی محمد عبدہٗ کو دکھاتے تھے اور وہ حسب ضرورت اس میں تصحیح یا ترمیم کرتے تھے۔ یہ

یادداشتیں المنار، ج ۳ (۱۹۰۰ء) میں مفتی محمد عبدہٗ کی تفسیر کے طور پر شائع ہونے لگیں۔ کتابی صورت میں ان تقریروں کی اشاعت مفتی صاحب کی زندگی میں شروع ہو گئی۔ سب سے پہلے سورہ العصر کی تفسیر شائع ہوئی۔ اس کے بعد تیسویں پارے کی سورتوں اور سورہ الفاتحہ کی تفسیر طبع ہوئی۔ مفتی محمد عبدہٗ کے انتقال (۱۹۰۵ء) کے بعد اس تفسیر کا سلسلہ سید رشید رضا نے جاری رکھا۔ بارھویں یعنی آخری جلد ۱۳۵۳ھ میں شائع ہوئی۔ وہ سورہ یوسف کی تفسیر لکھ رہے تھے کہ پیغام اجل آ پہنچا۔ انھوں نے یہ تفسیر زمانۂ حال کی ضرورتوں کے پیش نظر لکھی ہے۔ تفسیر میں علمائے سلف کے علاوہ ابن تیمیہ اور ابن قیم کے اثرات زیادہ نظر آتے ہیں۔ لغوی اور نحوی مشکلات کے حل کے علاوہ اعجاز القرآن پر دلپذیر مباحث بھی ملتے ہیں، تفسیر کی طوالت کے خیال سے انھوں نے اس کے اختصار کا بھی ارادہ کیا تھا، چنانچہ اس کے بعض مختصر اجزا ۱، ۲، ۱۱ اور ۱۲ شائع ہوئے ہیں۔

تاریخ و سیرۃ (۱) تاریخ الاستاذ الامام الشیخ محمدؒ عبدہ (قاہرہ ۱۹۲۶ تا ۱۹۳۱ء) سید رشید رضا نے سید جمال الدین افغانی، مفتی عبدہ کے سوانح، دینی معتقدات اور سیاسی افکار کے بارے میں یہ کتاب تین ضخیم جلدوں میں لکھی ہے۔ پہلی جلد میں ان دونوں اکابر کے مفصل حالات ہیں؛ دوسری جلد میں مفتی صاحب کے مضامین ہیں اور تیسری میں ان کے بارے میں ارباب علم و فضل کے مقالات، تاثرات، تعزیتی پیغامات اور مراثی ہیں۔ کتاب میں ضمناً بہت سے دینی، ادبی اور سیاسی مباحث آ گئے ہیں؛ (۲) ذکری مولد النبویؐ؛ (۳) مختصر ذکری مولد النبویؐ (۱۳۳۵ھ قاہرہ)، سیرت النبویؐ پر مختصر کتابچے ہیں جو فاضل مصنف نے محافل میلاد میں پڑھنے کے لیے لکھے تھے؛ (۴) الوحی المحمدی (طبع اول، قاہرہ ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء): وحی اور نبوت کی حقیقت، آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نبوت کا اثبات، اعجاز قرآنی اور اس کے انقلابی تاثرات، سیاسی اور سماجی اصلاح کے ذرائع، اسلام اور نظام جنگ اور اسلام میں حقوق نسواں پر حکیمانہ گفتگو کی ہے۔ آخر میں متمدن اقوام کو قبول اسلام کی دعوت دی ہے۔ کتاب پانچ بار شائع ہو چکی ہے۔ طبع اول کا اردو ترجمہ سید رضا کے شاگرد، عبدالرزاق ملیح آبادی، مدیر ہند جدید نے کلکتہ سے شائع کیا تھا۔

علم کلام و مناظرہ: شبہات النصاری و حجج الاسلام (قاہرہ ۱۳۲۲ھ) اسلام پر عیسائیوں کے اعتراضات کے جواب میں ہے؛ (۲) نداء للجنس اللطیف (حقوق النساء فی الاسلام، قاہرہ ۱۳۵۱ھ)۔ اسلام میں حقوق نسواں، تعدد ازواج، غلامی، پردہ اور طلاق کے مسائل پر حکیمانہ گفتگو کی ہے؛ (۳) محاورات المصلح والمقلد (قاہرہ ۱۳۲۵ھ): ایک جدید تعلیم یافتہ مصری اور ازہری عالم کے درمیان مناظرے کی کیفیت؛ (۴) المنار والازہر (قاہرہ ۱۳۵۳ھ)۔ ازہر کی اصلاح کے بارے میں مصنف کے خیالات اور آپ بیتی۔

سیاست: (۱) الامامۃ و الخلافۃ العظمیٰ (قاہرہ ۱۹۲۲ء): اسلام کے نظام حکومت پر فاضل مصنف کے ارشادات پر مشتمل ہے؛ (۲) الوہابیون والحجاز (قاہرہ ۱۳۴۴ھ)۔ سلطان ابن سعود کے قبضہ حجاز کے محرکات کا جواز اور حجاز کے سیاسی و آئینی مستقبل کے بارے میں، سید رشید رضا کے مقالات کا مجموعہ، جو المنار میں شائع ہوئے تھے۔ صلاح الدین المنجد نے ان کے فتاویٰ کو چھ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا ہے (بیروت ۱۹۷۰ء)۔

انھوں نے الزہراء، تحفۃ السنۃ، واسبوعہ، مساواۃ المرأۃ والرجل، الفرقۃ، تاریخہ، لکھی ندوں کی بھی، لیکن ان کا سب سے اہم عمل [illegible] وہ بحیثیت مفسر ہی ہے۔ ان کی آخری نقد مشہورہ رشیدیہ ہے، جو انھوں نے مشہورہ [illegible] کے جواب میں لکھی۔ [illegible] اشعار بھی، جن میں مسلمانوں کی اصلاح کے معنی اپنے حالات کو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ مشہورہ کے بعض اشعار اسرار البلاغۃ، طبع اول اور تاریخ الاستاذ الامام (ج ۱ : ۵۷۵ تا ۵۸۶) میں منقول ہیں، جو مفتی محمد عبدہ کی اصلاحات ازہر سے متعلق ہیں۔ اسی طرح جلد اوّل (۹۷۸ تا ۹۸۲) کے اشعار میں سید جمال الدین کی اصلاحی دعوت اور مصر میں ان کے کارناموں کا ذکر ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے انجیل برنباس، تفسیر ابن کثیر و بغوی، امام المقبلی کی علم الشامخ فی آثار الحق علی الآباء والمشایخ؛ عبدالقاہر الجرجانی کی دلائل الاعجاز و اسرار البلاغۃ، ابن قدامہ کی المغنی و شرح مختصر الخرقی اور امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم کی بہت سی کتابیں مقابلے، تصحیح اور تحشیہ کے ساتھ شائع کیں۔

مآخذ: (۱) براکلمان: تکملہ، ۳ : ۳۲۱ تا ۳۲۳، لائیڈن ۱۹۴۲ء؛ (۲) H.A.R. Gibb: *Whither Islam*، ص ۹۹، ۲۸ تا ۲۹، ۳۳، لنڈن ۱۹۳۲ء؛ (۳) Charles C. Adam: *Islam and Modernism in Egypt*، ص ۱۷۷ تا ۲۰۴، آکسفرڈ ۱۹۳۳ء؛ (۴) George Antonius: *The Arab Awakening*، بار چہارم، لنڈن ۱۹۶۱ء؛ (۵) السید رشید رضا: المنار والازہر، قاہرہ ۱۳۵۳ھ؛ (۶) وہی مصنف: تاریخ الاستاذ الامام الشیخ محمد عبدہ، ج ۱، قاہرہ ۱۹۳۱ء؛ (۷) شکیب ارسلان: حاضر العالم الاسلامی، ۲ : ۳۰۰، قاہرہ ۱۳۵۲ھ؛ (۸) وہی مصنف: السید رشید رضا و اخاء اربعین سنۃ، دمشق ۱۹۳۷ء؛ (۹) محمد فؤاد الباقی: مفتاح کنوز السنۃ، قاہرہ ۱۹۳۳ء؛ (۱۰) الصعیدی: المجددون فی الاسلام، ص ۵۳۹ تا ۵۴۵، مطبوعہ قاہرہ؛ (۱۱) محمد بہجۃ البیطار: السید محمد رشید رضا، در مجلۃ مجمع العلمی العربی، دمشق ۱۵ : ۳۶۵ تا ۳۷۳؛ الزرکلی: الاعلام، ۶ : ۳۶۱ تا ۳۶۲، مطبوعہ قاہرہ؛ (۱۲) عمر رضا کحالہ: معجم المؤلفین، ۹ : ۳۱۰ تا ۳۱۲، مطبوعہ دمشق ۱۹۶۰ء؛ (۱۳) سید سلیمان ندوی: حیات شبلی، ص ۴۴۹ تا ۵۰۰، مطبوعہ اعظم گڑھ؛ (۱۴) مسعود عالم ندوی: سیرت سید رشید رضا، در معارف، اعظم گڑھ، ج ۴۲ (۱۹۳۸ء) ۳۲۵ تا ۳۵۹، ۴۱۳ تا ۴۴۴، (ظہور حسین رکن ادارہ نے لکھا)۔

(ادارہ)

(شاہ) محمد رمضان شہید: (۱۱۸۳ھ/ ۱۷۶۹ء تا ۱۲۳۰ھ/ ۱۸۲۵ء) بن عبدالعظیم بن شاہ عبدالحکیم بن شاہ لطف اللہ الملقب بہ عطا محمد خان سہ ہزاری نائب صوبیدار لاہور، ضلع رہتک کے قصبہ مہم میں ماہ رمضان میں پیدا ہوئے۔ نام سے سال پیدائش نکلتا ہے۔ ان کا صدیقی خانوادہ رہتک اور مہم کے قلعوں میں رہتا تھا۔ ابو الفضل نے ان قلعوں کو پختہ خشت کا بتایا ہے۔ ان کے جد اول زبدۃ الاولیاء حضرت قاضی نوام الدین سلطان المشائخ حضرت نظام الدینؒ اولیاء کے خلفا میں سے تھے اور رہتک کے قاضی تھے۔ ان کے جد اول کے بعد پرگنہ مہم کی خدمات قضا وغیرہ اس گھرانے میں موروثی چلتی رہیں۔ کوئی دور ایسا نہیں گزرا کہ اس خاندان میں علما و مشائخ نہ رہے ہوں۔

قرآن شریف اور فقہ کی چند کتابیں اپنی والدہ سے پڑھ کر محمد رمضان حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور چودہ سال (۱۱۹۷ھ/۱۷۸۳ء تا ۱۲۱۱ھ/۱۷۹۶ء)

میں علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل کی ۔ ہفتے میں دو بار شاہ عبدالعزیز محدث سے استفادہ کرتے ؛ ان سے شاہ ولی اللہ دہلوی کی قول الجمیل اور کتاب الانتباہ پڑھ کر ان کی اجازت پائی اور ہادی ہریانہ کے نام سے مشہور ہوئے ۔ شاہ محمد رمضان جامع الصفات عالم اور درویش تھے ۔ بقول حافظ محمود شیرانی "وہ ہریانہ دیس کے صحیح معنی میں مصلح اور ہادی ہیں"۔ شریعت و طریقت میں توازن اور طریقت کے مروجہ خانوادوں میں بیعت ان کا شعار رہا ۔ ان کے ہاتھ پر غیر مسلموں نے بڑی تعداد میں اسلام قبول کیا ۔ صاحب نقیب الاولیا لکھتے ہیں کہ "ہریانہ ، میوات اور سوتر میں ہزاروں غیر مسلم ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے اور بلا مبالغہ لاکھوں نے کفر و شرک سے ان کے ہاتھ پر توبۃ النصوح کی" (ص ۷۵) ۔ انھوں نے اسلامی شعائر بالخصوص ذبیحہ گاؤ کی ترویج کی، مسلم راجپوتوں سے مشرکانہ رسوم ترک کرائیں ؛ ان کے نام اور لباس ہندووانہ ہوتے تھے، انھوں نے اسلامی نام اور مسلمانوں کی وضع قطع کے لباس تجویز فرمائے۔

شاہ محمد رمضان شہید سال کے بیشتر حصے میں اپنے درویشوں کی جماعت کے ساتھ تبلیغی دورے کیا کرتے تھے ۔ ان درویشوں میں عالم ، حافظ ، قاری ہوتے تھے اور نو مسلم بھی ۔ نو مسلموں میں ایک فرانسیسی بھی تھا جو ان کے ہاتھ پر اسلام لایا تھا ، اکثریت متدین مسلم راجپوتوں کی تھی ۔ شاہ صاحب جس گاؤں میں جاتے وہاں اگر مسجد نہ ہوتی تو بنوا دیا کرتے اور اس کی تعمیر میں بعض اوقات خود بھی حصہ لیتے ۔ اس سے مسلم راجپوتوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ وہ اپنے ہم اصل ہندوؤں سے جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں ۔

انھوں نے چند کتابیں نہایت سادہ نثر میں لکھیں اور ہریانی نظم کو بھی وسیلۂ اظہار بنایا ۔ ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں : (۱) عقائد عظیم ؛ (۲) بلبل باغ نبی ؛ (۳) آخر گت ؛ (۴) شرح قصیدہ امالی ؛ (۵) وصیت نامہ ؛ (۶) ادب چھوکرہ ؛ (۷) رنگیلی ، (۸) بوڑھی بیاض ، (۹) فتاوی محمدی ، (۱۰) رسالہ رمضان اور (۱۱) رسالہ برق لامع ان میں سے پہلی تین کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں ۔

۱۸۲۲ء میں اپنے مخلصین کے ساتھ حج بیت اللہ کے لیے گئے ۔ راستے میں ہر جگہ وعظ و تلقین کا سلسلہ جاری رہا ۔ مندسور میں ان کے وعظ سے چند بوہرے بہت متاثر ہوئے ۔ حج سے واپسی پر مندسور آئے تو بوہروں کے چالیس مسلح رفقا نے ۱۸ جمادی الاولی ۱۲۴۰ھ/۸ جنوری ۱۸۲۵ء کو انھیں مسجد میں شہید کر دیا ۔ ان کا مزار قصبہ مہم میں ہے۔

ان کے بعد بھی یہ اصلاحی تحریک جاری رہی ۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں بھی ان کے متبعین نے حصہ لیا ۔ ضلع رہتک کے ۱۹۱۰ء کے گزیٹیر میں اس کا ذکر موجود ہے ۔ سرکاری اہتمام میں لکھی ہوئی تاریخ ضلع رہتک (مطبوعہ ۱۸۸۱ء) میں "باغیوں" کا "سرغنہ" حضرت مولوی شاہ محمد اسمعیل صدیقی شہید کو بتایا گیا ہے (ص ۸۰) ، جو ہادی ہریانہ کے برادر اصغر تھے ۔ زاں بعد بھی شاہ محمد رمضان کی تعلیمات صوبہ ہریانہ کے مسلمانوں میں بڑی مقبول رہیں ۔ ۱۹۱۴ء میں صاحب نقیب الاولیا لکھتے ہیں "ان کی تصانیف کی مقبولیت عام کا بلا مبالغہ یہ حال ہے کہ میوات ، ہریانہ ، سوتر اور نواح دہلی غرض ملک کے ہر حصے میں کوئی گھر خالی نہیں جہاں عقائد عظیم ، آخر گت اور بلبل باغ نبی نہ

ہوں" (ص ۱۸)۔

مآخذ: مقالے میں مذکور مآخذوں کے علاوہ (۱) عبدالشکور و عطاء الحق: روضۃ الرضوان، لاہور ۱۹۱۵ء؛ (۲) مظفر احمد فضلی: نقیب الاولیا، جلد دوم، دفتر دوم، ۱۹۹۳ء؛ (۳) عظیم الدین (م ۱۸۳۲ء): انیس الاعتقاد (خطی)؛ (۴) منظور الحق صدیقی: مآثر الاجداد، لاہور ۱۹۶۳ء، و ہادی ہریانہ، لاہور ۱۹۶۳ء؛ (۵) حافظ محمود شیرانی: ہریانی زبان میں تالیفات، در اورینٹل کالج میگزین، لاہور، شمارہ فروری ۱۹۳۲ء۔

(منظور الحق صدیقی)

* **محمد رؤف:** ایک مشہور عثمانی مصنف اور شاعر جو موجودہ ترکی اور تحریری زبان کے ارتقاء میں نمایاں طور پر اثر انداز ہوا ہے۔ ۱ رجب ۱۲۹۲ھ) ۱۲ اگست ۱۸۷۵ء/ کو قسطنطینیہ میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک اناطولی تھا جو کتاھیہ کا باشندہ تھا۔ اس کی والدہ سرکیشیہ کی رہنے والی تھی۔ اس نے اچھی تعلیم پائی۔ وہ بحریہ کے مدرسے میں داخل ہوا اور ایک بحری افسر بن گیا، لیکن وہ اس محکمہ میں صرف اٹھارہ مہینے تک ملازم رہا اور زیادہ تر کریٹ ہی میں مقیم رہا۔ ابھی وہ کم عمر ہی تھا کہ اس کے دل میں تھیٹر اور ادبیت کا والہانہ شوق پیدا ہو گیا اور وہ دس برس ہی کی عمر میں مضامین لکھنے لگ گیا۔ وہ نمونے کے طور پر احمد مدحت کے افسانوں اور فرانسیسی میں جرأت مند رومانی داستانوں کے ترجمے زیر نظر رکھتا تھا۔ اس کی پہلی تصنیف ایک ڈرامہ تھا جس کا نام "دنائت یخود گسکونیہ قورس لری" (گسکونی کے بحری قزاقوں کا کمینہ پن) تھا۔ بعد میں جوں جوں اسے فرانسیسی اور انگریزی زبانوں پر عبور ہوتا گیا وہ اپنے مطالعہ اور معلومات کو وسعت دیتا رہا یہاں تک کہ مدرسہ میں اس کو "رومان اوتویں" آفندی (ناول پڑھنے والا) کے نام سے پکارنے لگے اور بعد میں رومان جی (ناول نویس) کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اس کی صحیح علمی سرگرمی بحری سکول ہی میں شروع ہوئی، جہاں اس نے Alphonse Dondent، Georgesohnet، Emile Zola، Flaubert، Octave Fenillet، ایسے فطرت پسندوں اور حقیقت نگاروں کی کتابوں کا مطالعہ کیا اور ان کی تقلید کرنے کی کوشش کی۔ اس زمانے میں ان کی کوششوں کا شاہکار "رجان تزا" نام کی کتاب ہے۔

جب اس نے جدت پسند مصنف عشاقی زادہ خالد ضیاء [رک بآں] کی تصانیف پڑھیں اور بالخصوص جب ان میں خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہوا اور اس نے اس کا افسانہ "دشمن" رسالہ "خدمت" میں شائع کیا تو وہ پوری طرح اس کا پیرو بن گیا۔ ضیاء (مصنف زیبا لکھتا ہے جو غلط معلوم ہوتا ہے) کے اسلوب کی وہ تقلید کیا کرتا تھا اور حسین جاہد، جس سے بعد میں اس کے دوستانہ مراسم بھی ہو گئے تھے، ان ہر دو کی وجہ سے اس نے پورے طور پر ادیبانہ زندگی اختیار کر لی اور مصنف بن گیا۔ جب جناب شہاب الدین کو ڈاکٹر کی حیثیت سے ملک حجاز میں جانا پڑا تو وہ اپنے رسالہ مکتب کی ادارت رؤف کے سپرد کر گیا۔ ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء میں رؤف نے ضیاء کے مشورے سے اپنا ناول "غرام شباب" "اقدام" میں شائع کرایا لیکن اس سے اسے کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ ۱۳۲۳ھ ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء میں رسالہ ثروت فنون کے تحریری تعاون سے اس کی شہرت بحیثیت مصنف شروع ہوئی۔ اس رسالے کی وجہ سے موجودہ ترکی ادب کو بڑی ترقی حاصل ہوئی۔ اس میں اس نے مصنف ضیاء اور شاعر توفیق فکرت [رک بآں] سے مل کر جس سے اس کی نسبتی قرابت داری بھی ہو گئی تھی کام شروع کیا۔ ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء

میں ''ثروت فنون'' بند ہو گیا اور اس کے ساتھ اس کی سرگرمیوں کے دور کا بھی ۱۹۰۸ء کے انقلاب تک کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

''ثروت فنون'' میں اس کے اولین مضامین جو شائع ہوئے وہ ''نقاہت دہ'' اور ''ازکدن'' تھے۔ انیسویں جلد میں اس کا مشہور ناول ایلول بالاقساط چھپا۔ ایلول (ستمبر) کو جو اس کے مجموعہ تصانیف کے دوسرے حصوں کی طرح کتابی صورت میں بھی شائع ہوا، ترکی ادبیات کے ارتقاء میں خاص اہمیت حاصل ہے (ادبیات جدیدہ کتب خانسی، ج ۶ ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء)۔ ایلول جو کئی بار چھپ چکا ہے اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے یکتا ہے ایسی بلندی کا حامل ہے جو رؤف کو کسی اور تصنیف میں حاصل نہیں ہو سکی۔ یہ تصنیف ملک میں بے حد مقبول اور اثر انداز ہوئی۔ زبان کی خفیف ناہمواری کے باوجود اس نے واضح اور درد انگیز اسلوب میں اور حقیقت نگارانہ اور موثر پیرائے میں ایک پاک اور معصوم محبت کے ارتقاء اور المناک انجام کا اظہار جس کوفت آفرین شوکت الفاظ کے ساتھ اس کتاب میں کیا ہے اسے ضیاء ایک ایسے ابر سے تشبیہ دیتا ہے جو ایک جگہ ہمیشہ گھومتا رہتا ہے۔

اس کے افسانوں یا ناولوں میں سے مفصلۂ ذیل قابل ذکر ہیں: (۱) فردائے غرام؛ (۲) ادبیات جدیدہ، عدد ۲۸؛ (۳) گنج قز قلبی (ایک نوجوان لڑکی کا دل)؛ (۴) منکشہ (بنفشہ) اور (۵) کابوس (خواب پریشان)۔

جدید مختصر افسانوں کی طرز پر اس کے مختصر اور طویل افسانوں کے مجموعوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس میں اس کی دوسرے درجہ کی مشہور تصنیف (۶) سیاہ انجلر (سیاہ موتی) شامل ہے۔ یہ آزاد نظم کا ایک مجموعہ ہے جو ضیاء کی کتاب منثور شعرلر اور Beaudelaires کی کتاب *Fleurs du mal* (ادبیات عدد ۱۱، ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء) کے نمونہ پر لکھا گیا؛ ان کے علاوہ لمبی کہانیوں کا ایک مجموعہ (۷) عاشقان (ادبیات عدد ۱۶ [۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء])؛ (۸) احتضار (وقت نزع) (ادبیات عدد ۱۲، ۱۳۲۴ھ)؛ (۹) سون امل (''آخری امید'') (ادبیات عدد ۲۹، ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء) اور (۱۰) برعشقین تاریخ (''ایک عشق بازی کی تاریخ'') (۱۳۳۰ھ/۱۹۱۱ء) نیز (۱۱) ''اوچ حکایہ'' (تین کہانیاں)؛ (۱۲) ازھر (''پھول'')؛ (۱۳) پروانہ لرجسی (''تیتریوں کی طرح'') وغیرہ۔

رؤف تمثیل نویسی کے اعتبار سے کچھ کم کامیاب نہ تھا۔ اس نے مفصلہ ذیل تمثیلات لکھی ہیں (۱) پنج (پنجۂ شاہین) ایک ڈرامہ (اوپن) چار ایکٹوں (فصل) میں (ادبیات عدد ۱۴، ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء)؛ (۲) فروی و شرکاسی (''فروی اینڈ کمپنی'') تین ایکٹوں میں ضیاء کے اسی نام کی کتاب کی تمثیلی شکل (ادبیات عدد ۱۷) اور (۳) جدال (جنگ) پانچ ایکٹوں میں (ادبیات عدد ۳۰، ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء)؛ (۴) اکی قوت (''دو طاقتیں'')؛ (۵) یقمرون دولیہ۔ رؤف ۲۳ دسمبر [۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء] کو قسطنطنیہ میں فوت ہوا۔

اس کے بے شمار مضامین ''ثروت فنون'' میں شائع ہوئے اور محاسن میں بھی جو کہ عورتوں کے لیے ایک نہایت ہی دلاویز رسالہ تھا۔ اور جس کی اسی نے ایک جلد شائع کی تھی۔ اس کے ادبی کارنامے میں اس کی طبعزاد نظمیں شامل ہیں (رؤف کی شعر و سخن کی قابلیت بھی کچھ کم نہ تھی اور اسے ترکی کا Bandelaire سمجھا جاتا تھا) اور تنقیدی مضامین میں معاصر ناولوں کے تبصرے

شامل ہیں جو مختلف مجموعوں اور متعدد رسالوں اور اخباروں میں کثرت سے شائع ہوئے۔ اس کی کتاب زنبک (سوسن) کی وجہ سے اس پر مصیبت آ گئی۔ اس کو فحش ہونے کی بناء پر ضبط کر لیا گیا اور مصنف کو سزائے قید دی گئی۔ اس نے اسی قسم کی اور چیزیں بھی لکھی تھیں جو شائع نہ ہوئیں۔ وہ اپنی تصانیف میں حساس کی نسبت فن کار زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ نثر بھی لکھتا ہے تو نظم معلوم ہوتی ہے۔ اس کی نثر بھی ایسی ہی اچھی ہے جیسی کہ ضیاء کی، جو تحریک ثروت فنون کا قائد سمجھا جاتا ہے۔ وہ اس قسم کے ادیبوں میں ایک اہم شخصیت رکھتا ہے گو اس کے اسلوب بیان کے ممتاز خصائص کے برابر ہی اس میں نقائص بھی موجود ہیں۔ درستی اسلوب کی طرف بے توجہی کی بناء پر اس کے نقائص اور بڑھ گئے تھے۔ اس کی تحریر میں ہم ترقی معکوس پاتے ہیں یعنی وہ کامل سے ناقص کی طرف چلتا ہے۔ غالباً اسے اس سے بھی زیادہ شہرت حاصل ہوتی اگر وہ اپنی تصانیف کے بعد اور کچھ نہ لکھتا۔ ہم نامی کی وجہ سے اور متوازی ادبی سرگرمیوں کے باعث محمد روف کو اکثر اوقات ایم رؤف بن فارق عاطف پاشا سمجھا جاتا رہا۔ جو ۲۳ فروری [۱۳۳۷ھ/۱۹۱۸ء] کو فوت ہوا اور "حیدر پاشا" میں دفن ہوا تھا۔ ایم روف رسملی کتاب کا مدیر تھا۔ اس نے حسب ذیل ڈرامے لکھے (۱) پروانہ؛ (۲) نگاہ دہ کرامت (نظر کرامت) اور ایک دل لگی کا ڈرامہ؛ (۳) آتش ال باروت ارسندہ (آگ اور باروت کے درمیان) اور ایک تمثیل؛ (۴) طراز جو بشمولیت رائف نجدت جو اس کا یار غار تھا مرتب ہوئی۔ مفصلہ ذیل ڈرامے کبھی طبع نہیں ہوئے: (۵) صلاح الدین ایوبی؛ (۶) ریمان اور متعدد ادبی تصنیفات۔ سید امیر علی کی انگریزی کتاب *The Life and Teachings of Mohammad or the Spirit of Islam* کا اس نے دو جلدوں میں ترجمہ کیا جس کا نام مصور تاریخ اسلام رکھا۔

مصنف ہونے کے علاوہ محمد روف مدرس بھی تھا۔ زبانوں کے وسیع علم نے اس میں اس پیشہ کے لیے بہت موزونیت پیدا کر دی تھی (فرانسیسی اور انگریزی کے علاوہ وہ عربی، فارسی، جرمن، اطالوی، یونانی اور دوسری زبانیں بھی جانتا تھا)۔ وہ یونیورسٹی میں علم الاصنام اور یونانی اور اطالوی علم و ادب پر درس دیا کرتا تھا اور اس موضوع پر اس نے دو درسی کتابیں بھی تالیف کیں: (۱) یونان قدیم تاریخ ادبیات اور (۲) اطالیہ تاریخ ادبیات۔ کچھ مدت وہ مغربی ادبیات اور ترک اور فرانسیسی ادب کے ثانوی مدارس میں بھی مدرس رہ چکا تھا۔

مآخذ: بروسلی محمد طاہر: عثمان لی مؤلفلری ۲: ۲۱۸؛ (۲) نوسال ملی ۱۳۰۲ھ ص ۲۲۲ تا ۲۳۶؛ (۳) شہاب الدین سلیمان: تاریخ ادبیات عثمانیہ ص ۳۶۷؛ (۴) اسمعیل حکمت: ترک ادبیات تاریخی، باکو [۱۳۴۴ھ/۱۹۲۵ء] ۱: ۹۳۱ تا ۹۵۱؛ (۵) ابراہیم نجمی: ترک ادبیات درس لری [۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء] ص ۳۰۷؛ (۶) اسمعیل حبیب: ترک تجدد ادبیات تاریخی [۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء] ص ۵۲۳؛ (۷) رائف نجدت: حیات ادبیہ ۱۹۲۲ء ص ۲۰۲ بعد ۲۸۷ و ۲۴۹ و ۲۵۱؛ (۸) خلیل حامد: در ثروت فنون ح ۵۳ [۱۳۳۷ھ/۱۹۱۸ء] ص ۸۲ و ۸۳؛ (۹) Fazy and Memdonik: *Anthologie*، ص ۲۵۵ تا ۲۵۹؛ (۱۰) M. Hartmann: *Dichter der neuen Turkei in M. S. O. S. As* ج ۱۹ (۱۹۱۶ء) ص ۱۲۴ تا ۱۶۹ و ۱۶ (۱۹۱۸ء) ص ۴۴ اور در *Urkunden und untersungen zur Geistesentwicklung des heutigen Orients*، ۳ برلن ۱۹۱۹ء ص ۸۴ تا ۸۶؛ (۱۱) O. Hachtmann: *Die turkische*، Literature des 20 Jahrh لیپزگ ۱۹۱۹ء ۱۲ تا ۱۶ ؛ (۱۲) N. O. ۲ [۱۳۳۷ھ/۱۹۱۸ء] ص ۵۳۰ و ۵۶۰ ؛ (۱۳) C. Frank: Zum Gedachtnis M. Renfs N.O. ۲ [۱۳۳۷ھ/۱۹۱۸ء] : ۱۶۷ ؛ (۱۴) Th. Menzel : Die Turkische Literatur Kultur der Gegenwart. Die Orientalischin در Hinneberg's Literaturen لیپزگ ۱۹۲۵ء بار دوم ص ۳۱۳.

(Th. Menzel)

® **محمد زاهد الهروی** : رک بہ میر زاہد الہروی .

* **محمد زعیم** : ایک ترک مورخ ، جس کے حالات زندگی محض اس کی تصانیف سے کچھ معلوم ہوتے ہیں ۔ وہ ۹۳۹ھ/۱۵۳۲ء میں پیدا ہوا تھا ۔ وہ خود بیان کرتا ہے کہ مراد ثالث کی تخت نشینی کے وقت یعنی ۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء میں اس کی عمر ۴۳ برس کی تھی ۔ گیارہ برس کی عمر ہی میں اس نے ۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء کی مہم میں اپنے بڑے بھائی پروانہ آغا کی معیت میں حصہ لیا جو اس وقت لیانٹو کے سنجاق بیگ یحیی پاشا اوغلو احمد بیگ کے ماتحت قپوجی باشی تھا ۔ جب سٹہلوی سینبرگ Stuhlweissenburg کی فتح کے بعد یحیی پاشا وہاں کا سنجاق بیگ مقرر کیا گیا تو اس وقت بھی غالباً یہ دونوں بھائی اس کی ملازمت ہی میں رہے اور یہ سلسلہ غالباً ۹۵۲ھ/۱۵۴۵ء تک جاری رہا جبکہ احمد بیگ کو سٹہلوی سینبرگ کے گرجاؤں کی لوٹ مار کے سلسلے میں استانبول بلایا گیا ۔ ۹۶۱ھ/۱۵۵۳ء میں جب سلطان سلیمان نے شاہ طہماسپ شاہ ایران کے خلاف فوج کشی کی تو اس وقت محمد زعیم حاکم شام تکہ اوغلو محمد کا کاتب تھا ۔ اور اس سے ایک سال بعد وہ ترکی کے زبردست وزیر اعظم محمد سوتولی کا کاتب (سکرٹری) بن گیا اور اس حیثیت میں اس نے سلیم ثانی کی موت اور مراد ثالث کی تخت نشینی کی رو داد مرتب کی ، جو دیار بکر حلب اور بغداد کے حاکموں کے پاس بھیجی گئی ۔ اس عہدے پر شاید وہ مشہور و معروف فریدون احمد بیگ [رک بآں] کی ترقی کے بعد مامور ہوا ہوگا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۹۸۷ھ/۱۵۷۹ء تک یعنی محمد سوتولی کی وفات تک وہ اسی عہدے پر فائز رہا ۔ اس کے بعد کا کچھ حال معلوم نہیں ہو سکا ۔ وہ ایک بہت بڑی جاگیر کا مالک تھا (زعامت : اسی وجہ سے اس کا لقب زعیم ہے) ۔ چنانچہ وہ خود لکھتا ہے "زعمائے عتبۂ سلاطین آل عثمانیدن محمد الی متعارف و شہیر" ۔ احباب نے اسے ایک تاریخ لکھنے کی فرمایش کی ۔ اس نے محرم ۹۸۵ھ/(از ۲۱ مارچ ۱۵۷۷ء) میں اسے شروع کیا اور اسی سال ذوالحجہ میں [۹ فروری ۱۵۷۸ء] اسے ختم بھی کر لیا ۔ اس کی تاریخ وفات اور مقام مزار کا کچھ پتا نہیں چل سکا لیکن اس نے کرافیریہ میں جو سالونیکا کے قریب ہے کچھ اوقاف چھوڑے تھے .

اس کی کتاب کا نام ہمائے جامع التواریخ ہے اس نے اس تصنیف کو اپنے مربی محمد سوتولی کے نام معنون کیا ۔ اپنے ماخذ میں وہ گیارہ مصنفین کے نام بتاتا ہے یعنی فردوسی اور طبری سے لے کر نامعلوم مصنف کی تواریخ سلاطین ال عثمان تک اور اپنا سب سے بڑا ماخذ بہجة التواریخ بتاتا ہے ۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس کتاب کے صفحوں کے صفحے اس نے بے تامل نقل کر دیے ہیں ۔ یہ کتاب ابھی تک طبع نہیں ہوئی ۔ اس کی ترتیب میں ایک دیباچہ ہے اور پانچ بڑے ابواب (اقسام جو پہلے گروہوں میں تقسیم کیے گئے ہیں اور پھر ""مقالات" میں) اور آخر میں خاتمۂ کتاب بھی لکھا ہے ۔ ریو اور دوسرے مصنفین نے اس کے

مخطوطات کے حوالے سے اس کے نفس مضمون کی تفصیل بھی بیان کی ہے ۔ پانچویں "قسم" کے چوتھے "گروہ" میں وہ عثمانیوں کا ذکر کرتا ہے اور اس میں کچھ قابل قدر تاریخی مواد ملتا ہے جہاں مصنف اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر ۹۵۰ھ/ ۱۵۴۳ء سے لے کر آئندہ زمانے تک کے حالات بیان کرتا ہے اور دم تحریر تک کے واقعات بیان کر کے اپنی داستان ختم کرتا ہے ۔ آخری واقعہ جو اس نے قلمبند کیا ہے اس مہینے کا ہے جس میں اس نے کتاب ختم کی ۔ ہنگری کے حالات کے متعلق جو بیانات اس کتاب میں موجود ہیں ان پر تھوری Thury نے Torok tortentirok ۲ : ۳۶۳ تا ۳۸۹ میں تبصرہ کیا ہے ۔ اسی مصنف نے اس کے سوانح حیات کے لیے مواد جمع کیا تھا ۔ ۷۹۳ھ/ ۱۳۹۰ء سے ۸۸۱ھ/ ۱۴۷۶ء تک کے حالات محمد زعیم نے اقتباسات میں دیے ہیں اور ۹۲۸ھ/ ۱۵۲۱ء سے ۹۷۳ھ/ ۱۵۶۶ء تک کے حالات کا پورا ترجمہ کیا ہے ۔ اس کتاب کے دوسرے حصوں میں سے جو کچھ کم قدر و قیمت کے ہیں Diez نے Denkwurdigkeiten von Asien ۲۱۲ ببعد نے قدیم تاریخ کا کچھ حصہ طبع کیا ہے جس میں قابیل اور اس کے اخلاف کا ذکر ہے اور V. Hammer نے Surles origines russes، ۳۱، ۱۲۰ کچھ حصہ ترجمہ کر کے طبع کیا ہے جو ترکوں کے قبائل کی تقسیم کے متعلق تھے اور جہاں روس کو ترکوں کا لواں قبیلہ قرار دیا ہے ۔ بعد کے عثمانی مورخین میں سے ابراہیم پچوی نے محمد زعیم کی کتاب کے حوالے سے ۹۴۹ھ/ ۱۵۴۲ء سے بعد کے واقعات قلم بند کیے ہیں ۔

مآخذ : Babinger : G. O. W.، ص ۲۰، ۹۸ ببعد ۹۲، جہاں اور ماخذ بھی مذکور ہیں ۔

(W. BJORKMAN)

محمد سعید : رک بہ خلیل آفندی زادہ ۔ *

محمد سعید : (میر جملہ) سترھویں صدی * عیسوی میں عبداللہ قطب شاہ والی حیدر آباد کا وزیر تھا ۔ اصل میں وہ جواہرات کا سوداگر تھا اور دکن میں وزیر بننے سے پہلے اپنی دولتمندی کی وجہ سے مشہور تھا ۔ جب اورنگ زیب نے اس کے آقا عبداللہ کو شکست دی تو میر جملہ نے اورنگ زیب کی ملازمت اختیار کر لی اور وہ ۱۰۷۱ھ/ ۱۶۶۰ء تا ۱۰۷۵ھ/ ۱۶۶۴ء بنگال کا گورنر رہا ۔ جب شاہ شجاع نے اپنے بھائی اورنگ زیب سے جنگ کی تو اس نے اسے شکست دی ۔ ۱۰۷۲ - ۷۳ھ/ ۱۶۶۱ - ۶۲ء میں اسے کوچ بہار اور آسام کی فتح کے لیے مقرر کیا گیا ۔ اس نے یہ دونوں ملک تاخت و تاراج کیے لیکن برسات کے موسم کی وجہ سے اور فوج میں وبا پھیل جانے کے باعث اسے واپس آنا پڑا ۔ اس مہم میں اسے پیچش کا عارضہ ہو گیا تھا ۔ آخر ۱۰۷۳ھ/ ۱۶۶۳ء میں ڈھاکہ پہنچنے کے بعد اس عارضے سے اس کا انتقال ہو گیا ۔

مآخذ : (۱) مآثر الامراء، ۳ : ۵۳۰؛ (۲) Blochmann : J. A. S. B.، ۱/۳۱ : ۵۱؛ (۳) Elliot & Dowson : History of India، ۷ : ۱۹۹؛ (۴) Imperial Gazetteer of India، ۲ : ۲۰۳، ۲۰۱ تاریخ ۱۰۷۳ھ/ ۱۶۶۰ء درست معلوم ہوتی ہے، ۷ : ۲۱۳؛ (۵) Elphinstone : History of India (۱۳۰۷ھ/ ۱۸۸۹ء)، ۵۸۸ تا ۶۱۳ ۔

(ایم ہدایت حسین)

محمد سلیمان تونسوی چشتی، حضرت ⊛ خواجہ : تونسہ سے تین کوس کے فاصلے پر سانگھڑ کے غیر آباد اور غیر معروف علاقے کے ایک چھوٹے سے گاؤں گڑگوجی میں افغانوں کے جعفریہ قبیلے کے سردار زکریا بن عبدالوہاب بن عمر خان کے

گھر ۱۱۸۳ھ/۱۷۶۹ء میں پیدا ہوئے اور فقر و تصوف میں انہیں اس قدر کمال حاصل ہوا کہ پنجاب سے گزر کر راجپوتانہ، دہلی اور بمبئی اور برصغیر سے باہر افغانستان، ایران اور عرب تک کے لوگوں نے ان سے روحانی اور باطنی فیض حاصل کیا۔ سیاسی لحاظ سے ان کا زمانہ بڑا پرآشوب تھا۔

ہ صاحب کے وطن کے چاروں طرف افغان، سکھ، انگریز اور دوسرے مفسدہ پرداز لوگ دار و گیر قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم کیے ہوئے تھے اور یہ مرد فقیر اعلیٰ اقدار کی شمع روشن کرنے میں مصروف تھا۔ خواجہ صاحب نے اس طرح مسلمانوں کو اس بحرانی دور میں دینی ذوق و شوق عطا کر کے اپنی جگہ پر ثابت قدم رکھا اور اپنے انداز میں وہی کام کیا جو ان کے معاصر سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید (م ۱۸۳۱ء) تحریک جہاد کے ذریعے انجام دینا چاہتے تھے۔

ان کے والد صاحب عالم آدمی تھے جو ان کے بچپن ہی میں وفات پا گئے۔ والدہ نے قرآن مجید حفظ کرنے کے لیے اپنے گاؤں کے ملا یوسف کے سپرد کیا۔ پہلے پندرہ پارے وہاں یاد کیے۔ پھر تونسہ کی مسجد میں میاں حسن علی کے پاس جا کر فارسی نظم و نثر کی کتابیں پڑھیں اور قرآن پاک پورا حفظ کیا۔ پھر وہ لانگھ پہنچے جو تونسہ سے پانچ کوس مشرق میں دریائے سندھ کے کنارے واقع تھا۔ وہاں فارسی درسیات کی تکمیل کی۔ پھر کوٹ مٹھن گئے جہاں قاضی محمد عاقل (م ۱۸۱۴ء) نے ایک دارالعلوم کھول رکھا تھا یہاں انہوں نے منطق کی مشہور کتاب قطبی پڑھی اور فقہ پر پورا عبور حاصل کیا۔ اپنے استاد کے ساتھ اوچ میں خواجہ نور محمد مہاروی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے ان کے متعلق کہا بسیار بلند ہمت و وسیع نہضت بنظر می آید (منتخب المناقب)۔ رخصت حاصل کرنا چاہی تو خواجہ صاحب نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے اور حضرت سید جلال الدین بخاری (م ۱۳۸۴ء) کے مزار پر لے جا کر بیعت کیا۔ اس وقت ان کی عمر پندرہ برس تھی۔ بیعت کے بعد روحانی تربیت کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ برابر جاری رہا۔ خواجہ نور محمد مہاروی فضلائے دہر میں سے تھے۔ باطنی توجہات کے علاوہ انہیں آداب الطالبین، لوائح، عشرہ کاملہ، فصوص الحکم وغیرہ تصوف کی کتابیں بھی پڑھائیں۔ خواجہ نور محمد مہاروی ان کے استقامہ کے متعلق کہا کرتے تھے "این طفلک در دریافت کردن و گرفتن چیزے از ما مارا متعجب و حیران گردانیدہ۔ حق تعالیٰ این را چہ وسیع و پر حوصلہ نمودہ کہ ہر چیز بگیرد استعداد و قابلیت فوق آن داشتہ باشد" (منتخب المناقب و سیرۃ سلیمان)۔ اپنے مرشد سے محبت و عقیدت کا یہ عالم تھا کہ بار بار مہار شریف حاضر ہوتے اور وہاں ایک ایک ماہ قیام کرتے۔ اس تربیت روحانی کے کوئی چھ سال گزرے تھے کہ ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۱ء میں جب کہ ان کی عمر ابھی صرف اکیس بائیس برس تھی انہیں خلافت عطا کر دی گئی۔

اب خواجہ صاحب اس کام کے لیے پوری طرح تیار ہو چکے تھے جس کے لیے خواجہ نور محمد مہاروی نے انہیں اس پرآشوب دور میں منتخب کیا تھا اور اپنی تحریک احیاء ان کے سپرد کر دی تھی۔ خواجہ مہاروی کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے گڑگوجی کو چھوڑ کر وہ تونسہ میں اقامت گزیں ہوئے جو ان دنوں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ انہیں درس و تدریس کا بڑا شوق تھا چنانچہ تونسہ میں انہوں نے مدارس قائم کیے۔ رفتہ رفتہ مدرسوں کے لیے پختہ مکانات بن گئے جن میں بیک وقت [illegible] علماء رہا کرتے تھے اور علوم

دینیہ کی انتہائی تعلیم دیا کرتے تھے۔ دو دو ہزار تک طالب علم ان کے دارالعلوم میں موجود رہتے تھے۔ اساتذہ اور طلبہ کی جملہ ضروریات کی کفالت وہ خود کیا کرتے تھے۔ ایک ماہ صرف ادویات کا خرچ اس سستے زمانے میں پانچ سو روپے نکلا۔ خواجہ محمد سلیمان تونسوی بھی احیاء العلوم، فتوحات مکیہ، فصوص الحکم وغیرہ کتب تصوف کا درس خاص خاص خلفا کو باقاعدہ دیا کرتے تھے۔ علاوہ بریں کنز اور کافیہ کا درس بھی انہوں نے دیا۔ عقائد اور تزکیہ کا اہتمام وسیع پیمانے پر جاری تھا اور دعوت و ارشاد کا کام باقاعدہ ہو رہا تھا۔ ان سے فیض حاصل کرنے کے لیے علماء اور صوفیہ دور دور سے پہنچتے تھے۔ امراء، والیانِ ریاست اور عوام بھی جوق در جوق عقیدت و ارادت کے ساتھ حاضر ہوتے تھے۔ لنگر کا باقاعدہ انتظام تھا جس سے دونوں وقت ہزاروں آدمی کھانا کھاتے تھے۔ سیم و زر سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ ان کے لنگر میں پختہ مکانات بنتے چلے گئے اور تونسہ ایک بارونق مقام بن گیا۔

حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسوی کے تبحر علمی کا اندازہ سطور بالا سے لگایا جا سکتا ہے۔ ان کی گفتگو آیات و احادیث سے مزین ہوتی تھی۔ فارسی اور پنجابی کے بر محل شعر بھی پڑھا کرتے تھے۔ ان کی شخصیت جمال اور جلال کا مظہر تھی۔ اوراد و وظائف اور عبادات کے سلسلہ میں اپنے معمولات کی پابندی زندگی کے آخری لمحات تک جاری رکھی۔ اکثر جذب و استغراق کی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ انہوں نے خود ارکان اسلام کی حفاظت کی اور اپنے متبعین اور متعلقین کو بھی یہی تعلیم دی۔ فرمایا کرتے تھے دین و دنیا کے ہر شعبہ اور سلوک و معرفت میں کامیابی کا انحصار اکمل ترین انسان یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع پر ہے۔ ان کے نزدیک نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے مظالم، سکھوں کی چیرہ دستیوں اور انگریزوں کے تغلب کی اصل وجہ مسلمانوں کے اپنے اعمال کی خرابی تھی۔ خواجہ تونسوی کی تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ احیا و اصلاحِ دین و ملت کی جو تحریک مہار شریف کے رستے پنجاب میں داخل ہوئی تھی تمام صوبے میں پھیل گئی اور پھر ان کے خلفاء نے اسے نہ صرف استحکام بخشا بلکہ پنجاب سے باہر حتی کہ بیرون ہند بھی پہنچایا۔ تاریخ مشائخ چشت میں ان کے تریسٹھ خلفاء کے نام درج ہیں۔ ان کے خلفاء میں سے خواجہ شمس الدین سیالوی (م ۱۸۸۳ء) نے سیال شریف میں جو خانقاہ قائم کی اس کی وجہ سے سرگودھا، جہلم، گجرات، راولپنڈی، میانوالی اور جھنگ کے اضلاع میں دینی شعور کو تقویت حاصل ہوئی اور اسلامی معاشرہ کی بنیادیں استوار ہوگئیں۔ اسی قسم کے نتائج ان کے باقی خلفاء کی وجہ سے بھی برآمد ہوئے۔

متواتر ساٹھ سال تک اپنے ظاہری و باطنی فیوض ہر طرف عام کر چکے تو ۸۴ برس کی عمر میں ۷ صفر ۱۲۶۷ھ/ ۱۲ دسمبر ۱۸۵۰ء کو وفات پائی۔ ان کا مزار تونسہ شریف میں ہے۔ ان کے دونوں فرزند خواجہ گل محمد اور خواجہ درویش محمد ان کی زندگی ہی میں وفات پا گئے تھے۔ اس لیے ان کے پوتے خواجہ اللہ بخش مسند نشین ہوئے۔ ان کے ملفوظات پر مشتمل کتاب نافع السالکین فارسی میں ہے۔ ان کی سیرت سے متعلق جو کتابیں تصنیف ہوئیں، ان میں سے خاتم سلیمانی، سیرت سلیمانی، مناقب سلیمانی اور منتخب المناقب خاص طور پر مشہور ہیں۔ سرسید احمد خان ان کے معاصر تھے انہوں نے آثار الصنادید میں لکھا ہے کہ خواجہ محمد سلیمان تونسوی کی شہرت قاف تا

قائم ہے ، یعنی دور دور تک پھیل چکی ہے ۔

مآخذ : امام الدین : نافع السالکین ، ترجمہ اردو ، محمد حسین للہی ؛ (۲) حاجی نجم الدین : مناقب المحبوبین ، مطبوعہ مطبع حسنی ؛ (۳) محمد الدین : تذکر حبیب ، مطبوعہ منڈی بہاء الدین ؛ (۴) خلیق احمد نظامی : تاریخ مشائخ چشت ، دہلی ؛ (۵) ہاشمی فرید آبادی : تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت ، جلد دوم ؛ (۶) حاجی فضل احمد : تذکرۃ الاولیائے جدید، (ماہنامہ سبیل کا خاص نمبر لاہور) ؛ (۷) محمد لطیف : تاریخ پنجاب بزبان انگریزی ؛ (۸) سرسید احمد خان : آثار الصنادید ؛ (۹) محمد حسین للہی : حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسوی ، لاہور ۱۹۷۹ء . (عبدالغنی رکن ادارہ نے لکھا) ۔

(ادارہ)

⊛ **محمد سلیمان سلمان** : قاضی منصورپوری، اردو میں سیرت پاک پر مشہور و مقبول کتاب رحمۃ للعالمین کے مصنف ؛ ۱۸۶۷ء میں منصور پور (سابق ریاست پٹیالہ ، بھارت) میں ایک علمی اور دیندار خاندان میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد قاضی احمد شاہ ریاست پٹیالہ میں نائب تحصیلدار تھے ۔ قاضی محمد سلیمان نے قرآن مجید کے علاوہ عربی کی بعض کتابیں اپنے والد سے پڑھیں ۔ بعد ازاں انہوں نے ۸۵-۱۸۸۴ء میں منشی فاضل کا امتحان مہندرا کالج پٹیالہ سے پاس کیا اور پنجاب یونیورسٹی میں اول آئے ۔ اس کے بعد وہ ریاست پٹیالہ کے مختلف محکموں ، تعلیم ، مال اور دیوانی میں کام کرتے رہے تا آنکہ سیشن جج کے عہدے سے پنشن یاب ہوئے ۔ انہوں نے مسلمانوں کی تعلیمی پستی دور کرنے کے لیے ایک مسلم ہائی سکول کی بھی بنیاد رکھی تھی ۔ انہوں نے ۳۰-۲۹ مئی ۱۹۳۰ء کو بحری جہاز میں انتقال کیا جب کہ وہ دوسری بار حج بیت اللہ سے مشرف ہو کر واپس آ رہے تھے ۔

قاضی محمد سلیمان بلند پایہ محقق و عالم تھے ۔ کتب سماوی بالخصوص انجیل پر گہری نظر رکھتے تھے ۔ وہ مسلمانوں کی دینی و دنیاوی بھلائی کے لیے کوشاں رہتے تھے ۔ وہ مرنجاں مرنج اور صلح جو تھے ، اس لیے ہر طبقے اور ہر جماعت میں یکساں مقبول تھے ۔

تصانیف : قاضی محمد سلیمان نے سیرت پاک اور دفاع اسلام میں متعدد کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں ۔ ان کتابوں کا اسلوب بیان سلیس ، سادہ ، اثر انگیز اور دلآویز ہے : (۱) ان کی بہترین کتاب رحمۃ للعالمین (۳ جلدیں) ہے ، جو متعدد بار چھپ چکی ہے ۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت طیبہ کے واقعات صاف اور سیدھی مگر مؤثر زبان میں بیان کیے گئے ہیں ۔ سیرت پاک کی یہ کتاب مستند اور معتبر ہونے کی بنا پر مقبول خواص و عوام رہی ہے، کتاب کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے ؛ (۲) الجمال و الکمال ، سورہ یوسف کی دلنشین تعبیر ؛ (۳) مہر نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی سیرت پاک پر ایک مختصر کتاب ؛ (۴) معارف الاسماء شرح اسماء اللہ الحسنیٰ، اسمائے حسنیٰ کی عمدہ شرح ہے ؛ (۵) تاریخ المشاہیر، تقریباً پچاس مسلم مشاہیر کا تذکرہ ؛ (۶) سبیل الرشاد ، سفر نامہ حجاز ؛ (۷) غایت المرام ، رد قادیانیت میں ایک رسالہ ؛ (۸) بدر البدور المعروف بہ اصحاب بدر ، جس میں اصحاب بدر کے مختصر حالات مذکور ہیں ۔ ان کتابوں کے علاوہ سیرت پاک پر کئی تقریریں ہیں ، ردّ نصاریٰ، آریوں کے اعتراضات اور قادیانیوں کے عقائد و مزعومات کے جواب میں متعدد رسائل ہیں اور مختلف دینی اور علمی انجمنوں کے اہتمام میں منعقدہ اجلاس کے خطبات صدارت ہیں ۔

مآخذ : (۱) رحمۃ للعالمین (جلد سوم ، مقدمہ از سید سلیمان ندوی) ؛ (۲) حکیم محمد عبداللہ جہانیاں : سیرت سلیمان ، در معارف الاسماء شرح اسماء الحسنیٰ لاہور ۱۹۷۳ء ؛ (۳) حالات زندگی قاضی محمد سلیمان (اسکی خطی مملوکہ قاضی حسن معز الدین) ؛ (۴) ماہنامہ اردو ڈائجسٹ ، لاہور .

(امین اللہ وثیر ، تلخیص از ادارہ)

* **محمد شاہ** : (۱۱۳۱ھ - ۱۱۶۱ھ/۱۷۱۹ء - ۱۷۴۸ء) جس کا نام روشن اختر بھی مشہور تھا ، جہان شاہ کا بیٹا تھا ۔ جہان شاہ ان تین بھائیوں میں سے ایک تھا جو اپنے سب سے بڑے بھائی جہاندار شاہ بن بہادر شاہ سے جنگ تخت نشینی میں مارے گئے ۔ محمد شاہ جمعہ کے روز ۲۳ ربیع الاول ۱۱۱۴ھ/ (۸ اگست ۱۷۰۲ء) کو پیدا ہوا تھا ۔ سید برادران سید عبداللہ اور سید حسین نے رفیع الدولہ کی وفات کے بعد ۲۵ ذوالقعدہ ۱۱۳۱ھ/(۸ اکتوبر ۱۷۱۹ء) کو اسے تخت نشین کیا ۔ محمد شاہ نے کوئی تیس برس تک حکومت کی ۔ سرھند کی لڑائی کے ایک مہینہ کے بعد فوت ہو گیا ۔ یہ جنگ اس کے بیٹے نے احمد شاہ ابدالی [رک باں] کے خلاف کی تھی ۔ اس کی موت جمعرات کے روز ۲۷ ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ/۲۶ اپریل ۱۷۴۸ء کو ہوئی ۔ اسے مقبرہ نظام الدین اولیاء کے صحن میں دفن کیا گیا ۔ اس بادشاہ کو ہم تیموری خاندان کا آخری بادشاہ کہ سکتے ہیں جس نے دہلی میں کسی حد تک با اختیار حکومت کی ۔ محمد شاہ کی وفات کے بعد جو چند بادشاہ تخت نشین ہوئے وہ امرائے دربار کے ہاتھوں میں محض کٹھ پتلی بنے رہے .

مآخذ : (۱) محمد ہاشم خافی خان : منتخب اللباب ، ۷ : ۸۳۰ ؛ (۲) Elliot & Dowson : History of India ، ۷ : ۴۸۵ ؛ (۳) Elphinstone : History of India ، ۱۸۸۹ء ، ص ۶۹۲ .

(اسم ہدایت حسین)

* **محمد شاہ اول** : علاء الدین خلجی (۶۹۵ھ / ۱۲۹۵ء تا ۷۱۵ھ / ۱۳۱۵ء) ، سلطان جلال الدین فیروز شاہ ثانی خلجی کا بھتیجا اور داماد تھا جسے اس نے غداری کر کے ۶۹۵ھ/ ۱۲۹۵ء میں کڑہ مانک پور کے مقام پر جو الہ آباد کے صوبہ میں واقع ہے ، قتل کر دیا اور اسی سال وہ دہلی میں تخت نشین ہو گیا ۔ اس نے گجرات کو دوبارہ فتح کیا (۶۹۷ھ/۱۲۹۷ء) ۔ چتوڑ فتح کر کے راجپوتوں کو عارضی طور پر مطیع کر لیا (۷۰۳ھ/۱۳۰۳ء) ۔ اس کے جرنیل ملک کافور نے جو خواجہ سرا تھا ، دیو گیر اور ورنگل کو فتح کیا اور سلطنت دہلی کے ماتحت صوبہ دکن کی بنیاد ڈالی ۔ اس کے عہد حکومت میں سلطنت خوب پھلی پھولی ۔ [شعر و سخن کی محفلیں گرم رہیں] ۔ معاصر شعرا میں سے امیر خسرو اور خواجہ حسن [سجزی] چوٹی کے شاعر مانے جاتے تھے ۔ مشہور عالم شیخ نظام الدین اولیاء اس زمانے میں زندہ تھے ۔ محمد شاہ ۷۱۵ھ/۱۳۱۵ء میں فوت ہوا اور پرانی دہلی کے ایک مقبرہ میں دفن ہوا جو اس نے اپنی زندگی ہی میں تعمیر کرایا تھا .

مآخذ : (۱) عبدالباقی نہاوندی : مآثر رحیمی ، ص ۳۲۲ تا ۳۳۰ ؛ (۲) نظام الدین احمد ہروی : طبقات اکبری ، لکھنو ۱۸۷۵ء ، ص ۹۸ تا ۸۶ ؛ (۳) سید احمد خان : آثار الصنادید ، دہلی ۱۸۴۷ء ، ۲ : ۱۰۷ ؛ (۴) Wright : Cat. of the Coins in the Indian Museum ، کلکتہ ، ۲ : ۸ ؛ (۵) Elphinstone : History of India ، ۱۸۸۹ء ، ص ۳۹۰ تا ۴۰۰ .

(اسم ہدایت حسین)

* **محمد شاہ بہمنی** : (رک بہ محمد اول تا ثالث .

* **محمد شریف النجفی** : دکن میں پیدا ہوا اور زندگی کے پہلے ۲۵ سال وہیں گزارے ۔ پھر سرکاری حیثیت سے گجرات ، مالوہ ، اجمیر ، دہلی ، آگرہ ، پنجاب ، سندھ اور کشمیر کا دورہ کیا ۔ کشمیر میں وہ جہانگیر کے عملے میں قاسم خان (۱۰۳۱ھ/۱۶۲۱ء) کی کمان میں گیا تھا ۔ وہ مجالس السلاطین کا مصنف ہے، جو شاہان دہلی و دکن کی ایک مختصر تاریخ ہے اور اس میں اسلامی فتوحات سے لے کر شاہجہان کی تخت نشینی تک کا ذکر ہے ۔ یہ تصنیف ۱۰۳۸ھ/۱۶۲۸ء میں مکمل ہوئی ۔

مآخذ : (۱) Elliot Dawson : *History of India*، ۴: ۱۲۳ تا ۱۳۰؛ (۲) Rieu : *Cat. Pers. MSS. Br. Mus.*، ص ۹۰۴ ۔

(ایم ۔ ہدایت حسین)

⊛ **محمد شفیع لاہوری** : مولوی ، ڈاکٹر (D.O.L.) خان بہادر، (سابق پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور و رئیس اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی ، لاہور) قصبہ قصور [توابع لاہور ، پاکستان] میں ایک علمی خاندان میں پیدا ہوے ۔ ۱۹۰۵ء میں انگریزی اور ۱۹۱۳ء میں عربی میں ایم ۔ اے کے امتحان پاس کیے ۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۸ء تک کیمبرج (انگلستان) میں تحصیل علم کی ۔ کیمبرج سے بی ۔ اے ، ایم اے ، اور اعلٰی تحقیق کے علاوہ ۱۹۱۸ء میں اسی دانشگاہ میں اردو زبان و ادب کی تدریس بھی کی ۔ ۱۹۱۹ء میں وطن واپس آئے تو پنجاب یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوے ۔ اس منصب پر ۱۹۴۲ء تک فائز رہے ۔ ۱۹۳۶ء کے بعد مذکورہ بالا سال تک یونیورسٹی اورینٹل کالج کے پرنسپل رہے ۔ ۱۹۵۰ء میں پنجاب یونیورسٹی میں اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے رئیس ادارہ مقرر ہوے اور ۱۹۶۳ء (سال وفات تک) یہی فرائض انجام دیتے رہے ۔ انھوں نے اس اثنا میں بیرون ملک (ایران وغیرہ) کے علمی سفر بھی اختیار کیے ۔ انھیں قلمرو ایران کی طرف سے علمی اعزاز (نشان سپاس) بھی ملا ۔ علما و ماہرین مشرقیات میں ان کی فضیلت علمی کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور عربی و فارسی موضوعات پر ان کی تحقیق کو سند کا درجہ حاصل تھا ۔ وہ لائڈن کے دائرہ معارف اسلامیہ (انگریزی) کی مشاورتوں میں بھی بطور Associate Member شریک تھے ۔ (مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے اُا اردو ، جلد اول ، ترقیمہ جو وفات پر لکھا گیا) ۔

مولوی صاحب کی تصانیف و مقالات کی فہرست طویل ہے ۔ ملاحظہ ہو (ارمغان علمی ، کج و بعد) ۔ اہم کتابوں کے نام (جو انھوں نے ایڈٹ کیں) یہ ہیں : (۱) فہارس العقد الفرید ، عربی (اشاریہ انگریزی میں) ۲ جلد ؛ (۲) تذکرہ مےخانہ عبدالنبی (متن عربی وحواشی) ؛ (۳) تتمہ صوان الحکمة از علی بن زید البیہقی (متن عربی وحواشی) ؛ (۴) مطلع سعدین از عبدالرزاق سمرقندی (متن فارسی مع حواشی) ؛ (۵) مکاتبات رشیدی از رشید الدین فضل اللہ (متن فارسی و حواشی) ؛ (۶) یاد نامہ ڈاکٹر اے ۔ سی ۔ وُلنر (انگریزی میں اس سابق پرنسپل کی یاد میں مضامین ایڈٹ کیے اور خود بھی مقالہ لکھا) ؛ (۷) اورینٹل کالج میگزین اور ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین کے مدیر تھے ۔ یہ ہیں ان کی ایڈٹ کردہ مطبوعہ کتابیں ، لیکن ان کے مقالات جن میں اوریجنل تحقیق کی ہے ، کی تعداد خاصی طویل ہے (دیکھیے ، ارمغان علمی ، کط) ۔ مذکورہ فہرست میں ۶۳ مقالات کا ذکر ہے ، لیکن شاید اس سے زیادہ ہوں ۔ بدائع وقائع مخلص کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے ۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی تدوین بھی ان

کا کارنامہ خاص ہے ۔ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کی عربی و فارسی انجمن کی بنیاد رکھی ۔

شفیع صاحب کی تحقیق کے موضوع بہت سے ہیں ۔ انھوں نے ایران اور ہندوستان کی علمی تاریخ میں منگولوں (مغول) اور تیموریوں کے دور کا خاص مطالعہ کیا ۔ عتیقیات ، خط شناسی اور خطاطی کے ارتقا سے خاص دلچسپی رکھتے تھے ۔ فرقہ نور بخشی کی تحقیق کی طرف بھی توجہ کی ۔ برصغیر کی علمی و تہذیبی تاریخ میں پنجاب اور لاہور و قصور کا حصہ بھی ان کے لیے مرکز توجہ رہا ۔ انھوں نے ایک خاصا بڑا کتب خانہ جمع کیا جس میں مذکورہ موضوعات کے علاوہ دیگر نوادر بھی بڑی تعداد میں اکٹھے کیے ۔ ان کی ذات اپنے زمانے کے علما و فضلا کے لیے قابل تقلید رہی اور انھوں نے علوم مشرقی کے تحفظ اور فروغ کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں ۔ انھیں علمائے کبار میں شمار کیا جاتا تھا ۔ (سید عبداللہ رئیس ادارہ نے لکھا) ۔

مآخذ : متن میں مذکور ہیں ۔

(ادارہ)

⊗ محمد صدیق نقشبندی مستونگی :

محمد حسنی بلوچ ، مقام پیدائش قندھار ۔ علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل جید عالم اور متدین بزرگ میاں ولی محمد کے درس سے ہوئی ، جن کا مسلک نقشبندیہ سلسلہ میں میاں فقیر اللہ شکار پوری سے ہوتا ہوا سید آدم بنوری سے جا ملتا ہے ۔ علم ظاہر و باطن کی تکمیل کے بعد درس و تدریس میں مصروف ہو گئے ۔

ایک مدت کے بعد حج بیت اللہ کا ارادہ کر کے چل پڑے ۔ راستے میں مستونگ (بلوچستان) قیام کیا ۔ شاگردوں میں اخوند ملا فیض اللہ بھی ہمراہ تھا ۔ کچھ عرصہ تک مستونگ میں مقیم رہے ۔ حج بیت اللہ شریف سے فراغت کے بعد پہلے مدینہ منورہ میں مستقل قیام کی ٹھانی ۔ بعد میں غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف سے اشارہ ہوا کہ مستونگ جا کر قیام کیجیے ۔ جہاں واپسی پر قیام محلہ سادات میں ہوا اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا ۔ عالم با عمل تھے ۔ ان کی مقبولیت دیکھ کر اہل محلہ نے ایذا رسانی شروع کر دی ۔ چنانچہ مولانا بالآخر کبیدہ خاطر ہو کر قندھار چلے گئے ۔

مستونگ میں ان کی آمد سے قبل اہل مستونگ اور مضافات کے لوگ مسلمان ہونے کے باوجود بعض ایسی رسوم میں مبتلا تھے ، جو شریعت محمدیؐ کے خلاف تھیں ۔ مولانا محمد صدیق کی روز و شب کی تعلیم و تربیت کے باعث ان خرابیوں کی اصلاح ہونے لگی ۔ ان کے چلے جانے کے بعد باشندگان مستونگ نے ان کی کمی کو شدت سے محسوس کیا اور سرکردہ لوگوں کا ایک گروہ ان کو واپس لانے کے لیے عازم قندھار ہوا ۔ مولانا نے سادات مستونگ کی مخالفت کے زیر نظر معذرت خواہی کی ، مگر ارباب نبی بخش خواجہ خیل نے ان کے گھر ، مدرسے اور مسجد کے لیے زمین کی پیشکش کی اور وفد کے اصرار سے متأثر ہو کر مولانا دوبارہ مستونگ تشریف لے آئے ۔ ارباب نبی بخش خواجہ خیل نے وعدے کے مطابق عمارات تعمیر کر دیں ۔ مولانا نے زندگی کے باقی بیس سال علم و عرفان کی خدمت میں گزار کر ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء میں داعی اجل کو لبیک کہا اور جامع مسجد مستونگ کے ایک گوشے میں مدفون ہوئے ۔

ان کے فیض یافتگان میں سے یہ حضرات اعلی مراتب تک پہنچے :

۱۔ شاگرد رشید و خلیفہ اول ملا عبدالواحد اخوند ؛ ۲۔ حاجی فیض اللہ ؛ ۳۔ مولانا محمد عمر

رئیسانی؛ ۴۔ سید عبدالرحمان شاہ کرد گابی؛ ۵۔ ڈاکٹر عبداللہ خان حکیم۔

آج تک مستونگ میں "مدرسہ صدیقیہ" علم کی روشنی پھیلا رہا ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ خان حکیم نے اپنی بعض مثنویوں (تحفہ حکیم، لاہور، ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء؛ گلشن حکیم، لاہور، ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) میں اپنے مرشد محمد صدیق نقشبندی مستونگی کی خدمت میں گل ہاے عقیدت پیش کیے ہیں۔

مآخذ: (۱) عبدالقیوم: سوانح حیات وقف راہ خدا و نجم راہ ھدی حضرت محمد صدیق جان مستونگی، شمس آباد مستونگ، ۱۳۰۹ھ ق (خطی)؛ (۲) انعام الحق کوثر: شعر فارسی در بلوچستان، لاہور، ۱۹۷۵ء؛ (۳) انعام الحق کوثر: تذکرہ صوفیاے بلوچستان، لاہور ۱۹۷۶ء؛ (۴) حکیم عبداللہ خان: گلشن حکیم، لاہور ۱۳۲۳ھ؛ (۵) وہی مصنف: تحفہ حکیم، لاہور ۱۳۲۵ھ؛ (۶) وہی مصنف: گلدستہ حکیم، لاہور ۱۳۲۲ھ؛ (۷) وہی مصنف: مخمس محمود نامہ، لاہور ۱۳۲۲ھ؛ (۸) مناجات حکیم مع نعت رسول کریم لاہور۔

(انعام الحق کوثر)

⊗ **محمد طاہر پٹنی:** (عربی: فتنی)؛ ملک المحدثین علامہ جمال الدین محمد طاہر پٹنی، ہندوستان کے ممتاز محدثین میں سے ہیں۔ وہ ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء میں بھارت کے صوبہ گجرات کے ایک قدیم قصبہ پٹن (عربی: فتن) میں پیدا ہوے۔ وہ بوھروں کے ایک متمول خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد ایک بڑے تاجر تھے اور ساری عمر تجارت میں مشغول رہے۔ اس وقت پٹن (نہروالہ) اسلامی علوم و فنون کا مرکز تھا اور قدیم پاے تخت ہونے کے سبب علما اور صوفیہ کا مرجع تھا۔ محمد طاہر نے نوعمری میں قرآن مجید حفظ کر لیا اور پندرہ برس کی عمر میں علوم دینیہ سے فارغ ہو گئے، (العیدروس: النور السافر، ص ۳۶۱ تا ۳۶۲، بغداد ۱۹۳۴ء)۔

۹۴۴ھ میں وہ علم حدیث کی تحصیل و تکمیل کے لیے حجاز روانہ ہوے۔ وہ پہلے مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ پہنچے اور بعد ازاں مکہ مکرمہ واپس آئے۔ اس زمانے میں حرمین محترمین میں بہت سے علماے حدیث موجود تھے، جن میں ابن حجر الھیثمی مکی اور شیخ علی متقی ہندی سربر آوردہ تھے اور ان کا فیض دنیاے اسلام میں جاری تھا۔ شیخ علی متقی کا پایہ علم حدیث میں بہت اونچا تھا۔ انھوں نے حدیث کی وہ دائرۃ المعارف ترتیب دی جو کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال (طبع جدیدہ حلب) کے نام سے مشہور ہے۔ شیخ محمد طاہر پٹنی نے ان کی تعلیم و صحبت سے بڑا فائدہ اٹھایا اور ان سے بیعت بھی ہو گئے (سید سلیمان ندوی: ہندوستان میں علم حدیث، در رسالہ معارف، اعظم گڑھ، اکتوبر ۱۹۲۸ء)۔

مکہ مکرمہ میں چار پانچ برس قیام کر کے شیخ محمد طاہر ۹۵۰ھ میں واپس وطن ہوے اور تعلیم و تدریس اور وعظ و تبلیغ میں مصروف ہو گئے۔ ان کی اپنی قوم یعنی بوھروں میں بعض بدعتوں کا رواج تھا، خصوصاً شادی بیاہ میں ہندوؤں کی بہت سی رسمیں جاری تھیں، شیخ نے ان کے استیصال پر کمر ہمت باندھی۔ اس سے بوھروں میں ہل چل مچ گئی (عبدالحق: اخبار الاخیار، ص ۲۸۰، مطبوعہ دھلی)۔ غرض شیخ محمد طاہر اپنی قوم کی اصلاح اور درس و تدریس میں اپنا وقت صرف کرنے اور فارغ اوقات میں تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے۔ اس زمانے میں عوام خود غرضی، نفاق، عیش پرستی اور عاقبت

فراموشی کے نشے میں مدھوش تھے جب کہ امرا خانہ جنگی میں مبتلا تھے۔

گجرات کے آخری سلطان، سلطان مظفر ثالث کے ابتدائی عہد (۹۶۸ھ) میں مہدویوں نے گجرات میں فتنہ و فساد کا بازار گرم کر دیا۔ مہدوی سید محمد مہدی جونپوری (م ۹۱۰ھ/ ۱۵۰۴ء) کے پیروکار تھے اور اس کو مہدی موعود مانتے تھے۔ مہدی، منکرین مہدوی کو کافر کہہ کر قتل کرنے لگے۔ شیخ محمد طاہر نے مہدویوں کے خلاف جدو جہد شروع کی اور تقریر و تحریر سے ان کے عقیدے کی غلطی ثابت کی۔ اس سے مہدی ان کے کھلم کھلا دشمن بن گئے۔ جب مہدویوں کی شورش میں کمی نہ ہوئی تو انھوں نے اپنے سر سے پگڑی اتار دی اور قسم کھا کر کہا کہ وہ جب تک اس بدعت کو ختم نہ کر لیں گے، اس وقت تک سر پر دستار نہیں باندھیں گے۔ (عبدالحی: نزھۃ الخواطر، ۴: ۲۹۹ تا ۳۰۰، حیدر آباد دکن ۱۹۵۵ء)۔

۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء میں جب مغل فرماں روا جلال الدین اکبر نے گجرات پر حملہ کر کے پٹن پر قبضہ کرلیا۔ وہ شیخ محمد طاہر سے بھی ملا۔ ان کی بڑی عزت افزائی کی۔ اپنے ہاتھ سے ان کے سر پر عمامہ باندھا، شیخ الاسلام کا عہدہ عطا کیا اور وعدہ کیا کہ آئندہ سے شرعی معاملات شیخ کے مشورے کے مطابق ہوں گے۔ اکبر کے رضاعی بھائی خان اعظم مرزا عزیز کوکا کے زمانہ صوبیداری تک پٹن میں امن و امان قائم رہا اور شیخ محمد طاہر مطمئن ہو کر درس و تدریس رشد و ہدایت اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ جب خان اعظم مرزا کوکا کی جگہ عبدالرحیم خان خاناں ناظم گجرات بن کر آیا تو مہدویوں کے فتنہ نے پھر سر اٹھایا۔ شیخ نے ناظم گجرات کو اس فتنے کی طرف توجہ دلائی تو اس نے کوئی دھیان نہ دیا۔ خان خاناں کے جانشین نے بھی مہدوی فتنے کی کوئی پروا نہ کی، لہذا شیخ محمد طاہر نے مجبور ہو کر خود آگرہ جا کر اکبر بادشاہ سے ملنے اور مہدوی فرقے کے استیصال کرانے کا عزم کیا۔

۹۸۶ھ/۱۵۷۸ء میں وہ گجرات سے کوچ کر کے آگرہ کے لیے روانہ ہوئے؛ مہدوی بھی ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے؛ چنانچہ انھوں نے راستے میں سارنگ پور (اُجّین) کے قریب شیخ کو جا لیا اور رات کے وقت عین نماز تہجد میں شیخ کو شہید کر دیا (۶ شوال ۹۸۶ھ/ ۶ دسمبر ۱۵۷۸ء) (غلام علی آزاد بلگرامی، سبحۃ المرجان، ص ۴۴، مطبوعہ بمبئی؛ (۲) مآثر الکرام، ص ۱۹۶، مطبوعہ حیدر آباد دکن)۔ کچھ عرصے بعد اکبر بادشاہ کے حکم پر شیخ محمد طاہر کی میت سارنگ پور سے لا کر پٹن میں ان کے خاندانی قبرستان میں دفن کی گئی (سید صدیق حسن: ابجد العلوم، ص ۸۹۶)۔

علم و فضل: شیخ محمد طاہر یوں تو تمام علوم اسلامیہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے، لیکن حدیث اور ان کے متعلقات میں انھیں امامت کا درجہ حاصل تھا۔ انھوں نے فن اسماء الرجال، علم الموضوعات اور غریب الحدیث پر بہت سی کتابیں لکھیں، جن میں مجمع بحارالانوار فی غرائب التنزیل و لطائف الاخبار، تذکرۃ الموضوعات اور قانون الموضوعات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مجمع، بحار الانوار اگرچہ قرآن مجید اور احادیث کے مشکل الفاظ کا لغت ہے، مگر علمائے محدثین کے اعتراف کے مطابق، وہ در حقیقت صحاح ستہ کی شرح ہے اور اسلامی ہند کا مایہ ناز کار نامہ ہے۔ یہ مفید کتاب دو بار مطبع نولکشور، لکھنو سے شائع ہو چکی ہے۔ اب اس کا محققانہ ایڈیشن

حیدر آباد دکن سے شائع ہوا ہے ؛ (۲) تذکرۃ الموضوعات، موضوع حدیثوں کے بیان میں ہے ؛ (۳) قانون الموضوعات میں مصنف نے ان راویوں کے نام بحروف تہجی جمع کیے ہیں جو موضوع حدیثیں بیان کرتے تھے۔ موخر الذکر دونوں کتابیں قاہرہ سے شائع ہو چکی ہیں ؛ (۴) کفایۃ المفرطین صرف کی مشہور کتاب شافیہ کی شرح ہے جس کا قلمی نسخہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ احمد آباد کے کتب خانے میں ہے (عبدالحی : نزہۃ الخواطر، ص ۴۰۱، حیدر آباد دکن ۱۹۵۴ء ؛ زبید احمد : India's contribution to Arabic Literature، مع اشاریہ)۔

مآخذ : (۱) غلام علی آزاد : سبحۃ المرجان، بمبئی ۱۸۸۵ء ؛ (۲) وہی مصنف : مآثر الکرام، آگرہ ۱۳۲۸ھ ؛ (۳) صدیق حسن خان : ابجد العلوم، بھوپال ۱۲۹۵ھ-۱۲۹۹ھ ؛ (۴) وہی مصنف : اتحاف النبلاء، کانپور ۱۲۸۸ھ ؛ (۵) وہی مصنف : التاج المکلل، بمبئی ۱۹۶۶ء ؛ (۶) عبدالحی لکھنوی : التعلیقات السنیہ، قاہرہ ۱۳۲۴ھ ؛ (۷) وہی مصنف : نزہۃ الخواطر، حیدر آباد دکن ۱۹۵۴ء ؛ (۸) وہی مصنف : الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، دمشق ۱۹۵۶ء ؛ (۹) مولوی رحمان علی : تذکرۂ علمائے ہند، (اردو ترجمہ)، کراچی ۱۹۶۶ء ؛ (۱۰) عبدالقادر العیدروس : النور السافر، بغداد ۱۹۳۴ء ؛ (۱۱) ابن العماد الحنبلی : شذرات الذہب، قاہرہ ۱۳۵۱ھ ؛ (۱۲) شیخ عبدالحق : اخبار الاخیار، (اردو ترجمہ)، کراچی، تاریخ ندارد ؛ (۱۳) مفتی غلام سرور لاہوری : خزینۃ الاصفیاء، لاہور ۱۲۸۲ھ ؛ (۱۴) علی محمد خان : مرآۃ احمدی، کلکتہ ۱۹۲۸ء ؛ (۱۵) فقیر محمد جہلمی : حدائق الحنفیہ، لاہور، تاریخ ندارد ؛ (۱۶) سرکیس : معجم المطبوعات، قاہرہ ۱۹۲۸ء ؛ (۱۷) براکلمان، .A. G. L، مع تکملہ بامداد اشاریہ، لائیڈن ۱۹۳۷ء ؛ (۱۸) حاجی خلیفہ : کشف الظنون، استانبول ۱۹۴۳ء ؛ (۱۹) اسماعیل پاشا البغدادی : ایضاح المکنون، استانبول ۱۹۴۵ء ؛ (۲۰) خیر الدین زرکلی : الاعلام، قاہرہ ۱۹۶۶ھ ؛ (۲۱) عمر رضا کحالہ : معجم المؤلفین، دمشق ۱۹۶۶ھ ؛ (۲۲) فہرس الکتبخانۃ الخدیویۃ، قاہرہ ۱۳۰۵ھ ؛ (۲۳) تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند، ۲ : ۲۴۲-۲۴۳، لاہور ۱۹۷۲ء۔

(ظہور احمد اظہر)

قاضی محمد عاقلؒ : فاروق النسب ⊛ ہیں۔ فتح سندھ کے بعد جب عرب یہاں آباد ہونے لگے تو ناصر بن عبداللہ بن عمرؓ کے پڑپوتے مالک بن یحییٰ بھی عساکر اسلامی کے ساتھ ادھر آ گئے۔ ان کی اولاد ملکی عہدوں پر فائز ہوتی رہی۔ سندھ میں رہنے والے عرب انھیں اپنا سردار سمجھتے تھے۔ مالک کی ساتویں پشت میں عیسٰیؒ بن یوسف نے فقر و تجرید اختیار کی۔ ان کے بعد اکثریت کا رجحان اسی طرف رہا۔ حضرت عیسٰی کی اولاد میں سے شیخ حسین ٹھٹھہ میں رکن سلطنت تھے۔ وہاں اب بھی ان کے آثار موجود ہیں لیکن شیخ حسین نے آخری عمر میں دولت و امارت چھوڑ کر سلسلۂ سہروردیہ میں بیعت کر لی اور مخدوم کہلانے لگے۔ ان کے ورثا میں سے مخدوم نور محمد سے ارادت خان وزیر شاہجہان کی بیعت تھی۔ شاہجہان نے ایک فرمان کے ذریعے مخدوم نور محمد کو پانچ ہزار بیگھہ اراضی سنگلوٹ علاقہ ملتان میں دی جہاں ان کے والد مخدوم محمد زکریا بعہد جہانگیر آ کر آباد ہو گئے تھے۔ فرمان میں مخدوم نور محمد کو "پیر و مرشد طریقت، ہادیٔ راہ حقیقت، رہبر راہ شریعت و معرفت، غواص بحر عرفان، زبدۂ خدا پرستان کہا گیا ہے" [مناقب فریدی، ص ۳۶-۴۷]۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مخدوم صاحب کو علم و فضل، زہد و

عبادت اور فقر و تصوف کے لحاظ سے ممتاز درجہ حاصل تھا۔ اردن میں ان کے نام کے ساتھ کوریجہ کا لقب بھی ہے جس کا مطلب ہے "کوزے ! اذان دے"۔ ایک موقع پر ان کے ایک بزرگ نے کوزے کو سندھی زبان میں یہ حکم دیا تھا اور اس وقت سے ان کا یہ خاندانی لقب مشہور ہو گیا۔ مخدوم نور محمد کوریجہ کے فرزند مخدوم محمد یعقوب تھے، جن کے پوتے قاضی محمد عاقل ؒ ہیں۔ سطور بالا سے واضح ہوتا ہے کہ قاضی محمد عاقل کو عالی ہمتی اور ظرف کی بلندی کے اوصاف ورثے میں ملے تھے۔ ان کے علمی مرتبہ کی بنا پر ان کو قاضی کہتے تھے۔ ان کے والد مخدوم محمد شریف بڑے مرتاض بزرگ تھے اور زہد و ورع اور قناعت و توکل میں یگانۂ روزگار سمجھے جاتے تھے۔ مناقب المحبوبین کے صفحہ ۱۱۹ پر درج ہے کہ وہ عالم با عمل اور صاحب برکت تھے۔ سنکوٹ کو ترک کر کے انہوں نے دریائے سندھ کے کنارے یاراوالی میں سکونت اختیار کی جہاں ان کے ارادت مندوں کی بڑی تعداد ہو گئی اور جب ان کے عقیدت مند مٹھن خان بلوچ رئیس یاراوالی نے لب دریا ایک پر فضا مقام پر مٹھن کوٹ آباد کیا تو وہ بھی وہاں منتقل ہو گئے۔ تکملہ سیر الاولیاء میں لکھا ہے [ص ۱۲۹] کہ وہ محدث دوراں تھے۔ انہوں نے اپنے فرزند قاضی محمد عاقل کو خود تعلیم دی۔ محمد عاقل نے کم عمری میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ حافظے کی یہ حالت تھی کہ جزوی مسائل تک صحت اور حوالے کے ساتھ ان کو یاد رہتے تھے۔ تحصیل علم کے بعد ان کے دل میں آیا کہ اصلاح باطن اور تزکیۂ نفس کے لیے مرشد کامل کی تلاش کی جائے۔ ان کے والد بھی با کمال بزرگ تھے، لیکن قاضی محمد عاقل ایک بلند پرواز عارف کامل سے نسبت قائم کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ اور ان کے بھائی میاں نور محمد دونوں خواجہ نور محمد مہاروی ؒ (م۔ ۱۷۹۱ء) کے مرید ہوئے جو مہار شریف ریاست بہاولپور میں ارباب چشت کے روحانی فیض کو بڑے کھلے دل سے عام کر رہے تھے۔ خواجہ مہاروی ؒ سے انہوں نے حدیث کی سند بھی لی۔ ان کے ہمراہ وہ دہلی میں خواجہ فخر الدین ؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے شرح عبدالحق اور سواء السبیل کا درس لیا۔ فیضان باطنی حاصل کرنے کے علاوہ ان سے مسائل تصوف بھی سمجھے۔ آخری بار جب خواجہ فخرالدین دہلوی ؒ نے ان کو رخصت کیا تو انہیں چار کتابیں عطا فرمائیں۔ ایک تو شیخ عبدالقدوس گنگوہی ؒ کے مکتوبات تھے جن پر خواجہ صاحب کے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا حاشیہ تھا۔ ایک کتاب مطول تھی اور ایک سواء السبیل۔ چوتھا ایک مجموعہ تھا جس میں لوائح جامی، شرح رباعیات جامی وغیرہ تھی [مناقب المحبوبین، ص ۱۲۱]۔ بیعت کے بعد قاضی صاحب نے سخت مجاہدات کیے۔ ذکر جہر ان کا محبوب وظیفہ تھا۔ ان کے ذکر کی آواز دور دور تک جاتی تھی۔ انہوں نے مجاہدہ حبس دم کو بھی کمال تک پہنچایا۔ کہا جاتا ہے کہ ان مجاہدات کا یہ اثر تھا کہ ان کا پچھلی عمر میں سایہ نہ تھا اور دھوپ اور چاند کی چاندنی میں وہ باہر نہیں نکلتے تھے تاکہ لوگوں سے یہ راز پوشیدہ رہے۔ [ریاست بہاولپور کا گزیٹیئر بزبان انگریزی، ص ۱۸۰]۔ خواجہ غلام حیدر ؒ شاہ صاحب جلال پوری (م ۱۹۰۸ء) کا ایک ملفوظ ہے کہ جب حجرہ سے وہ ادائے نماز کے لیے مسجد میں تشریف لے جاتے تو کہا جاتا ہے کہ ایک ابر کا ٹکڑا ان کے سر پر سایہ کر لیتا [ذکر حبیب، ص ۱۸۰]۔ اتباع سنت کا خاص لحاظ تھا۔ ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ احکام شریعت اور

سنت نبوی پر پورا پورا عمل کیا جائے چنانچہ ان کے آخری ایام تھے کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ و سلم نے ان کو خواب میں فرمایا : تو مارا بسیار خوش کردی کہ همگین منتهائے ما را زنده کردی [مناقب المحبوبین ، ص ۱۲۲] ۔ عبادت اور ریاضت کے اوقات کی قاضی صاحب سختی سے پابندی کرتے تھے ۔ لباس عمدہ اور لطیف پہنتے تھے ۔ کھانا بہت کم مقدار میں کھایا کرتے ۔ ہر ایک سے خوش اخلاق اور خندہ روئی سے پیش آتے ۔ ہر ایک سمجھتا جس قدر نوازش مجھ پر ہے کسی پر نہیں ۔ خلافت ملی تو عجز و انکسار کی بنا پر کچھ عرصہ تک سلسلہ کی اشاعت کی طرف توجہ نہ کی لیکن جب خواجہ مہارویؒ نے سختی کے ساتھ لکھا کہ فیض عام کریں اور خلق خدا کو داخل سلسلہ کریں تو انھوں نے ارشاد و تلقین کی طرف خاص توجہ دی اور لوگ ہزاروں کی تعداد میں حاضر ہونے لگ گئے ۔ ان کے لنگر سے کھانا کھانے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوا کرتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا شاهنشاهی لنگر ہے ۔ پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ کتنے لوگ آئے اور کتنا کھانا پکا ۔ بے شمار لوگوں نے ان کی تاثیر سے محبت الٰہی اور متابعت رسول صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کا جذبہ اپنے دلوں میں پیدا کیا ۔ مناقب المحبوبین میں درج ہے : ہزار ہا مخلوق از دروازہ ایشان فیض یاب شدند و صدها صاحب خانقاه ها از ایشان مبعوث شدند [ص ۱۲۳] ۔ خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ پنجاب کے نہایت ہی دور افتادہ اور غیر معروف علاقوں میں ان کی کوششوں سے مذہبی اور روحانی تعلیم کا چرچا ہو گیا [تاریخ مشائخ چشت ، ص ۵۷۵] ۔ انھوں نے کوٹ مٹھن میں ایک اعلی درجے کا دینی مدرسہ بھی کھول رکھا تھا جس میں مشکوٰۃ شریف ، احیاء العلوم ، صحیح بخاری ، لوائح و شرح قصیدہ ، سواء السبیل ، تسنیم ، فصوص الحکم ، شرح وقایہ مع حواشی ، ہدایہ ، شرح مواقف ، شرح ہدایۃ الحکمۃ ، میر ہاشم ، شرح عقاید خیالی ، مطول وغیرہ کتابوں کا درس دیا جاتا تھا ۔ جید علماء باقاعدگی سے درس و تدریس کا کام کرتے تھے ۔ وہ خود بھی سو سے زیادہ طالب علموں کو درس دیتے تھے ۔ ڈیڑھ پہر دن باقی ہوتا تھا تو ان کا حلقہ درس شروع ہو جاتا تھا ۔ اس طرح ارشاد و تلقین اور درس و تدریس سے انھوں نے اپنے پیر و مرشد خواجہ نورمحمد مہارویؒ کی تحریک احیاء واصلاح کو بہت آگے بڑھایا ۔ دور دور تک ان کے علم و فضل اور کمالات باطنی کی شہرت پہنچی ۔ اکبر شاہ ثانی نے شاهزادہ جہان خسرو اور کاوس شکوہ کو ان کا مرید کرایا ۔ بہادر شاہ ظفر کو بھی ان سے بڑی عقیدت تھی ۔ ۸ رجب المرجب ۱۲۲۹ھ مطابق ۲۶ جون ۱۸۱۴ء کو چار ماہ کی علالت کے بعد انھوں نے وصال فرمایا اور مٹھن کوٹ میں دفن ہوئے ۔ ان کے صاحبزادے میاں احمد علی سجادہ نشین بنے جو ان کے ساتھ آسودہ ہیں ۔ میاں احمد علی کے فرزند میاں خدا بخش مٹھن کوٹ کو چھوڑ کر چاچڑاں شریف ریاست بہاولپور میں رہنے لگے ۔ ان کے بیٹے خواجہ غلام فریدؒ (م ۱۹۰۱ء) ایسے عارف کامل ہوے ہیں کہ نواب بہاولپور ان کی گاڑی کھینچنا اپنے لیے موجب برکت سمجھتے تھے ۔ یہ وہی خواجہ غلام فریدؒ ہیں سرائیکی زبان میں جن کی کافیاں دلوں کو تازگی بخشتی ہیں ۔

مآخذ : (۱) ملک محمد الدین : ذکر حبیب ، منڈی بہاء الدین ، ضلع گجرات : (۲) نجم الدین چشتی : مناقب المحبوبین ، مطبع حسنی : (۳) خلیق احمد نظامی : تاریخ مشائخ چشت ، ندوۃ المصنفین، دهلی : (۴) بہاولپور سٹیٹ گزیٹیر (انگریزی) ۱۹۰۴ء ، مطبوعہ لاهور ۱۹۰۸ء : (۵) تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند ،

تیرھویں جلد، لاہور ۱۹۷۱ء[عبدالغنی رکن ادارہ نے لکھا]

(ادارہ)

⊛ **مفتی، سید محمد عباس:** (شمس العلماء) ابن سید علی اکبر موسوی جزائری شوستری، ایران کے مشہور محدث، فقیہ، ادیب نعمت اللہ جزائری (م ۱۱۱۲ھ) کی اولاد سے تھے۔ ربیع الاول ۱۲۲۴ھ مارچ ۱۹۰۸ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ خدا داد ذہانت، تقدس و پرہیزگاری کے ساتھ علم کی لگن اور ادب کے ذوق سے سرشار تھے۔ لکھنؤ کے علم پرور ماحول سے محمد عباس کو بچپن ہی میں شہرت حاصل ہوئی۔ بارہ سال کی عمر میں اردو مثنوی "بنیاد اعتقاد" اور چودہ سال کی عمر میں فارسی مثنوی "من و سلویٰ" لکھی جو ایک صدی تک بے حد مقبول رہیں۔ اٹھارہ سال کی عمر میں معقولات و منقولات پر مکمل دسترس حاصل کی۔ وہ وطن سے کبھی باہر نہیں گئے۔ اس کے باوجود عربی و فارسی عربوں اور ایرانیوں کی طرح بولتے اور لکھتے تھے۔ منبر پر برجستہ اور فی البدیہہ خطبے ارشاد کرتے۔ اردو، فارسی اور عربی میں شعر کہنے میں انھیں بڑی دسترس تھی۔ قطعات تاریخ اور تاریخی نام تجویز کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اپنے استاد سید العلماء سید حسین (م ۱۲۷۳ھ) سے مثالی عقیدت رکھتے تھے۔ اوراق الذہب اور رطب العرب میں جس ادب و احترام سے استاذ کا ذکر کیا ہے، وہ مشرق ادب میں نادر اور توجہ طلب ہے۔ نوجوانی میں وہ استاذ کے معاون، فتویٰ نویس، خطوط کا جواب دینے والے ماہر تھے۔ مدرسے میں مدرس، مسجد میں عابد و خطیب، گھر میں مصنف و شب بیدار تھے۔ سادہ مزاج، خوش اخلاق، کثیر الاحباب، کثیر التالیفات سخی اور فقیر منش بزرگ تھے، زبان میں تاثیر اور بات میں اثر تھا۔ صبر، بذلہ سنجی، مزاح، حاضر جوابی اور علمی وقار نے خاص و عام میں بڑی محبوبیت بخشی تھی۔

سلطان العلماء سید محمد (م ۱۲۸۴ھ) اور سید العلماء سید حسین (م ۱۲۷۳ھ) دونوں ان سے محبت کرتے اور ان کے مرتبہ کا احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ سلطان العلماء نے فقہی تبحر و مہارت کی بنا پر ۱۲۶۱ھ میں انھیں لکھنؤ کا مفتی یا قاضی شرع مقرر کیا تھا۔ بادشاہ اودھ نے "تاج العلماء، افتخار الفضلا" کے لقب سے ملقب کیا۔ مفتی صاحب نے مملکت کے لیے "دستور و قانون قضا" تحریر کیا جو اودھ کے تمام قاضیوں کو بھیجا گیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں مفتی صاحب کی یہ وقیع قانونی دستاویز ضایع ہوگئی۔ وہ لکھنؤ کی تباہی سے مشکلات میں گرفتار ہوئے، کتابخانہ لٹا، تصانیف تاراج ہوئیں، وطن میں رہنا دوبھر ہوگیا، کان پور بنارس، عظیم آباد اور کلکتے گئے، آخر دوبارہ لکھنؤ میں آ گئے۔ انتہائی پریشانی میں بھی تصنیف و تالیف سے دست کش نہ ہوئے۔ تفسیر میں "روائع القرآن" حدیث و مواعظ میں منابر الاسلام (عربی) کی یہ دونوں، فقہ پر سادہ اور مدلل کتابیں ہیں۔ انھوں نے شرحیں اور حاشیے بھی لکھے۔ "شریعت غرا" اور "حاشیہ شرح لمعہ" راقم الحروف کے کتاب خانے میں بھی ہیں۔ لسان الصباح ہیئت و بحث اوقات نماز پر بڑا نفیس مطبوعہ رسالہ ہے۔ عربی نظم و نثر میں وہ یکتائے روزگار تھے۔ معاصر عرب ادیب انھیں بڑے احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ روائع القرآن کی خوبی یہ ہے کہ جس آیت کی تفسیر لکھی ہے اسی کے ردیف و قافیہ و اسلوب کو سامنے رکھ کر عربی لکھی ہے مثنوی المرصع، تجنیس اور حسن لفظی و معنوی کا مجموعہ ہے۔ اوراق الذہب، منابر الاسلام، دیوان رطب العرب، برصغیر کی عربی انشا پردازی و شاعری کی قابل قدر کتابیں ہیں۔

مفتی موصوف کے عرب، ایران اور بر صغیر کے علما و اکابر سے وسیع روابط تھے۔ ان کی تالیفات میں ایسے حوالے بکثرت موجود ہیں جن کی روشنی میں انہیں اپنے عہد کا عبقری مانا جاتا تھا۔ انہوں نے اسی برس کے قریب عمر پائی اور کم از کم دو سو کتابیں تصنیف کیں جن میں سے سو سے زیادہ رسالے اور کتابیں چھپ چکی ہیں اور مرتب و مکمل باقی کتابوں کی فہرست مرزا محمد ہادی عزیز نے "تجلیات" میں درج کی ہے، جن میں ان کے نوٹ اور نا مکمل مسودے تھے۔ ان میں لغت، صرف و نحو، حدیث و تفسیر کے بارے میں بہت کچھ جمع تھا۔ سردست ان کتابوں کی فہرست لکھتا ہوں جو راقم الحروف کے کتاب خانے میں موجود ہیں:

(۱) روائع القرآن، عربی، طبع لکھنؤ؛ (۲) منابر الاسلام، دو مجلد عربی، طبع لکھنؤ؛ (۳) تعلیقہ انیقہ، حاشیہ شرح لمعہ، عربی، طبع لکھنؤ؛ (۴) الشریعۃ القراء، دو مجلد، عربی، طبع عظیم‌آباد؛ (۵) لسان الصباح، عربی رسالہ، وقت نماز صبح پر بحث، طبع لکھنؤ؛ (۶) رطب العرب، عربی دیوان، طبع لکھنؤ؛ (۷) الشعلۃ الجوالہ، عربی، طبع لکھنؤ؛ (۸) مثنوی المرصع، اجناس الجناس، عربی فارسی، طبع لکھنؤ: (۹) ریاحین الانشاء، فارسی، انشاء مکاتیب، طبع لکھنؤ؛ (۱۰) بیت الحزن، فارسی مثنوی، طبع لکھنؤ؛ (۱۱) آب زلال، فارسی مثنوی، طبع لکھنؤ؛ (۱۲) نان و حلوی، فارسی مثنوی، طبع لکھنؤ؛ (۱۳) بنیاد اعتقاد، اردو مثنوی، طبع لکھنؤ؛ (۱۴) ید بیضا، عربی و فارسی، قصیدہ و شرح، طبع لکھنؤ۔

مفتی موصوف نے ۲۵ رجب ۱۳۰۶ھ/۲۷ مارچ ۱۸۸۹ء کو رحلت کی۔

مآخذ: (۱) محمد ہادی عزیز: تجلیات، مخدوم سوانح، طبع لکھنؤ؛ (۲) عبدالحی: نزہۃ الخواطر، ج ۸، طبع حیدرآباد دکن؛ (۳) محمد [illegible] بے بہا، دہلی؛ (۴) آغا بزرگ طہرانی: الذریعہ؛ [illegible] مصنف، مصفی المقال فی مصنفی علم الرجال؛ (۶) [illegible] حسین فاضل: غالب اور مفتی محمد عباس، مشمولۂ نگار لکھنؤ، ۱۹۵۱ء؛ (۷) عبدالرؤف: بزم غالب، کراچی ۱۹۶۹ء۔

(مرتضی حسین فاضل)

محمد عبدالکریم (منشی): انیسویں صدی کے وسط کا ایک فارسی مؤرخ۔ ان کی سکونت لکھنؤ (تاریخ پنجاب، ص ۹۲) یا کانپور (محاربہ: ص ۳) میں رہی ہوگی۔ انہیں تاریخ کے مطالعہ کا بہت شوق تھا، اس لیے سیوطی کی تاریخ الخلفاء اور تاریخ مصر کا عربی زبان سے فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کے علاوہ تاریخ ابن خلکان کا خلاصہ بھی فارسی زبان میں مرتب کیا۔ انگریزی زبان سے علم نجوم اور جغرافیہ کی تصانیف کا ترجمہ فارسی اور اردو میں کیا۔ کہانیوں کی کتابوں الف لیلہ و لیلہ (مکمل) تاریخ بنگال، اور دیگر مفید اور نادر رسائل کا انگریزی زبان سے ترجمہ کیا (Dict. Orient. Biogr.)۔ ۱۸۵۱ء کے اواخر میں ان کی وفات ہوئی۔

ان کی فارسی کی تین حسب ذیل کتابیں جو ان کے عصر کی تاریخ سے متعلق ہیں، طبع ہو چکی ہیں۔

۱۔ محاربۂ کابل و قندھار: طبع سنگی، لکھنؤ ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۸ء اور کانپور ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء۔ اس میں جنگ افغان سے متعلق جنرل پولک کی مہم (ستمبر۔ اکتوبر ۱۸۴۲ء) تک کا ذکر ہے۔

۲۔ تاریخ پنجاب: تحفۃ الاحباب (یا تحفۂ احباب)، طبع سنگی، طبع محمدی (غالباً لکھنؤ)، ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۹ء، اس میں انگریزوں اور سکھوں

کی لڑائیوں کا تذکرہ ہے ، اس کتاب کو دو "حملوں" میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ پہلے حملے کا تعلق سکھوں کی پہلی لڑائی سے اور دوسرے کا سکھوں کی دوسری لڑائی سے ہے (۱۲۶۵-۶۶ھ/ ۱۸۴۸-۴۹ء).

اس تصنیف کا دار و مدار انگریز افسروں کے بیانات اور ان تذکروں پر ہے جو اس زمانے کے اخبارات میں شائع ہوئے اور جن کا باقاعدہ مقابلہ کر لیا گیا ہے ۔ اس تصنیف میں کچھ عجیب و غریب دستاویزات بھی موجود ہیں ، مثلاً سکھوں کے عہد میں پنجاب کے مالیات کا گوشوارہ، انگریزوں اور سکھوں کے درمیان جو عہد نامے ہوئے ، ان کا متن ، انگریزوں کے ان سرکاری اعلانات کے متون یا ان کا خلاصہ جو انھوں نے پنجاب میں اس زمانہ میں نشر کیے اور سکھوں کی توپوں پر کندہ کیے ہوئے کتبوں کی نقل وغیرہ.

۳۔ تاریخ احمد (یا تاریخ احمد شاہی)، طبع لکھنؤ ۱۲۶۶ھ/ ۱۸۵۰ء ؛ اس تصنیف کے مخطوطوں کے لیے دیکھیے (Storey، ۲ : ۴۰۳) نیز دیکھیے شجاع الملک درانی کی تاریخ جس نے لدھیانہ سے روانہ ہو کر اپنے بزرگوں کا تاج و تخت ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء میں انگریزوں کی مدد سے دوبارہ حاصل کیا ۔ تاریخ مکمل کرنے کے بعد مصنف نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ درانیوں کی مکمل تاریخ لکھے گا ۔ ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء تک کے واقعات کے لیے (زمان شاہ کے عہد سلطنت کے نصف تک) اس نے حسین شاہی یا تاریخ حسینی کا تتبع کیا جس کا مصنف امام الدین تھا ، جو افغانستان میں مدت دراز تک مقیم رہ چکا تھا (اس کے لیے دیکھیے Rieu: *Cat. Per. Mss British Museum*، ۳: ۹۰۴ ب) اس کے بعد کے واقعات کی بہت ہی مختصر تاریخ جس میں اس خاندان کے زوال تک کا حال ہے ، ان اطلاعات پر مبنی ہے جو مصنف کو ان باخبر قابل اعتماد اور صادق القول اشخاص سے ملنے والوں سے حاصل ہوئیں جو اس کے پاس کابل قندھار اور گرد و نواح کے علاقوں سے آیا جایا کرتے تھے (تاریخ احمد شاہی، ص ۳، ۵۱)۔ ابدالیوں کا شجرۂ نسب بیان کرنے کے بعد وہ احمد شاہ اور اس کے جانشینوں کے تاریخی حالات بیان کرتا ہے ۔ کتاب کے ربع آخر میں زمان شاہ کے امراء پنجاب کے حالات اور کابل، قندھار ، ہرات ، چشت (مع فہرست مزارات اولیائے چشت) کی شاہراہ کی مختلف منازل سفر کا ذکر ہے اور ایک باب ترکستان اور وہاں کے والی نربوتہ بے کے حالات کے لیے مخصوص ہے ۔ آخری واقعہ جو اس کتاب میں مذکور ہے ، وہ شجاع الملک کی موت اور افغانستان سے انگریزی فوج کی واپسی کا ہے اور اسی کے ساتھ پاینده خان کے ۱۷ بیٹوں کے ناموں کی فہرست بھی منسلک کر دی گئی ہے.

یہ کتاب اور محاربہ افغانستان کی تاریخ سراج التواریخ (کابل ۱۳۳۷ھ) جو امیر حبیب اللہ خان کے حکم سے مرتب کی گئی اس کے بنیادی مآخذ ہیں .

تاریخ احمد شاہی کا اردو ترجمہ میر وارث علی سیفی نے واقعات درانی کے نام سے کیا تھا جس کی طباعت کانپور میں ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں ہوئی ۔ E. Edwards : *Catalogue of the Persian Books in the British Museum* (لنڈن ۱۹۲۲ء)، ص ۲۱ میں ایک لغت کی کتاب موسومہ "*A dictionary of Anglo-Persian homogeneous words. Illustrated with 1001 gems of Persian Poetry . . . Together with Bait Bazi*" بھی اسی مصنف کی طرف منسوب کرتا ہے .

مآخذ : (۱) Storey : *Persian Literature* ،

(لنڈن ۱۹۳۶ء) Section II Fasciculus 2، ص ۳۰۲ تا ۳۰۳، Iasic ص ۳ و ۲۶۳: (۲) O. Mann: Quellen-studien Zur Geschichte des Ahmad Shah Durrani، در Z.D.M.G.، ۵۲ (۱۸۹۸ء)، ص ۱۰۶ ببعد؛ (۳) Ch. Schefer کی تصنیف Histoire de l'Asie Centrale par Mir Abdul Karim Boukhary، پیرس ۱۸۷۶ء، ص ۲۸۰ ببعد کے ایک باب زیر عنوان ترکستان کا فرانسیسی ترجمہ۔

(محمد شفیع)

⊛ **محمد عبدُہ (مفتی)**: مصر کے مشہور مفکر اور مصلح عالم جن کے افکار و نظریات نے ساری دنیائے اسلام کو متاثر کیا۔ محمد عبدُہ مصری کسانوں کے متوسط الحال خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد عبدہ ابن حسن خیر اللہ ترکی النسل تھے جب کہ ان کی والدہ کا سلسلہ نسب خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ تک منتہی ہوتا ہے۔ ان کا کنبہ مصر کے صوبہ بحریہ کے ایک گاؤں محلات نصر میں آ کر آباد ہو گیا تھا۔ محمد عبدہ ۱۸۴۹ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے معمولی نوشت و خواند کے بعد بارہ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ اس کے بعد دینی تعلیم کی تحصیل کے لیے طنطا کی احمدی مسجد میں بھیجے گئے، لیکن یہاں فرسودہ طریقہ تعلیم کی وجہ سے ان کا دل نہ لگا اور ڈیڑھ برس کے بعد اپنے گاؤں چلے آئے اور شادی کر لی۔

محمد عبدُہ واپس آ کر کھیتی باڑی میں لگ گئے۔ یہاں اتفاق سے ان کی ملاقات شیخ خضر درویش سے ہوئی جو ان کے والد کے خالو تھے۔ شیخ خضر درویش نے طرابلس الغرب کا سفر کیا تھا اور سنوسی طریقے کے ایک بزرگ سید محمد المدنی سے علمی استفادہ کرنے کے بعد سلسلہ شاذلیہ میں بیعت کر لی تھی۔ انھوں نے محمد عبدُہ کو قرآن مجید کے چند اسباق بھی اپنے طریقے پر پڑھائے اور انھیں تلقین کی کہ وہ خود کو عوام سے علیحدہ نہ سمجھیں بلکہ ان کے ساتھ گھل مل کر رہیں۔ شیخ درویش کی صحبت سے محمد عبدہ کو مزید تعلیم کے حصول کا شوق پیدا ہوا (محمد رشید رضا: تاریخ الاستاذ الامام الشیخ محمد عبدُہ، ۱: ۲۰ تا ۲۴، قاہرہ ۱۹۳۱ء).

محمد عبدہ دوبارہ جامع احمدی (طنطا) چلے آئے، لیکن وہ جلد ہی قاہرہ کی مشہور دینی درسگاہ جامع الازہر میں منتقل ہو گئے۔ الازہر کے نصاب تعلیم میں زندگی کی روح مفقود تھی۔ درس میں متن کتاب کی شرح ہوتی، شرح کا حاشیہ ہوتا اور حاشیہ پر تقریر ہوتی، طلبہ کی توجہ فقروں کی نحوی تحلیل اور لفظی بحث پر مرکوز رہتی، تاریخ، جغرافیہ اور سائنسی علوم کی کتابوں کا گزر نہ تھا۔ اساتذہ میں مستثنٰی شخصیت شیخ حسن الطویل کی تھی، جو قدیم فلسفہ اور ہندسہ کی تعلیم دیتے تھے۔ شیخ حسن الطویل کی مجالس درس نے شیخ محمد عبدہ کے شوق علم میں اضافہ کیا، لیکن انھیں علمی اور فکری غذا سید جمال الدین افغانی [رک باں] کے فیض صحبت سے ملی (احمد امین: زعماء الاصلاح فی عصر الحدیث، ص ۲۸۵ تا ۲۹۱، قاہرہ ۱۹۴۸ء).

سید افغانی کے فیض صحبت سے شیخ محمد عبدُہ نے قوم کی خدمت کا بے پناہ جذبہ پایا، دینی، خلقی اور اجتماعی اصلاح کا شوق پیدا ہوا اور قرآن مجید کی تفہیم و تفسیر کو مقصد زندگی بنا لیا (Charles Adams: *Islam and Modernism in Egypt*، ص ۳۳، لنڈن ۱۹۳۳ء)۔ بالآخر شیخ محمد عبدُہ نے ۱۸۷۷ء میں الازہر سے سند عالمیت حاصل کر کے الازہر ہی میں پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ الازہر میں منطق، فلسفہ اور توحید کی تعلیم اور گھر میں

بعض طلبہ کو ابن مسکویہ کی تہذیب الاخلاق کا درس دیتے اور چند شوقین طلبہ کو ایک فرانسیسی مصنف اور وزیر Guizot کی تاریخ تمدن یورپ (عربی ترجمہ) بھی پڑھاتے۔ ۱۸۷۸ء میں وہ دارالعلوم مصریہ میں تاریخ کے استاد مقرر ہوئے تو انھوں نے مقدمہ ابن خلدون پر کئی خطبات دیے اور طلبہ کو قوموں کے عروج و زوال کے فلسفہ سے آشنا کیا۔

اسی زمانے میں وہ مدرسة السنة میں عربی زبان و ادب کے معلم مقرر کیے گئے۔ انھوں نے طلبہ میں زبان اور ادب کا صحیح مذاق پیدا کرنے کے علاوہ مضمون نگاری کی مشق بھی کرائی تا کہ مصریوں کی نوجوان نسل عربی زبان اور علوم اسلامیہ کا احیا کرے اور مصری حکومت کی بے راہ روی کی اصلاح کرے (محمد رشید رضا: تاریخ الاستاذ الامام الشیخ محمد عبدہ، ۳: ۲۳، مطبوعہ قاہرہ)۔ شیخ محمد عبدہ اپنے علمی و تعلیمی مشاغل میں مصروف تھے کہ اچانک خدیو مصر رفیق پاشا نے سید جمال الدین افغانی کو ملک بدر کر دیا اور محمد عبدہ کو ملازمت سے برطرف کر کے ان کے گاؤں میں نظر بند کر دیا (ستمبر ۱۸۷۹ء)۔ ان کی برطرفی کی بڑی وجہ ان کے سیاسی مقالات اور ترقی پسندانہ خیالات تھے۔

خدیو کے محولہ بالا سخت گیر اقدام کے وقت روشن خیال وزیر اعظم ریاض پاشا مصر سے باہر تھے۔ جب بعد میں وہ واپس آئے تو انھوں نے شیخ محمد عبدہ کو حکومت مصر کے سرکاری اخبار الوقائع المصریہ کے عملہ ادارت میں شامل کر لیا اور تھوڑی مدت کے بعد وہ چیف ایڈیٹر بنا دیے گئے۔ اس کے علاوہ انھیں تمام اخبارات کا سنسر آفیسر بھی مقرر کر دیا گیا۔ اب سرکاری خبروں کے علاوہ الوقائع المصریہ میں ادبی، اجتماعی اور اصلاحی مقالات شائع ہونے لگے۔ شیخ محمد عبدہ کے خیال میں مصری قوم کی اصلاح نظام تعلیم کی بہتری سے ہوسکتی تھی۔ انھوں نے رائج الوقت خلاف شرع رسوم و رواج کی اصلاح کی کوشش کی، ان کے نقد و احتساب سے سرکاری محکمے بھی نہ بچ سکے۔ اخبار کے ذریعے ان کا سب سے بڑا کارنامہ مصریوں کے جذبہ حب الوطنی کو بیدار کرنا اور ان میں حقوق طلبی کا داعیہ پیدا کرنا تھا۔ (*Muhammad Abduh* : Osman Amin، ص ۲۵ تا ۳۴، میشی گن ۱۹۵۳ء)۔

شیخ محمد عبدہ اپنے علمی اور اصلاحی مشاغل میں مصروف تھے کہ عرابی پاشا [رک بآں] کی شورش نے ملک میں ہیجان پیدا کر دیا۔ اس شورش کے شروع میں شیخ محمد عبدہ اس سے الگ تھلگ تھے، لیکن جب حریت پسندوں نے نمائندہ حکومت کے قیام کا مطالبہ پیش کر دیا اور یہ تحریک انگریزوں کے مقابلے میں قومی تحریک بن گئی تو وہ بھی اس کے حمایتی بن گئے۔ اس تحریک کا انجام ناکامی اور انگریزوں کے تسلط سے ہوا۔ اس میں شرکت کے الزام میں شیخ محمد عبدہ تین سال کے لیے ملک بدر کر دیے گئے اور ۱۸۸۳ء میں وہ بیروت چلے گئے (محمد رشید رضا: تاریخ الاستاذ الامام الشیخ محمد عبدہ، ۱: ۲۹۶، قاہرہ ۱۹۳۱ء)۔

شیخ محمد عبدہ کو بیروت آئے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ پیرس سے سید جمال الدین افغانی کا دعوت نامہ ملا۔ انھوں نے پیرس جا کر سید افغانی سے مل کر العروة الوثقٰی نکالنا شروع کر دیا (۱۸۸۴ء)۔ العروة الوثقٰی کا مقصد صحیح دینی عقائد کی اشاعت کے علاوہ تمام مسلم ممالک میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنا، قرآن کے فہم کی

دعوت دینا اور خلافت راشدہ کے نمونے پر اسلامی حکومت کا قیام تھا ۔ اس اثنا میں وہ لندن بھی گئے ، انگریز مدبروں اور پارلیمنٹ کے ممبروں سے مصر اور سوڈان کے مسائل پر گفتگو کی اور مصریوں کا نقطہ نظر واضح کیا ، لیکن گفت و شنید بے نتیجہ رہی اور شیخ محمد عبدہ خالی ہاتھ واپس لوٹے ۔ آٹھ ماہ میں العروۃ الوثقی کے اٹھارہ شمارے نکلے تھے کہ انگریزوں نے اخبار کا داخلہ مصر اور ہندوستان میں بند کر دیا ، اس لیے اخبار بند کرنا پڑا ۔ سید جمال الدین افغانی نے ایران کا رخ کیا اور شیخ محمد عبدہ بیروت چلے آئے (احمد امین : زعماء الاصلاح فی عصر الحدیث ، ص ۳۰۵ تا ۳۰۷ ، قاہرہ ۱۸۴۸ء).

شیخ محمد عبدہ نے قیام بیروت کا یہ زمانہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزارا ۔ وہ بیروت کی دو مسجدوں میں قرآن مجید کا درس دیتے اور مدرسہ سلطانیہ میں معلمی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے ۔ انھوں نے فارغ اوقات میں نہج البلاغۃ اور مقامات بدیع الزمان کی شرحیں لکھیں ، سید افغانی کے فارسی رسالہ رد الدھریین کا عربی میں ترجمہ کیا ، گھر میں بھی ان کے علمی فیض کا چشمہ جاری رہتا جس سے مسلمان اور عیسائی یکساں طور پر مستفید ہوتے ۔ اس زمانے کے شاگردوں میں امیر شکیب ارسلان [رک باں] کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے (شکیب ارسلان : حاضر العالم الاسلامی ، ۱ : ۲۸۳ ، قاہرہ ۱۳۵۲ھ).

تقریباً ساڑھے تین سال کی جلا وطنی کے بعد متعدد با رسوخ اشخاص کی سفارش اور برطانوی ہائی کمشنر کی مداخلت سے خدیو توفیق پاشا نے شیخ کو وطن آنے کی اجازت دے دی ، چنانچہ ۱۸۸۸ء کے اواخر میں وہ مصر واپس آ گئے اور انھیں ابتدائی دیوانی عدالتوں کا قاضی مقرر کر دیا گیا ۔ جب وہ عابدین میں قاضی تھے اور ان کی عمر بھی چالیس برس سے متجاوز ہو چکی تھی تو انھوں نے فرانسیسی زبان سیکھنی شروع کر دی ۔ اس وقت ابتدائی عدالتوں کا نظام عمل فرانسیسی قوانین پر مبنی تھا ، لہذا فرانسیسی سیکھے بغیر چارہ نہ تھا ۔ تھوڑے ہی عرصے میں انھوں نے فرانسیسی زبان میں کافی استعداد پیدا کر لی ۔ جب مشہور انگریز فلاسفر اور ماہر تعلیم ہربرٹ سپنسر کی کتاب *Education* کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوا تو انھوں نے اس ترجمے کو عربی زبان میں التعلیم کے نام سے منتقل کر دیا (*Muhammad Abduh* : Osman Amin ، ص ۳۴ تا ۳۷ ، مطبوعہ بمبئی گ ن).

شیخ محمد عبدہ کی زندگی کا بڑا مقصد مدرسۃ الازہر کی اصلاح و ترقی تھا ۔ چونکہ الازہر دنیائے اسلام کا علمی و دینی مرکز تھا ، اس لیے ان کا عقیدہ تھا کہ اگر الازہر کی اصلاح ہو گئی تو پورے عالم اسلام کی اصلاح ہو جائے گی ، اس لیے ان کا خیال تھا کہ اس مدرسہ کے بہتر انتظام ، نصاب درس میں توسیع اور بعض جدید علوم کے اضافے سے الازہر ساری دنیائے اسلام میں مرکز ہدایت بن جائے گا ۔ عباس حلمی کا زمانہ آیا تو شیخ محمد عبدہ نے الازہر کی اصلاح کا منصوبہ خدیو کی خدمت میں پیش کیا ، چنانچہ ۱۵ جنوری ۱۸۹۵ء کو ایک سرکاری فرمان کے ذریعے الازہر کے لیے انتظامی کمیٹی مقرر کر دی گئی ، جس کے روح رواں خود شیخ محمد عبدہ تھے ۔ اس انتظامی کمیٹی نے اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافہ کرایا ، تنخواہوں کی درجہ بندی کی ، ہر درجے کے لیے کتابیں مقرر کی گئیں ، طلبہ کی رہائش گاہوں میں صفائی اور روشنی کا بہتر انتظام کیا ، نصاب تعلیم میں حساب ، الجبرا ، تاریخ اسلام اور سائنسی مضامین شامل کیے گئے ، ادب کی تعلیم کے لیے الکامل (المبرد)

اور دیوان الحماسہ جیسی معیاری کتابیں داخل کی گئیں اور سب سے بڑھ کر طلبہ کو روزانہ حاضری اور سالانہ امتحان میں شامل ہونے کا پابند قرار دیا۔ اس کے علاوہ الازہر میں ایک شفاخانہ (ہسپتال) قائم کیا اور مدرسہ کے کتب خانے کو مرتب و منظم کیا گیا (محمد رشید رضا : تاریخ الاستاذ الامام الشیخ محمد عبدہ ، ۱ : ۳۲۸ ، ۳۲۹ ، ۳۳۲ ، ۳۵۱ ، ۳۵۵ ، قاہرہ ، ۱۹۳۱ء).

۳ جون ۱۸۹۹ء کو خدیو مصر نے شیخ محمد عبدہ کو مصر کا مفتی اعظم مقرر کر دیا۔ انھوں نے اس عہدے کو نیا وقار اور نئی اہمیت بخشی۔ مصر کے علاوہ ساری دنیائے اسلام سے ان کی خدمت میں استفتاء آتے تھے۔ ان میں تین فتوے بہت مشہور ہیں : ایک میں ہندوستانی مسلمانوں کے استفسار کے جواب میں عام مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے غیر مسلمانوں سے امداد و اعانت لینا مباح قرار دیا، دوسرے میں مسلمانوں کے لیے یہودیوں اور عیسائیوں کا ذبیحہ حلال بتایا، اسی طرح ڈاک خانوں کے سیونگ بنکوں کی امانتوں پر منافع وصول کرنا جائز بتایا (محمد رشید رضا : تاریخ الاستاذ الامام الشیخ محمد عبدہ ، ۱ : ۶۳۷ تا ۷۱۷ باختصار قاہرہ ۱۹۳۱ء.

شیخ محمد عبدہ مفتی مقرر ہونے کے بعد ۱۸۹۹ء میں مجلس وضع قوانین کے مستقل ممبر مقرر کیے گئے۔ وہ ایک قابل پارلیمانی خطیب، مجالس مذاکرت کے ماہر اور محتاط مشیر ثابت ہوئے۔ ۱۹۰۰ء میں وہ جمعیۃ الخیریۃ الاسلامیۃ کے صدر مقرر ہوئے۔ اس انجمن کے مقاصد میں امیروں کے دلوں میں خدمت خلق کا جذبہ پیدا کرنا، نادار مسلمانوں کو امداد دلانا، غربا کے بچوں کے لیے مدارس کا اہتمام کرنا تھا۔ اسی زمانے میں عربی زبان کی نادر اور اہم ترین کتابوں کی طباعت و اشاعت کے لیے انجمن لجنۃ الاحیاء علوم العربیہ کے نام سے مفتی محمد عبدہ کی صدارت میں قائم کی گئی۔ ان کی سعی بلیغ سے ابن سیدہ اندلسی کی مشہور عالم لغت المخصص سترہ جلدوں میں شائع کی گئی۔ اس کے بعد فقہ مالکی کی جلیل القدر کتاب المدونہ کی تصحیح کا کام شروع کیا گیا اور اس کے قلمی نسخے تونس اور فاس سے منگوائے گئے اور اسے چھاپ کر شائع کیا گیا۔ (*Islam and Modernism in Egypt* ; Charles Adams، ص ۸۲ تا ۸۵ لنڈن ۱۹۳۳ء).

دفاع اسلام : یورپ کے فضلا اور مصر کے عیسائی اہل قلم جب کبھی اسلام پر ناروا حملے کرتے تو وہ دین حق کی حمایت میں سینہ سپر ہو جاتے۔ فرانس کے وزیر خارجہ ہانوتو Hanotaux اور عربی مجلہ الجامع کے عیسائی مدیر فرح انطون نے علی الترتیب اسلام کے عقیدہ توحید اور مسلمانوں کی رواداری اور علم پروری کے خلاف مضامین لکھے تو شیخ محمد عبدہ نے ان معاندین اسلام کے نہایت مدلل جواب لکھے۔ بعد میں یہ جوابات الاسلام و النصرانیۃ مع العلم و المدنیہ کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے، اور سارے عالم اسلام کی زبانوں میں ان کے تراجم شائع ہوئے (*Muhammad Abduh* : Osman Amin، ص ۸۸-۸۹، مطبوعہ میشی گن).

۱۹۰۳ء میں شیخ محمد عبدہ نے انگلستان کا سفر کیا، آکسفوڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیاں دیکھیں اور وہاں کے نظام تعلیم کا مطالعہ کیا اور مشہور برطانوی ماہر تعلیم ہربرٹ سپنسر سے ملاقات کی۔ وہ ان کی شخصیت علم و فضل اور شیریں بیانی اور صداقت شعاری سے بڑا متاثر ہوا۔ انگلستان سے واپسی پر وہ موسیولی بان سے ملنے

فرانس بھی گئے تاکہ تمدن عرب کی تصنیف پر ہدیہ تبریک و تحسین پیش کر سکیں ، لیکن اس کی غیر حاضری کی وجہ سے ملاقات نہ ہو سکی ۔ وہ فرانس کی سیاحت کے بعد تونس اور الجزائر ہوتے ہوے مصر واپس آ گئے.

شیخ محمد عبدہ کی مقبولیت اور شہرت نے ان کے بہت سے حاسد اور دشمن بھی پیدا کر دیے تھے ۔ علمائے ازہر تو شروع ہی سے ان کے حریف تھے ، وہ ان کو معتزلی اور تجدد پسند کہہ کر بدنام کیا کرتے تھے جب کہ جدید تعلیم یافتہ افراد انھیں رجعت پسند عالم کہا کرتے تھے کیونکہ وہ سیاست میں اعتدال اور تدریجی عمل کے قائل تھے ۔ اس زمانے میں خدیو مصر اپنی افتادہ اراضی کا انتقال اوقاف کی بہتر اراضی سے کرنا چاھتا تھا ، لیکن شیخ محمد عبدہ سد راہ تھے ۔ آخر دشمنوں کی ریشہ دوانیاں رنگ لا کر رهیں ، خدیو کا رویہ بدل گیا اور وہ تمام مجوزہ اصلاحات کی مخالفت کرنے لگا ۔ بالآخر شیخ محمد عبدہ نے تنگ آ کر الازہر کی انتظامی کمیٹی سے استعفی دے دیا اور الازہر کے معاملات پرانی ڈگر پر چلنے لگے ۔ (احمد امین : زعماء الاصلاح فی عصر الحدیث ، ۳۲۴ ، ۳۲۵ ، قاہرہ ۱۹۳۸ء).

شیخ محمد عبدہ کے استعفی کے خلاف عالم اسلام میں زبردست ردعمل ھوا ۔ نواب محسن الملک [رک باں] نے المنار میں خدیو مصر کے نام ایک مکتوب شائع کر کے مسلمانان ھندوستان کے جذبات کی ترجمانی کی اور خدیو مصر کے استبداد اور علمائے ازہر کے جمود اور طور طریقوں پر شدید تنقید کی ۔ مفتی محمد عبدہ یورپ جانے کے لیے اسکندریہ میں مقیم تھے کہ چند روز کی علالت کے بعد انھوں نے ۱۱ جولائی ۱۹۰۵ء کو انتقال کیا ۔ ان کے انتقال کے ساتھ ھی ان کے حریفوں کی خفیہ سازشیں اور نکتہ چینیاں بھی ختم ہو گئیں ۔ وہ ھندوستان ، ترکستان اور ایران کا سفر کر کے ان ممالک کے مسلمانوں کے احوال اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاھتے تھے ۔ وہ تاریخ اسلام کی تصنیف اور ایک روزنامے کے اجرا کا بھی عزم رکھتے تھے اور الازہر کی اصلاح سے مایوس ھو کر ایک جدید طرز کی جامعہ کی تأسیس بھی کرنا چاھتے تھے ، لیکن موت نے ان منصوبوں کی تکمیل کی مہلت نہ دی (محمد رشید رضا : تاریخ الاستاذ الامام شیخ محمد عبدہ ، ۹۳۹ تا ۹۴۹ قاہرہ ۱۹۳۱ء).

برطانوی ھائی کمشنر لارڈ کرومر نے لکھا تھا کہ شیخ محمد عبدہ روشن دماغ اور بلند نظر تھے ، لیکن عالم خیال میں رہنے والے تھے ، ان کی وطن پروری شبہ سے بالا ہے (*Modern Egypt* ، ۲ : ۱۷۹ تا ۱۸۱ ، مطبوعہ لنڈن) ۔ سچ یہ ہے کہ ان کے بعض منصوبوں کی ناکامی میں اس زمانے کے ظروف و احوال کا بھی دخل تھا ، لیکن وہ اپنے پیچھے اپنے شاگردوں اور مداحوں کی ایک جماعت چھوڑ گئے ، جس نے ان کے ادھورے کاموں کی تکمیل کی ۔ سید محمد رشید رضا نے [رک باں] المنار کے ذریعے ان کے دینی و اصلاحی افکار کی روشنی ساری دنیائے اسلام میں پہنچائی ، جامعۂ الازہر کی اصلاح کی تکمیل ان کے شاگرد شیخ مصطفی المراغی کے ھاتھوں ھوئی ، ان کے اصلاحی خیالات کی ترجمانی شکیب ارسلان [رک باں] کرتے رہے اور سیاسی میدان سعد زغلول پاشا [رک باں] نے سنبھالا اور بالآخر مصر کو آزادی سے ھمکنار کیا.

علم و فضل : شیخ محمد عبدہ علم و فضل ، فصاحت و بلاغت اور ملکہ انشاء میں اپنے معاصرین پر فائق تھے ۔ وہ مصر جدید کی ادبی بیداری کے بانی ھیں ۔ ان کے قلم نے عربی زبان کو ادبی ،

اخلاقی اور سیاسی غرض گوناگون زندہ مضامین کے بیان کی قوت بخشی۔ ان سے پہلے علماء و خواص بھی علم بلاغت کے صحیح مفہوم سے نا آشنا تھے۔ جب وہ بیروت سے واپس آئے تو انھوں نے الازہر کے رواق عباسی میں امام عبدالقاہر الجرجانی کی کتابوں دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغۃ کا درس دینا شروع کیا اور ان کو چھاپ کر اپنے حواشی کے ساتھ شائع کیا۔ طلبہ کو عربی زبان کے فصیح اور معیاری اسلوب بیان سے آشنا کرنے کے لیے نہج البلاغۃ اور مقامات بدیع الزمان الہمدانی کو ضروری تشریحات سے شائع کیا۔ ان کا درس ادبی ہوتا جس سے ذوق سلیم کی پرورش ہوتی اور اسلوب بیان میں سادگی اور صفائی اور اثر انگیزی پیدا ہوتی۔ ان کے درس سے ان کے شاگرد رشید محمد رشید رضا، سعد زغلول، احمد تیمور، محمد حافظ ابراہیم، مصطفی المنفلوطی اور عبدالرحمان البرقوقی وغیرہ نے پورا فائدہ اٹھایا اور آئندہ چل کر مصر کی ادبی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا (عباس محمود العقاد: الاستاذ الامام محمد عبدہ، ص ۲۶۷ تا ۲۷۰، مطبوعہ قاہرہ)۔

عقائد و نظریات: شیخ محمد عبدہ شروع میں فقہ مالکی کے مقلد تھے، لیکن بعد میں منصب افتاء پر فائض ہونے کے بعد فقہ حنفی کے مطابق فتوی دینے لگے۔ وہ بوقت ضرورت چاروں فقہی مکاتب کے ائمہ مجتہدین کے فتاوی و آراء سے اخذ و استفادہ ضروری سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنے دعوتی طریق کار اور نصب العین کی وضاحت اس طرح کی ہے "اسلام کو سلف صالحین کے طریقے پر سمجھنا، دین کے اولین سرچشمہ کی طرف رجوع کرنا، عقائد کو بدعات، خرافات اور اوہام سے پاک کرنا، قرآن مجید کے فہم و تعلیم کی طرف لوگوں کو دعوت دینا، عربی زبان کو فروغ دینا، الازہر کی اصلاح کرنا، خواص کے اخلاق و اعمال کو سنوارنا اور ان میں حقوق طلبی کا داعیہ پیدا کرنا" تھا۔

عقیدہ کی اصلاح کے لیے انھوں نے قرآن مجید تفسیر کو محور بنایا۔ بیروت کے زمانۂ جلاوطنی میں وہ بیروت کی دو مسجدوں میں قرآن پاک کا درس دیتے تھے۔ اس کے بعد جب وہ قاضی بن کر مصر آئے تو الازہر میں قرآن پاک کا درس دینے لگے۔ ان کے درس میں قوم کے سربراہ، سرکاری عہدے دار اور مدارس عالیہ کے طلبہ حاضر ہوتے اور ان کے خیالات سے سرشار ہو کر نکلتے۔ ان کی یہ تقریریں محمد رشید رضا قلمبند کر لیتے تھے اور شیخ کی اصلاح کی ترمیم کے بعد المنار میں عالم اسلام کے استفادے کے لیے شائع کر دیتے۔ ان کا خیال تھا کہ یورپ کی تقلید اور عقلی اصلاح کے بجائے دین کی راہ سے مسلمانوں کی اصلاح آسان ہے، جب ان کا مذہب تہذیب اخلاق، اصلاح اعمال اور سعادت مندی کا ضامن ہے تو اس کو چھوڑ کر دوسرا ذریعہ ڈھونڈنا بے معنی ہے۔ (احمد امین: زعماء الاسلام فی عصر الحدیث، ص ۳۲۹ و ۳۳، قاہرہ ۱۹۴۸ء)۔ شیخ محمد عبدہ سب سے پہلے مصلح عالم اور سب سے آخر میں سیاسی رہنما تھے۔ سیاست میں وہ اعتدال اور میانہ روی کے قائل تھے۔ وہ عرابی پاشا [رک بآں] کی بغاوت کا انجام دیکھ چکے تھے، اس لیے وہ سیاسی میدان میں تدریجی اور ارتقائی عمل کے حامی تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ سیاست بازی کے علاوہ بھی قوم و ملک کی خدمت کے بہت سے طریقے اور راستے ہیں۔

شیخ محمد عبدہ کے دینی خیالات، تعلیمی نظریات اور اصلاحی افکار نے ساری دنیائے اسلام کو مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک متاثر کیا۔ ان کے بعد جامع القرویین (فاس) اور جامعہ زیتونہ (تونس) کے نصاب تعلیم میں عصر حاضر کی ضروریات

کے تحت تبدیلیاں عمل میں لائی گئیں۔ جکارتا کی جمعیہ المحمدیہ اور شریکۃ الاسلام شیخ محمد عبدہ کے افکار کے زیر اثر انڈونیشیا کے مسلمانوں میں جدید تعلیم کی ترویج، اشاعت اسلام اور طبی امداد میں کوشاں رہی ہیں۔ ان کی بیشتر کتب اور تفسیر کا ترجمہ ملائی زبان میں شائع ہو چکا ہے (*Islam and Modernism in Egypt* : Charles Adams) ص ۱۰۲، لنڈن ۱۹۳۳ء)۔

ہندوستان میں نواب محسن الملک [رک بآں] شیخ محمد عبدہ کے تعلیمی اور اصلاحی خیالات کے بڑے حامی اور موید تھے۔ ان کی مساعی سے رسالۃ التوحید کا اردو میں ترجمہ ہوا اور مدتوں علی گڑھ کالج کے نصاب دینیات میں شامل رہا۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ کی تحریک بھی بڑی حد تک شیخ محمد عبدہ کے تعلیمی اور اصلاحی افکار سے متأثر تھی۔ مولانا شبلی کے شیخ محمد عبدہ سے دوستانہ تعلقات تھے، چنانچہ مولانا شبلی ندوۃ العلماء کے ناظم مقرر ہوئے تو ان کے حسن انتخاب سے دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغۃ (عبدالقاہر الجرجانی)، مقدمۂ ابن خلدون اور شرح بصائر النصیریہ دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کے نصاب تعلیم میں شامل کی گئیں، جس سے طلبہ میں زبان و ادب کا صحیح ذوق پیدا ہوا۔ ابو الکلام آزاد کی دعوت قرآن بھی کسی حد تک شیخ محمد عبدہ کی دعوت سے مماثلت رکھتی ہے۔

تصانیف: (۱) تفسیر سورۃ الفاتحۃ (قاہرہ ۱۹۰۵ء)؛ (۲) تفسیر سورۃ العصر (قاہرہ ۱۹۰۳ء)؛ (۳) تفسیر عمّ، پہلے المنار میں شائع ہوئی، پھر علیحدہ چھاپی گئی؛ (۴) تفسیر القرآن الحکیم (تفسیر المنار)، مفتی محمد عبدہ کی زندگی میں یہ تفسیر صرف سورۃ النساء تک مکمل ہو سکی، اس کے بعد سید رشید رضا نے اسے سورۃ توبہ تک پہنچوایا؛ اب تک اس تفسیر کی دس جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور ہنوز نامکمل ہے۔ اس کے بعض اجزاء کا اردو ترجمہ اخبار وطن، لاہور نے شائع کیا تھا؛ (۵) رسالۃ التوحید، کئی بار چھپ چکا ہے۔ بیشتر اسلامی زبانوں کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی میں اس کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے؛ (۶) الرد علی الدھریین: سید جمال الدین افغانی کی فارسی کتاب کا عربی میں ترجمہ، جس میں مادیت کا ابطال کیا گیا ہے؛ (۷) الاسلام و الرد علی منتقدیہ، موسیو ہانوتو کے اسلام پر اعتراضات کے جواب میں ہے (بار ثانی قاہرہ، ۱۹۲۴ - ۱۹۲۵ء)؛ (۸) الاسلام و النصرانیۃ مع العلوم و المدنیۃ۔ علم و تہذیب کے بارے میں اسلام اور نصرانیت کا تقابل، یہ مقالات پہلے المنار ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئے، بعد ازاں کتابی صورت میں علیحدہ اشاعت پذیر ہوئے؛ (۹) حاشیہ علی شرح الدوانی (الایجی کی کتاب عقائد پر الدوانی نے شرح لکھی تھی، یہ اس کا حاشیہ ہے)؛ (۱۰) شرح نہج البلاغۃ، بار اول، بیروت ۱۸۸۵ء، متعدد بار قاہرہ سے شائع ہوتی ہے؛ (۱۱) شرح مقامات بدیع الزمان الہمدانی، بار اول، بیروت ۱۸۸۹ء، محی الدین عبدالحمید کے اضافوں کے ساتھ کئی بار قاہرہ میں چھپ چکی ہے؛ (۱۲) شرح کتاب البصائر النصیریہ فی علم المنطق (عمر ابن سہلان الساوی) محمد عبدہ کے مقدمہ اور شرح کے ساتھ ۱۸۹۸ء میں قاہرہ سے شائع ہوئی۔ شیخ محمد عبدہ نے دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغۃ (عبدالقاہر الجرجانی) مختصر حواشی کے ساتھ پہلی بار قاہرہ سے شائع کرائیں۔ ان کے علاوہ ان کی کئی یاد داشتیں بھی ہیں، جو الازہر، محکمہ تعلیم اور شرعی عدالتوں کی اصلاح کے بارے میں حکومت کو پیش کی تھیں۔ ان کے اہم ترین مقالات محمد رشید رضا نے جمع

کر کے تاریخ الاستاذ الامام کی جلد دوم میں شائع کر دیے ہیں (براکلمان، تکملہ، ۳: ۳۱۵ تا ۳۲۲، لائیڈن ۱۹۴۲ء)؛ خیر الدین الزرکلی: الاعلام، ۷: ۱۳۱، مطبوعہ قاہرہ).

مآخذ: (۱) محمد رشید رضا: تاریخ الاستاذ الامام الشیخ محمد عبدہ، جلد اول، قاہرہ ۱۹۳۱ء، بمواضع کثیرہ؛ (۲) امیر شکیب ارسلان: حاضر العالم الاسلامی، ۱: ۲۸۸، قاہرہ ۱۳۵۲ھ؛ (۳) جرجی زیدان: مشاہیر الشرق، ۱: ۲۰۱ تا ۳۰۹، قاہرہ ۱۹۱۱ء؛ (۴) احمد امین: زعماء الاصلاح فی عصر الحدیث، ص ۲۸۰ تا ۳۳۷؛ (۵) عباس محمود العقاد: الاستاذ الامام محمد عبدہ، ص ۲۶۷ تا ۲۷۰، مطبوعہ قاہرہ؛ (۶) خیر الدین الزرکلی: الاعلام، ۷: ۱۳۱، مطبوعہ قاہرہ، ۱۹۵۶ء؛ (۷) Cromer Lord: *Modern Egypt*، ۲: ۱۷۹ تا ۱۸۱، مطبوعہ لنڈن؛ (۸) Charles Adams: *Islam and Modernism in Egypt*، لنڈن ۱۹۳۳ء؛ (۹) Osman Amin: *Muhammad Abduh*، میشی گن ۱۹۵۳ء؛ (۱۰) Brockelmann: *G.A.L.*، تکملہ، ۳: ۳۱۵ تا ۳۲۲، لائیڈن ۱۹۴۲ء؛ (۱۱) H. A. R. Gibb: *Studies on the Civilization of Islam*، ص ۲۵۲ تا ۲۵۳، ۲۵۵، ۱۹۶۲ء؛ [شیخ نذیر حسین رکن ادارہ نے لکھا].

(ادارہ)

* **محمد عطاء بے:** (۱۸۵۶ء تا ۱۹۱۹ء) عثمانلی عالم، صحافی اور سرکاری ملازم۔ ۱۹۰۸ء کے انقلاب حکومت کے بعد وہ مالی اصلاحات کی کمیٹی کا رکن مقرر ہوا اور ایک ہفتے کے لیے وزیر خزانہ بھی رہا۔ اخبارات و رسائل میں اس کے متعدد مقالات مفخری اور عطاء کے نام شایع ہوئے اور اس نے انتطاف کے نام سے اشعار کا ایک انتخاب بھی مرتب کیا، جو مکاتب میں ایک درسی کتاب کے طور پر بکثرت مستعمل رہا۔ اس کا سب سے بڑا اور اہم علمی کام Hammer کی *History of Ottoman Empire* کا ترکی ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ جو کتاب مذکور کے فرانسیسی ترجمے پر مبنی تھا J. J. Hellet نے کیا تھا، ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء میں استانبول میں چھپنا شروع ہوا۔ اس کی مجوزہ ۱۵ جلدوں میں سے عملاً صرف دس شائع ہوئیں، جن میں سے آخری ۱۳۳۷ھ/۱۹۱۸ء میں چھپی۔

مآخذ: (۱) Babinger، ص ۴۰۰، ۴۰۱؛ (۲) عثمانلی مؤلفلری، ج ۳: ۱۱۰-۱۱۱۔

(از لائیڈن، بار اول)

محمد علی بن مظفر الدین: رک بہ قاچار

* **محمد علی پاشا:** ۱۸۰۵ء سے لے کر ۱۸۴۹ء تک مصر کا مشہور اور نائب السلطنت تھا (یہ سارا عرصہ سلطان محمود ثانی [رک بآں] کا عہد سلطنت تھا)۔ وہ خدیوان مصر، بعد میں شاہان مصر کے خاندان کا بانی تھا۔

محمد علی [۱۱۸۳ھ/۱۷۶۹ء] میں مقدونیہ کے شہر قوالہ (رک بآں) میں پیدا ہوا۔ وہ غالباً البانوی نسل سے تھا۔ پہلے وہ تمباکو کی تجارت کیا کرتا تھا۔ پھر بک باشی کے طور پر اس البانوی فوج میں بھرتی ہو گیا جو ۱۷۹۹ء میں ترکوں کے ساتھ مصر میں اتری اور جسے ابو قیر کے مقام پر بونا پارٹ نے شکست دی تھی۔ ۲۵ جولائی [۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء] میں اسے مصر میں ایک با اثر فوجی مرتبہ حاصل ہو گیا۔ ۱۸۰۱ء کے آخر میں وہ جرنیل کی حیثیت میں مملوکوں کے خلاف لڑا، لیکن بعد کے پر آشوب سالوں میں اس نے مملوک بیگوں اور ترک گورنروں کا جو قسطنطینیہ سے بھیجے گئے تھے، ساتھ دیا۔ اس نے خسرو پاشا [رک بآں] کے خلاف سازش کی، تو اسے مئی ۱۸۰۳ء میں مصر سے نکلنا پڑا۔ اسی سال یہ جدہ کا اعزازی گورنر بھی بنا۔ اس کے بعد خورشید پاشا کی

گورنری کے زمانے میں محمد علی قاہرہ کے باشندوں اور وہاں کے روحانی پیشواوں میں مقبولیت پا کر ہر دلعزیز ہو گیا اور انھیں بڑی کامیابی کے ساتھ خورشید پاشا کے خلاف اپنی سازشوں میں استعمال کرنے لگا۔ خورشید پاشا کی افواج آبادی کے لیے ایک بلائے بے درمان تھیں، ان کے مقابلے میں اس کے البانوی سپاہیوں کو خاص ہدایات تھیں کہ وہ اپنا رویہ اچھا رکھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خورشید پاشا کو اگست ۱۸۰۳ء میں واپس جانا پڑا اور قاہرہ کا قلعہ وہ محمد علی کے قبضے میں چھوڑ گیا۔ حکومت ترکیہ نے کئی سفیر بھیجے اور البانوی افواج کو وہاں سے ہٹا لینے کی بھی کوشش کی، لیکن وہ مصر کے معاملات پر ضبط قائم نہ رکھ سکی اور آخر میں اس کو محمد علی کے خود اختیار کردہ (۲۱ نومبر ۱۸۰۵ء) مرتبے کو تسلیم کرنا پڑا، چنانچہ اسے اپریل ۱۸۰۶ء میں رسمی طور پر گورنر مقرر کر دیا گیا۔

باب عالی کی اندرونی اور بیرونی مشکلات نے اس وقت اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اس سلسلے میں کوئی مزید کارروائی کر سکے۔ انگریز جو اس وقت ترکوں سے برسر پیکار تھے [رک بہ سلیم ثالث] ۱۲۲۲ھ/ ۱۸۰۷ء میں اسکندریہ میں اتر آئے۔ اس وقت محمد علی نے بطور خود مملوک بیوں البردیسی اور الالفی کا مقابلہ کیا، جن میں سے موخر الذکر کو انگریز پوری طرح مدد دے رہے تھے۔ وہ بڑی سرعت کے ساتھ بالائی مصر سے واپس آیا اور قاہرہ کو مستحکم کیا اور اپریل میں رشید (Rosetta) کے مقام پر انگریزوں پر فتح حاصل کی۔ انگریزی بحری بیڑے کی روانگی کے بعد محمد علی پاشا نے انتظامی اور اقتصادی اقدامات شروع کر دیے، جن کی بدولت مصر کی اقتصادی حالت بحال ہونے لگی۔ اس اثناء میں مملوک بے اس کی مخالفت کرتے رہے۔ اس مخالفت کا خاتمہ ۳۰۰ مملوکوں کے اس قتل عام کی صورت میں ہوا، جو قاہرہ کے قلعہ میں ایک جشن کے موقع پر یکم مارچ ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء کو ہوا۔ اب محمد علی پاشا اس قابل ہو گیا تھا کہ وہ اپنے ملک کو خطرے میں ڈالے بغیر اپنی البانوی فوج کو عرب کے وہابیوں کی سرکوبی کے لیے بھیج سکے اور باب عالی کی ہدایات پر تعمیل کر سکے۔ یہ جنگ ستمبر [۱۲۲٦ھ/۱۸۱۱ء] میں شروع ہوئی اور [۱۲۳۲ھ/۱۸۱٦ء] تک جاری رہی۔

مصری افواج کو جو کامیابیاں وہابیوں کے خلاف ہوئیں، ان کی وجہ سے محمد علی کا اقتدار و اختیار تمام عرب پر بھی قائم ہو گیا اور زیادہ وسیع معنوں میں تمام مشرق قریب بھی اس کا لوہا ماننے لگا۔ پہلی مرتبہ مصر کا اقتدار سوڈان میں بھی قائم ہو گیا، جہاں محمد علی کا تیسرا بیٹا اسمٰعیل [۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء] میں فوت ہوا۔ اس زمانے میں مصر کی حکومت بحیرہ قلزم کی طرف بھی وسعت پذیر ہوئی، جس کی وجہ سے ان متواتر حملوں کا قرار واقعی انسداد ہو گیا، جو خانہ بدوش عربوں کی طرف سے وادی نیل پر ہوتے تھے۔ سواکن اور مساوہ (مصوع) کی بندرگاہیں مصری حلقہ اثر میں آ گئیں، گو ان پر باب عالی کی حکومت برقرار رہی۔

محمد علی کی طاقت ایک نئے طریق سے ترقی کرنے لگی کہ اس نے یونانیوں کی بغاوتوں کو جو ترکوں کے خلاف ہوا کرتی تھیں، دبانا شروع کر دیا اور محمد علی ہی کی امداد کا ثمرہ یہ تھا کہ نوپلیہ کے سوا سارے یونان کو مطیع کر لیا گیا۔ پہلے ابراہیم پاشا نے [۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء] میں کریٹ (اقریطش۔ کرید) فتح کیا اور پھر مصر کی افواج نے جو ۱۸۲۵ء میں موره میں اتر آئی تھیں، یونان کا بیشتر حصہ سر کر لیا۔ جب

۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء میں انگلستان، روس اور فرانس نے یونان کے معاملے میں دخل اندازی کی تو ترکوں اور مصریوں کا متحدہ بحری بیڑا خلیج نواربنو میں تباہ کر دیا گیا [۲۰ اکتوبر ۱۸۲۷ء]۔ اس سے اگلے سال مصریوں نے یہ جزیرہ نما خالی کر دیا اور محمد علی پاشا اور انگریزی امیر البحر کوڈرنگٹن کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا (۹ اگست ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء]۔ کریٹ ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء تک مصری حکومت کے زیر نگین رہا۔

اب محمد علی پاشا کو یہ حیثیت حاصل ہو گئی کہ وہ سلطان کی منظوری یا استصواب کے بغیر بین الاقوامی معاہدات طے کرنے لگا اور اس کے ساتھ ہی فرانس اور انگلستان کی بحیرہ روم کی دو بحری طاقتیں اس کوشش میں مصروف تھیں کہ اس سے خود مختارانہ حیثیت سے رابطہ و اتحاد پیدا کر لیں۔ ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء میں فرانس نے قریب قریب کلی طور پر محمد علی پاشا کو آمادہ کر لیا، کہ وہ الجزائر اور تونس کی بربری ریاستوں کو فتح کر لے، لیکن اس کی خواہش یہ تھی کہ وہ مشرق کی طرف اپنے علاقے کو وسعت دے۔ زیادہ تر اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ باب عالی نے اس سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ملک شام کے چار صوبوں کی گورنری اس کو یونان کی لڑائی میں حصہ لینے کی خدمات کے صلے میں دے دی جائیگی، لیکن یہ وعدہ کبھی ایفاء نہ ہوا۔ ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء کے آخر میں محمد علی اور باب عالی کے مابین پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں، کیونکہ محمد علی عکہ کی گورنری کا دعویدار تھا۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصری فوجیں ابراہیم پاشا کی قیادت میں ملک شام میں بھیج دی گئیں، ۲۷ مئی ۱۸۳۲ء/۱۲۴۸ھ کو عکہ فتح کر لیا گیا۔ اس سے اگلے مہینے اس لشکر کو جو سلطان نے بھیجا تھا، بار بار شکست ہوئی اور آخر قونیہ کے نزدیک ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء میں اس نے شکست فاش کھائی۔ مصری فوج نے اپنی پیش قدمی قسطنطینیہ کی طرف جاری رکھی اور کوتاھیہ (Kutahia) تک پہنچ گئی۔ آخرکار یہاں باب عالی اور ابراہیم کے درمیان جس نے اپنے باپ کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے بات چیت میں حصہ لیا، عارضی صلح نامہ طے ہو گیا۔ ۹ اپریل ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء کو محمد علی کو ملک شام اور ادنہ کی گورنری دے دی گئی۔

اس سے بعد کے چھ سال اس نائب السلطنت کا اقتدار و عروج اپنے اوج کمال پر رہا۔ ادھر ابراہیم ملک شام میں سختی کے ساتھ حکومت کرتا رہا، لیکن بحیثیت مجموعی ملک میں خوش حالی کا دور دورہ تھا اور ادھر محمد علی مصر میں اپنے نظام حکومت کو اپنے لائحہ عمل کے مطابق چلانے میں منہمک رہا۔ اس نے اتحاد عرب کی حکمت عملی جاری کی جس کا مقصد یہ تھا کہ تمام عربی بولنے والے ممالک اس قیادت میں متحد و متفق ہو جائیں۔ عرب میں اب بھی اس کا اثر و رسوخ وہابیوں کی جنگ کے بعد سے برابر قائم اور برقرار تھا۔ اب اس نے یہ کوشش کی کہ مصر کا اثر و رسوخ عراق تک وسعت پذیر ہو جائے۔ اس حکمت عملی کی وجہ سے سلطان سے دوبارہ اختلاف پیدا ہو گیا، جو بالاخر اپنی مملکت محروسہ کے دوسرے خود مختار باجگزاروں کو مطیع کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور ایسے موقع کے انتظار میں تھا کہ وہ مصر کے اس زبردست اور طاقت ور باجگزار گورنر کو بھی کچل ڈالے۔ محمد علی نے ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء میں تو یہاں تک جسارت کی کہ اس نے ترکی حکومت سے بالکل آزاد ہو جانے کے ارادے کا اعلان کر دیا۔

جنگ شروع ہونے کے بعد زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ ترکی فوج کو حافظ پاشا کی قیادت میں شمالی شام میں نِصِّیب کے مقام پر شکست فاش ہوئی (۲۴ جون ۱۱۵۵ھ/۱۸۳۹ء) جبکہ ترکی بحری بیڑا کپودان پاشا کے زیر کمان اسکندریہ کی طرف جاتے ہوئے محمد علی سے جا ملا۔ اس مایوس کن صورت حالات میں باب عالی کے اقتدار کو یورپ کی پانچ طاقتوں کی مداخلت نے بچا لیا، جو سلطنت عثمانیہ کے وقار کو قائم رکھنے کے لیے آڑے آئیں۔ اس طرح مصر کا معاملہ ایک بین الاقوامی سیاسی بحران کی صورت میں تبدیل ہو گیا اور یہ صورت حالات فرانس کی مخالفت کی وجہ سے اور زیادہ نازک ہوگئی۔ یورپین طاقتوں میں فرانس کا ملک ایک مدت سے محمد علی کی حمایت کر رہا تھا۔ معاہدہ لنڈن (۵ جولائی ۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء) کی رو سے انگلستان، روس، آسٹریا اور پرشیا کو باب عالی کی اس تجویز سے اتفاق ہو گیا کہ محمد علی پر کیا کیا شرائط عائد کرنا چاہییں۔ جب اس نے ان شرائط کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، تو ملک شام کے ساحلی شہروں پر فوجی مظاہرے ہونے لگے۔ عکہ، ۴ نومبر ۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء کو فتح ہو گیا.

اس کے بعد ہی ایک انگریزی بیڑا اسکندریہ کے سامنے آ نمودار ہوا اور امیر البحر نیپئر نے ۲۷ نومبر کو محمد علی سے ایک معاہدہ طے کیا، جو ترکوں کے بحری بیڑے کی واپسی پر راضی ہو گیا اور اس کے علاوہ وہ شام [اَطَنَہ] اور کریٹ کی گورنری سے بھی دست بردار ہو گیا، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی ہوا کہ وہ مصر میں عثمانیہ سلطنت کے ماتحت موروثی گورنر برقرار رہے۔ ان شرائط کی توثیق ۱۳ فروری ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء کے ایک فرمان شاہی کے ذریعہ کر دی گئی اور اس کی تکمیل ۲۴ مئی کے ایک اور فرمان سے ہو گئی، جس کی رو سے سلطان اور نائب السلطنت کے باہمی تعلقات کو بھی منضبط کر دیا گیا۔ اہم شرائط یہ تھیں کہ مصر میں تخت نشینی کا قاعدہ یہ ہوگا کہ محمد علی کے خاندان میں جو عمر میں سب سے بڑا ہو، وہ نائب السلطنت ہوا کرے۔ وہ خراج ادا کرے اور اسے اٹھارہ ہزار فوج رکھنے کی اجازت ہو، مگر اس کے اعلیٰ افسر سلطان کے حکم سے مقرر ہوا کریں.

محمد علی کی عمر کے آخری سال امن و صلح میں گزرے۔ ۱۸۴۶ء میں وہ قسطنطینیہ اور قوالہ میں بھی گیا، ۱۸۴۸ء میں اس کا بیٹا ابراہیم فوت ہو گیا، جس کے ذریعے اسے بہت سی فوجی کامیابیاں حاصل ہوئی تھیں۔ ۲۔ اگست ۱۸۴۹ء کو وہ خود بھی اسکندریہ میں فوت ہو گیا اور اس کی جگہ طوسون کا بیٹا عباس پاشا [رک بآں] تخت نشین ہوا اور اسے جامع جدید میں دفن کیا گیا جو اس نے قلعہ قاہرہ میں تعمیر کی تھی۔

کسی وقت کے اس گمنام ترکی افسر کے واقعات زندگی سے زیادہ حیرت انگیز وہ بےشمار تبدیلیاں ہیں جو اس کی کوشش و کاوش کی وجہ سے مصر کی بین الاقوامی حیثیت میں اور اس ملک کے حالات میں رونما ہوئیں۔ ان کی وجہ سے وہ مشرق قریب کا بطل جلیل شمار ہوتا ہے۔ اس کا عہد حکومت مصر کی تاریخ میں بطور خود ایک مستقل دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ محمد علی کا تازہ ترین سوانح نویس لکھتا ہے: اس کی عملی زندگی محض زر اندوزی سے شروع ہوتی ہے اور اس کا خاتمہ گو اتفاقی ہی سہی، اس کوشش میں ہوا کہ وہ ملک کو ترقی دے کر مہذب بنا دے (Dod Well، ص ۲۰۲)۔ اس کی کد و کاوش سے ایسا نتیجہ بر آمد ہوا جس کا حصول اسی قسم

کے حالات میں کسی دوسرے کے لیے مشکل تھا۔

نظم و نسق مملکت، مسئلہ اراضی، ملک کے صنعتی اور تجارتی ذرائع وغیرہ امور میں محمد علی نے جن منصوبوں اور تجاویز پر عمل کیا ان کا مختصر سا خاکہ مادہ خدیو میں دے دیا گیا ہے۔ یہاں صرف یہ بتا دینا کافی ہوگا کہ ان تمام اقدامات کا مقصد اولین یہ تھا کہ خود پاشا کو مصر کی تمام دولت اور خزائن کا مالک و مختار بنا دیا جائے۔ یہ سچ ہے کہ وہ یورپین اور دوسرے مشیروں کی صلاح اور مشورے پر عمل پیرا ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر وہ یورپین اداروں کی قدر کرتا تھا۔ اس خیال سے کہ ان کی کسی حد تک تقلید کرے، لیکن وہ اس کے لیے مشرقی طریقے استعمال کرتا تھا اور ملک کے اندرونی انتظام میں یورپین حکام کو استعمال کیے بغیر اس نے اصلاح و ترقی کے کام کو ممکن بنا دکھایا۔

محمد علی نے اپنی نئی فوج کے سلسلے میں متذکرہ صدر اصول کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا۔ پاشا خود بھی اپنی پیشہ ور فوج کو پورے طور پر قابو میں نہ رکھ سکا، اس لیے اس نے ایک نئی فوج بھرتی کرنے کا فیصلہ اس وجہ سے کیا جس کی بنا پر سلطان سلیم ثالث نے ”نظام جدید“ کے نام سے بالکل نئی اور باقاعدہ فوج قائم کر لی تھی۔ یہ کار عظیم بڑے اعتماد کے ساتھ فرانسیسی کپتان سیوے Sevey کی سپردگی میں کامیابی کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچا۔ یہ کپتان مسلمان ہو گیا تھا اور سلیمان پاشا کے لقب سے محمد علی کی ملازمت کرتا رہا۔ پہلے یہ کوشش کی گئی کہ سوڈان کے حبشی غلاموں کو سپاہیوں کی تربیت دی جائے، لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ پھر مصر ہی کے فلاحین کو بھرتی کیا گیا، افسر زیادہ تر نوجوان مملوکوں میں سے لیے گئے اور ان کے ساتھ یورپین افسر بھی کچھ کم تعداد میں نہ تھے۔ اس فوج سے موریہ میں فوجی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ اس قسم کی بھرتی کی بڑی سخت مخالفت پہلے مصریوں نے اور پھر شامیوں نے کی اور مطلوبہ تعداد کو پورا کرنے کے لیے جو طریقے استعمال کیے جاتے تھے بعض اوقات سخت گیرانہ ہوتے تھے، لیکن بالآخر پاشا کی سرگرمی غالب آئی۔ یہ فوجی تنظیم لوگوں کی تعلیم و تربیت کا باعث ہوئی اور اس کے ذریعہ قومی جذبے کی داغ بیل پڑ گئی جو آئندہ نسلوں کے لیے مفید ثابت ہوئی۔ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ ۱۲۵۷ھ / ۱۸۴۱ء کے آخری فرمان شاہی کی رو سے صلح کے زمانے میں فوج کی مجموعی تعداد اٹھارہ ہزار تک محدود کر دی گئی تھی۔

محمد علی کی یہ کوشش کہ مصر کے لیے ایک بحری بیڑہ تیار کیا جائے [۱۲۳۱ھ/۱۸۱۵ء] میں شروع ہوئی۔ پہلے پہل اس نے فرانس، اطالیہ اور بمبئی میں جہاز تعمیر کرائے، لیکن جلد ہی اسکندریہ میں بھی ایسے کارخانے قائم ہو گئے۔ نوارینو میں مصر کے بحری بیڑے کی تباہی کے بعد جہاز سازی کا کام پھر شروع ہوا اور ۱۲۴۷ھ/ ۱۸۳۱ء کے بعد فرانسیسی اور اطالوی افسروں کی اچھی خاصی تعداد مصر کی بحری فوج میں بھرتی کر لی گئی تھی۔ مصر کا بحری بیڑا اپنے بانی کی زندگی کے بعد زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔

بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ محمد علی کا عہد حکومت ترکی وضع کا تھا۔ نظام حکومت میں بہت سے ذمے دار عہدوں پر ترک افسر اور مملوکوں کی اولاد مقرر تھی۔ اس طرح عثمانیوں کی طرز حکومت کچھ تغیر و تبدل کے ساتھ یورپین نمونہ پر ڈھال لی گئی تھی۔

فن تعمیر کی یادگار عمارتیں بنوانے کے اعتبار سے محمد علی نے کوئی خاص شہرت حاصل نہیں کی۔ اس نے ترکی طرز تعمیر کی ایک مسجد قلعہ قاہرہ میں بنوائی، لیکن اس نے اپنی سکونت کے لیے کوئی گرانقدر محلات تعمیر نہیں کرائے۔ اس کے بہت سے تعمیری کام رفاہ عامہ کے ہوے، مثلاً ڈیلٹا میں آبپاشی کے طریقے میں ترقی اور توسیع ہوئی، جس میں قاہرہ کے نیچے دریائے نیل پر بند لگوانے کا کام بھی شامل ہے۔ یہ کام ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء میں شروع ہوا تھا لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔

محمد علی کی شخصیت کے متعلق اس کی زندگی ہی میں مختلف رائیں دی گئیں۔ اس کے مداح زیادہ تر فرانسیسی لوگ تھے۔ چونکہ فرانسیسی حکومت نے عام طور پر اس سے اپنے دوستانہ تعلقات برقرار رکھے، اس لیے یہ کوئی عجب بات بھی نہیں۔ انگریزوں کی رائے اس کے متعلق کچھ زیادہ اچھی نہ تھی، لیکن وہ تمام لوگ جنھیں اس والی سے سابقہ پڑا، اس کی ذاتی خوبیوں سے ضرور متاثر ہوے۔ اب چونکہ اس کا زمانہ، زمانہ ماضی ہو گیا ہے، ایک عظیم شخصیت کے آثار کئی صورتوں میں باقی رہ گئے ہیں۔ وہ بے اندازہ ذاتی جرات کا مالک تھا اور اعتماد اور وفاداری کے لحاظ سے اس کا مقام بہت بلند تھا۔ اس کا طریق کار بعض اوقات متشددانہ بھی ہو جاتا اور اپنی عملی زندگی کی ابتداء میں وہ اکثر ساز باز سے بھی کام لے لیا کرتا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اور ملک کی خوشحالی بڑھتی گئی، اس کے انداز حکمرانی میں بھی نرمی آتی گئی: چنانچہ اپنے عہد حکومت کے آخر میں وہ یقینی طور پر اپنی رعایا میں بے حد مقبول ہو گیا تھا۔ اب اسکندریہ کے سب سے بڑے چوک میں اس کا مجسمہ نصب ہے جس میں اسے گھوڑے پر سوار دکھایا گیا ہے اور قاہرہ کے بڑے بازاروں میں سے ایک کا نام اس کے نام پر مشہور ہے۔

مآخذ: مصری، انگریزی، فرانسیسی اور اطالوی محافظ خانوں کی دستاویزات ابھی حال ہی میں شائع ہونا شروع ہوئی ہیں اور اس خوبصورت مجموعہ کا نام *Publications speciales de la societe Royale de Geographie d'Egypte* ہے، جو قاہرہ میں شائع ہوا۔ اب تک یہ مطبوعات شائع ہو چکی ہیں: (۱) G. Douin: *L'Egypte de 1802 a 1804 : Correspondance consuls de France en Egypte*، ۱۹۲۵ء: (۲) G Douin: *Mohamed Aly Pacha du Caire (1805-7) Correspondance des Consuls de France en Egypte*، ۱۹۲۶ء: (۳) E.Driault: *Mohamed Aly et Napoleon (1807-14) Correspondance des Consuls de France en Egypte*، ۱۹۲۵ء: (۴) E Driault: *La Formation l'Empire de Mohamed Aly de l'Arabic au Soudan (1814-23)*، ۱۹۲۷ء: (۵) G. Doiun et Mme E. C. Faiotier Gones: *L'Angleterre et l'Egypte : la Campagne de 1807*، ۱۹۲۸ء: (۶) E. Douin: *Mohamet Aly et l' Expedition d'Alger*: (۷) J. Deny: *Sommaire des archives turques du Caire*، ۱۹۳۰ء: (۸) A. Summatco: *La Marina egiziana sotto Mohammed Ali. Il contribute italiano*، ۱۹۳۱ء: (۹) A. Summarco: *Il regno di Mohammed Ali nei documenti diplomatici italiano inediti genesi e primo svolgimento della crisi egiziano—Orientale del 1831-33*، ۱۹۳۱ء۔ بعد کی مطبوعات کے لیے جو ابھی زیر طبع ہیں، اسی مصنف کو دیکھیں: (۱۰) *I do cumenti diplomatici concernanti il rengo di Mohammed Ali e gli archivi di stato italiano*، در *Oriente Moderno*، ۱۹۴۹ء، ص ۲۸۷ جہاں محمد علی کے عہد کے مآخذ مولفہ Monier کا اعلان کیا گیا ہے، قسطنطینیہ کے محافظ خانہ کی کوئی دستاویز

انہی تک نتائج [illegible] (١١) کا [illegible] ؛
الاصل [illegible] تاریخ سوریہ فی عہد محمد علی [illegible] ٢ جلد،
Some , H. Hoskins Halford (١٢) [illegible] ، بیروت
recent works on Mohammed Ali [illegible]
Egypt [illegible] torical Journal [illegible] ، ص ٩٣
تا [illegible] با جزوی طور پر تاریخی سلسلہ مشرقی
مالک [illegible] ؛ عجائب الآثار، ج ٣ و ٤، قاہرہ
[illegible] جمع [illegible] قاہرہ [illegible] ترجمہ
Merveilles Biographiques et Historiques [illegible] Chroni-
ques [illegible] جودت پاشا: تاریخ قسطنطنیہ، ٣٠٩ھ
ج ٤ تا [illegible] تا ٥ ١٨١ء کا ذکر
ہے؛ [illegible] تاریخ [illegible] ، مطبوعہ قسطنطنیہ، ١٣٢٢ھ
: F.P. Bedenat Duvent [illegible]
L'Egypte sous Mehemed Ali [illegible] de l'
پیرس ، administration civile et [illegible]
Histoire de l'Egypte : F. Mengin [illegible]
، ٢ جلدیں ، sous le Gouvernement de Mohammed Aly
Histoire de la : J. Planat (١٧) [illegible] ، پیرس
regeneration de l'Egypte, Lettres ecrits du Caire a
(١٨) : ١٨٣٠ء، پیرس ، M. le comte [illegible] de Laborde
L'Egypte et : E. de Cadalvene et [illegible] de Breuvery
Egypte et ؛ ٢ و ١ ج ، la turquie de 1829 a 1836
E. de Cadalvene et (١٩) : ١٨٣٦ء، پیرس ، Nubie
Histoire de la guerre de Mehemed Ali [illegible]
: ١٨٣٧ء، پیرس ، contre la Porte Ottomane 1831-33
Histoire de L'Egypte sous : A. de [illegible] (٢٠)
de Histoire scientifique ، ١٩٠ و ٩ ج [illegible] Mohammed Ali
، et militaire de l'Expedition Francaise [illegible] d'Egypte
Histoire : F. Mengin (٢١) : ١٨٤٠ء [illegible] پیرس
sommaire de l'Egypte sous le gouvernement de
(٢٢) : ١٨٣٩ء، پیرس ، Mohammed Aly (1823 1836)
Report on Egypt and candia [illegible] : J. Bowring

لندن ، to the Right Hon. Lord Viscount palmerston
Apercu General sur : Clot Bey (٢٣) : ١٨٤٠ء
(Mehmet et sa famille ببعد ١: ٥٥) ٢ جلدیں ، l'Egypte
Stuttgart : Puckler-Muskau (٢٤) : ١٨٤٠ء، برسلز
(٢٥) : ١٨٤٣ء، شٹٹ گرٹ ، Aus Mehemed Alis Reich
: ١٨٤٢ء، ٢ جلدیں، لندن ، The war in syria : C. Napier
La Syrie sous le gouvernment de : F. Perrier (٢٦)
(٢٧) : ١٨٤٢ء، پیرس ، Mehemet Ali jusqu en 1840
L'Egypte au XIX eme siecle Histoire : E. Gouin
militaire et politique, anecdole et pittoresque de
پیرس ، mehemet Ali Ibrahim Pacha, Sultan Pacha
١٨٤٧ء۔

: A. Von Kremer (٢٨) بعد کا تاریخی مطالعہ
: J. W. Zinkeisen (٢٩) : ١٨٦٣ء، لیپزگ ، Aegypten
، Geschichte des osmanischen Reiches in Europa
Geschichte : G. Rosen (٣٠) : ١٨٦٣ء لیپزگ
(٣١) : ١٨٦٦ء، لیپزگ ، ٢ جلدیں ، der Turkei
A History of the Egyptian Revolution : A. A. Paton
from the Period of the Mamlukes to the Death of
M. (٣٢) : ١٨٧٠ء، بار دوم ، لندن ، Mohammed Ali
(٣٣) : ١٨٧٣ء، لیپزگ ، Agyptens neue zeit : Lutke
Mehmed Ali vizekonig : A. Von Prokesch-Osten
علی پاشا مبارک: (٣٤) : ١٨٧٧ء، وی آنا ، von Agypten
الخطط التوفیقیہ، ٧: ٦٢ تا ٣٤، بولاق ١٣٠٦ھ/١٨٨٩ء:
Le soudan Egyptien sous : H. Deherain (٣٥)
: Bendetti (٣٦) : ١٨٩٢ء پیرس ، mehemet Ali
Revue در ، Mehmed Ali durant ses dernieres annees
(٣٧) : ١٨٩٥ء، پیرس ١٢٩ ، des tome deux Mondes
، Histoire de l'Egypte de 1798 a 1900 : L. Brehier
A short memoir. : C.A. Murray (٣٨) : ١٩٠٠ء، پیرس
جرجی زیدان: (٣٩) : ١٨٩٨ء، لندن ، of Mohammed Ali
تراجم مشاہیر الشرق، طبع دوم، ج ١، قاہرہ ١٩١٠ء:

(۴۰) W.A. Phillips : *Muhammad Ali*، در *Encyclopaedia Britannica*، ۱۹۱۱ء؛ (۴۱) وہی مصنف، در *The Cambridge Modern History*؛ (۴۲) N. Jorga : *Geschichte des Osmanischen Reiches*، ج ۵، Weimar ۱۹۱۳ء؛ (۴۳) K. Sussheim، در *Historische Jahrbücher*، ۱۹۱۵ء؛ (۴۴) A. Hasenclever : *Geschichte Ägyptens im 19. Jahrhundert (1798—1914)*، ہالے ۱۹۱۷ء؛ (۴۵) *Mohammed Ali et le khalifat (1833—1837)*، در *Actes du Congrès de Géographie du Caire 1925*، ۵ : ۱۰؛ (۴٦) Asad J. Rustum : *The Struggle of Mehemet Ali Pasha with Sultan Mahmud II and some of its Geographical Aspects*، در مجلۂ مذکور، ۵ : ۲۳۳؛ (۴۷) محمد رفعت: تاریخ مصر السیاسی فی الازمنة الحدیثة، قاہرہ ۱۹۳۰ء؛ (۴۸) شفیق غربال: *The Beginnings of the Egyptian Question and the Rise of Mehemed Ali. A study in the Diplomacy of the Napoleonic Era based on Researches in the British and French Archives*، لندن ۱۹۲۸ء؛ (۴۹) M. Sabry : *L'Empire Egyptien sous Mohamed Ali et la question d'Orient (1811-1849)*، پیرس ۱۹۳۰ء؛ (۵۰) H. Dodwell : *The Founder of Modern Egypt, a study of Muhammad Ali*، کیمبرج ۱۹۳۱ء۔

(G. H. KRAMERS)

⊙ **محمد علی جناح، قائد اعظم**: جمہوریۂ اسلامیۂ پاکستان کے بانی.

ابتدائی حالات: قائد اعظم محمد علی جناح ۲۵ دسمبر ۱۸۷٦ء، بروز شنبہ، وزیر مینشن کراچی میں پیدا ہوئے۔ ان کے آبا و اجداد ساہی وال (پنجاب) کے تجارت پیشہ لوہانہ راجپوت تھے، جو حضرت عبدالقادر الجیلانیؒ [رک بآں] کے خاندان کے ایک بزرگ پیر عبدالخالق کے ہاتھ پر بیعت کر کے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ قائد اعظم کے ایک جد گجرات (کاٹھیاواڑ) میں جا کر آباد ہو گئے اور وہاں کے اسماعیلی خوجہ کی بیٹی سے شادی کر کے اس کے خاندان میں مل گئے، جو ہز ہائی نس آغا خان کو اپنا پیر و مرشد سمجھتا تھا؛ مگر جب قائد اعظم کے دادا نے اپنی دو بیٹیوں رحمت بی اور مریم بی کی شادیاں سنی خوجہ لڑکوں سے کیں تو یہ رشتہ بالکل منقطع ہو گیا (تاہم آغا خان قائد اعظم کی فراست اور قانون دانی کے ہمیشہ معترف رہے اور مذہبی نظریے مختلف ہو جانے کے باوجود قائد اعظم ہی ہمیشہ ان کے قانونی مشیر رہے).

قائد اعظم کے دادا پونجا بھائی اور ان کے خاندان کی مستقل رہائش پڑی پانیلی (ریاست گونڈل) میں تھی اور ان کے پاس کئی کھونڈیاں نہیں۔ پونجا بھائی اپنا کاروبار بڑھانے کی غرض سے ۱۸٦۰ء کے لگ بھگ اپنی بیوی، اپنی بیٹی مان بی اور تین بیٹوں والجی، ناتھو اور جینا کو ساتھ لے کر کراچی پہنچ گئے، جہاں ان کی جان پہچان کے کچھ لوگ پہلے سے آباد تھے۔ پونجا بھائی نے کراچی آ کر کانڈا گلی کے ایک احاطے میں، جو ڈیلا یا ڈیرا کہلاتا تھا، ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لیا اور کاروبار شروع کر دیا۔ کام قدرے بڑھنے لگا تو انھوں نے اپنے بڑے بیٹے کے نام پر ایک تجارتی ادارہ والجی پونجا بھائی اینڈ کمپنی قائم کر لیا اور مچھلی، گوند، چمڑے وغیرہ کا کاروبار کرنے لگے۔ کمپنی کے چھوٹے بڑے کئی گودام تھے، سامان لانے لے جانے کے لیے گدھا گاڑیاں، بیل گاڑیاں اور اونٹ گاڑیاں اور ماہی گیری کے لیے متعدد چھوٹی بڑی کشتیاں اور لانچیں تھیں۔ ان کی دو لانچوں کے نام فتح اور گیلانی تھے.

پونجا بھائی کے کاروبار کو ترقی دینے میں ان کے چھوٹے بیٹے جینا پونجا نے اہم کردار ادا کیا۔

جینا بھائی ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۸۷۴ء میں ان کی شادی آغا خان اول کے وزیر موسی جمعہ کی صاحبزادی شیریں بائی عرف مٹھی بائی سے ہوئی۔ وہ اپنے زمانے کے اعتبار سے خاصے تعلیم یافتہ تھے ، چنانچہ کچھ عرصے کے لیے وہ مشن ہائی سکول میں معلم بھی رہے ۔ ان کی محنت اور جفا کشی سے کاروبار میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا اور انھوں نے کئی مقامات پر اپنے تجارتی دفاتر کھولے اور تجارت کا سلسلہ انگلستان تک پھیل گیا ۔ لندن کی گراہم شپنگ ٹریڈنگ کمپنی Graham's Shipping Trading Company سے ان کے خصوصی تجارتی روابط تھے ۔ چونکہ سارا کاروبار انگریزی میں ہوتا تھا اور جینا پونجا بقدر ضرورت اس زبان سے واقف تھے ، اس لیے تمام تجارتی خط و کتابت شروع سے وہی کیا کرتے تھے ۔ شادی کے بعد جینا پونجا نیونہم روڈ کے ایک مکان میں منتقل ہوگئے ۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنے نام میں بھی تبدیلی پیدا کی ، یعنی جینا (گجراتی میں بمعنی دبلا پتلا) کے بجائے جناح (عربی میں بمعنی بازو) اور پونجا کی جگہ پونجاہ لکھنے لگے ۔

جناح پونجاہ کے چار بیٹے اور چار بیٹیاں پیدا ہوئیں ، یعنی (۱) محمد علی (۱۸۷۶ء)؛ (۲) رحمت بی (۱۸۷۸ء)؛ (۳) بندہ علی (۱۸۸۰ء)؛ (۴) مریم بی (۱۸۸۲ء)؛ (۵) احمد علی (۱۸۸۶ء)؛ (۶) شیریں بی (۱۸۸۸ء)؛ (۷) فاطمہ بی (۱۸۹۱ء) اور (۸) بجو (۱۸۹۳ء) ، جس کا انتقال عقیقے سے پہلے ہی ہو گیا ۔

بڑے بیٹے محمد علی کی پیدائش پر والدین نے بہت خوشی منائی ۔ نومولود کی رسم عقیقہ آبائی گاؤں پانیلی سے دس میل کے فاصلے پر حسن پیر کی درگاہ پر ادا کی گئی اور اس موقع پر ان کے والد نے بڑی داد و دہش کا مظاہرہ کیا ۔

تعلیم : محمد علی کی تعلیم کا آغاز ۱۸۸۲ء میں کراچی کے مدرسۃ الاطفال سے ہوا ، جہاں سے انھوں نے گجراتی میں چوتھی جماعت تک تعلیم پائی ۔ اس کے بعد انھیں سندھ مدرسۃ الاسلام میں انگریزی کی پہلی جماعت میں داخل کر دیا گیا ۔ چند ماہ سے قطع نظر ، جو انھوں نے اپنے ماموں قاسم موسی کے پاس بمبئی میں بسر کیے اور وہاں انجمن اسلام ہائی سکول میں پڑھتے رہے ، وہ سندھ مدرسہ ہی کے طالب علم رہے ۔ بقول فاطمہ جناح وہ شروع میں پڑھائی کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے اور خصوصاً حساب میں خاصے کمزور تھے ۔ والد اس بارے میں بہت متفکر تھے ، چنانچہ انھوں نے اپنے ایک انگریز دوست کے مشورے سے انھیں تجارتی کام کی تربیت کے لیے انگلستان بھیجنے کا فیصلہ کرلیا ۔ والدہ نے اصرار کیا کہ اس سے پہلے ان کی شادی ہو جانی چاہیے ، چنانچہ محمد علی ، جو اس زمانے میں انگریزی کی پانچویں جماعت میں تعلیم پا رہے تھے ، برات لے کر اپنے آبائی گاؤں کاٹھیاواڑ گئے ، جہاں ایک قریبی رشتہ دار کوہم جی کی بیٹی ایمی بائی سے ان کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی اور سولہ برس کے محمد علی اپنی چودہ برس کی دلہن کو بیاہ کر کراچی لے آئے (۱۸۹۳ء).

شادی کے بعد چند ماہ کے لیے محمد علی کا انگلستان جانا ملتوی ہوگیا ۔ اسی دوران میں انھوں نے مشن ہائی سکول میں چھٹی جماعت میں داخلہ لے لیا تاکہ وہ انگریزی ماحول سے قدرے مانوس ہوجائیں ۔ بہر حال اواخر ۱۸۹۲ء یا اوائل ۱۸۹۳ء وہ انگلستان روانہ ہوئے ، جہاں انھوں نے گراہم شپنگ ٹریڈنگ کمپنی کے صدر دفتر میں کار آموزی کا آغاز کر دیا اور فائلوں اور بہی کھاتوں میں دب کر رہ گئے ۔ یہ کام ان کے رجحان طبع کے خلاف تھا ؛ چنانچہ انھوں نے بیرسٹر بننے کا فیصلہ کرلیا ۔ پہلے تو والد نے اسے پسند نہیں کیا ، لیکن پھر اجازت دے دی ۔

محمد علی جناح نے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لنکنز اِن Lincolns Inn کو پسند کیا کیونکہ اس کے صدر دروازے پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کا اسم گرامی دنیا کے عظیم مقننین کی فہرست میں درج تھا ۔ ۲۵ جون ۱۹۸۳ء کو ان کا باقاعدہ داخلہ ہوا اور ۵۲ رسل روڈ ، کنگسٹن ہال میں مسز ایف ۔ ای ۔ پیج گیٹ کے ہاں رہائش کا انتظام ہو گیا ۔

اپنے زمانۂ قیام انگلستان (۱۸۹۲ء تا ۱۸۹۶ء) میں محمد علی جناح قانون کے مطالعے کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے ۔ دار العوام میں انگلستان کے نامور سیاست دانوں گلیڈ سٹون ، ڈزریلی ، سالسبری اور مورلے وغیرہ کی تقاریر سننا ان کا دل پسند مشغلہ تھا ۔ وہ سب سے کم عمر ایشیائی طالب علم تھے ، جنہیں ۲۹ اپریل ۱۸۹۶ء کو بیرسٹری کی ڈگری ملی ۔

پیشہ ورانہ زندگی کی ابتدا : ۱۸۹۶ء میں محمد علی جناح مراجعت فرمائے وطن ہوئے تو ان کے والد کا کاروبار انتہائی خسارے میں جا رہا تھا ۔ اگرچہ والد کی خواہش تھی کہ وہ کراچی میں پریکٹس شروع کریں ، لیکن انہوں نے بمبئی کو ترجیح دی اور بمبئی ہائی کورٹ میں اپنا نام رجسٹر کرا لیا (۲۴ اگست ۱۸۹۶ء) ۔ شروع شروع میں انہیں نہایت نامساعد حالات سے گزرنا پڑا ، لیکن انہوں نے بڑی مستقل مزاجی سے محنت جاری رکھی ۔ آہستہ آہستہ ان کی قانونی قابلیت کے جوہر عیاں ہونے لگے ، چنانچہ وہ پہلے ہندوستانی وکیل تھے جنہیں بمبئی کے ایڈووکیٹ جنرل میکفرسن نے اپنے چیمبر میں کام کرنے کی اجازت دی ۔ ۳ مئی ۱۹۰۰ء کو انہیں چھے ماہ کے لیے پریذیڈنسی مجسٹریٹ مقرر کیا گیا ، لیکن جب ڈیڑھ ہزار روپے ماہانہ کی یہ اسامی انہیں مستقلاً پیش کی گئی تو انہوں نے یہ کہ کر انکار کر دیا کہ وہ اتنا روپیہ روزانہ کمانے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔ غرضیکہ چار برس ہی میں انہوں نے وکالت کے پیشے میں اپنی حیثیت تسلیم کرا لی ۔

سیاسی زندگی کی ابتدا : ۱۹۰۴ء تک محمد علی جناح نہ صرف وکالت میں نام پیدا کر چکے تھے بلکہ سیاسی حلقوں میں بھی پوری طرح روشناس ہو چکے تھے ؛ چنانچہ انڈین نیشنل کانگرس کے سالانہ اجلاس میں جب برطانوی رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے ایک وفد بھیجنے کی تجویز زیر غور آئی تو طے پایا کہ اس میں بمبئی کی نمائندگی جناح اور گوکھلے (۱۸۶۶ تا ۱۹۱۵ء) کریں گے ۔

بہرکیف ان کی سیاسی زندگی کا باقاعدہ آغاز ۱۹۰۶ء میں ہوا جب انڈین نیشنل کانگرس کے سالانہ اجلاس میں وہ اس کے صدر دادا بھائی نوروجی (۱۸۲۵ تا ۱۹۱۷ء) کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے شریک ہوئے ۔ اس جلسے میں وقف علی الاولاد کے موضوع پر ان کی پہلی پبلک تقریر بہت سراہی گئی ۔

پارلیمانی زندگی کا آغاز : منٹو مارلے اصلاحات کے تحت ۱۹۰۹ء میں ہونے والے انتخابات میں محمد علی جناح نے بھی حصہ لیا اور بمبئی کے شہری مسلم حلقے سے امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے رکن منتخب ہو گئے ، جہاں انہوں نے بہت جلد ایک نڈر سیاست دان ، محب وطن اور قانون دان کی حیثیت سے اپنی پارلیمانی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا ۔ ۲۵ جنوری ۱۹۱۰ء کو پہلے ہی اجلاس میں ان کی وائسرائے لارڈ منٹو سے دلچسپ جھڑپ ہو گئی ۔ محمد علی جناح نے جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے بارے میں برطانوی حکومت کی حکمت عملی پر تنقید کرتے ہوئے اسے ظالمانہ قرار دیا تو وائسرائے ، جو صدارت کر رہے تھے ، چونک اٹھے اور کہا کہ

معزز رکن کو جلسے کے آداب کا خیال رکھنا چاہیے۔ جناح نے فی الفور جواب دیا کہ جناب والا! اگر آداب کا خیال نہ ہوتا تو میں اس سے کہیں زیادہ سخت الفاظ استعمال کرتا۔

اس دوران میں جو قراردادیں اور اہم مسودہ ہائے قانون کونسل میں بحث کے لیے پیش ہوئے، محمد علی جناح نے ان سب میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ ۲۲ مارچ ۱۹۱۰ء کو انھوں نے جاپان ایسے صنعتی ملکوں کے حوالے دیتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ ملک میں صنعتی تعلیم کو عام کرے۔ ۱۷ مارچ ۱۹۱۱ء کو انھوں نے مسلم اوقاف کے متعلق اپنا مشہور و معروف مسودۂ قانون پیش کیا، جس کی تیاری میں انھوں نے مسلم فقہا کی کتابوں کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ان کے وزنی دلائل کے باعث یہ مسودۂ قانون ۱۹۱۳ء میں باقاعدہ قانون بن گیا۔ یہ ان کی بہت بڑی کامیابی اور اسلامی ہند کی بہت بڑی خدمت تھی۔ ۲٦ فروری ۱۹۱۲ء کو بھوپندرا ناتھ باسو (۱۸۵۹ تا ۱۹۲۴ء) کے پیش کردہ ایک مسودۂ قانون پر، جو ہندوستان میں شادیوں کے بارے میں تھا، محمد علی جناح نے بڑے خوبصورت انداز میں بحث کرتے ہوئے کہا کہ شادیوں سے متعلق اسلامی قوانین کو نہ صرف انگریزی قانون سے گڈمڈ کیا جا رہا ہے بلکہ مسلم قانون معاہدہ (Mussalman Law of Contract) کو تسلیم نہیں کیا گیا اور مسلم قانون فوجداری کو سرے سے اور مسلم قانون شہادت کو عملی طور پر ختم کر دیا گیا ہے! چنانچہ انھوں نے اس نظام میں پیدا شدہ نقائص کو دور کرنے اور اصلاح احوال کے لیے ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کرنے کی سفارش کی۔ اسی طرح اپریل ۱۹۱۲ء میں ابتدائی قومی تعلیم سے متعلق گوکھلے کے مسودۂ قانون پر مدلل بحث کرتے ہوئے وہ سرکاری ممبروں پر خوب برسے اور ان کے اس نظریے کو غلط قرار دیا کہ تعلیم عام ہونے سے عوامی ایجی ٹیشن میں اضافہ ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ تعلیم سے ایجی ٹیشن نہیں بلکہ اچھے ذہن پیدا ہوتے ہیں، لہذا تعلیم کو عام کرنے کے لیے جہاں سے بھی رقم مہیا ہو سکے، مخصوص کی جائے۔

وائسرائے لارڈ ہارڈنگ (۱۹۱۰ تا ۱۹۱٦ء) نے کونسل میں محمد علی جناح کی اہم قومی امور میں گہری دلچسپی، الجھے ہوئے مسائل کی تہ تک پہنچ جانے کی صلاحیت، دلکش خطابت اور زور دار طرز استدلال سے متاثر ہو کر اور کچھ اس لیے کہ ابھی ان کے پیش کردہ مسودۂ قانون وقف علی الاولاد پر بحث باقی تھی، انھیں مزید تین سال کے لیے کونسل کا رکن نامزد کر دیا۔ ۱۹۱٦ء کے انتخابات میں بمبئی کے شہریوں نے ایک بار پھر محمد علی جناح کو امپیریل کونسل کے لیے منتخب کیا۔ اس زمانے میں نہ صرف ایک قانون دان اور پارلیمنٹیرین کی حیثیت سے ان کی شہرت عروج پر پہنچ گئی تھی بلکہ سیاسی، سرکاری، عوامی غرضیکہ ہر طبقے کے لوگ ان کی بلندی کردار کے بھی دل سے معترف ہو چکے تھے۔

۱۹۱۰ سے ۱۹۱۹ء تک ہندوستان کی مجلس قانون ساز میں تقریباً ۳۵ اہم مسودہ ہائے قانون اور قراردادیں پیش ہوئیں، جن پر ہونے والی بحثوں میں محمد علی جناح کی دلچسپی اور سرگرمی کا اندازہ ان کی متعدد تقاریر سے ہو سکتا ہے (یہ اب چھپ چکی ہیں)۔ اس دور کا اہم ترین مسودۂ قانون رولٹ بل (Rawlatt Bill) تھا۔ یہ ہندوستانیوں کی عزت نفس اور رائے عامہ کو کچلنے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ اس کی سب سے زیادہ مخالفت محمد علی جناح نے کی اور اسے ایک غیر آئینی اقدام قرار دیا، لیکن سرکاری ارکان کی اکثریت کے بل بوتے پر جب اسے

قانون کی حیثیت مل گئی تو مارچ ١٩١٩ء میں وہ اس بنا پر کونسل سے بطور احتجاج مستعفی ہوگئے کہ رولٹ بل کو قانون بنا کر انصاف کے بنیادی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر عوام کے حقوق کو پامال کیا گیا ہے ۔

بحیثیت قانون دان محمد علی جناح کے کردار کی نمایاں خصوصیت خود اعتمادی اور خود داری تھی اور بحیثیت قانون ساز ان کی سب سے بڑی خوبی بے خوفی تھی ۔ سیاست میں وہ بنیادی طور پر اعتدال پسند تھے۔ ان کی حکمت عملی یہ تھی کہ جہاں حکومت غلطی پر ہو اس کی مخالفت کی جائے اور جہاں ٹھیک کام کر رہی ہو ؛ اس سے تعاون کیا جائے۔

پیام بر ہندو مسلم اتحاد : محمد علی جناح شروع ہی سے ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے اور بقول سروجنی نائیڈو وہ مسلم گوکھلے بننا چاہتے تھے ۔ ١٩١٠ء میں ہندو مسلم اتحاد کے لیے جو کانفرنس الہ آباد میں منعقد ہوئی اس میں وہ شریک ہوے۔ اگرچہ یہ کانفرنس اپنے مقاصد کے لحاظ سے کامیاب نہ ہو سکی ، لیکن محمد علی جناح نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور انڈین نیشنل کانگرس اور آل انڈیا مسلم لیگ کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے بالخصوص کوشاں رہے ۔

منٹو مارلے اصلاحات (١٩٠٩ء) سے برصغیر کی آئینی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو چکا تھا؛ کونسلوں میں توسیع ہوگئی تھی اور مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا حق تسلیم کر لیا گیا تھا ۔ بایں ہمہ ہندو مسلم دونوں ان اصلاحات سے خوش نہیں تھے ، خصوصاً مسلمان تو تنسیخ تقسیم بنگال (١٩١١ء) ، جنگ طرابلس (١٩١١ء) ، جنگ بلقان (١٩١٢-١٩١٣ء) اور سانحۂ مسجد کانپور (١٩١٣ء) ایسے حالات و واقعات سے بے حد مشتعل تھے؛ چنانچہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے فضا خاصی سازگار تھی ۔ ضرورت تھی تو صرف ایسے سمجھ دار سیاسی رہنماؤں کی جو اسے عملی شکل دے سکیں ۔ اس سلسلے میں گوکھلے اور جناح موزوں ترین تھے ، چنانچہ جب فروری ١٩١٥ء میں گوکھلے کا انتقال ہو گیا تو ہندو مسلم اتحاد کے لیے ہونے والی تمام تر مساعی کا بار محمد علی جناح کے کندھوں پر آ پڑا ۔

محمد علی جناح ١٩٠٦ء ہی سے انڈین نیشنل کانگرس کے رکن چلے آ رہے تھے،لیکن جب ١٩١٠ء کے بعد مذکورہ بالا سیاسی حوادث سے مسلمانوں میں ہلچل پیدا ہوئی اور وہ انگریزی حکومت کی حمایت اور اطاعت کا راستہ چھوڑ کر اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کرنے لگے تو محمد علی جناح مسلم لیگ کونسل کی دعوت پر اس کے جلسوں میں شریک ہونے لگے اور جب ١٩١٣ء کے سالانہ اجلاس لکھنؤ میں مسلم لیگ نے اپنے اساسی دستور میں یہ مطالبہ شامل کر لیا کہ وہ ہندوستان کے لیے مناسب خود مختاری کے حصول کی کوشش کرے گی تو محمد علی جناح نے ، جو ان دنوں گوکھلے کے ساتھ انگلستان میں مقیم تھے ، مولانا محمد علی (١٨٧٨ تا ١٩٣١ء) اور سید وزیر حسن (١٨٧٤ تا ١٩٤٧ء)کی دعوت پر مسلم لیگ میں باقاعدہ شمولیت اختیار کر لی ۔ اس طرح وہ انڈین نیشنل کانگرس اور آل انڈیا مسلم لیگ دونوں کے سرگرم رکن ہونے کی حیثیت سے باہمی اتحاد کے لیے مؤثر کوشش کرنے کے قابل ہو گئے .

اسی زمانے کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ محمد علی جناح نے انگلستان میں مقیم طلبہ کو اپنے حقوق کے تحفظ اور سیاسی طور پر منظم کرنے کے لیے انڈین سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی (١٩١٣ء)، جس نے آگے چل کر بڑی اہمیت حاصل کی.

دسمبر ۱۹۱۴ء میں وائسرائے کی کونسل میں نئی اصلاحات نافذ کرنے کے لیے انڈین نیشنل کانگرس نے برطانوی سیاست دانوں سے گفت و شنید کی غرض سے ایک وفد انگلستان بھیجا ، جس میں محمد علی جناح بھی شامل تھے ۔

انگلستان سے واپس آ کر انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے اپنی عملی کوششیں تیز تر کر دیں ؛ ۱۹۱۵ء میں نیشنل کانگرس کا سالانہ اجلاس بمبئی میں ہونا طے پایا تو ان کی تجویز پر مسلم لیگ کے رہنماؤں نے اعلان کیا کہ انھیں ایام میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بھی بمبئی ہی میں منعقد کیا جائے گا۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ اس طرح لیگ کو کانگرس میں ضم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور نوکر شاہی نے بھی اس خدشے کو ابھار کر مسلم لیگ کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی ؛ لیکن محمد علی جناح نے ان کی ریشہ دوانیوں کا پردہ چاک کرتے ہوے واضح الفاظ میں بتایا کہ دونوں جماعتوں کا بیک وقت اجلاس منعقد کرنے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ دونوں جماعتوں کے درمیان دوستی اور اتحاد کو فروغ دیا جائے تاکہ خود مختاری کی منزل قریب تر لائی جا سکے ۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۱۵ء کو لیگ کا اجلاس زیر صدارت مظہر الحق (۱۸۶۶ تا ۱۹۲۱ء) منعقد ہوا ، جس میں لارڈ سنہا (۱۸۵۴ تا ۱۹۰۴ء) ، سریندر ناتھ بینرجی (۱۸۴۸ تا ۱۹۲۵ء) ، گاندھی جی (۱۸۶۹ تا ۱۹۴۸ء) اور سروجنی نائیڈو (۱۸۷۹ تا ۱۹۵۰ء) ایسے چوٹی کے ہندو رہنماؤں نے شرکت کی۔ حکومت کی شہ پر شرارت پسند عناصر اجلاس میں گڑ بڑ پھیلانے پر تلے ہوئے تھے اور اس ضمن میں انھیں بمبئی کے گورنر لارڈ ولنگڈن کی در پردہ حمایت بھی حاصل تھی ؛ چنانچہ دوسرے روز جب محمد علی جناح قرارداد پیش کرنے کے لیے اٹھے تو ان لوگوں نے اس قدر شور و غوغا برپا کیا کہ اجلاس ملتوی کرنا پڑا اور باقی کارروائی کی تکمیل اگلے دن تاج محل ہوٹل میں ہوئی۔ محمد علی جناح کی تجویز اور ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ تا ۱۹۵۸ء) کی تائید سے یہ قرارداد منظور ہوئی کہ مسلم لیگ کی ایک کمیٹی تشکیل دی جائے جو دوسری سیاسی جماعتوں کے مشورے سے اصلاحات کی سکیم تیار کرے ۔ اسی طرح کی ایک کمیٹی کانگرس نے بھی تشکیل دی ۔ دونوں جماعتوں کی کمیٹیوں نے مل کر اصلاحات کی جو عارضی سکیم تیار کی وہ اکتوبر ۱۹۱۶ء میں انڈین نیشنل کانگرس کی مجلس عاملہ اور مسلم لیگ کی کونسل کے مشترکہ اجلاس میں زیر غور آئی ۔ ان سب کارروائیوں کے روح رواں محمد علی جناح ہی تھے ۔ دوسری طرف انھوں نے امپیریل کونسل میں اپنے ہم خیال ارکان کے دستخطوں سے ایک یادداشت وائسرائے کو بھجوائی۔

دسمبر ۱۹۱۶ء میں دونوں جماعتوں کے اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوے۔ کانگرس کے اجلاس کے صدر آر۔ سی ۔ موجمدار تھے۔ مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت محمد علی جناح نے کی اور اپنے انتہائی فکر انگیز خطبۂ صدارت میں جملہ سیاسی مسائل کا مدبرانہ جائزہ لے کر ہندو مسلم اتحاد اور ملک کی آزادی کے لیے مشترکہ کوششوں پر زور دیا گیا ۔

المختصر محمد علی جناح کی کوششوں سے میثاق لکھنؤ تشکیل پایا۔ یہ ایک اہم دستاویز تھی ، جس میں ہندوستان کے لیے زیادہ خود مختاری اور کونسلوں میں توسیع کا مطالبہ کیا گیا۔ مسلمانوں کے جداگانہ طریق انتخاب کو ، جس کی کانگرس شروع سے مخالف رہی تھی ، قبول کر لیا گیا اور یوں نہ صرف مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت کو بلکہ آل انڈیا مسلم لیگ کو بھی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت

تسلیم کر لیا گیا ۔ حقیقت یہ ہے کہ کانگرس اس معاہدے میں اس طرح جکڑی گئی کہ پھر اس سے نکل نہ سکی۔ بلاشک و شبہہ میثاق لکھنؤ محمد علی جناح کی سیاست کا شاہکار تھا ۔

اسی زمانے میں ہوم رول لیگ کی تحریک تیزی سے بڑھنے لگی، جس کا بنیادی مقصد آزادی ہند کا حصول تھا۔ جون ۱۹۱۷ء میں اس کی صدر اینی بیسنٹ (۱۸۴۷ تا ۱۹۳۳ء) گرفتار کر لی گئیں، جس پر محمد علی جناح نے شدید رد عمل کا اظہار کیا اور اس تحریک میں باقاعدہ شامل ہو کر بمبئی ہوم رول لیگ کی صدارت کے فرائض بھی سنبھال لیے ۔ گویا اب وہ بیک وقت برصغیر کی تین اہم ترین سیاسی تنظیموں کے صف اول کے رہنما تھے ۔

پہلی جنگ عظیم کے حالات کے پیش نظر وزیر ہند مانٹیگو نے ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو برطانوی حکومت کی طرف سے ہندوستان کو تدریجاً خود مختاری دینے کا اعلان کیا، جس کا ملک بھر میں خیر مقدم کیا گیا ۔ حالات کا جائزہ لینے کے لیے وزیر ہند نے ہندوستان بھر کا دورہ کیا اور مختلف وفود اور سیاسی رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں۔ مانٹیگو نے محمد علی جناح کی ذہانت اور سیاسی فراست سے متاثر ہو کر اپنی ڈائری میں لکھا کہ یہ کتنی زیادتی کی بات ہے کہ ایسے شخص کو ہندوستان کے نظم و نسق میں شامل نہیں کیا گیا ۔

وزیر ہند کے اس اعلان سے جو خوشگوار توقعات پیدا ہوئی تھیں ان پر اس وقت پانی پھر گیا جب ۱۹۱۸ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ چھپ کر سامنے آئی۔ اس کا فوری رد عمل ہوا اور حکومت مخالفت کو کچلنے کے لیے جابرانہ قانون نافذ کرنے پر اتر آئی۔ اس ضمن میں ہوم رول لیگ نے بالخصوص بہت سرگرم کردار ادا کیا ۔ حکومت کی پر زور مخالفت میں محمد علی جناح پیش پیش تھے ۔ ان کے بارے میں بمبئی کے گورنر لارڈ ولنگڈن کے مخاصمانہ رویے کی یہی وجہ تھی ۔ اس چپقلش کا عوامی سطح پر اظہار اس وقت ہوا جب ۱۰ دسمبر ۱۹۱۸ء کو لارڈ ولنگڈن کی سبکدوشی کے موقع پر بمبئی کے شیرف نے ان کے اعزاز میں جلسہ بلانے اور شہریوں کی طرف سے سپاسنامہ پیش کرنے کا اعلان کیا ۔ محمد علی جناح کی قیادت میں لوگوں نے ہال پر قبضہ کر لیا، پولیس آئی، ہنگامہ ہوا اور جلسہ درہم برہم ہوگیا۔ بمبئی کے عوام نے اپنے لیڈر کی اس کامیابی پر یوں خراج تحسین ادا کیا کہ ایک روپیہ فی کس چندے سے ۶۵ ہزار روپے جمع کر کے جناح ہال تعمیر کیا گیا۔

۱۹۲۰ء میں محمد علی جناح ایک بار پھر آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے اور اس کے سالانہ اجلاس منعقدۂ کلکتہ میں اپنے خطبۂ صدارت میں انہوں نے رولٹ ایکٹ، حادثۂ جلیانوالہ باغ اور مارشل لا انتظامیہ کے بہیمانہ مظالم کی شدید مذمت کی۔ مزید برآں ترکیہ کے مسئلے پر بھی اپنے انتہائی دکھ کا اظہار کیا ۔ انہی دنوں ان کا انڈین نیشنل کانگرس سے پہلی بار اختلاف پیدا ہوا، جس پر اب گاندھی جی کا اثر و رسوخ غالب آتا جا رہا تھا۔ محمد علی جناح بنیادی طور پر ایک آئین پسند سیاست دان تھے اور غیر آئینی ہتھکنڈوں کے شدید مخالف تھے، چنانچہ دسمبر ۱۹۲۰ء میں جب ناگپور میں کانگرس کے سالانہ اجلاس کے دوران میں گاندھی جی کے ایما پر عدم تعاون کی قرارداد منظور ہوئی تو وہ اس سے اختلاف کرتے ہوئے کانگرس سے مستعفی ہوگئے ۔ ادھر ہوم رول لیگ بھی رفتہ رفتہ کانگرس کی طفیلی جماعت بنتی جا رہی تھی، چنانچہ انہوں نے اس سے بھی علیحدگی اختیار کر لی۔

پارلیمانی زندگی (۱۹۲۳ تا ۱۹۳۱ء):

۱۹۱۹ء میں امپیریل کونسل سے مستعفی ہونے کے بعد محمد علی جناح چار برس تک

پارلیمانی زندگی سے علیحدہ رہے ۔ ۱۹۲۰ء کے انتخاب میں انھوں نے احتجاجاً حصہ نہیں لیا، البتہ جب نومبر ۱۹۲۳ء میں مرکزی مجلس قانون ساز (جسے نئے ایکٹ کی رو سے امپیریل کونسل کے بجائے سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی کا نام دیا گیا تھا) کے انتخابات ہوئے تو وہ اپنے سابقہ حلقے سے بلا مقابلہ منتخب کر لیے گئے ۔ اس موقع پر انھوں نے اپنے انتخابی منشور میں اعلان کیا کہ میں حکومت سے کسی منصب اور خطاب کا خواہاں نہیں اور عوام کا مفاد اور ملکی فلاح ماضی کی طرح میرے مستقبل کے بھی رہنما اصول ہوں گے ۔ نومبر ۱۹۲۶ء میں وہ ایک بار پھر اسی حلقے سے منتخب ہوئے ۔

۱۹۱۹ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کو بحیثیت مجموعی ہندوستانیوں نے رد کر دیا تھا اور گاندھی جی کے زیر اثر کانگرس نے عدم تعاون کی پالیسی اختیار کر لی تھی ، تاہم جب دوبارہ انتخابات ہوئے تو بعض اعتدال پسند کانگرسیوں نے سی ۔ آر ۔ داس (۱۸۷۰ تا ۱۹۲۵ء) اور موتی لال نہرو (۱۸۶۱ تا ۱۹۳۱ء) کے زیر قیادت نئی اصلاحات کو اسمبلی کے اندر جا کر ناکام بنانے کا فیصلہ کیا اور یوں سوراج پارٹی کی تشکیل عمل میں آئی ۔ اس میں انھیں محمد علی جناح کا تعاون بھی حاصل تھا، جو اس وقت مرکزی اسمبلی میں اٹھائیس آزاد ارکان کی جماعت کے قائد تھے ۔ اگرچہ ان دونوں جماعتوں نے مل کر نیشنل پارٹی کی صورت اختیار کر لی تھی، لیکن محمد علی جناح نے حسب سابق سوراج پارٹی کی حمایت کی تو صرف اس وقت جب انھیں اس کا موقف درست نظر آیا؛ چنانچہ ۱۹۲۵-۱۹۲۶ء کے مالیاتی قوانین کے سلسلے میں ان کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا ۔

۱۹۲۴ء میں آئینی اصلاحات پر عمل درآمد کا جائزہ لینے کے لیے حکومت نے وائسرائے کی کونسل کے ایک ممبر سر الیگزنڈر موڈی مان Sir Alexander Muddiman کے زیر صدارت ایک کمیٹی تشکیل دی تو محمد علی جناح کو بھی اس کا رکن نامزد کیا گیا ۔ اس کمیٹی نے چار ماہ کی محنت کے بعد گورنر جنرل کو دو رپورٹیں ، اکثریتی رپورٹ اور اقلیتی رپورٹ ، پیش کیں ، جن میں سے اقلیتی رپورٹ پر محمد علی جناح نے دستخط کیے ۔

ہندوستانی فوج کو ”ہندوستانی“ بنانے کے سلسلے میں محمد علی جناح شروع سے زور دیتے چلے آ رہے تھے ۔ اگرچہ ۱۹۱۸ء میں ہندوستانیوں کے لیے سینڈھرسٹ کے فوجی تربیتی ادارے میں دس اسامیاں نکال کر ان کے لیے شاہی کمیشن میں داخلے کا راستہ کھول دیا گیا تھا ، لیکن یہ پیش رفت تسلی بخش نہ تھی ۔ ۱۹۲۴ء میں بجٹ پر بحث کرتے ہوئے محمد علی جناح نے یہ سوال بھی اٹھایا اور ہندوستان میں سینڈھرسٹ کی طرز کا کالج کھولنے کی قرارداد منظور کرائی ۔ اس ضمن میں چیف آف جنرل سٹاف سر اینڈریو سکین Sir Andrew Sakeen کی سرکردگی میں ایک کمیٹی قائم کی گئی، جس کے ایک رکن محمد علی جناح بھی تھے ۔ بالآخر ان کی کوششیں رنگ لائیں اور ۱۹۲۶ء میں ڈیرہ دون فوجی کالج قائم کرنے فیصلہ ہو گیا ۔ ۱۹ جولائی کو محمد علی جناح اسمبلی سے مستعفی ہو گئے ۔

سیاسی زندگی (۱۹۲۰ء - ۱۹۳۰ء) :

بیسویں صدی کا تیسرا عشرہ ہندوستانیوں، بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بڑا ہنگامہ خیز تھا ۔ اتحادیوں ، خصوصاً برطانیہ نے سلطنت عثمانیہ کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ، اس کا یہاں شدید رد عمل ہوا ، جو پہلے تحریک ہجرت (۱۹۲۰ء) ، پھر تحریک خلافت (۱۹۱۹ تا ۱۹۲۴ء) کی صورت میں ظاہر ہوا ۔ ان تمام واقعات سے محمد علی جناح بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے ۱۹۲۰ء میں اپنے خطبۂ صدارت میں اپنے جذبات کی شدت کا پر زور اظہار

کیا ۔ بایں همه وہ تحریک خلافت کے حامی ہونے کے باوجود سیاست میں کسی طرح کے تشدد کے قائل نہ تھے ۔ ان کے نزدیک ہندوستان کے تمام سیاسی اور خصوصاً اقلیتی مسائل کا حل ہندو مسلم اتحاد میں مضمر تھا ۔ میثاق لکھنؤ کے تحت ہندو مسلم اتحاد کی جو تحریک شروع ہوئی تھی وہ ۱۹۲۰ء کے بعد گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون کے باعث ماند پڑنے لگی ، لیکن جب تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون کا زور ٹوٹا تو محمد علی جناح نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے اپنی مساعی کا از سر نو آغاز کر دیا ۔ مئی ۱۹۲۴ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں انہوں نے گاندھی جی کی پالیسیوں پر سخت تنقید کی ، جن کے تحت مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کو بہر نوع ختم کرکے انھیں پوری طرح کانگرس میں ضم کرنا تھا ۔

مارچ ۱۹۲۷ء میں محمد علی جناح نے سربرآوردہ مسلمان رہنماؤں کا ایک اجلاس دلی میں طلب کیا ۔ اس میں ایک مصالحتی فارمولا تشکیل پایا ، جس کے اہم نکات یہ تھے : (۱) مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کے لیے ایک تہائی نشستیں ؛ (۲) پنجاب اور بنگال میں آبادی کی بنیاد پر نمائندگی ؛ (۳) شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان میں آئینی اصلاحات اور (۴) سندھ کی بمبئی سے علیحدگی ۔ یہ فارمولا انڈین نیشنل کانگرس نے رد کر کے ثابت کر دیا کہ وہ مسلمانوں کو ان کے جائز آئینی حقوق دینے پر آمادہ نہیں ۔

اسی زمانے کا ایک اہم واقعہ سائمن کمیشن کی آمد ہے ۔ ۱۹۲۷ء میں برطانوی حکومت نے ۱۹۱۹ء کی اصطلاحات پر نظر ثانی کے مطالبے کے پیش نظر ملکی حالات کا جائزہ لینے کے لیے سر جان سائمن کی سرکردگی میں ایک کمیشن مقرر کیا ، جسے محمد علی جناح نے اس اعتبار سے ایک غیر آئینی اور غیر اخلاقی اقدام قرار دیا کہ ہندوستان کے آئین اور کروڑوں ہندوستانیوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے کمیشن میں ایک بھی ہندوستانی شامل نہیں ۔ مجموعی طور پر ہر جگہ اس کمیشن کا استقبال کالی جھنڈیوں سے کیا گیا ۔ کانگرس بھی اس بائیکاٹ میں شریک تھی ، تاہم ہندوؤں کے مخاصمانہ رویے کے باعث مسلمانوں کا ایک گروہ کمیشن سے تعاون پر آمادہ ہو گیا تھا ؛ چنانچہ اس مسئلے پر مسلم لیگ دو دھڑوں ، یعنی جناح لیگ اور شفیع لیگ میں تقسیم ہو گئی ۔

سائمن کمیشن کی ناکامی کے بعد وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ نے ہندوستانیوں کو چیلنج کیا کہ وہ خود کوئی متفقہ آئین تیار کرکے دکھائیں ۔ اس سلسلے میں آل پارٹیز کانفرس نے موتی لال نہرو کی سربراہی میں ایک کمیٹی تشکیل کی ، جس نے اپنے مسلمان رکن شعیب قریشی کے اختلافی نوٹ کے باوصف ایک رپورٹ مرتب کرکے پیش کر دی ، جس میں کامل آزادی کے بجائے نو آبادیاتی درجے ، مخلوط انتخاب اور وحدانی طرز حکومت کا مطالبہ کیا گیا ۔ یہ رپورٹ اگست ۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ میں پیش کی گئی اور مسلمان رہنماؤں کی سخت مخالفت کے باوجود ہندو اکثریت نے اسے منظور کر لیا ۔ اس طرح ہندو مسلم اختلافات کی خلیج اور بھی وسیع ہو گئی ۔ اس زمانے میں محمد علی جناح انگلستان میں تھے ۔ انہوں نے واپس آ کر دسمبر ۱۹۲۸ء میں تمام پارٹیوں کا ایک کنونشن طلب کیا ، جس میں شفیع لیگ کے سوا تقریباً تمام اہم سیاسی جماعتوں نے شرکت کی ۔ محمد علی جناح نے نہرو رپورٹ کو قابل قبول بنانے کے لیے ۱۹۲۷ء کے دلی مصالحتی فارمولے (یعنی مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی ایک تہائی نمائندگی ؛ دس سال کے لیے پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو آبادی کی بنیاد پر نمائندگی ؛

صوبوں کے لیے اضافی اختیارات، سرحد اور بلوچستان میں آئینی اصلاحات اور سندھ کی بمبئی سے علیحدگی) کو اس میں شامل کرنے پر زور دیا ؛ لیکن کنونشن کی سب کمیٹی نے اسے مسترد کر دیا ۔ ۲۸ دسمبر کو کنونشن کے کھلے اجلاس میں جناح نے ایک بار پھر اپنی ہر ترمیم کے سلسلے میں ٹھوس دلائل دیتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد اور مفاہمت پر زور دیا، لیکن ہندو مہا سبھائی ذہنیت سے کانگرس کے کرتا دھرتا اس قدر مرعوب ہو چکے تھے کہ وہ نہرو رپورٹ میں کوئی تبدیلی قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ تھے ۔ محمد علی جناح نے اعلان کیا کہ چونکہ اس رپورٹ میں مسلمانوں کے اساسی مقاصد کے تحفظ کا کوئی سامان موجود نہیں ، اس لیے عامۃ المسلمین کے لیے یہ کسی صورت میں قابل قبول نہیں ۔

نہرو رپورٹ کے سلسلے میں ہندو رہنماؤں کی ضد اور ہٹ دھرمی نے بالآخر ہندو مسلم اتحاد کے پیامبر محمد علی جناح کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ اب ہماری راہیں الگ الگ ہو گئی ہیں ۔

مسلمانوں میں تنظیم کا فقدان : دراصل نہرو رپورٹ سے ہندوؤں کا یہ منصوبہ پوری طرح عیاں ہو گیا تھا کہ وہ برصغیر میں "رام راج" قائم کرنا چاہتے ہیں، جس میں مسلمانوں کو ایک مستقل اقلیت کی حیثیت سے ان کے رحم و کرم پر رہنا ہوگا ۔ محمد علی جناح مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں بے حد فکر مند تھے ، لیکن مسلمانوں میں تنظیم اور اتحاد کے فقدان کے باعث ان کی مساعی بار آور نہیں ہو رہی تھیں۔ موڈی مان کمیٹی میں اور بعد ازاں سائمن کمیشن کے معاملے میں محمد علی جناح اور سر شفیع کے درمیان اختلاف رائے نے مسلم لیگ کو دو دھڑوں میں تقسیم کر دیا تھا ۔ ان کے علاوہ ایک اچھا خاصا گروہ ان کانگرسی مسلمانوں کا تھا جو نہرو رپورٹ کے حامی تھے ۔ یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو بعض مسلمان رہنماؤں نے کانگرس اور ہندوؤں سے مایوس ہو جانے کے بعد تمام مسلمان جماعتوں کی ایک کانفرنس دہلی میں طلب کی تاکہ مسلمانوں کے حقوق کے تعین اور تحفظ کے بارے میں اتفاق رائے ہو جائے ۔ کانفرنس نے نہرو رپورٹ کی مذمت کی اور تجاویز دہلی کی اساس پر ، لیکن مخلوط انتخاب کے ذکر کو نظر انداز کرتے ہوئے، سر شفیع کی پیش کردہ ایک طویل قرارداد میں حکومت سے مطالبہ کیا کہ ہندوستان کے دستور اساسی میں مسلمانوں کے حقوق کا پورا لحاظ رکھا جائے ۔

محمد علی جناح اس کانفرنس میں شریک نہیں ہوئے ، لیکن مارچ ۱۹۲۹ء میں انھوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدۂ دہلی میں حسب ذیل مصالحتی فارمولا پیش کیا، جو اسلامیان ہند کی تاریخ میں "چودہ نکات" کے نام سے مشہور ہے :

۱۔ آئین وفاقی ہوگا : مابقی (residuary) اختیارات صوبوں کو حاصل ہوں گے ۔
۲۔ تمام صوبوں کو یکساں خود مختاری حاصل ہوگی ۔
۳۔ ملک میں مجالس قانون ساز اور دوسرے نمائندہ اداروں میں اقلیتوں کو مؤثر نمائندگی حاصل ہوگی ، لیکن کسی صوبے کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل نہیں کیا جائے گا ۔
۴۔ مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کو ایک تہائی سے کم نمائندگی نہیں دی جائے گی ۔
۵۔ جداگانہ طریق انتخاب کا اصول فی الحال جاری رہے گا البتہ ہر اقلیت کے لیے آزادی ہوگی کہ وہ کسی موقع پر مخلوط طریق انتخاب کے حق میں دست بردار ہو جائے ۔
۶۔ بنگال ، پنجاب اور سرحد میں نئی حد بندی کی اجازت نہیں دی جائے گی ۔

۷۔ هر ایک کو مذهبی آزادی حاصل هوگی (مذهبی آزادی سے مراد عقیده ، عبادت ، تعلیم، جماعت اور پراپیگنڈے کی آزادی هے)۔

۸۔ ملک میں کسی بھی مجلس قانون ساز یا نمائنده ادارے میں کوئی بل یا قرارداد یا اس کا کوئی حصه ، جو کسی اقلیت کے خلاف هو اور اس اقلیت کے تین چوتھائی نمائندے اس کے خلاف هوں ، زیر بحث نهیں لایا جا سکتا ۔

۹۔ سنده کو احاطهٔ بمبئی سے علیحده کر کے ایک نیا صوبه بنایا جائے ۔

۱۰۔ صوبه سنده اور بلوچستان میں دوسرے صوبوں کے مطابق اصلاحات کی جائیں ۔

۱۱۔ تمام سرکاری ملازمتوں اور بلدیاتی اداروں میں مسلمانوں کو معقول حصه دیا جائے ۔

۱۲۔ مسلمانوں کی ثقافت، تعلیم، زبان، مذهب، قانون اور خیراتی اداروں کی ترقی اور حفاظت کے لیے انتظام کیا جائے ۔

۱۳۔ مرکزی اور صوبائی وزارتوں میں مسلمانوں کو ایک تهائی نمائندگی دی جائے ۔

۱۴۔ وفاقی یونٹوں کے مشورے کے بغیر مرکزی دستور ساز اسمبلی کسی بھی تبدیلی کی مجاز نه هوگی ۔

مسلم کانفرنس میں سر شفیع نے جو قرارداد پیش کی تھی وه بھی چوده نکات پر مشتمل تھی ، لیکن ایک تو محمد علی جناح کے چوده نکات کے مقابلے میں اس کی زبان اور اسلوب میں اختصار اور سادگی کے بجائے ، جو آئین سازی کی روح هے ، تصنع اور لفاظی تھی ، جس سے جگه جگه معنوی اعتبار سے الجھاؤ پیدا هوگیا تھا ، مثلاً وه وفاقی یونٹوں کے لیے "صوبه" کے بجائے "ریاست" کا لفظ استعمال کرتے هیں، قرارداد میں نهرو رپورٹ کا تذکره تک نهیں کرتے ، مذهب کے تحفظ کی بات کرتے هیں تو ثانوی حیثیت سے ، اسلامی ثقافت کے بارے میں وه بالکل خاموش هیں اور مسلمانوں کی ایک زبان یعنی "اردو کے بجائے کئی زبانوں کی حفاظت اور ترقی کے طالب هیں ، جو ان کے علاقائی ذهن کی عکاسی کرتا هے؛ دوسرے وه مسلم اکثریتی صوبوں میں هندوؤں کو ان کی تعداد سے زیاده نمائندگی دینے پر آماده هیں بحالیکه محمد علی جناح ان صوبوں میں ایسی کسی تبدیلی کو برداشت کرنے کے لیے تیار نه تھے جس سے ان کی اکثریت متأثر هو ۔ اسی طرح مسلمانوں کے ذاتی قوانین اور مرکز اور صوبائی وزارتوں میں مسلمانوں کے تناسب کے مسئلے پر بھی سر شفیع کا ذهن صاف نه تھا ۔

محمد علی جناح نے چوده نکات دراصل ایک طرف مسلمانوں کو متحد کرنے اور دوسری طرف هندوؤں اور انگریزوں کے ساتھ سیاسی اور آئینی جنگ لڑنے کے لیے مرتب کیے تھے ۔ ان کی تشکیل سے جو نتائج برآمد هوئے وه فوری بھی تھے اور دور رس بھی ۔ شفیع گروپ کو آل انڈیا مسلم لیگ میں دوباره شامل هونے کا ایک موقع مهیا کیا گیا اور اس کا زور ٹوٹ گیا ، چنانچه اگلے سال ۱۹۳۰ء میں علامه اقبال نے ، جو قبل ازیں شفیع گروپ کے ساتھ تھے ، آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کرتے هوئے اپنا تاریخی خطبه دیا اور یوں برصغیر میں اسلامی ریاست کا تصور آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پیش هوا ۔ دوسری طرف آل انڈیا دهلی مسلم کانفرنس کی هر دلعزیزی بھی ختم هوگئی، جس کی بنیاد هی سر شفیع کی قرارداد پر تھی ، لیکن اب اس کی جگه محمد علی جناح کے چوده نکات نے لے لی تھی ۔ یه ان کی عظیم سیاسی کامیابی تھی که انهوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے مقابلے میں ابھرنے والی بڑی طاقت ور تنظیموں کو پنپنے کا موقع نه دیا

اور اسلامیان ہند مزید اختلافات اور انتشار کا شکار ہونے سے بچ گئے ۔

جہاں تک چودہ نکات کی تشکیل کے دور رس نتائج کا تعلق ہے ، ان کے ذریعے مسلمانوں کو ایسی مضبوط بنیاد مل گئی کہ اب وہ اپنے حقوق کی جنگ زیادہ اعتماد سے لڑ سکتے تھے ۔ ہندو مسلمانوں کے مطالبات کو ، جن میں پہلا مطالبہ وفاقی طرز حکومت کا قیام تھا ، سرے سے ماننے کے لیے ہی تیار نہیں تھے ۔ وہ صدارتی طرز حکومت کے ذریعے اپنی مستقل اکثریت کے بل پر پورے برصغیر میں ہندو راج کے قیام کا خواب دیکھ رہے تھے ۔ مسلمان مرکز کو کم سے کم اور صوبوں کو زیادہ سے زیادہ حقوق دینے کا مطالبہ اس لیے رہے تھے کہ یوں وہ اپنے حقوق کی حفاظت بہتر طور پر کر سکتے تھے ۔ سرحد اور بلوچستان میں آئینی اصلاحات اور سندھ کی احاطہ بمبئی سے علیحدگی کی مخالفت کے پیچھے بھی یہی مسلم دشمنی کار فرما تھی ۔ انھیں یہ خوف تھا کہ شمال مغرب میں مسلم اکثریتی صوبوں کا ایک ایسا بلاک بن جائے گا جس کی پشت پر افغانستان ، ایران اور دیگر مسلم ممالک واقع ہیں ۔ بہرحال مسلمان اپنے تمام اندرونی اختلافات کے باوجود ان مطالبات پر متحد رہے اور انگریزوں کو بھی ، جو ہر قیمت پر ہندو اکثریت کو خوش رکھنا چاہتے تھے ، ان مطالبات کو ہر اہم موقع پر مد نظر رکھنا پڑا ۔ سائمن کمیشن کی رپورٹ ہو یا گول میز کانفرنس ، ۱۹۳۲ء کا کمیونل ایوارڈ یا ۱۹۳۳ء کا قرطاس ابیض ، سلیکٹ کمیٹی کی تجاویز ہوں یا ۱۹۳۵ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ، وہ ان کو کسی موقع پر بھی نظر انداز نہ کر سکے ۔ اگرچہ مسلمانوں کے مطالبات کلیۃً تو تسلیم نہیں کیے گئے ، تاہم ان میں سے بیشتر کو ہندوؤں کی مخالفت کے باوجود اور اپنی مرضی کے خلاف انھیں منظور کرنا پڑا ۔ نئے آئین کے تحت وفاقی طرز حکومت کے اصول کو تسلیم کر لیا گیا ، جداگانہ طریق انتخاب بر قرار رکھا گیا ۔ سرحد میں اصلاحات کر دی گئیں ، بلوچستان میں بھی اس ضمن میں ابتدائی اقدامات کیے گئے ، سندھ کو ایک جداگانہ صوبے کی حیثیت دے دی گئی ، اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کی ضمانت دی گئی اور مسلم اکثریتی صوبوں ، خصوصاً پنجاب اور بنگال میں نئی حد بندیوں سے گریز کیا گیا ۔ مسلمانان ہند کی اس بہت بڑی کامیابی میں اہم ترین کردار محمد علی جناح نے ادا کیا ، جنھوں نے اپنے چودہ نکات کی بنیاد پر مسلمانوں کے حقوق کے لیے آئینی جنگ انتہائی تدبر اور فراست سے لڑی ۔

پارلیمانی زندگی (۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۷ء): گول میز کانفرنس (۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۲ء) کے بعد محمد علی جناح نے انگلستان میں مستقل رہائش کا فیصلہ کر لیا ، چنانچہ انھوں نے جون ۱۹۳۱ء میں مجلس قانون ساز سے استعفا دے دیا ۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں بمبئی کے مسلمانوں نے انھیں ان کی غیر حاضری میں دوبارہ منتخب کر لیا ۔ اسی طرح دسمبر ۱۹۴۵ء میں وہ ایک بار پھر اسی حلقے سے حسین لال بھائی کو بری طرح شکست دے کر انتخابات میں کامیاب ہو گئے ۔

۱۹۳۴ء اور ۱۹۴۰ء کے مابین محمد علی جناح نے اسمبلی کی کارروائیوں میں بڑا اہم حصہ لیا ۔ انھوں نے "آزاد" ارکان کی پارٹی پھر منظم کر لی ، جس کے ۲۲ ارکان میں سے ۱۸ مسلمان تھے ۔ اسمبلی میں منتخب جماعتوں کی پوزیشن یہ تھی کہ سرکاری ارکان کی کل تعداد ۵۰ تھی اور کانگرس ارکان کی ۴۴ ۔ نیشنلسٹ پارٹی کے ۱۱ ممبر بھی اکثر کانگرس ہی کا ساتھ دیتے تھے ۔ صورت حال یہ تھی کہ کسی قرارداد کی کامیابی کا انحصار اس امر پر موقوف تھا کہ محمد علی جناح کی پارٹی کس کا ساتھ

دیتی ہے ۔ ۱۹۳۵ء تک ان کی حکمت عملی عموماً یہی رہی کہ کانگرس پارٹی کے ساتھ ہر ممکن تعاون کیا جائے ، چنانچہ اس سال مرکزی اسمبلی کے پہلے اجلاس میں حکومت کو سات بار شکست کا سامنا کرنا پڑا ۔ کانگرس اور آزاد پارٹی کے باہمی تعاون سے حکومت کو مالی مسودوں پر جو زک اٹھانا پڑی اس سے حکومتی حلقوں میں تہلکہ مچ گیا ۔

اس زمانے میں محمد علی جناح کی پارلیمانی حکمت عملی کا شاہکار کمیونل ایوارڈ کی منظوری ہے ۔ جائنٹ پارلیمنٹری رپورٹ تین حصوں پر مشتمل تھی : فیڈرل سکیم ، پروونشل سکیم اور کمیونل ایوارڈ ۔ کانگرس فیڈرل سکیم اور کمیونل ایوارڈ کے سخت خلاف تھی اور گورنمنٹ فیڈرل سکیم کے حق میں تھی ۔ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کمیونل ایوارڈ پر مبنی تھا ، چنانچہ محمد علی جناح نے اس موقع پر کانگرس پارٹی سے اختلاف کیا اور اپنی پارٹی کی مدد سے کمیونل ایوارڈ منظور کرا لیا ۔

۱۹۳۶ء اور ۱۹۴۰ء کے مابین اسمبلی میں کانگرس پارٹی کے ساتھ تعاون برقرار نہ رہ سکا ۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں کانگرس پارٹی کو اتنی بڑی کامیابی حاصل ہوئی کہ ملک کے بیشتر صوبوں میں ان کی وزارتیں قائم ہو گئیں ۔ اس اقتدار سے کانگرسی قیادت کا ذہنی توازن اتنا بگڑا کہ ان کی نظر میں مسلمانوں اور ان کے حقوق کی کوئی اہمیت ہی نہ رہی ۔ اسمبلی میں کانگرس کے ساتھ اختلافات کا اندازہ محمد علی جناح کی اس زمانے کی تقریر سے بخوبی ہو سکتا ہے ۔ اب وہ ہر موقع پر دو قومی نظریے کو بر ملا پیش کرنے لگے ۔

۱۹۴۰ سے ۱۹۴۷ء تک اگرچہ محمد علی جناح کو اپنی سیاسی مصروفیات کے باعث مرکزی اسمبلی کی کارروائیوں میں حصہ لینے کا بہت کم موقع ملا ، لیکن جب بھی یہ موقع ملا انھوں نے دو قومی نظریے اور مطالبۂ پاکستان کی وکالت کا قرار واقعی حق ادا کیا ۔

سیاسی زندگی (۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۹ء) :

محمد علی جناح ۱۹۲۹ء میں کانگرس کے رویے اور ہندوستان کے مجموعی حالات سے انتہائی برگشتہ خاطر ہو چکے تھے ۔ اسی سال انھیں اپنی رفیقۂ حیات کی وفات کا صدمہ بھی اٹھانا پڑا ۔ بایں ہمہ وہ سیاست میں بدستور دلچسپی لیتے رہے ، جس کا ثبوت وائسرائے لارڈ ارون (۱۹۲۶ تا ۱۹۳۱ء) کے ساتھ ان کی خط و کتابت سے ہوتا ہے ۔ اس خط و کتابت میں انھوں نے ہندوستان کے سیاسی اور آئینی مسائل کا حل دریافت کرنے کے لیے اس بات پر بالخصوص زور دیا کہ ایک گول میز کانفرنس طلب کی جائے ۔ اس کانفرنس کا مطالبہ وہ ۱۹۲۲ء سے کرتے چلے آ رہے تھے ۔ بالآخر حالات کی نزاکت نے برطانوی حکومت کو نومبر ۱۹۳۰ء میں پہلی گول میز کانفرنس منعقد کرنے پر مجبور ہونا پڑا ، جو جنوری ۱۹۳۱ء تک جاری رہی ۔

پہلی گول میز کانفرنس میں شامل ہونے والے ستاون ہندوستانی مندوبین میں مسلمانوں کی تعداد سولہ تھی ۔ ان میں محمد علی جناح کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کانفرنس کے صدر وزیر اعظم برطانیہ کی تقریر کے بعد ہندوستانی مندوبین میں سب سے پہلی تقریر انھیں نے کی اور اس میں حکومت برطانیہ کو اس کے وعدے یاد دلاتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان کے ہر فرقے کے لوگوں کے حقوق کا خیال رکھا جائے اور ایسا دستور بنایا جائے جو ہندوستان میں سب کے لیے اور خاص طور پر مسلمانوں کے قابل قبول ہو ۔ بعد ازاں اس ضمن میں نو کمیٹیاں تشکیل دی گئیں ، جن میں سے وفاقی ڈھانچے ، دفاع اور سندھ سے

متعلق کمیٹیوں میں انہیں شامل کیا گیا اور ان تینوں مجالس میں انہوں نے مسلمانوں کے حقوق کی خوب وکالت کی ۔

دوسری گول میز کانفرنس ۱۹۳۱ء کے موسم خزاں میں منعقد ہوئی جس میں مسٹر گاندھی نے کانگرس کے واحد نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس میں محمد علی جناح نے ہندوستان کی اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے حقوق کی وکالت کا جس طرح حق ادا کیا اس کی روداد سر آغا خان نے اپنی آپ بیتی (*Memoirs*) میں تفصیل سے رقم کی ہے ۔

تیسری گول میز کانفرنس جنوری ۱۹۳۲ء میں منعقد ہوئی ، لیکن اس میں انہیں شمولیت کی دعوت ہی نہیں دی گئی ۔

دراصل محمد علی جناح چاہتے تھے کہ ہندوستان کے دستور کے بارے میں کوئی واضح فیصلہ ہو جائے ؛ ہندوستان کو زیادہ اختیارات دیے جائیں ، ہندوستان کی تمام اقوام کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی جائے اور صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل ہوں ۔ مرکز میں وہ وفاقی طرز حکومت کے خواہاں تھے ، لیکن اس طرز پر نہیں جس طرح برطانوی حکومت اور ہندوستانی والیان ریاست کی منشا تھی ۔ اسی طرح وہ ہندوستانی فوج کو خالصۃً ہندوستانی بنانے کے حق میں تھے ؛ لیکن اس ساری تگ و دو میں انہیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ۔ حالت یہ تھی کہ ان کے موقف کو تسلیم کرنا تو درکنار اسے سمجھنے کے لیے بھی کوئی عنصر آمادہ نہ تھا ۔ مسلمان انہیں ہندوؤں کا حامی اور ہندو انہیں ایک کٹر فرقہ پرست سمجھتے تھے ۔ والیان ریاست کے نزدیک وہ جمہوریت کے غیر معمولی علم بردار تھے اور انگریزوں کی نظر میں وہ انتہا پسند تھے ۔

بہر کیف پہلی گول میز کانفرنس کے بعد انہوں نے انگلستان میں رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا اور وائٹ کورٹ ہال کے علاقے میں ایک مکان خرید کر پریوی کونسل میں وکالت کرنے لگے ۔ ان کی ہمشیرہ فاطمہ جناح اور بیٹی دینا جناح بھی ان کے ساتھ تھیں ۔ لندن میں ان کا مستقل قیام ۱۹۳۵ء تک رہا ، گو اس عرصے میں وہ دوبارہ (اپریل ۱۹۳۴ء اور جنوری ۱۹۳۵ء میں) ہندوستان بھی آئے ۔ اس عرصے میں وہ ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں کے حالات سے پوری طرح باخبر رہے اور اس ضمن میں متعدد مسلمان رہنماؤں کے ساتھ ، جن میں آسام کے عبدالمتین چودھری خصوصاً قابل ذکر ہیں ، ان کی خط و کتابت رہی ۔ لیاقت علی خان اور دوسرے رفقا کے اصرار پر بالآخر انہوں نے ۱۹۳۵ء میں مراجعت وطن کا فیصلہ کر لیا اور اپنا مکان فروخت کر کے اکتوبر ۱۹۳۵ء میں بمبئی واپس آ گئے ۔

وطن واپس آنے پر ان کے پیش نظر اہم ترین مسئلہ اسلامیان ہند کا اتحاد تھا اور اس کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ کی تنظیم نو ضروری تھی ، جو کہنے کو تو مسلمانوں کی مرکزی جماعت تھی لیکن اس کا تنظیمی ڈھانچا بہت کمزور تھا اور اس کی قیادت زیادہ تر بڑے زمینداروں اور نوابوں کے ہاتھ میں تھی ۔ محمد علی جناح نے اس کی صدارت سنبھالتے ہی ملک کے طوفانی دورے شروع کر دیے ۔ مسلمان رہنماؤں کے باہمی اختلافات کو دور کر کے انہیں ایک پرچم تلے جمع کرنے کی کوشش کی اور پہلی بار جماعت کا رابطہ عوام سے ساتھ قائم کیا ۔

پنجاب کی اہمیت کا انہیں پوری طرح اندازہ تھا ، جہاں سر فضل حسین کے زیر قیادت یونینسٹ پارٹی نے بڑی مستحکم صوبائی حکومت قائم کر رکھی تھی ۔ ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج

کا المیہ وقوع پذیر ہوا ، جس میں محمد علی جناح کی کوششوں سے تحریک میں گرفتار ہونے والے مسلمانوں کی رہائی عمل میں آئی تھی اور سکھوں اور مسلمانوں کی باہمی کشیدگی میں قدرے کمی آ گئی تھی۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں انھوں نے سر فضل حسین کا تعاون حاصل کرنے کے لیے لاہور کا دورہ کیا، لیکن مؤخر الذکر کی ہٹ دھرمی سے یہ سعی ناشکور رہی۔ بہر حال انھوں نے پنجاب مسلم لیگ کو مضبوط کرنے کی کوششیں جاری رکھیں ، جن میں علامہ اقبال کی حمایت انھیں حاصل تھی ؛ چنانچہ آئندہ ہونے والے انتخابات کے سلسلے میں ایک پارلیمانی بورڈ کی تشکیل بھی کر دی گئی ۔

۱۹۳۶ء کے موسم سرما میں صوبائی اسمبلیوں کے لیے عام انتخابات ہوئے۔ کانگرس گیارہ میں سے آٹھ صوبوں میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گئی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی پوزیشن مسلم اکثریت کے صوبوں میں کمزور رہی، خصوصاً پنجاب میں وہ صرف دو نشستیں حاصل کر سکی۔ بایں ہمہ اس انتخابی مہم میں محمد علی جناح نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں کی بنا پر مسلمان عوام میں بے پناہ مقبولیت حاصل کر لی۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمان اب انھیں قائد اعظم کے لقب سے پکارنے لگے ۔

انتخابات کے سلسلے میں قائد اعظم کی حکمت عملی یہ رہی تھی کہ کانگرس اور لیگ ایک دوسرے سے تعاون کریں ، چنانچہ ایک حد تک اس پر عمل بھی ہوا؛ لیکن انتخابات میں کامیابی کے بعد کانگرس قیادت کا دماغ پھر گیا اور وہ ہندو راج کے خواب دیکھنے لگی۔ جواہر لال نہرو جیسے لوگ بھی، جن کی آزاد خیالی کا شہرہ تھا، کچھ اس قسم کی باتیں کرنے لگے کہ ہندوستان میں صرف دو طاقتیں ہیں : ایک انگریز ، دوسرے کانگرس۔ قائد اعظم نے فوراً اس بات کا نوٹس لیا اور فرمایا کہ انگریزوں اور ہندوؤں کے علاوہ ایک تیسری طاقت بھی ہے اور وہ ہیں مسلمان۔ بہر کیف کانگرس طاقت کے نشے میں چور تھی۔ اس نے پہلے وزارتیں قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی مرضی کی شرائط منوانا چاہیں ، لیکن پھر جولائی ۱۹۳۷ء میں وزارتیں قبول کر لیں ۔

کانگرسی وزارتیں اکتوبر ۱۹۳۹ء تک قائم رہیں۔ اس دوران میں کانگرس نے ہندو اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہر قسم کی زیادتیاں روا رکھیں۔ سرکاری عمارتوں پر کانگرسی جھنڈا لہرایا جاتا ، بندے ماترم کو قومی ترانہ قرار دیا گیا ، مسلمان بچوں کو گاندھی جی کی مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہونا پڑتا، اردو کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی ، مسلمان پریس کا گلا گھونٹا گیا ، ملازمتوں میں مسلمانوں کے تناسب کو نظر انداز کر دیا گیا ، صنعت و حرفت اور تجارت کے دروازے ان پر بند کر دیے گئے اور جگہ جگہ مسلمان کُش فسادات برپا کیے گئے۔ بحیثیت مجموعی ان صوبوں میں مسلمانوں کی حیثیت دوسرے بلکہ تیسرے درجے کے شہریوں کی سی ہو گئی اور کانگرسی حکومت سے عدل و انصاف کی کوئی توقع نہ رہی ۔

یہ سب اطلاعات قائد اعظم تک پہنچتی رہیں؛ چنانچہ ان کے زیر ہدایت آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے ان ستم آرائیوں کا مکمل جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی ، جس نے حالات اور واقعات کی تحقیق کر کے ایک مفصل رپورٹ پیش کی ، جو تاریخ میں پیر پور رپورٹ کے نام سے مشہور ہے ۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ کانگرس نے مطالبہ کیا کہ اختتام جنگ کے بعد مکمل آزادی کا غیر مبہم اعلان کیا جائے اور آئندہ دستور وضع کرنے کے لیے ایک دستور ساز

اسمبلی تشکیل دی جائے ، جس میں حکومت کا کوئی عمل دخل نہ ہو ۔ قائد اعظم نے اس کی مخالفت کی کیونکہ اس طرح صرف اکثریتی فرقے کا دستور ہی وضع ہو سکتا تھا ۔ وائسرائے نے بھی یہ مطالبہ مسترد کرتے ہوئے اعلان کیا کہ جنگ ختم ہونے پر مختلف جماعتوں، فرقوں اور مفادات کے نمائندوں کے مشورے سے فیصلہ کیا جائے گا ، جس پر ۱۳ نومبر ۱۹۳۹ء کو کانگرسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں ۔ ۲۲ دسمبر کو قائد اعظم کی اپیل پر مسلمانوں نے پورے ملک میں بڑے جوش و خروش سے یوم نجات منایا ۔ یہ بھی قائد اعظم کے تدبر کا ایک کرشمہ تھا کہ اس سے ایک طرف تو آل انڈیا مسلم لیگ اور اسلامیان ہند کی طاقت کا مظاہرہ ہوا اور دوسری طرف انڈین نیشنل کانگرس کے اس دعوے کی نفی ہو گئی کہ وہ مسلمانوں کی بھی نمائندہ جماعت ہے ۔

در اصل پچھلے دو تین برس سے قائد اعظم کی ولولہ انگیز قیادت نے مسلم لیگ کو ایک فعال جماعت بنا دیا تھا ۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں اجلاس لکھنؤ کے موقع پر قائد اعظم نے اپنے خطبۂ صدارت میں سیاسی مسائل کا سیر حاصل جائزہ لیا ۔ اس میں پنجاب ، بنگال اور آسام کے وزرائے اعظم نے بھی شرکت کی ۔ اس اجلاس میں سر سکندر حیات نے ، جو سر فضل حسین کی وفات کے بعد پنجاب یونینسٹ پارٹی کے قائد منتخب ہوئے تھے ، مسلم لیگ میں باقاعدہ شمولیت اختیار کی ۔ یہ قائد اعظم کی سیاسی بصیرت کی ایک اور نمایاں کامیابی تھی ۔ اس ضمن میں جو تحریر قلمبند ہوئی اسے آگے چل کر بعض لوگوں نے غلط طور پر "جناح سکندر پیکٹ" کا نام دینے کی کوشش کی حالانکہ یہ پیکٹ نہیں بلکہ سر سکندر حیات کی طرف سے قائد اعظم اور مسلم لیگ کے ساتھ تعاون اور وفاداری کی یقین دہانی تھی ۔

اکتوبر ۱۹۳۸ء میں ایک اور عظیم الشان اجلاس پٹنہ میں منعقد ہوا ۔ اس موقع پر کلکتہ کے مسلم اخبار عصر جدید نے قائد اعظم کو "زعیم الملت" کا خطاب دیا ۔ فی الحقیقت اس وقت برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں میں قائد اعظم کے پائے کا کوئی رہنما نہیں تھا اور علامہ اقبال جیسے مسلم دانشور اور مفکرین بھی ان کی قیادت کو صدق دل سے تسلیم کر چکے تھے ۔ علامہ اقبال نے اپریل ۱۹۳۸ء میں وفات پائی ، لیکن اس سے قبل ان کے قائد اعظم کے ساتھ گہرے تعلقات قائم ہو چکے تھے ۔ علامہ نے اپنے متعدد خطوط میں قائد اعظم کو وقت کے اہم مسائل کے بارے میں اپنے خیالات سے آگاہ کیا اور قائد اعظم نے بھی ان سے یقیناً رہنمائی حاصل کی ۔

الغرض ۱۹۳۸ء تک آل انڈیا مسلم لیگ اس قدر فعال اور ہر دلعزیز ہو چکی تھی کہ حکومت وقت خود اس سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی ۔ قائد اعظم اسلامیان ہند کے واحد رہنما کی حیثیت سے ابھر چکے تھے ۔ انگریز انہیں کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے ۔ اس بات کا ثبوت نہ صرف قائد اعظم اور وائسرائے لنلتھگو (۱۹۳۹ تا ۱۹۴۲ء) کی خط و کتابت سے ملتا ہے بلکہ کوپ لینڈ جیسے انگریز مصنفین نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے ۔

بایں ہمہ انگریزوں کا رویہ بحیثیت مجموعی قائد اعظم اور مسلم لیگ کے ساتھ معاندانہ ہی رہا ۔ ادھر کانگرس پورے ہندوستان کی نمائندگی کے دعوے کے باوجود ہندو مہاسبھائی ذہنیت کا شکار ہوتی جا رہی تھی اور اس کی ہٹ دھرمی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ مسلمانوں اور مسلم لیگ کے مطالبات کو تسلیم کرنا تو درکنار وہ انہیں کوئی اہمیت دینے کے لیے بھی آمادہ نہ تھی ۔ گول میز

کانفرنس کی ناکامی کے بعد قائد اعظم پر کانگرسی زعما کی مہاسبھائی ذہنیت پوری طرح عیاں ہو چکی تھی، تاہم انہوں نے مصالحتی کوششیں جاری رکھیں۔ گاندھی جی ، جواہر لال نہرو ، سوبھاش چندر بوس اور راجندر پرشاد کے ساتھ ان کی خط و کتابت اور مذاکرات اس کا بین ثبوت ہیں ۔ قائد اعظم کا اصرار تھا کہ حصول آزادی کے لیے مشترکہ کوششوں کے لیے ضروری ہے کہ کانگرس پہلے مسلمانوں کو ہندوؤں سے علیحدہ قوم اور مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرے، لیکن کانگرسی رہنماؤں نے ایسا کرنے سے ہمیشہ انکار کیا ؛ لہذا قائد اعظم اور ہندو رہنماؤں کے مابین خط و کتابت بے سود اور مذاکرات ناکام رہے ۔

مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ریاست کی ضرورت کا احساس قائد اعظم کو ۱۹۲۸ء ہی میں ہونے لگا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں حالات اتنی نازک صورت اختیار کر گئے کہ یہ ضرورت ناگزیر نظر آنے لگی ؛ چنانچہ اسی سال سندھ مسلم کانفرنس نے ، جس کے اجلاس میں قائد اعظم بھی موجود تھے ، مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ریاست کا مطالبہ پیش کر دیا ۔ اس وقت تک تقسیم سے متعلق اور بھی کئی تجاویز سامنے آ چکی تھیں ۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لاہور میں ہونا طے پایا ۔ اسے ناکام بنانے کے لیے حکومت اور لیگ کے مخالفین نے مختلف ہتھکنڈے استعمال کیے۔ ۱۷ مارچ کو لاہور میں خاکساروں اور پنجاب پولیس کے درمیان خونریز تصادم ہو گیا۔ پنجاب کی یونینسٹ حکومت نے قائد اعظم کو لیگ کا اجلاس ملتوی کرنے کا مشورہ دیا ، لیکن قائد اعظم اسے نظر انداز کرکے پروگرام کے مطابق ۲ مارچ کو دہلی سے لاہور روانہ ہو گئے ۔ ۲۱ مارچ کو لاہور ریلوے سٹیشن پر مسلمانوں نے ان کا والہانہ استقبال کیا ۔ لاہور پہنچتے ہی انہوں نے جلوس نکالنے کی ممانعت کی اور اس کے بجائے ہسپتال میں زخمی خاکساروں کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے ۔ اس سے شکوک و شبہات کے بادل چھٹ گئے اور مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس پر سکون فضا میں منعقد ہوا ۔

اس اجلاس کا اہم ترین پہلو یہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کے حصول کے لیے باضابطہ طور پر ایک قرارداد منظور ہوئی، جو تاریخ میں قرارداد لاہور کے نام سے مشہور ہے ۔ اس موقع پر قائد اعظم نے اپنے خطبۂ صدارت میں ہندوستان کے تمام سیاسی اور آئینی حالات کا جائزہ لیا اور دو قومی نظریے کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کرتے ہوئے پر زور دلائل سے ثابت کیا کہ برعظیم پاک و ہند کے مسلمان علیحدہ ریاست کے حصول کے لیے مجبور ہو چکے ہیں۔ یہی قرارداد آئندہ کے لیے مسلم لیگ کا نصب العین قرار پائی ۔ ۱۹۴۱ء میں اسے مسلم لیگ کے آئین میں باقاعدہ طور پر شامل کر لیا گیا۔ ۱۹۴۶ء میں مجالس قانون ساز کے مسلمان ارکان کی ایک کنونشن Convension میں ، جو قائد اعظم کے زیر قیادت دہلی میں منعقد ہوئی تھی، اس قرارداد کے ابہام کو دور کرکے اسے حتمی شکل دی گئی ۔

قائد اعظم اور تحریک پاکستان (۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۷ء) : قرارداد لاہور منظور ہو جانے کے بعد اسلامیان برعظیم کی زندگی میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا ۔ قائد اعظم اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ آزادی کی جنگ منظم اور متحد ہو کر ہی جیتی جا سکتی ہے، چنانچہ وہ مسلمانوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے ایک متحدہ پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لیے [illegible] سرگرم عمل ہو گئے ۔ مسلم

لیگ کی تنظیم پر خصوصی توجہ دی گئی ۔ دہلی ، کراچی اور سیالکوٹ میں مسلم لیگ کے اہم تاریخی اجلاس منعقد ہوئے ، جن کی قائد اعظم نے صدارت کی اور مطالبۂ پاکستان کے حق میں نہایت مدلل اور ولولہ انگیز خطبات دیے ۔ علاوہ ازیں انھوں نے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک طوفانی دورے کیے ، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم لیگ صحیح معنوں میں ایک فعال اور مؤثر جماعت بن گئی ۔ اس کی شاخیں ہر اہم مقام پر قائم ہو گئیں اور اس کی مقبولیت اس حد تک بڑھ گئی کہ بیشتر ضمنی انتخابات میں اسے کامیابیاں نصیب ہونے لگیں۔

مسلم لیگ کی تنظیم نو کے ساتھ ساتھ مسلمان طلبہ بھی منظم ہونے لگے ۔ قائد اعظم کی رہنمائی میں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن ۱۹۳۷ء ہی میں وجود میں آ چکی تھی ، لیکن ۱۹۴۰ء کے بعد طلبہ کی سرگرمیاں اور بھی بڑھ گئیں ۔ اس ضمن میں پنجاب کے مسلمان طلبہ نے بالخصوص جوش عمل کا ثبوت دیا ۔ جالندھر میں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن اور لائل پور اور لاہور میں پنجاب شاخ کے سالانہ اجلاس منعقد ہوئے اور قائد اعظم نے ان سب کی صدارت فرمائی۔ قائد اعظم نے طلبہ کی ہر اعتبار سے دلجوئی اور حوصلہ افزائی فرمائی اور ہر مشکل مرحلے پر انھیں اپنی رہنمائی سے نوازا ۔ وہ جانتے تھے کہ قوم کے مستقبل کے معمار یہی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ طلبہ کو تحریک پاکستان کا ہراول دستہ قرار دیتے تھے ۔

اسی طرح خواتین کی تنظیم کا آغاز بھی ۱۹۳۷ء سے ہو گیا تھا ۔ اس ضمن میں قائد اعظم کی ہمشیرہ فاطمہ جناح (۱۸۹۳ تا ۱۹۶۷ء) نے ان کی بے حد معاونت کی ۔ زنانہ مسلم لیگ کی شاخیں جگہ جگہ قائم ہو گئیں ۔ جس سے خواتین میں سیاسی شعور پوری طرح بیدار ہو گیا ۔

۱۹۳۰ء کے بعد قائد اعظم کی قیادت میں مسلم لیگ اس قدر فعال ، مؤثر اور طاقتور ہو گئی کہ اب اس کے اصول و ضوابط اور سیاسی حکمت عملی کی خلاف ورزی اس کے مقتدر سے مقتدر رکن کے بھی بس کی بات نہیں رہی تھی ۔ ۱۹۴۱-۱۹۴۲ء میں جب سر سکندر حیات ، بیگم شاہ نواز ، مولوی فضل الحق اور سر سعد اللہ وغیرہ نے مسلم لیگ اور قائد اعظم سے بالا بالا وائسرائے کی "وارکونسل" کی رکنیت قبول کی تو قائد اعظم نے ان کی سختی سے جواب طلبی کی ۔ مولوی فضل الحق کے سوا سب نے ان سے معذرت طلب کی اور کونسل سے مستعفی ہو گئے۔ مولوی فضل الحق کو مسلم لیگ سے خارج کر دیا گیا اور بعد ازاں جب انھوں نے اپنی اس بے ضابطگی پر غیر مشروط معافی طلب کی تو انھیں دوبارہ جماعت میں شمولیت کی اجازت دی گئی ۔ اسی طرح خضر حیات خاں ٹوانہ کو بھی ، جو سر سکندر حیات کے بعد پنجاب کے وزیر اعظم بنے تھے ، انضباطی کارروائی کا سامنا کرنا پڑا ۔ جناح سکندر پیکٹ کے تحت وہ پنجاب میں مسلم لیگ کی حکمت عملی کے تابع تھے ، لیکن انھوں نے تعاون میں پس و پیش سے کام لیا ۔ ۱۹۴۳ء میں قائد اعظم جب اپنے تنظیمی دورے کے سلسلے میں پنجاب تشریف لائے تو قیام لاہور کے دوران میں انھوں نے خضر حیات سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی ، لیکن انتہائی غیر ذمہ دارانہ رویہ اختیار کرنے کی بنا پر خضر حیات کو مسلم لیگ سے نکال دیا گیا ۔

مسلم لیگ جس قدر منظم ہوتی گئی اسی قدر تحریک پاکستان کی مخالف قوتیں بھی ابھریں لیکن قائد اعظم نے ان سب کا مردانہ وار مقابلہ کیا ۔ ان میں نام نہاد قوم پرست مسلمان رہنما پیش پیش تھے ۔ جمعیت العلمائے ہند ، مجلس احرار اور شیعہ کانفرنس ایسی نیشنلسٹ مسلمان تنظیموں نے تحریک

کی شدت سے مخالفت کی ۔ جماعت اسلامی دو قومی نظریے کی قائل ہونے کے باوجود مسلم لیگ کی قیادت کی سرے سے مخالف تھی ۔ خاکسار تحریک کے ساتھ ۱۹۴۰ء تک اشتراک عمل رہا ، لیکن بعدازاں علامہ عنایت اللہ مشرقی قائداعظم کے مخالف ہو گئے ۔ یہ مخالفت بعض ناپختہ ذہن کے خاکسار نوجوانوں میں اس حد تک بڑھی کہ ۲۶ جولائی ۱۹۴۳ء کو لاہور کے ایک خاکسار نوجوان رفیق صابر نے بمبئی میں قائد اعظم پر قاتلانہ حملہ کیا ، جس پر اسے اقدام قتل کے جرم میں پانچ سال قید بامشقت کی سزا ملی ۔

مسلمانوں کے لیے جداگانہ ریاست کے مطالبے کی سب سے زیادہ مخالفت قدرتی طور پر ہندوؤں کی طرف سے ہوئی ۔ ہندو عوام ، ہندو پریس اور ہندو جماعتوں اور رہنماؤں نے انتہائی برہمی کا اظہار کیا ۔ قرار داد لاہور میں پاکستان کا لفظ نہیں تھا ، لیکن ہندو پریس نے اس سکیم کی مخالفت کرتے ہوئے اسے طنزاً استعمال کیا ۔ ہندو مہاسبھا اور انڈین نیشنل کانگرس نے مخالفت میں آسمان سر پر اٹھا لیا اور قدم قدم پر روڑے اٹکانے شروع کر دیے ۔ کانگرس ابھی تک مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت قبول کرنے سے منکر تھی ، چنانچہ دنیا کو دھوکا دینے کے لیے اس نے ابوالکلام آزاد کو کانگرس کا صدر بنا دیا ۔ ۱۹۴۵ء میں شملہ کانفرنس کے دوران بھی کانگرس کی طرف سے بڑی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا ، لیکن قائد اعظم نے اپنی سیاسی بصیرت سے ہندوؤں کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا اور ہندو لیڈروں کو خط و کتابت یا مذاکرات میں اپنے دلائل سے لاجواب کر دیا ۔ اس دور میں گاندھی جی سے ان کی خط و کتابت اور مذاکرات قابل ذکر ہیں ۔ جولائی ۱۹۴۴ء سے ستمبر ۱۹۴۴ء تک گاندھی جی نے مطالبۂ پاکستان کے خلاف کئی نکات اٹھائے اور قائد اعظم نے ان سب کی مدلل وضاحت کی ۔ اس ضمن میں گاندھی جی کے نام ان کا وہ خط بالخصوص قابل ذکر ہے جس میں انھوں نے بڑے جچے تلے الفاظ میں تحریر فرمایا تھا کہ "بین الاقوامی قانون کی کسی بھی کسوٹی پر پرکھا جائے مسلمان ہندوؤں سے بالکل علیحدہ قوم ثابت ہوتے ہیں ۔ مسلمانوں کا مذہب ، تاریخ ، ثقافت اور تہذیب ہندوؤں کے مذہب ، تاریخ ، ثقافت اور تہذیب سے بالکل مختلف ہے ، لہذا ان دونوں کو ایک ہی نظام حکومت کے تحت نہیں جکڑا جا سکتا" ۔

ہندوؤں کے علاوہ سکھوں نے بھی مطالبۂ پاکستان کی مخالفت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ۔ اسے کمزور کرنے کے لیے انھوں نے پنجاب میں سکھ ریاست کے قیام کی تحریک چلائی ۔ قائد اعظم نے انھیں راہ راست پر لانے کی ہر ممکن کوشش کی اور انھیں بار بار یقین دلایا کہ پاکستان میں ان کے حقوق کا پورا پورا تحفظ کیا جائے گا ، لیکن اکالی دل کی قیادت اس وقت ماسٹر تارا سنگھ جیسے کانگرس نواز کے ہاتھ میں تھی ، چنانچہ ان کی مخالفت میں کسی طرح کمی نہ ہوئی ۔

خود انگریز بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ پاکستان معرض وجود میں آئے ۔ وہ اپنے مفاد کے پیش نظر ہندوستان کو متحد رکھنے کے حق میں تھے ، لیکن پاکستان کا مطالبہ آسانی سے مسترد بھی نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ ان سات برسوں کے دوران میں ان کی یہی کوشش رہی کہ کانگرس اور لیگ میں کوئی مصالحتی فارمولا طے پا جائے ۔ کرپس مشن کی تجاویز (۱۹۴۲ء) ، شملہ کانفرنس کا انعقاد (۱۹۴۰ء) ، عبوری حکومت کا قیام (۱۹۴۶ء) اور کیبنٹ مشن پلان (۱۹۴۶ء) اسی سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں (تفصیل کے لیے رک بہ پاکستان) ۔ ان سب مواقع پر قائد اعظم نے انتہائی

سیاسی تدبر کا ثبوت دیا ۔ انھوں نے کرپس مشن کی تجاویز کو قطعاً مسترد کر دیا کہ ان سے مطالبۂ پاکستان پورا نہیں ہوتا تھا ۔ شملہ کانفرنس میں ہندوؤں اور انگریزوں کی باہمی کوشش یہ تھی کہ لیگ کی مسلمہ نمائندہ حیثیت کو زک پہنچائی جائے ، لیکن قائد اعظم نے اسے متاثر نہ ہونے دیا ۔ عبوری حکومت اور کیبنٹ مشن پلان کے سلسلے میں بھی انھوں نے مخالفین کی تمام چالوں کو ناکام بنایا ۔ حکومت نے یہ اعلان کیا تھا کہ جو سیاسی پارٹی کیبنٹ منصوبے کو تسلیم کرے گی اسے حکومت بنانے کی دعوت دی جائے گی ۔ منصوبے میں اگرچہ مطالبۂ پاکستان کو تو نہیں لیکن اس کے بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا گیا تھا ، اس لیے قائد اعظم نے یہ منصوبہ قبول کر لیا ، تاہم کانگرس نے اسے مسترد کر دیا ۔ بایں ہمہ حکومت اپنے اعلان سے پھر گئی اور مسلم لیگ کو حکومت بنانے کی دعوت نہیں دی گئی ۔ اس پر قائد اعظم نے سخت برہمی کا اظہار کیا اور اپنی قوت کے مظاہرے کا فیصلہ کیا ۔ در اصل اب اس کا وقت بھی آ گیا تھا ۔ مسلم لیگ انتہائی مقبول اور طاقت ور جماعت بن چکی تھی ۔ اس کا ثبوت گزشتہ چند برسوں کے دوران ضمنی انتخابات میں مسلسل کامیابیوں کے علاوہ ۱۹۴۵ء - ۱۹۴۶ء میں مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابی کے نتائج سے سامنے آ چکا تھا ۔ مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ نے ۸۷ فیصد نشستیں حاصل کر لیں اور صوبائی اسمبلیوں میں ۴۹۵ مسلم نشستوں میں سے ۴۳۴ نشستوں پر قبضہ کر لیا ۔ انتخابی مہموں کی نگرانی قائد اعظم نے خود کی تھی اور انتہائی مہذبانہ طریقے استعمال کیے تھے ۔ اب مسلم لیگ کی مسلمہ نمائندہ حیثیت کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا ؛ چنانچہ قائد اعظم کی قیادت میں مسلم لیگ نے ۱۱ جنوری ۱۹۴۶ء کو یوم فتح منایا ، جس کے گہرے نفسیاتی اثرات مرتب ہوئے ۔

کیبنٹ پلان کے اجرا کے بعد عبوری حکومت کی تشکیل کے معاملے میں جو آئینی تعطل رونما ہوا وہ برطانوی حکومت اور کانگرس کے غلط رویے کا نتیجہ تھا ؛ چنانچہ قائد اعظم نے یوم راست اقدام (Direct Action Day) منانے کا حکم دیا ۔ ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو پورے ملک میں جلسے ہوئے ، جلوس نکالے گئے اور سرکاری خطاب یافتہ مسلمانوں نے اپنے خطابات واپس کرنے کا اعلان کیا ۔ نظم و نسق کی چولیں ڈھیلی پڑ گئیں ۔ ظاہر ہے کہ ملکی سیاست نے اس کے بہت گہرے اور دو رس اثرات قبول کیے ۔ حکومت مسلم لیگ کو عبوری حکومت میں شامل کرنے پر رضامند ہو گئی ۔ عبوری حکومت کا قیام ہندوستان کو متحد رکھنے اور مطالبۂ پاکستان کو ٹالنے کی آخری کوشش تھی ، لیکن قائد اعظم کی فراست نے اسے بھی ناکام بنا دیا ۔ بالآخر انگریزوں اور ہندوؤں کو پاکستان کا مطالبہ تسلیم کرنا پڑا اور ۳ جون ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا ریڈیو سے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے برعظیم پاک و ہند کی آزادی اور پاکستان کے قیام کا اعلان کر دیا ۔

پاکستان کو آئینی طور پر ایک علیحدہ اور آزاد مملکت تسلیم کر لینے کے بعد بھی اسے سبوتاژ کرنے کی کارروائیاں جاری رہیں ۔ پہلے تو یہ تجویز سامنے آئی کہ ماؤنٹ بیٹن کو پاکستان اور بھارت کا مشترکہ گورنر جنرل ہونا چاہیے ، لیکن قائد اعظم نے اس سراسر غیر آئینی تجویز کو رد کر کے اپنے سیاسی تدبر کا ثبوت دیا کیونکہ اس کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما تھا کہ پاکستان کو وجود میں لانے کے ساتھ ہی ختم کر دیا جائے ۔ پھر ہندوستان کی تقسیم کے لیے ریڈکلف کی سربراہی میں باؤنڈری

کمیشن کا قیام عمل میں آیا اور سوچی سمجھی سکیم کے تحت، جس میں وائسرائے اور جواہر لال نہرو نے اہم کردار ادا کیے، سراسر دھاندلی سے کام لیتے ہوئے جو علاقے پاکستان کا حصہ تھے انھیں بھارت میں شامل کرکے ایسا لولا لنگڑا پاکستان قائم کرنے کی کوشش کی گئی جو معاشی اور دفاعی اعتبار سے کبھی مستحکم نہ ہو سکے۔ یہی نہیں، انگریز وائسرائے اور ہندو سیاست دانوں کی ملی بھگت سے بڑے منظم انداز میں فرقہ وارانہ فسادات کرائے گئے اور بنگال، بہار، دہلی اور مشرقی پنجاب میں اتنے وسیع پیمانے پر مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا کہ تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ بہر حال ان تمام مخالفتوں، سازشوں اور رکاوٹوں کے باوجود ۱۴ اگست کو پاکستان کا قیام عمل میں آ گیا۔

قائد اعظم بحیثیت سربراہ مملکت (۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۸ء): قائد اعظم نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے سربراہ کی حیثیت سے گورنر جنرل کے عہدے کا حلف اٹھایا اور اپنی وفات (۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء) تک اس پر فائز رہے۔

یہ ایک انتہائی پر آشوب دور تھا۔ ہر نئی مملکت کی طرح پاکستان کو بھی بے شمار دقتوں اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ چونکہ انگریزوں اور ہندوؤں نے پاکستان کو صدق دل سے قبول نہیں کیا تھا، اس لیے پاکستان کو جلد از جلد ختم کر دینے کی معاندانہ کوششیں جاری رہیں۔ اس نوزائیدہ مملکت کے لیے نت نئے مسائل پیدا کیے گئے۔ ایک طرف تو مشرقی پنجاب اور بھارت کے کئی دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کے قتل عام کے بعد وہاں کے بچے کھچے مسلمانوں کو پاکستان کی طرف دھکیل دیا گیا، جس کے باعث پاکستان کو وجود میں آتے ہی لاکھوں مہاجرین کی آمد اور ان کی بحالی اور آبادکاری کے مسئلے سے دوچار ہونا پڑا اور دوسری طرف پاکستان کے اثاثے روک لیے گئے۔ مزید براں کشمیر پر جہاں مسلمانوں کی غالب اکثریت تھی، بھارت نے زبردستی قبضہ کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ جوناگڑھ، مانادور اور مانگرول کی مسلم ریاستوں پر، جنھوں نے پاکستان سے الحاق کا اعلان کیا تھا، بھارت نے جارحانہ قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد حیدر آباد کی باری آئی، جسے برطانوی دورِ حکومت میں بھی ایک نیم خود مختار مسلمان ریاست کی حیثیت حاصل رہی تھی۔ پھر نہری پانی کا مسئلہ پیدا کیا گیا۔ قائد اعظم نے ایک عظیم مدبر اور سیاست داں کی حیثیت سے ان تمام حالات و واقعات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اپنی ضعیف العمری اور خطرناک علالت کے باوجود وہ پیش آمدہ مسائل سے نجات حاصل کرنے کے لیے ان تھک محنت کرتے رہے اور تحریر و تقریر سے قوم کے عزم و حوصلہ کو برقرار رکھا۔ قیام پاکستان کے سلسلے میں جو دھاندلیاں ہوئی تھیں ان کا قائد اعظم کو گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ انھوں نے ایک تقریر میں کہا کہ تقسیم کے دوران ہمارے ساتھ نا انصافیاں روا رکھی گئی ہیں اور حتی الامکان ہمیں دبانے کی کوشش کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ریڈ کلف ایوارڈ صریحاً نا انصافی پر مبنی تھا، لیکن قائد اعظم نے قوم کو تلقین کی کہ اس کے باوجود ایک باعزت قوم کی طرح ہمیں اس فیصلے کی پابندی کرنی چاہیے۔ وہ بار بار اپنے عوام کو یہ بات ذہن نشین کراتے رہے کہ پاکستان کا قیام حقیقتاً عمل میں آ چکا ہے، یہ ہمیشہ قائم رہے گا اور اسے کوئی طاقت نہیں مٹا سکتی۔

قائد اعظم نے پاکستان میں زندگی کے ہر شعبے کو منظم کرنے کا آغاز کر دیا۔ دستور ساز اسمبلی کا افتتاح کیا اور اپنے انتہائی مہذب اور مدبرانہ افتتاحی خطبے میں فرمایا کہ "مملکت کے

تمام باشندوں کے حقوق مساوی ہیں۔ سب کو پوری پوری مذہبی آزادی ہوگی۔ سب کو اپنے باہمی اختلافات مٹا کر پاکستان کی ترقی اور استحکام کے لیے مل جل کر کام کرنا چاہیے"۔

قائد اعظم نے دستور ساز اسمبلی کو بھی اس کے کام کی طرف توجہ دلائی۔ در حقیقت وہ پاکستان کے دستور کے متعلق مخصوص نظریات رکھتے تھے اور اسے اسلامی جمہوریت ، مساوات ، اخوت اور سماجی انصاف کے اصولوں پر تشکیل دینے کے متمنی تھے۔ قائد اعظم نے انتظامی شعبوں کی طرف خصوصی توجہ دی۔ وہ انتظامیہ کو ہر قسم کی برائیوں سے پاک اور مستعد دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے متعدد بار سرکاری افسروں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ اپنے فرائض ایمانداری سے سر انجام دیں ، کسی قسم کی سیاست میں ملوث نہ ہوں کیونکہ سیاسی حکومتیں بدلتی رہتی ہیں ، وزیر آتے جاتے رہتے ہیں ، ملک ہمیشہ قائم رہتا ہے ، لہٰذا انتظامیہ کے افراد کو صرف ریاست کے خیر خواہ اور تابع فرمان رہنا چاہیے۔ اسی طرح فوج کے بارے میں بھی ان کے مخصوص نظریات تھے۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے ، وہ اپنی پارلیمانی زندگی کے ابتدائی دور ہی میں ہندوستانی فوج کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے نمایاں کردار ادا کر چکے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ فوج کو نئے خطوط پر انتہائی منظم ، مستعد اور چاق و چوبند دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ مختلف رجمنٹوں اور یونٹوں کا معائنہ کرتے رہتے تھے۔ ان کا ارشاد تھا کہ ہماری فوج کو ، جو قبل ازیں غیر ملکی حکومت کا تحفظ کرتی رہی ہے ، اب اپنی مملکت کی سرحدوں کی حفاظت کرنی ہے۔ ملک کے پسماندہ خطے اور قبائلی علاقوں کے مسائل کو وہ بہت اہمیت دیتے تھے۔ قائد اعظم نے نہ صرف قبائلی علاقوں سے وہ فوجیں ہٹا دینے کے احکام صادر کر دیے جو انگریزی دور حکومت میں یہاں ہمیشہ متعین رکھی جاتی تھیں بلکہ مختلف قبائل کے باہمی جھگڑوں کو نمٹانے اور ان کی معاشی حالت کو سنوارنے کی بھی پوری کوشش کی۔ بلوچستان قبل ازیں چیف کمشنر کے تحت تھا۔ قائد اعظم نے اسے براہ راست اپنے تحت لے لیا۔ انھوں نے بلوچستان اور قبائلی علاقوں کے دورے کیے اور قبائلی درباروں اور جرگوں سے خطاب کیا ، جس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ملک کے وہ باشندے جو ہمیشہ حکومت کے خلاف نبرد آزما رہتے تھے ملک کی وفاداری کا دم بھرنے لگے۔

پاکستان کو اقتصادی طور پر مستحکم کرنے کی قائد اعظم نے بطور خاص کوشش کی۔ جولائی ۱۹۴۸ء میں سٹیٹ بنک آف پاکستان کا افتتاح کیا۔ اسی طرح صنعت و حرفت کی طرف بھی لوگوں کو مائل کیا اور امرا کو سرمایہ کاری کی ترغیب دی۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں انھوں نے ولیکا ٹیکسٹائل مل اور فروری ۱۹۴۸ء میں بنگال آئل مل کا افتتاح کیا۔ ان کا ارشاد تھا کہ قدرت نے پاکستان کو لا محدود معدنی وسائل سے نوازا ہے اور اب یہ اہل پاکستان کا کام ہے کہ ان وسائل کو بروے کار لائیں اور پاکستان کی صنعتی ترقی کو فروغ دیں تاکہ ملک خوشحال ہو۔ علی ہذا ملک کی زرعی اور تجارتی ترقی بھی ہمیشہ ان کے مدنظر رہی۔ قائد اعظم کے نزدیک ان سب کا دارومدار تعلیم پر تھا۔ آپ کا فرمانا تھا کہ اگر ہم پاکستان کو تیزی سے ترقی کی راہ پر ڈالنا چاہتے ہیں تو ہمیں تعلیم کی طرف توجہ دینا چاہیے اور تعلیمی ترقی کے لیے ایسا پروگرام وضع کرنا چاہیے جو ہماری قومی امنگوں کے مطابق ہو اور بہترین شہری پیدا کرے۔

ملک میں ایسے عناصر بھی موجود تھے جو آزادی سے قبل مطالبۂ پاکستان کے شدید مخالف

رہے تھے ۔ پاکستان کا قیام ان کے عزائم کی شکست کے مترادف تھا، چنانچہ وہ اس کا انتقام لینے کے لیے طرح طرح کے صوبائی اور لسانی تعصبات کو ہوا دیتے رہتے تھے۔ ان فتنوں کا اثر زائل کرنے کے لیے قائد اعظم نے اپنی کمزور صحت کے باوجود ملک کے طویل دورے کیے ۔ بلوچستان اور سرحد کے بعد اپریل ۱۹۴۸ء میں وہ مشرقی پاکستان تشریف لے گئے، جہاں لسانی مسئلہ سر اٹھا رہا تھا۔ اسی دورے میں انھوں نے یہ تاریخی اعلان کیا کہ ملک کی قومی زبان اردو اور صرف اردو ہوگی .

ان مسائل کو سلجھانے کے علاوہ قائد اعظم نے مہاجرین کی بحالی کی طرف فوری توجہ دی ۔ ستمبر ۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں انھوں نے لاہور آ کر بحالیات کے کام کی خود نگرانی کی ۔ اس کے ساتھ ساتھ مسئلۂ کشمیر کے حل کی کوششیں بھی جاری رکھیں ۔ اس سلسلے میں انھوں نے ماؤنٹ بیٹن سے بھی تبادلۂ خیال کیا (نومبر ۱۹۴۷ء) اور بالآخر بھارت کی ہٹ دھرمی سے مجبور ہو کر کشمیر میں پولیس ایکشن کا فیصلہ کیا، لیکن بدقسمتی سے فوج کے انگریز کمانڈر انچیف نے تعاون سے کام نہ لیا اور یہ مسئلہ روز بروز الجھتا ہی چلا گیا (تفصیلات کے لیے رک بہ پاکستان) .

قائد اعظم کی یہ بھی خواہش تھی کہ ملک کی خارجہ پالیسی کو بھی صحت مند خطوط پر استوار کیا جائے ؛ چنانچہ انھوں نے غیر ممالک کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے میں بڑی عجلت سے کام لیا اور ہمیشہ سفارتی اہلکاروں سے ملاقاتوں اور سفارتی تقریبات میں شرکت کا سلسلہ جاری رکھا ۔ انھوں نے اپنی مختلف تقاریر میں اس بات پر زور دیا کہ پاکستان کی خارجہ حکمت عملی "ملک کے اندر اور ملک کے باہر امن و سلامتی" (Peace within and peace without) کے اصول پر مبنی ہے ۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ "ہم تمام اقوام عالم سے اپنے تعلقات دوستی اور خیر سگالی کی بنیاد پر قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کسی کے خلاف کوئی جارحانہ ارادہ نہیں رکھتے اور دوستی ، ایمانداری اور انصاف کے اصولوں پر یقین رکھتے ہیں" ۔ اس سلسلے میں وہ مسلم ممالک کے ساتھ تعلقات کے قیام کو ہمیشہ ترجیح دیتے رہے ۔ انھوں نے نہ صرف مشرق وسطیٰ کے ممالک میں اپنے خاص نمائندے بھیجے بلکہ اپنی تقاریر میں بار بار اس بات پر زور دیا کہ جب تک مسلم ممالک کا اتحاد نہیں ہوگا دنیا کے ایوانوں میں ان کی بات نہیں سنی جائے گی .

الغرض بحیثیت سربراہ مملکت قائد اعظم نے پاکستان کو ایک مثالی ریاست بنانے کے لیے ان تھک محنت کی ، یہاں تک کہ اپنے آخری ایام میں بھی ، جب صحت بالکل جواب دے چکی تھی ، وہ اپنے فرائض منصبی سر انجام دیتے رہے اور انھوں نے ضروری سرکاری فائلوں کو دیکھنے اور ان پر اپنے احکامات صادر کرنے کا سلسلہ جاری رکھا .

قائد اعظم کی صحت ایک عرصے سے خراب چلی آ رہی تھی اور بیماری سے ان کے پھیپھڑے بری طرح متاثر تھے ۔ اس کے باوجود انھوں نے کسی موقع پر اس کا اظہار نہیں ہونے دیا اور یہ ان کی قوت ایمانی اور قوت ارادی تھی کہ اپنے نحیف و نزار جسم کے ساتھ انھوں نے سات آٹھ برس تک حصول پاکستان کی جنگ متعدد محاذوں پر تن تنہا لڑی اور اس میں کامیاب ہوئے۔ قیام پاکستان پر باؤنڈری کمیشن ایوارڈ کی دھاندلی ، مسلمانوں کے قتل عام ، لاکھوں لٹے پٹے مہاجرین کی آمد کے صدمات اور پھر ان تمام مسائل کو حل کرنے کے لیے شب و روز کی مصروفیات اور محنت نے ان کی صحت کو اور بھی متاثر کیا ۔ بخار اور

کھانسی کی شکایت معمول بن گئی ، لیکن اس عالم میں بھی انھوں نے ملک کے طویل دورے کیے ، سیکڑوں سیاسی اور عوامی جلسوں میں شرکت کی اور سربراہ مملکت کے جملہ فرائض کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلسل مصروفیت اور تھکن سے صحت اس حد تک خراب ہو گئی کہ طبی مشورے کے تحت جون ۱۹۴۸ء میں وہ آرام اور علاج کے لیے پہلے کوئٹے اور پھر زیارت میں منتقل ہو گئے۔ یہاں بھی سرکاری مصروفیات جاری رہیں۔ ملک کے بہترین ڈاکٹروں کی مساعی کے باوجود جب بحالی صحت کی طرف سے مایوسی ہو گئی تو ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو انھیں بذریعہ ہوائی جہاز کراچی لایا گیا اور اسی دن وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ملک بھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ ۱۲ ستمبر کو لاکھوں افراد نے جنازے میں شرکت کی۔ نماز جنازہ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھائی اور کراچی کے عین وسط میں انھیں دفنا دیا گیا، جہاں یحییٰ مرچنٹ کے نقشے کے مطابق ایک عظیم الشان مقبرہ تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپے کی لاگت سے ۱۹۷۱ء میں مکمل ہوا۔ اسلامی فن تعمیر کا یہ خوبصورت نمونہ آج مرجع خاص و عام ہے۔

سیرت و کردار: قائد اعظم محمد علی جناح کا شمار بلا شبہہ دور حاضر کی عظیم ترین شخصیتوں میں کیا جا سکتا ہے۔ وہ بیک وقت بہت سی صلاحیتوں کے مالک تھے: ایک معروف ماہر قانون ، ایک ممتاز وکیل ، ایک منجھے ہوئے پارلیمنٹیرین ، ایک تجربہ کار سیاست دان اور ایک ذہین مدبر۔ انھوں نے کم و بیش چالیس برس تک مرکزی مجلس قانون ساز میں اور تقریباً پچاس برس تک میدان سیاست میں اہم کارنامے انجام دیے۔ زندگی کا آغاز انتہائی نامساعد حالات میں ہوا ، لیکن انھوں نے ہمیشہ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور ترقی کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کیں کہ بہت جلد برصغیر پاک و ہند کی صف اول کی شخصیتوں میں شمار ہونے لگے۔

قائد اعظم کی شخصیت انتہائی دلکش اور مرعوب کن تھی: لمبا قد ، چھریرا بدن ، دلکش تیکھے خط و خال اور بقول سروجنی نائیڈو: "عادات شاہانہ ، مزاج خسروانہ اور رکھ رکھاؤ اور وضعداری کا مجسمہ"۔ اس پر مستزاد یہ کہ احساس نظم و ضبط ، متانت و نفاست ، دیانت داری اور کفایت شعاری، جرأت اور بے خوفی ، غیرت و حمیت ایسے اوصاف تھے جو انھیں ورثے میں ملے تھے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں پختگی پیدا ہوتی گئی۔ علامہ اقبال نے ایک عظیم قائد کے لیے "نگہ بلند ، سخن دل نواز اور جاں پر سوز" کی جن شرائط کو لازم ٹھہرایا ہے وہ لاریب قائد اعظم میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

دیکھا جائے تو قائد اعظم کے ارادے شروع ہی سے بلند تھے۔ والدین انھیں تاجر یا صنعت کار بنانے کے متمنی تھے ، چنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر انھیں ولایت بھیجا گیا ، لیکن انھوں نے اپنی راہ خود متعین کی اور ایک بڑا بیرسٹر ، ایک بڑا قانون دان ، ایک بڑا پارلیمنٹیرین ، ایک بڑا سیاست دان اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک بڑا انسان بننے کا فیصلہ کیا۔ یہ کام آسان نہ تھا۔ اس کے لیے انتہائی لگن ، محنت اور ذہانت کی ضرورت تھی۔ ان کے بچپن کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔ وہ راتوں کو دیر تک مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ رشتے کی ایک خاتون نے اس کا سبب پوچھا تو جواب دیا: "اگر محنت نہ کروں گا تو بڑا آدمی کیسے بنوں گا؟" اپنے مقصد کے حصول کے لیے انتہائی محنت اور ریاضت کی یہ عادت ان کا معمول بن گئی جو

تحریک پاکستان کے ایام میں اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ ان دنوں کسی نے جب ان سے استفساراً کہا کہ کانگرس کے لیڈر تو سو رہے ہیں اور آپ جاگ رہے ہیں تو انہوں نے فرمایا "کانگرس کے لیڈر اس لیے سو رہے ہیں کہ ان کی قوم بیدار ہے اور میں جاگ رہا ہوں تو اس لیے کہ میری قوم سو رہی ہے۔" اپنی سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنے میں انہوں نے جو کچھ کیا وہ اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تن تنہا ان کی لگن محنت ، ان تھک جد و جہد اور تدبر و فراست کا کارنامہ ہے کہ بر عظیم پاک و ہند کا جغرافیہ بدل گیا اور یہاں ایک نیا اور دائمی انقلاب برپا ہو گیا۔

وکالت اور سیاست کے میدان میں ان کا کوئی خاندانی پس منظر نہ تھا۔ ان کے دور کے رشتہ داروں میں سے بھی کسی نے نہ تو وکالت کا پیشہ اپنایا تھا نہ سیاست میں کوئی حصہ لیا تھا۔ انہوں نے ایک وکیل اور سیاست دان کی حیثیت سے اپنے لیے جو مقام حاصل کیا وہ یقیناً بلند ترین تھا۔ ان دونوں حیثیتوں میں انہوں نے کبھی اپنے کردار پر کوئی ہلکا سا دھبہ بھی نہ لگنے دیا بلکہ ان کی جرأت اور دیانت ، فہم اور فراست ، اصول پرستی اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی پاسداری نے عوام و خواص کے دل جیت لیے اور ان کے مخالفوں کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑا کہ انہیں نہ تو خریدا جا سکتا ہے نہ خوف زدہ کیا جا سکتا ہے اور نہ دھوکا دیا جا سکتا ہے۔

وکالت ان کا پیشہ تھا۔ ان کے ہمعصر وکیل اور عوام سب ان کی جرأت ، دیانت ، منطقی استدلال اور قانونی فہم و فراست کے معترف تھے۔ قائد نے متعدد اہم ملی مقدمات کی پیروی کی ، جن میں غازی علم الدین شہید (۱۹۲۹ء) اور مسجد شہید گنج (۱۹۳۵ء) کے مقدمات بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ خود پاکستان کا حصول بھی کسی مقدمے سے کم نہ تھا ، جسے جیتنے کے لیے انہوں نے جو شاندار کردار ادا کیا اسے ان کی انہیں صلاحیتوں کے تناظر میں صحیح طور پر جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اگرچہ وہ ایک بہت بڑے عملی سیاست دان اور سیاسی مفکر تھے ، لیکن وکالت کی طرح یہ جہت بھی انہوں نے اپنی شخصیت میں خود پیدا کی اور سیاست و قانون سازی میں بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کے آئین میں بنیادی تبدیلی اور مسلمانوں کے قانون وقف علی الاولاد کی تدوین ، ۱۹۱۶ء میں میثاق لکھنؤ اور ۱۹۲۹ء میں چودہ نکات کی تشکیل ، ۱۹۳۴ء کے بعد مسلم لیگ کی تنظیم نو ، ۱۹۳۵ء میں کمیونل ایوارڈ کی منظوری اور اس کے بعد مسلم تصور قومیت کی تبلیغ و اشاعت ، دو قومی نظریے کی توضیح و تعریف اور پھر پاکستان کا حصول جیسے بے مثال کارنامے سرانجام دیے۔ بر عظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ اور خود مختار ریاست کے قیام کے مطالبے کو ناگزیر قرار دینا اور اس سلسلے میں بکھرے ہوئے مسلمانوں کو متحد کر کے ایک بھرپور تحریک چلانا اور اپنی منزل تک پہنچانا ان کی بلند نگاہی ہی کا نہیں ان کی بے خوفی اور جان پرسوز رکھنے کا بھی زندہ ثبوت ہے جس کے اعتراف کا عوام کی طرف سے اظہار کئی برس پہلے بمبئی میں جناح ہال کی تعمیر کی صورت میں ہو چکا تھا۔ تحریک پاکستان کے آخری ایام میں تو وہ جان کی بازی لگانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ براہ راست اقدام کی تحریک اس کا بین ثبوت ہے۔

اسی طرح ان کے سخن کی دلنوازی کے سامنے

ان کا اکثر سے اکثر مخالف بھی متاثر ہونے پر مجبور ہو جاتا تھا ۔ قائد اعظم انگریزی زبان کے بہترین مقرر تھے ۔ طرز ادا بڑی حد تک شیکسپیرین تھا ۔ ان کا انداز منطقی تھا اور استدلال محکم اور دل نشین ۔ تقریر میں اشارات و کنایات اور بے جا طوالت سے کبھی کام نہ لیتے ۔ لہجے کا اتار چڑھاؤ موقع اور محل کی مناسبت سے ہوتا ۔ متانت ، سنجیدگی اور وقار کا دامن کبھی ہاتھ سے چھوٹنے نہ پاتا ۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر فقرہ بلکہ ہر لفظ صداقت اور خلوص میں ڈوبا ہوا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ تقریر اسمبلی کے اندر ہوتی یا کسی جلسۂ عام میں ، سامعین چند سو ہوتے یا ہزاروں کی تعداد میں ، اسے بالکل خاموشی سے سنا جاتا اور اس کی روانی میں زیر بحث مسائل کا تجزیہ وہ یوں کرتے چلے جاتے جیسے دھنیا روئی دھنتا ہے اور تقریر کے بعد ماحول کی وہ کیفیت ہوتی جو موسلا دھار بارش کے بعد دیکھنے میں آتی ہے ۔

قائد اعظم ایک بہت بڑے سیاسی مفکر بھی تھے ۔ ان کے مخصوص سیاسی نظریات تھے ۔ وہ سیاست کو شطرنج سے تشبیہ دیتے تھے ، لیکن سیاسی شطرنج کو انصاف کے ساتھ کھیلنے کے قائل تھے ۔ وہ اخلاقی اقدار کو بلند رکھنے پر زور دیتے تھے ۔ انہوں نے متعدد بار انتخابات میں حصہ لیا ، لیکن کوئی گھٹیا حربہ نہ کبھی خود استعمال کیا نہ کسی دوسرے کو اس کی اجازت دی ۔ حب الوطنی اور رواداری کے ساتھ ساتھ آئین پسندی اور عدل و دیانت ان کی سیاست و قیادت کے بنیادی اصول تھے ۔ سال ہا سال تک وہ حزب اختلاف میں رہے ۔ وہ حکومت پر تنقید کرنا ہر پڑھے لکھے آدمی کا حق سمجھتے تھے ، لیکن مخالفت برائے مخالفت کے قائل نہ تھے ۔ ان کا ارشاد تھا کہ اگر حکومت کی حکمت عملی غلط ہو تو ڈٹ کر مخالفت کی جائے ، لیکن اگر وہ کوئی صحیح کام کرے تو اس کی توصیف میں بھی بخل سے کام نہ لیا جائے ۔ لوگوں کے بنیادی حقوق کی بحالی اور تحفظ اور محکوم قوموں کی حریت اور آزادی کے وہ زبردست حامی تھے ۔ ان کی سیاسی زندگی کے سرسری مطالعے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلامیان ہند کے حقوق کا انہیں شروع ہی سے خیال رہا ۔ وہ مسلمانوں کے علیحدہ تشخص کے ہمیشہ سے علمبردار رہے ۔ جداگانہ طریق انتخاب کو وہ مسلمانوں کے لیے نصب العین نہیں بلکہ نصب العین تک پہنچنے کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے اور ۱۹۳۴ - ۱۹۳۵ء کے بعد تو مسلمانوں کے علیحدہ تشخص کو تسلیم کرانے اور اس سلسلے میں دو قومی نظریے کی واضح تعریف و توضیح کو انہوں نے اپنی زندگی کا فریضہ قرار دے لیا تھا ۔

قائد اعظم ایک راسخ الاعتقاد مسلمان تھے ۔ انہیں اللہ تعالٰی پر ایمان محکم تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی عقیدت و محبت ۔ انہوں نے ہمیشہ ایک خدا ، ایک رسول ، ایک کتاب کو مسلمانوں کے باہمی اتحاد کی اہم ترین بنیاد گردانا ۔ ان کے فلسفۂ سیاست کی اساس قرآن تھی ۔ اسی لیے وہ پاکستان میں ایک اسلامی طرز حکومت کے قیام کے داعی تھے ۔ اکثر غیر ملکی اور بعض پاکستانی دانشوروں کا یہ خیال درست نہیں کہ قائد اعظم بنیادی طور پر ایک ”Secularist“ تھے ، یا ان کے ذہن میں ایک ”سیکولر“ جمہوری نظام کا نقشہ تھا ۔ اس ضمن میں قائد اعظم کی تقاریر اور بیانات کے بعض اقتباسات کو سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے پیش کیا جاتا ہے یا ان کی غلط تعبیرات نکالی جاتی ہیں ۔

آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں Secularist کی تعریف یہ دی گئی ہے کہ وہ شخص جو Secularism

کا پرستار ہو اور Secularism کا مفہوم یہ بتایا گیا ہے کہ یہ نظریہ اس اخلاق پر مبنی ہے جو صرف اس دنیا میں بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے ہو اور جس میں خدا پر ایمان اور آخرت کے عقیدے کو خارج از بحث سمجھا جائے۔ گویا ایک Secularist کے لیے Athiest یعنی دہریہ ہونا لازم ہے۔

اس تعریف کی رو سے ہم ایسے قائد کو کسی طور بھی "سیکولرسٹ" قرار نہیں دے سکتے جس کا دعوٰی ہی یہ ہو کہ "مسلمان ایک خدا، ایک قرآن اور ایک رسول پر ایمان رکھتے ہیں؛ لہذا ہم کو ایک قوم کی حیثیت سے متحد ہو جانا چاہیے"! یا یہ کہ "اسلامیان ہند کے لیے کتاب عظیم قرآن ہی لنگر کا کام دیتی ہے"۔

قائد اعظم کو مغربی جمہوریت کا علمبردار کہنا بھی درست نہیں۔ مغربی جمہوریت کا بنیادی مقصد، جیسا کہ سب جانتے ہیں، یہ ہے کہ عوام کی حکومت ہو، اس کی باگ ڈور عوام کے ہاتھ میں ہو اور یہ عوام کے لیے ہو۔ یہ مثالی جمہوریت دنیا میں کسی بھی جگہ کسی بھی زمانے میں قائم نہیں ہوئی بلکہ ہر جگہ اور زمانے میں اس کی مختلف تعبیرات نے اس کے بنیادی مفہوم کو ختم کر کے رکھ دیا؛ حتٰی کہ آج اس کی صحیح وضاحت پیش کرنے سے مغربی دانشور بھی قاصر ہیں۔ معاشرتی علوم کی بین الاقوامی انسائیکلوپیڈیا (*International Encyclopaedia of Social Sciences*) میں یہ اعتراف موجود ہے کہ جمہوریت کی تعریف محال ہے۔ برطانوی پارلیمانی جمہوریت کے حامی مصنفین کے لیے سر ونسٹن چرچل کا یہ قول قابل غور ہے کہ "جمہوریت بدترین نظام حکومت ہے"۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ قائد اعظم مغربی جمہوریت کو متحدہ ہندوستان کے لیے پسند کرتے تھے نہ بعد ازاں پاکستان کے لیے۔ *Time and Tide* (جنوری ۱۹۴۰ء) میں ان کے مطبوعہ مقالے میں یہ الفاظ قابل توجہ ہیں کہ "مغربی جمہوریت ہندوستان کے لیے انتہائی ناموزوں ہے"۔ ۱۹۴۱ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ کے اجلاس میں بھی انہوں نے اسی بات کو زیادہ پر زور الفاظ میں بیان کیا تھا۔ قائد اعظم کے قریبی رفقاء کا بھی یہی اعتقاد تھا، چنانچہ آل انڈیا مسلم لیگ کا جو آخری سالانہ اجلاس دسمبر ۱۹۴۳ء میں کراچی میں منعقد ہوا اس میں نواب بہادر یار جنگ نے اپنی تقریر میں قیام پاکستان کے بعد وہاں کے دستوری نظام کی ان الفاظ میں نشان دہی کی: "آپ کے قائد نے ایک سے زائد مرتبہ اس کا اعادہ فرمایا ہے کہ مسلمان اپنی حکومتوں میں کسی دستور اور قانون کو خود مرتب کرنے کا حق نہیں رکھتے۔ ان کا دستور مرتب و متعین ان کے ہاتھوں میں موجود ہے۔ اور وہ قرآن مجید ہے"۔ پھر کہا کہ "پلاننگ کمیٹی آپ کے لیے جو دستوری اور سیاسی نظام مرتب کرے گی اس کی بنیادیں کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر ہوں گی۔ سن لیجیے اور آگاہ ہو جائیے کہ جس سیاست کی بنیاد کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر نہیں وہ شیطانی سیاست ہے اور ہم ایسی سیاست سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں"۔ اس موقع پر قائد اعظم نے زور سے اور بڑے جوش سے میز پر مکا مار کر فرمایا "تم بالکل درست کہتے ہو"۔

یہاں یہ بات بھی مد نظر رہے کہ قائد اعظم اسلامی نظام حکومت میں ملائیت (Theocracy) کے قائل نہیں تھے۔ کیونکہ یہ بھی بطور ایک نظریہ اور نظام مغرب ہی کی پیداوار ہے۔ اسلام میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔

بہر حال قائد اعظم اسلامی جمہوری نظام ہی کے علمبردار تھے۔ انہوں نے تحریک پاکستان اسی نظام کے لیے چلائی تھی اور اسلام، اسلامی نظریہ اور اسلامی ثقافت اس تحریک کے بنیادی محرکات تھے۔

قائد اعظم کے کردار کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ ان کی تحریر و تقریر اور عمل میں مکمل ہم آہنگی تھی۔ وہ ہر مسئلے پر خوب غور و فکر کرتے اور جب کسی فیصلے پر پہنچ جاتے تو اس پر چٹان کی طرح ڈٹ جاتے۔ ان کی نظر میں مصالحت صرف انہیں باتوں میں ممکن تھی جو ملک و قوم کے وسیع مفاد میں ہوں ورنہ اصولوں پر سمجھوتا ان کے لیے ناممکن تھا۔ مشہور برطانوی مدبر سر سٹیفرڈ کرپس نے لکھا ہے: "مسٹر جناح ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے اصول میں کسی قسم کی نرمی برداشت نہیں کر سکتے۔ جس سختی سے وہ اپنے نظریے پر قائم تھے اس سے اس غیر معمولی احتیاط و فکر کا پتا چلتا ہے جس سے ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں کام لے رہے تھے اور جن کی بنا پر وہ تہ دل سے چاہتے تھے کہ ملک کے دور دراز گوشوں میں پھیلی ہوئی اس اقلیت کے لیے پورا سیاسی تحفظ حاصل کیا جائے۔ یہ ان کا عزم راسخ تھا کہ انہوں نے حالات کی ہر دعوت مقابلہ کو منظور کیا اور اپنی قوم کو آزادی کی منزل تک پہنچا کے رہے۔ انتہائی جرأت اور استقلال ان کے کردار اور شخصیت کا امتیاز تھا"۔ اسی طرح دہلی کے کانگرسی روزنامہ ہندوستان ٹائمز کے ایک اداریے کا یہ اقتباس بھی قابل توجہ ہے: "تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کے عزم صمیم کے سامنے حقائق مٹ گئے اور ایک خواب حقیقت کی شکل میں مجسم ہو کر دنیا کے سامنے آ گیا۔ وہ اپنے ارادے کے پکے اور پرخلوص نیت کے مالک تھے۔ تاریخ انہیں ہرگز فراموش نہیں کر سکتی کیونکہ انہوں نے تاریخ بنائی ہے"۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قائد اعظم کی بلندی کردار کے سبھی قائل تھے۔ یقین محکم، جرأت و بےباکی، صدق و دیانت، ان تھک محنت، قوت برداشت اور ایثار و خلوص، یہ خصوصیات تھیں جن کی بنا پر ان کی شخصیت شروع ہی سے مسحور کن بن گئی تھی اور اسی لیے ان کا بڑے سے بڑا حریف بھی ان سے بات کرتے جھجکتا تھا۔ سر آغا خاں نے اپنی *Memoirs* میں لکھا ہے "میں اپنی زندگی میں چرچل، لائیڈ جارج، مسولینی اور گاندھی ایسے بڑے بڑے سیاسی قائدین سے ملا ہوں، لیکن میں نے جناح کو ان سب سے زیادہ اہم پایا"۔ بیورلی نکلز نے *Verdict on India* میں انہیں "ایشیا کی سب سے زیادہ قابل توجہ شخصیت" قرار دیتے ہوئے لکھا تھا کہ دس کروڑ مسلمان ان کے حکم کے علاوہ کسی اور کا حکم ماننے کے لیے تیار نہیں۔ وہ صحیح معنوں میں اپنے عوام کے قائد تھے۔ برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ میں قائد اعظم سے زیادہ کسی رہنما کو عوام نے اپنی عقیدت اور اطاعت کا مرجع نہیں بنایا حالانکہ بظاہر ان میں عوامی لیڈروں والی کوئی بات نہ تھی۔ وہ کبھی قید نہیں ہوئے، انہوں نے زہد و تقویٰ کا دعویٰ نہیں کیا، عوامی بہروپ نہیں بھرا، اسلام نمائی کو اپنا شعار نہیں بنایا، تملق اور ظاہری انکسار سے کام نہیں لیا، تاہم یہ ان کے کردار کی بلندی اور پاکیزگی تھی کہ مسلم عوام محض ان کے ایک ارشاد پر اپنا سب کچھ قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے اور وہ بھی ایسے حالات میں کہ سیاست کے تمام کہنہ مشق کھلاڑی ان کے مخالف تھے اور ان کے ہم رکاب آزاد طلب اور گم نام قسم کے افراد تھے۔

یہ محض قائد اعظم کا خلوص ، استقلال اور تدبر تھا کہ برطانیہ عظمٰی کا استبداد ، کانگرس کا جاہ و جلال، ہندوؤں کی دولت، قوم‌پرست مسلمانوں کی سیاست اور اپنے عوام کی بے نظمی اور پسماندگی غرض کہ کوئی بات بھی ان کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکی ۔ بقول فاطمہ جناح : " قائد اعظم نے زندگی کے تمام معرکے عزم راسخ ، عالی حوصلگی اور پامردی کے ساتھ تن تنہا سر کیے ۔ وہ جس بات کو صحیح سمجھتے تھے ، اس سے ان کے والہانہ لگاؤ اور اپنے نصب العین سے ناقابل شکست عقیدت کو کم فہم لوگ غلطی سے ضد تصور کرتے تھے ۔ ان کے عزم میں اس قدر بلندی تھی کہ وہ اپنے غم و اندوہ میں کسی دوسرے کو شریک کرنا پسند نہیں کرتے تھے ۔ انہوں نے تمام مصائب و آلام کا صبر و سکون اور تحمل و حوصلہ سے تن بہ تقدیر مقابلہ کیا " ۔

دنیا کی تاریخ میں بہت کم انسان یہ فخر کر سکتے ہیں کہ وہ ذاتی کوشش سے ایک نئے ملک کے بانی بنے ہوں ۔ قائد اعظم ایسی حالت میں بانی بنے جب ایک دنیا ان کے خلاف تھی ۔ وہ تن تنہا ، مردانہ وار لڑے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے ۔

مآخذ : (۱) سروجنی نائیڈو : *Mohammad Ali Jinnah : An Ambassador of Unity* ، مدراس ۱۹۱۸ء ؛ (۲) جی ۔ اے ۔ نٹیسن : *Eminent Mussalmans* ، مدراس ۱۹۲۷ء ؛ (۳) ای ۔ ایس ۔ مانٹیگو : *An Indian Diary* ، طبع مسز مانٹیگو ، لنڈن ۱۹۳۰ء ؛ (۴) کیلاش چندر : *Tragedy of Jinnah* ، لاہور ۱۹۴۱ء ؛ (۵) M. R. T. : *Nationalism in Conflict in India* ، بمبئی ۱۹۴۲ء ؛ (۶) Joachim Alva : *Men and Supermen of Hindustan* ، بمبئی ۱۹۴۳ء ؛ (۷) وہی مصنف : *Leaders of India* ، بمبئی ۱۹۴۵ء ؛ (۸) رام گوپال اچاریہ : *Ghandi-Jinnah Talks* ، دہلی ۱۹۴۴ء ؛ (۹) بیورلی نکلز : *Verdict on India* ، لنڈن ۱۹۴۴ء ؛ (۱۰) پرکاش : *The Story of Simla* ، لاہور ۱۹۴۵ء ؛ (۱۱) اے ۔ اے ۔ رؤف : *Meet Mr. Jinnah* ، لاہور ۱۹۴۴ء ؛ (۱۲) زیڈ ۔ اے ۔ سلہری : *My Leader* ، لاہور ۱۹۴۶ء ؛ (۱۳) عظیم حسین : *Fazl-i-Hussain* ، لنڈن ۱۹۴۶ء ؛ (۱۴) عبداللطیف : *The Great Leader* ، لاہور ۱۹۴۷ء ؛ (۱۵) اکبر پاشا : *Pakistan Achieved* ، مدراس ۱۹۴۷ء ؛ (۱۶) اے ۔ بی ۔ راجپوت : *Muslim League : Yesterday and Today* ، لاہور ۱۹۴۸ء ؛ (۱۷) *Jinnah : Speeches as Governor General* ، کراچی ۱۹۵۱ء ؛ (۱۸) مطلوب الحسن سید : *Mohammad Ali Jinnah : A Political Study* ، لاہور ۱۹۵۳ء ؛ (۱۹) ہیکٹر بولیتھو : *Jinnah : Creator of Pakistan* ، لنڈن ۱۹۵۴ء (اردو ترجمہ از زاہد صدیقی : پاکستان کا بانی : محمد علی جناح ، لاہور ۱۹۷۶ء) ؛ (۲۰) لال بہادر : *The Muslim League : Its History , Activities and Achievements* ، آگرہ ۱۹۵۴ء ؛ (۲۱) وی ۔ پی ۔ مینن : *The Transfer of Power* ، پرنسٹن یونیورسٹی ۱۹۵۷ء ؛ (۲۲) جمیل الدین احمد : *Glimpses of Quaid-i-Azam* ، کراچی ۱۹۶۰ء ؛ (۲۳) وہی مصنف : *Quaid-i-Azam as seen by his contemporaries* ، لاہور ۱۹۶۶ء ؛ (۲۴) وہی مصنف : *Early Phase of Muslim Political Movement* ، لاہور ۱۹۶۷ء ؛ (۲۵) وہی مصنف : *Middle Phase of Muslim Political Movement* ، لاہور ۱۹۶۹ء ؛ (۲۶) وہی مصنف : *Final Phase of Struggle for Pakistan* ، کراچی ۱۹۶۰ء ؛ (۲۷) وہی مصنف : *Speeches and Writings of Mr. Jinnah* ، لاہور ۱۹۶۸ء ، ۱۹۶۷ء ؛ (۲۸) وہی مصنف : *Historic Documents of the Muslim Freedom Movement* ، لاہور ۱۹۷۰ء ؛ (۲۹) وہی مصنف : *Creation of Pakistan* ، لاہور ۱۹۷۶ء ؛ (۳۰) ابوالکلام آزاد : *India Wins Freedom* ، نیویارک ۱۹۶۰ء ؛ (۳۱) ایس ۔ کے ۔ موجمدار : *Jinnah and Gandhi* ، کلکتہ ۱۹۶۶ء ؛ (۳۲) پی ۔ مون : *Divide and Quit* ، لنڈن ۱۹۶۲ء ؛ (۳۳) وہی مصنف : *Wavell : The*

Viceroy's Journal ، کراچی ۱۹۷۳ء۔ (۳۴) سید شریف الدین پیرزادہ : Evolution of Pakistan ، لاہور ۱۹۶۳ء : (۳۵) وہی مصنف : The Pakistan Resolution and the historic Lahore Session ، لاہور ۱۹۶۸ء : (۳۶) وہی مصنف : Foundation of Pakistan : All India Muslim League Documents (1906-1947) ، ۲ جلد ، کراچی ۱۹۶۹ء : (۳۷) وہی مصنف : The Collected Works of Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah جلد اول (۱۹۰۶ء تا ۱۹۲۱) ، کراچی ۱۹۷۳ء : (۳۸) وہی مصنف : Quaid-i-Azam Jinnah's Correspondence ، کراچی ۱۹۷۷ء : (۳۹) وہی مصنف : Some Aspects of Quaid-i-Azam's Life ، اسلام آباد ۱۹۷۸ء : (۴۰) Selected Speeches and Statements of Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah, 1911-1934 and 1947-1948 ، طبع رفیق افضل ، لاہور ۱۹۶۶ء : (۴۱) Quaid-i-Azam M.A. Jinnah : Speeches in the Legislative Assembly of India, 1924-1930 ، طبع رفیق افضل ، لاہور ۱۹۷۶ء : (۴۲) ایم ۔ اے ۔ ایچ ۔ اصفہانی : Quaid-i-Azam, As I Knew Him ، کراچی ۱۹۶۶ء (اردو ترجمہ : قائد اعظم میری نظر میں ، کراچی ۱۹۶۸ء) : (۴۳) جی ۔ الانا : Our Freedom Fighters (1562-1947) ، کراچی ۱۹۶۹ء : (۴۴) وہی مصنف : Quaid-i Azam Jinnah : The Story of a Nation ، کراچی ۱۹۶۷ء (اردو ترجمہ از رئیس امروہوی : قائد اعظم جناح، ایک قوم کی سرگزشت، لاہور ۱۹۷۶ء) : (۴۵) وہی مصنف : Pakistan Movement : Historic Documents, Speeches and Statements of Quaid-i-Millat Liaquat Ali Khan, 1941-1951 ، لاہور ۱۹۶۷ء : (۴۷) سلیم قریشی : Jinnah and the Making of a Nation ، کراچی ۱۹۶۹ء : (۴۸) جاوید اقبال : The Legacy of Quaid-i-Azam ، کراچی ۱۹۶۷ء (اردو ترجمہ : میراث قائد اعظم ، لاہور ۱۹۶۷ء) : (۴۹) رفیق افضل : Malik Barkat Ali : His Life and Writings ، لاہور ۱۹۶۹ء : (۵۰) محمد انور : Quaid-i-Azam Jinnah, A Selected Bibliography ، کراچی ۱۹۶۹ء : (۵۱) سرفراز حسین مرزا : Muslim Women's Role in Pakistan Movement ، لاہور ۱۹۶۹ء : (۵۲) وہی مصنف : Punjab Muslim Students Federation ، لاہور ۱۹۷۸ء : (۵۳) ایچ ۔ وی ۔ ہاڈسن : The Great Divide ، لندن ۱۹۶۹ء : (۵۴) وحید احمد : Jinnah—Irwin Correspondence ، لاہور ۱۹۶۹ء : (۵۵) سی ۔ ایچ فلپس : The Partition of India : Policies and Perspectives ، لندن ۱۹۷۰ء : (۵۶) M. Sheila : Mohammad Ali Jinnah : Maker of Modern Pakistan ، ۱۹۷۰ء : (۵۷) ایس ۔ ایم ۔ اکرام : Modern Muslim India and Birth of Pakistan ، لاہور ۱۹۷۰ء : (۵۸) پرویز طاہر : Economic and Social Thinking of Quaid-i-Azam ، لاہور ۱۹۷۰ء : (۵۹) محمد عمر : Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah : Rare Speeches, 1910-1918 ، کراچی ۱۹۷۳ء : (۶۰) چوہدری محمد علی : Emergence of Pakistan ، لاہور ۱۹۷۳ء (اردو ترجمہ : ظہور پاکستان ، مطبوعہ لاہور) : (۶۱) شفیق علی خان : Mr. Jinnah as a Political Thinker ، حیدر آباد ۱۹۷۳ء : (۶۲) Lorry Colluis و Dominique Lappiene : Freedom at Midnight ، نیویارک ۱۹۷۵ء : (۶۳) M. A. Jinnah—Ispahani Correspondence ، مرتبہ زیڈ ۔ ایچ ۔ زیدی ، کراچی ۱۹۷۶ء : (۶۴) ایم ۔ ایس ۔ طوسی : My Reminiscences of Quaid-i-Azam ، اسلام آباد ۱۹۷۶ء : (۶۵) سید شمس الحسن : Plain Mr. Jinnah ، کراچی ۱۹۷۶ء : (۶۶) وحیدالزمان : Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah : Myth and Reality ، اسلام آباد ۱۹۷۶ء : (۶۷) احمد سعید : Writings of Quaid-i-Azam ، لاہور ۱۹۷۶ء : (۶۸) وہی مصنف : Eastern Times on Quaid-i-Azam ، مطبوعہ لاہور : (۶۹) محمد یوسف خان : The Glory of Quaid-i-Azam ، ملتان ۱۹۷۶ء : (۷۰) لطیف احمد شیروانی : The

Founder of Pakistan ، اسلام آباد ۱۹۷۶ء : (۷۱) محمد
علی : Quaid-i-Azam as a Constitutionalist ، اسلام آباد
۱۹۷۶ء : (۷۲) فیروزہ احمد : Quaid-i-Azam and
Muslim Women ، اسلام آباد ۱۹۷۶ء : (۷۳) ضیاء الدین
احمد : Mohammad Ali Jinnah · Founder of Pakistan ،
اسلام آباد ۱۹۷۶ء : (۷۴) رضوان احمد : The Quaid-i-
Azam Papers (1940) ، کراچی ۱۹۷۶ء : (۷۵) Remi-
niscences of the Day of Deliverance ، مطبوعۂ وزارت
تعلیم پاکستان ، اسلام آباد ۱۹۷۶ء : (۷۶) Pakistan.
Past and Present ، مطبوعہ Stacy International ، لندن
۱۹۷۷ء : (۷۷) قائم حسین جعفری : Quaid-i-Azam's
Correspondence with Punjab Muslim League Leaders ،
لاہور ۱۹۷۷ء : (۷۸) الٰہی بخش : With Quaid-i-Azam
during his last days ، کراچی ۱۹۷۸ء : (۷۹) Quaid-
i-Azam Mohammad Ali Jinnah, An Annotated Bib-
liography ، طبع خورشید الیس ، کراچی ۱۹۷۸ء :
(۸۰) مختار زمن : Students' Role in the Pakistan
Movement ، کراچی ۱۹۷۸ء : (۸۱) عتیق ظفر شیخ :
Quaid-i-Azam and the Muslim World ، کراچی
۱۹۷۸ء : (۸۲) World Scholars on Quaid-i-Azam
Mohammad Ali Jinnah ، طبع احمد حسن دانی ، اسلام آباد
۱۹۷۹ء : (۸۳) منیر احمد ، جسٹس : From Jinnah to
Zia ، لاہور ۱۹۷۹ء : (۸۴) شریف المجاہد : Quaid-i-
Azam Jinnah—A Chronology ، کراچی ۱۹۸۱ء : (۸۵)
وہی مصنف : Quaid-i-Azam : Studies in Interpretation
کراچی ۱۹۸۱ء : (۸۶) Stanley Walpert :
Jinnah of Pakistan ، مطبوعہ آکسفرڈ یونیورسٹی پریس
۱۹۸۴ء : (۸۷) ریاض احمد : Quaid-i-Azam as a
Magistrate ، راولپنڈی ۱۹۸۵ء : (۸۸) عائشہ جلال :
The Sole Spokesman ، کیمبرج یونیورسٹی پریس ۱۹۸۵ء :
(۸۹) شیر محمد گریوال : Jinnah Wavel Correspond-
ence ، لاہور ۱۹۸۵ء : (۹۰) The Transfer of Power,
1942-1947 ، سلسلۂ دستاویزات ، مطبوعۂ حکومت برطانیہ ؛
(۹۱) کانجی دوارکا داس : Rutti Jinnah : The Story of
a Great Friendship ، مطبوعہ بمبئی : (۹۲) وہی مصنف :
محمد علی جناح ، اردو ترجمہ از شہاب الدین ، دہلی ۱۹۷۰ء :
(۹۳) Iqbal's Letters to Jinnah ، مطبوعہ شیخ محمد
اشرف ، لاہور : (۹۴) قائم حسین جعفری : Congress
Leaders' Corrsspondence with Quaid-i-Azam ، مطبوعہ
لاہور : (۹۵) ایک بیرسٹر : Jinnah faces an Assassin ،
مطبوعہ بمبئی : (۹۶) The Quaid-i-Azam's Mausolium ،
طبع وزارت تعلیم پاکستان ، اسلام آباد : (۹۷) آفتاب
حسین : Mohammad Ali Jinnah's Career in the
Legislative Assembly ، تحقیقی مقالہ برائے ایم ۔ اے
(تاریخ) ، در کتاب خانۂ جامعہ پنجاب ، لاہور : (۹۸)
عبدالغفار : Quaid-i-Azam as Governor General ، تحقیقی
مقالہ برائے ایم ۔ اے (تاریخ) ، در کتاب خانۂ جامعۂ
پنجاب ، لاہور : (۹۹) محمد امین زبیری : سیاست ملیہ ،
آگرہ ۱۹۴۱ء : (۱۰۰) رضا علی : اعمال نامہ ، دہلی
۱۹۴۳ء : (۱۰۱) شریف الدین پیرزادہ : قائد اعظم پر
قاتلانہ حملہ ، بمبئی ۱۹۴۳ء : (۱۰۲) سید حسن ریاض :
پاکستان ناگزیر تھا ، کراچی ۱۹۷۰ء : (۱۰۳) سردار
محمد خان : حیات قائد اعظم ، لاہور ۱۹۳۹ : (۱۰۴)
محمد یامین خان : نامۂ اعمال ، ۲ جلد ، مطبوعۂ لاہور :
(۱۰۵) نعرۂ حق (قائد اعظم کی چند تاریخی تقریریں ،
۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۵ء) ، مطبوعۂ لاہور : (۱۰۶) رئیس احمد
جعفری : خطبات جناح ، لاہور ۱۹۶۶ء : (۱۰۷) وہی
مصنف : قائد اعظم اور ان کا عہد ، لاہور ۱۹۶۲ء :
(۱۰۸) سید نور احمد : مارشل لا سے مارشل لا تک ، لاہور
۱۹۶۵ء : (۱۰۹) خلیق الزمان : شاہراہ قائد اعظم (اردو
ترجمہ) ، کراچی ۱۹۶۷ء : (۱۱۰) احمد سعید : قائد اعظم
اور مسلم پریس ، لاہور ۱۹۷۶ء : (۱۱۱) وہی مصنف :
گفتار قائد اعظم ، لاہور ۱۹۷۶ء : (۱۱۲) وہی مصنف :
اشاریۂ قائد اعظم ، اسلام آباد ۱۹۷۶ء : (۱۱۳) وہی

مصنف: اقبال اور قائد اعظم، لاہور ۱۹۷۷ء؛ (۱۱۴) وہی مصنف: حیات قائد اعظم کے چند نئے پہلو، اسلام آباد ۱۹۷۸ء؛ (۱۱۵) آفتاب احمد: قائد اعظم، چند یادیں چند ملاقاتیں، لاہور ۱۹۷۶ء؛ (۱۱۶) رضوان احمد: قائد اعظم، ابتدائی تیس سال، کراچی ۱۹۷۶ء؛ (۱۱۷) وہی مصنف: پونجا جناح، کراچی ۱۹۷۶ء؛ (۱۱۸) وضی حیدر خواجہ: قائد اعظم کے ۷۲ سال، کراچی ۱۹۷۶ء؛ (۱۱۹) عبدالسلام خورشید: قائد اعظم اور پاکستان، کراچی ۱۹۷۶ء؛ (۱۲۰) رحیم بخش شاہین: نقوش قائد اعظم، لاہور ۱۹۷۶ء؛ (۱۲۱) عزیز جاوید: قائد اعظم اور سرحد، لاہور ۱۹۷۸ء؛ (۱۲۲) خورشید انیس: قائد اعظم محمد علی جناح، توضیحی کتابیات، جلد دوم، کراچی ۱۹۷۶ء؛ (۱۲۳) شمیم جالندھری: تحریک پاکستان میں خواتین کا حصہ، لاہور ۱۹۸۱ء؛ (۱۲۴) کرم حیدری: ملت کا پاسبان، کراچی ۱۹۸۱ء؛ (۱۲۵) شریف المجاہد: قائد اعظم، حیات و خدمات، کراچی ۱۹۸۳ء؛ (۱۲۶) زکریا ساجد: قائد اعظم میری نظر میں، کراچی ۱۹۸۳ء؛ مزید براں دیکھیے مختلف اخبارات، *The Dawn*، *The Pakistan Times*، *The Eastern Times*، نوائے وقت، زمیندار، احسان وغیرہ کے فائل؛ نیز رک بہ پاکستان، بالخصوص اس کے مآخذ.

(شیر محمد گریوال)

⊛ محمد علی جوہر، رئیس الاحرار مولانا:

برعظیم پاک و ہند میں برطانوی حکومت کے خلاف تحریک آزادی کے ممتاز اور نامور مسلمان رہنما، ۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء کو بمقام نجیب آباد، ریاست رام پور کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابھی دو سال کے تھے کہ ان کے والد عبدالعلی خان وفات پا گئے، لیکن ان کی والدہ عابدی بیگم نے تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باوجود انتہائی روشن خیالی سے کام لیتے ہوئے اپنے تینوں بیٹوں ذوالفقار علی، شوکت علی اور محمد علی کو جدید تعلیم دلوائی۔ محمد علی اور ان کے بڑے بھائی شوکت علی نے بطور طالب علم علی گڑھ کی مشہور درس گاہ میں بڑا نام پیدا کیا۔ محمد علی ایک اچھے کھلاڑی، ذہین طالب علم، اعلیٰ درجے کے مقرر، انشاپرداز اور شاعر ہونے کے علاوہ اپنی حق گوئی اور بیباکی کے باعث طالب علموں اور اساتذہ میں یکساں مقبول تھے۔ ۱۸۹۶ء میں وہ الٰہ آباد یونیورسٹی کے امتحان بی۔ اے میں اول آئے اور ۱۸۹۸ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے۔ یہاں انھوں نے آکسفرڈ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ شوکت علی کی خواہش تھی کہ محمد علی انڈین سول سروس کا امتحان دے کر بڑے افسر بنیں، لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ وہ اس امتحان میں ناکام رہے اور ۱۹۰۲ء میں ماڈرن ہسٹری میں بی۔ اے (آنرز) کی ڈگری لے کر وطن واپس آ گئے اور نواب رام پور نے انھیں انسپکٹر جنرل تعلیمات کے عہدے پر فائز کر دیا۔ ریاستی ریشہ دوانیوں سے برداشتہ خاطر ہو کر ۱۹۰۳ء میں وہ اپنے آکسفرڈ کے ہم جماعت مہاراجہ بڑودہ کی ملازمت میں آ گئے۔ یہاں انھوں نے اعلیٰ انتظامی عہدوں پر اپنے فرائض انتہائی دیانت داری اور خوش اسلوبی سے انجام دیے۔ ۱۹۱۰ء میں وہ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کے ٹرسٹی منتخب ہو گئے۔ اس زمانے میں ان کے بے شمار مضامین مشہور انگریزی اخباروں اور رسالوں، مثلاً *Punjab Review*، *Times of India*، *Indian Spectator*، *Lahore Observer* وغیرہ میں شائع ہوئے اور ان کی انگریزی انشاپردازی کی دھوم مچ گئی۔ ان مضامین نے جہاں انھیں شہرت بخشی، وہاں ان کے اندر اتنی خود اعتمادی پیدا ہو گئی کہ ملازمت سے مستعفی ہو کر یکم جنوری ۱۹۱۱ء کو کلکتہ سے ایک ہفت روزہ *Comrade* جاری کر دیا اور

یوں ان کی صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز ہوگیا ۔

یہ محمد علی کی زندگی کا ایک اہم موڑ تھا ، کیونکہ یہیں سے ان کی بھرپور سیاسی زندگی کا آغاز بھی ہوتا ہے ۔ یوں تو وہ اپنی ملازمت کے دوران ہی میں عملی سیاست میں حصہ لینے لگے تھے ، چنانچہ دسمبر ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کے وقت وہ ملک کے عظیم مسلمان رہنماؤں کے ساتھ ڈھاکہ میں موجود تھے اور اس تاریخی واقعے کی روداد بھی انہوں نے نواب محسن الملک (رکن بان) کی فرمائش پر *The Green Book* کے عنوان سے قلمبند کی تھی ۔

۱۹۰۹ء کی اصلاحات میں آل انڈیا مسلم لیگ کی مساعی سے علیحدہ طریق انتخاب کے بارے میں مسلمانوں کا مطالبہ منظور کر لیا گیا تھا ، لیکن مسلمان اس سے مطمئن نہ تھے ۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۱۱ء کو تقسیم بنگال کی تنسیخ سے ان کی بے چینی میں اضافہ ہوگیا ۔ اس کے بعد پے درپے ایسے واقعات رونما ہوئے جن سے مسلمانوں کے دل میں انگریزوں سے نفرت کا جذبہ گہرا ہوتا چلا گیا ۔ جنگ بلقان اور مسجد کانپور کے انہدام کے سلسلے میں محمد علی نے خاص طور پر مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کا پورا پورا حق ادا کیا ۔ ان کی کوششوں سے جنگ بلقان کے دوران میں ترک مجاہدین کی خدمت کے لیے ایک طبی وفد ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں روانہ کیا گیا ۔ ۱۹۱۳ء میں وہ سید وزیر حسن کی معیت میں مسجد کانپور کا مسئلہ پیش کرنے کے لیے انگلستان گئے ، جہاں انہوں نے تقریریں کیں ، مضامین لکھے ، وزرا اور ممبران پارلیمنٹ سے ملے ، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وائسرائے لارڈ ہارڈنگ نے یہ مسئلہ اپنے ہاتھ میں لے کر تحریک میں گرفتار ہونے والوں کی رہائی اور مسجد کی تعمیر کا حکم دے دیا ۔ اسی سفر کے دوران میں مولانا محمد علی نے (قائد اعظم) محمد علی جناح کو آل انڈیا مسلم لیگ کا باقاعدہ رکن بننے پر رضامند کر لیا ۔ ہندوستان واپس آ کر انہوں نے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا ، کیونکہ ان کے نزدیک ملک کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے ایک متحدہ محاذ کی ضرورت تھی ۔

یہ ایک انتہائی نازک اور پرآشوب دور تھا ۔ برطانوی نوآبادیاتی نظام اپنے عروج پر تھا ۔ اس کے خلاف کچھ کہنا یا لکھنا آسان نہ تھا ، لیکن مولانا محمد علی نے اپنے صحافتی اور سیاسی کردار کو انتہائی دلیری ، بے باکی اور ثابت قدمی سے ادا کیا اور کمال جرأت سے حکومت وقت کی غلط پالیسیوں کو ہدف تنقید بنایا ۔ ان کی تقریروں اور تحریروں نے جہاں مسلمانوں کے سیاسی شعور کو پوری طرح بیدار کر کے ان کے اندر آزادی کے لیے جد و جہد کا ایک بے پایاں جذبہ پیدا کیا وہاں ان کی تنقید سے برطانوی حکومت کے ایوان لرز اٹھے ۔ ۱۹۱۱ء میں وہ کلکتہ سے دہلی منتقل ہوگئے تھے اور یہاں سے کامریڈ کے علاوہ اردو کا ایک اخبار ہمدرد بھی جاری کر دیا تھا ۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو ترکوں نے جرمنی کا ساتھ دیا اس پر *London Times* نے ترکوں کو ہدف تنقید بناتے ہوئے *Choice of the Turk* کے عنوان سے ایک اداریہ لکھ مارا ۔ مولانا محمد علی نے کامریڈ میں اسی عنوان سے اس کا بڑا سخت اور مسکت جواب دیا ۔ ان کا یہ اداریہ بیس کالموں پر مشتمل تھا اور چالیس گھنٹے مسلسل بیٹھ کر لکھا گیا تھا ۔ بقول خود انہوں نے اسے شائع کر کے اپنی موت کے وارنٹ پر دستخط کر دیے تھے ۔ حکومت بری طرح سٹپٹا اٹھی کامریڈ اور ہمدرد سے ضمانت طلب کی گئی ، جس کا

نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں اخبار بند ہوگئے اور مولانا محمد علی اور ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی کو، جو سیاست کی پرخار وادی میں ان کے شریک سفر ہو چکے تھے ، قید کر دیا گیا ۔

ان کی اسیری کے دوران میں سیاسی افق پر کئی اہم واقعات رونما ہوئے ۔ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ کا میثاق لکھا گیا ۔ اسی سال والی مکہ شریف حسین نے انگریزوں کی شہ پر ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ ترکوں کو پہلے عرب و عراق سے دستبردار ہونا پڑا اور بعد ازاں جنگ عظیم میں شکست کا سامنا کرنا پڑا ۔ علی برادران کی عدم موجودگی میں ان کی والدہ ، جو اب بی اماں کے نام سے مشہور ہو چکی تھیں ، کمال جرأت سے سیاست میں حصہ لینے لگی تھیں؛ چنانچہ جب ستمبر ۱۹۱۷ء میں مسلمانوں نے مولانا محمد علی کی سیاسی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں مسلم لیگ کا صدر چن لیا تو اس کے سالانہ اجلاس میں کرسی صدارت پر مولانا محمد علی کی تصویر رکھی گئی اور بی اماں نے بڑی ولولہ انگیز تقریر کی ۔ یہی وہ زمانہ تھا جب گاندھی جی نے رولٹ ایکٹ کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک چلائی اور جلیانوالہ باغ کا خونیں سانحہ پیش آیا ، جس کے شدید رد عمل کے نتیجے میں حکومت کو تمام سیاسی قیدی رہا کرنے پڑے ۔ اس طرح ۱۹۱۹ء میں علی برادران کی رہائی بھی عمل میں آئی ۔ اس وقت تحریک خلافت کا آغاز ہو چکا تھا ، ہندوستان کو دارالحرب قرار دے دیا گیا تھا ، مسلمانوں میں ہجرت کی تحریک چل نکلی تھی اور ترکیہ کی شکست کے بعد اتحادی طاقتیں ، جن میں برطانیہ پیش پیش تھا ، سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے پر تلی ہوئی تھیں ۔ علی برادران رہا ہوتے ہی سیدھے امرتسر پہنچے ، جہاں کانگرس ، لیگ اور خلافت کمیٹی کے جلسے ہو رہے تھے ۔ یہاں ان کا بڑا پرجوش خیر مقدم کیا گیا ۔ علی برادران نے تحریک خلافت کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنی ولولہ انگیز قیادت سے اسے اتنی تقویت پہنچائی کہ تیس دن کے اندر تیس ہزار افراد جیلوں میں پہنچ گئے ۔ ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی کی زیر قیادت "وفد خلافت" یورپ گیا اور انگلستان ، فرانس اور اٹلی کے وزرائے اعظم کے علاوہ پوپ سے بھی ملاقات کی ، لیکن ان کے مطالبات پر کوئی توجہ نہ دی گئی اور وفد ناکام واپس آ گیا ۔

گاندھی جی نے تحریک خلافت کا ساتھ دے کر ہندوستانی سیاست میں اپنے لیے بڑا اہم مقام پیدا کر لیا تھا ، لیکن وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس تحریک کے ذریعے مسلمان ملک کی سیاست پر چھائے رہیں ؛ چنانچہ انہوں نے بڑی چابکدستی سے تحریک عدم تعاون شروع کر دی ۔ مولانا محمد علی نے اس میں بھی پورے خلوص سے حصہ لیا اور عملی طور پر اس کی قیادت بھی انہیں کے ہاتھ میں آ گئی ۔ یہ دیکھ کر گاندھی جی نے دفعتاً تحریک کے بند کر دینے کا اعلان کر دیا ۔ اب مولانا محمد علی کی توجہ کا مرکز تحریک خلافت تھی یا جامعہ ملیہ اسلامیہ ، جس کی بنیاد انہوں نے تحریک عدم تعاون کے سلسلے میں علی گڑھ میں رکھی تھی ۔

۱۹۲۱ء میں خلافت کانفرنس کا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا جس میں مولانا محمد علی نے اپنی پرجوش تقریر میں مسلمان فوجیوں کو برطانوی ملازمت چھوڑ دینے کی تلقین کی۔ مولانا شوکت علی بھی اس موقف میں برابر کے شریک تھے ؛ چنانچہ دونوں کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا ۔ حکومت نے ترغیب و ترہیب کا ہر حیلہ آزمایا ، لیکن علی برادران کے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہ آئی

اور انہیں دو دو سال قید با مشقت کی سزا سنا دی گئی ۔ ان کی عدم موجودگی میں بی اماں نے پہلے سے بھی زیادہ جرأت کا مظاہرہ کیا اور ان کے طوفانی دوروں سے ملک کے گوشے گوشے میں یہ صدا بلند ہونے لگی :

بولی اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

جب ۱۹۲۳ء میں علی برادران رہا ہوئے تو تحریک خلافت کا زور ٹوٹنے لگا تھا ۔ ترکیہ میں مصطفیٰ کمال پاشا نے برسر اقتدار آ کر "سلطان" کا ادارہ ختم کر دیا تھا اور "خلافت" کا ادارہ قائم تو تھا ، لیکن برائے نام ! پھر ۱۹۲۴ء میں اسے بھی کالعدم قرار دے دیا گیا ۔ علی برادران نے اس کے باوجود اپنے مشن کو جاری رکھا ، لیکن اب تحریک کی بنیاد ہی باقی نہ رہی تھی ۔ اس ضمن میں انہیں سعودی عرب کے سلطان ابن سعود سے کچھ امید تھی ، لیکن سلطان نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا ۔ سلطان نے مکہ معظمہ میں مسلمانان عالم کی ایک مؤتمر منعقد کی ، جس میں مولانا محمد علی نے بڑی شدت کے ساتھ ملوکیت کی مخالفت کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ملوکیت اسلامی تصور کے منافی ہے ۔

علی برادران کی اسیری کے دوران ہی میں فرقہ وارانہ تحریکیں زور پکڑنے لگی تھیں ۔ ہندو مہاسبھا نے شدھی اور سنگٹھن کی بنیاد ڈالی ، جسے کانگرس کے ہندو راہنماؤں کی آشیر باد بھی حاصل تھی ۔ مسلمانوں نے "تبلیغ اور تنظیم" کی صورت میں اس کا جواب دیا اور یوں تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون میں ہندو مسلم اتحاد کے جو نظارے دیکھنے میں آئے تھے ، خواب و خیال ہو کر رہ گئے ۔ سیاسی فضا اتنی مسموم ہو گئی کہ بات بات پر ہندو مسلم فسادات ہونے لگے ۔ ۱۹۲۳ء میں مولانا محمد علی کو باتفاق رائے آل انڈیا نیشنل کانگرس کا صدر منتخب کیا گیا ۔ اس کے سالانہ اجلاس میں ، جو کوکناڈا میں منعقد ہوا تھا ، مولانا محمد علی نے ایک بصیرت افروز خطبۂ صدارت دیا ۔ انہوں نے انتہائی کوشش کی کہ باہمی تلخیاں ختم کر کے دونوں قومیں برطانوی حکومت کے خلاف متحد ہو جائیں ، مگر متعصب ہندو راہنماؤں کے سامنے ان کی ایک نہ چلی اور وہ آہستہ آہستہ کانگرسی لیڈروں سے دور اور مسلم لیگ کے قریب ہوتے چلے گئے ۔ ۱۹۲۷ء میں انہوں نے تجاویز دہلی کی تدوین میں (قائداعظم) محمد علی جناح کے ساتھ کام کیا اور کچھ عرصہ بعد بغرض علاج انگلستان چلے گئے ، لیکن ابھی علاج مکمل نہ ہوا تھا کہ نہرو رپورٹ کی اشاعت کی خبر ملی جس میں تجاویز دہلی کو یکسر ٹھکرا کر ہندو راج کا منصوبہ پیش کیا گیا تھا ، چنانچہ مولانا فوراً عازم وطن ہو گئے ۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کو آل پارٹیز کنونشن میں تبصرہ کے لیے پیش کیا گیا ۔ محمد علی جناح نے ان میں بنیادی ترامیم پیش کیں اور مولانا محمد علی نے ان کی پرزور حمایت کی ۔ کنونشن کے چوتھے اور پانچویں دن ان رہنماؤں کی تقاریر پر ، جو کبھی ہندو مسلم اتحاد کے پیامبر سمجھے جاتے تھے ، ہندو راہنماؤں نے آوازے کسے ۔ جناح کو کانگرس کا بگڑا ہوا بچہ قرار دیا گیا اور مولانا کو گالیاں تک دی گئیں ۔

اب مولانا محمد علی کانگرس سے یکسر مایوس ہو چکے تھے ، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ دو قومی نظریے کے پرزور حامی بن چکے تھے ۔ وہ ہندو راہنماؤں پر زور دیتے تھے کہ مسلمانوں کی علیحدہ حیثیت کو تسلیم کر کے آگے قدم بڑھائیں ، لیکن انہوں نے اس پر قطعاً کان نہ دھرا اور اپنے

گھناؤنے عزائم کا اظہار کرتے رہے۔

مولانا کی زندگی کا آخری بڑا واقعہ گول میز کانفرنس میں ان کی شمولیت ہے۔ وہ سخت بیمار تھے، لیکن انھوں نے اس کی کارروائی میں بھرپور حصہ لیا۔ انھوں نے انگریزوں پر زور دیا کہ وہ ہندوستان کو فوری طور پر آزاد کر دیں۔ اپنی آخری معرکہ آرا تقریر میں انھوں نے کہا: "جب تک مجھے پروانۂ آزادی نہیں مل جاتا میں وطن واپس نہیں جاؤں گا۔ میں ایک غلام ملک میں واپس نہیں جا سکتا۔ میں ایک غیر لیکن آزاد ملک میں مرنے کو ترجیح دوں گا۔ اگر تم ہندوستان میں آزادی نہیں دے سکتے تو پھر تمھیں اپنے ملک میں میری قبر کے لیے جگہ مہیا کرنا ہوگی"۔

مولانا کا کہا پورا ہوا اور چند ہی روز بعد ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو وہ لندن ہی میں وفات پا گئے۔ عالم اسلام کے لیے انھوں نے جو عظیم خدمات سرانجام دی تھیں ان کے پیش نظر وہ بیت المقدس میں دفنائے گئے اور بقول اقبال:

خاک قدس او را باغوش تمنا در گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبرؐ گزشت

مولانا محمد علی اسلامیان ہند کی ایک تاریخ ساز شخصیت تھے۔ وہ مرد مومن بھی تھے اور بطل حریت بھی۔ مولانا مودودی نے لکھا ہے: "محمد علی کا سا زعیم غلام آباد ہندوستان نے شاید کوئی نہیں پیدا کیا۔ وہ گدائے بے نوا تھا، لیکن آغا خاں اور مہاراجہ محمود آباد اس کے حضور جھک کر آتے تھے۔ وہ اقلیت کا ایک فرد تھا لیکن اکثریت کا سب سے بڑا لیڈر گاندھی اس کی جیب میں تھا اور پٹیل، موتی لال، جواہر لال، راجندر پرشاد وغیرہ تو اس سے دوسرے ہی درجے پر تھے۔ وہ ایک غلام ملک کا باشندہ تھا لیکن دنیا کی سب سے بڑی سامراجی حکومت اس سے ڈرتی تھی۔ وہ بڑی آسانی سے انگریزی دور میں کم از کم وائسرائے کی اگزکٹو کونسل کا ممبر بن سکتا تھا لیکن ان مناصب عالیہ پر اس نے کبھی نگاہ غلط انداز ڈالنا بھی گوارا نہ کیا۔ اس کی زندگی کا مقصد منہاج خلافت راشدہ پر خلافت کا قیام تھا۔ وہ پابندی سے نماز پڑھتا تھا، پابندی سے روزے رکھتا تھا اور ذات رسالت مآب سے اس کے عشق اور شیفتگی کی یہ کیفیت تھی کہ ع

جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آوے

اس کی دوستی بھی اللہ کے لیے تھی اور دشمنی بھی اللہ کے لیے۔ اسی لیے وہ دوستوں کو دشمن اور دشمن کو دوست بناتا رہا"۔

محمد علی بہت بڑے انشا پرداز، بہت بڑے شاعر، بہت بڑے خطیب، اور سب سے بڑھ کر بہت بڑے انسان اور ایک سچے مخلص مسلمان تھے۔ وہ انگلستان سے مسٹر محمد علی بی۔ اے آکسن بن کر لوٹے تو انھیں انگریزی ادب و انشا، مصطلحات و محاورات، طرز ادا و طریقۂ بیان پر اتنا عبور اور تبحر حاصل ہو چکا تھا کہ وہ جہلا سے لے کر علما تک اور مزدوروں سے لے کر وزیروں تک ہر ایک کے الفاظ و عبارات کو قلم و زبان دونوں سے یکساں قدرت و مہارت کے ساتھ ادا کر سکتے تھے۔ اس اعتبار سے کوئی ہندوستانی ان کے مقابلے میں نہیں ٹھہرتا بلکہ ٹائمز آف انڈیا کے لندنی وقائع نگار کے مطابق انگریزوں میں بھی شاید بہت ہی کم ان سے بہتر لکھ سکتے تھے۔ پھر یہی مسٹر محمد علی جب مولانا محمد علی بنے تو سراپا تبلیغ بن گئے اور جامع مسجد دہلی میں عالمانہ وعظ کہنے لگے۔ وہ کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس جیسی جماعتوں کے صدر رہے، لیکن انھیں فخر تھا تو خادم کعبہ ہونے پر۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی ہندوستان کی آزادی،

اسلامیان ہند کے حقوق کے تحفظ اور عالم اسلام کی بقا اور سالمیت کی جنگ لڑتے ہوئے بسر کی۔ وہ خود اعتمادی اور جرأت رندانہ کے پیکر تھے۔ ان کی تحریر و تقریر نے ہندی مسلمانوں کو ایک نئی زندگی، نیا ولولہ اور سرفروشی کا جذبہ عطا کیا۔ ان کے اندر بے پناہ قومی و ملی شعور اور استبدادی قوتوں سے پنجہ آزمائی کی جرأت پیدا کی اور تحریک خلافت کے یہ سارے تجربات آگے چل کر تحریک پاکستان میں کام آئے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مولانا محمد علی بالواسطہ تحریک پاکستان کے پیش رو بھی تھے۔ ان کی سیرت و کردار پر غالباً بہترین تبصرہ ایچ۔ جی۔ ویلز H. G. Wells کا ہے کہ "مولانا کا دل نپولین کا دل ہے، مولانا کا قلم برکلے کا قلم ہے اور مولانا کی زبان برک کی زبان ہے"۔

مآخذ: (۱) مہر خورشید علی: سیرت محمد علی، دہلی ۱۹۳۱ء؛ (۲) گل شیر خان: مولانا محمد علی کی یاد میں، دہلی ۱۹۳۱ء؛ (۳) عشرت رحمانی: حیات جوہر، دہلی ۱۹۳۳ء؛ (۴) محمد سرور: مضامین محمد علی، دہلی ۱۹۳۸ء؛ (۵) وہی مصنف: خطوط محمد علی، دہلی ۱۹۴۰ء؛ (۶) وہی مصنف: مسلمان اور غیر مسلم حکومت، لاہور ۱۹۴۷ء؛ (۷) وہی مصنف: مولانا محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے، لاہور ۱۹۶۱ء؛ (۸) عبدالماجد دریا بادی: خطوط مشاہیر، لاہور ۱۹۴۳ء؛ (۹) وہی مصنف: محمد علی — ذاتی ڈائری کے چند ورق، اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء؛ (۱۰) شاہین فاروقی: ہندوستان کی سیاسی الجھنیں (خطبۂ صدارت، کوکناڈا)، حیدرآباد دکن ۱۹۴۷ء؛ (۱۱) رئیس احمد جعفری: خطبات، کراچی ۱۹۵۰ء؛ (۱۲) وہی مصنف: سیرت محمد علی، ۲ جلد، لاہور ۱۹۵۰ء؛ (۱۳) وہی مصنف: علی برادران، لاہور ۱۹۶۳ء؛ (۱۴) وہی مصنف: اوراق گم گشتہ، لاہور ۱۹۶۸ء؛ (۱۵) دوست ندوانی: گنجینۂ جوہر، کراچی [illegible] لاہور ۱۹۶۲ء؛ (۱۷) عبدالرؤف عروج: محمد علی اور ان کی شاعری، کراچی ۱۹۶۳ء؛ (۱۸) عبدالرشید ارشد: بیس بڑے مسلمان، لاہور ۱۹۶۹ء؛ (۱۹) ابو سلمان شاہجہانپوری: مولانا محمد علی کی صحافت، کراچی ۱۹۸۳ء؛ (۲۰) نقوش، لاہور، شخصیات نمبر، حصہ ۲؛ دیکھیے مطبوعہ ذیل تحقیقی مقالات برائے امتحان ایم۔ اے، در کتاب خانہ جامعۂ پنجاب، لاہور: (۲۱) فرخ سلطانہ: مولانا محمد علی جوہر کے کانگرس کے ساتھ تعلقات؛ (۲۲) منیر احمد: مولانا محمد علی کے سیاسی نظریات ("ہمدرد" کی رو سے)؛ (۲۳) زرین شاہ نواز: مولانا محمد علی جوہر کی علمی خدمات؛ (۲۴) صفیہ بیگم: مولانا محمد علی جوہر اور ان کی شاعری؛ نیز دیکھیے (۲۵) محمد علی: *My Life — A Fragment*، لاہور ۱۹۴۲ء؛ (۲۶) G. A. Netson: *The Eminent Musulmans*، مدراس ۱۹۲۷ء؛ (۲۸) *Select Writings and Speeches of Maulana Muhammad Ali*، طبع افضل اقبال، کراچی ۱۹۷۸ء؛ (۲۹) جی۔ الانا: *Our Freedom Fighters*، کراچی ۱۹۶۹ء؛ (۳۰) ایس۔ ایم۔ اکرام: *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*، لاہور ۱۹۷۰ء؛ (۳۱) مشیر الحسن: *Mohammad Ali — Ideology and Politics*، دہلی ۱۹۸۱ء؛ (۳۲) وہی مصنف: *Communal and Pan Islamic Trends in Colonial India*، دہلی ۱۹۸۱ء؛ (۳۳) وہی مصنف: *Mohammad Ali in Indian Politics*، ۳ جلد، کراچی ۱۹۸۵ء۔

(شبیر محمد گریوال)

⊗ **محمد عمر جان چشموی**: چشمہ شریف، نزد کوئٹہ (بلوچستان) کے مشہور نقشبندی بزرگ۔ ان کے والد خواجہ فیض الحق جان چشموی (م ۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۰ء) خواجہ روح اللہ کانگرزئی (م ۱۳۱۴ھ/ ۱۸۹۶ء)، صاحب ترویج الارواح، کے نامور خلیفہ تھے۔ ان کے خلفا نے کوئٹہ، [illegible] کے علاقوں میں رشد و ہدایت

کا فریضہ انجام دیا۔ خواجہ محمد عمر جان کی ولادت صفر ۱۲۸۸ھ/مئی ۱۸۷۱ء میں ہوئی۔ انھوں نے ظاہری علوم اپنے والد اور چچا ملا احمد اخوند سے حاصل کیے۔ طریقۂ مجددیہ میں تربیت اور خلعت خلافت بھی اپنے والد سے حاصل کی۔ خواجہ روح اللہ کانگرزئی سے بھی فیض یاب ہوئے تھے۔ پہلے کئی سال تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور بہت سے علمائے کبار نے ان سے درس لیا۔ والد کی وفات کے بعد سجادہ نشین ہوئے اور ارشاد و تلقین کا فریضہ انجام دینا شروع کیا۔ علما کی تربیت روحانی کی طرف خاص توجہ تھی۔ جلد ہی ان کی شہرت اطراف میں پھیل گئی اور لوگ جوق در جوق حصول فیض کے لیے آنے لگے۔ علم کے دلدادہ اور قدر دان تھے۔ اسی لیے اپنی اولاد کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا اور حصول علم کے لیے انھیں دور دور تک بھیجا؛ چنانچہ انھوں نے حدیث شریف کی سند برصغیر کے بڑے بڑے مدارس سے حاصل کی۔ صاحب کرامات تھے۔ ان سے اور ان کی اولاد سے بھی لوگ فیض یاب ہوئے۔ گرمی کا موسم چشمہ شریف میں گذارتے تھے، لیکن سردیوں میں شکار پور (سندھ) چلے جاتے تھے۔ وصال یکم ذوالحجہ ۱۳۶۰ھ/۲۰ دسمبر ۱۹۴۱ء کو ہوا۔ مزار چشمہ شریف میں ہے۔ مولانا محمد عبداللہ درخانی خلیفہ تھے۔ ان کے خلفا کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

خواجہ محمد عمر جان کے بڑے بیٹے کا نام آغا عبدالحی جان تھا۔ یہ بھی باکمال بزرگ ہوئے ہیں، لیکن ان کے بیٹے خواجہ معین الدین جان (م ۱۳۸۳ھ/۱۹۶۳ء) نے بڑی شہرت پائی۔ خواجہ معین الدین جان ہمیشہ عبادات اور مجاہدات میں مشغول رہتے تھے۔

کتاب سلسلۂ چشموی از محمد عبداللہ درخانی طبع لاہور ۱۹۲۶ء، اس خانوادہ کے حالات پر مشتمل ہے۔

مآخذ: انعام الحق کوثر: تذکرۂ صوفیائے بلوچستان، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۱۹۶ تا ۲۰۰، ۲۸۳ تا ۲۸۹، ۲۹۰ تا ۲۹۲؛ (۲) تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ج ۱۳، ۱۳، لاہور ۱۹۷۱ء [عبدالغنی، رکن ادارہ نے لکھا]۔

(ادارہ)

⊛ **محمد عمر دین پوری:** اپنے دور کے متبحر عالم، مفسر اور مشہور خطیب؛ عطا محمد عطائی کے ہاں ۱۸۸۱ء-۱۸۸۲ء میں بمقام مستونگ ولادت ہوئی۔ تعلق بلوچستان کے قبیلہ رئیسانی کی ذیلی شاخ پندرانی سے تھا۔ وہ مولانا محمد فاضل درخانی کے نامور شاگردوں میں سے تھے۔

لڑکپن بکریاں چراتے گذرا۔ ریوڑ لے کر شام کو لوٹتے تو اپنے قصبے کے مولوی صاحب سے قرآن مجید کا سبق لیتے۔ قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد مزید تحصیل کے لیے مولانا عبدالغفور کے شاگرد بنے۔ تین برسوں میں عربی، فارسی پر عبور حاصل کرنے کے بعد والدین نے آپ کی شادی کر دی۔ طلب علم کا جذبہ ابھی باقی تھا۔ اس لیے قصبہ درخان کا رخ کیا اور مولانا محمد فاضل کی خدمت میں رہ کر علوم متداولہ کی تکمیل کی اور عیسائی مشنریوں کی بلوچستان میں عیسائیت کی تبلیغ کو بے اثر کرنے میں مولانا محمد فاضل درخانی کا ساتھ دیا۔ مولانا عبیداللہ سندھی سے رابطہ قائم کیا اور تحریک ہجرت میں شامل ہو کر افغانستان گئے اور واپسی پر مولانا عبدالمجید سندھی کے لیے تحریک کا پیغام پہنچایا۔

ان کا سب سے بڑا کارنامہ اپنے علاقے میں جہالت، ناخواندگی، توہم پرستی اور دین سے بیگانگی کے خلاف

جد و جہد کرتا ہے۔ انہوں نے ۱۹۱۵ء میں قرآن مجید کا براہوئی ترجمہ شائع کیا۔ تفسیرالقرآن، تاریخ القرآن، احادیث، جامع فقہ، تعلیم الاسلام اور اڑتالیس دوسری تصانیف، مثلاً سودائے خام، حفظ الامکان، شرح اصول فقہ، ھدایت المستورات، آئینۂ قیامت وغیرہ براہوئی بلوچی زبان میں لکھیں۔ انہوں نے تعلیم نسواں پر بہت زور دیا۔ جیکب آباد کے قریب ھمایوں میں انہوں نے جو دارالعلوم قائم کیا اس میں مردوں کے ساتھ خواتین کو تعلیم دینے کا بھی مناسب بندوبست تھا۔ اسی دارالعلوم سے ان کی صاحب زادی محترمہ تاج بانو نے تکمیل تعلیم کی۔ وہ اپنے عہد کی بلند پایہ معلمہ، شاعرہ اور واعظہ گزری ہیں۔ دارالعلوم میں پردے اور پابندیِ شرع کا باقاعدہ اہتمام تھا۔

محمد عمر دین پوری ایک قادر الکلام شاعر بھی تھے؛ ان کی بہت سی کتب منظوم ہیں۔ ان کی زبان رواں دواں، دلکش، سادہ اور عام فہم ہے۔ لہجہ طنز سے بھرپور ہے اور ان کی تحریروں میں حریّت کا پیغام ہے۔

ان کی اولاد میں محمد شریف اور عبداللطیف دو بیٹے تھے۔ ان کے علاوہ ایک صاحب زادی تاج بانو بھی تھی۔ وصال ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء میں ہوا۔ جھالاوان کے ضلع خضدار میں ٹوربٹ کے مقام پر دفن ہیں۔ یہاں بھی ان کی قائم کردہ درسگاہ موجود ہے۔ انہیں حج کا شرف بھی نصیب ہوا۔ وہاں مولانا عبیداللہ سندھی سے بھی دوبارہ ملاقات ہوئی۔

مآخذ: (۱) ثقافت اور ادب وادیِ بولان میں، کوئٹہ ۱۹۶۶ء؛ (۲) تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند، ج ۱۴ (مقالہ براہوئی ثقافت و ادب، از انور رومان)، لاہور ۱۹۷۱ء؛ (۳) انعام الحق کوثر: تذکرۂ صوفیائے بلوچستان، لاہور ۱۹۷۶ء؛ (۴) وہی مصنف: تحریک خلافت کا اثر بلوچستان میں، در ماہ نو، لاہور، مئی ۱۹۷۹ء؛ (۵) وہی مصنف: بلوچستان میں اسلام کی آمد، در اردو ڈائجسٹ، جون ۱۹۷۹ء؛ (۶) وہی مصنف: اشاعت سیرت میں بلوچستان کا حصہ (قلمی)؛ (۷) عبدالرحمٰن براہوئی: قدیم براہوئی شعراء، حصہ اول، کوئٹہ ۱۹۶۸؛ (۸) ہفت روزہ ایلم (براہوئی)، مستونگ، خصوصی نمبر، علامہ محمد عمر دین پوری، ۱۹۷۹ء۔

(انعام الحق کوثر)

(قاضی) محمد عیسیٰ خان: بلوچستان میں ⊛ دور حاضر کے نامور سیاستدان اور قانون دان، جو عموماً قاضی عیسیٰ کے نام سے معروف ہیں، پشین کے ایک معزز خاندان میں ۷ جولائی ۱۹۰۲ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا نام قاضی جلال الدین خان تھا۔ ابتدائی تعلیم پشین میں اور ثانوی تعلیم کوئٹہ میں پائی۔ گریجویشن پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۲۲ء میں کیا۔ ۱۹۲۸ء میں برطانیہ سے بار ایٹ لاء کر کے بلوچستان لوٹے، مگر پریکٹس کرنے کے بجائے سیاست میں قدم رکھا۔ ان کے والد بھی سیاست میں دخیل رہ چکے تھے، مگر ان کی سیاست کا رخ انگریزوں کی خوشنودی کا حصول ہی رہا تھا۔ قاضی عیسیٰ انگریزوں کے حمایتی بننے کے بجائے مخالف نکلے۔ ۱۹۳۹ء میں بمبئی کا سفر اختیار کیا، جہاں ان کی ملاقات بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح سے ہوئی۔ قائد اعظم ان دنوں مالابار ھل پر مقیم تھے۔ انہوں نے بلوچستان میں مسلم لیگ کی تنظیم نو کی ذمہ داری قاضی صاحب کے سپرد کی۔ جون ۱۹۳۹ء میں انہوں نے کوئٹہ میں ایک پریس کانفرنس بلا کر مسلم لیگ کی حقیقی تنظیم کا مقصد بتایا اور کانگریس کا مقابلہ شروع کر دیا، جو بلوچستان میں خاصی طاقتور تھی۔ مسلم لیگ

کے جماعتی مقصد کو آگے بڑھانے کی غرض سے الاسلام کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا ۔ قاضی عیسٰی ھی کی کوششوں سے مسلم لیگ نیشنل گارڈ ، مسلم گرلز فیڈریشن ، مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن اور مسلم چیمبرز آف کامرس کی تنظیمیں وجود میں آئیں ۔ کوئٹہ کا پہلا ڈگری کالج اور کوئٹہ کی منتخب میونسپل کمیٹی کا قیام بھی قاضی عیسٰی ھی کی مساعی کے باعث ھوا ۔

۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان مسلم لیگ کے جس عظیم الشان اجلاس میں منظور ھوئی تھی اس میں قیام امن کی ذمہ داری قاضی عیسٰی ھی کے ذمے تھی ۔ انھیں کی کوششوں سے قائداعظم ۳ جولائی ۱۹۴۳ء کو پہلی مرتبہ بلوچستان گئے ۔ ۱۹۴۴ء میں قائد اعظم نے صوبہ سرحد مسلم لیگ کی تنظیم نو کے لیے ان کو آرگنائزر مقرر کیا ۔ ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں انھیں اس اعلٰی اختیاراتی کمیٹی کا صدر بنایا گیا جو جماعت کی نشر و اشاعت کے کاموں کی ذمہ دار قرار تھی ۔ انھوں نے اس کام کی بحسن و خوبی تکمیل کی ۔ قاضی عیسٰی نے ھندوستان کے طول و عرض کا دورہ کیا ، مسلم لیگ کے حق میں تقریریں کیں اور والیان ریاست کو پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے پر آمادہ کیا ۔ قلات کی ریاست نے جب الحاق سے پس و پیش کیا تو قاضی صاحب ھی نے مکران اور خاران وغیرہ کو علیحدہ الحاق کے لیے سبقت کرنے کی ترغیب دی ۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء میں سبی دربار کے موقع پر قائد اعظم نے قاضی عیسٰی کی خدمات کے اعتراف کے طور پر انھیں بلوچستان مشاورتی (ایڈوائیزری) کونسل کا سربراہ نامزد کر دیا ۔

۱۹۵۱ء میں قاضی عیسٰی کو برازیل میں پاکستان کا سفیر مقرر کر دیا گیا ۔ عہدۂ سفارت سے علیحدہ ھوئے تو برازیل کے صدر نے پاکستان اور برازیل کے درمیان دوستی اور تعاون کو ان کی کامیاب کوششوں کا ثمر قرار دیا ۔ ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کے نفاذ تک وہ سیاست سے کنارہ کش رہے ۔ وہ صدر ایوب کے "پاک افغان" تعلقات کے مشیر بھی رہے ۔ ۱۹۷۶ء میں انھیں افغانستان کے لیے پاکستان کا سفیر نامزد کر دیا گیا تھا، مگر ۱۹ جون ۱۹۷۶ء کی رات کو دل کے جان لیوا دورے سے وہ کوئٹہ میں انتقال کر گئے ۔ تدفین کے لیے میت ۳۶ میل دور پشین لے جائی گئی ۔ تخلیق و قیام پاکستان کے سلسلے میں قاضی صاحب مرحوم کی خدمات ناقابل فراموش ھیں ۔

[مآخذ : (۱) انعام الحق کوثر : تحریک پاکستان میں بلوچستان کا حصہ ، اسلام آباد ، ص ۲۶ تا ۲۸ ، ۳۰ ، ۳۲ ، ۴۰ و بمواضع کثیرہ ؛ (۲) ہلم مستونگ، آزادی نمبر، اگست ۱۹۶۶ء ، ص ۷ ببعد ؛ (۳) قاضی محمد عیسٰی : تحریک آزادی بلوچستان میں، در آھنگ ، کراچی ، ستمبر ۱۹۷۱ء : (۴) عائشہ جلال : *The Sole Spokesman* ، لنڈن ۱۹۸۵ء ، ص ۱۶۰ ؛ (۵) اے - بی - اعوان : *Bloochistan : Historical and Political Processes* ، لنڈن ۱۹۸۵ء ، ص ۱۶۶ ، ۱۸۲ ، ۲۰۶ ، ۲۱۲ ، ۲۲۰ ، ۲۲۲] .

(غوث بخش صابر)

محمد غوثؒ گوالیاری : ھندوستان کے * ایک ولی اللہ ۔ وہ مشہور و معروف [شاعر اور صوفی] شیخ فرید الدّین عطّار [رک بآں] کی اولاد میں سے تھے ۔ ان کا پورا نام ابوالمؤیّد محمّد بن خطیرُ الدّین بن لطیف بن مُعین الدّین قتّال بن خطیر الدّین بن بایزید بن فرید الدّین عطّار تھا ۔ بعض لوگ کہتے ھیں کہ ان کے پردادا مُعین الدّین قتّال ھندوستان میں تشریف لائے اور جونپور میں فوت ھوئے ۔ ان کے ایک بھائی شیخ بہلول، جو شہنشاہ ھمایوں کی ملازمت میں تھے ، جنگ کرتے ھوئے شہید

ھوے اور بیانہ کے قلعے کے پھاٹک کے پاس مدفون ھیں۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق وہ ۹۰٦ھ/۱۵۰۰ء میں پیدا ھوے۔ وہ شیخ ظہور الدّین حاجی حضور کے شاگرد تھے اور شطّاری صوفیہ کے سلسلے میں بیعت تھے۔ وہ اور ان کے آٹھ بھائی شیخ حاجی حمید خلیفہ شاہ قاضنؒ سے بیعت تھے، جو شیخ عبداللہ شطّاری کے مرید اور خلیفہ تھے۔ چنار کے پہاڑوں میں تیرہ برس کی عزلت گزینی کے بعد وہ علاقۂ گجرات میں آئے، جہاں ان کی ملاقات وھاں کے مقبول عام ولی اور عالم شیخ وجیہ الدّین گجراتی سے ھوئی۔ وہ ۹٦٦ھ/۱۵۵۸ء میں آگرے گئے، جہاں شہنشاہ اکبر نے ان کا بڑا اکرام و احترام کیا۔ اس کے بعد وہ گوالیار واپس آ گئے اور یہیں انھوں نے ۹۷۰ھ/۱۵٦۲ء میں انتقال کیا۔ ھمایوں کی بابت بھی مشہور ھے کہ وہ ان کے عقیدتمند مریدین میں سے تھا۔

وہ تصوّف کی کئی کتابوں کے مصنف ھیں۔ ان میں سے جواھر خمسہ بڑی مشہور کتاب ھے اور ۹٦٦ھ/۱۵۵۸ء میں مکمل ھوئی۔ شیخ محمّد غوث نے اسے فارسی میں لکھا اور سید مجد الدّین معروف بہ صبغۃ اللہ گجراتی (م ۱۰۱۵/۱٦۰٦ء) نے اس کا ترجمہ عربی میں کیا (زبید احمد: ص ۸۰، ۳۰۳)۔ پھر اس ترجمے پر احمد شناوی نے حاشیہ لکھا (حدائق الحنفیہ، ص ۴۰۱)۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ سید میر حسن رضوی نے کیا (مطبوعہ دھلی، ۱۳۰۴ھ)؛ ان کی دوسری تصانیف کلید مخازن، بحر الحیوٰۃ اور معراج نامہ ھیں۔ کہتے ھیں کہ معراج نامہ میں، ان کے جو وجدانی مقولے (شطحیات) درج ھیں، ان کی علماے گجرات نے سخت مذمت کی تھی اور انھوں نے محمد غوث گوالیاری کے قتل کا فتوے بھی صادر کردیا تھا، لیکن مذکورہ بالا شیخ وجیہ الدّین کی بروقت مداخلت سے ان کی جان بچ گئی۔

مآخذ: (۱) فہرست کتب خانۂ بانکی پور، ج ۱٦، عدد ۱۳۸۳ - ۱۳۸۴؛ (۲) [عبدالحق:] اخبار الاخیار، ص ۲۳٦؛ (۳) غلام سرور: خزینۃ الاصفیاء، ص ۹٦۹؛ (۴) [رحمان علی:] تذکرۂ علماے ھند، ص ۲۰٦؛ (۵) حاجی خلیفہ [: کشف الظنون]، ۲: ۹۳۳؛ (٦) Ethè: *India Office. Lib. Cat.*، عدد ۱۸۷۵ تا ۱۸۷٦ء؛ (۷) Loth: *Arab Cat.*، عدد ٦۷۱ تا ٦۷۲؛ [(۸) زبید احمد: *India's Contribution to Arabic Literature*، مطبوعہ الہ آباد، ص ۸۰ و ۳۰۳]۔

(عبدالمقتدر)

⊛ **(شاہ) محمد غوث لاھوریؒ**: لاھور کے ایک مشہور شیخ طریقت اور عالم، متعدد عربی و فارسی کتابوں کے مصنف اور بخاری شریف کی نہایت ھی بسیط شرح کے مؤلف۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے ملتا ھے۔ پشاور میں ۱۰۸۴ھ/۱٦۷۳ء میں ولادت ھوئی (محمد امیر شاہ: تذکرہ مشائخ قادریہ حسنیہ، ص ۷۷)۔ سات سال کی عمر میں قرآن مجید پڑھ لیا اور اپنے والد کے زیر سایہ اٹھارہ سال کی عمر میں مروجہ علوم کی تحصیل سے فارغ ھوے (شاہ محمد غوث: رسالہ در کسب سلوک و بیان طریقت و حقیقت، پشاور ۱۲۸۳ھ، ص ۳۵)۔ وہ اپنے والد ھی سے طریقہ قادریہ میں بیعت ھوے (کتاب مذکور، ص ۳۷)۔ اپنے والد کی وفات (یکم ذوالقعدہ ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء) کے بعد مزید علوم ظاھری و باطنی حاصل کرنے کے لیے تقریباً سارے پاکستان و ھند کا سفر کیا اور متعدد اکابر علما و فضلا سے استفادہ کیا۔ ساری زندگی تبلیغ دین میں صرف کی۔ تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ طلبہ کی تربیت بھی کرتے تھے اور صدھا اصحاب کو ظاھری و باطنی علوم سے بہرہ ور کیا۔ شاھان

و امرا کی صحبت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر نے ان کے والد سید حسن پشوری کو خانقاہ کے لیے پشاور میں وسیع قطعۂ زمین نذر کرنا چاہا، لیکن انھوں نے قبول نہ کیا۔ اورنگ زیب نے زمین کا فرمان دوبارہ ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء میں پشاور بھیجا تو ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے اخلاف نے اسے قبول کر لیا۔ یہ فرمان آج بھی کراچی کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔

جب نادر شاہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو اس نے ان کی بزرگی سے متاثر ہو کر خواہش کی کہ ان کی دائمی صحبت میسر آ جائے، لیکن انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ نادر شاہ فتح حاصل کرنے کے بعد مخلصانہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا (مفتی غلام سرور: خزینة الاصفیاء، ۱: ۲۰۰ - ۲۰۱)۔

لاہور میں انھوں نے قرآن و حدیث کا باقاعدہ درس جاری کیا۔ ان کے مدرسے میں پنجاب، سرحد، کابل اور غزنی کے طلبہ تحصیل علم کے لیے آتے تھے (محمد امیر شاہ: تذکرہ مشائخ قادریہ حسنیہ، ص ۲۹)۔ ان کے چار فرزند تھے: میر سید محمد عابد، میر سید شاکر، میر باقر، میر شاہ میر مظفر آبادی؛ یہ چاروں ان کے خلفا بھی تھے۔ ان کے علاوہ حافظ محمد سعید، حافظ محمد صدیق، شیخ محمد غوث، شیخ وجیہ الدین معروف بہ پیر زھدی لاہوری اور خود ان کے پوتے میر غلام کشمیری، مصنف خوارق العادات، بھی ان کے خلفا میں سے تھے۔ شاہ محمد غوث نے ۱۷ ربیع الاول ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء کو انتقال کیا (غلام کشمیری: ترجمة الشاہ محمد غوث، مشمولہ در رسالہ کسب سلوک، قلمی)۔ میر غلام کشمیری نے بھی ان کا سال وفات ۱۱۵۲ھ لکھا ہے۔ ان کی اولاد یکہ توت، پشاور، آزاد کشمیر، مقبوضہ کشمیر اور لاہور میں موجود ہے۔ ان کی خانقاہ محکمۂ اوقاف کی تحویل میں ہے۔ ان کی اولاد کے حالات پر ایک مستقل کتاب تذکرہ مشائخ قادریہ حسنیہ، مؤلفہ محمد امیر شاہ قادری شائع ہو چکی ہے۔

شاہ محمد غوث بڑی بلند پایہ اور دقیق کتابوں کے مصنف تھے۔ اب تک فقط ان کی حسب ذیل کتابوں کا سراغ مل سکا ہے: (۱) شرح غوثیہ (۱۱۳۱ھ/۱۷۱۸ء)، یہ صحیح بخاری کے پہلے تین پاروں کی شرح ہے، جو بڑی تقطیع کے ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے مطابق یہ شرح اپنی نظیر آپ ہے (تذکرہ مشائخ قادریہ حسنیہ، ص ۹۹)۔ یہ شرح اب تک شائع نہیں ہوئی۔ اس کے قلمی نسخے کتاب خانہ فوزی آغا، پشاور (بخط مصنف) اور پشاور یونیورسٹی، عدد ۳۳، میں موجود ہیں۔ مصنف کے ایک اور خود نوشت نسخے کا روٹوگراف پشاور میں مولانا محمد امیر شاہ قادری کے پاس محفوظ ہے؛ (۲) رسالہ در کسب سلوک و بیان معرفت و حقیقت (فارسی نثر)، یہ رسالہ طالبان راہ طریقت کی راہنمائی کے لیے لکھا گیا ہے اور اس موضوع پر اختصار کے باوجود جامع رسالہ ہے۔ فوزی آغا (پشاور) کے ہاں مصنف کا خود نوشت خطی نسخہ موجود ہے۔ اس پر میر غلام کشمیری بن سید محمد عابد بن شاہ محمد غوث نے عربی میں ایک مقدمہ لکھا ہے، جس میں شاہ محمد غوث کے حالات درج ہیں۔ اس کی متعدد نقول مقالہ نگار کی نظر سے گزری ہیں۔ اس کا فارسی متن ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں پشاور سے شائع ہوا تھا۔ اسرار الطریقت کے نام سے ایک معرف اردو ترجمہ لاہور سے کئی مرتبہ چھپ چکا ہے؛ (۳) رسالہ ذکر جہر (عربی و فارسی نثر): اس رسالے

میں آیات و احادیث اور اقوال علما سے ذکر جہر کا جواز پیش کیا گیا ہے۔ اس کا قلمی نسخہ مولانا محمد امیر شاہ قادری کے پاس ہے؛ (۴) شرح خمریہ قصیدہ غوثیہ (فارسی نثر)، قصیدہ غوثیہ کی عام فہم اور صوفیانہ شرح ہے۔ یہ رسالہ پیر عبدالغفار شاہ نے ۱۹۱۰ء میں لاہور سے شائع کر دیا تھا؛ (۵) اسرار التوحید (عربی): اس کے بارے میں خود فرماتے ہیں کہ فصوص الحکم کے مطالعے کے دوران میں کچھ مشکلات پیدا ہوئیں تو باطنی طور پر ان کا حل مصنف نے بتایا (رسالہ کسب سلوک، ص ۶۴)۔ انھوں نے اس موضوع پر عربی و فارسی میں متعدد رسائل لکھے تھے؛ (۶) رسالہ توحید: بخط مصنف، اس کے ایک نسخے کا روٹوگراف مقالہ نگار کو مولانا محمد امیر شاہ کے پاس دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا؛ (۷) رسالہ وحدت الوجود (فارسی نثر): اس رسالے کا روٹوگراف بھی مولانا محمد امیر شاہ قادری کے پاس محفوظ ہے، جو مصنف کے خود نوشت خطی نسخے کا عکس ہے؛ (۸) رسالہ مناجات (عربی نثر): اس رسالے میں الحاح وزاری کے ساتھ دعائیں تحریر کی گئی ہیں۔ ان دعاؤں میں ان کی پوری زندگی کی جھلک نظر آتی ہے (قلمی؛ بخط مصنف، مملوکہ مولانا محمد امیر شاہ قادری، پشاور)؛ (۹) رسالہ اصول حدیث (عربی): اس موضوع پر یہ جامع رسالہ ہے۔ شروع سے ہی دینی مدارس کے نصاب میں شامل ہے۔ اردو ترجمے کے ساتھ پشاور سے شائع ہو چکا ہے۔

مآخذ: (۱) شاہ محمد غوث لاہوری: رسالہ در کسب سلوک و بیان معرفت و حقیقت، فارسی، پشاور ۱۲۸۲ھ؛ (۲) وہی مصنف: شرح غوثیہ، روٹوگراف (بخط مصنف)، مملوکہ مولانا محمد امیر شاہ قادری، بکہ توت، پشاور؛ (۳) وہی مصنف: رسالہ وحدت الوجود، قلمی، بخط مصنف، روٹوگراف، مملوکہ مولانا سید محمد امیر شاہ قادری؛ (۴) وہی مصنف: رسالہ مناجات، قلمی، بخط مصنف، مملوکہ مولانا محمد امیر شاہ قادری؛ (۵) غلام کشمیری: خوارق العادات (حالات سید حسن پشاوری بزبان شاہ محمد غوث لاہوری)، ۱۱۸۹ھ، قلمی، مملوکہ مولانا محمد امیر شاہ قادری؛ (۶) وہی مصنف: ترجمہ شاہ محمد غوث بر خطی نسخہ مصنف: رسالہ کسب سلوک، مملوکہ، فوزی آغا، پشاور؛ (۷) محمد حیات نوشاہی: تذکرہ نوشاہی، ۱۲۳۶ھ، قلمی، در کتاب خانہ دانش گاہ پنجاب؛ (۸) پیر کمال لاہوری: تحائف قدسیہ، ۱۲۰۶ھ، قلمی، مملوکہ سید شرافت نوشاہی، گجرات؛ (۹) امام بخش نوشاہی لاہوری: مرآۃ الغفوریہ، ۱۱۹۰ھ، روٹوگراف، مملوکہ سید شرافت نوشاہی؛ (۱۰) محمد امیر شاہ قادری: تذکرہ علما و مشائخ سرحد، پشاور، ۲ جلد، ۱۹۶۹ء؛ (۱۱) وہی مصنف: تذکرہ مشائخ قادریہ حسنیہ، پشاور، ۱۹۷۲ء؛ (۱۲) شرافت نوشاہی: شریف التواریخ، جلد سوم، حصہ سوم، قلمی، مملوکہ مصنف؛ (۱۳) امام شاہ جہانپوری: تذکرہ شاہ محمد غوث، لاہور؛ (۱۴) غلام دستگیر نامی: سوانح حیات حضرت شاہ محمد غوث لاہوری، لاہور ۱۹۵۹ء۔

(محمد اقبال مجددی)

(مولانا) محمد فاضل درخانی: ڈھاڈر ⊛ کے قریب ضلع کچھی (بلوچستان) میں درخان کے قصبے میں ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۰ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ان دینی مدارس سے حاصل کی جو خان نصیر خان نوری نے خصوصی طور پر تبلیغ اسلام اور نفاذ دین کے لیے بلوچستان بھر میں قائم کرا رکھے تھے۔

بلوچستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد عیسائیت کے مبلّغین اور مشنری سادہ لوح لوگوں کو

مذهب سے گمراہ کرنے لگے۔ مولانا محمد فاضل درخانی نے اپنے علم و فضل سے اس طوفان کا رخ موڑنے کے لیے بتیس برس تک تبلیغ و هدایت کی شمع روشن رکھی۔ وہ بلوچستان کے چپے چپے پر پہنچے۔ ان کی زبان میں بڑی تاثیر تھی۔ جو بھی ایک بار ان کا وعظ سنتا، گرویدہ ہو جاتا۔ پھر جب انگریزوں نے لٹریچر کے ذریعے بلوچی براهوئی زبانوں میں عیسائیت کے پرچار کا راستہ اختیار کیا تو محمد فاضل درخانی نے بھی اسی طرز پر اس مہم کا مقابلہ کیا۔ انھوں نے خود اور اپنے قابل شاگردوں کے ذریعے براهوئی بلوچی میں عیسائیت، انگریزی تہذیب اور انگریزی زبان کے خلاف کتابیں لکھیں۔ اس غرض سے انھوں نے ڈھاڈر کے قصبہ درخان میں مکتبہ درخانی قائم کیا، جس نے علاقائی ادب علی الخصوص مذهبی علوم کی ترویج میں نمایاں کام کیا۔

مولانا محمد فاضل درخانی کی تبلیغی اور اصلاحی کوششوں کے طفیل بلوچستان کے عوام کے فکر و نظر اور سیرت و کردار میں خوشگوار تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ جہاں آئے دن قتل، چوری چکاری کے واقعات ہوتے تھے وہاں صالح معاشرہ قائم ہوا۔ پیر ابوالخیر دهلوی، حافظ محمد ابراهیم پھرچونڈی شریف، خواجہ فیض الحق چشموی، خواجہ محمد جان بابک کندنی قندهار، حاجی محمد صدیق نقشبندی ان کے همعصر علما و مشائخ میں سے هیں، جن سے ان کا علمی رابطہ اور فکری تبادلہ رها۔ ان کا وصال ۱۰ شوال ۱۳۱۴ھ/ ۲۳ مارچ ۱۸۹۷ء بروز منگل ہوا۔ کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ ایک لڑکی تھی۔ جس کی شادی محمد عبداللہ درخانی سے ہوئی اور اسی سے ان کا سلسلۂ نسل جاری ہوا۔

[مآخذ : (۱) بلوچی دنیا، ملتان مارچ ۱۹۶۹ء؛ (۲) محمد عبداللہ درخانی : قبلہ نقشبندی مجددی، ص ۲۰۰؛ (۳) سید کامل القادری : براهوئی ادب، در اورینٹل کالج میگزین، نومبر ۱۹۶۲ء؛ (۴) انور رومان : براهوئی ادب، در تاریخ ادبیات، پنجاب یونیورسٹی، لاهور ۱۴ : ۳۶۶ تا ۴۴۴].

(غوث بخش صابر)

* **(مولانا) محمد قاسم نانوتوی**ؒ : بانی دارالعلوم دیوبند، هندوستان میں انیسویں صدی عیسوی کے مشہور مجاهد، عالم، متکلم، معلم اور مناظر و مصنف۔ وہ شعبان یا رمضان ۱۲۴۸ھ/ ۱۸۳۲ء میں نانوتہ (ضلع سہارنپور، اترپردیش، بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ان کا تاریخی نام خورشید حسین ہے۔ ان کے والد شیخ اسد علی مولٰنا مملوک علی کے همدرس تھے اور انھوں نے شاهنامہ (فردوسی) تک فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ شیخ اسد علی کو کھیتی باڑی اور زمینداری سے شغف تھا، لیکن ساتھ هی ساتھ صاحب مروت و اخلاق، کنبہ پرور، مہمان نواز، نمازی اور پرهیزگار بھی تھے (سوانح قسمی، مرتبہ محمد یعقوب، در مناظر احسن گیلانی : سوانح قاسمی، ۱ : ۲۴، ۲۵، مطبوعۂ دهلی)۔

مولٰنا محمد قاسم بچپن هی سے ذهین، طباع، بلند همت، تیز طبع، حوصلہ مند، جفا کش، جری اور چست و چالاک واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے وطن کے ایک مکتب میں ابتدائی تعلیم کے علاوہ قرآن مجید اور کچھ فارسی کی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں نانوتہ سے مولٰنا مہتاب علی (برادر بزرگ مولٰنا ذوالفقار علی، شارح دیوان الحماسہ) کے مکتب میں دیو بند بھیج دیے گئے، جہاں انھوں نے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد اپنے وطن نانوتہ چلے آئے۔ حسن اتفاق سے مولٰنا مملوک علی، جو دلی عربی کالج میں علوم شرقیہ کے مدرس اور مولٰنا محمد قاسم کے رشتے دار تھے، اس زمانے میں اپنے وطن آئے ہوئے تھے، وہ دهلی جانے

ہوئے مولٰنا قاسم کو بھی ساتھ لیتے گئے (۱۲۶۰ھ/ ۱۸۴۴ء)۔ مولٰنا عبید اللہ سندھی کے بقول مولٰنا قاسم مولٰنا مملوک علی کے رشتے میں بھتیجے تھے (خطبات سندھی، ص ۲۱۳)۔ مولٰنا محمد قاسم نے آٹھ سال تک مولٰنا مملوک علی سے کالج کے فارغ اوقات میں ان کے گھر پر تعلیم پائی اور ایک سال دلی کالج میں علم ریاضی کی تحصیل میں گزارا۔ علم حدیث کے لیے وہ شاہ عبدالغنی مجددیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، جو اپنے زمانے کے باکمال محدث تھے اور جن کا سلسلۂ سند حدیث شاہ محمد اسحاقؒ کے واسطے سے شاہ ولی اللہؒ تک منتہی ہوتا ہے (عبدالحی: نزہۃ الخواطر، ۷: ۳۸۳، حیدرآباد دکن ۱۹۵۹ء)۔ اس زمانے میں مفتی صدرالدین آزردہ دہلی کی علمی، ادبی اور مجلسی زندگی کی روح رواں تھے۔ مولٰنا محمد قاسم نے ان سے بھی کسب فیض کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے حاجی امداد اللہؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور عمر بھر ان کی محبت و عقیدت سے سرشار رہے۔ مولٰنا رشید احمد گنگوہی مولٰنا محمد قاسم کے ایک سال بعد دہلی آئے تھے، دونوں نے مولٰنا مملوک علی اور شاہ عبدالغنی مجددی سے ایک ساتھ تعلیم پائی، دونوں حاجی امداد اللہ سے بیعت ہوئے اور ساری عمر یک جان و دو قالب بنے رہے۔

وہ طالب علمی سے فراغت کے بعد مولٰنا احمد علی سہارنپوری کے مطبع احمدی، دہلی، میں کتابوں کی تصحیح کی خدمت انجام دینے لگے (۱۲۶۹ھ/ ۱۸۵۲ء)۔ اس زمانے میں مولٰنا احمد علی بخاری شریف کی تصحیح اور تحشیہ میں مصروف تھے۔ پانچ چھ سیپارے آخر کے باقی تھے کہ انہوں نے سارا کام مولٰنا محمد قاسم کے سپرد کر دیا۔ مولٰنا نے حاشیہ اس قابلیت سے لکھا کہ دیکھنے والے انہیں خراج تحسین دیے بغیر نہ رہ سکے۔ مسلمانان ہند کے فخر کے لیے یہ امر کافی ہے کہ صحیح بخاری کو پہلی دفعہ انہوں نے نہایت صحت و صفائی کے ساتھ چھاپ کر شائع کیا۔ کتاب کے آخر میں مفتی صدرالدین آزردہ کی ایک تقریظ بھی ہے۔ ۱۸۵۳ء میں ان کی شادی ہوگئی۔ اس زمانے میں جنگ کریمیا جاری تھی، جس میں ترک اور روسی نبرد آزما تھے۔ مسلمانان ہند شب و روز ترکوں کی نصرت و فتح مندی کے لیے دعا گو رہتے تھے۔ مولٰنا محمد قاسمؒ نے اپنی اہلیہ کے تمام زیورات سلطانی چندے میں دے دیے (مناظر احسن گیلانی: سوانح قاسمی، ۱: ۵۱۰، ۵۱۱، مطبوعۂ دہلی)۔ ۱۸۵۶ - ۱۸۵۷ء میں وہ کبھی نانوتہ اور کبھی دیوبند میں مقیم رہے اور اسی زمانے میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی شروع ہو گئی تھی۔

مئی ۱۸۵۷ء میں میرٹھ چھاؤنی سے ہندوستانی فوجوں نے علم حریت بلند کیا تو سارا شمالی ہندوستان یکدم ہنگامے کی لپیٹ میں آ گیا اور ملک کا امن و امان تہ و بالا ہوگیا۔ دہلی میں جنرل بخت خان کی آمد (۲ جولائی ۱۸۵۷ء) پر علما کے مشورے سے جہاد کا اعلان ہوا اور اسی کی تحریک پر علمائے عصر نے جامع مسجد دہلی میں جمع ہوکر انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ مرتب کیا، جس پر مفتی صدرالدین آزردہ، مولوی محمد نذیر حسین اور مشہور مناظر اسلام مولوی رحمت اللہ کیرانوی کے دستخط تھے۔ مؤخر الذکر حاجی امداد اللہ کے نمائندے تھے۔ اس فتوے کا بہت اچھا اثر ہوا اور انقلاب کی اہمیت فتوائے جہاد کے باعث مسلمانوں میں بڑھ گئی۔ مغل بادشاہ بہادر شاہ اور شہزادوں میں بھی حاجی امداد اللہ کا وقار اور احترام تھا اور محل کی بیگمات میں بھی ان کی بزرگی کا چرچا تھا۔ مولٰنا

محمد قاسم نے نواب شیر علی خان، رئیس مراد آباد، معرفت بہادر شاہ کو آزادی وطن کی جنگ پر آمادہ کیا اور عرض کیا کہ بادشاہ انگریزوں کے خلاف اپنی طاقت استعمال کر کے دہلی کو انگریزوں سے پاک کرنے کی کوشش کریں اور ہم تھانہ بھون اور شاملی سے جہاد کرتے ہوئے دہلی کی طرف بڑھیں گے تو دہلی کا آزاد ہو جانا ممکن ہے (مناظر احسن گیلانی: سوانح قاسمی، ۲: ۱۳۶ تا ۱۳۷)۔

اس تحریک آزادی میں تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر) سے انگریزوں کا عمل دخل جاتا رہا تو شہر کے باشندوں نے حاجی امداد اللہؒ کو امام بنا لیا اور مولانا محمد قاسمؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ان کے مشیر قرار پائے۔ حاجی صاحب نے دیوانی و فوجداری مقدمات شرعی فیصلہ کے مطابق چند روز تک قاضی شرع بن کر فیصلے بھی فرمائے (محمد اکرام: آب کوثر، ص ۱۹۵)۔ جہاد کے لیے رضاکار بھرتی کیے گئے۔ مجاہدین کے حوصلے بڑھے تو انہوں نے شاملی کی تحصیل کو، جو قلعے کی طرح مستحکم تھی، حملہ کر کے اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس یلغار میں مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد گنگوہی بھی شامل تھے۔ محصورین میں سے ایک سو تیرہ آدمی مارے گئے اور مجاہدین اس فتح کے بعد تھانہ بھون لوٹ آئے۔ شاملی کی شکست نے انگریزوں کو بے حد مشتعل کر دیا تھا۔ اس اثنا میں ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو انگریزوں کا دہلی پر مکمل قبضہ ہو گیا تھا۔ انگریزوں نے کلکٹر مظفر نگر مسٹر ایڈورڈز کو حکم دیا کہ وہ تھانہ بھون پر یلغار کر کے شہر پر تسلط بحال کر دے۔ اس نے کچھ پیدل سکھ فوج اور کچھ گورکھے سواروں اور دو توپوں کے ساتھ تھانہ بھون پر حملہ کیا۔ مجاہدین نے پہلے تین حملے تو پسپا کر دیے، لیکن چوتھے حملے کو روک نہ سکے اور میدان چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اس جنگ میں حافظ محمد ضامن شہید نے بھی جام شہادت نوش کیا (بیس بڑے مسلمان، ۱۱۹)۔ تھانہ بھون پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا اور اس کو بری طرح تباہ و برباد کر دیا (محمد انوار الحسن شیرکوٹی: انوار قاسمی، ص ۲۸۳ تا ۲۹۳، لاہور ۱۹۶۹ء؛ (۲) اشتیاق حسین قریشی: *Ulema in Politics*، ص ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۱۰، کراچی ۱۹۷۳ء)۔ اس معرکے میں مولانا محمد قاسمؒ کے بھی سر میں گولی لگی تھی، لیکن وہ ہر طرح محفوظ رہے۔

جہاد آزادی کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے دار و گیر کی مہم شروع کر دی۔ بغاوت کے الزام میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا محمد قاسمؒ کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے۔ حاجی امداد اللہ چھپتے چھپاتے انبالہ پہنچے اور وہاں سے لدھیانہ، فیروز پور اور بہاولپور ہوتے ہوئے کراچی پہنچ کر مکہ معظمہ چل دیے اور بقیہ عمر وہیں گزاری۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ گرفتار ہوئے اور جیل میں ڈال دیے گئے، لیکن چھ ماہ بعد رہا کر دیے گئے۔ مولانا محمد قاسمؒ ہر قسم کی گزند سے محفوظ رہے۔ اگلے برس ۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ نے عام معافی کا اعلان کر دیا، لیکن مولانا محمد قاسمؒ عمر بھر سرکار برطانیہ کی نظروں میں مشتبہ اور ناپسندیدہ رہے۔ ۱۵ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ/ ۲۹ نومبر ۱۸۶۰ء کو وہ براستہ پنجاب و سندھ حج کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں جہاز پر ہی قرآن مجید حفظ کرنا شروع کر دیا۔ ہر روز جتنا حفظ کرتے تھے، رات کو نماز تراویح میں اتنا ہی سنا دیتے تھے۔ زیارت حرمین الشریفین کے بعد براہ

بمبئی دسمبر ۱۸۶۱ء میں اپنے وطن واپس آئے۔

حج سے واپسی پر انھوں نے منشی امتیاز علی کے مطبع مجتبائی میرٹھ میں تصحیح کتب کا کام شروع کر دیا۔ منشی امتیاز علی اپنے زمانے کے باکمال خوشنویس تھے۔ انھوں نے خط نسخ اور خط نستعلیق میں کتابت کی اصلاح بہادر شاہ ظفر سے لی تھی۔ میرٹھ میں مولنٰنا کا قیام ۱۸۶۸-۱۸۶۹ء تک رہا۔ فارغ اوقات میں وہ طلبہ کو صحیح مسلم اور مولانائے روم کی مثنوی معنوی کا بھی درس دیا کرتے تھے۔ ان کے قیام میرٹھ کا اہم کارنامہ حمائل شریف کی تصحیح ہے۔ یہ حمائل، جو ۱۲۸۶ھ میں مطبع مجتبائی دہلی سے چھپ کر شائع ہوئی تھی، آج بھی صحت اور صفائی کے لحاظ سے ایک عمدہ نمونہ سمجھی جاتی ہے (انوار قاسمی، ص ۲۱۳ تا ۲۱۹)۔

دہلی کی تباہی کے بعد بعض اکابر دیوبند کو یہ خیال آیا کہ اب ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ و بقا کی واحد صورت ایک عربی مدرسے کا قیام ہے، چنانچہ ان بزرگوں کی سعی سے ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ/ ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء کو دیوبند کی ایک مسجد میں مدرسہ عربیہ دیوبند کا، جو بعد میں دارالعلوم دیوبند کہلایا، قیام عمل میں آیا۔ بعد ازاں یہ مدرسہ جامع مسجد میں منتقل ہو گیا۔ مولنٰنا محمد قاسم، جو اس وقت میرٹھ میں مقیم تھے، ارباب مدرسہ کے مشوروں میں برابر شریک رہے اور کبھی کبھی دیوبند آ کر مدرسے کے امور میں ان کی برابر رہنمائی اور نگرانی بھی کرتے رہے۔ جب جگہ کی تنگی محسوس ہونے لگی تو مولنٰنا محمد قاسم نے تحریک کی کہ اب مدرسے کے لیے مستقل عمارت ہونی چاہیے؛ چنانچہ مدرسے کی عمارت کا سنگ بنیاد ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۶ء میں رکھا گیا۔ اس تقریب میں مولنٰنا قاسم نانوتویؒ کے علاوہ مولنٰنا احمد علی محدث سہارنپوری، مولنٰنا رشید احمد گنگوہی اور مولنٰنا محمد مظہر شامل تھے۔ چونکہ مدرسے کی تعمیر کے محرک و مؤسس مولنٰنا محمد قاسم ہی تھے، اس لیے وہی مہتمم قرار پائے اور وہ آخری دم تک مدرسے کی تعمیر و ترقی میں مصروف رہے۔ یہ درسگاہ پانچ برس میں بن کر تیار ہوئی۔

مدرسے کے کاموں کی نگرانی کے علاوہ مولنٰنا محمد قاسمؒ نے نکاح بیوگان اور لڑکیوں کے لیے وراثت میں حصہ دلانے کی تبلیغ بھی جاری رکھی، جس کا قبل ازیں سید احمد شہید نے کامیاب آغاز کیا تھا۔ انھوں نے اپنی بیوہ ہمشیرہ کا نکاح ثانی کرنے مسلمانوں کے سامنے عملی مثال پیش کر دی۔ غمی و شادی کی فضول رسموں کی اصلاح کی اور اہل بدعت کے خلاف قلمی و لسانی جہاد جاری رکھا۔ اسی زمانے میں انھوں نے سرسید کو ان کی حدیث و عقائد میں آزاد روی پر فہمائشی اور اصلاحی خطوط لکھے اور ان کے بعض شبہات و اعتراضات کا جواب دیا، جس کا ذکر تصفیۃ العقائد میں موجود ہے۔ اس کے باوجود مولنٰنا اور سرسید احمد کے تعلقات نہایت خوشگوار اور مخلصانہ رہے۔ دونوں ایک دوسرے کے مداح اور مرتبہ شناس تھے۔ مولنٰنا نے دوسرا حج ۱۸۷۰ء اور تیسرا حج ۱۸۷۶ء میں کیا۔ ان دونوں سفروں میں وہ اپنے پیرو مرشد حاجی امداد اللہؒ اور استاذ الحدیث شاہ عبدالغنی مجددیؒ کی زیارت سے شاد کام ہوئے۔

مولنٰنا محمد قاسمؒ کے زمانے میں بعض لوگ اسلام پر اعتراض و طعن کے لیے میدان میں اتر آئے تھے۔ ان میں عیسائی پادری اور آریہ سماجی پیش پیش تھے۔ ان کے مقابلے میں اسلام کی مدافعت

کے لیے مولٰنا محمد قاسمؒ بھی میدان میں نکل آئے۔ ۱۸۷۲ء میں ان کا مباحثہ پادری عمادالدین اور پادری تارا چند سے دہلی میں ہوا اور وہ کامیاب رہے۔ ۱۸۷۶ء میں چاند پور، ضلع شاھجہان پور (اتر پردیش، بھارت) کے ایک کبیر پنتھی تعلقہ دار نے تحقیق مذھب کے لیے ھندو پنڈتوں، عیسائی پادریوں اور مسلمان عالموں کو جمع کیا کہ وہ اپنے اپنے مذھب کی حقانیت ثابت کریں۔ اس نے اس میلے کا نام "میلۂ خدا شناسی" رکھا۔ اس جلسے میں پنڈت دیانند سرسوتی اور مولٰنا محمد قاسمؒ بھی مدعو تھے۔ مولٰنا محمد قاسمؒ نے ابطال تثلیث و شرک اور اثبات توحید میں ایسی مدلل تقریریں کیں کہ دوست و دشمن سب مان گئے اور عیسائی پادریوں نے اعتراف شکست کر لیا۔ اگلے سال پھر جلسہ ہوا۔ اس دفعہ پنڈت دیانند سرسوتی نے اسلام پر اعتراضات کیے، جن کا شافی جواب مولٰنا محمد قاسمؒ نے دیا۔ اس کے بعد پنڈت دیانند نے اسلام کے خلاف ھرزہ سرائی کی مہم شروع کر دی۔ ۱۸۷۸ء میں اس نے رڑکی (ضلع سہارنپور) پہنچ کر اسلام پر کچھ اعتراضات مشتہر کیے۔ اھل رڑکی نے مولٰنا محمد قاسمؒ کو دعوت دی کہ وہ رڑکی آ کر پنڈت دیانند کی یاوہ گوئی کا جواب دیں، لیکن وہ خود الٹے سیدھے بہانے کر کے رڑکی سے بھاگ نکلا اور میرٹھ پہنچ گیا۔ مولٰنا بھی گفتگو کے لیے میرٹھ گئے، لیکن دیانند کو ان کے سامنے آنے کی جرأت نہ ھوئی اور اس نے راہ فرار اختیار کرنے میں عافیت سمجھی (مناظر حسین گیلانی: سوانح قاسمی، ۲: ۵۰۰ تا ۵۱۳، مطبوعۂ دھلی؛ P. Hardy: *The Muslims of British India*، ص ۱۷۱، کراچی ۱۹۷۲ء).

تیسرے حج سے واپس ھوتے ھوے مولٰنا محمد قاسمؒ کو بخار، کھانسی اور سانس کی تکلیف شروع ھو گئی تھی، مگر اس حالت میں بھی وہ دارالعلوم دیوبند کے فروغ و ترقی اور عیسائیوں اور آریاؤں سے مناظروں میں برابر حصہ لیتے رھے اور طلبہ کو بھی پڑھاتے رھے۔ یونانی طبیبوں نے ھر قسم کا علاج کیا، ڈاکٹروں نے ھر طرح سے تدبیر کی، لیکن مرض رفع نہ ھوا۔ آخر انھوں نے ۴ جمادی الاولی ۱۲۹۷ھ/۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء کو بعد نماز ظہر وفات پائی اور دارالعلوم دیوبند میں دفن ھوے۔ اس طرح ان کی زندگی، جو طویل سیاسی، علمی اور تبلیغی جد و جہد سے عبارت تھی، اختتام کو پہنچی۔ "ھائے خزانۂ خوبی" تاریخ وفات ھے۔ ان کے متعلق سرسید نے لکھا ھے: "مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم نے اپنی کمال نیکی، دینداری اور ورع و انکسار سے ثابت کر دیا تھا کہ اس ولی کی تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی محمد اسحٰق صاحب کی مانند اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ھے، بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ . . . ان کا پایہ اس زمانے میں شاید معلومات علمی میں شاہ عبدالعزیزؒ سے کم ھو، الا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا . . . مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل تھے، در حقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت شخص تھے (علی گڑھ گزٹ، ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء).

مولٰنا محمد قاسمؒ سے سیکڑوں طلبہ نے استفادہ کیا تھا۔ ان میں ممتاز ترین مولٰنا فخرالحسن گنگوھی (مصنف التعلیق المحمود علی سنن ابی داؤد)، مولٰنا احمد حسن امروھوی اور (شیخ الھند) مولٰنا محمود حسن [رک بآں] ھیں، جن کے تلامذہ در تلامذہ نے علوم اسلامیہ کی بیش بہا خدمات انجام دی ھیں (فقیر محمد جہلمی: حدائق الحنفیہ، ص ۴۹۳، مطبوعۂ لکھنؤ).

تصانیف: (۱) حاشیہ صحیح البخاری، جس کا

سطور بالا میں ذکر آ چکا ہے ، مولٰنا احمد علی محدث سہارنپوری اور مولٰنا محمد قاسم کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ ہے ۔ یہ اختصار کے باوجود بہت سی شروح پر فوقیت رکھتا ہے اور گزشتہ سوا سو برس میں متعدد مرتبہ چھپ چکا ہے ؛ (۲) تقریر دلپذیر : اسلام کے اصول کلیہ پر جامع و مانع تقریر ؛ (۳) تحذیر الناس عن انکار اثر ابن عباس : حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ایک روایت کی عقلی و نقلی تشریح اور زمینوں کے سات ہونے اور حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کا بیان ؛ (۴) آب حیات : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حیات برزخی کا بیان ؛ (۵) انتصار الاسلام : آریہ سماجیوں کے مقابلے میں اسلامی اصول کا فلسفہ ؛ (۶) تصفیة العقائد : سرسید احمد خان سے خط و کتابت اور ان کے شبہات کا جواب (اس کے انگریزی ترجمے کے لیے دیکھیے عزیز احمد و G. E. Von Grunebaum در *Muslim Self. Statement in India and Pakistan 1857-1968*، Weisbaden، ۱۹۷۰ء، ص ۹۰ تا ۹۷)؛ (۷) حجة الاسلام : عیسائیوں کے مقابلے میں اسلامی اصولوں کی وضاحت ؛ (۸) قبلہ نما : پنڈت دیانند نے مسلمانوں پر اعتراض کیا تھا کہ وہ کعبے کی طرف منہ کر کے کیوں نماز پڑھتے ہیں ، اس کا شافی جواب ؛ (۹) تحفۂ لحمیہ : آریوں کے شبہات کا جواب ؛ (۱۰) مباحثۂ شاہجہان پور : آریوں سے مناظرے کی روداد ؛ (۱۱) جمال قاسمی : مکتوبات ؛ (۱۲) توثیق الکلام : مسئلہ فاتحۂ خلف الامام پر بحث ؛ (۱۳) اجوبۂ اربعین : تحذیر الناس پر علمائے رامپور کے اعتراضات کا جواب ؛ (۱۴) ہدایة الشیعہ : شیعہ عقائد پر مفصل بحث (عبدالرشید ارشد : بیس بڑے مسلمان ، ص ۱۴۳ ، لاہور ، ۱۹۷۰ء)۔

مولٰنا محمد قاسمؒ کی سب سے بڑی علمی اور زندہ جاوید یادگار دارالعلوم دیوبند کا قیام ہے ۔ [مولٰنا محمد قاسم نانوتویؒ مدرسہ دارالعلوم دیوبند [رک بہ دیوبندی] کے اصل بانی نہ تھے ، لیکن مدرسے کو ایک شاندار دارالعلوم بنانے کا خیال آپ کا تھا ۔ جن قابل عزت بزرگوں نے اس مدرسے کو شروع کیا ، شاید ان کا منتہائے مقصود ایک مکتب سے زیادہ نہ تھا جو جامع مسجد کی سہ دری میں بھی جاری رہ سکتا تھا ، لیکن مولٰنا نے شروع ہی سے اپنا تخیل بلند تر رکھا اور مدرسے کی علمی و فکری بنیادیں اس قدر وسیع اور بلند رکھیں کہ اس پر دارالعلوم کی شاندار عمارت تعمیر ہو سکی] ۔ اس کے علاوہ انھوں نے مراد آباد (مدرسہ قاسم العلوم)، امروہہ (مدرسہ عربیہ اسلامیہ، جامع مسجد) ، گلاؤٹھی (بلند شہر) اور نگینہ (ضلع بجنور) میں بھی مدارس قائم کیے ، جو اب تک دینی خدمات انجام دے رہے ہیں (ضیاءالحسن فاروقی : *The Deoband School*، ص ۳۲، کلکتہ ۱۹۶۳ء) ۔ ان مدارس کے فضلا نے ، جو اقصائے چین سے سواحل افریقہ اور ترکستان سے لیکر سری لنکا تک پھیلے ہوے ہیں ، مسلمانوں کے قومی تشخص کے برقرار رکھنے اور علوم اسلامیہ کے تحفظ و اشاعت کی ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں ۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ارباب دیوبند اور فضلائے دیوبند انگریزوں کے جاہ و جلال سے کبھی مرعوب نہ ہو سکے اور نہ انھوں نے برطانوی استعمار سے سمجھوتے کی کوشش کی، بلکہ تحریک دارالعلوم درحقیقت برطانوی استعمار کے خلاف ہمیشہ سرگرم عمل رہی [رک بہ محمود حسن ؛ دیوبندی] ۔ وہ خاموشی سے اپنے کام میں لگے رہے ۔ انھوں نے صدق و دیانت ، تقوٰی و دینداری ، امت محمدیہ سے ہمدردی و خیر خواہی اور راہ حق میں سرفروشی و جانبازی کی جو روشن مثالیں پیش کی ہیں وہ ممالک اسلامیہ کے علما اور فضلا کے لیے

قابل رشک ہیں۔ گزشتہ سوا سو برس میں انھوں نے علوم اسلامیہ، خصوصاً علوم نبوت کے تحفظ، ان کی تعلیم و تدریس، اور ان کی نشر و اشاعت کے لیے جو سرگرم کوششیں کی ہیں، بہت سے عرب ممالک بھی ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

مآخذ: (۱) ضیاء الحسن فاروقی: *The Deoband School*، کلکتہ ۱۹۶۳ء؛ (۲) اشتیاق حسین قریشی: *Ulema in Politics*، ص ۲۰۳، کراچی ۱۹۷۲ء؛ (۳) P. Hardy: *The Muslims of British India*، ص ۱۷۱، کراچی ۱۹۷۲ء؛ (۴) عزیز احمد و G. E. Von Grunebaum: *Muslim Self-Statement in the India and Pakistan 1857-1968*، ص ۶۰ تا ۷۹، Wiesbaden ۱۹۷۰ء؛ (۵) عبدالحی: نزہۃ الخواطر، ۷: ۳۸۲ تا ۳۸۴، حیدرآباد دکن ۱۹۵۹ء؛ (۶) فقیر محمد جہلمی: حدائق الحنفیہ، ص ۴۹۶ تا ۴۹۷، مطبوعہ لکھنؤ؛ (۷) محمد یعقوب: سوانح قاسمی، مطبوعہ بہاولپور؛ (۸) مناظر احسن گیلانی: سوانح قاسمی، ۳ جلدیں، مطبوعۂ دہلی؛ (۹) محمد انوار الحسن: انوار قاسمی، لاہور ۱۹۶۹ء؛ (۱۰) عبدالرشید ارشد: مقالہ مولانا محمد قاسم نانوتوی، در بیس بڑے مسلمان، ص ۱۱۳ تا ۱۴۳، مطبوعۂ لاہور ۱۹۷۰ء؛ (۱۱) حافظ عبدالرحمٰن جھنجھانوی: سفینۂ رحمانی، ص ۸۳ تا ۹۰، ۹۹ تا ۱۲۰؛ (۱۲) رحمان علی: تذکرہ علماے ہند، ص ۴۶۵ تا ۴۶۸، مطبوعۂ کراچی ۱۹۶۱ء؛ (۱۳) شیخ محمد اکرام: رود کوثر، لاہور ۱۹۷۹ء، ص ۱۹۸ تا ۲۰۱، ۶۷۲ تا ۶۸۲ [تلخیص، رکن ادارہ نے لکھا]۔

(ادارہ)

⊗ **محمد قلی قطب شاہ**: (ولادت ۹۷۳ھ/۱۵۶۵ء)، قطب شاہی خاندان کا پانچواں فرمانروا، اپنے باپ ابراہیم قلی کی وفات کے بعد ۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء میں تخت نشین ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں اکبر کی شہنشاہیت کا ڈنکا بج رہا تھا۔ جب ملک کو بیرونی اور اندرونی لڑائیوں سے کسی قدر نجات ملی تو محمد قلی کو رفاہ عام کے کاموں کی طرف توجہ کرنے کا موقع ملا؛ چنانچہ اس نے مالگزاری میں کچھ اصلاحات کیں اور اجناس پر وہ محصول معاف کر دیا جو گزشتہ سلاطین کے زمانے سے چلا آ رہا تھا۔

اسے تعمیرات کا بڑا شوق تھا۔ اس نے مدرسے، عاشور خانے، مسجدیں اور شفاخانے تعمیر کرائے۔ مسافروں، اور راہ گیروں کی آسائش کے لیے کنویں کھدوائے اور لنگر خانے جاری کیے، لیکن اس کا سب سے بڑا کارنامہ شہر حیدر آباد کی بنا ڈالنا ہے۔ یہ شہر اس نے سابق دارالحکومت گولکنڈہ سے چار کوس کے فاصلے پر تعمیر کرایا اور اس کا نام اپنی محبوبہ بھاگ متی کے نام پر بھاگ نگر رکھا۔ بعد میں یہ نام بدل کر حیدر آباد کر دیا گیا۔ اسی نے شہر کے وسط میں "چار مینار" کی بنیاد رکھی، جو شہر حیدرآباد کی ایک شاندار اور خوبصورت عمارت ہے۔ اس کے علاوہ اس نے متعدد عالیشان محل تعمیر کرائے۔

اس کے عہد حکومت میں علم و فن کا بھی خاصا چرچا تھا، خصوصاً شاعری کی بہت قدر تھی۔ اس کے درباری شاعروں میں وجہی اور غواصی خاص طور پر بہت مشہور ہیں۔ بادشاہ خود بہت اچھا شاعر تھا اور اس کی کلیات، جو بہت ضخیم ہے، تقریباً ۱۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے جانشین اور بھتیجے عبداللہ قطب شاہ نے اس تصنیف پر ایک منظوم دیباچہ لکھا ہے، جس میں وہ لکھتا ہے کہ بادشاہ نے پچاس ہزار شعر کہے تھے۔ محمد قلی نے علاوہ اردو کے فارسی اور تلنگی میں بھی طبع آزمائی کی۔ اس کا ایک اور دیوان حال ہی میں نواب سالار جنگ کے کتابخانے سے دستیاب ہوا، جو اب شائع ہو چکا ہے۔

محمد قلی نے اپنی شاعری کو صرف غزل اور قصیدے تک ہی محدود نہیں رکھا، بلکہ انسانی معاشرت اور مظاہر قدرت پر بھی نظر ڈالی ہے۔ مثلاً متعدد مثنویاں پھلوں اور میووں، شکاری پرندوں، وغیرہ کے بیان میں ہیں۔ بہت سی غزلیں قصیدے اور مثنویاں شاعر نے اپنے محلات، اس وقت کے رسم و رواج اور تیوہاروں، اپنی سالگرہ، شب برات، میلاد نبوی[۳]، خم غدیر، برسات، ہولی، بسنت، پان اور اپنے ہاتھی پر لکھی ہیں۔ ایک مکالمہ صراحی اور پیالے کا اور دوسرا کالی اور گوری کا ہے۔

محمد قلی کا کلام اردو میں سب سے قدیم ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے قبل کی بھی نظمیں ملتی ہیں، مثلاً میراں جی شمس العشاق (م ۹۰۲ھ/۱۴۹۶ء) کی دو ایک نظمیں، جو مذہبی اور صوفیانہ رنگ کی ہیں، یا نظامی (عہد علاء الدین بہمنی) کی "عشقیہ مثنوی"، مگر یہ بہت معمولی ہیں اور ان کو محمد قلی کے کلام سے کوئی نسبت نہیں۔ اردو زبان میں کسی شاعر کی یہ پہلی کلیات ہے جس کی ترتیب جدید طرز پر کی گئی ہے۔ محمد قلی کے کلام سے صاف ظاہر ہے کہ فارسی شاعری کی تمام خصوصیات دکنی اردو میں آ گئی تھیں۔ بحریں تمام فارسی ہیں۔ تشبیہات و استعارات، تلمیحات نیز خیالات تقریباً وہی ہیں جو فارسی شعرا کے کلام میں پائے جاتے ہیں، البتہ عشق و محبت کے معاملے میں ہندی رنگ بھی آ گیا ہے، یعنی عشق کا اظہار عورت کی طرف سے ہوتا ہے اور وہ مرد کو بے وفائی کے طعنے دیتی ہے۔

بعض مستثنیات سے قطع نظر، جن کا درجہ ہماری شاعری میں بہت بلند ہے، محمد قلی کا کلام اردو کے اکثر شعرا کے کلام سے کسی طرح کم نہیں اور زبان کی قدامت اور بعض خاص ترکیبوں کے سوا کوئی فرق معلوم نہ ہوگا۔ اس کے اشعار میں سادگی، آمد اور خلوص پایا جاتا ہے۔ عشق و مستی اور تصوف میں بھی اس کا کلام کسی سے کم نہیں۔ بعض اوقات یہ معلوم ہوتا ہے کہ حافظ کے فیض نے شاعر کی طبیعت کو گرما دیا ہے۔ اس نے حافظ کی بعض غزلیات کا ترجمہ بھی کیا ہے۔

محمد قلی نے قصیدے بھی لکھے ہیں، جو نعت منقبت، محلات و باغات شاہی، نو روز، بسنت وغیرہ کے موضوعات پر ہیں۔ ان میں وہی شکوہ اور قوت پائی جاتی ہے جو ہمارے ادب میں قصیدے کی خصوصیات ہیں۔ جس طرح وہ پہلا شخص تھا جس نے اردو کے علاوہ بھی مختلف مضامین وغیرہ عشقیہ مثنویاں اور قصیدے لکھے ہیں، اسی طرح وہ پہلا شاعر تھا جس نے واقعۂ کربلا پر اردو میں نوحے اور مرثیے لکھے۔

محمد قلی نے اپنے کلام میں ہندی الفاظ کے ساتھ عربی و فارسی الفاظ کے میل سے نئی ترکیبات وضع کی ہیں، جیسے، پھل اشتاق وغیرہ۔ اسی طرح ہندی الفاظ کے ساتھ اضافت اور واو عطف کا استعمال کیا ہے، جیسے باغ و پھل۔ عربی الفاظ کو اسی طرح لکھا ہے جس طرح اس زمانے میں لوگ عام طور پر بولتے تھے، مثلاً قفل کو کلف، منع کو منا، شمع کو شما، فہم کو فام، وغیرہ۔ حروف کو متحرک یا ساکن پڑھنے کی پابندی بھی نہیں کی۔ یہ بدعتیں ولی کے زمانے تک دکن کے دوسرے شاعروں میں بھی پائی جاتی ہیں۔

قطب شاہی بادشاہ شیعی مذہب کے پیرو تھے۔ محمد قلی کو اس مذہب سے غیر معمولی شغف تھا۔ ماتم و عزا داری کی رسوم ملک بھر میں بڑے اہتمام سے ادا کی جاتی تھیں۔

[illegible] ء میں کچھ دن بیمار رہ کر اس

نے ۴۹ سال کی عمر میں وفات پائی ۔

ماخذ : (۱) تاریخ فرشتہ ، مطبوعہ نولکشور پریس ۱۸۸۳ء ؛ (۲) حدیقۃ العالم ، مقالہ دوم ، سیدی پریس حیدر آباد دکن ۱۳۰۹ھ ؛ (۳) تاریخ دکن ، حصہ دوم (سلسلہ آصفیہ) ، مفید عام پریس ، آگرہ ۱۸۹۷ء ؛ (۴) کلیات محمد قلی قطب شاہ ، در رسالہ اردو انجمن ترقی اردو ، جلد دوم ، جنوری ۱۹۲۲ء ؛ (۵) عبدالمجید صدیقی : تاریخ گولکنڈہ ، حیدر آباد دکن ، ۱۹۳۹ء ؛ (۶) کلیات و حالات محمد قلی قطب شاہ ، مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین زور ، ۱۹۴۰ء ۔

(مولوی عبدالحق)

* **محمد کاظم بن محمد امین :** اورنگ زیب کا ایک منشی یا کاتب (سیکرٹری) تھا ۔ اس کے سپرد یہ کام ہوا کہ وہ سرکاری دستاویزات کی مدد سے شہنشاہ کے عہد حکومت کی ایک مکمل تاریخ مرتب کرے اور اسے حکم دیا گیا کہ وہ اس کا مسودہ بغرض تصحیح بادشاہ کو پیش کرے ۔ وہ شہنشاہ کے سفر اجمیر میں اس کے ہمراہ گیا ، جہاں وہ بیمار ہو گیا اور اسے دہلی واپس بھیج دیا گیا ۔ اپنی واپسی کے تھوڑے عرصے بعد ہی وہ ۱۰۹۲ھ/۱۶۸۱ء میں وفات پا گیا ۔

اس نے ایک تاریخ لکھی ہے جو عالمگیر نامہ کے نام سے مشہور ہے ۔ یہ ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۷ء سے شروع ہوتی ہے جب عالمگیر اورنگ آباد روانہ ہوا اور اس میں ۱۰۷۸ھ/۱۶۶۷ء تک کے واقعات درج ہیں ۔ یہ Bibliotheca Indica کلکتہ ۱۸۶۵ - ۱۸۶۸ء میں طبع ہوئی تھی ۔

ماخذ : (۱) خافی خان : منتخب اللباب ، ۲ : ۲۱۰ ؛ (۲) Elliot-Dowson : History of India ، ۷ : ۱۷۴ تا ۱۸۰ ؛ (۳) N. Less : Journal of the Royal Asiatic Society ، ۳ : ۴۶۴ ؛ (۴) Rieu : Cat. of the Persian Mss. Br. Mus. ، ۱ : ۲۶۷ الف ۔

(محمد ہدایت حسین)

⊗ **محمد کرد علی :** عصر حاضر میں شام کے مشہور فاضل ، مؤرخ اور ادیب تھے ۔ ان کے آبا و اجداد سلیمانیہ (موصل) کے عرب کرد تھے ۔ محمد کرد علی کے دادا نے عراق سے آ کر دمشق میں اقامت اختیار کر لی تھی ۔ ان کے والد نے جسرین نامی گاؤں میں تھوڑی سی اراضی خرید لی اور قفقاز کی رہنے والی چرکسی نسل کی ایک خاتون سے شادی کر لی تھی ۔

کرد علی ۱۲۸۳ھ/۱۸۷۶ء میں دمشق میں پیدا ہوئے ۔ معمولی نوشت و خواند اور حساب کی تعلیم ایک مکتب میں پائی ۔ ثانوی تعلیم مکتب الرشدی العسکری میں ہوئی ۔ اس وقت شام کے سرکاری مدارس میں ذریعۂ تعلیم ترکی زبان تھی اور فرانسیسی زبان بھی لازمی طور پر پڑھائی جاتی تھی ۔ اس کے علاوہ انہوں نے دمشق کے مشہور علما سید مبارک ، شیخ سلیم البخاری اور شیخ طاہر الجزائری سے کتب ادب ، فقہ اور تفسیر کا درس لیا ۔ کرد علی سب سے زیادہ شیخ طاہر الجزائری سے متاثر ہوئے اور عمر بھر شیخ موصوف کے علم و فضل کے مداح و ثنا خواں رہے (محمد کرد علی : خطط الشام ، ۶ : ۴۱۱ تا ۴۱۳ ، دمشق ۱۹۲۸ء) (۲) براکلمان : تکملہ ، ۳ : ۴۳۰ تا ۴۳۲ ، لائڈن ۱۹۴۲ء) ۔

کرد علی زمانۂ تعلیم ہی میں اخبارات کے لیے مضامین لکھا کرتے تھے ۔ ۱۳۱۵ھ میں جب ان کی عمر صرف بائیس برس کی تھی ، انہوں نے ایک ہفتہ وار اخبار الشام کی ادارت قبول کی ۔ کرد علی نے تین سال تک اس اخبار میں کام کیا ۔ ان دنوں مصر کا مشہور مجلہ المقتطف شائع ہونا شروع ہوا تھا ۔ کرد علی پانچ سال تک مدیر المقتطف کی قلمی معاونت کرتے رہے ۔ ان کے زیادہ تر مضامین تاریخ ، ادب ، اور اجتماع پر ہوتے تھے ۔ یہ

مضامین مصر کے علمی حلقوں میں مقبول ہو کر ان کی شہرت کا ذریعہ بنے۔

محمد کرد علی نے فرانسیسی ادب کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ وہ فرانس کے علما، ادبا اور فلاسفہ سے ملنا چاہتے تھے، جو اس وقت کی ادبی اور ثقافتی دنیا پر چھائے ہوئے تھے؛ چنانچہ ۱۹۰۹ء میں وہ شام سے سیر و سیاحت کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ راستے میں قاہرہ پڑتا تھا، جہاں وہ چھ دنوں کے لیے اپنے قدیمی دوست سید محمد رشید رضا [رک بان]، مدیر المنار سے ملنے کے لیے ٹھہر گئے۔ سید رشید رضا کی وساطت سے کرد علی کی رسائی مفتی محمد عبدہ تک ہوئی، جو ان دنوں جامع ازہر کے رواق عباسی میں قرآن مجید کی تفسیر کا درس دیا کرتے تھے۔ کرد علی نے ان کی عام اور نجی صحبتوں سے بہت استفادہ کیا اور وہ ان کے تعلیمی اور اصلاحی خیالات کے عمر بھر موید رہے۔ چند ماہ بعد وہ دمشق واپس آ گئے۔ حاسدوں کی ریشہ دوانیوں سے انہیں بہت جلد مصر جانا پڑا، جہاں وہ المؤید کے سٹاف میں شامل ہو گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنا مشہور علمی رسالہ المقتبس بھی جاری کیا، جس میں فرانسیسی ادیبوں کے افکار کے تراجم اور کتب تو شائع کی جاتی تھیں (محمد کرد علی: کتاب مذکور)؛ (۲) سامی الکیالی: الادب العربی فی السوریہ، ص ۱۰۷ تا ۱۱۱، قاہرہ ۱۹۵۹ء)۔

۱۹۰۸ء میں عثمانی انقلاب کے بعد نیا قانون اساسی شائع ہوا تو کرد علی واپس وطن چلے آئے۔ یہاں آ کر انھوں نے المقتبس کے نام سے روزانہ اخبار جاری کیا، لیکن ترکی حکومت اس اخبار کی اشاعت کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکی؛ چنانچہ اخبار بند کر دیا گیا اور کرد علی نے ملک چھوڑنے میں عافیت سمجھی۔ ۱۹۰۹ء میں وہ لبنان سے ہوتے ہوئے فرانس پہنچ گئے اور وہاں کی تاریخی عمارتوں، درس گاہوں، اور علمی اداروں کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ وطن واپس آ کر انہیں شام کی سیاسی، علمی، اور تمدنی تاریخ لکھنے کا خیال آیا۔ تاریخ کی تالیف کے لیے ضروری تھا کہ یورپ کا سفر کیا جائے اور وہاں کے کتابخانوں میں تاریخ اسلام پر جو مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں ہیں، ان سے استفادہ کیا جائے۔ روما میں امیر کائتانی کا کتابخانہ عربی نوادر کے لحاظ سے بے نظیر ہے، جہاں وہ دو ماہ تک خطط الشام کے لیے مواد جمع کرتے رہے۔ اٹلی سے وہ سوئٹزر لینڈ، فرانس اور جرمنی ہوتے ہوئے استانبول کے راستے دمشق پہنچ گئے۔ جنگ عظیم اول کے زمانے میں انھوں نے جمال پاشا والی دمشق کے اصرار پر المقتبس دوبارہ جاری کر دیا۔ بعد ازاں سرکاری اخبار الشرق کی ادارات بھی قبول کر لی (محمد کرد علی: خطط الشام، ص ۳۱۸ - ۳۱۹، دمشق ۱۹۲۸ء)۔ اس اثنا میں وہ کبھی دمشق اور کبھی قسطنطنیہ آتے جاتے رہے۔

وزارت: ۱۹۱۸ء میں اتحادیوں نے دمشق فتح کر لیا اور امیر فیصل نے کچھ عرصے کے لیے شام پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ امیر فیصل کے زمانے میں قومی وزارت قائم ہوئی تو وزارت معارف کا منصب ان کے سپرد کیا گیا۔ ان کی وزارت کا اہم کارنامہ مجمع العلمی العربی کی تاسیس، دارالآثار کا قیام اور دارالکتب الظاہریہ کی توسیع و ترقی ہے۔ ۱۹۲۰ء میں جب فرانسیسیوں کی شام پر عملداری قائم ہوئی تو وہ دوبارہ وزیر تعلیم مقرر کیے گئے۔ مجمع العلمی العربی کی سربراہی بھی انھیں سے متعلق رہی۔ ۱۹۲۸ء میں وہ تیسری بار وزیر تعلیم بنائے گئے۔ اس دور کی وزارت کا کارنامہ کلیۃ الالٰہیات اور کلیۃ العلوم الادبیۃ العلیاء کا افتتاح ہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے آکسفرڈ جا کر مؤتمر المستشرقین میں شام کی

نمائندگی کی۔ وزارت سے سبکدوش ہونے پر وہ تصنیف و تالیف میں منہمک ہوگئے اور مرتے دم تک مجمع العلمی العربی کے صدر رہے۔ انھوں نے ۲۰ جون ۱۹۵۳ء کو ۷۷ برس کی عمر میں انتقال کیا۔

علم و فضل: کرد علی دور حاضر کے ایک باکمال عالم، مؤرخ اور ادیب تھے۔ انھیں تاریخ اسلام اور عربی تمدن سے گہرا شغف تھا۔ فرانسیسی ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور وہ فرانسیسی ادبا، حکما سے بے حد متأثر تھے۔ وہ ایک وسیع المعلومات مؤرخ تھے، جو تاریخ نویسی کے قدیم و جدید اصولوں سے واقف تھے۔ انھیں قدیم و جدید مصادر پر یکساں دسترس حاصل تھی۔ عربی ادب پر ان کی نظر گہری اور ناقدانہ تھی۔ عربی کے سیکڑوں قصائد اور ہزاروں اشعار ان کے نوک زبان تھے۔ ترکی اور فارسی سے اچھی طرح آشنا تھے، بلکہ ترکی اہل زبان کی طرح بولتے تھے۔

اسلوب انشا: کرد علی شروع میں مسجع اور مقفی انشا کے دلدادہ تھے۔ بعد ازاں جب انھوں نے متقدمین، مثلاً ابن المقفع، جاحظ اور ابو حیان توحیدی کی تصانیف کا مطالعہ کیا تو انھیں عالم ہی دوسرا نظر آیا۔ پرتکلف اور رنگین بیانی سے ان کی طبیعت ہٹ گئی اور انھوں نے سادہ نثر نویسی اختیار کرلی۔ وہ خود ابن حزم، الغزالی، ابن تیمیہ، ابن قیم اور ابن خلدون کی سادہ اور شیریں بیانی کے معترف تھے، لہذا ان کے اسلوب بیان پر ان اساطین علم کے اسلوب نگارش کا اثر بھی نمایاں ہے (مذکرات، ۴: ۱۰۹۳، دمشق، ۱۹۵۱ء)۔

تصانیف: (الف) تاریخ، تذکرہ اور سوانح: (۱) خطط الشام (۱۹۲۵ تا ۱۹۲۸ء)، شام کی سیاسی، علمی اور تمدنی تاریخ، جو فاضل مصنف نے بارہ سو عربی، ترکی اور فرانسیسی کتابوں کے مطالعے اور بیس برس کی محنت شاقہ کے بعد چھ جلدوں میں لکھی ہے؛ (۲) الاسلام والحضارۃ العربیۃ (قاہرہ، بار دوم، ۱۹۳۶ء)، اسلام کی تمدنی تاریخ، اسلام کی مدافعت، عربی تہذیب کی یورپی تہذیب پر برتری اور افضلیت، مستشرقین کی غلطیوں کی نشاندہی اور بیسیوں قیمتی مباحث پر مشتمل ہے۔ کتاب کا اردو میں ترجمہ ہوچکا ہے (شاہ معین الدین: اسلام اور عربی تمدن، مطبوعہ اعظم گڑھ)؛ (۳) امراء البیان (قاہرہ ۱۹۳۷ء)، عربی کے ادبا کے حالات اور تصانیف کے بارے میں ہے، جس میں ان ادبا کے اسالیب انشا پر بھی سیر حاصل تبصرہ شامل ہے؛ (۴) کنوز الاجداد (دمشق ۱۹۵۰ء)، اس میں مشہور عرب مصنفوں اور انشا پردازوں کے دلچسپ حالات زندگی تحریر کیے ہیں۔ شروع میں انھوں نے اپنے استاذ شیخ طاہر الجزائری کے حالات بڑی محبت اور عقیدت سے لکھے ہیں۔ مؤخر الذکر دونوں کتابوں میں ان کی انشا پردازی سحر حلال تک پہنچی ہوئی ہے؛ (۵) دمشق، مدینۃ السحر والشعر، (دمشق ۱۹۴۴ء)، دمشق کی مختصر تاریخ اور اس کے حسین و جمیل مناظر کا بیان؛ (۶) غوطہ دمشق (دمشق ۱۹۵۲ء)، دمشق کے پرفضا مقام غوطہ کا بیان، جو سیاحوں اور نوواردوں کے لیے باعث کشش رہا ہے۔

(ب) سفر نامہ: (۱) حاضر الاندلس و غابرہا (قاہرہ ۱۹۲۳ء)، کرد علی نے ہسپانیہ کا سفر کیا اور واپس آکر اندلس کے تاریخی آثار اور اس کے حال و ماضی پر یہ دلچسپ کتاب لکھی؛ (۲) غرائب الغرب (قاہرہ ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۲ء)، فاضل مصنف کی یورپی سیاحت کے حالات اور وہاں کے تمدنی اور معاشرتی تاثرات پر مشتمل ہے۔

(ج) مقالات: (۱) القدیم والحدیث (قاہرہ ۱۹۲۵ء)،

المقتبس و المؤید میں مصنف کے شائع شدہ مضامین کا مجموعہ ؛ (۲) اقوالنا و افعالنا (قاہرہ ۱۹۴۶ء)، مقالات اور خطبات جو القدیم والحدیث کے بعد شائع ہوے ؛ (۳) المذکرات، ۴ جلدیں (دمشق ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۱ء)، فاضل مصنف کی تقریروں، ہلکے پھلکے مضامین، خاکوں اور معاشرتی زندگی پر تبصروں کا مجموعہ ہے۔

(د) تراجم: (۱) تاریخ الحضارة، فرانسیسی مصنف سینوبوس کی کتاب کا ترجمہ، قاہرہ ۱۹۰۸ء؛ (۲) الفضیلة والرذیلة، (۳) المجرم البری اور (۴) یتیمة الزمان، فرانسیسی قصوں کے عربی تراجم ہیں (محمد کرد علی: المذکرات، ۱ : ۳۰۷ تا ۳۳۰، دمشق ۱۹۴۸ء)۔

(ہ) علمی کام: انھوں نے سیرة احمد بن طولون (البلوی)، رسائل البلغاء، المستجاد من فعلات الاجواد (التنوخی)؛ تاریخ حکماء الاسلام (البیہقی)، اشربہ (ابن قتیبہ) ایسی علمی کتابیں مقابلے، تصحیح اور تحشیہ کے بعد شائع کیں۔

المجمع العلمی العربی: کرد علی کا زندہ جاوید کارنامہ مجمع العلمی العربی کی تاسیس ہے۔ ۱۹۱۹ء میں جب وہ وزیر تعلیم تھے تو انھوں نے حکومت کے سامنے عربی اکادمی قائم کرنے کی تجویز پیش کی، جو باضابطہ منظور کرلی گئی۔ تھوڑے سے وقفے کو چھوڑ کر وہ عمر بھر اس علمی مجلس کے صدر رہے۔ اس مجلس نے جو مجمع العلمی کے نام سے مشہور ہے، عربی زبان کو بے حد ترقی دی ہے۔ مجمع العلمی کا مقصد علمی اصطلاحات وضع کرنا، رائج الوقت غلط الفاظ اور تراکیب کی تصحیح، علمی خطبات کا اہتمام اور مخطوطات کو تہذیب اور تحشیہ کے ساتھ شائع کرنا ہے۔ المجمع العلمی العربی کے ارکان میں مختلف عرب ممالک کے مشہور علما اور ادبا کے علاوہ ممتاز مستشرقین بھی شامل ہیں، جن کے اشتراک سے پچاس علمی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مجمع کی طرف سے ایک باقاعدہ سہ ماہی علمی رسالہ مجلة المجمع العلمی العربی (مجلة المجمع اللغة) کے نام سے ۱۹۲۲ء سے برابر نکل رہا ہے۔

مآخذ: (۱) براکلمان: تکملة، ۳ : ۴۳۰ تا ۳۳۴، لائیڈن ۱۹۴۲ء؛ (۲) کرد علی: خطط الشام، ۶ : ۴۱۱ تا ۴۲۵، دمشق ۱۹۲۸ء؛ (۳) وہی مصنف: المذکرات، ۱ : ۳۰۷ تا ۳۳۰ و ۳ : ۱۹۲ تا ۱۹۴، دمشق ۱۹۵۱ء؛ (۴) سامی الکیالی: الأدب العربی المعاصر فی السوریة، ص ۱۰۷ تا ۱۱۱، قاہرہ ۱۹۵۹ء؛ (۵) سامی الدھان: محمد کرد علی، در مجلة المجمع العلمی العربی، دمشق، ۳۰ : ۲۱۱ تا ۲۵۲؛ (۶) احمد امین: فیض الخاطر، ۸ : ۱۲۸ تا ۱۳۳، مطبوعة قاہرہ؛ (۷) عباس العقاد: مطالعات فی الکتب والحیاة، مطبوعة قاہرہ؛ (۸) سید قطب: کتب و شخصیات، ص ۲۴۳ تا ۲۵۰، مطبوعة قاہرہ؛ (۹) الزرکلی: الاعلام، ۷ : ۲۷ تا ۵۷، مطبوعة قاہرہ؛ (۱۰) عمر رضا کحالہ: معجم المؤلفین، ۱۰ : ۱۶۲ تا ۱۶۵، دمشق ۱۹۶۰ء؛ (۱۱) نذیر حسین: استاد کرد علی، در برہان، دہلی، ۳۹ (۱۹۵۷ء) : ۱۱۶ تا ۱۲۲۔

(نذیر حسین)

* **محمد کوپرولو**: رک بہ کوپریلی۔

* **محمد گورجی پاشا**: اس نام کے دو وزیر اعظم ہوئے ہیں: (۱) المعروف بہ خادم محمد پاشا نے اپنے سیاسی دور کا آغاز محل سلطانی میں ایک خواجہ سرا کی حیثیت سے ملازمت کے بعد کیا۔ ۱۶۰۴ء میں وہ مصر کا حاکم مقرر ہوا جہاں وہ کسی حد تک امن و امان قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس کے بعد دارالسلطنت کی وزارت میں دو مرتبہ، یعنی ۱۶۱۱ء اور ۱۶۲۲ء میں قائم مقام کی حیثیت سے مامور رہا، اس اثنا میں وہ ارز روم، بوسنہ اور بلغراد کا حاکم بھی رہا، اسے سلطان

مصطفی اول کے دوسرے عہد حکومت میں وزارت عظمیٰ* کے لیے طلب کیا گیا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب "ینی چری" اور "سپاھی" قسطنطنیہ میں اپنی من مانی کر رہے تھے (ستمبر ۱۶۲۲ء) ۔ وزارت عظمیٰ کے لیے خادم محمد پاشا کا انتخاب "سپاھیوں" کی حمایت کی بدولت ہوا ، جو "ینی چری" کے سردار میر حسین کو برطرف کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے ۔ اس کے علاوہ اسے والدہ (سلطانہ) کا اعتماد بھی حاصل تھا اور ایک تجربہکار سیاستدان ہونے کی حیثیت سے بھی اس کی شہرت ہو چکی تھی ۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ فوجی نظام میں بہت سی خرابیوں کے دور کرنے میں کامیاب ہوا ۔ اس نے اس غرض کے لیے عمائد کی ایک مجلس طلب کی، جس میں یہ فیصلہ ہوا کہ "قانون اساسی" کو از سر نو جاری کیا جائے ۔ جب ساری سلطنت کے کئی حصوں میں "ینی چری" کے اقتدار اور بالخصوص ارز روم میں اباظہ پاشا (رک بآں) کی کارروائی کی مخالفت شروع ہو گئی تو صدر اعظم قسطنطنیہ میں "ینی چری" کا مقابلہ نہ کر سکا ۔ ان کا سردار میر حسین پھر ساز باز میں مصروف تھا اور اس کے علاوہ وہ سپاہ سلطان عثمان ثانی کے قتل کے انتقام کے لیے چیخ و پکار کر رہی تھی ۔ ان مساعی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سابق وزیر اعظم داؤد پاشا جنوری ۱۶۲۳ء میں مارا گیا ۔ اسی سال [illegible] فروری کو "ینی چری" باغیوں نے یہ اعلان کر کے کہ ایک خواجہ سرا وزیر اعظم نہیں ہو سکتا ، اسے معزول کرا دیا اور اس کی جگہ میر حسین مقرر ہو گیا ۔ گرجی محمد جلا وطن ہو گیا، لیکن سلطان مراد رابع کی تخت نشینی کے بعد وہ پھر وزیر بن کر دارالسلطنت میں واپس آ گیا اور مئی ۱۶۲۴ء میں تیسری مرتبہ قائم مقام وزیراعظم بن گیا، کیونکہ مستقل وزیراعظم اباظہ پاشا کے خلاف مہم پر چلا گیا تھا ۔ وہ ۲۶ مارچ کو فوت ہو گیا اور (حضرت) ایوبؓ [انصاری] کے قبرستان میں ایک تربت (مقبرے) میں دفن ہوا ۔ ماخذ سے اس کی عمر کا پتا نہیں چلتا ۔ انگریز ریذیڈنٹ رو Roe کی رائے میں گرجی محمد ان چند اشخاص میں سے تھا جو امور سلطنت کو سرانجام دینے کی اہلیت رکھتے تھے ۔

مآخذ : (۱) مؤرخین نعیما ، پیچوی ، حسن بے زادہ ، حاجی خلیفہ (فذلکہ) ؛ (۲) طغی : وقائع سلطان عثمان خان ، جسے Von Hammer نے اپنے استعمال کیا ہے ۔ یہ کتاب طبع نہیں ہوئی ، لیکن اس کا فرانسیسی ترجمہ موجود ہے ، دیکھیے Babinger ، در *G O W* ، ص ۱۵۷) ؛ (۳) عثمان زادہ تائب : حدیقة الوزراء ، ص ۷۲ ؛ (۴) سجل عثمانی ، ۴ : ۱۵۱ ؛ (۵) فان ہیمر Hammer، در *G O R* ، ج ۳ ؛ (۶) Jorga : *Gesch des Osm. Reiches*، ج ۳ ۔

(۲) [سلطان] محمد رابع کے عہد حکومت کے پہلے دور کا وزیراعظم، جب حکومت کا اقتدار حقیقی معنوں میں والدہ [سلطانہ] کوسم (رک بآں) اور قزلر اغاسی سلیمان کے ہاتھوں میں تھا ۔ اسے شام اور دوسرے صوبوں کا طویل عرصے تک حاکم رہنے کی حیثیت سے امور سلطنت کا کافی تجربہ حاصل تھا ۔ جب ۹۴ سال کی عمر میں نومبر ۱۶۵۱ء کے آغاز میں اسے اس بلند ترین منصب کے لیے طلب کیا گیا تو وہ سیاوش پاشا کی جگہ مقرر ہوا، جو دربار کے خلاف خود مختارانہ رویے کا اظہار کر چکا تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی وزارت کے زمانے میں نااہلیت کا ثبوت دیا اور ایشیاے کوچک میں اباظہ پاشا ، ابشیر پاشا اور قاطرجی اوغلو کی خطرناک بغاوتوں کے خلاف انتہائی سکوت وجمود کا اظہار کیا ۔ اسے خاص طور پر یہ فکر لاحق رہا تھا کہ وہ دارالسلطنت سے ایسے تمام لوگوں کو نکال دے جو وزارت عظمیٰ کے منصب کے لیے اس کے ممکن حریف بن سکتے ہوں

اور جن میں محمد کوپرولو بھی شامل تھا۔ اسی وجہ سے بقول نعیما اس کا عرف عام "عجب السلاطین" (جمال گوزہ) ہو گیا تھا۔ ۲۱ جون ۱۶۵۲ء کو دوباری گروہ نے اسے پھر معزول کر دیا۔ جلا وطن ہونے کے بعد وہ کچھ عرصے تک [محلہ] ایوب میں رہا اور ۱۶۶۵ء میں اس نے ۱۰۰ برس کی عمر پا کر دمسوار میں وفات پائی۔

مآخذ: (۱) نعیما اور پیچوی کی تاریخوں کے علاوہ وجیہی کی تاریخ (غیر مطبوعہ، جس سے Von Hammer نے استفادہ کیا ہے، دیکھیے Babinger، در GOW، ص ۲۰۸)؛ نیز (۲) اولیا چلبی: سیاحت نامہ؛ (۳) عثمان زادہ تائب: حدیقۃ الوزراء، ص ۹۵ ببعد؛ (۴) فان ہیمر، در GOR، ج ۵؛ (۵) Jorga: *Gesch. des osm. Reiches*، ج ۴؛ (۶) احمد توفیق: قادینلر سلطنتی ("بیگمات کی حکومت")، قسطنطنیہ ۱۹۱۳ تا ۱۹۲۳ء۔

(J. H. Kramers)

* **محمد لالا پاشا**: رک بہ محمد پاشا لالا۔

* **محمد لالا زاری**: شیخ؛ لالہ کے پھولوں پر ایک کتاب میزان الازہار کا مصنف۔ گل لالہ کی کاشت سے متعلق یہ رسالہ سلطان احمد ثالث کے عہد حکومت (۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء تا ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء) میں لکھا گیا تھا، جس نے اپنے صدر اعظم ابراہیم پاشا کے مشورے سے ۱۷۱۸ء اور ۱۷۳۰ء کے مابین مصنف کو "شگوفہ پروران" کا خطاب دیا

مآخذ: (۱) H. Fr. von Diez: *Denkwurdigkeiten aus Asien*، Halle و برلن ۱۸۱۵ء، ۲ : ۱ ببعد؛ نیز بار دوم موسومہ بہ *Vom Tulpen-und Narcissen-Bau in der Turkey aus dem Turkischen des Scheich Muhammed Lalezari*، Hall و برلن ۱۸۱۵ء؛ (۲) Pertsch: *Katalog der Turk. Hss. Berlin*، ص ۳۰۵، عدد ۲۲۲۔

(Th. Menzel)

* **محمد لالہ زاری**: طاہر، ایک قاضی کا نام، جس کا انتقال ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۹ء میں قسطنطنیہ میں ہوا اور جس نے متعدد دینی رسالے اور شرحیں لکھیں، جو اب تک صرف مخطوطات کی شکل میں ہیں: میزان المتقیم فی معرفۃ قسطاس المستقیم؛ دفع اعتراض راغب فی حق النصوص؛ شرح قصیدہ نونیہ اور شروح کا ایک مجموعہ، جو قسطنطنیہ میں عاشر آفندی کے کتابخانے میں ایک جلد کی شکل میں محفوظ ہے (دفتر کتابخانہ عاشر آفندی، قسطنطنیہ ۱۳۰۶ھ، ص ۱۸۸، شمارہ ۴۲۱، وقف نامۂ سوم، جس میں یہ کتابیں شامل ہیں: الجواہر الظاہرہ (کذا، الزاہرہ؟)، الغزالی پر)؛ یاقوتۃ الحمرا (برگوی پر)؛ الزمردۃ الخضراء (حضرت شیخ عبدالقادر الجیلانیؒ پر)؛ الدرۃ الزہراء (حزب البحر پر) اور الکوکب الدری (ابن مشیش پر)۔ لالہ زاری کا نام لالہ زار کی نسبت سے ہے، جو فاتح مسجد کے قریب قسطنطنیہ کا ایک محلہ ہے۔

مآخذ: (۱) بورسہ لی محمد طاہر: عثمانلی مؤلفلری، ۱ : ۳۴۹؛ نیز (۲) سجل عثمانی، ۳ : ۲۳۳، جس میں لکھا ہے کہ طاہر لالہ زار زادہ ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶-۱۷۸۷ء میں ایوب کا مُلّا تھا۔

(Th. Menzel)

⊗ **محمد لکھوی**: حافظ محمد بن حافظ بارک اللہ بن حافظ محمد امین، ۱۲۲۱ھ میں موضع لکھو کے (ضلع فیروز پور، بھارت) میں پیدا ہوئے۔ سلسلۂ نسب امام محمد بن الحنفیہ کی وساطت سے چھبیسویں پشت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ لکھوی خاندان کئی پشتوں سے نیکی، پرہیزگاری، تصوف اور خدمت دین کے لیے مشہور تھا اور لوگ دور دراز سے آ کر علمی اور روحانی فیض حاصل کرتے تھے۔

حافظ محمد نے تجوید، فقہ، اصول، منطق،

فلسفہ، معانی، صرف و نحو اور عربی ادب کی اکثر کتابیں اپنے والد سے پڑھیں۔ فارسی کی تعلیم بھی انھیں سے حاصل کی۔ باپ سے باقاعدہ بیعت بھی ہوئے۔ سند حدیث مولانا شاہ عبدالغنی مہاجر مدنی اور مولانا احمد علی سہارن پوری (محشی صحیح بخاری) سے حاصل کی، جو مولانا شاہ محمد اسحٰق دہلوی مہاجر مکی کے شاگرد تھے۔ حافظ محمد کو شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے تلمیذ ہونے اور میر محبوب علی سے سند و اجازہ حاصل کرنے کا شرف بھی حاصل تھا۔ بعض حضرات کے نزدیک حافظ محمد لکھوی کو مولانا سید نذیر حسین دہلوی سے بھی شرف تلمذ حاصل تھا، لیکن بعض حضرات کو اس سے اتفاق نہیں، البتہ ان کے بیٹے مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی سید صاحب کے شاگرد تھے اور خود حافظ صاحب ہی ان کو سید صاحب کے پاس دہلی لے کر گئے تھے۔ جب تک وہ وہاں پڑھتے رہے، حافظ صاحب وہیں مقیم رہے تا کہ بیٹے کی تعلیم و تربیت کی براہ راست نگرانی کر سکیں۔

حافظ صاحب کے حالات اور ان کی تصانیف سے واضح ہوتا ہے کہ وہ تمام اصناف علم، یعنی تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، منطق، فلسفہ اور صرف و نحو وغیرہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ پنجابی کے بلند مرتبہ شاعر بھی تھے۔ ان کی بیشتر منظوم تصنیفات پنجابی میں ہیں۔ ان کی شہرت کا اصل باعث فراوانی علم کے ساتھ پنجابی شاعری بھی ہے۔

ان کی تصنیفات ضروری تعارف کے ساتھ درج ذیل ہیں:

(۱) تفسیر محمدی: اس کا تاریخی نام "موضح فرقان" (۱۲۸۵ھ) ہے، اسی لیے سرورق پر "تفسیر محمدی مسمی بموافق تاریخ آغاز بہ موضح فرقان" مرقوم ہے۔ یہ ان کی آخری دور کی تصنیفات میں سے ہے۔ پنجاب میں اس کتاب کو بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ کتاب سات جلدوں میں منقسم ہے اور ہر جلد قرآن مجید کی ایک منزل پر مشتمل ہے۔ اس کی تصنیف کے سلسلے میں مشہور تفسیریں اور احادیث و فقہ کی کتابیں ان کے سامنے رہیں، لیکن البغوی کی معالم التنزیل اور قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی کی تفسیر مظہری سے انھوں نے بالخصوص استفادہ کیا۔ ان کا طریق تفسیر یہ ہے کہ پہلے قرآن مجید کی آیت درج کرتے ہیں۔ اس کے نیچے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا فارسی ترجمہ اور بعض مقامات پر شاہ رفیع الدینؒ کا ترجمہ دیتے ہیں۔ اس کے نیچے پنجابی زبان میں اپنا ترجمہ دیتے ہیں۔ پھر پنجابی نظم میں اس کی تفسیر بیان کرتے ہیں۔ کتاب پر حواشی بھی ہیں، جو پنجابی نثر میں ہیں۔ تفسیر محمدی کی تصنیف سے حافظ صاحب ۱۲۹۷ھ میں فارغ ہوئے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ مطبع کوہ نور لاہور سے طبع ہوئی۔ کچھ جلدیں پہلی بار گلزار محمدی پریس لاہور سے بھی طبع ہوئیں؛ (۲) احوال الآخرت: یہ بھی تاریخی نام ہے (۱۲۷۷ھ)۔ اس میں موت اور اس کے بعد پیش آنے والے حالات، تذکرۂ قبر اور احوال قیامت کو قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ کی غنیۃ الطالبین اور شاہ رفیع الدین دہلوی کے قیامت نامہ سے مسائل اخذ کیے گئے ہیں۔ پنجابی نظم میں یہ مشہور اور مقبول کتاب ہے۔ متعدد مقامات پر فارسی میں حواشی بھی ہیں، جنھیں بعد میں آن کے فرزند مولانا محمد حسن لکھوی (م ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۵ء) نے اردو میں منتقل

کیا؛ (۳) انواع مولوی بارک اللہ: یہ کتاب انھوں نے اپنے والد مولانا حافظ بارک اللہ کے ارشاد کی تعمیل میں لکھی، اس لیے انھیں کے نام پر اس کا نام رکھا۔ اس میں ضروری فقہی مسائل درج ہیں۔ یہ اس زمانے کی تصنیف ہے جب حافظ محمد مسلک احناف سے تعلق رکھتے تھے؛ (۴) انواع محمدی (۱۲۸۹ھ): یہ کتاب انواع بارک اللہ کی ناسخ ہے۔ جب انھوں نے دہلی جا کر حدیث پڑھی، مسائل فقہ کی تعبیر و ترجمانی احادیث نبوی کی روشنی میں کرنے لگے اور مسلک اہل حدیث اختیار کر لیا تو پھر یہ کتاب تصنیف کی۔ اس میں بلوغ المرام کی احادیث کا ترجمہ اور پنجابی نظم میں ان کی تشریح کی گئی ہے؛ (۵) زینت الاسلام: اس میں دل نشین انداز میں توحید و سنت کی تعلیم دی گئی ہے اور شرک و بدعت کی تردید کی گئی ہے؛ (۶) عقائد محمدی: اس میں اسلامی عقائد کی تشریح کی گئی ہے؛ (۷) محامد الاسلام: اس میں اسلام کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ بعض مقامات پر اس موضوع کے بارے میں انگریز مصنفین کے حوالے بھی دیے گئے ہیں؛ (۸) رد نیچری: علمی انداز میں سرسید احمد خان اور ان کے هم خیال لوگوں کے افکار و خیالات کی تردید ہے؛ (۹) تطہیر الاعتقاد کا فارسی ترجمہ: صاحب سبل السلام علامہ محمد بن اسمعیل یمانی نے قبر پرستی پر شرکیہ رسوم و بدعات کی تردید میں تطہیر الاعتقاد کے نام سے ایک رسالہ عربی زبان میں تصنیف کیا تھا، جس کا حافظ محمد لکھوی نے فارسی میں ترجمہ کیا تھا؛ (۱۰) [illegible]: پنجابی نظم میں تردید شیعیت کے موضوع سے متعلق ہے؛ (۱۱) کھیتی: پنجابی نظم میں مشہور حدیث "الدنیا مزرعۃ الآخرۃ" کی تشریح، جو اب نایاب ہے؛ (۱۲) ابواب الصرف: عربی مدارس کے مروجہ نصاب تعلیم کے سلسلے کی مشہور اور متداول کتاب ہے؛ (۱۳) قوانین الصرف: فارسی نظم میں عربی علم الصرف کے قواعد بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب سے پتا چلتا ہے کہ حافظ صاحب فارسی میں بھی شعر کہتے تھے؛ (۱۴) حاشیہ سنن ابی داؤد: صحاح کی مشہور کتاب سنن ابی داؤد پر یہ حاشیہ عربی زبان میں ہے، جو حافظ صاحب نے اپنے قیام دہلی کے دوران میں لکھا تھا۔ اب یہ نایاب ہے؛ (۱۵) حاشیہ مشکوۃ: یہ بھی عربی زبان میں ہے اور نایاب ہے؛ (۱۶) حاشیہ بر انواع مولوی عبداللہ لاہوری؛ (۱۷) حاشیہ بر شہباز شریعت: مشہور پنجابی شاعر مولوی نور محمد ماہوتری کی معروف تصنیف شہباز شریعت پر حاشیہ؛ (۱۸) قصۂ شیخ قصوری۔

تصانیف کی اس فہرست سے واضح ہوتا ہے حافظ صاحب عربی اور فارسی پر کامل عبور رکھتے تھے۔ قرآن مجید کی تفسیر کی طرح وہ صحیح بخاری کا ترجمہ اور تشریح بھی پنجابی اشعار میں کرنا چاہتے تھے، لیکن موت نے مہلت نہ دی۔ پتھری کا عارضہ لاحق ہونے پر اپریشن کرانا پڑا، اور اس کی وجہ سے صفر ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء میں وفات پا گئے۔

مآخذ: (۱) شمس الحق: مقدمہ غایۃ المقصود شرح ابی داؤد؛ (۲) فضل حسین: الحیات بعد الممات؛ (۳) عبدالحق: ایقاظ غفلاء الزمان فی ترجمہ الشیخ محی الدین عبدالرحمن کوئلوی؛ (۴) حافظ محمد لکھوی: دیباچہ تفسیر محمدی، جلد اول: دیباچہ و جلد ہفتم: اشعار خاتمہ؛ (۵) وهی مصنف: احوال الآخرۃ، ص ۴، ۷، ۱۴۳ تا ۱۵۱ (مطبوعہ جامعہ محمدیہ، اوکاڑہ)؛ (۶) هفت روزہ الاعتصام، لاهور، بابت ۲۲ فروری، یکم مارچ و ۸ مارچ ۱۹۵۷ء۔

(محمد اسحاق بھٹی)

٭ **محمد محسن الحاجؒ** : بن حاج فیض اللہ۔

ان کا دادا آغا فضل اللہ ایران کا ایک امیر تاجر تھا، جو اٹھارویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہندوستان آیا۔ وہ کچھ عرصے تک مرشد آباد میں مقیم رہا اور وہاں بہت بڑے پیمانے پر تجارتی کاروبار کرتا رہا، لیکن یہ دیکھ کر کہ ہوگلی نسبةً زیادہ مفید مرکز ہے، وہ اپنے بیٹے حاجی فیض اللہ کے ساتھ آ کر وہیں سکونت پذیر ہو گیا۔ یہیں اس [اس کے پوتے] محمد محسن الحاج کی ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء میں ولادت ہوئی۔ اس سے پہلے ہوگلی میں ایک شخص آغا مُطہّر بھی موجود تھا، جو آغا فضل اللہ کی طرح آیا تو ایران ہی سے تھا، لیکن اس نے اورنگ زیب [رک بآں] کے دربار میں راہ و رسم پیدا کر لی۔ بادشاہ نے اسے جیسور کے علاقے اور دوسرے مقامات میں بڑی وسیع جاگیریں عطا کر دیں اور آغا مطّہر جاگیروں پر قبضہ کرنے کے شوق میں بالآخر دہلی سے مشرقی صوبے کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے اپنی نئی جاگیروں کا ایسا اعلیٰ انتظام کیا کہ وہ بہت جلد اس صوبے کے سب سے دولت مند اشخاص میں شمار ہونے لگا۔ اس نے ہوگلی کو اپنا صدر مقام بنایا۔ آغا مُطہّر کئی سال تک بے اولاد رہا اور کہیں بڑی عمر میں جا کر اس کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کی ساری محبت و الفت اسی لڑکی پر مرکوز رہتی تھی، جس کا نام مانو جان خانم تھا۔ جب اس لڑکی کی عمر سات برس کی ہوئی تو وہ فوت ہوگیا اور اپنی ساری جائداد اس کے لیے چھوڑ گیا۔ آغا مُطہّر کی بیوہ اپنے خاوند کے رویے سے ناراض تھی، اس لیے اس نے بعد میں حاجی فیض اللہ مذکور سے نکاح کر لیا، جو اس کے خاوند کے دوست آغا فضل اللہ کا بیٹا تھا۔ اس شادی سے حاجی محمد محسن پیدا ہوا۔ وہ اپنی سوتیلی بہن مانو جان خانم سے آٹھ برس چھوٹا تھا۔

محمد محسن کی تعلیم و تربیت کی ابتدا ہوگلی میں اور تکمیل مرشد آباد میں ہوئی۔ پھر وہ ہوگلی میں اپنی بہن کے ہاں آ گیا۔ بعد ازاں اس نے ۲۷ برس کا ایک طویل سفر اختیار کیا، جس میں اس نے ہندوستان، عرب، ایران اور وسط ایشیا کی سیاحت کی۔ جب وہ ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ گیا تو اس نے اپنی سیاحت ختم کرکے واپس آ جانے کا فیصلہ کیا۔ شمالی ہند میں ہوتے ہوئے وہ لکھنؤ پہنچا اور وہاں سے ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء میں مرشد آباد آیا۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ وہاں آباد ہو جائے، لیکن اس کی اس طویل غیر حاضری کے دوران میں اس کی بہن مانو جان خانم اس کے عمزاد صلاح الدین محمد خان سے، جو آغا مطہّر کا بھتیجا تھا، شادی کر چکی تھی۔ اس کا خاوند عنفوان شباب ہی میں انتقال کرگیا: وہ بڑی بیتابی سے اپنے سوتیلے بھائی کی واپسی کی منتظر تھی۔ آخر کار اپنی بہن کی منت سماجت پر وہ ہوگلی آگیا اور جب ۱۲۱۸ھ/۱۷۰۳ء میں مانو جان خانم کا ۸۱ برس کی عمر میں انتقال ہوا تو وہ ایک وصیت نامہ چھوڑ گئی، جس کی رو سے اس نے اپنی کل جائداد اپنے بھائی محمد محسن کے نام ہبہ کر دی۔

اس طرح حاجی محمد محسن ۷۳ سال کی عمر کو پہنچ کر اس زر کثیر کا مالک بن سکا، جس کی بدولت اس کے ہم مذہبوں کو حصول تعلیم کے کاموں میں بڑی مدد ملی۔ اس نے کبھی شادی نہیں کی اور جب اس کی سوتیلی بہن فوت ہو گئی تو اس کا کوئی قریبی عزیز باقی نہ رہا۔ اسے اس بات کی بڑی فکر تھی کہ اس کی دولت اس کی موت کے بعد کسی نیک کام پر صرف ہو، چنانچہ ۷ صفر ۱۲۲۱ھ/۲۶ اپریل ۱۸۰۶ء کو اس نے ایک وقف نامہ تحریر کیا، جس کی رو سے اس نے اپنی تمام جائداد تا بدوام خیراتی کاموں کے لیے وقف

کر دی ۔

حاجی محمد محسن اپنی جائداد کا اس نیک طریق سے فیصلہ کرنے کے بعد چھے سال تک زندہ رہا ۔ اس نے اپنے ذاتی گزارے کے لیے صرف اتنی جائداد رکھ لی تھی ، جس سے اسے کوئی ایک سو روپیہ ماہانہ کی آمدنی ہو جاتی تھی ۔ وہ ۱۲۲۷ھ/ ۱۸۱۲ء میں ۸۲ سال کی عمر میں فوت ہو گیا اور اس امام باڑے کے قریب دفن ہوا جس کے لیے اس نے ایک بڑی جائیداد وقف کر دی تھی۔

مآخذ: (۱) F. B. Bradley-Bert : *Twelve men of Bengal*، کلکتہ ۱۹۱۰ء، ص ۴۵ تا ۵۹ ؛ (۲) مہندر چندر مترا : *Life of Haji Mohammad Mohsin*، کلکتہ ۱۸۸۰ء، ص ۱ تا ۲۹ ؛ (۳) O'Malley : *Bengal District Gazetteers, Hooghly*، کلکتہ ۱۹۱۲ء، ص ۲۹۲ تا ۲۹۳ ؛ (۴) D. G. Crawford : *Hooghly Medical Gazetteer*، کلکتہ ۱۹۰۳ء، ص ۲۳۲ ؛ (۵) *Bengal Past and Present* (*Journal of the Calcutta Historical Society*)، ۲ : ۶۳ ببعد، کلکتہ ۱۹۰۸ء ۔

(محمد ہدایت حسین)

* **محمد مرتضٰی الزُّبیدی**: بن محمد بن محمد بن عبدالرزاق ابوالفیض الحسینی الزبیدی الحنفی ، عربی زبان کے ایک عالم [اور ماہر لغت نویس] ۔ وہ ۱۱۴۵ھ/ ۱۷۳۲ء میں شمال مغربی ہندوستان کے ضلع قنوج کے موضع بلگرام میں پیدا ہوئے ۔ [ان کا سلسلۂ نسب حضرت علیؓ تک پہنچتا ہے (مقدمہ تاج العروس)]۔ حصول علم کی جستجو میں طویل سفر کرنے کے بعد ۹ صفر ۱۱۶۷ھ/ ۶ دسمبر ۱۷۵۳ء کو وہ قاہرہ میں جا کر آباد ہوئے ۔ وہاں انھوں نے خاص طور پر مدعو کردہ جماعتوں کو درس دے کر علم حدیث کے مطالعے میں نئی دلچسپی پیدا کر دی ۔ بالائی مصر میں بھی عرب شیخ ہمام کے ہاں وہ ایک معزز مہمان کی حیثیت سے قیام کیا کرتے تھے اور مصر کے دیہات میں بھی ان کی بڑی عزت و توقیر تھی ہوتے ہوتے ان کی شہرت سوڈان بلکہ ہندوستان تک پہنچ گئی۔ ۱۱۹۱ھ/ ۱۷۷۷ء سے انھیں حکومت کی جانب سے ایک وظیفہ ملنے لگا ۔ انھوں نے شعبان ۱۲۰۵ھ/ اپریل ۱۷۹۱ء میں بعارضہ طاعون وفات پائی ۔

ان کی بڑی بڑی تصانیف میں سے دو شرحیں ہیں ۔ انھوں نے الفیروز آبادی کی قاموس پر تاج العروس کے نام سے شرح لکھی جو ۱۱۸۱ھ/ ۱۷۶۷ء میں چودہ سال [اور دو ماہ] کی محنت کے بعد مکمل ہوئی ۔ اس کتاب کے دیباچے میں وہ ایک سو سے زیادہ ایسے مآخذ کا حوالہ دیتے ہیں ، جنھیں انھوں نے اس تصنیف میں استعمال کیا ہے ، لیکن انھوں نے قاموس پر جو اضافے کیے ہیں ، وہ کافی حد تک ابن منظور کی لسان العرب سے لیے گئے ہیں ۔ یہ تصنیف پہلے غیر مکمل طور پر قاہرہ میں پانچ جلدوں میں ۱۲۸۶-۱۲۸۷ھ میں شائع ہوئی ، پھر ۱۳۰۷ھ میں وہیں دس جلدوں میں مکمل صورت میں چھپی ۔ [حکومت کویت کی طرف سے تحقیقی طباعت کے سلسلے میں تاج العروس کی ۲۲ جلدیں ۱۹۶۵ء تا ۱۹۸۵ء میں شائع ہو چکی ہیں] ۔ انھوں نے الغزالی کی تصنیف احیاء العلوم الدین پر بھی ایک ضخیم شرح لکھی، جس کا نام اتحاف السادۃ المتقین ہے ۔ اس کتاب میں الفاظ کے معانی کی تشریح کے علاوہ انھوں نے ان احادیث کی تخریج پر خاص توجہ دی ہے جو الغزالی نے نقل کی ہیں ۔ یہ کتاب فاس میں ۱۳۰۲ تا ۱۳۰۴ھ میں ۱۳ جلدوں میں طبع ہوئی اور ۱۳۱۱ھ میں قاہرہ میں دس جلدوں میں ۔ شرحوں کے علاوہ انھوں نے لغت اور حدیث کی چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں اور حضرت علیؓ کی اولاد کے شجرے بھی مرتب کیے :

(۱) نشوة الارتیاح فی بیان حقیقة المیسر والقداح، طبع Landberg: *Primeurs arabes*، ۱: ۳۰ تا ۵۵؛ (۲) القول المبتوت فی تحقیق لفظ التابوت، طبع قاہرہ، در الفہرست (طبع ثانی)، ۱: ۹۶؛ (۳) تحقیق الوسائل لمعرفة المکاتبة و الرسائل، مطبوعۂ موصل، داؤد: مخطوطات، ص ۱۴۰؛ (۴) الامالی الشیخونیه، دروس حدیث، جو انھوں نے جامع شیخو میں دیے، مخطوطہ برلن، Ahlwardt، شمارہ ۱۰۲۵۳؛ (۵) رسالة فی احادیث یوم العاشوراء، طبع قاہرہ، در الفہرست، ۶: ۲۰۹؛ (۶) تحفة القماعیل فی مدح شیخ العرب اسمعیل، مقدمے کی طرز پر، مطبوعہ قاہرہ، در الفہرست، ۳: ۷۴؛ (۷) ایضاح المدارک فی الافصاح عن العواتک، ۳ ربیع الثانی ۱۱۹۳ھ/۹ اپریل ۱۷۸۰ء کو ختم ہوئی، در کتاب مذکور، ۵: ۵۱؛ (۸) جذوة الاقتباس فی نسب بنی العباس، ۲۶ ذوالحجه ۱۱۸۲ھ/۲ مئی ۱۷۶۹ء کو مکمل ہوئی، در کتاب مذکور، ص ۱۵۰؛ (۹) حکمة الاشراق الی کتاب الآفاق، عربی رسم الخط اور مشہور کاتبوں کی تاریخ، ۲۲ ذوالحجه ۱۱۸۳ھ/۳۰ مارچ ۱۷۷۱ء کو پایہ تکمیل کو پہنچی، در کتاب مذکور، ص ۱۶۳؛ (۱۰) الروض المعطار فی نسب السادة آل جعفر الطیار، در کتاب مذکور، ص ۲۰۵؛ (۱۱) مزیل نقاب الخفاء عن کنی ساداتنا بنی الوفاء، ۱۶ رمضان ۱۱۸۷ھ/۱ نومبر ۱۷۷۳ء کو مکمل ہوئی، در کتاب مذکور، ص ۳۴۳؛ (۱۲) نسبة السید محمد افندی ابن حواء بنت احمد، در کتاب مذکور، ص ۳۴۹ ب، ۸۰۔ [اس کے علاوہ عبدالستار احمد فراج نے مقدمۂ تاج العروس (کویت ۱۹۶۵ء) میں الزبیدی کی ایک سو آٹھ کتب کا جو تذکرہ کیا ہے، اس میں ہر موضوع کی کتب شامل ہیں]۔

مآخذ: (۱) الجبرتی: عجائب الآثار، قاہرہ ۱۹۲۷ء، ۲: ۱۹۶ تا ۲۱۰؛ جس کا تتبع (۲) علی پاشا مبارک: الخطط التوفیقیه الجدیدة، بولاق ۱۳۰۶ھ، ۳: ۹۴ تا ۹۹ میں کیا گیا ہے؛ (۳) مومن الشبلنجی: نور الابصار فی مناقب آل بیت المختار، بولاق، ص ۳۲۷ ببعد.

(C. BROCKELMANN)

محمد معز الدین: بن سام، شنسبانی، *

شاہزادگان غور میں سے سلطنت غزنی کا چوتھا بادشاہ۔ اس کا اصلی نام شہاب الدین تھا، لیکن اس نے معزالدین کا لقب اختیار کر لیا تھا۔ اس کا بڑا بھائی غیاث الدین ۱۱۶۳ء میں اپنے عمزاد بھائی سیف الدین کی جگہ تخت نشین ہوا اور اس نے محمد معزالدین کو ہرات کا حاکم بنا کر اس کے سپرد یہ کام بھی کیا کہ وہ اس خاندان کی سلطنت کی ہندوستانی حدود کو وسعت دے۔

محمد معز الدین نے پہلی مرتبہ ۱۱۷۵ء میں ہندوستان پر حملہ کیا اور اسمٰعیلی فرقے کے ملاحدہ [قرامطہ] کو، جو ملتان میں حکومت کر رہے تھے، وہاں سے نکال دیا۔ اس نے اس صوبے میں ایک راسخ العقیدہ شخص کو حاکم مقرر کر کے اُوچ کو بھی فتح کر لیا۔ ۱۱۷۸ء میں یورش کر کے گجرات کے علاقے میں داخل ہو گیا، لیکن وہاں کے راجا بھیم واگھیلہ نے اسے شکست دی اور وہ غزنی میں صرف اپنی بچی کھچی فوج لے کر واپس پہنچ سکا۔ اگلے ہی سال اس نے پشاور فتح کر لیا اور ۱۱۸۱ء میں لاہور پر بھی قابض ہو گیا۔ یہاں اس نے غزنوی خاندان کے آخری تاجدار ملک خسرو کو اسیر کر لیا اور پنجاب کا صوبہ اپنے بھائی کی سلطنت میں شامل کر دیا۔ ۱۱۹۰-۱۱۹۱ء میں اس نے دہلی کی چوہان سلطنت پر حملہ کر کے بٹھنڈا پر قبضہ کر لیا، لیکن راجہ پرتھوی راج نے اس کے خلاف لشکر کشی کر کے اسے کرنال کے قریب تراوڑی کے مقام پر شکست دی۔ وہ اس جنگ میں زخمی ہو گیا،

تاہم وہ بچ نکلا اور ۱۱۹۲ء میں وہ پھر ہندوستان واپس آیا۔ اس دفعہ اس نے پرتھوی راج کو تراوڑی ہی کے میدان میں شکست دی، راجا پرتھوی راج وہیں لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس نے ہانسی ، سامانہ ، کہرام اور دوسرے قلعوں کو بھی فتح کرلیا اور اجمیر کو تاراج کیا ۔ غزنی واپس آنے سے پہلے وہ ہندوستان میں قطب الدین ایبک [رک باں] کو ہندوستان میں نائب السلطنت مقرر کرگیا ۔ ۱۱۹۳ء میں ایبک نے دہلی فتح کرکے اسے اپنا پایۂ تخت بنایا ۔ ۱۱۹۵ء میں ایبک اجمیر میں محصور ہوگیا۔ محمد معزالدین نے بطور کمک اسے افواج بھیجیں ، جن کی مدد سے اس نے گجرات کے راجا بھیم کو شکست دی اور اس کے پایۂ تخت انہل واڑہ کو لوٹ لیا ۔

اب وہ اپنے بھائی کے ساتھ مل کر خراسان کو واپس لینے کی کوشش کرنے لگا۔ تکش خان خوارزم شاہ [رک باں] کا انتقال ۳ جولائی ۱۲۰۰ء کو مرو کے مقام پر ہوگیا تو محمد چُربک کو مرو پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ اس نے غیاث الدین کے حق میں مرو کو فتح کرکے اس پر قبضہ کر لیا اور اس کے علاوہ نیشا پور کو بھی فتح کیا ۔ اس کے بعد محمد معزالدین کی قیادت میں ایک مہم رے کے خلاف بھیجی گئی، لیکن اس کی فوج کی بدعنوانیوں پر اسے زجر و توبیخ ہوئی جس کی وجہ سے دونوں بھائیوں کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوگئی ۔ باہمی رنجش کا صرف یہی ایک واقعہ تھا جو اس کی زندگی میں رونما ہوا ۔

۱۲۰۲ء میں غیاث الدین کی موت پر محمد معزالدین اس وسیع سلطنت کا بادشاہ بن گیا جس کی تعمیر میں اس نے اپنے بھائی کی بڑی امداد کی تھی۔ ادھر محمد خوارزم شاہ [رک باں] نے چربک سے مرو دوبارہ فتح کرلیا اور نیشا پور پر بھی قبضہ کر لیا، لیکن ہرات کو فتح کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ محمد معزالدین نے اس کے خلاف چڑھائی کی، لیکن اندخوئی کے قریب اسے شکست ہوئی اور وہ طالقان کی جانب بھاگ گیا۔ قرہ ختائی امیر گور خان نے اسے محصور کرلیا اور اسے اپنی جان بچا کر واپس چلے جانے کی اجازت صرف اسی شرط پر ملی کہ وہ اپنا سارا مال و اسباب اور سامان حرب وہیں چھوڑ کر چلا جائے۔ جب وہ اس برے حال میں غزنی کے قریب پہنچا تو اس کے غلام ایلدیگز نے اسے شہر میں داخل نہ ہونے دیا ، لیکن اس نے اس پر حملہ کرکے اسے شکست دی اور ناصرالدین قباچہ [رک باں] کو اس صوبے کا حاکم مقرر کردیا ۔ وہ غزنی واپس آیا اور وہاں مستقل طور پر رہنے لگا۔ اس نے ایلدیگز کی جان بخشی کرکے اسے معاف کردیا ۔ خوارزم شاہ سے اس نے جو عہد نامہ کیا اس کی رو سے بلخ اور ہرات تو اس کے قبضے میں رہے لیکن نیشا پور اور مرو اس کے ہاتھ سے نکل گئے ۔

۲۰ اکتوبر ۱۲۰۵ء کو اس نے غزنی سے ہندوستان کی طرف کوچ کیا اور قطب الدین ایبک کی مدد سے کھوکھروں کو شکست دی، لیکن غزنی کو واپسی کے وقت ۱۵ مارچ ۱۲۰۶ء کو دریاے سندھ کے کنارے آیا تو اسمٰعیلیوں یا کھوکھروں نے اسے قتل کر دیا ۔ غور میں اس کا بھتیجا محمود اس کا جانشین ہوا، جو غیاث الدین کا بیٹا تھا، لیکن صوبوں کے حاکم یا نائب السلطنت خود مختار ہو گئے، یعنی ایبک دہلی میں ، قباچہ ملتان میں، تاج الدین یلدز کرمان میں اور ایلدیگز غزنی میں .

مآخذ : (۱) طبقات ناصری ، مترجمہ Major H.G. Raverty، (Bibl. Ind.) : (۲) حمد اللہ المستوفی: تاریخ گزیدہ ، مترجمہ E. G. Browne ، ج ۲ :

(سلسلۂ یادگار گب) : (۳) *The Cambridge History of India*.

(T. W. HAIG)

⊛ **محمد معصوم شیخ** : حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ (رک باں) (م ۱۶۲۴ء) کے فرزند اور جانشین تھے۔ شجرۂ نسب ۲۷ واسطوں سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالی عنہ سے ملتا ہے۔ کنیت ابو الخیرات تھی، لقب مجدد الدین اور خطاب قطب الہدیٰ عروۃ الوثقی۔ وہ سلسلۂ مجددیہ کے قیوم ثانی تھے جبکہ قیوم اول حضرت مجدد الف ثانیؒ تھے۔ ان کی ولادت سرہند میں ۱۰ شوال ۱۰۰۷ھ/۶ مئی ۱۵۹۹ء کو ہوئی۔ حضرت مجددؒ ان کی ولادت کو مبارک کہا کرتے تھے کیونکہ اس سال حضرت مجددؒ کو حضرت خواجہ باقی باللہؒ (م ۱۶۰۳ء) کی صحبت نصیب ہوئی۔ قرآن مجید سات سال کی عمر میں مع قراءت و تجوید حفظ کیا۔ اکثر علوم اپنے والد ماجد سے حاصل کیے۔ چند کتب درسیہ اپنے بڑے بھائی خواجہ محمد صادق سے پڑھیں۔ شیخ طاہر لاہوری سے علوم ظاہری کی تکمیل کی۔ سولہ سال کی عمر میں علوم عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل سے فارغ ہو چکے تھے۔ حضرت مجددؒ بڑی تاکید سے ہدایت کیا کرتے تھے کہ "تحصیل علم انہماک سے کریں۔ ہمیں تم سے بڑا کام لینا ہے۔" چودہ سال کی عمر میں انہوں نے خواب دیکھا کہ ان کے وجود سے ایسا نور نکلا ہے جس سے تمام عالم منور ہو گیا [روضۃ القیومیہ، اردو ترجمہ، ص ۵]۔ یہ خواب سن کر حضرت مجددؒ نے بشارت دی : "تو قطب وقت خویش می شوی و این سخن را از من یاد دار" [محمد ہاشم کشمی : زبدۃ المقامات، ص ۲۷۸]۔ پندرہ سال کی عمر میں اپنے والد ماجد کی بیعت کی اور مراحل سلوک ان کی زیر نگرانی طے کیے۔ خلوت و جلوت میں ان کا ساتھ رہتا تھا اور استعداد اس قدر زیادہ اور فطرت اتنی بلند تھی کہ باطنی نسبتوں کا اقتباس یوماً فیوماً کرتے تھے۔ جلد ہی آپ پر حال کا غلبہ ہو گیا۔ ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۳ء میں سفر اجمیر سے واپسی پر حضرت مجددؒ نے ان کے قیوم ہونے کا اعلان کیا، اپنا جانشین مقرر کیا اور خلعت پہنائی۔ ۲۷ ذوالحجہ ۱۰۲۱ھ/۱۸ فروری ۱۶۱۳ء کو ان کا نکاح میر صفیر احمد رومی کی صاحبزادی رقیہ سے ہوا اور چھے فرزند اور چھے صاحبزادیاں ہوئیں۔ حضرت مجددؒ کا وصال ماہ صفر ۱۰۳۴ھ/دسمبر ۱۶۲۴ء میں ہوا تو خواجہ محمد معصومؒ پنجشنبہ یکم ربیع الاول ۱۰۳۴ھ/۱۲ دسمبر ۱۶۲۴ء کو ارشاد و قیومیت کی مسند پر والد کے جانشین ہوئے۔ اس وقت متعدد خلفاے کبار اور تقریباً پچاس ہزار افراد نے ان سے بیعت کی۔ ماوراء النہر اور دیگر علاقوں سے بھی لوگ آتے اور بیعت سے فیضیاب ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ تین سال تک جاری رہا۔ ان کا مقصد اپنے والد کے مشن کو کامیاب بنانا اور سلسلۂ مجددیہ کو ترقی دینا تھا، اس لیے انہوں نے سلاطین اور امرا سے روابط منقطع نہ کیے، بلکہ ان کے ذریعے تبلیغ و ارشاد کے کام کو وسعت دی۔ شاہجہان نے جب شاہزادگی کے ایام میں بغاوت کی تو وہ جہانگیر کے ساتھ سرہند سے دکن تک گئے اور متعدد لشکری ان کے مرید بنے (روضۃ القیومیہ، اردو ترجمہ، ص ۱۴)۔ ۱۰۴۱ھ/۱۶۳۱ء میں ملک شام کے علما و مشائخ ان کی زیارت کے لیے سرہند آئے۔ اہل عالم کا ان کی طرف بڑا رجوع تھا۔ کم و بیش نو لاکھ مرید تھے، جن میں سے سات ہزار کو خرقہ و خلافت حاصل ہوا [تذکرہ علماے ہند، ص ۲۱۲]۔ خزینۃ الاصفیاء (ص ۶۰۳) میں ہے کہ "مریدان معصومی کہ بہ توجہ وی بدرجات ولایت رسیدند، زیادہ از صد ہزار بودند۔" فارسی زبان

کا مشہور شاعر ناصر علی سرہندی ، (م ۱۶۹۷ء) بھی ان کا مرید تھا ۔ اس نے اپنی مثنوی میں ان کے فیض صحبت کی وسعت اور ہمہ گیری کا ذکر کیا ہے ۔ ان کی تمامتر کوشش ترویج شریعت اور احیاے سنت کے لیے وقف تھی ۔ اللہ کا پیغام بے شمار انسانوں تک پہنچایا اور حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تعلیمات کو رائج کیا ۔ اپنے والد کی طرح بصیرت افروز مکتوبات کا سلسلہ جاری رکھا ۔ برصغیر سے باہر کے حکمرانوں کو بھی خطوط لکھے ۔ اکثر و بیشتر امرا ان سے بیعت تھے ۔ انھوں نے سرہند کو علم و عرفان اور ارشاد و تلقین کا عظیم مرکز بنا دیا ۔

کمال الدین محمد احسان کا بیان ہے کہ ۱۰۴۷ھ/ ۱۶۳۷ء میں اورنگ زیب نے خواجہ محمد معصوم سے بیعت کی ، لیکن اور کسی ذریعے سے اس کی تائید نہیں ہوتی ، البتہ عالمگیر نامہ اور مآثر عالمگیری کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اورنگ زیب ان کا اور ان کے سب بھائیوں کا بڑا معتقد تھا ۔ اورنگ زیب کی بہنوں روشن آرا بیگم اور گوہر آرا بیگم نے خواجہ صاحب کی بیعت کی ۔

جب تیس بتیس سال کی مسلسل مساعی سے برصغیر کے علاوہ بعض دوسرے اسلامی ممالک میں خواجہ صاحب اپنے مکتوبات اور خلفا کے ذریعے سلسلۂ مجددیہ کو پھیلا چکے تھے تو ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۵ء میں انھوں نے براہِ سورت حرمین شریفین کا سفر اختیار کیا ۔ اورنگ زیب ان دنوں دکن کا حاکم تھا ۔ دریاے نربدا کو عبور کر کے وہ ان کی زیارت کے لیے حاضر ہوا ۔ دیارِ عرب میں خواجہ صاحب کی زبان سے جو ملفوظات نکلے ، انھیں مناقب احمدیہ کے نام سے مولانا محمد امین نے مرتب کیا ۔ انھوں نے اپنا جانشین اپنے فرزند اکبر خواجہ محمد نقشبند کو بنایا ، جو قیوم ثالث کہلائے ۔ ۷۲ سال کی عمر میں ۹ ربیع الاول ۱۰۷۹ھ/ ۱۷ اگست ۱۶۶۸ء کو انھوں نے وفات پائی ۔ حضرت مجدد کے مقبرے کے قریب دفن ہوئے ۔ روضہ شہزادی روشن آرا بیگم نے بنوایا ، جو اپنی ساخت کے اعتبار سے "روضہ چینی" کہلاتا ہے ۔ ناصر علی سرہندی نے اس کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا اور ایک غزل میں اس کی شان بتائی ہے ۔ ان کے مکتوبات تین جلدوں میں چھپے ہیں ۔ ان میں عقائد و کلام ، عبادات و معاملات ، مقام احسان و تقویٰ ، تزکیہ نفس ، تہذیب اخلاق اور اصلاح اعمال کے ارشادات و تفصیلات ہیں ۔ ان کا ملخص نسیم احمد فریدی نے تیار کیا تھا ، جو رسالہ فرقان میں چھپا ۔ مکتوبات کا ایک ملخص ان کے مرید مولانا محمد باقر بن شرف الدین لاہوری نے بھی تیار کیا اور کنز الہدایت نام رکھا ۔ محمد الحنفی نے اس کا ترجمہ عربی میں کیا ، جس کی عکسی نقل پاکستان میں امین اللہ وثیر کے پاس ہے ۔ ان کے متعلق دو تصانیف طبقات معصومیہ اور مقامات معصومیہ ہیں ، جن کے حوالے روضۃ القیومیہ میں ملتے ہیں ۔ اس کا رکن دوم ان کے حالات پر مشتمل ہے اور اس کے مصنف کمال الدین محمد احسان خواجہ محمد معصوم ہی کی اولاد سے تھے ۔ اس کا ترجمہ اردو میں ہو چکا ہے اور لاہور سے طبع ہوا ہے ۔ ان کے دیار عرب کے ملفوظات مناقب احمدیہ کا اردو ترجمہ اللہ والے کی قومی دکان کشمیری بازار لاہور نے ۱۹۰۹ء میں شائع کیا ۔ خاندان مجددی میں سے ایک شخص خواجہ محمد فضل اللہ نے عمدۃ المقامات کے نام سے ایک کتاب ۱۲۳۱ھ میں تصنیف کی ، جو حیدر آباد سندھ سے ۱۲۵۵ھ میں چھپی ۔ حضرت محمد معصوم کے متعلق براہ راست معلومات

کی یہ آخری کتاب ہے۔ جواہر معصومیہ میں ان کے سوانح خواجہ احمد حسین امروہی نے اردو میں مرتب کیے، جس کا نیا ایڈیشن اللہ والے کی قومی دکان نے طبع کرایا۔ افکار معصومیہ از عبدالمجید سیفی حال ہی میں طبع ہوئی ہے۔ مطبع مجتبائی دہلی نے بھی ایک کتاب ہدیہ احمدیہ، از شیخ احمد مکی، طبع کی تھی، جس میں ان کے سوانح ہیں۔ زبدۃ المقامات از محمد ہاشم کشمی بھی ایک مشہور کتاب ہے، جس میں ان کے حالات ملتے ہیں۔ اس کا اصل اور اردو ترجمہ دونوں مطبوعہ ہیں۔ ڈاکٹر غلام مصطفی خان نے ادارہ مجددیہ کراچی سے مکتوبات سیفیہ کے نام سے خواجہ محمد معصوم کے فرزند خواجہ سیف الدین کے مکتوبات طبع کرائے ہیں۔

مآخذ: (۱) محمد اختر دہلوی: تذکرہ اولیاے ہند، جلد سوم، دہلی ١٩٢٨ء؛ (۲) محمد دین کلیم: لاہور میں اولیاے نقشبند کی سرگرمیاں، مطبوعہ لاہور؛ (۳) مفتی غلام سرور: خزینۃ الاصفیاء، مطبوعہ لاہور؛ (۴) شیخ محمد اکرام: رود کوثر، بار دوم، مطبوعہ کراچی؛ (۵) محمد کاظم: عالمگیر نامہ، کلکتہ ١٨٦٨ء؛ (٦) کمال الدین محمد احسان: روضۃ القیومیہ، اردو ترجمہ، مطبوعہ لاہور؛ (۷) ہدایت اللہ چودھری: حضرت خواجہ محمد معصوم، قلمی نسخہ، در پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور؛ (۸) داراشکوہ: مجمع البحرین، اصل و ترجمہ انگریزی از محفوظ الحق، کلکتہ ١٩٢٩ء؛ (۹) دارا شکوہ: سر اکبر، مطبوعہ گیان پریس گوجرانوالہ؛ (۱۰) محمد ہاشم کشمی: زبدۃ المقامات؛ (۱۱) رحمان علی: تذکرہ علماے ہند، کراچی ١٩٦١ء؛ (۱۲) محمد ساقی مستعد خان: مآثر عالمگیری۔ [محمد عبدالغنی رکن ادارہ نے لکھا]۔

(ادارہ)

محمد معصوم، بھکری: رک بہ میر معصوم بھکری۔

محمدی: دور صفویہ کا ایرانی مصور۔ معاصر مآخذ میں اس کے حالات بہت کم ملتے ہیں، البتہ متعدد ایسی تصاویر ملتی ہیں جن پر یا تو اس کا نام اپنے دستخط کی صورت میں موجود ہے یا قدیم زمانے میں انھیں مدت سے اس سے منسوب کیا جا رہا ہے اور ان میں باہم کم از کم اتنی مطابقت پائی جاتی ہے کہ ہم اس کے اسلوب یا یوں کہیے کہ اس کے دو اسالیب کو متمیز کر سکتے ہیں۔

اسکندر منشی نے اپنی تالیف تاریخ عالم آرائے عباسی میں، جو ١٠٣٨ھ کے قریب ختم ہوئی تھی (مخطوطہ انڈیا آفس، Ethe، عدد ٥٣٠، ورق ٧٥ راست، جس کا اقتباس T. W. Arnold: *Painting in Islam*، آکسفرڈ ١٩٢٨ء، ص ٤٤ میں ہے) اس کا ذکر ٩٨٠ھ تا ٩٨٥ھ کے نواح کے بہترین مصوروں کے ضمن میں کیا ہے، جبکہ شاہ طہماسپ کے عہد حکومت کا آخر اور اسماعیل ثانی کا دور سلطنت تھا۔ ترک مؤرخ عالی نے بیان کیا ہے کہ محمدی، سلطان محمد کا بیٹا اور شاگرد تھا اور اس نے جلدوں پر سنہری روغن سے نقاشی اور مناظر مجلس کی تصویر کشی کی (مناقب ہنروران، ص ٧٦، جس کا اقتباس A.B. Sakisian: *Laminiature presane du XIIe an XVII e siecls* Paris Bruxelles ١٩٢٩ء، ص ١٢٣ میں ہے)۔ تعجب ہے کہ قاضی احمد بن میر منشی نے اپنی گلستان ہنر میں اسے شمار نہیں کیا اور نہ اس کا کوئی حوالہ دیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف مذکور کے آقا اور فن کے دلدادہ صفوی شہزادے ابراہیم میرزا والی مشہد نے اس سے کام نہیں لیا

سر ٹامس آرنلڈ کی رائے میں محمدی بمعنی ”مسلمان“ ایک ایسا نام ہے جو شاذ ہی رکھا جاتا ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ مصور مذکور نومسلم تھا (Paintivg in Islam، آکسفرڈ، ۱۹۲۸ء، ص ۱۳۵)۔ ماخذ میں اس امر کی جانب کوئی اشارہ نہیں ملتا، لیکن اسے ایسا کوئی ثبوت قرار نہیں دیا جا سکتا کہ حقیقت اس کے برعکس ہوگی۔ بہر حال یہ بات قابل ذکر ہے کہ قاضی احمد کی گلستان ہنر میں ایک منشی المعروف بہ محمدی بک کا ذکر آیا ہے، جو ۹۲۸ھ/۱۵۲۲ء میں فوت ہوا تھا (ترجمہ V. and T. Minorsky، واشنگٹن ۱۹۵۹ء، ص ۹۲ - ۹۳)۔ اس اہلکار کے مسلمان باپ دادا کا بہت اچھا شجرہ نسب تھا اور یہ امر کہ ایسے شخص کا مذکورہ بالا نام تھا، ظاہر کرتا ہے کہ اس دور میں دوسرے لوگوں کا بھی یہ نام رکھا جاتا ہوگا۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کی بنائی ہوئی، یا اس سے منسوب اہم ترین تصویر پیرس کے عجائب خانہ لوآر Musee du Louvre (عکس در Sakisian: کتاب مذکور، شکل ۱۶۱) میں موجود ہے۔ اس پر مندرج تحریر میں صرف اس کا نام ہی نہیں بلکہ تاریخ (۹۸۹ھ/۱۵۷۸ء) بھی دی ہوئی ہے۔ یہ ایک دیہاتی منظر ہے، جسے بہت حسن و خوبی سے ترتیب دیا گیا ہے اور اس میں بہت سی شبیہیں موجود ہیں: ایک بنسری بجاتا ہوا گڈریا اپنے گلے کی حفاظت کر رہا ہے؛ گلے میں ایک بھیڑ اپنے میمنے کو دودھ پلا رہی ہے اور دو مینڈھے ایک دوسرے سے سر ٹکرا رہے ہیں؛ دو خیمے ہیں، جن میں کئی عورتیں ہیں: ان میں سے ایک عورت چرخہ کات رہی ہے؛ ایک نوجوان بہتی ندی میں سے ایک برتن میں پانی بھر رہا ہے؛ ایک کسان آہستہ آہستہ اپنے ہل کے پیچھے چلا جا رہا ہے، جس میں بیل جتے ہیں اور ساتھ ساتھ ایک درویش سے باتیں بھی کر رہا ہے، جو ایک اونچے درخت کے نیچے بیٹھا ہے۔ سیدھے سادے لوگوں کی روزمرہ زندگی میں مصور نے جو دلچسپی لی ہے اور درختوں، پھولوں، پرندوں اور جانوروں کی تصویر میں ان کی فطری صورت میں جس شوق اور اہتمام سے بنائی ہیں، پھر کم سے کم رنگوں اور ان کی ہلکی ہلکی جھلکیوں کی مدد سے خاکہ بنانے میں جس طرح نازک خطوط سے کام لیا ہے، ان سے ہمیں ایسے سراغ مل جاتے ہیں جن سے کام لے کر ہم مصور مذکور کی اسی اسلوب کی ان تمام تصاویر کو پہچان سکتے ہیں جن پر اس کا نام درج ہے۔ ان میں حسب ذیل تصاویر قابل ذکر ہیں: (۱) رقص صوفیہ (اس پر دستخط موجود ہیں) اور شاہ عباس اعظم کی ایک پرانی مہر ثبت ہے۔ آجکل یہ تصویر فریئر گیلری آف آرٹ، واشنگٹن عدد ۵۰ و ۴۶، شکل ۱) میں ہے؛ (۲) ایک نوجوان درویش برچھا لیے ہوئے ہے، دستخط شدہ (؟)، انڈیا آفس لائبریری کے (عکس در J. V. S. Wilkinson، L. Binyon و B. Gray: Persian Miniature Painting، لنڈن ۱۹۳۳ء، ص ۱۳۱، عدد ۱۸۷، لوح ۹۹)؛ (۳) ایک اور مرکب تصویر، جس میں ایک سوار شہزادے کو اس کے ملازمین کے ساتھ اور کسانوں کی ایک جماعت کو دف اور ڈھول کی گت پر بیلچے لہراتے ہوئے ناچتے دکھایا گیا ہے۔ یہ تصویر آجکل لینن گراڈ کے عجائب خانہ ہرمیٹیج (Hermitage Museum) میں محفوظ ہے (عکس در F. N. Martin: *The Miniature Paintings and Painters of Persia, India and Turkey*، لنڈن ۱۹۱۲ء، ج ۲، لوح ۱۵۲)؛ (۴) ”بیلچہ بردار نوجوان“، یہ بھی انڈیا آفس لائبریری کے ذخیرۂ جانسن میں ہے (J.V. S. Wilkinson: *Some Persian*

Drawings in the Johnson Albums at the India Office, London، در *Ars Islamica*، ج ۱۵، ۱۶، ۱۹۵۱ء، ص ۱۳۳ و شکل ۵ چپ)۔ تصاویر کے دوسرے مجموعے میں زیادہ تر درباری موضوعات ہیں۔ ان میں سے ایک یا دو لڑکوں کی مکمل رنگین تصویریں قابل ذکر ہیں، جنھوں نے شاہ عباس کے دور کی وضع کے مطابق بڑا طرحدار لباس پہن رکھا ہے۔ ایک ممتاز مثال وہ تصویر ہے جس میں ایک نوجوان کو پتلے سے عصا کے سہارے ذرا جھکا ہوا اور ایک چھوٹا سا پیالہ لیے ہوئے استادہ دکھایا گیا ہے۔ اس پر ایک قدیم تحریر درج ہے، جس میں اسے مصور مذکور سے منسوب کیا گیا ہے۔ آجکل یہ فریئر گیلری آف آرٹ، واشنگٹن (عدد ۷، ۳۳، شکل ۲) میں ہے (عکس در A. D. Coomaraswamy: *Orinetaun de la Collection Gloubewlan Museum of Fine Arts de Boston*، Paris-Brauxelles ۱۹۲۹ء، لوح ۲۲ راست)۔ اسی دوسرے اسلوب میں کتاب میں ایک نوجوان کی تشبیہ کی نقل، سترھویں صدی کے مشہور مصور رضائے عباسی کے ھاتھوں کی بنائی ہوئی آتی ہے، جو اپنے سرنامے کی رو سے استاد محمدی کی تصویر کو دیکھ کر بنائی گئی تھی (Martin: کتاب مذکور، ج ۲، لوح ۱۱۰، مرکز)۔ عجائب خانہ بوسٹن میں ایک اور کثیر الاشکال تصویر بھی موجود ہے، جس کی قدیم عبارت انتساب مؤخرالذکر طرز سے ملتی جلتی ہے۔ اس میں ایک شاہی بزم نشاط کو پیش کیا گیا ہے (Coomaraswamy، کتاب مذکور، لوح ۲۴)۔ اگر یہ اور اس دوسرے اسلوب اور مؤخر زمانے کی تصاویر فی الواقع محمدی کی تخلیق ہیں تو ان دو اسلوبوں کے درمیان ایک تعلق قائم کیا جا سکتا ہے، جو ایک ہی بزم نشاط کی دو مختلف تصاویر میں ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو ہوفر P. Hofer کے مجموعے میں شامل تھی اور اب کلیولینڈ کے عجائب خانۂ فن (Cleveland Museum of Arts) میں موجود ہے اور دوسری پیرس کے کتاب خانۂ ملی (Bibliotheque Nationale) میں ہے۔ یہ تعلق اس اعتبار سے قائم کرنا ممکن ہے کہ ان دو تصویروں میں درباری اور دیہاتی زندگی کے موضوعات کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ خطوط زیادہ نازک، معنی خیز اور مستقیم ہیں اور رنگوں سے مقابلۃً زیادہ واضح طور پر کام لیا گیا ہے۔

کئی دوسری تصاویر یا خاکے انہیں دو اسلوبوں کے حامل اور اسی بنا پر ماضی میں محمدی سے منسوب کیے جاتے رہے ہیں جیسا کہ گرے اور ولکنسن نے صحیح طور پر پُر زور الفاظ میں کہا ہے کہ ان "منسوبات" کو انتہائی احتیاط سے پرکھنا چاہیے کیونکہ دوسرے مصوروں نے بھی بلا وجہ ان اسلوبوں کی نقل کی ہے (دیکھیے جدید ترین تنقید از Wilkinson: کتاب مذکور، ص ۱۳۲، ۱۳۳).

مصور مذکور کی ایک تصویر بوسٹن کے عجائب خانہ فنون لطیفہ (Museum of Fine Arts) میں محفوظ ہے، جو ایک قدیم تحریر میں اس سے منسوب کی گئی ہے (دیکھیے کمارسوامی: کتاب مذکور، لوح ۲۳)۔ کمار سوامی اور باسل گرے نے اسے مصور کے اپنے ھاتھوں کھینچی ہوئی تصویر تسلیم کیا ہے۔ اس مصور کے بارے میں کوئی "تنقیدی مطالعہ" ابھی تک شائع نہیں ہوا.

مآخذ: متن مقالہ میں درج ہیں:

(RICHARD ETTINGHAUSEN)

* **المحمدی**: المحمدیہ (الطریقہ) رک بہ درد، ناصر عندلیب.

* **محمدی صاحبزادہ بن محمد عمر چمکنی**: رک بہ چمکنی میاں عمر.

المحمدیہ : متعدد دبستانوں کا نام ، بالخصوص انتہا پسند شیعی محمدیہ، جیسا کہ کیسانیہ [رک بآں] کی مثال سے ظاہر ہے : زمانۂ قدیم میں بعض اہل تشیع نے امامت کو ان کی طرف منتقل کردیا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بیٹی حضرت فاطمہؓ کی اولاد میں سے نہ تھے اور اس کے بعد امامت ان لوگوں میں منتقل ہو گئی جو علوی بھی نہ تھے : چنانچہ منصوریہ فرقے کے لوگ ایک ایسے ہی شخص ابو منصور العجلی کو امام مانتے تھے ، جسے حاکم عراق یوسف بن عمر الثقفی نے خلیفہ ھشام کے زمانے میں ، یعنی ۱۲۵ھ/۷۴۳ء سے بھی قبل، قتل کرا دیا تھا ۔

ابو منصور نے، جسے امام جعفر الصادقؒ نے غلو کی بنا پر رد کردیا تھا، علویوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے رجحانات کو اور زیادہ ترقی دی ۔ وہ کہتا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاندان عرش معلی ہے ، شیعی زمین اور وہ خود عرش کا ایک ٹکڑا ہے جو زمین پر آگرا ہے ، جس کا ذکر سورۃ ۵۲ [الطور] آیۃ ۴۴ میں ہے کیونکہ اسے خود اللہ نے چھوا ہے اور عرش معلی کی ایک سیر میں اس کی تعلیم فرمائی ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے مذہبی قوانین کو منسوخ کر دیا تھا ۔ اس کی موت کے بعد ایک گروہ تو حسینیہ کہلایا، جو اس کے بیٹے الحسین کو امام تسلیم کرتا تھا اور دوسرا گروہ محمدیہ تھا ۔ یہ امام محمد (النفس الزکیۃ) بن عبداللہ بن الحسن بن الحسین بن علیؓ بن ابی طالب کا معتقد تھا، جو ۱۳۵ھ/۷۶۲ء میں مدینے میں عباسی خلیفہ المنصور کے لشکر کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے ۔ محمدیہ نے پھر کسی علوی کو امام تسلیم کرنے کے لیے ابو منصور کا ایک مبینہ وصیت نامہ پیش کیا اور اس میں مفصلہ ذیل ترتیب امامت ہے، یعنی امام محمد باقر حسینی کی وصیت بحق ابو منصور ، اور اس کی وصیت بحق محمد بن عبداللہ حسنی کا مقابلہ سلسلۂ یہود سے کیا ، جس میں پہلے حضرت موسیٰؑ، پھر یوشع بن نون، پھر ابنائے ہارون آتے ہیں (مراد متأخر امامت سے ہے) ۔ یہ ترتیب دونوں صورتوں میں اس لیے منتخب کی گئی کہ دو بھائیوں کی نسلوں (بطنان) میں تصادم پیدا نہ ہو ۔ بہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ آیا محمدیہ نے کوئی مستقل فرقہ بھی قائم کیا یا نہیں ۔ اس نام سے تو صرف یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ النفس الزکیۃ کا اثر و رسوخ وسیع تھا اور جن کی طرف تمام اہل تشیع حتی کہ وہ شیعی بھی جو حسینی گروہ سے متعلق تھے ، رجوع کر گئے اور اس کے علاوہ مغیریہ فرقے کے افراد نے بھی اگر اور کچھ نہیں تو اپنی دلی دعاؤں سے النفس الزکیۃ کی حمایت و تائید کی ۔ مغیریہ فرقہ کے افراد مغیرہ بن سعید کے پیرو تھے، جسے ۱۱۹ھ/۷۳۷ء میں یوسف بن عمر کے پیشرو خالد بن عبداللہ القسری نے غالباً جابر بن عمر یزید الجعفی کی قیادت میں ھلاک کر دیا تھا ۔

اس گروہ سے بالکل ھی مختلف ایک انتہا پسند اسلامی فرقہ محمدیہ بھی ہے، جو میمیہ کہلاتا ہے ۔ ان کا نام اس عقیدے کی وجہ سے مشہور ہوا کہ وہ عُیانیہ یا عَینیہ کے مقابلے ، میں جو [نعوذ باللہ] حضرت علیؓ کی خدائی کے قائل تھے ، آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو [نعوذ باللہ] خدا مانتے تھے ۔ اس فرقے کا سب سے بڑا نمائندہ الفیاض بن علی تھا، جو ۲۷۹ھ/۸۹۲ء اور ۲۸۹ھ/۹۰۲ء کے مابین سزائے موت پا کر کیفر کردار کو پہنچا ۔

خارجیہ محمدیہ ایک علیحدہ فرقہ تھا، جو خالصۃً خارجی گروہ عجاردہ کا ایک ذیلی فرقہ تھا، یہ ایک شخص محمد بن زُرق کے پیرو تھے ۔

مآخذ: (۱) الاشعری: مقالات الاسلامیین، ص ۱ ببعد، طبع H. Ritter، قسطنطینیہ ۱۹۲۹ء، ۱ : ۸ ببعد، ۲۰۰، ۲ : البغدادی: الفرق بین الفرق، قاہرہ ۱۳۲۸ھ، ص ۲۳ ببعد، ۲۱۶ ببعد، ۲۳۳ ببعد؛ (۳) ابن حزم: الفصل فی الملل، قاہرہ ۱۳۱۷ھ تا ۱۳۲۱ھ، ۴ : ۱۸۶ ببعد؛ (۴) الایجی: مواقف، طبع Soerensen، لائپزگ ۱۸۴۸ء، ص ۳۵۳ ببعد؛ (۵) المسعودی: مروج الذہب، طبع B. de Meynard، بمدد اشاریہ؛ (۶) J. Friedlander: *The Heterodoxies of the Shi'ites*، در *JAOS*، ج ۲۸ و ۲۹، بمدد اشاریہ؛ (۷) Th. Haarbrucker (الشہرستانی کی تصنیف [الملل والنحل] م): *Religionsparteien und Philosophenschulen*، ۲ : ۴۰۹۔

(R. Strothmann)

* **مُحَمَّرَہ**: خلیج فارس کے دہانے پر ایک شہر اور بندرگاہ کا نام، جو ایران کے صوبۂ عربستان میں واقع ہے۔ یہ رود حفّار (جو پہلے نہر بیان کہلاتی تھی) کے دائیں کنارے آباد ہے، جو دریائے کارون کو شط العرب سے ملاتی ہے۔ وہ قدیم گاؤں، جس نے اس شہر کی شکل اختیار کر لی، بظاہر رود حفار کے بائیں کنارے پر آبادان [رک بآں] کے جزیرے میں واقع تھا اور اس لیے محمرہ وہ شہر نہیں ہو سکتا جسے "بیان" کہتے تھے، گو اب یہ اسی جگہ پر آباد ہے۔ اس کے علاوہ جغرافیہ نگار بیان کے شہر کو عراق عرب میں شامل کرتے تھے حالانکہ محمرہ، جو آبادان کے جزیرے میں واقع ہے، ایران کا ایک حصہ تھا، یہاں تک کہ دریا کا راستہ بدل جانے کی وجہ سے یہ ایران اور ترکیہ کے درمیان نزاع کا باعث بن گیا۔ ارزروم کے عہد نامے (۱۸۴۷ء) کے مطابق یہ شہر ایران کے حوالے کر دیا گیا، لیکن اگرچہ یہاں شوستر کے صدر مقام سے حکومت ہوتی تھی، تاہم یہ شہر حقیقت میں چعب (یا کعب) قبیلے کے شیخ کے زیر نگین رہا، جو شیعی مذہب کا پیرو تھا۔ اس حقیقت سے کہ عرب جغرافیہ نگار اس شہر کو بالخصوص اس کے موجودہ نام کو نظر انداز کر جاتے ہیں (بیان کے حوالوں کے متعلق دیکھیے G. Le Strange)۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہ مقام (مُحرزی؟) یا تو بہت کم اہمیت رکھتا ہوگا یا مقابلۃً حال ہی کے زمانے میں معرض وجود میں آیا ہوگا۔ آج کل اس بندرگاہ کو ایران کی تجارت میں خاص اہمیت حاصل ہے اور یہاں کا بڑا سامان تجارت کھجوریں ہیں، تاہم نیل کی تجارت بھی ہوتی ہے۔

مآخذ: (۱) G. Le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate*، ص ۴۸؛ (۲) S. H. Longrigg: *Four Centuries of Modern Iraq*، بمدد اشاریہ؛ (۳) H. G. Rawlinson: *Notes on Mohamrah and the Cha'ab Arabs*، در *P R G S.*، ۱۱ : ۳۵ ببعد؛ (۴) یاقوت: معجم، ۲ : ۹۰۵۔

(R. Levy)

تصحیحات

جلد (۱۹)

صفحہ	عمود	سطر	خطا	صواب
۳	۱	۶	پر نہ آ جائے	پر آ جائے
۵	۲	۸	جکھڑے	جھگڑے
۱۹	۱	۹	شکایات	شکایت
۲۰	۱	۱۸	اپنی	اپنی
۲۸	۱	۲۱	توفا	الوفا
۳۸	۲	۱۶	اسلام	سلام
۲۹	۱	۴	یعلمُ	یَعْلَمْ
۳۰	۱	۸	تھا کہ اس کے	کہ ساکے
۳۷	۱	۷	نے ابن دغنہ نے	ابن دغنہ نے
۳۹	۱	۲۶	کے پاس بھیجا	کے پاس پیغام بھیجا
۴۰	۱	۶	ابقان	ایقان
۵۴	۱	۸	میہ بنو ہوازن	بنو ہوازن
۵۸	۲	۱	علمدرآمد	عملدرآمد
۶۱	۲	۱۶	نکال دیا گیا۔	نکال دیا
۶۶	۱	۲۴	گئی ہے۔	گئی
۶۸	۱	۲	جسم مبارک سے ایسی	جسم مبارک ایسی
۷۱	۱	۲۶	کے	کی
۷۴	۱	۲۴	فرض کے خلاف ورزی	فرض کی خلاف ورزی
۷۵	۱	۴	الکتٰب	الکِتٰبَ
۷۶	۲	۱۸	ھیں	میں
۷۷	۲	۸	صاحبھا	صاحبہ
۸۵	۱	۲۵	چلنے اور	چلنے کا حکم دیا گیا اور
۸۹	۱	۲۷	شائتع	شائع
۹۴	۱	۱۰	بنیک	نیک
۹۶	۱	۲۶	اس وقت کپڑے	اس وقت تک کپڑے

صفحہ	عمود	سطر	خطا	صواب
۹۹	۱	۱۹	وسلم رمضان المبارک	وسلم کا رمضان المبارک
۱۰۱	۲	۲۰	لا الہ اللہ	لا الٰہ الّا اللہ
۱۰۳	۱	۲۲	دشمنوں کی	دشمنوں سے
۱۰۳	۱	۲۴	کے پوری	کے ساتھ پوری
۱۰۷	۱	۲	اللہُ	اللہ
۱۰۷	۱	۷	یُحِببکُم	یحببکم
۱۰۸	۱	۱۳	بجز اس کے کوئی	بجز اس کے کہ کوئی
۱۲۶	۱	۶	کو	تو
۱۲۷	۱	۲۱	رءوف	رءوف
۱۲۷	۱	۲۴	رحمۃ	رحمۃ
۱۳۵	۱	۲۰	ان کے لیے میں دعائے خیر	ان کے لیے دعائے خیر
۱۳۷	۱	۲۳	پہنوچانا	پہچانا
۱۳۹	۲	۱۱	المزا	المزاح
۱۴۰	۱	۶	جبو	جبھو
۱۴۲	۲	۳۹	اسل	اسال
۱۵۰	۱	۱۷	صعمعہ	صعصعہ
۱۵۲	۱	۲۴	مقتون	مفتون
۱۵۲	۲	۲۷	کانٹی	کانٹے
۱۵۶	۱	۲۲	ملوظ	ملحوظ
۱۵۷	۲	۳	وصلم	وسلم
۱۵۷	۲	۳، ۴	عمرو بن وهب الجمحی	عمیر بن وهب الجمحی
۱۵۸	۱	۲۱	رہ	راہ
۱۵۸	۱	۳۱	زیاد	زیادہ
۱۵۹	۱	۳۱	سوم اس کے لیے	سوم ، اس لیے
۱۷۵	۱	۳۲	گاڑی	گاڑھی
۱۸۱	۲	۳۰	ٹیلے عقب سے نمودر	ٹیلے کے عقب سے نمودار
۱۸۲	۱	۶	روشناس	روشناس کرایا
۱۸۲	۲	۸	عتبہ	شیبہ
۱۹۳	۲	۱۶	فرادی	افرادی
۱۹۵	۱	۲۲	سے	کا

صفحہ	عمود	سطر	خطا	صواب
۱۹۸	۲	۳	شرح الموھب	شرح المواھب
۲۰۱	۲	۲۷	کو	کر
۲۰۳	۱	۱۷	تعین	متعین
۲۰۹	۱	۷	کی سرکوبی	ان کی سرکوبی
۲۱۲	۲	۲۷	القسطلانی	القسطلانی
۲۱۳	۱	۱۳	الذین	الذین
۲۱۷	۱	۱۰	ہ	ھ
۲۳۲	۱	۱۰	سے	کے
۲۳۳	۲	۳	کاع صحیح	کا صحیح
۲۵۰	۲	۱۹	السفیہ	السفیہ
۲۵۶	۲	۲۱	ناقص	نقص
۲۶۳	۱	۱	سرۃ	سورۃ
۲۶۵	۱	۳	تناقض	تناقض
۲۶۶	۱	۹	جب وہ وہ لوگ	جب وہ لوگ
۲۶۸	۱	۸	لازل	نازل
۲۶۹	۲	۳	کُلّہ	کُلّہ
۲۷۰	۱	۱۵	بقوم	بقوم
۲۷۱	۱	۱۲	اُوتُوا العلم	اُوتُوا العلم
۲۷۳	۲	۳۱	ان کو حق	ان کا حق
۲۷۳	۱	۲۷	جلودھم	جلودھم
۲۷۵	۲	۲۵	ایزی	ایزدی
۲۸۲	۱	۲۷	بارے میں کی اطلاع	بارے میں اطلاع
۲۸۹	۲	۲۶	سحر مستمر	سحر مستمر
۲۸۹	۲	۳۰	انشاق	انشقاق
۲۹۱	۲	۱۷	بقول	یقول
۲۹۳	۲	۱۶	زبہ	زبد
۲۹۵	۲	۲۸	کا	کے
۳۰۱	۲	۱	کو	کی
۳۱۰	۲	۱۲	القرات	الترات
۳۳۲	۲	۲۶	بڑھا کر دیا	بڑھا دیا
۳۳۳	۲	۱۲	بڑی	بڑھی

صفحہ	عمود	سطر	خطا	صواب
۳۳۸	۱	۱۹	قرآن مجید احادیث صحیحہ	قرآن مجید اور احادیث صحیحہ
۳۳۸	۲	۲۸	توصل	توسّل
۳۳۹	۱	۸	الا للہ	الا اللہ
۳۳۹	۱	۳۱	الجاھیلہ	الجاھلیۃ
۳۴۰	۱	۱۵	المکلل	المکلل
۳۴۳	۱	۲۳	اڑ	بڑھ
۳۴۵	۲	۱۶	النسابہ	انساب
۳۵۲	۱	۳۲	۱۱۸ء	۱۱۱۸ء
۳۵۲	۲	۲۶	قمل	قتل
۳۵۷	۲	۳	معسی	موسیٰ
۳۶۳	۲	۱۹	ھید	میں
۳۶۸	۱	۸	دے اور	دے دیے اور
۳۷۸	۱	۱۰	نکتہ نظر	نقطۂ نظر
۳۸۳	۱	۱۰	سن ۱۰۸۱ھ حج	۱۰۸۱ھ میں حج
۳۸۴	۱	۲۶	ہو برتاؤ	ہر برتاؤ
۳۸۵	۱	۱۱	تلحخیص	تلخیص
۳۸۶	۱	۹	تعلیم و ترییب	تعلیم و تربیت
۳۸۶	۱	۱۳	اسفحان	اصفہان
۳۸۶	۱	۲۵	ذیل کا نام	ذیل کے نام
۳۸۷	۲	۱۴	تصف و تالیف	تصنیف و تالیف
۳۸۸	۲	۸	بھی میں طبع	بھی طبع
۳۸۹	۱	۳	جمادی ۹۸۱	جمادی الآخرۃ ۹۸۱ھ
۳۹۸	۱	۳۲	ڈالنے	ڈال
۴۱۰	۲	۲۵	مسجمع	مسجّع
۴۱۱	۱	۲۰	جنون	جنوں
۴۲۰	۱	۱۴	لعد اول	نعیما (جلد اول) ،
۴۲۳	۲	۲۳	تصیح	تصحیح
۴۲۶	۱	۸	جامعہ	جامہ
۴۳۳	۱	۱۷	عالم	علم
۴۳۷	۲	۱۲	ترقمیہ	تراجمہ
۴۳۹	۱	۲۳	محمدثین	محدثین
۴۴۰	۱	۸	مہدی، منکرین مہدی کو	[illegible] منکرین مہدی کو

صفحہ	عمود	سطر	خطا	صواب
٣٣٢	١	١٣	ورع	ورع
٣٣٣	٢	١٧	روائح	روائح
٣٣٥	١	١٨	القراء	الفراء
٣٣٦	٢	٢٨	*Illastrated*	*Illustrated*
٣٣٨	١	٢٩	الوقائع	الوقائع
٣٥١	٢	٩	الاسناد	الاستاذ
٣٥١	٢	١٢	شتخ	شیخ
٣٥١	٢	١٣	پروی شبھ	پروری شبدے
٣٥٢	١	٢٣	فائض	فائز
٣٥٣	١	٩	المحسن الملک	محسن الملک
٣٥٣	١	٢٩	کے نام شایع	کے نام سے شائع
٣٦٠	١	١٢	جلفین	جاذیں
٣٦٠	٢	٦	*Syria*	*Syrian*
٣٦٠	٢	١٣	*Aggpten*	*Agypten*
٣٦٨	٢	٢١	کر دے فیصلہ	کردے کا فیصلہ
٣٦٩	١	٢٩	اصطلاحات	اصلاحات
٣٧٢	١	٢٧	ایوارڈ نا	ایوارڈ ہو یا
٣٧٣	٢	١٨	مجبور ہوئی پڑا	مجبور کر دیا
٣٧٣	٢	٣٠	کے قابل قبول	کے لیے قابل قبول
٣٧٣	٢	٦	دوبارہ	دو بار
٣٧٨	١	١٣	١٩٢٠ء	١٩٣٧ء
٣٨٠	١	٢٣	انتخابی	انتخابات
٣٨٧	١	٦	Athiest	Atheist
٥٠٠	١	١٩	تھی	ہوئی تھی۔

فہرست عنوانات

جلد ۱۹

عنوان	صفحہ
(حضرت) محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم	۱
نسب	۳
ولادت	۱۲
رضاعت	۱۶
نوعمری	۱۹
شباب	۲۳
ریاضت	۲۷
بعثت	۲۸
دعوت و تبلیغ	۳۰
قریش کی ایذا رسانی	۳۱
ہجرت حبشہ	۳۶
مقاطعۂ قریش	۳۷
عام الحزن	۳۸
اسراء و معراج	۳۹
ہجرت مدینہ	۴۲
اجتماعی اور سیاسی تنظیم	۴۳
غزوات	۴۶
فتح مکہ	۵۲
آنحضرتؐ اور یہود	۵۳
آنحضرتؐ اور عرب قبائل	۵۸
بیرون عرب تبلیغ	۶۰
حجۃ الوداع	۶۲
وفات اقدس	۶۴
جانشینی	۶۹
اسوۂ حسنہ	

عنوان	صفحہ
دینی تعلیم	۷۱
عبادات	۷۲
تعمیل و تنظیم	۷۳
ازواج مطہرات	۸۶
اولاد و احفاد	۸۷
تعلیقات :	
شمائل و اخلاق نبوی	۸۹
آنحضرتؐ بحیثیت مبلغ	۱۳۷
میثاق مدینہ	۱۵۹
معاہدات عہد نبوی	۱۶۶
غزوات نبوی	۱۷۳
عہد نبوی میں نظم و نسق مملکت	۲۱۳
رسول اکرمؐ بطور مقنن	۲۲۲
آنحضرتؐ بحیثیت خطیب	۲۳۳
خواتین کے حقوق حضورؐ کی تعلیمات میں	۲۴۱
معجزات نبوی	۲۵۳
ماخذ	۳۰۳
محمد (سورۃ)	۳۰۴
محمد بن ابراہیم : رک بہ ابوالحسن	۳۱۲
محمد بن ابراہیم عادل شاہ	۳۱۵
محمد بن ابوبکر	۳۱۶
محمد بن ابوبکر : رک بہ ابن قیم الجوزیہ	
محمد بن ابی [illegible]	۳۱۷
محمد بن ابو [illegible] : رک بہ [illegible] الاسعد	۳۲۰
محمد بن ابی ال[illegible]	[illegible]

عنوان	صفحہ
محمد بن ابی عامر : رک به المنصور بن ابی عامر	۳۱۸
محمد بن ابی القاسم : رک به ابن ابی دینار	۳۱۸
محمد بن ابی محمد : رک به بن ظفر	۳۱۸
محمد بن احمد : رک به (۱) ابن عقبی ؛ (۲) ابن ایاس ؛ (۳) ابن رشد	۳۱۸
محمد بن ادریس : رک به الشافعی	۳۱۸
محمد بن اسحق : رک به (۱) ابن اسحق ؛ (۲) الندیم	۳۱۸
محمد بن اغلب : رک به اغالبه	۳۱۸
محمد بن الیاس : رک به الیاسیه	۳۱۸
محمد بن انوشتگین : رک به خوارزم شاه	۳۱۸
محمد بن بقیه بن علی : رک به ابن بقیه	۳۱۸
محمد بن تغلق : رک به محمد تغلق	۳۱۸
محمد بن تکش : رک به خوارزم ، خوارزم شاه	۳۱۸
محمد بن تومرت : رک به ابن تومرت	۳۱۸
محمد بن جریر الطبری: رک به الطبری، ابو جعفر	۳۱۸
محمد بن الجزری : رک به ابن الجزری	۳۱۸
محمد بن حبیب : رک به ابن حبیب	۳۱۸
محمد بن الحسن : رک به (۱) ابن درید ؛ (۲) ابن حمدون ؛ (۳) الشیبانی	۳۱۸
محمد بن حسین	۳۱۸
محمد بن الحسین : رک به (۱) ابوالحسن ؛ (۲) ابو [illegible] (۳) ابن مقلة ؛ [illegible] الشریف الرضی	۳۱۹
محمد بن الحنفیہؒ	۳۱۹
محمد بن داؤد : رک به (۱) ابن اجروم ؛ (۲) الاصفہانی	۳۲۱
محمد بن دشمن زیار : رک به کاکویه (بنو)	۳۲۱
محمد بن رائق : رک به ابن رائق	۳۲۱
محمد بن رزین : رک به ابوالشیص	۳۲۱
محمد بن سالم : رک به ابن واصل	۳۲۱
محمد بن سعد : رک به (۱) ابن مردنیش ؛ (۲) ابن سعد	۳۲۱
محمد بن مسعود : رک به غوری (خاندان)	۳۲۱
محمد بن مسعود : (صحیح مسعود بن محمد)	۳۲۱
محمد بن سیرین	۳۲۱
محمد بن طاهر : رک به القیسرانی	۳۲۲
محمد بن طغج	۳۲۲
محمد بن عباس : رک به قاجار	۳۲۷
محمد بن عبداللہ : رک به (۱) ابن الابار ؛ محمد ابن الخطیب ؛ (۳) ابن مالک	۳۲۷
(۴) بن عبداللہ	۳۲۷
محمد بن عبداللہ حسان	۳۳۱
محمد بن عبدالرحیم : رک به ابن الفرات	۳۳۵
محمد بن عبدالمالک : رک به (۱) ابن طفیل ؛ (۲) ابن زهر	۳۳۵
محمد بن عبدالمالک (ابن الزیات)	۳۳۵
محمد بن عبدالوهاب	۳۳۵
محمد بن عبداللہ : رک به ابوالمعالی	۳۴۰
محمد بن عثوان : رک به ابوزیان اول	۳۴۰
محمد بن علی : رک به (۱) الجواد الاصفہانی ؛ (۲) ابن العربی ؛ (۳) ابن عساکر ؛ (۴) ابن بابویه ؛ (۵) ابن الطقطقی ؛ (۶) ابن وحشیه	۳۴۰
محمد بن علی (ابو جعفر باقرؒ)	۳۴۰
محمد بن علی الرضاؒ	۳۴۱
محمد بن عمر : رک به ابن القوطیه	۳۴۵
محمد بن عمار : رک به ابن عمار	۳۴۵
محمد بن عیسی : رک به ابن عیساویه	۳۴۵
محمد بن فرامرز : رک به خسرو ملا	۳۴۵
محمد بن القاسم الثقفی	۳۴۵
محمد بن القاسم : رک به (۱) ابوالعیناء ؛ (۲) الانباری	۳۴۸

عنوان	صفحه
محمد بن محمد: رک به (۱) ابو علی؛ (۲) ابوالوفاء؛ (۳) الغزالیؒ؛ (۴) ابن عاصم؛ (۵) ابن بطوطه؛ (۶) ابن جهیر؛ (۷) ابن الہباریه؛ (۸) ابن نباته؛ (۹) عماد الدین	۳۴۸
محمد بن محمود	۳۴۸
محمد بن مروان	۳۴۹
محمد بن المستنیر : رک به قطرب	۳۵۰
محمد بن المظفر : رک به مظفر	۳۵۰
محمد بن مکرم : رک به ابن منظور	۳۵۰
محمد بن ملک شاه	۳۵۰
محمد بن موسی بن شاکر : رک به موسی (بنو)	۳۵۲
محمد بن الولید : رک به ابن ابی زندقه	۳۵۲
محمد بن هانی : رک به ابن هانی	۳۵۲
محمد بن الهذیل : رک به ابوالهذیل	۳۵۳
محمد بن یاقوت	۳۵۳
محمد بن یحیی : رک به ابن باجه	۳۵۴
محمد بن یزید : رک به (۱) ابن ماجه؛ (۲) المبرد	۳۵۴
محمد بن یوسف : رک به ابو حیان	۳۵۴
محمد اول تا سوم : رک به (بنو) معاویه	۳۵۴
محمد اول (بهمنی)	۳۵۴
محمد دوم	۳۵۴
محمد سوم (لشکری)	۳۵۵
سلطان) محمد اول	۳۵۶
(سلطان) محمد دوم	۳۵۸
سلطان) محمد سوم	۳۶۲
(سلطان) محمد چهارم	۳۶۳
(سلطان) محمد پنجم	۳۶۵
(سلطان) محمد ششم	۳۶۶
محمد ابو احمد	۳۶۷
محمد آزاد : رک به بیدر	۳۶۸
محمد احمد بن عبدالله	۳۶۸
محمد اسحاق خان (هزاره)	۳۷۱
محمد اسعد : رک به اسعد افندی احمد	۳۷۲
محمد اسعد : رک به غالب دده	۳۷۲
محمد اسماعیل بن عبدالغنی الشهید : رک به اسمعیل شهید، شاه	۳۷۲
محمد اعلی تهانوی	۳۷۲
محمد الیاس	۳۷۳
محمد امین، میر: رک به برهان الملک سعادت خان	۳۷۵
محمد انور شاه (سید)	۳۷۵
محمد ایوب خان : رک به پاکستان	۳۷۸
محمد باقر مجلسی	۳۷۸
محمد بختیار خلجی	۳۸۷
محمد بقاء	۳۸۷
محمد بوٹا : رک به میاں محمد بوٹا	۳۸۷
محمد بے ابو ذهب : رک به علی بے	۳۸۷
محمد بے عثمان الجلال	۳۸۷
محمد بیرام	۳۸۸
محمد پاشا : رک به (۱) محمد داماد پاشا؛ (۲) محمد گرجی پاشا؛ (۳) قره مانی، محمد پاشا؛ (۴) صوقوللی	۳۹۲
محمد پاشا : رک به قره مانی محمد پاشا	۳۹۲
محمد پاشا الماس	۳۹۲
محمود پاشا بالطه جی	۳۹۲
محمد پاشا قریاکی	۳۹۳
محمد پاشا، روم	۳۹۴
محمد پاشا، سلطان زاده	۳۹۵
محمد پاشا صوقوللی : رک به صوقوللی	۳۹۶
محمد پاشا قره مانی : رک به قره مانی محمد پاشا	۳۹۹

عنوان	صفحه
محمد پاشا لالا	۳۹۶
محمد پاشا یگن	۳۹۷
محمد تغلق	۳۹۸
محمد تقی بہار	۴۰۱
محمد ثالث	۴۰۳
(ملک) محمد جائسی	۴۰۶
میرزا محمد جعفر قراجه داغی	۴۰۷
محمد جمال حافظ ملتانی	۴۰۸
محمد جمال الدین القاسمی	۴۰۹
ملا محمد حسن براہوئی	۴۱۱
محمد حسن خان	۴۱۲
محمد حسین بٹالوی (مولوی)	۴۱۳
محمد حسین پیر مراد	۴۱۶
محمد حسین تبریزی	۴۱۶
محمد حسین گیسو دراز : رک به گیسو دراز	۴۱۷
محمد حیات سندھی	۴۱۷
نواب محمد خان جوگزئی	۴۱۸
محمد خلیفه : رک به محمد بن حسین	۴۱۹
محمد داماد پاشا	۴۱۹
محمد درفشان شنے	۴۲۰
محمد دین فوق	۴۲۰
محمد رضا سید	۴۲۱
(شاہ) محمد رمضان شہید	۴۲۶
محمد رؤف	۴۲۸
محمد زاہد الہروی	۴۲۹
محمد زعیم	۴۳۱
محمد سلیمان تونسوی چشتیؒ	۴۳۲
محمد سلیمان سلمان ، قاضی (منصور پوری)	۴۳۵
محمد شاہ	۴۳۶
محمد شاہ اول	۴۳۶
محمد شاہ بہمنی : رک به محمد اول تا ثالث	[illegible]

عنوان	صفحه
محمد شریف النجفی	۴۳۷
محمد شفیع لاہوری	۴۳۷
محمد صدیق نقشبندی مستولگی	۴۳۸
محمد طاہر پٹنی	۴۳۹
(قاضی) محمد عاقل	۴۴۱
مفتی ، سید محمد عباس	۴۴۳
محمد عبدالکریم (منشی)	۴۴۵
محمد عبده (مفتی)	۴۴۷
محمد عطاء بے	۴۵۳
محمد علی بن مظفرالدین : رک به قاچار	۴۵۳
محمد علی پاشا	۴۵۳
محمد علی جناح ، قائد اعظم	۴۶۱
محمد علی جوہر ، رئیس الاحرار	۴۹۲
محمد عمر جان چشموی	۴۹۷
محمد عمر دین پوری	۴۹۸
(قاضی) محمد عیسی خان	۴۴۹
محمد غوث گوالیاریؒ	۵۵۰
(شاہ) محمد غوث لاہوریؒ	۵۰۱
(مولانا) محمد فاضل درخانی	۵۰۳
(مولانا) محمد قاسم نانوتویؒ	۵۰۳
محمد قلی قطب شاہ	۵۱۰
محمد کاظم بن محمد امین	۵۱۲
محمد کرد علی	۵۱۲
کپرولو : رک به کوپریلی	۵۱۵
محمد گورجی پاشا	۵۱۵
محمد کانا پاشا : رک به محمد پاشا کاکا	۵۱۷
محمد کاکا زاری	۵۱۷
محمد کالہ زاری	۵۱۷
محمد لکھوی	۵۱۷
محمد محسن ، الحاج	۵۲۰
محمد مرتضی الزبیدی	۵۲۱

عنوان	صفحہ
محمد معزالدین	۵۲۲
محمد معصوم، شیخؒ	۵۲۳
محمد معصوم بھکری: رک بہ میر معصوم بھکری	۵۲۴
محمدی	۵۲۶
المحمدی : المحمدیہ (الطریقہ)، رک بہ	
درد، ناصر عندلیب	۵۲۸
محمد صاحبزادہ بن محمد عمر چمکنی : رک بہ چمکنی میاں عمر	۵۲۸
المحمدیہ	۵۲۹
محمرہ	۵۳۰

جملہ حقوق بحق پنجاب یونیورسٹی محفوظ ہیں
مقالہ نگار یا کسی اور شخص کو
کلی یا جزوی طور پر اس کا کوئی مقالہ یا تعلیقہ یا اس کا کوئی طویل اقتباس
یا ترجمہ شائع کرنے کی اجازت نہیں

بار دوم ــ اگست ۲۰۰۱ء
ناشر : کرنل (ر) مسعود الحق، رجسٹرار، پنجاب یونیورسٹی، لاہور
طابع : عبدالمتین ملک ..... مفوض مطبع
مطبع : ادبستان، ۲۳۔ ریٹی گن روڈ، لاہور

Urdū
Encyclopædia of Islām

Under the Auspices
of

THE UNIVERSITY OF THE PANJAB
LAHORE

Vol. III

(Efendi — Ba'idū)

(Reprinted 1422 / 2001)